مشیر
مارچ سنہ ۱۹۵۵ء
قیمت فی پرچہ پاکستان : آٹھ آنے
بھارت : دس آنے
جلد 6
مرتبہ عبدالغفور بیگ
شمارہ 3
THE MUSHIR KARACH

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ

ٹیلی فون ———— ۷۹۲۳

جلد: ۶ ★ شمارہ: ۳

مارچ ۱۹۵۵ء

★

مرتبہ :- عبدالغفور بیگ

★

بدل اشتراک : پاکستان: سالانہ: پانچ روپے + فی پرچہ: آٹھ آنے

بھارت: سالانہ: چھ روپے + فی پرچہ: دس آنے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ:

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یوپی) بھارت

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا)

فہرستِ مضامین

فشیر (کراچی)

6 (3—12) 1955

(1-2)

دن سرست ہے، نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش کام آتی ہے، بجز اس کے جس کے حق میں اللہ خود ہی سفارش کی اجازت دے۔"

(السبا-۳)

"کہو، تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر کردے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا کونسا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں دلا دے گا۔ اسی کے لئے تعریف ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور وہی اکیلا صاحب حکم و اقتدار ہے، اور اسی کی جانب تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اللہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لئے رات طاری کردے، تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لائے گا کہ اس میں تم سکون حاصل کرسکو، کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟" (قصص ۱۷)

(بشکریہ "دیہات سدھار")

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر

تخاب نمبر شائع ہوا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب سننا پڑیں۔ سب سنتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ہمیں اپنی کوتاہ دستی اور
ں احساس ہے، اعتراف ہے ——— بھلا یہ کام کسی ایک کے بس کا تھا بھی کب۔ اپنی جلتی میں بہتیرے ہاتھ پیر مارے؛ لوگوں
تقاضے کئے ....پر.... "اثران پر ذرا نہیں ہوتا" کم ہی ایسے ہیں، جو سنکر دیتے ہیں، جنھوں نے قدم بڑھایا، ہاتھ بٹایا (ہم
یں)۔ ——— بایں ہمہ اگر "تحفۂ درویش" آپ کو پسند آیا تو یہ حسنِ نظر ہے اور مقامِ خوشی؛ اور اگر نہ بھایا تو یہ امرِ واقعہ ہے اور
ب راہ۔

وشی بھی ہے اور غم بھی کہ "رج انتخاب نمبر" پہلے ہی روز ختم ہو گیا۔ خوشی تو اس بات کی کہ محنت "ٹھکانے لگی"، اور غم اس امر کا
۔وا ہو گیا: کس کس کو یہ "تحفہ" دینا تھا، بھیجنا تھا۔ کہاں کہاں یہ "نذر" مانی تھی، پہونچانی تھی۔ لیکن "حسرت ہی رہی" ———
ں لکھا"
، "نامہ بردں" کی عنایات بھی خاص رہیں۔ یوں تو ہر مہینے ہی کچھ نہ کچھ شکایات موصول ہوتی تھیں؛ لیکن اس دفعہ تو یہ حال
سی تعداد جمع ہو چکی ہے، پھر بھی خط پر خط چلے آ رہے ہیں اور یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ ہر ڈاک یہ دُہائی دیتی ہوئی آتی ہے
ی کا پرچہ نہیں پہونچا، "رج انتخاب نمبر" نہیں ملا۔ اب تک روایات یہی رہی ہیں کہ جب کبھی پرچہ نہ ملنے کی کوئی شکایت
، دوبارہ پرچہ بھیج دیا گیا، لیکن جب پرچہ ہی موجود نہ ہو تو بھیجا کیا جائے۔
ملنے کی شکایات پر ہمیں شکایت ہے ——— اور کوئی چارۂ کار نہ پاکر یہ الفاظ زبان پر آ رہے ہیں۔ —— کہ "نمبر" شائع
جب ہم نے خاص طور پر توجہ دلائی کہ رجسٹری سے منگوائیے، ٹکٹ بھیج دیجئے، تو کم ہی ایسے تھے، جنھوں نے پروا کی ہو ——— اور
یں کہ ان کا پرچہ لیا قیمت ان تک پہونچ گیا۔ ——— لیکن اب ہر محرومی کے ساتھ غم ہے، غصہ ہے، شکوہ ہے، شکایت ہے۔ کہیں
انی دیتی ہے کہ "پرچہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔" کہیں سے حکم ہوتا ہے کہ "پرچہ نہیں بھیجنا ہے تو پیسے واپس کر دو۔" کوئی نوٹس ملتا ہے کہ
فوری تدارک نہ کرنے کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔"........ "حیران ہوں کہ روؤں یا پیٹوں جگر کو میں۔"
، سے آرڈر، جن میں خاصی تعداد ایجنسیوں کی ہے، کافی دیر میں موصول ہوئے، اور ہم تعمیل سے قاصر رہے۔ ہمیں اپنی اس
یں ہے اور توقع ہے کہ معذور سمجھ کر معاف کر دیا جائے گا۔

رحضرات کی طرف سے بہت کافی خطوط ایسے بھی موصول ہوتے رہتے ہیں کہ جن میں خریداری نمبر درج نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دوسرا

ایسا حوالہ دیا ہوتا ہے کہ ضروری حوالہ جات تلاش کرکے تعمیل کی جا سکے ـــــ یہ بات اس کے علاوہ ہے کہ ہماری بار بار کی گزارش کے باوجود نہ تو جوابی کارڈ بھیجے جاتے ہیں اور نہ ضروری ٹکٹ ـــــ پھر شکایت ہوتی ہے کہ خط کا جواب نہیں دیا گیا ...... بھلا "قصور" کس کا ہے؟

آپ جانتے ہیں، "مشیر" کوئی بازاری پرچہ نہیں اور نہ اس کا "مقصد" پیسے کمانا ہے۔ یہ تعمیرِ ذہن اور اصلاحِ مذاق کا داعیہ لیکر میدان میں آیا ہے۔ اس راہ میں جب ایک بار ساتھ ہو جاتا ہے تو چھوڑ دینے اور چھوٹ جانے کے لئے نہیں ـــــ البتہ ہم مجبوریوں کا انکار نہیں کرتے ـــــ اس لئے جب کوئی ساتھی چھوٹتا ہے تو فکر ہوتی ہے، کیا خطا ہم سے ہوئی۔ خدانخواستہ اگر کوئی ایسا موقعہ آئے تو ہمیں ترکِ تعلق کا سبب ضرور بتا دیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔ توقع ہے۔ اس گزارش کو نظر انداز نہ کیا جائیگا۔

(ادارہ)

ماہنامہ "مشیر" کراچی

مئی سنہ ۱۹۵۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے اس کے مطمئن کر دینے والے دلائل، پاکیزہ معیار اور حسین و دلآویز کتابت و طباعت نے اسے ملک کے مشاہیر جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ اب تک اپنا اچھا خاصا حلقہ بنا چکا ہے، اور تجارتی حلقوں میں پورے انہماک سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ آپ کی صنعت و حرفت اور شہرت کا ایک سریع الاثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

نرخنامہ اشتہارات

نمایاں مقامات •	اتفاقیہ	مشروط
سرورق آخری صفحہ	۱۲۵ روپے	۱۰۰ روپے
سرورق صفحہ نمبر دو یا تین	۱۰۰ روپے	۸۰ روپے
عام مقامات •		
سالم صفحہ	۶۰ روپے	۵۵ روپے
نصف صفحہ	۳۵ روپے	۳۰ روپے

منیجر، شعبۂ اشتہارات، ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی ۲

نور لدھیانوی

جمال و جلال

سُن، اے اسیرِ طلسماتِ حاضر و موجود! — تیرے خیال کی پرواز ہے ابھی بے سُود
کمالِ شوقِ دلِ بیقرار، یادِ حبیبؐ — زوالِ ذوقِ نفس، ترکِ شغلِ ذکر و دُرود
مجھے یقین کہ پابندِ وضع ہے ادراک — تجھے ہے وہم کہ ذوقِ جنوں اسیرِ حُدود
رموزِ "کُن فیکُوں" سے وہ بے خبر ہی رہا — کہ جسکا قلب ہے ناآشنائے بود و نبُود
مری نماز اگرچہ ہے بے گداز مگر — یقیں کے سوز سے محروم ہے ترا ابھی سجُود
اُدھر وہ ملّتِ اغیار محوِ تیغ و سناں — اِدھر یہ ملّتِ بیضا کہ وقفِ رقص و سُرود
ادا کوئی تو کرے سُنّتِ براہیمیؑ — کہ پھر ہے شعلہ فشاں آج آتشِ نمرُود
دبی ہوئی تھی جو صدیوں سے انتقام کی آگ — اسے پھر آج ہوا دے رہے ہیں اہلِ ہنوُد
سمجھ سکا نہ کوئی بھی سیاستِ افرنگ — ہوئی ہے اہلِ تدبّر کی فکر سب بے سُود
فقیرِ گوشہ نشیں واقفِ نشیب و فراز — فقیہہِ شہر ہے ناآشنائے سرِّ وجُود
وہی وجود ہے بے سود بزمِ امکاں میں — کہ جس وجود سے مفقود ہو خودی کی نمُود
جو اپنے نفس کا فاتح ہوا اس زمانے میں — وہ کامیاب سپاہی، وہی امیرِ جنُود
خودی ہے عالمِ ظلمت میں چشمۂ انوار — خودی کے نوُر سے پُرنور ہے حریمِ وجُود
اِسی کے فیض سے انسانیت بلند ہوئی — اِسی کی ضرب سے برہم نظامِ ہست و بُود
یہی جمال کا مخزن، جلال کا مرکز — یہی ہے اصل میں رُوحِ روانِ ذوقِ سجُود
اسی سے قائم و دائم ہے جلوت و خلوت — کمال یہ کہ کمالات اِس کے لامحدُود
یہی ہے زیب دہِ حسنِ ثابت و سیّار — یہی ہے زینتِ مہر و مہ و سپہرِ کبُود
گرہ کشائے رموزِ ازل فروغ اِس کا — فقط یہی ہے معمّائے "لَاتَخَف" کی کشُود
اسی سے زندہ فضاؤں میں تازہ ہنگامے — اسی سے ٹوٹتا ہے عالمِ سکوت و جمُود
اسیر اسی کے ہوئے جبرئیلؑ و اسرافیلؑ — اسی سے بندۂ ناچیز واصلِ معبُود

فکر تونسوی

قطرے پہ گہر ہونے تک

صبح کی ڈاک سے مجھے لمبے سائز کا ایک سرکاری لفافہ موصول ہوا، جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے جو چیز آتی ہے، خوف پیدا کرتی ہے، چاہے اس سرکاری لفافہ میں بادام ہی ڈال کر کیوں نہ بھیجے گئے ہوں۔

لفافہ کھولنے پر معلوم ہوا کہ خوف اور بے خوفی میں بس نام نہاد سا فرق ہوتا ہے۔ بادامی رنگ کے کھُردرے سے کاغذ پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی

"ہرگاہ کہ مجھ ڈپٹی کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ کے نوٹس میں لایا گیا ہے کہ تم مسمّی فقیر چند ولد امیر چند ذات بخذہ نے آزادی کی تحریک میں جیل کاٹی تھی۔ چنانچہ سرکارِ عالیہ نے تمہاری خدمات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تین روپے سات آنے بطور ماہانہ وظیفہ دیا جایا کرے۔ یہ وظیفہ ماہ گزشتہ یعنی مارچ ۱۹۵۷ء سے شروع ہو کر تا حیات مسمّی مذکو کو جاری رہیگا۔ لہذا تم ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں بہ نفسِ نفیس حاضر ہو کر ماہ گزشتہ کا وظیفہ مذکورہ بالا حاصل کر لو۔

نوٹ:۔ اگر تم نے تاریخ مقررہ پر حاضر ہونے میں کوتاہی برتی تو سرکار کے نوٹیفکیشن ۱۰۹ مجریہ ۲۱ مئی کے مطابق تمہارے خلاف کاروائی یک طرفہ عمل میں لائی جا دے گی۔"

دستخط انگریزی...

لفافہ پڑھ کر پہلے تو خیال آیا کہ یہ لفافہ اٹھا کر سامنے چوک میں بھیک مانگتے ہوئے فقیر کے منہ پر دے ماروں اور اُس سے کہوں "جاؤ دوست اپنی خدمات کا صلہ وصول کرلاؤ۔ ہم اپنی قومی خدمات تمہارے نام ٹرانسفر کرتے ہیں"۔ لیکن فوراً بعد خیال آیا کہ حق حق والے کو ہی ملنا چاہئیے۔ اور نا انصافی نہیں برتنا چاہیے۔ اس سالے نکھٹو فقیر نے تو تحریک آزادی میں تنکا تک نہیں توڑا ہوگا۔ اس لئے اس کو وظیفہ دے کر حلال کا مال کیوں حرام کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی قومی خدمات کے آئینہ میں ایک بار پھر اپنی شکل دیکھی۔ زلفیں سنواریں اور ایک رکشا پر سوار ہو کر ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں پہونچ گیا۔

ڈپٹی کمشنر کے لال کوٹ والے دربان نے میری اوقات بھانپتے ہوئے کہا:

"کہاں منہ اٹھائے ہوئے گھسے آرہے ہو؟ صاحب اندر نہیں ہیں"

"جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "تو رشوت چاہتا ہے"۔ میں نے دُور اندیشی سے کام لیا۔ اسے ایک سگرٹ پلا دینا چاہئیے۔ میں نے رشوت خور کو سگرٹ پیش کر دیا۔

دربان نے سگرٹ سلگانے کے بعد میری ماچس اپنی جیب میں رکھ لی، اور خلوص کے مارے ہوئے لہجہ میں کہا "آئیے، اندر تشریف لے چلئیے۔"

میں نے کہا "تم کتنے مہذب انسان ہو"

دربان نے کہا "وہ زمانہ لد گیا جب دربان غیر مہذب ہوا کرتے تھے۔ اب تو آزادی کا زمانہ ہے"

میں نے کہا "سچ کہتے ہو بھائی! آزادی حیوان کو انسان اور انسان کو حیوان بنا دیتی ہے"

دربان کی سمجھ میں حیوان و انسان کی یہ فلسفیانہ منطق نہ آسکی اور وہ میری طرف حیرت سے تکنے لگا، جیسے کوئی ان پڑھ آدمی اخبار کی طرف تکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے اس فقرے کا مفہوم سمجھا دوں، لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ہر آدمی کو کہاں تک اخبار پڑھ کر سنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں دل ہی دل میں جلتا بھنتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور بلند چق سے پرے بیٹھی ہوئی ڈپٹی کمشنر کی نشست کے قریب جا کھڑا ہوا جہاں ایک ادھیڑ عمر کا گھسا پِسا ہوا نیم نوجوان موٹی سی عینک لگائے کاغذات پر جھکا ہوا تھا۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ فا[illegible] انسان ڈپٹی کمشنر نہیں ہو سکتا۔

انسان مذکور کو میری آمد کا قطعاً علم نہ ہوا۔ میں نے خود ہی

نور لدھیانوی

جمال وجلال

سُن، اے اسیرِ طلسماتِ حاضر و موجود! تیرے خیال کی پرواز ہے ابھی بے سُود
کمالِ شوقِ دلِ بیقرار، یادِ حبیبؐ زوالِ ذوقِ نفس، ترکِ شغلِ ذکر و دُرود
مجھے یقین کہ پابندِ وضع ہے ادراک تجھے ہے وہم کہ ذوقِ جنوں اسیرِ حُدود
رموزِ "کُن فیکُوں" سے وہ بے خبر ہی رہا کہ جسکا قلب ہے ناآشنائے بود و نبُود
میری نماز اگرچہ ہے بے گداز مگر یقیں کے سوز سے محروم ہے تیرا بھی سُجود
اُدھر وہ ملّتِ اغیار محوِ تیغ و سناں اِدھر یہ ملّتِ بیضا کہ وقفِ رقص و سُرود
ادا کوئی تو کرے سُنّتِ براہیمیؑ کہ پھر ہے شعلہ فشاں آج آتشِ نمرُود
دبی ہوئی تھی جو صدیوں سے انتقام کی آگ اسے پھر آج ہوا دے رہے ہیں اہلِ ہنُود
سمجھ سکا نہ کوئی بھی سیاستِ افرنگ ہوئی ہے اہلِ تدبّر کی فکر سب بے سُود
فقیرِ گوشہ نشیں واقفِ نشیب و فراز فقیہہِ شہر ہے ناآشنائے سِرِّ وجُود
وہی وجود ہے بے سود بزمِ امکاں میں کہ جس وجود سے مفقود ہو خودی کی نمُود
جو اپنے نفس کا فاتح ہوا اِس زمانے میں وہ کامیاب سپاہی، وہی امیرِ جنُود
خودی ہے عالمِ ظلمت میں چشمۂ انوار خودی کے نوُر سے پُرنور ہے حریمِ وجُود
اِسی کے فیض سے انسانیت بلند ہوئی اِسی کی ضرب سے برہم نظامِ ہست و بُود
یہی جمال کا مخزن، جلال کا مرکز یہی ہے اصل میں رُوحِ رَوانِ ذوقِ سجُود
اسی سے قائم و دائم ہے جلوت و خلوت کمال یہ کہ کمالات اِس کے لامحدُود
یہی ہے زیب دہِ حسنِ ثابت و سیّار یہی ہے زینتِ مہر و مہ و سپہرِ کبُود
گرہ کشائے رموزِ ازل فروغ اِس کا فقط یہی ہے مُعمّائے "لَاتَخَفْ" کی کشُود
اسی سے زندہ فضاؤں میں تازہ ہنگامے اسی سے ٹوٹتا ہے عالمِ سکوت و جمُود
اسیرؔ اسی کے ہوئے جبرئیلؑ و اسرافیلؑ اسی سے بندۂ ناچیز واصلِ معبُود

فکر تونسوی •

قطرے پہ گہر ہونے تک

صبح کی ڈاک سے مجھے لمبے سائز کا ایک سرکاری لفافہ موصول ہوا، جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے جو چیز آتی ہے، خوف پیدا کرتی ہے، چاہے اس سرکاری لفافہ میں بادام ہی ڈال کر کیوں نہ بھیجے گئے ہوں۔

لفافہ کھولنے پر معلوم ہوا کہ خوف اور بے خوفی میں بس نام نہاد سا فرق ہوتا ہے۔ بادامی رنگ کے کھردرے سے کاغذ پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی

"ہرگاہ کہ مجھ ڈپٹی کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ کے نوٹس میں لایا گیا ہے کہ تم مسمیٰ فقیر چند ولد امیر چند ذات نچندہ نے آزادی کی تحریک میں جیل کاٹی تھی۔ چنانچہ سرکار عالیہ نے تمہاری خدمات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تین روپے سات آنے بطور ماہانہ وظیفہ دیا جایا کرے۔ یہ وظیفہ ماہ گزشتہ یعنی مارچ ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر تا حیات مسمیٰ مذکور جاری رہیگا۔ لہذا تم ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں بہ نفس نفیس حاضر ہو کر ماہ گزشتہ کا وظیفہ متذکرہ بالا حاصل کرلو۔

نوٹ:۔ اگر تم نے تاریخ مقررہ پر حاضر ہونے میں کوتاہی برتی تو سرکار کے نوٹیفکیشن مجریہ ۲۱ مئی کے مطابق تمہارے خلاف کارروائی یک طرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔"

دستخط انگریزی...

لفافہ پڑھ کر پہلے تو خیال آیا کہ یہ لفافہ اٹھا کر سامنے چوک میں بھیک مانگتے ہوئے فقیر کے منہ پر دے ماروں اور اس سے کہوں "جاؤ دوست اپنی خدمات کا صلہ وصول کرلاؤ۔ ہم اپنی قومی خدمات تمہارے نام ٹرانسفر کرتے ہیں"۔ لیکن فوراً بعد خیال آیا کہ حق حق والے کو ہی ملنا چاہیئے۔ اور نا انصافی نہیں برتنا چاہیئے۔ اس سالے نکھٹو فقیر نے تو تحریک آزادی میں تنکا تک نہیں توڑا ہوگا اس لئے اس کو وظیفہ دے کر حلال کا مال کیوں حرام کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی قومی خدمات کے آئینہ میں ایک بار پھر اپنی شکل دیکھی۔ زلفیں سنواریں اور ایک رکشا پر سوار ہوکر ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں پہونچ گیا۔

ڈپٹی کمشنر کے لال کوٹ والے دربان نے میری اوقات پہچانتے ہوئے کہا:

"کہاں منہ اٹھائے ہوئے گھسے آرہے ہو۔ صاحب اندر نہیں ہیں"

"جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "رشوت چاہتا ہے"۔ میں نے دوراندیشی سے کام لیا۔ اسے ایک سگرٹ پلا دینا چاہیئے۔ میں نے رشوت خور کو سگرٹ پیش کردیا۔

دربان نے سگرٹ سلگانے کے بعد میری ماچس اپنی جیب میں رکھ لی، اور خلوص کے مارے ہوئے لہجہ میں کہا "آیئے اندر تشریف لے چلیئے"

میں نے کہا "تم کتنے مہذب انسان ہو"

دربان نے کہا، "وہ زمانہ لد گیا جب دربان غیر مہذب ہوا کرتے تھے۔ اب تو آزادی کا زمانہ ہے"

میں نے کہا "سچ کہتے ہو بھائی! آزادی حیوان کو انسان بنا دیتی ہے اور انسان کو حیوان بنا دیتی ہے"

دربان کی سمجھ میں حیوان و انسان کی یہ فلاسفی نہ آسکی اور وہ میری طرف حیرت سے تکنے لگا، جیسے کوئی ان پڑھ آدمی اخبار کی طرف تکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے اس فقرے کا مفہوم سمجھا دوں، لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کردیا کہ ہر آدمی کو کہاں تک اخبار پڑھ کر سنایا جا سکتا ہے چنانچہ میں دل ہی دل میں جلتا بھنتا ہوا اندر داخل ہوگیا اور بلند چبوترے پر بنی ہوئی ڈپٹی کمشنر کی نشست کے قریب جا کھڑا ہوا جہاں ایک ادھیڑ عمر کا گھسا پٹا ہوا نیم نوجوان موٹی سی عینک لگائے کاغذات پہ جھکا ہوا تھا۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ فاقہ زدہ انسان ڈپٹی کمشنر نہیں ہوسکتا۔

انسان مذکور کو میری آمد کا قطعاً علم نہ ہوا۔ میں نے دو بار

کی حد ہے۔ کیا ڈپٹی کمشنر صاحب آگئے ہیں؟"

"آتو گئے ہیں، لیکن وہ اس وقت کسی سے مل نہیں سکتے۔"

میں نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بچے میٹھے آم کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

اس نے کہا: "آپ تو خواہ مخواہ ڈپٹی کمشنر کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، آپ کا کام تو ان کے بغیر بھی کروایا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "آپ کے بچے، سو میرے بچے۔"

دربان نے ایک آم اٹھا کر جلدی سے جیب میں ڈال لیا، اور کہا: "دیکھئے آپ نہایت بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ادھر ادھر مت بھٹکئے بلکہ یوں کیجئے کہ وہ سامنے صاحب سپرنٹنڈنٹ بیٹھے ہیں۔ وہاں چلے جائیے وہ نہایت نیک آدمی ہیں۔ دو منٹ میں آپ کا سارا کام کر دیں گے جائیے۔"

مشورے کی فیس ایک آم دے کر میں سامنے دفتر کی طرف لپکا، جہاں ایک خوب صورت سی چق کے باہر ایک ادھیڑ چپراسی سٹول پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کے سر کو انگلی سے ٹھوکتے ہوئے کہا "جاگئے حضرت! کہ آج کل بیداری کا زمانہ ہے۔"

اس نے چڑ کر کہا "تم کون ہوتے ہو جی مجھے جگانے والے؟"

میں نے بغیر جھجکے جواب دیا: "ساری قوم کو جگانے والا ایک سیاسی ورکر۔"

"یہ کسی قوم ووم کا دفتر نہیں ہے، سرکاری دفتر ہے۔"

میں نے کہا: "ارے کمبخت سے جاگ بہلانے کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت یہ جاننے کی ہے کہ آپ سگریٹ پینا پسند کریں گے یا آم کھانا؟"

کافی دیر کی ذہنی کشمکش کے باوجود وہ یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ اقتصادی اعتبار سے سگریٹ نفع بخش رہے گا یا آم۔ چونکہ میں اس سے زیادہ اقتصادیات کے نازک رموز کو سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر اپنا فیصلہ ٹھونستے ہوئے کہا: "آپ سگریٹ کی بجائے آم ہی لے لیجئے۔" اگرچہ چپراسی کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ آم کے ساتھ ساتھ سگریٹ چلانے میں بھی کوئی خاص قباحت تو نہ تھی، مگر میں نے ان نگاہوں سے کہا کہ لالچ بری [illegible] ہے۔

آم لینے کے بعد چپراسی نے میری طرف طربناک نگاہوں سے دیکھا اور میں نے آموں کے خالی لفافے کی طرف کرب ناک نگاہوں سے [illegible] اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر دل و جان سے فدا ہو کر مجھے چق اٹھا کر اندر جانے کی اجازت دیتا، میں نے اسے روک دیا اور کہا: "پہلے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لئے بازار سے دو آم لے آؤں۔" چنانچہ میں بھاگم بھاگ ٹمنٹ میں آم لے کر واپس آگیا۔ گرچہ دربان نے کہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہایت نیک آدمی ہیں، مگر ان جھوٹے دربانوں کا کیا اعتبار؟

سپرنٹنڈنٹ صاحب واقعی نیک آدمی نکلے، کیوں کہ انھوں نے میرے آموں اور میرے کھدر کی کوالٹی کی بے حد تعریف کی۔ مجھے ایک قربانی مجسم سیاسی ورکر سمجھ کر پانی کا گلاس پلایا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک بیٹھ کر سرکار کی انصاف پسندی اور بڑھتی ہوئی گرانی کے گن گاتے رہے۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا: "قدر و منزلت روپوں کی تعداد سے نہیں پائی جاتی، تین روپے سات آنے ماہوار کی رقم بظاہر نہایت حقیر دکھائی دیتی ہے لیکن اگر نگاہِ عقیدت سے دیکھا جائے تو عزت کی ایک پائی بھی ایک سو روپے کے برابر ہوتی ہے۔" میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی کیونکہ منہ پر برائی کرنا میرے ایسے بزدل کا فرض نہیں تھا۔ آخر سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا: "آپ جیسے دیوتا لوگوں نے ہی ہمارے ملک کا سر اونچا کیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو آج ملک پر نوکر شاہی کا تسلط ہوتا۔"

میں نے کہا: "یہ تو صرف آپ کی اور ڈپٹی کمشنر صاحب کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"

"ہمارے ڈپٹی کمشنر صاحب نے آتے ہی دفتری نظام کی کایا پلٹ دی ہے۔ اب یہی دیکھئے، انگریز کے راج میں کسی سیاسی ورکر کی مجال تھی کہ ہم سے آکر یوں بات کر سکتا۔ دھکے مار مار کر باہر نکال دیتے۔"

"بالکل، بالکل، جہاں تک دھکے مار کر باہر نکالنے کا تعلق ہے، میں چار دن پہلے جب یہاں آیا تھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب کے دربان نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ دھکے مارنا اب قانوناً جرم قرار دے دیا گیا ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب جھوم اٹھے، اور میں [illegible] فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: "تو جناب! [illegible] سات آنے دلوا دیجئے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے فوراً گھنٹی بجائی، اور اس منشی سے ریڈر کو بلایا
...سے کہا "مسمی فقیر چند ولد امیر چند کی فائل اٹھا کر لے آؤ۔" ریڈر
...تھوڑی سی فائل اٹھا کر لے آیا جس میں پیلے، نیلے، سفید اور سبز
...کے کوئی پچاس ساٹھ فل سکیپ کاغذات ایک دوسرے سے
...ے ہوئے پڑے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان پچاس ساٹھ
...ت کی مارکیٹ ویلیو تین روپے سات آنے سے ضرور زیادہ ہو گی

سپرنٹنڈنٹ نے کہا "ان کا کام کب تک ہو جائے گا؟"

ریڈر بولا "صاحب چھ دن کے لئے شکار پر گئے ہوئے ہیں۔
...ن واپسی پر ہی ہو سکے گا۔"

میں نے کہا "شکار کے بعد صاحب بہادر کہاں جائیں گے؟"

ریڈر نے کہا "سرکاری راز بتائے نہیں جا سکتے۔"

اس کے بعد نجانے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کون سا ٹیکنیکل پوائنٹ
...ٹھایا کہ ریڈر نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے اور مجھ سے تیزی سے کہنے لگا کہ
...نے میرے ساتھ چلیئے" اور پھر میں ریڈر صاحب کے پیچھے پیچھے یوں چلا
...یا جیسے .... (تشبیہ بازاری ہے اس لئے ملتوی
کرتا ہوں۔)

ریڈر جب اپنی کرسی پر دوبارہ آکر بیٹھا تو اس نے مجھ پر ایک
قہر آلود نگاہ ڈالی۔ میں اس قہر آلود نگاہ کا مفہوم نہ پا سکا، ورنہ اس
اس کا مفہوم پانے کی کوئی فوری ضرورت تھی، کیوں کہ اب جب کہ
دفتری نظام میں ڈپٹی کمشنر صاحب ایک انقلاب لا چکے تھے اس انقلا(ب)
کو واپس کھینچنا بددیانتی تھی۔ ریڈر نے جب دیکھا کہ اس کی قہر آلود نگاہیں
محو کر ناکام لوٹ آئی ہیں تو اس نے مجھ سے کہا:

"رسید لکھ لاؤ جی! کھڑے کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو!" اور لہجہ
...لیا تھا، جیسے خشک لکڑی تڑاخ سے ٹوٹ کر گری ہو۔

میں نے کہا "جی کون سی رسید؟"

"رسید ہندوستانی زبان کا ہی لفظ ہے۔"

"میں آپ سے کلی اتفاق کرتا ہوں۔"

"تو پھر جائیے، لکھ لائیے۔"

...کہ جاؤں؟ رسید لکھنے کے لئے کون سی جگہ موزوں ہو سکتی ہے؟

کیا ریڈر کی میز؟ —— مگر نہیں، ریڈر کی میز سرکاری میز ہے، پبلک
کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ تو کیا باہر برآمدے میں جا کر لکھوں؟
لیکن کون جانے مجھے یوں پراسرار طریقے پر لکھتے دیکھ کر کوئی مجھے جاسوس
نہ سمجھ لے۔ نیا نیا ملک آزاد ہوا ہے، جاسوسوں سے ہر قدم خبردار رہنا
ضروری ہے۔ بالآخر چند منٹ تک سوچنے کے بعد میں وہیں ڈپٹی
کمشنر کے ہی ایک کمرے کے ایک گوشہ میں زر ریڈر کی طرف پشت
کر کے کھڑا ہو گیا، اور تین روپے سات آنے کی رسید لکھ کر آناً فاناً
ریڈر کی میز پر دھر دی۔

"یہ رسید نہیں چلے گی۔"

"میرے خیال میں چل جائے گی، آپ غور سے دیکھیے۔"

"غور سے ہی دیکھی ہے۔ اس رسید پر کسی ذمہ دار آدمی کی گواہی
لکھوا کر لائیے، کسی مجسٹریٹ کی، کسی میونسپل کمشنر کی یا کسی دوسرے ذمہ
دار آدمی کی۔"

"تو کیا میں غیر ذمہ دار آدمی ہوں؟" مجھے غصہ آ گیا۔

"قانون کی نظروں میں۔"

"آپ تو نہایت غیر ذمہ دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کی نظروں میں۔"

اس سے زیادہ بحث بیکار تھی۔ ایک معمولی سا ریڈر میری
توہین کر رہا تھا، اور وہ بھی صرف تین روپے سات آنے کے لئے
حالانکہ میں نے انگریز کے راج میں ہزاروں روپوں کی پیش کش
نہایت حقارت سے ٹھکرا دی تھی۔ لیکن آہ! اب انگریز چلا گیا تھا، اور
مجھے رسوائی کے لئے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تاؤ میں آکر
رسید اٹھا کر پھاڑ دی اور بڑی تمکنت کے ساتھ اس سے کہا "میں ابھی
ابھی میونسپل کمشنر کے دستخط کروا کر لائے دیتا ہوں تا کہ آپ مجھے اتنا گرا پڑا
انسان نہ سمجھیں۔" اور آدھ گھنٹہ بعد جب میں میونسپل کمشنر کے دستخط کروا کر
دوبارہ لوٹا تو دربان نے مجھے بتایا کہ ریڈر صاحب چلے گئے ہیں اور دفتر
کا ٹائم اوور ہو چکا ہے۔ اب آپ کل تشریف لائیے۔"

دوسرے دن میں چاق چوبند ہو کر صبح دس بجے ہی گیا۔

راستہ میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ ریڈر کے ساتھ ہیں میکو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پریم پیار سے انسان چاہے کسی کو قتل کر دے تو کوئی نہیں پوچھتا، مگر لڑ جھگڑ کر تو کوئی آدمی آئس کریم کھانا بھی پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ میں صدق اور صفا سے بھرپور دل لے کر دفتر پہنچا۔ دربان نے آج سگریٹ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ چار آنے نقد بھی طلب کئے اور اتنے حسن و رعنائی کے ساتھ طلب کئے کہ میں نے سوچا کہ اس آدمی کو تو ہر ماہ چار آنے دیئے جا سکتے ہیں (حسن کی قدر کرنا میری فطرت میں داخل ہے)

ریڈر نے میونسپل کمشنر کے دستخط دیکھے اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ دستخط جعلی ہیں تو اس کی بات بن جاتی لیکن اس سے چوک ہو گئی، اور وہ صرف ماتھے پر مسلسل تیوریاں ابھارتا اور مٹاتا رہا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بڑی ملائمت کے ساتھ کہا "ریڈر صاحب!"

اس نے کہا "یہاں دستخط کر دو۔"

میں نے ایک کاغذ پر دستخط کر دیئے، اور اس نے میری رسید کے جواب میں ایک چھپی ہوئی رسید نما سی چٹ مجھے پکڑا دی، اور کہا "سامنے کلرک صاحب کے پاس جا کر مہر لگوا لو۔"

سامنے والے کلرک نے اپنی تینوں درازیں کھول کر دیکھیں اور ریڈر سے کہا "مہر تو آپ کے پاس تھی۔"

"جی نہیں آپ کے پاس تھی۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔"

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

یا لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی! یہ مہر کہاں گئی؟ دونوں سرکاری حضرات گرگٹوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے پھر شاید ڈپٹی کمشنر صاحب شکار پر ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر ریڈر نے نہایت دیانتداری سے کام لیتے ہوئے کہا "آپ باہر برآمدے میں بیٹھئے دو بجے کے قریب مسٹر تریبھون ناتھ کلرک ۔۔۔ آئیں گے۔ مہر انہی کے پاس ہے۔"

دو بجے تک تریبھون ناتھ تو نہ آیا مگر مہر ضرور مل گئی۔ مہر ملنے کی تقریب پر میں نے سگریٹ بانٹے اور سرکاری چٹ لیکر خراماں خراماں جانے لگا تو ریڈر صاحب نے آواز دے کر مجھے روک لیا اور کہا "کہاں چلے ہیں آپ؟ اس چٹ پر ابھی مہر کے ساتھ ساتھ صاحب بہادر کے دستخط ہوں گے۔ ان کے دستخطوں کے بغیر تو یہ چٹ ایک کوڑی کی بھی نہیں۔"

"لیکن صاحب بہادر کی مہر موجود ہے۔"

ریڈر ہنسا۔ "مہر تو بازار میں بارہ آنے میں بن جاتی ہے جناب لیکن صاحب بہادر کو تو بارہ آنے میں کوئی نہیں بنا سکتا۔"

"تو پھر صاحب بہادر کے دستخط کروا دیجئے، یہ آپ کی ڈیوٹی ہے"

"ڈیوٹی" کے لفظ پر ریڈر کی خودی بیدار ہو گئی۔ "دستخط کرنا تو ڈپٹی کمشنر کی اپنی ڈیوٹی ہے، ریڈر کا کام تو دستخط کروانا ہے۔ مگر وہ دستخط کیسے کروائے؟ صاحب بہادر تو شکار کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے ہیں۔" مجھے اچانک ریڈر صاحب کے ساتھ ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی، اور میں نے اس سے دست بستہ معافی مانگ کر کہا "غلطی آپ کی نہیں ہے، قطعی نہیں ہے، آپ میری طرف سے مطمئن رہیں مجھے سٹوپنگ گنتی اچھی طرح آتی ہے۔ اس لئے میں صاف صاف کہہ سکتا ہوں کہ ساتویں دن ڈپٹی کمشنر نے اپنے دستخط اس چٹ پر کئے، اور میں نے ریڈر سے کہا کہ "اب تو سرکاری کارروائی بخیر و خوبی سرانجام پا گئی ہے، اس لئے اب نکالیے تین روپے سات آنے۔"

ریڈر نے کہا "آپ بہت کوتہ ذہن انسان ہیں۔ آپ کو اتنا بھی علم نہیں کہ ہم تین روپے سات آنے کی صرف چٹ دے سکتے ہیں۔ روپے دینا سرکار کے اکاؤنٹنٹ کا فرض ہے۔"

"تو اکاؤنٹنٹ صاحب کہاں ملیں گے؟"

ریڈر مسکرایا۔ میں جل گیا۔ اسے میرے جلنے کی پروا نہیں تھی۔ اس نے وہ اور بھی مسکرایا اور جب یہ مسکراہٹ منہ چڑانے کی صورت میں تبدیل ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ "آپ یہ چٹ لے کر امپیریل بنک میں چلے جائیے روپیہ وہیں سے ملے گا۔"

وہاں سے ڈیڑھ دو میل پر امپیریل بنک تھا۔ چار آنے تانگے والے کو دے کر جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ بنک ۔۔۔

ہو جاتی ہیں

دوسرے دن بینک کے پورے نو بابوؤں نے یکے بعد دیگرے تو ہی صاد رکیا کہ اس چٹ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دسویں بابو کو نہ جانے میری ڈھلی ہوئی قمیص پسند آگئی یا اُسے خدائی بارگاہ میں اپنا کوئی گناہ بخشوانے کے لئے ایک آدھ نیکی کرنا مقصود تھی کہ اس نے مجھے بتا دیا کہ سرکاری روپے کی ادائیگیاں پچھلی طرف ہوتی ہیں۔ آپ ادھر چلے جائیے۔ اور لکھمی داس کی کھڑکی پوچھ لیجئے۔

لکھمی داس کی کھڑکی کے سامنے آدمیوں کی ایک لمبی قطار تھی میں نے ایک سرکاری پراپیگنڈہ فلم میں یہ ہدایت سُنی تھی کہ قطار باندھ کر کھڑے ہونا مہذب طریقہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی مہذب بننے کی خاطر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن آدھی قطار ہی بھگتائی گئی تھی کہ ٹائم اوور ہو گیا۔ دوسرے دن کی قطار میں جب میری باری آئی تو لکھمی داس کو بینک کے منیجر صاحب نے بلا لیا اور اس کی واپسی تک ٹائم اوور ہو گیا۔ تیسرے دن کی قطار میں جب میری باری آئی تو لکھمی داس کو شاید زکام تھا۔ اس لئے اس نے برگشتہ خاطر ہو کر کہا:

"پرسوں آنا۔ سرکار کی طرف سے ابھی آپ کے کاغذات نہیں آئے"

"کون سے کاغذات؟"

"آپ کا سر"

"سرِ تسلیم خم ہے"

میں نے دل میں فیصلہ کیا اگر پرسوں تک مجھے سن اسٹروک نہ ہو گیا تو میں یہاں ضرور آؤں گا اور لکھمی داس سے کہہ دوں گا کہ یہ تین روپے ساتھ آنے کی چٹ میں آپ کے پاس ایک روپیہ سات آنے میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ ہے منظور ہے سودا؟

لیکن جب پرسوں آئی تو لکھمی داس نے انکشاف کیا کہ سرکار کی طرف سے اس کے پاس سب کچھ موجود ہے اس لئے وہ ایسی ذلیل حرکت نہیں کرے گا چنانچہ اس نے پہلے میرے کاسیٹ کو دائیں بائیں نیچے اوپر [illegible] میرے کاغذات کو ستائیس مرتبہ دیکھنے کے [illegible] اور میرے کاغذات مع چٹ تریپ بیٹھے ہوئے کلرک کے حوالے کر دیئے اور مجھ سے کہا، اُدھر دوسری کھڑکی پر آجائیے۔ دوسری کھڑکی کے کلرک نے سینکڑوں فائلوں کے نیچے میرے کاغذات کو دبا دیا۔ میں نے تڑپ کر کہا "حضرت! میں گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ان تین روپے ساتھ آنوں کا تعاقب کر رہا ہوں۔ براہِ کرم مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ وہ کہاں دفن ہیں اور ان کاغذات کو روپوں میں بدلتے ہوئے کتنے آسمان طے کرنے پڑیں گے۔"

کلرک سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ یا ممکن ہے اس گرم توے پہ میری بوند جاتے ہی خشک ہو گئی ہو۔ چنانچہ میں پاؤں کے تلووں کو بدلتا رہا اور کلرک مذکور فائلیں بدلتا رہا اور ایک بار پھر ٹائم اوور ہو گیا

وہاں سے تیر کی طرح اڑتا ہوا میں سیدھا ایک بیرسٹر کے ہاں پہنچا۔ اس سے پوچھا "بیرسٹر صاحب! میری ساری داستان یہ ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ کیا اس کی بنا پر قانون کی کوئی دفعہ میری امداد کر سکتی ہے، جس کی رُو سے میں ان سبھی کارندوں کو جیل میں بھجوا دوں؟"

بیرسٹر نے بڑی سنگدلی کے ساتھ سر ہلا دیا اور کہا "ایسی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔"

"تو کیا میں ان پر توہین کا مقدمہ کر دوں؟"

"سرکار سے ٹکر نہیں لینی چاہیئے۔"

"تو کیا میں ان تین روپے ساتھ آنوں کا خیال چھوڑ دوں"

"یہ بزدلی ہے۔"

ایک طرف بزدلی تھی۔ دوسری طرف توہین کا ایک سلسلہ تھا آخر رد و قدح کے بعد میں نے دوسری چیز کو اپنانا مناسب سمجھا" اور آنے والے بے پانچ دن لکھمی داس کے محاذ پر حق انصاف اور آزادی کی لڑائی لڑتا رہا۔ میری بیوی نے لکھمی داس کی بیوی کے قدموں پر جا کر اپنا سر رکھ دیا اور آخر ایک دن اپنی بیوی کے خوف سے شاید اس نے میرے کاغذات پاس کر دیئے۔ کاغذات پاس کرنے کے بعد اس نے چپڑاسی سے کہا کہ میرے یہ کاغذات اب ادائیگی کے لئے خزانچی کے پاس لے جائے۔

اچانک نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے چپڑاسی۔

کاغذات نے کران پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ یہ سرسری نگاہ ایک دم سنجیدہ نگاہ بن گئی، اور وہ چلا اٹھا:۔

"غلط ہے، بالکل غلط ہے، نمبر ہی نہیں ملتا"

"کاہے کا نمبر نہیں ملتا صاحب!"

"یہ ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ اس چیٹ کو دوبارہ ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں لے جائیے اور نمبر ٹھیک کروالائیے"

"مگر جناب! یہ تو بتائیے کہ نمبر کون سا ہے اور غلطی کیا ہے"

"بس، وہ خود سمجھ جائیں گے۔ ان سے کہیے کہ سیریل نمبر نہیں ملتا۔ ایک ہندسہ چار کی بجائے پانچ پڑا ہوا ہے"

"مگر جناب! ہندسہ تو چار کا ہی پڑا ہوا ہے"

"نہیں پانچ کا ہے، میں اندھا نہیں ہوں"

"اندھا اگرچہ میں بھی نہیں ہوں، مگر آپ ذرا اپنی عینک کی بجائے میری عینک سے دیکھئے تو آپ کو صاف صاف چار کا ہندسہ دکھائی دے جائے گا"

"اپنی عینک اپنے پاس ہی رکھیے"

"آپ مجھے جان بوجھ کر تنگ کر رہے ہیں"

"یہ سرکاری معاملہ ہے"

"نان سنس"

"شٹ اپ"

"شٹ اپ"

"شٹ اپ"

اور پھر لکھی داس کی کھڑکی شٹ اپ ہو گئی۔ اور چیٹ میرے ہاتھ میں یوں پکڑی رہ گئی جیسے یہ تین روپے سات آنے نہ ہوں بلکہ صرف شٹ اپ ہو۔

وہ چیٹ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس پر ابھی تک چار پانچ کے دونوں ہندسے بیک وقت نظر آتے ہیں۔ میں دوبارہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں نہیں گیا، بلکہ اپنے ایک رشتہ دار کی طرف سے ایک بنڈل لفافہ صاحب بہادر کو بھجوا دیا ہے جس میں لکھا ہے کہ مستی فقیر

چند طلبا امیر چند کی چونکہ موت واقع ہو گئی ہے۔ اس لیے اس کا سرکاری وظیفہ بھی سرکار ضبط کر لیا جائے۔

بشکریہ "ساقی"

ابنِ احمد •
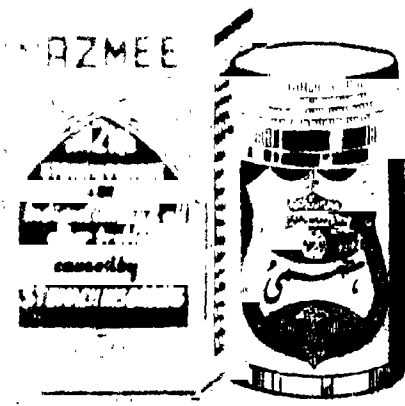
وہ جو حق کی بازی جیت گئے

ڈاکٹر حسن اسمٰعیل الہضیبی

شیخ حسن الہضیبی نے قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا اور بہت جلد اس میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا اور بالآخر جج بنا دیئے گئے۔ انھوں نے قانونیات کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ اسلامی قوانین اور جدید قوانین کا مقابلہ کر کے اسلامی قوانین کی برتری ثابت کرنا ان کا خاص موضوع تھا۔

اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا شہید کی زندگی میں ہی اخوان سے کافی تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اور حسن البنا ان سے مختلف معاملات میں مشورے بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ۱۹۵۱ء میں اخوان المسلمین کے ارکان نے ان کو تحریک کی قیادت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا چیف جسٹس کے اصرار کے باوجود انھوں نے پنشن لے لی اور اپنا سارا وقت تحریک اسلامی کے کاموں میں دینے لگے۔

ڈاکٹر حسن الہضیبی ایک بلند کردار اور بے داغ سیرت رکھنے والے آدمی ہیں انہیں قرآن کریم سے خاص شغف ہے اور اخوان میں قرآن سے لگاؤ پیدا کرنے کی خاص کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کوئی بیان قرآن کے مطالعہ اور اس کے تدبر کی تاکید سے خالی نہیں ہوتا۔

اخوان المسلمین کے سلسلہ میں ہضیبی صاحب کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ کارکن کو زیادہ سے زیادہ توجہ اسلام کی بنیادی دعوت پھیلانے اور اسلامی اصولوں پر عمل کرنے والے نوجوانوں کی نئی نسل پیدا کرنے میں صرف کرنا چاہئے اور ہنگامی کاموں میں زیادہ وقت صرف کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

مصر کی انقلابی حکومت کے بارے میں ان کی پالیسی یہ تھی کہ اخوان ان کاموں میں اس سے پورا پورا تعاون کرتے رہیں جو یہ قوم کی بھلائی کے لئے کرے مگر اس کا دم چھلا نہ بن جائیں بلکہ اپنی انفرادیت کو محفوظ رکھیں۔ چنانچہ اوائل ۱۹۵۳ء میں جب جمال ناصر نے ایک نئی جماعت "محاذ آزادی" بنائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اخوان کو اس میں مدغم کر دیا جائے تو ہضیبی صاحب نے صاف صاف انکار کر دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین دلایا کہ اخوان نئی پارٹی کے ساتھ بھلائی کے کاموں میں تعاون کرتے رہیں گے۔

وہ سامراجی تسلط کے سخت مخالف تھے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی فوجیں غیر مشروط طور پر سویز کے علاقہ کو خالی کر دیں اور اسی بنیاد پر انھوں نے اینگلو مصری معاہدہ پر تنقید کی کیونکہ اس میں یہ شرط موجود ہے کہ بعض مخصوص حالات میں انگریز فوجیں دوبارہ سویز کے علاقہ میں واپس آسکتی ہیں۔

اس معاہدہ پر تنقید کے بعد حکومت مصر نے اخوان پر سختیاں شروع کیں جس کے نتیجہ میں ۸ر دسمبر کو اخوان لیڈروں کو شہید کر دیا گیا اور آٹھ رہنما با مشقت عمر قید اور دو رہنما پندرہ سال کی سزا کاٹ رہے ہیں ہضیبی صاحب بھی ان سات افراد میں سے ہیں جن کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا مگر بعد میں سزائے موت کو اس بنیاد پر کہ ہضیبی صاحب کی صحت خراب رہتی ہے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔

ہضیبی صاحب صبر و ثبات کے پیکر ہیں ان کو جیل میں متعدد طریقوں سے ذہنی اذیت پہنچائی گئی لیکن وہ اپنی جگہ ایک پہاڑ کی طرح جمے رہے اور جب سرکاری وکیل نے عدالت میں ان کے لئے سزائے موت کا مطالبہ کیا تو وہ مسکرا دیئے اور انھوں نے کہا کہ زندگی اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا میں اپنے مقدمے کا دفاع نہیں کرنا چاہتا صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

میں بالکل بیگناہ ہوں۔"

عبدالقادر عودہ شہید

مصر کا ۴۷ سالہ عظیم ماہر قانون و مفکر جس نے بیسویں صدی میں حضرت حبیب کی یاد تازہ کر دی جس کے ہونٹوں پر تختہ دار کی طرف جاتے وقت یہ اشعار تھے کہ:

"میں بستر پر مروں یا میدانِ جنگ میں، آزاد مروں
یا قید میں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے ملنا تو
اللہ ہی سے ہے۔"

عبدالقادر عودہ کا اخوان سے تعلق کافی پرانا ہے۔ لیکن یہ باقاعدہ اس میں ۱۹۵۰ء میں شریک ہوئے۔ اس سے قبل یہ منصورہ میں ایک جج کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور اس زمانہ میں انھوں نے ایک مقدمے میں اخوان کو بری قرار دیا تھا۔ مقدمے کی جب بالائی عدالت میں اپیل کی گئی تو عبدالقادر عودہ نے اپنی ججی کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا اور اخوان میں باقاعدہ شامل ہو گئے اور ان کے وکیل کی حیثیت سے مقدمہ لڑے اور مقدمہ جیت کر اپنے ہی کئے ہوئے فیصلہ کی توثیق کر ڈالی۔

عودہ ایک زبردست قانون داں تھے جنھوں نے اسلامی قوانین کا مصری قوانین کے ساتھ گہرا تقابلی مطالعہ کیا تھا ان کے اس وسیع مطالعہ کا حاصل ان کی آٹھ سو صفحے کی وہ کتاب ہے جو انھوں نے "اسلام کے قانون فوجداری" پر لکھی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ صدیوں سے اس موضوع پر اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی۔

اس ضخیم کتاب کے علاوہ انھوں نے متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً "اسلام اور ہمارے موجودہ قانونی نظام"، "اسلام کا نظام مالیات و حکمرانی" اور "مسلمانوں کی جہالت اور علماء کی بے حسی کے درمیان اسلام کا حال" وغیرہ ۔۔۔۔ ۱۹۵۱ء میں عبدالقادر عودہ کو اخوان کا نائب مرشد عام منتخب کیا گیا۔

جنوری ۱۹۵۴ء میں جبکہ حکومت مصر نے اخوان کو توڑ دیا تو باوجود اس کے کہ تقریباً ایک ہزار اخوان گرفتار کر لئے گئے تھے، عودہ کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں عودہ اخوان کی قیادت کا تمام کام سرانجام دیتے رہے۔

فروری میں جب جنرل نجیب کی اس خواہش کے برعکس کہ مصر میں آزاد جمہوری اور پارلیمانی زندگی قائم ہونی چاہیئے، کرنل ناصر نے فوجی آمریت کے برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تو عوام میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور قاہرہ میں سخت پابندیوں اور شدید خطرات کے باوجود دس ہزار سے زائد افراد نے ایک زبردست مظاہرہ کیا۔ عبدالقادر عودہ ان پُرخطر حالات میں پیش پیش تھے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس واقعے نے ہی موجودہ مصری حکومت کے ارکان کو ان کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس الزام پر کہ وہ اخوان اور جنرل نجیب یعنی صدر جمہوریہ مصر کے مابین رابطہ کا کام کر رہے تھے اور یہ کہ ان کا حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں ہاتھ تھا، بغیر جرم ثابت کئے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

اپنے مقدمہ کی پیروی قادر عودہ نے خود کی اور اس میں اس بات کا انکشاف کیا کہ اخوان کے پاس جو اسلحے موجود ہیں وہ خود کرنل ناصر کے دیئے ہوئے ہیں اور یہ کہ انھوں نے کوئی سازش نہیں کی۔

پھانسی کے تختہ پر جاتے وقت انھوں نے یہ کہا "میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے شہادت کی موت بخشی۔"

یوسف طلعت

اخوان المسلمین کا ۴۲ سالہ قائد جس کے ہونٹوں پر پھانسی کے تختے پر چڑھتے وقت بھی اپنے دشمن کے لئے دعائے مغفرت کے کلمات تھے۔ یہ سیرت و کردار، عظمت، صبر و ثبات اور بے لوثی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔

یوسف طلعت اسماعیلیہ میں غلّے کے تاجر تھے اس سے قبل وہ ایک معمولی کارپینٹر تھے بعد میں انھوں نے غلّہ کی ایک معمولی سی دکان کھولی تھی۔

یوسف طلعت کو جیل میں اتنی شدید تکلیفیں دی گئی تھیں کہ وہ عدالت میں کھڑے ہو کر شہادت نہ دے سکے اور جب وہ عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے تو ان کی آنکھ نذر کو سب سے چکی تھی ۔۔۔۔ اپنی شہادت کے دوران انھوں نے کہا کہ [illegible]

کسی قتل کی سازش سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے برعکس ڈاکٹر حفیبی صاحب کی خاص طور پر یہ ہدایات تھیں کہ جرائم اور قتل وغیرہ کی روح کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

یوسف طلعت نے خود اپنے مقدمے کی پیروی کرنی چاہی مگر صدر عدالت نے ایک صحافی کو ان کا وکیل مقرر کر دیا۔

یہ جب عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے تو صدر عدالت نے کہا "یہ عوام اور حکومت کے خلاف سازش کرنے والے آرہے ہیں"۔ خطرناک نتائج کا اندازہ کرنے کے باوجود بھی پابہ زنجیر یوسف طلعت اس کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے پوری جرأت کے ساتھ کہا "تم مجھے پھانسی دیدو یا گولی مار دو لیکن مجھ سے اس طرح کی بات نہ کرو" مصر میں بے حجابی کا جو عام رجحان پایا جاتا ہے اس کے باوجود یوسف طلعت پردے کے قائل تھے چنانچہ اس کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ حکومت مصر نے ان کے فلیٹ کی بالکونی پر پڑے ہوئے پردے کی تصویر مصری اخبارات میں چھپوائی تھی اور یہ الزام لگایا تھا کہ یہ شخص بے انتہا ظالمانہ طبیعت رکھتا ہے اور اپنے گھر کی عورتوں کو اس نے محبوس کر رکھا ہے۔

محمد فرغلی

مصر کا ۴۷ سالہ انقلابی لیڈر جس کی علاقہ سوئز میں دلیرانہ جہاد اور بہادرانہ یلغار گزشتہ سال سے انگریزوں کے لئے سب سے بڑا درد سر بنی ہوئی تھی، اور جو بار بار اپنی سزائے موت پر خوش ہو ہو کر کہتا رہا کہ "میں بہت خوش ہوں کہ میں اللہ سے ملنے جا رہا ہوں"۔

فرغلی اخوان المسلمین کے بانیوں میں سے ہیں یہ ابتداء ہی سے حسن البنا کے معتمد علیہ رہ چکے ہیں۔ اخوان کی مرکزی مجلس عاملہ (مکتب الارشاد) کے رکن اور اسماعیلیہ کی اخوان المسلمین کے صدر تھے

۱۹۴۸ء میں جب اخوان پر شاہ فاروق کے دور حکمرانی میں پابندی لگائی گئی تو اس وقت بھی اخوان پر دہشت پسندی کے الزام میں مقدمہ چلا تھا۔ فرغلی بھی اس مقدمے میں تھے اور عدالت نے انھیں بری قرار دیدیا تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب نحاس پاشا برسر اقتدار آئے اور مصری جنگ آزادی شروع ہوئی تو اخوان نے اس میں نمایاں حصہ لیا اس سلسلے میں سب سے بڑا پارٹ خود فرغلی کا تھا جنھوں نے گوریلا دستوں کی تنظیم کی اور انگریزوں کو مسلسل پریشان کرتے رہے۔

ابراہیم طیب

قاہرہ کا ایک ۳۲ سالہ وکیل جس نے خندہ پیشانی کے ساتھ شہادت قبول کی اور پھانسی کے تختہ پر جاتے ہوئے بھی جو اللہ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اسے شہادت نصیب ہو رہی ہے۔

اخوان المسلمین میں ۱۸ سال کی عمر میں شریک ہوئے جبکہ وہ کالج کے ایک طالب علم ہی تھے۔

یہ اخوان المسلمین کے ہیڈ کوارٹر کے شعبۂ قانون میں کام کرتے رہے۔

۱۹۴۹ء میں جب اخوان پر پابندی عائد کر دی گئی اور اخوان کو جیلوں میں بھیجدیا گیا تو وہ بھی نو ماہ تک جیل میں رہے۔

جنوری ۱۹۵۴ء میں جب اخوان پر فوجی حکومت نے پابندی لگائی تو اس وقت بھی دو ماہ تک جیل میں رہے۔

(بشکریہ "مقاصد")

کوثر نیازی

یہ درد سراپا راحت ہے، اس درد میں راحت کچھ بھی نہیں
اے دوست! نسبت سب کچھ ہے، اے دوست! نسبت کچھ بھی نہیں

•

اس دور کی حالت کیا کہیے، اس دور کی حالت کچھ بھی نہیں
اعزازِ ریا و کذب تو ہے، انعامِ صداقت کچھ بھی نہیں

•

اب موت و حیات کی سرحد پر بیمارِ محبت آ پہنچا
تم اپنی نوازش رہنے دو، اب اسکی ضرورت کچھ بھی نہیں

•

اے دوست! سزائے دار و رسن ملنی ہے تو مل جائے لیکن
جو جرم تری چاہت کا ہوا، اب اس پہ ندامت کچھ بھی نہیں

•

اس پر بھی ہیں ہم دنیا سے جدا، اس پر بھی ہیں ہم محبوبِ خدا
شیطان سے یارانہ ہے مگر، اللہ کی طاعت کچھ بھی نہیں

•

بازارِ جہاں میں جنسِ ریا بکتی ہے بنامِ صدق و صفا
اس مکر کی دنیا میں کوثر! اخلاص کی قیمت کچھ بھی نہیں

قمرالدین رام نگری ●

"ایک سے بڑھ کر ایک"

اسٹیشن کے سامنے میدان میں کانگریس کا جلسہ ہو رہا تھا۔ صوبہ کے کوئی وزیر آئے ہوئے تھے۔ بڑی تیاری تھی اسٹیج کو پھول پتّی اور ترنگی جھنڈیوں سے خوب سجایا گیا تھا۔ وزیر صاحب کے پیچھے ڈائس پر کانگریس لیڈر بھی کھدّر کے سفید دھوتی کرتے اور پتلی سی گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج کے نیچے دور تک دری کا فرش تھا، اور اُوپر خوب صورت شامیانہ۔ شامیانے کے چاروں طرف کانگریسی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ بہت سے لوگ دری پر بیٹھے تھے اور ایک بڑی بھیڑ فرش کے چاروں طرف کھڑی تھی۔ وزیر صاحب۔ پبلک کو بتا رہے تھے۔ حکومت نے اب تک عوام کے لئے کیا کیا ہے، اور آئندہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو کھانے کپڑے اور زندگی کی دوسری چیزوں کی تکلیف ضرور ہے لیکن ان کو گھبرانا نہیں چاہیئے، خوشحالی کا زمانہ قریب ہے۔ ان کو اتنا کھانا ملے گا کہ کھا نہ سکیں گے، اور کپڑا اتنا ملے گا کہ پہنتے پہنتے گھبرا جائیں گے، اور دوسری چیزوں کی بھی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ کوئی ان چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا پسند نہ کرے گا۔

وزیر صاحب کچھ منجھے ہوئے مقرر تھے۔ لوگ بڑی دلچسپی سے تقریر سن رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد "گاندھی جی کی جے" "پنڈت نہرو زندہ باد" ـــــــ "کانگریس سرکار کی جے" کے نعرے لگا دیتے تھے۔ لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا، وزیر صاحب خوش حالی کے جس زمانے کی خبر دے رہے ہیں، وہ آ چکا ہے اور لوگ اپنی ساری مصیبتیں بھول چکے ہیں۔

کھڑی ہوئی بھیڑ کے درمیان بہاری لال بھی موجود تھا۔ وہ شکل وشباہت سے ایک شریف اور نیک آدمی نظر آتا تھا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا اس لئے مہذب اور شائستہ آدمیوں میں بہت اچھی طرح کھپ جاتا تھا وہ جہاں بھی ہوتا اپنی بات چیت میں انگریزی کے دو چار چلتے ہوئے الفاظ شامل کر کے اپنی جگہ بنا لیتا تھا۔ اور پھر نہایت صفائی کے ساتھ اپنا کام کر کے وہاں سے ٹل جاتا تھا۔ اس نے ایک بڑے شہر میں رہ کر اپنے پیشے میں معقول مہارت حاصل کر لی تھی لیکن شاید وہاں سے اس کا آب و دانہ ہی اٹھ چکا تھا، جو وہ مسلسل تین بار گرفتار ہوا اور آخر میں پولیس کی سختیوں سے تنگ آ کر اسے وہ شہر چھوڑ دینا پڑا۔ اب کچھ عرصہ سے وہ اسی قصبے میں رہتا تھا اور اطمینان سے زندگی گزار رہا تھا۔ ایک بڑے شہر کے ہوشیار لوگوں کے درمیان کام کرنے کے بعد یہاں کے سیدھے سادے لوگوں میں کام کر لینا کیا مشکل ہے۔

لوگ لیکچر سننے میں محو تھے۔ ایک بار جب بھیڑ نے اپنے گلے کے پورے زور سے گاندھی جی کی جے کا نعرہ لگایا اُسی درمیان میں بہاری لال نے ایک شخص کی جیب پر آہستہ سے بلیڈ پھیرا اور ایک نوٹ کیس اس کے ہاتھ آ گیا جس کا وزن بتا رہا تھا کہ نوٹ کیس کے اندر ایک معقول رقم موجود ہے۔

بہاری لال اپنا کام کرتے ہی بھیڑ سے نکل آیا۔ یہاں کے لوگ بھی کتنے بدھو ہیں بہاری لال نے پندرہ روز کے اندر دوسری بار اس شخص کی جیب کاٹی تھی۔ اس کاروبار کے لئے یہ جگہ اس اعتبار سے بڑی موزوں تھی۔

بہاری لال محض جیب کترا ہی نہیں تھا۔ ایک خوش ذوق آدمی بھی تھا۔ وہ بھیڑ کے پاس ہی ایک محفوظ مقام پر یہ دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا کہ اس نے جس شخص کا نوٹ کیس اڑایا ہے اُسے جب اس کا پتہ چلتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور دوسرے لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی اس شخص کا خیال جیب کی طرف گیا اور اُسے جیب کٹنے کا علم ہوا اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ حیرت و پریشانی کیساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگوں کو واقعہ کا علم ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے ان میں انتشار پھیل گیا جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔

"اجی کتنی رقم تھی نوٹ کیس میں؟"

لیکن اس کا توٹ کیس اور تعارفی خط غائب ہوگیا تو وہ کب گھر جائے گا، کب دوسرا خط لکھا جائے گا اور گاڑی کے وقت کس طرح اسٹیشن واپس آجائے گا اور پھر جو سو روپے کا دھکا لگا ہے، تو شری مان ہزاری لال جی کو بھائی کی تقریب کی شرکت کے لئے بھیجنے کا جملہ ہی کیا باقی رہ گیا ہوگا۔ وہ لال پیلی آنکھیں نکالے مراری کو سخت سست سنا رہے ہونگے ان کا دماغ کہاں ٹھکانے ہوگا کہ تعارف کا دوسرا خط لکھیں اور دوسرے سو روپے نکال کر دیں۔ کتنا مزہ آئے اگر میں خود چلا جاؤں۔ آخر اس میں دشواری ہی کیا ہے۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ، تعارفی خط، سو روپے جیب میں مراری لال کے سوا گھر سے کوئی جا رہا نہیں۔ مراری لال کو وہاں کسی نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے مراری لال بن جانے میں کون سی دقت ہے۔ مجھے دونوں طرف کا پورا پورا تعارف حاصل ہو ہی چکا ہے مراری لال فرمیلا اور کم سخن ہے میں شرم اور کم سخنی کا ایسا پاٹ ادا کر دونگا کہ لوگ بھی حیران رہ جائیں گے بات چیت میں بھائی اور بھابی ــــــــــــ کا وہ نقشہ کھینچوں گا۔ کہ لوگ گویا ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ ایشور نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے یہ سنہرا موقع عطا کیا ہے۔ میرے جیسے آدمی کو لکھ پتی بڑے گھر کی تقریب کی شرکت اور مہمانی کا لطف اٹھانے کا ایسا موقع دوبارہ ہاتھ آنے والا کہاں۔ اس کے علاوہ بڑے گھر کی تقریب ہے تو مہمان بھی بڑے بڑے ہی لوگ آئیں گے ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوگی کیا عجب کہ وہاں اپنے کام کی بھی کوئی معقول صورت نکل آئے اور کوئی گہری رقم ہاتھ لگ جائے۔ اس خیال نے بہاری لال کے ارادے میں اور پختگی پیدا کر دی۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نظر بدن کے کپڑوں پر پڑی تو وہ سوچ میں پڑ گیا بھلا ایسے کپڑوں میں شری مان ہزاری لال کے چھوٹے بھائی مراری لال جی ایک رئیس کے بیٹے کی تقریب شادی میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ ہی سے ظاہر ہے کہ ان کا کس لباس میں ہونا چاہیئے۔

صرف اس رکاوٹ کی وجہ سے بہاری لال کی تقریب کی شرکت کے موقع کو چھوڑ نہیں سکتا تھا اس نے سوچنا شروع کیا کہ اس کمی کو کیسے پورا کیا جائے۔ سوچتے ہیں اس کا دھیان دوسرے لفافہ کی طرف گیا [illegible] خط نکال کر دیکھا اب اسے قسمت کی سازگاری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس خط نے کپڑے کے مسئلے کو ضرورت سے زیادہ ہی آسانی اور خوبی کے ساتھ حل کر دیا۔ خط یہ تھا :-

"شری جگدیش جی!

آپ نے لکھا ہے کہ میرا اسرج کا سوٹ تیار ہے لیکن میں اپنی بیماری کے سبب آنے سے معذور ہوں میرے چھوٹے بھائی مراری لال ایک تقریب کی شرکت کے لئے وہاں جا رہے ہیں۔ آپ سوٹ ان کو دے دیں ہم دونوں بھائیوں کا ناپ تقریباً یکساں ہے۔ ان کے پاس دوسرے سوٹ موجود ہیں لیکن وہ اسی کو پہن کر تقریب میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں دوسرے اخراجات کے لئے پندرہ روپے پیشگی دے چکا ہوں۔ باقی جو کچھ آپ چاہیں گے وہ دے دیں گے۔

"ہزاری لال"

لفافے پر پتہ درج تھا :-

"میسرز جگدیش اینڈ کمپنی
سول اینڈ ملٹری ٹیلرز"

اس خط کو پڑھ کر بہاری لال کی مسرت و شادمانی کی انتہا نہ رہی۔ آج کا دن بھی اس کے لئے کتنا مبارک ہے! بن مانگے سب کچھ ملتا جا رہا ہے۔ آدمی کی قسمت یاوری کرتی ہے تو مراد مندی اس طرح آگے بڑھ بڑھ کر قدم چومتی ہے۔ تقریب کی دلچسپی اور مہمانی کے لطف کے ساتھ ایک قیمتی سوٹ بھی ہاتھ آئے گا۔ دھنیہ ہو بھگوان۔

وہ جگدیش اینڈ کمپنی سے سوٹ پہن کر کرائے کی ٹیکسی کرے گا اور شان کے ساتھ مانک چند کی کوٹھی پر پہنچے گا۔ دیکھنے والے بھی سمجھیں گے کہ کسی بڑے گھر کا نوجوان اور ایک رئیس کا بھائی ہے۔

بہاری لال نے ہر طرح اپنا ارادہ پختہ کر کے پیش آنے والے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ استعمالی کپڑے کہاں رکھونگا؟ درزی کی دکان پر رکھ دونگا اور واپسی میں لے لونگا لیکن نہیں اپنے کپڑے دوسری جگہ چھوڑ دینا احتیاط کے خلاف ہے ان کو ایک بکس میں ساتھ [illegible]

وہاں پہونچکر سوٹ اتارنا بھی تو پڑے گا اس کے لئے کچھ خرچ بھی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ چل رہا ہوں تو شان کے ساتھ چلنا چاہئیے۔

اسٹیشن کا بازار قریب ہی تھا۔ بہاری لال نے متوسط سائز کا ایک سوٹ کیس خریدا اس کے لئے یہ چیزیں بھی خریدیں ایک عمدہ ٹائی دو سلک کے خوبصورت رومال ایک اچھا موزہ اور پلاسٹک کی ایک شیشی۔ اس کے بعد اسے یاد آیا کہ ایک سگریٹ کیس بھی ہونا چاہئیے، لیکن اچھا سگریٹ کیس نہ ملا۔ اس نے سوچا کہ کچھ مضائقہ نہیں، آج کل سگریٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے کر چلنا بھی ایک فیشن ہے۔ اس نے نیوی کٹ کا ایک ڈبہ خرید لیا ایک بار قمیص پر نظر ڈالی۔ زیادہ اچھی نہ تھی لیکن کام دینے کے لائق تھی اچھی قمیص بازار میں تیار مل بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک جوتے کی طرف دیکھا وہ جوتہ فیشن کا کابلی شو تھا، جو سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے لئے موزوں تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن خرچ کا مسئلہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا۔ دھیرے دھیرے کرکے پچیس روپے اٹھ چکے تھے نئی چیزوں کی خریداری میں کچھ لطف ہی ایسا آتا ہے کہ انسان کو جیب کا خیال ہی نہیں رہتا۔ اسی مصروفیت میں اس نے دیر سے گھڑی نہیں دیکھی تھی اب جو گھڑی پر نظر پڑی تو گاڑی کے وقت میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے جوتے کے مسئلے پر مزید غور و فکر کا موقع نہ تھا وہ تیز تیز قدم بڑھاتا اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

سب کچھ مکمل ہو چکنے کے بعد بہاری لال کے دل میں ایک کانٹا پھر چبھا۔ آخر یہ کیسے مان لیا ہے کہ اب مراری لال تقریب میں شرکت کے لیے کسی طرح جا ہی نہیں سکتا اگر وہ پہنچ گیا تو؟ لیکن ایک موہوم سے شک پر بہاری لال دو ڈھائی سو روپے کے سرج کے سوٹ، تقریب کی شرکت اور دعوتی کے مزے کے لالچ کو دل سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے یہ طے کر لیا کہ اسٹیشن چلنا چاہئیے اگر مراری لال کو چلنا ہوا تو پلیٹ فارم پر ضرور نظر آ جائے گا۔

اسٹیشن پہنچکر بہاری لال نے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کو جھانکا مسافروں میں مراری لال موجود نہ تھا احتیاطاً انٹر کے ویٹنگ روم کو بھی دیکھ لیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ گھر واپس جاکر دوبارہ اسٹیشن نہیں پلٹا ہے کیونکہ اب اس کے آنے کا امکان باقی تھا۔ اس لئے ٹکٹ گھر کا [illegible] تھا۔ بہاری لال ہاتھ میں سوٹ کیس لئے فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ کی کھڑکی سے کسی قدر دور ہٹ کر ٹہل رہا تھا اور شان سے [illegible] سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اس وقت کتنا لطف آ رہا تھا اسے اس پیشے کی یہی تو خوبی ہے جو بار بار جیل جانے کے بعد بھی وہ اسے نہ چھوڑ سکا۔

وہ رہ رہ کر گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کے وقت میں اب بھی چند منٹ کی دیر تھی۔ لیکن گاڑی پر بڑا غصہ آ رہا تھا گاڑیاں لیٹ تو اکثر ہو جایا کرتی ہیں۔ کبھی پہلے کیوں نہیں آ جاتیں۔ اگر مراری لال آ گیا تو سارا پروگرام خاک میں مل جائے گا۔ گاڑی آ گئی بہاری لال کے لئے یہ سب سے زیادہ اضطراب کا وقت تھا کہیں مراری لال بھاگا نہ چلا آ رہا ہو۔ کیا اچھا ہوتا کہ اب تک گاڑی چھوٹ چکی ہوتی۔ وہ بار بار مسافروں پر نظر دوڑا رہا تھا کہ کہیں ان میں مراری لال تو نہیں ہے۔ پہلی سیٹی ہو گئی۔ بہاری لال کی نگاہ اب بھی ٹکٹ گھر کی طرف تھی وقت برابر کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آخری بار انجن سے لے کر گارڈ کے ڈبے تک ایک بار نگاہ دوڑائی اور ڈبے میں داخل ہو گیا اور جب تک گاڑی روانہ نہیں ہو گئی کھڑکی سے سر نکال کر برابر باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تو وہ اطمینان کا سانس لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ کس قدر شاندار سفر ہوتا ہے سیکنڈ کلاس کا! اس شان کا سفر تو اس کے باپ کو بھی میسر نہ ہوا ہوگا یہ سب اس پیشے کا طفیل ہے! وہ سوچنے لگا [illegible] پر اتر کر ایک بار پھر مراری لعل کو دیکھ لوں گا۔ حالانکہ یہ یقینی امر ہے کہ وہ اس ٹرین میں نہیں ہے اور اسے ہونا بھی نہیں چاہئیے۔ جس کی جیب سے ابھی ابھی سو روپے نکل گئے ہوں اس کے دل میں اب کسی تقریب کی شرکت کا ولولہ کیا باقی رہ سکتا ہے؟ رہ گیا نئے سوٹ کا شوق تو اس وقت وہ بھی سرد پڑ گیا ہوگا۔ ایک بار بہاری لال نے پھر اپنی قسمت کو سراہا خود اپنے آپ کو مبارکباد دی اور اپنے شوق کو دعوتیہ یاد کیا، شادی کی تقریب، دعوتی، [illegible] تعارفی خط، نیا قیمتی سوٹ، سو روپے نقد، جیسے سارا [illegible] اسی کے لئے کیا تھا اور وہ مزے سے لے کر سگریٹ کے کش [illegible]

بہاری لال نے جنکشن پر اتر کر پوری احتیاط سے ایک بار پھر مسافروں کا جائزہ لیا۔ ایک ایک کی صورت دیکھی۔ مراری لال کا پتہ نہ تھا۔ اب وہ اطمینان کے ساتھ ایک رکشے پر جگدیش اینڈ کمپنی میں پہنچا۔ خط میں لکھا ہوا تھا کہ خط لے جانے والا ہزاری لال کا چھوٹا بھائی ہے، اس لئے فوراً ایک چائے، پان اور سگریٹ سے بہاری لال کی خوب مدارات ہوئی۔ اس موقع پر پھر اس کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوئی کہ تقریب والوں نے مراری لال کو تو نہیں دیکھا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جگدیش کمپنی والوں نے بھی اسے نہ دیکھا ہو لیکن اس اندیشے کو جگدیش بابو ہی نے دور کر دیا۔ پوچھا: "تو آپ ہی ہیں شری ہزاری لال کے چھوٹے بھائی مراری لال جی؟"

"جی ہاں"

"آپ کا نام تو سنتا رہتا تھا لیکن آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"جی ہاں اس لئے کہ میں یہاں تو رہتا نہیں، کاروبار کے سلسلے میں دہلی رہنا پڑتا ہے۔"

"یہ تو معلوم ہے اب آپ سے ملاقات ہو گئی کبھی دہلی آنا ہوا تو ملیں گے۔ آپ راجدھانی کے رہنے والے ہیں پھر بھی میری خواہش ہے کہ میری کمپنی کے کام کا بھی ایک نمونہ آپ کے پاس رہنا چاہئے۔ شری مان ہزاری لال جی مجھ پر خاص مہربانی رکھتے ہیں کسی اچھے کپڑے کے لئے وہ میرے سوا کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے۔ صرف روزآنہ کے استعمال کی معمولی چیزیں وہاں سلوا لیتے ہیں۔"

بہاری لال نے ہزاری لال کے مزاج و مذاق کا اندازہ لگاتے ہوئے ایک کپڑا پسند کیا اور سوٹ کا ناپ دے کر پوچھا: "کچھ پیشگی دے دوں؟"

جگدیش بابو نے کہا: "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپکے خاندان سے لین دین تو چلتا ہی رہتا ہے پھر آپ کچھ اس ارادے سے تو آئے نہیں ہیں۔ آپ کو کچھ اور بھی تو کام ہوں گے۔"

جگدیش بابو کی کمپنی میں ہزاری لال کی کتنی بات بنی ہوئی ہے کیوں [illegible] سال میں ان سے کمپنی کو فائدہ بھی تو کتنا ہوتا ہوگا اور

مراری لال جی ان کا چھوٹا بھائی ہو۔

بہاری لال ایک بار اپنے کو بھول سا گیا کہ وہ ایک سزا یافتہ جیب کترا ہے اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا واقعی وہ مراری لال ہی ہے شری مان ہزاری لال کا چھوٹا بھائی ہے۔

بہاری لال نے اتارے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اس دکان سے اتر کر ٹیکسی کے اڈے کی طرف چلا۔ بازار میں پہنچا تو اسے یاد آیا کہ اب بھی بڑی کسر رہ گئی ہے، سوٹ کے مطابق ایک فلٹ کیپ بھی ہونی چاہئے۔ کچھ روپے خرچ ہو جائیں تو ہو جائیں دینے والے بھگوان ہیں ان کی دیا ہو گی تو آج ہی رات کیا کچھ نہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس نے ٹوپی کے ساتھ ایک خوبصورت سی چھڑی بھی خریدلی۔ ایک طرف پھول والے بیٹھے خوشبودار پھولوں کے ہار گجرے اور گلدستے فروخت کر رہے تھے۔ سب کچھ سامان ہو چکا ہو تو گلے کے لئے ایک گجرا اور ہاتھ کے لئے ایک گلدستہ بھی لے لینا چاہئے۔ اس نے بیس روپے کا ایک بڑا سا موٹا گجرا خریدا، جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے اور نیچے کی طرف گلاب ہی کے پھولوں کا ایک پھالنک رہا تھا۔ آٹھ آنے کا اسی طرح کا ایک گلدستہ بھی لے لیا، اور ایک کرنے کی ٹیکسی لے کر اس پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ اس نے بڑے قاعدے سے ٹائی باندھی جیب میں ریشمی رومال رکھا جس کا کچھ حصہ باہر بھی نظر آ رہا تھا۔ سنٹ کی شیشی نکال کر اسنس لگایا اور گلے میں گجرا ڈال لیا۔ اس شان و شوکت کے ساتھ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کسی بڑے رئیس خاندان کا نوجوان نہیں، بھیڑ بھاڑ میں گھس کر لوگوں کی جیبیں کاٹنے والا ہے۔

تھوڑی دیر میں ٹیکسی ہزاری لال کے لفافے پر لکھے ہوئے پتے پر پہنچ گئی۔ لیکن وہاں کسی تقریب کا کوئی سامان نہ تھا۔ ایک وسیع احاطے کے وسط میں ایک شاندار کوٹھی تھی۔ شام کا جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ اندر بجلی جل رہی تھی۔ بہاری لال نے سوچا آج کل رئیسوں کے ہاں اسی سادگی کے ساتھ تقریبیں ہوا کرتی ہیں ان کو نمود و نمائش کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دنیا جانتی ہے وہ بڑے آدمی ہیں۔ نمود و نمائش تو اچھے لوگوں کے ہاں ہوتی ہے جو اس کے ذریعہ اپنے کو بڑا آدمی ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یہاں سارا انتظام کوٹھی کے اندر ہوگا، اور اعلیٰ پیمانے پر ہوگا۔

سب سے پہلے سوچتے ٹیکسی کوٹھی کے پورٹیکو میں جا کر کھڑی ہوئی۔ ایک صاحب جو شاید موٹر کی آواز سن کر پہلے سے دروازے میں آ کھڑے ہوئے تھے دروازے کے باہر نکل آئے۔ وہ ایک بار بہاری لال کو دیکھ کر ہکا بکا سے رہ گئے۔ اس کے بعد خوش خوش آگے بڑھ کر خیر مقدم کرتے ہوئے بولے "آئیے، آئیے آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی میں نے سب انتظام کر دیا تھا۔ سوٹ تو بہت فٹ ہوا ہے آپ کے بدن پر"

بہاری لال کے ہونٹ جیسے آپس میں چپک گئے تھے۔ اس کا دم اندر ہی اندر گھٹا جا رہا تھا لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا

اس کا میزبان وہی شخص تھا جس کی اس نے چند گھنٹے پہلے جیب کاٹی تھی۔ اس شخص کے آواز دیتے ہی ایک پولیس مین نے آکر سرکاری قاعدہ سے سلام کیا اور پیچھے کھڑا ہو گیا۔

میزبان نے کہا "آپ اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہیں ہم دونوں کا پیشہ ایک دوسرے سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ آپ بھی اپنے فن کے ماہر ہیں اور مجھے بھی کچھ نہ کچھ اپنے پیشے کا سلیقہ ہے۔ آپ جیب کترے ہیں اور میں پولیس کا انسپکٹر ہوں۔ اب عدالت میں پیش ہونے تک آپ میرے مہمان ہیں اور میں آپ کا میزبان ہوں"

(بشکریہ ہمت قلندر)

نیاز احمد اسلم •

مرحوم والد کی یاد میں

ہر لحظہ ہے خیال میں شامل تمہاری یاد
ہے فرطِ اضطراب کی حامل تمہاری یاد
آواز دو، پکارو، کدھر ہو، کہاں ہو تم؟
ہونے لگی ہے زیست میں حائل تمہاری یاد

تم کو مری جدائی گوارا نہ تھی کبھی
رکھتے تھے میرے ذوقِ طبیعت سے آگہی
کس دل سے مجھکو چھوڑ کے تنہا چلے گئے
لینا تھا ساتھ اپنے کہ منزل دراز تھی

اب ضبطِ غم بھی ضبط کی حد سے گذر نہ جائے
سوزِ غمِ فراق کہیں کام کر نہ جائے
حالت دگر ہے میرے دلِ بیقرار کی
سیلابِ اشک چشمِ حزیں سے ابھر نہ جائے

دنیائے آرزو مری تاریک ہوگئی!
جاگے ہوئے نصیب کی تقدیر سو گئی
خونِ جگر نہ روؤں تو اب اور کیا کروں؟
دونوں جہاں کی دولتِ نایاب کھو گئی

قدرت کی روزِ ازل سے ملی مجھے
رنی پڑی ہے غم کے حوالے خوشی مجھے
رہر قدم پہ منزلِ راہِ حیات میں
سوس ہو رہی ہے تمھاری کمی مجھے

بے چین، بیقرار، تمھارے انیس دیار
سینوں میں ہیں چھپائے ہوئے قلبِ سوگوار
جائیگا عمر بھر نہ یہ داغِ مفارقت
آباد تھی جو تم سے، وہ محفل ہے اشکبار

دل رو رہا ہے خون کے آنسو جدائی میں
پرسانِ حال کوئی نہیں اب خدائی میں
اب کون جو دکھائے نشیب و فرازِ زیست
تم رہنما تھے میری بھلائی برائی میں

آؤ نسیمِ صبح کا جھونکا لئے ہوئے
"بیٹھا ہوں انتظار کی دنیا لئے ہوئے"
امید و یاس، درد و خلش، سوز و اضطراب
اک قلبِ مضطرب میں ہوں کیا کیا لئے ہوئے

ونا پڑا ہوا ہے تمھارے بغیر گھر
لپٹے ہوئے ہیں یاس میں دیوار اور در
ربت دکھاؤ اپنی کہ تسکینِ قلب ہو
رتی ہیں جستجو میں نگاہیں ادھر ادھر

دامن چھڑا لیا ہے خرد نے شعور سے
مجبور ہوگیا ہوں دلِ ناصبور سے
کانوں کو بعض وقت گزرتا ہے یہ گماں
جیسے کہ تم نے مجھکو پکارا ہو دور سے

سر پہ جو آہ! سایہ تمھارا نہیں رہا
جینے کا اب جہان میں یارا نہیں رہا
ہمت کو تم نے توڑ دیا ساتھ چھوڑ کر
اسلم کو زندگی کا سہارا نہیں رہا

ترجمہ: محمد عمر ایم۔ اے

جادو کے حروف

اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جبکہ ماں للتا اور رامائن کو گھر لیجانے کے لئے آئی۔ یہ دونوں دو ہفتے سے کورین صاحب کی بیوی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والدین اندرون ملک میں سفر پر گئے تھے۔

بچوں نے کورین صاحب کی بیوی کو اپنی ماں سے یہ کہتے ہوئے سنا: "تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تمہارے دونوں بچے ایسے اچھے ہیں! بیچارے ہر وقت کام میں ہاتھ بٹانے یا کوئی پیغام لے جانے کو تیار رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی مل کر اچھی طرح رہتے ہیں! کچھ بچے تو ہر وقت ایک دوسرے سے لڑا کرتے ہیں!"

للتا اور رامائن برابر کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے گویا انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس پر ماں ہنس دی "تم نے دوسروں کے ساتھ رہ کر ان کا یہ رنگ دیکھا ہو" اس نے کہا: "گھر پر ان سے ایک پیالہ بھی صاف کرانے کے لئے ان سے جھوجھنا پڑتا ہے" اور پھر ان کا ذرا ذرا سی بات پر جھگڑنا اور مصیبت ہوتی ہے"۔

اسی دن ذرا دیر بعد رامائن نے للتا سے کہا: "میں نہیں سمجھتا کہ ماں نے ہماری بابت اس طرح کیوں بات کی۔ ہم تو واقعی جب تک کورین صاحب کی بیوی کے ساتھ رہے اچھے بن کر رہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ماں کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہم وہاں اچھی طرح رہے اور ان کی ذلت نہیں ہونے دی۔ گھر پر سب ہی ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں"۔

"لیکن یہ ہمارے لئے جھگڑنے کا بہانا تو نہیں بن سکتا" للتا نے بڑی بن کے انداز سے کہا: "اور تم جانتے ہو کہ تم ہمیشہ اپنے حصہ کے کام سے جی چراتے ہو۔ اگر میں جھگڑا نہ کروں تو تم ایک طشتری بھی مانجھ کر نہ دو"۔

"لیکن میں پیغام تو سب سے بڑی پھرتی سے لیجاتا ہوں، تم ایک بار سودا لینے جاتی ہو تو میں دو بار جاتا ہوں"۔

یہ کہکر رامائن باہر بھاگ گیا اور دروازہ بند کرتا گیا۔ باہر وہ لکڑی کے سائبان پر چڑھ گیا۔ اس سائبان پر ایک بڑے نیم کے درخت کا سایہ رہتا تھا اور یہ جگہ چھپ کر بیٹھے رہنے کے لئے بڑی عمدہ تھی۔

اکثر جب رامائن وہاں بیٹھا رہتا تھا تو للتا اس کا پیچھا نہیں کرتی تھی لیکن آج وہ آئی اور اپنے بھائی کے پاس سرک کر بیٹھ گئی۔ "لو یہ کچی پنسل" اس نے کہا "اس کو اپنے پاس رکھو۔ میں ــــ میں سوچتی ہوں کہ میں نے برا کیا"۔

"آہ! اس معاملہ میں میں نے بھی برا کیا" رامائن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں برابر سوچ رہی ہوں" للتا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "ہم کورین صاحب کے مکان پر اتنی اچھی طرح رہے اور ویسا ہی کچھ برتاؤ کیا جیسا اماں کے کہنے کے مطابق دوسروں کے ساتھ رہ کر کرنا چاہئے پھر اب ہم گھر پر بھی اسی طرح کیوں نہ رہیں جس طرح دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ نرمی اور خوب صورتی کے ساتھ کام تقسیم کر لیں جیسا کورین صاحب کے ہاں کیا تھا؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کر کے تو دیکھیں۔ ہم بڑے ہوئے کیا ہمیشہ جھگڑتے ہی رہیں گے؟"

"میں سمجھتا ہوں یہ ٹھیک ہے" رامائن نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ "مگر بات جب ہے کہ تم میرے کام کرنے کے طریقے میں عیب نہ نکالو کیونکہ گھر کے کام میں ذرا جی کم لگتا ہے"۔

"اچھا میں تو نہیں سمجھتی! کچھ کام تو تم مجھ سے بہتر کرتے ہو۔ پھر میں کوشش کروں گی کہ تمہارے اوپر زیادہ بوجھ نہ ڈالوں"۔

"اور میں کوشش کروں گا کہ اپنے حصہ کے کام سے جی نہ چراؤں۔ ہم ایسا طریقہ سوچیں کہ ایک دوسرے کو یاد دلا سکیں!"

للتا نے ایک منٹ سوچا "ہم کہیں غ سب یعنی غیروں میں رہ کر برتاؤ۔ مگر کہنا آہستہ تاکہ لوگ نہ سنیں"۔

"ہاں غ۔ ب اچھا رہے گا۔ ایک قسم کی اصطلاح ہے"۔

کچھ ہی دن بعد چھٹی کے روز ماں نے اپنی بہن کو شہر کے دوسرے سرے پر ایک تحفہ کا تمونہ بھیجنا چاہا۔

"میں چاہتی ہوں تم میں سے ایک یہ کام کر لائے"۔ ماں نے للتا اور راماین سے کہا "اور دوسرا گھر پر رہ کر گھر کی صفائی میں میری مدد کرے اس کی بحث نہیں کہ تم میں سے کون جاتا ہے کون رہتا ہے، یہ تم دونوں طے کر لو"۔

"پچھلی مرتبہ تم ماسی کے ہاں گئی تھیں للتا" راماین نے کہا: "آج میری باری ہے"۔

"جی نہیں۔ میری"۔ للتا نے چیخ کر کہا: "تم ٹلی دیدی کے ہاں کل گئے تھے اور میں گھر پر تھی اور کام بھی کیا"۔

"ٹلی دیدی کی گنتی نہیں۔ ان کے سر میں درد تھا، اور کچھ مزا نہیں آیا"

"غ۔ ب" للتا نے چپکے سے کہا۔

راماین بس رک ہی تو گیا "دوا اچھا! اس نے بہن سے کہا "جاؤ مجھے کوئی پرواہ نہیں"۔

"ذرا ایک منٹ!" ماں بول اٹھی "میں بھی تو جانوں یہ غ۔ ب۔ کیا مطلب رکھتا ہے۔ کیا یہ جادو کے حروف ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف تم دونوں کے سارے جھگڑے طے کر دیتے ہیں! کیا مجھے نہ بتاؤ گے ان کا کیا مطلب ہے؟ شاید مجھے بھی ان سے مدد ملے"۔

"اُف اماں آپ کو ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے" للتا نے جواب دیا "لیکن یہ حروف غیروں میں برتاؤ کے لئے ہیں"۔

"آپ جانتی ہیں اس دن جب آپ کورین صاحب کے ہاں ہم لینے گئی تھیں" راماین نے کہنا شروع کیا "اور کورین صاحب کی بیوی نے ہماری بڑی تعریف کی تھی کہ ہم خوب کہنا مانتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے" للتا نے بات پوری کر دی۔

"ہاں اور میں نے تم لوگوں کے خلاف کہہ کر سب بگاڑ دیا؟" ماں نے "میرے خواب میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم اتنے سنجیدہ ہو جاؤ گے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تم لوگ بڑے ہوتے جا رہے ہو اچھا اب میں تمہارے خیالات اپنے استعمال میں لے لیتی ہوں۔ جب تک تم اچھے بچے ہو، تمہارے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کروں گی جیسا کورین صاحب کی بیوی تمہارے ساتھ کرتی تھیں"۔

"مطلب یہ ہے کہ آپ میزبان جیسا برتاؤ کریں گی؟" للتا بولی۔

"اور آپ کے جادو کے حروف م۔ ب۔ ہوں گے" راماین نے لقمہ دیا

"قطعی، لیکن یاد رکھو میرا م۔ ب اسی وقت تک رہے گا جب تک تمہارا غ۔ ب قائم رہتا ہے" ماں نے ان سے کہا۔

"ہاں مناسب ہے" راماین بول اٹھا۔

"ابتدا میں یوں کرتی ہوں" ماں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ میں گھر کی صفائی کسی ایسے دن تک ملتوی کر دوں گی جب تم دونوں میری مدد کر سکو۔ آج سہ پہر کو تم دونوں چاچی بلدا کے ہاں جا سکتے ہو، اور اگر چاہو تو رات کے کھانے تک رک کے ٹھہر بھی سکتے ہو"۔

"واہ۔ وا!" بچے خوشی سے چلا اٹھے۔

للتا ماں سے چمٹ گئی "اماں آپ کا م۔ ب دنیا میں سب سے اچھا ہے۔"

(بشکریہ "ہیلتھ")

سعادت حسن منٹو

دھوبی

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا ـــــ میں نے اس تصویر سے اس کو پُر کر دیا، اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا، کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دُھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہئیے اس لئے کہ مفلسی کے اس زمانہ میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے کہ جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضعداری قائم رکھ سکتے تھے۔ میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا تھا۔ دھوبی شریف آدمی تھا، یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا، لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو، میری نادہندگی سے تنگ آ کر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے، اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے، جو کہ ظاہر ہے کہ بہت ہی معیوب بات ہوتی۔ کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُسے کسی طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا۔ "ساب سلام" کر کے اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا، اور ایک عجیب و غریب آواز حلق سے نکالی

"ہے ہے ہے ہیں؟" میں نے پوچھا "کیا بات ہے دھوبی"؟

دھوبی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں۔ "یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہیں

"کون؟"

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا "ساعید شالیم بالشٹر"

"تم جانتے ہو انہیں؟"

دھوبی نے زور سے سر ہلا دیا "ہاں .... دو بھائی ہوتا ـــــ اُدھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا ـــــ ساعید شالیم بالشٹر ـــــ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا"

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہوگی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبئی میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم؟"

دھوبی نے زور سے سر ہلا دیا "ہاں ـــــ شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا، ایک دھوتی دیا، ایک کرتا دیا ـــــ نیلے ـــــ بہت اچھا لوگ ہوتا ـــــ ایک کا ڈاڑھی ہوتا ـــــ یہ بڑا" ـــــ اس نے ہاتھ سے ڈاڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ چھوٹا ہوتا۔ اس کا تین باوا لوگ ہوتا۔ دو لڑکا ایک لڑکی۔ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا۔ کولابے میں کوٹھی ہوتا بہت بڑا ...."

میں نے کہا "دھوبی، یہ میرے بھائی ہیں"

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی "ہے ہے ہے ہیں، ساعید شالیم بالشٹر؟"

میں نے اسکی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا "یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔ ڈاڑھی والے محمد حسن ہیں، ہم سب سے بڑے"

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی، بجلی کی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھا۔ ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزارہا کھٹمل تھے دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشٹر کا بھائی ہوں، لیکن جب میں نے اس کو بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے

سے جنبش دی اور کہا "ساعید شالیم بالشنٹر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں ہے؟"

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا "دنیا کے یہی رنگ ہیں۔ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

"ہاں صاب ہم بر دبر کہتا ہے ـــــ" یہ کہکر دھوبی نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے، جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک جانے آنے کے لئے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ میری نیت صاف ہے، میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا "دھوبی! ـــــ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا ـــــ خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔" دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا "صاب ہم حساب نہیں رکھتا ـــــ ساعید شالیم بالشنٹر کا ایک برس کام کیا ـــــ جو دیدیا لے لیا۔ ہم حساب جانتا ہی ناہیں۔"

یہ کہکر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی ـــــ میری شادی ہوگئی حالات بھی بہتر ہوگئے، اور میں سیکنڈ پیر خاں اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو روپیہ ماہوار تھا، کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں، جس کا کرایہ پینتیس روپیہ ماہوار تھا، اٹھ آیا۔

اور دھوبی کو ماہ بماہ اسکی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں۔ چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا "بیگم صاب! ـــــ صاب کا بھائی ساعید شالیم بالشنٹر بہت بڑا آدمی ہوتا۔ اُدھر کولابے میں رہتا ہوتا ...... جب تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا ـــــ تمہارا صاب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوتا۔"

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سُنا چکا تھا اور اس کو یہ بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانہ میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا ـــــ دیدیا، جو دیدیا، اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی ـــــ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا "چار برس سے میرا کام کرتا رہا ہے۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔"

جواب یہ ملا "حساب کیوں کرتا ـــــ ویسے دو گنے چوگنے وصول کرلیتا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ نہیں جانتے جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں اُن کو ایسے لوگ بیوقوف بنانا جانتے ہیں۔"

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہدیتا ـــــ "بیگم صاب ـــــ ہم حساب جانتا ناہیں۔ تم جھوٹ ناہیں بولے گا ـــــ ساعید شالیم بالشنٹر کو تمہارے صاب کا بھائی ہوتا ـــــ ہم کو ایک برس اس کا کام کیا ہوتا۔ بیگم صاب بولتا، دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا ـــــ ہم بولتا، ٹھیک ہے"

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے کے لئے اس سے کہا "دھوبی اس مہینہ ساٹھ کپڑے ہوئے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے ـــــ بیگم صاب تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔"

میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیئے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلنے لگا میری بیوی نے اسے روکا "ٹھہرو دھوبی! ساٹھ نہیں ڈھائی سو کپڑے تھے ـــــ لو اپنے باقی روپے۔ میں نے مذاق کیا تھا۔"

دھوبی نے صرف اتنا کہا "بیگم صاب تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔" باقی روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دہلی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا پھر واپس بمبئی آگیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کئے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے کبھی دھلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جبکہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے، وہ اچانک آگیا اور کہنے لگا "صاب کو ہم نے ایک دن بس میں دیکھا ـــــ ہم بولا کیسا ـــــ صاب تو

گیا تھا .... ہم نے ادھر پانی کھاتہ میں تپاس کیا — کچھ پتہ
نہیں ملا ادھر پانی میں تپاس کرو — باجو والی چالی ساب کا دوست
ہوتا — اس سے پوچھا اور" آگیا۔

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑے ملنے کے دن ہنسی خوشی گزرنے
لگے۔

کانگریس برسر اقتدار آئی تو امتناع شراب کا حکم نافذ ہو گیا۔
انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی تھی
ننانوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔ دن بھر پانی میں
رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی ہمارا
دھوبی بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے
کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے
معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے
تک پہنچا دیا۔ میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات
کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک
بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی، نوکر اور شوفر کی مدد سے
اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا
چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا: "ڈاکٹر
صاحب آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر مسکرایا "تو آدھا آدھا کر لیجئے۔"

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی۔

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی
سے دور ہو گئی۔ نقاہت تھی وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال
سے ختم ہو گئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے
ہمیں دعائیں دیتا تھا "بھگوان ساب کو شالیم بالشٹر بنائے۔ اُدھر کولابے
میں ساب رہنے کو جائے۔ باوا لوگ ہو — بہت بہت پیسہ ہو
بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا موٹر میں اُدھر کے (قلعے) میں ڈاکٹر کے
پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔ بھگوان بیگم ساب کو خش رکھے۔..."

کئی برس گزر گئے۔ اسی دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔
دھوبی ہمارا برابر آتا رہا۔ اسکی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ
گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ دعائیں دیتا تھا۔
شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا
کرتا تھا۔ پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن
دور کرنے کے لئے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات
شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان۔ اور مسلمانوں کے علاقوں
میں ہندو۔ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کئے جانے لگے
میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہو گئے تو میں نے دھوبی سے
کہا: "دیکھو دھوبی! اب تم کام بند کر دو — یہ مسلمانوں کا محلہ ہے
ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہیں مار ڈالے۔" دھوبی مسکرایا "ساب اپن کو کوئی نہیں
مارتا۔"

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں لیکن دھوبی برابر آتا رہا
ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے
صفحے پر کرکٹ میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے
شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار — میں ان
دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آگیا۔ کاپی نکال کر
میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں
شروع کر دیں "تیسا عید شالیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔ یہاں سے جاتا
ہوتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی ایک کرتا دیا ہوتا۔ تمہارا بیگم ساب
بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا — باہر کام گیا ہے، —
اپنے ملک میں۔ — ادھر کاگج لکھو تو ہمارا سلام بولو......
موٹر لیکر آیا، ہماری کھولی میں — ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا —
ڈاکٹر نے سوئی لگایا — ایک دم ٹھیک ہو گیا — اُدھر کاگج
لکھو تو ہمارا سلام بولو — بولو گرام کھلاون بولتا ہے ہم کو بھی کاگج
لکھو —"

میں نے اسکی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا "دھوبی! —
دارو شروع کر دی؟"

دھوبی ہنسا۔ "دارو؟ — دارو کہاں ملتی ہو ساب؟"

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھری بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے۔ لاہور سے تار پہ تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑ دو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتہ کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دونگا لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں۔ چنانچہ شام کو وکٹوریہ لیکر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اس لئے آمد و رفت جاری تھی۔ ٹرامیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہو۔ ہجوم منتشر ہوا تو دیکھا۔ دور بھٹیوں کے پاس دھوبی لاٹھیاں لئے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اسکو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا ——— جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھکر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھکر ایک دھوبی سے پوچھا۔" رام کھلاون کہاں رہتا ہے،؟"

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس کے پاس اس آیا اور جس سے میں نے سوال کیا تھا" کیا پوچھت ہو؟"

"پوچھت ہے' رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟"

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا" تم کون ہو؟"

"میں؟ ——— رام کھلاون میرا دھوبی ہے؟"

"رام کھلاون تمہارا دھوبی ——— تو کس دھوبی کا بچہ ہو؟"

ایک چلایا" ہندو دھوبی کا یا مسلمان دھوبی کا؟"

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکے تانے اور لاٹھیاں ہلاتے میرے گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا مسلمان ہوں یا ہندو؟ ——— میں بیحد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔

نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے لئے پکارتا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں گفتگو شروع کر دی" رام کھلاون ہونڈ ہے .... ہم پوچھتا ہے کدھر رہتا ہے .... اس کی کھولی کہاں ہے .... دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے .... بہت بیمار تھا ——— ہم اس کا علاج کرایا تھا۔ ہماری بیگم .... ہماری میم صاحب یہاں موٹر لیکر آئی تھی ...."

......" یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لئے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے۔ اس احساس نے جرأت پیدا کر دی۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا،" میں مسلمان ہوں"

"مار ڈالو ——— مار ڈالو" کا شور بلند ہوا۔

دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا" ٹھیر و ——— اسے رام کھلاون مارے گا"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لئے ڈولتا رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا" رام کھلاون"

رام کھلاون دھاڑا" چپ کر بے رام کھلاون کے .....!"

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آ پہنچا تو میں نے خشک گلے کے ساتھ ہولے سے کہا" مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟"

رام کھلاون نے وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا ——— ایکدم اسکی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آ کر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا" ساب! " پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا" یہ مسلمین نہیں، یہ میرا ساب ہے۔ بیگم ساب کا ساب وہ جو موٹر لیکر آیا تھا .... ڈاکدر کے پاس لے گیا تھا ——— جس نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا"

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے

سب شرابی تھے۔ تُو تُو میں میں شروع ہو گئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہو گئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آ گئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا۔ اور وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا سامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بیقرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آ جائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چلدوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو میرا فلیٹ مجھے اندر قید کر دیگا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آ گئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

"ساب سلام!"

"سلام"۔

"میں اندر آ جاؤں؟"

"آؤ۔"

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

اس نے رونا شروع کر دیا۔ "ساب مجھے ماف کر دو۔ یہ سب دارو کا قصور تھا ——— اور دارو .... دارو آج کل بالکل مفت ملتی ہے ...... سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو .... مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب ...... ہم کو ماف کر دو ——— ہم پیئے ہوا تھا ...... ساعید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا ہم کو ایک پگڑی ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا ——— ...... تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا ——— جلاب سے ہم مرتا ہوتا .... وہ موٹر لیکر آتا، ڈاکڈر کے پاس لے جاتا ..... اتنا پیسہ خرچ کرتا .... تم ملک جاتا .... بیگم ساب سے سلام بولنا ——— رام کھلاون ......!"

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا "ٹھیرو! رام کھلاون" ——— لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

(بشکریہ "نقوش")

عمران انصاری •

یہ کیسے کہوں

کیسے کہوں اے جانِ چمن! آزاد نہیں اب اپنا وطن
[ل]وگ تو ابھی تک بھوکے ہیں، ننگے ہیں ابھی تک لاکھوں بدن

میخانہ وہی، پیمانے وہی، ایوان وہی، کاشانے وہی
آثار وہی، ویرانے وہی، افلاس کے تانے بانے وہی
پندار وہی، دیوانے وہی، جمشید وہی، جم خانے وہی
ساقی نے چولا بدلا ہے، کچھ رندوں نے بدلے پیراہن
کیسے کہوں اے جانِ چمن!

میخوار وہی، خونخوار وہی، صدیوں کے اجارہ دار وہی
عیار وہی، مکار وہی، ہیں چوروں کے بازار وہی
بیکار مگر پرکار وہی، ہو جن پہ خدا کی مار وہی،
[جی]نے کو نہیں اک نانِ جویں، مرنے کو نہیں دو گز بھی کفن
کیسے کہوں اے جانِ چمن!

احساس وہی، جذبات وہی، آکاش وہی، دن رات وہی
آلام وہی، آفات وہی، مزدور کی ہے اوقات وہی
محکومی کے صدمات وہی، ہے پردے کے پیچھے ہاتھ وہی
[خ]ون کی کھیلی ہولی ہے، پھر رنگ میں ڈوبے گنگ و جمن،
[ک]یسے کہوں اے جانِ چمن!

گو تخت نیا ہے، تاج وہی، راجے تو نئے ہیں راج وہی
جو کل تک تھا ہے آج وہی، مفلوک وہی، محتاج وہی
ہے تاخت وہی، تاراج وہی، دو کوڑی کی ہے لاج وہی
[ر]اہے یہی، پھر روتے ہیں، کیوں آج نہیں ہم خندہ دہن
[کی]سے کہوں اے جانِ چمن!

جب وہ بھی وہی ہیں، ہم بھی وہی پھر کیوں نہ رہے ماتم بھی وہی
باقی بھی وہی، برہم بھی وہی، ہم میں ہے ابھی تک دم بھی وہی
سر دینے کے سرگرم بھی وہی، من مندر میں چھم چھم بھی وہی
[را]ت بھی چھٹ جائیگی، ہے دل میں ہمارے چند کرن
[بدلے] گا زمانہ بدلے گا، امید کا کیوں چھوڑیں دامن؟ •

انور صدیقی •

شبِ زنداں

اُداس رات، یہ زنداں کی ظلمتوں کا طلسم
خموشیوں نے بھی دم سادھ سا لیا جیسے
صباحتِ رُخِ مہتاب اڑ گئی شاید.....
نجوم و کہکشاں گردِ راہ بن سے گئے
محیطِ ارض ہے تاریک رات کا شہپر
فضا میں چاندنی اب بھی اسیرِ ظلمت ہے
حیات جادۂ تاریک پر ہے محوِ خرام

★

ہمارے پاؤں کے بجتے ہوئے سلاسل سے
سکوتِ شب کی چٹانوں میں دَر سا آتا ہے
کبھی کبھی تو محافظ سپاہیوں کی پکار.....
ہمارے سینوں میں شمعیں جلا سی جاتی ہے
صبا سکوت کے کاندھوں پہ جب بھی آتی ہے
ہمارے ذہنوں میں کلیاں چٹکنے لگتی ہیں
دلوں میں کتنے ہی غم کروٹیں بدلتے ہیں
سحر کی یاد کے جب ارغنوں سے بجتے ہیں
مہیب کتنے ہیں سائے سوادِ زنداں کے
کوئی بتاؤ کہ اب کتنی رات باقی ہے

گیانی گورمکھ سنگھ جی مسافر
ممبر انڈین پارلیمنٹ

رُوس میں مسلمان

روس میں مذہبی آزادی کا چرچا آج کل بھی کیا جاتا ہے جبکہ وہاں مخالفت مذہب
مہم پورے زور وں پر ہے۔ حال ہی میں ہند پارلیمنٹ کے ممبر گیانی گورمکھ سنگھ جی نے
سوویٹ روس کا دورہ کیا تھا۔ اس میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے روسیوں کے ساتھ پوری
ہمدردی سے قلمبند کیا ہے۔ ذیل میں ان کے ایک مضمون کا حصہ دیا جاتا ہے جس سے اندازہ
ہوگا کہ روسی مسلمان اب کہاں ہیں۔

(دعوت)

روس کے مسلمانوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے مذہب کو پیار کرتے ہوئے بھی انھوں نے مذہبی تعصب کو تلانجلی[1] دیدی ہے۔ کئی ایسی باتوں کو بھی تلانجلی دیدی ہے جنہیں مذہب کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک بات ہے "پردہ"۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کا پردہ اسلام کا بہت ضروری انگ[2] ہے۔ ایک وقت روس کے مسلمان بھی ایسا ہی سمجھتے تھے، لیکن اب وہ کھلم کھلا پردے کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ لوگوں میں اس کے خلاف جذبہ پیدا کرنے کے لئے ڈرامے بھی کھیلتے ہیں۔

تاشقند میں ایک ڈرامہ ہم نے دیکھا جس کا نام "گلسرا" تھا، جسے لکھنے والے دو مسلمان لیتین اور محمد تھے، اور جو شروع سے آخر تک پردے کے خلاف تھا۔ یہ ڈرامہ اس تھیٹر میں کھیلا گیا جو ازبکستان کے مشہور شاعر "علی شیر نوائی" کے نام پر بنا ہے۔ "گلسرا" ایک لڑکی کا نام ہے۔ اس کا پتا پرانے خیالات کا ہے، پردے کا بہت کٹر حامی، وہ اپنی نوجوان بیٹی کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ پردہ کرے۔ لیکن جب گلسرا کی شادی ہوتی ہے تو اس کا پتی اسے سمجھاتا ہے کہ پردہ بے سود اور بے معنی ہے۔ گلسرا اس کی بات مان لیتی ہے اور پردہ اتار دیتی ہے اور جب اپنی ماں کے گھر آتی ہے تو پردے کی کٹر مخالف بن کر۔ اپنے پتا کو وہ بتاتی ہے کہ پردے سے کیا کیا نقصان ہوتے ہیں لیکن پتا تو مانتا نہیں وہ بضد ہے کہ اس کی بیٹی ضرور پردہ کرے۔ گلسرا کی ماں اپنے پتا کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے، وہ پردے کی مخالفت کرتی ہے کہ مرد نے عورت کو قید کر رکھا ہے۔ عورت اس قید میں رہے گی نہیں۔ گلسرا کا پتا غصہ میں آکر بیوی کو قتل کر دیتا ہے اور پھر اپنے گلے میں چاقو گھونپ کر خودکشی کر لیتا ہے اور ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامہ میں حصہ لینے والے سب کے سب مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں تھیں۔ حاضرین میں بھی قریب قریب سب لوگ مسلمان تھے کتنے ہی بوڑھے بھی تھے جب پردے کے خلاف تقریر کی جاتی وہ تالیاں بجاتے تھے —— اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پردے کے خلاف کتنا سخت جذبہ مسلمانوں میں پیدا ہو رہا ہے اور یہ پردہ وہ چیز ہے جس کے خلاف بولنے کی وجہ سے ازبکستان کے ایک اور مشہور شاعر حمزہ حکیم زادہ نیازی کو ۱۹۲۹ء میں تاشقند کے نزدیک فرغانہ کے علاقہ میں سنگسار کر دیا گیا تھا۔ سمرقند میں ہم نے جب حمزہ حکیم زادہ نیازی کی سنگساری کا ذکر کرتے ہوئے حیرت کے ساتھ پوچھا "انقلاب کے بارہ برس بعد بھی یہ شرمناک بات ہوئی کس طرح؟"

سمرقند کے مسٹر عبدالقادر نے کہا: "لوگ دھیرے دھیرے سیکھتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا "نیازی کے قاتلوں کا کیا ہوا؟"

مسٹر عبدالقادر نے غصے کے ساتھ اپنے ہاتھ کو تلوار کی طرح ہلاتے ہوئے کہا: "ختم کر دیئے گئے سب۔"

یہ ہے روس میں مذہب کا حال۔ نیازی نے جس بات کے لئے قربانی دی تھی وہ اب لوگوں کا دستور بن گئی ہے۔ اب صرف پردہ ہی کیوں مذہب کی ہر بات تعصب سے مبرا ہو گئی ہے۔ خود مذہب ہی ثانوی چیز بن گیا ہے۔ مذہب کو بھول کر لوگ آپس میں شادیاں بھی کرتے ہیں اور شادی سول رجسٹرار کے سامنے ہوتی ہے۔ تاشقند میں ایک سیمینار سید "ابو الوفا" نے ہمیں بتایا۔

---

[1] دست بردار [2] جز۔ لازم حصہ۔ عقیدہ کے صاحب

"مذہب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے میں مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا، اسلئے اصطلاحی طور پر مسلمان ہوں، لیکن صرف اصطلاحی طور پر۔ اس کے معنی کیا کرتا ہوں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اچھا انسان بننا چاہئے"

تاشقند میں کل ۷ مسجدیں ہیں۔ سبھی میں نماز پڑھی جاتی ہے لیکن اگر کسی مسجد میں جمعہ کے روز تین ہزار آدمی نماز پڑھتے ہیں تو باقی مسجدوں میں اس سے بہت کم پڑھتے ہیں۔ تاشقند کی کل آبادی دس لاکھ ہے قریباً سبھی مسلمان ہیں لیکن عام لوگوں کو مذہب کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے مذہب پر کوئی پابندی روس میں عائد نہیں ہے لیکن دوسری باتوں کی طرف عوام کی توجہ اتنی زیادہ ہے کہ مذہب کی طرف توجہ دینے کی بات دھیان عموماً پہنچتی ہی نہیں۔ مذہب روس کے اندر انسان کی زندگی کا ثانوی پہلو بن کر رہ گیا ہے ابتدائی اور بہت ضروری پہلو نہیں رہا۔

تاشقند میں ایک عجیب بات بھی دیکھی ہم لوگ مسجد میں جانے لگے تو احتراماً اپنے جوتے اتار دیئے۔ لیکن ہمارے ساتھ قاضی ضیاء الدین نے جوتے نہیں اتارے وہ جوتوں کے ساتھ ہی اس جگہ چلے گئے جہاں نماز پڑھی جاتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاضی صاحب مسجد کا احترام نہیں کرتے بات یہ ہے کہ احترام کرنے کا جو رواج ہمارے ہاں موجود ہے وہ تاشقند میں موجود نہیں۔

مختصراً اتنا یاد رکھیے کہ روس میں مذہب کو بہت اہمیت نہیں دی جاتی۔ شروع شروع اس کے خلاف سختی سے پرچار کیا گیا لیکن اب یہ سختی موجود نہیں لوگ اگر چاہیں تو گرجا گھروں، مندروں یا مسجدوں میں جا سکتے ہیں لیکن وہ عموماً جاتے نہیں کیونکہ مذہب سے اب کسی کو دنیاوی فائدہ نہیں ہوتا کوئی برتری نہیں ملتی۔ کوئی رعایت نہیں ملتی۔

—— لیکن مذہب اور دوسری ہر بات کے متعلق جس مرکز سے ہر حکم جاری ہوتا ہے اس کا نام ہے "کریملن"

سلہ نکر۔ (بشکریہ "دعوت")

حاذق نروائن پلز

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں، اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ ہذا کے خاص تجربات میں سے ہیں۔

قیمت: چالیس گولی برائے بیس یوم؛
چار روپے بارہ آنے

ساختہ: حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی

نعیم صبا

"زہراب"

معطر ہوائیں، منور فضائیں، میخانہ بردوش رنگیں گھٹائیں
کہیں ساغروں میں مئے ناب رقصاں کہیں معصیت بُنے رہی ہے صدائیں
کہیں ہیں محبت کی شمعیں فروزاں، کہیں زندگی بن گئی ہے فسانہ
کہیں آرزوؤں نے انگڑائی لیکر سُنایا ہے دل کو شبابی ترانہ
کہیں مرمریں فرش کی لغمگی سے، زر و سیم کی ہیں لکیریں نمایاں
کہیں چند مٹی کے ڈھیروں کے اُوپر کسی بے نوا کی تمنّا ہے گریاں

اگر یہ تلاطم نہ ہو شش جہت میں، اگر بے قراری نہ ہو خامشی میں
تو ساحل کو موجوں کی حسرت نہ ہوگی، جمودِ مسلسل رہے زندگی میں
جمودِ مسلسل لیے زندگی میں تو قندیلِ محفل فروزاں نہ ہوگی
در و بام پر سائے لہرائیں گے اور جوانی شبستاں میں رقصاں نہ ہوگی
فضائیں ہیں خنداں، بہاریں ہیں رقصاں، چمن میں نسیمِ سحر نغمہ زن ہے
گل و برگ و شاخ و ثمر کی رگوں میں نئی زندگی ہے، نیا بانکپن ہے
چمن کے درخشاں نظاروں کے سائے میں رنگیں بہاروں کی تخلیق ہوگی
قمر سے ضیائے قمر چھین کر اب سنئے چاند تاروں کی تخلیق ہوگی
فضا میں بغاوت کے آثار ہیں اور زمیں سرخ لاوا اگلنے لگی ہے
مہ و مہر و انجم کی تابانیوں سے نئی روشنی اب نکلنے لگی ہے
جو انسان مجبور و بے بس رہے ہیں اب ایک جست میں زندگی چھین لیں گے
زر و سیم کی طاقتوں کے مقابل بتوں سے غرورِ خودی چھین لیں گے

رئیس باغی

اے عصرِ نو کے شاعر!

سازِ دل پر ہے غم و جور کی مضراب زنی
جامِ ہستی سے چھلکتا ہے اخوت کا لہو
زندگی سنگِ مساوات شکن ہے یکسر
ٹوٹ جائے نہ کہیں صبر و تحمّل کا سبو
لبِ مانوسِ فغاں مائلِ فریاد نہ کر
پیکرِ مہر و وفا شکوۂ بیداد نہ کر

تیرگیٔ غم و آلام سے ڈرنا ہے فضول
زندگی راحت و آرام کی شہ پائے گی
خود بخود نشۂ پندار اُتر جائے گا
دادِ آشفتگیٔ زیست بھی مل جائے گی
روحِ زیست کو مجموعۂ اضداد نہ کر
نقشِ خاموشِ دلِ زار کو نقّاد نہ کر

ہاں تجھے سجدہ کریں گے یہی ماہ و انجم
رفعتِ فکر تری، تجھکو دکھائے گی اثر
منتظر ہیں ترے، رعنائیٔ فردا کے محل
چل ذرا تیز، زمانے کی روش سے ہٹ کر
دولتِ دانش و ادراک کو برباد نہ کر
توڑ دستورِ قفس، منّتِ صیّاد نہ کر

حسنِ امّید سے قائم ہے خیابانِ حیات
حُسنِ امّید ہی اک صبحِ درخشندہ ہے
"دُور تک یادِ وطن آئی ہے سمجھانے کو"
یاس اک تیرگیٔ غم کی نمائندہ ہے
فطرتِ درد کو بیگانۂ افتاد نہ کر
یعنی بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہ کر

ظفر منصور

گیٹ کیپر

یہ رنگ پور اسٹیشن کا قصہ ہے جہاں تین ریلوے افسران کھڑے ایک ضروری گفتگو میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں سے ہٹ کر قریب ہی دیہقانی آدمیوں، ڈری سہمی عورتوں اور دیگر مسافروں نے بھیڑ لگا رکھی ہے۔ یہ سب تماشائی بڑے استعجاب کے ساتھ آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

"لیکن یہاں ریلوے کراسنگ پر گیٹ کیپر کون ہے؟"
ایک افسر نے پُروقار لہجہ میں اپنے دونوں ماتحت افسروں سے دریافت کیا۔

ادھیڑ عمر کے دراز قد افسر نے جواب دیا:
"جناب وہی شخص جو یہاں پچھلے تیس سال سے مامور ہے۔"
"کیا کہا؟ —— پچھلے تیس سال سے!"
اس پر تیسرے نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، جو مرتبہ کے لحاظ سے دونوں سے نیچے کا افسر ہے۔

"اور آپ دونوں حضرات اس قسم کے شخص سے اطمینان بخش ام کی اُمید رکھتے ہیں؟" بڑے افسر نے اپنی بید کی چھڑی سے بین کریدتے ہوئے کسی قدر تعجب سے سوال کیا۔ باقی دونوں افسر ھ وقفہ خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر ادھیڑ عمر والے ے کہا:

"جناب یہ گیٹ کیپر ایک پرانا آدمی ہے جواب بڈھا ہو چکا ہے بن کو ریلوے میں ملازمت کرتے ہوئے پورے تیس برس ہو چکے یا۔ اتنی طویل ملازمت کے بعد اب یہ دوسری جگہ جا بھی کہاں سکتا ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے بقیہ دن یہیں ختم کر لینے دیئے جائیں۔ جہاں سے اس نے عملی طور پر یہ وع کئے تھے۔"

بڑے افسر تے بغور سنتے ہوئے پہلے تو اپنی بھنویں اور ہونٹ سکیڑ لئے۔ پھر اپنی بید کی چھڑی کو پھک دیگر پتھر کے ایک ریزے کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا:

"ہمیں محض لوگوں کے کام سے غرض ہے، ان کی ذاتی زندگی سے کیا واسطہ، اور پھر ہم کو اس خاص شخص کے مستقبل کے بارے میں فکرمند بھی نہیں ہونا چاہیئے۔"

ادھیڑ عمر والا افسر یہ سُن کر کچھ اُداس سا ہو گیا۔ وہ ذاتی طور پر رحمدل واقع ہوا تھا۔ ریلوے کی ملازمت میں وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے داخل ہوا تھا، لیکن اب وہ رنگ پور کے اسٹیشن ماسٹر کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس کی ترقی دوسروں کی طرح ناجائز طریقے سے عمل میں نہ آئی تھی، بلکہ مختلف افسروں کے ماتحت رہ کر اپنے فرائض کی عمدہ انجام دہی کی بدولت اس نے قابلِ عزت جگہ حاصل کر لی تھی۔ وہ بہت زیادہ قابل بھی نہ تھا، بلکہ صرف محنتی، ایماندار اور معقول تھا۔ اس نے افسرِ بالا کے ہونٹوں کی سختی اور اس کی پنہاں معنویت کا جائزہ کرتے ہوئے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا:

"جناب عالی! بدری ناتھ تیس سال سے گیٹ کیپر ہے، اس لئے وہ خاص عنایت کا مستحق ہے۔"
"اس کی عمر کیا ہوگی؟"
"غالباً ساٹھ سال۔"
"تب تو وہ یقیناً اپنے فرائض کو انجام دینے کے ناقابل ہے۔"
افسر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"تاہم ...." ادھیڑ عمر والے نے جرأت کی۔
"ہم غور کریں گے ..."
اسٹیشن ماسٹر ہوشیار آدمی تھا۔ یہ سوچ کر کہ ایک افسر سے بحث کرنا اور اس کی خواہش کے سے الجھنا ٹھیک نہیں سمجھا مرش
[illegible]

سٹیشن سے دو فرلانگ پر ایک کراسنگ تھی۔ بدری ناتھ تیس
سال سے ریلوں کے اس موڑ پر رہا کرتا تھا۔ ابھی ایک حالیہ موقع پر جبکہ
ایک ٹرین گزرنے والی تھی، بدری ناتھ گیٹ بند کرنا بھول گیا تھا اس کی
فراموش کاری سے ایک زبردست حادثہ ہوتے ہوتے بچ گیا۔ اسی
سلسلے میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ، ٹریفک انسپکٹر اور اسٹیشن ماسٹر کے
درمیان گفتگو عمل میں آئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی اور ٹریفک سپرنٹنڈنٹ
اپنے اسپیشل کوچ کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہونے کے بعد اس نے
بڑی شاہانہ تفاخر سے سٹیشن ماسٹر سے کہا،

"ہمیں کوئی دوسرا تجربہ کار اور جوان آدمی اس جگہ پر مقرر کرنا
پڑے گا۔"

اس کے کچھ آخری الفاظ ریل کی تیز سیٹی میں گم ہو گئے۔ باقی
دونوں افسروں نے مؤدبانہ سلام کیا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔

دنائیک راؤ، اسٹیشن ماسٹر روزانہ شام کو سیر کے لئے ٹہلتا ہوا
ریلوے کراسنگ کی سمت نکل جایا کرتا تھا۔ اس کی سنہرے ہتھے والی
چھڑی، اس کے پرانے مگر صاف ریشمی دوپٹے اور چپلوں نے قریب دس
سال سے اس فسیانہ روز سیر میں ساتھ دیا تھا۔ وہ اکثر بدری ناتھ گیٹ کیپر
کے ہاں بھی جاتا اور اس کی جھونپڑی میں بھی ستانے کے لئے بیٹھ جاتا۔

بدری ناتھ دنائیک کو آتا ہوا دیکھ کر اپنے جھونپڑے سے ہاتھ میں
ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا لئے ہوئے باہر آتا اور ادب کے ساتھ اسٹیشن
ماسٹر کے سامنے پیش کرتا۔ اس نے اپنے مختصر سے کمرے کے سامنے ایک
قطعہ سا بنا لیا تھا، جہاں ترکاریوں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں
یہاں بیٹھ جاتے اور پھر اپنے ذاتی معاملات اور اپنے دکھ سکھ کے بارے
میں بات چیت کرتے اس طرح سے شام بیت جاتی۔

ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے دورہ کی شام کو دنائیک راؤ حسب معمول
بدری ناتھ کے ہاں گیا۔ آج اس کا چہرہ متفکر تھا اور اس کی چال بھی سست
تھی۔ جب وہ جھونپڑی میں پہنچا تو اس کو بڈھا آدمی اپنے قطعہ میں
نہ دکھائی پڑا لیکن وہ اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں روز بیٹھا کرتا تھا۔ پھر وہ
ایک گہری سوچ میں ڈوب کر اس بڈھے آدمی کی ترکاری، لگائے ہوئے
پودوں اور جھونپڑی پر پھیلی ہوئی بیلوں کا جائزہ لینے لگا۔ قطعے کے کنارے
دروازہ پر نیلے نیلے پھولوں والی بیل بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس
باغیچہ کے ایک طرف چند مسالوں اور مرچ کے پودے بھی لگے ہوئے
تھے۔ قریب ہی تلسی کے تین چار گملے رکھے ہوئے کسی پُراسرار
رُوحانی عظمت کے معصوم اشارے معلوم ہو رہے تھے۔ بیچ کی
کھلی ہوئی جگہ پر گوبر سے لِپا ہوا ایک دائرہ بنا ہوا تھا، جو اپنی صفائی
کے باعث نمایاں نظر آتا تھا۔ اس دائرے سے ہٹ کر ایک جانب
بکری بندھی ہوئی تھی۔ آج نہ جانے کیوں دنائیک راؤ ان تمام چیزوں
میں ایک نیا مزہ، ایک نیا لطف پا رہا تھا۔ شاید بڈھا آدمی اپنی تمام
سادگی کے ساتھ اس کو ایک مقدس ہستی محسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد جھونپڑی میں سے دس گیارہ
سال کی ایک لڑکی باہر آئی، مگر دنائیک راؤ کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں واپس
چلی گئی اور بدری ناتھ سے کہا:

"دادا اسٹیشن ماسٹر صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

دنائیک راؤ تین چار روز سے اس کے ہاں نہیں آیا تھا
اور اسی عرصہ میں بدری ناتھ بیمار پڑ گیا تھا۔ تاہم لڑکی سے اس نے
ایک گلاس پانی لانے کو کہا اور خود نہایت نقاہت سے چلتا ہوا
باہر آیا اور دنائیک راؤ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے بکری کے دو
بچے بھی کھیلتے ہوئے بھاگ آئے اور دنائیک راؤ کے پیروں سے
کھیلنے لگے۔ دنائیک راؤ نے آج غیر معمولی طور پر محسوس کیا کہ یہ جھونپڑی
اور یہ باغیچہ اس بڈھے کے لئے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اس کا یہ اپنا ایک
چھوٹا سا پیدا کیا ہوا ماحول اس کی اپنی شخصیت کی غمازی کر رہا ہے۔
اس کی ذات اس جگہ کے گوشے گوشے اور ذرّے ذرّے سے پھوٹ
رہی ہے۔ یہاں کی ہر شے صرف اسی کے گیت گا رہی ہے اور ہر
چیز پر اس کی حکمرانی کی مہر لگی ہے۔ خاموشی اس کی رفیق اور سکون
اس کا ساتھی ہے۔ بے لوث فطرت اس کی ہمراز ہے۔ وہ ٹہنیوں پر
کھلے ہوئے پھولوں اور چہکتی ہوئی چڑیوں کا رکھوالا ہے۔ اور تعلقی
مظاہر سے مسرور ہونے والی واحد ہستی ہے یہ جگہ اس کی متاعِ زندگی
ہے بلکہ خود اسی کی اپنی ذات ہے، جو منقسم ہو کر مختلف روپ اور چیزوں
میں جلوہ گر ہے ـــــــ آج دنائیک راؤ اپنے ان اُجڑتے شاہوں

پر حیران تھا۔ اسے ہر چیز میں ایک نیا پن محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے غور سے چھوٹی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اسکے متعلق دریافت کیا۔

"وہ اپنی شانتا ہے"۔ بڈھے نے جواب دیا۔ "جو سڑک کے اس پار ایک باغبان کی لڑکی ہے۔ یہی بیچاری پچھلے تین دنوں سے یہ بکری دوہتی ہے۔ بڑی سیدھی بچی ہے۔ ایشور کرے ہمیشہ خوش رہے۔"

شانتا پانی سے بھری ہوئی ایک لٹیا لائی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ وہ بڑی معصوم اور بھولی لگ رہی تھی۔

"اچھا دادا! اب جاتی ہوں"۔ شانتا نے کہا۔

"موتی کو دودھ لیا"۔ بڈھے نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ موتی اس کی بکری کا نام تھا۔

"ہاں دادا"۔ اس نے جواب دیا۔

"بہت اچھا، اب تم جاؤ، مگر صبح جلدی آنا بیٹیا!"

شانتا تھوڑی دور جانے کے بعد پھر واپس آگئی اور بولی۔ "اور دا چار روز بعد دیوالی ہے۔ تم آٹے کی مٹھائی نہیں بناؤ گے؟"

اس پہ بڈھا مسکرایا اور کہا "نہیں بیٹیا!"

"کیوں نہیں دادا! اس دن تو ہر شخص مٹھائی کھائے گا۔"

"اچھا تو بیٹیا! تم بھی تھوڑا سا گیہوں اندر سے لے لو لیکن اسے مت موٹا نہ پیسنا"۔

اس چھوٹی لڑکی شانتا کی ان خدمت گزاریوں کو دیکھ کر ینک راؤ بڑا متاثر ہوا۔ پھر وہ بڑی ملائمت سے بولا:

"اس عمر میں تم بڑی مشکل سے کام کر پاتے ہو، اور پھر اس قدر طویل مدت کے بعد اب شاید تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"آہ! پر میں مشکل سے چند سال اور جیونگا۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کام تم ریٹائر ہو جاؤ اور بقیہ زندگی پوجا پاٹ میں گزارو۔"

"پر اس عمر میں اب کون میرا مددگار بیٹھا ہے۔ میرا بیٹا، بیوی سب مر چکے۔ اب تو میں ہی اکیلا ہوں۔ لہٰذا جب تک اس کمزور اور ناتواں جسم میں جان باقی ہے پیٹ بھرنے کے لئے کوئی آسرا چاہیے جس کے لئے مجھے کام کرتے رہنا ہوگا۔"

ونائیک راؤ ان باتوں کو سن کر کسی حد تک سنجیدہ ہو گیا۔ جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گیٹ کیپر کا تعلق اس کے جھونپڑے اور باغیچے سے اتنا ہی ہے جتنا ایک ماں کا اپنے بچے سے ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن ٹریفک انسپکٹر سٹیشن ماسٹر سے ملنے آیا اور اس نے پوچھا "کیا طریقہ عمل اختیار کیا گیا ہے؟"

"بڈھے کو ڈسمس کرنا مجھے ذرا مشکل معلوم دیتا ہے"۔ ونائیک نے جواب دیا۔ "کیونکہ مسٹر پربھاکر آپ خود سوچئے کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے، اس کا کوئی اپنا نہیں۔ اس صورت میں اگر اسے برطرف کیا جاتا ہے تو اسے پناہ اور سہارے کے لئے کوئی دوسری جگہ میسر نہ آئے گی۔"

مسٹر پربھاکر نے جواب دیا "یہ سب صحیح ہے۔ میری کوئی یہ خواہش نہیں ہے کہ بڈھے کو تکلیف پہنچے مگر بڈھے کا کام سادہ اور آسان ہونے کے باوجود انتہائی نازک بھی ہے۔ بڑھاپے کے باعث وہ اس قسم کے فرائض کے لئے قطعی ناموزوں ہے —— میں اس کی ہر طریقے سے مدد کرنا چاہتا ہوں، لیکن کیا کروں مجھے حکم دیا جا چکا ہے"۔ ٹریفک انسپکٹر نے فیصلہ کن بات کی۔

"تو کیا اس غریب کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا؟"

ونائیک راؤ نے درخواست کی: "مجھے یقین ہے کہ آپ کی سفارش کچھ وزن اور اثر رکھ سکتی ہے"۔ —— مسٹر پربھاکر! میرا واسطہ، آپ کچھ کیجئے —— اس کو ایک اور موقع دیا جائے؟"

"میرا خیال ہے ایسا طریقہ کار خطرے سے خالی نہیں۔ یہ تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بڈھا ہے لہٰذا ریٹائر ہو جانے کے علاوہ اس کے لئے کوئی دوسری صورت نہیں اور یہ پرائیویٹ سروس تو ہے نہیں کہ جس میں ذاتی خیالات کی آزادی ہو۔ اگر کبھی دفعہ وہ گیٹ بند کرنا بھول گیا جس کی وجہ سے ریلوے کی سخت بدنامی ہوئی —— پھر اگر ایسا ہو گیا تو ہم اور آپ دونوں اس کے ذمہ دار ہوں گے ہمارا سروس ریکارڈ خراب ہو جائے گا اور ہم سے بازپرس ہوگی —— اس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

ونائیک راؤ ٹریفک انسپکٹر کی اس دلیل کو سن کر لاجواب ہو گیا لیکن ایک بار پھر اس نے درخواست کی کہ اس پر رحم کیا جائے۔ وہ گیٹ کیپر بوڑھا ہونے کے باوجود بھی اسٹیشن ماسٹر کی نظروں میں قابلِ احترام ہے۔ روزانہ کی پر خلوص ملاقاتیں چھوٹے اور بڑے کے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر سکتی ہیں اور اگر ایک بڑے آدمی کے ضمیر میں انسانیت اور مروّت کی رمق بھی ہے تو وہ کسی دیوتا سے کم نہیں۔ ونائیک راؤ کو بدری ناتھ سے سچی عقیدت تھی وہ ہر حال میں اس غریب کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے سوچا کہ اب بحث و مباحثہ سے گیٹ کیپر کو بچایا نہیں جا سکتا اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ بدری ناتھ خود ٹریفک انسپکٹر سے بالمشافہ درخواست یا اصرار کرے، مگر اس ترکیب سے بھی کوئی امید افزا بات پیدا نہیں ہو سکتی جہاں ونائیک راؤ ناکامیاب رہ گیا وہاں بیچارہ گیٹ کیپر کیسے کامیاب ہو سکتا ہے تاہم گیٹ کیپر ایک دفعہ درخواست کر کے قسمت آزمائی تو کر لے۔ چنانچہ اس نے ٹریفک انسپکٹر سے درخواست کی کہ وہ کم از کم بدری ناتھ کو شرفِ ملاقات بخشیں۔

دوسرے دن بڈھا گیٹ کیپر ٹریفک انسپکٹر کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر مسٹر پربھاکر کے پیروں پہ مودبانہ جھک گیا۔ وہ حسبِ معمول ریلوے کی نیلی اور بوسیدہ وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اسی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا صافہ بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کھردرے تھے لیکن ان میں کسی قدر جلدی ملائمیت ضرور تھی۔ وہ ملتجی نگاہوں سے کھڑا ہوا اسٹیشن ماسٹر اور ٹریفک انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ٹریفک انسپکٹر بولا:

"بدری ناتھ تمہارا ہی نام ہے؟"

"ہاں سرکار!" اس نے جواب دیا۔

"دیکھو بدری ناتھ! اب تم کافی ضعیف ہو چکے ہو۔ ریلوے کی خدمت میں بھی تم کافی دن ہو گئے ہیں ایسی حالت میں؟"

ٹریفک انسپکٹر کے جملہ ختم کرنے سے پہلے ہی بدری ناتھ نے کہا: "ہاں صاحب! سرکار کی نوکری میں بال سفید ہو گئے ہیں"۔ بدری ناتھ نے خوشی سے اس کا اظہار کیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کو طویل خدمت کے صلہ میں کوئی انعام ملے گا لیکن ٹریفک انسپکٹر نے اس سے دوسرا مفہوم اخذ کیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ بڈھا اس کی بات مان گیا ہے لہٰذا اس نے کہا:

"اچھا تو آج شام کو اسٹیشن ماسٹر سے مل کر اپنا حساب طے کر لو تم کل کی تاریخ سے ریٹائر کئے جاتے ہو۔"

بدری ناتھ یہ سن کر متعجب رہ گیا، اور اس کو ایسا محسوس ہوا گویا یکلخت اس پر چھت گر پڑی ہو۔ تھوڑی دیر تک اسے اپنے کانوں پہ اعتبار نہ ہوا۔ خیالات کی مغموم رو میں اسے اچانک اپنی گزشتہ غلطی یاد آگئی جب کہ وہ گیٹ بند کرنا بھول گیا تھا۔ وہ سمجھا کہ غالباً اسی خطا کی پاداش میں اسے برخاست کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ بولا:

"صاحب مجھ پر رحم کیجئے اس جہاں میں کوئی میرا سہارا نہیں ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ...."

اور بڈھے کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے جن کی چمک دیکھ کر ٹریفک انسپکٹر کے چہرے پہ جذبۂ ترحم کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پھر اس نے پوچھا:

"کیا دُور کا بھی تمہارا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں جس کے پاس تم جا سکو؟"

"نہیں حضور! کوئی بھی تو نہیں ہے ——— یہی پیڑ پودے جنھیں میں نے اپنے جھونپڑے کے سامنے لگایا ہے، بس میرے سنگھی ساتھی ہیں۔"

"بدری ناتھ!" ٹریفک انسپکٹر نے کسی قدر نرمی کے ساتھ کہا "تم نہیں سمجھتے اور پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ ریلوے تمہاری ان باتوں پہ غور و خوض کرے۔ مجھے بڑا افسوس ہے ——— بہرحال ہم سب کو ایک نہ ایک دن ملازمت سے سبکدوش ہونا ہے اور فی الحال تمہاری ملازمت کو بدستور جاری رکھنا بہت خطرناک ذمہ داری ہے جو کہ میرے اختیار سے باہر ہے تاہم ہم غور کریں گے۔"

بدری کے چلے جانے کے بعد دونوں افسران نے باہم گفت و شنید کی اور متفقہ فیصلہ کیا کہ ہمدردی کا جذبہ خواہ کتنا ہی بلند و ارفع کیوں نہ ہو مگر وہ اس معاملہ میں قطعی مجبور ہیں اور اپنی خواہش کے خلاف ان کے لئے بدری ناتھ کو برخاست کرنا ضروری ہے۔

اس روز شام کو بدری ناتھ بڑی بے چینی سے ونائیک راؤ کی

آمد کا منتظر تھا۔ بالآخر جب وہ حسب معمول وہاں پہنچا تو بدری ناتھ نے بڑی عاجزی اور اُمید کے ساتھ پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ونائیک راؤ نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے ناکامی کا اظہار کیا۔ پھر چند لمحے وہ اپنی چھڑی کا سنہرا دستہ پکڑے ہوئے نہایت تفکرانہ انداز میں باہر کے قطعہ کا جائزہ لیتا رہا، جس پر بڈھے کی محنت اور اس کے شوق کے پھل لگے ہوئے تھے۔

"تو مجھ کو یہ جگہ کل صبح تک چھوڑ دینا پڑے گی؟" بدری ناتھ نے دل گرفتہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اب تو کرنا ہی پڑے گا" یہ کہتے ہوئے ونائیک راؤ نے ایک آہ کھینچی اور پھر وہ بدری ناتھ کے پیروں پر جھک گیا۔

"راؤ صاحب، راؤ صاحب!" بڈھا چلّایا، "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ونائیک راؤ نے اٹھتے ہوئے کہا:

"کاکا! تم میرے باپ کے برابر ہو۔ میں تم کو ایک اچھا آدمی سمجھتا ہوں۔"

پھر ونائیک راؤ نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا:

"کاکا! میری سنو، اب تم میرے ساتھ رہو اور مجھ کو اپنے بیٹے کی طرح خیال کرو۔"

بڈھے نے ونائیک راؤ کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"راؤ صاحب! آپ بڑے رحمدل آدمی ہیں۔ میں آپ کی اس مہربانی کا انتہائی شکرگزار ہوں، لیکن میں اسی جگہ رہوں گا اور یہیں مروں گا۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" ونائیک راؤ نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم، مگر ضرور رہوں گا۔ میں اس جگہ کو شاید کبھی کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا، اور راؤ صاحب آپ سے ایک التجا ہے کہ آپ ان بکری کے بچوں کو لے جائیے اور ان کی دیکھ بھال خود کیجیے۔"

"میں بکری کے بچوں کو تو لے ہی جاؤں گا مگر کاکا تم کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑیگا۔" ونائیک راؤ نے اصرار کیا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا تمہارا اکیلے رہنا مناسب نہیں اور پھر تم یہاں رہ بھی کس طرح سکتے ہو کل صبح یہاں دوسرا گیٹ کیپر آ جائے گا جو تمہیں یقیناً نکال دیگا۔ کاکا! تم اتنا بھی نہیں سمجھ پاتے؟"

"آہ! یہ جگہ میں کیسے چھوڑ دوں؟" بڈھے نے آبدیدہ ہو کر کہا: "ہر چند یہ جھونپڑی میری نہیں ہے۔ مگر میں اس سے اتنا وابستہ ہو چکا ہوں کہ اس سے علیحدہ ہونا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ میری زندگی کی جڑیں بھی اسی زمین میں گڑ چکی ہیں۔ میں خود انہی پیڑوں کی طرح ہوں جن کو میں نے پروان چڑھایا ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔"

"نہیں کاکا! تمہارا یہ گھر نہیں ہے، تمہارا گھر اب سے میرا گھر ہے۔ میرا تم سے ملنا جلنا کیا کوئی معنی نہیں رکھتا؟ تم کو ان پیڑ پودوں سے تو لگاؤ ہو گیا مجھ سے نہیں؟ میرے نزدیک تم ایک قریبی رشتہ دار سے بھی زیادہ ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ کاکا کہا ہے۔ پھر تم یہ کس طرح کہتے ہو کہ تمہارا کوئی دوسرا اور گھر نہیں ہے۔ میرے گھر کے دروازے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ چلو اٹھو۔"

بڈھے نے انتہائی استعجاب کے عالم میں ونائیک راؤ کے متحرک ہونٹوں کو دیکھا، جس سے ان کے سچے اور دلی جذبات عیاں تھے۔ وہ درحقیقت اسٹیشن ماسٹر کے آنے جانے اور اس کے ملنے جلنے اور اس کے نیک سلوک کو ہمیشہ ہمدردی اور عنایت تصور کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے تعلقات کو دوستی کے نقطۂ نظر سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کس طرح ایک غریب گیٹ کیپر اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ دوستی کا دعویٰ کر سکتا تھا؟ مگر نہیں، آج وہ ونائیک راؤ کی سچی ہمدردی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ایشور کرے راؤ صاحب! آپ ہمیشہ سکھی رہیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں، اس لئے اب آپ پر بوجھ بن کر آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"نہیں تم بوجھ کاہے کو بنو گے؟ تم تو جانتے ہی ہو کاکا! میرے باپ مر چکے ہیں۔ اب تم میرے اور میرے بچوں کے لئے بزرگ ہو۔ تم کو ہمارے ہاں آرام ملے گا۔ اس بڑھاپے میں تم کو میں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" ونائیک راؤ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا، جیسی آپ کی مرضی، مگر آپ بڑے رحمدل آدمی ہیں، مگر میں آپ کے ساتھ کل صبح چلوں گا۔ رات بھر خوب کے لئے

[illegible] ذات سے آپ کو تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن میری بچوں سے بھی مشورہ کر لیں تو بہتر ہے"

وِنائیک راؤ کے چہرے پر دفعتاً مسکراہٹ کھل اٹھی۔ وہ بولے:

"میں نے پوچھ رکھا ہے" کاکا! تم فکر نہ کرو اور جہاں تک غور کرنے کا سوال ہے وہ میں کر چکا"

دوسرے دن وِنائیک راؤ طلوع آفتاب سے قبل ہی بدری کے مکان پر پہنچ گئے۔ چھوٹی لڑکی شانتا وہاں موجود تھی اور بکری دوہ رہی تھی۔ دودھ دوہنے سے فارغ ہونے کے بعد وہ جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی: "دادا! اٹھو، سویرا ہو گیا"

مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

"دادا! میں نے دودھ دوہ لیا" مزید خاموشی کے بعد شانتا نے پھر کہا: "اور دادا میں کیہوں بھی پیس لوں گی"

غیر معمولی طور پر آج جواب نہ پا کر وِنائیک راؤ نے دروازہ کو دھکا دیکر کھول دیا۔ گیٹ کیپر چارپائی پر پیر پھیلائے مکمل سکون کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ وہ سمجھی روز کی طرح آج بھی دادا نیند کا بہانہ کئے پڑے ہیں۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ دادا ابدی نیند کی آغوش میں سو رہے تھے۔ وہ ایک ایسے گھر میں اٹھ گئے تھے جہاں سے انہیں کوئی افسر نہ نکال سکتا تھا اور جو وِنائیک راؤ کا بھی گھر تھا، سب کا گھر تھا، افسروں کا اور ماتحتوں کا.........

وِنائیک راؤ نے اس کے چہرے کو چادر سے ڈھک دیا، اور آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتے ہوئے باہر چلا آیا۔

(بشکریہ ادب)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری مارچ ۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں، یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی، پی، مطلوب ہے، اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم: مینیجر "مشیر" کراچی

۲۱۲۳	محمد اختر چک ۱۰۶ جنوبی	۲۳۰۹	محمد لیٰسین کشمور
۲۱۲۵	ملک حیات محمد میانوالی	۲۳۱۲	عبد الغفور لاہور
۲۱۲۸	مرزا سوڈا فیکٹری گوجر خاں	۲۳۱۶	محمد قمر نواں کلی
۲۱۳۰	ظہور الدین کراچی	۲۳۱۷	ثروت سلطانہ کراچی
۲۲۹۲	منظر کلیمی ڈیرہ غازی خاں	۲۳۱۸	محمد بخش حیدرآباد سندھ
۲۲۹۷	محمد شبیر خاں گلگت	۲۳۱۹	عبد المنان دہلی (بھارت)
۲۳۰۰	عبد المجید ورنگا پٹم (انڈیا)	۲۳۲۰	غلام مصطفےٰ للیانی
۲۳۰۲	عبد الغنی راجن پور	۲۳۲۳	جی ایم ہوسٹل ڈھاکہ
۲۳۰۶	قیصر بیگم نیازی کانپور (انڈیا)	۲۳۲۴	دار المطالعہ جماعت اسلامی پسرور
۲۳۰۸	افتخار احمد کھیانی	۲۳۲۶	عبد اللہ خاں کھوردالہ
۲۳۰۷	کتب خانہ عام کراچی	۲۳۲۸	مدرسۃ البنات لاہور

ابنِ محمود

رفیقۂ حیات سے

جانِ من! صبر کرو، ضبط کرو، غم نہ کرو
جانِ من! تلخیٔ ایام کا ماتم نہ کرو

ہے، ماحول مخالف ہی ہمارا تم سے
یا عیشِ فراواں نے کنارا تم سے
گیا عشرتِ فانی کا سہارا تم سے
ایک فانی سے سہارے کا مگر غم نہ کرو
دیکھو، اب تلخیٔ ایام کا ماتم نہ کرو
جانِ من! صبر کرو، ضبط کرو، غم نہ کرو

بجا! اب نہ وہ پہلی سی کوئی بات رہی
ناہوں کہ نہ دولت کی وہ بہتات رہی
نہ وہ دن ہی رہا اور نہ وہ رات رہی
خوئے تسلیم یہی، آنکھ کو پر نم نہ کرو
دیکھو اب تلخیٔ ایام کا ماتم نہ کرو
جانِ من! صبر کرو، ضبط کرو، غم نہ کرو

ذرا بات پہ دل توڑ نہ بیٹھو جانم!
نِ صبر و رضا چھوڑ نہ بیٹھو جانم!
صلہ بہرِ خدا چھوڑ نہ بیٹھو جانم!
خاطرِ شوق کو آزردہ و برہم نہ کرو
دیکھو، اب تلخیٔ ایام کا ماتم نہ کرو
جانِ من! صبر کرو، ضبط کرو غم نہ کرو

تم نے جو دیا ہے تو نبا ہو جانم!
تو چاہا ہے میرے حق کو بھی چاہو جانم!
لیں دیکھ کے مجھ سے نہ جدا ہو جانم!
آگ سینے میں جو بھڑکی ہے اسے کم نہ کرو
دیکھو، اب تلخیٔ ایام کا ماتم نہ کرو
جانِ من! صبر کرو، ضبط کرو۔ غم نہ کرو

عالم اکبرآبادی

چند زاویے

نہ پوچھ عہدِ طلب کے گراں نفس شب و روز
نہ ہو سکیں گے بیاں ابتدا سے افسانے

میں نے بھی دیکھے ہیں ان کے عارض و گیسو پوچھ
ایک کعبہ کی سحر ہے، ایک بت خانہ کی شام

تو اپنے حسن پہ نازاں، میں اپنے شوق میں گم
کسی کو بازیٔ الفت میں مات بھی ہوگی؟

ترے کرم کا میں ممنون ہوں مگر ساقی!
اگر شراب ہے تیری تو جام ہے میرا

عشرتِ خلوت بھی ڈھونڈا کی مجھے
آج کتنے وہ مرے نزدیک تھے

نشاطِ کیفِ شبستاں سے اس قدر بھی [illegible]
نہ جانے صبح کہاں ہو یہ جلوۂ معصوم

حسن بھوپالی

دعوتِ فکر

(زنانِ مشرق کا پیغام ــ "اپوا" کی کارکنوں کے نام)

تم کہ اپنی قرار دادوں میں   ہم کو جائز مقام دیتی ہو
اذن و لطف بخش کر جلوے   اذنِ دیدارِ عام دیتی ہو
کس قدر پُر خلوص جذبے سے   اک "مدلّل پیام" دیتی ہو
چند اعلان، چند تقریریں   ان کو خدمت کا نام دیتی ہو

کیا تمہارے یہ نو بہ نو پیماں   کیا یہ اعلان کیا یہ تجویزیں
کیا یہ ناقابلِ عمل اقوال   کیا یہ محدود کردہ تحریکیں
درحقیقت کیا توڑ ڈالیں گی   حدِّ فاصل کی سخت دیواریں
بخش دینگی زنانِ مشرق کو   حرفت و فنّ و علم کی قدریں؟

تم نے دیکھے ہیں وہ سیہ خانے   جن میں پژمردہ طفل پلتے ہیں
جن میں بستی ہے بھوک بیماری   جن پہ عسرت کے حکم چلتے ہیں
جن میں چلتا ہے صبر کا سکّہ   جبرِ بیجا جہاں پہ پلتے ہیں
جن کا سرمایہ رات دن محنت   جن کے بل پر نظام چلتے ہیں

اپنی تزئین رکھو مدِّ نظر   اور ہماری بھی سادگی دیکھو
اپنے نام و نمود کو پرکھو   اور گمنام زندگی دیکھو
زرد رخسار چشمِ نم دیکھو   خشک بالوں کی برہمی دیکھو
دیکھکر قصرِ مرمریں اپنے   "کہنہ قبروں" میں زندگی دیکھو

ان حقائق کو سامنے رکھکر   اپنا ہر لائحہ عمل بدلو
جن سے بنتی ہے دولت و عزت   ایسے پیمانے توڑ بھی ڈالو
اپنے اصلی مقام پہ بہنو!   جس قدر جلد ہو سکے لوٹو
یا پھر اپنی روش بدل ڈالو   یا قیادت کا ڈھول مت پیٹو

مسز ائژن ھاورڈ

اگر آج میں دلہن ہوتی

زمانہ بدلتا رہتا ہے مگر وہ بنیادی اور اساسی چیزیں جو ازدواجی زندگی کو خوشگوار بناتی ہیں، ماہ و سال کی تبدیلیوں کے باوجود وہی رہتی ہیں۔

اگر آج میں دلہن ہوتی تو آتش کبس کی بجائے کسی فریجیڈیر کی قیمت ڈالتی۔ اور جزیرہ ترائوں کی جگہ جذبات سے بھرپور عشقیہ نظموں کی تانیں اڑاتی اس بات سے ذرا بھی دہشت محسوس نہ کرتی کہ میرا شوہر کسی بھدّے اور بھونڈے قسم کے اُرن کھٹولے کا تجربہ کرنا چاہتا ہے، وہ اُرن کھٹولا جو ۱۹۱۶ء میں اڑایا جاتا تھا۔ بلکہ خود اپنے سفر کے لئے بھی طیارے ہی پسند کرتی۔ اور پھر جو حال ان تمام دلہنوں کا ہر سال رہا کرتا ہے وہی میرا بھی رہتا۔ میں بھی غذا کی قیمت کے بارے میں ہمیشہ پریشان و فکرمند رہا کرتی ——

—— لیکن ذاتی اور شخصی مسائل چونکہ وہی ہیں اس لئے ماحصل بھی ادر تردد کا یہی نکلتا کہ مکھن کی قیمت میں تبدیلی تو ہو سکتی ہے مگر ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی قدر و قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سب سے پہلا اور اہم اصول بالکل صاف اور سادہ ہے اگر ایک دلہن اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز ہی میں اپنے ذہن و فکر کو ہموار کر لے اور سمجھے کہ اب وہ بیوی ہے اور اس کا شوہر سردار خانہ ہے، تو پھر وہ تمام الجھنیں، تبدیلی و تنظیم کی، اور ترتیب و تطبیق کی، جن کا پیش آنا بہرحال لازمی ہے، وہی ہموار ہو جائیں۔

جی ہاں ہمیں اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہئیے۔ کہ ہماری زندگیاں ہمارے مردوں کے ارد گرد گھومتی ہیں، اور یہی ہونا بھی چاہئیے۔ آخر ان لوگوں کے بغیر واقعی کوئی حقیقی خاطر جمعی اور سچی تسکین کیا ہے؟ میرا البیلا محبوب جب مجھ سے تین ساڑھے تین سال تک جدا رہا تھا تو میری زندگی تو کچھ بھی نہیں تھی —— کسی کام کی بھی نہیں، بالکل اجڑی اجڑی اور ویران ویران —— ایک سچی بیوی کے احساسات و جذبات تو بالکل یہی ہوتے ہیں۔

بیوی ہونا سب سے بہتر وظیفۂ حیات ہے جو یہ زندگی کسی عورت کو عطا کرتی ہے۔ لپے لپے خوشنما اور خوب صورت شہانے جوڑوں اور بیش بہا تحفے تحائف سے کہیں زیادہ بڑی اور بے شمار چیزیں اور بھی ہیں جو شادی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ "سدا سہاگن رہو" کی دعائیں تو اس تقریب کے ادا ہوتے ہی خود بخود وجود میں نہیں آجاتیں۔ ان کے لئے ضرورت ہے سلیقہ مندیوں کی، فکر مستقیم کی، اور دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے خود اپنے اندر بہت کچھ موزوں اور مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کی۔ ہوش مند بیوی وہی ہے جو آغاز ہی میں یہ کہتی ہے کہ: —— میں تو رضاکارانہ طور پر خوشی خوشی خود اپنے اندر سب سے زیادہ تبدیلیاں پیدا کروں گی بلکہ قابل قدر اگر کوئی بات ہے تو یہی ہے ——

اگر آج میں کوئی نئی نویلی دلہن ہوتی، تو اس سے زیادہ بہتر طلب و تمنا میری کوئی اور نہ ہوتی کہ اس نکتے کو الفاظ و بیان کے طومار کے ذریعے نہیں بلکہ "جبلّت انسانی اور ایمائے فطرت" کے سہارے دل نشین کرلوں۔ اگر آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر، جن کا کبھی کوئی اثر کسی چیز پر نہیں پڑ سکتا، برسرِ جنگ نہ ہو جایا کریں، تو مردوں کو خوش کر لینا تو بہت ہی آسان ہے میری ازدواجی زندگی کے اوائل میں بے شمار ساعتیں ایسی آتی ہیں جب میں کسی تنہائی کے گوشے میں بیٹھ کر اپنے دل سے یوں باتیں کرتی تھی کہ —— سن تو سہی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اس معاملے میں اپنا راستہ الگ اختیار کروں؟ آخر اس سے مجھے حاصل کیا ہوگا۔ اگر اینکی" (رونالڈ) نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا ہے ——

نو خیز بیویاں جو ہولناک غلطیاں کرتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ ان کے اپنے من کی موج اور ترنگ بھی گویا کوئی قانون ہے، یقین کیجئے میں ان کے متعلق انتہائی طاقتور تقریر کر سکتی ہوں، کیونکہ اب میں پوری طرح ہوش مند ہوں۔ میری جب شادی ہوئی تھی تو میں اس وقت دنیا کی ایک بگڑی ہوئی چھوکری تھی۔ میری عمر اٹھارہ سے زیادہ نہیں تھی

[illegible] کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتی تھی۔ بس اتنا [illegible] محبت میں مبتلا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کھانا کس طرح [illegible] گھر کس طرح چلایا جاتا ہے اور نہ ایک ڈالر کی قدر و قیمت ہی [illegible] سا تصور بھی میرے ذہن میں تھا۔ ۶ مئی ١٩١٥ء

"آئیکی" (ریمنڈ) سے میری ملاقات ستمبر ١٩١٥ء میں ہوئی تھی [illegible] گریجویٹ ہو کر "ویسٹ پوائنٹ" سے نکلا تھا اور ٹیکساس [illegible] فورٹ سام ہوسٹن سے منسلک ہو گیا تھا۔ میرا گھرانہ "ڈینوَر" [illegible] میں رہتا تھا مگر جاڑوں کا موسم ہم لوگ "سان انٹونیو" میں گزارا [illegible] تھے۔ پہلی برف باری کے بعد والد نے اور والدہ نے اور میری بہنوں [illegible] سیر کو جانے کا پروگرام بنایا تو اس دن میں ان کے ساتھ جانا نہ [illegible] تھی کیونکہ اسی رات آٹھ بجے مجھ سے ملنے ایک بانکا جوان اور البیلا [illegible] والا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ شاید ہم لوگ وقت پر واپس آ کر گھر پر [illegible] سکیں، لیکن ظاہر ہے کہ کسی اجنبی نوجوان فوجی افسر کی ملاقات کی [illegible] زیادہ فکر ہی کیا ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میری سہیلیوں نے بڑی ہوا [illegible] تھی، اور کہا تھا کہ وہ بڑا ہی حسین ہو کر اجیل ہوا ایسا ہے ویسا ہے؟ [illegible] سیر کو چلی گئی۔ بس یہی نقطہ آغاز ہے —

دوسرے دن ہم سب لوگ مچھلی کے شکار پر چلے گئے۔ وہاں سے [illegible] آئے تو معلوم ہوا کہ "آئیکی" کے ہاں سے ایک نک کری پینڈ [illegible] ہے جس پر والد نے بڑی ہی خشکی کے ساتھ کہا کہ "یہ نوجوان تو بڑا [illegible] معلوم ہوتا ہے گویا ثابت قدمی کی لاٹ ہے" — اور [illegible] کا یہ خیال بالکل درست تھا۔

آنے والے ماہ فروری میں ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔ میکسیکو کی سرحد [illegible] دنوں کچھ گڑبڑ تھی اور یورپ کی جنگ بھی روز بروز ہم لوگوں سے [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا گھر والوں نے مختصر سی قسم کی منگنی پر رضا [illegible] اور یکم جولائی ١٩١٦ء کو ہماری شادی ہو گئی —

[illegible] نہیں کہہ سکتی کہ میں کتنی شدت کے ساتھ محبت میں مبتلا [illegible] جنون مجھے بس یہی تھا کہ اب جیسے بھی ہو کسی طرح اس شخص [illegible] شادی ہو جائے اور میں ایک فوجی افسر کی بیوی بن جاؤں [illegible] کے باوجود میری والدہ نے میری شادی کے کپڑے بھی بنوائے۔ شادی کا کیک بھی تیار کروایا اور وہ تمام چیزیں مہیا کیں جو واقعی شادی کے لوازمات شمار ہوتی ہیں۔

*ہمارے ہاں ایک دعوت منعقد ہوئی۔ دیوان خانے کو پھولوں سے خوب سجایا سنوارا گیا تھا اور پادری کے خطبے سے پیشتر بربط پر ہلکی موسیقی جاری تھی۔ بڑی سادگی تھی۔ بس گھرانے ہی کے لوگ تھے —

لیکن ہر چیز جیسے بڑی پیاری پیاری سی معلوم ہو رہی تھی۔

شادی تو بس زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے اس لئے مجھے توقع ہے کہ وہ لڑکیاں جو کسی سے وابستہ ہوں اور وہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے یہ تقریب ادا کرنے کی سوچ رہی ہوں، وہ ایک مرتبہ پھر سوچنے کی زحمت کریں گی کہ شادی درحقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے آپ اپنی ساری عمر یاد رکھتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسے ایک عمدہ اور حسین تقریب منایا جائے، جس قدر بھی عمدہ اور حسین بنانا آپ کے امکان میں ہو۔

آپ کے شوہر کے لئے یہ ساری عمر کی ایک یادگار چیز ہوتی ہے۔

"آئیکی" کا جی چاہتا تھا کہ شادی کا گلدستہ تک ہمیشہ باقی رہے اور تازہ رہے۔ ہم جب دو دن کا "ہنی مون" ایلڈوریڈو اسپرنگس میں منا کر واپس آئے تو اس نے گلدستے کو آتش بکس کے اندر سے نکال کر قرینے سے رکھا اور پھر اپنے کام پر چلا گیا۔ اس نے کہیں یہ پڑھا تھا کہ اگر پھولوں کو موم کے اندر ڈبو دیا جائے تو وہ ہمیشہ تازہ رہتے ہیں، چنانچہ اس نے موم بتی چھیل چھال کر تیار کی اور اس کی آزمائش کرنے لگا لیکن یا تو موم ٹھیک نہیں تھا یا شاید ضرورت سے زیادہ گرم ہو گیا تھا یا پھر کوئی اور بات ہو گی۔ بہرحال گلدستے نے اسے دغا دی —

ہمارا پہلا گھر فورٹ سام ہوسٹن میں دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا — ایک دیوان خانہ اور ایک خواب گاہ۔ باورچی خانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ کھانا دانا ہم لوگ بجلی کے چولہے اور ٹوسٹر پر پکاتے تھے۔ فرنیچر بھی بس قیامت ہی تھا — یعنی پرانی کرسیاں تھیں، جن کی نشستیں چمڑے کی تھیں۔ ایک الماری تھی، اور کتابوں کے شیلف لیکن "آئیکی" چونکہ اپنی رجمنٹ کا سب سے کم عمر افسر تھا لہٰذا ہمارے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ ہم اس سے زیادہ کے حق دار نہ تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک خوبصورت سا مشرقی قالین بھی تھا اور کرائے پر ہم نے ایک پیانو بھی

اپنے مشورے دینے کی کوشش کرتا۔ میں نے ان میں سے بعض مشورں پر واقعی عمل کیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں کیا۔ فورٹ سام ہوسٹن میں ایک بیوی نے کہا کہ "سنو پیاری! تمہاری زندگی بالکل فوجی ہو۔ تمہیں ساری عمر یاد ادھر سے ادھر منتقل ہی ہوتے رہنا ہو۔ لہٰذا عقلمندی کی بات یہ ہوگی کہ گھر کا سارا ساز و سامان ہر جگہ لئے لئے پھرنے کے بجائے دوں میں نہ پڑنا جہاں تم کسی شہر سے نکلو سب سامان فروخت کر دینا اور جب وہاں پہنچو جہاں مقیم ہونا ہو تو نئے اسباب سستے داموں سے اپنی پسند کے مطابق خرید لینا۔" چنانچہ میں نے اپنا تمام فرنیچر فروخت کر دیا۔ یہ فرنیچر کوئی نو سو ڈالر کا تھا۔ مگر میں نے اسے نناوے ہی ڈالر میں نکال دیا اور کیمپ میڈ چلی گئی۔

لیکن اب جو وہاں فرنیچر خریدنا چاہا تو معلوم ہوا کہ میں نے اپنا فرنیچر بیچ کر سخت حماقت کی۔ روپیوں کی قدر و قیمت کے بارے میں یہ بڑا ہی تلخ تجربہ تھا جو مجھے ہوا۔ لیکن مشورہ دینے والی بہن کا خیال بھی ایک چیز کے بارے میں بہرحال ٹھیک ہی تھا کہ جائداد منقولہ بہرحال جائداد منقولہ ہو اس سے زیادہ اسکی اور کوئی حیثیت نہیں۔

اگر آج میں کوئی اتنی نئی دلہن ہوتی تو اسی طرح انتہائی ضروری قسم کی اشیاء سمیٹ کر اپنی زندگی کا آغاز کرتی جس طرح میں نے کیمپ میڈ میں کیا تھا۔ یعنی باقی چیزوں کے بغیر ہی اس وقت تک رہتی جب تک ہاتھ میں اتنی رقم نہ آجاتی کہ زندگی بھر میں ساز و سامان خرید لینے کی ہمت کرتی۔

کیمپ میڈ پہنچ کر ہم لوگوں نے کوارٹر ماسٹر (جی آئی) کے یہاں سے پلنگ منگوا لئے، اور ایک ڈیسک بھی وہیں سے حاصل کیا جو بیٹھنے کے کام آتا تھا۔ پلنگ کے بکسوں کی میزیں بنائیں اور ان پر چھینٹ چڑھائی۔ یہ واقعی بڑی خوب صورت بن گئیں تھیں اور بہت بھانے کے کام کی ہو گئیں تھیں۔ شرق الہند کی کھجور جیسی بیل کی بنی ہوئی بڑی زبردست تین کرسیاں بھی منگوا لیں اگرچہ بہت زیادہ موزوں نہیں تھیں مگر آرام دہ ضرور تھیں۔ کبھی ان کو پھینکنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ برسوں کام آتی رہیں۔ جب ہم نے رہن سہن کے لئے اعلیٰ معیار قسم کا فرنیچر تیار کر لیا تب بھی وہ کرسیاں برآمدوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ مگر ننگا تھا مگر جو چیزیں بھی اس کے اندر تھیں ان کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ لہٰذا بقیہ چیزوں کے لئے ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ زمانے میں مجھے اٹھارہویں صدی کے انگلستانی وضع کی ایک بڑی خوبصورت سی الماری مل گئی۔ چیزیں رکھنے کے لئے ہمیں ایسی کسی چیز کی انتہا ضرورت تھی لیکن جب تک ہاتھ میں رقم نہ ہوئی ہم نے الماری کے بغیر ہی گذارا کیا۔ یہ الماری بڑی خوب صورت ہو اور اب تک میری خواب گاہ میں موجود ہے۔ پلنگ اچھے نہیں تھے لیکن جب "آئیکی" کی دادی نے عمدہ سا قدیم چرخی دار پلنگ بھیجا، جو آئیکی کے دادا کی یادگار تھا جب منتقل ہو کر کنساس آئے تھے تو بیل گاڑی پر لاد کر اسے ساتھ لائے تھے ـــــ تو ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ عارضی نظم کی چیزوں کی خاطر ہمیں قرض میں مبتلا نہ ہونا پڑا۔

اگر آج میں نئی دلہن ہوتی تو میرا نعرہ ہوتا "قطعی نقد" ـــــ کیونکہ بعض وقت کسی چیز کا خریدنا خواہ کتنی ہی آسانیاں اسکی ادائیگی میں کیوں میسر نہ آتی ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا فتنہ اور ایسا جال ہو جس میں ایک دلہن ہمیشہ گر سکتی ہو۔ میں نے بیشمار جوڑوں کو فکر و پریشانی میں مبتلا دیکھا ہے محض اس وجہ سے کہ ان کی تنخواہ ہر مہینے بقایا ادا کرنے سے پہلے ہی دوسری چیزوں کی نذر ہو جایا کرتی۔ "آئیکی" پہلی مرتبہ "چاندی کا کافی سٹ" جو لایا تو معلوم ہے کس طرح لایا؟ ایک ایک کر کے۔ اور تب کہیں سٹ پورا ہوا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کسی شخص نے یہ خیال نہ کیا کہ معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے ہم لوگ صرف اس لئے باعث شرم و ننگ تھے کہ ہمارے ہاں چائے دانی تو چاندی کی تھی مگر دودھ دان اور شکر دان چینی کے تھے۔

میرے خیال میں بے شمار نئے جوڑے شروع میں بڑا اونچا تصور باندھ لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوست احباب کی صرف اس لئے دعوت نہیں کرتے کہ وہ اس اعلیٰ پیمانے پر دعوت کا ساز و سامان نہیں رکھتے جس اعلیٰ پیمانہ پر ان کے والدین کر سکتے تھے۔ مگر یہ لوگ اتنا سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ماں باپ جس مقام اور جس طرز زندگی تک پہنچے ہیں وہ ایک دو سال میں نہیں بلکہ تیس تیس اور چالیس چالیس سال میں پہنچے ہیں۔

...پر بکھرے پڑے تھے۔ مگر جب یہ لوگ منٹ سے یا فوجی خدمت سے نکل جاتے ہیں تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان لوگوں کو اپنی چیزیں جہاں تہاں پھینکنے اور بکھیرنے ہی میں مزا آتا ہے۔

لیکن بیوی بھی اگر یہی کرے تو پھر اس سے زیادہ بیوقوفی اور کوئی نہیں۔ فوجی تربیت نے ممکن ہے آپ کے شوہر کو خود صاف ستھرا بنایا ہو مگر صفائی ستھرائی کے معاملے میں سند اور اختیار بیوی کو آپ ضرور بنا دیتی ہے۔

اگر میں نئی دلہن ہوتی تو اپنے وظائف عمل میں اسے لازمی طور پر داخل کر لیتی کہ جہاں تہاں بکھری ہوئی چیزوں کو چنتی پھروں۔ یہ بہت ہی معمولی اور چھوٹی سی بات ہے۔ دلیل بازیوں کی چیز بالکل نہیں، بالخصوص ایسی صورت میں جب آپ جیتنے والی نہ ہوں، لیکن دیکھئے اپنی چیزیں تو آپ کبھی، بھول کر بھی ادھر ادھر نہ بکھرا دیجئے۔ صرف اس رسیدیا کردہ اپنی چیزیں بکھیرا کرتا ہے۔

اگر آپ اپنے گھر کو بالکل ٹھیک ٹھاک رکھیں، اور ایسا کہ جس وقت اس کا جی چاہے اپنے دوست احباب کو لے کر بے تکلف آ دھمکے، تو پھر یہ سمجھ لیجئے کہ واقعی اس کا صلہ انعام بہت ہی شاندار ہے اگر کوئی شوہر اپنے گھر کے معاملہ میں فخر و ناز محسوس کرتا ہو تو پھر بیوی اس کے دوستوں کی دوستی میں بھی شریک ہے، اور اگر وہ اپنے دوستوں کو گھر نہ لا سکتا ہو تو پھر لازماً وہ اس عادت میں پڑ جائے گا کہ خود بھی گھر سے دور دور رہے۔ گھر کو ہر وقت درست رکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے ——— مجھے خود برسوں کے بعد اس کا تجربہ حاصل ہوا ہے کیونکہ آپ کی — اپنے تین چار دوستوں کو بالکل غیر متوقع طور پر لے کر آ پہنچتا تھا ——— مگر یہ بڑی ہی قابل قدر کوششیں ہیں اور کرنے کی۔

بیوی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بیش قیمت لباسوں میں ملبوس گڑیا بنی ہر وقت بیٹھی رہے۔ لیکن میری رائے میں ایک خوب صورت سی دلہن کے لئے یہ بھی بڑی ہولناک بات ہوگی کہ وہ "کولڈ کریم" لگائے میلے کچیلے کپڑوں میں بازو سے گود ہر لٹکتی پھرے کسی سکریٹری ... میں کب کسی نے یہ سنا ہے کہ اس نے کام کے لئے دفتر والا لباس ... پہنا ہو صرف اس لئے کہ دفتر میں تو اس کے آقا کے سوا اور بھلا کون اسے وہاں دیکھے گا۔

• آپ کا شوہر آپ کا آقا (Boss) ہے۔ اس بات کو کبھی فراموش نہ کیجئے۔

اُن نو خیز دلہنوں پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے جو یہ نہیں جانتیں یا جن کے گوشۂ خیال میں کہیں یہ تصور گھر بنائے رہتا ہے کہ "میں تو ہر لحظ طلاق حاصل کر سکتی ہوں" یا جن کو یہ فکر ہے کہ "گھریلو کام کاج میں کوئی مستقبل بھلا کہاں ہے ——— میں تو کوئی ملازمت کر لوں گی۔"

بچوں کے پوتڑے دھونا اور لانڈری کا حساب دیکھنا۔ بیزار کن بات ہو سکتی ہے، ایک ہی انداز کا اور کبھی ختم نہ ہونے والا گھریلو کام کاج بعض اوقات بڑا حقیر اور ہیچ پوچ سا معلوم ہوتا ہے، نہایت ہی لغو قسم کا چھوٹا کام معلوم ہوتا ہے، بالخصوص ایسے موقع پر تو اور بھی زیادہ عجیب آپ کا شوہر بڑی بڑی اہم خبروں سے بھرا پرا گھر آتا ہے اور کہتا ہے کہ "پیاری! اور تم نے دن بھر کیا کیا؟" جس کے جواب میں آپ صرف یہی کہہ سکتی ہیں کہ "جی ہاں میں نے تیل کا یا بجلی کا بقایا ادا کیا ———"

اور یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب کسی ملازمت کا خیال ہمیں بار بار آتا ہے، جس کی بدولت لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع پیدا ہوں، اور پھر فاضل پیسے بھی حاصل ہوں۔ لیکن ——— میں سچ کہتی ہوں زندگی کہیں زیادہ مسرت بخش ثابت ہوگی اگر آپ اس دلدل میں نہ پڑیں، اور جو کہیں پڑ گئیں تو پھر آپ اپنی ذات سے اور کچھ حاصل نہ کر سکیں گی بجز اس ملازمت کے جو آج سے بیس برس بعد کی چیز نہ ہے ——— یا بجز ایک ایسے گھر کے جس کو آپ اور آپ کا شوہر، دونوں اس قدر فراموش کر چکے ہوں کہ اب پہنچنے کا راستہ تک یاد نہیں۔

اگر میں آج نئی نویلی دلہن ہوتی تو وہی کرتی جو میں نے پہلے کیا ہے لگے تھم بٹاتی اور اپنے گھر کو اپنے شوہر کی مختصر آمدنی کے مطابق چلاتی اپنی رفاقت اور البطی تعمیر کرتی۔ اور اس بات پر پوری توجہ رکھتی کہ وہ ہر صبح جب گھر سے باہر جانے کے لئے تیار ہو تو گرما گرم ناشتہ اس کے لئے موجود رہے۔ اور پھر جو کچھ بھی بنیں ڈالے اور ... اس کے

ہیں ہوں۔ ان کے حصول میں معین و مددگار بننے کے لئے اپنی طرف
انی کوشش کرتی۔

میرا وظیفہ زندگی بھی رہا ہے، وظیفہ زندگی ہی نہیں مسرت
گی بھی ——— میں کہہ نہیں سکتی کہ اسی کے گھر کو مستحکم بنا
ائم و برقرار رکھنے کی جدوجہد اور اپنے خصوصی فرائض کی تکمیل میرے
لئے کتنی عجیب و غریب، کتنی مسرت بخش اور کس قدر مسرت و [illegible]
اور لطف و راحت سے معمور رہی ہے ——— بتیس سال
کی یہ پوری زندگی۔

(بشکریہ سائیکولوجی)

حافظ امرتسری

یہ پاپ کی بستی ہے

ہر صبح اندھیرا ہے، ہر شام اجالا ہے
جو روپ کا گماں گزرے، وہ رنگ نکالا ہے
ماحول معطر ہے، اک کیف ہے مستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی کے لوگوں کی ہر بات نرالی ہے
تہذیب و شرافت پر اک طنز ہے گالی ہے
من موہنی صورت ہے، آپ اپنے پہ ہنستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی کے باشندے بیباک ہیں ساحر بھی
فنکار بھی، تاجر بھی، راہی بھی، مسافر بھی
سمجھا نہ کوئی ان کو، کیا ان کی بھی ہستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی کے چہرے پر سج دھج ہے، ادائیں ہیں
عشوے ہیں بناوٹ کے، غمزے ہیں، جفائیں ہیں
بکھرا ہوا اس پر بھی شیرازۂ ہستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی میں جتنے ہیں، سائے ہی جوانکے ہیں
ہر صبح بھی پجاری ہیں، ہر گام پجاری ہیں
راتوں کی سیاہی میں اصنام پرستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی میں رونق ہے سو رنگ کے کھلونے
آراستہ ایواں ہیں، محروم اصولوں سے
اس بستی کی رفعت خود پستی کو ترستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی کی ہر عورت منت کشِ غازہ ہے
ملبوسِ طلائی میں ایک زندہ جنازہ ہے
ہر آنکھ جو اٹھتی ہے، آوازے ہی کستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

اس بستی میں طبلے کی دھن دِھن پہ چھنا چھن ہے
مضراب کے تاروں میں کچھ لے بھی ہے کچھ فن ہے
ہیں صاحبِ فن لیکن قسمت ہی میں پستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

پائل کی چھنک پا کر دل دیتے ہیں دل والے
ابرو کے اشارے پر کٹ مرتے ہیں بیچارے
ہر چیز یہاں مہنگی، عزت ہے کہ سستی ہے
——— یہ پاپ کی بستی ہے

منظر کلیمی •

ہم نہ کہتے تھے

ٹک جائیگا منزل سے مسلماں ہم نہ کہتے تھے
ملا بیٹھے گا ارشاداتِ قرآں ہم نہ کہتے تھے

نہ کلیاں مسکرائیں گی نہ ہونگے چاک دامانِ گل
گذر جائیگی یوں فصلِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

ں گی اہلِ باطل پر فدا آسانیاں لیکن
ت انجمن میں ہونگے اہلِ ایماں ہم نہ کہتے تھے

حرم محروم ہو جائیگا اپنے پاسبانوں سے
اذانوں سے لرز اٹھے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے

اں سنجی کے ہاتھوں قمریوں کو عندلیبوں کو
اِس آئے گا ماحولِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے

بہت دشوار ہو جائیگی راہی کے لئے منزل
کہ ہو جائے گا خود رہبر گریزاں ہم نہ کہتے تھے

کلیمی بزمِ عالم میں بہ فیضِ حضرتِ انساں
رہے گا رات دن انساں پریشاں ہم نہ کہتے تھے

محمد قاسم نوری •

مشورہ

انساں ہے تو عظمتِ انساں سے گزر جا
شبنم کی طرح روح گلستاں سے گزر جا

اندیشۂ ادراک و بصیرت بھی نہ کرائی
جینا ہے تو تقدیر کے زنداں سے گزر جا

اوہام کے جلوؤں پہ قناعت نہیں اچھی
لازم ہے حقائق کے شبستاں سے گزر جا

یہ دل نہیں تیرا نہ یہ جاں تیری رہے گی
اندازۂ احساسِ دل و جاں سے گزر جا

ہرخیز کہ بیکس ہے زلیخائے تمدن
یوسف کی طرح خلوتِ کنعاں سے گزر جا

کہتے ہیں جنوں جسکو وہ معراجِ خرد ہے
فرزانہ نہ بن ہوش کے ایواں سے گزر جا

تسلیم نہ کر گردشِ دوراں کی اطاعت
کوندے کی طرح وسعتِ دوراں سے گزر جا

تعارف و صدارت: [illegible]
احمد ندیم قاسمی

بابا نورؔ

"کہاں چلے بابا نور؟" ایک بچے نے پوچھا۔

"بس بھئی یہیں ذرا ڈاک خانہ تک۔" بابا نور بڑی ذمہ دارانہ سنجیدگی سے جواب دیکر آگے بڑھ گیا، اور سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے ادھر سے مولوی قدرت اللہ آنکلے تو بولے:

"ہنسو نہیں بچو! ایسی باتوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے پروا ہے۔"

بچے خاموش ہو گئے، اور جب مولوی قدرت اللہ چلے گئے تو وہ سب ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "ڈاک خانہ جا رہا ہے بابا نور" وہ ایک دوسرے کو ٹھوکے مارتے ہوئے کہنے لگے۔

بابا نور نے مسجد کی محراب کے پاس رک کر جوتے اتارے، ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب پر دونوں ہاتھ رکھے، پھر سر آگے بڑھا کر محراب کو ہونٹوں سے اور باری باری دونوں آنکھوں سے چوما، الٹے قدموں واپس ہو کر جوتے پہنے اور چلنے لگا۔

اور جب بابا نور نے محراب کو چوما تو بچے یوں چپ چاپ ادھر ادھر گلیوں میں کھسکنے لگے جیسے ایک دوسرے سے شرما رہے ہوں۔

بابا نور کا سارا لباس دھلے ہوئے سفید کھدر کا تھا۔ سر پر کھدر کی ٹوپی تھی جو بالوں کی سفیدی کی وجہ سے گردن تک چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سفید داڑھی کے بال تازہ تازہ کنگھی کی وجہ سے خاص ترتیب سے اس کے سینے پر پھیلے ہوئے تھے۔ گہرے رنگ میں زردی نمایاں تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ بالکل چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی طرح مصنوعی معلوم ہوتی تھیں۔ لباس، بالوں اور جلد کی اتنی بہت سی سفیدی میں یہ دو کالے بھونرا نقطے بہت اجنبی سے لگتے تھے لیکن یہی اجنبیت بابا نور کے چہرے پر بچپنے کی سی کیفیت طاری کئے رکھتی تھی۔ بابا نور کے کندھے پر سفید کھدر کا ایک رومال بھی پڑا رہتا تھا جو اس وقت چلنے کے بوجھ سے مسجد کی محراب تک تین چار بار کندھا بدل چکا تھا۔

"ڈاک خانے چلے بابا نور؟" ایک دکان کے دروازے پر بیٹھے ہوئے نوجوان دکاندار نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! جیتے رہو۔" بابا نور نے جواب دیا۔ اور رومال جھٹک کر دوسرے کندھے پر ڈال لیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا:

"آ ہا ہا بابا نور ڈاک خانے چلا۔"

"بھاگ جا یہاں سے۔" دکاندار نے بچے کو گھرکا۔

اور بابا نور جو کچھ دور نکل گیا تھا، پلٹ کر بولا:

"ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو؟ بچہ بھی کوئی ڈانٹنے کی چیز ہے ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔"

دور دور سے دوڑ کر آتے ہوئے بچے وہاں تک بے اختیار ہنسنے لگے اور بابا نور کے پیچھے ایک جلوس مرتب ہونے لگا تھا مگر آس پاس سے کچھ نوجوان لپک کر آئے اور بابا نور کے روکنے کے باوجود بچوں کو گلیوں میں بکھیر دیا۔

بابا نور اب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ پگڈنڈی مینڈ مینڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی، بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آجاتی۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں، ہاتھ اور چولے کے دامن بچاتا ہوا چلنے لگتا۔ اگر کسی راہی ..... کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آر پار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نور اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا اور جس جگہ سے پودے نے خم کھایا ہوتا اسے کچھ یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہے پھر وہ کھیت کی مینڈ پر پہنچ کر پچھلی کمی کو پورا کرنے کے لئے اور تیز چلنے لگتا۔ ہوا میں اس کی داڑھی کے بال بکھر بکھر کر سنورتے، اور رومال کندھے پر سے اڑ اڑ جاتا مگر اس کی رفتار میں صرف اسی وقت کمی آتی جب پگڈنڈی پھر سے گندم کے کھیت

ں اتر جاتی۔

بابا نور مینڈ مینڈ جا رہا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر تین کسان پگڈنڈی پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ایک کسان لڑکی گندم کے پودوں کے درمیان کچھ اس صفائی کے ساتھ درانتی سے گھاس کاٹتی پھر رہی تھی کہ مجال ہے جو گندم کے کسی پودے پر خراش بھی آ جائے۔ بابا نور ذرا سا رک کر لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ گھاس کی دستی کاٹ کر ہاتھ کو پیچھے لے جاتی۔ اور گھاس پیٹھ پر لٹکتی ہوئی گٹھڑی میں ڈال کر پھر درانتی چلانے لگتی۔

"بھئی کمال ہے۔" بابا نور نے دور ہی سے کسانوں کو مخاطب کیا۔ "لڑکی تو بالکل مداری ہے۔ اتنی بڑی درانتی اٹھا رکھی ہے۔ چپے چپے پر گندم کا پودا اگ رہا ہے، پر درانتی گھاس کاٹ لیتی ہے اور گندم کو چھوتی تک نہیں۔ یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"تو کس کی بیٹی ہے بٹیا؟" بابا نور نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے مسکرا کر بابا نور کو دیکھا، اور ادھر سے ایک کسان کی آواز آئی: "میری ہے بابا!"

"تیری ہے؟" بابا نور کسانوں کی طرف جانے لگا، "بڑی سیانی بیٹی ہے، بڑی اچھی کسان ہے۔ ایسا کمال تو میں نے تیری لڑکی میں دیکھا ہے، یا اپنے لڑکے میں۔ خدا حیاتی لمبی کرے۔"

"ڈاک خانے جاؤ گے بابا؟" لڑکی کے باپ نے پوچھا۔

"ہاں" بابا نور بولا، "خدا تیرا بھلا کرے۔ میں نے کہا پوچھ آؤں شاید کوئی چٹھی وٹھی آئی ہو۔"

تینوں کسان ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک طرف ہٹ کر پگڈنڈی چھوڑ دی اور بابا نور آگے بڑھ گیا۔

"کیوں پوچھا تم نے؟" ایک کسان نے لڑکی کے باپ سے پوچھا۔

"نہیں پوچھنا چاہیئے تھا۔" دوسرا بولا۔

اور لڑکی کا باپ جیسے سچ مچ شرمندہ ہو کر پگڈنڈی پر انگلی سے لکیریں کھینچنے لگا۔

ابھی بابا نور کھیت کے پرلے سرے پر پہنچا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی: "[illegible] بابا نور؟"

[illegible] اور گاؤں سے نکلنے کے بعد پہلی بار مسکرایا

"پانی لو گے بٹیا؟" پھر ذرا سا رک کر بولا "پیاس تو نہیں پر تو کیوں مسافر کو پیاسا، پانی پلا کر ثواب نہ کمائے۔ لا؟" رومال کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کر کے وہ بولا "پر دیکھ ذرا جلدی سے لا دے۔ ڈاک کا منشی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے، چلا نہ جائے۔"

لڑکی نے گھاس کی لٹکتی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اتار کر دہیں کھیت میں رکھی۔ پھر وہ دوڑ کر مینڈ پر اگی ہوئی ایک بیری کے پاس آئی۔ تنے کی اوٹ میں پڑے ہوئے برتن کو خوب چھلکایا۔ ایک لوٹا ٹھنڈے پانی کا کٹورا بھرا اور لپک کر بابا نور کے پاس جا پہنچی۔

بابا نور نے ایک ہی "ڈیک" میں سارا کٹورا پی کر رومال سے ہونٹ صاف کئے اور بولا،

"تیرا نصیبہ اس لسی کی طرح صاف ستھرا ہو بٹیا!" پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیا۔

مدرسے کے برآمدے میں ڈاک کا منشی بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنے رقانہ کے فارم پر کر رہا تھا اور دیہاتیوں کو نئی نئی معلومات سے مستفید کر رہا تھا۔ "لاہور پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، پر لوگ کہتے ہیں کہ اب کراچی اول نمبر پر ہے، اور میں کہتا ہوں کہ لاہور پر خواہ مارشل لا ایسی کتنی ہی آفتیں نازل ہوں پر لاہور آخر لاہور ہی رہے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" ایک دیہاتی بولا، "پر خدا کراچی کا بھی گلہ نہ کرائے۔ میرا سالا وہاں چپراسی کا کام کرتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو مجھے افسوس کے لئے کراچی جانا پڑا۔ بات یہ ہے منشی جی کہ ایک بار کراچی ضرور دیکھ لو چاہے وہاں رکشا ہی میں جُتنا پڑے۔ اتنی موٹر کاریں ہیں کہ ہمارے گاؤں میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ ایک ایک موٹر میں وہ وہ عورت ذات بیٹھی ہے کہ اللہ نے اور اللہ ہی لے۔ وہاں بخشش دینے لینے میں ہے نہ دینے میں۔ اللہ کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ ایک رکشے والا کہہ رہا تھا کہ جب سے پاکستان بنا ہے کراچی تو پیرس بنتا جا رہا ہے۔ اپنے تو وارے نیارے ہیں۔ دن بھر میں آٹھ، دس کی کوڑی ہو جاتی ہے۔"

"چھوڑو ان رکشا والوں کو۔" منشی تیوری چڑھا کر بولا "انسان ہو کر ڈھوروں کی طرح جُتے پھرتے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے منشی جی!" وہ بولا، [illegible]

[illegible] ہیں۔ وہ [illegible]

پھرتے ہیں۔ رنگ برنگ کی صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جگہ جگہ کی سیر ہوتی ہے۔ اور شام کو دس بارہ روپے سے جیب بھاری ہوئی ہوتی ہے؟"

"لعنت بھیجو! ایسی کمائی پر" منشی جی جھنجھلا کر بولے۔ "پچھ مہینے کے بعد خون بھی تو تھوکنے لگتے ہیں، تپ دق کے مریضوں میں اضافہ بھی تو ہو رہا ہے" اور منشی اداس نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں ایک نقطے پر جم کر رہ گئیں۔ اس کا رنگ فق ہو گیا، اور ہونٹوں کی ساری تری سوکھ کر پپڑیاں بن گئیں۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولا:

"بابا نور آ رہا ہے!"

سب لوگوں کے سر ایک دم جیسے ایک مشترکہ جھٹکے سے مڑے اور سب کے چہرے کمھلا کر رہ گئے۔

سفید براق بابا نور سیدھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آ رہا تھا، اور لوگ سہمے جا رہے تھے۔ ایک دو تو جیسے گھبرا کر اٹھ بھی کھڑے ہوئے۔ بابا نور ابھی فاصلے پر ہی تھا جب منشی ضبط نہ کر سکا اور بولا:—

"آؤ بابا نور آؤ!"

برآمدے کے پاس پہنچ کر بابا نور نے کہا:—

"ڈاک آ گئی منشی جی؟"

"آ گئی بابا!" منشی نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی؟" بابا نور نے پوچھا۔

"نہیں بابا!" منشی بولا۔

"بڑی کھلنڈری طبیعت کا ہے" بابا نور بولا۔ "چٹھی ہی نہیں لکھتا" — اور پھر بابا نور نے رومال کو ایک کندھے پر سے اتار کر جھٹکا اور اسے دوسرے کندھے پر رکھ کر چپ چاپ واپس چلا گیا، اور جب وہ پگڈنڈی پر وہ ایک سفید کا کالا سا بن کر رہ گیا، تو منشی بولا:

یارو کوئی بتاؤ میں کیا کروں؟ آج دو برس سے بابا نور [illegible] آتا ہے اور یہی سوال پوچھتا ہے۔ اور آج تو جی میں آیا تھا کہ سچ سچ جواب دے دوں۔ [illegible] کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ [illegible] ڈسٹرکٹ [illegible] کی [illegible] وہ چٹھی میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں لکھا تھا کہ تمہارا بیٹا ... کے جتھے کے ساتھ ... لڑتے لڑتے ... میں شہید ہو گیا ہے۔ جب سے وہ پاگل سا ہو گیا ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن بیٹے کی چٹھی لینے آ نکلتا ہے۔ پر مجھے خدا کی قسم ہے دوستو کہ اگر آج کے بعد وہ پھر بھی میرے پاس یہی پوچھنے آیا تو مجھے بھی پاگل کر جائیگا"

(بشکریہ "نقوش")

انصار الہ آبادی

ہر ایک غم ہے محبت میں انبساط افزوں
ہزار ہوش تصدق بپائے نازِ جنوں

تمہارے غم سے تمہارے کرم کا صدقہ ہوا
کہو تو سوز بنوں، اور کہو تو ساز بنوں

بہت قریب سے آواز دے رہا ہے جنوں
حجابِ دوست کہاں تو ہے اور کہاں میں ہوں

جمالِ لالہ و گل بھی فریبِ کم نظری
تم ہی بتاؤ کہ آخر تمہیں کہاں ڈھونڈوں

رہِ وفا میں کوئی اور ساتھ کیا دیتا
جنوں کا بھی نہ گذر ہو سکا بجز جنوں

حجابِ ناز کو جنبش نگاہ کیا دے گی
ابھی تو آپ ہی میں پردہ ہائے راز میں ہوں

حدودِ موسمِ گل سے نکل نہیں سکتا
ہر ایک سانس ہے منت کشِ طلسمِ جنوں

تم اپنی نیم نگاہی کو یوں ہی رہنے دو
اسی خلش سے تو بے زندگی میں زندہ ہوں

خدا کے واسطے یوں ہی مجھے تڑپنے دے
بڑے مزے کا ہوا ہے دل مذاقِ سوزِ دروں

متاعِ کون و مکاں سے کہیں زیادہ ہے
وہ خوش نصیب کہ جسکو نصیب ہو نہ سکوں

کہاں تک آہ سے دامن بچاؤں اے انصارؔ
ہر ایک اشک ہے آئینہ دارِ سوزِ دروں

شبیر سعیدی

تباہیوں پر ہماری آخر وہ مسکراتے رہیں گے کبتک
ہم اپنی بربادیوں پہ آنسو یونہی بہاتے رہیں گے کبتک

خرد پہ اپنی وہ ناز کرلیں مگر ذرا مجھ کو یہ بتا دیں
جنوں کے ہاتھوں سے اپنا دامن وہ اب بچاتے رہیں گے کبتک

مجھے یہ اہلِ خرد بتا دیں تو ان سے اک بات میں یہ پوچھوں
قفس کے شام و سحر چمن میں بھی یاد آتے رہیں گے کبتک

پہنچ ہی جائیں گے اپنی منزل پہ ٹھوکریں کھا کے اک نہ اک دن
وفا کے پیکر رہِ محبت میں ڈگمگاتے رہیں گے کبتک

تمہارے وعدوں میں جان کیا ہے تمہیں ذرا سوچکر بتاؤ
یہ غم کے مارے فریبِ فردا مزید کھاتے رہیں گے کبتک

یہ غم کے مارے جو موت کی کش مکش میں اب تک بھی مبتلا ہیں
کوئی بتائے کہ زندگانی کے گیت گاتے رہیں گے کبتک

شفیق کی حیثیت سے کبتک وہ آئیں گے سامنے ہمارے
خلوص بنکر دل و نظر میں وہ اب سماتے رہیں گے کبتک

کسی کو گستاخ کہہ رہے ہیں کسی کو باغی سمجھ رہے ہیں
میں سوچتا ہوں نئے نئے اب وہ گل کھلاتے رہیں گے کبتک

زباں پہ مہرِ سکوت ہم نے اگرچہ کرلی ہے ثبت شبیرؔ
مگر ہمیں اب یہ دیکھنا ہے وہ ظلم ڈھاتے رہیں گے کبتک

محمد حنیف۔ بی۔ اے

زرتاج

دکن کی راج دہانی گلبرگہ کے تخت پر اٹھارہ سالہ نوجوان سلطان
ث الدین جلوہ افروز تھا، جس کے دربار میں سینکڑوں اعیان و عمائدین
اپنے مراتب کے لحاظ سے متمکن تھے۔ اس کے جلو میں ترکی نژاد غلام
ن کھڑا تھا جس کے چہرے پر بے اطمینانی اور بددلی کے آثار ہویدا تھے
سلطان نے غلام کے چہرے کو بھانپ کر اس کی دلی کیفیت دریافت
چاہی ۔ نعمان! عجب ہے ما بدولت نے عنان سلطنت ہاتھ میں لی ہے
رعایا اور ارکین نہایت خوش و خرم نظر آتے ہیں، مگر تمہارے چہرے
مایوسی اور اداسی ٹپک رہی ہے۔

۔ ولی نعمت! غلاموں کو کسی حال میں بھی اطمینان قلب نصیب
نہیں ہو سکتا، لیکن پرانے خدمت گار کی واجبی قدر نہ کی جائے
تو اسے رنج ضرور ہوتا ہے۔

لان ۔ اگر آقا منصف مزاج ہو تو غلاموں کے [illegible] ہونے کا کوئی موقعہ
نہیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ انہیں امراء اور شہزادگان کے دوش
بدوش کھڑا کیا جائے۔

۔ مگر وہ یہ توقع تو کر سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک
روا رکھا جائے۔

ان ۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک غلام اور آزاد انسان کو ایک ہی صف
میں نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔

۔ عالی جاہ! یہ فلسفہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اسلام نے غلاموں
کو بادشاہی بھی بخشی ہے، اور یہ ــــــ آپ پرانے خدمت گزار
کو معمولی درباری کی حیثیت بھی مرحمت نہیں فرمانا چاہتے۔

ن ۔ نعمان! تم اس حقیقت کو فی الحال نہیں سمجھ سکتے۔ ما بدولت تم
کو پھر کسی وقت سمجھانے کی کوشش کریں گے۔

نعمان غلام تھا، لیکن شہنشاہ مرحوم سلطان محمود
کی خصوصی توجہات سے انعام و اکرام پا کر مالا مال ہو گیا تھا۔ اس کے

دماغ میں آزادی کے علاوہ عہدہ و منصب کی ہوا بھی بھری ہوئی تھی۔ اور
غیاث الدین کے بادشاہ ہونے پر اُسے یہ خیال ہو گیا تھا کہ جس طرح دوسرے
افراد سے حُسن سلوک روا رکھا گیا ہے ، اُسے بھی خاص وقعت کی نظر سے
دیکھا جائے گا۔

لیکن چونکہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس لئے اس کے دل میں سلطان
غیاث الدین کی طرف سے گرہ پڑ گئی، اور وہ کسی نہ کسی طرح سلطان کو
معزول کر کے اپنی تحقیر کا بدلہ لینے کے منصوبے سوچنے لگا۔ اس کی ایک
لڑکی تھی جو حسن و جمال میں لاثانی تھی، اور علم موسیقی میں کافی دسترس رکھتی
تھی۔ سلطان اس کے حسن کا شہرہ سن کر نادیدہ عاشق ہو گیا۔ اس کے دل
میں جوانی کی امنگیں انگڑائیاں لینے لگیں، اور وہ لڑکی کو دیکھنے کے لئے بیحد
مشتاق ہو گیا۔ ایک دن غیاث الدین اپنے چھوٹے بھائی شمس الدین کے
ہمراہ شاہی باغ میں مصروف سیر و تفریح تھا کہ ایک چودہ سالہ خوبصورت
لڑکی کا ادھر سے گزر ہوا۔ سلطان نے فوراً شمس الدین کو بھیجا کہ جا کر لڑکی
کو بلا لائے۔ جب وہ اپنے سادہ لباس میں سلطان کے حضور میں آئی تو
دونوں بھائی لڑکی کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوئے، لیکن ایک نے
دوسرے پر اپنے دلی جذبات ظاہر نہ ہونے دیئے۔ لڑکی کچھ عرصہ کے لئے
نہایت خوشی کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ سلطان نے کچھ دیر
سوچنے کے بعد سوال کیا۔ "تم کون ہو اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو؟"
لڑکی نے کہا "میرا نام "زرتاج" ہے اور حضور کے خانہ زاد نعمان کی اکلوتی بیٹی
ہوں"۔

اس کے بعد چند معمولی سوال و جواب ہوئے اور مختصر سی بات
چیت کے بعد کورنش بجا لا کر وہاں سے چلی گئی۔ زرتاج کے جانے کے بعد
سلطان غیاث الدین نے اپنے چھوٹے بھائی شمس الدین سے پوچھا کہ "اس
لڑکی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

شمس الدین نے جواب دیا کہ [illegible]

کچھ نثار کرنے کو تیار ہوں۔" اس پر سلطان نے ہنس کر کہا "تو بے وقوف لڑکے غلام آزادی تخت کے قابل نہیں۔" شہزادہ نے جواب دیا "اس وقت ایک غلام زادی کو دکن کی سلطنت کے شہنشاہ کی والدہ محترمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔" سلطان نے تدبر و تامل کے بعد کہا "یہ کوئی اچھی مثال نہیں خیر اس قسم کی باتیں مت کرو۔ اور نعمان کی بیٹی کے متعلق ہر قسم کے خیالات اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔ اور آج سے اس لڑکی کو حرم شاہی میں داخل سمجھو۔ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔ ہاں لیکن جیسی دلچسپی بادشاہ لونڈیوں سے رکھتے ہیں۔" شمس الدین خاموش تو ہو گیا۔ لیکن اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ ایسی خوب صورت لڑکی کو حرم میں لونڈی کی حیثیت سے داخل نہیں ہونے دیگا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ نعمان کے پاس گیا اور "زرتاج" کی تعریفیں کرنے لگا۔ نعمان جو پہلے ہی سلطنت کے خلاف تھا شمس الدین کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اور اسے اپنا آلۂ کار بنانے کی فکر کرنے لگا

"لیکن شہزادہ صاحب! آپ کا یہاں آنا جانا سلطان پر شاق گذریگا۔ وہ پہلے ہی بندہ و آقا کے امتیاز میں الجھے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ میرے ساتھ آپ کے بھی برخلاف ہو جائیں گے۔"

شہزادہ :- میں آزاد ہوں اور مجھے حق حاصل ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی بناء پر جہاں چاہوں شادی کروں میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ شادی "زرتاج" سے کروں گا۔ بشرطیکہ تم منظور کر لو۔

نعمان :- ———— میں آپ کے ارادہ کو عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ اگر آپ "زرتاج" کی رضامندی حاصل کر لیں تو مجھے بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن یہ رشتہ آپ کے لئے باعث ننگ و عار ہوگا۔

شہزادے نے وعدہ کیا کہ میں تمہاری آزادی کی ضمانت لیتا ہوں ———— میرا بھائی میری اس درخواست کو کبھی رد نہ کریگا۔

نعمان کے سینے میں انتقام کی جو آگ سلگ رہی تھی وہ اب شعلہ بن کر اٹھی اور شمس الدین کو اپنا طرف دار پاکر غیاث الدین کے تخت و تاج کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اس نے شمس الدین کو زرتاج سے ملنے کا موقع دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوسکے۔ ایک دن سلطان نے نعمان کو اپنے محل میں بلایا

"نعمان! ہم نے تمہارے متعلق بہت غور و خوض کیا ہے۔ واقعی تمہاری خدمات کا صلہ نہ دینے میں ہم سے سخت کوتاہی ہوئی ہے۔ ہم تمہیں آزاد کر دینا چاہتے ہیں۔"

نعمان نے دست ادب جوڑ کر گزارش کی "میں حضور والا کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔" سلطان نے کہا "مگر تمہیں اس آزادی کا کچھ فدیہ دینا پڑیگا۔ میں صرف ایک گوہر چاہتا ہوں۔"

نعمان نے عرض کی "اگر میرے پاس ہو تو ... ظل سبحانی کو فقط نام لینے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے گی۔" سلطان نے بے تکلف کہا "تمہاری دختر نیک اختر "زرتاج"۔"

نعمان نے سوال کیا "غلام اس عزت افزائی کا شکر گذار ہے لیکن کیا شادی حضور کے شایان شان ہوگی؟" ———— "یقیناً نہیں لیکن با بد دلت شادی کے لئے نہیں کہتے اگر تمہیں آزادی عطا کی جائے تو "زرتاج" خاص شرائط کے ماتحت محل سرا میں داخل کی جائے گی۔"

سلطان کی گفتگو پر نعمان چڑ گیا۔ اور کہنے لگا "شہنشاہ سلامت میں آپ کا خانہ زاد غلام ہوں ...... مگر میں ایسی آزادی کو پائے استحقار سے ٹھکراتا ہوں۔ زرتاج اس قسم کے تعلقات کے مقابلہ میں غیاث الدین سے بھی زیادہ طاقت ور شہنشاہوں کی خواہشات کو نظر تحقیر سے دیکھے گی۔"

اس اثناء میں زرتاج اور شہزادہ شمس الدین بے محابا ملتے رہے نعمان اپنی بیٹی کے ملکہ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس کا ارادہ تھا کہ کسی طرح شمس الدین کو تخت پر بٹھائے۔ نعمان کی طرح چند امراء اور بھی تھے جو سلطان غیاث الدین سے ناراض تھے۔ اس نے ان سے ساز باز کی اور اپنے ساتھ شمس الدین کو بھی ملا لیا۔ سلطان مطمئن تھا اور وہ یہ بھول گیا تھا کہ نعمان خوفناک منصوبے بنا رہا ہے۔ کچھ دن گزر جانے کے بعد نعمان نے سب انتظامات درست کر کے ایک دن سلطان کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ سلطان نے زرتاج کے تصور میں اس دعوت کو بطیب خاطر قبول کر لیا اور چند امراء کو جن کی تعداد ۲۴ تھی ہمراہ لیکر شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نعمان کے مکان پر پہنچ گیا۔

دعوت نہایت پر تکلف تھی جب شراب کا دور شروع ہوا تو نعمان نے اپنے خواجہ سرا "تراب" نامی کو سلطان کا ساقی مقرر کر کے یہ

ہدایت کردی کہ سلطان کو خاص قسم کی نشہ آور شراب پلائے اور خود سلطان سے یہ درخواست کی کہ وہ امراء کو علیحدہ کردے۔ سلطان نے یہ سمجھ کر کہ اب "زرتاج" سے ملاقات کا موقع بہم پہنچایا جا رہا ہے امراء کو علیحدگی کا حکم دیدیا۔ نعمان تھوڑے عرصہ بعد ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے واپس آیا اور سلطان پر حملہ کردیا۔ سلطان نے نشہ کی حالت میں اپنی جان بچانے کی کوشش کی لیکن نعمان کے خواجہ سرا نے اُسے بالوں سے دبوچ کر دے ٹپکا اور دونوں نے نوک خنجر سے سلطان کی آنکھیں نکالدیں۔ پھر اسے دوسرے کمرے میں بند کرکے جملہ امراء کو ایک ایک کرکے تہ تیغ کردیا، اور لاشیں بھیڑیوں کے لئے جنگل میں پھکوادیں۔ سلطان کو ساغر کے قلعہ میں بند کردیا۔ لیکن جب اس واقعہ کا علم زرتاج کو ہوا تو وہ کانپ اٹھی اور اس نے عہد کرلیا کہ آئندہ اپنے باپ سے کلام نہ کریگی۔ امراء جو سلطان غیاث الدین سے بدظن تھے نعمان سے آملے اور اسے فاتح سمجھ کر اسکی پناہ ڈھونڈھنے لگے۔ ان کی مدد سے نعمان نے سولہ سالہ شہزادہ شمس الدین کو تخت پر بٹھادیا۔ شمس الدین کی والدہ "مخدومہ جہاں" اور نعمان کے درمیان ساز باز ہوئی اور زرتاج کا رشتہ پکاّ ہوگیا۔ لیکن جب شمس الدین "زرتاج" کے پاس گیا، اور بھائی کے افسوسناک سانحہ کا ذکر کرنے کے بعد اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا تو اس شریف خاتون نے جواب دیا "افسوس ہے تمہاری سلطنت کی باگ ڈور شیطانی ہاتھوں میں ہے۔ آنے والی نسلیں ایسے تخت کو جس کے راستے میں خون کے چھینٹے پڑے ہوں کبھی مستحسن نظروں سے نہیں دیکھیں گی۔" شمس الدین نے کہا "زرتاج! جو کچھ ہوا وہ واقعی قابل ملامت ہے لیکن چونکہ ملک کے قانون اور رواج کے مطابق نابینا کو بادشاہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور سلطنت کا ولی عہد میں تھا اس لئے مجھے تخت سنبھالنا پڑا۔"

زرتاج :- میں ایسے شخص سے جس نے ظلم و جبر سے طاقت اور عزت حاصل کی ہو شادی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔

شمس الدین :- کیا میں ایسا ہی گنہگار ہوں کہ تمہاری محبت سے محروم کیا جاؤں؟

زرتاج :- محبت سے تو نہیں بلکہ شادی سے، میرے اور تمہارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی ہے۔

شمس الدین :- اگر تم تخت و تاج کی محبت کے راستے میں کانٹا سمجھتی

ہو تو میں سلطنت کو خیرباد کہنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔

(۳)

حالات نے رنگ بدلا۔ امراء اور عوام نعمان کی طاقت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر خائف ہوئے اور اس کے خلاف منصوبے سوچنے لگے۔ فیروز خاں اور نواز خاں جو رشتے میں معزول سلطان غیاث الدین کے چچا تھے، ساغر کے قلعہ میں پہنچے اور وہاں سے لشکر جرار لیکر گلبرگہ پر چڑھ آئے، لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور انہیں شکست ہوئی۔ کچھ دن ٹھہر کر انھوں نے سلطان شمس الدین سے معافی حاصل کرلی اور گلبرگہ میں چلے آئے۔ اب اندر اندر سازشیں ہونے لگیں۔ امراء محل سرا میں فوجیوں کو جمع کرکے شمس الدین اور نعمان کو قید کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ فیروز خاں نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ تمام انتظامات مکمل کرلینے کے بعد معزول و نابینا سلطان کو ساغر کے قلعہ سے طلب کیا گیا۔ فیروز خاں نے بھتیجے کو مخاطب کرکے کہا: "بیٹا! ملک کا قانون تمہیں تخت نہیں دلاسکتا، اس لئے کہ تم نابینا ہو، لیکن تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

غیاث الدین :- (مایوسی و بے بسی کے لہجہ میں) میں اب تخت لیکر کروں گا ہی کیا؟ مجھے اسکی ضرورت نہیں۔ میری دو خواہشیں ہیں۔

اوّل تو نعمان کو میرے حوالے کردیا جائے تاکہ میں اس سے انتقام لے سکوں۔

دوسرے یہ کہ مجھے حج بیت اللہ کے لئے بھیجدیا جائے۔

فیروز خاں نے دونوں خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کرلیا۔ نعمان کو اس کے سامنے پابجولاں لاکر کھڑا کردیا۔ غیاث الدین نے برہنہ تلوار تول کر کہا:

"تیرے سامنے کون کھڑا ہے؟" نعمان خاموش تھا۔ "بول اس غدار کو کیا سزا دینی چاہئے جو اپنے آقا سے دغا کرے؟"

نعمان چپ چاپ کھڑا رہا۔ غیاث الدین نے کہا "تم جانتا ہوں تم نے میری آنکھیں نکال کر قسمت کی بخشی ہوئی روشنی چھین لی، دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی۔ تمہارا سر قلم ہونے [illegible] کیا تم مرنے کے لئے تیار ہو؟"

سابق سلطان نے نعمان کے شانے پر بایاں ہاتھ رکھ کر اور دائیں ہاتھ سے اس زور سے اس کی گردن پر تلوار ماری کہ اس کا سر کٹ کر سلطان کے قدموں پر آ پڑا۔ دوسرے دن زرتاج سلطان فیروز خاں کی خدمت میں پہنچی۔ اور عرض کی: "عالی جاہ! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رحم عادل شہنشاہوں کے تاج کا بہترین ہیرا ہوتا ہے......!"

سلطان: "خوب صورت لڑکی! تم کس کے لئے رحم کی درخواست لیکر آئی ہو ۔؟"

زرتاج: معزول سلطان شمس الدین کے لئے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا براہِ راست اس جرم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ شمس الدین حکومت نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اگر اس نے تخت و تاج سے انکار کیا تو اس کی زندگی کی خیر نہیں۔ ہم نے آپس میں ایک عہد کیا تھا۔ میں نے اس سے بحیثیت سلطان شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیوں کہ میں اسے غاصب سمجھتی تھی۔ لیکن اب میرے اور اس کے درمیان جو دوری تھی، وہ ختم ہو چکی ہے۔

سلطان: لڑکی! تمہاری درخواست منظور کی جاتی ہے اسے تمہاری وجہ سے رہائی مل رہی ہے۔ چونکہ اس نے تخت پر بیٹھ کر کوئی ظلم نہیں کیا اور جتنے دن بھی حکومت کی، ہی سلامت روی میں گزارے ہیں۔ اس لئے ہم اسے دولت آباد کا حاکم مقرر کرتے ہیں اور یہ اطلاع اسے تم ہی پہنچاؤ گی۔ زرتاج فرطِ خوشی سے اظہارِ تشکر کے لئے سلطان کے قدموں میں گر پڑی جس نے اٹھا کر مزید شفقت و مہربانی کا وعدہ فرمایا۔

زرتاج سلطان سے رخصت ہو کر شمس الدین کے قید خانہ [illegible] گئی اور جاتے ہی اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پکاری ——
[illegible] شمس الدین نے کہا: "اللہ اکبر! یہ زرتاج کی آواز ہے۔ کیا تم [illegible] سے ملاقات کے لئے آئی ہو؟ بہت خوب!" زرتاج نے [illegible] تمہاری رہائی کا پروانہ لیکر آئی ہوں۔ تمہیں یہ خیال [illegible] سے محبت نہیں ہے لیکن یہ تمہاری غلطی تھی۔ شمس! لیکن [illegible] نہیں آتا تھا کہ سلطنت میں میری قسمت نے دوسرا پلڑا بھی کھلایا ہو۔ فرطِ خوشی سے دیوانہ وار بولا "زرتاج! جو کچھ تم کہہ رہی ہو کیا درست ہے؟"

زرتاج: حرف بحرف درست ہے۔ مجھے تم سے محبت تھی اور تم لیکن تمہاری بادشاہی سے نفرت تھی، کیونکہ میرا ضمیر... اس چیز کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ سلطان نے تمہاری رہائی کا حکم دیدیا ہے اور ساتھ ہی تمہیں دولت آباد کا حاکم بنانے کا حکم صادر کر دیا ہے۔ اگر تم غلام زادی کو کسی قابل سمجھو تو وہ اپنا عہد پورا کرنے کے لئے حاضر ہے۔"

شمس الدین نے اپنی باہیں زرتاج کے گلے میں ڈال دیں، اور دونوں سلطان فیروز خاں کے محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

(بشکریہ "جنگ")

منیر غازی پوری •

○

پ فرقت سے میں تشنہ لبی محسوس کرتا ہوں
اب دنیائے دل میں آگ سی محسوس کرتا ہوں

بہارِ نو بہ نوہے آشیاں ہے' بادِ باراں ہے
نگاہِ یار اک تیری کمی محسوس کرتا ہوں

ہل جانے کی صورت گر نکالیں پھر بھی اے ہمدم!
ہانِ عشق میں بے چارگی محسوس کرتا ہوں

یہ منزل کونسی منزل ہے جس منزل کی راہوں میں
دائے عشق ہو کر سروری محسوس کرتا ہوں

محبت میں یہ عالم ہے جمالِ شاہدِ مقصد
زمیں سے آسماں تک روشنی محسوس کرتا ہوں

تجھے حسرت سے تکتا اس لئے ہوں ساقیٔ محفل!
تری تصویر میں اک دلکشی محسوس کرتا ہوں

نہ جانے حشر کیا ہوگا منیرؔ آشفتہ سر اپنا
کسک اک اور میں دل میں نئی محسوس کرتا ہوں

سلمٰہ زبیری •

خواب ہے سب.......

زندگی کچھ بھی نہیں خواب حقیقت کے سوا
چند امیدوں کی سجائی ہوئی جنت کے سوا

بھولنے والے تجھے یاد نہیں ہوں نہ سہی....
مجھ کو تو یاد نہیں کچھ تیری صحبت کے سوا

میری بے داغ محبت ہے وہ ہیرا اے دوست!
جسکی قیمت نہیں کچھ تیری محبت کے سوا

اعتبار اب بھی ہے اتنا کہ میری نظروں میں
خواب ہیں سب تیرے وعدوں کی حقیقت کے سوا

وہ ضرور آئیگا اسکا وہ ضرور آئے گا
جس نے سب کچھ مجھے بخشا ہے محبت کے سوا

چند خطوط

* انور صدیقی
* افتخار اعظمی
* ضیاء احمد (ایم۔اے)

برادرم صدیقی صاحب کا خط اُس وقت ملا تھا جبکہ نومبر کے شمارے میں اشاعت ممکن نہ تھی، پھر دسمبر کے شمارے میں بھی خطوط شامل نہیں کئے جا سکے — اور "رزم انتخاب نمبر" کے موقع پر بھی کئی چیزیں روکنا پڑیں — "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا" (ادارہ)

محترم بیگ صاحب! ارمغانِ شوق

"مشیر" کا نیا شمارہ آج ملا۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ "مشیر" کی موجودہ روش (Policy) پر کچھ اظہارِ خیال کروں، مگر حوادثِ دوران کے قدموں کی آہٹ برابر سنائی دیتی رہی اور میں انھیں آہٹوں کو اپنے احساس سے ہم آہنگ کرتا رہا۔ آج وہ آہٹیں کافی تیز ہو چکی ہیں — میں جی کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ "مشیر" کی موجودہ روش پر اظہارِ خیال کروں۔ یہ جرأت اس لئے اور ہو رہی ہے کہ دوسرے فنکار بھی اسی قسم کے خطوط برابر لکھ رہے ہیں اور وہ چھپ بھی رہے ہیں۔ ان خطوط کو دیکھ کر میرے اندر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ جاگ اٹھا کہ پاکستانی فنکاروں کے درمیان بھی ایک داخلی کشمکش چل رہی ہے۔ کم از کم میں نے کوثر نیازی اور رحمٰن شاد کے خطوط سے تو یہی نتیجہ نکالا ہے۔ رحمٰن شاد پر کوثر نیازی نے ترقی پسندیت کا الزام عائد کیا۔ رحمٰن شاد نے انھیں ترقی پسندی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا قرار دیا۔ جہاں تک رحمٰن شاد کے لہجے اور آہنگ کا تعلق ہے وہ ترقی پسند ادب سے ضرور متاثر ہیں، مگر ان کی فکر کو کسی صورت میں بھی ترقی پسند نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ رحمٰن شاد کی بعض بعض نظموں میں ساحر اور کیفی اعظمی کی نظموں کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی تقلید ادبی موت کے مترادف ہے۔ اگر وہ ان شعراء کے مطالعے میں علیحدگی (Detachment) کا احساس رکھا کریں تو بڑا اچھا ہو ورنہ وہ اپنی گرہ کی پونجی بھی کھو بیٹھیں گے۔ فن و فارم کی جدت بہت ضروری ہے، مگر یہ جدت ایسی نہ ہو جو ہمیں اپنی پچھلی رفیع اور برگزیدہ ادبی روایات سے علیحدہ کر دے۔ ایسے ادبی تجربات ادھ کچرے اور خام ہوں گے، ان میں اعتدال اور توازن کا نام تک نہ ہوگا، اور جب ان میں اعتدال اور توازن نہ ہوگا تو ان کا دامن ادب سے کسی طرح بھی نہ بندھ سکے گا۔ ادب میں نئے تجربات سے پہلے کلاسیکی ادب کا بھرپور اور واضح تصور قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ادبی تسلسل کی کڑیاں ٹوٹ جائیں گی اور ہمارا ادب سادی ([illegible]) بن کر رہ جائیگا۔ رحمٰن شاد کو ادبی تسلسل اور اعتدال کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ انہیں موضوع میں بھی تنوع پیدا کرنا چاہئے۔ ان کی اکثر نظموں کی ایک ہی منطق ہوتی ہے اور ایک ہی تسلسل — سیاست ان کا خاص موضوع ہے۔ شاعر کو چاہئے کہ وہ کائنات کے دل کی ایک ایک دھڑکن کو اپنے فن میں سمو لے اور اپنے جذبات کی آنچ دیکر بنی نوع انسان کے دل سے ہم آہنگ کر دے۔ اس وقت اس کا غم انسان کا غم ہو جائیگا اور اس کا افسانہ دوسروں کا افسانہ بن جائیگا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بنتی گئیں آہنگِ وقت
میرا افسانہ حدیثِ دیگراں بنتا گیا

کوئی جمالی بات نہیں کر رہا ہوں۔ دنیا کا ہر بڑا شاعر جس کے سر پر روایت
ج ہے یہی کرتا آیا ہو۔ اسی طرح ایک آفاق گیر فن پیدا ہوتا ہو اور اسی
ئے نئے تجربوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ فن شعر میں اسی سے حدوث
انقلاب آیا ہے، اور اسی سے بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے۔ ان چیزوں کا
ے تمام دوستوں کو خیال رکھنا چاہئے، اس لئے کہ وہ اسی معیاری فن
لیق کے لئے "پرورشِ لوح و قلم" کر رہے ہیں۔ رحمٰن شاد کو جذبات سے
ت کریعنی ([illegible]) ہو کر ان حقائق پر غور کرنا چاہئیے۔ میں
صرف اسی لئے لکھ رہا ہوں کہ میرے دوست ان باتوں کا آئندہ سے لحاظ
ں۔ حالانکہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ انھیں مشورے دے سکوں
ی جی نہیں مانتا۔ خیالات کے کارواں اذنِ خرام چاہ رہے ہیں۔

رحمٰن شاد کا تذکرہ چھڑا تو کیوں نہ کوثر نیازی کی غزل گوئی پر بھی اپنی
ئے دے ڈالوں۔ غنائی شاعری جذبات کے ترنم کا دوسرا نام ہو۔ لے
ت سے ــــــ لوگوں نے زندگی کا رومان اور زندگی کی قوسِ قزح
ہے۔ اس کی یہ حیثیت تو اپنی جگہ پر ہے، مگر آج کے اس تصوراتی
ہیں اس کے مزاج اور موضوع میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہونی چاہیئے
ی شاعری کے متعلق مشہور روسی مصنف مائی کافسکی کی رائے ہو کہ وہ
ں دور میں ایک کارگر اور نفوذ پذیر آلہ ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی غنائی صنفِ
ن یعنی غزل کو تحریکی نقطۂ نظر سے اسی طرح استعمال کرنا چاہیئے مگر اس
، ذرا سی لغزش بھی خطرناک ہو سکتی ہو۔ اس قسم کی لغزش کو مایاکافسکی "مجرمانہ
راہ روی" کہتا ہو۔ کوثر نیازی کی غزل کو پڑھ کر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ
ایک خاص نظامِ فکر کے لئے غزل کو آلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اُن
کے یہاں وہی جذبات ملتے ہیں، جو دوسرے بے مقصد غزل گویوں کے
ہاں پائے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، یہاں پر میرے بعض دوستوں کے
دل میں اعتراض پیدا ہو۔ مگر میں اپنی بات کو مثالوں کے ذریعہ بھی ثابت
کر سکتا ہوں۔ غزل جذبات کے ارتعاشات سے بنتی ہو، مگر ان ارتعاشات
کا محرک ہمیشہ بلند پایہ قدریں ہوتی ہیں۔ ان قدروں کو جذبات کا
رنگ و رنگ اور طلسماتی فضا دیکر چمکانا ایک بلند پایہ فن کار کا کام ہے
قدریں کوثر کے یہاں فدالکم ہی ملتی ہیں۔ ان کے یہاں عشق کے تصور میں
ندرت نہیں ہے۔ وہی یاد جاناں، وہی تابِ نیم شبی اور وہی روایتی آو

سحرگاہی ہمیں کوثر کے یہاں ملتی ہے۔ کچھ مطالب کے [illegible]
انداز میں ملتے ہیں۔ بلند پایہ عشق کا تصور [illegible] شفیق مسرتی نے اس شعر
میں پیش کیا ہے ؎

جب سامنے تم آجاؤ گے، خود داد بصیرت لے لیں گے
آوارہ پھریں، ڈھونڈیں نظریں، یہ اہلِ نظر کا کام نہیں

کوثر کے یہاں عشق کا وہ اسلامی تصور بھی نہیں ملتا، جس کے ذریعہ معرکۂ
بدر و حنین بھی عشق بن جاتا ہو اور مہ و نجوم بھی اس کے نخچیر ہو جاتے ہیں۔ عشق
کا یہ متحرک اور فعال تصور ہمیں کوثر کے یہاں کہیں بھی نہیں ملتا۔ کوثر نے
ابھی اپنا کوئی خاص انداز بھی نہیں پیدا کیا۔ ان کی غزلوں میں فیض کی غزلوں
کا رومانی دھندلکا نظر آتا ہو، اور اسے ہم ایک معمولی تجزیے کے بعد کورانہ
تقلید کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ جو غزل اس شمارے (اکتوبر ۵۲ء) میں شائع ہوئی
ہو، اس میں فیض کی غزل کا لوح روشن ہو جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

جنوں میں جتنی بھی گذری، بکار گذری ہو
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

ہمارے شعراء کی یہ مرعوبیت ان کے اندر ایک آزاد انفرادیت کو پیدا نہیں ہونے
دیتی ــــــ اور سچ بات تو یہ ہو کہ اس سے ان کا نشو نما رکتا ہو ــــــ لہٰذا ہم
اس تقلیدی روش سے بروقت آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا فن ہمارے تصورات
سے ابھرتا ہو۔ ہمیں اس کی مثال پیش کرنی چاہیئے۔ میری اس تلخ نوائی سے کوثر کو دلگیر
نہ ہونا چاہیئے۔ میں تو صرف انہیں مشورہ دے رہا ہوں اور وہ اسی قسم کے
مشورے مجھ کو بھی دے سکتے ہیں، کیونکہ میں بھی ایک شاعر ہوں۔

تازہ شمارے (اکتوبر ۵۲ء) کا شعری حصہ کافی اچھا ہے۔ مجھے خصوصاً
ماہر القادری اور شمیم جاوید کی نظمیں پسند آئیں ــــــ غزلوں میں کوثر اور اعجاز
عظمی کی غزلیں پسند آئیں۔ ہاں افتخار کی غزل کے متعلق یہ ضرور کہوں گا
اس سے ایک "عافیت" کا احساس ہوتا ہو بلکہ [illegible] کی غزل
میں جھلکتا ہے۔ اب کی بار افتخار عظمی کی غزل میں کچھ آنچ نہیں محسوس ہوئی۔ اس سے
پہلی والی غزل بھی کچھ ایسی ہی تھی، اسے ایک دوست نے "لوری" کہا ہو۔ ناظرین [illegible]
فیصلہ خود کریں۔

اور بہت دنوں کے بعد ایک نظم [illegible] غزلیں [illegible]
رہا ہوں۔ اس وقت بات کے [illegible] بہت [illegible]

... کی لڑکی ضرر ترا رہی ہو ——— اب اسے گل ہی کر دیں ... اجازت۔

نیاز کیش ——— انور صدیقی۔

محترمی!

"مشیر" کا سرورق انتخاب نمبر ملا، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ نظمیں اور غزلیں قریب قریب سبھی اچھی ہیں۔ میری نظم "غم آرزو" کے پہلے حصے کے آخری شعر میں "کروں" کی جگہ "کہوں" کی ترمیم میں نے کی تھی۔ وہ صوتی حیثیت سے ممکن ہے کچھ صحیح ہو، لیکن چونکہ محاورے کے خلاف ہے، اس لئے بہتر ہے کہ جدید شمارہ میں اس غلطی کی ضرور تصحیح کر دیں۔

غلط ——— شکوۂ غم اب نہ میں تجھ سے "کہوں" تو کیا کروں

صحیح ——— شکوۂ غم اب نہ میں تجھ سے "کروں" تو کیا کروں

دوسری جگہ ایک غلطی اور نظر آئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ غلطی آپ کے کاتب سے ہوئی یا میرے بھائی سے جس نے مسودہ صاف کیا تھا:۔

غلط ——— میری شام غم رہی ہے نا آشنائے صبح نو

صحیح ——— میری شام غم رہی "نا آشنائے صبح نو"

ان اغلاط کی آپ اس شمارہ میں ضرور تصحیح کر دیں! ورنہ ممکن ہے کہ نکتہ چیں یا عیب بیں ان اغلاط پر مجھے ہدف بنائیں۔ میں ذرا ناقدین سے ڈرتا ہوں۔

حضرت جگر، نسیم صدیقی اور یعقوب طاہر کا کلام خوب ہے۔ فرصت ملتی ورنہ شاید ایک تنقیدی مضمون ضرور لکھتا۔

اپنی ایک جدید نظم "جمال عبدالناصر" بھیج رہا ہوں۔ میں نے پس منظر بھی لکھ دیا ہے۔ اگرچہ کسی حد تک طویل ہے، لیکن اس کی اشاعت اس لئے ضروری ہے کہ ناقد کو اس نظم کے پس منظر کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ انگریزی شاعروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی منظومات کا پس منظر بھی لکھتے ہیں۔ اس سے شاعر کے ذہنی پس منظر کا اور اس ماحول کا پتہ چلتا ہے جس میں شاعرانہ تخلیق وجود میں آئی۔ اس نظم کے ساتھ میری پرانی نظم "مصر کا ... جدید" ضرور شائع کیجئے۔ ان دونوں میں شاعر کے تصور کی صاف ... جھلک ...

جناب عروج اعظم انصاری کی بعض جدید غزلیں بھیج رہا ہوں۔ وہ جنوبی ہند کے معروف شاعر ہیں اور اچھے تعمیر پسند۔ جوش ملیح آبادی اور عروج اعظم انصاری دونوں نے مدتوں بھوپال میں جناب شہاب ... سے اصلاح لی ہے۔

اک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ میری نظم "غم آرزو" پر خواہ کسی قسم کی کوئی تنقید آئے، اُسے آپ ضرور شائع فرمائیں۔ ان تنقیدوں سے مجھے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اچھے شعر کے لئے اچھے ناقد اور اچھے سخن شناس کی ضرورت ہے۔ اب ضروری ہے کہ عملی تنقید کا آغاز ہو۔ تعمیر پسند تحریک کا دامن اب وسیع ہو چلا ہے۔ اب بھی اگر ناقدین نے اُسے اپنے انتقادی مضامین سے سامنے لانے کی کوشش نہ کی تو یہ بات کسی حد تک ... نہ ہو گی۔

والسلام

افتخار اعظمی

محترمی!

ہماری یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو میں پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی کی قابلیت مسلّم ہے۔ انھیں "مشیر" کا "انتخاب نمبر" مطالعہ کے لئے دیا گیا تھا۔ پڑھنے کے بعد انھوں نے تعریف کی اور حصّہ منظومات پر اپنی وقیع ترین رائے پیش کی۔ خوشی کا مقام ہے کہ اسلامی ادب کی اس تحریک نے اساتذہ کو بھی متاثر کر لیا ہے۔ آپ "مشیر" کے نئے شمارے میں ان کی رائے کو ضرور پیش کریں۔

والسلام

سکریٹری

انجمن تعمیر پسند مصنفین، علی گڈھ

دین کی اس غربت کے زمانے میں، جب کہ الحاد اور کمیونزم وغیرہ کی تحریکات ملک میں ہر جگہ پھل پھول رہی ہیں، کچھ اہل حمیت اٹھے اور دوسرے شعبوں کی طرح ادب کو بھی مُفسد مہلک عناصر سے پاک کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ ادب کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ "Application of skill to the production of beauty."

یعنی تخلیق حسن کی غرض سے صناعی کے استعمال کا نام ہے۔

حسن کا بھی تو کوئی مقصود ہونا چاہیئے۔ رومی نے کیا خوب فرمایا ہے:

نقاشِ نگارد زرّیں نقش ——— بے امید نفع، بہر عین نقش
بہر مہمانان و کساں ——— کہ بہ فرحت وارہند از اندوہہا

اسی طرح تخلیقِ حسن کا مقصد حیاتِ انسانی کو بلند سے بلند تر کرنا
لیکن آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے ہمارے ادب
کا حصہ انسانیت کو پست سے پست تر کرنے کا "فرض" انجام دیتا رہا
۔ ہمارے بڑے بڑے دماغ ہندوستان اور پاکستان میں لادینی،
بیدی، عریانی اور فحاشی کی تخلیق میں مصروف رہے اور سماجی اور
فضا مسموم ہوتی رہی۔ خالص ادب کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو
سرمایۂ فرنگی چیتی ترکیبوں، عام پسند نعروں، سستے ابہام اور رمزیت
سوا کچھ نہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتے ہیں، لیکن اکثریت کا یہی رنگ
ایسی حالت میں جب کہ بہت سے لوگ اسلام کا نام لیتے ہوئے
شرماتے تھے، تعمیر پسند ادیبوں نے بڑی جرأت سے اسلامی اقدار کو (جو
جن میں اعلیٰ انسانی اقدار بھی ہیں) ادب میں پیش کیا۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ انھوں نے ادب سے پروپیگنڈے کا کام لیا۔ ہمارا مقصد
ہے کہ ہر قوم کے ادب کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ تعمیر پسند ادیبوں نے اس
کو صحیح طور پر پہچانا، اور اپنی نظم و نثر میں اسکی ترجمانی کی۔ اگر وہ صرف
یہی کرتے تو بھی یہ ایک بڑی خدمت ہوتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے
یہاں عموماً فکر کی گہرائی، خیال کا توازن اور ادبیت کی چاشنی بھی ہے، جس
سے اس تحریک کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ اس وقت "مشیر" کراچی کا
سالنامہ انتخاب نمبر جولائی ۱۹۵۶ء ہمارے سامنے ہے۔ اسکی منظومات اور
نثر کا ایک بڑا حصہ ہمارے دعوے کا مؤید ہے۔

جگر آج غزل کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ ان کی غزل
(ص ۹۰) کا کیا کہنا۔ ماہر القادری، احسان دانش، قابل اجمیری، فضا
اعظمی بھی ملک کے اچھا لکھنے والوں میں ہیں۔

ان حضرات کی غزلیات بلند خیالی اور پختہ مشقی کا نمونہ ہیں۔ بعض
اشعار اپنی جگہ خوب ہیں۔ حضرت جگر کا تغزل ملک میں مسلم ہے لیکن
اس سے ان کی غزلیات میں گہری لطافت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں
ست کا ایک رنگ بھی نظر آنے لگا ہے۔ یہ کہ ممکن تھا کہ وہ [illegible]

[illegible] سے پہلا تھا اور شاعر جو سب سے [illegible]
ہے غیر متاثر رہے۔ فرماتے ہیں:-

وہی دل ہے مگر لے حسنِ جاناں کا ——— کسے فرصت بھلا دیوانگی سے
خبردار اپنے میخانے سے ساقی! ——— اٹھے شعلے سے جام آگہی سے

اسی کے ساتھ اس رنگ کا شعر بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

مرا کفرِ محبت اللہ اللہ! ——— شعاعیں پھوٹ نکلیں تیرگی سے

ایرانی شاعر کا شعر بھی یاد رکھیئے:-

ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نرسد
کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

منظومات میں نعیم صدیقی کی نظم "یہ کون تھا، کس کا خون
بہا" محمد یعقوب طاہر کی "یہ ماحول" افتخار اعظمی کی "غم آلود" اور
لدھیانوی کی "حسن معنی" بھی قابلِ قدر ہیں، جن کی اشاعت پر ادارہ
"مشیر" مستحقِ مبارکباد ہے۔ جوش کی ایک نظم "شاعروں کو سلام"
بھی شاملِ انتخاب ہے اور اس کا جواب بھی۔ جوش کو نظم پر جو قدرت
اور مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں: مگر اب ان کی نظمیں پراگندہ
بن کر رہ گئی ہیں اور ان میں حسن کی جگہ ایک خاص چڑچڑاپن محسوس ہوتا
ہے۔ اس کے جواب میں مسٹر موہن کی نظم خیالات کے لحاظ سے خوب
ہے، اگرچہ اس میں فن کی خامیاں ملتی ہیں۔ رسالے میں بجا طور پر اخوان
شہدائے مصر سے متعلق کئی مضامین اور نظمیں ہیں۔ بعض نظمیں واقعات
کی تصویر اور جذبات درد کی عکاسی کے لحاظ سے کامیاب ہیں، لیکن
بعض جگہ جذبات زیادہ ہیں اور شعریت کم۔ تاہم عرفی کا مشورہ بھی ادا
بخوں آلودہ دست و پائے تنتاری لذوپے تحسیں
تو اوّل زیب اسپ و زینت برگستواں بینی
ایک چیز، جو بعض شامل اشاعت نظموں میں کھٹکی، وہ تشدد کی تبلیغ
ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۵ پر "یہ ماحول" ایک نظم ہے جس کے آخری شعر ہیں:

جب تک تری آواز میں شامل نہ ہوں شعلے
ارباب ہوس نغمہ ترا سن نہیں سکتے
جب تک نہ ہو تلوار کی جھنکار [illegible]
[illegible] تیرے رقص [illegible]

ہماری رائے میں کمیونسٹ جماعت کی تشدد آمیز تحریروں کے جواب میں تشدد کا پرچار ملک کو انارکی کے قعر میں ڈھکیلنا ہے فریقین کے ذمہ دار افراد کا فرض ہے کہ اپنے جوشیلے ارکان کو تخریبی کاروائی کی اشاعت سے روکیں۔

"بدر و حنین" کے معرکوں کی اہمیت مسلّم، لیکن "صلح حدیبیہ" کا بھی ایک محل ہے ——— افتخار صاحب کی نظم بہت کامیاب ہے۔ وہ ایک نوجوان مفکر اور صحیح الخیال اہل قلم ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم "غم آرزو" میں اپنے مدہم سُروں سے جو فضا تیار کی ہے وہ رفتہ رفتہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور وہ نظم کے مد و جزر میں کھو جاتا ہے۔ اگرچہ بندوں میں اشعار کی تعداد میں کوئی تناسب نہیں رکھا گیا ہے

تاہم نظم مذکور مجموعی طور پر نہایت اثر آفریں ہے، اور خیال کی پاکیزگی کے ساتھ فن کی رعایت قابلِ ستائش ہے۔

اس مجموعے میں بعض آزاد نظمیں بھی نظر پڑیں۔ اگرچہ آزاد نظموں کو نظم کہنا صحیح نہیں ہے ——— کیونکہ آخر نثر و نظم میں کوئی مابہ الامتیاز ہونا چاہئے ——— دراصل اس قسم کی شاعری (اگر اس کو شاعری کہہ سکتے ہیں) ہمارے ادب کے مزاج سے چنداں میل نہیں کھاتی۔ البتہ یہ امر موجب مسرت ہے کہ رسالۂ مذکور کی آزاد نظمیں جدید ادب کے ابہام و اشکال سے پاک ہیں، بلکہ اس قبیل کی ایک آدھ نظم، مثلاً "ماں" (صفحہ ۱۲۱) تو شعریت سے بھرپور ہے — مگر میں نے غلطی کی۔ وہ نظم آزاد کب ہے۔ اس کے ٹکڑے تو وزنِ عروضی پر پورے اترتے ہیں۔

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
ریڈر شعبۂ فارسی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خاور قریشی بی-اے

○

کیا گری برق میرے خرمن پر — اک اداسی ہے سارے گلشن پر
اب کہاں آنکھ میں وہ جوشِ اشک — داغ سے رہ گئے ہیں دامن پر
دوست غمخوار اگر نہیں نہ سہی — مجھکو ہے اعتماد دشمن پر
خود لٹا دی متاعِ دل ہم نے — ناحق الزام آیا رہزن پر
لاکھ معصوم حسنِ خود بیں ہو — خونِ ناحق ہے کس کی گردن پر
برق نے دی نہ مجھکو دادِ ستم — رہ گئی کوند کر نشیمن پر
یاس و حسرت میں جان نکلی تھی — خاک اُڑتی ہے آج مدفن پر
رُخ ہے انقلاب پر مائل — جامۂ زیست تنگ ہے تن پر
نورِ عرفاں کی اک تجلی سے — کھل گئے راز چشمِ روشن پر
کیا اسی کا ہے نام غمخواری؟ — لوگ ہنستے ہیں آہ و شیون پر

در خورِ قہر و غضب ہیں خاور ہم
کیا کوئی آئے اپنے مسکن پر

روشن کرن

سید علی اکبر شاہ

سورج کسی بدمست کی طرح ڈگمگا رہا تھا۔ غصے سے کانپتے ہوئے الٹی سیدھی آنکھوں سے دنیا کو گھورنے لگا، اور متکبرانہ انداز سے بولا "ہے کوئی میرے بعد جو اس تاریک شام کو روشن کرے گا؟"

مٹی کا ایک دیا جو کونے کے طاقچے میں ٹمٹما رہا تھا، کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ایک سرخ و سفید شعلہ چھت کی طرف بلند ہوا۔ روشنی اندھیرے پر غالب آگئی۔ دیا کہنے لگا: "اتنی نہ بڑھا شعلۂ تاباں کی حکایت"

سورج نے ایک دیئے کی جرأت و ہمت دیکھ کر خجالت سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

تذکرے اور تبصرے

"Property in the U. S. S. R

(روس میں ملکیت)

شائع کردہ سفارتخانہ روس، کراچی

برائے تقسیم عام بر سبیل پروپیگنڈہ

ضخامت کتابچہ : ۲۰ صفحات ۔

پیشِ نظر کتابچہ روس میں مسئلۂ ملکیت سے متعلق چند سوالات
ان کے جوابات پر مشتمل ہے جن کے ذریعے روس میں ملکیت کی
سوں، قومی ملکیتوں، ان کے قیام، ترقی کے ذرائع اور قومی ملکیت
ملک گیر اور ہمہ گیر نتائج اور فوائد مفصل بیان کئے گئے ہیں —
یا گیا ہے کہ روس میں آلات اور ذرائع پیداوار پر بیشتر غلبہ
شتراکی ملکیت کو حاصل ہے، اور اسی پر ملکی معاشیات کی بنیاد قائم
ہے۔ چنانچہ عوامی اشتراکی ملکیتیں دو حیثیتوں سے سارے ملک میں
ود ہیں۔ ایک حکومت کی ملک کی حیثیت سے، دوسرے امداد
ی کے اجتماعی کاشت کے اداروں کی ملک کی حیثیت سے ۔
ا دراصل یہ مقصود ہے کہ روس کی موجودہ حکومت نے انسان کے
ان پر تفوق اور سیادت و حکومت کے سارے راستے مسدود کر
ئے ہیں۔ معاشیات کے ان مروجہ طریقوں کے پہلو بہ پہلو نہایت
ود حد تک — اور وہ بھی انفرادی حیثیت سے — ذاتی ملکیت
گنجائش بھی رکھی گئی ہے، جو ایک کاشتکار یا دستکار خود اپنی محنت
بنا سکے اور جسمیں کسی دوسرے فرد سے اجرت پر کام نہ لیا گیا ہو۔
تمام کتابچہ میں قومی ملکیت کے حصول کی اصولی حیثیت سے
یاں بیان کرنے اور منطقی طرزِ استدلال اختیار کرنے کے بجائے
زعامیانہ اختیار کیا گیا ہے، جو اس کتابچے کی معیاری حیثیت
ت کچھ گرا دیتا ہے۔ پورے کتابچے میں مجرد اعداد و شمار کے
سے پر ذہنوں کو اشتراکیت کی برکات کا گرویدہ کرنے کی کوشش
کی گئی ہے جس سے کتابچے کی اہمیت پروپیگنڈہ لٹریچر کی حیثیت
سے بھی کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتی ۔

"Freedom of Religion in the Soviet Union."

(اشتراکی روس میں مذہبی آزادی) مصنف : ج۔ اسپاکو

شائع کردہ :۔ سفارت خانہ روس، کراچی

برائے تقسیم عام —— ضخامت :۔ ۳۱ صفحات

اس کتابچے میں موجودہ اشتراکی حکومت سے قبل مملکت
زار میں گرجے کی اہمیت اور عیسائیوں کے ایک خاص مذہبی گروہ
کے دینی افراد کے کردار، ایوان حکومت میں در خور اور عوام کے ساتھ
ان کے مستبدانہ سلوک کی جمالی تاریخ بتلانے کے بعد یہ باور کرانے کی
کوشش کی گئی ہے کہ زار کی پوری مملکت میں اس مذہبی گروہ کے خلاف
عوام کے دلوں میں نفرت کے سخت جذبات پرورش پا رہے تھے جب
سنہ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں عوام نے دوسرے انقلابی سیاسین کے
ساتھ ملکر زار کی حکومت اور اس وقت کے شاہ پرست طبقے کو مٹا
کر ایک نئے انقلابی دور کی ابتدا کر دی جسمیں جمہوریہ کے ہر ہر فرد
کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی کہ وہ ذاتی طور پر جس طرح
چاہے عبادت کرے، کوئی اس کی طرزِ عبادت میں مخل ہونے والا
نہ تھا۔ بظاہر یہ ایک عادلانہ اور صحیح نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن
جن الفاظ میں اور جن قوانین کے تحت اس نظریے کی تشریح کی گئی
وہ خود حکومت کے مجریہ احکام کے مطابق یہ کچھ ہیں ۔

- مذہب ریاست سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔
- تعلیمی اداروں کے دروازے مذہبی تعلیم کے لئے بند کئے
جاتے ہیں —— البتہ ذاتی طور پر کوئی خود مذہبی تعلیم [illegible]

حکومت کے ایک دوسرے حکم مجریہ سنہ ۱۹۳۶ء میں بھی مذہبی آزادی کی توضیح کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

"شہریوں کے لئے آزادیٔ ضمیر کی ضمانت دلانے کے لئے جمہوریہ اشتراکیہ روس میں مذہب کو ریاست سے الگ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اداروں کو بھی مذہبی تعلیم کے لئے بند کیا جاتا ہے۔ ہر شہری کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ عبادت کا جو طریقہ چاہے اختیار کرے اور چاہے تو خلافِ مذہب پروپگنڈہ کرے۔" (واضح رہے کہ مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں دی گئی)

اس مذہبی آزادی کے ثبوت میں یہ کہا گیا ہے کہ اکثر گرجوں کے پادریوں کو اس کی اجازت ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی مذہبی رسم ادا کرنے کے لئے آئے، تو وہ ان رسوم کے ادا کرنے میں اس کی مدد کر سکتے ہیں، اور اس طرح اگر کوئی ان کو کچھ رقم گرجے کے انتظام کیلئے دے تو وہ بھی قبول کر سکتے ہیں۔ نیز اپنے قوتِ بازو سے کمائی ہوئی رقم بھی گرجے کے انتظام میں صرف کر سکتے ہیں۔ جمہوریہ روس نے مذہبی اداروں کے ساتھ "مزید سیر چشمی کا ثبوت" یوں دیا ہے کہ بڑے گرجوں کے منتظمین کے حوالہ دوسرے قدیم لیکن مذہبی حیثیت سے معروف گرجوں کی نگرانی دیدی ہے، اور اسلامی اداروں کے کارکنوں کے حوالے مشہور مقبروں کی نگرانی کر دی ہے ــــ مسلمان خوب جانتے ہیں کہ ان مقابر کی نگرانی کو اسلام سے کیا نسبت ہے، اور روس میں اسلام کی کیا کچھ دُرگت بنائی گئی ہے، جہاں ایک مسلسل نظامِ حیات کو ماننے والوں اور برپا کرنے والوں کو مقبروں کی مجاوری پر مجبور کر کے اسی کو مذہبی آزادی کا نام دینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

کتابچہ میں اسی پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ روس کے عیسائی اور مذہبی رہنماؤں کے بیانات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، جس میں مذکورہ اقدام کو مذہبی آزادی کے مترادف قرار دیکر اس کو سراہا گیا ہے، لیکن اس ملک کے وہ عوام جن کے لئے یہ کتابچہ شائع کیا گیا ہے، اپنے روزانہ مشاہدہ کی بنیاد پر خوب جانتے ہیں کہ ان بیانات کی حقیقت کیا ہے۔ اسی سلسلے میں مبارک ساغر جیسے لوگوں کے اسلام کے متعلق بیان کو اہمیت دیکر نادانستہ طور پر جمہوریہ کے سفارتی عملے نے پاکستان کے مسلم عوام سے ناواقفیت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔

اس طرح کتابچہ کی اشاعت سے روسی حکومت کا مقصد شاید پورا ہو جائے، لیکن روس میں مذہبی آزادی کے نشانات تک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

"The Last night at Madina"

(مدینہ کی آخری شب)

ضخامت: ۲۵ صفحات

مولینا سید ودود الحئی صاحب ندوی خطیب سنی خوجہ مسجد بمبئی نے لکھی اور دفتر سیرۃ نے نمبر ۱۰۲ تانتن پورا اسٹریٹ کھڑک بمبئی نمبر ۹ نے شائع کی۔ کتاب انگریزی میں ہے جس میں مولینا ودود الحئی صاحب نے سنہ ۱۳۶۸ھ میں محرم کی نویں شب کی قلبی واردات یوں بیان فرمائی ہے :-

"صبح سے فراغت پانے کے بعد میں مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ روضۂ اقدس کی جدائی کے خیال سے دل بیٹھا جا رہا تھا کہ ناگہاں اس بے چینی کے عالم میں ایک دیرینہ تمنا نے انگڑائی لی اور قلب کو یک گونہ طمانیت و تسلی نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد مولانا موصوف نے بتایا کہ انھوں نے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اسی شب ایک تحریری عہد باندھا جس میں اس امر کا اقرار تھا کہ وہ آنحضرتؐ کی سیرت پاک کے ہر گوشہ کو اجاگر کرنے اور دنیا میں پھیلانے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کریں گے۔

آگے چل کر مولانا نے فرمایا ہے کہ کس طرح ایک صاحبِ دل اور صاحبِ مال مرد مسلمان نے مالی اعانت کر کے مولانا کو اپنے اس مقصد کی ابتدائی منزل طے کرنے اور اکابرینِ ملت نیز علمائے کرام کی آراء سے استفادہ کرنے پر آمادہ کیا ــــ علمائے کرام اور زعمائے ملت کی رایوں اور مشوروں کے بعد سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے عملی اقدام کی تفصیل بتائی ہے، اور آخر میں مسلمانانِ عالم سے اپیل کی ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اس کار خیر میں مولینا اور دوسرے کارکنان کا ہاتھ بٹائیں اور رسول اللہ صلعم کے

...کے مستحق ٹھہریں ــــ ظاہر کہ اس نیک مقصد سے کس مسلمان [کو] اختلاف ہو سکتا ہے۔

"Seerat wa Soorat"

(سیرت وصورت) مجلد، مع گرد پوش،

ضخامت، ۳۷ صفحات

مصنفہ: مولانا ودود الحق، شائع کردہ مجلس سیرۃ بمبئی

کتاب انگریزی میں ہے اور مفت تقسیم کے لئے شائع کئے [جانے کی وج]ہ سے کوئی قیمت نہیں مقرر کی گئی۔ کتاب کی ابتدا میں جناب [...] جامعی صاحب کا ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں اس کتا[ب کی اشا]عت کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور اعانت کی اپیل کا اعادہ [کیا گیا] ہے ــــ اس کے بعد پیش لفظ میں مصنف نے بتایا ہے [کہ اس] کے پہلے مخاطب خود مسلمان ہیں۔ اس لئے اس سلسلے کی ابتد[ا ...] کی صورت و سیرت سے کی گئی ہے، جنکی واقفیت ہر [مسلما]ن کے لئے ضروری ہے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ کم سے کم جگہ [میں] زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کر دی جائیں، تاکہ ہر چھوٹا بڑا [اس] سے استفادہ حاصل کر سکے۔ پھر اس کا بھی التزام کیا گیا ہے [کہ جو] لکھا گیا ہے، وہ اختلاف سے بری اور روایات صحیحہ پر مبنی ہو۔ کتاب کے پہلے حصہ میں سیرۃ پاک کے ایک ایک پہلو پر [روش]نی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصے میں حلیہ مبارک کا تفصیلی [بیان] ہے ــــ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس کار خیر کا اجر اور پڑھنے [والوں] کو اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(م۔ع)

"سرودِ بقا یا خوابِ طفلی"

از:- ڈاکٹر عشرت حسن انور (ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی)

سفید کاغذ۔ ۱۸×۲۲/۱۶ سائز ۲۹ صفحات

رنگین سرورق، قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- ۲۸ حالی روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر انور صاحب علم معلم اور اردو کے شاعر ہیں، آپ کی ایک نظم، جو مشہور انگریزی شاعر ورڈز ورتھ (Wordsworth) کی ایک نظم کا ترجمہ ہے، "کوئل" کے عنوان سے دسمبر کے "مشیر" میں شائع ہو چکی ہے۔ پیش نظر کتاب بھی ورڈز ورتھ کی ایک نظم "اوڈ ٹو امار ٹیلٹی" (Ode to Immortality) کا ترجمہ ہے، اور بہت خوب ہے۔

کسی زبان کی بقا اور ارتقاء کے لئے جہاں دوسرے لوازم ہیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اسے دوسری زبانوں کے علمی ذخائر سے بہرہ ور کیا جائے۔ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" اردو کو ابھی اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مختلف زبانوں کی علمی اور فنی کاوشوں کو اس میں منتقل کیا جائے۔ اس سلسلے میں جو بھی تعمیری قدم اٹھایا جائے، وہ مستحسن اور قابل مبارکباد ہے۔ ڈاکٹر انور صاحب نے "سرودِ بقا" پیش کر کے حقیقی ادبی خدمت انجام دی ہے۔

نظم کا انتخاب ڈاکٹر صاحب کی سلامت طبع کی علامت ہے اور اس کا ترجمہ ان کی مہارت فن کی شہادت۔ ترجمہ اور نظم کا اور وہ بھی منظوم ایک ایسا کام ہے، جو خصوصی مہارت چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے "سرودِ بقا" میں اس کا خاطر خواہ ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ترجمہ میں مطالب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ہی پوری ادبی شان پائی جاتی ہے۔ سلاست اور روانی میں ذرا کمی محسوس نہیں ہوتی۔ پھر خوبی یہ ہے کہ آپ اصل سے کہیں دور نہیں ہٹتے۔ اس کا اندازہ متن سے کیا جا سکتا ہے، جو ترجمہ کے ساتھ ساتھ دیا گیا ہے۔

"جماعت اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینہ میں"

مرتبہ شعبہ تنظیم جماعت اسلامی علی گڑھ

[illegible]

سادہ سرورق ——— قیمت ڈھائی آنے

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی، باقی منزل محلہ بدرقہ اعظم گڑھ (یوپی)

جب بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے، قدرتی طور پر اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تحریک اسلامی کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے ——— جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ———

چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک شخص حق کی آواز بلند کرے لوگ سنتے ہی اس کے پیچھے ہولیں۔ اور خراماں خراماں کامیابی کی منزل تک جا پہونچیں۔

اس وقت برّصغیر ہندو پاک میں احیائے اسلام کے لئے مختلف تحریکیں چل رہی ہیں، جن میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے جماعت اسلامی دیگر اسلام پسند جماعتوں کے مقابلے میں دو نمایاں خصوصیات رکھتی ہے: ایک تو یہ کہ اس کا اپنی تحریک سے متعلق وسیع اور واضح لٹریچر ہے، دوسرے یہ کہ اس کی تنظیم نہایت مستحکم اور پائیدار ہے ان ہی دو اسباب کا نتیجہ ہے کہ یہ جماعت اپنی کم عمری کے باوجود نہایت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ چنانچہ اس کی موافقت و مخالفت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے بعض حلقوں کی طرف سے جماعت اسلامی پر مختلف الزامات لگائے گئے تھے، جو نظریات وعقائد، نصب العین اور طریق کار، انداز فکر اور طرز عمل وغیرہ سے متعلق تھے۔

اس سلسلے میں اعظم گڑھ (یوپی) کی جماعت اسلامی ہند نے مذکورۂ بالا کتابچہ تیار کیا ہے، جس میں "جماعت" کے لٹریچر سے مختلف اقتباسات لیکر مختلف ضروری عنوانات کے تحت جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتابچہ جماعت اسلامی کی پوزیشن کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور جستجو کا جذبہ رکھنے والے جماعت اسلامی کے موافقین و مخالفین دونوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

"شعلۂ خیال"

از نعیم صدیقی

اچھا سفید کاغذ۔ ۲۰×۳۰/۱۶ سائز۔ ۶۰ صفحات

خوب صورت جلد ——— قیمت تین روپے ۱۲ آنے۔

ناشر: مکتبہ چراغ راہ، لاہور

نعیم صدیقی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اسلامی ادب کے پیش رو اور ادب اسلامی کے سربراہ ہیں۔ وہ بہ یک وقت نثر نگار اور نغز گو شاعر ہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی صنف ادب ایسی ہو جو ان سے چھوٹی ہو۔ وہ افسانہ، ڈرامہ، مقالہ، مزاحیہ، نظم اور غزل سب ہی کچھ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ "یہ اس کی دین ہے جسے دے"

پیش نظر کتاب نعیم صاحب کا ایک مجموعۂ کلام ہے جس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ "بسم اللہ" کوئی معشوق ہے (پردہ میں)" کے عنوان سے ابتدائیہ کے ذریعہ کی گئی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ کیوں نہ ہو ...... کہتے ہیں:-

"ہمارے عشق کا معیار ہی الگ تھا
نہ محو رنگ میں، یوں میں رہے، نہ رس میں رہے"

توقع ہے، یہ "شعلۂ خیال" کتنے ہی دلوں کو گرمائے اور کتنی ہی "گرمیاں" برقرار رکھے گا۔ (ر۔ج۔ق)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
ALWAYS DRINK
Asmar
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

مشیر

اپریل ۱۹۵۵ء

فی کاپی: پاکستان آٹھ آنے
بھارت، دس آنے

جلد 6 شمارہ 4

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

MUSHIR MONTHLY

بلند معیاری ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی
یونانی ادویہ مشہور
اور مقبولِ عام
ہیں
ہضمی امراض معدہ اور ان سے اچانک پیدا
والی تمام تکالیف کے لئے بہترین یونانی مرکب ہے
قیمت
فی شیشی
مُصفّی (جدید) خون صاف کرنے کی مشہور یونانی دوا۔ خارش
پھوڑے پھنسیوں اور دائمی قبض کے لئے بید مفید ہے
قیمت
فی شیشی
مُفرّح فولادی تازہ خون پیدا کرتا ہے وزن بڑھ
ہڈیوں کو مضبوط کرکے قوت اور طاقت بخشتا ہے قیمت فی شیشی 9
سلورین پلز جنسی طاقت کو بڑھانے اور بحال رکھنے کے
عنبر سونا اور مروارید جیسی قیمتی اجزا سے مرکب گولیاں
قیمت 45
12
فیملن عورتوں کی پوشیدہ مرض لیکوریا۔ ماہوار کی
تمام بیماری کو دور کرکے نیا خون اور طاقت
کرنے کے لئے اکسیری گولیاں۔ قیمت 45 گولی 12
منیجر
حاذق دوا
بندر روڈ۔ کراچی
HAZMEE
FEMALEEN
2 02

ـــ کو معیار قرار دیتی اور ایسے اوصاف رکھنے والے افسروں کو تلاش کرتی جو ایک مسلمان کا سا کردار اور ذہن رکھنے والے ہوتے۔ نہ یہ کہ ان چیزوں کا تو کوئی نوٹس نہیں کیا گیا اور مغربی اطوار و عادات کو معیار بنا کر پیش کر دیا گیا۔ بہتر ہو کہ ہمارے حکمران اس بات کو محسوس کریں کہ اب وہ غلام نہیں ہیں بلکہ ایک آزاد اسلامی ریاست کے باشندے ہیں اور وہ اپنے بھی کچھ اصول اور تجربات رکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے دوسروں سے فائق تر ہیں۔

مولانا مودودی کی رہائی اور حکومت پنجاب

گزشتہ ماہ پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں اس کے ایک رکن چودھری محمد افضل چیمہ کے ایک سوال کے جواب میں صوبائی وزیر تعلیم و جیل خانجات چودھری علی اکبر نے بتایا تھا کہ موجودہ حساب سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جناب عبدالستار خاں نیازی کی میعاد قید علی الترتیب ۱۸ اور ۲۳ دسمبر کو ختم ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ چونکہ ہر قیدی کے معاملے میں "معافی" کی مقدار مختلف ہوتی ہے اور مقدار کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی معافی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس مرحلے پر یقینی طور پر یہ بتانا کہ یہ دونوں حضرات کس تاریخ کو رہا کئے جائیں گے۔ ممکن نہیں ہے۔ ایک ضمنی سوال کے جواب میں وزیر تعلیم نے تسلیم کیا تھا کہ وہ کسی قیدی کی مدت قید میں کمی کرنے کا اختیار رکھتے ہیں لیکن یہ اختیار وہ معمولی قیدیوں کے معاملے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ دو حضرات غیر معمولی قیدی ہیں اس لئے ان کے معاملے میں وہ یہ اختیار استعمال نہیں کریں گے۔

اسیران مارشل لا بالخصوص مولانا مودودی کے ساتھ پاکستان کے ارباب اختیار کا معاملہ اب تاریخ کا ایک حصہ ہے اور آئندہ آنے والا مورخ جب اس واقعے کو لکھنے بیٹھے گا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔ مولانا مودودی کو جن حالات میں گرفتار کیا گیا، ان پر جو الزام لگایا گیا، انھیں جس طرح سزا دی گئی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا گیا یہ ساری باتیں تاریخ میں محفوظ رہیں گی اور ان کی روشنی میں آئندہ آنے والی نسلیں دیکھیں گی کہ پاکستان کی باگ دوڑ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ کس اخلاق کس ظرف اور کن اوصاف کے لوگ تھے اور ایک داعی حق کے ساتھ انھوں نے کیا معاملہ کیا تھا اور ان کے اس طرز عمل کے جواب میں اس شخص نے کیا روش اختیار کی تھی۔ یہ سبھی چیزیں ہیں جو تاریخ کے اوراق پر نقش ہو چکی ہیں اور کوئی طاقت ان کو لوح ہستی سے محو نہیں کر سکتی۔

صوبائی حکومت کا یہ آخری انکشاف بھی ہماری رائے میں اسی سلسلۂ ظلم کی ایک کڑی ہے جس کا نشانہ آج تک مولانا مودودی کو بنایا گیا ہے۔ ہمیں اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ آنریبل وزیر تعلیم نے مولانا مودودی اور مولانا نیازی کو غیر معمولی قیدیوں میں شامل کر کے اس معافی سے کیوں محروم کر دیا ہے جو وہ معمولی قیدیوں کو دے سکتے ہیں اور نہ ہمارے دل میں یہ خواہش ہے کہ اگر مولانا مودودی کو کچھ معافی اور مل جاتی تو وہ ۱۸ دسمبر سے چند دن پہلے جیل سے باہر آ جاتے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ مولانا مودودی کو جس روز جیل سے باہر آنا ہے اور اللہ تعالیٰ جس روز ان کے ایام اسیری کو ختم کرنا چاہے گا اس دن وہ ختم ہو کر رہیں گے اور مولانا مودودی ان کی خواہشات کے باوجود جیل سے باہر آ جائیں گے۔ جو ذات پھانسی کو عمر قید اور عمر قید کو تین سال کی قید میں تبدیل کرا سکتی ہے۔ وہ یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کی خواہشات کے علی الرغم مولانا مودودی کو جس وقت چاہے جیل سے باہر لے آئے۔ چند ماہ پہلے یا چند ماہ بعد کی رہائی ایک بے حقیقت چیز ہے اور اس سے مولانا مودودی یا تحریک اسلامی کو انشاء اللہ کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ارباب اختیار کے اس آخری طرز عمل کے متعلق بھی بعض باتیں واضح کر دیں تاکہ اس سلوک کی حقیقت اور بھی واضح ہو جائے جو ان لوگوں نے آج تک مولانا مودودی کے ساتھ روا رکھا ہے۔

مولانا مودودی کو ۲۷، ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب کو گرفتار کیا گیا۔ انھیں ۱۱ مئی کو موت کی سزا سنائی گئی اور ۱۳ مئی کو یہ سزا عمر قید میں بدل دی گئی۔ گویا اگر ان کی قید ۲۸ مارچ کے بجائے ۱۳ مئی سے بھی شمار کی جائے تو اس صورت میں بھی ان کی تاریخ رہائی اگست ۵۵ء کے وسط میں بنتی ہے کیونکہ معمولاً ایک قیدی کو سال میں تین ماہ کی معافی مل جاتی ہے اس حساب سے مولانا مودودی صاحب کو سوا دو سال قید کاٹنی چاہیئے۔ یہ معافی کوئی خصوصی رعایت نہیں ہوتی بلکہ ہر قیدی کو خود بخود مل جاتی ہے اور نہ کبھی اس کو روکا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جیل میں کسی قیدی کا طرز عمل اچھا نہ ہو

بطور سزا اس کو روک لیا جائے۔ حکومت نے جس تاریخ رہائی کا اعلان کیا ہے۔ اس کے مطابق مولانا مودودی کو تاریخ گرفتاری سے دو سال اور ساڑھے ماہ بعد اور تاریخ عمر قید سے دو سال سات ماہ بعد رہا کیا جائے گا اور یوں عام قاعدے کے لحاظ سے بھی انہیں کم از کم چار ماہ زائد جیل میں رکھا جائے کا ری اطلاع کے مطابق اس زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی سزا تین سال ہونے کی تاریخ تک ان کے ٹکٹ پر کوئی معافی درج نہیں ہی۔ اور لاہور سنٹرل جیل کے دوران میں گورنروں اور وزراء کے دورے کے موقعہ پر ساری جیل کے دو ہزار قیدیوں کی مدت میں جو تخفیف کی گئی اس کا کوئی اندراج مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کے ٹکٹوں پر نہیں کیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر صرف یہی "معافیاں" ان کی مدت قید میں سے ح کی جائیں تو ۱۰ دسمبر اور ۳ دسمبر تک ان کے جیل میں رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان واقعات کی موجودگی میں یہ خدشہ بہت قوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے کہ ارباب اختیار کی خواہش یہ ہے کہ مولانا مودودی کو زیادہ زیادہ عرصے تک جیل میں بند رکھا جائے ہم ان لوگوں کی خدمت میں عرض کرینگے کہ اگر وہ اپنی اس پالیسی پر اصرار کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ظلم اور ناانصافی ایسی چیزیں ہیں جن کا وبال بہر حال پڑ کے رہتا ہے۔ (بشکریہ تسنیم)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اپریل سنہ ۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیج کر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم (مینجر "منبر" کراچی)

- ۱۰۲۰ شیخ محمد شفیع صاحب گوجرانوالہ
- ۱۰۳۹ حافظ حبیب الرحمٰن حیدپور
- ۱۰۴۰ جدید دواخانہ شاہ پور پاک
- ۱۰۴۸ عزیز احمد۔ کونٹریلہ
- ۱۰۵۲ سیف الدین، کراچی
- ۱۰۶۵ ایم۔ایچ خان۔ جبلپور
- ۱۰۶۶ حکیم غلام محمد جہانیاں
- ۱۰۷۰ عبدالعظیم۔ قصور
- ۱۰۷۵ محمد جلیل خان۔ بنوں
- ۱۰۸۰ غلام سرور۔ جھنگ
- ۲۱۲۹ عزیز الرحمن۔ کراچی
- ۲۱۶۴ عبدالمنان۔ اسٹور گلگت
- ۲۱۹۷ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور
- ۲۳۱۰ غلام اصغر۔ لاہور
- ۲۳۱۱ منظور احمد۔ حیدرآباد سندھ
- ۲۳۱۴ نثار احمد خاں
- ۲۳۲۱ اشفاق اللہ شفاعت اللہ، شاہجہاں پور
- ۲۳۲۵ محمد یوسف، لاہور چھاؤنی
- ۲۳۲۷ محمد امین، کراچی
- ۲۳۳۰ دفتر جماعت اسلامی۔ ملاہ والی
- ۲۳۳۱ عبدالناصر صدیقی۔ رمنا
- ۲۳۳۲ مقبول الرحمٰن، ایبٹ آباد
- ۲۳۳۳ اصلاحی دارالمطالعہ، پاک پٹن
- ۲۳۳۴ ہیڈ ماسٹر صاحب۔ چوپالہ
- ۲۳۳۵ محمد شریف۔ گوجرانوالہ
- ۲۳۳۶ ہیڈ ماسٹر چک ۸۲/۱۲۰۰ منٹگمری
- ۲۳۳۷ جی۔ایم۔ابراہیم خاں۔ بہاولنگر

عبدالقدیر اصغر

حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں، کیا کہنا

(یہ نظم دنیا کے عام حالات کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے)

اُف یہ تہذیب یہ ماحولِ جواں کیا کہنا
یہ اندھیرا، یہ ہوائیں، یہ دُھواں کیا کہنا
سارے گلشن پہ مسلّط ہے خزاں کیا کہنا

کل شہنشاہوں کا ممنون کرم تھا انساں
کل وزیروں کے شبستان تھے جنت کی دکاں
آج جمہور کے خدام کا سکّہ ہے رواں

قصۂ جور و جفا، ذکرِ فغاں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

بلبلیں کل بھی تھیں فریاد کناں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

اب بھی محفل میں کھنکتے ہیں وہی جام و سُبو
عدل کا پیرہن چاک ہے محتاجِ رفو
اب بھی مظلوم کے ناسور سے رستا ہے لہو

وہی شوکت، وہی آداب، وہی جاہ و حشم
وہی الطاف و عنایات، وہی جود و کرم
وہی طاقت کی نمائش ہے وہی مشقِ ستم

اب بھی بیباک ہے ظالم کی زباں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

اب بھی تنقید پہ کٹتی ہے زباں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

کل بھی تھا آج بھی ہے شکوہ بیدادِ چمن
کل بھی تھے آج بھی ہیں حق کیلئے دار و رسن
کل بھی تھی آج بھی ہے تاج کے ماتھے پہ شکن

امن و اصلاح کے دعوے بھی ہیں اقرار بھی ہیں
عہد و پیمان بھی الفاظ کے انبار بھی ہیں
بم بھی ہیں، ٹینک بھی ہیں توپ بھی تلوار بھی ہیں

کل بھی ہر سمت تھا اک شورِ فغاں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا،

جنگ و پیکار بدعوائے اماں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

رقص کو ساز، غمِ انجام کو آزادی ہے
عیش کوشی کو مئے و جام کو آزادی ہے
کفر و الحاد کو اوہام کو آزادی ہے

اور پابند ہے آوازِ اذاں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہیں تیغ و سناں کیا کہنا

(بشکریہ "دعوت")

ایک تمثیل

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے گھر کے ایک حصے میں اپنے کاتب اور مشیر رجا بن حیات کی معیت میں نمودار ہوتے ہیں حضرت عمر لکھوانے والے کی معیت میں ہیں اور رجا، کاتب کے لباس میں......

حضرت عمر: جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھیئے۔

رجاء: (پڑھتا ہے) میں تم کو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ، اجتہاد، اتباع سنت اور ترک بدعت کی وصیت کرتا ہوں۔ اور معلوم ہو کہ جس نے بھی بدعت اختراع کی۔ اس کو پہلے وہ خود اختیار کرتا ہے۔ ان کا جو انجام ہوا وہ ہمارے سامنے عبرت ہے۔ اسلئے تجھے لازم ہے کہ سنت رسولؐ کی پیروی کرے۔ جو تیرے لئے نجات کا باعث ہے تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ جس نے بھی کوئی طریقہ جاری کیا وہ اس کے تمام سقم بھی جانتا ہے۔ سلف صالحین نے اپنے علم پر اس پر خوب غور و فکر کی ہے اور اسے ناقدانہ نظر سے جانچا ہے۔ وہ امور کی حقیقت جاننے کے زیادہ قابل تھے جنھوں نے اس طریقہ کو چھوڑ کر نئی راہ نکالی ہے انھیں نے سلف صالحین سے روگردانی کی اور دوسرا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ترقی بھی نہ کر سکے۔ اور جنھوں نے ان سے کچھ بھی حاصل کیا وہ بلندی پر پہنچ گئے۔

عمر: (بات کو کاٹتے ہوئے) نہیں یہ مضمون بہت لمبا ہے۔ دوسرا لکھیئے (رجا، دوسرا کاغذ لیتے ہیں) تم دوسرا کاغذ کس لئے لیتے ہو؟ کیا پہلے میں کچھ جگہ باقی نہیں....؟

اے رجاء! خدا تعالیٰ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے بقیہ جلد پر ہی لکھیئے۔

"اما بعد جس نے رسول خدا صلعم اور قرآن کی تعلیم سے منہ موڑا وہ ہدایت سے دور ہلاکت کے قریب ہو گیا والسلام"

نہیں، نہیں یہ بھی مٹا دیجے۔ کیونکہ اس میں ادبی بناوٹ ہے دوسرا لکھیئے۔ (لکھاتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ اس کے بغیر کوئی چیز قابل قبول نہیں۔ اور جو واقعی اس کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ ان کے لئے رحمت کا باعث ہے اور اس کا فائدہ صرف عمل کرنیوالوں کو ہی ملتا ہے۔ اس کی نصیحت تو بہت لوگ کرتے ہیں۔ لیکن عمل کرنے والے قلیل ہیں۔ والسلام رجا، آپ کی بھی عجیب عادت ہے میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ جب تقریر کے دوران آپ کہنے لگے اور لوگ آپ کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور آپ کی بات لوگوں پر اثر انداز ہونے لگی تو آپ نے اپنی تقریر روک لی اور خدائے تعالیٰ سے نفس کی برائی کی پناہ مانگنے لگ گئے۔ اے امیر المومنین اس کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت عمر: کیا تو نے بھی اسے محسوس کیا ہے میں نے یہ تعجب اور ظاہرداری سے خوف کی وجہ سے کیا کہ کہیں اگر میں نے اپنے عملوں کو اچھا سمجھا ہے تو خدا ان کو ضائع نہ کر دے (تھوڑی خاموشی کے بعد) عدی بن ارطاۃ کو جو خط لکھا گیا ہے وہ کہاں ہے؟

رجاء: اے امیر المومنین پیش خدمت ہے (کاغذ و لسے نکالتے ہیں)

حضرت عمر:۔ اسے پڑھیئے۔

رجاء :۔ (پڑھتا ہے) ہم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو۔ آپکو بہت سے خطوط روانہ کئے گئے۔ ان تمام کے ذریعے میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی چاہتا ہوں اور آپ کو حجاج بن یوسف جیسے اشخاص کی پیروی سے منع کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک مصیبت تھی۔ جو قوم کو ان کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر دی گئی تھی۔ جب تک خدا تعالیٰ کی مرضی رہی وہ حکومت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ختم ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ کی مہربانی سے لوگوں نے اس سے نجات پائی۔ نماز کے بارے میں اس کے طرزِ عمل سے آپ کو منع کرتا ہوں کہ وہ تاخیر سے ادا کرتا ہوں۔ زکوۃ کے بارے میں اس کے طرزِ عمل سے بچنا کہ وہ یہ ناجائز طریقوں سے وصول کر کے غیر مستحق لوگوں کو عطا کرتا تھا ان چیزوں پر عمل کرنے سے ہر صورت میں اجتناب کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دلائی اور لوگوں کو اس کے شر سے پاک کیا

والسلام

حضرت عمر:۔ نہیں، نہیں، یہ بہت طویل ہے دوبارہ باریک قلم سے تنگ سطروں میں لکھیئے کیونکہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم حجاج بن یوسف کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہو اسے ترک کرو کیونکہ وہ نماز ٹھیک وقت پر ادا نہ کرتا اور ناجائز طریقوں سے زکوۃ حاصل کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی بہت سے عیب تھے۔ والسلام

رجاء :۔ اے امیر المومنین! کیا آپ حجاج بن یوسف سے بالکل نفرت کرتے ہیں۔؟

حضرت عمر:۔ اگر قیامت کے دن تمام قومیں اپنی خباثت کا اظہار کر چکیں تو ہم صرف حجاج کو پیش کر کے ان تمام پر غالب ہو جائیں گے۔

رجاء :۔ اے امیر المومنین! بہت سے والیوں کی طرف سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن کا میں نے خلاصہ تیار کیا ہے اجازت ہو تو پیش کروں؟

حضرت عمر:۔ ہاں ضرور کیجئے۔

رجاء :۔ (ایک خط لیکر اس پر نظر دوڑاتا ہے) یہ خط کعبہ شریف کے خدام کی طرف سے ہے۔ وہ درخواست کرتے ہیں کہ کعبہ شریف کے لئے ہر سال نئے غلاف کی ضرورت ہے کہ پہلے خلفاء کے عہد میں دستور رہا ہے۔

حضرت عمر:۔ ان کو لکھیئے کہ وہی پرانا غلاف ہی ٹھیک ہے اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس غلاف کی قیمت کے بدلے بھوکے لوگوں کا کوئی سامان کروں۔ کیونکہ کعبہ کے لیے نئے غلاف کی نسبت ان کی ضرورت زیادہ ہے۔

رجاء :۔ (دوسرا خط لیتے ہیں) یہ خط ایک والی کی طرف سے ہے کہ ایک مجرم پر چوری ثابت ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ثبوت بھی مل گیا ہے کہ اس نے چوری بھوک اور احتیاج ضرورت کی وجہ سے کی۔

حضرت عمر:۔ اس کو لکھیئے کہ اسے کسی قسم کی سزا نہ دی جائے بلکہ اس کی ضرورت کے مطابق اسکا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ (چراغ میں کچھ خرابی ہو جاتی ہے حضرت عمر اُٹھکر اس کو ٹھیک کرتے ہیں)

رجاء :۔ (ان کو کھڑا دیکھتا ہے) آپ نے یہ تکلیف کیوں کی، مجھے ہی فرما دیا ہوتا۔

حضرت عمر:۔ اس میں نئی بات کونسی تھی۔ جب میں گیا تو بھی عمر بن عبد العزیز تھا۔ اور جب واپس آیا تو بھی عمر بن عبد العزیز تھا۔ اے رجاء اپنے کام کو جاری رکھیئے۔

رجاء :۔ (تیسرا خط لیتے ہیں) یہ مدینہ کے عامل کی طرف سے ہے جو لکھنے کے کاغذوں کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔

حضرت عمر:۔ اس کو لکھیئے کہ وہ باریک قلم کے ساتھ مختصر بات لکھا کریں۔ عجیب بات ہے کہ مسلمان کے مال سے کاغذ لیتے ہیں اور ان پر باریک قلموں کے بجائے موٹی قلمیں استعمال کرتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ ان کے خطوط ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوں۔ مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ مسلمانوں کا مال بے جا

استعمال کیا جائے۔

: (چوتھا خط نکالتے ہوئے) یہ ابن ارطاۃ کی طرف سے ہے کہ لوگوں کے دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے خراج میں کمی ہوگئی ہے۔

رت عمر: (خدا ہی ان کو حق سمجھائے) اسے لکھیئے کہ خدا تعالیٰ نے محمد صلعم کو ہادی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ مال جمع کرنے کے لئے — میری تو خواہش یہ ہے کہ خدا کرے تمام لوگ مسلمان ہو جائیں اور آپ اور ہم سب کھیتی باڑی سے اپنا گزارہ چلائیں۔

: (پانچواں خط پڑھتے ہوئے) اے امیر المومنین! یہ عامل لوگوں کے کاموں میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے نماز میں تھوڑی دیر ہونے کی اجازت مانگتے ہیں۔

رت عمر: ان کو لکھیئے کہ نماز کے وقت کام سے پرہیز کریں۔ کیونکہ مسلمان نماز کو ضائع نہیں کرتے۔

: (چھٹا خط نکالتے ہوئے) ایک والی پوچھتے ہیں کہ ایک آدمی پر حد جاری کرنی ہے مگر اس معاملے میں شبہ ہے۔

ت عمر: ان کو لکھیئے کہ جہاں تک ہو سکے شبہ والی سزاؤں سے درگذر کریں کہ معافی دینے میں خطا ہو جاتی ہے وہ سزا دینے کی خطا سے بہرحال بہتر ہے۔

: اے امیر المومنین! خدا تجھے بھلائی سے رکھے بس یہی آخری تھا۔

(حضرت عمر کا غلام ابو اُمیّہ ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے)

یہ: اے امیر المومنین! میری فریاد کو پہنچو۔ مجھ پر زیادتی کی گئی ہے

ت عمر: کس نے تجھ پر زیادتی کی ہے؟

یہ: میری مالکہ (امیر المومنین کی بیوی) نے مجھ پر میرا معاملہ سخت کر دیا ہے۔ مجھے کھانے کے لئے ہر روز دال ہی ملتی ہے۔ آج جب میں نے ہر روز کی دال پر اعتراض کیا تو جواب ملا — کہ خود امیر المومنین کا ایک ماہ سے یہی کھانا ہے جب میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سب خلافت کی ذمہ داری کی وجہ سے ہے کاش کہ ہم پر یہ ذمہ داری ڈالی ہی نہ جاتی۔ کیوں نہ ہم نے اس کے شروع ہی سے کوئی آرام نہیں پایا۔

حضرت عمر: اے ابو امیّہ! تو ٹھیک کہتا ہے۔ خدا نے ہمارے لئے سادہ غذا ہی پسند فرمائی ہے میں دال کو اسی صورت بدلتا ہوں جبکہ دوسرا کھانا اس سے کمتر ہو۔ کیونکہ جس نے پیٹ کی پوجا کی وہ ہلاک ہوا۔

رجاء: اے امیر المومنین! خدا کی قسم آپ ایک عادل امام، بہت ہی نیک انسان، بھلائی کرنے والے خلیفہ ہیں۔

حضرت عمر: سوچ کر بات کرو۔ حقیقت کو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے (غلام سے) اپنے کام کی طرف جائیں اور جو کچھ خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے اس پر صبر کرو۔ ہم نے کبھی اچھی چیز آپ سے چھپا کر نہیں کھائی۔ ہر وقت موت کا خیال کیجئے کہ یہ پیاری چیزوں سے میری رغبت کو کم کر دے گی۔

(بشکریہ "مقاصد")

کوثر نیازی •

دو غزلیں

○

جب زیست کے مشکل لمحوں میں اپنے بھی کنارا کرتے ہیں
اس وقت بھی ہم اے اہلِ جہاں! ہنس ہنس کے گزارا کرتے ہیں

تھوڑی ہی کسر بس باقی ہے، دنیا کے جہنم بننے میں!
ماحول گواہی دیتا ہے، حالات اشارا کرتے ہیں

صیاد نے تیرے اسیروں کو آخر یہ کہہ کر چھوڑ دیا!
یہ لوگ قفس میں رہ کر بھی گلشن کا نظارا کرتے ہیں

جذبات میں آ کر مرنا تو مشکل سی کوئی مشکل ہی نہیں
اے جانِ جہاں! ہم تیرے لئے جینا بھی گوارا کرتے ہیں

منجدھار میں ناؤ ڈوب گئی تو موجوں سے آواز آئی
دریائے محبت سے کوثرؔ یوں پار اتارا کرتے ہیں

(نوائے وقت)

○

حرم کے گوشۂ خلوت سے تا بہ دار آئے
کہاں کہاں تجھے اہلِ جنوں پکار آئے

عروسِ دہر! سُنا ہے کہ چند دیوانے
لہو کے عطر سے گیسو ترے سنوار آئے

حضورِ عشق میں ہم ایسا کامیاب نہیں
نگاہِ عقل میں بازی اگرچہ ہار آئے

حیاتِ خضر بھی ان کے عوض نہیں منظور
وہ چند روز جو زنداں میں ہم گذار آئے

قفس میں رہ کے بھی دل سے نہ جا سکی کوثرؔ!
یہ آرزو کہ چمن میں کبھی بہار آئے

(نوائے وقت)

عرفان اللہ صدیقی
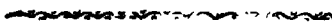
قیدی

(یہ ذکر ایک اسلامی ملک جمہوریہ کا ہے جو ابھی ابھی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوا ہے……)

جیوری پروقار طور پر خاموش بیٹھی ہوئی فیصلہ لکھ رہی تھی۔
لا، کبھی خاموش کھڑے تھے کمرۂ عدالت کے باہر لاکھوں انسانوں کا
ٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ بڑی خاموشی سے فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا۔
الت کے در و دیوار پر دہشت برس رہی تھی۔ عدالت کے کمرہ سے
ن کی بو آرہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان در و دیوار نے
خون کیا ہو آج ملک کے مشہور رہنما ابوالحسن صاحب کے مقدمہ
فیصلہ تھا۔ ابوالحسن صاحب پر حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام
ا۔ برسر اقتدار لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ہماری حکومت کا تختہ الٹنا
ہتا تھا۔ عدالت سے دور دو آدمی آپس میں باتیں کرتے چلے آرہے
تھے۔ ایک نے کہا:۔

"بھئی ہم نے اس ملک کے لئے گراں بہا قربانیاں دی ہیں۔
کی بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کا خون ہے۔ ان شہیدوں میں معصوم
بچے، بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں تک شامل ہیں۔ اس ملک کی وجہ سے
ہزاروں سے زیادہ پاکیزہ مغویہ بہنوں کی عصمتیں لٹی ہیں۔ یہ ملک صرف
للہ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہمارے رہنماؤں نے ہم سے وعدہ
کیا تھا۔ کہ آزادی ملنے کے بعد ملک میں خدا کا قانون نافذ ہوگا۔ اور
خلفائے راشدین کی جیسی حکومت ہوگی۔ لیکن وعدوں کے برعکس یہاں
فسق و فجور اور بھی بڑھ گیا۔ جو ظلم غلامی کے دور میں ہوتا تھا۔ اب اس
سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اگر ابوالحسن صاحب نے اس کے خلاف
احتجاج کیا۔ اور ارباب اقتدار کو ان کے وعدے یاد دلائے تو ان پر
بغاوت کا الزام لگا کر انھیں جیل میں ٹھونس دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے
الزام اس شخص کے خلاف ہے جس کی راست بازی، کردار کی پختگی
سلامت روی کا اعتراف ان کے بدتر سے بدتر مخالف کرتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس دور میں نہ صرف ہمارے ملک بلکہ عالم
اسلام میں اپنی بعض خوبیوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے منفرد شخصیت
ہیں۔ یہ اس ملک کا تن تنہا وہ راہنما ہے جس کے سامنے انسانی زندگی
کی اصلاح و تطہیر کا ایک ایسا اجتماعی مشن ہے جس کی کامیابی سارے عالم
اسلام میں اسلامی سیاست کے عروج اور مسلم تہذیب کی نشاۃ ثانیہ
کی ضمانت ہے ہمارے ملک میں صرف یہی ایک رہنما ہے جس کے متعلق
ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حق گو، راست باز، فعال اور اسلامی
فکر و نظر رکھنے والا رہنما ہے۔ دیکھئے جیوری آج کیا فیصلہ سناتی ہے؟
جیوری سے انصاف کی امید تو ہے نہیں۔ کیونکہ انتظامیہ یعنی حکومت
کا دخل اور اثر عدلیہ میں بھی ہے۔ باتیں کرتے کرتے دونوں شخص عدالت
کے کمرہ میں پہنچ گئے۔ جیوری نے قلم روک دیا۔ منہ اٹھا کر مجمع کی طرف
دیکھا۔ اور سپاہیوں کو حکم دیا جو سنگین تانے کھڑے تھے۔ تمام لوگوں کو
عدالت کے کمرہ سے باہر نکال دو۔ ماسوائے وکلاء کے۔ سپاہیوں نے
آناً فاناً تمام لوگوں کو باہر نکال دیا۔ بہت سوں کو شک ہوا۔ کہ کہیں
پھانسی کی سزا نہ دیدی جائے۔ لیکن خاموشی سے باہر نکل گئے جیوری
نے بلند آواز سے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

ابوالحسن نے چونکہ حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کی تھی
اور عوام میں مذہبی اسپرٹ پیدا کر کے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔ اس
لئے اس کو عمر قید کی سزا با مشقت دی جاتی ہے۔

مجمع جو بالکل ساکن اور خاموش کھڑا تھا۔ یکدم چیخ اٹھا۔ یہ
ظلم ہے ظلم۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ابوالحسن اپنی قیمتی زندگی جیل
کی تاریک کوٹھڑیوں میں نہیں گزار سکتے۔ ہم حکومت کا تختہ الٹ
دینگے، لیکن ابوالحسن صاحب کو جیل میں نہیں رہنے دیں گے۔

سن صاحب کی جماعت فلاح انسانیت کے کارکن بھی باہر کھڑے تھے
پر یہ فیصلہ بجلی بنکر گرا۔ لیکن وہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے
ے۔ اور فوراً مجمع کو خاموش کراکر عدالت سے ذرا فاصلہ پر ایک جلسہ
نے لگے جس میں انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ کوئی غیر قانونی نعرہ
لگائیں۔ اور نہ ہی کوئی غیر قانونی حرکت کریں۔ البتہ اپنے رہنما کو رہا
نے کے لئے آئینی جدوجہد کریں۔ فلاح انسانیت کے کارکن ملک کے
ے گوشہ میں پھیل گئے۔ ہر طرف سے رہائی کے مطالبات شروع ہو گئے
سے ہوئے جلوس نکالے گئے، رہائی کی قراردادیں پاس ہوئیں لیکن
ب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ملک کے انتخابات بھی
یک آگئے۔ اس لئے انھوں نے اعلان کردیا کہ اگر ابوالحسن صاحب معافی
م کی درخواست کریں تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ ان کے دوستوں
ان سے ملاقاتیں کیں اور ان سے کہا کہ معافی مانگ لو، ورنہ ساری
گی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گزارنی پڑیگی مشقت
مدہ۔ انکی بیوی نے بھی انھیں خط لکھا۔ لیکن اس مرد مجاہد کا جواب
ل صد آفرین تھا۔ انھوں نے جواب میں لکھا۔

مسعودہ! تم پر خدا کی رحمت ہو۔

تمھارا خط اس وقت میرے پاس ہے۔ اگرچہ میں ان ظالموں
سیر ہوں اور تم سے کوسوں دور ہوں۔ تمھاری صورت تک نہیں
ھ سکتا۔ لیکن خط کی عبارت پڑھتے ہوئے تمھارا تصور میرے ذہن
ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھاری آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ اور
اری مخروطی انگلیاں جن سے تم کبھی میرے بالوں میں کنگھی کیا کرتی
ہیں خط لکھتے ہوئے لرز رہی ہیں۔ مسعودہ! میں سمجھ رہا ہوں۔ کہ
ہیں میری گرفتاری اور پھر عمر قید کی سزا با مشقت پر زبردست صدمہ
ابل برداشت صدمہ ہوا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری گرفتاری نے
ارے دل پر زبردست چوٹ لگائی ہوگی۔ میں تمھارا محبت بھرا دل
ھر دور افتادہ مقام پر اسیری کی مصیبتیں جھیل رہا ہوں۔ اور یہ تک
یں سوچتا کہ ایک عورت میرے فراق میں رات تارے گنتے گنتے کاٹ
تی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے جیل سے
بت ہوگئی ہے۔ جیل کی آہنی سلاخوں سے عشق ہوگیا ہے۔ مسعودہ!
مجھے صرف ایک چیز سے محبت ہے اور وہ تم ہو۔ لیکن تم سے بھی زیادہ
عزیز چیز ایک اور ہے اور وہ ہے میرا فرض۔ مجھے اپنے فرض سے عشق
ہے۔ عشق اور جیل میں میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں مجھے میرا فرض
یہاں لے آیا۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے
اور میں یہ جہاد کرتا رہا ہوں، کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس جہاد
پر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ میں تم سے اس
لئے جدا نہیں ہوا کہ اپنے لئے مال و دولت جمع کروں میں سلطنت
جاہ و حشم کا بھی خواہشمند نہیں۔ میں صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں اور
اسی فرض کی ادائیگی کی وجہ سے تم سے جدا کر دیا گیا۔ میری آزادی سلب
کر لی گئی۔ اس فرض کے ادائیگی کی وجہ سے تم سے تو دور ہوگیا ہوں لیکن
اس نے مجھے خدا اور اس کے محبوب کا قرب بخشا ہے۔ تمھاری جدائی
اگرچہ میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ اگر مجھ سے دنیا کی ہر چیز
چھین لی جاتی۔ لیکن تم نہ چھینی جائیں۔ میں تب بھی خوش ہوتا لیکن
تمھارا چھن جانا میری روح کے لئے بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔ مگر اسکے
باوجود میں خوش ہوں۔ مجھے اس وقت بے پایاں مسرت ہے اور وہ
اس لئے کہ [illegible] ے عزم [illegible] ے ارادے کو کوئی چیز متزلزل کرسکی تو وہ
تمھاری جدا[illegible] اللہ کا [illegible] ہے کہ میں نے اپنے فرض کی خاطر تمھاری
رفاقت کو بھی قربان کر دیا۔ تمھاری جدائی بھی میرے عزم واستقلال
کو متزلزل نہ کرسکی۔ تمھاری جدائی ہی میرے لئے سب سے بڑی آزمائش
تھی۔ اللہ کے فضل سے میں اس میں پورا اترا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی
محبت اور حکم کو اپنی محبت اور اپنی خواہشات سے مقدم رکھا خداوند
کا احسانمند ہوں کہ اس نے مجھے اس میں ثابت قدم رکھا اور میں
کامیاب ہوگیا۔ مسعودہ اس سے تمھیں بھی خوش ہونا چاہیئے۔ اور
خداوند عالم کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے تمھارے خاوند کے کردار
پر آنچ نہیں آنے دی، اس نے تمھارے شوہر کا ایمان مضبوط رکھا
اس نے اپنی محبت تمھارے شوہر کے دلمیں اتنی راسخ کردی کہ اس نے
تمھاری محبت کو بھی قربان کر دیا۔ مسعودہ تم نے لکھا ہے کہ کوئی صورت
رہائی کی نکالوں۔ اور اگر مناسب سمجھوں تو تمھیں رحم کی درخواست کرنے
اجازت دیدوں۔ مسعودہ! میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ خیال

ے دل میں کیسے آیا کہ تم ان ظالموں سے میرے لئے رحم کی درخواست
کیا تم یوسفؑ کے قصہ کو بھول گئیں ؟ تم ان ظالموں سے رحم کی
ست کرتی ہو ؟ کیا تم ان اقتدار پرستوں سے رحم کی امید کرتی
اور کھو اگر تم نے ان سے رحم کی درخواست کی تو میں تمھیں کبھی
ا نگا۔ آخر میرا کونسا جرم ہے میں نے کونسا گناہ کیا ہے جو میں
سے رحم کی درخواست کردوں۔ میرا جرم صرف اتنا ہی تو ہے کہ حق کو
ر باطل کو باطل کہتا ہوں فسق و فجور پر ٹوکتا ہوں اور اگر یہ جرم
ناہ ہے تو یہ ایک بار نہیں سو بار بھی جرم اور گناہ کروں گا۔
ے مجھے تختہ دار پر ہی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔ مسعودہ خدا کے حضور
دعا کرو کہ وہ میرا جہاد قبول فرمائے۔ تم خود بھی جہاد کرو۔ اور
جہاد یہ ہے کہ تم بھی اپنی ... ت اور خواہشات پر اللہ کی محبت اور
ا حکم مقدم رکھو۔ اپنے شوہر کے عزائم کو اور بھی راسخ کرتی رہو مسعودہ
ے ہونٹ جام شہادت کے پیاسے ہیں میں چاہتا ہوں کہ شربت
بت کا جام میرے لبوں سے لگ جائے۔ تم جانتی ہو ان لبوں نے
ب شراب نہیں چھوئی۔ ان لبوں سے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں
یہ لب ہمیشہ ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ خدا سے دعا کرو۔ اللہ
اس تمنا کو پوری کردے۔ مسعودہ تم حق کے لئے ہر مصیبت کا
پیشانی سے مقابلہ کرنا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ تمھارا
و ناصر ہو۔ رفیقوں کو سلام کہہ دینا ــــ

تمھارا ابوالحسن ... سنٹرل جیل

مسعودہ خط پڑھکر سجدہ میں گر گئی۔ اور خدا کے حضور میں گڑگڑا
کرنے لگی یا اللہ تم ہمیں بھی ایسا ہی عزم و استقلال عطا فرما۔
رے حق پرست شوہر کو کامیابی و کامرانی عطا فرما .....

نیلا آسمان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس کا خداوند بھی اس کی
یں سن رہا تھا کہ فضا میں فلک شگاف نعرے بلند ہوئے ... ساری
خدا کے لئے ہے۔ اسی نے آج حق کا بول بالا کیا ــــ لاوڈ اسپیکر
ح انسانیت کے کارکن الیکشن کے نتیجہ سے عوام کو آگاہ کر رہے
فلاح انسانیت نے اسی فیصدی نشستیں جیت لیں۔ ریڈیو
ا لگنے لگا۔ جمہور کے صدر نے فلاح انسانیت کے لیڈر کو
وزارت بنانے کی دعوت دیدی ہے اور ان کے محبوب رہنما ابوالحسن
صاحب کو رہا کر دیا گیا ہے۔ نئی پارٹی نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ملک
کا نظام اسلامی ہوگا۔ در و دیوار سے اسلامی نظام کی صدائیں بلند
ہونے لگیں، اور مغرب میں چھپنے والا سورج بھی مسکراتا ہوا رخصت
ہونے لگا۔ اور مسعودہ پھر سجدہ میں گر گئی ٭

اویس احمد ادیب (ایم۔اے)

رابندرناتھ ٹیگور کی ایک کہانی بطرز ریڈیائی فیچر

پردیسی

کردار

بابوجی ——— منّی
منّی کی ماں ——— کابلی
سپاہی

بابوجی :۔ (آواز دیتا ہے) منّی کی ماں — منّی کی ماں! ذرا دیر کیلئے تو منّی کو اپنے پاس بُلالو۔

منّی کی ماں :۔ (دُور سے گرجتی ہوئی مانگ پر آتی ہے) بس تمھاری یہی باتیں تو مجھکو بری معلوم ہوتی ہیں۔ ذرا جا کر لڑکی کھڑی ہوئی، اور تم نے آفت برپا کی۔

بابوجی :۔ (گھبرا کر) اچھا بھئی اچھا، خطا ہوئی، معاف کرو۔

ماں :۔ لاحول ولاقوۃ — ناول — ناول لکھا جا رہا ہے۔ آخر پڑھنے لکھنے کا کوئی وقت بھی ہے تمھارا؟

بابوجی :۔ خدا کے واسطے جاؤ بھی تم اب — اپنی تقریر ختم کرو اور میرا گناہ معاف کرو۔

ماں :۔ ہائے ہائے، میری تو بولی بھی بُری معلوم ہوتی ہے ان کو۔ لو میں جاتی ہوں۔ (جاتی ہے)

منّی :۔ بابوجی! سبوَدھ کوّے کو کاگ کہتا ہے، وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور امّی بھی کاگ کی طرح چلّاتی رہتی ہیں۔

بابوجی :۔ (ہنستا ہے) بیٹی! ہر بچہ الگ الگ بولی بولتا ہے ہر انسان کا اندازِ گفتگو الگ الگ ہوتا ہے۔ تمھاری امّی کی بولی بھی سب سے الگ ہے۔

منّی :۔ ہوں — اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آسمان سے جو پانی برستا ہے وہ ہاتھی اپنی سونڈ سے برساتے ہیں۔

بابوجی :۔ وہ ایسی ہی جھوٹی باتیں کرتا ہے۔

منّی :۔ اور کیا؛ جب دیکھو وہ بک بک کرتا رہتا ہے۔

بابوجی :۔ ہاں، بالکل تمھاری طرح۔

منّی :۔ (تعجّب سے) میری طرح؟ میں تو بکواس نہیں کرتی۔

بابوجی :۔ تمھیں تکلیف ہوئی "بکواس" کہنے سے۔ اچھا منّی اب بُرا نہیں کہوں گا۔

منّی :۔ بابوجی! میری ماں تمھاری کون ہیں؟

بابوجی :۔ (قہقہہ لگا کر) واہ ری منّی واہ۔ تیری بعض باتوں کا پاس کوئی جواب ہی نہیں ہے۔

منّی :۔ بتا دیجئے بابوجی!

بابوجی :۔ جاؤ منّی، تم سبوَدھ کے ساتھ کھیلو۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔

منّی :۔ اچھا! بابوجی وہ جا رہا ہے میرا کابلی (آواز لگاتی ہے) کابلی — او کابلی!

کابلی :۔ (قریب آ کر) سلام بابوجی!

منّی :۔ تیرے جھولے میں کیا ہے کابلی؟

کابلی :۔ میوہ ہے۔ منّی تو کھائے گی؟ — یہ لو منّی — میوہ — میوہ! —

منّی :۔ (تعجّب سے) میوہ؟

کابلی :۔ ہاں میوہ! خوبانی، کشمش، بادام۔

منّی :۔ ماں تو کہتی ہیں کہ کابلی اس جھولے میں لڑکیوں کو بند کر کے لے جاتے ہیں۔

:- (قہقہہ لگا کر) تمھاری ماں بہت ڈرتی ہیں منی۔

:- ماں کہتی ہیں کہ کابلی کے پاس نہ جایا کرو۔

:- کیوں؟

:- معلوم نہیں۔

:- منی! میں اب تمھارے لئے روز میوہ لایا کروں گا۔

:- کابلی! یہ مناسب نہیں ہے کہ منی کو پھل دے کر تم نقصان اٹھاؤ۔

:- گھر کی دوکان ہے بابوجی!

:- ٹھیک ہے مگر تم پردیسی ہو اور گھر بار چھوڑ کر چار پیسے کمانے نکلے ہو۔

:- منی بہت موہنی ہے بابوجی!

:- میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے کابلی؟

:- جواب دینے کی بات بھی تو ہو بابوجی!

:- یہ لو اٹھنی، آج کے میوے کی قیمت۔

:- اچھی بات ہے بابوجی (ٹھنڈی سانس لے کر) میں پردیسی ہوں، میرا اعتبار ہی کیا؟

:- کابلی اب مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا۔ (جاتا ہے)

:- منی! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ لو یہ اٹھنی تم ہی رکھ لو۔

:- لاؤ۔

:- منی! تم سسرال جاؤ گی؟

:- اور کابلی تم سسرال کب جاؤ گے؟

(قہقہہ)

:- اچھا منی۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر آؤں گا۔

:- ضرور آنا کابلی ــــ اور جھولی میں کیا لاؤ گے؟

:- ہاتھی ــــ (قہقہہ) ــــ (جاتا ہے)

:- منی ــــ اتنی آوازیں دیں تم کو ــــ اور تم سنتی ہی نہیں۔

:- میں اپنے کابلی سے باتیں کر رہی تھی ماں!

:- اُفوہ: تجھے کابلی کتنا اچھا لگتا ہے۔

منی :- وہ مجھے میوہ اور پیسے دے گیا ہے ماں!

ماں :- پیسے؟ ــــ دیکھوں ــــ ارے اٹھنی ــــ!

منی :- ہاں ــــ کابلی نے مجھے میوہ دیا اور اٹھنی بھی۔

ماں :- ضرور اس کے دل میں کوئی کھوٹ ہے (منی کو مارتی ہے) تو نے یہ اٹھنی کیوں لی؟ ــــ ایک ــــ دو ــــ تین ــــ توبہ کر ــــ اب تو نہیں لے گی پیسے کابلی سے؟

منی :- (چلاتی ہے اور روتی ہے) نہیں ماں، اب نہیں لونگی۔

بابوجی :- یہ کیا ہو رہا ہے؟ منی کو پیٹا ہے؟ ــــ کیوں؟

ماں :- اس کی عادت خراب ہو گئی ہے، اس نے کابلی سے پیسے لئے ہیں۔

بابوجی :- منی! دیکھوں بیٹی؟

ماں :- یہ لو اٹھنی ــــ جو کابلی اس کو دے گیا ہے۔

بابوجی :- اٹھنی!

ماں :- ہاں اٹھنی!

بابوجی :- یہ اٹھنی تو کابلی کو میں دے گیا تھا۔

ماں :- نہیں ــــ تم نے اس کو یہ اٹھنی نہیں دی، وہ کہتی ہے کابلی نے اس کو دی تھی۔

بابوجی :- ہاں ــــ میں نے یہ اٹھنی کابلی کو ہی دی تھی۔ وہ پھلوں اور میوہ کی قیمت نہیں لے رہا تھا۔ اس وجہ سے میرے جاتے ہی وہ شاید یہ اٹھنی منی کو دے گیا ہے۔

ماں :- پھر بھی اس نے یہ کیوں لی؟ اس طرح عادت بگڑ جاتی ہے۔ کل کو اگر وہ اسے کوئی اور چیز دیگا تو یہ لے لے گی۔

بابوجی :- یہ عادت تو ضرور بری ہے مگر میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ کابلی منی کو اپنی بیٹی سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔

ماں :- تم نے دھوپ میں بال سفید کئے ہیں کیا؟ ان کابلیوں سے تم واقف نہیں ہو؟ یہ لڑکیاں اور لڑکے چرا کر لے جاتے ہیں۔

بابوجی :- تم تو بڑی وہمی اور شکی ہو۔

ماں :- (بگڑ کر) جب دیکھو میری بات ہنسی میں اڑا دیتے ہو کیا

کبھی کوئی بچہ چوری نہیں گیا ؟

بابوجی :- بہت سے بچے چوری ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا سب کے سب کابلی لے جاتے ہیں ؟

ماں :- میں کہتی ہوں ان کا اعتبار نہیں، کیا وہ کابلی منی کو بہلا پھسلا کر نہیں لے جا سکتا ؟

بابوجی :- ہو سکتا ہے۔

ماں :- تم تو کچھ اونچ نیچ سوچتے ہی نہیں ہو۔ اب اگر وہ آئے تو اسے منع کر دینا کہ وہ ہمارے دروازے پر قدم نہ رکھے۔

بابوجی :- (آہستہ سے) ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت میں فرق پڑ جائے (زور سے) منی کی ماں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ آج سے میں کابلی کو آنے نہ دوں گا۔

(یکایک دور سے شور و غل کی آواز نزدیک آتی ہے)

منی :- ماں! وہ ہے کابلی ... کابلی ... او کابلی!

کابلی :- منی!

پہلا سپاہی :- چلو سیدھے چلتے ... یہاں کہاں رک گئے ؟

کابلی :- بھائی اپنی منی سے تو بات کر لوں۔

بابوجی :- (تعجب سے) یہ کیا ہوا کابلی؟ تمہارے کپڑوں پر خون کے دھبے ؟

دوسرا سپاہی :- اور یہ چھری بھی تو دیکھئے بابوجی!

بابوجی :- (گھبرا کر) یہ کیا معاملہ ہے کابلی ؟

کابلی :- بابوجی! آپ کے پڑوس میں ایک چپراسی رہتا ہے۔ اس نے روپیہ دینے کے بجائے مجھے گالی دی۔ اس پر جھگڑا بڑھا اور میں نے اس کے چھری گھونپ دی۔

بابوجی :- ایسا غصہ حرام ہوتا ہے کابلی!

منی :- کابلی! اپنی سسرال کب جاؤ گے؟

کابلی :- سسرال جا رہا ہوں منی!

منی :- اور اب پھل لیکر کب آؤ گے؟

کابلی :- (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جب سسرال سے لوٹوں گا منی!

منی :- نہیں کابلی ... نہ جاؤ سسرال ... رو رہے ہو تم کابلی؟

کابلی :- (سسکیاں بھر کر) ہاں، اس لئے کہ اب اپنی پیاری منی سے ملنے نہ آ سکوں گا۔

سپاہی :- چلو، چلو ...

کابلی :- چلو ...

(منظر تبدیل ہوتا ہے)

(سات سال بعد)

(شادی کے نغمے، نفیری کا بجنا، شور و غل)

بابوجی :- آج میرا دل بہت خوش ہے۔ میرا گھر مہمانوں سے ... ہولہے۔

ماں :- منی بھی آج بہت خوش ہے۔

بابوجی :- یہ سب کی خوشی کا دن ہے۔

ماں :- یہ دیکھو حساب ...

بابوجی :- میں حساب دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ابھی کتنے روپے کی ضرورت اور پڑے گی؟

ماں :- مرد ہو کر جب تم کو نہیں معلوم، تو میں عورت ہو کر بتا سکتی ہوں۔

کابلی :- سلام بابوجی!

بابوجی :- (بگڑ کر) کون ہو جی تم؟ کیوں آئے ہو یہاں؟

کابلی :- مجھے پہچانا نہیں بابوجی؟

بابوجی :- میں نے کبھی کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا۔

کابلی :- اب سے سات سال پہلے دیکھا ہے بابوجی؟

بابوجی :- کیوں جھوٹ بولتے ہو ... لمبے لمبے بال، دبلا پتلا لمبا چہرہ ... مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کوئی ایسا آدمی کبھی دیکھا ہے۔

کابلی :- (کمزور آواز میں) ٹھیک ہے بابوجی ... میں بھی تو ایسا نہیں تھا۔ میں کابلی ہوں۔

بابوجی :- ارے کابلی ہو تم؟

کابلی :- ہاں بابوجی ... بہت کمزور ہو گیا ہوں۔

بابوجی :- کب جیل سے آئے ہو تم؟

:- آج ہی جیل سے چھوٹا ہوں، پورے سات سال بعد؛

:- اچھا کابلی ـــ اب تم جاؤ پھر آنا۔

:- بہت اچھا بابوجی (جاتا ہے)

:- اچھا ہوا جو تم نے اس کو ٹال دیا۔ ایسے موقعوں پر خونیوں کا موجود ہونا شگون خراب کر دیتا ہے۔

:- ہاں ـــ تو حساب کتنا ہے؟

:- بابوجی!

:- ارے تم پھر لوٹ آئے؟

:- میری منی کہاں ہے بابوجی؟

:- (بے توجہی سے) آج گھر میں کام ہے تم منی سے مل نہ سکو گے کابلی!

:- (خوشامدانہ لہجہ میں) اچھا بابوجی ـــ یہ انگور، یہ کشمش اور تھوڑے سے یہ بادام میری منی کو دیدیجئے

:- اچھی بات ہے ـــ یہ لو اس کی قیمت۔

:- (قدرے تیزی سے) بس بابوجی میں تمھاری مہربانی کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے یہ قیمت دیکر دکھ پہنچا ہے ہو تمھاری منی جیسی میرے بھی ایک لڑکی تھی۔ میری بیٹی کا چہرہ اور ڈیل ڈول سب کچھ منی سے ملتا جلتا ہے مجھے منی سے اپنی بیٹی کیطرح محبت ہے اس لئے میں کبھی کبھی منی کے لئے میوہ لے آتا ہوں

:- اچھا اچھا، میرا ہاتھ تو چھوڑ دو بھائی!

:- اور بابوجی اس پڑیہ میں جو کچھ ہے وہ بھی منی ہی کے لئے ہے۔

:- (پڑیہ کھول کر) سونے کی انگوٹھی! رو رہے ہو کابلی؟

:- ہاں بابوجی ـــ اپنی منی اور اپنی اکلوتی بیٹی کو یاد کر کے رو رہا ہوں۔

:- (آواز دیتے ہیں) منی ـــ بیٹی منی!

:- بس بس، منی اب کابلی کے سامنے نہیں آئے گی

:- کوئی جرم نہیں ہے، منی کو آنے دو۔ اسکا کابلی آیا ہے۔

:- مہمانوں سے گھر بھرا پڑا ہے۔ ابھی تھو تھو ہونے لگے گی۔

:- اس کی پروا نہ کرو تم!

منی :- (نزدیک آکر) بابوجی!

بابوجی :- منی ـــ تمھارا کابلی آیا ہے بیٹی!

کابلی :- (ہنس کر) اب منی سسرال جائے گی ـــ دیکھ لیا اپنی منی کو ـــ بڑی ہو گئی ہے منی تو؟

بابوجی :- اور کیا۔ تم اب بھی منی کو پہلے کی طرح سمجھ رہے تھے؟

کابلی :- ہاں بابوجی۔

بابوجی :- تم ٹھنڈی سانسیں لے رہے ہو کابلی؟

کابلی :- منی جاؤ ـــ گھر میں جاؤ، خدا تمھیں خوش و خرم رکھے۔

بابوجی :- اور اب سر پر ہاتھ رکھکر کیا سوچ رہے ہو کابلی؟

کابلی :- یہ سوچ رہا ہوں بابوجی کہ میری بیٹی بھی اب اتنی ہی بڑی ہو گئی ہوگی۔

بابوجی :- لڑکی کی ذات بہت جلدی بڑھتی ہے۔

کابلی :- سات سال سے مجھے اس کی خبر نہیں۔ معلوم نہیں زندہ بھی ہوگی وہ؟ (سسکیاں لیتا ہے)

بابوجی :- رو نہیں کابلی ـــ جاؤ اپنے وطن جاکر اسے دیکھ آؤ۔

کابلی :- ایک پیسہ بھی پاس نہیں ہے بابوجی۔ سات سال بعد منی کو دیکھنے آرہا تھا۔ خالی ہاتھ بیٹی کو دیکھنے کیسے آتا۔ میوہ بھی ادھار لیکر آیا ہوں۔ یہ انگوٹھی ایک صاحب کے پاس امانت تھی۔ وہ مل گئی۔ جو میں نے اپنی پیاری بیٹی کو دیدی۔

بابوجی :- ہونھ!

کابلی :- دوکان تباہ ہو گئی۔

بابوجی :- اچھا کابلی ـــ یہ لو پچاس روپے، تم وطن جاؤ، اپنی بیٹی کو دیکھو اور باپ کی محبت کو ٹھنڈا کرو۔

کابلی :- بابوجی! خداوند تعالیٰ آپ کو دھن اور دولت دے۔ آپکے اقبال کو بلند کرے۔ آپ نے یہ روپے دیئے اور میں نے لئے یہ خرچ کا وقت ہے بیٹی کا بیاہ ہے۔ اس کو آپ میری طرف سے منی کے بیاہ میں لگا دیجئے۔ آج اگر میری دوکان ہوتی، تو اپنی منی کے گھر کو میووں سے بھر دیتا (ٹھنڈی سانس لیکر) منی آج سسرال جا رہی ہے اور میں آج اپنی سسرال سے

لوٹا ہوں۔

بابوجی :۔ رنجیدہ نہ ہو کابلی — لو یہ لو — ہاتھ بڑھاؤ۔

کابلی :۔ یہ ہاتھ لینے کے لئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آج لینے کا دن نہیں، دینے کا دن ہے۔

بابوجی :۔ یہ تو وقت کی بات ہے کابلی — میری خوشی یہی ہے کہ تم یہ روپیہ لے لو۔

کابلی :۔ اگر آپ کی مرضی ہے تو میں لئے لیتا ہوں اور منی کے لئے کوئی تحفہ لائے دیتا ہوں۔

بابوجی :۔ ہرگز نہیں کابلی — تم پردیسی ہو اور پردیس میں ہو — جاؤ اور ابھی جاؤ۔ سیدھے اپنے وطن جاؤ، تمھاری بیٹی بھی شادی کے قابل ہو گئی ہو گی ...... مگر ...... کابلی .... اپنی منی کے لئے دعا کرنا۔

کابلی :۔ منی ہمیشہ سکھی رہے گی بابوجی!

بابوجی :۔ بس جاؤ کابلی — ابھی روانہ ہو جاؤ، اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس ......

کابلی :۔ سلام بابوجی! (جاتا ہے)

ماں :۔ مگر اب پچاس روپے کی کمی پڑ جائے گی۔

بابوجی :۔ خدا کو خوش کرنے سے کمی نہیں آتی۔ اس کام کو روحانی خوشی سے بھی جگمگا لینے دو۔

ماں :۔ جاؤ، جاؤ بارات آرہی ہے، براتیوں کا استقبال کرو

(دُور سے باجے کی آواز آتی ہے اور نزدیک آ کر ختم ہو جاتی ہے)

(بشکریہ "جنگ")

اعتذار

گذشتہ شمارہ (مارچ سنہ ۵۵ء) میں صفحہ ۵۳ پر محمد قاسم صاحب نوری کا "مشورہ" کچھ غلط چھپ گیا ہے۔ تصحیح اس طرح فرمالیں۔

پہلا مصرع: انساں ہے تو ہر عظمتِ انساں سے گزر جا۔ تیسرا مصرع: اندیشۂ ادراک و بصیرت بھی نہ کر اب

انور صدیقی

رات

رات کے ہاتھ گریبانِ سحر تک پہنچے
تھرتھرانے لگے آنسو سرِ مژگانِ نجوم
رنگ رخسار کا اڑنے لگا مانندِ نسیم
لب ہر غنچہ پہ شعلوں کی مہر لگنے لگی
رات بڑھتی رہی ظلمت کے علم تھامے ہوئے
اور کمیں گاہوں سے امڈ آیا سیلِ ناپاک
شہپروں کے نئے نغموں سے فضائیں چونکیں
رات کے قصر میں ہر سمت چراغاں سا ہوا
زرمِ شبنم پہ بھی زنجیرِ گراں بڑھنے لگی!

رات نے چاہا کہ خورشیدِ درخشانِ حیات
اور کچھ دیر نہ نکلے کہ عمل اس کا رہے
اس کے میخانے رہیں
اس کے پیمانے رہیں
اس کے بربط رہیں
مینائیں رہیں
چنگ رہیں
اس کی آغوش سے پھوٹا کرے شاخِ ظلمات
اور ان شاخوں پہ لہراتے رہیں ظلم کے پھول
رات نے چاہا کہ خورشیدِ درخشانِ حیات
اور کچھ دیر نہ نکلے کہ عمل اس کا رہے
اور کچھ دیر رہے صبح اندھیروں میں اسیر
اور کچھ دیر رخِ نور رہے زخموں سے نڈھال
اور کچھ دیر صبا پا بہ سلاسل ہی رہے
اور کچھ دیر لبِ گل پہ رہے مہرِ سکوت
اور کچھ دیر بہاریں رہیں محرومِ نشاط
اور کچھ دیر رہیں نقش وہ دھندلائے ہوئے
ذرہ ہائے دل کی محنت نے ابھارا ہے جنہیں
سرخیٔ خونِ شہیداں نے نکھارا ہے جنہیں
اور کچھ دیر رہیں نقش وہ دھندلائے ہوئے
ریگ زاروں پہ عرب کے جو نمایاں ہیں ابھی
نیل و کاجیان[1] کی موجوں پہ جو رقصاں ہیں ابھی
ارضِ رومی پہ بہ اندازِ گلستاں ہیں ابھی
محرمِ پرتوِ خورشیدِ درخشاں ہیں ابھی
اس سیہ رات میں جو نور بداماں ہیں ابھی
رات کو ڈر ہے وہی نقش نہ بن جائیں نجوم
ان کی تابانی نہ ہو موجبِ تخلیقِ سحر
اس لئے فتنۂ زنجیر و رسن آج بھی ہے
تازہ اس دور میں یہ رسمِ کہن آج بھی ہے

---

[1] انڈونیشیا کا مشہور دریا

سمرسٹ ماہم
ترجمہ: اکرم جلیلی

دوست

تیس سال سے میں اپنے ساتھیوں کی نفسیات کا مطالعہ کر رہا ہوں
مگر ان کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ اس لئے میں چہرے کو دیکھ کر کسی
کو ملازم رکھنے سے ہچکچاتا ہوں۔ یہ صرف چہرہ ہی ہے جس سے ہم اپنے ملاقاتیوں
کے متعلق کسی قسم کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہم جبڑے کی بناوٹ، آنکھوں کی
گہرائی و چمک، اور منہ کی ہیئت سے نتائج استخراج کرتے ہیں۔ اور یہ امر
میرے لئے حیران کن ہوتا ہے کہ ان مستخرجہ نتائج اور ان اندازوں میں ہم صحیح
سے زیادہ غلط ہوتے ہیں۔ ناول اور ڈرامے اکثر زندگی کی صحیح عکاسی کیوں
نہیں کرتے! اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف ان کے کردار منتخب کرتے وقت
اندازوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ وہ تضاد بیانی سے کام نہیں لے سکتے
کیونکہ وہ اس طرح ناقابل فہم ہو جاتے ہیں۔ اور ہم میں سے اکثر خود تکذیبی
کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم متضاد کیفیتوں کے مفاجاتی مرکب ہوتے
ہیں میں بڑے حیران کن انداز میں اپنے کندھے ہلاتا ہوں جب لوگوں سے
سنتا ہوں کہ عام آدمیوں کے متعلق ان کا پہلا تاثر و اندازہ ہمیشہ صحیح ہوتا
ہے میں سمجھتا ہوں ایسے لوگ بالغ نظری سے محروم اور غلط سوچنے والے ہوتے
ہیں۔ کیونکہ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں جتنا زیادہ لوگوں کے متعلق جانتا
ہوں اتنا ہی وہ میرے لئے معمہ بن جاتے ہیں۔ میرے پرانے دوست وہ
ہیں جن کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کی ایک بات بھی نہیں جانتا۔

میرے دماغ پر ان کے تصورات انعکاس اس لئے ہوا ہے کہ میں نے
اخبار میں پڑھا ہے کہ ایڈورڈ ہائڈ برٹن کوبے میں وفات پا گیا ہے وہ ایک
رکھتا اور کئی سالوں سے جاپان میں تجارت کرتا تھا۔ میں اس کے متعلق
بہت کم جانتا تھا مگر مجھے اس میں اس لئے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کہ ایک دفعہ
اس نے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنا کر بڑی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اگر
میں اس کے لبوں سے یہ واقعہ نہ سنا ہوتا تو میں کبھی یہ یقین نہ کرتا کہ وہ ایسی
بات کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے چہرے کی معصومیت، اس کی
مسکراہٹ کی حلاوت اس کی نیلی آنکھوں میں شفقت و ترحم کی چمک اور اس کی
کمزور و بے ضرر طبیعت اس واقعہ کی تکذیب کرتی تھیں۔ اور یہی چیز
میرے لئے حیران کن تھی۔ وہ صورت و اطوار کے لحاظ سے بڑا معمولی طا
واضح قسم کا آدمی تھا۔ وہ دبلا پتلا پست قامت آدمی تھا اور اس کا قد پانچ
فٹ چار انچ سے زیادہ لمبا نہ تھا۔ اس کے بال سفید، چہرہ سرخ اور
آنکھیں نیلی تھیں۔ میرا خیال ہے جب میری اس سے شناسائی ہوئی تھی
اس وقت اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔ وہ اپنی عمر اور حیثیت کے
لحاظ سے صاف ستھرا لباس پہنتا تھا۔

اگرچہ اس کے دفاتر کوبے میں تھے مگر وہ اکثر یوکوہاما آتا رہتا تھا
ایک دفعہ مجھے وہاں جہاز کے انتظار میں چند دن گزارنے کا اتفاق ہوا۔ میرا
اس کے ساتھ تعارف برٹش کلب میں ہوا تھا۔ ہم اکٹھے برج کھیلتے تھے
برج کھیلنے میں وہ بڑا ماہر اور فراخدل واقع ہوا تھا۔ کھیلتے وقت اور بعد میں
شراب نوشی کے دوران میں وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ اور جب بھی
وہ بولتا، بڑے سلجھے ہوئے انداز اور معقول لہجہ میں بولتا۔ وہ کلب میں اچھا
خاصا ہر دلعزیز معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی لوگ
اس کے متعلق تعریفی کلمات کہتے رہتے تھے۔

اتفاق یہ ہوا کہ ہم دونوں گرانڈ ہوٹل میں مقیم تھے۔ اس لئے جب مجھے
دوسرے روز اس نے پر مدعو کیا کھانے پر میں نے اس کی فربہ، پختہ
عمر کی جنس مگر بیوی اور اس کی دو لڑکیوں سے تعارف حاصل کیا۔ وہ خوش
باش، متحد اور دلکش خاندان تھا۔ مجھے جس چیز نے زیادہ متاثر کیا وہ برٹن
کی کرم گسترانہ طبیعت تھی۔ اس کی ملائم نیلی آنکھوں میں خوش کن کیف
لہریں لیتا رہتا تھا۔ اس کا لہجہ دھیما اور اس کی آواز نرم تھی۔ کوئی اس امر کا
اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے اندر کبھی غصہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی
مسکراہٹ سے حلاوت ٹپکتی تھی۔ وہ دوسروں کی توجہ اور التفات کا مرکز
اس لئے بنا ہوا تھا کہ وہ اپنے رفقا کے لئے حقیقی اور مخلصانہ محبت بھرے
جذبات رکھتا تھا۔ اس کے اندر کشش تھی۔ وہ کسی کمزوری کا حامل نہیں تھا

ش وجاذبیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اتنا کمزور اور ناتواں تھا ک
کے اندر حفاظت کے احساسات پیدا کرسکتا تھا۔ کوئی تصور بھی
یں کرسکتا تھا کہ اس نے کبھی کسی کو کبھی ضرر پہنچایا ہوگا۔ وہ اچھے انداز
سپ اور سبق آموز واقعات سناتا تھا۔ وہ بہت امیر آدمی تھا
کوششوں سے کافی دولت اکٹھی کرلی تھی۔

یک دن میں گرانڈ ہوٹل کے ایک کمرے میں کاہلانہ انداز میں مصروف
وا تھا۔ یہ زلزلے سے قبل کا واقعہ ہے۔ کمرے میں چمڑے سے بنی ہوئی
ں پڑی ہوئی تھیں۔ دریچے سے بندرگاہ کے خوشنما مناظر کا لطف
ہا سکتا تھا۔ سنگاپور، ہانگ کانگ اور شنگھائی کے راستے یورپ اور
رانسسکو جانے والے جہاز سمندر میں تیر رہے تھے۔ مختلف قوموں کے
کے جہاز سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھاتے لڑھکتے جا رہے تھے
تیاں اونچے اور رنگ دار بادبانوں سے مزین اور اسرار سے پُر لطفوں کی طرح
قیں۔ یہ بھرا بھرا خوشنما منظر روح میں بالیدگی پیدا کر رہا تھا۔ اس
ں قدر خوشگواریت اور رومانیت تھی کہ اسے اپنانے کے لئے ہاتھ
لے کو جی چاہتا تھا۔

برٹن کمرے میں آیا اور مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ والی کرسی پر

تھوڑی سی پی لیں تو کیا ہرج ہے؟" اس نے ہاتھ کے اشارے
سے کو بلایا اور دو شراب کے پیمانے لانے کو کہا: جونہی بیرا شراب
ایک آدمی باہر بازار میں مجھے ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا

تم ٹرنر کو جانتے ہو" برٹن نے مجھ سے دریافت کیا جونہی میں
نر کی سلام کے جواب میں سر ہلایا۔
میری اس کے ساتھ کلب میں ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا
ہ بیکاری کے باوجود فارغ البال آدمی ہے"
ہاں! میں جانتا ہوں وہ ایسا ہی ہے۔ اس قسم کے ہمارے ہاں
سے آدمی ہیں۔ یہ لوگ بڑی مہارت اور فراخدلی سے جوا کھیلتے
پچھلے سال اسی قسم کا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ میرا ہم نام
ج کھیلنے کا بڑا ماہر اور مشاق تھا۔ اس کا نام یعنی برٹن تھا میرا خیال

ہے اس کا تعلق کسی اونچے درجہ کی کلب سے تھا"۔ "وہ غیر معمولی
مہارت کا مالک تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاش سمجھنے کی صلاحیت اسے
قدرت کی طرف سے خاص طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ وہ بہت چالاک
تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ رقم لگا کر کھیلا کرتا تھا۔ وہ کچھ عرصے
کوبے میں رہا تھا" برٹن نے شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اور
ایک پیمانہ خالی کرلینے کے بعد اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا
"یہ ایک عجیب کہانی ہے، وہ کوئی خاص بڑا آدمی نہ تھا۔ وہ کچھ کچھ
خوب صورت بھی تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے اور رخسار سرخ تھے۔
عورتوں کے لئے وہ بہت زیادہ جاذبِ نگاہ تھا۔ وہ کثرت سے شراب
پیتا تھا جس طرح اس قسم کے لوگ عموماً پیا کرتے ہیں۔ اسے گھر سے کچھ
رقم آتی تھی۔ اور باقی وہ جوا کھیل کر بنا لیتا تھا۔ مجھ سے بھی اس نے بہت
روپے جیت لئے تھے" برٹن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ میرا
تجربہ تھا کہ وہ جوئے میں فراخدلی سے روپیہ ہار سکتا ہے۔ اس نے اپنی ٹھوڑی
اپنے نازک ہاتھوں پر رکھی ہوئی تھی۔ برٹن نے اپنی بات جاری رکھی۔
"ایک دن خلافِ توقع وہ میرے دفتر میں آیا اور مجھ سے ملازمت
کی درخواست کی۔ میں حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ
پے بہ پے بڑی بڑی رقمیں جوئے میں ہارنے کے بعد وہ دیوالیہ ہوگیا ہے۔
اس کے پاس اب بنیادی ناگزیر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی کوئی
پیسہ نہیں ہے اور گھر سے بھی کسی رقم کے آنے کی توقع نہیں ہے لہذا وہ ملازمت
کرنے پر مجبور ہے! میں نے اس سے پوچھا تمہاری عمر کتنی ہے؟
"پینتیس سال!" اس نے کہا۔
"اور اب تک تم کیا کرتے رہے ہو" میں نے دریافت کیا۔
"کچھ نہیں" اس نے کہا۔
میں ہنسنے سے باز نہ رہ سکا۔
"مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا"
میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا "پینتیس سال کے بعد پھر میرے پاس آنا
اس وقت میں کچھ مدد کرسکوں گا۔"
وہ واپس جانے کے لئے نہ ہلا۔ البتہ اس کے چہرے پر زردی
چھا گئی۔ وہ کچھ دیر رکا اور پھر کہنے لگا کہ وہ کچھ عرصے سے جوئے میں بدبختی

سکے دور سے دوچار رہا ہے۔ اس نے برج کھیلنے کی خواہش کو ترک کرکے "پوکر" کھیلنے کا اشتیاق پیدا کیا مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور یہ ہارنے سے پائی پائی کا محتاج ہو گیا ہے۔ وہ اس میں اپنی ساری پونجی ہار گیا ہے حتیٰ کہ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بھی قابل نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے اسے ہوٹل سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ اب اگر اسے کوئی کام نہ ملا تو وہ خودکشی کرلے گا۔"

میں نے اس پر نگاہ ڈالی وہ پھٹے حالوں تھا۔ کثرت سے شراب نوشی نے اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ وہ پچپن سال کا معلوم ہوتا تھا۔ لڑکیاں اسے اس حالت میں دیکھتیں تو اس کی طرف نگاہ التفات کبھی نہ ڈالتیں۔

"اچھا! یہ تو بتاؤ! جوا کھیلنے کے علاوہ تم اور کیا کرسکتے ہو؟"

"میں تیر سکتا ہوں" اس نے کہا۔

"تیرنا!" میرے کانوں نے اس کے جواب پر اعتبار نہ کیا۔ یہ بڑا اتفاقیہ جواب تھا۔

"میں کالج کے ایام میں تیراک رہا ہوں" اس نے بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی جوانی کے ایام میں مشاق تیراک تھا" میں نے جواباً کہا۔

اور اچانک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ برٹن نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ کہ پہلے میں شورائیہ کلب بھی میں اس کا ممبر تھا۔ جب میں جوان تھا تو ترومی کے ساحل تک جو تین میل تک پھیلا ہوا تھا تیرتا ہوا چلا جاتا تھا حالانکہ موجوں کے تھپیڑوں میں تیرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔!

شبیر! میں نے اپنے ہمنام سائل کو کہا کہ اگر وہ بھی تین میل کا فاصلہ تیر کر دکھائے تو میں اسے ملازمت دے دوں گا" میں نے دیکھا کہ وہ کچھ خوفزدہ ہو گیا ہے۔

"تم نے کہا ہے کہ تم اچھے تیراک ہو" میں نے کہا۔

"میں اس وقت اچھی حالت میں نہیں ہوں" اس نے جواب دیا۔

میں نے انکار کے انداز میں اپنے کندھے ہلائے۔ اس نے ایک لمحہ مجھے دیکھا اور پھر رضامند ہو گیا۔

"بہت اچھا" اس نے تیرنے کے لئے راضی ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کب چاہتے ہیں کہ میں تیروں؟"

میں نے گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔

"تیرنے میں تمہیں سوا گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنا چاہیئے۔ پر موٹر کے ذریعے پہونچوں گا اور ساڑھے بارہ بجے تمہیں وہاں ملبوس لباس تبدیل کرنے کے لئے کلب لے آؤں گا اور وہاں ہم اکٹھے لنچ کریں گے۔"

"مجھے منظور ہے" اس نے کہا۔

ہم نے ہاتھ ملائے۔ میں نے اس کی کامیابی کی اشیر... اور وہ چلا گیا۔

اس صبح مجھے بہت کام تھے۔ اس لئے میں بمشکل ساڑھے بجے ترومی کے ساحل پر پہونچ گیا مگر وہ ابھی تک ساحل پر نہ پہنچا اور اس کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔

"کیا وہ آخری لمحہ پر دھوکہ دے گیا" میں نے برٹن سے پوچھا

"نہیں۔ اس نے دھوکا نہیں دیا۔ وہ اپنے وعدہ کے مطابق پانی میں کود پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے جسم کی توانائی اور طاقت کثرت شراب سے کھو بیٹھا تھا اور جھیل میں موجوں کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے پہاڑوں کی سی سختی اور شیروں کی سی توانائی کی ضرورت تھی۔۔۔۔۔ تین دن کے بعد اس کی لاش مل گئی تھی"

برٹن ایک دو لمحے تک کچھ نہ بول سکا۔ میرے جسم میں غم کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پھر میں نے برٹن سے سوال کیا۔

"جب تم نے مشروط طور پر اسے ملازمت پیش کی تھی۔ اس تم نہیں جانتے تھے کہ وہ ڈوب جائے گا۔ اور تم اپنے ہمنام دوست سے ہاتھ دھو بیٹھو گے؟"

اس کے لبوں پر ہلکی اور میٹھی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اپنی نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے اپنے نازک ہاتھ سے ٹھوڑی کو رگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس وقت میرے پاس کوئی اسامی خالی نہ تھی۔"

(ترجمہ)

رشید احمد

بھائی اور بہن

وہ ایک حجام کی دکان پر ہیر کٹر کا کام کرتی تھی اور وہ ہوائی فوج میں
ل تھا۔ اسی دکان سے ان کی ملاقات کا آغاز ہوا۔ اور یہیں سے ان کی
ت کے پاک دامن پر سیاہ دھبے نمودار ہوئے۔ اس کا شادی سے پہلے
م ڈوروتھی تھا اور کارپول کا ولیم۔ ڈوروتھی اپنی زندگی کے باوجود ہزار احتیاط
اس خطرے سے دوچار ہوگئی۔ جس کا اسے ڈر تھا کہنے کو وہ مس ڈوروتھی
تی تھی لیکن اس کا ذہن اب اس نام کے غلط ہونے کی بار بار رٹ لگا رہا
ا۔ کارپول ولیم ویک اینڈ کی رخصت لیکر آج جب اس سے ملنے آیا تو وہ کچھ
ت تھی۔ اس نے ولیم کو پورے فرینڈ کی حدود سے تجاوز کرکے شادی کرلینے
ر کیا اور ان کی شادی کے رسوم مقامی گرجے کے پادری کے توسط سے طے
۔ اب وہ مسز ولیم تھی اور دو بچوں کی ماں۔

نہر سویز کے علاقہ کے حالات کے پیش نظر ان کو تیار رہنے کا حکم مل
چکا تھا۔ کارپول ولیم ڈیوٹی پر تھا اور مسز ولیم گھر کے سامان کا جائزہ لے رہی
ی مکان کے کونے کونوں سے ہر چیز کو بغور دیکھ کر اس کے ضروری اور
ضروری ہونے پر وہ غور کر رہی تھی اور سفر کے اندیشے کے پیش نظر وہ کسی
ضروری چیز کو سامان میں شامل کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے ردی کاغذوں اور
ن تصویروں کا انبار لگا رکھا تھا جو محض ہابی کے طور پر وہ دونوں جمع کرتے
تے ۔۔۔ اسکی نظریں ایک تصویر پر گڑ گئیں وہ بار بار اسے اٹھا کر دیکھ رہی
اس کے ذہن میں ایک تلاطم برپا تھا۔ بھولے ہوئے واقعات ایک
کے اس کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اس نے کافی غور کیا اور کئی بار
یقین کو جھٹلاتے ہوئے تصویر کو ردی تصویروں میں پھینک بھی دیا۔
نہ جانے وہ کیوں مجبور ہوکر پھر اسی تصویر کو اٹھا لیتی اور اسکے تو اس کی
میں آنسو آگئے اسے یقین آگیا کہ یہ تصویر اس کی ماں کی ہے۔ وہ لاوارث
کی پرورش گاہ میں پلی تھی جو ایک مشنری کے ماتحت تھا۔ اسے وہاں دیکھنے
لئے اکثر ایک عورت آیا کرتی تھی۔ وہ جب بھی آتی اسے بہت پیار کرتی اور
اکثر اوقات کچھ کھلونے بھی اسے دے جایا کرتی وہ نرسوں سے سنا کرتی تھی کہ
یہ اس کی ماں ہے۔ اور یہ تصویر اسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔ کتنی پیاری تصویر
ہے اس نے دل ہی دل میں کہا اور تصویر کو اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اور صاف
کرکے ایک خالی فریم میں سجا کر میز پر رکھ دیا۔

مسز ولیم کے تصورات میں خیالات کا ایک دریا بہہ رہا تھا وہ سوچ
رہی تھی کہ یہ تصویر یہاں کیسے آئی اس کا دماغ اس مشکل معمہ کا حل نہ پا سکا
اور وہ چند منٹ بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے دوسرے سامان کی
چھانٹی میں مشغول ہوگئی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک انقلاب اس
کے دروازے پر دستک دے رہا ہو کچھ موہوم سے اندیشوں نے اسے گھیر لیا
اور وہ کام کاج چھوڑ کر آئی میز کے نزدیک آکر بیٹھ گئی وہ سامنے رکھے ہوئے
آئینہ میں اپنی شکل اور اس تصویر کے نقش و نگار کو ایک ایک کرکے دیکھ رہی
تھی اور اس کے یقین میں اور بھی پختگی آرہی تھی۔ وہ کتنی ملتی جلتی شکلیں ہیں یقیناً
وہ اس کی ماں ہے یقیناً اس کی ہی یہ تصویر ہے۔ اس نے تصویر کو پھر بوسہ
دیا اور ذہن میں ہلکی سی مسرت محسوس کرتے ہوئے وہ پھر کام میں مشغول ہوگئی

کارپول ولیم کے ڈیوٹی پر سے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور وہ
سارے ضروری سامان کو بکسوں میں دوبارہ بند کرکے فرصت حاصل کر چکی
تھی۔ اور جلدی جلدی باتھ روم میں جا کر میک اپ کو درست کرکے برآمدے
میں آکر بیٹھ گئی۔

وہ تصویر اس کے زانو پر رکھی تھی۔ کارپول ولیم نے چپکے سے آکر
اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس کی نظریں بھی اس تصویر پر گر گئیں

"ڈارلنگ یہ تمہیں کہاں سے مل گئی؟"

کارپول ولیم نے مسز ولیم کو تھپکتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"سامان چھانٹتے ہوئے یہ ردی تصویروں میں سے ملی ہے" مسز ولیم
نے آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تو اُسے بہت تلاش کر چکا تھا۔ اور اب مایوس ہو چکا تھا۔"

"یہ کس کی تصویر ہے؟" مسز ولیم نے دریافت کیا۔

"یہ میری ممی ہے ڈارلنگ!"

"تمہاری ممی ہے؟" مسز ولیم نے پوچھا۔

"اور تم کیا سمجھ رہی ہو؟" کارپول ولیم ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے خیال کیا عورتیں کس قدر ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے مسز ولیم اس تصویر کو کوئی اگلی گرل فرینڈ سمجھ رہی ہوگی۔ بہر حال اچھا ہوا۔ معاملہ صاف ہو گیا۔

کارپول نے بیوی مسز کو اندر بلایا۔ بیرہ کھانا میز پر لا چکا تھا۔ اور وہ دونوں میز پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مسز ولیم کے حلق میں گویا کانٹے پڑ چکے تھے۔ اس نے فورک رکھتے ہوئے کہا "میں بہت تھک چکی ہوں۔ میں نہیں کھا سکتی۔"

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک طوفانی آندھی میں کھڑی ہو۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور وہ برآمدے میں آکر پھر آرام کرسی پر لیٹ گئی۔

رہ رہ کر اس کے ذہن میں یہ سوال آ رہا تھا کہ کیا کارپول ولیم میرا بھائی ہے؟ کیا میں نے اپنے بھائی سے معاشقہ اور پھر شادی کی ہے؟ کیا یہ دونوں بچے بہن اور بھائی کی سیاہ کرتوت کا نتیجہ ہیں۔ اس کا جسم سرد ہو گیا اس کے جذبات پر برف پڑ گئی۔

کارپول کھانا کھا کر جا چکا تھا۔ وہ اٹھی اور لکھنے کی میز کے پاس جا بیٹھ گئی۔ میز پر رکھے ہوئے پیڈ پر اس نے ایک خط چھوڑا اور آیا کو بلا کر بچوں کی پوری نگہداشت کرنے کی تاکید کی اور کوارٹر سے باہر نکل گئی۔

کارپول ولیم جب واپس لوٹا۔ تو کوارٹر خالی دیکھ کر آیا سے دریافت کیا تو آیا نے بتایا کہ آپ کے تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی تھیں۔ اور میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھیں۔ مجھے بچوں کی نگہداشت کرنے کی تاکید کر کے گئیں۔

ولیم نے میز پر رکھے خط کو کھولا۔ لکھا تھا۔

"میرے پیارے بھائی ولیم!

آج اس تصویر نے انسانی زندگی کے ایک عظیم گناہ کا انکشاف کر دیا۔ جس کے ہم دونوں مرتکب ہوئے۔ سماج نے آزادی کا فریب دیکر عورت کو اس طرح ذلیل کیا ہے کہ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوان بن چکی ہے۔

تم اپنی اور میری ہی مثال دیکھ لو۔ ہم دونوں نے ایک ہی کوکھ سے جنم لیا ہے مگر ہماری ماں نے سوسائٹی گرل کی حیثیت سے ہمیں جنم دیکر مختلف پرورش گاہوں کے حوالے کر دیا۔ اور ہم دونوں جوان ہو کر بجائے بہن بھائی کے میاں بیوی بن گئے۔ خدا جانے ایسے کتنے جوڑے اس مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں ہماری اور تمہاری طرح ہونگے۔ میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ زندگی میرے لئے ایک بار ہو چکی ہے اور تمہیں منہ دکھاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اس لئے میں جا رہی ہوں مجھے تلاش نہ کرنا....."

شام ہو چکی تھی۔ ایک یورپین عورت کی لاش سویز کی لہروں کی آغوش میں دیکھی گئی۔ سیاسی ذہنوں نے اسے مصریوں کی سازش قرار دیا۔ اور کارپول ولیم اپنے سیاہ ماضی پر غور کرتا ہوا خاموش دیکھتا رہا۔ کا پوسٹ مارٹم ہوا اور دوسرے دن لاوارث لاشوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دی گئی۔

التماس ہے کہ......

★ اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا نام و پتہ لکھنا نہ بھولیں۔ بغیر نام و پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ نیز ادارہ مشیر ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ آپ مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھئے

★ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔

★ خط و کتابت کرتے اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ رہے۔

(ایڈیٹر)

نظر خورجوی ●

…نے یہ کب کہا ہے کہ میری خطا نہیں
…لیکن آپ کی شانِ عطا نہیں

نالہ نہیں، فغاں نہیں، آہ و بکا نہیں
مجھ کو نصیب اے فلکِ پیر! کیا نہیں؟

…س طرح میرے دل کو یقیں آئیگا نہیں
…دکھ بھی دو زباں سے میں تم سے خفا نہیں

اپنی جبیں کی خود بھی ذرا قدر کیجئے
ہر ایک در پہ سر کا جھکانا بجا نہیں

…ل جائے کوئی صاحبِ صدق و صفا مجھے
…کو خیالِ دولتِ دنیا ذرا نہیں!

میرے کریم مجھ کو گنہ کا ہے اعتراف
لیکن ترے کرم کی کوئی انتہا نہیں!

…تہا میں اسطرح سے جئے جا رہا ہوں میں
…البقا ہے جیسے یہ دارِ فنا نہیں

ایک آہ کی تو عرش کی زنجیر ہل گئی
اے دل جو رائیگاں ہو وہ تیری دعا نہیں

…کو تمہارا باغ مبارک ہو ہم صفیر!
…رے لئے یہ میرا چمن کچھ بُرا نہیں

تو بھی نہ ہو کنارہ کش اے دوست ہم سے آج
تیرے سوا کسی کا ہمیں آسرا نہیں

…ئے نہ ٹوٹ شیشۂ دل دیکھنا کہیں
…فاک بار بار اسے آزما نہیں

گلشن میں خاک لطف انھیں آئیگا نظرؔ
کانٹوں سے کھیلنے کا جنھیں حوصلہ نہیں

زبیر باغی ●

اسیرِ دامِ مصیبت و غم کہیں نہ راحت ابھی ملیگی
یہ زندگی ختم ہوگی جس دن تجھے نئی زندگی ملیگی

نئی روش ہے، نیا زمانہ، ہر ایک بات اب نئی ملیگی
جہاں جہاں رہبری ہے رقصاں وہیں وہیں رہزنی ملیگی

یقیں تھا ہم کو نئے چمن میں بہارِ نو کی خوشی ملیگی
یہ کیا خبر تھی وہ گل کھلیں گے کہ جن سے افسردگی ملیگی

جو دشتِ غربت میں آرہے ہیں ذرا سمجھ کر قدم بڑھائیں
یہ سیرگاہِ وطن نہیں ہے یہاں فقط بیکسی ملیگی

زباں پر الفت دلوں میں نفرت بیان نگین بدی پہ تہمت
جس انجمن کی ہو ایسی حالت وہاں ہمیں کیا خوشی ملیگی

چمن کی تعریف کرنے والو، گلوں کی حالت بغور دیکھو
شگفتگی کی تہوں میں پنہاں ضرور افسردگی ملیگی

ہم آشنائے جنوں ہیں باغیؔ ہوس پرستی نہیں ہے شیوہ
ہزار غم ہوں ہزار صدمے، ہمارے لب پر ہنسی ملیگی

ایس. ڈی. ناصرہ

فرض اور انتقام

"کرنل ——— کیا خیال ہے تمہارا، کیا کیپٹن کولٹر اس تنگ درے میں اپنی توپ رکھنا پسند کرے گا" جرنیل نے ایک درے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ——— اس کا لب ولہجہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس وقت سنجیدگی سے بات نہیں کر رہا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی شرارت چمک رہی تھی۔ کرنل نے خیال کیا کہ جرنیل اس سے مذاق کر رہا ہے کیونکہ اس درے میں توپ رکھنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔

"آپ جہاں حکم دیں، کولٹر وہیں اپنی توپ کھڑی کر سکتا ہے، بشرطیکہ دشمن اس کی زد میں ہو" ——— کرنل نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں یہی ایک ایسی جگہ ہے" جرنیل نے اس تنگ گھاٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب وہ کسی قدر سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان یہ تنگ درہ بڑی پُر اہمیت جگہ پر واقع تھا۔ اس کے آس پاس اونچے اونچے پہاڑ، ناقابلِ گزر راستے اور دشمن کی طرف ایک بڑی ڈھلوان تھی۔ کوئی ایک میل تک پہاڑیوں اور ڈھلوان کا یہ سلسلہ چلا گیا تھا۔ درے کے آس پاس تنگ گھاٹیاں اور گڑھے تھے۔ صرف درے کی ہموار سطح تھوڑی سی فوج کو پناہ دے سکتی تھی۔ دشمن کی فوجیں جو ——— ڈوبی پارٹی سے تعلق رکھتی تھیں کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر درختوں کے جھنڈ تلے چھپی ہوئی چند توپوں پر مشتمل تھی۔ ان تمام توپوں میں سے صرف ایک نظر آ رہی تھی جو ایک عالیشان عمارت کے سامنے کھڑی تھی ———

کرنل نے مایوس نگاہوں سے جرنیل کی طرف دیکھا اور کہا "سپہ سالار، اس جگہ صرف ایک توپ کھڑی ہو سکتی ہے ——— مگر وہ سامنے ان کی بارہ توپیں چھپی ہوئی ہیں"

"تم ٹھیک کہتے ہو ——— مگر تمہارا دلیر کولٹر تو بذاتِ خود ایک توپ خانہ ہے" جرنیل نے طنزیہ لہجے میں کہا، جسے کرنل نے فوراً بھانپ لیا اور وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اتنے میں ایک نوجوان افسر گھوڑے پر سوار پاس سے گزرا ——— وہ عمر کے لحاظ سے کوئی تیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد درمیانہ اور جسم دبلا تھا۔ اس کے لباس سے بے توجہی اظہار عیاں تھا۔ اس کے کوٹ کے بٹن اُوپر سے کھلے ہوئے تھے ——— یہ کیپٹن کولٹر تھا، اس نے قریب پہنچکر اپنے افسروں کو سلام کیا اور آگے بڑھنے والا تھا کہ کرنل نے اشارے سے اُسے روک لیا۔

"کیپٹن کولٹر" کرنل نے کہا: "دشمن نے سامنے بارہ توپیں مورچے میں لگائی ہوئی ہیں ——— سپہ سالار کا خیال ہے کہ تم اس درے میں ایک توپ سنبھالو اور دشمن پر حملہ کر دو۔"

کچھ دیر بعد کولٹر نے جرنیل کی طرف دیکھا اور کرنل سے مخاطب ہوا: "اس گھاٹی میں ——— آپ کا مطلب ہے؟"

"ہاں ——— تم یہاں کے حالات سے واقف ہو گے؟" کرنل نے کہا۔

"کیا ان پر حملہ کرنا ضروری ہے؟ کیا یہ حکم آخری ہے؟" کولٹر نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں کسی آنیوالے خطرے کا اظہار کر رہی تھیں۔ کرنل نے اس کے استفسارات سے کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سپہ سالار وہاں سے چلا گیا۔ کرنل کیپٹن کولٹر کے سوالات کو حکم کی خلاف ورزی سمجھ رہا تھا۔ وہ اُسے گرفتار کرنے کا حکم دینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کولٹر نے سیلوٹ کیا اور چلا گیا ——— تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک توپ اس تنگ گھاٹی میں مورچہ بنا چکی تھی۔ چند ہی لمحات میں ایک دھماکہ کے ساتھ سفید دھوئیں کے بادل اُٹھے اور حملہ شروع ہو گیا۔

(۲)

یہاں اس جنگ کا ذکر کرنا فضول ہے کیونکہ یہ بغیر کسی کمال اور داؤ کے لڑی گئی تھی۔ اسی وقت جبکہ کولٹر کی توپ نے گولہ باری شروع کی فوراً دشمن کی بارہ توپوں نے گولہ باری شروع کر دی، اسی گھاٹی میں اِدھر اُدھر لوہے کے ذرات کی بارش ہو رہی تھی۔ سپاہی فتح یا شکست سے بے نیاز اندھا دھند گولہ باری کر رہے تھے۔ کرنل گھاٹی سے کچھ دُور دوربین لئے کبھی دشمن کی توپوں کی طرف دیکھتا اور کبھی کیپٹن کولٹر کے بہادر ساتھیوں کے مورچے

طرف ـــــــ ـــــــ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا اور
دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کولٹر کے ساتھیوں کے نشانوں
سے دشمن کے کئی سپاہی اور گھوڑے مر چکے تھے۔

کرنل اس معرکہ کو بند نہ کر سکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے خیال
میں یہ معرکہ قطعی فضول تھا۔ اس نے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے
کی خاطر اپنے ایڈجوٹنٹ کی طرف دیکھا اور کہا: "کیا تم نے کولٹر کی بیوی کبھی دیکھی
تھی ـــ ؟" ایڈجوٹنٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں ایک
افسر جلدی جلدی چڑھائی چڑھتا او پہنچا اور سلام کرتے ہی کہنے لگا: "کرنل
ہارمن کا خیال ہے کہ دشمن کی توپیں ہماری بندوقوں کی زد میں ہیں اور وہ آپ
کی اجازت چاہتے ہیں کہ ان توپوں کو خاموش کر دیا جائے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں ـــــــ مگر تم کرنل ہارمن سے کہو کہ سپہ سالار
کے احکام یہی تھے نہیں۔" کرنل نے کہا۔ اس کے چہرے سے بے چینی عیاں
تھی ـــ ایڈجوٹنٹ بھی بے چین سا تھا۔ نوجوان افسر سلیوٹ کر کے چلا گیا
تو اُس نے کہا: "کرنل میرے خیال میں اس معرکہ کے پس منظر کوئی خاص
وجہ پوشیدہ ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کیپٹن کولٹر جنوبی علاقے سے تعلق
رکھتا ہے ـــ ؟"

نہیں" کرنل نے کہا: "کیا یہ حقیقت ہے؟"

"میں نے سنا ہے کہ جس ڈویژن کو جنرل کمان کرتا تھا پچھلے سال کولٹر
کے گھر کے قریب مقیم تھا۔ جنرل نے کولٹر کے خاندان سے کافی تعلقات
پیدا کر لئے تھے۔ میں اچھی طرح نہیں جانتا مگر سنا ہے کہ جنرل کولٹر کی بیوی
کو چاہتا تھا اور اس بات پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ صدر دفاتر کو شکایات
ملیں تو انہوں نے جنرل کو وہاں سے تبدیل کر دیا۔ اپنے تمام خاندان میں
سے صرف کولٹر ہی شمالی افواج کا طرفدار ہے" ایڈجوٹنٹ نے کہا۔

کرنل کچھ کہنے ہی والا تھا کہ درے کی طرف سے گڑگڑاہٹ کی
آواز آنے لگی ـ یہ توپ کے پہیوں کی آواز تھی۔ توپ بیکار ہو چکی تھی اور
اس کی جگہ ایک نئی توپ داخل کی جا رہی تھی ـــــــ تھوڑی دیر میں
پھر گولہ باری شروع ہو چکی تھی ـــــــ کرنل کی آنکھوں میں ایک
عجیب سی بیداری مضمر تھی، اس نے ایڈجوٹنٹ کی طرف دیکھا اور کہا:
"مورلین، یہ کہانی ہے یا حقیقت؟ تم نے کسی جھوٹے شخص سے تو
یہ باتیں نہیں سنیں ـــــــ ؟"

"فی الحال میں یہ بتانے سے مجبور ہوں کہ میں نے یہ باتیں کہاں
سے حاصل کیں" ایڈجوٹنٹ مورلین نے کہا: "مگر میں قسم کھانے کے لئے
تیار ہوں کہ یہ سب حقیقت ہے ـــــــ"

کرنل پر تمام حقیقت واضح ہو چکی تھی، وہ ایک افسر کو بلانے
کے لئے مڑا مگر پھر خود ہی گھوڑے پر سوار ہو کر درے کی طرف چل پڑا۔ درے
میں پہنچ کر کرنل نے جو منظر دیکھا وہ ایک دوزخ کا نمونہ تھا۔ ہر طرف دھواں
اور آگ پھیلی ہوئی تھی۔ لوہے کے ٹکڑے اور گولیوں کے ذرات اِدھر اُدھر
بکھرے ہوئے تھے۔ چار توپیں بالکل بیکار ہو کر پڑی ہوئی تھیں کئی سپاہی
اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر پڑے سسک رہے تھے۔ سپاہیوں کے
چہرے بالکل نہ پہچانے جا سکتے تھے۔ وہ سب بھوت نظر آ رہے تھے۔ ان
کے بدن پر زخم تھے اور خراشوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے آگ سے جھلس
گئے تھے اور دھویں سے بدن کا رنگ خوفناک حد تک بدل چکا تھا۔ جب
ایک آدمی گولہ باری سے بیکار ہو جاتا تو فوراً دوسرا آدمی اس کی جگہ لے لیتا۔
کسی کو خبر نہ تھی کہ اس کا افسر کون ہے؟ ـــ اُسے کسی کے احکام کا انتظار
نہ تھا۔ اُسے صرف اپنے فرض کا دھیان تھا۔ اتنے میں اس کے سامنے
ایک اور نوجوان اٹھا اور توپ کی طرف بڑھا۔ وہ بالکل بھوت لگ رہا تھا
اور اس کے بدن پر خراشوں اور دھویں کی لکیروں نے اس کے بدن کو بالکل
عجیب و غریب بنا دیا تھا ـــــــ کرنل اُسے بالکل نہ پہچان سکا، کیونکہ
کولٹر تھا ـــ ـــ ایک بدنصیب مگر فرض کو پہچاننے والا افسر ـــــ
اس نے کرنل کو دیکھ کر سلام کیا اور اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر پیچھے ہٹ گیا
گولہ باری بند ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دشمن نے بھی گولہ باری بند کر دی

(۳)

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد تمام بریگیڈ دشمن پر فتح پانے کے بعد اسی
جگہ فروکش تھا جہاں کچھ عرصہ پیشتر دشمن کی بارہ توپیں گولہ باری کرنے پر متعین
تھیں ـــــــ یہ ایک باغ تھا اور اس کے درمیان ایک خوبصورت
مکان واقع تھا مگر گولہ باری کی وجہ سے مکان کا حلیہ تبدیل ہو چکا تھا۔
جگہ جگہ دیواریں شکستہ ہو چکی تھیں اور چھتیں بھی قدرے کمزور ہو گئی تھیں
کرنل نے اپنے آفیسروں کو اس مکان میں ٹھہرنے کی اجازت دیدی اور

اتی سپاہیوں نے ارد گرد کے علاقہ میں رہائش کا بندوبست کرلیا۔

رات کے کھانے کے دوران ایک اردلی کھانے کے کرہ میں آیا اور کرنل سے مخاطب ہوا "کرنل ——— ایک کمرے میں نامعلوم کون شخص ہے میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں ——— " کرنل نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور ایک افسر کے ہمراہ چل پڑا، اردلی انہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں وہ ایک انسانی شکل دیکھ کر ڈر گئے۔ چہرہ تقریباً پوشیدہ تھا مگر وہ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا کرنل نے لالٹین نیچے کی ——— وہ شخص ایک عورت کو اپنے ساتھ چپٹائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ عورت کے لمبے بالوں میں چھپا ہوا تھا اور عورت کے بازوؤں میں ایک بچہ تھا۔ عورت کے بالوں سے خون ٹپک رہا تھا اور نیچے ایک کتا ہوا پاؤں چند قدم دور پڑا ہوا تھا ——— کرنل نے از راہ ہمدردی کہا: "میں حیران ہوں کہ یہ کمرہ ایسا تو نہیں تھا کہ گولہ باری اس پر اثر نہ کر سکے" مگر فوراً ہی اس آدمی نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا ——— وہ بالکل زرد تھا اور اس کی آنکھوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی ——— اس کا چہرہ ... سا ہو گیا تھا اور خون کی لکیریں اور خراشیں عیاں تھیں، کرنل ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ——— کرنل نے پوچھا،

"یہ میرا گھر ہے کرنل ———"

"اوہ، تمہارا گھر ——— مگر یہ کون ہیں؟" کرنل نے عورت اور بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"میری بیوی اور میرا بچہ ——— میں کیپٹن گولسٹر ہوں ———"

(ایمبروس بائرس سے) (ترجمہ)

محمد خالد اختر

مسٹر گھامڑ کا ادبی کیریر

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

اپنی دال روٹی کی طرف سے قدرے مطمئن ہونے کے بعد مسٹر گھامڑ کو اکر نیکا سودا سمایا۔ اس نے سیاست کے میدان کی طرف نظر کی۔ یہاں مشکلات دکھائی دیں۔ سیاست میں کامیاب ہونے کے لئے جس شیطانی اور چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت نے مسٹر گھامڑ کو ودیعت کی تھی۔ پھر ایک دن اس نے اپنے دوست فقیرو رکشا والے کے ہاتھ میں ایک ماہنامہ کا خاص نمبر دیکھا۔ اس نے یہ نمبر اپنے دوست سے لیا۔ اور گھر آکر اس نے ورق گردانی شروع کی۔ اس ماہنامہ کے پہلے چار صفحات ادیبوں کی تصویروں کے تھے جن میں سے بیشتر گنجے اور بدنما لگتے تھے۔ اس کے بعد دو صفحے ان ادیبوں کے تعارف کے وقف تھے۔ جن کے بعد مقالوں، افسانوں اور نظموں کا ایک طومار تھا جس نے سب مضامین کو اوپر سے نیچے تک پڑھا۔ بیشتر مقالے اور نظمیں سمجھ سے بالا تھیں۔ لیکن وہ ان کی علمیت اور گہرائی سے بے حد مرعوب ہوا۔ اس نے قینچی سے مقالہ نویسوں کی تصویروں کو رسالے میں سے کاٹ کر دیوار پر چسپاں کر دیا۔ اس کا انھیں فریم کرانے کا ارادہ تھا۔ مگر اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ اس کے بعد گھامڑ اردو ادب کا ایک پڑھنے والا بن گیا۔ اور جیسا کہ قدرتی امر ہے اسے بھی اپنے نام کو ادیب لکھنے کی خواہش ستانے لگی۔ ادبی شہرت سے اسے ایک ایسی چیز ملی ہوئی جس کے حصول کے لئے نہ روپے کی ضرورت تھی اور نہ چرب زبانی کی اور جس کا حاصل کرلینا اسے بہت آسان نظر آیا۔

لیکن ادبی شہرت حاصل کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ اس نے سمجھا تھا۔ اس نے پہلے پہل ایک رکشا والے کے بارے میں ایک کہانی لکھی اس کو رسالہ "قدریں" میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ اور اس پرچے کے اگلے شمارے کا انتظار کرنے لگا اس نے اگلے شمارے کو خریدا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ فہرست مضامین کو اوپر سے نیچے تک پڑھا۔ اس کی کہانی اس میں نہیں تھی۔ یہ اس سے اگلے شمارہ میں بھی نہیں تھی۔ اس نے ایڈیٹر کو خط لکھا جس میں اس نے کہانی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ گھامڑ نے ہمت نہ ہاری۔ اب کے اس نے ایک جدید طرز کی معرّا نظم "زندان میں شام" لکھی۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا جو کہانی کا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے خاص نمبر کے سب سے عالمانہ مقالہ کے نمونے کو سامنے رکھ کے "ادب میں بحران کا پس منظر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ یہ بھی نہ چھپا۔ اور نہ ہی "قدریں" کے اڈیٹر نے اس کی رسید ہی دی۔

مایوس ہو کر اس نے سوچا کہ یوں تو کام نہ بنے گا کوئی اور ترکیب لڑانی چاہیئے۔ چنانچہ یہ تجویز اس کے ذہن میں آئی کہ کسی طرح "قدریں" کے ایڈیٹر سے دوستی گانٹھنا چاہیئے۔ اس نے خاص نمبر میں ایڈیٹر کا فوٹو دیکھا تھا۔ ایک موٹا سا پلا ہوا آدمی جو ایڈیٹر سے زیادہ ایک پھل فروش لگتا تھا۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایڈیٹر کو کافی ہاؤس کی سیڑھیوں پر اوپر چڑھتے دیکھا۔ گھامڑ بھی فوراً اس کے پیچھے اوپر چڑھ آیا اس نے ایڈیٹر کو ایک کونے کی خالی میز کے پاس بیٹھتے دیکھا۔ گھامڑ بھی وہاں جاکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایڈیٹر سے کہا "معاف کیجئے! آپ ہندوپاکستان کے عظیم ادیب عاقل فریادی تو ہیں؟"

"بندہ ہی عاقل فریادی ہے" ایڈیٹر نے خوشی سے ایک بلی کی طرح خرخراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے آپ کا فوٹو دیکھا تھا۔ اور اسی سے آپ کو پہچانا ہے" گھامڑ نے کہا "میں آپ کے فن کا بڑا مداح ہوں۔ آپ کے ماہنامے کو باقاعدہ پڑھتا ہوں آپ کی نظم "سرگوشی" مجھے بڑی پسند آئی تھی ـــــ کہئے کافی ہاؤس پیجئے گا

اللہ ———— ادھئی بیرا ————"

گھامڑ نے ایڈیٹر کے لئے کافی کے ساتھ کیک بھی منگوائے اور کافی کے بعد انھوں نے آئس کریم بھی کھائی۔ گھامڑ نے اس شام ایڈیٹر کی مہمان نوازی میں بڑی دریادلی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنی سارے دن کی کمائی مسٹر عاقل فریادی پر خرچ کر دی۔ لیکن اسے اس کا ذرہ برابر بھی افسوس نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رقم جو وہ خرچ کر رہا ہے۔ یہ ادبی شہرت اور مقبولیت کے حاصل کرنے کے لئے (انوسٹمنٹ) Announcement ہے جس کو لگانے میں اسے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ کافی کے بعد دو گھنٹے جدید ادب اور لکھنے والوں پر باتیں ہوتی رہیں جن سے گھامڑ نے نتیجہ نکالا کہ مسٹر عاقل فریادی کی رائے میں اس وقت اردو کا بہترین نقاد، افسانہ نگار، اور شاعر مسٹر عاقل فریادی تھا۔

گھامڑ نے ادب کے بارے میں چند مبہم اور مختلط خیالات کا اظہار کیا۔ ایک اچھے لکھنے والوں کے نام سنے اور ادبی بحران پر تشویش ظاہر کی۔ اسی سلسلے میں اس نے ایک اتفاقیہ لہجے میں اس کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ موجودہ انحطاطی رجحانات کو ایک مقالے میں زیر بحث لا رہا ہے۔

"وہ لکھنے کے بعد مجھے دیدیجئے" ایڈیٹر نے کہا "ایسے مقالوں کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ کا ادب کے بارے میں مطمح نظر بے حد وسیع ہے"

"شکریہ" گھامڑ کی باچھیں کھل گئیں۔

گھامڑ اور ایڈیٹر رفتہ رفتہ اچھے دوست بن گئے۔ گھامڑ اکثر ایڈیٹر سے ہاؤس میں ملتا۔ گھامڑ نے آخر اپنے انحطاطی رجحانات والے مقالے کو شروع کر دیا۔ اس نے اس پر بے حد محنت کی۔ پہلے تو اس نے خاص طور سے سب سے طویل مقالے میں سے مشکل اور بار بار استعمال ہونے والے الفاظ چن کر ایک کاغذ پر لکھ لئے ———— مثلاً غیر طبقاتی شعور، سرمایہ پرستی، رجعت پسندی، جدلیاتی قدریں، استحصالی نظام، سامراج، بورژوا ذہنیت۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے ایسے فقرے بنانے کی کوشش کی جن میں ان لفظوں اور ترکیبوں میں سے کم از کم ایک آدھ ضرور استعمال ہو۔ گھامڑ کو خود اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ وہ کیا لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دس دن کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ اپنے مقالے کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہ مقالہ بیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا عنوان تھا "ادب کے انحطاطی رجحانات۔ شعوری۔ نیم شعوری اور لاشعوری" اس کے پہلے ابتدائی دو صفحے یہ ہیں:۔

ادب کے انحطاطی رجحانات
شعوری۔ نیم شعوری۔ لاشعوری

از۔ ل۔ گھامڑ

"اس موضوع پر مجرد بحث ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ مسئلہ کی اہمیت مسلّم ہے اس لئے کم از کم یہ جاننے کی کوشش کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ عوامی ادب اور انحطاطی ادب میں کیا فرق ہے۔ کیونکہ ہم اپنی ناعاقبت اندیشانہ روش کی وجہ سے اس منزل پہ پہونچ گئے ہیں۔ جہاں عوامی ادب اور انحطاطی ادب میں تمیز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ یہ افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس دور کے انحطاطی ادب کو رواج دینے والے بھی زیادہ تر وہ ہی ہیں جو عوامی اور بر خود غلط ترقی پسند قلم کار بنے ہیں۔ اور وہ ان قدروں کو اپنا رہے ہیں۔ ۔ بلکہ اپنا چکے ہیں جو ادب کو زندگی سے دور لے جاتی ہیں۔ چنانچہ یہی۔ اقبال جوش اور حالی کی رزمیاں نہیں بلکہ بہت کچھ بے سوچے سمجھے لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں کا انحطاطی رجحان عوامی اور ترقی پسند ادب کے لئے جو خطرہ پیش کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ درآنحالیکہ ہر تاریخ کا طالب علم اس سے آگاہ ہے کہ تاریخ کے دھارے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایک سمت میں بہنے والے تیز گام دریا کا الٹا رخ نہیں بہایا جا سکتا۔ چنانچہ شبلی۔ اقبال۔ جوش۔ کی نظموں میں جو محنت و سرمایہ کا تضاد ملتا ہے وہ جدلیاتی ہے۔ اور ان بزرگوں کا تاریخی شعور مجہول اور ٹھوس ہے۔ اگرچہ ان کے حق میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کم از کم بورژوا طبقے کو مزدور طبقے سے آگاہ کیا۔ پھر بھی ان کے تاریخی ارتقا۔ ۔ پس منظر میں سرمایہ و محنت کی جدلیات کے عدم وجود کی وجہ سے ان کی تخلیقات کو انحطاطی دور کی پیداوار کہا جائیگا۔ کیونکہ ہمیں ان کی نیت سے کچھ غرض نہیں۔ وہ سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں سے ماسوا غالباً اقبال کے باقی سب کی طویل سفید ڈاڑھیاں ان کے گھٹنوں تک آتی تھیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کی شاعری سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اور آیا یہ کہ شاعری جاگیردارانہ اور سرمایہ پرستانہ صورت اور معنی کی حامل ہے کہ نہیں۔ لیکن ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ صورت اور معنی ایک ہی شے ہیں۔ یہی تو ایک بڑی غلطی ہے کون صحیح الفہم

ہوش آ کر یہ کہے گا کہ دُم کٹے کتے اور شیر ببر میں کوئی فرق نہیں۔ اس مسئلے پر خواہ وضاحت کے بعد ہی عوامی ادب کی نئی اقدار کو زیر بحث لایا جا سکتا کیونکہ اس سائنٹفک دور میں ادب کے صورت و معنی کو مادی تغیرات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی ہیئت بدلنا لازمی ہے۔ چنانچہ ہمارے … قلم کاروں نے یہی غلطی کی ہے کہ وہ ابھی تک اپنے اذہان میں "ادب برائے ادب" کے فرسودہ نظریے کے قائل ہیں۔ ورنہ عوامی ادب … پرستی اور … کے حسن کو اس قدر اہمیت کیوں دی۔ جب کہ عوامی ادب کو عام بول چال کی زبان میں ہونا چاہئے اور … روحانی … سے پہلو تہی کرنی چاہئے۔

خیر اس کو فی الحال چھوڑیئے۔ ہمارے ادیب ابھی تک بورژوائی … کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کے خیالات میں … رجعت کا عنصر نمایاں ہے۔ چنانچہ اقبال کو لیجئے جسے ہم نے … کا شکار ہو کر بام فلک پر بٹھا دیا۔ … ایک … دور کے شاعر ہیں۔ اور ان کے کلام کو عوامی ادب … کوئی … ان کی شاعری ایک غیر سائنٹفک کی پیداوار ہے۔ خیر اقبال کو چھوڑیئے۔ غالب کو لیجئے۔ غالب کی شاعری صورت پرستی کی شاعری … سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے انحطاطی دور کے انگریزی … شیلے اور بائرن کو۔ … ان کی شاعری کی عظمت اب ہمارے محض ایک تاریخی … نہیں۔ ہم جب تک تخلیقات کی … سائنٹفک اور مادی نظریۂ معیشت اور فہم اور شعور پر نہ رکھیں گے … انسانی اور رجعت پسندانہ معیشت کے تقاضوں پر قابو پا کر … کالعدم کر کے ایک نئی حیات کی تخلیق کرے جو فطرت اولیہ کا تضاد … ثانیہ کی نفی ہو، تو معاف کیجئے۔ صالح اور صحیح غیر جذباتی ادب نہیں کیا جا سکتا۔

سومرسٹ ماہم، ہیمنگوے، جوائس، … آلڈس ہکسلے … زیادہ پیداوار … تخلیقات کو اگر تاریخ اور سائنس کی ارتقائی قدروں پر جانچا جائے تو ان کی اتنی قدر و قیمت بھی نہیں رہتی جتنی بازار میں بکتی ہوئی ردی کی۔ ان … پر مبنی نظریات کا پرچار کرنے والے ادیبوں نے تاریخ کو پیچھے لے جانے کا ناقابل معافی گناہ کیا ہے۔ اور ان کے بجلک۔ غیر سائنٹفک اور رجعت پسندانہ اذہان کی مریضانہ جنسی خرافات نے موجودہ پود پر ایسا زہریلا اثر چھوڑا ہے کہ ہمیں اس کو زائل کرنے کے لئے شاید عظیم اور مسلسل جدوجہد کرنا پڑے۔ ان بورژوائی علمبرداروں کا طریق فکر سب مظاہر کو مختلف تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک محبت محبت ہے۔ نفرت نفرت ہے خود غرضی خود غرضی ہے۔ کتا کتا ہے اور گھوڑا گھوڑا۔ ان کا طبقاتی شعور اس قدر غیر پختہ اور انحطاط پذیر ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ ان کے مظاہر میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ اور ان کا ظاہرا تضاد اصلاً تضاد نہیں۔ بلکہ محبت۔ نفرت۔ خود غرضی۔ کتا اور گھوڑا معیشت کے قوانین کے لازمہ مظاہر ہیں۔ جو اس کے بدلتے ہی نیا قالب اختیار کر لیں گے۔ اسی منطق پر کاربند رہنے والا ہمارے ہاں منٹو ہے۔ خیر اس مصنف کو فی الحال چھوڑیئے مجھے ابھی اور ضروری باتیں کہنا ہیں۔ وہ یہ کہ میں منٹو کی مریضانہ ذہنیت کا تجزیہ کر دوں گا

اسی طرز میں اس مقالے کے پندرہ سولہ صفحات اور تھے لے کچھ کچھ شک ضرور تھا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ ناقابل فہم بکواس ہے۔ مگر جب اس مقالے کو اپنے دوست ایڈیٹر عاقل فریادی کو دکھایا تو اس کے سائنٹفک طریق تنقید سے بےحد متاثر ہوا۔ اس نے اس مضمون کو شاہکار کہا اور گھامڑ کو یقین دلایا کہ یہ مقالہ تنقید نگاری کی سب پچھلی روایات کو بدل ڈالے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ اردو میں پہلا مقالہ ہے جس میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے اختلافات کا اس گہرائی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ گھامڑ یہ سب تعریف سن کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ عاقل فریادی بھی اپنی جگہ ایک "نئی ادبی دریافت" کرنے پر مفتخر تھا۔

"قدریں" کے اگلے شمارہ میں اس مقالے کے ساتھ گھامڑ کی تصویر اور اس کا تعارف بھی چھپا۔ تصویر میں گھامڑ کو سگریٹ پیتے ہوئے اور اس کے دھوئیں میں کھوئی کھوئی نظروں سے غور و فکر کرتے ہوئے دکھلایا گیا تھا ——— اس مقالے کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں گھامڑ کی دھاک بیٹھ گئی اسے ادبی رسالوں کے کئی ایڈیٹروں کے خط آئے جن میں اس سے تنقیدی مقالوں کی فرمائشیں کی گئی تھیں۔ تین چار مہینے میں گھامڑ کا شمار ملک کے چوٹی کے نقادوں میں ہونے لگا۔ ایک صبح حجامت کرتے ہوئے گھامڑ کو خیال آیا کہ ادب کے ایک ہی شعبہ میں ٹکے رہنا کافی نہیں۔ چنانچہ اس نے افسانہ لکھ کر اپنے مداحوں کو اپنی قابلیت سے اور

ہ متحیر بیشسشدر کرنیکا فیصلہ کیا۔ اس نے "قدریں" کے خاص نمبر کے
انوں کو ایک بار پھر پڑھا۔ اور پھر ایک مشہور افسانہ نگار کے افسانے کے
نے کو سامنے رکھ کر ایک گھنٹہ میں ایک افسانہ لکھدیا۔ جس کا عنوان
"لکڑی کا درخت" لسے لکھنے کے بعد ہی خود اس کے دل نے اس سے
گھا مڑ کم بخت! تو نے تو شاہکار افسانہ لکھدیا ہے۔ اور پہلے ہی
میں!" وہ افسانہ یہ تھا،

لکڑی کا درخت

از۔ ل۔ گھامڑ

• شام کو مسافر روپ پور کے ننھے پہاڑی گاؤں میں پہنچا۔ تو وہ سا
چلتے رہنے سے بیحد تھکا ہوا تھا۔ مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا۔ اور شفق
رمزی رنگ نیچے سُست خرام ندی کے پانی میں گھل رہے تھے۔ اُسے
یسا معلوم ہوا جیسے پانی میں لالہ زار گھل رہا ہے۔

مسافر دن بھر چلتا رہا تھا۔ اپنے دیس سے وہ ریل پر پریم نگر کے
پر آیا تھا۔ اسٹیشن سے چاند آباد تک بس میں۔ اور وہاں سے وہ
پیدل چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا
وہ کہیں اور کیوں نہ چلا گیا۔ وہ کونسی کشش تھی جو اسے روپ پور میں کھینچ
لائی۔ اس نے ایک ننھے بے باک چرواہے سے پوچھا جو بھیڑیوں کو ہنکا
کے پاس سے گذرا۔

"ننھے۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

چرواہے نے اسے معصوم اور تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔

"مجھے کیا معلوم" اس نے کہا۔

کتنا ذہین بچہ ہے۔ مسافر سوچنے لگا ——— اور اسے کبھی معلوم
شعر کا حسن کیا ہے؟ دانتے کا انفرنو میں کیا لکھا ہے ——— یہ
ر بھیڑیں ہی چراتا رہے گا ——— اور اس کا بیٹا بھی اس کے بعد
یہی چرائے گا۔

ناگہاں مسافر نے چند دیہاتی دوشیزاؤں کو سر جھکائے، زلفیں
انگلیوں کے پوروں سے لالہ گوں ندی کے پانی سے کھیلتے دیکھا۔
تا ہوا وہاں پہنچا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ یہ دوشیزائیں درحقیقت
بید مجنوں کے اشجار تھے جن کی لانبی مخروطی ڈالیاں نازک نسائی انگلیوں سے
اس قدر مشابہت رکھتی تھیں۔

وہ واپس لوٹا اور ننھے چرواہے کے پاس گیا۔

میں رات کو یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔

میرے ساتھ آؤ ——— چرواہے نے کہا۔ اور وہ اسے اپنے کچے
مکان میں لے گیا جس کی چھت سُرخ کھپریل کی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد
دھان کی بالیاں رنگین خوابوں کی طرح سرسرا رہی تھیں۔

بچے نے کہا "میری بہن اور میں یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ ہمارے ماں
باپ دو سال ہوئے گزر گئے۔ ہم بھیڑ بکریاں چرا کر اپنی گزران کرتے ہیں۔
مسافر نے سوچا۔ لوگ کیوں مرتے ہیں۔ آناً فاناً موت انھیں کیوں
دبوچ لیتی ہے۔ قدرت کتنی بے رحم اور سنگدل ہے۔

میری بہن ابھی یہاں نہیں ہے۔ بچہ بولا۔ وہ اس وقت زمیندار
کے ہاں جاتی ہے ——— وہ سامنے تین منزلہ مکان ہے نا۔ وہ
زمیندار کا ہے۔ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ میری بہن کو بڑی اچھی اچھی چیزیں دیتا ہے۔
دونوں مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مسافر چارپائی پر بیٹھ کر اپنے
بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ بچہ اس کے لئے بکری کا تازہ دودھ کا کٹورا بھر
لے آیا۔ اسے پینے کے بعد مسافر کی ساری کسل دور ہو گئی۔

اتنے میں بچہ کی بہن بھی آ گئی۔ وہ ایک سترہ سالہ دوشیزہ تھی اس
کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور اسکی آنکھیں وحشی ہرنی کی طرح بے باک تھیں۔

"تم کون ہو؟" آخر مسافر نے پوچھا۔

لڑکی ہنسنے لگی۔ اس کے دانت بیسے آبدار موتیوں کی طرح سفید
اور چمکیلے تھے۔ مسافر کو ایسا معلوم ہوا جیسے یکایک بادلوں میں سے مہتاب
کا نور بہنے لگا۔ جھونپڑی میں جیسے اجالا ہو گیا۔

"میرا نام موشا ہے" ——— لڑکی نے کہا۔

مسافر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا "موشا۔ لکڑی لا کر کچھ آگ جلاؤ
میں سردی سے جم رہا ہوں۔"

موشا نے حسرت سے مسافر کو دیکھ کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی
اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"مسافر! یہاں لکڑی کی آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ لکڑی زمیندا

ی ہے۔"

اور پھر مسافر کو پتہ لگا کہ وادی کے سب درخت چیل۔ دیودار۔ بید مجنوں زمیندار کی ملکیت تھے۔ اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر ان درختوں کی ایک ٹہنی تک نہ کاٹ سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کتنا ظلم ہے ــــــ اس کے دل میں اس دیوصفت زمیندار کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔

"موشا!" اس نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا: "مجھے کلہاڑا دو میں لکڑی کاٹوں گا۔ اور ہم اس کمرے میں لکڑی کی آگ جلائیں گے ــــــ بھڑکتی ہوئی گاتی ہوئی آگ۔ اور تم اور تمہارا ننھا بھائی اور میں ساری رات اس آگ کے گرد بیٹھ کر کہانیاں کہیں گے۔"

"سچ" ــــــ موشا نے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا: "مسافر! مجھے کہانیاں بڑی پسند ہیں۔"

اس رات کلہاڑا نہ ملنے کی وجہ سے مسافر لکڑیاں کاٹ کے نہ لا سکا دوسرے دن وہ صبح سویرے گاؤں میں چلا گیا۔ اس نے گاؤں والوں میں پرچار کیا کہ اس وادی کے درخت تمہارے ہیں۔ اور تمہیں ان کو کاٹنا چاہیئے۔ مگر گاؤں کے لوگ زمیندار کے ہرکاروں سے خوف زدہ تھے مسافر نے ان میں سے چند جیالے نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ وہ کلہاڑے لیکر اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ ڈھول بجاتے، نعرے لگاتے اور کلہاڑیاں لہراتے وہ جنگل کی طرف چلے۔ اب انھیں زمیندار اور اس کے ہرکاروں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ ان میں سویا انسان جاگ چکا تھا۔

زمیندار نے اپنے سہ منزلہ مکان کی چھت سے انھیں دیکھا۔ اسے نیچے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا رنگ اس ہجوم کو دیکھ کر زرد ہو گیا یہ درخت ہمارے ہیں۔ گاؤں والوں نے زمیندار کو دیکھ کر نعرے لگائے۔

زمیندار چلایا ــــــ یہ میرے ہیں۔ میرے پردادا نے انہیں پہاڑوں پر اگایا تھا۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ اور پہاڑ کے دامن میں جا کر انھوں نے درخت کاٹے۔ اب ان کے گھروں میں لکڑی کی آگ جلنے لگی۔ اور سب رات کو دن کے کام کاج کے بعد معصوم بچے، جیالے نوجوان، اور ان کی سیاہ زلفوں اور پتلی کمروں والی محبوبائیں آگ کے گرد بیٹھ کر پہیلیاں بوجھتیں ہنستیں، اور ایک دوسرے سے چھیڑیں کرتیں۔

لیکن زمیندار نے پریم نگر کے جاگیردار کو چٹھی لکھی۔ اور اس نے وہاں سے فوج بھیج دی۔ اور فوج نے آکر گاؤں والوں پر ظلم ڈھائے۔ اُن کی عورتوں اور بہنوں کو پکڑ کر لے گئے۔ اور پھر وادی پر اداسی چھا گئی۔

یہ سارا قصور مسافر کا ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے کہتے۔ یہ ہمیں زمیندار کے خلاف نہ ابھارتا۔ تو ہمارے گھر بار یوں تباہ نہ ہوتے آخر اپلوں کی آگ سے تو ہم سینکتے ہی تھے۔

دن گزر گئے۔ ہفتے گذر گئے۔ مہینے گذر گئے۔ برس گزر گئے۔ بارہ برس گزر گئے۔ اور مسافر ابھی تک گاؤں میں تھا!

اور اس عرصہ میں زمیندار کا ظلم اور تشدد بڑھتا گیا۔ اب گاؤں والے اپلے جلاتے تھے۔ لکڑی کی بھڑکتی ہوئی آگ کیسی ہوتی ہے۔ شاعری کیا چیز ہے۔ زبان کی لطافت کیا شے ہے۔ پہاڑوں پر زریں ملائم کھال والے خوبصورت شیر کیسے چپکے سے دبے پنجوں چلتے ہیں ــــــ یہ سب باتیں گاؤں والے بھول گئے تھے۔ اب مسافر کے سوا جو ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلتا تھا باقی سب کو پریم نگر کے جاگیردار نے اپنی فوج میں زبردستی بھرتی کر لیا تھا۔ گنواریاں اب بات بات پر ہنستی نہ تھیں نہ مسکراتے اور کھیلتے نہ تھے۔ گاؤں پر اداسی گہری ہوتی گئی۔ چیلوں اور دیوداروں سے پتے جھڑ گئے ملائم کھال والے شیر اور سنہری جسم پر زنگاری رنگ کی دھاریوں اور دھبوں کے کوٹ پہننے والے چیتے جنگل کے نہ رہنے سے وادی کو چھوڑ کر پربت کی ترائیوں میں اتر گئے۔ چتکبری ریشمی کینچلیوں والے سانپ جو زریں وادی میں چاندنی راتوں میں ملہار الاپتے تھے۔ خاموش ہو گئے۔ لوگ محبت کو بھول گئے اور بال بڑھا کر وحشیوں کی طرح پہاڑوں پر پھرنے لگے

مسافر کا دل یہ ظلم دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ مگر وہ جاگیردار اور زمیندار کی فوجوں اور توپوں کے سامنے بے بس تھا۔ اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ مسافر جانتا تھا کہ زمیندار بھی خوش نہیں تھا۔ اس کے پاس دولت تھی۔ خوب صورت فرنیچر تھا۔ محل تھا۔ پھر بھی خوش نہ تھا۔ اس کے پاس دو پالتو لنگور تھے اور تین لگڑ بگڑ۔ پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ اس کے باپ نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے دادا نے بھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس

کے پرداد لنے بھی پہاڑوں پر جنگل اگانے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا۔ پھر بھی زمیندار خوش نہ تھا۔

ایک دن سوچتے سوچتے مسافر کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ س نے گاؤں والوں سے کہا:

"تم گاؤں میں ایک پیپل کا درخت لگاؤ۔ پھر اس پر زمیندار کا کوئی ق نہ ہوگا۔"

مندر کے پاس پیپل کا درخت لگایا گیا۔ پانچ سال۔ دس سال ندرہ سال بیت گئے۔ اور وہ درخت بہت بڑا ہو گیا۔ گرمیوں میں لوگ ں کے گھنیرے چھتر دار سایے کے نیچے آرام کرتے۔ اور سرما میں جب ادی ں برفیلی ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ اسکی شاخوں کو کاٹ کر اپنے گھروں ں آگ جلاتے۔ زمیندار یہ دیکھتا تو اس کے سینے پر سانپ لوٹتے لیکن ھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ پیپل اسکی ملکیت نہ تھا۔ اسے نہ اس کے باپ نے گھاد نہ اس کے دادا نے۔ اور نہ اس کے پردادا نے۔

اب پھر وادی سے نحوست اٹھ گئی چیل اور دیودار پھر اپنے پنپنے لنے لگے حسین بادشاہوں کی طرح اکڑ کر چلنے والے شیر پھر سے اپنی وادی دبلے پنجوں سے گھومنے لگے۔ ایک دن جب سر دار پور کے جنگل میں رکھیلنے گیا ہوا تھا۔ تو ایک شیر نے اس پر حسبت کی۔ اور اسے ہر سب ..... ریشمی کینچلیوں والے سانپ پھولوں کے کنجوں میں بدست ہرانے لگے۔ رات کو ان کی ملہار ساری وادی میں گونجتی۔ ایک دن ں سے ایک نے مسافر کو ڈس لیا۔ مسافر کا انگ انگ نیلا پڑتا گیا۔ گی کی لو دھیمی اور دھیمی ہوتی گئی...... اور وہ مر گیا۔ لیکن وہ ہ وہ زندہ ہے۔ وہ اس نیلے خوابیدہ دھویں کی طرح زندہ ہے جو دسنے ہی رد پ پور کے پتھریلے گھروں سے اوپر بل کھاتا ہوا اٹھتا ہے گرمی کے درخت کی کہانی ہے۔ اب میں آپ سے یہ بھی نہیں پ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ میں آپ کو اچھے اور صاف ہننے سے بھی نہیں روکتا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ صوفہ ں بجائے مونڈھوں پر بیٹھا کریں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا وں کہ آپ چھتر دار پیپل کے حامی ہیں یا دیودار اور چیل کے۔ دیکھئے واب دیجئے۔ آپ کے اس جواب پر اس ملک کے کروڑوں محنت

کش عوام کے مستقبل کا دار و مدار ہے اور اردو ادب کا بھی ــــ"

گھامڑ نے اس افسانہ کو ملک کے سب سے مشہور ادبی رسالے کے افسانہ نمبر کے لئے بھیجا۔ اسکی اشاعت پر گھامڑ نے فوراً ایک ہند کے اردو افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ حاصل کر لی۔ ملک بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس کے مداح اس کے اس کمال فن پر حیران اور خوش ہوئے۔ گھامڑ کئی ماہ تک اپنے نئے افسانوں سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کرتا رہا ـــــــ پھر اس نے تنوع کی خاطر سوچا کہ اب غزل گوئی میں کیوں نہ طبع آزمائی کیجائے۔ تاکہ ادب کی یہ صنف بھی باقی نہ رہے لیکن غزل کہنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھا۔ گھامڑ بے چارہ آزاد منش انسان قافیے اور ردیف کی بندشیں اس کے بس کا روگ نہ تھیں۔

اس نے غزل لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ اور کئی ایک جدید نظمیں پڑھنے کے بعد پورے پانچ منٹ میں ایک آزاد نظم "نوید سحر" لکھ ڈالی اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ نظم بھی ایک شاہکار تھی۔ وہ نظم یہ تھی:

نوید سحر

از :ـــ گھامڑ

نوید سحر سنو!
ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم
مرے ندیم مسرور ہو۔ کہ اب بیت گئی رات
تاروں کے کہکشاں کی بہار تو دیکھ
پھیکے ہوئے جاتے ہیں ظلم کے یہ علمبردار
اور اب صبح ہونے کا فقط ہے انتظار
اور یہ سلاسل ٹوٹ جائیں گے یہ سلاسل بے شمار
نوید سحر سنو!
ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم
کہ ظلم اور سامراج کا دور ختم ہونے کو ہے
ختم ہونے کو ہیں ملوک و اسقف و مخدوم
بڑھ رہے ہیں محکوموں کے ہجوم
چھیننے کے لئے اپنا حق۔ اپنی آزادی
یہ مدتوں کچلے ہوئے فریادی

بلند حوصلے سے پرچموں کی چھاؤں میں
ہر ایک کھیت میں۔ ہر ایک گاؤں میں
قدموں کی چاپ ہے
چپ چپ چپ چپ
نوید سحر سنو!
ڈم ڈم۔ ڈم
مسرور ہوا ہے ہم وطنو، سن یہ فرحناک آواز
دیکھ یہ مایوس بجھے دلوں کی لاہوتی پرواز
اب اٹھ چھپتی جاتی ہے تاریکی
پہن قبا۔ نقرئی لٹیں سنبھال
گذر ہو گئی اے دوست
نوید شادا!
ڈم!

یہ نظم چھپی تو ادبی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ دوجیسے گئے سال منتخب ادب کا مجموعہ شائع ہوا تو گلامڑ کی تین تخلیقات اس کے صفحات کی زینت تھیں جو ادب کے تین مختلف شعبوں میں اس کی استادی کی آئینہ دار تھیں ــــــ مقالہ "اردو ادب کے رجحانات۔ شعوری، نیم شعوری، اور لاشعوری" افسانہ "لکڑی کا درخت" اور اس کی نظم "نوید سحر" ــــــ تینوں انتخاب کی زینت تھیں۔ یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوا ہے۔ اور جس سے کئی پرانے ادیبوں کو اس سے للٰہی بغض ہو گیا۔

ادبی شہرت کے زینے پر چڑھنے کے بعد گلامڑ کی طبیعت یک لخت لکھنے لکھانے سے کھٹی ہو گئی۔ اور اس نے لکھنا بالکل ترک کر دیا۔ ایڈیٹروں کی طرف سے ایک دو سال تک فرمائشیں آتی رہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ اس نے شادی کر لی تھی۔ اور خانہ داری کے جھنجال اور نمک تیل کے بکھیڑوں نے گلامڑ کو سب چوکڑی بھلا دی تھی۔ اور اسکے دماغ کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تین سال کے بعد تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے کبھی ادیب کی حیثیت سے اچھا خاصا نام پیدا کر لیا تھا ــــــ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا نام اسکے مداحوں کے دماغوں سے بھی جلد ہی محو ہو گیا۔

ادبی شہرت کی عمر بھی کتنی مختصر ہے!؟

(بشکریہ "افکار")

اختر حسین اختر

شہیدانِ وفا

اے فدایانِ محبت اے شہیدانِ وفا
جان دے کے کردیا تم نے وفا کا حق ادا
دے رہا ہی تہنیت تم کو ہر اک چھوٹا بڑا
مرحبا اے جاں نثارانِ محبت! مرحبا

ہم وفا کیشوں کا تم پر آج ہو لاکھوں سلام
اور دے اللہ جنت میں تمہیں اعلیٰ مقام

ریڈیو میں جب یہ موجِ برق پر آئی خبر
ہو گئی خونِ شہیداں سی زمینِ مصر تر!
ہوک اک سینے میں اٹھی ہل گئے قلب و جگر
اشک کا دریا اُمڈ کر بہہ گیا رخسار پر

کروٹیں لینے لگا پہلو میں دل غم کیلئے
صف پہ صف بچھنے لگی ہر سمت ماتم کیلئے

خونِ ناحق سے تمہارے مچ گیا اک تہلکہ
عالمِ اسلام سارا بن گیا ماتم کدہ
آہ و نالہ شورِ واویلا سے گونج اٹھی فضا
جس طرف دیکھو نظر آتا تھا اک محشر بپا

کچھ نہ ظالم پر ہوا فریادِ پیہم کا اثر
کھینچ ڈالا بے گناہوں کو ستم سی دار پر

جانتے ہو ظالموں نے ڈھائی آفت قید میں
بے بسوں کو دی اذیت پر اذیت قید میں
ان سے اٹھوائی مصیبت پر مصیبت قید میں
ان پہ توڑی اُف اقیامت پہ قیامت قید میں

جان کی بازی پھر آئی جسم کی باری کے بعد
خون بھی آخر بہا ڈالا جفاکاری کے بعد

وہ تمہارا مسکرا کر جان دینے کا سماں — وہ دعائے عفوِ قاتل کیلئے لب پر رواں
بے گناہی کا وہ اطمینان چہروں سے عیاں — ہے سبق آموز کتنی غم بھری یہ داستان

اس سے یہ ظاہر ہوا تم بے خطا تھے پاک تھے
حق کی خاطر جان دینے میں مگر بیباک تھے

حق پہ مرنے کا جہاں کو دے گئے پیغام تم — تھا جو کرنے کا وفا میں کر گئے وہ کام تم
یوں گئے دنیا میں روشن کر کے اپنا نام تم — کفر کے بدلے جہاں سے لے گئے اسلام تم

یاد آ آ کر تمہاری دل جگر تڑپائے گی!
سینۂ مومن کو سوزِ عشق سے گرمائے گی

حق کا پائیگا اشارہ خونِ ناحق ایکدن — رنگ لائیگا تمہارا خونِ ناحق ایکدن
بنکے چمکے گا ستارہ خونِ ناحق ایکدن — ہوگا سب پر آشکارا خونِ ناحق ایکدن

سخت ہوگی وہ گھڑی باطل پرستوں کیلئے
دشمنانِ دین و ملت چیرہ دستوں کیلئے

تجھکو تیری ہی قسم، سچ سچ بتا اے آسماں! — کیا شہیدوں کا لہو جائیگا یونہی رائیگاں؟
سُنکے مجھ سے آج میری دکھ بھری کُل داستاں — کہہ گیا آکر کوئی کانوں میں میرے ناگہاں

جس طرح رنگِ شفق کو کوئی دھو سکتا نہیں
یہ شہیدوں کا لہو برباد ہو سکتا نہیں

داغہائے سینۂ رشکِ قمر بھی دیکھنا — رو رہا ہوں آج میری چشمِ تر بھی دیکھنا
کس طرح ہوتا ہے آہوں کا اثر بھی دیکھنا — دوستو! اب اپنا اپنا دل جگر بھی دیکھنا

دل سے ہے نکلا ہوا نالہ اثر کر جائے گا
سننے والوں کو یہ آخر حشر تک تڑپائے گا

مفید سبزی تھی جو سبزہ زار پر لڑ پھر رہی تھی دائیں جانب نیلے صنوبر کی
چوٹیاں دکھائی دیر ہی تھی جو دریائے ماسکو پر جھکی ہوئی پہاڑیوں
تھے ان درختوں کے نیچے دو یا تین دو یا تین بوڑھی کسان عورتیں
ر روایتی سفید رومال باندھے ہوئے سوسن کے پھولوں کی دیکھ
بھی رہی تھیں۔ صرف یہی انسان تھے۔ مجھے وہاں نظر آئے سامنے
ں ہو کا عالم تھا۔ درختوں پر پڑے والی کھٹ بڑھے کی چوٹیں ہی
اس خاموشی کو توڑتیں اور سارے کریملن میں گونج اٹھتی تھیں۔

ایک بڑی سیاہ کار

لیکن اچانک ہی میں خوب سے بیدار سا ہوگیا۔ بورو ونسکی گھنٹ
ں پھر بجنے لگی تھیں۔ ایک بڑی سیاہ رلموزین کار سال سال
ئی دروازے سے نکل گئی۔ کوئی شخص کریملن سے باہر جا رہا تھا
شخص اس لئے کہہ رہا ہوں۔ کیوں کہ کار کی کھڑکیوں پہ پیارک
ے ہوئے کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص تو میری نظروں سے
ہوئے تھے۔

اسی دروازے سے ہی وزیر اعظم جارجی مالنکوف اور اس کے
یوم نیوزی ...رو مولوٹوف گزر کر اپنے دیہاتی رہائشی مکانات
لے تھے۔ ... ماسکو دریا کے تھے تھا شہر کے شمالی مغرب
ں واقع ہیں۔ ... ہمیشہ ہی لموزین پر سفر کرتے ہیں۔ جو ۱۱ ہارس
ر کی کار ریکارڈ کا مقابلہ کرنے والی ... اور دنیا
زیادہ زیر ... گلیوں میں ... انتہائی رفتار سے گزرتی ہیں۔
کے ہر بلاک میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ پہلے ہی آگے والی پولیس
نبر ہو جائے اور ... سڑکیں اور راستے خالی کروا دیں اس وقت
ری انسان ... کوئی دوسری موٹر کار ... لمبی
... ہوئی گزر جاتی ہیں اور ان کے پیچھے مسلح محافظوں سے بھرے
رک ہوئے ہیں۔

قدیم ترین سیاسی قلعہ

جب بورو ونسکی گیٹ کی گھنٹیاں خاموش ہو گئیں تو ہم نے دریا
ی ۱۳۰ فٹ لمبی پہاڑی پر چلنا شروع کیا۔ اس جگہ سے یہ بات
دیکھی جا سکتی تھی۔ کہ صدیوں کے دوران میں کریملن کا قلعہ کس طرح
بنتا اور بڑھتا رہا۔ دراصل دنیا بھر میں یہ سیاسی اقتدار کا قدیم ترین صدر مقام
ہے جو پہلے بھی قلعہ تھا اور آج بھی قلعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ روس کے موجودہ
حکمران اس کی ٹھوس تعمیر اور اندرون دیوار تنہائی کو اپنے راز دارانہ اور
تحقیقاتی آہنی پردے کے لئے موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں۔

کریملن کا انگریزی لفظ کریمل سے بنا ہے یہ لفظ تاتاری زبان سے آیا
ہے اور اس کا مطلب ہے "ایک قدیم روسی قصبے کا اندرونی مضبوط مقام"
بارھویں صدی میں شہزادہ یوری نے لکڑیوں کی پہلی کریملن دیوار
بنائی تھی ۱۲۳۸ء میں مشرق کی طرف سے آنے والے تاتاریوں نے اس
دیوار کو راکھ کر دیا لیکن بعد ازاں پھر اس کی تعمیر کر دی گئی۔ اس بار شاہ بلوط
کی دیواریں بنائی گئیں اور اس وقت کریملن میں جہاں گرجا گھر بنے ہوئے
ہیں۔ عین اسی جگہ لکڑی کے گرجا گھروں کی تعمیر کی گئی۔ درباری اور کسان
لوگ پاس ہی مکان بنوانے لگے۔ وہ کریملن کی محافظ دیواروں کے عین قرب میں
رہنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح ماسکو کی شروعات ہوئیں۔

میری گائیڈ نے مجھے بتلایا کہ کریملن کی سب سے پہلی پتھر کی دیوار کی
تعمیر ۱۳۶۷ء میں کی گئی تھی۔ یہ دیوار نہ صرف ماسکو کے شہزادے کی حملہ آوروں
سے حفاظت کرتی تھی۔ بلکہ ماسکو کے ہر سال خاک سیاہ کر دینے والی آگ
سے اس کے محلات اور گرجوں کو بچاتی تھی آئیون اعظم (خونخوار آئیون) کی
حکومت کے دنوں میں اونچی اینٹ کی دیواریں اور پتھر کی بعض عمارتیں بنائی
گئی تھیں جو ابھی تک قائم ہیں۔ ان دنوں کریملن آج کا روپ دھارن کر گیا

دو تباہیاں — نئی زندگی

۱۸۱۲ء میں نپولین کے حملے کے وقت اور ۱۹۱۷ء کے بالشویک
انقلاب میں اس قلعے کو بہت سا نقصان پہنچا۔ لیکن اپنے صدر مقام کو
پھر سے زندگی دینے میں سوویٹ لیڈروں نے لاکھوں روبل
صرف کئے۔ آج اونچی اینٹوں کی دیواریں اپنی مخصوص تیکھی فصیل کے ساتھ
سوا میل لمبی ماسکو کے وسط میں کریملن کے گرد موجود ہیں۔ کریملن کے چار
دروازے اور ۱۹ برج آج بھی صدیوں پہلے کی شان اور جلال کے ساتھ
کھڑے ہیں۔

میں اور میری گائیڈ کریملن کے میدانوں میں چل رہے تھے مجھے
اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ دیواروں کے اندر زندگانی کا کوئی ثبوت

نہیں ملتا۔ کریملن کے مشرق میں پیلی اینٹوں کی عمارتوں سے اونچا اٹھتا ہوا برج ہی ہے جو کبھی باہر سے خاموش علاقہ تھا۔ ویسے بھی بہت ڈراؤنا دکھائی دیتا تھا کیونکہ ان عمارتوں کے اندر روس کے حکمران رہتے اور کام کرتے ہیں۔ وہاں مالنکوف کے نزدیکی دوست اور نزدیکی رقیب رہتے کھاتے پیتے لکھتے پڑھتے اور سوتے ہیں۔ ان کمروں میں کھڑکیوں سے ساری رات روشنی چھن کر آتی رہتی ہے۔

سوویت آقاؤں کے محل

کریملن کے وسط میں کمیونسٹ کرچے میں جوکہ گرجا چوک کے شمال میں واقع ہے کھڑے ہو کر میں نے سوویٹ آقاؤں کے رہنے اور کام کرنے والے مکان کو نزدیک سے دیکھا۔ یہاں مرکزی چوک کے چاروں طرف سبزہ زار ہیں اور سرخ دسنگتری پھولوں کی پھلواریاں منظر کو رنگین بناتی ہیں۔

اس سبزہ زار سے ذرا پیچھے ہی زرد دیواروں اور سبز چھت والی کمیونسٹ دنیا کا ہدایتی مرکز ہے شروع شروع میں یہاں بہت سے محلات اور گرجا گھر تھے۔ تاہم حالیہ برسوں میں سوویٹ سرکار نے یا انہیں گرا دیا ہے تبدیل کر دیا ہے یا نئے سرے سے تعمیر کیا ہے آج سوویٹ کے اعلیٰ ترین لیڈران ان گنجان عمارتوں میں رہتے ہیں۔

چار چھتوں والی ان عمارتوں میں بیٹھکیں خواب گاہیں اور غسل خانے ہی نہیں بلکہ ان کے دفتر کانفرنس کے کمرے لائبریریاں اور ریکارڈ گھر ہیں کریملن کے باورچی خانے لانڈریاں وغیرہ بھی یہیں ہیں۔

فون کا مرکز

شاید کریملن کے ٹیلیفون سسٹم کا مرکز بھی یہیں ہے۔ میں شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ ماسکو کی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں کریملن کا کوئی نمبر نہیں دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو فون کرنے کے لئے ۱۱-۱۵-۶ K نمبر پر ڈائل گھمانا پڑتا ہے۔ تو وزارت کے لئے ۵۱-۹۰-۵ K حالانکہ دونوں کے افسران اعلیٰ کریملن میں ہی رہتے اور کام کرتے ہیں۔

اس ہیڈکوارٹر کی عمارتوں کی کھڑکیوں سے بہت شاندار نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ وزیر اعظم مالنکوف اور اس کے ساتھی جدھر بھی نگاہ کریں یہ نظارہ دکھائی دیتا ہے مشرق کی طرف دیکھنے سے کریملن کی دیوار کے اوپر سے سرخ چوک اور لینن واسٹالن کے مزار دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی دائیں طرف سینٹ بیسل کا پیازوں والے گنبدوں کا گرجا ہے جو کہ خوفناک آئیون نے تعمیر کروایا تھا۔

اگر مالنکوف دریائے ماسکو سے دور جنوب کی طرف نگاہ دوڑائے تو اس کی نگاہ افق تک پھیلے ہوئے روسی دیہات پر پڑتی ہے۔ فیکٹریوں کے نکلے ہوئے دھوئیں اور پرانے گرجوں کے میناروں سے لدے پڑے ہیں اور دائیں طرف ماسکو یونیورسٹی کی نئی بتیس منزلوں والی عمارت کھڑی ہے۔ شمال میں پیلی اینٹوں والا کریملن کا اسلحہ خانہ سارے منظر پر چھایا ہوا ہے اب یہ اسلحہ خانہ کریملن کے سنتریوں کی رہائش گاہ کے طور پر کام آتا ہے میں نے کئی دفعہ کریملن کے افسروں اور دوسرے سپاہیوں کو مایوسانہ نگاہوں سے بارکوں کی کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے پایا ہے اگر ایسے کچھ ہفتے بیشتر مالنکوف اور اس کے دوست اپنے گھروں کی چھتوں سے دیکھتے تو انہیں بارکوں کے سامنے والے بازار میں امریکی جھنڈا لہراتا ہوا دکھائی دیتا۔ لیکن اب امریکی سفارتخانے کو وہاں سے ہٹائے جانے پر مجبور کر دیا گیا ہے حکومت کا کہنا تھا کہ انہیں ماسکو کی یونیورسٹی کے لئے وہ عمارت درکار تھی۔

مغرب میں باقی کریملن کا سارا نظارہ آجاتا ہے۔ تین مشہور گرجا گھر جو اب میوزیم بنائے جا چکے ہیں ان میں ایک گرجا ۱۴۸۲ء سے ۱۴۹۰ء کے سالوں کے درمیان تعمیر ہوا تھا اور زار انہیں شادیوں وغیرہ کے لئے استعمال میں لاتے تھے۔ دوسرا گرجا گھر ایک اطالوی معمار ارسٹوٹل فیوراونتی نے ۱۴۷۵ء اور ۱۴۷۹ء تک کے سالوں میں تعمیر کیا اور یہاں روس کے زاروں کی تخت پوشی کی رسم ادا ہوتی تھی۔ اور تیسرا گرجا جو کہ ۱۵۰۵ء سے ۱۵۰۹ء کے سالوں میں تعمیر ہوا تھا اس میں زار دفنائے جاتے تھے ـــــ مغربی کھڑکیوں سے مالنکوف آئیون اعظم کا بارعب گھڑیال دکھائی دیتا ہے جو ۳۲۰ فٹ اونچا ہے نزدیک ہی کریملن کی دو عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ ایک تو زار کا گھڑیال جو کہ ۲۰۰ ٹن ہے۔ اور دوسری زار کی توپ یہ ۴۰ ٹن بھاری ہے اور اپنے زمانے کی سب سے بڑی توپ تھی لیکن یہ دونوں چیزیں استعمال نہیں کی گئیں ۱۷۳۷ء میں جب زار کا گھڑیال نیچے گر پڑا اور اسے پھر کبھی اوپر چڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی! اور توپ تو محض نمائشی تھی۔

وحید اللہ وحید •

○

سناؤں سننے والو کیا کہانی دکھ بھری اپنی
سراسر رنج و غم کی داستاں ہے زندگی اپنی

بہار عمر ان قصوں میں آخر ہو چلی اپنی
جسے کہتے ہوئے شرما رہا ہوں زندگی اپنی

جہاں بدلے، جہاں کی وضع بدلے سلطنت بدلے
بدل سکتا نہیں تحریر قسمت آدمی اپنی

الٰہی دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہے
کسی کا عکس تھا پردے پہ یا تصویر تھی اپنی

کٹھن ہوتی گئیں اتنی ہی راہیں تیری منزل کی
خرد کرتی گئی بڑھ بڑھ کے جتنی رہبری اپنی

میں بلبل بن کے دیکھ آیا حقیقت سارے گلشن کی
نہ خار اپنا، نہ گل اپنا، نہ کوئی پنکھڑی اپنی

بچا نیر تا بہ کے دامن نگاہیں پاس حرمت سے
نہ جب خود حسن دلکش سے تجلی رک سکی اپنی

ہمیں سے ہیں ہمیں سے ہیں بہاریں حسن دلکش کی
اسے کیا لطف جو دیکھے تجلی آپ ہی اپنی

وہ محفل اٹھ گئی سنتی تھی جو نغمے غم دل کے
وحید اب ساز اپنا اپنا ہے اور راگنی اپنی

دار کاشمیری •

دل سمجھے گا دل کی بات

عقل کے دن میں عقل کی رات ۔۔۔ کون سنے گا، دل کی بات
جیت گئے وہ جیت گئے ۔۔۔ آخر ہم نے کھائی مات
عقل کے بس کی بات نہیں ۔۔۔ دل سمجھے گا دل کی بات
یوں کٹتی ہے تیرے بغیر ۔۔۔ جیسے رُوٹھ گئی ہو حیات
حسن پہ اک الزام نہیں ۔۔۔ عشق پہ سو سو الزامات

جس کو دیکھو دُنیا دار
اپنا مطلب اپنی بات

محمد نواز چونڈہ ایم اے

تجرّد و ازدواج

(کنواروں اور شادی شدہ لوگوں کی زندگی کا تقابل)

امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے حال ہی میں ازدواج و تجرد کے مسائل کا تحقیقاتی جائزہ لیا ہے، یہ جائزہ اپنی علمی اہمیت سے قطع نظر بصیرت افروز بھی ہے اور حقیقت کا آئینہ دار بھی۔ اس جائزہ کے لئے تقریباً ۱۲ سو افراد سے استفسار کیا گیا۔ یہ لوگ مختلف عمر، مختلف مزاج اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تحقیقات اور استفسار خط وکتابت کے ذریعہ کیا گیا۔ جوابی خطوط پر کسی نے بھی اپنا نام دینا نہیں لکھا تھا۔

ہر ایک نے اپنی عمر، تعلیم پیشہ اور صحت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا نیز یہ بھی بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے یا کنوارا بصورت اول ان کی ازدواجی زندگی کی مدت کیا ہے اور وہ کیسے گزر رہی ہے۔ سب نے اپنی آپ بیتی لکھی۔ ان نفسیاتی مسائل کا بالترتیب ذکر کیا جو انہیں، اکثر پریشانی اور اضطراب کی حالت میں رکھتے ہیں، مثلاً خوف دہراس کا احساس، بجھی بجھی سی طبیعت، ہر وقت، کھڑا، کھڑا سا مزاج، خاص خاص اوقات میں ذہنی اور جسمانی زبوں حالی، مسلسل بے چینی، اور پژمردگی، غلط رجحانات کی نشوونما وغیرہ، وغیرہ،

جوابات کے موصول ہونے اور انھیں غور سے پڑھنے کے بعد انہیں چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ شادی شدہ مرد، شادی شدہ عورتیں اور غیر شادی شدہ عورتیں۔ ان میں سے شادی شدہ اور غیر شادی کی تعلیم اور عمر میں چنداں فرق نہیں ہے یعنی دونوں فریق ذہنی اور طبقاتی لحاظ سے تقریباً ایک ہی معیار رکھے ہیں۔ ہر گروہ کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی اوسط تعداد کچھ اس طرح بنتی ہے:-

شادی شدہ مرد	۱۶٫۱۰
غیر شادی شدہ مرد	۱۷٫۵
شادی شدہ عورتیں	۱۶٫۳
کنواری عورتیں	۱۸٫۹

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہر گروہ کو تقریباً ایک ہی قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ چنانچہ ہم اس ایک حد تک قائم شدہ نظریئے کو آسانی سے جھٹلا سکتے ہیں۔ کہ شادی شدہ لوگوں کو کنوارے لوگوں کی نسبت زیادہ مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک شادی شدہ شخص جس کی ازدواجی زندگی انتہائی تلخ ہے اگر کنوارہ ہوتا تو اسے کہیں اس سے بھی زیادہ کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا۔ تقدیر ضرور اسے کسی اور پُر ہول غار زار میں دھکیل دیتی اور وہ زیادہ مصائب کا شکار ہوتا۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسان اجرام فلکی، ارض و سما کی یہ لامحدود وسعتیں اور یہ ساری کائنات کسی ایک ہی وقت یا لمحے کی تخلیق نہیں۔ بلکہ ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے پیہم ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے، اور اس ارتقائی عمل میں رفاقت اور ہم جنس کا جذبہ بدرجہ تم موجود ہے۔

نئی نسل کے مردوں اور عورتوں میں شادی سے بیزاری اور انکار کا جو رجحان بڑھ رہا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ قدرت اس توازن کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں۔ ایسے لوگ انسانی فطرت کے بنیادی اصولوں سے منحرف اپنی زندگیاں تلخ اور ناخوشگوار کر لیتے ہیں اور اس طرح خود اپنی ذہنی الجھنوں میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ غیر شادی شدہ عورتیں ہر وقت ایک نامعلوم سی بےچینی کا شکار رہتی ہیں اور دوسروں کی قابلِ رشک ازدواجی زندگی دیکھ کر بھی اپنے آپ کو ان سے برتر تصور کرنا ایک محض خود فریبی ہے۔ بلشیتر عورتیں اس میں مبتلا رہتی ہیں۔ سچی خوشی اور سکون قلب جیسی نعمتوں سے انہیں تمام عمر محروم رہنا پڑتا ہے۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے، ذہنی امراض اور طرح طرح کے خواب ان عورتوں کی عام بیماریاں ہیں اپنے متعلق "دوسروں" کی رائے معلوم کرنا ان کی بہت بڑی خواہش ہوتی ہے، وہ سمجھتی ہیں کہ دوسرے

ہر وقت ان کے متعلق ہی سوچتے رہتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی حالت کنوارے مردوں کی ہے، اپنی قابلیت پر بھروسے کا یکسر فقدان ضرورت سے زیادہ خود آگاہی، حد سے زیادہ احساس، لوگوں کی نکتہ چینی، اور حرف گیری پر انتہائی سنجیدگی سے غور و فکر کرنا، اپنے لئے پریشان کن نتائج اخذ کرنا ان کی نمایاں خصوصیات ہیں، بیس سے لیکر اٹھائیس سال کی عمر کے ایسے لوگ بے حد وہمی اور متلون مزاج ہوتے ہیں، ذیل کے اعداد و شمار سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کو کن کن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا کل تعداد کے مقابلے میں کیا تناسب ہے۔

مسائل

حسب ذیل مسائل شادی شدہ عورتوں کو زیادہ پریشان کرتے ہیں مجموعی طور پر زندگی کو زیادہ سنجیدگی اور غور و فکر سے دیکھنا ۲۰ فیصد، اپنے حقوق دوسروں کی خاطر قربان کرنا ۲۰ فیصد، اہم امور کو یاد رکھنے سے معذوری ۱۸ فیصد، ہر وقت سخت بیماری کا خدشہ ۱۹ فیصد، مفلسی کا خوف ۱۵ فیصد، رشتہ داروں سے خوشگوار تعلقات قائم نہ رکھ سکنا ۱۵ فیصد، بڑھاپے کا خوف ۱۰ فیصد، زندگی میں کامیابی کے امکانات کی کمی ۱۴ فیصد، موزوں لباس کے انتخاب نہ کر سکنا ۸ فیصد، شگفتہ اور مسرت بخش لمحات کی کمی ۸ فیصد، ایسی الجھنیں اور مسائل، جو کنواری عورتوں کو زیادہ پریشان کرتے ہیں، یہ احساس کہ دوسروں کا ان کے متعلق کیا نظریہ ہے ۳۵ فیصد، نہایت عجیب و غریب خواب دیکھنا ۳۰ فیصد، موٹاپے کا خوف ۲۶ فیصد، بے اخراجات کو کم نہ کر سکنا ۲۸ فیصد، احساس کمتری ۲۱ فیصد، کسی کے بہکاوے میں آجانا ۱۲ فیصد، کام سے زیادہ آرام و آسائش میں دلچسپی لینا ۱۵ فیصد، صحیح دوستوں اور ساتھیوں کے انتخاب میں نا اہلیت ۱۱ فیصد، دوسروں پر اعتماد ۱۵ فیصد، گرمجوشی اور انہماک کی کمی ۱۵ فیصد، سستی کی عادت ۱۴ فیصد، غیر معروف ہونا ۱۴ فیصد، روکھا پن اور چڑچڑا پن ۱۰ فیصد، یہ احساس کہ میں قابلیت کے اوسط معیار سے کم ہوں ۱۱ فیصد، جنسی جذبات سے مغلوب ہو جانا ۲۲ فیصد۔

ایسے مسائل جو شادی شدہ مردوں کو غیر شادی شدہ مردوں سے زیادہ پیش آتے ہیں۔

حد سے زیادہ قدامت پسندی ۲۲ فیصد، چڑچڑا پن ۲۰ فیصد، زیادہ کوشش اور حاصل کرنے کی قوت میں کمی ۱۷ فیصد، اکھڑ پن ۱۷ فیصد، بڑھاپے کا خوف ۱۷ فیصد، پہلے نہ کھائی ہوئی چیزوں کو کھانے میں ہچکچاہٹ ۱۷ فیصد، دوسروں کی خاطر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جانا ۱۶ فیصد، ذہنی انتشار کا خوف ۱۶ فیصد، مناسب لباس کے انتخاب میں نا اہلی ۹ فیصد، ملازمت سے الگ کر دیئے جانے کا خوف ۸ فیصد۔

ایسے مسائل جو غیر شادی شدہ مردوں کو شادی شدہ مردوں کی نسبت زیادہ پیش آتے ہیں۔ خود اعتمادی کی کمی ۴۲ فیصد، حد سے زیادہ خود آگاہی ۳۷ فیصد، حد سے زیادہ حساس ہونا ۳۲ فیصد، دوسروں کی نکتہ چینی سے پریشان ہو جانا ۳۱ فیصد، افسردہ لمحات کا دورہ ۴۹ فیصد، بے دینی کے رجحانات ۲۹ فیصد، احساس کمتری ۲۳ فیصد، فضول خرچی کا میلان ۳۴ فیصد، محنت سے زیادہ عیش و آرام میں دلچسپی ۲۲ فیصد، ناخوشگوار حقائق سے منہ موڑنا ۱۶ فیصد، جنسی جرم کے ارتکاب کرنے کا خوف ۱۳ فیصد، جنسی مخالف سے رغبت ۲ فیصد، ناشائستہ الفاظ کہنے سے احتراز کرنا ۶ فیصد۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے پیش نظر کنوارے لوگ کہتے ہیں کہ ایک دقیق اور انتہائی پریشان کن مسئلے کو سلجھانے سے بہتر ہے کہ آدمی اس مسئلے سے ہی الگ ہو جائے۔ مثلاً یہ کتنی بڑی مشکل ہے کہ بیوی اپنے ذہنی معیار سے پست اور عادات و خصائل میں بالکل مختلف ہو اور زندگی ایک مسلسل عذاب بن کر رہ جائے۔ لیکن ماہر نفسیات یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے تحت الشعور کے مسائل ہمارے شعوری مسائل سے کسی طرح بھی کم ہیں اور ان کو حل کرنا اس سے بہتر ہے کہ ہم کئی چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کے پیچھے پریشان ہوتے پھریں اور پھر ان رجحانات کے متعلق یقین ہو کہ انہیں دبایا جا سکتا ہے ہماری پریشانی کا باعث نہیں۔

نفسیات کے ہر طالب علم کو اس واضح حقیقت کا علم ہے کہ کنوارے مردوں اور عورتوں کی الجھنوں اور مسائل میں سے اکثر کی بنیادی وجہ جنسی جذبے کی تشنگی ہوتی ہے۔

ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے پر یہ حقیقت واضح ہے کہ ازدواجی زندگی میں قدم قدم پر مختلف مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شادی شدہ

لوگ کچھ فطرتاً قناعت پسند اور کم آمیز ہو جاتے ہیں یا انہیں ہونا پڑتا ہو زندگی کے تقاضے انہیں ایسا ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جو اس مختصر اور غیر یقینی دور زندگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دینا چاہتے تھے انسان کے دل میں ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں لیکن ہم مانتے ہیں کہ ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ ان میں اکثر کے ارمان دل ہی میں رہ جاتے ہیں۔ وہ ہر نیا قدم اٹھانے سے جھجکتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ کہیں ان کے بیوی بچوں کو اقتصادی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر انجانی اور نئی شاہراہ پر چلنے کی بجائے اسے پرخطر سمجھکر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ انہیں دوسروں کی خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی زندگی دوسروں کے لئے ایک خاص ڈگر پر چلنا شروع ہو جاتی ہو لیکن ستم تو یہ ہو کہ ان کی بیویاں ممد و معاون ہونے کی بجائے اکثر اوقات ان کے لئے بلائے جان بن جاتی ہیں۔ شوہروں کے منہ پر ان کی خامیاں گننا۔ تنگ مزاجی لاپرواہی صاف نہ رہنے جانے کیا کیا مناتے رہتی ہیں ایسے حالات ہم آئے دن دیکھتے سنتے ہیں۔ بیچارے شوہر کو سر تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مجرد آدمی ایسی علامت سے تو بچے رہتے ہیں۔

تحقیقات کے بعد مشورہ دیا گیا ہو کہ محض حسن اور دولت پر مرنا درست نہیں بلکہ سلجھا ہوا ذوق اور صحت مندی نسوانیت کا اصل جوہر ہیں اور یہی لازوال حسن کے بنیادی عناصر ہیں۔

(بشکریہ نوائے وقت)

خاور نظامی

پھر بھی غدّارِ قوم کہتے ہیں!

کس قدر باوقار ہیں ہم لوگ
بر سرِ اقتدار ہیں ہم لوگ

رازِ غنچہ ہیں، روحِ شبنم ہیں
کیفِ رنگِ بہار ہیں ہم لوگ

قوم کو ہم نے رکھ لیا زندہ
قوم کا اعتبار ہیں ہم لوگ

شمعِ منزل ہمارے نقشِ قدم
آشکار آشکار ہیں ہم لوگ

چھوڑ دی ہے نشاط کی دُنیا
کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ

ناز کیجئے سرائے فانی پر
آپ کے جاں نثار ہیں ہم لوگ

ہم کو دریا دلی وُدیعت ہے
نازشِ روزگار ہیں ہم لوگ

ناز کرتا ہے مے کدہ ہم پر
مُنتخب بادہ خوار ہیں ہم لوگ

بُزدلوں کو دلیر ہم نے کیا
خلق کے پردہ دار ہیں ہم لوگ

وہ سُنائیں گے تم کو رازِ حیات
جن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

پھر بھی غدّارِ قوم کہتے ہیں
چند روزہ بہار ہیں ہم لوگ

حسن احسانی

بندۂ معبود

یقین و تقویٰ، جہاد و عمل، خشوعِ سجود
جو یہ نہیں، تو ہے بے رُوح بندۂ معبود

کوئی ستارہ یہاں نحس ہے نہ چرخِ کبود
جو تو مطیعِ علیم و قدیر! سب مسعود

بغیرِ تقویٰ تری زندگی ہے بے مقصود
جو یہ نہیں ہے تو مشکل ہے ارتقائے نمود

نتیجہ ظلم و معاصی کا کیا ہے؟ "بربادی"
کہ سطحِ دہر پہ باقی نہیں ہیں عاد و ثمود

یقین نہیں، تو جہنم ہے ہر بہشتِ اُمید
یقین ہو، تو ہے گلزار آتشِ نمرود

قیصر تمکین

کھلا دروازہ

تیسرے پہر کی چائے دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد پی کر چھوٹے
اہ جی بارات کے ساتھ آئے ہوئے مہمانوں اور داروغہ جی کو ساتھ لیکر ٹہل
ئے کے لئے گدڑ والہ باغ کی طرف چلے گئے اور گڑھی کے ہر حصّہ سے پیراں
ٹ! پیراں بھاٹ، کی آوازیں آنا کچھ کم ہو گئیں تو پیراں بھاٹ دو راتوں
نیند کا نشہ آنکھوں میں سنبھالے اور تقریباً تین دھڑی بیجھڑ ھنکا بوجھ
ر پر لادے گڑھی کے پھاٹک سے اس طرح باہر نکلا کہ اُسے اپنی حالت
ی صحیح اندازہ تھا۔ اس وقت اگر کوئی شخص اُسے گڑھی کے پھاٹک پر
ک لیتا اور پوچھتا کہ "پیراں بخش، یہ تین دن تک برابر باراتیوں کے لئے حقّہ
ر، ان کی گاڑیوں کے بیلوں کے لئے چری کاٹ کر، ان کے ساتھ آئے
ئے ملازموں تک کے نہانے کے لئے رات رات بھر کنوئیں سے پانی
پکر سنخادوں میں بھرنے کے بعد تمہیں تکلیف زیادہ پہونچی ہے یا بغیر امید
پندرہ سیر اناج مفت مل جانے کی خوشی زیادہ محسوس ہوتی ہے" تو یقیناً
ں بھاٹ سے کوئی جواب بن نہ پڑتا۔ اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا۔ ہو سکتا
کہ وہ اپنے سر کا یہ پندرہ سیر بوجھ اٹھا کر اس آدمی کے منہ پر دے مارتا اور
ے "مجھے ...... مجھے بس کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے"

اُسے بس کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اناج
ی گٹھری وہیں کہیں پھاٹک کے قریب کسی نالی میں پھینک دے اور گھر
پکر فقیرا کی ماں کو چوٹی سے پکڑ کر لائے اور چلا چلا کر کہے کہ "مردار میں تیری اور
ے فقیرا کی قسمت کا اناج گڑھی کے پھاٹک پر پھینک آیا ہوں۔ بھوک
ہی ہو تو مر جا بھوکی" اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ اناج یہاں نہ پھینکے
گھر لیجا کر فقیرا کی ماں کو دیدے اور بڑے پیار کے ساتھ کہے "فقیرا کی
یہ اناج خود چھوٹے شاہ جی نے مجھے دیا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اب کی
ں مجھے بیگار میں پکڑا گیا ہے لیکن شاہ جی نے مجھ سے خود کہا کہ پیراں تمہارے
ے کا اناج اصطبل کی کوٹھری میں رکھا ہے جب گھر جاؤ تو اپنی چادر میں

باندھ کر لیتے جانا۔ تو یہ لے۔ اب چاہے پیس پائیں کر روٹیاں پکالے یا
یونہی اُبال ڈال۔ میں تو تیرے لئے باراتیوں کا کھانا بھی لا سکتا تھا لیکن
پھر میں نے سوچا کہ حویلی کی ڈیوڑھی پر جاؤں گا تو اندر سے کسی نہ کسی کو میرے
لئے کوئی کام یاد آ جائیگا۔ اور پھر تو جانے ایک کام کے بعد دوسرا کام نکالتا
ہے۔ لا جلدی سے کمبل تو ڈال دے میرے اوپر۔ اور دیکھ۔ زمیندار کے گھر
سے کوئی مجھے بلانے کے لئے آئے تو مجھے اٹھانا نہیں ——— اُسے باہر
سے ہی ٹال دینا!"

پھاٹک کے پاس والی گلی سے گزرتے وقت اسے بڑی خوشی ہوئی
کہ کلوا بنئیے کی دکان کھلی ہوئی تھی اور اس نے چبوترے پر غفورا تیلی، بھیرو چلاہا
رمضان لوہار، اور گاؤں کے کئی دوسرے آدمی بیٹھے تھے لیکن ان میں
سے کسی نے اُسے آواز نہیں دی۔ ان لوگوں کی نظر سے چھپنے کے لئے
اس نے اپنے سر کی گٹھری کو ماتھے کی طرف کچھ زیادہ جھکا لیا تھا۔ اور قدموں
کی آواز بھی کچھ آہستہ کر دی تھی لیکن پھر بھی وہ اس گاؤں کا پیراں بھاٹ
تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ انھوں نے اسے پہچاننے کی کوشش نہیں کی
پیراں بھاٹ انہیں گڑھی یا اِدھر اُدھر کی کوئی بات سنانے کے موڈ میں
نہیں تھا۔ کوئی نئی بات اس کے پاس تھی بھی نہیں۔ لیکن کسی نے اُسے
پہچانا کیوں نہیں؟ اُسے نظر انداز کیوں کر دیا؟

دو راتوں کی بیداری نے پیراں کا دماغ کچھ ماؤف سا کر دیا تھا
کسی بات کو ذہن میں رکھ کر اُسے زیادہ دیر تک کریدتے رہنے کی طاقت
اس میں باقی نہیں تھی۔ لیکن وہ کلوا بنئیے کی دکان کے قریب سے گزرا اور کسی نے
اُسے آواز نہیں دی۔ وہ سر جھکائے ہوئے بڑی رازداری کے ساتھ چپکے
چپکے باتیں کر رہے تھے۔ کیا یہ باتیں پیراں بھاٹ کی ذات سے زیادہ اہم
تھیں ——— اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر رکھی ہوئی تین
دھڑی اناج کی گٹھری تین من کی ہو گئی ہے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں

بیٹھی ہوئی دورانوں کی ٹھنڈک ایک کپکپی کی شکل میں اس کے جسم کے انگ انگ میں اتر رہی ہے۔

ایک ہلکی سی جھرجھری لیکر اس نے اپنی رفتار تیز کردی اور جیونا چمار کی جھونپڑی کے قریب مڑکر فقیروں والی گلی میں داخل ہوگیا۔

یہ گلی بالکل سونی پڑی تھی۔ یہاں کے سارے مرد، عورتیں، اور بچے گڑھی گئے ہوئے تھے۔ وہاں وہ اس وقت بھی ملازموں کا ہاتھ بٹا رہے ہونگے اور باراتیوں کے بچے ہوئے کھانے میں اپنے حصہ کی آس لگائے ادھر ادھر کے اوپری کام کرتے پھر رہے ہونگے ——

پیراں کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے ان تین دن میں کوئی کام اوپری دل سے نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کی طاقت سے زیادہ محنت کی تھی۔ لیکن کسی باراتی کا جھوٹا کھانا اٹھا کر وہ نہیں لایا تھا۔ فقیروں کے مقابلہ میں اپنی برتری کے اس احساس نے پیراں کی تھکی ہوئی ٹانگوں میں ایک بار پھر ایک نئی روح پھونک دی۔

تیلیوں کے محلہ میں بھی کوئی خاص چہل پہل نہیں تھی۔ جیلا تیلی کا بیل ہمیشہ کی طرح آنکھوں پر ایک سیاہ پٹی باندھے بڑی سی ایک لکڑی میں بندھا ہوا ایک مقررہ گھیرے میں چکر لگائے جارہا تھا پیراں نے اس کی طرف صرف ایک نظر ڈالی اور اپنا منہ جلدی سے دوسری طرف پھیر لیا۔

بیل کولہو میں جتا ہوا تھا۔ پیراں اب آرام کرنے جا رہا تھا۔ اس کے کام کا انعام بھی اسے مل چکا تھا۔ ہاں بس کوئی اس بوجھ کو اس کے گھر تک پہونچا دے۔

غفورا تیلی کے کتے نے زمین پر لیٹے لیٹے گردن اٹھا کر پیراں کی طرف دیکھا اور عادت کے مطابق ایک ہلکی سی غرغراہٹ اپنے حلق سے نکالی "اچھا تم ہو پیراں۔ تمہیں تو میں اچھی طرح جانتا ہوں"

کتے نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔ پیراں کی چال میں اب دوبارہ سستی پیدا ہو چلی تھی۔ تیلیوں کے جھونپڑوں سے آگے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ اس کے بعد رمضان لوہار کا مکان اور دکان اور پھر امیرا جولاہے کا جھونپڑا۔ اور پھر ایک بڑا سا میدان، پھر چھوٹی گڑھی کا احاطہ اور حویلی کی دیوار اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ پھر سات تیس چالیس گز کی خالی زمین چھوڑکر رہٹ کا کنواں ہے اور تمباکو کے دو کھیت ہیں اور کھیتوں کے فوراً بعد اس کی اپنی جھونپڑی۔ اس کا اپنا مکان۔ جہاں فقیرا کی ماں ہے اور فقیرا ہے، اور ٹوٹا ہوا ایک پلنگ ہے۔ اور ایک پھٹی ہوئی دری ہے۔ اور ایک پیوند لگا ہوا کمبل ہے، اور نیند ہے، اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنا گھر ہے۔

مگر اب اس کی ٹانگیں اتنی آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں کہ یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی کاٹنا اسے اپنی ہمت سے باہر معلوم دے رہا تھا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چل نہیں رہا ہے۔ چلنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ رمضان لوہار کا مکان امیرا جولاہے کا جھونپڑا۔ اور پھر بڑا میدان یہ سارے منظر اس کے جانے پہچانے منظر تھے۔ ان راستوں پر وہ آنکھیں بند کرکے بھی چل سکتا تھا۔ بس وہ آنکھیں بند کرکے ہی چل رہا تھا۔ یہ میدان ختم ہوگیا۔ یہ چھوٹی گڑھی کا احاطہ ہے، یہ چھوٹی حویلی کی دیوار ہے، یہ بیٹھک ہے۔ لے ۔ ۔ ۔ ۔

اسے محسوس ہوا جیسے سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہے۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

حیرت اور اشتیاق کی ایک لہر سی اس کے دماغ کی اندھیری کوٹھری سے اٹھی اور آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں پھنسے ہوئے نیند کے روڑ کو کاٹتی چلی گئی۔ داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے سر کی گٹھری کچھ اور زیادہ مضبوط پکڑ کر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اس نے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح رگڑا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا! اس کے دونوں کواڑوں کے درمیان کوئی ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔

دبے پاؤں قدم اٹھاتا ہوا وہ اپنے بوجھ سمیت چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازہ کے بالکل قریب پہونچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی تازہ دم ہوکر پلنگ سے اٹھا ہے۔ پہلا جیسا نشہ اور غنودگی اب اس کے آس پاس بھی کہیں باقی نہیں تھی۔ آہستہ سے دروازے کے قریب پہنچکر اس نے کواڑوں کے اندر کی طرف جھانکنے کی کوشش کی۔ اس کا دل کہے دے رہا تھا کہ یہ تجسس بیکار ہے۔ مکین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مکان کے اندر ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ بھی تو ایک انہونی بات تھی۔ پیراں بھاٹ نے اپنا منہ

دروازہ کی طرف بڑھایا۔

لیکن اس کے منہ سے پہلے اس کی سر کی گٹھری کواڑوں سے ٹکرائی۔ کواڑ کچھ اور زیادہ کھل گئے اور ایک ہلکی سی آواز بھی انھوں نے پیدا کی۔ آج سے ایک سال پہلے یہ کواڑ کھلتے وقت کوئی آواز نہیں نکالتے تھے۔ اب ایک سال بعد کھلے ہیں تو ان کی عادت بدل گئی ہے۔

پیراں بھاٹ اس وقت کوئی آواز پسند نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے وہ بے جان کواڑوں سے ہی کیوں نہ پیدا ہو رہی ہو۔ اور جب وہ پیدا ہو گئی تو جلدی سے اس نے اپنی گردن موڑی اور سیڑھیوں کی طرف گھوما۔ لیکن اس بار پھر وہ اپنے سر کی گٹھری کو بھول گیا تھا۔ گٹھری نے گھومتے گھومتے ایک کواڑ کو کچھ اور زیادہ کھول دیا اور دوسرے کو ساتھ لا کر ایک زوردار آواز کے ساتھ چوکھٹ پر دے پٹکا۔

"کون ہے" اندر سے کسی نے پوچھا۔

پیراں بھاٹ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ واقعی وہی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ لہجہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اب اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ باہر نکل آئیں گے۔ اور اگر اس نے جواب دیا تو اسے اندر بلا لیں گے اور جب وہ ان کے پاس اندر بیٹھا ہوا ان کی عجیب عجیب باتیں سن رہا ہوگا تو گاؤں کا کوئی نہ کوئی آدمی ادھر سے گزرے گا اور دیکھ لیگا کہ پیراں بھاٹ چھوٹی حویلی میں بیٹھا ہے اور بھاگا ہوا جائیگا ——— اور بھاگا ہوا جائیگا۔

"کون ہے" آواز اب مکان کے ایسے حصہ سے آئی جو بیٹھک کے زیادہ قریب تھا۔ یقیناً وہ باہر آ رہے تھے۔

"کوئی نہیں میاں۔ میں ہوں۔ پیراں بخش بھاٹ" اس نے جلدی سے کہا اور ایک چھلانگ لگا کر گٹھری سمیت چبوترے سے نیچے آ گیا۔

"اندر آ جاؤ . . . . . خدا بخش" اندر سے آواز آئی۔ وہ اسے پیراں بخش کی جگہ خدا بخش ہی کہتے تھے۔

"اندر آ جاؤ" ایک بار پھر انہوں نے کہا۔ ساتھ ہی ان کے جوتوں کی آواز اندر کے کسی کمرے سے بیٹھک کی طرف بڑھتے بڑھتے راستہ ہی میں خاموش ہو گئی۔ گویا وہ اب خود باہر نہیں آئیں گے۔

"ابھی آتا ہوں میاں" پیراں نے احاطہ کے دروازہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہ تھوڑا سا اناج گھر پہنچا دوں"

احاطہ سے باہر نکل کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ بڑی خیریت ہوگی کہ انھوں نے اسے اندر بلانے کے لئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ اگر بیٹھک سے باہر نکل آتے اور سامنے آ کر اسے آواز دیتے تو وہ ہرگز بھی انکار نہ کر پاتا۔ مگر اب دعا کرے کیا۔ اس غیر متوقع واقعے نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا چھوٹی حویلی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ادھر سے گزرنے والا ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے۔ اور پیراں کے دماغ کی تمام رگیں خشک ہو گئی ہیں۔ صرف تین دھڑی اناج اس کی گردن کے رگ پٹھوں کو لگاتار دے رہا ہے۔ حویلی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور وہ سامنے رہٹ کا کنواں دکھائی دے رہا ہے۔ تمباکو کے کھیتوں سے آگے اس کی اپنی جھونپڑی ہے۔ فقیرا کی ماں اناج کے دانے دانے پر جان دیتی ہے۔ حویلی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اپنے سر کا یہ بھاری بوجھ اٹھا کر زیادہ دور تک نہیں چل سکتا ——— دروازہ کھلا ہوا ہے اور ادھر سے گزرنے والا ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے۔

ایک بار پھر اس نے اپنے پیروں پر گھوم کر دروازہ کی طرف دیکھا پہلے اس میں صرف ایک جھری تھی۔ اب پیراں بھاٹ اپنی حماقت سے اس کا ایک کواڑ پورا پورا کا پورا کھول کر چلا آیا تھا۔ کاش وہ اسے کسی طرح بند کر آتا پھر اسے اطمینان رہتا کہ وہ اپنے سر کا بوجھ گھر تک پہونچانے کے بعد تک گاؤں کے دوسرے لوگوں نے اس اطلاع کو پوشیدہ رکھ سکتا ہے لیکن اب اگر وہ واپس گیا تو یقیناً وہ اسے دیکھ لینگے۔ کیا پتہ وہ اب بیٹھک میں ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گئے ہوں۔ عجیب آدمی ہیں۔ انہیں چاہئے تھا کہ دروازہ خوب اچھی طرح بند کر کے بیٹھتے۔ وہ خود ان کی جگہ ہوتا تو دروازہ کو ہمیشہ اندر سے مقفل رکھتا۔

"کہو پیراں ——— بڑے دن بعد گڑھی سے لوٹے ہو ——— کیا کیا مال ہیں گٹھری میں"

پیراں نے گھبرا کر دیکھا۔ رمضان کا لڑکا غنیا لوہار اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ بدمعاش ——— اب وہ حویلی کے چبوترے سے لگا لگا گزریگا۔ اور دروازہ کو کھلا ہوا دیکھ لیگا۔ اور فوراً بھاگا ہوا جائیگا ——— فوراً وہ بھاگا ہوا جائے گا پیراں نے سوچا۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ واقعی غنیا بدمعاش نے بیٹھک کا دروازہ

...لا ہوا دیکھ لیا ہے۔ اور چبوترے کے اوپر چڑھ گیا ہے ـــــ پیراں کے دیکھتے دیکھتے وہ اس دروازہ کے اندر غائب ہو گیا

اور پیراں کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہے۔ اور اوپر سورج کی پیلی دھوپ حویلی کی چھت کی طرف بھاگی جا رہی ہے اور وقت کے بازوؤں میں پر لگ گئے ہیں اور وہ اڑا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اور اب غنیا بھی چھوٹی حویلی سے اڑتا ہوا باہر نکلے گا۔ غنیا کے کاندھوں پر پر لگے ہوئے ہونگے۔ پیراں کے سر پر بھاری بوجھ لدا ہوا ہے۔ غنیا اڑ جائیگا۔ پیراں کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

اس نے اپنے سر کا بوجھ وہیں احاطہ کی باڑھ کے قریب پٹک دیا اور اپنے جسم کا سارا بچا کچھا خون اپنی ٹانگوں میں جمع کر کے بھاگا۔

حویلی کے سامنے کا بڑا میدان اس نے ایک ذرا سی دیر میں پار کر لیا۔ میرا جولاہے کا جھونپڑا، رمضان لوہار کا مکان، ہر چیز پیچھے کی طرف دوڑی گئی۔ اور پیراں بھاٹ آگے کی طرف بڑھتا گیا۔ تیلیوں کے جھونپڑوں سے گزرتے وقت اس کی رفتار کچھ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ جیالا تیلی کا بیل اسی طرح اپنے کھیرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ غفورا تیلی کا کتا اسی طرح گلی کے عین درمیان میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا لیکن اب کی بار اس نے صرف آنکھیں کھولنے اور گردن اٹھانے پر اکتفا نہیں کی۔ اپنے حلق کی پوری طاقت سے وہ نئی نئی آوازیں نکالتا ہوا کافی دور تک اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ ویسے اس کی چال میں لپک کر کاٹنے یا پکڑ لینے والا کوئی انداز موجود نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا پوچھتا ہوا معلوم دے رہا تھا "تم اپنے گاؤں کے پیراں بھاٹ ہو نا؟ تو تم کس چیز کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟"

وہ بھاگتا رہا۔ کتا پیچھے رہ گیا۔ فقیروں والی گلی اور جیونا چمار کی جھونپڑی بھی پیچھے رہ گئی۔ اور پیراں کو یاد آیا کہ اس کے تین دن کی لگاتار محنت اور دو راتوں کی نیند کا معاوضہ بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ فقیرا کی ماں، اپنی جھونپڑی، کمبل، نیند، تین دھڑی اناج، ہر چیز پیچھے رہ گئی ہے لیکن آگے شاہ جی ہیں۔ ایک ذرا سی اچھی خبر سن کر وہ اسے پچھ بیگھے کا ایک کھیت بغیر لگان کے جوتنے بونے کے لئے دے سکتے ہیں۔ پیچھے جھونپڑی ہے۔ پیراں بھاٹ ایک زیادہ اچھی جھونپڑی بنائیگا۔ تین دھڑی اناج ـــ پچھ بیگھے کے کھیت سے کئی من غلہ پیدا ہوتا ہے۔ بستر، نیند، ـــــ نئے لحاف میں کئی جاڑے آرام کے ساتھ گذارے جا سکتے ہیں۔ لیکن تین دھڑی کا اناج۔ تین دن سے اس نے کوئی مزدوری نہیں کی ہے۔ فقیرا کی ماں پتہ نہیں کیا کھا کر زندہ رہی ہوگی۔

اس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ غنیا لوہار سے پہلے چھوٹے شاہ جی کے پاس پہونچ جائیگا۔ لیکن غنیا چھوٹی حویلی سے باہر نکلے گا اور اس کی گٹھری کو زمین پر لاوارث پڑا دیکھ کر چپکے سے اٹھا کر اپنے گھر میں ڈال لیگا۔

ایک بار پھر اس نے بھاگنا شروع کیا۔ لیکن اب وہ پھر اپنے گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔

جیالا تیلی کے بیل کی آنکھوں پر سیاہ پٹی چڑھی ہوئی تھی اور وہ اسی طرح ایک مقررہ دائرہ میں چکر لگا رہا تھا۔ غفورا تیلی کا کتا ایک بار پھر بھونکتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن اب کی اس کی بھونک قہقہوں سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ چھوٹی حویلی کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ پیراں کی گٹھری اسی طرح احاطہ کی باڑھ کے پاس پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھا کر پھر اپنے سر پر رکھ لیا۔

اور عین اسی وقت حویلی کی بیٹھک سے غنیا مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی مسکراہٹ گویا اعلان کر رہی تھی کہ وہ پیراں کی قسمت پر مہر لگانے جا رہا ہے۔ پیراں نے تین دھڑی بیجھڑ سنبھال لی ہے۔ غنیا چھ بیگھے کا کھیت لینے جا رہا ہے۔

پیراں نے اپنی آنکھوں سے زمیندار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

اور ذرا پیراں کو خیال آیا کہ غنیا غلط راستہ پر جا رہا ہے۔ چھوٹے شاہ جی گڑھی میں موجود نہیں ہے۔ وہ قصبہ کے تحصیلدار کے ساتھ ہرن مارنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اور اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی کچھ دیر پہلے غلط راستے پر دوڑ رہا تھا۔ گڑھی کی طرف جانے کی بجائے اسے گنڈ والے باغ کی طرف جانا چاہئے تھا۔ غنیا پہلے گڑھی جائے گا پیراں چاہے تو اب بھی اس سے پہلے گنڈ والے باغ تک پہونچ سکتا ہے لیکن اس کے سر پر ایک بھاری بوجھ رکھا ہے۔

وہ سامنے ریت ہے۔ اور کھیت ہیں۔ اور اس کی جھونپڑی
(ہ)و۔ فقیرا کی ماں اناج کے دانے دانے پر جان دیتی ہے۔ وقت گذر(ت)ا
جا رہا ہے۔

وہ اپنے سر کے بوجھ سمیت بھاگا۔ کولہو کا بیل اپنے دائرہ
(م)یں چکر لگا رہا تھا۔ غفورا تیلی کے کتے نے پھر اپنی گردن اٹھا کر اسے دیکھا
(پی)راں کا سر پر گٹھری لادے ہوئے اس طرح بھاگنا شاید اسے اور بھی زیادہ ناگوار گزرا
(چ)نانچہ اس مرتبہ وہ زیادہ زور سے بھونکتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑا۔ وہ پوچھ رہا
(تھ)ا "پیراں ——— تم چور تو نہیں تھے ——— مگر یہ گٹھری کیا واقعی
تمہاری اپنی گٹھری ہے؟"

جیونا چمار کی جھونپڑی سے گڈھی اور گدڑ والے باغ کے راستے
علیحدہ ہو جاتے تھے۔ پیراں گدڑ والے باغ کے راستے پر گھوم گیا۔ تلسیا
ٹھٹھیک کے کھیت تک اس کی رفتار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن
بیریوں کے چھتے کے پاس پہنچ کر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے
(س)امنے دو طویل اور سیاہ راتیں کالے کووں کی طرح آ کر ہوا میں معلق ہو گئی
(ہ)یں اور پر پھڑ پھڑا رہی ہیں، اسکی کنپٹیوں پر کسی نے گرم گرم انگارے
(ر)کھ دیئے ہیں۔ اس کے جسم کے تمام رونگٹے لوہے کی گرم سلاخیں بن
گئے ہیں۔ لیکن اس کی جلد کے اندر برف سے ترشی ہوئی چیونٹیاں سی
رینگتی پھر رہی ہیں۔ اُس کے جسم کی کھال پر باہر باہر پسینہ بہہ رہا ہے
لیکن اندر ہی اندر اس کی شریانوں کا خون منجمد ہوتا چلا جا رہا ہے اسکی ٹانگیں
گھٹنوں تک شل ہو چکی ہیں۔ بس اب کچھ دیر بعد وہ برف کے ایک تودے
کی طرح یہیں کہیں گر پڑیگا۔

وہ کہیں گرا نہیں ——— پتہ نہیں کس طرح وہ اپنے جسم اور
سر کے بوجھ سمیت گدڑ والے باغ تک پہونچ گیا۔ وہاں چھوٹے شاہ جی
موجود تھے۔ بارات کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے گاؤں کے زمیندا(ر)
اور پاس والے قصبہ کے وار دمندی بھی موجود تھے۔ پیراں بھاٹ کو ایسا
محسوس ہوا کہ جیسے چھ بیگھے کھیت میں پیدا ہونے والے اناج کی ساری
طاقت اس کے حلق میں آ کر جمع ہو گئی ہے۔ اپنی آواز کے پورے زور
کے ساتھ وہ چلایا "شاہ جی . . . . چھوٹے شاہ جی"
وہاں کسی جامن کی بندوق سے دھواں اگلا۔ آم کی شاخ پر

بیٹھا ہوا کوئی پرندہ پتوں میں کھڑ بڑ کرتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ چھوٹے
شاہ جی ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف دوڑے۔ وہ اسے ہوا میں ہی پکڑ لینا
چاہتے تھے۔

"چھوٹے شاہ جی . . " پیراں بھاٹ اب ان کے بالکل نزدیک
پہونچ چکا تھا۔ چھوٹے شاہ جی کی توجہ صرف ایک سیکنڈ کے لئے اپنے
شکار کی طرف سے ہٹ گئی۔ شکار ان کے ہاتھ میں آنے کی بجائے
زمین پر گر پڑا اور لوٹنے لگا۔

"سور . . . . گدھا کہیں کا . . . . منحوس" اور پھر اس سے بھی
زیادہ غلیظ گالیوں کا ایک سیلاب سا چھوٹے شاہ جی کے منہ سے ابل
پڑا۔ ہریل کو مارنے کے بعد اگر اسے ہوا میں ہی نہ پکڑ لیا جائے تو زمین
پر گرتے ہی اُس کا وزن آدھا رہ جاتا ہے۔ پیراں نے ہریل کا وزن آدھا
کر دیا تھا۔ اور یہ ہریل چھوٹے شاہ جی کے سمدھی نے مارا تھا ———
چھوٹے شاہ جی اب اپنی لڑکی کی سسرال میں منہ دکھلانے کے قابل
نہیں رہے تھے۔ بڑی دیر تک ان کے منہ سے گالیوں کا سیلاب سا
ابلتا رہا۔ غصہ کے جھاگ اڑتے رہے۔ اور پھر انہوں نے شادی او(ر)
عظیما کو سر کا اشارہ کیا "کھال ادھیڑ دو ——— سور کے بچے کی . . . .؟
منحوس کہیں کا"

شادی اور عظیما شکار کے تھیلے اور کارتوسوں کی پیٹیاں سنبھالے
کھڑے تھے۔ ان چیزوں کو انہوں نے جلدی سے زمین پر رکھ دیا اور
پیراں پر اپنے بازوؤں اور لاتوں کا پورا زور آزمانے لگے۔ چھ بیگھے کھیت
کا اناج اب پیراں کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کوئی
آواز نہیں نکال سکا۔ وہ کراہ تک نہیں۔ وہیں زمین پر لیٹے لیٹے
اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ دیر تک اُس کے جسم پر گھونسے اور
لاتیں برستی رہیں۔ پھر شاید اسے غنودگی سی آ گئی۔

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ باغ میں اکیلا پڑا تھا۔ اُس کے
اناج کی گٹھری بھی اُس کے قریب موجود نہیں تھی۔ شادی اور عظیما نے اس اناج
کو آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہوگا۔ لیکن اس کی چادر۔ پتہ نہیں یہ چادر ان
دونوں میں سے کس کے حصّہ میں آئی ہوگی ———؟ پیراں بھاٹ اس
چادر کو اپنے کمبل کے ساتھ لگا کر رات کے وقت اوڑھا کرتا تھا۔ اب خالی

کمبل میں گزارہ کرنا مشکل ہو جائیگا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اُس کے ہاتھ پیر سردی سے منجمد نہیں تھے۔ منجمد ہونے کی بجائے اس کے سارے جسم سے گرم گرم لپٹیں نکل رہی تھیں۔ مشرق کی طرف دور املتاس کے ایک تنہا درخت کے اوپر رکھا ہوا بڑا سا سورج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ زیادہ دیر سے باہر نکلا ہوا نہیں ہے۔ لیکن رات گزشتہ شام جیسی ٹھنڈ اب وقت موجود نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ یقیناً اسے بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے ممکن ہے نمونیہ ہو گیا ہو۔ یا ممکن ہے سینہ کا یہ درد اور یہ حرارت صرف شاذی اور عظیما کی مار سے پیدا ہوئی ہو۔ وہ کھڑا ہو گیا اور گھسٹ گھسٹ کر گاؤں کی طرف چلنے لگا۔

زمین سے اٹھتے وقت ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ کی گھٹنے کی ہڈی اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ یہ ٹانگ چلنے میں اسے کافی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ اپنے جسم کا سارا بوجھ اس نے اپنی دوسری ٹانگ پر ڈال رکھا تھا اور اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا گاؤں کی طرف لیجا رہا تھا۔ پچھلے سال حمدانی میاں بھی اسی طرح لنگڑاتے ہوئے گاؤں سے اسٹیشن تک گئے تھے۔ شاذی اور عظیما نے ان کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دیا تھا یا ممکن ہے ان کے ٹانگ کی ہڈی غفور، شعبان، منگلو، امیرا یا کسی اور آدمی کے پیر کی ٹھوکر سے ٹوٹی ہو کیونکہ ان کے اوپر راتیں اور گھونسے برسانے میں تو پورا گاؤں شریک تھا۔ ——— خود پیراں بھاٹ نے بھی اپنے پھٹے ہوئے جوتے کی ایک ٹھوکر ان کے سینہ میں ماردی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے سینہ میں ایک ٹیس سی اٹھی ہو۔ اس کے کاندھے، پیٹھ اور رانوں میں جگہ جگہ سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ حمدانی میاں کا اتنی مار کھا کر اس دن کیا حال ہوا ہوگا۔ آج وہ پھر اسے اپنی حویلی میں بلاتے تھے۔ یقیناً وہ اسے پہلے کی طرح بڑے پیار بھرے لہجہ میں سمجھاتے۔ غفیا لوہار سے بھی وہ اتنی دیر تک اسی ملائم لہجہ میں بات چیت کرتے رہے ہوں گے۔ دوسرے کے ہاتھ سے پتھر کھا کر اسے پیار سے اپنے قریب بلانا ان کی عادت میں داخل ہے ——— اور تو اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے اپنی اتنی بڑی گڑھی چچا کے لئے خالی کر دی اور خود چچا کی چھوٹی سی حویلی میں چلے آئے۔ وہ چاہتے تو کیا اپنے چچا کی طرح بڑے بڑے افسروں سے میل ملاپ نہیں کر سکتے تھے لیکن اتنا کچھ پڑھ لکھ جانے کے بعد بھی اپنے گاؤں کے کسانوں ہی کی دوستی میں مزا آتا تھا۔

"کوئی آدمی بڑا بنے رہنا نہیں ہوتا خدا بخش" وہ اسے پیراں بخش یا پیراں بھاٹ کی بجائے خدا بخش ہی کہتے تھے "اللہ تعالےٰ کے نزدیک تو بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو اس کے بندوں میں بڑا بن کر نہ بیٹھتا ہو"

چھوٹے شاہ جی نے ان سے کہا کہ میرا خاندان بڑا ہے اور تم اس گڑھی میں اکیلے رہتے ہو تو انھوں نے فوراً اپنی گڑھی چھوٹے شاہ جی کے حوالہ کر دی۔ اور خود اپنا سامان لیکر چھوٹی حویلی میں چلے گئے۔ سارا گاؤں کہتا تھا کہ وہ پاگل ہیں۔ ساری حرکتیں وہ پاگلوں جیسی ہی کرتے تھے کسی کسان کو زمین دیدی تو اس سے لگان کا تقاضا ہی نہیں کرتے یا اٹھا دیا تو اس کی فصل کے پہل تک نہیں مانگتے۔ بعد میں چھوٹے شاہ جی وارد ہوئے جو ۔ کہ ذریعہ کسانوں کو ٹکٹکی پر نہ کسواتے تو اس زمانہ کا پیسہ آجتک وصول نہ ہو پاتا۔

بس ایک کام وہ برا کرتے تھے۔ اپنے دادا پردادا کے عرس کے خلاف انھیں کوئی بات نہیں کہنا چاہئے تھی۔ گاؤں کے سارے آدمی اور عرس کے موقع پر باہر سے آنے والے لوگ ان قبروں کو چومتے ہیں تو آخر یہ انہی کے باپ دادا کی قبریں ہیں۔ انہیں اس بات پر خوش ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ جب بھی کسی سے ملتے تھے اسے یہی سمجھاتے رہتے تھے کہ سجدہ صرف خدا کو کیا جاتا ہے۔ عجیب بات تھی۔ گویا پیغمبروں کی قبر کو پیار کرنا بھی نماز والا سجدہ کرنا ہوتا ہے۔ بس اس لئے تو چھوٹے شاہ جی کو ان کے خلاف سارے گاؤں کو ورغلانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حمدانی میاں شہر کے اسکول میں پڑھ کر کافر ہو چکے ہیں۔ اور بعد میں جب قصبہ کے بڑے مولوی صاحب نے بھی یہی فتویٰ دیدیا کہ وہ کافر ہیں اور بھولے بھالے مسلمانوں کا ایمان خراب کرتے ہیں تو چھوٹے شاہ جی نے خود سامنے کھڑے ہو کر انھیں ——— اپنے بھتیجے کو گاؤں کے تمام آدمیوں سے پٹوایا شاہ جی نے سارے مجمع کے سامنے اُن سے پوچھا کہ وہ اس فتوے کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے بھرے مجمع میں کہدیا کہ میں خدا اور رسول کو جانتا ہوں لیکن کسی مولوی کو نہیں جانتا میں مسلمان ہوں اور مجھے

فر کہنے کا حق کسی مولوی کو نہیں پہونچتا۔"

"بڑے مولوی صاحب کو بھی نہیں؟" شاہ جی نے کڑک کر پوچھا

"میں کسی بڑے اور چھوٹے مولوی کو نہیں جانتا۔"

بس۔ ایک آگ سی لگ گئی۔ بڑے شاہ جی بھپر پڑے۔ سارے مع کو سانپ سونگھ گیا

پیراں کے جسم کا رواں رواں درد کر رہا تھا لیکن اس کے دماغ شاید کوئی شدید ضرب نہیں پہونچی تھی۔ اس دن کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شاہ جی غصّہ میں آگ بھبوکا ہے گاؤں کے لوگوں کو چلا چلا کر سنا رہے ہیں۔ "سن لیا تم نے۔ یہ نص تمہیں اپنے پیروں کے مزاروں تک جانے سے منع کرتا ہے یہ نص تمہارے مولوی کو برا بھلا کہتا ہے۔ یہ انہیں جاہل سمجھتا ہے اس علاقہ کے سارے مسلمان بچوں کو انہوں نے ہی دین پڑھایا ہے۔ دور دور تک ن کا جیسا کوئی مولوی موجود نہیں ہے۔ یہ تمہارے پیروں کو برا کہتا ہے اور سن رہے ہو۔ یہ تمہارے مذہب کو گالیاں دیتا ہے اور تم سنتے ہو — سلمانو —"

اور اس نے دیکھا کہ مجمع اب بھی دم بخود کھڑا ہے۔ ان تمام لوگوں پر حمدانی میاں کے احسانات ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ وہ ہمیشہ ان کی بھلائی کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں مگر ان کے مذہب میں مداخلت کر رہے ہیں۔ وہ اپنی محبت کے شہد کے ساتھ انہیں بد دینی کا زہر پلا رہے ہیں۔

عظیما اور شادی آگے بڑھتے ہیں۔ حمدانی میاں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن عظیما ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے شادی انھیں دھکا دیکر نیچے گرا دیتا ہے۔ پھر ان کے جسم پر لاتوں اور گھونسوں کی ایک بارش سی شروع ہو جاتی ہے۔ چھوٹے شاہ جی ابھی تک چیخ رہے ہیں "ہاں ہاں مار دو۔ جان سے مار دو۔ جو تمہارے دین کو برا کہے اس کی زبان گدی سے کھینچ کر کھینچ لو" چھوٹے شاہ جی نعرے لگا رہے ہیں۔ حمدانی میاں سے ہٹ آہستہ آہستہ ہلتے ہیں عظیما چیخ چیخ کر مجمع کو بتاتا ہے کہ وہ پیروں کو گالیاں دے رہے ہیں۔ سارے مجمع پر ایک جوش سا طاری ہو جاتا ہے۔ سارا مجمع حمدانی میاں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن ان سب کے ہاتھ اور پیر پوری طاقت کے ساتھ نہیں چل رہے ہیں۔ حمدانی میاں کے احسانات اور ان کی محبت ایک دیوار بن کر درمیان میں کھڑی ہو گئی ہے۔ لوگ اس دیوار سے سر ٹکرا رہے ہیں۔ یہ دیوار نہ ہوتی تو حمدانی میاں اس دن زندہ نہ بچ سکتے تھے۔

پھر اس سے اگلے دن شام کی گاڑی سے حمدانی میاں شہر چلے جاتے ہیں۔ اسٹیشن تک جانے کے لئے انھیں گاؤں کا کوئی یکّہ نصیب نہیں ہوتا۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر لنگڑا لنگڑا کر چل رہے ہیں گاؤں کا کوئی آدمی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ چھوٹے شاہ جی نے اعلان کر دیا ہے کہ جو شخص ان سے بات کرتا دیکھا جائے گا اس کی بھی یہی حالت بنائی جائیگی۔ کافر سے کافر ہی مل سکتا ہے اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو دوسرے دن گاؤں میں ایک عام افواہ پھیل جاتی ہے کہ اگر وہ دوبارہ اپنے گاؤں میں واپس آ گئے تو دوبارہ ان کی یہی حالت بنانے والے کو چھوٹے شاہ جی چھ بیگھے کا ایک کھیت بغیر لگان کے مفت عطا کرینگے — لیکن گاؤں کے تمام لوگ جانتے ہیں کہ یہ انعام کسی کو نہیں ملیگا۔ حمدانی میاں اب کبھی اس گاؤں میں آنے کی ہمّت نہیں کریں گے۔

مگر اب وہ پھر آ گئے ہیں۔ انھیں نہیں آنا چاہئے تھا۔ غالباً انہے اب تک کبھی کی یہ اطلاع چھوٹے شاہ جی تک پہونچا دی ہوگی۔ اب تک وہ گاؤں والوں کے ہاتھ سے ملنے بھی جا چکے ہونگے۔ اگر وہ مر گئے تو شاہ جی کا کچھ نہیں بگڑیگا۔ داروغہ جی کے سامنے ہی وہ ان کی لاش کو ٹھکانہ لگوا دیں گے۔ ممکن ہے وہ ان کے لئے پیروں کی درگاہ میں ایک اچھا سا مزار بھی بنوا دیں۔

پیراں کھاٹ کا دماغ تبھائیں تبھائیں کرنے لگا۔ بیریوں کے جھنڈ کے قریب ہوا بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تیز آندھیوں کے کئی جھونکے اُس کے کانوں کے اندر گھس گئے ہیں اور اس کے سر کی شریانوں میں شعلے سے لپک رہے ہیں۔ حمدانی میاں مارے نہیں گئے ہوں گے۔ وہ مر گئے تو گاؤں کی روح مر جائیگی۔ گاؤں مر جائیگا۔ لوگ انہیں مار کر ان کی قبر پر چادریں چڑھائیں گے۔ ان کی قبر پر چراغاں کیا جائیگا لیکن وہ زندہ نہیں ہونگے۔ کوئی انسان زندہ نہیں ہوگا۔ انسان مر جائیں گے اور قبریں

باقی رہ جائیں گی۔

تیریں! پیراں کے دماغ میں لپکتے ہوئے شعلے چراغوں کی طرح جل اٹھے۔ جیروں کی قبر بھی قبر ہی ہوتی ہے، مٹی کا ڈھیر۔ اور حمدانی میاں پکے مسلمان آدمی ہیں۔ انہوں نے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی۔ کوئی روزہ قضا نہیں کیا۔ قرآن شریف انھیں پورا حفظ ہے۔ وہ اس کی آیتوں کا مطلب بھی لوگوں کو اردو میں سمجھا دیتے ہیں۔ وہ کوئی بات کہتے ہونگے تو کتابوں میں پڑھ کر ہی کہتے ہونگے۔

اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے سر سے تین دھڑی کا بوجھ اب گرا ہے۔

ہاں وہ نہیں مر سکتے۔ گاؤں کا کوئی آدمی انہیں جان سے مارنے کی کوشش نہیں کریگا۔ وہ تین دن تک گاؤں کی دنیا سے باہر گڑھی کی چاردیواری میں بند رہا ہے۔ ان تین دن میں گاؤں کے اندر بڑے بڑے کام ہو سکتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ نیکی کا جواب نیکی اور پیار کا بدلہ پیار سے دینے کے عادی ہیں۔ چھوٹے شاہ جی کی جوشیلی تقریریں ان کی آنکھوں پر تھوڑے عرصے کے لئے پٹی باندھ سکتی ہیں۔ لیکن وہ اپنا برا بھلا اپنے دماغ سے بھی سوچ سکتے ہیں۔ کل جب وہ کلوا بنئے کی دکان سے گزرا تھا تو گاؤں کے کسی آدمی نے گدھی کی کوئی تازہ خبر معلوم کرنے کے لئے اسے آواز نہیں دی تھی۔ یقیناً ان کی عادتوں میں کوئی بڑا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ لیکن اگر یہ غلط ہے۔ اگر کسی نے حمدانی میاں کو مارنے کی کوشش کی تو؟

پیراں بھاٹ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ بھی اب چلنے میں اس کا کسی نہ کسی حد تک ساتھ دینے لگی ہے۔ کسی نے نہیں مارنے کی کوشش کی تو وہ ان سے پہلے اپنی جان دیدیگا۔ اسکی چال خود بخود تیز ہو گئی۔

جیونا چمار کی جھونپڑی سے کلوا بنئے کی دکان دکھائی دے سکتی تھی۔ وہ ابھی تک بند تھی۔ اس کے چبوترے پر دھوپ سینکنے کے لئے کوئی آدمی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ فقیروں کی گلی میں دو تین بچے کھیل رہے تھے لیکن کوئی بڑا آدمی یہاں بھی موجود نہیں تھا۔ تیلیوں کے جھونپڑوں میں بھی کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ جیالا تیلی کا بیل چرخ (؟) ناند کے قریب کھڑا ہوا جگالی کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی نہیں تھی۔ پیراں نے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بیل نے بھی گردن اٹھا کر پیراں کو دیکھا اور پیراں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ہلکا سا تبسم بیل کی آنکھوں میں بھی تیر رہا ہے۔

غفور تیلی کا کتا ایک انگڑائی لیتے لیتے رک گیا اور ایک ہلکی سی غرغراہٹ اس نے اپنے حلق سے نکالی۔ پیراں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

لیکن جلد ہی اس کے سینہ میں کبوتر سے پھڑ پھڑانے لگے۔ حمدانی میاں زندہ ہونگے۔؟ حمدانی میاں زندہ ہونگے؟ آف خدا۔

حویلی کی بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پیراں کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے دماغ کی آندھیاں اور طوفان، مگر گاؤں کی گلیوں میں چلنے لگیں اور اسے اپنے تیز جھونکوں کے ساتھ اٹھا کر حویلی کے اندر پھینک دیں۔ اس کی ٹانگوں میں اب بہت کم جان باقی رہ گئی تھی۔ بیٹھک کی سیڑھیوں پر چڑھتے وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے جسم کے علاوہ کوئی غیبی طاقت بھی اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ایک ایسی طاقت جو آج سے پہلے اس کے جسم میں کبھی بھی موجود نہیں تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پیراں کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ ایک بار، صرف ایک بار وہ اس دروازہ کے اندر داخل ہو جانا چاہتا تھا۔

اندر سے آدمیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پیراں ان تمام آوازوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے پہچان سکتا تھا رمضان لوہار، کلوا بنیا، غفور تیلی، جیالا تیلی، امیرا جولاہا، غلام بخش فقیر اور . . . . . . اور حمدانی میاں۔ حمدانی میاں دبی دبی ہنسی ہنس رہے ہیں۔ گاؤں کے تمام آدمی زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان قہقہوں میں غنیا کا قہقہہ بھی شامل ہے۔ غنیا لوہار نے ایک بار پھر پیراں بھاٹ کو شکست دیدی تھی۔ وہ اس سے پہلے حمدانی میاں کے پاس پہونچ گیا تھا۔ لیکن پیراں کو غنیا پر غصہ نہیں آیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بہرحال اب وہ بھی یہاں تک پہونچ

گیا ہے۔

لیکن اب اس کی ٹانگوں نے جواب دیدیا تھا۔ اُسے محسوس
ہو رہا تھا کہ بیریوں کے جھنڈ سے یہاں تک وہ کسی انجان قوت کے
سہارے چلا آیا ہو۔ لگے قہقہے تھے، مسکراہٹ تھی۔ پیراں کا جسم پیچھے
کہیں کھو گیا تھا۔ اب یہ صرف اُس کی روح تھی جو اس کے جسم کو کھینچتی
ہوئی یہاں تک لے آئی تھی۔ حویلی کے اندر سے ہنسنے بولنے کی آوازیں
باہر چلی آ رہی تھیں۔ پیراں کو دفعتاً کچھ ایسا محسوس ہوا گویا یہ آوازیں کہیں
دور سے بہت دور سے آ رہی ہیں۔ یہ آوازیں اُسے اپنی طرف کھینچ
رہی تھیں لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے جسم کی لاش کو گھسیٹ کر
ان قہقہوں اور مسکراہٹوں کی دنیا میں کبھی بھی نہیں پہونچ سکے گا۔ اس

مفلوج جسم کو گھسیٹ کر کسی نہ کسی طرح وہ چبوترے کی سیڑھیوں کے
اوپر چڑھ گیا اور کھلے ہوئے دروازہ میں جا گرا۔۔۔ دروازہ نے ایک
زوردار آواز پیدا کی: "تم آ گئے پیراں ۔۔۔ میں تو کل بھی کھلا ہوا تھا"

"کون ہے؟" اندر سے کسی نے پوچھا:

پیراں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے اب
کتنی ہزار راتوں کی نیند پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُس نے اپنا سر دروازہ کی
چوکھٹ سے ٹیک دیا۔ ۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے
جھونپڑے کی چارپائی پر جا گرا ہو اور فقیرا کی ماں نے ایک موٹا سا لحاف
اس کے اوپر ڈال دیا ہو۔ طمانیت کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر دوڑ گئی
اور ایک معصوم مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر جم گئی۔

اکرام اللہ سیوری

ایک معصوم یتیم

ہاتھ میں مٹی کا پیالہ زرد چہرہ سست چال
ایک بچہ پا برہنہ اور غبار آلودہ بال

اس جہاں میں کوئی اسکا پوچھنے والا نہ تھا
کیونکہ وہ تھا اک مہاجر خانداں کا نونہال

آنکھ میں آنسو رخِ غمگیں پہ قطرات عرق
شدتِ گرما سے پژمردہ شکستہ دل نڈھال

اہلِ دنیا میں نہ تھا کوئی شریکِ درد و غم
اہلِ دولت میں نہ تھا اسکا کوئی پرسانِ حال

ہاتھ پکڑے اپنے بچوں کا گزر جاتے تھے سب
اس سے لیکن کون کہتا آ ادھر اے خستہ حال!

مانگتا تھا ان سے پیسہ ڈانٹ دیتا تھا کوئی
اہلِ زر کی یہ رعونت یہ اکڑ، یہ بول چال

ہر طرح کی نعمتوں کو دیکھتا تھا یاس سے
اُف وہ فاقہ کش پریشاں مضطرب آشفتہ حال

★

بھوک میں مانگا جو پیسہ ایک خوش پوشاک سے
اللہ اللہ! ہوگیا منہ شدتِ غصہ سے لال

ہٹ گیا بچہ ڈر کر اس کی چشمِ غیظ سے
اتنی بھی ہمت نہ تھی کرتا وہ دوبارہ سوال

سب کی افلاس نے جب طاقت نہ رکھی
ایک جانب وہ سڑک کے پر رہا ہوکر نڈھال

دوسرے دن جب ہوا بازار میں میرا گذر
یہ سنا میں نے کہ اسکا ہوگیا ہے انتقال

ناگہاں کانوں میں آئی میرے آوازِ غیب
دیکھنا نازل نہ ہو دنیا پہ قہرِ ذوالجلال

اے امیرانِ وطن تم نے یہ سوچا ہے کبھی
کتنے بچے ملک میں یوں ہو رہے ہیں پائمال

کاش اے اکرام اہلِ زر کبھی یہ سوچتے
بعد مردن قبر میں جانا نہیں مال و منال

راز کاشمیری

○

میں کر نہ سکا بڑھ کے کبھی منتِ ساقی
میں رہ گیا کیوں تشنہ دہن یاد رہے گا

دو روز کے اس عیش و مسرت کے صلہ میں
یہ رنج و محن، چرخِ کہن یاد رہے گا

مغموم ہیں کلیاں تو ہر اک پھول پریشاں
اربابِ چمن! حالِ چمن یاد رہے گا

اک جرم ہے احساس زیاں کا بھی دلانا
یہ دور بھی اربابِ وطن یاد رہے گا

(آل پاکستان انٹر کالجیٹ مشاعرہ گوجرانوالہ در حلقۂ ادبِ اسلامی گوجرانوالہ میں سنائی گئی)

ائے۔ سلطان •

دن میں خواب

میں ایک غریب بیوہ کا لڑکا ہوں۔ میرا باپ مجھے اور میری دو بہنوں کو ماں کے کمزور سہارے پر چھوڑ اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ میری ماں بڑے لوگوں کا کھانا پکا کر اور چھوٹے لوگوں کے کپڑے سی کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ میں نے میٹرک تک تعلیم پائی ہے۔ اس سے زیادہ پڑھانے کے لئے میری ماں متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں نے مختلف دفاتر میں نوکری کے لئے درخواستیں دینا شروع کر دیں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں جوان ہو گیا ہوں اور میری دونوں بہنیں بھی جوان ہو چکی ہیں۔ میری ماں کو ان کی شادیوں کی بہت فکر ہے۔ بالآخر مجھے ایک دولتمند ٹھیکیدار نے رکشا چلانے پر نوکر رکھ لیا۔ زمانے کے ستائے ہوئے اور بھی کئی جوان اس کی رکشائیں چلاتے ہیں۔ ہمیں روزانہ مزدوری کا بیس۲ فیصدی کمیشن دیا جاتا ہے۔ میں صبح سے لیکر رات گئے تک رکشا چلایا کرتا ہوں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ میں کبھی دو۲ روپیہ لاکر اپنی دکھی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ یہ میری زیادہ سے زیادہ کمائی ہوتی ہے۔ رکشائیں ٹھیکیدار کی ہیں اس لئے وہ ہماری کمائی کا بڑا حصہ خود لے لیتا ہے۔ میری ماں اب بھی بڑے آدمیوں کا کھانا پکاتی ہے اور اس کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ بیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ دس پیسے ہمیشہ وہ سینے پرونے سے بھی پیدا کر لیتی ہے۔ بہرحال ہم ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں۔

(۲)

ایک فوجی افسر میری رکشا میں بیٹھا ہے۔ میں ڈیڑھ روپے کے عوض اس کو کینٹ (Cantt) تک پہنچانے جا رہا ہوں۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا ہے۔ فوجی افسر میٹھے سروں میں سیٹی بجاتے بجاتے یکایک رک کر مجھ سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس نے مجھ سے میرا نام اور پتہ پوچھا ہے۔ میں نے اس کو اپنی دکھ بھری داستان سنا دی ہے۔ فوجی افسر بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ بنگلے پر پہنچ کر اس نے مجھے پانچ روپے مزدوری دی ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں رکشا چلانا چھوڑ دوں اور اس کے دو چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دوں۔ وہ مجھے چالیس روپے ماہوار دیتا رہے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میں فوجی افسروں کی بھرتی کے امتحان کے لئے تیاری شروع کر دوں۔ اگر میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ مجھے فوج میں کمیشن دلا دیگا۔ میں افسر کی فراخدلی پر بہت حیران ہوں۔ تاہم میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔

(۳)

میں نے رکشا ڈرائیوری چھوڑ دی ہے۔ اب میں روزانہ پانچ میل دور فوجی افسر کے بچوں کو پڑھانے جاتا ہوں۔ میری ماں اب میرے پیشے سے مطمئن ہے۔ وہ ہر وقت میری کامیابی کے لئے دعائیں مانگا کرتی ہے۔ میں نے امتحان کے لئے پرانی کتابیں خرید لی ہیں۔ افسر نے مجھے سلیبس (Syllabus) اور پراسپکٹس (Prospectus) دلوا دیا ہے میں اس کا بہت مشکور ہوں۔ میں خوب محنت کر رہا ہوں۔ افسر کی مدد سے میں پہلے فوجی امتحانات کے پرچے بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب میں ان تمام پرچوں کو بخوبی حل کر سکتا ہوں۔ امتحان کے دن نزدیک آ رہے ہیں۔ میری بہنوں اور ماں کی دعاؤں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ امتحان ختم ہو گیا۔ میرے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہے اور میں بہت مسرور ہوں۔ اب میں جلد ہی فوجی افسر بن جاؤں گا۔ پھر سب دلدر دور ہو جائیں گے۔ امتحان کا نتیجہ نکل گیا ہے۔ میں اول آیا ہوں۔ فوجی افسر نے مجھے مبارکباد دی ہے۔ میں نے اس کے احسانات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے۔ میری ماں اور بہنیں بہت خوش ہیں۔ آج انہوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھا کھانا پکایا ہے کچھ خیرات بھی کی ہے۔ میری ماں بار بار میری بلائیں لیتی ہے۔ میری خوشی

کیا ٹھکانا۔

(۳)

فوجی افسر نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ڈاکٹری جانچ (Medical Test) میں اس نے مجھے کامیاب کرا دیا ہے۔ میں پری کیڈٹ (Pre-cadet) بھرتی ہو گیا ہوں۔ اب پانچ سال تک مجھے ٹریننگ Training لینی ہے۔ ایک سال میں فوجی کالج میں پڑھوں گا۔ پھر مجھے دور دراز کے ممالک میں بھیجا جائیگا اگر میں ٹریننگ سے کامیاب واپس آؤں تو حکومت مجھے سب لفٹیننٹ کا عہدہ دیگی۔

(۴)

میں خوب تندرست ہو گیا ہوں۔ میرا کسرتی بدن سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی میں خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنی ماں اور بہنوں کو بہت یاد کرتا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہیں۔ میری ماں بڑی بے چینی کیساتھ میرا انتظار کرتی ہوگی ٹریننگ جلد ختم ہو جائیگی تو ان کو اپنے پاس بلالوں پھر ہم سب بنگلے میں رہا کریں گے۔ میں فوجی افسر کے احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ اس نے بغیر کسی لالچ کے میری زندگی سنوار دی ہے میں نے اپنی محنت اور جانفشانی سے بہت اچھا ریکارڈ قائم کیا ہے اعلیٰ افسران مجھ سے بہت خوش ہیں۔ کتنے ہی تمغے میں نے اپنے کارناموں کے صلے میں حاصل کئے ہیں۔

(۵)

میری ٹریننگ کی مدت ختم ہو گئی۔ اب میں اپنے شہر واپس آگیا ہوں۔ اعلیٰ افسران کی سفارش سے مجھ کو براہِ راست لفٹیننٹ کا عہدہ ملا ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے محسن فوجی افسر سے ملاقات کرنے گیا ہوں۔ ان کو ایک درجہ اوپر ترقی مل گئی ہے۔ وہ میری کامیابی سے بہت مسرور ہیں۔ انھوں نے میری دعوت کی ہے۔ میں بھی کسی روز ان کو کھانے پر بلاؤں گا۔ اب میں اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ ایک بنگلے میں رہتا ہوں۔ میری ماں مجھے دیکھ کر مجھ سے چمٹ گئی تھیں اور مارے خوشی کے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ یہی حال میری بہنوں کا تھی ہوا میری ماں نے میری کامیابی کی خوشی میں بڑے جشن منائے ہیں۔ وہ تفکرات کے سبب سے بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ میری غیر موجودگی میں بہنیں سلائی کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ یہ لوگ اسی طرح بری بھلی زندگی بسر کرتے رہے ہیں شہر میں خاصہ تغیر آچکا ہے بہت سے پرانے چہرے نظر نہیں آتے۔ کچھ نئے چہروں کا اضافہ ہو گیا ہے میرا مالک ٹھیکیدار بھی اب یہاں نہیں ہے۔ اس کی شاندار کوٹھی میں چند کرایہ دار رہتے ہیں۔

میری ماں اب صاف کپڑے پہنتی ہے اور بہنیں عمدہ شلواریں اور غرارے پہنے سپاہیوں پر رعب گانٹھتی پھرتی ہیں۔ اب ان کی بہت سی سہیلیاں بھی بن گئی ہیں۔ ماں کو ان کی شادی کی بہت فکر ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ اب زیادہ ٹالنا مناسب نہیں۔ پہلے مجبوری تھی۔ اب اچھے اچھے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ میرے کئی ٹریننگ کے ساتھی میری طرح شریف نوجوان فوجی افسر ہیں۔ میرے ان سے گہرے تعلقات ہیں ان ہی میں سے انتخاب کرکے اپنی بہنوں کی شادی کی کوشش کروں گا۔

(۶)

میں اب بڑا آدمی ہو گیا ہوں۔ بڑے بڑے لوگ مجھ سے ملاقات کرنے کو آتے ہیں۔ میں ان کو صوفوں والے ڈرائنگ روم میں بٹھاتا ہوں۔ میری بہت عزت کی جاتی ہے جن لوگوں نے مجھے رکشا چلاتے دیکھا اب بہت حیران ہوتے ہیں اور میری کامیاب زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ جب میں باہر نکلتا ہوں تو فوج اور پولس کے سپاہی مجھے سیلوٹ کرتے ہیں۔

میں ....

"عزیزا و عزیز۔ اے تم چارپائی پر پڑے کیا سوچ رہے ہو۔ آٹھ بج رہے ہیں کیا آج کام پر نہیں جانا۔ اب تک کتنی مزدوری ہو جاتی"

"جاتا ہوں اماں۔ آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی"۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولئے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو!

محمد حمید اللہ صدیقی ●

ایک مذہب — دو لاشیں

پانی پہنچانے والا ٹرک ایک جھٹکے کے ساتھ سڑک سے گلی میں مڑا
جھکتے ہی بے دھیانی میں آتا ہوا نوجوان تھوڑی دیر تک خاک خون
لپ کر سرد ہو گیا اور پھر ایک گزرتی ہوئی کار اسے اٹھا کر ہسپتال لے گیا
اور مجمع دھیرے دھیرے چھٹ گیا۔

مر گیا بیچارہ۔ اکرام نے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ایک ٹھنڈا سانس
اور پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور چہرے پر ہلکی سی سیاہی
چھا گئی۔ شاید یہ خوش نصیب تھا۔ چلتے چلتے یکایک مر گیا اور اس طرح
ں سے مردوں میں داخل ہو گیا۔ زندہ جسم۔ مردہ لاش۔ یہ مردہ لاش
ان زندہ لاشوں سے تو بہتر تھی جو رات دن سڑکوں اور بازاروں میں
تی ہیں جن کی آنکھیں نہ معلوم کس خلاء میں گھورتی رہتی ہیں۔ جو سب
دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں دیکھتے۔ اکرام خیالات کی رو میں بہا جا رہا تھا۔ نہی
نقوش جو ہزار مٹانے کے باوجود اب تک نہ مٹ سکے تھے۔ جنھیں
نے کی کوشش کے باوجود وہ مٹانا نہ چاہتا تھا ایک ایک کر کے اس کے
میں ابھرنے لگے۔ یہ نقوش کتنے گہرے تھے جیسے پتھر کے نقوش۔ اجنتا
ماروں کے نقوش جو بے شمار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح
ے ہوئے ہیں۔

اور پھر اسے وہ شام یاد آئی جب پانچ بجے دفتر سے واپس آ کر اس نے
آٹھ فٹ لمبے اور چھ فٹ چوڑے کمرے کا دروازہ کھولا تھا یہ کمرہ اب اس
ب کچھ تھا۔ یہی اس کا پورا مکان تھا جہاں وہ چند ماہ قبل بھائی اور بھابی
ناراض ہو کر چلا آیا تھا۔ کمرہ کھولتے ہی اندر دن بھر کی گھٹی اور اُمسی ہوا
بھبکے نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس استقبال نے اس کی طبیعت
مکدر کر دی تھی کہ وہ کمرے میں جانے کے بجائے وہیں باہر مکان کے
نے پر بلا مقصد کھڑا ہوا دور بس اسٹینڈ پر آنے جانے والی بسوں کو
نے لگا تھا۔ اور پھر اسے نقوی صاحب کا خیال آ گیا تھا معلوم نہیں
ی آفس سے واپس آئے یا نہیں اور اس خیال کے آتے ہی اس کی نظر

بغل کے مکان کے دروازے پر پڑی ہوئی چق کی طرف اٹھ گئی تھی۔ گہرے
زرد رنگ کی چق شام کی ہلکی ہوا اور دھندلاتے اجالے میں آہستہ آہستہ
ہل رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چق کی اوٹ میں کوئی کھڑا
ہو۔ اور وہ زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔ نقوی صاحب کی ادا بھی بڑی دلچسپ
ہے اس نے سوچا تھا۔ یہ ان کی مستقل عادت تھی کہ وہ ہر کام بڑی آہستگی
اور شائستگی سے کیا کرتے تھے۔ وہ کمرے میں اس طرح دبے پاؤں چلے
آتے تھے کہ پتہ بھی نہ چلتا تھا اور ایک مرتبہ تو انھوں نے سچ مچ ڈرا دیا
اسے آئے ہوئے چند دن گزرے تھے۔ نقوی صاحب سے محض علیک
سلیک ہی ہوئی تھی اور جب وہ رات میں بیٹھا ہوا بڑے انہماک سے اپنے
تکیے کے لئے نیا غلاف کاڑھ رہا تھا اور وہ چپ چاپ آ کر کھڑے ہو گئے
تھے اور پھر جب یکایک اسے ان کی موجودگی کا احساس ہوا تھا تو مارے
گھبراہٹ کے اس نے سوئی انگلی میں چبھو لی تھی۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ
نقوی صاحب کا انداز اسے بڑا پیارا معلوم ہوتا تھا۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری
بہت سی چھوٹی چھوٹی اور پُر تکلف اور شائستہ باتوں ہی نے تو اسے ان
کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور پھر وہ مسکراتا ہوا چق کی جانب بڑھا تھا۔ اس کے
دل میں کوئی نئی شرارت کلبلا رہی تھی مگر دفعتاً چق کے ایک سرے کو پکڑے
ہوئے چند نرم و نازک حنائی انگلیاں اندر کی جانب کھسک گئی تھیں
اور پھر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں جم کر رہ گئے تھے
اور نومبر کی شام کی لطیف خنکی کے باوجود اس کے ماتھے پر نمی سی آ گئی
تھی اور وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا اور اسی
طرح کوٹ پتلون پہنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ کون ہو سکتا تھا۔ اور معاً اس
کا ذہن نسیمہ کی طرف گیا لیکن وہ وہاں کیوں کھڑی تھی۔ ایسا تو کبھی نہ
ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا تھا یہاں تک کہ نقوی صاحب کی
محبت بھری آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"آج کام بہت زیادہ کیا ہو گیا؟"

"نہیں۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔یونہی بس ذرا لیٹ گیا تھا" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا تھا اور پھر اس شام نہ جانے کیوں وہ نقوی صاحب سے آنکھیں ملاتے ہوئے جھینپ رہا تھا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں صاحبزادے کہ شادی کرلو" بس نقوی صاحب کی اسی ایک بات سے اسے بڑی بوریت ہوتی تھی۔ جب دیکھو شادی کرلو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

"ارے نقوی صاحب چھوڑیئے بھی۔ اور آخر کہاں شادی کروں" اس نے ذرا جھنجھلا کر کہا تھا آخری جملے پر تو اسے خود بھی ذرا حیرت ہوئی تھی اور معلوم نہیں نقوی صاحب اس کا کیا جواب دیتے وہ تو خیریت ہوگئی کہ ٹھیک اسی وقت سامنے کے مکان سے اس کے دوست اسلم نے آواز لگادی تھی۔۔۔ "کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں" اور پھر تھوڑی ہی دیر میں شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں قہقہوں کی گونج پھیلنے لگی تھی۔

اور پھر کئی دن کے بعد جمعہ کی اس صبح کو جبکہ وہ سائیکل نکال کر دفتر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یکایک نقوی صاحب کی چق کو حرکت ہوئی تھی اور نسیمہ نے بالکل خلاف معمول چق کا ایک کونا اٹھا کر باہر گلی میں کھیلتے ہوئے چھوٹے بھائی کو آواز دی تھی اور پھر جاتے جاتے ان کی نظریں مل گئی تھیں اور نسیمہ نے آنکھیں جھکالی تھیں اور اس کے مرمریں رخسار پر ایک ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی تھی۔ اس دن دفتر میں وہ کوئی کام نہ کرسکا اس نے لاکھ کوشش کی تھی کہ اُن دو بھوری بھوری بلی جیسی آنکھوں کو اپنے دل سے نوچ کر پھینک دے مگر وہ مستقل گھورتی رہی تھی۔

اور پھر نقوی صاحب کے بالکل پڑوس میں رہنے سے اور اسی طرح کے گزرے ہوئے متعدد واقعات اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس ذہنی کشمکش اور دماغی خلش کا احساس بھی تازہ ہو رہا تھا جس سے ایسے مواقع پر وہ دوچار ہوا کرتا تھا اور پھر ایک بار ایسے ہی کسی موقع پر جب اسلم نے اسے اور نسیمہ کو مسکراتے دیکھا کہا تھا کہ شریف آدمی دوستی کے پردے میں دھوکہ نہیں دیا کرتے تو اس کا سارا بدن کانپ گیا تھا۔ دھوکہ۔ یہ ایک لفظ نہ جانے کتنے دنوں تک اس کے دماغ میں گونجتا رہا تھا مگر آخر کار یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ دھوکہ تو کسی کو نہیں دے رہا ہے لیکن پھر بھی اب اسے نقوی صاحب کے پاس بیٹھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ دل ہی دل میں کچھ ندامت سی محسوس کیا کرتا تھا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہو۔ کبھی کبھی تو اس کا دل واقعی یہ چاہتا کہ وہ نقوی صاحب سے یہ سب کچھ کہہ دے اور رونے لگے یا پھر یہاں سے بھاگ جائے مگر ہمیشہ ایسے مواقع پر وہ بھوری بھوری آنکھیں اس کا دامن پکڑ لیتیں اور وہ وہیں کا وہیں رہ جاتا۔

اور پھر اسلم کی وہ بات کہ میاں لڑکی کوئی کھلونا نہیں ہوتی۔ پسند ہو تو شادی کرڈالو۔ شادی۔ اور پھر چار حرفوں کا یہ لفظ اس کے ذہن سے کبھی نہ نکل سکا تھا۔ بلکہ دن بدن یہ حروف ابھرتے رہے اور موٹے ہوتے رہے۔ شادی لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ نقوی صاحب اور اس میں کس قدر فرق ہے۔ مذہبی اختلاف۔ ایسا بھلا کہیں ہوتا ہے لیکن پھر اس نے سوچا تھا کہ یہ نقوی صاحب بار بار شادی کا ذکر ہی کیوں کرتے ہیں اور کسی کو اتنی فکر نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر یہ سب کیوں کیلئے اس نے سوچا تھا۔ کیا ہے۔ یہ صبح شام آفس جانے سے پہلے آنے کے بعد تم چق کی طرف کیوں دیکھتے ہو۔ کس کا انتظار رہتا ہے یہ تمام دن دل ہی دل میں کیا سوچتے رہتے ہو۔ اس کے دل کے کسی کونے سے کوئی بول اٹھا تھا۔ ہو نہ ہو کون سی برائی کر رہا ہے وہ۔

اور پھر اسے اتوار کی وہ دوپہر یاد آگئی جبکہ وہ اور اسلم نقوی صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ اور کھانے کے دوران میں نقوی صاحب کا محبوب موضوع چھڑ گیا تھا۔ اور پھر یکایک اسلم نے بلا کسی تمہید کے کس قدر بے باکی سے کہا تھا کہ نقوی صاحب کیا مذہبی اختلافات آپ کے خیال میں شادی بیاہ میں بھی بدراہ ہو سکتے ہیں۔ اسلم کے اس سوال پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ کھانا کھانے لگا تھا۔ جیسے اس نے اسلم کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اور پھر نقوی صاحب نے کس قدر اطمینان سے کہا تھا کہ اسلم صاحب اس معاملے میں ذرا آزاد خیال واقع ہوا ہوں اور اپنے بچوں کی خوشی پیش نظر رکھوں گا۔ وہ جوان ہو کر جہاں چاہیں گے کردوں گا بلکہ میں نے تو محبت کرکے شادی کی ہے اور ایسی شادی زیادہ پسند کرتا ہوں جس میں دو دل پہلے ہی سے مل چکے ہوں۔ اور اس پر اس نے محسوس کیا کہ جیسے چند لمحہ قبل جو بوجھ اس کی کمر توڑ ڈالے رہا تھا وہ اتر گیا ہو۔

اور پھر جنوری کی وہ رات جب وہ اپنے کمرے میں اسلم سے اپنے دوسرے دن ہندوستان جانے کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ کتنی مدت کے بعد وہ اپنے ماں باپ سے ملے گا اور اسلم اس سے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جانے سے قبل دل کی خواہش زبان پر لاکر دیکھ لو۔ ایسا نہ ہو بلاوجہ ماں باپ کی تمناؤں کا خون کرنا پڑے۔ مگر اس نے اسلم کی بات ٹال دی تھی اس لئے کہ اپنے اور نقوی صاحب کے تعلقات کی گہرائیوں کو وہ اسلم سے زیادہ جانتا تھا۔ اسے نقوی صاحب کی اس بات پر بڑا بھروسہ تھا کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہو مجھے بلا تکلف کہہ دیا کیجئے۔ اور پھر نقوی صاحب خود ہی اس کے کمرے میں آگئے تھے اور ایک ایک چیز کی صفائی اور ستھرا پن کا بڑا مزہ لے لیکر تعریفیں کرنے لگے تھے۔ اور پھر انھوں نے خود ہی مذاقاً کہا تھا

"اسلم صاحب۔ کیا خیال ہے آپ کا، یہ اپنے میکے سے واپس آجائیں تو میں انہیں اپنے گھر میں ڈال لوں۔"

اور اس نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ سے اسلم کو دیکھا تھا اور اسلم زیر لب مسکرا کر چپ رہ گیا تھا اور پھر بات بدل گئی تھی۔

اور پھر وہ دو ماہ کے لئے وطن چلا گیا تھا۔ اور وہاں اس نے ماں باپ کی منتوں اور سماجتوں کا خون کر دیا تھا اور چچی رشتے کی منسوب بہن کو ٹھکرا کر چلا آیا تھا۔ اور پھر واپسی پر نقوی صاحب نے کس طرح اس کا استقبال کیا تھا اور پھر دوسرے دن صبح جبکہ ہر طرف ابھی سناٹا تھا اور وہ باہر نکل کر ورزش کر رہا تھا اسے کاغذ کا ایک پرچہ چھت سے گرتا ہوا نظر آیا تھا۔ کاغذ کا وہ پرچہ جس میں حسین شکوے اور شکایات اور محبت کا پہلا واضح اعتراف تھا اس پرچے نے تو اس کے دل و دماغ میں آگ ہی لگا دی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بات بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ کسی کھڈ کے کنارے آپہنچا ہو مگر پھر یہی کھڈ کسی بہشت ارضی کا روپ دھار لیتی تھی۔ اور پھر بالآخر اس نے بھی لکھ کر دریافت کیا تھا کہ اس محبت کا مقصد کیا ہے اور جواب میں وہی چار لفظ آیا تھا جو ایک عرصے سے اس کے ذہن میں ابھر ابھر کر نمایاں ہو رہا تھا۔

اور پھر یکایک اسے معلوم ہوا تھا کہ نقوی صاحب کہیں اور جا رہے ہیں اس لئے کہ اس مکان میں ان کے ہم زلف آرہے ہیں اور پھر اس کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ وہ مکان ان کے ہم زلف ہی کا تھا جو اب مستقل رہائش کے لئے ڈھاکہ سے چل پڑے ہیں لیکن ساتھ ہی نقوی صاحب نے اسے یقین دلایا تھا کہ دوسرے مکان میں کافی گنجائش ہے اور اسے بھی وہیں چل کر رہنا ہوگا۔ اور اسے محسوس ہوا تھا کہ ذمہ داری کا بوجھ اور گراں ہو گیا اور پھر جوں جوں روانگی کے دن قریب آرہے تھے محبت کا التفات بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے دل و دماغ کا بوجھ بھی۔ کہیں یہ محل محض کاغذی نہ ہو۔ کہیں یہ ساری عمارت نہ گر جائے کہیں یہ سب کچھ محض سراب نہ ہو اور اس نے نسیمہ سے ملاقات کی فرمائش کی تھی تاکہ اس بات کو ہمیشہ کے لئے صاف کر لے۔

اور پھر اپریل کے مہینہ کی وہ رات جبکہ وہ نسیمہ سے ساتھ نقوی صاحب کے باہر کے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اور اس کا دل کس طرح لرز رہا تھا۔ دوسرے کمرے اور برآمدے سے آگے صحن میں سارا گھر سو رہا تھا۔ ہر لمحہ اسے یہ خیال ہوتا کہ اگر کوئی جاگ اٹھا تو کیا ہوگا۔ مانا کہ مقصد اور نیت دونوں پاک ہو لیکن۔ لیکن وقت اور حالات تو برے ہیں۔ اگر نقوی صاحب نے دیکھ لیا۔ کیا سوچیں گے، دنیا کیا کہے گی۔ وہ سر سے پیر تک پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ نقوی صاحب دور صحن میں سو رہے تھے نسیمہ سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور وقت گزر رہا تھا اور محبت کے حسین عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ جاں نثاری کے وعدے پختہ کئے جا رہے تھے اور رفتہ رفتہ وہ خوف و ہراس سے بالکل بے پرواہ ہو کر ماحول کی اس رنگینی میں کھو گیا تھا کہ یکایک سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی نسیمہ چونک اٹھی تھی۔ صحن میں کسی چارپائی سے چرچوں کی آواز آئی تھی۔ نسیمہ نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تھا اور آکر کہا تھا۔

"غضب ہو گیا۔ بابا جاگ گئے۔ آپ فوراً چلے جایئے۔" اور اس نے چاروں طرف چھائے ہوئے گھپ اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا تو سامنے صحن میں نقوی صاحب اپنے پلنگ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور ان کا رخ اسی طرف تھا۔ جیسے وہ اندھیرے میں سیاہ پردوں کو پھاڑ کر کمرے کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"چلے جایئے۔ خدا کے لئے چلے جایئے۔" نسیمہ کہہ رہی تھی "بابا کچھ سمجھ چکے ہیں۔ انھوں نے میرا خالی پلنگ دیکھ لیا ہے۔"

مگر وہ وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس نے نسیمہ کی درخواست مستر

دی تھی۔ !

"نہیں نسیمہ میں نہیں جاؤں گا۔ میری نیت پاک ہے مقصد
لے ہے۔ اگر میں بھاگ گیا تو نقوی صاحب نہ جانے کیا سمجھ لیں گے اور
کی نظر میں ہم دونوں ہمیشہ کے لئے گر جائیں گے۔ میں بیٹھ کر انکا انتظا
رونگا اور آج سب کچھ ان سے کہہ کر فیصلہ کر لوں گا۔"

اور اس بات پر نسیمہ چپ ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح بے جان کرسی
میں ہوئی تھی۔ وہ بھی بیٹھا تھا۔ اور سامنے صحن میں نقوی صاحب
ریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا اور
وہ مجبوراً یہ سوچ کر چلا آیا تھا کہ دوسرے دن بات کرے گا۔

اور دوسری صبح اسلم کی مسکراتی نظریں یہ بتا رہی تھیں کہ اسے
ب خبر ہے اور پھر نقوی صاحب بھی بالکل اسی طرح ملتے تھے جیسے
لے ملا کرتے تھے اور اسلم نے اس سے کہا تھا کہ اب مسکراہٹ سے دھو
کا نا۔ یہ محض وضعداری بتا رہے ہیں اس لئے کہ انھیں دو ایک دن
رہنا ہے اور وہ شاید یہ نہیں چاہتے کہ یکایک تعلقات ختم کر کے
ں کو چہ میگوئیوں کا موقع دیں۔

اور پھر اسے وہ رات یاد آئی کہ جبکہ وہ نقوی صاحب سے فیصلہ کن
لو کرنے کے لئے ان کے کمرے میں گیا تھا اور وہی نقوی صاحب جو
نہ شادی شادی کیا کرتے تھے اب اسکی بات بھی نہیں سمجھ رہے تھے
ں تک کہ اسے بالکل کھل کر اپنے کو نسیمہ کے لئے پیش کرنا پڑا۔ تھا۔ اور
ی صاحب نے صاف صاف جواب دیدیا تھا کہ انہیں اور اس میں
رق ہے۔ اس نے ان کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ انھیں دوستی
پردے میں دھوکہ دیا ہے۔ وہ نسیمہ کو کنواری بٹھا سکتے ہیں۔ زندہ دفن کر سکتے
گر اس سے اب بیاہ نہیں سکتے۔ نہ خود کبھی کوئی تعلق رکھ سکتے ہیں۔ اور
لے نقوی صاحب کو ان کی ایک ایک بات یاد دلائی تھی مگر انھوں
سب سنی ان سُنی کر دی تھی یہاں تک کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا
لم کو اسے گھسیٹ لانا پڑا تھا)۔ اور پھر دوسرے دن نقوی صاحب
گئے تھے۔

اور اسے وہ زمانہ یاد آیا جس میں وہ صبح شام روتا تھا۔ اور اسے ایسا
م ہوتا تھا جیسے اسکی زندگی میں ایک وسیع خلا پیدا ہو گیا ہو جو کبھی نہ
بھر سکے گا۔ اسکی آنکھوں میں صرف آنسو ہی رہ گئے ہیں جو کبھی نہ رک سکیں
گے اور وہ روتا رہا۔ رات کی تنہائیوں میں۔ دن کے اجالے میں وہ روتا رہا

اور پھر اسے نسیمہ کا آخری خط یاد آیا جو ایک دن یکایک اسے ڈاک
سے ملا تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ نسیمہ مدت ہوئی مر گئی اب اسکی نعش
کی شادی ہونے والی ہے اور اس کا جنازہ نکلنے والا ہے۔ اور پھر اس نے صبر
کی تلقین کی تھی۔ اور خط کو پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ دنیا میں اس طرح پھرنے
والے انسانوں میں درحقیقت نہ جانے کتنے زندہ ہیں اور کتنے مردہ اور ان
مردوں میں دو کا اور اضافہ ہو گیا۔ دو چلتی پھرتی ہنستی بولتی لاشوں کا جوڑا جو ا
کے وسیع صحرا میں اس طرح بھٹکتی رہیں گی۔ سسکتی رہیں گی اور پھر ایک دن
کسی میدان میں یا کسی درخت کے سائے میں تھک کر سو جائیں گی۔

اور اسکی آنکھوں سے آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے گر کر اسکے
سینے پر پھیل گئے اور دور کہیں مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز نے اسے چونکا دیا
کمرے کے باہر دن غروب ہو چکا تھا اور شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

ارشد کاظمی ●

تحریک

میرے باطل شکن عزم کے ساتھیو
زندگی کے سہاروں کو آواز دو

آج انساں اندھیرے میں بے حال ہے
طور کے جلوہ زاروں کو آواز دو

یہ مظالم یہ ذلّت یہ درد و الم
داستانِ ستم آسماں سے کہو

ناامیدی ہے رقصاں سرِ آرزو
چاند تاروں سے اور کہکشاں سے کہو

پھول ہیں دو محبت کی دلکش ادا
حسن آنسو تھا ڈھلکا نشاں ہوگیا

اشکِ غم کی تپش ہی تو اک کھیل تھا
کیسی ہی میں نہ جانے کہاں کھو گیا

تم ہو مومن مجاہد مرے ساتھیو
اٹھ کے دنیا کو راحت کا پیغام دو

ناتواں، بے کسوں کا سہارا بنو
تشنہ ہونٹوں کو پھر زیست کا جام دو

سچ ہے بجا، آج زنداں کا در ہے کھلا
اور جھنکار ہر سو ہے زنجیر کی

جرم ہے صاف گوئی مگر ساتھیو!
تا کجے زندگی دورِ بے پیر کی

بجلیوں کی طرح تلملاتے رہو
خرمنِ کفر و باطل جلاتے رہو

اہرمن پر یونہی مسکراتے رہو
ہر قدم اپنا آگے بڑھاتے رہو

عزیز حسین موج لکھنوی ●

○

یہ مانا گلستاں والے بہت ہشیار بیٹھے ہیں
مگر برق و شرر والے بھی کیا بیکار بیٹھے ہیں؟

سمجھتے ہو جنھیں ہمدرد ہیں غم خوار بیٹھے ہیں
نہ بگڑو تم تو کہہ دوں مطلبی سب یار بیٹھے ہیں

دماغ و دل یہاں آکر ہوئے مسحور کچھ ایسے
اٹھے ہر بار محفل سے تری، ہر بار بیٹھے ہیں

تقاضے ہیں بت و بتخانہ سے تجدیدِ الفت کے
مگر ہم توڑ کر اب رشتۂ زنّار بیٹھے ہیں

اب آخر اور بھی کیا چاہتا ہے اے غمِ دوراں!
متاعِ زیست کی بازی بھی اب تو ہار بیٹھے ہیں

ہماری ہمّت و غیرت کو یارب کیا ہوا آخر؟
گھر اپنا لُٹ رہا ہے اور ہم لاچار بیٹھے ہیں

نظامِ بزمِ عالم موج کچھ ایسا ہوا برہم
اٹھا ہے چین دنیا سے سبھی بیزار بیٹھے ہیں

(بیسویں صدی کراچی)

اے۔ جے۔ کرانن
ترجمہ: نعیم بی۔ اے

میں خدا پر ایمان کیوں رکھتا ہوں؟

سائنس کے طلبا عام طور پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک ان کا مذہب کے نئے احتیاد تعلیم کا تعلق ہے۔ چنداں قابل ذکر نہیں ہوتے۔ میں بھی بحیثیت سائنس اسٹوڈنٹ کے گلاسکو یونیورسٹی میں اس طبقہ کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہ تھا۔ تو تامی۔ دم۔ دیکھو جہاں سائنس کے طلبا انسانی جسم اور اس کے اعضا کی قطع و برید اور ناٹ تراش کرتے ہیں۔ میں انسانی جسم کی قطع و برید کرتے وقت انسان کا جسم سوائے اس کے کہ یہ ایک لاتعداد کل پرزوں کی ایک الجھی ہوئی مشین ہے، میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ کے دوران جتنے بھی پوسٹ مارٹم تجربے کے لئے کئے گئے۔ ان میں سے ایک تجربہ بھی تو ایسا نہ تھا۔ جس کو میں ایک غیر فانی ۔ ۔ ۔ نازول روح کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتا۔ جب کبھی میں نے خدا کے متعلق سوچا ایک حقارت آمیز مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل جاتی کہ "یہ کیا پرانا خیالی واہمہ ہے؟" ۔ ۔ ۔ لیکن پھر ــــــــــــــ

ایک وقت آیا جب مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ساؤتھ ویلز ([illegible]) کو جانا پڑا۔ جہاں مجھے کان کنوں میں کام کرنا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے زندگی کو قریب سے بالواسطہ سمجھنے کا موقع ملا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کہ میری طرح کے دوسرے بنی نوع انسان ــ ــ زندگی کی بڑی بڑی مصائب و آلام میں کس قدر حوصلہ اور ہمت اور خوش مزاجی کا ثبوت دیتے ہیں۔ پہلی دفعہ میں نے "روح کی دنیا" میں جھانکنا شروع کیا۔ ایک دفعہ ایک بچہ کی پیدائش جو ایک معجزہ سے کم نہیں ــــــــ کے موقع پر ــــ ایک طرف بچہ پیدا ہو رہا تھا اور دوسری طرف خوفناک اور تاریک موت کے پروں کی مسلسل پھڑپھڑاہٹ ــــ میرا نقطۂ نظر زیادہ سے زیادہ ناقابل اعتماد اور کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ اس کائنات میں موجود ہے اس کا بہت کم حصہ میرے احاطۂ مطالعہ میں آیا ہے۔ اور جو کتابیں میں نے پڑھی تھیں انھوں نے حقیقت کا کافی سے زیادہ حصہ میرے سامنے نہیں پیش کیا۔ مختصر یہ کہ اس واقعہ کے بعد میرا احساس برتری ختم ہو کر رہ گیا اور اگرچہ مجھے اس کا شعور نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ خدا کو پانے کی طرف میرا پہلا قدم تھا۔

مجھے وہ گھڑی ہرگز نہ بھولے گی۔ جب ایک کان میں بہت نیچے کا ایک دھماکا ہوا۔ اور چودہ کان کن اس کے نیچے دب کر رہ گئے۔ پورے پانچ دن تک یہ لوگ نیچے دفن رہے۔ سارا گاؤں دعائیں کر رہا تھا۔ پھر جب کسی طرح سے دبنے والوں نے زمین کے نیچے سے اپنے پیروں کی ٹھوکروں اور مسلسل جدوجہد سے کہیں راستہ بنا لیا تو گاؤں کے لوگوں نے آہستہ آہستہ، ہلکی ہلکی سی دعا کی آواز سنی۔ وہ دعا یہ تھی "اے خدا تو ماضی میں ہمارا سہارا رہا" اور اس طرح دبنے والوں نے اپنے حوصلے اور ہمت کو برقرار رکھنے ــــ کشمکش اور جدوجہد کو جاری و ساری رکھنے کے لئے یہ نغمہ انتخاب کیا۔ اور جب وہ باہر نکل آئے ــــــ اور جو کمزور اور تھک سے گئے تھے لیکن زخم کوئی بھی نہ آیا تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں اکٹھا ہو گیا۔ اسی نغمے کو شروع کر دیا۔ بیک وقت ہزاروں آوازیں تنگ وادی میں خوشی سے گونج اٹھیں جونہی میں رہا ہونے والوں کی معیت میں اس ہجوم کی طرف بڑھا، بے شمار آوازیں میرے کانوں سے اس طرح ٹکرائیں جیسے سمندر کی لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ ــــ یہ تھا انسان کے ایمان و یقین ــ ــ کا مظاہرہ ــــ عظیم الشان مظاہرہ جس کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔

بارہ ماہ کے بعد میں ایک دوسرے مقام، مان ماؤتھ شائر ـــــ پر چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹی اور پس ماندہ جگہ تھی۔ جس میں معقول طبی سہولتوں کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اور جہاں مجھے زیادہ تر اپنا کام ضلع کی ایک نرس کے ساتھ مل کر کرنا پڑتا تھا۔ نرس سادہ لیکن ایک جامع شخصیت تھی۔ اس کا چہرہ کتابی تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ کشش اور چمک تھی تقریباً بیس برس تک اس ضلع میں وہ تن تنہا کام کرتی رہی تھی۔

کا کام بہت مشکل اور تھکا دینے والا تھا۔ ہر روز دس میل کا راؤنڈ اسے لگانا پڑتا تھا۔ مجھے اس کے حوصلہ و ہمت۔ صبر و استقلال۔ اور ہر وقت خوش رہنے پر سخت حیرت و تعجب ہوا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی انتہائی خود فراموشی اور اخلاص اس کے کریکٹر کی سب سے زیادہ اہم خصوصیات تھیں۔ وہ کبھی بھی اس قدر مصروف کار نہ رہتی تھی۔ کہ دوسروں سے ہمدردی کے چند بول بھی نہ کہہ سکے۔ اور نہ کسی رات۔ اس نے اس قدر کبھی اتنی تھکاوٹ بھی محسوس نہ کی کہ وہ کسی بہت ضروری بلاوے (Calls) کے لئے تیار بیٹھ بھی نہ سکے۔ اس کی تنخواہ قطعی تھوڑی اور غیر معقول تھی۔ ایک رات گئے جبکہ ہم ایک سنگین کیس سے ابھی ابھی نپٹ کر آئے تھے اور اب ہم بیٹھے دونوں چائے پی رہے تھے۔ میں نے احتجاج کرنے کی آخر جرات کر ہی لی اور میں نے کہا "آپ محکمہ والوں سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ آپ کو زیادہ تنخواہ دیں، آپ کو کم ازکم ہر ہفتہ ایک پونڈ زائد ملنا چاہیئے۔ خدا جانتا ہے کہ یہ آپ کا جائز حق ہے۔۔۔۔ ایک وقفہ کے لئے وہاں خاموشی سی چھا گئی وہ مسکرائی، لیکن وہ اس شدت کے ساتھ مجھے گھورنے لگی کہ میں گھبرا اٹھا۔ "ڈاکٹر" وہ بولی "اگر خدا یہ جانتا ہے کہ یہ میرا جائز حق ہے تو ——— بس یہ میرے لئے کافی ہے"۔ مجھے اس وقت شدید احساس ہوا کہ اسکی تمام تر خدمت خلق، قربانیاں، خود فراموشی اور خلوص اور محبت کی بنیاد اور وجود اس کے خدا پر ایمان و یقین کا ایک غیر فانی ثبوت ہے اور ایک لمحہ کے ہی اندر اندر میری عقل پہ یہ بات بالکل واضح ہو گئی، کہ ایک طرف اس نرس کی زندگی کس عظمت اور شان کی حامل ہے، اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں میری زندگی میں کس قدر سطحیت اور کھوکھلا پن پایا جاتا ہے یہ ایک عجیب و غریب "حادثہ" تھا کہ جس میں ایک سادہ مختصر سے جملے نے مجھے فلسفیانہ شک و شبہ ——— ظن و گمان کی دنیا سے اٹھا کر ——— یقین و ایمان کی دنیا میں لا بسا دیا۔

میں یہاں خدا کی ہستی پر یقین و ایمان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اس کا مستحق ہے۔ کہ اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔ انسانی تاریخ کے کسی بھی دور میں اس موضوع پر جس قدر توجہ دی گئی ہے آج یہ اس سے بھی زیادہ توجہ کا مقتضی ہے آج دنیا کے نصف انسانوں نے جو الحاد اور دہریت کے بری طرح شکار ہیں مذہب اور خالق کائنات کے تصور کے خلاف جہاد کو اپنے اوپر فرض کر رکھا ہے۔ اور جبکہ ہم دوسرے بقیہ نصف ——— خدا کے بارے میں ہمارا رویہ اس قدر غیر جانبدارانہ اور اپنے مقصد وجود کے لئے اس قدر خطرناک ہے کہ ہماری غفلت اور لاپرواہی کی بناء پر زندگی کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو جو تباہیاں اور خطرے لاحق ہو گئے ہیں، وہ اس ہر دروازے پر کھڑے دستک دے رہے ہیں۔

خدا کے وجود کو حسابی مساوات Mathematical Equation سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ———

لیکن اگر ہم یہ کائنات جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، کہ اس کے اندر ایک نظم و ضبط، اس کی پیچیدگیاں اور پوشیدہ راز اور اس کا بے پناہ حسن اور سلیقہ جس کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں حیرت، خوف، انکسار اور اطاعت کے ملے جلے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اگر ان سب باتوں کو تسلیم کریں تو پھر ہمارے ذہنوں میں اس کے مبداء ... پہلے خالق کے تصور کا پیدا ہونا ناگزیر ہے، کس کی مجال ہے، جس کے دماغ پر عقیدہ و فلسفہ غلبہ پائے ہوئے ہے۔ کہ یہ کائنات۔ وسیع و عریض صرف ایک "اندھے حادثہ" (Blind Chance) کا نتیجہ؟ پھر رات کی پرسکون خاموشی میں آسمان پر پھیلے ہوئے ——— چمکتے ہوئے لاتعداد ستاروں پر غور بھی سکے ——— اور پھر ہماری اپنی دنیا جو اس فضا میں ایک مضبوط بندھے ضابطے کے تحت ——— ایک عجیب توازن کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے عمل اور ترقی کا اظہار باقاعدہ موسموں کو پیدا کر کے کرتی ہے۔ یہ ہماری اپنی زمین کیا واقعی یہ ایک لایعنی ——— بیکار، فضول گیند ہے، مادے کی بنی ہوئی جس کو سورج نے محض اتفاقاً نیچے پھینک دیا ہے۔

آپ کو پورا اختیار حاصل ہے۔ کہ خدا تعالے کے بارے میں بائبل کے اس نقطہ نظر کو رد کر دیں کہ اللہ تعالے نے خود اپنے ہاتھوں سے چھ دن میں اس کائنات کی تخلیق کی۔

آپ کو اس کی بھی آزادی ہے کہ اس کے مقابلہ میں "نظریہ ارتقاء" کو اس کی تمام تر تشریحات اور "قدرتی اسباب" (Natural Causes) کے متعلق اس کے نقطہ نظر کو قبول کر لیں لیکن پھر بھی آپ

وہی اہم بنیادی پیچیدگی (Mystery) کا سامنا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "جو کچھ بھی نہیں اس سے کچھ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟" (یعنی ہر چیز کا بہرحال کوئی سبب ناگزیر ہے)۔

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے لندن میں ایک ادارہ "ورکنگ بوائز کلب" (Working Boys' Club) قائم کیا تھا۔ ایک دفعہ ایک بہت بڑے مشہور دانشمند "ماہر حیوانات" (Zoologist) کو اپنے کلب کے ممبروں کے سامنے لیکچر دینے کے لئے بلایا۔ میری دلچسپی اور مزاج کے پیش نظر انہوں نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ یہ تھا۔

"ہماری اس دنیا کی ابتدا" ——— نہایت بے جھجک اس نے اطمینان و دیانت کے ساتھ بیان کیا کہ کس طرح ——— نامعلوم عرصہ پہلے ——— زمین کی سب سے پہلی ابتدائی سطح پر ——— ایک خاص رفتار سے مد و جزر سمندر کی لہروں نے ——— اثرات کے رد عمل کے ذریعہ ——— سلسلہ وار چپکنے والی خمیر پیدا کیا۔ اور پھر اس سے کس طرح ... یہ نہیں بتایا کہ کیسے؟ زندگی اور حرکت ——— سب سے پہلی اور ابتدائی شکل میں پیدا ہوئی۔ جب وہ اپنا لیکچر ختم کر چکا تو ماحول پر ایک عجیب دلکش خاموشی سی طاری ہو گئی ایک نوجوان کلرک کھڑا ہو کے بولا "معاف کیجئے گا صاحب" اس نے ذرا کانپتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا "آپ نے یہ تو بیان فرما دیا کہ کس طرح سمندر کی ...... بڑی بڑی لہریں ساحل سے ٹکرائیں ... لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس پہلی جگہ پر وہ تمام پانی کہاں سے آگیا ———؟" اور فضا ایک بار پھر عجیب و غریب سکوت کی نذر ہو گئی۔ لیکچرار صاحب لال سرخ ہو گئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتے۔ سارا کلب زوردار قہقہوں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے منطق اور فلسفہ کا جو عظیم الشان قصر تعمیر کیا تھا اُسے ایک سادہ ذہن کے اس چیلنج آمیز سوال نے دھڑام سے زمین پر گرا کر رکھ دیا۔

حقیقت، دراصل یہ ہے کہ آج تک کائنات اور قوانین فطرت کے متعلق جتنی بھی سائنسی تحقیقات و تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں کوئی معقول وجہ اور کوئی صحیح بنیاد ایسی فراہم نہیں کی جا سکی کہ جس کی وجہ سے خدا کے وجود کا انکار کیا جا سکے۔ بلکہ آدمی فطری طور پر مجبور ہے کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ کائنات اور اس کے اندر قوانین فطرت اور ان کا عمل ——— شروع شروع میں جب تخلیق کئے گئے تو ——— اس کے پیچھے ایک "اعلیٰ ترین عقل" ——— کام کر رہی تھی۔ کر رہی ہے ——— اور کرتی رہے گی۔

اکثر جذباتی قسم کے لوگوں کے لئے خدا پر ایمان و عقیدہ کے بارے میں جو چیز سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک ثابت ہوئی ہے وہ ——— آئے دن اُن کا مشکلات و مصائب میں گھرا رہنا ہے۔ یہ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ——— طوفانوں و طغیانیوں کی شکار دنیا ——— قحطوں و مہلک بیماریوں میں مبتلا دنیا ——— زلزلوں اور بجلی کی خوفناک گرجوں سے سہمی ہوئی دنیا ——— غمناک اور نہایت تکلیف دہ بیماریوں اور ظالم بے رحم موت کے ہاتھوں ستائی ہوئی دنیا ——— کے ہوتے ہوئے خدا پر ایمان کیونکر لایا جا سکتا ہے؟ اور خدا کہاں ہے؟ یہ لوگ چلا کر کہتے ہیں" بے شک تمہارا خدا بڑا ہی نامکمل اور غیر معقول خالق ہے جو ایسے تکلیف دہ نتائج و اسباب پیدا کرتا ہے"۔

لیکن اس مادیت کے دور میں جبکہ حصول راحت و خوشی ہمارا واحد نصب العین بن چکا ہے، افسوس ہے کہ ہم یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ محض عیش و آرام اور خوشی و مسرت کا حصول ہی ہمارا مقصد وجود نہیں۔ اگر ہم خدا کے وجود اور اپنی غیر فانیت کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگیاں خوشی کا جھونکا نہیں جو آیا اور آ کر بس چلا گیا۔
بلکہ یہ ایک تیاری کا وقت ہے جو بہت مختصر ہے ——— اور ایک لمحہ ہے جس میں ہمارا امتحان و آزمائش ہوتی ہے ——— اور اس کے نتائج اس وقت ہمارے سامنے آئیں گے جب ہم قیامت کے روز دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ مصائب و آلام میں مبتلا ہونا ہمارے لئے مقدر ہو چکا ہے جس قدر ہم اپنے آپ کو مشکلات سے بچانے کی کوششیں کریں گے اُسی قدر اور زیادہ مشکلات میں ہم پھنس جائیں گے۔ ایک بڑے صاحب بصیرت شخص نے ——— تھامس کیمپس جو کبھی اس دنیا میں تھا کتنا صحیح لکھا ہے "جب تک مشکلات سے تمہارا جی گھبراتا رہیگا ——— اور

تک تم ان سے بھاگنے کی سعی کرتے رہو گے۔ یہ مشکلات تم سے نہ ہوں گی۔ بلکہ جہاں کہیں تم جاؤ گے یہ تمہارا پیچھا ہی کریں گی۔"

دراصل مصائب و آلام، مایوسیاں و ناامیدیاں اور غم و رنج کا نا کرکے ہی ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ایک بنیاد مہیا کر سکتے۔ یہ جوب (ایوب) ہی تھا جس نے اپنے یقین و ایمان اور اطاعت انبرداری کا اظہار کرتے ہوئے علی الاعلان کہا! "جو مصیبت و آزمائش آتی ہے آنے دو۔ چاہے اللہ تعالیٰ مجھ کو قتل ہی کر دے۔ یہ گردن کے سامنے پھر بھی جھکی رہے گی اور میں اُس پر بھروسہ رکھوں گا!" رف یہی اندر کی روحانی روشنی ہی ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کو دکھا سکتی عقل تو اس قابل بھی نہیں کہ کائنات کے اس لامتناعی سلسلے میں ڈے سے ہی حصے کو کھرچ کر ہمارے سامنے ننگا کر دے۔ خدا کے وجود حساس صرف قلب و روح کی گہرائیوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں جب میں اٹلی گیا تو ایک سہانی دوپہر کو فانی سول کے ... کے قریب ایک پہاڑی پر ایک مشہور خانقاہ پر چلا گیا۔ میں نے رھویں صدی کے بنا ہوا خوبصورت چرچ دیکھا۔ اس زمانے کے مصنفین کے اپنے ہاتھوں سے سنہری رنگ میں لکھے ہوئے کتابچے بھی دیکھے بہت ہی عمدہ اور نفیس تھے۔ اور آرٹ و فن کے نادر نمونے دیکھے ۔۔۔ یہ سب کچھ خدا کی عظمت اور بزرگی کے حضور وقف تھا۔ لیکن ایک دن انقاہ کے باغ میں گھومتے ہوئے "مجھے خزانہ ہاتھ لگ گیا" جو ان تمام یزوں سے یقیناً بڑا تھا۔ باغ میں ایک ضعیف بزرگ آدمی سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس بزرگ کی کمر مسلسل محنت اور بدن کے جوڑوں میں خت درد اور تکلیف کی وجہ سے جھک سی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی نکھوں میں بے پناہ جوش اور چمک پائی جاتی تھی۔ مسلسل تیس برس تک بزرگ ہستی باغ کے اس چھوٹے سے حصے کو اپنی انتھک کوششوں سے بناتی اور سنوارتی آ رہی تھی۔ گویا "مسلسل کام کرنا" ہی اس کی عبادت تھی۔ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے پودوں اور پھل دار رختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھئے یہ میرے لگائے ہوئے ننھے ننھے پودے۔ ان میں معصوم پتیاں نکل آئی تھیں پھر ان سے پھول نکلیں گے اور ۔۔۔ پھر ان سے پھل ۔۔۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو پھر میں خدا پر ایمان لے آتا ہوں۔"

اگر ہم سینوں میں اس یقین و ایمان کا نشو و نما حصہ بھی پیدا کر لیں اور ہم اپنی "کاملیت" کے بیجا پندار کو جھٹک کر دور کرکے رکھ دیں۔ تو بھی ہم شاید کہ ۔۔۔ اللہ میاں کی طرف جانے والے راستے پر گامزن ہو سکتے۔ خدا کو پانے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی "عبدیت" و بندگی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے سامنے جھک جائے۔ اور اسکی اطاعت و فرمانبرداری کا اعلان کر دے۔ اس راستے پر ایک بار جب ہم چل پڑے پھر جوں جوں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں ہمارا اعتماد و بھروسہ اور علم بڑھتا چلا جائیگا۔ یہاں تک کہ ہم یقین و ایمان تک پہنچ جائیں گے اور جب کوئی "اس روشنی" کی سب سے پہلی کرن کو، چاہے وہ کمزور ہی ہو پا لیتا ہے تو پھر اس پر یہ خوفناک حقیقت واضح و ظاہر ہو کر رہتی ہے کہ "کس قدر بیکار اور فضول بھٹکی ہوئی اور بے مقصد تھی میری زندگی اس روشنی کے بغیر"؟

ایک دفعہ میں شمالی انگلینڈ کے ایک شہر میں ایک آدمی کے پاس گیا۔ اس شخص کو ساری عمر اس بات پر ناز رہا کہ وہ دہریہ اور ملحد ہے۔ اسی بنا پر اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو بھی "عاق" کر دیا اور اس سے تمام تعلقات منقطع کر لئے محض اس وجہ سے کہ اس کی لڑکی نے ایک ایسے سکول ماسٹر سے شادی کر لی تھی کہ جو کٹر مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب یہ شخص ایک لاعلاج مرض کا شکار ہو گیا تب بھی اس بوڑھے ملحد کے دل میں یہ خواہش و تمنا سخت شدت کے ساتھ مچلنے لگی کہ وہ کسی طرح اپنے داماد کے سامنے یہ ظاہر کر دے کہ وہ اب بھی راستے پر ہے۔ بار بار وہ اپنے نوجوان داماد کو بحث میں الجھائے رکھتا اور بحث کے خاتمے پر ہمیشہ یہ جملہ کہتا "آپ لوگ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں اب بھی خدا کو نہیں مانتا"! اس جملے پر آخر ایک دن اس کی لڑکی نے جواب دیا "لیکن ابا جان وہ بزرگ خدا اب بھی آپ پر بھروسہ رکھتا ہے"! اس مختصر سادہ سے جملے نے

ے کی تمام سابقہ ہٹ دھرمیوں اور ضد کو ختم کر کے رکھدیا۔ یہی وہ
ہے جو ہم سب کو بہلائے ہوئے ہے۔ ہم کچھ بھی سوچیں ۔ کچھ بھی
یں ۔ ہم پھر بھی خدا تعالیٰ کے محض بچے ہی ہیں۔ وہ ہمارا منتظر
لب ہم ۔ اسکی طرف جھکتے ہیں۔ وہ غفور الرحیم ہے۔ یقین و ایمان
ر وہی ایک جملہ خدا کی ہستی کو پانے کے لئے کافی ہے۔
صدیاں گزر گئیں۔ اس عرصے کے دوران ۔ لاتعداد انسانوں
نا اپنی زندگیوں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین اور سچائی پر
پروان چڑھایا۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے کمزوروں کو حوصلہ عطا فرمایا۔
تھکاوٹ سے چُور چُور ہو جانے والوں کو ولولہ اور طاقت بخشی اور مایوسوں
اور ناامیدوں کو امید کی شمع ہاتھ میں تھمادی۔ وہ ہم سب کے سینوں
میں رہتا ہے۔ ہم اس کو ہر وقت پاسکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں تلاش و جستجو کا
شوق بے پایاں ہو۔

(بشکریہ "قاصد")

مولانا امین اصلاحی
مرسلہ: ادارہ خواتین، لاہور

عورت ۔ معمارِ خانہ

یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ تمام نظام اجتماعی و سیاسی کے اندر اصلی مرکزی نقطہ خاندان ہے۔ پہلے خاندان وجود میں آتا ہے، پھر خاندان کے مجموعہ سے معاشرہ بنتا ہے اور پھر معاشرہ سے ریاست وجود میں آتی ہے اگر خاندان کا وجود نہ ہوگا تو ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر خاندان کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے اثر سے ریاست کے نظام میں خلل واقع ہو جائیگا۔ اور اگر خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پوری ریاست کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ خاندان کی اس اہمیت کی وجہ سے نظام اجتماعی و سیاسی کے اندر سب سے زیادہ فکر اس کے تحفظ کی کی جاتی ہے کیونکہ اس کی حیثیت جڑ کی ہے اور اسی کے تحفظ پر پورے نظام کے تحفظ کا انحصار ہے۔

خاندان کی اس اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آئیے دیکھئے کہ خاندان کی شیرازہ بندی میں اصلی اہمیت کس کو حاصل ہے مرد کو یا عورت کو؟ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندان کی تشکیل میں مرد اور عورت دونوں ہی حصہ لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کام میں جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سامانِ تعمیر کی فراہمی میں تو بیشک مرد کا حصہ نمایاں ہے لیکن گھر کی اصلی معمار عورت ہی بنتی ہے اس کی ذات کشش ہے جس کی شیرازہ بندی سے گھر، گھر کی شکل اختیار کرتا ہے وہ نہ ہو تو گھر کے ساتھ مرد کی وابستگی آدمی میں باقی نہ رہے۔ گھر والوں کو دو وقت روٹی بھی ملنی دشوار ہو جائے۔ بچے گلیوں اور سڑکوں میں مارے مارے پھرنے لگیں۔ اور دیکھتے دیکھتے نوکر اور نوکرانیاں گھر کو ٹھکانے لگا دیں۔ عورت موجود ہے تو سارا چمن آباد ہے۔ اور اگر وہ غائب ہو جائے یا ذرا سی غافل ہو جائے تو تھوڑی دیر بھی نہ گزرے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگے۔

گھر کی ظاہری صورت پذیری ہی عورت کی رہین احسان نہیں ہے بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گھر کی معنوی اور روحانی صورت گری میں بھی جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہیں ہے اس کے رحم کی طہارت سے خاندان میں نجابت و شرافت کا جوہر پیدا ہوتا ہے اس کی مامتا کا جمال گھر کو رحم و محبت کی نورانیت سے منور کرتا ہے۔ رفیقِ زندگی کی حیثیت سے اسی کی وفاداریاں اور جاں نثاریاں ہیں۔ جو خاندان میں وفاداریوں اور جاں نثاریوں کی روایات چھوڑتی ہیں۔ اس کے صبر و وفا سے بچے صبر و وفا کا سبق سیکھتے ہیں۔ اس کی قربانیوں سے اولاد کو ایثار کا درس ملتا ہے اس کی آنکھوں کی ایک گردش میں جو معانی مضمر ہوتے ہیں۔ وہ ہزارہا اوراق میں نہیں سما سکتے۔ اور وہ اپنی پُرمحبت جھڑکیوں سے جو کچھ سکھا دیتی ہے۔ ہزارہا لمحوں کی محنت سے بھی وہ چیز نہیں سکھائی جا سکتی۔

یہ ساری برکتیں خاندان کو صرف عورت کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ اگر عورت کو اس کی جگہ سے ہٹا کے کسی کارخانہ یا دفتر میں بھیج دیجئے تو خاندان کے اندر اس کے سبب سے جو جگہ خالی ہوئی اس کو آپ اور کسی طرح سے پر نہیں کر سکتے۔ دفتر اور کارخانوں کے لئے آپ کو ہر ساخت اور ہر قابلیت کے لاکھوں اور کروڑوں آدمی مل سکیں گے لیکن گھر کے اندر جو جگہ وہ خالی کریگی اس کو بھرنے کے لئے اس آسمان کے نیچے اس کے سوا خدا نے کسی اور کو پیدا ہی نہیں کیا ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ روٹی ہوٹلوں میں بھی کھائی جا سکتی ہے راتیں کلبوں اور سینما گھروں میں بھی گذاری جا سکتی ہیں۔ خبر گیری و تیمارداری ہسپتالوں اور نرسنگ ہوم میں مل جاتی ہے۔ علیٰ ہذالقیاس یہ بھی ممکن ہے کہ انعامات اور تمغوں کا لالچ دیکر جیسا کہ روس میں کیا جاتا ہے عورتوں سے بچے بھی جنوائے جایا کریں۔ اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ کی نرسوں اور اتاؤں کے ذریعہ سے ان بچوں کی پرورش بھی کرالی جایا کرے۔ لیکن ہم کو خوب یاد رکھئے کہ ہوٹل میں جینے اور ہسپتال میں مرنے کی یہ زندگی نہ

نہ تو خاندان کی زندگی کا بدل ہو سکتی ہے اور نہ تمغہ اور الاؤنس کی خاطر جنے ہوئے بچے اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ پر لگائی ہوئی اور پرورش پائی ہوئی نسلوں سے کوئی قوم بن سکتی ہے آدمی سازی اور جوتا سازی کے کام میں آسمان وزمین کا فرق ہے آپ جس طرح انعام اور اجرت کے بل پر کارخانوں میں جوتے تیار کر سکتے ہیں اگر وہی طریقہ آپ نے آدمی سازی کے لئے بھی اختیار کر لیا۔ تو آدمیوں کی شکل کی ایک مخلوق تو ضرور تیار ہو جائیگی لیکن وہ آدمیت کے تمام اوصاف سے یکسر خالی ہوگی۔ جو آدمی بالم کے جوتوں کے طرح تیار جائیں گے۔ وہ پاؤں میں پامال کئے جانے کے لئے۔ تو اچھے رہیں گے لیکن زمین کی خلافت میں ان کا کوئی حصہ ہو، یہ ناممکن ہے۔

جو بچے اس طرح دنیا میں آئیں گے کہ وہ اپنے باپ کو بھی متعین طور پر شناخت نہ کر سکیں وہ نجابت و شرافت کا جوہر کہاں سے لائیں گے جو ماں کی ممتا اور اس کی شفقت سے کبھی آشنا ہی نہ ہوئے ہوں ان کے اندر رحم و شفقت کے جذبات کس طرح نشوونما پائیں گے؟ جو حقیقی بھائیوں اور بہنوں کی طرح ایک ماں باپ کی آغوش میں پالے ہی نہ گئے ہوں وہ خونی اخوت و محبت کے راز سے کہاں سے آشنا ہونگے؟ جنہوں نے ایک خاندان کے اندر رہ کر ایک وفادار اور جانثار ماں اور وفادار اور شفیق باپ کی زندگی ہی نہ دیکھی ہو وہ وفاداری اور جاں نثاری کے مفہوم سے کس طرح واقف ہونگے؟ جنہوں نے ماں اور باپ کے ایثار کے مزے سر سے اٹھائے ہی نہ ہوں وہ دوسروں کے لئے کس طرح ایثار کر سکیں گے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خاندان کے نظام کو منتشر کر دینے کے بعد ان اوصاف کی پرورش کے لئے آپ کوئی اور طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یاد رکھئے کہ یہ محال ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان جذبات و موالفت کے بغیر بھی اس دنیا کا یہ کارخانہ چل سکتا ہے تو یہ محض تر ہے۔ آج دنیا میں جو خرابیاں پھوٹ پڑی ہیں اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انسان ان اوصاف سے خالی ہو رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ ان اوصاف سے بالکل ہی خالی ہو گیا تب تو اس دنیا کا ایک گھڑی بھی زندہ رہنا ناممکن ہو جائیگا۔ جو تباہی اس پر صبح کو آنے ہے وہ شام کو ہی آ جائے گی۔

(پاکستانی عورت دوراہے پر)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
ALWAYS DRINK
Asmar
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

Monthly "MUSHIR" Karachi.

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

قیمت :-
پاکستان
بھارت
دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

بلند معیاری

ں کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادویہ

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ

ٹیلی فون ــــــــــ ۷۹۲۳

جلد: ۶ ★ شمارہ: ۵

مئی ۱۹۵۵ء

★

مرتبہ: عبدالغفور بیگ

★

بدل اشتراک:- پاکستان: سالانہ: پانچ روپے ● فی پرچہ: آٹھ آنے
بھارت: سالانہ: چھ روپے ● فی پرچہ: دس آنے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ:
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور۔ یو پی۔ بھارت

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ۔ کراچی سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

سخنے چند

* صحیح راستہ
* افسوسناک رجحانات

صحیح راستہ

امیر جماعتِ اسلامی پاکستان مولانا امین احسن اصلاحی نے ملک کی موجودہ صورتِ حال کے متعلق ایک اخباری بیان میں پاکستان کے حکمرانوں کو مشورہ دیا ہے کہ ملک کو موجودہ دستوری اور سیاسی بحران سے نکالنے کے لئے جمہوریت کو جلد از جلد بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور دستور سازی کا کام کرنے کے لئے عوام کو براہ راست اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ مولانا اصلاحی نے کہا ہے کہ غیر یقینی کی موجودہ کیفیت کا زیادہ دیر تک جاری رہنا ملک کے لئے خوشگوار نتائج پیدا کرنے کا باعث نہیں ہوگا۔

ملکی حالات پر نظر رکھنے والا کوئی بھی دیانتدار شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلے چند ماہ کے واقعات کے نتیجہ میں پاکستان سے جمہوری حکومت کی تمام نشانیاں ایک ایک کرکے مٹتی جارہی ہیں اور آج جمہوری نقطۂ نگاہ سے ہم جس پست مقام پر کھڑے ہیں، اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ یہ انحطاط کا یہ عمل پچھلے سات سال سے مسلسل جاری ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد طلوع ہونے والی ہر صبح نے یکے بعد دیگرے ہمیں ان تمام چیزوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے جن سے کوئی متمدن قوم محبت کر سکتی ہے۔ لیکن سیاسی و آئینی پستی کا یہ عمل پچھلے چند ماہ میں بڑی تیزی کے ساتھ ہوا ہے۔ اور ہر اٹھنے والے قدم نے قصرِ جمہوریت کے کسی نہ کسی ستون کو گرایا ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ سیاسی انحطاط کی یہ المناک داستان کن کن مفادوں کی مرہونِ منت ہے، اور آج جو کیفیت ہم پر طاری ہے، اس میں کس کا کتنا حصہ ہے؛ لیکن اتنی بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ پاکستان کی حکومت پر شروع سے لے کر آج تک جو لوگ قابض رہے ہیں۔ اس ملک کے عوام کے نزدیک وہ سب کے سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان میں کچھ ردوبدل ہوا ہے تو اس کا باعث ان کے درمیان کسی نظری و فکری اختلاف کے رونما ہونے سے زیادہ ان کے مفادات اور اغراض کا تصادم تھا۔ اس لحاظ سے پاکستان کا ایک عام شہری موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری ان تمام لوگوں کے سر ڈالنے پر مجبور ہے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس ملک کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اور اس کے نزدیک تازہ ردوبدل نے حکومت کرنے والے ہاتھوں میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی، جس کی بنا پر ان لوگوں کو پچھلی کوتاہیوں سے بالکل بری الذمہ قرار دیا جاسکے۔

بہرحال نئی اور پرانی خرابیوں کی ذمہ داری جس پر بھی ہو، اس وقت جو سوال ہمارے سامنے حل طلب ہے، وہ یہ ہے کہ اب حالات کی اصلاح کیا شکل ہے، اور جو کچھ ہم کھو چکے ہیں۔ اس کو دوبارہ کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے مستقبل کا انحصار اب اس سوال کے تسلی بخش حل پر ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے تو پچھلی حماقتوں کی حقیقت محض ایسے گناہوں کی سی رہ جائے گی جن کی تلافی کرلی گئی ہو لیکن اگر اب بھی ہم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا اور حالات کو سدھارنے کی کوئی مخلصانہ کوشش نہ کی تو پھر ہمارے لئے کسی مہلک انجام سے دوچار ہونے سے محفوظ رہنا ممکن نہیں ہوگا۔

یہ ایک حوصلہ افزا بات ہے کہ اگرچہ آج ہم جمہوری طور طریقوں سے بہت دور جا چکے ہیں لیکن اس کے باوجود تمام حلقے اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے لئے صحیح راستہ جمہوریت ہی کا ہے اور خود حکومت کے سربراہ بار بار اعلان کرچکے ہیں کہ وہ جلد از جلد ملک میں جمہوریت کو بحال کرنے کا

رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ آج کل دنیا کا کوئی حکمران فرد یا گروہ یہ نہیں کہتا کہ وہ جمہوریت کا مخالف ہے اور ملکی معاملات کی انجام دہی میں عوام کے رائے کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اس اقرار کے باوجود ان میں سے بہت سوں کا طرزِ عمل ان کے دعوے کی تکذیب کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اصل چیز کسی حکومت کا عمل ہے نہ کہ قول، اور اگر کسی کے قول اور فعل میں تضاد ہو تو لامحالہ اس کے متعلق وہی رائے قائم کی جائے گی۔ جو اس کے فعل پر مبنی ہو۔ ہمارے حکمران اگرچہ یہ دعویٰ تو کر رہے ہیں کہ وہ جمہوریت کو بحال کرنے کا ہر وقت ارادہ رکھتے ہیں لیکن ان کا عمل ایک اس دعوے کا ساتھ نہیں دیتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کا ہر قدم ملک میں جمہوریت کی فوری بحالی کے امکانات کو ختم کرتا جا رہا ہے۔

اب ایک عام آدمی اگر بہت زیادہ حسنِ ظن سے بھی کام لے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ جمہوریت بحال تو کرنا چاہتے ہیں لیکن نادانستہ ایسے طریقے اختیار کر رہے ہیں جن کا انجام جمہوریت کی بحالی نہیں، بلکہ اس کی پامالی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ موجودہ حکمران سرے سے جمہوریت بحال کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ جن خطوط پر یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک واقعی ملک کے لئے یہی مفید ہوں گے، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ دنیا ایک طویل عرصے کے تجربے کے بعد بعض چیزوں کو غلط اور بعض کو درست قرار دے چکی ہے، اور آج اگر کوئی گروہ نیک نیتی سے بھی ایسے طریقے اختیار کرتا ہے، جو انجام کے لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہو چکے ہیں، تو اسے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اختیارات کا کم سے کم ہاتھوں میں مرکوز کر دینا، عوام کو ایک عرصے کے لئے معاملاتِ ملکی میں بولنے کے حق سے محروم کر دینا، حکومت کا احتساب کرنے والے اداروں کا معطل یا غائب ہو جانا ایسی علامات ہیں جن کے بعد طاقت کے غلط استعمال کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

کوئی گروہ خواہ کسی قدر مخلص اور نیک نیت ہو، اگر وہ غلط راستے اختیار کرے گا تو غلط انجام سے دوچار ہو کر رہے گا۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جو دنیا کی تاریخ کا ہر دور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ پاکستان کے حکمران اگر آج جمہوریت کے خواہشمند ہونے اور غیر جمہوری طریقوں کے نقصانات سے آگاہ ہونے کے باوجود عملاً ایسے طریقے اختیار کر رہے ہیں، جن سے جمہوریت کی نفی ہوتی ہے تو خواہ ان کی نیت کسی قدر نیک ہو، وہ ان نتائج سے نہیں بچ سکتے، جو ایسے طریقوں کو اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لئے سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس قسم کے خطرات میں ڈالے بغیر سیدھی طرح جمہوریت کی معروف شکلوں کو اختیار کیا جائے، براہ راست انتخابات سے ملک کے حکمرانوں کا انتخاب کیا جائے اور جو پارٹی اس انتخاب کے نتیجے میں اکثریت حاصل کرے، وہ حکومت کا کام سنبھالے اور اپنے تمام کاموں کے لئے اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہو۔

ہم امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تائید کرتے ہوئے اپنے حکمرانوں کو مشورہ دیں گے کہ اگر وہ ملک کو واقعی موجودہ بحران سے نکالنا چاہتے ہیں تو بلا تاخیر جمہوریت کی بحالی کے لئے اقدامات کریں اور دستور سازی کا حق عوام کو لوٹائیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے زبانی دعوؤں کے باوجود لوگ یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جمہوریت کی باتیں محض دکھاوے کے لئے کی جا رہی ہیں۔

افسوسناک رجحانات

قیامِ پاکستان کے وقت سے ملک کے نظامِ تعلیم کی اصلاح اور اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی اہمیت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ اور اس بات کو متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم جسے انگریز نے اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر مرتب کیا تھا، ایک آزاد اسلامی ملک کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس اعتراف کے باوجود نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لئے اب تک کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس متعدد واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاح کی بجائے صورتِ حال اور بگڑ رہی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک آزاد اسلامی ریاست کے نظامِ تعلیم کا اولین مقصد [illegible] فکر و نظر کے لحاظ سے مسلمان ہوں، اسلام کو شعوری طور پر ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے [illegible] اور دنیا کے [illegible] زندگی کے مقابلے میں اس کی برتری

ہائش ہوں۔ دوسری طرف وہ مختلف علوم وفنون اور فلسفہ و سائنس کا ایک مسلمان کی نظر سے مطالعہ کریں۔ اور ان سے وہ کام لے سکیں، جو انسان کے لئے مفید ہو اور اسلامی طرز کا نظامِ زندگی عملاً برپا کرنے میں مددگار ہو۔ ہمارے نظامِ تعلیم کا یہ وہ مقصد ہے جس کے مطابق اس کی ساری ترتیب و تدوین ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک ہمہ گیر اور بنیادی تبدیلی درکار ہے۔ یہ تبدیلی طریق تعلیم اور نصاب تعلیم سے لیکر کالجوں اور اسکولوں کے ماحول اور اساتذہ کی ونظر تک درکار ہے۔ اس کے بغیر حصول مقصد میں پوری کامیابی ممکن نہیں لیکن جب تک یہ تبدیلی نہ ہوسکے۔ اس وقت تک بھی جو اصلاحات کی جائیں وہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کی جانی چاہئیں۔ مگر ہمارے سامنے بعض ایسی چیزیں آرہی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اربابِ تعلیم اس مقصد سے یکسر غفلت برت رہے ہیں اور نظامِ تعلیم کو ایسے رخ پر لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں، جس پر چلنے کے بعد اصل مقصد کی طرف لوٹنے کے امکانات اور بھی کم ہوجاتے ہیں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے نام سے اسلامی معلومات بہم پہنچانے کا جو تھوڑا بہت انتظام تھا۔ اس کو بھی ختم کرنے کی کوشش جاری ہے اور اس سے بڑھکر پنجاب یونیورسٹی میں ایسے رجحانات زور پکڑ رہے ہیں کہ کسی طرح اسلامیات اور عربی زبان وغیرہ کی ترویج کو روکا جائے۔ اس طرح اسلام اور اسلامیات سے تھوڑا بہت شغف باقی رہنے کا جو انتظام موجود ہے، اس کو بھی ختم کر دیا جائے۔ یونیورسٹی کا شعبۂ عربی، شعبۂ اسلامیات اور علوم شرقیہ کی تعلیم کے دوسرے انتظامات کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ ان کی تعلیم کو بند کر دیا جائے۔ پھر یہ بات بھی پریس میں آچکی ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں دینیات کو لازمی تعلیم کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہم اس تعلیم کی افادیت سے آگاہ ہیں لیکن بہرحال اس کی سے بچوں کو کچھ نہ کچھ دینی معلومات حاصل ہوجاتی تھیں۔ ہمارے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ پنجاب کے متعدد اسکولوں میں سرکلر بھیجکر دریافت کیا گیا ہے کہ عربی اور فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد کیا ہے اور ان دونوں میں سے طلبا کس کو آسان سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر جواب یہ ملے کہ طلبا کے لئے عربی پڑھنا مشکل ثابت ہوتا ہے تو پھر اس کو ختم کرنے کی کوئی تدبیر سوچی جائے۔

ادھر کچھ روز قبل اورینٹل کالج کی سالانہ تقریب کے موقعہ پر کالج کے پرنسپل نے شکایت کی ہے کہ صوبائی اسمبلی نے پنجاب یونیورسٹی سے متعلق اپنے پچھلے اجلاس میں جو قانون منظور کیا ہے اور جسے پہلے آرڈیننس کی شکل میں نافذ کیا گیا تھا اس میں یونیورسٹی کمیشن کی سفارشات کو نظرانداز کرتے ہوئے السنۂ شرقیہ اور اورینٹل کالج کو ترقی دینے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد کالج کی بعض ایسی جماعتیں ختم کردی گئی ہیں جن کی کالج میں مستقل حیثیت تھی۔ اسی طرح خلیفہ شجاع الدین صاحب نے اس موقعہ پر اپنے خطبۂ صدارت میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں حالانکہ عربی، فارسی اور اردو کو پاکستان میں زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے تھی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے اور اورینٹل کالج کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ انھوں نے اسلامیات اور فلسفی کو ایک ہی فیکلٹی میں جمع کرنے کی تجویز کو بھی بجا طور پر مضحکہ خیز قرار دیا ہے۔

ہماری اطلاع کے مطابق اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے شعبہ کا حال بھی آجکل پتلا ہورہا ہے اور وہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ خطرہ ہے کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ مفید کام بھی بند نہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا حقائق سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیمی پالیسی کی تشکیل کرنے والوں کے ذہن کس رخ پر کام کر رہے ہیں اور وہ یہاں کس قسم کے رجحانات کو پرورش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان رجحانات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسی کوششوں کو سخت غیر مستحسن قرار دیتے ہیں۔ تقریروں اور بیانات میں ہر وقت اسلام کا نام لینا اور تعلیم کے میدان میں ایسے عناصر کو کھلی چھٹی دینا جو اسلامیات کے تمام اثرات کو ختم کرنا چاہتے ہیں، ایک عجیب و غریب تضاد ہے۔ یا تو آپ صاف کہیے کہ آپ قومی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں سے اسلام کو خارج کرنا چاہتے ہیں اور پھر کھل کر اس کے لئے کوشش کیجئے۔ ورنہ یہ دورخا پن کسی طرح بھی درست نہیں۔ بہتر ہوگا کہ ایسے رجحانات رکھنے والے لوگ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ اس ملک کے باشندے اسے ایک اسلامی ملک بنانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں اسلامیات کا صحیح یا غلط جو تھوڑا بہت اثر موجود ہے، اسے بھی ختم کر دیا جائے۔

(بشکریہ "تسنیم")

ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ کراچی ۱

مئی سنہ ۱۹۵۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مطمئن کر دینے والے دلائل
پاکیزہ معیار اور حسین و دلآویز کتابت و طباعت نے اسے ملک کے مشاہیر جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا ہے
یہ اب تک اپنا اچھا خاصا حلقہ بنا چکا ہے۔ اور تجارتی حلقوں میں پورے انہماک کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔
یہ آپ کی صنعت و حرفت اور شہرت کا ایک سریع الاثر ذریعہ بن سکتا ہے —

نرخنامۂ اشتہارات

نمایاں مقامات	اتفاقیہ	مشروط
سرورق آخری صفحہ	۱۲۵ روپے	۱۰۰ روپے
سرورق نمبر دو یا تین	۱۰۰ روپے	۸۰ روپے
عام مقامات		
سالم صفحہ	۶۰ روپے	۵۵ روپے
نصف صفحہ	۳۵ روپے	۳۰ روپے

منیجر شعبۂ اشتہارات ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

مولانا محمد صادق سیالکوٹی

کارزارِ بدر میں رسالتمآب کا خطاب

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال

کفارِ مکہ کے شتر کینہ کا طوفان، بغض اور عدوان کا سیلاب جب مدینہ منورہ کی طرف امڈ آیا تو خدا کے سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے تین سو تیرہ فلک بوس "پہاڑ" اس ریلے کے آگے کھڑے کر دیئے۔ انسانی سعی خواہ کتنی ہی آفاق گیر اور عالم بردوش ہو۔ اگر نصرتِ ایزدی، تائیدِ یزدانی اور عنایتِ خداوندی اس کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ اصلاً نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ لیلائے کامرانی محملِ جستجو کی طرف رخ نہیں کرتی۔ اور پھر نصب العین دھرارہ جاتا ہے۔ "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کا درسِ قرآنی تگ و دو کے میدان میں انسان کو دوڑنے کا حکم دیتا ہے اور "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ" کا ایقان مقصد وری کا پھل خدا کے ہاتھ میں دکھاتا ہے۔ کہ توکل کے آفتاب اپنی سعی کے نتیجے کا شکار ہو کر جادۂ توحید سے پھسل نہ جائیں۔ اسی نکتۂ توحید کو سمجھانے اور جزوِ ایمان بنانے کے لئے رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں لڑائی سے قبل ایک لافانی خطبہ دیا جو نہ صرف اہلِ بدر کی فتح و نصرت کا باعث ہوا بلکہ ہر زمانہ کے موحد مسلمانوں کو فوز و فلاح اور کامرانیوں کا راز بتا گیا۔ اور تا دورِ یرینِ فرزندانِ توحید کے لئے اس کی ہدایت کا آفتاب نیم روزی شان کے ساتھ ضیا بار رہے گا جس طرح بدر کی لڑائی کفر اور اسلام، حق اور باطل میں ایک فیصلہ کن جنگ تھی اور اسلام کے ایمان شہ پاروں کی بنیاد اور اصل و اساس تھی، اسی طرح حضور صلعم کا یہ خطبہ توحید کی روح، ایمان کی جان، اسلام کا اعلام اور ملتِ بیضا کے ربط و ضبط کی پاکیزہ تعلیم تھی میدانِ وغا میں صف بندی کے بعد پیغمبرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد یوں ارشاد فرمایا:-

اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَحُثُّکُمْ عَلٰی مَا اَحَثَّکُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَ اَنْهَاکُمْ عَمَّا نَهَاکُمُ اللّٰهُ عَنْهُ فَاِنَّهٗ جَلَّ وَعَلَا عَظِیْمٌ شَاْنُهٗ یَاْمُرُ الْحَقَّ وَیُحِبُّ الصِّدْقَ وَیُعْطِیْ عَلَی الْخَیْرِ اَهْلَهٗ اَهْلَ مَنَازِلِهِمْ عِنْدَهٗ بِهٖ یُذْکَرُوْنَ وَبِهٖ یَتَفَاضَلُوْنَ، وَاِنَّکُمْ قَدْ اَصْبَحْتُمْ بِمَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْحَقِّ لَا یَقْبَلُ فِیْهِ اللّٰهُ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا مَا ابْتُغِیَ بِهٖ وَجْهُهٗ وَاِنَّ الصَّبْرَ فِیْ مَوَاطِنِ الْبَاْسِ مِمَّا یُفَرِّجُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ بِهِ الْهَمَّ وَیُنَجِّیْ مِنَ الْغَمِّ وَتُدْرَکُ بِهِ النَّجَاةُ فِی الْاٰخِرَةِ فِیْکُمْ نَبِیُّ اللّٰهِ یُحَذِّرُکُمْ وَیَاْمُرُکُمْ فَاسْتَحْیُوا الْیَوْمَ اَنْ یَطَّلِعَ اللّٰهُ عَلٰی شَیْءٍ مِنْ اَمْرِکُمْ یَمْقُتُکُمْ عَلَیْهِ۔ فَاِنَّهٗ تَعَالٰی یَقُوْلُ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَکْبَرُ مِنْ مَقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ اُنْظُرُوا الَّذِیْ اَمَرَکُمْ بِهٖ مِنْ کِتَابِهٖ وَاَرَاکُمْ مِنْ اٰیَاتِهٖ وَاَعَزَّکُمْ بَعْدَ الذِّلَّةِ —— فَاسْتَمْسِکُوْا بِهٖ یَرْضَ رَبُّکُمْ عَنْکُمْ وَابْلُوْا رَبَّکُمْ فِیْ هٰذَا الْمَوَاطِنِ اَمْرًا تَسْتَوْجِبُوا الَّذِیْ وَعَدَکُمْ بِهٖ مِنْ رَحْمَتِهٖ وَمَغْفِرَتِهٖ —— فَاِنَّ وَعْدَهٗ حَقٌّ وَقَوْلَهٗ صِدْقٌ وَعِقَابَهٗ شَدِیْدٌ۔ وَاِنَّمَا اَنَا وَاَنْتُمْ بِاللّٰهِ الْحَیِّ الْقَیُّوْمِ اِلَیْهِ لَجَاْنَا وَبِهٖ اِعْتَصَمْنَا وَعَلَیْهِ تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلِلْمُسْلِمِیْنَ

(سیرۃ الحلبیۃ)

"صحابہؓ! میں تم کو اسی چیز کی طرف راغب کرتا ہوں جس کی طرف خدا تعالیٰ نے تمہیں رغبت دلائی ہے اور اسی طرح میں تمہیں ان ہی چیزوں سے روکتا ہوں، جن سے اللہ بزرگ و برتر نے باز رکھا۔ وہ بزرگیوں اور بلندیوں کا مالک بڑی شان والا

یہی باتوں کا ہی حکم کرتا ہے اور سچائی ہی اس کو پسند ہے نیکیاں
کرنے والوں کو اپنے پاس بڑے بڑے مرتبے، رتبے عطا فرماتا ہے۔ اسی کر
نیکیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے اور نیکی سے ہی بزرگیاں حاصل ہوتی ہیں۔
(سن لو) آج تم (میدانِ بدر میں) حق کی منزلوں میں سے ایک منزل
پر آ پہنچے ہو۔ یہاں تمہارا صرف وہی کام شرفِ قبول پائے گا، جو تم
محض اللہ کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لئے کروگے۔ تمہیں صرف اعلائے
کلمۃ اللہ کی نیت سے ہی تیغ زنی روا ہے۔ (خبردار تعریف و شہرت
اور مال و منال کی نیت سے اپنا عمل برباد نہ کر لینا) خوب یاد رہے
کہ (ہنگام وغا) اگر یاس و قنوط کے سیاہ بادل تمہیں ہر سمت سے آگھیریں
اور نجات و غلبہ کی کوئی صورت نظر نہ آئے، تو (سنو! سنو) پھر بھی
مایوس نہ ہونا مستقل مزاج ثابت قدم اور صبر و ثبات کے سراپے
بنے رہنا۔ اگر تم نے میری اس نصیحت پر عمل کیا، تو تمہارا ہم و غم اور
رنج و حزن دور ہو جائے گا۔ ناامیدی کی کالی گھٹائیں دیکھتے ہی دیکھتے
چھٹ جائیں گی اور ہر مشکل کی تاریکی آسانیوں کے اجالے میں گھل
جائے گی۔ اور خدا اس جہان کی بہتری کے علاوہ نجات آخرت بھی بخش
دے گا۔

(تعمیر اسلام کی بنیاد رکھنے والو! پیارے دوستو! ساتھیو!
یاد رکھو!) تم میں خدا کا رسولؐ موجود ہے جو تم کو (مناہی سے) روکتا
بھی ہے، (اللہ کا خوف دلا کر بدیوں سے) روکتا ہے اور ساتھ ہی نیکیوں
کا حکم بھی کرتا ہے۔ (خبردار) (کتاب و سنت کے خلاف) کوئی ایسا
قدم نہ اٹھا بیٹھنا جس سے خدا تعالیٰ تم پر ناراض ہو جائے۔ خدا نے خود
ہی فرمایا ہے کہ خدا کی ناراضی اور ناخوشی کا وبال بہت ہی سخت، کڑ
نہایت زبردست ہے، ایسا کہ اور کسی (مخلوق) کی خفگی اتنی باعثِ
اذیت نہیں ہو سکتی۔ (سنو سنو) خدا تعالیٰ کے احکام مدنظر رہیں
جو اس نے اپنی کتاب قرآن مجید میں نازل فرمائے ہیں، ان پر ٹھیک
ٹھیک چلنا ہوگا اور وہ تو اپنی (عظمت و جلال کی) نشانیاں بھی تمہیں
دکھا چکا ہے۔ ذلت کے بعد اس نے تمہیں عزت عطا کی ہے اب
تمہیں اس کے احکام (کی تابعداری) پر عزم بالجزم اور پورے صبر و قرار
کے ساتھ جم جانا چاہیئے جس قدر دین توحید پر مضبوطی سے قدم رکھوگے

اسی قدر اللہ بزرگ و برتر تم سے راضی اور خوش ہوگا۔ آج جہاد کے
موقع پر خدا تعالیٰ سے ایسی پرخلوص دعائیں مانگو (اور ایسے نیکی اور خیر محض
کے مجسمے بن جاؤ (شاہراہ توحید اور کتاب و سنت کے جادہ سے پاؤں
نہ ڈگمگائے) کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ (نصرت و اعزاز) تم سے پورا ہو،
خدا کی رحمت اور مغفرت تم کو آلے (یقین مانو) اللہ تعالیٰ کا وعدہ اٹل
ہے۔ اس کا کلام برحق ہے اور (نافرمانوں اور سرکشوں کے لئے) اس کے
عذاب بڑے مہیب خوفناک اور نہایت سخت ہیں (پھر سنو! اور
یاد رکھو) میں خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور تم سب اس
حی و قیوم خدائے لایزال کی مدد و معونت سے کامیاب اور آباد
ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم (فتح و نصرت، فرح و مسرت اور زندہ و آباد
رہنے کے لئے صرف) اسی کی طرف جھکتے ہیں، اسی ذات پاک سے
دلجمعی، مضبوطی ثابت قدمی اور استواری حاصل کرتے ہیں۔ اسی پر
بھروسہ تکیہ اور توکل کرتے ہیں کہ ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے
خدائے قدوس ہمیں اور تمام مسلمانوں کو بخش دے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ
عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ٥ (بشکریہ "اہل حدیث")

اچی

شبنم سبحانی

موجو!

نیل کی اے سبک گام موجو!
ہائے خاموش کیوں ہو ابھی تک!
لٹ رہی ہے متاعِ زمانہ
ہوش آیا نہ تم کو ابھی تک
آج پھر اہلِ حق کا سفینہ
نرغۂ موج و گرداب میں ہے
آج پھر کش مکش اہلِ فرعون
اور موسیٰ کے احباب میں ہے

غرق کر دو وہ زندان و دیوار
جن سے بدنام ہیں تیرے ساحل
ڈھا دو وہ سارے ایوانِ عالی
جو ہیں سازش گہہ اہلِ باطل
حق کی ہر شمع روشن بھی ظالم
چاہتے ہیں کہ جلنے نہ پائے
تیرہ و تار راتوں کا دشمن
مصر میں کوئی رہنے نہ پائے

آج نیلام پھر ہو رہے ہیں
کتنے یوسف تری وادیوں میں
خونِ "بنّا" سے پھر کتنے فاروق
ہاتھ، ہو کر نڈر، دھو رہے ہیں
بچھ گیا تختہ دار ہر سو
کھل گئے آہنی در قفس کے
اب تو خاموش بیٹھو نہ موجو!
ان کناروں سے نکلو مچل کے

سرنگوں ہو سکیں گے نہ شبنم!
وادیٔ نیل کے ماہ پارے
ان کی بنیاد سے لاکھ ٹکرائیں
ظلمتِ شب کے بے تیز دھارے
عشق کی آگ جو لگ چکی ہے
یہ بجھائیں گے، ہو گی وہ روشن
کر دیں پابندِ گفتار لیکن
کون دل پر لگائے گا قدغن

ابن فرید بی اے

بُت کا جانشین

یہ زمانہ بستی میں خوشیاں منانے کا تھا۔ ساری فصلیں تیار ہو کر کسانوں اور کسانوں کے کھتے ان کی محنت کی کمائی سے بھرتے جا رہے تھے، گھر گھر روشنیاں تھیں اور خوشیاں، ہر سمت قہقہے سنائی دے رہے تھے اور ہر لب انتہائی مسرت میں تھرتھرا رہا تھا، بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر طرح طرح کے کھیلوں میں مشغول تھے اب ان کے کندھے اناج کے بوجھوں سے فراغت پا کر ہلکے پھلکے لگنے لگے تھے اور اُن پر اپنے تہوار کے لباس کی منقش ریشمی پٹیاں لٹکائے اور خوشبو دار پھولوں کی ٹہنیاں سروں کے گرد لپیٹے وہ ہر طرف اچھلتے کودتے پھر رہے تھے۔ بستی کے بڑے لوگ شوخ رنگ کے لمبے لمبے نما کپڑوں میں ملبوس، جگہ جگہ کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے یا آنے والی خوشحالی کے اظہار کے طریقے طے کر رہے تھے۔

اس دن سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی تمام آبادی جاگ گئی۔ تمام گھروں سے مسرت آگیں شور بلند ہونے لگا۔ انسانی آوازوں کی ایک مدھم سی دل خوش کن بھنبھناہٹ چاروں طرف سنائی دینے لگی۔ کبھی کبھی چند ایک تیز آوازیں بھی فضا میں گونج اٹھتی تھیں جیسے نعرے لگ رہے ہوں۔ ہر چوراہے پر نفیریوں اور ڈھولوں کی آوازیں لوگوں کو مست کر رہی تھیں۔ عورتیں گھروں میں چھوٹے چھوٹے حلقے بناتے لوک گیتوں کی تانوں کو چاروں طرف بکھیر رہی تھیں اور بڑے ہیکل کا بڑا گھنٹہ اپنی مسلسل آواز سے آبادی کو اپنے تقدس اور اس دن کی اہمیت کا احساس دلا رہا تھا۔

پھر سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور بڑا کاہن بستی کے ریاضت گھر سے اپنی مسند پر سے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس کو سنبھالتا ہوا اٹھا۔ اور باہر آ کر منتظر مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے سر اور منہ کے تمام بال منڈے ہوئے تھے اور اپنے چہرہ کو اٹھائے، اب وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اپنی روحانی نگاہوں سے دور دستوں میں خداوند خدا کو دیکھ رہا ہو۔ وہ اپنے قدم آہستہ آہستہ اور بڑے ہی تقدس کے ساتھ اٹھا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلنے والی ہیکل کی رقاصاؤں کے شانوں پر تھے جن کے جسم نیم عریاں تھے اور جلوس میں چلنے والوں کے اندر ایک جذباتی ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھیں اور ہر بیباک نگاہوں کا جواب بے باکی سے دیتی تھیں۔ ہجوم کا مرکز توجہ بعض دفعہ وہی لگتی تھیں ان کے پیچھے عام کاہنوں کی ایک پوری ٹولی چل رہی تھی جن کے لبوں سے مناجاتوں کے بول بلند ہو رہے تھے اور وہ سر کو جھکائے ادب کیش بڑے کاہن کے پیچھے چل رہے تھے باہر شاہراہ تک امراء کے دو رویہ پرے کھڑے تھے، ان کے جواہرات اور ریشمی کپڑے روشنی میں جگمگا رہے تھے جن سے دور کھڑے ہوئے کسانوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں اور یہ رؤسا ہاتھ باندھے اور گردنوں کو انتہائی عبودیت کے انداز میں خم کئے کھڑے تھے۔

بڑا کاہن ان کے بیچ سے گزرتا ہوا شاہراہ تک آ گیا۔ اس کے پیچھے دوسرے کاہن اور پھر رؤسا۔ شاہراہ پر بڑے کاہن کے پہنچتے ہی خداوند خدا کے نام پر چاروں طرف نعرے لگنے لگے، اور شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ دونوں رقاصائیں بڑھ کر ہیکل کے اونٹ کے پاس جا کر رک گئیں اور بڑا کاہن ان کا سہارا لے کر محمل میں داخل ہو گیا فوراً ہی قرنوں کی آواز بلند ہوئی نقاروں پر مسلسل چوٹیں پڑنے لگیں اور پھر نفیریوں اور ارغنوں کی آوازوں میں اونٹ کھڑا ہو گیا۔ محمل کے حریری پردوں سے سورج کی ابتدائی کرنیں لپٹ کر مچلنے لگیں، اور طلائی و نقرئی نازک کھمبوں کی چمک میں اور اضافہ ہو گیا۔

مختلف باجوں کی چہکیاں رنگا رنگ کے راگ بکھیرتی ہوئی چل دیں۔ ان کے بعد محافظوں کا ایک دستہ اپنے تیزوں اور چمکتے ہوئے ہتھیاروں کو سورج کی شعاعوں میں بلند کئے سینے تانے قدموں کے ساتھ آیا۔ پھر عود و عنبر کی انگیٹھیاں سروں پر رکھے ہوئے لونڈیاں ان کے پیچھے رقاصاؤں کے دائرے میں کاہن کی سواری اور اس کے بعد مناجاتیں پڑھتے ہوئے کاہنوں کی ٹولیاں۔ پھر ان کے بعد رؤسا کی سواریاں اور آخر میں عورتیں، کم سن لڑکیاں اور لڑکے سروں پر اناج

سے بھری ہوئی تھیلوں کی خوب صورت ٹوکریاں رکھے، ایک لامتناہی قطار کی صورت میں چلے آ رہے تھے۔ شاہراہ کے دونوں طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے اور دو رویہ مکانوں کی چھتوں پر بھی بچوں اور عورتوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔

جلوس بڑی آہستہ خرامی سے گذرتا رہا۔ اور شاہراہ کے دونوں طرف مشتاق مجمع آگے کی طرف کھسک کر بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ سورج کی شعاؤں میں ہلکی ہلکی تمازت آنے لگی۔ اب جلوس ہیکل کے احاطے تک پہنچ گیا اور احاطے میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ ادھر ادھر پھیلنے لگا۔ جب بڑے کاہن کی سواری بھی وہاں پہنچی تو اس کی گھومتی ہوئی مغرور نظریں اچانک قطار سے علیحدہ کھڑے ہوئے ایک شخص کی نگاہوں سے ٹکرائیں جو بغیر کسی مرعوبیت کے اپنے لمبے عصا پر زور دیئے کھڑا اُسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ بڑے کاہن کے چہرے سے خوشی اور عزم ایک دم غائب ہوگیا اور خوف کی علامات کے ساتھ اس پر ہوائیاں چھُٹتی معلوم ہونے لگیں جیسے کوئی چور چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ "دراز قد اور اجنبی زیر لب بڑبڑایا۔ "گھبراؤ نہیں تیرا وقت ختم ہو رہا ہے۔ میں نے ہی تجھے یہاں تک پہنچایا تھا اور اب جان لے کہ میں ہی تیرے انجام تک بھی پہنچاؤں گا"۔

یہ تاثر اس قدر جلد اور آنِ واحد میں ہوا تھا کہ اُس اجنبی شخص کے آس پاس کھڑے ہوئے سب لوگ گھبرا گئے اور گردن موڑ موڑ کر اس شخص کو دیکھنے لگے جس سے نگاہیں ملتے ہی بڑے کاہن جیسے عظیم شخص کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک قد آور اور وجیہہ شخص ہے مگر اس کے کپڑے بوسیدہ ہیں اور سفر کی صعوبتوں کی علامات اس پر ثبت ہیں۔ وہ سر سے پر خمیدہ عصا کو تھامے اس طرح یوں تنکا کھڑا تھا جیسے چرواہا کھڑا اپنی بھیڑوں کی نگہبانی کر رہا ہو۔ جلوس اس دوران میں آگے ہی بڑھ رہا تھا۔ کاہن نے ایک لمحہ ہی اس کی طرف دیکھا پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پچھلے غرور کی علامات اگئیں جیسے وہ بھول گیا ہو کہ ابھی اس نے کس کو دیکھا تھا۔

ہیکل کے بلند دروازے کے سامنے سواری رک گئی۔ بڑے کاہن کے اترتے ہی دوبارہ قرنوں اور نقاروں کا شور بلند ہونے لگا اور نفیریوں، ڈھولوں اور ارغنوں پر ایک مقدس لے بجائی جانے لگی۔ پھر بستی کی کمسن لڑکیوں نے خداوند خدا کی تعریف میں ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ بڑا کاہن ہیکل کی رقاصاؤں کے جلو میں ہیکل کے دروازے کی طرف شانِ تقدس کے ساتھ بڑھا۔ اس کے پیچھے کاہنوں کی ٹولیاں اور ان کے پیچھے اناج سے بھری ٹوکریاں سروں پر رکھے عورتوں، کمسن لڑکیوں اور لڑکوں کی قطاریں بڑھنے لگیں۔

بلند و بالا سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بڑے کاہن کی نظریں ہیکل کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ کیونکہ جب وہ آخری سیڑھی طے کریگا تو دروازہ اندر سے کھول دیا جائے گا۔ پھر بڑا کاہن خداوند خدا کے اُس بت کے آگے سجدہ ریز ہوگا جس کی عبادت اس بستی میں اُسی نے آکر شروع کرائی تھی اس کے بعد تمام دوسرے کاہن بھی سجدہ کریں گے۔ پھر اناج کی ٹوکریاں خداوند خدا کے بت کے قدموں میں نذر کی جائیں گی۔ اس طرح خداوند خدا خوش ہو جائے گا اور سال بھر پوری بستی فراغت سے زندگی گزارے گی۔

جب بڑا کاہن آخری زینہ طے کر چکا تو مناجاتوں گیتوں اور ان کی لے میں بجنے والے سازوں کی آوازیں اور تیز ہوگئیں۔ اب ہیکل کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ بڑے کاہن کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ چند لمحے گزر گئے مگر دروازہ نہ کھلا۔ بڑا کاہن کچھ متحیر ہوا۔ اس نے گلا صاف کر کے چند ثانیے پھر انتظار کیا لیکن دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ بڑے کاہن نے اب خلافِ معمول بڑھ کر ہیکل کے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ مجمع میں بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ لیکن دروازہ اب بھی بند تھا۔ تب بڑے کاہن نے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔ چاروں طرف سرگوشی کی آوازیں اونچی ہوتی گئیں دروازہ اُسی طرح بند رہا۔ بڑے کاہن کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ اُس نے مڑ کر کاہنوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ بڑی بدشگونی ہے۔ دروازہ کھولنے کا جلد انتظام کرو"۔ کاہنوں نے بڑھ کر دروازے کو بہت جھنجھوڑا پیٹا کھٹکھٹایا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ عوام میں کھلبلی مچ گئی۔ چاروں طرف ایک ہراس اور خوف چھا گیا۔ اور چند منٹ پہلے کی مسرت نہ معلوم کس بھیانک خواب کی وادی میں گم ہوگئی۔

آخر کار ہیکل کا دروازہ توڑ دیا گیا۔ اور بڑا کاہن۔ دوسرے کاہن اور تمام امراء اور رؤسا سب بے اوسانی کی حالت میں بے ترتیبی سے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ہیکل کے صحن سے گذر کر معبد میں داخل ہوئے۔ چاندی کی عود عنبر کی انگیٹھیاں سرد پڑی تھیں۔ زیتون کے تیل کے طلائی چراغ اوندھے پڑے تھے خداوند خدا کے بُت کی ساری آرائشیں نچی ہوئی تھیں اور اُس کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور نائب کاہن جو آج کے دن دروازہ کھولتا تھا غائب تھا۔ تمام لوگوں کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ بڑا کاہن بیٹھا

تیناک آواز سے گرجا "غضب! اتنی بڑی توہین!" تمام لوگ مبہوت ہو گئے مجمع پر ہراس طاری ہو گیا۔ موت کی سی خاموشی چاروں طرف اس طرح چھا گئی جیسے کسی سماوی آفت کے آثار دیکھ کر لوگ مارے ڈر کے بت بن گئے ہوں۔

بڑے کاہن نے فرط اضطراب میں چاروں طرف ششدر کھڑی بھیڑ کی طرف منہ کر کے کہا: "تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے خداوند خدا کو بے عزت کیا گیا ہے اس کی اتنی بڑی توہین کی گئی ہے اس کو ہم سے ناراض کیا گیا ہے اس خداوند خدا کو جس نے ہم کو زندگی دی جو ہم کو زندہ رکھ رہا ہے جس نے ہم کو عیش و آرام کے یہ سارے سامان دے رکھے ہیں۔ جو ہم کو رزق دیتا ہے جس کی نذر کرنے کے لئے ہم اپنی فصلوں میں سے یہ ٹوکریاں بھر کر لاتے ہیں ———— تم دیکھ رہے ہو کہ اس خداوند خدا کو ہم سے ناراض کر دیا گیا ہے تاکہ وہ ہم پر اپنی آفتیں نازل کرے تاکہ وہ ہماری زمینوں کو بنجر کر دے اور اس طرح ہم سب بھوک اور قحط کی نذر ہو جائیں۔ یقین جانو۔ خداوند خدا ہم سے ناراض ہو گیا ہو تو پھر کبھی وہ بادل نہ ہوں گے جو بارش نہ لائے گا۔ اب دو زمینوں سے غلّہ نہ اُگنے دیگا۔ اب ہمارے کھیتوں میں کبھی شادابی نہ آئے گی۔ اے خداوند خدا ہم کو معاف کر دے"

ابھی کاہن کی بلند آہنگ آواز کی گونج معبد میں لرز ہی رہی تھی کہ ایک طرف سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ سب نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ ایک کاہن خوف سے زرد چہرہ اوپر اٹھائے ہاتھ سے کسی چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اُدھر مڑ گئیں معبد کے وسط میں بلند چھت ایک دائرہ کی صورت میں کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کے کنگورے پر نائب کاہن آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے دو سرا ونچا کئے کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مقدس ہستی کی بارگاہ میں کھڑا اس کی مناجات کر رہا ہے۔

"وہ رہا!" بڑا کاہن جوش سے چلایا "وہ رہا خداوند خدا کا باغی۔ ہم اسے اپنے اندر اب سانس بھی نہ لینے دیں گے۔ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔" اور پھر اس نے بپھر کر مجمع کی طرف دیکھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا تم اپنے خداوند خدا کے باغی سے انتقام نہ لو گے! ———— اس کی بوٹی بوٹی نوچ کر کتوں کو کھلا دو بزدلو! تمہارا خداوند خدا بے عزت ہو گیا اور تم کھڑے دیکھ رہے ہو!"

مجمع پر ہیجان اور غم و غصہ کی گھٹا چھا گئی۔ ہر چہرے پر ایک بہیمی کالونس چھا گئی۔ سارا مجمع چیختا اور انتقامی نعرے لگاتا بڑی محراب کے پاس کے زینے سے چھت کی طرف دوڑا۔ اور ذرا سی دیر میں بلند چھت کے کھلے دائرے میں سے ایک کنگورے کے پاس ایک بھیڑ دیوانہ وار نائب کاہن کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئی ان میں سے ایک نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر گھسیٹا اور وہ بھی گر کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ پھر چیلوں جیسی عجلت سے لوگ اسے کھینچتے اور مارتے ہوئے نیچے اترے۔ اتنی دیر میں باہر یہ خبر پہنچ جانے کے باعث ہیکل کے دروازے پر عوام کا مجمع ٹوٹ پڑا تھا اور باوجود کاہنوں کے روکنے کے ایک سیلاب اندر بہا چلا آ رہا تھا۔ اوپر سے آنے والی بھیڑ نے نائب کاہن کو گھسیٹتے ہوئے لا کر بڑے کاہن کے آگے دھکیل دیا۔ بڑے کاہن نے انتہائی اشتعال میں اس کی گردن کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا "بول۔ ظالم گستاخ۔ تو ہی ہے خداوند خدا کو بے عزت کرنے والا۔ اس کو ہم سے ناراض کرنے والا۔ تاکہ وہ ہمارے کھیتوں کو بنجر کر دے تاکہ بادلوں کے ذریعہ وہ اپنی بارش کی رحمت ہم تک نہ بھیجے۔ بول۔ تو ہی ہے وہ گستاخ؟"

اور چھوٹے کاہن نے انتہائی وقار کے ساتھ مجمع کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن بڑے کاہن کے آہنی چنگل میں پھنسی تھی۔ تکلیف کی وجہ سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "ہاں، میں ہوں تمہارے باطل خدا کو باطل کہنے والا جو نہ بارش روک سکتا ہے، نہ کھیتوں کو بنجر کر سکتا ہے اور نہ آبادیوں کو ویران کر سکتا ہے۔ وہ ذلت اور یہی ہے جس کو تم نے اپنی حرص و طمع کے پردوں میں، لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے جیسے۔۔۔۔۔"

ابھی وہ بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ بڑا کاہن غصہ سے بے تاب ہو گیا اور اسے ساکت مجمع کے آگے دھکیل دیا "لو۔ سنتے ہو بزدلو! یہ اب بھی خداوند خدا سے گستاخی کر رہا ہے اور تم اسے اب بھی زندہ چھوڑ رہے ہو" پورا مجمع یہ سنتے ہی مارے اشتعال اور غیظ کے اندھا ہو گیا کچھ لوگوں کی غضبناک ٹولی بھوکے کتوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور تھوڑی ہی دیر میں اس کاہن کی بوٹیاں بوٹیاں نوچ ڈالیں اور اس کی لاش کے ٹکڑوں کو شاہراہ پر پھینک دیا۔

جلوس کی تمام رونق ایک وحشت میں بدل چکی تھی۔ وہ شاہراہ جہاں چاروں طرف انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا مسرور سمندر نظر آ رہا تھا اب یکسا ایسے خالی دریا کی طرح نظر آنے لگی جس کے پانی کو زمین چشم زدن میں نگل گئی ہو۔ گھر جاتے ہوئے، سہمے ہوئے لوگوں کے اکا دکا سائے گلیوں اور محلوں کے گوشوں میں کبھی کبھی نظر آتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ چوراہے کے جس مقام پر نائب کاہن کی روندی ہوئی لاش کے ٹکڑے پڑے تھے۔ وہاں سے فوراً ہی

مجمع ایسا غائب ہوگیا تھا جیسے پتھر پھینکنے سے کائی پھٹ جاتی ہے ــــــ
سوائے ایک قدآور شخص کے جو ابتدا سے اب تک یوں ہی اپنے عصا کے سہارے
اس طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا جیسے چرواہا بھیڑوں کی نگہبانی کر رہا ہو۔ اس کے
لباس کی بوسیدگی اور تراش خراش کسی لمبے سفر اور ایک اجنبی دیس سے آنے کا
پتہ دے رہی تھی۔

اسی حالت میں جب دھوپ کی شدت اور تمازت سے ہر چیز گرم ہونے
لگی تو اس پتھر کی طرح کھڑی ہوئی مورت میں بھی جان آئی۔ عصا کو دوسرے
ہاتھ میں لیکر اُس نے کھڑے ہونے کا پہلو بدلا۔ اور بڑبڑایا "عجیب۔ بالکل عجیب
کسے خیال تھا کہ تو یوں ہماری چال کو کامیاب کر دے گا۔ مگر جیسا تو کرتا ہے، یہ
کامیابی بھی ہماری ناکامی کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اچھا خیر۔ دیکھیں تو کیا کرتا ہے اور
ہم تب تک کیا کر لیتے ہیں؟" اپنا عصا پھر پہلے ہاتھ میں لے کر وہ سیدھا ہوا
اور آہستہ آہستہ بستی کی چوپال کی جانب چلدیا۔

شام ہوگئی۔ مگر ابھی تک پوری بستی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ہر جگہ
ہراس اور خوف طاری تھا۔ فضا میں اک سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ لوگ
دہشت سے ایسے نیم مردہ ہو رہے تھے کہ جو کھڑا تھا وہ کھڑا تھا اور جو بیٹھ گیا
تھا وہ تب سے بیٹھا ہی ہوا تھا۔ ساری رات یہی کیفیت رہی۔ صبح لوگ یہ امید
لئے ہوئے اٹھے۔ کہ شاید یہ پریشانی اب کم ہوگئی ہو۔ مگر ہر ایک کو دوسرے کا
چہرہ دیکھ کر یہی اندازہ ہوا کہ فکر اور اضطراب میں کمی نہیں کچھ اور اضافہ ہی ہوگیا پھر
یہ اضطراب ہر روز بڑھتا گیا۔ اور یہ حالت ہوگئی کہ جہاں چار آدمی جمع ہوتے
ہیکل کے اس واقعہ پر باتیں ہونے لگتیں۔ لوگ ادھر اُدھر پھرتے، مگر ایسے
خائف جیسے ہر قدم وہ اس اندیشے کے ساتھ اٹھا رہے ہوں کہ ہیکل کی توہین کا
غضب اب ان پر ٹوٹا ہی چاہتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں پر اپنے اثاثے اور مال و
دولت پر، اپنے گھروں اور مویشیوں پر اور اپنی زمینوں پر ویسی حسرت بھری نظر
ڈالتے تھے جیسے خداوند ان کا خدا بس ان کو لمحہ بھر بعد ہی ان سب سے جدا کرنے والا ہو
ان کو اپنی زندگیاں پانی پر ابھر آنے والا بلبلہ نظر آ رہی تھیں جس کے پھوٹ کر فنا
ہو جانے کا وقت اب آ چکا تھا۔ ان کی باتوں میں یاس و ناامیدی گھل کر رہ گئی
تھی۔ ان کے ہونٹوں سے اب کم ہی کچھ سنائی دیتا تھا ــــــ سوائے ٹھنڈی
آہوں کے۔ ان کی تمام دلچسپیاں سرد پڑ چکی تھیں جیسے وہ وقت سے پہلے بدھے
ہو چکے ہوں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اس حرماں نصیبی میں اور بھی اضافہ

ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو سکوت یوں چھاتا جیسے بستی میں ایک بھی متنفس نہ بچا ہو۔
کتوں کے بھونکنے یا بچوں کے رونے کی آوازیں بڑی ہی ڈراؤنی محسوس ہوتیں۔
لوگوں کو موت سامنے کھڑی نظر آتی۔ عجیب منظر تھا۔ عجیب کیفیت تھی۔
لوگ چوپال پر جمع ہوتے، مگر خاموش رہتے۔ اور پھر اک آہ بھر کر
اٹھ کر چلے جاتے۔ یا اگر کوئی گفتگو کرتا بھی تھا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مرثیے پڑھ
رہے ہوں۔ ــــــ سوائے اس قدآور اجنبی کے جسے گو، بستی میں آئے
اتنا عرصہ گذر گیا تھا مگر ابھی تک کوئی بھی نہ جان سکا تھا کہ وہ کون ہے کہاں سے
آیا ہے کس لئے آیا ہے اور کب تک رہے گا۔ پر سب کچھ نہ جاننے پر بھی اس
کا ایک عجیب خوف اور ہیبت لوگوں پر طاری رہتی۔ اکثر وہ آتا اور چوپال میں
ایک طرف خاموش بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کرتا۔ یا کسی بات کے پوچھے
جانے پر اس کا جواب دیتا۔

"بارش کا زمانہ اب آ ہی رہا ہے" کبھی کوئی بولتا۔ "بارش؟" دوسرا چونک
کر تعجب سے پوچھتا "کیا تم بڑے کاہن کا کہنا بھول گئے؟ اب بارش کہاں"
"ہاں۔ اب یا تو قحط ہے یا تباہی!"

کسی تیسرے کی یہ رائے سن کر سب کے منہ پر پھر موت کی سی زردی
پھیل جاتی کہ اچانک ایک طرف سب سے الگ بیٹھا ہوا اجنبی بڑبڑاتا "کم اعتقا
تھڑدلے، ریت پر اپنے عقیدوں کی بنیاد رکھتے ہیں اور دیکھ کر بھی نہیں
اگر یہیں نفع نقصان اسی طرح ہر ایک کے ہاتھ میں ہوتا تو معلوم کیا ہوتا؟" پھر
غیر مرئی ہستی کو مخاطب کر کے کہتا "اور تو سمجھتا ہے کہ تو ایسوں کو ہماری راہ
چلنے سے روک سکے گا اور نہیں اپنی شاہراہ پر چلا سکے گا؟ ہُمنہ!"

اس کے اس لہجہ اور اس لہجے کی پُراسراریت سے پہلے سب
ہو جاتے پھر کچھ خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے۔ اور کچھ
مضطرب ہو جاتے جیسے اُن ہی کے خیالات کو کسی نے پڑھ لیا ہو۔ مگر پھر
سب اپنے گھروں کو چلے جاتے لیکن وہاں جب ایک ایک چیز پر ان کی حسرت
بھری نظریں پڑتیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور چھلکتی ہوئی آنکھ
وہ اپنے ہاتھوں سے چھپا کر بیٹھ جاتے۔

"بارش ہونے والی ہے۔ تم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا؟" ان کے گھر کی
اس وقت ان سے پوچھتیں۔

"کچھ نہیں کیا؟" وہ سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے "کیا

آخر اتن کس سے؟ اب ہم یہاں کتنے دن کے ہیں۔"

اور پھر پہلے کی سی ناامیدی کی فضا چھا جاتی۔

وقت یونہی گذرتا رہا۔ بستی پر ایک قبل از وقت ویرانی چھائی رہی اور لوگ بے مقصد مارے مارے پھرتے رہے ان کی تمام دلچسپیاں اور مصروفیتیں ختم ہو چکی تھیں ——— کہ ایک دن دفعتاً افق سے گہری تاریکی ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ لوگ سراسیمہ ہو کر اپنے گھروں سے نکل آئے۔ اور خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسی سمت تکنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ خداوند خدا کا غضب تھا۔ یہ اس کا قہر تھا۔ جو ان پر ٹوٹنے ہی والا تھا کہ ان کی گردنیں گم ہو کر ایک طرف ڈھلک گئیں ——— اور گہری تاریکی ابھرتی رہی۔ یہاں تک کہ پورے گاؤں پر چھا گئی۔ اور پھر بادل کی گرج اور بجلی کے کوندے دلوں کو دہلانے لگے۔ ان کو لگ رہا تھا کہ پوری فضا میں بجلی کے کڑکوں سے آگ لگ جائے گی اور بادلوں کی گرج سے آسمان پھٹ کر ابھی ان پر آ رہے گا۔ ان کے دل اس تیزی سے دھڑک رہے تھے کہ ان کی حرکت رکتی معلوم ہوتی تھی ——— کہ دفعتاً بارش کے بڑے بڑے قطرے گرنے شروع ہو گئے۔

وہ سمجھے کہ یہ سماوی کنکروں کی مار ہے جو ابھی دم کے دم میں ان کو ریزہ ریزہ کر دے گی لیکن وہ صحیح سالم رہے اور تمام بستی میں جل تھل ہو گیا۔ ان کے لباس بارش سے شرابور ہو گئے اور شاہراہوں پر تیزی سے بہتا ہوا پانی ان کے قدموں میں سے ہو کر گذرنے لگا۔ تب ان کو یقین آیا کہ نہیں، یہ بارش ہی تھی، اور وہ اپنے گھروں کی طرف خوف اور مسرت کی ملی جلی کیفیت لئے ہوئے بھاگے

ایک حیرانی اور جھجک کے عالم میں انہوں نے اپنے ہلوں کو درست کیا اور ایک بار پھر کھیتوں میں چہل پہل ہو گئی۔ فصلیں بونے کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن اب بھی ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خداوند خدا کے قہر و غضب سے محفوظ ہیں اب بھی وہ خائف رہتے تھے کہ نہ معلوم کب یہ تر و تازہ زمین شق ہو جائے اور وہ اپنے ہلوں اور بیلوں کے ساتھ اس میں دھنس جائیں۔ وہ کھیت جوتتے اور بیج ڈالتے ہوئے بھی ہر قدم اسی بے اطمینانی ہی کے ساتھ اٹھاتے تھے۔

"تعجب ہے بھائی، زمین اس بار بھی ویسی ہی نرم ہو گئی ہے" چوپال میں کوئی بولتا۔

"ہاں ——— مگر آگے کیا ہوتا ہے، کون جانے"

"ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ سچ پوچھو تو دل اب تک خداوند خدا کی ناراضگی سے کانپ رہا ہے"

"ہاں، دیکھو یہ گستاخی کیا رنگ لاتی ہے"

اور چوپال کے سرے پر بیٹھا ہوا خاموش قد آور اجنبی بیزاری سے بڑبڑاتا "اور رحمت بھیج! دیکھا۔ تو سمجھتا ہے یہ تجھے اس طرح جان لیں گے۔ یہ اجن کی سرشت ہی میں سچ کو جان بوجھ کر جھٹلانا ہے۔ یہ تجھے پہچان لیں اور ان جھوٹے معبودوں کی دنیا میں بھٹکنے سے باز آجائیں؟ کیسی عجیب امید ہے تجھے ان سے!" اس کے الفاظ کی پُراسراریت، اُس کے لہجے کا یقین، اور اس کا پُرہیبت انداز، سب چوپال میں ایک ایسی فضا پیدا کر دیتے کہ بعض لوگوں کو چوپال ہیکل سے زیادہ" اور وہ اجنبی بڑے کاہن سے زیادہ مقدس معلوم ہونے لگتا۔ اب لوگ اجنبی سے خوف کھانے کے بجائے اکثر اس کے گرد اس کی باتیں سننے جمع ہو جاتے۔ وہ جب بھی کچھ بولتا لوگ بڑے انہماک اور عقیدت کے ساتھ اسے سنتے۔ کچھ لوگ اب بھی اُس سے خوف کھاتے تھے۔ مگر بستی کی اکثریت رفتہ رفتہ اپنی عقیدت کا رُخ اسی کی طرف موڑ رہی تھی۔ بعض لوگ تو دبے الفاظ میں یہ خیال بھی ظاہر کرنے لگے تھے کہ اس کے پاس شاید بڑے کاہن سے بھی بڑھ کر طاقت ہے۔ مگر وہ طاقت کیسی ہے اور وہ جب پُراسرار باتیں کرتا ہے تو کس ہستی سے کرتا ہے۔ سب کے لئے یہ سوال اب تک ایک معمہ تھا۔ گو ان کو اس کی باتوں سے اپنے دل میں خداوند خدا کی عقیدت اور خوف کم ہوتا معلوم ہوتا تھا مگر پھر بھی لوگوں کی دلچسپی اس کی ذات میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ ایک ایسی حالت میں تھے جب صبح نمودار ہوئی ہو مگر رات کے آثار تیزی سے ختم ہو رہے ہوں۔ مگر یہ شک اور تذبذب جیسے جیسے فصلیں بڑھتی گئیں، لوگوں کے دلوں سے کم ہوتا گیا۔ اب وہ صرف اس وقت ایک جھرجھری سی محسوس کرتے جب ان کو اُس مخصوص واقعہ کا خیال آجاتا۔

وقت گذرتا گیا۔ فصلیں تیار ہو گئیں۔ گیہوں کی بالیں اور اناج کے خوشے پک کر سنہری ہو گئے اور کھیتیاں فخر سے سر اٹھا کر جھومنے لگیں۔ تب بستی والوں کا شک ختم ہو گیا اور اس یقین نے اس کی جگہ لے لی کہ اب کی بار ان کی فصلیں ان کے کھتّوں کو دوبارہ بھر دیں گی۔ اب ان کے تفکر کے گہرے نشانات مٹ چکے تھے۔ اور وہ اپنی گفتگوؤں میں یاس و قنوطیت کا شکار بہت کم دکھائی دیتے تھے۔

تب ایک شام بستی کا ایک دلیر شخص بڑے کاہن کے پاس حاضر ہوا۔

"اے مقدس آقا! خداوند خدا کی ناراضگی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"یہ بات آنے والا وقت بتائے گا جس کی کسی کو خبر نہیں۔ خداوند اتنی بڑی گستاخی بخشنے والا نہیں!"

"مگر ہماری فصلیں جو اس سے پہلے کبھی اتنی اچھی نہیں ہوئی تھیں، ہم کو یہ یقین دلا رہی ہیں کہ ہمارا قصور معاف ہو گیا!"

"یہ معافی نہیں ایک مہلت ہے۔ تاکہ خداوند خدا اس وقت تم کو تمہارے قصور پر پکڑے جب تم اسے بھول کر اور اپنے عیش میں پڑ کر اس سے بے خوف ہو جاؤ۔"

"کیا اُسے خوش نہیں کیا جا سکتا؟"

"شاید اس بار کی پوری فصلوں کا نذرانہ کچھ امید پیدا کر سکے!"

"ساری فصلیں! لیکن اے مقدس آقا۔ لوگ بھوکوں مر جائیں گے!"

"کیا وہ خداوند خدا کو خوش کرنے کے لئے بھوکوں بھی نہیں مر سکتے!"

اور پھر وہ شخص بڑے کاہن کے حضور سے ادب کے ساتھ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

چوپال میں پہنچ کر وہ شخص سیدھا اسی قدآور اجنبی کے پاس پہنچا جو چپ چاپ ایک گوشے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اس نے اجنبی کے قریب بیٹھ کر اور جھک کر سرگوشی کے انداز میں اس سے کچھ کہا جسے سن کر اس اجنبی نے سر ہلایا۔ اور اس شخص کو کوئی بات کہہ کر رخصت کر دیا۔ وہ شخص بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔

وہ قدآور بوڑھا اجنبی اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر بستی کے باہر چلا گیا۔ رات گئے تک وہ کھیتوں کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ ٹہلتا رہا۔ کبھی وہ گیہوں کی بالوں کو بڑے پیار سے چھوتا ان کا کوئی خوشہ توڑ کر اس پر ہاتھ پھیرتا اور اس کے دانے ہتھیلی پر رکھ کر ان کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے وہ آبدار موتی ہوں جو اس کی ہتھیلی پر پڑے جھلمل جھلمل کر رہے ہوں۔ اس نے کئی بار نظریں اٹھا کر دور تک پھیلی ہوئی فصلوں کو دیکھا۔ وہ کسی فکر میں غرق دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ایسا لگا کہ جیسے اس کے ذہن میں ایک کوندا لپکا ہو جس سے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہو گئی ——— کہ اتنے میں پو پھٹنے لگی اور پھر صبح ہو گئی۔

جب وہ واپس چوپال میں پہنچا تو ایک طرف کچھ لوگ بیٹھے کھیتوں میں تیار کھڑی ہوئی فصل کے بارے میں مشورے کر رہے تھے۔ چند اور کسان دوسری طرف بیٹھے اپنے آئندہ منصوبے، ایک دوسرے کو بتا رہے تھے، دو چار سوداگر جو دوسرے ملک کی منڈیوں میں تجارت کرنے جاتے تھے، اس وقت ان لوگوں کے درمیان بیٹھے ان فصلوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔ اور ایک چبوترے پر بستی کے چند امیر لوگ بیٹھے اپنے پرانے قرضے وصول ہو جانے اور پھر جمع شدہ دولت سے نئے سال کے نفع بخش کاموں کو شروع کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ پوری چوپال میں ایک گہما گہمی اور بشاشی کا عالم طاری تھا۔ وہ جیسے ہی چوپال میں داخل ہوا نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ کچھ لوگ اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ کچھ نے باتیں کرنا بند کر دیں اور کچھ، اس کے متعلق آپس میں سرگوشی کرنے لگے، وہ ان ٹولیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا خلافِ معمول چبوترے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا، رک کر وہ مڑا۔ اور اس نے لوگوں پر گھومتی ہوئی نظر ڈالی۔ گفتگو اب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ لوگ خاموش ہو کر اس کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اب کچھ کہے گا۔

"بستی والو!" وہ بڑی ٹھہری ہوئی گمبھیر آواز میں بولا۔ "میں جو تمہارے درمیان اب تک اجنبی ہی ہوں، تم کو وہ بات بتاتا ہوں جسے تمہارے باپوں نے تم کو، اور تم نے اپنی اولاد کو نہیں بتایا۔ وہ بات تم اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ چکے ہو مگر اپنی کم عقلی سے سمجھے نہیں۔ میں جو اس بات کو جانتا ہوں جس سے تمہاری بستی کی ابتداء سے اب تک کوئی واقف نہ تھا، آج تم کو بتاتا ہوں کہ تم نے کتنی بڑی بات جان کر بھی نہیں جانی!"

وہ رکا۔ اس کی شخصیت اور اس کی باتوں میں جو اسرار جھلکتا تھا وہ اس وقت ساری چوپال پر چھا گیا تھا۔ اس کی بات کے اثر سے مبہوت اور متحیر ہو کر سب لوگ پتھر کی مورتوں کی طرح ساکت بیٹھے تھے ہر طرف موت کا سا سناٹا تھا۔ وہ پھر بولا۔

"اور اس بات کے بتانے سے پہلے میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم سوچ بھی سکتے ہو کہ خداوند خدا ناراض ہو۔ اور پھر بھی وہ لوگوں کا بال تک بیکا نہ کر سکے؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" ذرا سے تامل کے بعد ایک طرف سے کسی کی آواز آئی

"کیا تم دیکھ نہیں چکے کہ تم کو اس کے ناراض ہونے کا یقین دلایا گیا، لیکن تم پہلے سے زیادہ مال و دولت والے ہو گئے۔ کیا اسی کو تم ناراضگی کہتے ہو؟ تب تو تمہاری بستی زمین پر سب سے عجیب بستی ہوئی۔"

"کیا معلوم، اب بھی، کب اُس کا غضب ہم پر بھڑک اٹھے۔"

"تم کم اعتقادو! اپنی فصلوں اور مویشیوں کی اس برکت اور ترقی کو کس کا انعام سمجھو گے؟"

لوگ چپ ہو گئے، جیسے ان کو آج کوئی بات نئی معلوم ہوئی ہو۔ بوڑھا اجنبی پہلے سے زیادہ بلند آواز سے بولا۔

"اب سنو۔ اے کم فہمو! اور لرز اٹھو، یہ بات جان کر کہ خداوند خدا تمہارا اصلی خدا نہیں ہے۔"

لوگوں پر ایک بجلی گر پڑی۔ وہ دم بخود بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ اس اجنبی کی گرجتی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔

"اور یہ بھی جان لو کہ تمہارا بڑا کاہن میرا بھاگا ہوا شاگرد ہے جو یہ ڈھونگ رچا کر تمہاری بستی میں، تمہارے باپوں سے پہلے سے آیا اور سب کو خداوند خدا کے اس بت کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور جو آج اس ہیکل میں کھڑا ہے۔"

وہ پھر رکا اور عصا کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے کر اس نے پہلا ہاتھ بلند کیا۔

"تمہارا اصلی خدا خداوند معبود تھا۔ جو تمہارے درمیان آیا مگر تم اپنی بدبختی سے اسے پہچان نہ سکے۔ تم نے دیکھا کہ اصلی خداوند معبود نے اس باطل خداوند خدا کے جھوٹ کا پردہ چاک کر ڈالا۔ مگر تم دیکھ کر بھی اندھے بنے رہے۔ تم نے اس پر ظلم کیا تم نے اسے اپنے درمیان رحمت بن کر رہنے نہ دیا۔ پھر بھی اس نے تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے تمہیں اس بار سب سے اچھی فصل دی۔ تمہارے باغوں کو پھلوں سے لاد دیا۔ تمہارے گنتی کے مویشیوں کو گلے کے گلے بنا دیا۔ اور تم کو ایسی فارغ البالی اور خوشحالی دی جو اس سے پہلے تم کو خواب میں بھی نہ نظر آئی تھی۔ پھر بھی تم بڑے کاہن کے اس نقلی خدا ہی سے ڈرتے رہے حالانکہ وہ اپنی انتہائی ناراضگی کے باوجود تمہارا کچھ نہ کر سکا۔ اور یہ کاہن اب بھی یہی چاہتا ہے کہ تم اس کے پھندے میں پھنسے رہو اور پوری پوری فصل بھی نذر لانے میں دیر کرو تم کو نجات نہ ملے اسی خوف میں جو تم نے کاہن کے سامنے تمہارے خداوند معبود نے کہا تھا: "میں ہوں تمہارے باطل خدا کو باطل کہنے والا، جو نہ بارش روک سکتا ہے نہ کھیتی اگا سکتا ہے نہ آباد دلوں کو ویران کر سکتا ہے۔ وہ ذات اور ہی ہے جس کو تم نے اپنی حرص و طمع کے پردوں میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، ——— آج تم دیکھ رہے ہو کہ خداوند معبود کا کہا ہوا ایک ایک حرف صحیح ہو رہا ہے۔"

لوگوں نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلے۔ اور حیرانی بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر ایک دوسرے سے نظریں ملتے ہی اس طرح گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں جیسے ان کو خطرہ ہو کہ دل کا چور دوسرے پکڑ نہ لیں۔ اُن کے دلوں میں جو پرورش پا رہا تھا آج وہ ایک اجنبی دیس سے آئے ہوئے پُر ہیبت شخص نے ان ہی کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

اب جب کہ تم کو وہ سب سے بڑی بات معلوم ہو گئی جس نے تمہارے دلوں میں وسوسہ اور شبہ پہلے ہی پیدا کر دیا تھا، تو کیا اب تم تھڑدلے کم اعتقادوں کی طرح ایسے ہی بیٹھے رہو گے اور اپنے خداوند معبود کا شکریہ ادا کرنے اور اسے اس کا صحیح مقام دینے کے لئے تم نہیں اٹھ کھڑے ہو گئے؟ بولو۔ جواب دو! تمہارا خداوند معبود دیکھنا چاہتا ہے کہ اُس نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے تم اُس کے بدلے اس کے لئے کیا کرتے ہو!"

اس مسحور اور ساکت مجمع سے یہ آخری بات کہہ کر وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چوپال سے نکل کر آگے بازار کے موڑ پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بڑی دیر کے بعد لوگ اس جادو سے جاگے۔ اور اس عجیب بات پر غور کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ خاموشی ٹوٹتی گئی اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ پھر سرگوشیاں تیز گفتگوؤں اور شور و غل میں بدل گئیں۔ پھر یہ باتیں اور شور و غل سلگتی ہوئی آگ کی طرح بستی بھر میں پھیل گیا۔ لوگوں میں تیز ہراس اور غصہ اور انتقام کا جذبہ پھیلتا گیا۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے مگر اب ان کے انداز میں سہم اور خوف نہیں دکھائی دیتا تھا۔

دوپہر گذرتے گذرتے لوگوں کا غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اور شام کی عبادت ہونے سے پہلے ہی ہیکل کے گرد بے انتہا لوگوں کا اژدحام ہو گیا۔ آج لوگ یہاں ایک جلوس کی شکل میں جذبۂ تقدس لئے ہوئے نہیں آئے تھے، بلکہ آج چاروں طرف غل مچاتے، نعرے لگاتے اور ہیبتناک چیخیں بلند کرتے ہوئے لوگوں کی ایک مشتعل بھیڑ تھی جو انتقام اور نفرت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہیکل کو ڈھا دینے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ ایک ہجوم ہیکل کے بلند بالا دروازہ کو توڑنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ قدآور اجنبی جو اتنے عرصہ تک لوگوں کے لئے ایک پراسرار ہستی بنا رہا تھا۔ آج اُن سب کے آگے آگے تھا۔ بستی کے دولتمند اور جوشیلے نوجوان کی ٹولیاں اس کی پشت پناہی انتہائی سرگرمی سے کر رہی تھیں اور ہجوم کو دہشت انگیزی پر اکسا رہی تھیں۔

آخر کار ہیکل کا دروازہ مشتعل ہجوم کے قدموں میں آ رہا۔ بڑا کاہن اور دوسرے تمام چھوٹے کاہن انتہائی ہراسانی کے عالم میں چھپتے پھر رہے تھے اور ہجوم ان میں سے ایک ایک کو پکڑ کر بڑی بے دردی سے ختم کر رہا تھا۔ سب سے آخر میں خداوند خدا کے بُت کی باری آئی۔ انھوں نے اس کو ہتھوڑوں سے توڑ کر پاش پاش کر دیا پھر اس کے ٹکڑوں کو فرش پر پٹخ پٹخ کر ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

وہ اجنبی شخص خداوند خدا کے بُت کے خالی چبوترہ پر آ کر کھڑا ہوا اور بڑی اونچی اور بھاری آواز میں بولا۔

"بستی والو! —— لو اب یہ جگہ خداوند معبود کے لئے خالی ہے اب یہاں جلد سے جلد اس کا بُت بنا کر کھڑا کر دو جو تمہارا حقیقی خدا ہے"!

اور تمام لوگوں نے کھلی ہوئی چھت میں سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنے نئے خداوند معبود کی مناجات شروع کر دی کھلی ہوئی چھت کے بلند کنگروں میں سے ایک کے آس پاس، جہاں اس عظیم واقعہ کے سب کاہن کھڑا کسی غیر مرئی ہستی کے حضور کچھ عرض کر رہا تھا۔ ان مناجاتوں کی گونج سے اونچی، ایک بات فضا میں گردش کر رہی تھی: "ہم نے تجھے پہچاننے میں کوتاہی کی، تو وہاں نہیں ہے جہاں ہم تجھے تلاش کر رہے ہیں، تو وہ نہیں ہے جو ہم نے سمجھ رکھا ہے۔ یہ تو صرف دولت کے چند حریصوں کی بازی گری ہے انھوں نے یہ بہانہ بنا کر اپنے خزانوں کو سونے چاندی سے بھرنے کا انتظام کر لیا ہے"!

پھر جلد ہی ایک شام کو پچھلے خداوند خدا کے بُت کی جگہ خداوند معبود کا عظیم مجسمہ ہیکل کے اس چبوترے پر نصب کر دیا گیا اور بستی بھر کے لوگوں نے پہلے کی طرح اس نئے خدا کے سامنے انتہائی عقیدت سے سر جھکا دیا۔ اور بستی کے سرے پر پہاڑی کو عبور کرتے ہوئے اُس قدآور اجنبی نے اس وقت رک کر پیچھے ایک نظر ڈالی اور فخر و اطمینان اس کے چہرے پر منڈ آئے۔ عصا کو دوسرے ہاتھ میں تھام کر اس نے نگاہیں اونچی کر کے آسمان کے خلا میں دیکھا اور بولا،

"دیکھ! یہ ہے تیری اس مقرب مخلوق کا انجام۔ ہو سکتا ہے کہ تو پھر ان کو کسی طرح ہوشیار کر دے مگر میں اس بار تو انھیں کئی نسلوں تک اس نئے معبود کی محبت کے نشے میں مدہوش کر کے جا رہا ہوں —— کامیاب و فاتح کی طرح!"

یہ کہہ کر اس نے بڑھتی ہوئی شام کی سیاہی کی طرف رُخ لیا۔ اور پہاڑوں کی چوٹی کے دوسری طرف تاریکی میں اتر گیا۔

(بشکریہ "نئی نسلیں")

سید رضوان بریلوی

حسن و عشق

(۱)

کہتے ہیں جس کو زندگی کچھ بھی نہیں مگر ہے حسن
عالمِ کائنات میں جنتِ ہر نظر ہے حسن

حسن کی ضو سے کامیاب جلوۂ فطرتِ شباب
حسن بنائے اضطراب عشق بنائے انقلاب

حسن تمام منتظر انجمنِ حیات میں
حسن تغافل آزما پردۂ التفات میں

حسن کی منزلت گراں حسن کی نعمتیں عظیم
حسن کی گرد پائے ناز نزہتِ جنتِ نعیم

حسن جمالِ سرخوشی حسن نشاطِ سرمدی
حسن نظامِ زندگی حسن کمالِ آگہی

پست و بلندِ دہر میں حسن ہی حسن ہے عیاں
حسن کی آن مستقل حسن کی شان جاوداں

مرکزِ جستجوئے عشق، محورِ آرزوئے عشق
حسن کی دولتِ سماع لذتِ گفتگوئے عشق

(۲)

ہوش و خرد سے بے نیاز، جذبۂ صد جنوں نواز
شانۂ زلفِ امتیاز، رخنہ گرِ حجابِ ناز

ناظمِ بزمِ کائنات، قاسمِ کیفِ حسنات
شارحِ دفترِ حیات پردہ کشائے شش جہات

زندگی اس کی زندگی سینۂ پاش پاش ہے
جسم میں خوں رواں دواں روح کے ارتعاش سے

حسن سے بے خبر بھی ہے حسن سے باخبر بھی ہے
حسن کا پردہ دار بھی حسن کا پردہ در بھی ہے

عشق ہے سر بسر پیام محوِ کلام لا کلام
عشق وظیفہ و درود عشق ہی سجدہ و سلام

عشق سے بڑھ کے کون ہے کشتۂ خنجرِ امید
عشق تمام یاس ہے پھر بھی ہے پیکرِ امید

شمعِ جہاں بھی عشق ہے دودِ دخاں بھی عشق ہے
سیلِ رواں بھی عشق ہے تیغ و سناں بھی عشق ہے

عرش رسا و فرش گیر نغمۂ نو بہار ہے
موجۂ بادۂ طہور، عظمتِ کردگار ہے

ابوالقاسم نعمانی ٭

امام اوزاعیؒ منصور کے دربار میں

(حق گوئی کی ایک نادر مثال)

ایسے عظیم المرتبت وائمہ ہدیٰ وعلمائے حق کی فہرست تو بہت طویل ہے جو اپنے زمانے میں کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے ہر ممکن حد تک کوشش کرتے رہے حتیٰ کہ جابر سے جابر حاکم وقت کے سامنے بھی کسی دبدبہ اور رعب کو خاطر میں نہ لائے اور کسی گندے ماحول سے معمولی سا بھی تاثر لئے بغیر وہ دین حق کی تبلیغ اور اطاعت خدا ورسول کی تلقین میں مصروف رہے لیکن یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ زمین وآسمان کے آقا اور حقیقی مالک سے ڈرنے والے زمین کے "جھوٹے خداؤں" کے ساتھ کس قدر بیباکانہ معاملہ کرتے رہے ہیں اور خوف آخرت کے ہر وقت غالب رہنے کی بنا پر وہ دنیا کی متاع حقیر سے کس حد تک بے نیاز رہے ہیں۔

خاندانِ عباسیہ کا مشہور حکمران ابوجعفر منصور جو ظلم میں بہت مشہور تھا قتل وغارت لوٹ مار اس نے اپنا شیوہ بنا رکھا تھا ایک دفعہ اس نے عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعیؒ امام شام کو دربار میں طلب کیا امام اوزاعیؒ جس وقت دربار میں پہنچے۔ آتے ہی ان سے پوچھنے لگا "ہمارے پاس آنے میں اتنی دیر کیوں کی؟"

امام صاحبؒ "میرے متعلق کیا کام ہے۔؟"

ابوجعفر "میں آپ سے کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں"!

اس پر امام صاحب نے فرمایا۔ دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من بلغہ عن اللہ نصیحۃ فی دینہ فھی رحمۃ من اللہ سیقت الیہ فان قبلھا بشکرو الا کانت حجۃ من اللہ تعالیٰ علیہ لیزداد اثما ولیزداد اللہ علیہ غضبا وان بلغہ شیئ من الحق فرضی فلہ الرضاء وان سخط فلہ السخط (الحدیث)

جس کے پاس دین کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی نصیحت پہنچی تو اگر اس نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کر لیا تو اس کے لئے وہ رحمت خداوندی ثابت ہوئی۔ اور اگر اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر حجت قائم ہو جائے گی۔ اس کے گناہ بڑھتے جائیں گے اور اللہ کا غضب شدید ہوتا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس کوئی حق بات پہنچی جس پر وہ راضی ہوا تو اس کے لئے اللہ کی بھی رضا ہے اور اگر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ تعالیٰ بھی غیظ وغضب سے پیش آئیں گے۔

اے خلیفہ! تو ہرگز نادانی کا ثبوت نہ دینا"

خلیفہ نے کہا۔ کیسے؟

امام صاحب نے فرمایا" اس سے بڑھ کر اور کیا نادانی ہوگی کہ تو سن تو سب کچھ لے مگر سنی ان سنی کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

یا ایھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون۔

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے یہ تو کہہ دیا کہ "ہم نے سن لیا" حالانکہ وہ کچھ نہیں سنتے (یعنی انھوں نے عملاً اس بات کا ثبوت دیا کہ انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں)

ربیع نامی حاجب نے جو پاس ہی کھڑا تھا فوراً تلوار کھینچ لی تاکہ امام اوزاعی کو قتل کر دے لیکن منصور کا دل گداز ہو چکا تھا نصیحت طاہرہ کی بابرکت بارش سے اس کے دل کا غبار دھل چکا تھا۔ اس نے ربیع کو ڈانٹ کر کہا "پیچھے ہٹ جا یہ خیر وبرکت کی مجلس ہے۔ نہ کہ جزا وسزا کی کچہری" پھر امام صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا آپ

اپنے ارشادات سے مستفیض فرمائیں؟

امام اوزاعیؒ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

"اے امیرالمومنین! حکام و ولاۃ کو تو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ ہر زخم خوردہ کی مرہم پٹی کریں، کمزوروں کا سہارا بنیں۔ لوگوں کی مشکلات کا ازالہ کریں۔ لیکن تو ہے کہ منصب خلافت سے کچھ اور ہی کام لینا شروع کر دیا ہے تو نے اقتدار کو ناجائز استعمال کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔

یاد رکھ

اللہ تعالیٰ تجھ سے پائی پائی کا حساب لینے والا ہے۔ ذرّے ذرّے کے متعلق باز پرس ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من ولاہ اللہ شیئاً من امور المسلمین فاحتجب دون حاجتھم وخلتھم وفقرھم احتجب اللہ دون خلتہ وفقرہ یوم القیمۃ"

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی کام کا والی مقرر کیا پس اس نے ان کی حاجت و ضرورت کی خبرگیری نہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن اس کی مسکینی و فقر میں خبرگیری نہیں کریگا۔

ما من راع یموت غاشاً لرعیتہ الاحرم اللہ علیہ رائحۃ الجنۃ

جس حاکم کی موت اس حالت میں ہوتی ہے کہ وہ رعیت کا بدخواہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی بو بھی حرام کر دیتا ہے۔

حکمران کے لئے یہی انسب و اولیٰ ہے کہ وہ پبلک کی دیکھ بھال لوگوں کی حاجت براری اور ایثارات دن کا وظیفہ بنالے۔ اور جب تک ننگوں کے لئے کپڑے کا، بھوکوں کے لئے کھانے کا اور مظلوموں کے لئے عدل و قسط کا انتظام کر سکتا ہے کرے اور اسے کسی "مہذب" کی تہمت اور کسی شریر کی عداوت کی فکر ہرگز دامنگیر نہ ہونی چاہیئے۔

اے امیر المومنین! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نابینا (عبداللہ ابن مکتوم) سے اپنی توجہ ہٹائی تھی جس پر فوراً اللہ نے یہ وحی نازل کر دی ——

عبس وتولی —— اسی طرح ایکدن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی خشک ٹہنی ہاتھ میں لئے مسواک فرما رہے تھے۔ اچانک غیر ارادی طور پر ایک اعرابی کی کھوپڑی پر جا لگی

حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور کے پاس آئے اور فرمانے لگے۔

یا محمد ان اللہ لم یبعثک جباراً ولا متکبراً تکسر قرون امتک،

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے آپ کو جبار و متکبر بنا کر نہیں بھیجا کہ آپ امت کے سروں کو پھوڑنا شروع کر دیں۔

چنانچہ آپ نے مسواک پھینک دی اور اس اعرابی کو قصاص کے لئے بلایا۔

لیکن اس شخص کا کیا حال ہوگا جو لوگوں کے مال لوٹتا ہے اور قتل و غارت کر کے اپنے ہاتھ خون سے رنگتا ہے۔

اے امیر المومنین! بے شک اللہ کے نزدیک سب سے بڑی بزرگی تقویٰ ہے۔

- جو شخص اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اللہ اسے بلند کرتا ہے اور عزت و عظمت سے سرفراز کرتا ہے۔
- جو اللہ سے بغاوت و غداری کر کے عزت کا طالب بنتا ہے اللہ اسے نیچے گراتا ہے اور ذلت و مسکنت اس پر مسلط کرتا ہے۔

یاد رکھ

ملک و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اگر یہ کسی کی دوامی جاگیر ہوتی تو تیرے پاس کیسے پہنچتی جس طرح دوسروں کے پاس نہیں رہی تیرے پاس بھی نہیں رہے گی۔ تجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ امیر و حاکم چار قسم کے ہیں۔

(۱) وہ امیر حاکم جو خود بھی دست درازی نہیں کرتا اور نہ ہی عمال کو دست درازی کا موقعہ دیتا ہے۔ اس کے لئے مجاہدین

کے برابر اجر ہے

ب وہ حاکم جو خود بھی عیش و عشرت میں مبتلا ہے اور اس کے کارندے بھی گلچھرے اڑاتے ہیں۔ یہ نادان اپنا بوجھ تو اٹھا ہی رہا ہے مگر دوسروں کا بوجھ بھی اپنی گردن پر لادے ہے۔

ج وہ حاکم جس نے لوگوں کی ضروریات سے اپنا ہاتھ کھینچ رکھا ہو مگر اس کا ماتحت عملہ خوب نا و نوش کی داد دے رہا ہو۔ یہ وہ بدبخت ہے جس نے اپنی آخرت بگاڑ کر دوسرے کی دنیا بنائی

(د) وہ حاکم جس نے خود تو کھل کر "بابہ بعیش کوش" کا نعرہ لگایا مگر رعیت کے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے اور ماتحتوں کی دنیا تنگ کر رکھی ہے۔

یہ "الحطمہ" جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

ان شر الرعاۃ الحطمۃ بدترین حاکم وہ ہے جس نے ظلم و ستم سے لوگوں کا کچومر نکال دیا ہو۔

اور اگر تو یہ کہے کہ میں رسول اللہ کے خاندان سے ہوں حضور مجھے جنت کا "پاسپورٹ" عنایت فرما دیں گے اور مجھ پر دوزخ کی آگ حرام کر دیں گے تو تیرا یہ دعوےٰ بھی بالکل باطل ہو گا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا

یا عباس! اللہ سے ڈرو میں تمہیں اللہ سے ذرہ برابر بھی نہیں بچا سکتا۔

اے صفیہ! اللہ سے ڈرو میں تمہیں اللہ سے بالکل نہیں بچا سکتا۔

اے فاطمہ بنت محمد! اللہ کا جو حکم تمھیں مجھ سے پوچھنا ہے پوچھ لو۔ بیشک میں تمہارے متعلق اللہ کے فیصلوں کو نہیں روک سکتا

اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے تم سے بہتر و برتر حضرت داؤد کی طرف جو حکم بھیجا تھا کیا تم نے اسے فراموش کر دیا؟

یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض، فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب۔

اے داؤد (علیہ السلام) ہم نے تجھے زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کر۔ اپنے نفس کی خواہش پر نہ چل۔ یہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے ہٹ گئے ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ کیونکہ انھوں نے یوم الحساب کو فراموش کر دیا۔

کہاں ہے تیرا عدل؟ کب کیا تو نے انصاف؟

- جس سے تیرا ملک مضبوط و قوی ہوتا
- جس سے تیرا ذکر خیر عام ہوتا
- جو تجھے اس آگ سے نجات دلاتا جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

یہ ہے وہ راہ عمل جس کا بتلانا میرا فرض تھا۔ اگر تو اسے اختیار کرے گا تو اپنا ہی بھلا کرے گا اگر اس سے انحراف کرے گا تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی چلائے گا۔ اپنی ہی جان کا دشمن بنے گا۔ والسلام علیک

دوران تقریر میں ہی خلیفہ پر ان نصائح کا شدت سے اثر ہو رہا تھا اور پسینے کے قطرات اس کے چہرہ پر جھلک رہے تھے

اختتام تقریر پر ابو جعفر نے امام صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور چاہا کہ آپ کو بہت بڑی مقدار میں زر و مال سے نوازا جائے لیکن امام اوزاعی نے نہایت مومنانہ شان و وقار سے پوری بے اعتنائی کے ساتھ خلیفہ کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا۔

- کیا میں ان قیمتی نصیحتوں کو اس حقیر دنیاوی مال و دولت کے بدلے بیچ دوں۔ اگر تمام دنیا بھی اس کے بدلے مجھے ملے تب بھی میں لینے کے لئے تیار نہیں ہوں
- کیا میں اس سودا بازی سے اس عظیم الشان اجر و ثواب سے محروم ہو جاؤں جو خدا کی طرف سے مجھے ملیگا۔
- کیا میں اس قلیل نفع کے عوض کثیر نفع سے ہاتھ دھولوں

(شکریہ "تفہیم")

اشم میرزا

شکاری

انور گھر پر اکیلا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ گاؤں میں اپنے ایک قریبی عزیز کی شادی کے ہنگاموں میں شریک ہو جاتا۔ اس کی والدہ نے اسے مجبور بھی کیا تھا۔ مگر اس نے اپنی تعلیمی مصروفیتوں کا بہانا بنا کر جان چھڑا لی تھی۔ درحقیقت وہ اپنے دوستوں کے بہکانے پر اس تنہائی سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اس کے خوابوں اور خیالوں میں جو ایک اذیت ناک انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاج کی خاطر اسے پرسکون تنہائی کی ضرورت تھی جس میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے دوستوں کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے ———— رات تاریک اور سرد تھی۔ گلی میں سوز ندگی کی ہماہمی سمٹ کر لحافوں میں دبک گئی تھی۔ برفیلی ہوا پراسرار سرگوشیوں کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ سرکاری بجلی کے بلب کی ٹھٹھری ہوئی بیمار زرد روشنی نے ماحول کو آسیب زدہ بنا دیا تھا! اور انور اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا تیسرے دوست کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار چونک پڑتا۔ اور جعفر اور اکبر بھی دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ گلی میں ابھرتی ہوئی کسی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگتے۔ ———— سراج چالی دفعہ انور کا اوورکوٹ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ تاکہ راستے میں کسی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لئے تینوں اس بات سے تو مطمئن تھے کہ سراج جیسا چالاک شکاری ان کے لئے کسی خطرے کا موجب نہیں بن سکتا۔ البتہ اس کے دیر لگانے سے وہ مضطرب تھے کہ کہیں بنا بنایا ہوا پروگرام اپ سٹ نہ ہو جائے۔ اور انہیں پھر کسی نئے "چانس" کے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جعفر اور اکبر کو سراج پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ان کا گہرا دوست تھا۔ انہیں کی بدولت انور سے بھی اس کی دوستی پیدا ہوئی تھی اور اس لئے انور بھی اس کے متعلق کوئی برا نظریہ نہ قائم کر سکا تھا۔ ———— انور کے والد کو یہاں تبدیل ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ کالج کے ماحول میں سب سے پہلے جس لڑکے نے انور کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ جعفر تھا۔ ایک ہنس مکھ کھلنڈرا لڑکا۔ جو رنگین شعر گنگنا تا تھا۔ امریکن بش شرٹ پہن کر لڑکیوں کا تعاقب کرتا تھا۔ اور پھر مزے لے لے کر اپنے معاشقوں کا حال دوستوں کو سناتا تھا۔ انور ایک شرمیلا لڑکا تھا۔ اس کے گھر کا ماحول ابھی تک اخلاقی اقدار کا گردیدہ تھا۔ اس نے شرمیلا پن ورثے میں پایا تھا۔ اس لئے وہ کسی سے کھل کر بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت کی تھی۔ جس سے گھر کے کسی فرد کو اس کی جوانی کی خودسری کا خدشہ پیدا ہوا ہو۔ تعلیمی مصروفیتوں میں الجھے ہوئے اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ مد و جزر کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ کیوپڈ کی پرستش کیوں کی جاتی ہے۔ ———— مگر جعفر کی دوستی نے اس کے سامنے ایک نئی دنیا کا نقشہ پیش کر دیا تھا۔ اس کے رنگین شعروں کا تاثر انور کے دل میں ایک چنگاری بن کر سلگنے لگا تھا۔ اکبر بھی جعفر سے مختلف نہ تھا۔ کریب سول کے بوشٹ اور ٹخنوں سے اونچی پتلون پہن کر وہ یوں چلا کرتا تھا۔ جیسے اسے امریکہ کی سیاحت کے لئے عنقریب وظیفہ ملنے والا ہو۔ سگرٹ پینے اور انگریزی فلم کا بہت شوقین تھا۔ انور ان کے لئے ایک "بھولا شکار" تھا۔ وہ دونوں اگرچہ اس کے ہم جماعت نہ تھے۔ مگر کالج میں اسے دوسرے لڑکوں کے مذاق سے بچانے کا پارٹ ادا کرتے ہوئے وہ اس کے قریب ہو گئے تھے۔ ان کی ہمدردی نے انور کو ان کا دوست بنا دیا تھا۔ اس نئے ماحول میں وہ انہیں اپنا رہبر سمجھنے لگا تھا۔ جعفر اور اکبر برابر اس کے شرمیلے پن کو دور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جنسی جرائم کے قصے وہ اس انداز سے سنایا کرتے تھے کہ انور کے جذبات میں ابال آجاتا تھا۔ رنگین الفاظ میں عورت کے سراپا کی یوں تعریف کیا کرتے تھے کہ انور کی سانس چلنے لگتی تھی ———— اور عریاں تصویروں کے البم دکھا کر یوں اپنے تجربات بیان کرتے تھے کہ انور کی ذہنی کائنات میں ایک زلزلہ سا آجاتا تھا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود انور کا شرمیلا پن ایک خوف بن کر اس کے حواس پر چھا جاتا تھا۔ اور تندرستی زبردست تحریک کے بعد بھی وہ دوستوں کے ساتھ کوئی عملی قدم اٹھانے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ ایک پریشان کن کشمکش میں

...پھنس گیا تھا۔ اس کے گھر کا شریفانہ ماحول ملے سے ان دوستوں کا ساتھ چھوڑ دینے پر اکساتا تھا۔ اور دوستوں کے پروگرام ملے سے اخلاقی اقدار کو پامال کرنے پر ابھارتے تھے جب تک وہ دوستوں کے پاس رہتا بغاوت کے جراثیم اس کے دل کی گہرائیوں میں پھلتے رہتے۔ اور جب گھر میں پاکیزگی کا مظاہرہ دیکھتا۔ تو یہ جراثیم سمٹ کر کسی تاریک کونے میں چھپ جاتے گلی قدم اٹھانے سے اگرچہ وہ خوف محسوس کرتا تھا۔ مگر وہ خود کو خیالوں اور خوابوں میں ایک ان دیکھی دوشیزہ کے مرمریں بت کی پرستش سے روک نہ سکا تھا، باغیانہ جذبات کو دبانے کی کوشش نے اس کے تصورات میں شعلوں کو رقصاں کر دیا تھا۔

انگریزی فلموں کے جذباتی مناظر اس کی نیندوں میں انتشار پیدا کر دیتے تھے ــــ کھلی سڑکوں اور باغات میں بن سنور کر سیر کرتی ہوئی دوشیزائیں اسے بداخلاقی بند حسن توڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جن مناظر کے پاس سے کبھی وہ نظریں جھکا کے گزر جایا کرتا تھا۔ اب وہ اس کے لئے ایک خاص اہمیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ جعفر اور اکبر کی ایسے موقع کے منتظر تھے۔ جو انور کو ایک ایسے بھنور میں پھنسا دے۔ جس سے بچ کر کنارے پر پہنچنا اس کے لئے ناممکن ہو جائے۔ ان کے نزدیک گھر کی عورتوں کے سوا اور کوئی عورت قابل احترام شریف نہ تھی۔ ہر راہ چلتی عورت سے انتقام لینے کے منصوبے بناتے ہوئے وہ حیوانیت کی سطح سے بھی گر جاتے تھے۔ اور اب انور ان کی رہبری میں ایک ایسے خطرناک موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں سے آگے ظلمتوں کی مہیب گھاٹیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ــــ ایک ہفتہ پہلے جب اس نے ان دوستوں کو اپنے عزیز کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تو انہیں ایک قدم اور آگے بڑھانے کا بہانہ مل گیا۔ جعفر نے اکبر کے کان میں سرگوشی کی اور پھر انور سے پوچھا "اور کون کون جا رہا ہے؟" "گھر کے سب افراد جائیں گے" انور کے جواب سے جعفر کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے انور کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "شادی میں شریک ہونے سے زیادہ ہم یہاں رہ کر لطف اٹھا سکتے ہیں"

"وہ کیسے؟" انور نے کچھ حیران سا ہو کر پوچھا۔ اکبر نے پروگرام کا خاکہ پیش کر دیا۔ اور انور کا رواں رواں ایک ان جانی لذت سے جھوم اٹھا۔ وقتی طور پر اس نے یوں خوشی محسوس کی تھی۔ جیسے اس نے بہار وں کے تبسم۔ چاندنی کی ٹھنڈک۔ جھرنوں کے ترنم اور پھولوں کی مہک کو چرا کر اپنے سینے میں چھپا لیا ہو۔ سراج سے مل کر انہوں نے معاملہ طے کر لیا تھا۔ اور انور نے پیشگی دس کا

نوٹ لے کر تھما دیا تھا۔ سراج ایسے معاملہ میں بہت ماہر تھا۔ پہلے وہ ایک سینما میں گیٹ کیپر تھا۔ وہاں سے جواب ملنے پر فلمی گانوں کی کاپیاں بیچنے لگا۔ اور آج کل وہ ایک گرلز اسکول کے سامنے کھانڈ کی گولیاں۔ چورن اور املی بیچا کرتا تھا۔ جعفر اور اکبر اس کی فریب کاریوں کے قصیدہ خواں تھے۔ اور اب انور بھی اس کی عزت کرنے لگا تھا

گھر کے سب افراد شادی میں شرکت کرنے کی خاطر گاؤں جا چکے تھے۔ اور انور گھر پر رہ گیا تھا۔ اور اب وہ دونوں دوستوں کے ساتھ تیسرے دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ سراج نے آنے میں دیر لگا دی تھی۔ انور کے لئے انتظار کے لمحے بہت تکلیف دہ بنتے جا رہے تھے۔ جعفر سگرٹ سلگا کر ٹہلنے لگا۔ اور اکبر سوچ رہا تھا "سراج کسی حالت میں بھی ناکام لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ کسی اچھے مال کی تلاش میں وہ ضرور کہیں دور نکل گیا ہو گا ــــ"

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ گلی میں قدموں کی مدہم چاپ سنائی دی۔ جیسے کوئی بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا ہو۔ انور یکدم کھڑا ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند نہ کیا ہوا تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اور سراج نئے شکار کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ جعفر اور اکبر بیٹھک کا دروازہ کھول ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ اور انور بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی بھاری بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔ شکار کو دور سے دیکھ کر اس کے جذبات بری طرح مچلنے لگے تھے اور شکار اپنے قبضہ میں دیکھ کر اس میں اتنی طاقت نہ رہی تھی۔ کہ وہ اس کی طرف ایک قدم بھی اٹھا سکے۔ جس پروگرام کے تحت وہ انتظار کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہی پروگرام اب اسے ایک ایسی چکنی اور سیدھی دیوار معلوم ہونے لگا جس پر چڑھنا ناممکن ہو۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے!" جھنجھناہٹ کی تیز لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن وہ آگے قدم نہ اٹھا سکا۔ ڈیوڑھی کے بائیں طرف کا کمرہ شکار کے پرکھنے کے لئے منتخب کیا ہوا تھا۔ شکار کو اس کمرہ میں پہنچا کر سراج بیٹھک میں آ گیا۔ انور گم سم کھڑا تھا۔ سراج مسکراتے ہوئے بولا "ویسے تو کئی شکار ملے تھے۔ لیکن ان میں سے آپ کے لائق کوئی نہ تھا۔ اگر دوسری جگہ ہوتی۔ تو ٹرخا دیتا۔ مگر آپ کی دوستی کا پاس تھا۔ اس لئے اتنی دیر ہو گئی ہے!" اور انور نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کے گھر کا تقدس انجانے راستوں سے اس کے حواس پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ سراج غور سے اس کی طرف دیکھ کر بولا "آپ بھی جا کر شکار کو پرکھ لیں" پھر کچھ سوچ کر اس نے جعفر اور اکبر

آواز دی۔ دونوں مسکراتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوتے۔ جعفر نے مڑتے ہوئے کہا "سراج نے آج کمال کر دیا ہے۔ وہ شکار ڈھونڈ کر لایا ہے کہ تمام عمر یاد کرو گے" اکبر بولا "میرا تو اس کے پاس سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا اگر تمہاری دل شکنی کے ڈر سے آگیا ہوں۔ لیکن دوست رات اگرچہ لمبی ہے لیکن ایسے موقع پر وقت چٹکیوں میں گزر جاتا ہے" اور انور یوں ان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ پر آگیا ہو۔ جہاں پر کوئی اسے نہ جانتا ہو۔ کوئی کی زبان نہ سمجھتا ہو۔ اپنا خیال کسی پر واضح نہ کر سکتا ہو۔ اکبر نے اسے گدگدانے کے لئے کہا "ابھی سے مست ہو گئے ہو۔ جب ایک جھلک دیکھ لو گے۔ تو اس وقت نہ جانے تمہارا کیا حال ہو گا" جعفر بے چین ہو کر بولا "اب باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ انور۔ چونکہ سب بندوبست تمہارا ہے۔ اس لئے پہلی باری تمہاری ہے" اس نے انور کو زبردستی ڈیوڑھی میں دھکیل دیا ——— انور سوچنے لگا۔ چند گھنٹوں کے لئے کرایہ پر حاصل کی ہوئی جوانی سے وہ کس طرح بات کر سکے گا۔ ایسے موقع پر کیسے محبت کا آغاز کرنا چاہیے حالانکہ اس نے اپنے دوستوں سے بیسیوں باتیں سن رکھی تھیں۔ مگر اس وقت اسے کوئی بات یاد نہ آرہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حلق خشک ہو گیا سراج نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کہا "انور صاحب۔ آپ کے یوں جھجکنے سے ہم سب اس کی نظروں میں بدھو بن جائیں گے۔ ورنہ ہماری تو یہی ہے کہ تمہیں ایک ماہر شکاری کی طرح وہاں جانا چاہیئے" اور انور یوں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا جیسے غیر ارادی طور پر اس سے کوئی فعل سرزد ہو گیا ہو۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اور سراج نے اکبر کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "ابھی نیا نیا ہے گھبرا کوئی بات نہیں۔ جلد ہی راستے پر آجائے گا" وہ تینوں انور کے متعلق قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اپنے اپنے تجربے کے مطابق وہ انور کے لئے پن کا اظہار کر رہے تھے۔ بند دروازے کے پیچھے کھیلے جانے والے ناٹک کے پہلے منظر کی ہنسی حجت کر رہے تھے ——— اور پھر یکدم ان کی مسکراہٹیں مٹ گئیں۔ اور تینوں تعجب سے انور کو بیٹھک کے دروازے پر کھڑے دیکھنے لگے۔ اکبر نے تشویشناک لہجے میں پوچھا "کیا بات ہو گئی ہے؟" انور کے چہرے پر ندامت کا تلخ احساس نمایاں تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں نے اسے بھگا دیا ہے"

"آخر کیوں؟" سراج طے شدہ رقم اور وقت کا خیال کر کے بول پڑا۔ انور نظریں جھکاتے ہوئے بولا "اس کا نام ریحانہ تھا"

"کیا مطلب؟" اکبر نے بے چین لہجے میں پوچھا۔ انور نے غمناک آواز میں کہا "میری بہن کا نام بھی ریحانہ ہے" ——— "اب تم سب یہاں سے چلے جاؤ ——— " اور ان تینوں کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ کہ انور کیسے بھیانک معبور سے بچ کر کنارے پر پہنچ گیا ہے۔

افتخار اعظمی

تجدیدِ ستم

(مُدعیانِ چنگیزی و فرعون کے نام)

دہر میں زندہ ہے اُف سنّتِ چنگیز ہنوز! وہی جاری ہے شہنشاہئی خونریز ہنوز!

یہ نظم میں نے ۲۷ دسمبر ۱۹۵۲ء کو لکھی، دسمبر کی تعطیل کی وجہ سے یونیورسٹی بند ہو چکی تھی، رات کا وقت تھا، میں فیض آباد ایکسپریس سے لکھنؤ جا رہا تھا۔ میں جب لکھنؤ جاتا ہوں تو راہِ سفر میں میرے ذہن میں اعزّا اور احباب کی محبّت اور خلوص کی مختلف تصویریں آتی ہیں لیکن اس بار سفر میں میرے ذہن کے پردے پر جو خیالات آئے، وہ مصر، ایران اور پاکستان کے مظالم سے متعلق تھے۔ میں ہر بات برداشت کر سکتا ہوں لیکن ظلم و ستم برداشت کرنا میری فطرت کے خلاف ہے۔ اگرچہ شبِ مہتاب میں ٹرین کا سفر حد درجہ لطف آفریں ہوتا ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ مصر کے حالیہ واقعات ایسے الم انگیز تھے کہ چاند کی روشنی بھی مجھے پھیکی نظر آنے لگی۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ ٹرین رات کی خاموش فضا میں شور مچاتی چلی جا رہی تھی، اور میرے پردۂ ذہن پر مصر و ایران کے بہت سے مظلومین کے تصوّرات چھائے ہوئے تھے یہی تصوّرات آہستہ آہستہ ان نغموں کی صورت میں نمودار ہوئے۔ میں ان نغموں کی تعمیر میں کچھ اس طرح مصروف رہا کہ مجھے سفر کی طوالت اور تھکن کا احساس تک نہ ہوا۔

اس نظم سے قبل آپ وہ نظم بھی دیکھیں جو میں نے مصر کے انقلابِ جدید سے متعلق لکھی ہے۔ یہ انقلابِ جدید اخوان* کی کوششوں سے جنرل نجیب کی قیادت میں ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ ان دونوں نظموں سے شاعر کے تاثرات اور تصوّرات دونوں کا اندازہ ہو گا۔

افتخار اعظمی

روشِ افرنگ کی سیکھی ہے کہاں سے تم نے جو بھی حق بات کہے اس کو گرفتار کرو
یہ بھی اندازِ محبّت ہے تمہارا کیا خوب خاطرِ دوست نہیں خاطرِ اغیار کرو
وادیٔ غرب میں جو فتنے ہیں خوابیدہ ابھی وادیٔ شرق میں اس شان سے بیدار کرو
مدّتوں سرد رہا مصر کا بازارِ ستم تم جو آئے ہو تو پھر گرم یہ بازار کرو

تا بہ کے آہ! یہ آئینِ ہلاکت آموز؟
زندہ ہے مصر میں اُف سنّتِ فرعون ہنوز

مصر سے تا بہ کراچی ہوئی تجدیدِ ستم گو وہ شاہانِ ستم کیش نہیں ہیں نہ سہی
کیوں نہ ظاہر ہو ابوالہول کے چہرے پہ نشاط مصر میں تازہ ابھی تک ہے وہی رسمِ شہی
خوش ہیں مغرب کے جفا کیش کہ اب مشرق سے رسمِ تہذیب اٹھی عظمتِ انساں نہ رہی
کیا قیامت ہے کہ ایران سے تا مصرِ جدید جوئے خوں بادۂ گلرنگ کے مانند بہی

کیا عجب دہر میں پھر آئے وہی بادِ بہار
جس سے ہو آتشِ نمرود گلستاں بکنار
سینۂ نیل سے تازہ کوئی طوفاں نہ اٹھے
مصر کی خاک سے پھر موسیٔ عمراں نہ اٹھے

افتخار اعظمی

مصر کا انقلابِ جدید ۱۹۵۲ء

سُن رہا ہوں نیل کی وادی سے پھر ابرِ کرم
اُٹھ رہا ہے اپنے دامن میں لئے دیدِ عدن
صبحدم گلشن میں یہ کہنے لگی بادِ صبا
مصر میں شاید پھرے اب قسمتِ سرو و سمن
شاخِ گل سے ایک طائر نے چہک کر یہ کہا
کاش! پھر "شاداب" ہو جائے وہی "نخلِ کہن"!
جس کا سایا ہے خنک ابرِ بہاری کی طرح
جس کے طائر ہیں بڑے شیریں زباں شیریں سخن
خستگانِ راہ کو دیتا ہے جو لطفِ سکوں
دُور کر دیتا ہے جو دم بھر میں سب رنج و محن
کاش! پھر شاداب ہو جائے وہی نخلِ کہن!

ندیم مرادآبادی

حُسن ہے چشمِ آگہی کے قریب
آ گیا عشق زندگی کے قریب

بیخودی تو نہیں خودی کے قریب
تیرا جلوہ ہے زندگی کے قریب

اللہ اللہ مقامِ دیدہ و دل!
آ گئے منزلِ خودی کے قریب

زندگی نغمہ و فغاں تو نہیں
ڈھونڈیئے کیوں غم و خوشی کے قریب

موت سے مل سکا ہے کس کو مفر
موت تو خود ہے زندگی کے قریب

دیکھنے والے خوابِ عشرت کے!
غم بھی موجود ہے خوشی کے قریب

آئینہ ڈھونڈتی ہے رعنائی
محوِ حیرت ہوں میں کسی کے قریب

آج تک وہ سمجھ سکے نہ ہمیں
اک اندھیرا ہے روشنی کے قریب

کوئی حرمانِ غم ندیمؔ نہ تھا
یعنی جب ہم تھے زندگی کے قریب

شوکت تھانوی

ایک ملازم کی ضرورت ہے

جی ہاں ۔ ایک ملازم کی ضرورت ہے جس کے لئے پہلے تو بہت
ں شرطیں تھیں کہ ذرا معقول قسم کا کھانا پکانا جانتا ہو ۔ ایماندار ہو ۔ صاف
ھری عادتیں ہوں ۔ اس کی زبان دراز نہ ہو کسی نشے کا عادی نہ ہو
زا یافتہ نہ ہو ۔ خوبصورت نہ سہی مگر بجید بدصورت نہ ہو ۔ عمر ایسی نہ ہو کہ
ورش کا بار بھی ہم پر ہی پڑے اور نہ ایسی کہ تجہیز و تکفین کے اخراجات
ں ہمارے ہی سر آئیں ۔ کسی متعدی مرض میں مبتلا نہ ہو علی الحساب
احب اولاد نہ ہو ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اب امتداد زمانہ سے صرف ایک
رط باقی رہ گئی ہے کہ وہ محض طوطا چشم نہ ہو ۔ باقی سب کچھ منظور رہ
ی اس کا مہاجر ہونا تو منظور ہے مگر وہ مستقلاً ہجرت کا عادی نہ
یا ہو ۔ اٹھاؤ چولھا نہ ہو ۔

بات یہ ہے کہ صاحب ناک میں دم ہو گیا ہے تقسیم ہند کے
ند سے کچھ ایسا قحط الرجال کا عالم ہے کہ ایک بھی ڈھنگ کا ملازم کم
ے کم ہم تو نصیب نہیں ہوا ۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا ملازم
پنے نئے حالات کے ساتھ ہمارے لئے نت نئی مصیبتیں لیکر نازل
دجاتا ہے اور عین اس وقت جب کہ ہم ہر طرح کی نفس کشی کے بعد
پنے کو اس کی کوتاہیوں کا خوگر بنا چکے ہیں وہ داغ مفارقت دیکر
ور ایک آدھ برتن ، کچھ کپڑے تھوڑے روپے وغیرہ لیکر غائب ہو جاتا
۔ یہ سچ ہے کہ ان چیزوں کے جانے سے نہ ہم لٹ جاتے ہیں ۔ نہ یہ
ئی ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے ۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ
ماری نظروں میں جنس وفا کی اب کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے
ور ہماری قوت فیصلہ جواب دے چکی ہے کہ اب اس دنیا میں کس
و با وفا سمجھیں اور کس کو بے وفا ۔

ایک سے ایک پیکر وفا اور مظہر صدق و صفا تشریف لاتے
یں جن میں سے بعض کی آنکھوں میں تو نور کی جگہ بھی مروت ہی چھلکتی ہوئی
نظر آتی ہے ۔ وفاداریوں کا اظہار وہ زبان سے کرتے ہیں باقی اپنے
چہرے سے ٹپکاتے ہیں ۔ آنکھوں سے برساتے ہیں اور آخر کار اس کا
قائل کر دیتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی یہ دنیا اب ایسی بھی
وفا سے خالی نہیں ہے ۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد سے تقریباً یہی
ہو رہا ہے کہ ہمارے ملازموں کی دنیا آنی جانی بنی ہوئی ہے ۔ اور
فراست الید کے ایک ماہر نے ہاتھ دیکھ کر اب تو یہ بھی بتا دیا ہے کہ
بابا تیری قسمت میں ملازم نہیں ہے اس لئے کہ ہاتھ میں سب لکیریں
ہیں ملازم کی لکیر ایک سرے سے ہے ہی نہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد سے یہ صورت اس لئے پیش آ رہی ہے
کہ تقسیم ہند تک ہمارے پاس جو بزرگ محترم تھے وہ اس تقسیم کے بعد
ہم سے اس طرح بچھڑ گئے گویا باؤنڈری کمیشن نے ہمارے اور ان کے
درمیان ایک خط کھینچ کر ان کو ہم سے چھین کر ہندوستان کو بخش دیا
اور ہم کو مجبور کیا گیا کہ ہم نئے ملازم کی جستجو شروع کریں ۔ مگر اس سلسلے
میں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا تیسرے ہی دن عین اس وقت جبکہ
ہم ہوٹل کا کھانا کھانے کے بعد نمک کے پانی سے غرغرہ کر رہے تھے
تاکہ بازار کے گھی کی وجہ سے حلق کو کوئی مستقل نقصان نہ پہنچ جائے ہم کو
یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ ملازمت کا امیدوار آیا ہے ۔ حالانکہ وہ نہیں
بلکہ اس کے امیدوار ہم خود تھے ۔ ہم دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہوئے باہر
آئے ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک عجیب الخلقت درویش صورت بزرگ
صورت کھڑے ہوئے بیڑی پی رہے ہیں اور دوسری جلی ہوئی
بیڑی ان کے کان میں لگی ہوئی ہے اس بدتمیزی کے ساتھ بیڑی
پینا ہم کیونکر برداشت کر سکتے تھے ڈانٹنے ہی والے تھے کہ دل نے
کہا ع

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

لہٰذا نہایت ادب سے خود ان کو سلام کرکے دریافت کیا: "کیوں بھئی نوکری کروگے؟"

جواب کا استغنیٰ ملاحظہ ہو: "مل جائے نوکری لیں گے۔ ورنہ گویا گھر کے رئیس تو ہیں ہی۔"

عرض کیا: "کھانا پکانا جانتے ہو؟"

جواب ملا: "جانتے کیوں نہیں ہیں"

عرض کیا: "اکیلے ہو یا بال بچے بھی ہیں"

فرمایا: "میاں کچھ بال بچے بھی ہیں مگر یہاں میں اکیلا ہی ہوں۔ تنخواہ کیا ملے گی؟"

عرض کیا: "بھئی تنخواہ کا فیصلہ تو تمہارا کام دیکھ کر ہو سکتا ہے تم آج کھانا پکا کر دکھاؤ اس کے بعد ہم تمہارا اندازہ کر سکیں گے۔"

وہ راضی ہو گئے اور ان کو باورچی خانے کا چارج دیکر سمجھا دیا گیا کہ اس وقت کھانے میں یہ چیزیں تیار کرنا ہیں۔ جو کچھ بھی سامان وہ طلب کرتے رہے ان کو ملتا رہا اور ہم سب خدا کا شکر ادا کرتے رہتے کہ کہ ملازم کے سلسلے میں جن پریشانیوں کا اندازہ تھا کم سے کم ہم کو ان سے دوچار ہونا نہیں پڑا اور شکر ہے خداوند تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے خزانۂ غیب سے ہم کو ایک ملازم عطا کر ہی دیا آج یہ معلوم ہو رہا تھا گویا ہم سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلسل یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس کا منہ دیکھ کے اٹھے تھے۔ خدا کی دین کا موسیٰ سے احوال پوچھنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ خود ہی قائل ہو رہے تھے کہ وہ چھپر پھاڑ کر ملازم دیتا ہے۔ اگر کوئی ملازم کے متعلق ذرا بھی ان کی شان سے گری ہوئی بات کرتا تھا تو اس کی جان کو آ جاتے تھے۔ بھائی جان نے باورچی خانے کا چکر لگا کر کہا "باورچی تو یہ خاک بھی نہیں ہے صورت سے تو چڑیمار نظر آتا ہے۔"

ہم نے جل کر کہا "مصیبت تو یہ ہے کہ آپ کے یہاں باورچی بھی وہی ہو سکتا ہے جو حسن کے مقابلے میں انعام پا چکا ہو۔"

بیگم صاحب نے کہا "مجھے تو اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔"

ہم نے کہا "سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ آنکھوں کی سرخی بھی ایک حسن ہے۔" ؎

گلابی ان آنکھوں میں سرخی کے ڈوڑے
مئے آتشیں رنگ کے دو کٹورے

آپا نے کہا "چاہئے تھا کہ پہلے اس کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا دیتے پھر کھانا پکواتے۔ کس قدر گندہ ہے کمبخت۔"

ہم نے ڈر کر کہا "خدا کے لئے اتنے زور سے کمبخت نہ کہیئے اگر سن لیا اس نے تو دل شکنی ہو گی۔"

کھانے کے وقت تک اس کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کے تصور سے معدے کو مشتعل کرتے رہے اور کھانے کے وقت سارا گھر ایک ہی دسترخوان پر جمع ہو گیا۔ دسترخوان سجایا گیا۔ سب سے پہلے ہم نے قورمہ نکالا۔ اس قورمے کی سب سے پہلی خصوصیت تو باورچی نے یہ رکھی تھی کہ وہ صورت سے قورمہ نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے شاہی دسترخوانوں کا حال پڑھا ہوگا کہ یہ شاہی باورچی کھانا پکانے سے زیادہ کرتب دکھاتے اور گویا پہیلیاں بجھاتے تھے۔ مثلاً آصف الدولہ بہادر کے باورچی نے ان کو اپنے سمدھی کے سامنے محض اس لئے سرخرو کر دیا تھا کہ سمدھی صاحب قورمے کو مربہ سمجھ کر کھا گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ مربے ہی کی صورت کا تھا۔ غالباً یہی آرٹ ہمارے اس باورچی نے اس قورمے میں صرف کیا تھا کہ وہ قورمے کے بجائے ہو بہو رسا دل نظر آ رہا تھا۔

بھائی نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا "یہ کیا چیز ہے خانساماں؟"

بڑے فخر سے خانساماں نے فرمایا "کاری بیگم صاحبہ"۔۔۔

ہم نے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا کہ یا اللہ یہ کونسی کاری ہے کاریگری کے تو خیر ہم قائل ہی ہو چکے تھے۔ مگر کاری کی تشخیص باقی تھی اور زیادہ تر خیال یہ تھا کہ یہ صورت سے کچھ مدکچی اور کچھ چیرے نظر آ رہے ہیں۔ لہٰذا ہو نہ ہو یہ آبکاری۔ ہم ابھی اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھے کہ آواز آئی "آخ تھو"

بیگم صاحبہ نے منہ بناتے ہوئے کہا "توبہ ہے اتنا نمک تیزاب کر دیا شوربے کو بالکل۔"

اب ہم جو چکھتے ہیں تو واقعی معلوم ہوا کہ سالن میں نمک ڈالنے کے بجائے ان حضرت نے نمک کے سالن میں گوشت ڈال دیا ہے

خیر یہ تو ممکن ہے کہ اس بیچارے نے خود اپنے کو بعد نمک خوار بنانے کے لئے ایسا کیا ہو۔ مگر اس کے علاوہ جو دوسری خصوصیات تھیں ان کو ہماری سمجھ بھی نہیں سکتا۔ البتہ چونکہ ہم اس عرصے میں ایک سے ایک بدمزہ کھانا کھا چکے تھے۔ لہٰذا اس قورمے کو چکھ کر تو دنگ رہ گئے۔ اس میں گوشت کا مزہ مع اپنی خوشبو کے بالکل علیحدہ تھا۔ مسالے کے تمام اجزا اپنا انفرادی رنگ اور ذائقہ رکھتے تھے گھی سب سے الگ تھا اور بحیثیت مجموعی معلوم ہوتا تھا کہ قورمہ پکانے کے بعد اس کو غسل دیا گیا ہے پھر وہ نہایا دھویا قورمہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ کباب توڑنا چاہا تو پتہ چلا کہ ابتک سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود کباب توڑنے کے لئے اوزار وضع نہیں ہو سکے دوسرے پتھر کے کباب کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ معلوم نہیں یہ کباب کھانے کے لئے تھے یا سر پھوڑنے کے لئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قاب میں ترازو کے باٹ رکھے ہوئے ہیں اور ان کو اٹھاتے ہی غالب کا یہ مصرعہ خود بخود یاد آ جاتا تھا۔

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بمشکل تمام طے کیا کہ فیرنی پر ہم اکتفا کرینگے۔ مگر اس کا پہلا چمچہ سانپ کے منہ چھچھوندر بن گیا۔ معلوم ہوا کہ دھوبی کے کلف میں منہ جا پڑا ہے اور منہ میں پہلے سے کوئی میٹھی چیز تھی انا للہ وانا الیہ راجعون جب سارا گھر فاقہ سے اٹھ گیا اور خود ہمارے محسن خانساماں صاحب بھی کھانا کھا کر فارغ ہو گئے تو آپ اس کارگذاری کی روشنی میں معاملات طے کرنے کے لئے بیڑی پیتے ہوئے تشریف لائے اور سر کھجاتے ہوئے بولے

"اچھا جی۔ تو پھر بات ہو جائے"

ہم اس عرصہ میں طے کر چکے تھے کہ اگر یہ حضرت خود تنخواہ دیکر یہ کھانا کھلانے پر نوکر رکھنا چاہیں تو بھی ہم ان سے صرف جان کی اماں چاہیں گے۔ مگر دیکھنا تو یہ تھا کہ خود ان کی اپنے متعلق کیا رائے ہے لہٰذا عرض کیا "ہاں بھئی تو شرطیں کیا ہیں۔ تمہاری؟"

وہ بولے "تنخواہ تو میں تیس روپے اور کھانے سے کم نہ لوں گا اس کے بعد میں یہی کپڑا اوڑھا رہ جاتا ہے وہ تو دیدیا کیجئے گا اور بیڑی کے دو بنڈل روز کے نائی اور دھوبی کا خرچ تو مالکوں کے سر ہوتا ہی ہے اور شرطیں کیا ہوں گی"

عرض کیا "رہیں گے کہاں جناب اور کچھ بستر وغیرہ ہے یا نہیں"

بڑے توکل کے ساتھ فرمایا "رہنے کا کیا ہے۔ یہیں رہ جائیں گے اور بستر تو آپ کو دینا ہی پڑے گا"

اب ہم نے نہایت ادب سے ان کو سمجھا دیا کہ بندہ نواز اول تو آپ کا انسان ہونا ہی مشکوک ہے۔ خدا جانے آپ کن جانوروں میں اب تک رہے ہیں۔ دوسرے باورچی تو آپ ایک سرے سے ہیں ہی نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ انسانیت کے جامے میں رہ سکیں تو آپ کو نام کام کاج کے لئے رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً گھر کی صفائی۔ جوتوں پر پالش کرنا۔ بچوں کو اسکول پہنچا دینا۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں لا دینا وغیرہ اور اس کی تنخواہ آپ کو فی الحال بیس روپے مل سکے گی۔ حادثہ ہوا کہ وہ راضی ہو گئے اور رہنے لگے گھر میں۔ دوسرے دن ان کو حجامت اور غسل وغیرہ کے ذریعے ادرہال کیا گیا اور اب وہ تین چار گز کے فاصلے سے کچھ انسان نظر آنے لگے۔ مگر تھے وہ مبارک قدم۔ اس لئے کہ دوسرے ہی دن باورچی آ گیا۔

غالباً چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک بائیسکل جو ملازموں کے لئے رہتی تھی، دس روپے کا ایک نوٹ جس میں سے ان کو چائے کا ڈبہ لانا تھا۔ ایک کھیس جو وہ اوڑھے ہوئے تھے لیکر جو غائب ہوئے ہیں تو آج آتے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ تو لکھوادی ہے مگر پولیس والوں کے پاس ایک یہی کام تو ہے نہیں کہ ان کے ہجر سے بیقرار ہو کر ان کی جستجو شروع کر دیں۔ ان کے جانے کے بعد باورچی صاحب نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیئے۔

اس رنگ بدلنے پر یاد آیا کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ شاید اتنا رنگ نہیں بدلتا۔ جتنا یہ ملازم ملازم کو دیکھ کر رنگ بدلتے ہیں اب ان خانساماں صاحب نے غالباً اس بات پر غور کیا ہوگا کہ اس ناکارہ ملازم کو حسن خدمات کا یہ صلا مل سکتا ہے کہ وہ ایک سائیکل، دس روپے اور ایک کمبل لیکر غائب ہو جائے تو میرا حق یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے یا غالباً یہ خیال آیا کہ اب تو لے دیکر میں ہی اکلوتا ملازم رہ گیا ہوں اور یہ بابا لوگ کے والدین آقا لوگ اس بات پر

تھے کہ میری نازبرداریاں کریں لہٰذا اسی شام کو ان حضرت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اختلاج کا دورہ پڑا اور وہ سیدھے ہمارے پاس تشریف لائے۔ صاحب میں مجبور ہوں۔ اختلاج کا پرانا مریض ہوں اور جب دورہ پڑ جاتا ہے تو مجھ سے پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔

عرض کیا "بھئی تم کچھ نہ کرو۔ آرام کرو۔"

کہنے لگے "صرف اس سے تو کام نہیں چلے گا۔ اختلاج میں گاجر کا حلوہ مفید ہوتا ہے اور میرے مزاج کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو

نہایت عاجزی سے عرض کیا "یہ تو ٹھیک ہے مگر انصاف شرط ہے۔ اب گاجر کا حلوہ کون بنائے۔ گاجریں کون لائے رہ گئی یہ بات کہ مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ کو معلوم ہو کہ ہم ویسے ہی آپ کے چشم و ابرو کے اشاروں کے تابعدار واقع ہوئے ہیں۔"

کہنے لگے "دام مل جائیں تو گاجر کا حلوہ بھی برابر والی کوٹھی کے خانساماں سے بنوا لوں گا۔

غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ یہ برابر والی کوٹھی کا خانساماں ہمارے کچھ سوتیلے عزیزوں میں سے ہے بقصور صرف اتنا ہے کہ یہ حضرت پہلے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے اور چونکہ ہم نے ان کی یہ شرط منظور نہ کی تھی چار مہینے کی تنخواہ پیشگی دیدیں لہٰذا وہ بس اتنی سی بات پر ایسے ناراض ہوئے ہیں کہ اب مستقل طور پر ہمارے ہر ملازم کو بھڑکاتے ہیں۔ مگر اس وقت مقطع میں کچھ ایسی سخن گسترانہ بات آ پڑی تھی کہ ہم نے چپکے سے گاجر کے حلوے کے دام خانساماں صاحب کو دیدیئے حالانکہ اس کے باوجود برابر والی کوٹھی کے خانساماں نے ان حضرت کو ہمارے یہاں سے رفو چکر کر دیا۔ اور یہ حضرت بھی دغا نہ کر سکے

دوسرے دن ہم اپنی محرومی قسمت پر بیٹھے غور ہی کر رہے تھے کہ ایک بزرگ محترم جو غالباً کسی مدرسہ کے ملا یا کسی مسجد کے مؤذن ہونگے آئے اور "السلام علیکم" کا نعرہ بلند فرما کر ٹوٹ پڑے

عرض کیا "وعلیکم السلام! کیسے زحمت فرمائی؟"

مولانا نے فرمایا "سنا ہے آپ کو نوکر درکار ہے"

اب تو اور بھی حیرت ہوئی کہ اب تک تو خواجہ خضر بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھایا کرتے تھے اور اب یہ ملازم بھی دلوانے لگے۔ ہم نے اپنے آپ کو سراپا شکر بنا کر عرض کیا "جی ہاں ضرورت تو ہے کیا آپ کی نظر میں کوئی ملازم ہے اور آپ تشریف تو رکھئے اس کرسی پر۔"

مولانا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا کام کرنا ہوگا؟"

عرض کیا "حضرت بس کام یہی ہے کہ کھانا پکانا جانتا ہو۔ ذرا ایمان دار ہو۔

مولانا نے ریش اقدس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ایماندار؟ ایمان اگر نہیں ہے تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ میں حرام سمجھتا ہوں، بے ایمانی کو۔"

عرض کیا "حضرت آپ سے کیا مطلب میں ملازم کے متعلق کہہ رہا تھا۔"

مولانا نے فرمایا "میں خود ہی تو ملازمت کے لئے آیا ہوں۔"

ایک مرتبہ "جی" کہہ کر ہم پہلے تو اچھل پڑے۔ پھر خیال آیا کہ ایسے مقدس بزرگ کو ملازم رکھنا سوائے بے ادبی اور گستاخی کے کیا ہو سکتا ہے۔ مگر پھر سوچا کہ ممکن ہے یہ کوئی فرشتۂ رحمت ہو جو ملازم کے روپ میں آ گیا ہے اور اس کے پکائے ہوئے کھانے کا قیامت میں حساب نہ دینا پڑے۔ دیر تک سوچنے کے بعد اب یہ فکر کہ یہ حضرت کرسی پر اس ٹھاٹھ سے برابر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آئندہ بھی ان کو اسی قسم کے سلوک کی توقع ہوگی۔ لہٰذا عرض کیا "بڑے میاں بات یہ ہے کہ تمہارے انداز کچھ ملازموں کے ایسے معلوم نہیں ہوتے کہیں اور بھی نوکری کی ہے؟"

کہنے لگے "کیوں نہیں مدرسہ کاظمیہ کے دارالاقامت میں مدت سے نوکر تھا۔"

پوچھا "آپ کی شرائط کیا ہیں؟"

کہنے لگے "تنخواہ اور کھانا تو بعد میں انشاء اللہ طے ہو جائیگا مگر ایک بات ہے کہ میں کھانا آپکے ساتھ کھاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ وقت پڑ گیا ہے ورنہ میں خود اعلیٰ خاندان سے ہوں۔

وہ تو ہم کرسی پر بیٹھنے کے انداز ہی سے سمجھ گئے تھے مطالبہ اس کا جائز تھا اسلامی مساوات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ مگر اب کیا

عرض کیا جائے کہ ان معاملات میں ہم لوگ کس قدر مسلمان رہ گئے ہیں۔ بہر حال سوال تو اس وقت یہ تھا کہ ان حضرت کو جواب کیا دیا جائے؟ بمشکل تمام خیال آیا کہ جھوٹ ہی بول دیں۔ عرض کیا "بھائی بات یہ ہے کہ اس وقت ایک اور ملازم آرہا ہے۔ اس کو میں وعدہ کر چکا ہوں اور ایفائے عہد کا بڑا درجہ رکھا ہے۔ ہمارے اسلام نے لہٰذا آپ کل پرسوں تک پوچھ لیجئے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو دیکھا جائے گا۔

وہ فرشتہ صورت بزرگ تو چلے گئے مگر ان کے جاتے ہی واقعی ایک اور ملازم آ گیا جو صورت سے تو خیر معدار معلوم ہوتا تھا۔ عمر بھی خاصی تھی۔ مگر ہاتھ پیروں میں ابھی دم معلوم ہوتا تھا۔ گفتگو کی تو پتہ چلا کہ حواس خمسہ میں صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ سوجھتا بھی کم ہے۔ سنتے بھی برائے نام ہیں اور بولتے بھی وہ زبان ہیں جس کا بس مفہوم ہی ٹٹولا جا سکتا ہے ہم نے کہا چلو کچھ نہیں سے کچھ ہے بہر حال بہتر ہی ہوتا ہے۔ تنخواہ طے کر لی۔ مزید شرائط بھی کچھ نہ تھے۔ بیچارہ بے عذر سا نظر آتا تھا اور چونکہ کوشش یہ تھی کہ اب ان حضرت کا دل ہاتھ میں رکھ کر ان کو اپنے اخلاق کا گرویدہ بنائیں گے۔ تاکہ یہ اخلاقی زنجیروں میں جکڑ جائیں لہٰذا ان کو چچا میاں کہنا شروع کر دیا۔ وہ حضرت یہ سن کر کچھ اس شفقت سے مسکرائے جس کا فارسی میں ترجمہ ہوتا ہے۔

زقدر شوکت سلطاں نگشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

چلئے سر سے ایک بار اتر گیا۔ صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اب یہ بھاگ نکلنے اور طوطا چشم بننے والا آدمی نہیں ہے۔ بیچارہ پڑا رہے گا گھر میں سب کو منع کر دیا کہ اس کی بزرگی کا خیال رکھا جائے اور کوئی زیادتی نہ ہو

دوسرے دن جو دفتر سے آئے تو گھر میں ہر ایک کے چہرے پر ایک عیارانہ قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آپا نے صورت دیکھتے ہی کہا "اب آئے گا مزہ نوکر رکھنے کا۔ اور کہو چچا میاں وہ اب پوری خدمت کرائیں گے۔

بھابی بولیں "ہم میں سے تو کسی کے بس کا روگ ہے نہیں اب یہ ہی تازہ روٹیاں پکا پکا کر کھلایا کریں گے۔

ہم نے حیرت سے پوچھا "آخر کچھ معلوم تو ہو یہ معمہ کیا ہے؟"

بیگم صاحبہ نے ہنس کر کہا "اطمینان سے بیٹھئے تو ان بڑے میاں کی شرطیں سنائی جائیں۔

ہم نے گھبرا کر کہا "یعنی ان کی بھی کچھ شرطیں ہیں۔ آپ بتلائیے میں اطمینان سے ہوں"

معلوم ہوا کہ بڑے میاں نے اپنے متعلق سب کو نوٹس دے دیا ہے کہ چونکہ میں تنفس کے مرض میں مبتلا ہوں لہٰذا چاول بالکل نہیں کھا سکتا حالانکہ یہ بات ہم سے کہنے کی نہ تھی بلکہ راشن بندی کے حکام سے کہنے کی تھی جو نصف چاول دیتے ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کوئی بادی چیز کوئی کھٹی چیز، کوئی مرچ کی چیز یا تیل کی چیز ہرگز نہیں کھا سکتا۔ میرے لئے آدھ پاؤ گوشت اِس وقت اور آدھ پاؤ اس وقت علیحدہ پکے گا۔ بے مرچ اور بے کھٹائی کا روٹی میں کھانے کے ساتھ اس طرح کھا سکتا ہوں کہ گرم گرم اترتی جائے اور میں کھاتا جاؤں۔ لہٰذا سب کے لئے تو خیر میں پکا دوں گا اس لئے کہ نوکر جو ٹھہرا۔ مگر میرے لئے کسی اور کو یہ تکلیف کرنا پڑے گی۔ صبح کی چائے مجھ کو نہ دی جائے اس کے بجائے ایک پیالی دودھ پی لیا کروں گا۔ رات کو نو بجے تک میں آپ کا ملازم ہوں اس کے بعد بستر سے ہرگز نہ نکلوں گا۔ سورج نکلنے سے پہلے مجھ کو کبھی نہ اٹھایا جائے ورنہ درد سر ہو جاتا ہے

تفصیلات ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ ہم نے بڑے زور سے پکارا "چچا میاں"

بڑے میاں نے آ کر نہایت راز داری سے پوچھا "کیا مجھ کو بلایا تھا"

عرض کیا "جی ہاں دریافت یہ کرنا تھا کہ پاگل خانہ میں آپ رہ چکے ہیں یا اب جانے کا ارادہ ہے؟"

اور پھر جو یہ سنی ہوئی شرطیں ان کو سنائیں تو وہ ان پر اڑے رہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب ان حضرت سے کیا کہیں اور نہ کہیں تو کیا کریں ارادہ کر رہے ہیں کہ ان کو ایک پرچہ صرف یہ مصرعہ لکھ کر بھیج دیں کہ

نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

مگر کیا واقعی ہمارے ہاتھ میں ملازم والی ریکھا ہے ہی نہیں ایک سرے سے؟

(بشکریہ "حریم")

شاہد العارفی

گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا

میں اسلام پر ناروا اور رکیک حملے

سوویت رہنماؤں کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ آئے دن اپنے لاتعداد تشہیری ذرائع سے روس میں آباد مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کے عقائد جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ کمیونسٹ حکومت دنیا سے اسلام اور اس کے ماننے والوں کا نام و نشاں تک مٹانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھی ہے، پہلے پہل حاکم بننے کے زعم اور فوری جوش کے ماتحت وہ عقل و خرد سے بیگانے ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد مذہب پرستوں، خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا، اس نے بہتوں کے ایمان متزلزل کر دیئے، کچھ سہم کر خاموش رہ گئے اور بقیہ مخفی طور پر اپنے دلوں میں شمع ایمان روشن کئے رہے بہرحال مذہب کی آندھی نے ہر دوسرے مذہب کے بقا و دوام کو مخدوش بنا دیا۔ مسلمانوں نے تو ان سب دینوں کے خلاف اعلانیہ جنگ کی تھی، لیکن ان کی ایک نہ چلی اور وہ محکوم بنا لئے گئے۔

کمیونسٹ حکومت کے اپنے قیام کے وقت سے لیکر آج تک اسلام کے علمبرداروں کے قتل اور اس کے ماننے والوں پر سفاکیوں سے باز نہیں آئی انہیں تمدنی اور اقتصادی بحران کا شکار بنا کر مرتد کیا جا رہا ہے۔ گو جنگ کے دوران مذاہب کے خلاف پروپیگنڈا ایک معمولی سی مدت کے لئے روک دیا گیا تھا لیکن اسلام اس وقت بھی بری نہیں کیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد انھوں نے مشرق پر اثر انداز ہونے کے لئے سفاکی کے اس دھانے پر ایک کمزور بند ضرور باندھا لیکن کمیونسٹ رہنماؤں کی صدا دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز نہ ہو سکی، اور وہ بند دوبارہ توڑ دیا گیا۔ یہی سلسلہ اب شدت کے ساتھ جاری ہے مسلم علاقوں میں ریڈیو سے بلا ناغہ "اسلام اور اس کا رجعت پسندانہ رول" کے زیر عنوان تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ روسی مطبوعات میں مذہب اسلام اور اس کے پیروکاروں پر کیچڑ اچھالنا اور اس کے پیشوا کو انتہائی گندے الفاظ سے خطاب کرنا ان کا شعار بن چکا ہے۔

گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کی جدید اشاعت میں جہاں دوسرے مذاہب اور ان کے پیشواؤں پر رکیک حملے کئے گئے ہیں، وہیں اسلام اور حضرت محمدؐ کو بھی بہتان تراشیوں اور بے سر و پا باتوں کے اس طوفان میں لپیٹ لیا گیا ہے۔ اسلام کے متعلق اتنی غلط بیانی اور اس کی اس قدر تضحیک کی گئی ہے کہ بھاری بھرکم ایمان قاری پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی رسوائے زمانہ کتاب کے چند جملے نقل کرتے ہیں، جو اسلام کی تعریف کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ (حوالے کے لئے دیکھئے: بولشایا سوویتسکایا انتسکلوپیڈیا (سوویت قاموس العلوم کلاں) ۱۹۵۳ء، جلد ۱۸، صفحہ ۵۱۶ تا ۵۱۹)

اسلام کے متعلق تشریح کی ابتداء یوں کی گئی ہے:-

"اسلام: (عربی۔ اطاعت و فرمانبرداری) یا محمدیت۔ ایک مذہب جس کی بنا ساتویں صدی کی ابتدا عرب میں پڑی۔ جو بعد میں عرب فتوحات کے نتیجہ میں مشرق قریب و وسطیٰ، شمالی افریقہ، جنوب مشرقی ایشیا، مشرق قریب کے کچھ حصوں میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ایک رجعت پسندانہ کردار ادا کیا ہے۔ یہ لنفع اندوزوں کی جانب سے محنت و مشقت کرنے والوں کے لئے ایک روحانی جبر و تعدی کا ہتھیار ہے۔ اسے غیر ملکی نوآبادکاروں کی جانب سے مشرقی عوام کو غلام بنانے کے لئے رائج کیا گیا تھا۔"

اسلام کی نشو و نما کی بابت یوں لکھا ہوا ہے:-

"عرب میں طبقاتی سماج کے قیام کی وجہ سے مقامی قبائل

میں ایک اقتصادی اور سماجی بحران ترقی پذیر تھا جس کا نتیجہ اسلام کی ترقی تھا، جو (اسلام) سماجی اور اقتصادی عدم مساوات اور استحصال بے جا کرنے کے طریق کو روا رکھنے کے لئے نعرہ زن تھا۔"

مضامین قرآن مجید کا ذکر کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف رقمطراز ہے:۔

"اللہ (مسلمانوں کا خدا) خاتمہ جہاں" اور خطرناک انصاف" کی جلد آمد کی پیش گوئی کرتا ہے اور منکرین و منحرفین کو جو اسے بحیثیت قادرِ مطلق نہیں مانتے، دوزخ کے عذاب کے ذریعہ دہشت زدہ کرتا ہے۔ اللہ صابروں اور فرمانبرداروں سے وعدہ کرتا ہے کہ موت کے بعد جنت میں ان کے لئے شہوانی عیش و عشرت کا کامل سامان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (قرآن) نقشہ کشی کرتا ہے کہ عدم مساوات ملکیت اور غلامی تمدنی لحاظ سے فطری عمل ہے جو اللہ کی جانب سے قائم کی گئی ہے اور اسی لئے کسی ردو بدل کی محتاج نہیں۔"

انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کی توسیع کی اصل وجہ آگ، تلوار اور جبر و تشدد بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حج، زکوٰۃ، کعبہ، سنت، شریعت، سنی شیعہ، صوفیت، حدیث اور کرامت کی تصریح میں بھی بدترین خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

(مرسلہ ڈیموکریٹک ریسرچ سروس، بمبئی)

نئی سوویت انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کو ایک ایسا رجعت پسند مذہب قرار دیا گیا ہے، جسے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقہ نے ایجاد کیا، ترقی دی اور قائم رکھا۔ یہ انسائیکلوپیڈیا سوویت یونین کے طول و عرض میں تمام مدارس اور کتب خانوں میں رکھی جارہی ہے۔ روس کے مسلمان علاقے کے مدارس اور کتب خانے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا سوویت نظریہ کے مطابق تاریخ کی ایسی تشریح ہے جس کو سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ اس میں روس کے تمام اساتذہ کے لئے ایک ایسا راستہ تجویز کر دیا گیا ہے، جس پر سب کا چلنا لازمی ہے۔ تعلیم چونکہ حکومت کے ہاتھ میں ہے اس لئے اساتذہ و طلباء کے لئے صرف یہی سرکاری اور اشتراکی تشریح قبول کرنا ضروری ہے۔

ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"عرب میں طبقاتی معاشرہ کی تشکیل کے بعد معاش اور معاشرتی لحاظ سے مقامی قبائل میں ایک ہنگامی صورت پیدا ہو گئی تھی، جس کا نتیجہ اسلام کی شکل میں نکلا، تاکہ اس طرح لوٹ کھسوٹ کے قائم ہونے والے نظام کی معاشرتی اور معاشی عدم مساوات کو صحیح قرار دیا جاسکے۔"

"قرآن میں پر زور طریقہ پر اور مسلسل غلامی کی حمایت کی گئی ہے اور اسے حق بجانب قرار دیا گیا ہے نیز لوٹ کھسوٹ کرنے جاگیرداری رکھنے اور عدم مساوات کو قائم رکھنے کی حمایت کی گئی ہے۔"

کمیونزم مذہب کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس نے اپنے دائرۂ اقتدار کے اندر بڑی شدت سے مسیحیت کا استیصال کیا" اور اس ترکی علاقے میں، جو سیانکیانگ سے کرمیا تک مسلمان ترکوں سے آباد تھا، ایسے ظلم کے ساتھ اسلام کی بیخ کنی کی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ ابتدائی زمانۂ انقلاب میں ترکوں نے بطیب خاطر یہ منظور کیا کہ وہ اپنی املاک اور جائدادوں کو ترکی مسلمانوں پر اس طرح تقسیم کردیں کہ اس کے اقتصادی پروگرام کے مطابق اس علاقہ میں اقتصادی مساوات قائم ہو جاتے! لیکن روس نے یہ منظور نہیں کیا۔ روس کی بالشویک حکومت نے ترکی علاقوں میں کالے روسیوں کو اس کثرت سے آباد کیا اور ترک آبادی کو روس کے دوسرے علاقوں میں جبری مشقت کرنے کے لئے اس حد تک منتقل کیا کہ ترکستان میں کالے روسیوں کی اکثریت پیدا ہو گئی۔ ترکوں کی املاک اور جائدادیں ان کالے روسیوں میں تقسیم کی گئیں۔

پھر ——— روس کے ہر علاقہ میں تعلیم کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے؛ اور اس تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے عقائد تبدیل کئے جائیں۔ گزشتہ تیس برس کے اندر پرانی ترکی نسل ختم ہو گئی ہے اور نئی نسل کمیونسٹ تعلیم کے اندر جوان ہوئی ہے۔ یہ ترکستان سے اسلام کی بیخ کنی کی دوسری مہم تھی۔ روس میں مسجدیں ہوں گی۔ امام ہوں گے، کوئی کوئی اور کبھی کبھی نماز بھی پڑھتا ہوگا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ روس اور کمیونزم مذہب کا مخالف ہے اور وہ اس کو مٹانے کے درپے ہے۔

کبھی سختی سے اور کبھی نرمی سے، حکومت روس کے اس قسم کے اعلانات سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایسی باتیں نہ کی جائیں جن سے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے یا کسی تعداد میں روس کے مسلمانوں کو حج کرنے کی اجازت مل گئی۔ یا جنگ کے زمانے میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ روس میں لوگوں کو اجازت ہے کہ مذہبی عقائد رکھیں اور عبادتیں کریں یا مسجدیں اور گرجے کھول دیئے گئے کیونکہ عام اعتقاد مذہب کا مخالف ہے اس معاملے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔

(بشکریہ "مقاصد")

خلیل الرحمن اعظمی●

صید نامہ

(بہت سے صیاد دل سے معذرت کے ساتھ)

اب مکاں ہے نہ کوئی اور نہ مکیں ہے صیاد!
تھرتھرائی ہوئی گلشن کی زمین ہے صیاد!

جانے کیا سوچ کے غنچوں نے لہو تھوکا ہے
گل کے پہلو میں کوئی تندِ جبیں ہے صیاد!

گرم سانسوں سے پگھل جاتی ہے زنجیرِ گراں
ان اسیروں میں ابھی ذوقِ یقیں ہے صیاد!

اسی سینے پہ ترے تیرِ ستم کھائے ہیں
یہی سینہ تو محبت کا امیں ہے صیاد!

زندگی جھوم کے پیمانہ اٹھا لیتی ہے
ان گھٹاؤں میں ابھی کوئی حسیں ہے صیاد!

شاخیں مل مل کے بہت روئی ہیں ان کانٹوں سے
باغ میں آج کوئی پھول نہیں ہے صیاد!

آج نیرنگیٔ فطرت کا گلہ کون کرے
باغباں ہی جو مرا بس میں نہیں ہے صیاد!

کسی دیوار کے سائے میں بچھانا تھا یہ دام
میری سوئی ہوئی تقدیر وہیں ہے صیاد!

کیا ہوا تو نے چھڑایا جو چمن کو مجھ سے
وہ گلِ تر تو مرے دل کے قریں ہے صیاد!

یہ بھی ممکن ہے میں اُڑ جاؤں قفس کو لیکر
مجھ کو مت چھیڑ، مجھے ہوش نہیں ہے صیاد

لب پہ نالہ ہے نہ سینے میں فغاں ہے صیاد!
آج سوکھی ہوئی پھولوں کی زباں ہے صیاد!

آگ بن بن کے اب اڑتے ہیں چمن کے تنکے
کیسی گھبرائی ہوئی برقِ تپاں ہے صیاد!

ہونٹ تو سی دیئے مرغانِ چمن کے تو نے
پھر بھی گونجی ہوئی کانوں میں اذاں ہے صیاد!

چاک داماں تو ہے لیکن یہ نہیں موسمِ گل
اک نئے بھیس میں اب فصلِ خزاں ہے صیاد!

بڑھ چلا سوزِ دروں خیر ہو اب دنیا کی
ڈگمگایا ہوا یہ کون و مکاں ہے صیاد!

کفر و ایماں کے دوراہے پہ ابھی تک ہے خرد — سرِ منزل یہ مگر عشق جواں ہے صیّاد!

اک طرف حسن ہے، اک سمت ہے سارا عالم — آج بھی کش مکشِ سود و زیاں ہے صیّاد!

دانہ و دام نہ ہو آج، زر و سیم سہی — کچھ بھی ہو اب بھی وہی تیری کماں ہے صیّاد!

دشت میں دھونی رمائے ہوئے اب بیٹھا ہوں — تیری بستی میں گزر میرا کہاں ہے صیّاد!

کیا ہوا آج کہ رندوں نے سبو توڑ دیا — کس کے میخانے سے اٹھتا سا دھواں ہے صیّاد!

ایک اک لفظ میں سو طرح کے معنی پنہاں

ہم فقیروں کا یہ اندازِ بیاں ہے صیّاد

کیسی یہ رسم ہے، یہ کیسا چلن ہے صیّاد! — آج بھی سر پہ وہی چرخِ کہن ہے صیّاد!

آشیاں میرا نہیں، لالہ و گل میرے نہیں — کیسے کہہ دوں کہ یہی میرا چمن ہے صیّاد!

عندلیبوں پہ تو لگتے ہیں چمن میں پہرے — اور چہکتا ہوا ہر زاغ و زغن ہے صیّاد!

کاش اک قطرۂ شبنم ہی کوئی ٹپکا دے — تلملایا سا ہر اک غنچہ دہن ہے صیّاد!

ڈھل چکی رات، وہ پو پھوٹنے ہی والی ہے — یہ نئی صبح نہیں تیرا کفن ہے صیّاد!

جانے اب گردشِ ایّام پہ کیا بیتے گی — آج دیوانوں کی ابرو پہ شکن ہے صیّاد!

کون اب آنکھ ملاتا ہے اسیرانِ ستم سے — ساتھ اب معرکۂ دار و رسن ہے صیّاد!

موجۂ خوں سے گزر آئے ہیں یہ تشنہ لباں — پھر کوئی آج سرِ گنگ و جمن ہے صیّاد!

زخم کھا کھا کے سنورتی ہی چلی جاتی ہے — میری دنیا نہیں یہ کوئی دلہن ہے صیّاد!

ٹوٹ کر پاؤں کی زنجیر گری جاتی ہے — اک نئے رقص میں اب دارِ کفن ہے صیّاد!

میرے اشعار میں ہے سینۂ گیتی کی تڑپ

یہ کوئی سحر نہیں، یہ مرا فن ہے صیّاد!

——— (بشکریہ "الحمرا")

انعام الرحمٰن ●

ماہِ شب کی چوری

مسٹر اسحاق پنٹو نے سگار کو اپنے لبوں سے علیحدہ کیا اور کہا:

"کافی حسین جگہ ہے"

سانگی کی چھوٹی سی بندرگاہ کے متعلق پسندیدگی کا اظہار کر کے مسٹر اسحاق نے سگار کو دوبارہ اپنے لبوں سے لگا لیا اور اطمینان سے قدرت کے حسین و دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔

مسٹر اسحاق پنٹو تقریباً ادھیڑ عمر کے تندرست و توانا انسان تھے اور تندرستی اچھی ہونے کی وجہ سے وہ دیکھنے میں عمر بھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک نہایت قیمتی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دولت مند طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے چہرے سے اتنی طمانیت اور بے فکری کا اظہار ہوتا تھا جو صرف ایسے ہی شخص کو نصیب ہو سکتی ہو جو دنیاوی تفکرات سے بے نیاز ہو۔

ان کے ہمراہ ان کے دوست مسٹر ایاز پاشا، سر مخدوم اور لیڈی نیلوفر مخدوم تھیں، ان کے علاوہ ایک نئے شناسا تاجر مسٹر جعفری اور ان کی نوعمر لڑکی فرزانہ بھی ساتھ تھی۔ مسٹر اختر اور مسٹر عادل بندرگاہ پر ان کے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود تھے۔

یہ سب لوگ ابھی مسٹر اسحاق کے اسٹیمر سے اتر کر آئے تھے مسٹر اسحاق سالانہ سانگی پر نمائش دیکھنے کی غرض سے آئے تھے کیونکہ ادھر اپنی مصروفیتوں کی بنا پر انہیں تفریح کا موقع عرصے سے نہیں ملا تھا۔

وہ لوگ نمائش پہنچے تو کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہر طرف لوگوں کی چہل پہل اور قہقہوں سے نمائش گونج رہی تھی۔ لیکن مسٹر جعفری کی نوعمر صاحبزادی فرزانہ کی شوخیوں نے اس پارٹی کو اور بھی زیادہ مسرور کر رکھا تھا مسٹر اسحاق نے جیسے ہی کھانا کھانے کی تجویز پیش کی فرزانہ ایک دم بول اٹھی:

"تو مسٹر اسحاق ——— ابھی نہیں، پہلے میں اس بلوچ نجومی کو اپنا ہاتھ دکھاؤں گی اس نے کہا تھا کہ وہ میری قسمت کا سارا حال بتا دیگا۔"

"فرزانہ تو بالکل پاگل ہے" اس کے باپ مسٹر جعفری نے کہا۔ "آپ اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیں مسٹر اسحاق۔"

"نہیں ابھی تو کافی وقت ہے" مسٹر اسحاق نے شوخ و طرار فرزانہ کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "فرزانہ کو قسمت کا حال معلوم کرنے دیجئے ہم تب تک نشانہ بازی میں قسمت آزمائیں۔"

"صحیح نشانہ لگانے پر قیمتی انعامات" ——— "چھوٹے دائرے پر پچاس، درمیانی پر بیس اور بڑے پر پانچ روپے ——— آیئے آیئے حضرات" ایک شخص چلائے جا رہا تھا۔

اور سب جا کر پستول سے نشانہ بازی کرنے لگے لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ ہر وار خالی جاتا اور وہ لوگ جھنجھلا کر دوسرا فائر کرتے یہاں تک کہ دونوں سب کچھ بھول کر اسی میں مشغول ہو گئے۔

لیڈی نیلوفر نے مسکرا کر مسٹر عادل سے کہا: "ہماری پارٹی میں صرف فرزانہ ہی بچہ نہیں ہے۔"

عادل اس کے طنز لطیف پر بے ساختہ مسکرا دیا لیکن وہ کچھ کھویا ہوا سا تھا صبح سے ہی وہ گم سم نظر آ رہا تھا اور اس نے بہت کم گفتگو میں حصہ لیا تھا اور اس کے جوابات ہر مرتبہ نہایت غیر موزوں تھے۔

لیڈی نیلوفر نے اپنے شوہر کے قریب کھسک کر سرگوشی میں کہا: "مسٹر عادل آج صبح سے ہی کسی بات کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

"یا کسی شخص کے متعلق" سر مخدوم نے مسز اختر کی سمت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

لیڈی نیلوفر نے تعجب سے سر مخدوم کی جانب دیکھا، سر مخدوم کی سیاہ بڑی آنکھوں میں معنی خیز جھلک تھی، لیڈی نیلوفر ان کے خیال پر مسکرا دیں اسحاق پنٹو اور ایاز پاشا دونوں جواہرات کے مشہور تاجر تھے اور دونوں ملی

ایک ساتھ مل کر تجارت کرتے تھے، سر مخدوم اور لیڈی نیلو فر نہ صرف ان کے قدیمی گاہک تھے بلکہ ان میں بہت گہرے اور مستحکم تعلقات بھی تھے وہ آج کل مسٹر اسحاق کے یہاں مہمان تھے اور تفریح کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔

"[illegible]" عادل نے مسز اختر سے کہا۔

مسٹر عادل ایک تندرست و خوبرو نوجوان [illegible] کے توانا جسم اور حسین آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی یہ جاننا مشکل ہے کہ مسز اختر نے بھی اس کشش کو محسوس کیا تھا یا نہیں۔ وہ بظاہر تو مسٹر عادل کی طرف زیادہ مائل بہ التفات نظر نہ آتی تھیں لیکن اس سے بھی منکر نہیں ہوا جا تا کہ وہ اس کی قربت میں مطمئن تھی، مسز اختر کافی دلفریب خد و خال کی عورت تھی، ان کے ہونٹوں پر ایک قدرتی مسکراہٹ ان کی آنکھوں میں ایک سحر انگیز کشش تھی، ان کے سڈول اعضا اور تندرست و نوجوان جسم کی رعنائی ہر شخص کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ غمگین تھی، کیونکہ شادی کے فوراً بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی تھی۔

فرزانہ اسی وقت دوڑتی اچھلتی اور قہقہے لگاتی وہ واپس آ گئی۔ وہ چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی تھی لیکن شوخی اور چنچل پن کے ساتھ ساتھ اس کی حرکتوں میں معصومیت تھی اور اسی وجہ سے لوگ اس کی باتوں کو بچپنے کی شرارت سمجھ کر ٹال دیتے تھے حالانکہ بظاہر وہ جوانی کے شاداب دور میں قدم رکھ چکی تھی۔

"سترہ برس کی عمر میں میری شادی ہو جائیگی" اس نے ہانپتے ہوئے کہا "اور ایک بہت مالدار شخص کے ساتھ اور منگل اور جمعرات میرے لئے بہترین دن ہیں اور نمبر ۸ میرے لئے خوش قسمت نمبر ہے، اور مجھے ہمیشہ سبز رنگ کا لباس پہننا چاہئے اور ــــ"

"اچھا بابا ــــ اچھا ــــ اب بقیہ باتیں پھر بتانا" سر مخدوم نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی وقت مسٹر اسحاق اور ایان پاشا نشانہ بازی کی مشق سے واپس ہوئے دونوں کو اس بات پر بڑا غصہ تھا کہ وہ ایک مرتبہ بھی صحیح نشانہ نہیں لگا سکے۔

"یہ بھی محض اتفاق ہے" ایان پاشا نے کہا۔

مسٹر اسحاق نے زور سے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"مجھ سے کبھی ایسا نہیں ہوا، میرا خاندان نشانہ بازی میں مشہور ہے صرف جواہرات کی تجارت نہیں کرتے ــــ اوہ خیر ــــ اب چلنا چاہئے فرزانہ بیگم آپ سنائیے، نجومی نے کیا کسی شخص سے خبردار رہنے کو کہا ہے"

"شخص نہیں عورت" فرزانہ ایک دم پھر چہک اٹھی "سیاہ آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت جو مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریگی۔"

سب ہنس پڑے اور رائل جارج ہوٹل کی سمت روانہ ہو گئے۔

ڈنر کا آرڈر پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔ رائل جارج ساحل سانگی کا مشہور اور بہترین ہوٹل تھا، ان کے داخل ہوتے ہی بیرے نے جھک کر انہیں زینے پر جانے کے لئے اشارہ کیا اور انہیں ایک پرائیوٹ روم میں پہونچا دیا جو پہلی منزل پر واقع تھا، کمرے میں ایک بڑی گول میز بچھی ہوئی تھی، اور ایک بڑی کھڑکی ساحل کی سمت سڑک پر کھلتی تھی جہاں سے نمائش کے شور و غل کی آواز کمرے میں آ رہی تھی اور پارک میں بجتے ہوئے ساز کی ہلکی دھنوں سے فضا رومانک ہو رہی تھی۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور مسٹر اسحاق نے میزبانی کے فرائض بہت فراخدلی سے انجام دینے شروع کئے انہیں اپنے مہمانوں کی خدمت سے بہت مسرت ہوتی تھی۔ اس کی نگاہوں نے ہر ایک کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لیڈی نیلو فر ــــ وہ حسب عادت مسکرا مسکرا کر گفتگو کر رہی تھی مسٹر اسحاق کو لیڈی نیلو فر پر کافی اعتماد تھا اور سر مخدوم ان کی معیت پر نازاں تھے ان کا یہ ناز اسحاق کی نظروں میں بجا تھا۔

مسٹر جعفری ــــ کافی معمر اور تجربہ کار نظر آتے تھے، ان سے حال ہی میں مسٹر اسحاق سے شناسائی ہوئی تھی اور چونکہ وہ بھی اسی نواح میں تجارت کرتے تھے اس لئے وہ مسٹر اسحاق سے ملنے آتے تھے، لیکن ان کے غیر موزوں سوالات سے مسٹر اسحاق کو اکثر کوفت ہو جاتی تھی۔ فرزانہ البتہ کافی شوخ اور دلکش خوبیوں کی لڑکی تھی۔ مسٹر اسحاق نہ معلوم کیا سوچ کر مسکرا دیئے۔

عادل ــــ خوش مزاج اور نیک فطرت نوجوان تھا اور مسز اختر سے وہ بہت ملتفت تھا مسٹر اسحاق نے اس مسئلہ پر مزید غور کرنا مناسب نہ سمجھا، اور پھر مہمانوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"مسٹر اسحاق" فرزانہ نے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کہو شریر لڑکی!" مسٹر اسحاق نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا اس وقت بھی وہ ہیرا آپ کے پاس موجود ہے؟ وہی جو گزشتہ شب آپ نے

ہم سب کو دکھلایا تھا اور کہا تھا کہ آپ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔"

مسٹر اسحاق نے قہقہہ لگایا۔

"میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا بھی لڑکی ——— وہ اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"میرے خیال میں آپ کو اتنا لاپرواہ نہیں رہنا چاہیے، اگر اس ہیرے بجائیں کوئی اسے چرا لیتا تب ——— اف خدا کتنی خطرناک بات ہوتی۔"

"او نہیں ——— تم بھی ہو ——— میرا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اپنے مال کی حفاظت کرنا خود بخود سکھا دیتا ہے۔"

"لیکن پھر خطرہ تو ہے۔ وہ چوری کر سکتا ہے۔" فرزانہ نے ضد کی۔

"نہیں ——— وہ "ماہ شب" کو نہیں چرا سکتے۔" مسٹر اسحاق نے کہا۔ اول تو وہ ایک اندرونی خفیہ جیب میں پوشیدہ ہے، دوسرے میں اپنے مال کو محفوظ رکھنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی کی ہمت نہیں جو "ماہ شب" کو چرا سکے۔

فرزانہ ہنسنے لگی۔

"آپ تو مانتے ہی نہیں ——— میں شرطیہ اسے چرا سکتی ہوں۔"

"اور میں شرطیہ کہتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔" مسٹر اسحاق کو بھی ضد ہو گئی۔

"اچھی بات ہے تو شرط لگا لیجئے۔ میں اسے چرا سکتی ہوں، گذشتہ شب جب آپ نے ہم سب کو ہیرا دکھا دیا تو اس کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔"

"اور وہ ترکیب کیا ہے؟"

فرزانہ نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور مسٹر اسحاق کے سامنے جھک کر بیٹھ گئی۔ وہ عجیب انداز میں مسکرا رہی تھی "میں یہ نہیں بتلاؤں گی لیکن اگر میں جیت گئی تو آپ کیا دیں گے؟"

مسٹر اسحاق کے ذہن میں جوانی کی یاد تازہ ہو گئی۔

"ایک درجن دستانے۔" فرزانہ چلائی "دستانے کون پہنتا ہے؟"

"اچھی بات ہے، سلک کے موزے تو پہنتی ہو۔"

"ہاں، ہاں ——— میرے پاس موزے بھی کم رہ گئے ہیں لیکن آپ کیا لیں گے؟"

"اوہ ——— مجھے ایک نیا تمباکو کا پائپ (ربڑ کا تھیلا) کافی ہوگا۔"

"اچھی بات ہے تو شرط ہو گئی لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمباکو کا پائپ آپ کو خود خریدنا ہوگا۔ اب آپ بالکل گذشتہ شب کی طرح وہ ہیرا سب کو دیکھنے کے لئے دے دیجئے۔"

وہ چپ ہو گئی کیونکہ دو بیرے پلیٹوں کو اٹھانے کے لئے کمرے میں داخل ہوئے۔ جب وہ دوبارہ تازہ پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ تو مسٹر اسحاق نے کہا:

"لیکن یاد رکھو ننھی بچی اگر یہ ہیرا سچ مچ غائب ہو گیا، تو میں پولیس کو بلانے کی زحمت کیوں کیجئے۔ لیڈی نیلوفر اور مسز اختر یہ فرض اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" مسٹر اسحاق نے کہا۔ تم ہیرے کی جعلسازی کی کافی مہارت حاصل کر چکی ہو کیا۔؟"

"اگر اس میں نفع ہوا تو میں یہی پیشہ اختیار کر لوں گی۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا:

اگر تم نے "ماہ شب" چرا لیا تو یہ کافی ہوگا۔ کیوں کہ اس کو دوبارہ کاٹنے کے بعد بھی اس کی قیمت کم از کم تیس لاکھ ضرور ہو گی۔"

"تیس لاکھ۔" فرزانہ حیرت سے چیخی۔ میرے خدا۔

لیڈی نیلوفر نے بھی تعجب سے کہا:

"اور آپ اتنا قیمتی پتھر جیب میں رکھ کر چلتے ہیں کمال ہے۔" ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"اچھی بات ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ اب شروع کیجئے پہلے ہیرے کو باہر نکالئے اور پھر بالکل وہی الفاظ دہرائیے جو آپ نے گذشتہ شب کہے تھے۔"

مسکراتے ہوئے مسٹر اسحاق نے اپنی اندرونی جیب میں ٹٹول کر کسی چیز کو باہر نکالا جو ان کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی چمکنے لگی۔ سب نے حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ایک ہیرا" . . .

یاد کرتے ہوئے مسٹر اسحاق نے گذشتہ شب کے جملے دہرانے شروع کئے ———

میرے خیال میں آپ تمام حضرات و خواتین اسے دیکھ کر لطف اندوز

ہوں گی۔ میں اسے "ماہ شب" کہتا ہوں اور یہ ایک طرح سے میرے لئے "ماہ شب" ہے ـــــ وہ کسی یاد میں گم ہو گیا ـــــ "ماہ شب" ـــــ یہ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے ایک لمحہ کو بھی جدا نہیں ہوتا۔"

اس نے ہیرا لیڈی نیلوفر کی سمت بڑھا دیا جنہوں نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھ کر مسٹر جعفری کی سمت بڑھا دیا۔ جعفری نے "بہت حسین بہت حسین" کہا اور ہیرا عادل کی طرف بڑھا دیا۔

ہیرے کے داخل ہونے سے ایک لمحہ کو سب خاموش ہو گئے جب وہ پلیٹیں لے کر واپس چلا گیا تو فرزانہ نے کہا "بہت حسین پتھر ہے" اور اسے ایاز پاشا کی سمت بڑھا دیا جنہوں نے بلا کوئی رائے دیئے ہوئے فوراً ہی اسے فرزانہ کو واپس کر دیا۔

"کتنا خوب صورت ہیرا ہے" فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا:

"اوہ ۔۔۔۔۔ " ہیرا اس کے ہاتھوں سے پھسلتے ہی وہ چلائی۔ یہ گر پڑا۔

اس نے اپنی کرسی پیچھے گھسیٹی اور میز کے نیچے جھک کر "ماہ شب" تلاش کرنے لگی، اس کے داہنے جانب سر مخدوم بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی تلاش کرنے جھکے اسی وقت گڑبڑ میں ایک گلاس میز سے نیچے گر پڑا۔ مسٹر عادل اور مسز اختر بھی تلاش میں شامل ہو گئیں۔ اور آخر میں لیڈی نیلوفر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

صرف مسٹر اسحاق نے تلاش میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ اطمینان سے میز پر بیٹھے ہوئے سب دیکھتے رہے۔

ایک ایک کر کے تمام لوگ ہمت ہارنے لگے۔

"وہ درحقیقت غائب ہو گیا پنٹو" سر مخدوم نے واپس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا:

"بہت خوبی سے غائب کیا،" مسٹر اسحاق نے کہا۔ "تم بہترین اداکارہ بن سکتی ہو فرزانہ۔ لیکن یہ بتاؤ وہ تمہارے پاس ہے یا تم نے کہیں چھپا دیا۔"

"میری تلاشی لے لیجئے۔" فرزانہ نے اداکارانہ انداز میں کہا۔

مسٹر اسحاق نے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے اسکرین کی طرف دیکھ کر لیڈی نیلوفر اور مسز اختر کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ دونوں زحمت کریں گی۔"

دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

لیڈی نیلوفر نے کہا:

"آپ فکر نہ کیجئے مسٹر اسحاق، ہم کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے"

وہ دونوں فرزانہ کو لے کر پردے کے پیچھے چلی گئیں۔

کمرے میں کافی گرمی تھی، مسٹر عادل نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی
اخبار والا سامنے سے گزرا۔ عادل نے جیب سے پیسہ نکال کر پھینکا۔ اس نے
دیا اور روانہ ہو گیا۔

عادل نے اخبار کو کھولا: "حکومت نے نئی پابندیاں عائد
"حکومت کو اس کے علاوہ کام ہی کیا رہ گیا ہے۔" مسٹر جعفری
" ذرا ریس کا کالم تو دیکھئے۔" سر مخدوم نے کہا۔ میں نے ایک گ
پر داؤ لگایا تھا کیا نتیجہ رہا ـــــ

"پاشا ـــــ، آپ ذرا دروازہ بند کر دیں۔" مسٹر اسحاق نے کہ
نہیں چاہتا کہ اس مذاق کے دوران میں وہ آ جائیں۔

"چکوری اول رہی!" عادل نے کہا

"آج قسمت نے ساتھ نہیں دیا!" سر مخدوم مسکرا کر بولے۔

تینوں عورتیں پردے کے پیچھے سے باہر آئیں۔

"کہیں بھی پتہ نہیں" مسز اختر نے کہا۔

"آپ بالکل یقین کریں کہ اس کے پاس نہیں ہے" لیڈی نیلوفر نے
پھیری اور اس کے بعد مسٹر اسحاق کے لئے شبہ کی بالکل گنجائش نہ تھی۔

"اور مجھے یقین ہے کہ فرزانہ نے اس کو نگل جانے کی حماقت نہ کی ہو
مسٹر اسحاق نے فرزانہ کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے یقیناً دیکھ لیا ہوتا" ایاز پاشا نے کہا۔ کیونکہ میں باقاعد
ن کی حرکات کی نگرانی کر رہا تھا۔

"میں اتنی بڑی چیز نہیں ہضم کر سکتی تھی" فرزانہ نے کہا۔ اب ک
ارادہ ہے مسٹر اسحاق۔ اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی جگہ کھڑی رہو، حرکت مت کرنا" مسٹر اسحاق نے کہا۔

اس کے بعد انہوں نے ایاز پاشا اور عادل کی مدد سے میز کا تختہ
کا ایک ایک انچ کو دیکھا اور اس کے بعد انہوں نے اس کرسی کو اچھی طرح دیکھ
جس پر فرزانہ بیٹھی تھی، لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی، اس کے بعد انھوں

نے فرزانہ کے آس پاس کی کرسی دیکھی

ایک بار پھر سب نے مل کر کمرے کی ہر چیز، حتیٰ کہ فرش تک کو چھان مارا لیکن بے سود۔ اس دوران میں فرزانہ پردے کے قریب کھڑی ہوئی ہنستی رہی۔

آخر کار تھک کر مسٹر اسحاق فرش سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے جب وہ کرسی پر بیٹھے تو ان کے چہرے کی تازگی ایک حد تک غائب ہو چکی تھی۔

"اچھی بات ہے شریر لڑکی!" انہوں نے کہا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم ہیرا چرانے میں ماہر ہو اور اس سے بہتر چور میں نے آج تک نہیں دیکھا لیکن مجھے بے حد تعجب ہے کہ تم نے ہیرے کا کیا کیا، بہر نوع کچھ بھی ہو میں ہار مانتا ہوں۔

"اور ایک درجن سلک کے موزے!"

"وہ بھی تمہارے ہیں شریر لڑکی!"

"اچھی فرزانہ ——— بھلا تم نے کہاں اسے چھپا یا ہے؟" مسز اختر نے تعجب سے پوچھا۔

فرزانہ آگے بڑھی۔

"میں ابھی دکھلاتی ہوں اور آپ سب حیران رہ جائیں گے!"

وہ برابر کی چھوٹی میز پر گئی جہاں ڈرائینگ ٹیبل سے اٹھا کر سامان رکھ دیا گیا تھا، اس نے اپنا سیاہ چرمی پرس اٹھایا۔

"بالکل آپ کی نظروں کے سامنے، آنکھوں میں دھول جھونک کر!"

اچانک وہ حیرت زدہ کھڑی رہ گئی اس کے چہرے کی شوخی غائب ہو گئی اور اس پر ہراس چھا گیا۔

"اوہ ......" اس کے گلے سے سہمی ہوئی آواز نکلی "اوہ ...."

"کیا بات ہے فرزانہ؟" اس کے والد نے چونک کر پوچھا۔

"فرزانہ کے لبوں نے سرگوشی کی: "وہ غائب ہو گیا وہ غائب ہے۔ میرے خدا ...."

"کیا معاملہ ہے؟" مسٹر اسحاق نے جلدی سے قریب آ کر پوچھا۔

فرزانہ بے چینی کے ساتھ مڑی۔

"میں بتلاتی ہوں!" اس نے کہا۔ "میرے پرس کے اوپر ایک بڑا مصنوعی نگ پلاسٹک میں جڑا ہوا تھا لیکن کل وہ کہیں گر پڑا، اور کل شب کو ہی جب آپ نے "ماؤ شب" ہم لوگوں کو دکھلایا تو مجھے خیال ہوا ——— کہ ہیرے کو چرانا کتنا آسان ہو صرف ذرا سی چالاکی سے اسے اپنے پرس کے اس خلاء میں چپکا دیا جائے جس سے نگ گر چکا ہے اور چونکہ وہ بالکل فٹ ہوگا اس لئے کسی کا خیال اس طرف نہیں جائیگا اور میں نے اس ترکیب پر اس وقت عمل کیا تھا پہلے میں نے اسے گرا دیا ——— اور پھر پرس ہاتھ میں لئے ہوئے اسے اٹھاتے جھکی اور اسے اس خلاء میں چپکا دیا جو نگ سے پیدا ہوا تھا میں پرس پر گوند پہلے ہی سے لگا کر لائی تھی اور پھر اپنا پرس اس میز پر رکھ کر تلاش کرنے میں مشغول ہو گئی، میری ترکیب اتنی عمدہ تھی کہ مجھے یقین تھا کسی کو خبر نہ ہوگی اور نہ آپ میں سے کسی نے دیکھا۔"

"مجھے تعجب ہے" مسٹر ایاز نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

مسٹر اسحاق نے پرس فرزانہ کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔ خالی جگہ پر اب تک "چونگ گم" کا گوند لگا ہوا تھا، لیکن ہیرا غائب تھا۔

"وہ یہیں کہیں گرا ہوگا، میرے خیال میں ایک مرتبہ ہم پھر تلاش کریں"

تلاش پھر شروع ہوئی لیکن اس مرتبہ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، پراسرار اور پریشان کن خاموشی، ہر ایک کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا۔

آخر کار ہر شخص تھک کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا۔

"ہیرا اس کمرے میں نہیں ہے" ایاز پاشا نے ترشی سے کہا۔

"اور کوئی شخص کمرے سے باہر نہیں گیا ——— تعجب ہے!" سر مخدوم نے حیرت سے کہا۔

ایک لمحہ خاموشی رہی، اچانک فرزانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جسے اس کے والد نے گلے سے لگا کر اسے چمکارا۔

"نا ——— نا ——— بری بات ہے"

سر مخدوم، ایاز پاشا کی سمت مڑے۔

"مسٹر پاشا" انہوں نے مخاطب کیا۔ "ابھی ذرا دیر قبل آپ نے میرے سے کچھ کہا تھا۔ لیکن جب میں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے ٹال دیا لیکن اتفاق سے میں نے آپ کا جملہ سن لیا تھا، فرزانہ نے ابھی کہا تھا کہ کسی

...لا یہ نہیں دیکھا کہ اس نے ہیرا کہاں چھپایا ہے اور آپ نے فوراً ہی جواب
ایک ... تعجب ہے" ... اور اب صورت حال ایسی ہے کہ مجھے
یہ سوچ کر سولنے ایک شخص کے کسی کو حقیقت کا علم نہیں اور وہ شخص جسے
ہے اس کمرے میں موجود ہے اس لئے میری تجویز ہے کہ ہر ایک شخص
باعزت طریقے پر تلاشی دینی چاہئے ہر لڑکے سے باہر نہیں جا سکتا۔"
سر مخدوم کی بھاری رعب دار آواز کمرے میں گونج کر خاموش ہو گئی
... اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا ہوا تھا۔
"میرے لئے یہ سب کچھ انتہائی تکلیف دہ ہے" مسٹر اسحاق نے
... شی سے کہا۔
"یہ سب میری غلطی ہے" فرزانہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا
"میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ؟"
"کوئی بات نہیں بچی" ایاز پاشا نے نرمی سے کہا۔ تم کو کوئی الزام
نہیں دے رہا ہے۔
"لیکن، میرا خیال ہے سر مخدوم کی تجویز سے ہم سب کو اتفاق ہے"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں" مسٹر عادل نے کہا۔
اس کے بعد سب نے حامی بھر لی، ایک بیرے نے دروازے
... دستک دی، لیکن اندر آنے سے منع کر دیا گیا، اور پانچ منٹ بعد ایک
پھر ہر شخص ایک دوسرے کو حیران کن پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا اور
... شبہ ... ایک تاریکی میں گم ہو چکا تھا۔
سب لوگ میز کے گرد دوبارہ بیٹھ گئے اور مسٹر اسحاق نے دروازہ
... کر بیرے سے کافی لانے کے لئے کہا، ایاز پاشا نے پولیس کو بلانے کی
پیشکش کی، حالانکہ سب کے لئے یہ تکلیف دہ تھا لیکن پھر بھی اس کے علاوہ
... چارہ نہیں تھا مسٹر پاشا فون کرنے نیچے چلے گئے۔
بیرے نے کافی لا کر رکھ دی مسز اختر نے ہر ایک کے لئے کافی
... کی، مسٹر عادل اس وقت ایاز پاشا کی کرسی کے برابر بیٹھے ہوئے تھے
... کے دوسری جانب مسٹر جعفری کی کرسی تھی ... ایاز پاشا واپس
اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور کافی پینے لگے۔
چونکہ اس اچانک واقعے سے لوگ کافی متاثر تھے اس لئے کوئی
... گفتگو کا سہارا نہ دیتا تھا۔ اسی وقت اچانک ایک عجیب بات ہو گئی

مسٹر ایاز پاشا بیٹھے بیٹھے اچانک بے ہوش ہو گئے لیکن اس سے
قبل کہ وہ گرتے مسٹر عادل نے انہیں سنبھال لیا۔ اسی وقت ایک دم دروازہ
کھلا اور انسپکٹر زیدی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے فوراً بقیہ کافی اور کافی کے
پیالے کو چھونے کی ممانعت کر کے ڈاکٹر کو فون کیا، ڈاکٹر نے معائنہ کے
بعد بتایا کہ صرف ایاز پاشا کی پیالی میں زہر ملایا گیا ہے ان کو فوراً ہسپتال پہنچا دیا
گیا اور انسپکٹر سلیم ضروری کارروائی سے فراغت پا کر واپس چلے گئے کیونکہ سب
لوگ معزز طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے بلا کسی ثبوت کے پولیس کسی
بھی طرح کارروائی کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

سر اعزساں آئی آر ایرانی نے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف
غور سے دیکھا۔
"کافی دلچسپ کہانی ہے مسٹر عادل،" اس نے کہا۔ لیکن اب میں کیا
خدمت کر سکتا ہوں؟"
"سچ پوچھئے تو مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں
لیکن، مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔"
عادل نے بے چینی کے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "اور نہ میں نے
آپ کے پاس آنے سے قبل ملاقات کا کوئی مقصد نہیں سوچا۔" میں نے پھر
دہرایا "لیکن سوال یہ ہے کہ ہیرا جاتا بھی کہاں؟ یہ بڑی تکلیف دہ بات
ہے کہ میں خواہ مخواہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے آپ کے متعلق معلوم تھا کہ آپ ایسے
پراسرار معموں کو آسانی سے حل کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس لئے میں
حاضر ہو گیا۔"
"آپ نے عقلمندی کا ثبوت دیا مسٹر عادل" سر اعزساں نے
جواب دیا "میں ایسی پریشانیاں دور کرنے میں ماہر ہوں اور آپ کو اس واقعہ
سے بہت تکلیف پہونچی ہو، لیکن آپ کو یقین ہے کہ آپ نے کوئی تفصیل چھوڑ دی
تو نہیں۔"
"صرف ایک بات" عادل نے کہا۔ ایاز پاشا بروقت طبی امداد
سے بچ گئے ہیں، لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ ابھی کئی دن تک پوری طرح
ہوش میں نہیں آ سکتے ... اور کوئی بات میں نے نہیں چھوڑی سب کچھ
ذرا سی دیر میں ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کی تلاشی لی گئی یہاں تک کہ خود مسٹر

اسحاق نے بضد ہو کر اپنی تلاشی دی، کوئی شخص کمرے سے باہر نہیں گیا پھر بھی "ماہ شب" غائب ہو گیا۔

"اس درمیان میں کوئی ہیرا بھی باہر نہیں گیا؟" سراغرساں نے پوچھا

"فرزانہ کے ہاتھ سے ہیرا گرنے کے بعد کوئی ہیرا اندر داخل نہیں ہوا کیونکہ مسٹر اسحاق نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ لیکن آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہم ہی میں سے کسی کے پاس ہے؟" عادل نے کہا۔

"بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔" سراغرساں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"وہ کمبخت اخبار والا ــــ" عادل نے غصہ سے کہا "مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ وہ سب اسی کے متعلق سوچ رہے ہیں، کیونکہ صرف یہی ایک ذریعہ ممکن ہو۔"

"مجھے دوبارہ اس واقعہ کو سنائیے۔"

"یہ بالکل آسان ہے۔" میں نے کھڑکی کھولی آواز دیکر اسے بلایا اور کھڑکی سے نیچے پیسے پھینکے اور جھک کر اخبار لے لیا اور یہی ایک طریقہ تھا جس کے ذریعہ ہیرا باہر جا سکتا تھا، میں اس بہانے نیچے کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کو ہیرا دے سکتا تھا۔"

"صرف یہی ذریعہ نہیں ــــ اور بھی ممکن ہو۔"

"وہ کیا ہو سکتا ہو؟" عادل نے جلدی سے پوچھا۔

"اگر آپ نے خود ہیرا باہر نہیں پھینکا تو یقیناً کسی اور ذریعہ سے وہ غائب ہوا ہے۔"

"اوہ۔ میرا خیال تھا آپ نے اور کوئی بات سوچ لی ہے۔ بہرحال میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یا کسی اور نے ہیرا باہر نہیں پھینکا۔"

"مجھے یقین ہے۔" سراغرساں نے کہا۔

"اچھا ــــ لیکن کیوں؟"

"کیوں کہ آپ مجرم نظر نہیں آتے۔" سراغرساں نے کہا۔

"یہ مقصد نہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں کے چہرہ پر کوئی خاص بات ہوتی ہے ایسے جرائم بے شک ہیں جن کا آپ ارتکاب کر سکتے ہیں، لیکن یہ بحث فضول ہے، میں آپ پر اس چوری کا شبہ نہیں کرتا۔"

"حالانکہ اور سب کو یقین ہے۔" عادل نے بیچینی سے کہا "وہ میری طرف عجیب مشکوک انداز میں دیکھتے ہیں، اور پھر ایاز پاشا کو زہر دینے کا مسئلہ سب کی تلاشی لینے کے باوجود کسی کے پاس سے زہر برآمد نہیں ہوا بیرے نے کافی کو چھوا نہیں اور کافی کی کیتلی میں نہیں صرف پاشا کے پیالے میں زہر ملایا گیا تھا، ان تمام باتوں نے مجھ کو مشکوک کر دیا ہے۔ بہرحال مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں گرفتار کیا جاؤں گا لیکن مجھے ان لوگوں کے شبہ سے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

"اور خصوصاً ایک شخص کے مشکوک ہو جانے سے آپ کو غم نہیں!"

عادل کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"صرف انہی کے مشکوک ہونے سے کیوں۔"

"اوہ عزیز من! ہمیشہ ایک ہستی ایسی ہوتی ہے جس کے خیال اور رائے کے بارے میں خیال رکھنا پڑتا ہے اور خصوصاً جب وہ عورت ہو تب!"

"جی ہاں ــــ جی ہاں . . . . وہ بہت پریشان ہے اور اسے بڑا صدمہ ہوا ہے اسے کبھی بھی یہ توقع نہیں تھی کہ ــــ"

"ٹھیک ہے" سراغرساں مسکرا دیا۔ اور اسی لئے جناب میرے خیال میں معاملہ صاف ہونا چاہیئے۔

عادل نے بے بسی سے ہلکا قہقہہ لگایا "یہ کہنا تو آسان ہے۔"

"اور کرنا اس سے زیادہ" سراغرساں نے جواب دیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہاں معاملہ بالکل صاف ہے اور میں نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں!"

عادل نے بے چینی سے ایک لمبی سانس بھری۔

"ابھی صبر کرو میرے دوست!" سراغرساں نے کہا۔ کیا اس دن کوئی گلاس گر کر ٹوٹ کر گر گیا تھا۔

عادل نے تعجب سے دیکھا! "ہاں وہ میز سے گر کر پیروں کے دب گیا تھا!"

"بہت خوب! کتنے موقع سے اس کے ریزے ریزے ہو گئے خیر تو گلاس کس کا تھا؟"

"میرے خیال میں مس فرزانہ کا!"

"اور اس کے برابر میں کون بیٹھا تھا؟"

"مسز مخدوم ــــ"

"آپ نے دیکھا تھا کہ گلاس کس نے گرایا؟"

"تمہیں کیا معلوم ہے؟"

"کچھ خاص نہیں ــــــ میں نے یونہی پوچھ لیا تھا، اچھی بات ہے مسٹر عادل شب بخیر ــــــ آپ کل دوپہر تک تشریف لائیں۔ میرے خیال میں اس وقت تک سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں مسٹر ایرانی۔"

میں ایسے معاملات میں کبھی مذاق نہیں کرتا جن کا تعلق میرے پیشے سے ہو اس سے میرے موکلوں میں بد اعتمادی پیدا ہونے کا احتمال ہے میرے خیال میں آپ کل ۱۲ بجے آجائیے ــــــ شکریہ۔"

مسٹر عادل امید و بیم کی حالت میں بالکل ٹھیک وقت پر سراغرساں کے دفتر میں داخل ہوا۔ سراغرساں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"سنائیے؟" اس نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے" سراغرساں نے جواب دیا "پولیس نے آج صبح اس گروہ کو گرفتار کر لیا ہے۔"

"گروہ ــــــ کیا گروہ؟"

"جواہرات کی چوری کرنے والا گروہ" میں نے تفصیلات سن کر ہی ان کے طریقۂ واردات کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور ایک مرتبہ غور کرنے کے بعد کوئی شبہ ہی نہ رہا۔"

"لیکن وہ گروہ ہے کس کا ہی؟"

"باپ، بیٹے اور بہو کا ــــــ بشرطیکہ سلمہ، باسط کی بیوی ہو۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"بالکل آسان ہے ــــــ یہ ایک ہوشیار گروہ ہے۔ نقلی جعفری اصل مشہور جواہرات کا جو مشہور ہے اس نے خود کو تاجر بتلا کر مسٹر سہاق سے دوستی کی۔ وہ حقیقت سے "ماہ شب" کی فکر میں تھا آپ کی شہرت بھی فرزانہ ــــــ جس کی عمر ظاہر ۱۸ برس کی ہے منور کی بہو ہے اور ۲۲ سال کی عورت ہے۔"

"میرے خدا ــــــ میرے خدا!" عادل نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اس گروہ کے تیسرے جزو باسط نے اپنا کام بیرے کی حیثیت سے لیا۔ نمائش کی وجہ سے لائن جامع میں عارضی بیروں کی جگہ ملنا آسان تھی۔ معاملہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ نقلی جعفری نے شیشے کا ٹکڑا ہیرا کی جگہ اور ہیرا پروگرام کے تحت ایک دوسرے کے پاس سے ہوتا ہوا جعفری اسی کے پاس پہنچتا ہے اسی وقت بیرے داخل ہوتے ہیں اور ان کی واپسی تک ہیرا جعفری کے پاس ہی رہتا ہے لیکن بیروں کی واپسی کے ساتھ ساتھ ہیرا بھی کمرے سے باہر چلا جاتا ہے کیونکہ اسے ایک پلیٹ کے نچلے حصے میں چپکا دیا گیا تھا۔ اور باسط وہ پلیٹ واپس لے جاتا ہے۔"

"لیکن میں نے اس کے بعد بھی ہیرے کو دیکھا وہ موجود تھا۔"

"نہیں نہیں میرے دوست وہ ہیرا "ماہ شب" نہیں بلکہ معمولی شیشے کا ٹکڑا تھا جسے پہلے ہی سے بنوایا گیا تھا اور اسی وقت ہیرا میز سے نیچے گرتا ہے اور پھر شیشہ کا گلاس بھی۔ فرزانہ جان بوجھ کر گراتی ہے اور پوری طاقت سے نقلی ہیرے اور گلاس کو پیروں سے کچل دیتی ہے جس کے بعد فرش پر صرف شیشے کے ریزے باقی رہ جاتے ہیں اور اصل ہیرا اس طرح اچانک گم ہو جاتا ہے لیکن غالباً ایاز پاشا کو اس حرکت پر شبہ ہو جاتا ہے اور باسط جو دروازہ پر کھڑا تمام گفتگو سن رہا تھا اسے ختم کرنے کے لئے کافی کی پیالی میں زہر ملا کر لاتا ہے آپ کو یاد ہے سب کے سامنے پیالیاں کس نے رکھی تھیں؟"

"بیرے نے۔"

"ٹھیک ہے ــــــ اور پھر باقی کیا رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ مسٹر عادل آپ نئی بچیوں کو ذرا غور سے دیکھا کریں، ان کی خوشیاں خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔"

عادل نے سراغرساں کو غور سے دیکھا اور مسرت سے کہا "میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں مسٹر ایرانی۔ آپ درحقیقت دوسرے ہومز پیدا ہوئے ہیں۔"

(بشکریہ "سراغرساں")

التماس ہے کہ . . . .

- اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے
- دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتہ لکھنا نہ بھولیے، تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو

"مینیجر"

عمران اعظم انصاری

ہمارا قصۂ غم درمیاں سے مت پوچھو
یہاں سے چوٹ لگے گی یہاں سے مت پوچھو

سحر کے بعد ہی لوٹی گئی متاعِ چمن
حدیثِ غنچہ و گل باغباں سے مت پوچھو

دلیلِ حادثہ و واردات کیا ہوگی؟
جوازِ عشق دلِ بے زباں سے مت پوچھو

تڑپ تڑپ نہ اٹھیں کشتگانِ عشق و جنوں
کسی کا راز کسی رازداں سے مت پوچھو

خرد کی رازِ جنوں تک رسائیاں، توبہ!
یقیں کی بات، خیال و گماں سے مت پوچھو

ہمارا حال خود احوال ہی سے ظاہر ہے
ہمارا حال ہماری زباں سے مت پوچھو

مجھے تباہ کیا ہے مرے عزیزوں نے
مری تباہی مرے خانداں سے مت پوچھو

تباہیوں کا خدا سے گلہ، خدا کی پناہ!
زمیں کی بات ہے تم آسماں سے مت پوچھو

فسانۂ غمِ عمران، درد سے معمور
تمھیں یہ کیسے بتاؤں کہاں سے مت پوچھو

نظر نظر ہے جو والہانہ، قدم قدم میرا فاتحانہ
جدھر جنوں گام زن ہوا ہے اسی طرف چل پڑا زمانہ

چمن چمن میں روش روش پر کہاں کہاں تک بچھاؤں دامن
وہیں بنے برق کا نشیمن جہاں بنے میرا آشیانہ

یہ کیا ہوا ہے انقلابِ دوراں! کسی کو قطرہ، کسی کو طوفاں
کہیں کہیں آبشارِ خرمن کہیں کہیں صرف دانہ دانہ

میں ندیمِ جادہ تو ندیمِ منزل، میں موجِ یم تو متاعِ ساحل
اسیرِ رسم و رواج تو ہے، مزاج میرا ہے باغیانہ

رخ اپنا دریا بدل گئے ہیں، پہاڑ مرکز سے ٹل گئے ہیں
نہ ٹل سکا ہے خیال تیرا، بدل گیا محورِ زمانہ

تجھی سے کیا ہو تری شکایت، بڑی پرانی ہے یہ روایت
گزر گئی دل پہ جو قیامت، مری حقیقت ترا فسانہ

ہزار پیالے ڈھل رہے ہیں، چھلک رہے ہیں، اچھل رہے ہیں
کہ ساقیا تیری چشمِ سرمست، مرکزِ گردشِ زمانہ

جبیں پہ افشاں کہ عطرِ شبنم، حجاب اندر حجاب پیہم
یہ نیچی نیچی نظر کا عالم، نفس نفس اک حسیں بہانہ

کروں کہاں جا کے شہر یاری کہ دل ہے کون و مکاں پہ بھاری
سما سکے گی نہ نغمۂ عشق میں مری حیاتِ قلندرانہ

وہ ایک سیلِ خروشِ اعظم تو نغمۂ نے نواز میں ہوں
وہ حسن کا شاہکار ٹھہرا تو میری فطرت ہے شاعرانہ

عمران اعظم انصاری

بخدا ہم کسی عنوان بھی مجبور نہیں
پھر بھی تقدیر بنانے کا ہی مقدور نہیں

دونوں عالم ہیں خرد انساں کے تخیل میں مگر
ورنہ انساں کسی عالم میں بھی محصور نہیں

جن کو میخانۂ ہستی سے ملے بادۂ عشق
ان کی نظروں میں پھر افشردۂ انگور نہیں

سلطنت کا وہی اگلا سا تصور ہے ابھی
وہی سلطان ہیں یہ سلطانیٔ جمہور نہیں

دور رہنے پہ جو مجبور بنے بیٹھے ہیں
خود چلے آئیں تڑپ کر تو وہ دل دور نہیں

شرکتِ غیر کا کیوں غم ہے اے عمرانِ نواز
میری منظورِ نظر تو ہے کوئی حور نہیں

سایا مجھ سے تو میں سائے سے گریزاں تو نہ تھا
ایسا عالم کبھی اے گردشِ دوراں تو نہ تھا

میں بہاروں سے نمایاں تھا، بہاریں مجھ سے
میں چمن میں ہدفِ طنزِ بہاراں تو نہ تھا

میں کہ تھا اہلِ نظر کے لئے اک سادہ کتاب
میری صورت سے مرا حال نمایاں تو نہ تھا

کیوں مرے حال پہ ہنستے ہیں زمانے والے
گریۂ اہلِ زمانہ پہ میں خنداں تو نہ تھا

جب برستا ہوں تو کھل کر ہی برس جاتا ہوں
میری پلکوں پہ اک آنسو کبھی لرزاں تو نہ تھا

اور تو اور یگانے بھی ہوئے بیگانے
ورنہ میں لفظِ محبت پہ پشیماں تو نہ تھا

چاندنی رات میں مجھ سے بھی عجب بھول ہوئی
میرا ہی سایا تھا، وہ ساتھ خراماں تو نہ تھا

غمِ جاناں کی اسیری میں کئی پہلو تھے
ورنہ میں صیدِ زبونِ غمِ دوراں تو نہ تھا

عرش سے اور پرے تھی مری پروازِ خیال
میں کبھی بستۂ افکارِ پریشاں تو نہ تھا

کفر کو کیفرِ کردار سمجھتا ہوں میں
میں کبھی بے خبرِ نکتۂ عرفاں تو نہ تھا

یوں بھی سوچا ہے کبھی تم نے زلیخا والو!
چاکِ دامن تھا وہ یوسف کا گریباں تو نہ تھا

یاد پڑتا ہے خطائیں ہوئیں از خود سہواً
ورنہ عمراں میں اقدام پہ نازاں تو نہ تھا

کراچی

خاور قریشی •

عمل اور ارتقائے حیات

کائنات کے اس وسیع نظام میں جو بدرجۂ اتم مکمل ہے۔ ہر اس شے کا وجود
ں نظام کو قائم رکھنے میں شریک کار ہے نہ صرف اپنے مقام پر اس لئے
ہو کہ اس کے سبب سے نظامِ عالم کو مدد ملتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ زندگی کی
ی اور ارتقاء کے راستے میں اہمیت رکھتا ہے۔ آفتابِ عالم تاب سے لیکر
ہ خاک تک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ نظامِ قدرت میں کوئی شے خواہ
دوسری شے کے مقابلے میں کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنے مقام پر خاص اہمیت
الک ہے۔ یہ چاند سورج، آسمان و زمین، خشکی و تری، باد و باراں، برق و
ش، جمادات و نباتات، پہاڑ اور سبزہ زار، غرض کہ یہ تمام اشیاء جن سے ہمارا
تول بناہے ہماری زندگی کی ضروریات کے لئے انفرادی طور پر اہمیت رکھتی ہیں
زندگی کی ترقی نیز معاشرت کے ارتقاء میں ان کا زبردست دخل ہے۔ کارخا
رت میں ہر قسم کا ساز و سامان موجود ہے، صرف اس کو صحیح اور بہتر سے بہتر
یقوں پر استعمال کرنے کے لئے عقل و دانش اور معلومات کی ضرورت ہے۔ یہی
لومات و انکشافات اور علوم و تحقیقات کا فیض ہے کہ زمین پر تہذیب و تمدن
ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ تہذیبوں کی کہانی انہی لوگوں کی کہانی ہے
ہوں نے اپنی عقل و دانش، تحقیق و دریافت، علم و فنون اور سائنس کی مدد
سے اپنے ماحول کو سمجھا اور خاص حالات کے ماتحت موجوداتِ عالم سے استفادہ
یا۔ انہوں نے اپنی معلومات کے بل پر مادی ماحول میں رد و بدل کیا جو نہ صرف
تی طور پر کسی خاص زمانے کی زندگی پر خوشگوار طور سے اثر انداز ہوا بلکہ آئندہ
سلوں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوا۔ برخلاف اس کے روئے زمین پر آج
ں ایسے ممالک پائے جاتے ہیں جہاں لوگ اپنی دوسری ہم عصر قوموں سے
اعتبار سے پیچھے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پستی اور پس ماندگی کا سبب ان کا ذہنی کسل
و دا اور قدرت کے ذرائع پر قابو پانے سے گریز ہے جن سے قومی حیثیت
سے اصلی عمل کا فقدان ہو جاتا ہے۔

کائنات کی ہر چیز ایک رشتۂ لامتناہی میں منسلک ہے لیکن
ہر چیز اپنے مقام پر اضافی حیثیت سے کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی لیکن
فی ذاتہٖ اس کی اہمیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے وجود
سے تمام نظامِ ہستی کو تقویت نہ پہنچے۔ اسی طرح جب کسی شے کا وجود اضافی
حیثیت سے کم اہم ہو جاتا ہے اور ایک وہ مقام آجاتا ہے جہاں اس کی اہمیت
بالآخر ختم ہو جاتی ہے تو وہ شے زوال پذیر ہو کر رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے
اور اس کی جگہ کوئی دوسری شے لے لیتی ہے جس کی نظامِ عالم میں ضرورت ہوتی
زندگی اسی تغیر و تبدل کی پُر پیچ راہوں سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی
ہے۔ اور اسی طرح آنے والے ادوار سے گزرتی چلی جائے گی۔ اس کے راستے
میں تنگ و تاریک مقامات بھی آئیں گے، ہمالہ جیسی بلندیاں بھی اسے سر کرنی
پڑیں گی، اسے صحرائے افریقہ جیسی دشوار گزار منازل بھی طے کرنی ہوں گی،
بحرِ انیانوس جیسے سمندروں اور سیلاب پر آشوب سے مقابلہ کرنے کے لئے قسم
قسم کے معبر بنانے کا حوصلہ بھی درکار ہوگا، اس کا گزر پستیوں میں بھی ہوگا اور
ایوانِ فلک کے درخشاں گوشوں میں بھی، مشکلات اس کے سامنے آہنی دیواریں
بن جائیں گی، لیکن یہ ان سب دشواریوں سے گزرتی ہوئی اپنے ساتھ برق
انتساب جذبہ لئے ہوئے اپنی روش میں سرگرمی بڑھاتے ہوئے، ایک
جاودانی سُرعت اور ناقابلِ مزاحمت رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جائے گی
تغیر و تبدل اور حرکت و عمل کا یہ وہ ان تھک اصول ہے جو ابتدائے آفرینش سے
زندگی کے ارتقاء کا ذمہ دار ہے۔ اسی اصول کے ماتحت انسان قدرت کے ذرائع
سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا ہے اور مختلف زمانوں میں
حالاتِ زندگی کے مطابق زندگی کے مجازی نظام میں ترمیم کرتا رہا ہے یہیں سے
انسانی عمل کی ضرورت اور اس کی اہمیت پیدا ہوئی۔ عمل کی قوت حیات کی قوت
بنی اور عمل زندگی کے اتار چڑھاؤ کا ذمہ دار بنا۔

زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے جو قدم قدم پر مادۂ حیات
کو بڑھنے سے روکتا ہے اور اس طرح حیات کی راہ بدلتی رہتی ہے لیکن حیات میں

ایک عزم و استقلال بھی موجود ہے اور جب عزم و استقلال کو انسانی عمل سے مدد ملتی ہو تو حیات اپنی راہ سے مادہ کی مزاحمت کو ہٹا دیتی ہو۔ انسانی عمل کا دارومدار انسان کے ضمیر پر ہوتا ہو ضمیر میں جس قدر انا قوی ہوگی۔ اُسی قدر عمل پُر زور اور کامیاب ہوگا۔ انا کی دو کیفیات ہیں۔ ایک تخلیقی، جو مادہ کو نہ صرف راہ سے ہٹاتی ہو بلکہ اس کو اپنا مطیع بنا کر حیات کے لئے مفید بناتی ہے دوسری تخریبی اور زوال آمادہ جو اس حد تک منفی اثرات کی حامل ہوتی ہے کہ تخریب کی تکمیل کے لئے مادی ذرائع پر پورا قابو حاصل کر لیتی ہو جب انسان کی تخلیقی انا بالکل کمزور اور خوابیدہ ہو جاتی ہے تو تخریبی انا کا عروج ہوتا ہے اور تخریب کی تکمیل اُس کی بھی فنا ہو کیوں کہ اس مقام پر تخلیقی انا پھر بیدار ہو جاتی ہو اور اس اثنا میں کھوئی ہوئی قوت واپس آجاتی ہے چنانچہ بعض اوقات ہمہ گیر تخریب ایک بہتر نظام حیات کی تعمیر کے لئے محض ضروری ہوتی ہے عمل کا یہ تصادم حیات کو آگے بڑھانے کے لئے اہم ہے اور اسی لئے انسانوں کے شعور میں انا کی دونوں صورتوں کا پایا جانا خلاقِ عالم کے مظہر کا تضاد نہیں بلکہ اس میں بھی یکتائی کا پہلو جلوہ گر ہے۔

جس طرح عالم کائنات میں ہر شے دوسری شے پر اپنے عمل سے اثر انداز ہوتی ہو۔ اور تمام چیزوں کے متحدہ عمل سے ایک نظام قائم ہے اسی طرح تمام انسان ناگزیر طور ایک دوسرے سے فطری موانست اور باہمی ارتباط و اختلاط کی قیود میں مبتلا ہیں۔ ایک انسان کے عمل کا اثر اس کے گرد و نواح کے دوسرے انسانوں پر عموماً پڑتا ہے۔ اگر یہ انسان اپنے دوسرے ہم جنسوں سے شعور و ادراک، عقل و فہم اور علم و تحقیق میں برتر ہے تو یہ عمل نہایت گہرا اثر کرتا ہے۔ برخلاف اس کے انسانوں کے ایک گروہ کا عمل ایک نوزائیدہ انسان پر غیر شعوری طور پر محیط ہو جاتا ہے۔ اسی باعث بچہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کی کمزوریوں یا قوتوں نجاستوں یا پاکیزگیوں کو جذب کر لیتا ہو۔ ماحول کی خارجیت انسان کی داخلیت پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہو اور یہ اثر پیدائش ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ بڑا ہونے کے بعد اگر انسان کی انا قوی ہے تو وہ ماحول کے خلاف جہاد کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم حالتوں میں پایا جاتا ہے

خارجی اثرات انسان اپنی قوت ادراک سے قبول کرتا ہو۔ اسی کی بدولت وہ ماحول کو سمجھتا بھی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو اس کو ماں باپ، بہن بھائی، دوست دشمن، آب و آتش، زہر و تریاق وغیرہ کا امتیاز کراتی ہے اسی سے اس میں احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ ضمیر کی کسوٹی پر خارجی و داخلی محسوسات کا جائزہ لیتا ہے۔ ان تجربات کی روشنی میں وہ اپنی عقل کی اعانت سے اپنے مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ اور زندگی کا ایک لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوت ادراک عمل کے لئے ایک بنیادی شے ہو جس شخص کا ادراک ناقص ہوگا وہ زندگی کے حقائق اور اسرار و رموز کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے گا اس شخص کے ضمیر میں ایسی الجھنیں رونما ہونے کا امکان ہے جو اس کے ذہنی و عملی نظام میں بے ربطی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ ایسے حالات میں انسان اپنے داروات قلبی اور محسوسات و مشاہدات کا غلط اندازہ لگاتا ہو۔ زندگی کے بارے میں وہ ایک غلط تجزیہ کر بیٹھتا ہے جس سے ایسی بصیری کا ظہور ہوتا ہے جو تہذیب انسانی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ یہ انا کی تخریبی طاقتوں کے لئے ظہور کا رُخ ہے جس سے تہذیبوں کا زوال اور تمدنوں کی تخریب ہوتی ہے۔ وقتی طور پر تو ایسے فتنے سحر سامری کی طرح تخلیق کی طرف بڑھتے ہوئے معلوم دیتے ہیں لیکن ان کا ردِ عمل ان کے ظہور سے زیادہ دل دوز ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمیں اس کی مثال نشاۃ ثانیہ کے دور میں ملتی ہے۔ اس دور میں نئے نظریات نے بہت فروغ پایا۔ یہاں تک کے خود عیسائیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو کر رہ گئیں ہیں۔ مغرب میں ایسے علوم مروّج ہوئے جو تہذیب مادّی کی اساس بنے۔ ان نظریات اور علوم کا عمل، جبر و تظلّم اور وحشیانہ جنگوں کی صورت میں نمودار ہوا جو تہذیب جدید کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ عالمگیر لڑائیاں بھی ہوئیں جن کا مقصد دنیا میں تخریبی عناصر کو مٹانا نہیں تھا بلکہ جن کی تہہ میں نسلی تفوق اور کینہ و بغض کے جذبات پوشیدہ تھے۔ یہ لڑائیاں اپنے اندر کچھ ایسے جراثیم رکھتی تھیں کہ اہل یورپ اپنے علوم فلسفوں اور سائنس کی جدید تحقیقات کے باوجود انسان کو تباہی سے نہ بچا سکے۔ افسوسناک ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اسی دور میں جو انسانیت کے تحفظ کا نقیب اور دعویدار ہے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ایجاد کی طرف قدم اٹھائے گئے جو زندگی کو سوز جہنم بنانے میں بہت بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔

عمل کے لئے ارادہ لازمی ہے اور ارادے کے لئے خیال شرط ہے

ہر خیال کسی نہ کسی ارادے کا محرک ہوتا ہے۔ میں نے مختصراً بتایا کہ مہلک خیالات کا انسانی عمل پر خوفناک اور بدانجام اثر پڑتا ہو۔ اور یہ اثر صرف ایک

ی: ایک خاندان یا قوم ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ شدید حالات میں تمام نبی
ٔ آدم اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یہی حال تعمیری خیالات کا ہوتا ہے
خیالات سے وہ عمل پیدا ہوتا ہے جو اپنی قوتوں کی مدد سے زمانے کے
ائے کو غلط سمت بہنے سے روکتا ہے۔

ندگی قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی چلی آئی ہو۔ اور انسان اپنے کردار کی
لمت سے جو بیشتر اس کے اپنے حسنِ عمل پر مبنی ہو جو زندگی کو سنبھالتا چلا آیا
ے۔ انسان کے عظیم عمل سے تہذیبوں کی داغ بیل پڑتی رہتے طور وقت کے
ین انسان اپنی عملی زندگی سے اپنے خیالات اور اصولوں کو ثابت کرتے
ے ہیں۔ اگرچہ اچھے یا برے خیالات کے امتیاز کا کوئی واضح معیار قائم کرنا مشکل
ہم انہی خیالات کو اچھا کہا جا سکتا ہے جو ایسے عمل کا محرک نہیں جن سے حیات
ٓگے بڑھنے کا سہارا ملے۔ اچھا عمل اچھے خیال کا مرہون منت ہوتا ہے
چونکہ حیات کی رفتار سے عمل کو براہ راست تعلق ہے خیال کو نہیں اس لئے
تمام حیات انسانی پر محیط ہے۔ عمل ایک ایسا آلہ ہو جس سے انسان کی خوابیدہ
ت کو بیدار اور مردہ صفات کو زندہ کیا جا سکتا ہو۔ یہی ذریعہ انسان کی
انی، دماغی اور روحانی تعلیم و تربیت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت
سکتا۔ خیال بے عمل ایسا ہو جیسا کہ عمل بے علم۔ عمل کے لئے علم کی ضرورت
ہر ہے۔ علم انسان کو نشیب و فراز سے آگاہ کرتا ہو اور بے راہ روی سے
کتا ہو۔ عمل کی بے اعتدالی علم کے فقدان سے ہوتی ہو۔ علم جس قدر پختہ ہوگا
ل اسی قدر کامل ہوگا۔

تہذیب خواہ یونان قدیم کی ہو خواہ جدید یورپ کی، چین کی ہو یا جاپان
، علم و عمل کی ہم آہنگی اور امتزاج کا نتیجہ ہوتی ہو۔ جس طرح عمل، علم کے
بر مثل اندھے آدمی کے ہو اسی طرح علم بغیر عمل کے اندھے کی لاٹھی کے مشابہ
ہے۔ علم و عمل کے باہمی امتزاج سے کلچر، تمدن، معاشرت اور تہذیب کی بنیاد
تی ہو۔ تہذیبوں کے مختلف نظریات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
لک و ملت کے انسان عمل اور علم کے درمیان ایک بے پایاں تاریک خلیج
ں ہاتھ پاؤں مارتے رہے ہیں۔ یہ خلیج فکر و نظر، غور و خوض، جستجو اور تجزیے
خلیج ہے۔ ہندوؤں میں یہ خلیج سنیاس اور یوگ کی صورت میں نمودار ہوئی
یسائیت میں یہ [illegible] رہبانیت کے بھیس میں نظر آتی ہے، اسلام کے
غاز کے بعد سے تو اس نے بہت سے چولے بدلے۔ کہیں بھگتی کے روپ
میں اور کہیں تصوف کے رنگ میں، کہیں نیشنلزم کیمونزم کے لباس میں اور
کہیں انسانیت کے دوستی کے جذبے میں۔ کہیں روحانی وجود کے انکار میں
اور کہیں وحدت الوجود کی پکار میں۔ اہل مغرب بھی اس کے اثرات سے محفوظ
نہ رہ سکے۔ گیٹے اور ایمرسن جیسے مفکروں نے اس کے اثرات کو قبول کیا گیٹے
نے عمل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ صلاحیت و جوہر تنہائی میں
بیٹھ کر غور و تفکر سے پیدا ہوتے ہیں لیکن کردار زمانے کے دھارے میں بنتا ہے
ایمرسن بھی اسی کو صحیح معنے میں انسان سمجھتا ہے جو ہنگامہ عالم میں رہکر زندگی
کے نشیب و فراز سے دوچار ہو اور پھر بھی اپنی انفرادی آزادی اور زندگی سے
حقیقی دلچسپی قائم رکھ سکے۔ افلاطون کا نظریہ اس سلسلے میں قابل غور ہو۔ وہ
کہتا ہو کہ زندگی اصولی اور عالمگیر حسن سے حسنِ مطلق کے احساس تک پہنچنے
کا عمل ہے۔ تصوف، بھگتی، رہبانیت اور یوگ کا تصور اس نظریے سے
کافی ملتا جلتا ہے۔ صوفیوں، بھگتوں، راہبوں اور یوگیوں نے اپنے اپنے
طریقوں سے روحانی طور پر پاکیزگی حاصل کرکے "حسنِ مطلق" میں جذب ہوجانے
کو زندگی کی تکمیل قرار دیا۔ روح کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے ان
لوگوں نے مادی دنیا اور اس کی نعمتوں کو خیرباد کہا۔ انہوں نے انسان کو ہنگامہ
عالم سے فرار کی تعلیم دی اور ظاہر ہو کہ ہنگامہ عالم سے فرار ہو کر انسان اس
پر قابو نہیں پا سکتا۔ ان کے انکشافات ضمیری دنیا کے لئے خوش فہمیوں کا
باعث ہوتے اور اوہام پرستی کا در کھل گیا۔ انہوں نے خواب و مراقبہ میں
غرق ہوجانے کو اکتسابِ علم اور وجودیتِ عمل پر ترجیح دی۔ ان کا یہ تصور کہ صرف
روحانی ترقی ہی انسان کی معراج ہے ساری دنیا کے لئے کسل و جمود کا پیغام
لایا۔ افلاطون کا نظریہ بھی واضح نہیں ہے اور اس میں عمل کی ماہیت ایک
فلسفیانہ حیثیت رکھتی ہو مذہب نے عمل کی افادیت کو سمجھا اور اس پر زور دیا
چنانچہ عملی طور پر جو مذہب جتنا جاذب توجہ رہا وہ اتنا ہی اعلیٰ نجات کا ذریعہ
مانا گیا۔

عمل سے زندگی کی گہماگہمی قائم ہو۔ خالق حقیقی کو بھی عمل پیارا ہے
جب ہی تو اس نے کائنات کا اتنا عجیب و غریب نظام قائم کیا۔ اگر آج
کارخانۂ قدرت کی اشیاء اپنے عمل میں کوتاہی کرنے لگیں تو یہ سارا نظام
درہم برہم ہوجائے۔ زندگی بھی ایک نظام ہو۔ اور ہم میں سے ہر شخص پر
اس کی تقویت کا انحصار ہے۔ عمل میں تعیش پسندی، تنزل کا موجب

ہوسکتی ہے اور چونکہ حق آسانی زندگی کا نصب العین نہیں ہے اس لئے حیات اپنے اندر سے لیے تمام عناصر نکال پھینکتی ہے۔ حق آسان قومیں ذہنی، روحانی اور مادی موت مرجاتی ہیں۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں عمل کی وہ آزادی درکار ہے جس میں انسان کے شعور، ذہن، عقل، روح اور جسم کی صحیح نشوونما ہو سکے۔ عمل محکوم بھی ہو جاتا ہے اور یہ نفسی پستی کے سبب یا خارجی ذرائع پر قابو نہ ہونے کے باعث ہوا کرتا ہے۔ عمل کی آزادی حیات کی آزادی ہے اور جب زندگی آزاد ہو، وہ صاف فضا میں سانس لے سکے، تو پھر کوئی فرد بھی ذہنی، روحانی اور جسمانی حیثیت سے غلام نہیں رہ سکتا۔ عمل کی قوت بڑی زبردست ہے۔ ایک معمولی عمل بڑی بڑی کی بنیاد بنتا ہے جو تمام انسانوں کی زندگیوں کو بہائے جاتی ہیں، کبھی کی طرف اور کبھی پستی کی طرف اور حیات الٰہی ارتقائی منازل سے گزر بڑھتی جاتی ہے۔

(بشکریہ "شاہین")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے :-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری مئی سنہ ۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا چندہ پانچ روپے بھیج کر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور اس کو ہمارے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم: منیجر "مشیر" کراچی

۱۰۵۷ دارالمطالعہ جماعت اسلامی۔ لائلپور۔ گوجرہ
۱۰۶۰ سید ابوالخیر صاحب اچھرہ
۱۰۶۴ محمد نذیر الدین صاحب بھاولنگر
۱۰۶۷ نیاز محمد صاحب۔ چھور سٹیشن
۱۰۶۹ عاشق محمد صاحب۔ لاہور
۱۰۷۴ عبدالغنی صاحب۔ گڑھی دوپٹہ
۱۰۷۶ سید مظفر علی شاہ صاحب لاہور
۱۰۷۸ چودھری محمد عبدالقادر صاحب۔ کھیالی
۱۰۸۶ انعام اللہ صاحب۔ بغداوہ
۱۰۹۵ ایوب علی خاں صاحب۔ رانی پور
۲۰۰۱ عبدالمتین صاحب۔ رحیم آباد
۲۰۴۹ محمد مصطفیٰ صاحب۔ رامپور
۲۱۰۹ محمد ایوب صاحب۔ باگرٹی
۲۱۳۶ محمد شریف صاحب۔ چکلالہ
۲۱۴۲ ملک خدا بخش۔ بھون
۲۱۴۸ محمد عارف صاحب۔ کوٹلی ستیاں
۲۱۵۲ مکتبۂ جماعت اسلامی۔ منڈی۔ ماموں کانجن
۲۱۶۵ سلطان محمد لیٹی
۲۱۸۳ محمد یونس۔ شیخ خیرالدین۔ گوجرانوالہ
۲۲۳۸ مسعود حسن صاحب۔ ڈھاکہ
۲۲۳۹ ظفر اقبال۔ پشاور
۲۲۴۰ محمد منشا۔ رحیم یار خاں
۲۲۴۱ ابراہیم محمد سیود۔ کراچی
۲۲۴۲ محمد عبدالحق صاحب۔ لاہور
۲۲۴۳ مظفر لطیف۔ کراچی
۲۲۴۴ وجیہہ فاطمہ۔ کراچی
۲۲۴۵ خلیل الرحمن۔ جہالم کلاں
۲۲۴۶ مولانا عبدالمالک۔ ملتان شہر
۲۲۴۷ چودھری محمد شفیع۔ نور پور نون
۲۲۴۸ رسول خاں بھاولنگر
۲۲۴۹ راجہ غضنفر علی۔ مجلوال
۲۲۵۲ ناظم جمعیۃ الطلبا دارالسنت
۲۲۵۳ چودھری محبت خان۔ نین رانجھ

عرش ملسیانی

حیاتِ نو

(شاعر خدا سے ہمکلام ہوتا ہے اور خدا شاعر سے)

حضورِ باری تعالیٰ

ظاہر ضمیرِ شب سے پھر صبحِ پر ضیا ہو ... مجمِ گشتہ کارواں کو جو خضر جسکی رہنما ہو
پھر صبح کی اذاں دے کوئی سرِ ہمالہ ... غرب کا طلسم ڈھا دے بیدار ایشیا ہو
اک آفتابِ تازہ مشرق سے ہو ہویدا ... تارہ وہ ڈوب جائے جو جھلملا رہا ہو
تیرے جہاں میں سارے مرتے ہی جی رہے ہیں ... کوئی نہیں اب ایسا جو نائبِ خدا ہو
پھر جامِ بیخودی میں پھر کھینچے خودی دے ... جاری ہر اک کے لب پر پھر نعرۂ انا ہو
ہو جائے عام پھر وہ جوشِ جنوں دلوں میں ... مشرق کے شاعروں کا زخمِ جگر ہرا ہو
افرنگیت کو پھر سے اصلاح آشنا کر ... راہِ عمل نما پھر میناءِ قرطبہ ہو
معصوم حسن پر ہو کیوں غازۂ تکلف؟ ... گلگونہ آشنا کیوں حسنِ کلیسا ہو؟
نظمِ کہن کو ڈھا دے، دنیا نئی بسا دے ... طوفانِ نوح تازہ ایک بار پھر بپا ہو
رگ رگ میں دوڑ جائے ایک حیات ایسی ... لیکن حیات ایسی، یارب! جو دیرپا ہو

آوازِ غیب

اے غم نصیب شاعر! آنکھیں ہیں بند تیری ... موجودہ شورشوں سے اے کاش آشنا ہو
جسمِ وطن ہوا جب محرومِ روحِ مذہب ... باہم تصادموں سے یہ نظم خود فنا ہو
کہتا ہے تو کہ درہم کر دے نظامِ کہنہ ... تازہ کہن سے تیرے پیدا جہاں نیا ہو
عریاں حقیقتیں ہیں موجودہ شورشوں میں ... اے کاش! واقفیت ان سے تجھے ذرا ہو
پیشِ نگہ ہو تیرے جنگِ جہاں کہ دیکھے ... اس رزمِ خیر و شر کی کس طرح انتہا ہو
دنیا سے تو ہویدا وہ ہو رہی ہے، غافل! ... ہر شرط دید لیکن چشمِ تماشا وا ہو
لیکن حیات تو ہے پیہم سعی میں مضمر ... گر خواہشِ بقا ہو تو زور آزما ہو

ہاں نبرد آزما ہو طوفانِ تند خو سے
کر منقطع تعلق تو حرفِ "لاتقنطوا" سے

مشیرالحق بحری ابادی

احساسِ فرض

گاڑی اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ چھوٹی لائن کی گاڑی اور وہ بھی تیسرا درجہ۔ اس لئے بغیر گرم کپڑوں کے سب سب لوگ گرم ہو رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لکڑی کی دیواروں میں بجلی کے ہیٹر لگے ہیں جس سے چھن چھن کر گرمی نکل رہی ہے، جن لوگوں کو موقع مل گیا تھا وہ سو رہے تھے۔ باقی جاگنے اور سونے کے درمیان تھے۔ ہندو کے سر پر مسلمان کا پیر تھا اور مسلمان کے سر پر ہندو کا، مکمل مساوات کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈبہ کی دنیا ایک نئی دنیا ہے جہاں شیخ و برہمن گلے ملتے ہیں۔ رند و پارسا ساتھ بیٹھتے ہیں، چھوت چھات اور ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ نیند کے جھونکوں اور ٹرین کے ہچکولوں کی وجہ سے بیٹھے ہوئے مسافروں کے سر کبھی لڑ بھی جاتے تھے لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا لیکن اس فضا میں ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی اور تھوڑی دیر بعد جب ٹرین چلنے لگی تو ایک شخصیت ڈبہ میں نمودار ہوئی، سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ملبوس ———— یہ جناب ٹکٹ کلکٹر تھے۔

ٹکٹ ———— ٹکٹ! کھٹ، کھٹ! کی فضا سے درجہ میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ہر شخص کچی نیند سے جاگ کر پہلے تو ٹکٹ کلکٹر کو ایک خاص انداز سے دیکھتا پھر جیبوں کو ٹٹول کر ٹکٹ دکھا دیتا۔

درجہ کے ایک کونے میں کچھ لوگ یکساں قسم کے بیٹھے تھے یکساں کا مطلب یہ نہیں کہ سب کے چہرے مہرے ایک تھے۔ یا سب کے سب ایک قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ نہیں! بلکہ ان کے آپس کے برتاؤ، ہنسی مذاق اور بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ کسی کالج کے طالب علم ہیں ٹکٹ کلکٹر جب ان کے پاس پہونچا تو اس کا استقبال ایک معنی خیز مسکراہٹ اور سگریٹ کیس سے کیا گیا۔ جنگل میں جب ٹکٹ کلکٹر کو سگریٹ سے کر دیا تو اس نے ان سے ٹکٹ مانگنے کی ضرورت نہ سمجھی اور سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا ٹکٹ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس سیٹ پر ایک بڈھا مزدور بیٹھا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے اس کے کندھوں کو ہلا کر کہا:

"بڑے میاں ٹکٹ!"

بڑے میاں نے ایک عجیب بے چارگی سے سر اٹھایا اور بولا:

"بابوجی ٹکٹ نہیں ہے۔ پیسے نہیں تھے۔"

یہ سن کر بابوجی کا "احساسِ فرض" بیدار ہو گیا اور بولے: "پیسے نہیں تھے تو گاڑی میں سوار کیوں ہوئے؟"

بڈھے نے کہا: "ضروری کام تھا۔ مجھے آج ہی رام گنج پہونچنا تھا۔"

"رام گنج جاؤ گے۔!" اتنا کہہ کر ٹکٹ کلکٹر صاحب نے کوٹ کی جیب سے ایک کاپی نکال کر کچھ جوڑا گھٹایا اور بولے:

"نو روپے پندرہ آنے ہوئے ———— لاؤ جلدی نکالو۔"

بڈھا بولا: ———— "سرکار پیسے ہوتے تو پہلے ہی ٹکٹ خرید لیتا۔"

اب ٹکٹ کلکٹر کو غصہ آ چکا تھا، کہنے لگے:

"میری ڈیوٹی یہ نہیں ہے کہ مسافروں کی جیبیں دیکھتا پھروں۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤ۔ پولیس خود وصول کر لے گی۔"

ڈبہ میں کھاگھمی پیدا ہو چکی تھی کچھ لوگ بڈھے کی سفارش کر رہے تھے کہ آپ کا نقصان ہی کیا ہے غریب کے پاس پیسے نہیں ہیں، جانے دیجئے۔ کچھ لوگ ملک کے نا ترقی یافتہ ہونے کا سبب اسی بڈھے کو ٹھیراتے تھے جو قومی خزانہ کو نقصان پہونچا رہا تھا۔ بھانت بھانت کے جملوں اور قسم قسم کی باتوں سے ڈبہ میں مذاق کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ بڈھا دام دینے پر راضی نہ تھا۔ اور ٹکٹ کلکٹر کا فرض انھیں محصول لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

آخر ایک گوشہ سے ایک صاحب اٹھے اور انھوں نے درمیانی صورت یہ نکالی کہ رات ٹھنڈی ہے اور سفر طویل، وقت کسی نہ کسی طور کاٹنا ہی ہے اس لئے بڈھا ایک کہانی سنائے۔ اگر کہانی حقیقت سے قریب ہو تو اس کو رام گنج جانے دیا جائے ورنہ اسے اگلے اسٹیشن پر اتار دیا جائے۔ لوگوں نے اسے

اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب بھی اس پر راضی ہو گئے اور انھیں لوگوں کے پاس بیٹھ کر سگریٹ کیس سے دوسرا سگریٹ سلگایا جنھوں نے پہلے ہی سگرٹ پلا کر قلعہ بندی کر لی تھی۔

بڈھے نے سر اٹھایا۔ ڈبہ میں خاموشی تھی۔ اس نے زور سے کھنکھا کر کہنا شروع کیا:

"بابوجی! بہت پہلے کی بات ہے ہمارے آپ کے جنم سے بھی پہلے کی۔ جب شیطان اور انسان ملا کرتے تھے۔"

ایک صاحب نے بات کاٹی اور بولے: "دیکھو بڑے میاں جھوٹی کہانی کی سند نہیں۔"

نہیں بھیا، جھوٹی کہانی نہیں بالکل سچی کہانی ہے۔ مگر بیچ میں ٹوکو مت اس طرح تو میں بھول جاؤں گا، لوگوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس نے پھر کہنا شروع کیا:

"ہاں تو یہ اس وقت کی بات ہے جب انسان اور شیطان مل سکتے تھے، بات چیت کرتے تھے، اس وقت کسی گاؤں میں ایک بہت بڑا آم کا درخت تھا، کچھ دنوں تک تو وہ درخت صرف درخت رہا لیکن پھر نہ معلوم کس طرح گاؤں میں یہ بات اڑ گئی کہ درخت ایک بزرگ کا گھوڑا ہے بس پھر کیا تھا، اس کو لوگ پوجنے لگے۔ پہلے ایک دو آدمیوں نے اس کی تعظیم کی، اس کے ارد گرد زمین صاف کی، اس کی پتیوں پر لوگوں اور جانوروں کو چلنے سے روکا اور دیکھتے ہی دیکھتے آم کا وہ درخت اس گاؤں کا بہت بڑا بزرگ بن گیا، جس کو جو کچھ مانگنا ہوتا وہ اسی سے مانگتا۔ جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی وہ اسی سے کرتا، اس پر نذر و نیاز چڑھنے لگی، اس کی پتیاں اور ڈنٹھل بیماریوں کے لئے مجرب علاج ثابت ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ وبا ایسی پھیلی کہ پورا گاؤں کا گاؤں بلکہ اور دگر کے کئی گاؤں اس مرض کے مریض ہو گئے — لیکن اسی گاؤں کے ایک صاحب تھے جو ان سب کو خرافات سمجھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح سے یہ وبا ختم ہو جائے لوگ آم کے درخت کو پھر آم کا درخت سمجھنے لگیں لیکن کوئی بھی ان کی بات پر کان نہ دھرتا تھا۔ جب وہ کہہ سن کر تھک گئے تو ایک دن غصہ میں اٹھے کہ جاکر اس درخت کو کاٹ پھینکیں گے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری — درخت اور ان کے گھر کے درمیان ایک سنسان سا میدان پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا وہ کندھے پر کلہاڑی رکھے چلے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کو ایک شخص نہیں کی عمر کا ملا۔ اس نے پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو؟"

انھوں نے کہا: "درخت کاٹنے!"

اس نے کہا: "مت جاؤ"

وہ بولے: "جاؤں گا"

اس نے پھر کہا: "تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ درخت نہ کاٹو!"

وہ بولے: "نقصان فائدہ تو میں جانتا نہیں، لیکن درخت ضرور کاٹوں گا۔"

جب اس نے دیکھا کہ بڑے میاں سمجھانے بجھانے سے نہیں ماننے تو بولا:

"آؤ ہم تم کشتی لڑیں، اگر تم مجھے پٹک دو تو درخت کاٹ دو، اگر میں تم کو پٹک دوں تو تم درخت نہ کاٹو"

بڑے میاں نے اپنے کو دیکھا، اسے دیکھا اور بولے، اچھا آؤ،

اتنا کہہ کر بڈھا رکا۔ کان پر سے بیڑی کا ٹکڑا اٹھا کر بابوجی کی آنچ سے جلایا اور دھواں ڈبے میں بکھرنے لگا۔ ڈبہ کا ہر شخص توجہ سے سن رہا تھا۔ لوگوں کو یہ وقفہ ایسا معلوم ہوا جیسے گاڑی اپنی پوری رفتار سے چلتے چلتے رک گئی ہو۔ تو جس طرح ایسے موقعوں پر گاڑی سے اتر کر زمین پر ٹہلنے والے لوگ ٹہلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح سگریٹ اور بیڑی کے شوقینوں نے دھوئیں بازی شروع کر دی۔ دو تین لمبے لمبے کش لیکر، کھانس کر بلغم باہر پھینکتے ہوئے بڈھے نے پھر کہنا شروع کیا:

ہاں تو دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ کشتی سے فیصلہ کر لیا جائے بڑے میاں نے کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور لنگر لنگوٹ کس کر بولے

آؤ میدان میں —

اور دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ کچھ دیر تک اٹھا پٹک ہوتی رہی۔ کبھی یہ نیچے اور کبھی وہ۔ لڑتے لڑتے دونوں تھک چکے تھے۔ پسینہ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن ہمت نے ساتھ نہ چھوڑا تھا آخر کار بڑے میاں جو درخت کاٹنے جا رہے تھے، انھوں نے ایک ایسا داؤں کیا کہ ان کا حریف چاروں شانے چت تھا۔ وہ اس کے سینے پر فتح مندانہ

...سے بیٹھ کر بولے:

"اب بتاؤ، اب تو میں درخت کاٹ سکتا ہوں۔"

ہاں کاٹ تو سکتے ہو لیکن آؤ معاملہ کر لیں۔

کیسا معاملہ —!

تم درخت نہ کاٹو، اس کے بدلے میں تم کو ہر صبح تکئے کے نیچے کچھ روپے مل جایا کریں گے۔

بڑے میاں کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:

"مگر اس میں دھوکہ نہ ہو"

نہیں، نہیں آپ بالکل اطمینان رکھئے۔ بڈھا بولا: "جب تک آپ زندہ رہیں گے تب تک یہ رقم آپ کو ہر صبح ملتی رہے گی۔"

بڑے میاں اس معاملہ پر راضی ہو گئے اور کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھ کر گھر واپس آ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ رات کو سوئے، صبح اٹھتے ہی انھوں نے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا تو پانچ روپیہ کا ایک نوٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے اس کارنامہ پر انہیں بہت مسرت ہوئی کہ زندگی میں بھی تو ایک کام ہوا ہے جس سے پانچ روپیہ روز کی آمدنی ہو گئی۔

کئی روز گذر گئے۔ انہیں ہر صبح پانچ روپیہ تکیہ کے نیچے ملتے رہے اور درخت کی عبادت اسی زور شور سے ہوتی رہی۔ کچھ دنوں بعد انہیں روپیہ ملنا بند ہو گیا دو ایک روز تو انھوں نے انتظار کیا جب روپیہ نہ آیا تو سمجھ گئے کہ بڈھے نے انہیں دھوکہ دیا اور ایک دن پھر کلہاڑی لیکر چلے کہ آج تو اس درخت کو بالکل جڑ سے کاٹ کر پھینک دوں گا ——

جب وہ میدان میں پہونچا تو وہی بڈھا انہیں پھر ملا اور بولا: "کہاں جا رہے ہو؟"

انھوں نے کہا: "اسی درخت کو کاٹنے جس نے لوگوں کو شیطان کا پجاری بنا دیا ہے۔"

بڈھا یہ سن کر زور سے ہنسا اور بولا: "میں نے تو تم سے اسی مرتبہ کہہ دیا تھا کہ تم اس درخت کو نہیں کاٹ سکتے۔ اب پھر تم خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہے ہو۔"

کیسے نہیں کاٹ سکتا! اس مرتبہ تم نے مجھے دھوکہ دیا اور میں چلا گیا تھا لیکن اس مرتبہ تو یا میں رہوں گا یا وہ درخت۔

دونوں ہی رہیں گے —— بڈھے نے مسکراتے ہوئے کہا

نہیں، صرف ایک! بڑے میاں نے کہا۔

اچھا آؤ، یہیں فیصلہ کر لیں، تم مجھے درخت سمجھو اگر مجھے کشتی میں پچھاڑ دو تو سمجھو کہ درخت کٹ گیا، اگر نہ پچھاڑ سکو تو واپس چلے جانا۔

لیکن اس مرتبہ میں کوئی معاملہ نہ کروں گا۔ بڑے میاں نے کہا

ہاں ہاں —— کوئی معاملہ نہیں، بس، دو ٹوک فیصلہ، یا تم یا درخت

اچھی بات ہے آؤ۔

اور دونوں پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے لیکن بڑے میاں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کے بڈھے حریف نے چند سکنڈ میں انھیں چت کر دیا اور بولا: "اب بتاؤ۔"

بڑے میاں نے غصہ سے کہا

"ایک مرتبہ اور —"

اور وہ پھر راضی ہو گیا۔ اس طرح تین مرتبہ دونوں لڑے اور تینوں بار بڈھے نے بڑے میاں کو پچھاڑ دیا۔

تیسری مرتبہ جب بڑے میاں شرمندگی کے ساتھ کھڑے ہوئے تو بڈھا بولا:

"حضرت! میں آدمی نہیں ہوں بلکہ وہی شیطان ہوں جس کی پوجا درخت کے بھیس میں ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ آپ اپنے فرض کی پکار پر آئے تھے آپ کی کوئی غرض نہ تھی۔ اس لئے آپ کی مدد قدرت کر رہی تھی اور اسی وجہ سے مجھے شکست ہو گئی لیکن اس مرتبہ آپ فرض کی پکار پر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے روپیوں کی وجہ سے آئے تھے اس لئے آپ کے ساتھ قدرت کی مدد نہ تھی۔ اور میں نے آپ پر فتح پالی۔ میں تو صرف اسی سے ہارتا ہوں جو بے غرض مجھ سے جنگ کرے۔ اتنا کہہ کر وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔

بڑے میاں میں پھر اتنی ہمت نہ رہی کہ وہ درخت کو کاٹنے جائیں نہ جانے کہاں سے ان کے دل میں یہ بات آ گئی کہ میں تو اکیلا ہوں اور درخت کے پجاری تو بہت سے ہیں میں اکیلا ان کا مقابلہ کس طرح کر سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ بات پہلے کبھی ذہن میں آ سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ اپنے گھر واپس آ گئے اور درخت کی پوجا ہوتی رہی۔

بڈھا خاموش ہو گیا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر پہونچ رہی تھی۔

ٹکٹ کلکٹر بلا! "مجھی یہ انسان اور شیطان کی کہانی حقیقت سے بہت دور ہے۔ تم نے تو وعدہ ہوا تھا کہ کبھی کہانی سناؤ گے؟"

"یہ حقیقت سے دور نہیں ہے بابوجی!" بڈھا اٹھتا ہوا بولا "یہ رام گنج کا اسٹیشن ہے۔ میرے پاس ٹکٹ بھی ہے، یہ دیکھئے ———

ٹکٹ نہ ہونے کا بہانہ تو میں نے اس لئے کیا تھا کہ ذرا دیکھوں آپ کتنے پانی میں ہیں ——— فرض کی بجا آوری صرف مجھ ہی پر ہوتی ہے یا ان لوگوں پر بھی جن کے سگرٹ بہت بیدردی سے آپ پھونک رہے ہیں۔

ڈبہ میں ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ گاڑی رک چکی تھی بڈھا اتر کر چلا گیا۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب بھی وہاں نہ رک سکے۔ لیکن بڈھے کی کہانی بہت سے مسافروں کے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

"کہ تم میں سے کون ایسا ہے جو دولت سے فائدہ پر فرض سے دستبردار نہیں ہوجاتا؟"

(بشکریہ "تعمیر" لکھنؤ)

ابوالخطیب

یہ کون جاگا؟

(مسلسل ناول)

اس کا نام کمال تھا لیکن اب اس نے خود کو اکمل لکھنا شروع کر دیا تھا تاکہ نام کی معنوی بلندی اسے آگے بڑھنے میں مدد دے سکے۔ یہ ایک طوائف کا لڑکا تھا۔ قد لمبا گول مٹول چہرہ، اس میں دو چھوٹی چھوٹی بادام نما آنکھیں ہر وقت محبت اور خلوص سے چمکا کرتیں بھوری بھوری پلکیں ان پر جھالر کی طرح پڑی رہتیں اور ان کی اوٹ سے یہ چمکتے ہوئے دیدے تھرکتے ہوئے بڑے پیارے معلوم ہوتے ناک بھی قد کی مناسبت سے قدرے بیضوی تھی۔ دہانہ بھی کچھ زیادہ بڑا نہ تھا جب اس پر مسرت کا کوئی لمحہ گذرتا تو اس کے چہرے کے سارے خد و خال ابھر کر چمکنے لگتے۔ اس کی فطری معصومیت اور خلوص اس پر خون کی سرخی کی طرح چھپا ہوا محسوس ہوتا وہ سب سے بڑے پیار محبت سے ملتا اور ہر ایک چھوٹے بڑے کی تعظیم کرتا لوگ اس کے اس اخلاق سے متاثر ہوتے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ ایک طوائف کا لڑکا ہے تو یکایک سب کے رویہ میں روکھا پن آجاتا اور اس سے ملنے جلنے سے پرہیز کرتے اس غیر انسانی سلوک سے اس کا دل ٹوٹ جاتا بد حواسی اس پر چھا جاتی جب تک یہ سلوک اس پر چھایا رہتا اس وقت تک اچھے اچھے کپڑے وہ نہ پہنتا حالانکہ نئی تراش خراش کے کپڑوں کا وہ بڑا شوقین تھا اس مجروح عالت میں کبھی کبھی اچھے کپڑے پہننے کی ہوک سی اٹھتی لیکن اس وقت وہ اسے بیکار نظر آتے کیوں کہ جب اس کا ہی احترام نہ کیا جاتا تو ان کپڑوں کو کون پسند کر کے اسے داد دیتا اس لئے جب تک یہ بدحواسی اس پر طاری رہتی وہ اچھے اچھے کپڑے بالکل نہ پہنتا اور تنہا بازاروں میں گھوما کرتا لیکن دوسروں سے بے غرض محبت کرنا تو اس کی عادت تھی آخر اس عادت سے وہ کب تک باز رہتا اس لئے جب کبھی محبت کا اس پر دورہ سا پڑتا تو وہ محلّے کے بچوں کو ڈر ڈر کر پیار کرتا کہ کہیں یہاں بھی اسے جھڑک نہ دیا جائے اس اظہار محبت کے علاوہ وہ کبھی محلے میں کوئی اندھا یا اپاہج روٹیاں مانگتا نظر آجاتا تو خود اسے محلے کے چبوترے پر بٹھا کر گھر گھر سے اس کے لئے روٹیاں جمع کرتا پھرتا اور اس طرح وہ اپنی انسانی محبت کو تسکین دیتا رہتا۔

لوگوں کی بے اعتنائی نے نہ صرف اس کے جذبات کو ہی پست کر دیا بلکہ اس کی فطری صلاحیتیں بھی دب کر رہ گئیں تھیں کیونکہ ماحول میں ان کی نکاسی اور پرورش کا کوئی سامان نہ تھا اس لئے وہ اداس دل کو لئے اپنے شہر کے جنگلوں اور پارکوں میں گھوما کرتا اسی اثنا میں ہندوستان میں ۱۹۴۲ء کی جنگ آزادی کا دھماکہ ہوا تو اس میں پھر کچھ حرکت پیدا ہوئی "کہ اس موقع پر میں اپنے ملک کی جنگ آزادی میں حصہ لوں اور خود کو قوم و ملک کا وفادار ثابت کر دوں شاید لوگ میرے ساتھ برابری کا سلوک کر کے عزت و محبت سے پیش آئیں تاکہ خوشی خوشی میں بھی اس دنیا میں ترقی کروں"!

اس تجویز سے اس کا دل مطمئن ہو گیا اور اس نے دوسرے ہی دن اسکول میں اسٹرائیک کی کوششیں شروع کر دیں اور یکایک پورے اسکول میں ہڑتال ہوئی سارے اسکول کے لڑکے کلاسوں سے باہر نکل آتے اور انگریزوں کے تشدد کے خلاف نعرے لگاتے رہے اکمل ان سب میں آگے تھا۔

کچھ لڑکوں کو یہ بات بڑی ناگوار گزری انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ اسکول کی لیڈر شپ ان کے ہاتھ سے جا رہی ہے دوسرے دن اسکول میں لڑکے جمع ہوئے تو ان سب کے کان بھرے جا چکے تھے۔

"رنڈی بچہ تمہاری رہنمائی کرے، اس کے حسب نسب کا کیا ٹھیکا یہ کیا وفا کریگا، اپنی آنکھوں کے سامنے سولی پر چڑھوا کر الگ جا کھڑا ہو گا"

اس کے بعد پولس بھی آپہونچی، سنگینیں تن گئیں لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے اکمل اور اس کے ساتھیوں نے انہیں پکارا لیکن کسی نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تیسرے دن جب اکمل اسکول گیا تو اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے چپ چاپ اپنے گھر چلا آیا پلنگ پر آ کر لیٹ گیا اور سوچ میں پڑ گیا "لوگ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں اگر میں رنڈی کے گھر میں پیدا ہوا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور، دنیا نسل خاندان پر آ جیا

کو کہیں پڑ سکتی ہے۔ ان سوالات نے اس کے درد کو قدرے کم کر دیا اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ارمانوں پر سے شعور کی گرفت ڈھیلی کر دی تاکہ اس طرح سوالات کے تصور میں وہ کچھ تسکین پالیں دیر تک وہ آنکھیں بند کئے پلنگ پر پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے نیم کے پیڑ پر ایک بندریا بیٹھی اپنے ایک بچے کے سر میں سے جوئیں بین رہی تھی۔ اسے ایک دم ہنسی آگئی۔ دل کا بوجھ ادھ ہلکا ہو گیا اور اسے کچھ قرار آگیا۔

اسٹرائیک کی وجہ سے اسکول سے اس کا اخراج ہو چکا تھا دنیا اور دنیا والوں سے اب اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف برگ و شجر اس کے مونس و غمگسار تھے وہ اب گھر میں بھی زیادہ عرصے تک نہ بیٹھتا کیوں کہ آدمیوں میں بیٹھ کر وہ ایک ذہنی اکتاہٹ میں مبتلا ہو جاتا صرف کھانے اور سونے کے اوقات وہ گھر آتا اور دن دن بھر وہ ہرے بھرے کھیتوں یا جنگلوں میں پھرا کرتا لیکن وہاں بھی اسے انسان نظر آجاتے تو وہ پھر کسی اونچے ٹیلے کی اوٹ میں اگر کسی گھنے پیڑ کے سائے میں بیٹھ جاتا ماں اس روش کو اس کی والدہ ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی ایک دن دوپہر کے وقت وہ کھانا کھانے گھر پر آیا۔ ہوا نے اس کے بالوں کو ڈوبنی طرح الجھا دیا تھا جن پر دھول کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ آنکھیں بیزار اور سرخ تھیں ہاتھ میں ایک مڑا ہوا اخبار تھا اور پیروں میں چپل ماں اسے اس حال میں دیکھ کر تڑپ گئی کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی، باورچی خانے میں کھانا نکالا، اور اس کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ اکمل نے فوراً ہی کھانا شروع کر دیا اور ماں قریب بیٹھ کر پنکھا جھلتی رہی۔ کھانا ختم ہو گیا تو اکمل حسب معمول بغیر کچھ کہے اٹھا تو ماں نے رونی سی صورت بنا کر اس سے کہا: "بیٹا بیٹھ جا، نہ تو اسکول جاتا ہے نہ تو کوئی اور کام کرتا ہے۔ ایسی زندگی کب تک گذارے گے؟"

ماں کا سوال سن کر اکمل دیر تک ماں کو دیکھتا رہا۔ اس کا منہ بند تھا آنکھیں کسی اندرونی جذبے کی کشمکش سے سرخ ہوتی جا رہی تھیں کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ ہلنے لگے، اسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"میرے لال!" ماں نے بیٹے کی آنکھوں کو آبدیدہ دیکھ کر اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"امی لوگ ہماری عزت نہیں کرتے کیا تم اختر اور شمیم کو کرسے پر سے نہیں اٹھا سکتیں اس بیٹے کو اب ہمارے گھر سے نکل جانا چاہیئے" اکمل جب اپنی بات ختم کر چکا تھا تو اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے اپنے چہرے کو ماں کی گود میں چھپا لیا۔ امی اس بات کو سن کر سکتے میں آگئیں۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا ہاں کبھی کبھی گہرے غور و خوض میں ڈوبی ہوئی امی کی آنکھیں جھپک ضرور جاتیں اس مستقل درد کے اظہار سے اکمل کو کچھ تسکین ہوئی وہ ماں سے کچھ کہے بغیر پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ اور ماں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا۔

رات گئے اکمل گھر آیا امی انتظار کر رہی تھیں۔ اکمل خلاف معمول آج باورچی خانے میں نہ آیا بلکہ اپنے سونے کے کمرے میں جانے لگا۔

"کمالو! کیا آج کھانا نہیں کھائے گا، تیری بہنوں نے آج تیری پسند کے کباب پکائے ہیں۔"

"جی نہیں امی۔ آج جی نہیں چاہ رہا۔"

تھوڑی دیر بعد امی کھانا اور پانی اسی کمرے میں لے آئیں۔ اکمل ماں کو کمرے میں آتا دیکھ کر تعظیماً اٹھ بیٹھا اور بتی جلائی۔

"امی اتنی رات گئے آپ یہ کیا کرتی رہتی ہیں مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے؟"

"کمالو میں جانتی ہوں کہ تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ کچھ لقمیں الفاظ دیکھو کباب تمہاری بہنوں نے کیسے پکائے ہیں۔"

اکمل مجبوراً کھانے پر بیٹھ گیا اور مشکل سے ایک روٹی ہی کھائی ہو گی کہ اندر سے پھر اداسی اور اکتاہٹ نے اس پر حملہ کیا تو اس نے روٹی کا نوالہ انگلیوں کی گرفت میں لے کر چھوڑ دیا۔

"بیٹا میں خود بہت تھوڑے کباب لائی ہوں ان سب کو کھا جاؤ"

"امی زیادہ مجبور نہ کیجئے ورنہ میری طبیعت خراب ہو جائیگی"، اکمل نے یہ جملے قدرے بیزاری کے انداز میں کہے ماں نے کھانا اٹھایا اور لے کر باہر چلی گئی اکمل نے پھر بتی بجھائی اور مسہری پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد پھر آہٹ ہوئی اس کے بعد آواز آئی۔

"کمالو"

جی ——— اکمل مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا امی کمرے میں آکر اور بتی جلا کر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

اس وقت ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اور ماں کی آنکھیں کسی بڑے بوجھ کو سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی تھیں تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے البتہ اکمل کبھی کبھی جمائی لے لیتا۔

کمالو! صبح میں نے جو بات کہی کیا تم نے اس پر غور کیا انشاءاللہ اب تم بڑے ہو گئے ہو تمہیں اب خود اپنی عقل سے بھی کام لینا چاہیئے۔ اگر ہمارے گھر سے یہ پیشہ چلا جائے تو کیا ہماری عزت ہو جائے گی۔ یہ لوگ کیا ہمیں اپنے برابر بٹھا سکیں گے۔ بیٹی بیاہ کر سکیں گے۔ میرے لال اس دنیا میں تو شریف وہ ہے جو بڑے خاندانوں میں پیدا ہوا۔ یا جس کے پاس سونے کا ڈھیر ہو شریف کام کرنے سے اس دنیا میں کوئی شریف نہیں بنتا۔ لڑکپن مت کر۔ اپنی زندگی بنا۔ پڑھنا لکھنا شروع کر دے۔ اگر تو بی اے کر لیگا تو میرے پرانے جان پہچان والے ریٹائرڈ ڈسٹی مجسٹریٹ ہیں ان کی سفارش سے تجھے کہیں نوکری مل جائیگی اور زندگی آرام سے گزرے گی ان جھگڑوں کو چھوڑ جب سے یہ دنیا قائم ہے یہ اس میں رہتی آئی ہے۔

امی! کیا یہ کام اچھا ہے؟

امی اس سوال کو سن کر گھبرا اٹھیں۔ ان کی پلکیں آنکھیں شرم سے جھک گئیں کیوں کہ بیٹے نے اس قسم کے سوال کبھی نہ کئے تھے۔ گردن جھکی رہی خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی تھی امی کے بوڑھے ذہن میں معاً ایک بات آئی۔ کمالو اب لڑکا بچہ نہیں کہ ڈرانے دھمکانے سے دب جائے اب ان سوالوں کے جواب اسے دینا ہی چاہیئے تاکہ اپنا آگا پیچھا سوچنے کی اس میں ابھی سے عادت پڑے۔

ہاں امی بتاؤ۔ اکمل نے پھر پوچھا۔

نا۔ بیٹا۔ اچھا کام اسے کون کہتا ہے۔ لیکن اسے چھوڑ کر ہم کریں کیا!

امی: اگر یہ کام برا ہے تو اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ دنیا کے لئے نہیں اپنے لئے یہ خود اپنے دل کو برا معلوم ہوتا ہے —— ہمارا اپنا جی کڑھتا ہے ہمیں شرم آتی ہے —— ہمارا سر نیچا ہوتا ہے —— بس میں اتنا ہی جانتا ہوں ان فقروں کو کہتے ہوئے اکمل نے اپنے سر کو اونچا کر لیا اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اچھا اس کے بعد پیٹ کس طرح بھرے گا، ماں نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

اکمل نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ پنسل سے مسہری کے تکیے پر لکیریں سی بنانے لگا۔

ہاں کہو بیٹے! کیا سوچا جواب دو۔ ماں کے لب و لہجہ میں اس وقت بزرگانہ زور پیدا ہو چکا تھا۔

امی: ابھی ہمارے پاس کچھ رقم ہے اسی کو بیٹھ کر کھایا جائے۔ پھر میں ——————

"بیٹے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ انسانوں کی باتیں کر اسے کھا کر پھر کیا ہوگا۔" ماں آپے سے باہر ہو گئیں۔ اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

(باقی آئندہ)

فیروزنظر

وطن سے خطاب

(موجودہ نظام کے نام بہت بہت پیار کیساتھ)

اقتضائے وقت تھا تجھ سے جدا ہو جاؤں میں
آخرش کرنا پڑا مجھ کو سرِ تسلیم خم

وقتِ رخصت کا وہ منظر اب بھی مجھکو یاد ہے
میرے لب بھی تھے فسردہ تیری آنکھیں بھی تھیں نم

کس قدر بے تاب ہوں میں تجھ سے ملنے کیلئے
کاش تو بھی جان سکتا اے مرے پیارے وطن!

کھا رہا ہوں گرچہ ہر اک گام پر لاکھوں فریب
کر رہا ہوں پھر بھی ہر ایک گام پر لاکھوں جتن

اب بھی دیتا ہوں میں اہلِ گلستاں کو اک پیام
سی دیئے ہیں باغباں نے میرے لب، تو کیا ہوا

میرے ارماں کا تو مدفن ہے تری آغوش میں
تو "دیارِ غیر" کہلاتا ہے اب، تو کیا ہوا

توڑ ڈالوں گا کہن سالہ نظامِ کائنات!
وقت کے بربط پہ نغماتِ خوشی گاؤں گا میں

اے وطن! اے میرے قلب و جان سے پیارے وطن!
تیرے قرباں تجھ سے ملنے کو ضرور آؤں گا میں

نسیم محبوبی

○

تا کجا اہرمنا تیری شاہی
اہلِ یزداں کی کب تک تباہی

دور ہو گی یہ شب کی سیاہی
مسکرائے گی پھر صبح گاہی

ہاں شہیدوں کا ہر قطرۂ خوں
کل قیامت میں دیگا گواہی

تم انھیں خاک کرنے چلے تھے
جاوداں ہو گئے حق کے راہی

نائلہ۔ لاہور

سراب

غسل کے بعد وہ ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ بیڈ روم میں اس وقت سبز رنگ کی لائٹ جل رہی تھی۔ اس لائٹ میں کمرے کی ہر چیز خوابیدہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے اس رنگ کی لائٹ بیحد پسند تھی کیوں کہ اس سے کمرے کی ہر چیز حسین دکھائی دیتی۔ دنیا کی ہر خوب صورت چیز اُسے پسند تھی چاہے کسی رنگ میں ہو وہ اُس پر جان دیتی تھی۔ یہی اُس کے بیڈ روم میں بہت سی خوبصورت چیزیں تھیں جس سے اس کا کمرہ ایسے معلوم ہوتا جیسے کسی الف لیلوی شہزادے کی خواب گاہ ہو۔ ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آکر اُس نے جھک کر ایک نظر اپنے آپ کو دیکھا اور پھر گنگنانے لگی۔ اُس کی مدھر آواز اس حسین اور دلفریب کمرے میں ایسے گونجنے لگی جیسے چاندی کی ننھی منی گھنٹیاں آپس میں ٹکرا رہی ہوں۔ یک لخت اُس کی نظر کلاک پر پڑی۔ گھبرا کر اُس نے لباس تبدیل کرنا شروع کیا "اُدھو بہت دیر ہو گئی نغمہ، فردوس، بشریٰ انتظار کر رہی ہوں گی۔" جلدی سے اُس نے گرین لائٹ کو آف کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے قمقموں کو روشن کر دیا۔ رنگ برنگ قمقموں کا عکس آئینہ میں پڑنے لگا اور آئینہ یوں معلوم ہونے لگا جیسے صاف شفاف سمندر کی سطح پر رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ بالوں کو ایک خاص انداز سے جھٹکا دیکر اُس نے پیچھے گرا دیا اور دراز سے میک اَپ کا سامان نکالنے لگی۔ آئینہ میں وہ اپنا عکس دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دی۔ جھلملاتی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد حسین دکھائی دے رہا تھا۔ "اگر میں نہ بھی میک اپ کروں تو میری دلآویزی میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔" لیکن اس نے اس خیال کو جلدی سے دل سے جھٹک دیا "سوسائٹی میں ان کی کوئی قدر نہیں جو اس فن سے محروم ہوں اور میں تو میک اپ کرنے میں ماہر ہوتی ہوں۔" فخر سے اس کی گردن تن گئی اور وہ زور شور سے پینٹ کرنے لگی "آج تو اس انداز سے بال بناؤں گی کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں۔" چہرے پر پوڈر لگاتے دیتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ ہر کوئی اس کی نقل اتارتا ہے جو کچھ میں فیشن کر کے جاتی دوسرے دن تمام کالج نے نقل اتاری ہوتی ہے۔ اس بات پر اسے بیحد ناز تھا۔ پوڈر کو ٹھیک کرتے ہوئے اس کی نظر اچانک ایزر پر پڑی ہوئی "ثریا" کی تصویر پر جا پڑی۔ ثریا اس کی پسندیدہ سٹار کتنی خوب صورت تصویر ہے۔ اُسے خیال آیا کہ اس کی اپنی شکل بھی تو ثریا سے ملتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ تیری شکل ہو بہو ثریا جیسی ہے۔ "واقعی ملتی ہے" اُس نے آئینہ میں اپنی شکل کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "دانت تو میرے بالکل اس جیسے ہیں" اور وہ یونہی بلاوجہ ہی مسکرا دی اس کے صاف شفاف دانتوں کی ایک شعاع آئینہ پر پڑی "ثریا نے کس قدر شہرت حاصل کی ہوئی ہے کاش میں ثریا ہوتی یا میرے گھر والے ذرا آزاد خیال ہوتے تو میں اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کر سکتی تھی۔ کاش میری قسمت بھی اس کی طرح چمکتی ہوتی" ایک ٹھنڈی سانس اس کے منہ سے نکل اور اس کی نمی سے آئینہ دھندلا پڑ گیا۔ "میں ثریا ہوں گی اگر حالات نے ساتھ دیا تو۔" کیسے ایکٹنگ کی تھی اس نے فلم میں پف نیچے رکھ کر اس نے نقل اتاری اور گھبرا کر پیچھے دیکھنے لگی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ لپ سٹک لگاتے خیال آیا کہ "کیا شاید میں ضد کروں تو اجازت دیدیں لیکن امی کبھی نہ دیں گی ان کا بس چلے تو ملانی بنا کر رکھ دیں۔ کاش "ثریا" کی نانی کی طرح میری بھی امی ہوتی تو میری پبلسٹی میں خود کوشش کرتیں مگر ایسی قسمت کہاں"۔ خیالات کے بھٹکنے پر اس کی لپ سٹک بھی بہہ نکلی "ہائے یہ کیا ہو گیا سارا منہ خراب ہو گیا۔" رومال سے اُس نے منہ صاف کیا اور دوبارہ لگانی شروع کی۔ لپ سٹک کی نوک سے اس نے ہونٹوں پر خم بنا دیا جس سے اس کا چہرہ بے حد بھدا دکھائی دینے لگا جیسے کوئی ننھا سا بچہ منہ بسور رہا ہو۔ میک اپ ختم کر کے اس نے تنقیدی نظروں سے آئینہ میں اپنا جائزہ لینا شروع کیا لیکن آپ اس کی مرضی کا نہیں ہوا تھا پرے زور زور سے ہنے اور ردی تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی "بجی کمال کرتی ہو ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئیں۔" ردی نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ "ردی پینٹ میری مرضی کا نہیں ہوا۔" "اتنا اچھا تو ہے آج تو ہو بہو ثریا کی تصویر لگ رہی ہو اگر کوئی تُمہیں چھاپے اور تمہیں دکھائے تو کوئی پہچان نہ سکے۔" "نہ بھئی

ہمیں ایکٹرسوں سے نہ ملایا کرو۔" نجمہ سے بظاہر بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "روشنہ نہیں جا رہی؟" روحی نے پوچھا۔ "نہیں امی نے نہیں جانے دیا وہ مجھے بھی جانے سے روک رہی تھیں کہ رات کے وقت مت جاؤ ویسے بھی مجھے پارٹیوں پر جانے پر منع کرتی رہتی ہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ ابھی سے کون اپنے دل کو مارے۔ یہی تو عیش کرنے کے دن ہیں۔" "اور کیا؟" روحی نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "چلو اب چلیں۔" روحی نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو ذرا ماتھے سے پاؤڈر ٹھیک کر لوں۔" نجمہ پوڈر ٹھیک کرنے لگی اور روحی نے ریڈیو کھول دیا۔ "بھئی تمہارا کمرہ تو ایسا ہے جیسے کسی شہزادی کی خواب گاہ ہو کتنی خوش قسمت ہو جسے ایسا کمرہ رہنے کے لئے ملا ہو۔" "کمرہ کوئی حسین نہیں کمرے کی چیزیں ہی خوبصورت ہیں بڑی مشکل سے ضد کر کے منگوائی ہیں تم پہلے بھی آئی تھیں کیا خوبصورتی تھی اس کمرے میں۔ ان چیزوں اور قمقموں سے میں نے ہی اسے سجایا ہے وہ پکچر تم نے بھی دیکھی ہو گی جس میں ایک کمرے کا سین دکھایا گیا تھا۔ کتنا خوبصورت کمرہ تھا۔ بس میں نے ویسے ہی اپنے کمرے کو ترتیب دی ہے۔" ریڈیو گرم ہو چکا تھا اور کہیں فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ طبلے کی تھاپ پر روحی کے پاؤں بھی تھرکنے لگے۔ "ہیں تمہیں ڈانس بھی آتا ہے؟" نجمہ نے تعجب سے پوچھا۔ "لو تو میں ایسے ہی فلموں پر روپیہ برباد کرتی ہوں میں تو تقریباً تمام قسم کے ڈانس سیکھ گئی ہوں۔" روحی "میں نے بہت سی فلمی تصویریں منگوائی ہیں راشدہ بھی اسکول سے بہت سی تصویریں لائی ہے دکھاؤں یا آ کر دیکھو گی۔" نجمہ نے تپائی سے اٹھتے ہوئے کہا، "نہیں بھئی آ کر دیکھوں گی پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے" روحی نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔ "صورتیں پسند تو ایسی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ویسے ہی بن کر تصویریں اتروائیں" "کیوں نہیں۔" روحی نے جوش سے جواب دیا۔

پارٹی میں شدت سے ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی سب کی نظریں آنے والوں پر اٹھیں اور پھر سب طرف نجمہ ہی چھا گئی۔ قمیض کی کٹنگ، شلوار کے پائنچے، لپ سٹک لگانے کا ڈھنگ غرض ہر طرف نجمہ ہی نجمہ تھی اطلاع پاتے ہی باورچی خانے سے شاہدہ، بشریٰ، نسرین بھاگتی ہوئی آئیں۔ "بہت انتظار کروایا۔ بھئی آج تو ثریا کو بھی مات کر دیا۔ غضب کی لگ رہی ہو" ہر طرف نجمہ جانی، دبی دبی آوازیں آنے لگیں اور نجمہ بے نیازی سے مسکرا رہی اور پھر ڈرائنگ روم نگار خانہ بن گیا فلمیں ڈسکس ہو رہی ہیں پاس [illegible] ریکارڈنگ ہو رہی۔ ڈرائنگ روم کے کسی کونے میں گانوں کو ترتیب دی جا رہی تھی اور کہیں ہیرو ہیروئن کا انتخاب ہو رہا تھا اور کہیں ایک دوسرے کی شکلیں فلمی پریوں سے ملائی جا رہی تھیں تمام ڈرائنگ روم میں فلمی ہی پریاں دکھائی دے رہی تھیں اور نجمہ اپنے آپ کو سب ہی سے بہتر خیال کر رہی تھی اور سہیلیوں نے بار بار اسے ثریا ثریا کہہ کر اسے یقین دلا دیا کہ وہ ثریا ہی ہے اور اگر فلم میں کام کرے تو کوئی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اور جب وہ وہاں سے لوٹی تو اس کا ذہن بری طرح جل رہا تھا اور ایک ہی بات اس کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی کہ اگر میں فلم میں کام کروں تو کوئی میرے پائے کو نہیں پہنچ سکتا۔ دولت، عزت، شہرت اس کے قدم چومیں مسرت سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں رنگین خیالوں سے اس نے ایک منٹ بھی جدا ہونے کو دل نہ چاہا اور وہ بغیر کپڑے بدلے ہی پلنگ پر لیٹ گئی۔ فلمی پریاں کتنی عزت اور شہرت ہوتی ان لوگوں کی۔ ہر جگہ ان کا نام لیا جاتا ہے اور دولت الگ۔ یہی لوگ صحیح معنوں میں زندگی گزارتے ہیں میں فلم سٹار بنوں گی۔ اور اگر امی نے اجازت نہ دی تو، وہ تو کبھی بھی نہ دیں گی اور کب تک میں حالات کے سازگار ہونے کے لئے بیٹھی رہوں۔ تب تک تو شاید بوڑھی بھی ہو جاؤں۔ پھر کیا مزہ چھوٹی عمر میں ہی شہرت حاصل کرنے میں لطف ہے کل اخبار میں اشتہار آیا تھا کہ اداکاری کے شائقین کے لئے سنہری موقع۔ کیوں نہ میں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور چلی جاؤں لیکن مجھے گھر کو چھوڑنا پڑے گا اس گھر میں رہ کر میں ایسا کام نہیں کر سکتی۔ گھر کو چھوڑنا پڑے گا ماں باپ بہن اور سہیلیوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیا میں رہ سکوں گی ان کے بغیر۔ راشدہ کے بغیر راشدہ جس سے مجھے بے انتہا محبت ہے جس کو میں ایک منٹ نہ دیکھوں تو مجھے چین نہ پڑتا اور امی، شاید امی کے بغیر رہ لوں لیکن راشدہ اور ابا کے بغیر تو مشکل ہے اور پھر یہ کمرہ بھی مجھے چھوڑنا پڑے گا جہاں آ کر مجھے دلی سکون حاصل ہوتا ہے اور پھر اس نے ایک نظر کمرہ کی طرف دیکھا اور ثریا کی تصویر پر جو نہی اس کی نظر پڑی تو دل کے کسی کونے سے آواز آئی۔ جب تو فلم اسٹار بن جائے گی دولت تیرے قدم چومے گی اور ایسے لاکھوں کمرے بنوا سکے گی اور ماں باپ بہن بھائی سب کو کسی نہ کسی دن تو چھوڑنا پڑے گا کیوں نہ اسی وقت چھوڑ دے اور اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ "جب صبح ہو گی تو میری پہلی کوشش یہی ہو گی اس جگہ جاؤں جہاں اداکاری کے لئے موقع دیا جاتا ہے شکر ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ترقی ہونے لگی ہے اور موجودہ زمانے میں ایسے ادارے وجود میں آ گئے ہیں جو شائقین کی مشکلیں حل کرتے ہیں اور ان کو موقع بہم پہنچاتے ہیں کہ وہ اپنا شوق پورا کر سکیں۔ اگر کسی نے

اعتراض کیا تو؟ اس نے دل میں سوچا۔ تو کہہ دوں گی کہ آرٹ کی خدمت کر رہی ہوں۔ آرٹ کی خدمت اور سرپرستی کرنا بھی ایک بہت بڑا فن ہے۔ اس کوشش دینچ میں اس نے صبح کر دی اور صبح تک کئی دفعہ اس کا ارادہ لوٹ کر جڑ چکا تھا اور بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ چائے پی کر وہ جلدی سے کمرے میں آئی اور چند چیزیں لیکر وہ کمرے سے باہر آئی۔ اس کا دل بُری طرح لرز رہا تھا۔ کمرے سے قدم باہر رکھتے ہی اس کا دل بھر آیا۔ آخری مرتبہ اس نے کمرے کی طرف دیکھا اور آنسو اس کی آنکھوں میں اٹک گئے۔ "اب یہ کمرہ میں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ جہاں رات کو سبز رنگ کی لائٹ جلتی ہے۔ جس کے ڈریسنگ ٹیبل پر رنگ برنگ کے قمقمے جلتے ہیں اس کا دل چاہا کہ واپس لوٹ جائے۔ لیکن اُسے خیال ہے کہ اگر واپس لوٹ گئی تو شوق کبھی پورا نہ ہوگا۔ اس گھٹے گھٹے ماحول میں رہکر امنگیں بھی گھٹ جائیں گی ارمان چار دیواری میں دب جائیں گے۔ سنہرے سپنے کبھی پورے نہ ہو سکیں گے اور زندگی نا کام ہوگی اور جب شوق پورا نہ ہوگا تو مردہ ہوگی جو خوشی سے تو نہ جی سکے گی بلکہ جو زبردستی جینے پر مجبور ہوگی۔ جس کی زندگی نہ ہوگی۔ نون تیل لکڑی کے بکھیڑے ہوں گے ذرا سی کوشش مجھے کامیاب بنا سکتی ہے اس کا شوق اُسے گھسیٹ کر لیجانے لگا۔

"کہاں جا رہی ہو باجی؟" راشدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ "ذرا بازار تک جا رہی ہوں" نجمہ نے اس کی طرف بغیر دیکھے ہوئے کہا مبادا اس کی صورت واپس کھینچ لانے پر مجبور نہ کرے۔ "باجی تصویریں البم میں لگائیں گے" "بہت اچھا" وہ جلدی سے جواب دیکر آگے بڑھ گئی۔ ادارے کے دروازے کے قریب پہنچکر اس نے منیجر کے کمرے کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے اندر چلی گئی اس کا دل خود بخود دھڑکنے لگا اس کا دل پھر چاہا کہ وہ واپس لوٹ جائے لیکن اس کے شوق نے پھر اس کی ڈھارس بندھائی کہ بس یونہی ٹیسٹ دینے کی دیر ہے اور پھر فلم اسٹار۔ اس نے دل کی کمزوری پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی جو یونہی خوف دلا رہا تھا۔ اسے وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا کافی دیر تک اُسے کوئی نظر نہ آیا تو اس نے سوچا کہ وہ چوکیدار سے پوچھے کہ اچانک اسے دور ایک دروازہ نظر آیا اور وہ ہولے ہولے قدم بڑھاتی اس کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا اس نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی نظر آئے اس سے پوچھے کہ کھڑکی جو اس سے کوئی دس گز کے فاصلہ پر تھی پردے ندر زور سے ہلے اور کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی پر گہرے بلو رنگ کے پردے پڑے تھے جو ابھی تک زور زور سے ہل رہے تھے جیسے کوئی پردے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ حیران کھڑی دیکھتی رہی اور سوچ رہی تھی کہ آگے بڑھے یا نہ یا یہیں کھڑی کسی کے باہر آنے کا انتظار کرے کہ چوڑیاں چھنکیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی پردے زمین پر آ رہے نجمہ ایک نظر دیکھ کر یک لخت پیچھے ہٹ گئی اور جلدی جلدی باہر کی طرف بھاگی۔ اس کا سانس بُری طرح پھول رہا تھا۔ سراب، جھوٹ، مکر اس وہ بے دم سی ہو کر پلنگ پر گر پڑی اور پھر جب اس کی سانس درست ہوئی تو سجدے میں گر پڑی اور خدا کا شکر ادا کرنے لگی جس نے اسے بر وقت بچا لیا تھا۔ "باجی میری تصویریں لائی ہو؟" راشدہ نے اندر آتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔ "نہیں ننھی جو میرے پاس ہیں ان کو بھی آگ لگا دوں گی" "کیوں باجی؟" راشدہ بڑی حیران ہو رہی تھی "بے فائدہ ہیں کیا ملتا ہے جمع کر کے" "باجی تم جلاؤ گی تصویریں یہ کبھی نہیں ہو سکتا" راشدہ ہنستی ہوئی باہر جانے لگی۔

باورچی خانے میں کسی چیز کے جلنے کی بو پاکر راشدہ بھاگی بھاگی باورچی خانے کی طرف گئی۔ "باجی یہ کیا کر دیا تم نے تمام تصویریں جلا دیں۔ اگر تمہیں نہیں ضرورت تھی تو مجھے البم دیدیتیں جلانے کیوں بیٹھ گئی تھیں"

"نہیں راشدہ میں تمہیں تباہ ہونے نہیں دوں گی" راشدہ جو باقی چند ایک رہ گئی تھیں ان کی طرف لپکی تاکہ اُسے جلنے سے بچالے کہ نجمہ نے اسے پرے دھکا دیدیا اور تمام تصویریں چولھے میں رکھدیں۔

راشدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ وہاں سے چلی گئی نجمہ دل میں بیٹھی دعا کر رہی تھی کہ خدایا تو راشدہ کی حفاظت کر اسے ثریا بننے کا شوق نہ ہو۔ اور دوسرے کمرے میں تکئے پر سر رکھے راشدہ بری طرح رو رہی تھی۔ "ہائے اللہ سب تصویریں جلا دیں۔ اتنی مشکل سے میں نے اکٹھی کی تھیں۔ اونہہ آئیں بڑی باجی خود تو ہر کام کر لیتی ہیں اور مجھے منع کرتی ہیں۔ اُف کتنی خوب صورت تصویریں تھیں تمام جلا کر رکھدیں۔ راشدہ بُری طرح رو رہی تھی۔

رشک بدایونی •

زیر و بم

ڈوبتا سورج زوالِ زندگی — اُف! یہ انجامِ کمالِ زندگی
کتنا مشکل ہے سوالِ زندگی — ان حدوں پر اے خیالِ زندگی

دل بہت گھبرا رہا ہے، کیا کروں

میری جانب انکی چشمِ التفات — ہو نہیں سکتی کسی دن ایسی بات
رُخ بدل کر رہ گئے ہیں واقعات — کیوں نہ تڑپوں اے نظامِ کائنات

دل بہت گھبرا رہا ہے، کیا کروں

وحشتِ دل! تیری دنیا الاماں — ہر کشاکش میں حیاتِ جاوداں
ایسے عالم میں بتا جاؤں کہاں — اے سکوتِ شام اے سوزِ نہاں؟

دل بہت گھبرا رہا ہے، کیا کروں

ڈوب جائیں اب ستارے ڈوب جائیں — زندگی کے ماہ پارے ڈوب جائیں
شامِ فرقت کے سہارے ڈوب جائیں — یا مری وحشت کے مارے ڈوب جائیں

دل بہت گھبرا رہا ہے، کیا کروں

جوشِ وحشت میں گریباں پھاڑ لوں — گردشِ دوراں کی نظریں تاڑ لوں
یا پھر ایسے میں وفا کی آڑ لوں — انکی تحریروں پہ نظریں گاڑ دوں

دل بہت گھبرا رہا ہے کیا کروں

بڑھ چکا حد سے جنوں کا سلسلہ — مل گیا رشکؔ ان وفاؤں کا صلہ
انسے رکھوں بھی نہ کیا اب واسطہ؟ — چھوڑ دوں تکمیلِ ارماں کا گلہ؟

دل بہت گھبرا رہا ہے کیا کروں

خالد (علیگ) •

قطعات

(۱)

بغیرِ مرضیٔ "مختارِ کل" کوئی حرکت
ہزار چاہو کسی طور کر نہیں سکتا
تم اپنی عمر سے بڑھ کر تو جی نہیں سکتے
میں اپنے وقت سے پہلے تو مر نہیں سکتا

(۲)

تم لاکھ احتساب کرو، سختیاں کرو
پیغامِ جد و جہد تو دیتا رہوں گا میں
لاتے رہو تراش کے تم بُت نئے نئے
لیکن "خُدا" کا نام تو لیتا رہونگا میں

۳

حقیقتوں کو جو شرمائے، وہ فسانہ ہے
لبِ حیات پہ مچلا ہوا ترانہ ہے
نہ پوچھ مردِ خود آگاہ کا مقامِ بلند
"خدائے وقت" ہے، "پیغمبرِ زمانہ" ہے

(۴)

"قلندری" کے "معارف" سے تو نہیں آگاہ
"نوائے نیم شبی" ہے "متاعِ درویشی"
جو کر سکے مرا "سوز و گداز" پیدا کر
کہ مجھ سے آج بھی لرزاں ہے خوئے چنگیزی

بلاتبصرہ

چند خطوط

برادر محترم مدیر "مشیر"

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مشیر کا "روح انتخاب" نمبر موصول ہوا۔ آپ کے اس نمبر کے متعلق گذشتہ اشاعتوں کے اعلانوں کو دیکھ کر اس نمبر کا جو خاکہ ذہن و دماغ میں بن چکا تھا اور جس معیار پر نظر آنے کی توقعات ہم نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ قطعاً پوری نہیں ہوئیں۔ اس انتخاب میں کچھ بھی روح جلوہ گر نظر نہیں آتی۔ تعمیری ادب کے سات سالہ ذخیرہ میں کیا یہی سب تخلیقات آپ کے ہاتھ آئیں۔ اگر ذرا سی محنت و کاوش اور جستجو سے کام لیا جاتا تو اچھے درخشاں گوہر نکالے جا سکتے تھے مگر کیا کیا جائے کہ گھونگھے اور مونگے ہاتھ لگے ——— اس انتخاب کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اگر تعمیری ادب نے اس عرصے میں یہی کچھ فراہم کیا ہے تو اس کی حالت پر آنسو بہایا جا سکتا ہے کاش کہ اس انتخاب میں کچھ بھی حسن کچھ بھی جان اور کچھ بھی روح ہوتی، جس سے کم از کم ڈھارس بندھ جاتی۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کا گھٹیا سے گھٹیا مواد شامل کر لیا گیا ہے۔ بہرحال اب جو کچھ سامنے ہے اس پر ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے برادرانہ مشوروں کو ایک مخلص دل کی آواز سمجھ کر اپنائیں گے۔

اس انتخاب کے پہلے حصے میں عجیب قسم کی ہنگامیت نظر آتی ہے اور یہ بالکل اخباری مواد سے مزین نظر آتا ہے اسی چند مہینے کے عرصہ ایک مخصوص واقعے کے تحت لکھی درجنوں تخلیقات جن کو ہم قطعاً پائیدار ادب کی بنیاد رکھنے والے فنکار کے شایان شان نہیں سمجھتے نظر آتی ہیں۔ اگر یہ روح انتخاب نمبر نہ ہوتا تو ہم شاید یہ چیزیں کسی طرح برداشت بھی کر سکتے تھے۔ مگر اس قسم کے ہنگامی رنگ میں رنگی ہوئی چیزیں جن کا دو تین سال کے بعد انسانی ذہن و دماغ میں کوئی نقش نہ ہوگا اور کوئی تاثر نہ رہ جائیگا۔ اسلامی ادب کی شاہراہ پر سنگ میل

شبنم سبحانی

محسن بھوپالی

قائم کرنے والے ایک ضخیم نمبر میں شامل کرنے کے قابل نہ تھیں۔ بھلے ہی ہم انھیں اسلامی تاریخ کے اوراق میں محفوظ کریں گے اور سنہرے الفاظ میں یہ داستان لکھی جائے گی۔ مگر ادبی دنیا میں ان کی کوئی وقعت نہ ہوگی یہ سب کا سب اخباری مواد ہے۔ سب سے پہلے نعیم صاحب کی نظم سامنے آتی ہے۔ تعجب ہے کہ اس سات سال کے ادبی ڈھیر میں یہی ایک تخلیق جوہر بے بہا نظر آئی جبکہ نہ جانے وہ کتنے دوسرے بیش بہا فن پاروں کی تخلیق کر چکے ہیں۔ نعیم صاحب نے اپنی روایت کے مطابق اس تخلیق میں بھی زبان پر کچھ دھیان نہیں دیا ہے اور بہت سے مسخ شدہ الفاظ کو استعمال کیا۔ مثلاً "کس ہاتھ سے زہری تیر چلا" میں "زہری" یا "اس جیت میں تم نے کھیل ہرا" میں "ہرا"۔ یہ الفاظ کتنے بھدے اور ذوق لطیف پر کتنے بار ہیں۔ ان کا احساس قاری کو بری طرح ہوتا ہے۔ یہ نظم فنی اعتبار سے بہت گری ہوئی نظر آتی ہے۔ بالخصوص آخری مصرعے میں تو شعریت کا بالکل فقدان ہو گیا ہے ——— اس کے بعد "الاخوان المسلمون اور فوجی آمریت"، ایک اچھا خاصا اخباری بیان نظر آتا ہے۔ یہ بالکل بے موقع ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جذباتی اثر سے مرعوب ہو کر ہمارے انتخاب کرنے والوں نے "تسنیم" اور "دعوت" سے ان اخباری مقالات اور نظموں کو منتخب کر لیا۔ اس کے لئے نہایت سنجیدگی اور غور و فکر کے بعد اقدام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے اسلامی ادب کے باذوق قدردانوں کو کتنا دھکا پہنچے گا۔ کاش اس کا احساس آپ کو ہوتا ——— اسی طرح آگے بھی ہنگامی اور وقتی تاثرات میں ڈوب کر لکھی گئی کیفی لوگانوی، نعیم صدیقی اور مسعود جاوید کی تخلیقات ملتی ہیں۔ مسعود جاوید کی دونوں آزاد نظمیں فنی اعتبار سے بلند پایہ کی ہیں۔ مگر حسین فاطمی کے بارے میں انھوں نے جس عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ بہت کچھ مجھے ضرورت سے زیادہ نظر آتا ہے۔ یہاں تو

ہزاروں انسان اپنے مشن اور اپنے مقصد کے لئے تختۂ دار پر ہنستے ہنستے جان قربان کر دیتے ہیں اور یوں تو ہر اللہ پر ایمان رکھنے والے کے بارے میں ہم کہہ ہی دیتے ہیں کہ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"، مگر اسے اتنے بڑے شہید وطن اور حق دوست کا مرتبہ دینا یقیناً مبالغہ آرائی ہے اسلام قوم و وطن کی پرستش بے جا کی بنیاد پر ضرب کاری لگا کر دنیا کے سارے حق دوستوں اور ایمان والوں کو ایک ملت قرار دیتا ہے۔ فاطمی نے حق کے لئے کیا کیا۔ فاطمی نے دنیائے اسلام کو اپنی اس قربانی سے کیا فائدہ پہنچایا اور اہل اسلام کے دلوں میں اس کا کیا مرتبہ اسکو سوچتے ہوئے اس کی شان میں اس قسم کے قصیدے کم از کم ایک اسلامی شاعر کی زبان سے ناموزوں نظر آتے ہیں تعجب ہے کہ شاعر نے اس کی شخصیت کو اتنا زیادہ اٹھایا کہ اہل ایمان کے لئے اس کے کردار کو ایک معیاری حیثیت دے دی۔ اس قسم کے وقتی اور ہنگامی جذبات سے مغلوب ہو کر لکھی جانے والی تخلیقات کا یہی عالم ہوا کرتا ہے —— تعجب ہے ہمارے رفیق نے کتنی غلط حیثیت فاطمی کی متعین کی ہے —— طالب حجازی کی نظم کا یہ مصرعہ " یہ تیرے اشارے پہ ہزیں لوٹ جاتے" بڑا ہی بھدا اور شعریت سے خالی ہے۔ اس کے بجائے یہ بہتر ہے ——

"ترے ہر اشارے پہ نظریں جھکاتے"۔ ارشد کاظمی کا یہ مصرعہ "مری زبان تو کاٹ لی .... نہایت غیر معیاری ہے۔ شاعر اپنا مافی الضمیر حسن و خوبی سے ادا نہ کر سکا۔ آخر شعر کا پہلا مصرعہ "امیر کارواں سنبھل کہ اب فریب کھل گیا" میں سنبھل کے بجائے ٹھہر ہونا چاہیئے —— زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" اچھی تخلیق ہے۔ پھر بھی مقصدی پہلو کا فقدان ہے۔ فنی اعتبار سے اچھا طنزیہ ہے —— ماہر کا انتخاب اچھا کیا گیا ہے۔ پھر بھی "سڑکوں پہ ہے نمائش رخسار آج بھی" کی قسم کے اشعار بڑے ہیجان اور کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں۔

محمد یعقوب طاہر کی نظم "نیا ماحول" نہایت غیر معیاری ہے روانی اور سلاست کا نام و نشان نہیں کتنے مصرعے وزن سے گرے ہوئے ہیں اور کتنے زیادہ —— بڑی گھسی گھسائی باتیں دہرائی گئی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تخلیق میں کیا تنوع اور حسن آپ کو

جلوہ گر نظر آیا جس کی وجہ سے آپ کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ اس بڑی مایوسی ہوتی ہے —— احمد ظفر کے افسانے "حقیقت" کے پلاٹ میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ محمود جیسے شریف اور بلند اوصاف کے مالک کی بہن محمودہ سے جس قسم کی ذلیل حرکتیں سرزد ہوئی ہیں وہ غیر فطری ہیں "بہن" کے کردار کو بھی [illegible] طرح اجاگر نہیں کر سکے ہیں —— کوثر نیازی کی تخلیق بھی فنی اور مقصدی مرتبے پر نظر نہیں آتی —— یہ شعر "اللہ رے[1] انقلاب زمانہ کی معصیت" میں معصیت اور کچھ لگا ؤ نظر نہیں آتا۔ خیر کی گود میں شر پروان چڑھ رہا ہے یا "پاکیزگی کی گود میں جنم لے رہی ہے۔ یا طوفان کناروں کے زیر پل رہے ہیں ہوتا تو کچھ تطابق بھی ہوتا۔ مطلع اگرچہ تشبیہ کی باریکی انداز بیان کے حسن سے مزین ہے مگر مقصدی اعتبار سے بالکل نظر آتا ہے۔ اس قسم کے اشعار اگر ہمارے لکھنے والوں سے سر ہو جایا کریں تو وہ براہ کرم ان کے لئے قربانی کر کے بیدردی سے کا وجود ختم کر دیا کریں —— آثم مرزا کا افسانہ کسی قدر قابل برداشت ہے۔

عاصی کرنالی کی غزلیں حاصل "روح انتخاب نمبر" ہیں پرچے میں یہی دونوں تخلیق فن، مقصد کے اعتبار سے اس نمبر کے شایان شان ہیں۔ یہ شعر

کمال آدم کے راستے میں بڑے بڑے مرحلے ہیں عاصی
ہر آنکھ کو نم صدف نہ سمجھو ہر ایک آنسو گہر نہیں ہے

یا

[illegible] سے اڑا کون یہ بلبل کی نواؤں کا اثر
چاک ہوتے نہیں اس دور میں پھولوں کے جگر

خوب ہیں۔ اب ہمارے سامنے محمود فاروقی صاحب کی تازہ تخلیق "قاہرہ کے بیٹے" آئی ہے۔ اس تخلیق میں انداز بیان اور قابل تعریف ہے۔ فاروقی صاحب زبان کے معاملے میں بڑے

[1] کوثر صاحب خود بھی توجہ دلا چکے ہیں کہ یہ شعر اس طرح ہونا چاہیے تھا

اللہ رے انقلاب زمانہ کہ معصیت
پروان چڑھ رہی ہے مزاروں کی گود میں

...واقع ہوئے ہیں۔ بول چال کی زبان اور بالخصوص دکن کی ...چال کی زبان اکثر استعمال کرجاتے ہیں جو کہ تحریر کے لئے غیر موزوں ...یوں ہوا کرتی ہے۔ ــــ مثلاً "دور دور تک یوں معلوم ...ہوتا ہے معلوم دیتا اگرچہ ہم بولتے ہیں مگر تحریری شکل میں معیوب ہوتا ...ہوتا ہے۔ اس کے بعد صحرا میں طوفان کا منظر کھینچا گیا ہے۔ ...طوفان ہے تب تو خیر اگر آندھی ہے تو ضروری تھا کہ نیل کی ...پرسکون نہ رہ سکتیں۔ تلاطم برپا ہوجاتا۔ جب کہ آپ نے ...ستہ روی سے بہتا ہوا دکھایا ہے۔ اس کے بعد "آخری ہمدم ...پھیلے ہوئے "نیل کے نیچے پیچھے" نہایت غیر موزوں ہے چھپا ...زوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے لئے اسی مناسبت سے ...لفظ لانے کی ضرورت تھی۔ "ہم بڑبڑاتے ہیں مصر کے بوڑھے ایک ...کا بڑبڑا اٹھے" کے بجائے "مصر کے بوڑھے ایک ساتھ چیخ اٹھے" برمحل ...ــــ "کنیز و بطورہ کا ہیروں سے لدا ہوا سراپا کیا یہ کچھ کم ہے ...یں سراپا" غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ "دو سالوں تنا ندار فرعون ...ان کی سل زدہ ممی" سل زدہ کے بجائے سیلن لگی ہوئی وغیرہ ہونا ...ہیے تھا۔ اس سے ان کے پنجے ہوئے شکموں" پنجے کیا ہے یہ اب تک ...سمجھ کا۔ اسی طرح "انکار کرجانے" ہیں کرجانا تحریر میں استعمال نہیں ...ہوتا۔ یہ تو ہم اسے بولتے ہیں۔ "آندھیوں کا منہ حقارت سے پھیرنا" ہیں ...حقارت سے بے موقع بے جا نظر آتا ہے۔ وغیرہ۔ اس کے بعد نور لدھیانوی ...کی "حسن معنی" سامنے آتی ہے۔ اقبال کی شاعری سے ہم یقیناً ...ستد روح جذب کریں گے۔ مگر ان کے انداز بیان لہجے اور تراکیب ...ہی اختیار نہ کر جائیں گے اور غلط قسم کا تصرف نہ کریں گے یہ بات ...ہمیشہ پیش نظر رکھنی ہوگی۔ اقبال کیا کسی بھی شاعر کی یوں غلط بلند ...تقلید مناسب نہیں۔ ہر شاعر کو اپنا ایک الگ انداز بیان تنوع اور ...اپنی اور رنگ اختیار کرنا ہوگا۔

"نہ بدلا حالت کو تو نے اپنی بدل چکا ہے مگر زمانہ"

...اس قسم کے مصرعے شعریت سے بالکل خالی ہیں۔

شوکت تھانوی کا مزاحیہ "آجکل کی بیوی" نہایت بے مقصد تخلیق ہے۔ سماج سے اس قسم کا مواد اخذ کرکے ہمیں تضیع اوقات نہیں کرنی ہے۔ اس قسم کی تخلیقات ہمارے تصور ادب کو ٹھیس پہنچاتی ہیں اور تعجب ہے کہ انھیں روح انتخاب میں مقام ملتا ہے! سعد گیلانی کا افسانہ "گمنام نگارشات" بھی شاید سب سے بڑی کمزوری تھا۔ مقصد غیر واضح اور مبہم ہے۔ افسانہ نگار کرداروں سے کیا بات کہلوانا چاہتا ہے اور ان کی کونسی خامی یا اچھائی دکھانا چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ احسان دانش کی غزل بھی کسی بلند فنی مرتبے پر نظر نہیں آرہی ہے اس کے کچھ اشعار ہمارے نقطۂ نظر سے اور اصول زندگی سے ٹکراتے ہیں۔

سیف کی نظم کا یہ شعر نہایت بھونڈا ہے: "دولت صبح وطن مجھ سے بچھڑانے والے" آخری شعر میں شاعر نے اقبال سے اسی قسم کی التجا کی ہے جیسی ہم ہر روز دعا میں خدائے ذوالجلال سے کیا کرتے ہیں یہیں سے شخصیت پرستی کی حدیں شروع ہوجاتی ہیں جو تعمیری شاعری کے لئے زہر قاتل ہیں ــــ تعجب ہے منشی پریم چند بھی پاکستان کے سات سالہ تعمیری نچوڑ میں جلوہ گر نظر آرہے ہیں۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید منشی جی کو دوبارہ زندگی مل گئی۔ پھر "واردات" نے بتایا کہ مخصوص رعایت ان کو ہمارے منتخبین نے کسی اہم تاثر و عقیدت کی بنا پر دی ہے۔ مگر افسوس کہ ان کی یہ تخلیق قطعاً ان کا شاہکار نہیں۔ پہلی تو قانونی غلطی اور پھر دوسری ایک معمولی قسم کے افسانے کا انتخاب یہ دو قسم کی غلطیاں بیک وقت "سرزد فرمائی" گئی ہیں۔

افتخار صاحب کی تخلیق میں تخیلی ہم آہنگی کا فقدان ہے خیالات میں انتشار ہے۔ انھوں نے فکری بے راہ روی کا مظاہرہ کیا ہے اس نظم میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک شاعر کے سامنے زندگی کی کوئی مخصوص متعین کردہ شاہراہ نہیں جس پر وہ یقین کے ساتھ چل سکے۔ یا اگر چل بھی رہا ہے تو تذبذب کے ساتھ۔ یقین و عزم بالکل نہیں۔ ایک عجیب قسم کی یاس و قنوطیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ زبان و فن اور انداز بیان کے لحاظ سے یہ ان کا شاہکار ہے۔ مگر فکری انتشار ہماری نظر میں ان کی اس تخلیق کے مقام کو بالکل گرا دیتا ہے ــــ "سرخ فیتہ" اچھی تخلیق ہے اس کے بعد ایک گوشے میں دبی ہوئی حسن احسانی کی غزل سامنے آتی ہے۔ زبان و فن کے معیار پر یہ بالکل کھوٹی اترتی ہے۔ "ابر کرم

کب بہتے گا وزن سے گرا ہے "دردِ محبت جان کا لیوا" میں جان کا لیوا غلط ہے ہمیشہ جان لیوا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کے نیچ میں کوئی اضافت نہیں آتی۔ پھر مصر کو غالباً شاعر یوسف کا محبوب وطن سمجھتا ہے حالانکہ ان کا وطن کنعان تھا اسے ہم محبوب زمین البتہ کہہ سکتے ہیں

فضا کے یہ دو اشعار بڑے غیر سنجیدہ ہیں

نہ چل سکے گا فسونِ حجاب اس دل پر
جو تیری شوخ اداؤں کا رنگ پہچانے

جب اٹھے پہلو سے تم تسکینِ دل
درد کے سانچے میں ڈھل کر رہ گئی

یہ شعر اچھا ہے

عشق کی منزل فضا آساں نہ تھی
زندگی کچھ دور چل کر رہ گئی

جیلانی کا افسانہ "واحویہ" اچھی تخلیق ہے۔ اس میں پھول فروش جس طرح اور جن بلند تخیلات کا سہارا لے کر پھول بیچ رہا ہے وہ ایک عام پھول فروش یا مالی کے خواب و خیال میں نہیں آسکتا ظاہر ہے اس قسم کا طبقہ کم علم اور محدود خیالات کا حامل ہوتا ہے۔ ان کا یہ جملہ کھٹکتا ہے۔ "ڈوبے اور ابھرے پانی پر دوشیزہ کی آوارہ آنکھوں کی طرح تیر رہے تھے" اس قسم کے انداز بیان سے ہم کو قطعاً احتراز کرنا ہے اس سے ہمارے سامنے ان جنسی امراض زدہ انسانوں کا خاکہ سامنے آجاتا ہے جو آج کے دور میں برائیوں کے مخرج سے بنے ہوئے ہیں اور قاری کا ذہن تعمیری پہلوؤں سے ہٹ کر دوسری طرف بہک جاتا ہے۔ موجودہ احول کی ہم کو اصلاح کرنا ہے۔ اس کی برائیوں کو دور کرنا ہے۔ اگر ہم ان برائیوں کو اپنے انداز بیان میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے استعمال کریں گے تو ہمارا حربہ کند ہو جائے گا۔ ایک جگہ "مانگے تانگے" استعمال کیا ہے یہ دنیائے ادب کے لئے نامانوس لفظ ہے یا یوں کہیے کہ بول چال کا لفظ ہے جو کہ تمانہ تحریر بنا رہا ہے۔ ایک جگہ افسانہ نگار نے حسن میں شبنم کے قطرے جمانے کی کوشش کی ہے اس قسم کی کوششیں اگرچہ نئی ہیں گر بار ہیں۔ کئی مقام پر پانی جمع بنا کر پانیوں استعمال کیا ہے جو کہ سراسر غلط ہے سینچائی کو سینچ لکھا ہے۔ کھجور کے پیڑ میں شاخیں لگا دی ہیں حالانکہ جھالردار شاخوں کے بجائے جھالردار پتے مناسب تھا پتیاں کیا

بار یک قطرات ٹھہرے کر دیئے ہیں۔ دغیرہ طویل افسانہ تھا۔ پورا نہ پڑھ سکا۔ احمد ریاض کی غزل بڑی تھرڈ کلاس ہے۔ بالخصوص یہ شعر "تیرے غم کو نکھار بخشا ہے کشتۂ روزگار لوگوں نے"

بازگشت کو ہم اچھی تخلیق نہیں کہہ سکتے ہیں۔ سماجی برائیوں پر بڑی سطحی نظر ڈالی گئی ہے۔ بڑا کھوکھلا طنز کیا گیا ہے۔ زبان بڑی کاروباری قسم کی ہے۔ گلہ۔ کھیلیاں اور پھرکس قسم کے الفاظ خاص طور سے ذوقِ لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔ عظیم قریشی کی آزاد نظم "دھواں" اس پرچہ کا لب لباب ہے اسے ہم بہترین نگارشات میں شمار کر سکتے ہیں۔

احمد پرویز کی غزل کوئی اچھی نگارش نہیں کئی شعر ایسے ہیں جن کے دونوں مصرعوں میں کچھ بھی تعلق نہیں۔

عزیز عرفی کا افسانہ "اور برف پگھل گئی" ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ پرچے میں اس قسم کا مواد دیکھ کر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کس خوبی کی بنا پر اسے شامل انتخاب کیا گیا ہے۔ اسلامی ادب کے وقار اور سنجیدگی کو اس قسم کا چھچھورا طرز تنقید ٹھیس پہنچاتا ہے ——— جوش کی نظم کے جواب مومن کی نظم اگرچہ مقصدی اعتبار سے کسی حد تک ٹھیک ہے۔ مگر فن اور زبان کے لحاظ سے سورج کے مقابل ذرہ کی مانند ہے۔ روانی اور تسلسل کا فقدان ہے۔ زبان و فن کے لحاظ سے یہ بہت ہی گری ہوئی تخلیق ہے

ماہر کا "راز" بہترین تخلیق ہے۔ زکی زاکانی کی دوسری نظم "بھوک" نظر سے گزری۔ اول تا آخر نظم میں بھوک کی تعریف کی گئی ہے۔ شاعر بھوک ہی کو دنیا کی تمام پریشانیوں اور تکلیفوں کا منبع و مخرج قرار دیتا ہے تعجب ہے کہ اسلامی نظام زندگی کو برحق تسلیم کرنے والا اور اسلامی ادب سے ہمدردی رکھنے والا ایک شخص کیسے اس قسم کی تخلیق کو قبول کر لیتا ہے۔ زبان و فن کی کئی خامیاں ہیں گر یہ کشتی بالکل بے مقصد ہے اور شاید ادب برائے ادب کا حامی بھی۔ اس میں پورے طور سے دلچسپی نہ لے سکے۔ تعجب اور افسوس ہے کہ اسے کیوں شامل کیا گیا کیا منبر ہی کے صفحات میں اور وہ صفحات جس میں مدیر محترم نے پاکستان کے سات سالہ تعمیری ادب کا انتخاب پیش کرنا چاہا ہو اس کے لئے جگہ رہ گئی تھی "رندِ مشرب" بھلے ہی اسے

سکتے ہیں مگر تعمیری ادب کے "مشیر" کے شایان شان نہیں۔
...ماو صاحب کی نظم سامنے آتی ہے۔ اس میں درجنوں زبان و فن
...میاں ہیں ان کو بتانا تضیع اوقات ہے۔ البتہ ایک خاص غلطی
...ادِ قوم و وطن کا بھی تقاضا ہے" میں شاعر نے مفادِ قوم و وطن
...ن قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسلامی ادب ہمیشہ اپنی نظر کو عالمگیر
مفادِ ملت و دین کو پیش نظر رکھے گا۔ صادقہ نسیم کی "جاگتی راتیں"
کے قابل نہ تھی۔ ہاں "الحسنات" میں ہم اسے نمایاں مقام دیتے
بہرحال ذوقِ منتخب کو کیا کہے کوئی جبکہ سات سالہ ادب کا یہ
...۔ اس میں تقریباً آدھی تخلیقات غیر شائع شدہ ہیں۔ تعجب ہے کہ
...تخاب میں ان کو مقام ملنا تھا۔ بہرحال یہ چند باتیں تھیں۔ امید
...اب برا نہ محسوس کریں گے۔

مخلص: شبنم سبحانی

مدیر محترم، السلام علیکم

ماہ مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ میری نظم "دعوت فکر" شائع
...کا شکریہ۔ نظم کے آخری دو شعر اصل میں یوں تھے

...کی جدید راہوں سے　　　جس قدر جلد ہو سکے لوٹو
...پنی روش بدل ڈالو　　　یا قیادت کا ڈھول مت پیٹو

شائع شدہ صورت میں پہلا شعر یوں ہے

...ہلی مقام پر پہنچو!　　　جس قدر جلد ہو سکے لوٹو

تبدیلی قبول...... لیکن اس طرح یہ شعر مطلع بن گیا۔
انداز بیان بھی کمزور سا ہو گیا ہے
آخری شعر کا پہلا مصرع اس طرح چھپا ہے
یا پھر اپنی روش بدل ڈالو۔ اس میں پھر کی "ر" وزن سے خارج
...ہے کہ دونوں اشعار اپنی حالت میں شائع فرما دیئے جائیں۔ شکریہ
ہمیشہ کی طرح اب کے بھی مشیر اپنے جلو میں بہترین اور منتخب
...اور افسانوی ادب لئے ہوئے ہے۔
عمران انصاری کی نظم "یہ کیسے کہوں" مجھے بہت پسند آئی
...بند کا آخری مصرع یوں شائع ہوا ہے:

"پھر خون کی کھیلی ہولی ہے پھر رنگ میں ڈوبے گنگ وجمن"

شاید یہ یوں ہو:

"پھر خون کی ہولی کھیلی ہے پھر رنگ میں ڈوبے گنگ وجمن"

حضرت نور لدھیانوی کی نظم "جلال و جمال" جس کا فکری محور "خودی اور یقین" ہیں، بہت عمدہ ہے۔ ان کے یہاں مردِ مومن کا سوز و گداز، عزمِ کامل اور مشعل یقین کی تابناک روشنی ملتی ہے جس سے تہذیب حاضر کے مسلمان کو منزل سے ہمکنار ہونے میں مدد مل سکتی ہے۔

انور صدیقی کی نظم "شب زندان" کا آخری مصرع "کوئی بتاؤ کہ اب کتنی رات باقی ہے" کا انداز بیان سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے خیال میں یوں ہونا چاہیئے "کوئی بتائے کہ اب کتنی رات باقی ہے"۔ ——— شب زنداں میں فیض کی بھی نظم ہے لیکن یہ نظم اس سے بالکل ہٹ کر اور جدت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اگرچہ ...احول وہی ہے۔

غزلیں کافی میں، شگفتہ ہیں۔ جدید رنگ کی بھی ہیں اور پرانے رنگ کی بھی۔ بہرحال کوثر نیازی کی غزل اپنا مخصوص رنگ لئے ہوئے ہے۔ موثر بھی ہے اور رواں دواں بھی!

نیاز کیش: محسن بھوپالی

تذکرے اور تبصرے

Jamaat Islami Pakistan

از علی احمد خاں ——— (تعارفی سلسلہ نمبر ۲)

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، ۲۰ صفحات۔ چکنا سفید کاغذ،

سادہ سرورق، قیمت دو آنے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی

۲۰۵، نواب پور روڈ، ڈھاکہ

جماعت اسلامی ڈھاکہ کی طرف سے ایک تعارفی سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے ایک کتابچہ ——— "Who is Maudoodi" کے نام سے انگریزی میں شائع ہوا تھا جس پر ستمبر سنہ ۵۴ء کے "منشور" میں تبصرہ کیا جا چکا ہے اب یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں نہایت سلیس انگریزی اور جامع انداز میں جماعت اسلامی کی غرض و غایت، اس کا مقصد، طریق کار اور مختصر تاریخ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ کتابچہ غیر مسلم اور غیر اردو داں حضرات کے لئے اچھی چیز ہے۔ ہمارے ملک میں چلنے والی تحریک اسلامی کی قیادت اس وقت جماعت اسلامی کر رہی ہے اور یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے ہمارے پڑھے لکھے اور ذہین طبقے کو جماعت اسلامی کے متعلق ضروری معلومات بہرحال ہونی چاہئیں۔ (ر ج۔ ق)

حدیث اور قرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، ۱۵۲ صفحات، سفید کاغذ

رنگین سرورق ——— قیمت بارہ آنے

ملنے کا پتہ: مکتبہ "چراغِ راہ" کراچی

روایت پرستی دراصل مسلم معاشرہ کا جمود تھا جو برسوں کے انحطاط اور زوال کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس پورے دور میں اسلام ایک نظام نہیں بلکہ رسم و رواج کا ایک مجموعہ بنا رہا۔ اس صورت حال کے خلاف بتدریج بیداری پیدا ہوتی رہی۔ اگر اس ردعمل کو بروقت صحت مند افکار و نظریات کی طرف پھیر دیا جاتا تو ملت مسلمہ ان بہت سارے فتنوں سے بچ جاتی جن سے ہماری تاریخ داغدار ہے یہ ردعمل کھلے انکار کی صورت میں رونما نہیں ہوا بلکہ اس نے بالعموم اسلامی اصطلاحوں میں چھپ کر شبخون مارنے کی کوشش کی۔ "انکار حدیث" بھی اسی قسم کا ایک جذباتی اقدام ہے جو چہرہ بچانے کے لئے گردن اڑا دینے کے احمقانہ تقاضے کے مترادف ہے کیونکہ منکرین حدیث نے "روایت" پر لدے ہوئے غلط اوہام و خیالات کے بوجھ کو اتارنے کی بجائے سرے سے "روایت" ہی کو ذبح کر دینے کا جہاد شروع کر رکھا ہے ——— پیش نظر کتاب "قدیم روایت پرستوں" اور ان "جدید درایت پرستوں" کی پیدا کردہ دو انتہاؤں کے درمیان "حسن روایت" اور "حسن درایت" کی متوازن راہ کو ہموار کرتی ہے۔ کتاب پانچ بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے جو اپنے دلائل اور انداز بیان کے لحاظ سے ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا مخصوص طرز تحریر ہر جگہ دامن فکر کو تھام لیتا ہے۔

اس وقت جبکہ پاکستان میں اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کی جنگ اپنے پورے عروج پر پہنچی ہوئی ہے اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لئے ضروری و لازمی ہے۔ (م۔ ت)

سندھ مسلم کالج میگزین (حصہ اردو)

کراچی کے اس قدیم ترین تعلیمی ادارے کا میگزین ابھی حال میں مطالعے اور غور و فکر کا اچھا خاصہ مواد لے کر شائع ہوا ہے۔ میگزین

اپنے حسین سرورق سے لیکر آخر تک سلیقہ مندی، خوش ذوقی اور ندرت سے پُر ہے۔

ہمارے لئے اس میگزین میں دل آویزی کی سب سے بڑی وجہ وہ نیا صحت مند رجحان ہے جو بہت نمایاں طور پر موجود ہے اور جس کی نشاندہی خاص طور پر مدیر میگزین عبدالقدیر سلیم کے فاضلانہ اداریے میں کی گئی ہے۔ متذکرہ اداریہ ملک کے ارباب اختیار و تعلیم کے ارباب حل وعقد کے لئے سنجیدہ توجہ کا محتاج ہے۔ اداریے میں اس بات کو پورے زور شور کے ساتھ کہا گیا ہے کہ

"اگر اس ملک کو ذہنی وفکری پراگندگی، معاشرتی انتشار اور اخلاقی دیوالیہ پن سے بچانا ہے تو اس کے لئے پہلا کام نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کرنے کا ہوگا۔ لادینی نظریات کی ایجابی تعلیم اور بغیر مناسب تنقید کے انھیں جوں کا توں پڑھا دینا ہماری نئی نسلوں کو زہر دیدینے سے زیادہ برا ہے۔ کوئی بھی سلیم الطبع شخص مغربی افکار کی اہمیت سے انکار نہیں کرے گا کیونکہ وہ انسانیت کے ایک طویل تجربے کی کڑیاں ہیں، لیکن انھیں حرفِ آخر مان لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مروجہ علوم کی اسلامی نظریات کی روشنی میں صحیح تنقید کی جائے اور ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو واضح طور پر پیش کیا جائے۔ علم کی تشکیل نو کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔"

افسوس ہے کہ کرسیوں کی جنگ ہمارے ارباب حکومت کو نظام تعلیم کی تشکیل نو کے مسئلے پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں دیتی۔ یہ مسئلہ قوم کے مستقبل کے سلسلے میں اولین توجہ کا محتاج ہے۔

میگزین میں طلباء کے قلم سے کئی اچھے سنجیدہ مضامین موجود ہیں۔ خاص طور پر عبدالقدیر سلیم کا مقالہ "فلسفہ جبل اور اسلام" بعض مقامات پر تشنہ ہونے کے باوجود خاصا فکر انگیز ہے۔ اس کے علاوہ "اردو ادب کے نئے رجحانات"، "ہمارے ادب میں قومی نظریات"، "اقبال اور اشتراکیت"، "سائنس کا اثر انسانی زندگی پر"، "عمر خیام اور توبۃ النصوح میں کردار نگاری" پڑھنے کے قابل مضامین ہیں۔ طنزیات وافسانوں کے حصے کا سب سے دلچسپ اور پُرلطف مضمون "حسرت ان سرخوں پہ ہے"، پاکستان کے "پریشاں روزگار آشفتہ مغز، آشفتہ ہو" سرخوں کا خاکہ ہے۔ جو حبیب احمد نے بڑی چابکدستی سے مرتب کیا ہے۔ حبیب احمد میں طنز و مزاح کی اچھی صلاحیت معلوم ہوتی ہے

بحیثیت مجموعی میگزین کافی دل چسپ ہے۔ ہم اس کے لائق ایڈیٹر عبدالقدیر سلیم کو ان کی کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ (ن ط ا)

مہ پارہ

از نسیم انہونوی

سائز ۳۰×۲۰/۱۶ معمولی اخباری کاغذ، ۴۰۰ صفحات

خوبصورت سرورق۔ قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ: نسیم بکڈپو لکھنؤ (یو۔ پی) بھارت

ماہنامہ "حریم" خواتین کا معروف رسالہ ہے جو لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ "حریم" نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر سالنامہ ۱۹۵۵ کی حیثیت سے "مہ پارہ" کو پیش کیا ہے۔ "حریم" کے سالنامے خواتین کے حلقوں میں اکثر پسند کئے جاتے رہے ہیں۔ پہلے "خانہ داری نمبر" "کشیدہ کاری نمبر" وغیرہ شائع ہوئے تھے۔ ادھر چند برسوں سے اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

ناول نے ہمارے ادب میں جو اہمیت حاصل کر لی ہے، وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ انسان ہمیشہ سے کہانیوں کو پسند کرتا رہا ہے اور آج تو ناول سینما کی طرح عام ہو چکے ہیں ——— البتہ یہ ہمارے معاشرے کی بدقسمتی ہے سینما کی طرح ناول بھی بناؤ کی جگہ بگاڑ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس حال میں اگر کوئی اصلاحی ناول سامنے آتا ہے تو قدرتی طور پر طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے اور نہایت خوشی کا مقام ہے کہ "مہ پارہ" بھی ایک ایسا ہی ناول ہے۔

نسیم صاحب آزمودہ کار لکھنے والے ہیں اور اس سے پہلے بھی کئی ناول لکھ چکے ہیں۔ "مہ پارہ" میں انھوں نے بڑی خوبی سے اخلاق کی برتری اور اس کی کامیابی کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنی اس کامیاب کوشش پر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں ——— یہ ایک شریف گھرانے

داستان ہے اور شریف گھرانوں ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ پڑھنے والے کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کا کافی پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ (ج-ق)

تازیانے

ترجمہ: مولانا ابوالبیان حماد

سائز ۳۰×۲۰/۱۶، ۲۸۸ صفحات، معمولی اخباری کاغذ، خوبصورت سرورق مع گرد پوش۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ: نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی

حماد صاحب قارئین منیر کے لئے نئے نہیں۔ آپ ایک صاحب علم عالم اور اہل قلم ادیب ہیں۔ آپ کی منظومات "منیر" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حماد صاحب اسلامی فکر کے حامل اور اسلامی انقلاب کے داعی ہیں اور آپ کی ادبی کاوشوں میں بھی آپ کا یہ رنگ ہمیشہ واضح اور نمایاں رہتا ہے۔ پیش نظر کتاب ایک عربی تالیف کا ترجمہ ہے اصل کتاب کئی سو برس پہلے لکھی گئی تھی جس میں آنحضرت صلعم کی احادیث، صحابۂ کرام کے ارشادات اور بزرگان دین کے اقوال کو پند و نصیحت کے لئے جمع کیا گیا تھا۔ یہ کتاب خاصی مقبول ہوئی اور اس کے تراجم بھی شائع ہوئے۔ حماد صاحب نے فی الحقیقت شستہ اور ادیبانہ زبان میں اس کتاب کا آزاد ترجمہ کیا ہے انھوں نے الفاظ کی پابندی سے زیادہ مفہوم پر نظر رکھی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ تجربہ لفظی ترجمہ سے زیادہ کامیاب ہے۔

اصل کتاب بجائے خود ایک بے بہا خزانہ ہے جس میں انمول موتی بھرے پڑے ہیں۔ پھر حماد صاحب کی ترجمانی اور اصح المطابع کی کتابت و طباعت نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس طرح ایک ایسا قابل قدر مرقع فراہم ہو گیا ہے جو ایمان میں تازگی اور عمل میں سرگرمی کا ذریعہ بن سکتا ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ ہر گھر میں رکھا جائے اور ہر مدرسے میں پڑھایا جائے۔ (ج-ق)

اسلحۂ جنگ

از میجر جنرل محمد اکبر خاں

سائز ۲۲×۱۸/۸، ۱۱۶ صفحات، اچھا سفید کاغذ، خوبصورت گرد پوش۔ بہتر جلد، قیمت ڈھائی روپے۔

ملنے کا پتہ: فیروز سنز، لاہور، پشاور، کراچی

اس سے پہلے میجر جنرل محمد اکبر خاں صاحب کی کتاب "حدیث دفاع" پر "منیر" کے اوراق میں تبصرہ کیا جا چکا ہے پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میجر صاحب مذکور بقول خود ایک سپاہی آدمی ہیں۔ لیکن یہ کھلا امر واقعہ ہے کہ وہ مرد میدان ہونے کے ساتھ ہی صاحب قلم بھی ہیں... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلام کا درد رکھتے ہیں اور اسلامی انقلاب کے خواہاں ہیں۔ فی الحقیقت ان کتابوں کو لکھ کر انھوں نے ایک بڑا کام کیا ہے انھوں نے ایک ایسی ضرورت کو پورا کیا ہے جس کی طرف اب تک ہمارے اہل علم نے کم ہی توجہ دی تھی۔

متذکرہ کتاب میں بڑی خوبی کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل کے اسلحۂ جنگ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اسلحہ جات کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ اور ان کے استعمال کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ پھر کمال تو یہ ہے کہ زبان کی سلاست اور انداز بیان کی دلنشینی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

نفس مضمون سے متعلق متعدد تصویروں اور خاکوں نے کتاب کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ فیروز سنز کی عمدہ کتابت و طباعت اس پر مزید اضافہ ہے۔ توقع ہے، یہ کتاب ابنائے وطن کے لئے نہایت مفید ثابت ہو گی۔ (ج-ق)

تین شعر

از شفیع الحق آدمی

کاش! مظلوم کی آہوں میں اثر ہو جائے
یہ تشدد کا جہاں زیر و زبر ہو جائے

اک چمن اور بسے ہم میں ہو اک فرد اگر
ایک دل، ایک دماغ، ایک نظر ہو جائے

ڈگمگا جائیں نہ ظلمت میں عزائم کے قدم
شام غم دور ہو لے کاش! سحر ہو جائے

1955 Regd. No.

Monthly "MUSHIR" Karachi.

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

کراچی
مشیر
ماہنامہ
جون
۱۹۵۵
مرتبہ
عبدالغفور بیگ
قیمت فی پرچہ
پاکستان ۰-۸-۰
بھارت ۰-۱۰-۰
دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

جواہر پارے

● — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن نہ طعنہ زن ہوتا ہے، نہ فحش گفتار اور نہ فضول گو۔

● — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کو کسی معصیت کا الزام لگا کر شرمندہ کیا، وہ (شرمندہ کرنے والا) نہیں مریگا تاوقتیکہ اس معصیت کا ارتکاب نہ کرے۔

● — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے دن مجھ سے بعید تر بکواس کرنے والے، دریدہ دہن، مخاطب پر اپنی فوقیت جتانے والے، علم کے جھوٹے مدعی اور متکبر ہونگے

● — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے استہزا کرنے، اور ان کا مذاق اڑانے والے ہر فرد کے لئے قیامت کے دن جنت کا ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ "تشریف لائیے"۔ وہ اپنی رذالتوں اور عیوب کے ساتھ آئیگا اور جیسے ہی دروازے تک پہنچے گا، اس پر دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے سامنے دوسرا دروازہ کھولا جائیگا۔ اور کہا جائیگا کہ "آئیے آئیے"..... وہ اپنے معائب کے ساتھ آئیگا اور جونہی قریب پہنچے گا۔ اس پر دروازہ بند کر دیا جائیگا۔ پھر اسے کہا جائیگا کہ "آؤ" تو وہ مایوسی کے سبب وہاں آنے اور داخل ہونے کی ہمت نہ کرے گا۔

(بشکریہ "قاصد")

پاکستان کا واحد پاکیزہ اُردو ڈائجسٹ

مشیر

ٹیلی فون: ۷۹۲۳

جلد: ۶ شمارہ: ۶
جون ۱۹۵۵ء

مُرتّبہ:
عبد الغفور بیگ

★

بدلِ اشتراک:
پاکستان: سالانہ: پانچ روپے، فی پرچہ: آٹھ آنے
بھارت: سالانہ: چھ روپے، فی پرچہ: دس آنے
بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ:
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (بھارت)

[illegible] مقام اشاعت: دفتر مشیر [illegible] کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کے ایک اجتماعی مسئلے کا واحد حل

تاجران لاہور کی طرف سے دی جانے والی ایک دعوت افطار میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک ترقی یافتہ اسلامی ریاست بنانے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے اندر پائے جانے والے دو بڑے متضاد مکاتیب فکر کے درمیان جماعت اسلامی جو مسلک اعتدال پیش کر رہی ہے اسے پھیلنے اور اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنے کا موقع دیا جائے اور اس طرح ملک سے فکری و نظری تصادم کی کیفیت ختم کر کے پاکستان کی قوتوں کو یکسوئی کے ساتھ قومی تعمیر اور ایک خالص اسلامی ریاست کی تشکیل کے کام پر صرف ہونے کا موقع دیا جائے۔ مولانا مودودی نے کہا کہ جب تک لوگوں کو اس درمیانی راستے کی طرف آنے سے روکا جاتا رہے گا اس وقت تک کش مکش کی حالت ختم نہ ہو سکے گی اور ملک کبھی صحت مند بنیادوں پر ترقی نہ کر سکے گا۔

جو لوگ پاکستانی معاشرے کے عناصر ترکیبی اور ان کے باہمی تعلقات کی آٹھ سالہ تاریخ سے آگاہ ہیں وہ مولانا مودودی کے اس تجزیے سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ متعدد تاریخی اسباب کے نتیجے میں پاکستان کے اندر واضح طور پر دو ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو ایک ہی ملک میں رہنے کے باوجود فکر و نظر، افتاد مزاج اور ذہنی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں جن کے درمیان اس کے سوا کوئی دوسری وجہ اشتراک نہیں کہ ان دونوں کا تعلق پاکستان سے ہے اور دونوں مسلمان معاشرے میں شامل ہیں۔ اس قدر مشترک کے علاوہ زندگی کے ہر مسئلے پر ان کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ جو چیز ایک کے نزدیک عین ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا اصل سرمایۂ افتخار ہے۔ وہ دوسرے کے نزدیک ایک دفتر بے معنی ہے جس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اولین مہلت میں اسے دریا برد کر دیا جائے۔ زندگی کی جو قدریں اور ترک و اخذ کے جو معیار ایک دوسرے کے نزدیک مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں دوسرے کے نزدیک وہ زمانۂ قدیم کے اوہام و خرافات ہیں اور اس بوجھ کو جس قدر جلدی ممکن ہو اٹھا کر پھینک دینا چاہیئے! دھر دوسرے گروہ نے زندگی کے جس نقشے کو پسند کر لیا ہے اور جسے وہ انسانیت کی معراج سمجھتا ہے اسے دوسرا گروہ خسر الدنیا والآخرہ قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک زندگی کا یہ نقشہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے۔ پھر اس اختلاف کے ساتھ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ ان اوصاف اور صلاحیتوں سے خالی ہے جو اس کے مدمقابل میں پائی جاتی ہیں۔ ایک فریق مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام کی مبادیات تک سے آگاہ نہیں بلکہ اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر اسلام کے خلاف طرح طرح کے شکوک و شبہات رکھتا ہے اور مسلمان کہلانے کے باوجود اسلامی طرز زندگی میں اس کے لئے کوئی کشش نہیں۔ دوسرا فریق بیسویں صدی میں رہنے کے باوجود ان حقائق سے ناواقف اور ان عصری تقاضوں سے بے خبر ہے جن سے ناواقف اور بے خبر رہ کر اس دور میں کسی قوم کے لئے زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ دونوں فریقوں کے اندر یہ صلاحیتیں اور خامیاں Qualification & Disqualification تاریخی اسباب کے تحت پیدا ہوتی ہیں اور ہمارا معاشرہ متعدد عوامل کے نتیجے میں ان دو حصوں میں بٹا ہے۔ یہ صورت حال آج کم و بیش ہر مسلمان ملک میں پائی جاتی ہے لیکن پاکستان میں اس لئے بہت زیادہ نمایاں ہے کہ خاندان مغلیہ کے خاتمے اور انگریزی عہد حکومت کی ابتدا کے وقت مسلمانوں کے ایک طبقے نے اپنے دین اور اپنی تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ مسلمانوں کے اندر دین کے علم کو باقی رکھا جائے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے مکاتب و مدارس کا ایک نظام قائم کیا اور مسلمانوں کے ایک قابل لحاظ حصے نے ان سے اپنا تعلق قائم کیا۔ اسی زمانے میں انگریزی اثرات کے تحت یہاں مغربی تصورات و نظریات کا دور دورہ ہوا اور جو لوگ ان سے متاثر ہوئے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ ان کے ہاتھ میں طاقت و دولت

کا ایک بڑا حصہ نہیں آیا۔ پھر تحریک پاکستان کے زمانے میں زیادہ تر انہی لوگوں کو مسلمانوں کی قیادت کا موقعہ ملا۔ اب اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف قدیم طرز خیال کے لوگ ہیں جن کا دل اپنے طور طریقوں اور اپنے مشاغل پر پوری طرح مطمئن ہے اور دوسری طرف جدید طرز فکر کے لوگ ہیں جو پاکستا کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے ان دونوں گروہوں کو پاکستان میں اچھی خاصی قوت حاصل ہے اور کسی ایک کے لئے ممکن نہیں کہ دوس بآسانی سے اثر انداز ہو سکے یا اس پر غالب آسکے

یہ صورت حال خاصی پیچیدہ ہے اور پاکستان کے لئے ایک بہت بڑے اجتماعی اور عمرانی مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر پاکستان اپنے اس اندرونی اور داخلی مسئلے کو صحیح طور پر حل نہ کرسکا اور اس کا معاشرہ اسی طرح دو متحارب گروہوں میں بٹا رہا تو نا ممکن ہے کہ وہ تعمیر و ترقی کی ہموار راہ پر گا ہو سکے بلکہ نا ممکن ہے کہ اس مرحلے میں جبکہ اس کے دستور کی صورت گری کا معاملہ بھی باقی ہے وہ اندرونی خلفشار سے محفوظ رہ سکے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ دو چار سال کے عرصے میں ان دونوں میں سے کوئی ایک طبقہ ختم ہو جائے گا اور دو پوری طرح غالب آجائے گا۔ ہماری رائے میں ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ کیونکہ ایک طرف مسلمان عوام کی عظیم الشان اکثریت اپنی عملی و اخلاقی گمراہیوں کے با اسلام سے محبت رکھتی ہے اور قدیم طرز خیال کے لوگوں کو ہی اسلام کا نمائندہ اور علمبردار سمجھتی ہے اس لئے یہ سمجھنا کہ مسلمان معاشرے میں سے قدیم مکتہ کے اثر کو اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔ ایک طفلانہ سادگی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو جو اپنی قلیل تعداد کے با پاکستان کی قسمت پر قابض ہے اپنی موجودہ حیثیت سے بے دخل کیا جا سکتا ہے تو وہ حقائق سے اپنی لاعلمی کا ثبوت دیتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نہ ان دونوں میں سے کسی ایک طبقے کے بالکل ختم ہو جانے کا امکان ہے نہ موجودہ حالت پر قائم رہتے ہوئے ان دونوں سے تعاون و اشتراک ممکن ہے تو پھر ہمیں سوچنا ہوگا کہ اس مشکل سے نکلنے کے لئے ہمارے پاس کونسا راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ان دونوں طبقوں کو زیادہ سے زیادہ قریب کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح ایک ایسا عنصر وجود میں لایا جائے جو دونوں طرف کے ایسے لوگو مشتمل ہو جو فریق ثانی کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور اس کی خوبیوں کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ دراصل پاکستان کی اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر غالب کیا جائے بلکہ اس کی اصل ضرورت ان دونوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکالنا ہے۔ ان دونوں طبقوں کی حیثیت بجلی کی منفی اور مثبت رووں کی ہے جن کے ملاپ سے روشنی وجود میں آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے اندر ایک ایسا عنصر ظہور میں آئے جو ایک طرف اسلا کے علم اور اس کی روایات کا حامل ہو اور دوسری طرف جدید رجحانات اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو اور یہ عنصر زمانے کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے پاکستان کو اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق ایک ترقی پذیر جدید اسلامی ریاست بنا سکے۔

پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ جماعت اسلامی کی شکل میں یہاں ایک ایسی تنظیم موجود ہے جو اسی درمیانی عنصر پر مشتمل ہے اور جس کے دائرے کے دونوں طرف سے ایسے لوگ شامل ہیں جنھوں نے دوسرے فریق کے افکار و نظریات کو سمجھنے اور انکے اوصاف حمیدہ کو خذ اور اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ دونو طرف کے یہ لوگ پوری طرح سوچ سمجھ کر قلب و دماغ کی پوری تائید سے اس دائرے کے اندر آئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اندر آپ جدید و قدیم کا ایک ایسا حسین امتزاج ملے گا جو دونوں طرف کے اوصاف سے متصف ہے اور دونوں طرف کی خامیوں سے مبرا ہے۔ یہ بات اظہار کے لئے نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ محض ایک واقعہ کا بیان ہے اور اس غرض کے لئے کیا جا رہا ہے تاکہ پاکستان کے ارباب فکر کو دعوت دی جائے کہ وہ کی افادیت اور اس کی توسیع کی اہمیت کو محسوس کریں۔ سب جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے اندر ایسے لوگ ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خالص مغ تعلیم یافتہ ہیں جنھیں اپنے تعلیمی زمانے میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو جاننے کا کوئی موقعہ نہیں ملا تھا۔ لیکن جماعت اسلامی کے لٹریچر سے متا ہونے کے بعد جہاں ان کی عملی زندگی میں تبدیلی آئی وہاں ان کے اندر اسلام اور علوم اسلامی سے واقفیت حاصل کرنے کا بھی شوق بیدار ہوا۔ اسی طر جماعت اسلامی کے حلقے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے بنیادی طور پر دینی تعلیم حاصل کی اور علوم مغربی سے جنھیں واقفیت حاصل کرنے کا

ڈاکٹر تاراچند سفیر ہند متعینہ ایران۔

اسلام کیونکر پھیلا؟

اسلام میں بلاشبہ چند ایسی خوبیاں اور خصوصی صفات ہیں جن کی وجہ سے اسے مختصر عرصہ میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا جھنڈا بلند ہوا اور عرب کی سب قومیں ایک جھنڈے کے سایہ میں جمع ہو گئیں تو عرب تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیلنے لگے۔ ان کی فوجیں جنگلوں میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی شام، ایران، افغانستان اور بلوچستان کو طے کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہونچ گئیں۔ مسلم بیڑوں نے ایرانیوں کے بیڑوں کو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سونپ دیا اور بحر ہند پر اپنا قبضہ کر لیا ان بیڑوں کے ساتھ عرب کے تاجر بحر ہند کی ساری تجارت کے ٹھیکہ دار ہو گئے۔ کولم میں میت کیوں کے نام کے قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر ۱۶۶ھ ۷۸۳ء کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں مالابار کے ساحل پر مسلمان آباد ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کا اثر بہت جلد جلد بڑھا۔ ہندو راجاؤں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ان کو تجارت کی آسانیاں پہونچائیں۔ ان کو زمین خریدنے اور مسجدیں بنانے کی اجازت دی۔ مالابار میں آباد ہوتے ہی انہوں نے اپنے مذہب کے پھیلانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں پر دہبت اور پادری نہیں ہوتے لیکن ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مذہب کی اشاعت کرے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ لوگوں کو خدا کے راستے پر چلنے کا پیغام دو اور ان کو عقلمندی اور رحم کے ساتھ بتاؤ۔ (۱۶ - ۶ - ۱۲)

اس تبلیغ کے کام میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں نے بڑا حصہ لیا ہے یہاں تک کہ مسلمان قیدی بھی اشاعت مذہب کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایک مسلمان قیدی نے سب سے پہلے یورپ میں اسلام پھیلایا۔ غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ شیخ احمد مجددؒ کو جہانگیر نے قید خانے میں بھجوایا تھا انہوں نے دو برس میں سینکڑوں ہندو قیدیوں کو مسلمان کر لیا۔ آٹھویں صدی میں مسلمان کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب تھے۔ دکن کے لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کی دولت اور بڑھتی ہوئی طاقت کا ان کے دلوں پر سکہ جم گیا تھا لیکن سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے خیالات، ان کے رواجوں، ان کے اطوار اور چال چلن کا اثر پڑا۔ ان کا مذہب سادہ، آسان اور اچھا تھا۔ ان کی پرستش کے طریقے ذہنوں میں گھر کرنے والے تھے اور رات دن خدا کی یاد دلانے والے۔

رینان ایک فرانسیسی عالم ہے اس نے خود قبول کیا ہے کہ میں جب کسی مسجد میں جاتا ہوں تو میرا دل ایک ناقابل بیان کیف سے امنڈ آتا ہے اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں مسلمان کیوں نہ ہوا۔ جب رینان ایسے کٹر ملحد اور سائنسداں کے دل پر اسلامی عبادت کا ایسا اثر ہوتا ہے تو اوروں کا کیا ذکر ہے۔ ایک اور بات جو بھولنی نہیں چاہئیے یہ ہے کہ پہلی صدیوں کا اسلام ایک بڑا عملی مذہب تھا۔ اسلام کے ماننے والے اپنے عقیدوں کو محض زبان سے نہیں دہراتے تھے بلکہ اپنی زندگی اور چال چلن میں ان پر پابند ہو کر رہتے ان کی نماز کی صف بندی، روزوں کی سختی، خیرات اور زکاۃ کے قاعدے سماج میں برابری و مساوات کا برتاؤ مذہب کے ایسے زبردست حصے تھے کہ آدمی کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے خلاف آٹھویں صدی میں دکن میں ہندوستانی دھرموں میں سخت اختلاف تھا۔ بودھ، جین اور ویدک دھرم کے ماننے والے ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

برہمنوں کی کوشش سے بودھ اور جین مذہب (دھرم) ختم ہو چلے تھے اور شیو اور وشنو کا مت پھیل رہا تھا۔ چیر اور گرالی کی طاقتیں گھٹ رہی تھیں اور نئے گھرانے ابھر رہے تھے مسلمان دکن میں اس وقت آئے جب سماج اور راج میں فساد برپا تھا۔ ان کے آنے کا قدرتی طور پر بڑا اثر ہوا۔ نویں صدی کے اوائل میں مالابار کے خاندان کا جو چیرمن پیرل کے لقب سے ملقب تھا خاتمہ ہوا اور اس کا سبب معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے آخری راجہ نے جس کی راجدھانی کوڈنگلور تھی اپنے دھرم کو چھوڑ دیا اور اسلام قبول کر لیا۔ راجہ کے مذہب

بدلنے کی وجہ سے بڑی ہلچل مچی اور اس واقعہ نے لوگوں کے دلوں پر بڑا اثر ڈالا۔ مالا بار میں مدتوں یہ رواج رہا ہے کہ جس وقت راجہ تخت پر بٹھایا جاتا تھا تو اس کا سر مونڈتے تھے اور اسے مسلمانوں کا سا لباس پہناتے۔ ایک موپلا اس کے سر پر مکٹ رکھتا تھا۔ گدی پر بٹھائے جانے کے بعد راجہ کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے تھے جو ایک ذات سے نکالے ہوئے آدمی کے ساتھ۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ راجہ آخری چیرمین پیرومل کا داسن ہے اور اپنے راجہ کے لوٹنے کا انتظار کر رہا ہے۔ ٹراونکور کے مہاراجہ تخت نشینی کے وقت تلوار کمر میں باندھتے ہوئے یہ اعلان کرتے تھے کہ میں تلوار اس وقت تک رکھوں گا جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ہے لوٹ نہ آئے۔ آخری چیرمین پیرومل کی داستان تاریخی حیثیت سے کہاں تک سچی ہے کہنا مشکل ہے لیکن اس واقعہ کے کچھ آثار باقی ہیں گو ان کے نام ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کیونکہ چیرمین پیرومل خطابی نام ہے لیکن اتنا ماننے پڑے گا کہ کوڈنگلور کے شاہی خاندان کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ اس کے آخری راجہ نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ کوچین کے راجہ (جسے زمورن کہتے ہیں) کی عرب سوداگروں پر بڑی مہربانی کی نگاہ تھی اس کی اجازت سے راج میں بہت سے سوداگر آباد ہوتے ان کی تجارت سے راج کو بہت سے مالی فائدہ پہنچا اور ان کے ماذودں کی قوت راج کی طاقت بڑھی۔ زمورن نے آس پاس کے راجاؤں کو شکست دیکر ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ جہاں جہاں راجاؤں کا تسلط ہوا۔ وہاں مسلمان تاجروں نے منڈی قائم کر لی۔ اسی طرح کالی کٹ کی بندرگاہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہاں کا قاضی جیسے وہاں والے "کویا" کہتے ہیں زمورن کا بڑا مددگار رہتا۔ اس کی طرف سے ہمیشہ دوسرے راجاؤں کے خلاف لڑا کرتا تھا قاضی کی مدد کے سبب سے وہ جنوبی مالابار میں سب سے طاقتور راجہ بن گیا اور راجہ نے مہاکھم کے میلے کا نظم جو ترموی کے مقام پر ہوتا تھا اسی کے سپرد کیا۔ اس سے اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ "کویا" کے برابر ہی راجہ کا گھرانا تھا جس کے نالک کولاتری راجاؤں کے بیڑوں کے سردار تھے۔ ہندو راجہ مسلمانوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ خود انہوں نے اپنی رعایا کو مسلمان ہونے کے لئے جوش دلادیا۔ انہیں اپنے بیڑوں کے سفینے مسلمان ملاحوں کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے اجازت دی کہ مکران قوم کے ہر گھر میں ایک یا دو آدمی اسلام قبول کر لیں۔ نویں صدی کے بعد اسلام کا اثر دن بدن بڑھتا گیا مسعودی نے ۹۱٦ء میں ہندوستان کا سفر کیا تھا وہ لکھتا ہے کہ چولی میں دس ہزار سے زائد مسلمان آباد تھے۔ ان کا سردار تھا جسے ہرامہ کہتے تھے۔

ابو ولادت مستمر بن المہلہل چولی کی مسجدوں کا ذکر کرتا ہے۔ ابن سعید نے تیرھویں صدی میں سمندر کے کنارے ہر جگہ مسلمانوں کو آباد کیا۔ سردار کوبولو نے دیکھا کہ لنکا کے راجہ مسلمان سپاہیوں کو باہر کے ملکوں سے لا کر اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ ابوالفدا (۱۲۷۳ء سے ۱۳۳۱ء تک) لکھتا ہے کہ کولم میں ایک خوب صورت مسجد اور مسلمانوں کا چوک تھا۔ ابن بطوطہ نے کھمبایت سے لے کر سارے مالابار میں کنارے کا سفر کیا اسے ہر جگہ مسلمان ملے اور وہ اچھی حالت میں تھے۔ اس کا بیان ہے کہ گوا مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ کہ زباد میں مسلمانوں نے اس سے ملاقات کی کوزکاہ میں اس نے ایک پرانی مسجد دیکھی۔ وہاں پرانے حیدری درویشوں کا ایک ٹولی ملی غرضیکہ اسلام مختصر سے عرصے میں اپنی خوبیوں کی بنا پر ہندوستانیوں کا محبوب مذہب بن گیا۔

(بشکریہ "دعوت")

(بقیہ اداریہ صفحہ ۴)

جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج ایسے لوگوں کی ایک قابل لحاظ تعداد میسر آگئی ہے جو ذہن و فکر کے لحاظ سے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت جدید و قدیم نگاہ رکھتی ہے۔ پھر جماعت اسلامی کے اندر نظر و فکر میں ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ جزئی سے جزئی مسئلے تک میں پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جماعت کے کارکنوں کا ذہن ایک طرح سوچتا ہے اور یہاں اس فکری تصادم کا شائبہ بھی موجود نہیں جو پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ اس لحاظ سے جماعت اسلامی اس مثالی معاشرے کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ جو پاکستان میں برپا ہونا ناگزیر ہے اگر اسے صحت مند بنیادوں پر ہمہ جہتی ترقی کرنا ہے۔ مولانا مودودی کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کے تمام بہی خواہوں کو خواہ وہ جماعت اسلامی کے مخالف ہوں۔ دعوت دیتے ہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے مسلک اعتدال پر غور کریں اور اگر ان کا دل مطمئن ہو کہ پاکستان کے اس عمرانی مسئلے کا حل جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطروں میں کیا ہے واقعی جماعت اسلامی نے پیش کر دیا ہے تو پھر ان کا فرض ہے کہ وہ اس کو اپنا دلی تعاون پیش کریں۔

(بشکریہ "تسلیم")

ماہر القادری

طرحِ نو

جدید غزل

شرم و غیرت ہے آبروئے جمال
اے مرے شاہدِ پری تمثال

سر سے آنچل ڈھلک گئے تو کیا
تو مگر دامنِ نظر کو سنبھال

میری دنیا میں ہے رمِ آہو
تیری دنیا ہی صرف چشمِ غزال

ذرّے تاروں کو چھو کے لوٹ آئے
پستیوں کو ابھی کچھ اور اُچھال

کتنے عارض شراب سے گلرنگ
کتنے چہروں پہ صرف گردِ ملال

اسکی باتیں چٹک شگوفوں کی!
اس کی رفتار یا نسیمِ شمال

مہر بر لبِ غریب ہیں لیکن
ہر نظر میں ہزار دستِ سوال

زندگی صرف ہے عمل ہی عمل
واعظِ خوش بیاں ہے قال ہی قال

کب کے دار و رسن سے کھیل چکے
اس زمانے کے صاحبانِ حال!

قصر و ایواں کی ہل گئی ہے بِنا
جب فقیروں کو آگیا ہے جلال

رقص و نغمہ، شراب عیش و نشاط
ان دریچوں سے جھانکتا ہے زوال

اسد ملتانی

وحدتِ ملّی

کون ہوگا جسے توحید کا اقرار نہیں
کون ہم میں سے محمدؐ کا فدا کار نہیں
کون رکھتا نہیں قرآں کی صداقت پہ یقیں
کون اسلام کی شوکت کا طلبگار نہیں
پھر سبب کیا ہے کہ بایں ہمہ ایمان و عمل
ہم جہاں میں کسی عزت کے سزاوار نہیں
جس نے اسلاف کو دنیا میں سرافراز کیا
کیوں میسّر ہمیں وہ دولتِ بیدار نہیں

نیک کاموں میں ہیں مصروف بہت لوگ مگر
ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں
صاحبِ سیف بھی ہیں اہلِ قلم بھی ہیں بہت
لیکن افسوس کہ آپس میں مددگار نہیں
باغِ ملّت میں ہیں موجود ہر اک رنگ کے پھول
لیکن آراستہ و پیراستہ گلزار نہیں
یوں چلنے کو چلے جاتے ہیں چلنے والے!
ایک طرف سب کی نگاہیں دمِ رفتار نہیں
قوم ترشی ہوئی اینٹوں کا اک انبار تو ہے
لیکن اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں
پوری تسبیح کے دانے ہیں فراہم لیکن
جسمیں ان سب کو پرو دیں وہی اک تار نہیں
بے شمار انجمنیں ہیں مگر انکا حاصل
کچھ بجز تفرقہ و فتنہ و پیکار نہیں!
اہلِ سنّت میں مگر اہلِ جماعت میں کہاں
کان سنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

ہم نے جس چیز کو تنظیم سمجھ رکھا ہے
وہ بجز کوششِ نقّالیِ اغیار نہیں

شیطان کے دوست اور دشمن

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ ایک دن آپ نے ابلیس لعین سے دریافت فرمایا کہ میری امت میں تیرے کتنے دوست ہیں۔ اس نے کہا: "آپ کی امت میں دس قسم کے لوگ ایسے ہیں جو مجھے چاہتے ہیں اور میں بھی انہیں دوست رکھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں"

"حاکم ستم پیشہ جس کی حکومت جور و استبداد کی بنیادوں پر قائم ہو بادۂ پندار و غرور کے خمار میں مست و مگن رہنے والا وہ بے لگام دولت مند جسے اس بات کی کچھ پرواہ نہیں کہ مال کن راہوں سے آتا ہے۔ حلال ذرائع سے یا حرام طریقوں سے اسے تو بس ہر طرح دھن جمع کرنے کی دھن ہے خواہ اس کے لئے بیکسوں اور غریبوں کا خون چوسنا پڑے۔ کہیں ڈاکہ ڈالنا پڑے کسی کو دھوکہ دینا پڑے کسی کا گلا کاٹنا پڑے۔ کسی کی آبروریزی کرنی پڑے مال کمانے کے بعد پھر اسے یہ بھی فکر نہیں ہوتی کہ اس کی دولت کے مصارف کیا ہیں جائز یا ناجائز اور کہاں کہاں وہ خرچ ہو رہی ہے۔ برمحل یا بے محل بس اندھا دھند لٹانے سے کام ہوتا ہے وہ دنیا دار عالم جو امیروں اور دولتمندوں کو ان کے ہر ظلم کے جھوٹے دلائل گھڑ کے اور غلط بنیادیں فراہم کرکے دیتا ہے اور ان کی برائی کو سند جواز عطا کرتا ہے۔ وہ سوداگر جس کی تجارت خیانت۔ دھوکہ کھوٹ اور فریب و مکاری کے ذریعہ چلتی ہے۔ اور غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرنے والا جو اس وقت تک غلہ بازار میں نہیں لاتا جب تک قیمتیں چڑھ نہ جائیں اور خالیکہ بندگان خدا کو ایک دانے کے لئے ترستے رہتے ہیں اور قحط کی سی کیفیت رونما ہو گئی ہوتی ہے وہ زناکار جو شب و روز عیاشی اور بدمعاشی میں مبتلا رہتا ہے اور عصمتوں کا خون کرتا ہے اور وہ سود خوار جس کا طعون وجود معاشرہ کے لئے گرگ خونخوار اور جونک سے کم نہیں ہے اور وہ بخیل تنگ دل جو حلال و حرام ہر طرح مال جمع کرتا ہے۔ اور کسی محتاج و بے کس کو ایک پائی بھی نہیں دیتا اور وہ عادی میخوار جسے شراب کی لت پڑ گئی ہے اور وہ دختر رز کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کے رہ گیا ہے۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ابلیس سے دریافت فرمایا کہ میری امت میں جن سے تیرا یارانہ ہے ان کا حال تو معلوم ہو گیا۔ ذرا ساتھ ہی یہ بھی تو بتا دے کہ میری امت میں تیرے دشمن کتنے ہیں جن سے تجھے نفرت و عداوت ہے۔ اس نے کہا بہت اچھا یہ بھی آپ کو بتلائے دیتا ہوں۔ آپ کی امت میں بیس کردار ایسے ہیں جن سے میری کبھی بنتی ہی نہیں ہے میں سب سے زیادہ خطرناک دشمن خود آپ کو سمجھتا ہوں آپ کی ذات گرامی سے میں ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتا ہوں۔ آپ کی ایک جنبش ابرو مجھے لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ آپ کا وجود اقدس رحمت مجسم اور مرکز خیر و شرح ہے میرا دوسرا دشمن وہ عالم دین ہے جو اپنے مقتضیات علم پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس کا علم پر عمل بھی کرتا ہے اس کا علم عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے تو عمل علم کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ اس کے علم و عمل اور دل و زبان میں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا میں جہاں کہیں اسے دیکھ پاتا ہوں۔ بید لرزاں کی طرح خمیدہ ہو جاتا ہوں اور بسا اوقات اس کا راستہ بھی کترا جاتا ہوں۔ وہ جدھر سے گزرتا ہے میں ادھر سے نہیں گزرتا۔ بلکہ سمت مخالف سے چلا جاتا ہوں اور عالم باعمل کو دیکھ کر میرے حواس باختہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کا وارث و جانشین اور آپ کے نقش قدم کا پیرو مخلص ہوتا ہے اور معرکہ خیر و شر میں مجاہدانہ تیور لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے آپ جس انقلاب عظیم کے داعی ہیں وہ بھی اس انقلابی تحریک کا حامل اور سرگرم مجاہد ہوتا ہے۔ میں اگر اس سے ٹکراؤں تو بجز اس کے کہ میری تحریک شر و فساد ذلیل ہو جاتے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا میرا تیسرا مخالف حافظ قرآن ہے۔ کیونکہ وہ اس کتاب ہدایت کو اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور جسے اللہ نے آپ کی امت کے لئے ایک مستقل نظام حیات اور دستور زندگی بنا دیا ہے۔ قرآن کریم کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کی بنا پر چونکہ حافظ قرآن کو آپ کے ساتھ ایک قسم کا ربط معنوی پیدا ہو جاتا ہے اور مجھے آپ کے کردار کی کچھ جھلک اس میں بھی نظر آجاتی ہے اس لئے میں اسے دور ہی سے سلام کر دیتا ہوں اور خالصاً لوجہ اللہ اجرت و معاوضہ لئے بغیر پنج وقتہ اذان دینے والا بھی میرا مخالف ہے اس کی اذان سنتا ہوں تو مجھ پر ہول طاری ہو جاتا ہے۔ اذان شروع ہوتے ہی میری

سراسیمگی کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ میں حواس باختہ ہوکر رفتاں و خیزاں میلوں دور بھاگ جاتا ہوں۔ اور اذان ختم ہونے تک واپس نہیں پلٹتا۔ مجھے ایسے موذن پر آپکے بلال رضی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ جس کی اذان شوق میری مملکت میں تہلکہ برپا کردیتی ہے۔ اب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی۔ کہ میرا چوتھا دشمن سوز و گداز اور خلوص و ایمان کا حامل موذن ہے۔ میرا پانچواں حریف وہ دردمند اور جذبۂ غمخواری رکھنے والا ہے۔ جو محتاجوں کی مدد کرتا ہے۔ مسکینوں پر ترس کھاتا ہے۔ یتیموں کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ اور بیکسوں کی محسن و ہمدرد بنا رہتا ہے۔ میرا چھٹا دشمن حق کی خاطر عجز و خاکساری اور نیاز مندی و فروتنی کا مظاہرہ کرنے والا مرد مومن ہے۔ میرا ساتواں دشمن وہ صالح نوجوان ہے جس کا عالم شباب اللہ تعالےٰ کی عبادت و بندگی میں بیت گیا۔ میرا آٹھواں دشمن غذائے حلال پر اصرار کرنے والا ہے۔ جو حرام کا ایک لقمہ بھی اپنے شکم میں کبھی نہیں جانے دیتا۔ میرا نواں دشمن وہ شخص ہے جو اپنے پہلو میں رحم و مروّت اور شفقت و رحمت سے بھرا ہوا دل رکھتا ہو۔ ان دوستوں سے بھی میری دشمنی ہے اور میں اور میں انہیں اپنا دسواں دشمن سمجھتا ہوں جن کی دوستی اور محبت صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ اور اس میں کسی نفسانی غرض کو دخل نہیں ہوتا۔ میرا گیارھواں حریف وہ نمازی ہے جو شدت کے ساتھ اول وقت پر جماعت سے نماز ادا کرتا ہو۔ میرا بارھواں دشمن وہ ہے جو سکوت شب کی تنہائیوں میں ایسے موقع پر اپنی پیاری نیند چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے۔ جبکہ سارا عالم محو خواب و استراحت ہوتا ہے اور ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا رہتا ہے۔ میرا تیرا دشمن وہ تقوٰی شعار ہے جو اللہ کی حرام کردہ اشیاء سے اپنے نفس کو بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ میرا چودھواں حریف وہ ہمدرد بنی نوع انسان ہے۔ جو سب کی خیرخواہی اور بھلائی میں لگا رہتا ہے۔ اپنے سب بھائیوں کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہے۔ اور کسی مسلمان بھائی کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش نہیں رکھتا۔ میرا پندرھواں دشمن وہ مستقل مزاج اور پابند اصول مومن ہے جو کبھی اپنے اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ چاہے اس کی وجہ سے نقصان عظیم ہی اُسے کیوں نہ پہنچے۔ اور جب وہ کوئی کام شروع کرتا ہے تو اسے برابر نبھاتا بھی ہے۔ یہ نہیں کہ جوش میں آکر چند روز کرتا رہا پھر چھوڑ بیٹھا۔ اور ہمیشہ پاک و صاف اور باوضو رہتا ہے۔ میرا سولھواں حریف وہ سخی ہے جس کی داد و دہش اور صدقہ و خیرات سے تمام بندگان خدا مستفید ہوتے ہیں۔ میرا سترھواں دشمن وہ خوش خلق اور ملنسار مرد مومن ہے۔ جو سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتا ہے۔ میرا اٹھارھواں حریف وہ متوکل علی اللہ ہے جو ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اور اللہ نے جن باتوں کا اس سے وعدہ کیا ہے اور جن امور کی ضمانت لی ہے۔ انہیں سچ سمجھتا ہے۔ اور سعی و عمل کے بعد بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر کرتا ہے۔ جب اللہ نے رزق کی ضمانت لی ہے تو وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کا حصہ ضرور اسے مل کر رہے گا۔ میرا انیسواں دشمن وہ ہمدرد و غمخوار مومن ہے جو اپنے پرائے کا غم کھاتا ہے۔ بیواؤں اور یتیموں کی خبرگیری رہتا ہے۔ دکھے ہوئے دلوں پر مرہم لگاتا ہے اور بیکس و مظلوم کی چارہ جوئی اور داد رسی کرتا ہے۔ میرا بیسواں اور آخری دشمن وہ حقیقت شناس مومن ہے۔ جو حیات دنیوی کی بے قدری سے آگاہ ہے۔ دنیائے دوں کو سرائے فانی تصور کرتا ہے۔ سفر آخرت اور موت کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہے اور اللہ کی ملاقات سے کامیاب و فائز المرام ہوتا ہے۔

(بشکریہ "دعوت")

بقیہ مضمون: جنسی تحلیل نفسی صفحہ ۳۷

Oedipus Complex اتنا ہی قوی ہوتا جتنا کہ فرائیڈ کا خیال ہے تو خواب میں جنسی ہیجان کے وقت کوئی دوسری چیز تسکین کا ذریعہ بنکر سامنے ہی نہ آتی۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ تو کسی کسی شخص کو زندگی میں ایک آدھ دفعہ ہی ایسی حالت میں نظر آجاتے ہوں گے۔ لیکن دوسری چیزیں زندگی میں سینکڑوں بار آتی ہیں۔ اس لئے چند خوابوں کی بنا پر ایک مستقل اور مکمل نظریے کی عمارت کھڑی کردینا "پسندیدہ خیال آرائی" Wishful thinking کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔

گوہر صدیقی ٭

گرفتاری

"ہتھکڑی لگا لیجئے تھانیدار صاحب!" میں نے سب انسپکٹر پولیس کی خاموشی پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے شرمندہ نہ کرو سعید!" تھانیدار صاحب نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا

سعید کا لفظ سن کر میرے جسم میں بجلی کی رو سی دوڑ گئی۔ میں نہایت پریشان ہو کر تھانیدار کا منہ تکنے لگا۔ آج سے پندرہ برس پہلے کے واقعات ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے۔ میں نے زیادہ حیرانی سے تھانیدار کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کیونکہ بچپن کے چند ساتھیوں اور خاص خاص عزیز و اقارب کے سوا مجھے سعید کے نام سے کوئی نہیں جانتا تھا۔

اظہر راشدی کے گہرے دوستوں کو بھی معلوم نہیں کہ اظہر راشدی کو کسی زمانے میں لوگ سعید کہتے تھے۔

تھانیدار کی دائیں آنکھ سے کچھ اوپر ہاکی کی چوٹ کا نشان دیکھ کر 'اشرف' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا اور راجہ محمد اشرف خاں ایک چیخ کے ساتھ میرے سینے سے لپٹ گئے۔ آنسوؤں کے دو گرم قطرے ان کی آنکھوں سے ٹپک کر میری آستینوں پر آگرے میری گرفتاری کے لئے تھانیدار کے ساتھ آنے والے سپاہی مجسّم حیرت بنے یہ سب، کچھ دیکھ رہے تھے۔

ننھے منیر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

میں اشرف کا بازو تھامے اندر لے آیا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ اشرف کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ سپاہی ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوئے اندر آ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ راجہ محمد اشرف خاں کی آنکھوں میں آنسو شاید آج پہلی بار دیکھنے میں آئے تھے۔

"اندر جا کر امی سے کہو کہ چائے تیار کریں۔ تمہارے چچا آئے ہیں۔" میں نے منیر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کمرہ میں پھر سکوت طاری ہو گیا اشرف جواب تک میرے سہارے چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ٹھیک ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: "سعید! تم اظہر راشدی کب سے ہو گئے؟" یہ الفاظ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہے۔

"جب سے تم اشرف کی بجائے راجہ محمد اشرف خاں بن گئے۔"

میں نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔ لیکن آج ہنسی ہنس مکھ اشرف سے دُور جا چکی تھی بہت دُور۔

"تمہارے متعلق مجھے صرف اتنا علم تھا کہ تم میٹرک کرنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہو گئے تھے اور بس۔ تمہیں بھی یاد ہو گا اشرف! وہ زمانہ جب ہم اسکول کی چار دیواری میں بیٹھ کر آرزوؤں کی دنیا بسایا کرتے تھے۔ کتنے اچھے دن تھے وہ"۔ میں نے اپنی زندگی کے منتشر اوراق کو ترتیب دینا شروع کیا۔

اشرف سر جھکائے یہ سب کچھ سنتا گیا۔ میں اسے بتاتا رہا کہ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد جب اشرف اپنے والد کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے جو ہمارے گاؤں کے پٹواری تھے، سکول سے سرٹیفکیٹ لیکر چلا گیا۔ میری زندگی میں ایک خلا سا واقع ہو گیا لیکن طالب علمی کا زمانہ تھا۔ گھر والوں کی پابندیاں دوستوں سے ملاقات کے لئے جانے کی کہاں اجازت دیتی تھیں۔ دو چار ماہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا لیکن بعد میں ہمیں ایک دوسرے کو بھلا دینا پڑا۔

میں اپنے قصبہ کے سکول سے میٹرک پاس کر کے جالندھر چلا آیا۔ کالج کی فضا میں آ کر پرانے دوستوں کے نقوش لوحِ دل پر اور بھی دھندلے پڑ گئے۔ سیکنڈ ائیر میں ایک سکول کے دوست سے ملاقات ہوئی۔ اشرف کی بات چھڑ گئی۔ دوست نے بتایا کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد پولیس میں ملازم ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے

پھر اشرف کی یاد تازہ ہوگئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامہ کی جلد پر "اشرف" لکھدیا۔

بی۔ اے کرنے کے بعد "لا" کرنے کے لئے لاہور آیا طبیعت کا رجحان ادھر نہ تھا لیکن والد صاحب کے سامنے کیا پیش جاتی۔ وہ مجھے ایک کامیاب وکیل دیکھنا چاہتے تھے۔ خدا خدا کرکے یہ کورس ختم ہوا۔ نہایت بے دلی سے پڑھنے پر بھی ایل۔ ایل۔ بی کا لیبل میرے ماتھے پر چسپاں کردیا گیا۔

میاں اختر علی صاحب کے زیر سایہ پریکٹس شروع کی۔ میاں صاحب والد محترم کے گہرے دوست تھے۔ انہی کے مشورے سے مجھے لا کالج میں داخل کرایا گیا تھا۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اس لئے موکلوں کی کمی نہ تھی۔ گو ان کی فیس "معقول" تھی لیکن "معقول کیس" کے لئے "معقول فیس" دینے پر کسے اعتراض ہو سکتا تھا۔ غرض میاں صاحب کی پانچوں گھی میں تھیں اور چار اسر کڑاہی میں۔ والد صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے جب میاں اختر علی صاحب کہہ دیتے۔ "چوہدری جی! تمہاڈا پتر بڑا کامیاب وکیل بنے گا"۔ میں بھی زیر لب مسکرا کر سعادتمند فرزندوں کی طرح گردن جھکا دیتا۔

یونہی پریکٹس شروع تھی کہ فضا "پاکستان کا مطلب کیا... ...... لا الہ الا اللہ، مسلم لیگ زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ چودہ اگست کا سورج مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوگیا۔ ہم لوگ جو ... پ کو "پاکستانی" کہہ دینے والے تھے۔ ہندوستان کی باغی اقلیت ... دے دیئے گئے۔ انسان نما درندوں نے انسانوں کا شکار شروع کردیا۔ نشانے آزمائے گئے۔ خون کی ہولی کھیلی رہی۔ ننھی ننھی ہزاروں کلیاں کھلنے سے پہلے مسل دی گئیں ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوگئے۔ غرض انسان انسانیت کے بھیس سے نکل کر جو کچھ کر سکتا ہے وہ سب کچھ کیا گیا۔ امن اور آشتی کے ڈھنڈورچی گورکھشا میں محو سب کچھ دیکھتے رہے۔

میں چھوٹے بھائی امجد۔ ماں اور بہن سکینہ کو ساتھ لیکر پاکستان پہنچا۔ والد صاحب کی قسمت میں پاکستان کی زیارت نہ تھی قافلے پر برسائی گئی گولیوں میں سے ایک ان کی کنپٹی کے قریب آ لگی اور وہ بغیر کسی وصیت کے راہی ملک عدم ہوئے۔

ایک بھائی ایک بہن اور ماں — یہ تھی میری کل کائنات جب پاکستان کی سرزمین میں قدم رکھا۔ یہاں آکر "کامیاب" وکالت کی بجائے ایک سکول میں ٹیچر لگ گیا۔ یہ سکول مہاجرین نے ہی آکر کھولا تھا۔ خوش قسمتی سے تھوڑے ہی دنوں بعد یہ سکول گورنمنٹ سکول بن گیا۔ زندگی بسر ہوتی رہی۔ شادی بھی ہوگئی۔ بیوی خدا کے فضل سے ایسی ملی کہ جس دن سے گھر میں آئیں "بے نماز کو کھانا نہیں ملے گا" کا قانون نافذ ہوگیا۔ تنخواہ جس سے مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ اب پس انداز بھی ہونے لگی۔ جو کتابیں جہیز میں وہ لائی تھیں۔ میں نے بھی پڑھنی شروع کردیں۔ اسلام ایک حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے آنے لگا۔ نہ جانے کیا جادو تھا ان کتابوں میں میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی تحریک کے حوالے کردیا جو اپنے اصولوں کی بنا پر اسلامی کسوٹی پر پوری اترنے والی کہی جا سکتی تھی اپنے فرض کو فرض سمجھنے لگا اور سکول میں اگر پہلے کبھی سستی سے کام لیتا تھا تو اب تنخواہ کے ایک ایک پیسے کو حلال کرنے کے لئے دل و جان سے محنت کرنے لگا

جماعت سے میرا تعلق پوشیدہ نہ تھا۔ اس لئے چند ایک ہمدرد احباب نے خوب نصیحت کی کہ میں ایسی فضول باتوں سے باز رہوں مسلمان کا کام اللہ اللہ کرنا ہے۔ یہ چھوڑ دوں۔ لیکن ہمیشہ میری نظریں اللہ کے اس حکم پر لگ جاتیں۔ جس میں کہا گیا ہے۔

"اللہ کے راستے میں اس وقت تک
کوشش کرو کہ کہیں فساد باقی نہ رہے
اور دین خالص اللہ کے لئے ہو جائے"۔

اس لئے ان کے ہمدردانہ مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے انہیں اسی نصب العین کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔ جس کو میں خود سمجھتا ہوں۔

۱۱ نومبر کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک کاغذ کا پرزہ

میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے نہایت غمگین صورت بناتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو محکمہ نے فارغ کر دیا ہے ہمیں نہ جانے کب یک انگلش ٹیچر میسر نہ آسکے۔ عجب لوگ ہیں یہ افسر بھی۔ قوم کے ان نونہالوں کا ذرا بھی تو احساس نہیں کرتے۔" "مجھے پہلے ہی سے توقع تھی ہیڈ ماسٹر صاحب! یہ کوئی عجیب بات نہیں ایسا ہمیشہ ہوتا آتا ہے۔" میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لیکر تجارت شروع کر دی رازق تو اللہ ہی ہے۔ گزر ہوتی رہی۔

اب ایک تقریر کرنے کے الزام میں جس کے متعلق خیال کیا گیا ہے کہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے والی تھی۔ گرفتار کرنے کے لئے اشرف کو یہاں آنا پڑا۔

اشرف کے آنسوؤں سے میرا کندھا جس پر وہ سر رکھے ہوئے تھا۔ بالکل بھیگ چکا تھا۔ اشرف نے سر اوپر اٹھایا۔ اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا "سعید! تقریر تو نفرت پھیلانے والی نہیں تھی۔ جن لوگوں کے دل میں چور ہوں۔ انھیں سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس لئے تمہاری تقریر کو نفرت پھیلانے والی خیال کیا گیا ہے۔"

"ابا جان! چائے تیار ہے۔" ننھا منیر اندر سے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ میں اٹھ کر چائے لایا۔ اشرف خاموشی سے چائے پیتا رہا کسی گہری سوچ میں غرق۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ ہم تھانہ جانے کے لئے ٹانگے پر سوار ہو گئے۔ میرے اصرار پر بھی اشرف مجھے ہتھکڑی لگانے پر رضامند نہ ہوا۔ ٹانگہ چل دیا۔

"ابا جان! آپ کب آئیں گے؟ ہمیں مٹھائی تقسیم کرنی ہے۔ میں نے تیسرے پارے کا آخری رکوع بھی حفظ کر لیا ہے" منیر تانگے کی رفتار کے ساتھ ساتھ آواز بلند کرتے ہوئے بولا۔

(بشکریہ "تسنیم")

اشر صہبائی

ضرورت ہے وطن کو......

ضرورت ہے وطن کو ایسے خوش سیرت جوانوں کی
وہ انساں جن کے دل مانند شبنم پاک ہوتے ہیں

ہو جن کے پاؤں کے نیچے بلندی آسمانوں کی
محبت سے مگر مانند گل صدچاک ہوتے ہیں

جو پژمردہ دلوں میں آتشِ حب وطن بھر دیں
وہ انساں جو صداقت کے لئے جاں سے گذر جائیں

وطن کو کارواں سالارِ اقوام جہاں کر دیں
وہ انساں جو وطن پر زندگی قربان کر جائیں

جو مظلوموں کے حامی ہوں جو محتاجوں کے کام آئیں
جو گم گشتہ دلوں کو جادۂ منزل پہ لاتے ہیں

جو ظلمِ ناروا کے تند طوفانوں سے لڑ جائیں
چراغِ راہ بن کر راستہ ان کو دکھاتے ہیں

ضرورت ہے وطن کو ایسے اربابِ حکومت کی
وہ انساں جو طلسمِ خوفِ باطل توڑ دیتے ہیں

جنھیں اندھا نہ کر دیں ہستیاں صہبائے عشرت کی
دلوں کے منتشر ٹکڑوں کو باہم جوڑ دیتے ہیں

جو پستی کو بھی دیکھیں جھک کے منصب کی بلندی سے
وہ انساں جو نظر سے خاک کو اکسیر کرتے ہیں

جو خوں گشتہ دلوں کا غم بٹائیں دردمندی سے
خزف ریزوں سے اک دلکش جہاں تعمیر کرتے ہیں

جنھیں محبوب ہو ذکرِ وطن ہر ذکر سے پہلے
ہجومِ غم میں بھی رہتے ہیں سرخوش بادۂ حق سے

جنھیں فکرِ وطن ہو اپنی اپنی فکر سے پہلے
مٹا سکتا نہیں جن کو فلک بھی حادثۂ حق سے

نہ سیم و زر، نہ شمشیر و تبر، درکار ہیں اس کو
یہی ہیں زینتِ روئے زمین و آسماں آرا

نہ سحرِ عقل و افسونِ ہنر درکار ہیں اس کو
جہاں بین و جہاں بان و جہانگیر و جہاں آرا

فقط مردانِ خوش کردار سے قوموں کی عزت ہے
یہی خوش بخت ہیں جن سے وطن کی شان بڑھتی

یہی قوموں کی دولت ہے یہی قوموں کی عظمت ہے
یہی وہ پھول ہیں جن سے چمن کی شان بڑھتی ہے

(بشکریہ ہمایوں)

سید ظل الرحمٰن ●

مائکروفون کے پیچھے

اناؤنسر

صاحب! یقین جانئے کہ آپ کا اناؤنسر پروگرام کا اعلان کرتے وقت اکثر اپنا نام بھی بھول جاتا ہے۔ دو چار دن اُدھر کی بات ہے، میں نے اناؤنس کیا: "آج کی مجلس میں آپ کے اناؤنسر ہیں: "رفعت مرزا" اور..... اور...... میں"

خیال آیا کہ سننے والے "میں" سے کیا سمجھیں گے؛ مگر خدا سمجھے اس وحشت کو کہ اپنا نام زبان پر نہ آنا تھا، نہ آیا۔ سننے والے تو خیر ہنس کر یا زیادہ سے زیادہ ہمارے دماغی توازن پر دو چار فقرے چست کر کے مطمئن ہوں گے، مگر ریڈیو والے بھلا مطمئن ہونا کیا جانیں۔ دوسرے دن جواب طلب ہو رہا ہے کہ "کل تیسری مجلس میں آپ نے اپنا نام اناؤنس کیوں نہیں کیا؟"

جواب دیا کہ "صاحب بھول گیا تھا"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ کوئی اپنا نام بھی بھولتا ہے؟"

"صاحب! بھولنا کیوں نہیں۔ سگمنڈ فرائڈ نے اس مسئلے پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ دیکھئے ذرا ان کتابوں کو"

جواب ملتا ہے "آپ اناؤنسر کا کام کرنے آتے ہیں، ماہر نفسیات کا نہیں"

درست فرمایا۔ اناؤنسر کی نفسیات ہوتی ہی کب ہے؟"

خیر آپ بھی کہاں تک سنئے گا۔ باتوں باتوں میں اناؤنسر کے کام کام کا ذکر نکل آیا ہے تو یہ عرض کر دوں کہ اناؤنسر ہے کس مرض کی دوا۔ ہاں تو سامعین باتمکین!

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

اناؤنسر یعنی اعلانچی یا معلّن اصل میں ایک پھیری والا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پھیری والا گلی گلی گھوم کر آواز لگاتا ہے اور چیزیں بیچتا ہے! اور اناؤنسر ایک بند کمرے میں بیٹھکر آواز لگاتا ہے اور پروگرام بیچتا ہے۔ آپ کہیں گے، یہ پروگرام بیچنا کیا بات ہوئی۔ تو، صاحب! اپنے اعلان کو ایسا پراثر اور دلکش بنانا کہ آپ پروگرام سننے پر مجبور ہو جائیں۔ بیچنا ہی تو ہوا! اور پھر اس بیوپار میں مشکل یہ ہے کہ پھیری والا تو آپ کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے، صرف اس کی بولیوں پر آپ متوجہ نہ ہوں تو وہ ناچ کر عجیب عجیب چہرے بنا کر اور ایسی ہی بیسوں حرکتیں کر کے آپ کو متوجہ کر سکتا ہے؛ مگر بیچارے اناؤنسر کا ہتھیار تو فقط آواز ہے۔ اسی کے سہارے وہ آپ کو خوش گپیوں، دوست احباب کے لطیفوں، گھریلو حساب کتاب اور ننھے منے بچوں کی پیاری پیاری باتوں سے ہٹا کر ریڈیو کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اب اگر اناؤنسمنٹ ہی بے اثر ہو تو آپ پروگرام کب سنیں گے۔ غرض اناؤنسر کا سارا وقت آواز کی جنبانگ میں گذر جاتا ہے۔ بیچارا دن رات اسی دعا میں مصروف رہتا کہ "خداوندا اس آواز کو سلامت رکھیو۔ کہیں یہ "ٹھپ" ہو گئی تو کہاں کی اناؤنسری اور کہاں کا ریڈیو"

اور آواز سلامت بھی رہی تو نوکری کا کیا بھروسہ؟ کیونکہ اناؤنسر کو نوکری دینا تو ریڈیو والوں کے ہاتھ میں ہے، مگر نوکری چھیننا؟ یہ ریڈیو سننے والے کے اختیار کی بات ہے۔ فرض کیجئے، کوئی بزرگ اپنے دوست سے یا اپنی بیگم سے جنگ فرما کر ریڈیو سننے بیٹھے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت اناؤنسر کہتا ہے:-

"زندگی ہے پیار سے، پیار میں بتائے جا"

ظاہر ہے، وہ پیار کے موڈ میں قطعی نہیں ہے۔ پروگرام کیسے پسند آتے لیجئے، پروگرام کے ساتھ اناؤنسر کی بھی خامیاں الم نشرح ہو گئیں۔ اور موصوف نے اپنی بے لاگ رائے سے ریڈیو والوں کو بھی مطلع کر دیا۔ ان کے گھر میں تو جنگ کا اعلان بھی ہو گیا صلحنامہ پر دستخط بھی ہو گئے؛ مگر اناؤنسر اپنے دن

اپنے دن گن رہا ہے کہ اور دو چار گھروں میں ایسے حادثے ہوتے تو اس کی نوکری کا خدا حافظ ہے۔

آپ ضرور کہیں گے کہ میاں یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔ جس کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹتے ہو۔ ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ کر آواز لگاتے رہنا۔ کبھی دھیرے دھیرے اور کبھی بلند، ذرا سی تعالیٰ کے ساتھ، یہ بھی کوئی بڑا کام ہے۔ بالکل صحیح فرمایا آپ نے ؟ مگر ابھی ابھی جو "اطمینان" کا لفظ آپ بڑے اطمینان سے بول گئے، بس کسر یہی کی ہے۔ اناؤنسر اور اطمینان میں ہمیشہ سے بیر ہے ؟ یا یوں سمجھ لیجئے کہ جہاں اناؤنسر پہنچا وہاں سے اطمینان کھسک گیا۔ لگے ہاتھوں اس کا حال بھی سن لیجئے۔

آواز لگانا تو خیر اناؤنسر کا فرض ہے۔ مگر صرف یہی ایک فرض تو نہیں ہے۔ ہر پروگرام کی تفصیلات کا ایک بڑے سے کھاتے میں اندراج یہ بھی اسی فرض کی ایک شاخ ہے ! اور صاحب یہ کھاتا ہوتا ہے بڑا خطرناک ایک بھی چیز درج ہونے سے چھوٹ گئی تو سمجھئے کہ پکڑے گئے۔ اس کی تفصیل کو شاید آپ پسند نہ کریں۔ چھوڑتے اس کو۔ ایک اور چیز ہوتی ہے "کیو شیٹ" اس کو اناؤنسر کا پیشگی اعمال نامہ سمجھ لیجئے۔

اس "کیو شیٹ" میں ایک مجلس کے سامنے پروگرام سلسلے سے درج ہوتے ہیں، اور اسی کو دیکھ کر ہم اپنے اعلان تیار کرتے ہیں ؟ مگر بیاری لاکھ کیجئے "گھپلا" تو مقدر ہے۔ یہی ہوا ایک دن۔ میں نے اناؤنس کیا کہ "ایک ڈاکٹر آپ کو ملیریا سے بچنے کی تدبیریں بتائیں گے" اور اسی کے ساتھ ایک خاتون نے گیت شروع کر دیا :-

"کاہے ہوت نراس پگلے"

بس کچھ نہ پوچھئے۔ دماغ پر ایک گھونسہ سا لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گیت کا مخاطب میں ہی ہوں۔ اندر دنی جواب سوال کو چھوڑئیے۔ باہر والے کیا کہہ رہے ہوں گے، اس خیال ہی سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بات معمولی سی تھی۔ بجائے اوپر والے پروگرام کے میں نے نیچے والا پروگرام اناؤنس کر دیا۔ پروگرام سے پہلے ایک لمحہ کی بھی مہلت مل ہوا اعلان نامہ دیکھنے کی تو قسم لے لیجئے۔ اور اس دن ہوا بھی عجیب حال۔ ساڑھے چار بجے ڈیوٹی پہ پہنچنا ہے۔ تین بجے سے موسلا دھار بارش۔ کوئی سواری نہیں۔ اپنی قسمت کو روتے برساتی اوڑھ کر گھر سے نکلے۔ راستے میں ریلوے گیٹ بند ہے۔ بھلا لگنا مشکل کہ پتہ نہیں کب ریل آجاتے۔ خدا خدا کر کے راستہ کھلا۔ اسٹوڈیو پہنچے تو پتہ چلا کہ ہماری گھڑی آج پندرہ منٹ سست تھی صرف دو منٹ باقی تھیں پروگرام شروع ہونے میں بس بھاگے اور فوراً اسٹوڈیو کے اندر۔ سانس الگ پھول رہا ہے۔ بدن میں کپکپی ایسے میں غلط اناؤنسمنٹ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا ؟ مگر سبکساران ساحل کو کیا خبر ؟

پروگرام پیش کرنے والے بھی اکثر اناؤنسر کی مصیبتوں میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ گلزار بیگم اپنے پروگرام میں دو غزلیں گانے والی ہیں۔ مجھے بتایا کہ پہلے غالب کی غزل گائیں گی اور پھر میر کی۔ تو صاحب میں نے بھی بڑی جانفشانی کے ساتھ اپنے گلے میں سارا جادو بھر کر اعلان کیا کہ گلزار بیگم سے غالب کی غزل سنیئے اور وہ گا رہی ہیں۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میر کے ہمسایہ کو چھوڑتے اور انصاف سے فرمائیے کہ اناؤنسر کیا خاک اطمینان سے کام کرے گا۔

استادی گانے والے تو اور بھی ستم ڈھاتے ہیں۔ استاد دل پسند خاں جھنجھوٹی راگ سنا رہے ہیں۔ پروگرام ختم ہونے میں ایک منٹ باقی میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ سمجھے داد دے رہا ہوں۔ لیجئے پھر تان اٹھی پروگرام دو منٹ بڑھ گیا۔ اب اس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے کہ آرٹسٹ کو ٹھیک سے سمجھایا کیوں نہیں۔

ایک دن ایک نئے فنکار تشریف لائے۔ غزل گانے والے تھے میں نے بڑی خوبصورتی سے اعلان کیا مطلع ایسا پڑھا کہ مرزا غالب سن لیتے تو سر دھنتے رہ جاتے۔ آرٹسٹ صاحب کو اشارہ کیا کہ شروع ہو جاتے۔ مگر انہیں نہ جانے اشارے میں کیا ناگواری نظر آئی کہ اٹھے اور اسٹوڈیو کے باہر۔ اب کیا ہو گا ؟ بھاگا ان کے پیچھے کہ بھائی یہ کیا غضب کرتے ہو کہنے لگے "جی گھبراتا ہے۔ گا نہیں سکیں گے"

لیجئے اب ان کی تسلی کیجئے۔ غرض کہاں تک سناؤں آپ کو۔ انور نے کہا تھا کہ سر بلا اسی کا گھر ڈھونڈتی ہے۔ خدا جانے کہاں تک سچائی تھی مگر ریڈیو اسٹیشن کے اندر ہر بلا اناؤنسر کا یقیناً پیچھا کرتی ہے۔ اور اسی بلا کا نام ہے "گھپلا" یوں سمجھ لیجئے کہ "گھپلا" اور اناؤنسر چولی دامن کا ساتھ ہوتے

کبھی کبھی ظالم توآنہ بھی دغا دے جاتی ہے۔ لاکھ زور لگائیے آواز نکلتی ہی نہیں۔ ایک دن کچھ ایسی ہی کیفیت تھی کہ ہم نے اناؤنس کیا۔

"ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔ اقبال کا فلسفۂ خودی (آواز پست کرکے) پروفیسر ارسطو کی تقریر سنیئے"

پروفیسر صاحب سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کا نام دبا دیا۔ ڈیوٹی افسر الگ ناراض۔ اور سننے والے، وہ تو ناراض ہی رہتے ہیں ہم سے۔ غرض سعدی کا قول شاید اناؤنسر ہی کے لئے ہے کہ

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

(بشکریہ "آہنگ")

کوثر نیازی •

اے ساقی!

جن فضاؤں پہ تھا جنّت کا گماں اے ساقی!
خاک اڑتی ہوئی دیکھی ہے وہاں اے ساقی!

کیا میں گردِ رہِ منزل سے لپٹ کر ر
لوگ تو جانبِ منزل ہیں رواں اے ر

ہر عمل روحِ حیاتِ ابدی سے خالی
ہر نفس محوِ حیاتِ گزراں اے ساقی!

دیکھئے کون ہو جو عدل کو قائم کردے
چشمِ مظلوم ہے اب تک نگراں اے ساقی!

گلشنِ دہر کی مسموم بہاریں توبہ!
دلِ ہر برگ سے اٹھتا ہے دھواں اے ساقی!

آج بھی اُن کے مظالم میں ہے قوت
آج بھی میرے عزائم ہیں جواں اے

آہ! یہ روح کی آواز کی قاتل دُنیا
چھوڑ دوں تجھ کو تو مِلتی ہے اماں اے ساقی!

حاجتیں جن کی ہوئیں وقف ترے در کے لئے
وہ گداگر ہیں شہنشاہِ جہاں اے ساقی!

اب تو انسان کو محبوب ہوئی "خونخواری"
"بادہ خواری" کے مزے آج کہاں اے ساقی!

میں جسے منفعتِ کون و مکاں سمجھا ہ
اہلِ دنیا اسے کہتے ہیں زیاں اے ر

آج اشرار میں ممتاز نظر آتے ہیں
وہ جو تھے قبلۂ اشرافِ جہاں اے ساقی!

ذکر بھی جن کا طبیعت کو ہلا دیتا تھا
وہ مصائب بھی ہیں اب راحتِ جاں اے ساقی!

دلِ شاعر میں ہو اخلاص تو پیدا ہو جائے
شعر میں جوہرِ شمشیر و سناں اے ساقی!

غلام عباس

گندم کا دانہ

ایک دن چند بچوں کو دوران کھیل ایک عجیب و غریب چیز ملی، جو
دم کے دانے کے مشابہ تھی۔ اس کے درمیان ایک گہری لکیر تھی جیسا کہ
دم کے دانہ کے درمیان ہوتی ہے، لیکن وہ مرغی کے انڈے کے برابر تھی۔
راہ گیر نے بچوں کے پاس اسے دیکھا تو ایک پیسہ میں خرید لیا اور شہر
ر بادشاہ کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کر دیا۔

بادشاہ نے اپنے دانشوروں کو بلا کر پوچھا کہ "یہ کیا چیز ہے؟" تمام
نشوروں نے سر جوڑ کر غور و خوض کیا لیکن وہ اس کی حقیقت معلوم کرنے
ں کامیاب نہ ہو سکے ——————! ایک دن ایک مرغی نے اپنی
نچ سے اس میں سوراخ کر دیا تو پتہ چلا کہ یہ عجیب و غریب شے حقیقت میں
دم کا ایک دانہ ہی ہے۔ جب دانشوروں پر اس شے کی حقیقت ظاہر
ی تو وہ بڑے حیران ہوئے اور انہوں نے بادشاہ کے پاس جا کر کہا۔

"جہاں پناہ، یہ تو گندم کا دانہ ہے۔"

بادشاہ بھی یہ سن کر بہت حیران ہوا اور اس نے انہیں حکم دیا
علوم کریں کہ ایسی گندم کی فصل کب اور کہاں ہوا کرتی تھی۔ دانشوروں
... پتہ نکالنے کے لئے اپنی کتابوں کی طرف رجوع کیا لیکن وہ ناکام
ے۔ آخر انہوں نے بادشاہ کے حضور حاضر ہو کر کہا:

"حضور ہمارا کتابی علم ناقص ہے۔ ہم اس مسئلہ میں کوئی رائے دینے
قابل نہیں۔ البتہ آپ کسانوں سے دریافت کیجئے۔ ممکن ہے وہ اس
لہ پر کوئی روشنی ڈال سکیں۔"

دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ ملک کے بوڑھے سے بوڑھے
ان کو اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے۔ اس کے کارندوں نے بڑی مشکل
ایک بوڑھے کسان کو ڈھونڈ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بوڑھا خمیدہ
زرد رو تھا اور اس کے منہ میں دانت نہیں تھے۔ بوڑھا کسان بڑی مشکل
دو لکڑیوں کے سہارے ہانپتے کانپتے ہوئے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔

بادشاہ نے اسے گندم کا دانہ دکھایا لیکن بوڑھا اس قابل نہ تھا کہ
وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا اس لئے اس نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر
چھوا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔

"بوڑھے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس قسم کی گندم کہاں پیدا ہوا کرتی
تھی، تم نے کبھی ایسی گندم خریدی تھی؟ اور کیا تم نے کبھی اپنے کھیتوں میں ایسی
گندم کی کاشت کی تھی؟"

بوڑھا کسان اتنا بہرہ تھا کہ اس نے بادشاہ کے ان استفسارات
کو بڑی مشکل سے سنا۔

"نہیں" آخر اس نے جواب دیا "میں نے نہ کبھی ایسی گندم خریدی
تھی۔ جب ہم گندم خریدتے تھے تو اس وقت کی گندم آجکل کی گندم ہی کی
طرح ہوتی تھی۔ اس وقت کی گندم کے دانہ اور آجکل کے گندم کے دانہ میں کوئی
فرق نہ تھا۔ میں تو اس چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا
باپ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ بہتر ہو گا کہ آپ اس سے پوچھیں۔"

بادشاہ نے بوڑھے کہنے کے مطابق اس کے باپ کو بلا بھیجا۔ اس
بوڑھے کو بڑی مشکل سے راضی کر کے بادشاہ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ وہ
ایک لاٹھی کے سہارے شاہی دربار میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے اسے گندم
کا دانہ دکھایا اور بوڑھے کسان نے گندم کے دانہ کو اچھی طرح دیکھا۔ کیونکہ
اس کی بینائی ابھی تھوڑی بہت قائم تھی۔ بادشاہ اس سے یوں مخاطب ہوا:

"بوڑھے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایسی گندم کہاں پیدا ہوا کرتی تھی؟
کیا تم نے ایسی گندم کبھی خریدی تھی یا اپنے کھیتوں میں اس کی کاشت کی تھی؟"

اگرچہ بوڑھا بہت اونچا سننا کا عادی تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے
اپنے بیٹے سے بادشاہ کے استفسارات کو زیادہ اچھی طرح سنا۔

"نہیں" اس نے کہا: "میں نے کبھی ایسی گندم اپنے کھیتوں میں بوئی
تھی نہ کاٹی تھی۔ اور جہاں تک گندم کی خرید کا تعلق ہے میں نے کبھی گندم

کہیں نہیں تھی۔ کیونکہ میرے زمانہ میں سکہ جاری نہیں ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق فصل خود اگاتا تھا۔ اور جب کبھی کسی کو گندم کی مزید ضرورت پڑتی تھی تو ہم ایک دوسرے سے لے لیتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس قسم کی گندم کہاں پیدا ہوتی تھی۔ میرے وقت کی گندم آجکل کی گندم سے قدرے بڑی ہوتی تھی اور اس میں سے زیادہ آٹا نکلتا تھا۔ لیکن میں نے ایسی گندم کبھی نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے اپنے باپ سے اتنا ضرور سنا ہے کہ اس کے زمانے میں گندم آجکل کی گندم سے بہت زیادہ موٹی ہوتی تھی۔ اور اس سے آجکل کی نسبت بہت زیادہ آٹا نکلتا تھا۔ آپ سے اس لئے گذارش ہے کہ میرے باپ سے اس کے بارے میں دریافت کریں۔"

بادشاہ کے حکم کے مطابق اس کے باپ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ وہ لکڑیوں کی مدد کے بغیر بڑی آسانی سے چلتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھیں صاف اور چمکدار تھیں۔ اس کی قوت سماعت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور اس کے لب و لہجہ میں ایک وقار سا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی گندم کا دانہ دکھایا اور بوڑھے دادا نے اسے بڑے غور سے دیکھا اور اسے لے کر اپنے ہاتھوں میں گھمایا۔

"ایسی عمدہ گندم دیکھے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہوا۔" اس نے کہا۔ اور پھر تھوڑا سا دانتوں میں کاٹ کر اسے چکھا۔

"یہ بالکل اسی قسم کی ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"بڑے میاں، مجھے بتلاؤ۔" بادشاہ نے کہا: "کب اور کہاں ایسی گندم پیدا ہوا کرتی تھی؟ کیا تم نے کبھی ایسی گندم خریدی تھی یا اپنے کھیتوں میں بوئی تھی۔" اور بوڑھے نے جواب دیا۔

"میرے وقت میں ایسی گندم ہر جگہ اور ہر طرف پیدا ہوا کرتی تھی۔ میں نے تمام جوانی میں ایسی ہی گندم کے سہارے پیٹ اہل و عیال کی پرورش کی تھی اور اسی سے دوسروں کا پیٹ بھرتا تھا۔ ہم ایسی ہی گندم بویا اور کاٹا کرتے تھے اور صاف کر کے اپنے گھروں میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔

"بڑے میاں، مجھے یہ تو بتاؤ کبھی تم نے ایسی گندم کسی سے خریدی تھی یا خود کاشت کی تھی۔"

بوڑھا مسکرا دیا۔

"میرے وقت میں۔" اس نے کہا: "کوئی ایسے گناہ کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ روٹی کی خرید و فروخت کرے۔ ہم روپے پیسوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ہر شخص کے پاس اپنے گذارے کے لئے کافی گندم ہوا کرتی تھی۔"

"اچھا۔" بادشاہ نے کہا "یہ تو بتاؤ کہ تمہارے کھیت کس جگہ تھے اور تم ایسی گندم کی کاشت کہاں کرتے تھے؟"

اور بوڑھے نے جواب دیا۔

"میرے کھیت خدا کی یہ وسیع زمین تھی۔ جہاں کہیں میں ہل چلاتا تھا۔ اسی جگہ میرے کھیت ہوتے تھے۔ زمین کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جسے کوئی اپنی ملکیت نہیں کہتا تھا۔ صرف انسانی محنت ہی ایسی چیز تھی جسے لوگ اپنی ذاتی ملکیت کہتے تھے۔"

"مجھے مزید دو سوالوں کا جواب دو۔" بادشاہ نے کہا "اس وقت اتنی موٹی اور بڑی گندم زمین سے کیوں پیدا ہوا کرتی تھی۔ اور اب کیوں پیدا ہونا بند ہو گئی؟ اور دوسرے یہ کہ تمہارا پوتا کیوں دو لکڑیوں کے سہارے چلتا ہے اور تمہارا بیٹا ایک لکڑی کے سہارے اور تم بغیر کسی مدد اور سہارے کے چلتے ہو تمہاری آنکھیں پر نور ہیں اور دانت مضبوط، اور تمہاری گفتگو میں مٹھاس ہے، ٹھہراؤ ہے اور وقار ہے۔ ان تمام عجیب باتوں کی وجہ کیا ہے؟"

اور بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔

"یہ اس لئے ہے کہ انسان نے اپنی محنت اور مشقت کے سہارے زندگی گذارنا ترک کر دیا ہے۔ اور دوسروں کی محنت اور مشقت پر بھروسہ کرنے لگا ہے۔ پہلے وقتوں میں انسان خدا کے قانون اور حکم کے مطابق زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ کچھ ہوتا تھا جو ان کا اپنا ذاتی اور مشقت سے پیدا کیا ہوتا تھا۔ اور وہ دوسروں کے پاس مال و دولت کی فراوانی کو حسد اور لالچ کی نگاہوں سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔"

(ٹالسٹائی کی ایک کہانی) م

التماس ہے کہ ....

- اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیئے
- دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتہ لکھنا نہ بھولئے، تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔

"مینیجر"

مُشیر الحق مجری لہاری ●

جب اور اب

جب ـــــــــــــــــ

رمضان کی ۲۹ تاریخ ہے، مغرب کا وقت ہے، مسلمانوں کی نگاہیں آسمان کی طرف لگی ہوئی ہیں، لوگ چاند دیکھنے میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک کے منہ سے نکلا ـــــــ وہ چاند ـــــــ، کہاں ـــــ؟ کس طرف ـــ؟ ارے بھئی کدھر ـــ؟ میاں مجھے بھی تو دکھاؤ:۔ وہ رہا درخت کی پھننگ کے اوپر ـــــ وہ میری انگلی کے رُخ پر دیکھئے ـــــــ ہاں نظر آ گیا، مبارک، مبارک، ...

لوگوں نے ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے رمضان کے روزے رکھے تھے، اپنا نفس مار رکھا تھا۔ منع کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام سمجھ رکھا تھا، آج اس، چاند نے ان حرام چیزوں کو ان پر پھر سے حلال کر دیا تھا، لوگ سجدہ شکر ادا کر رہے تھے، اللہ کی راہ میں بچھے جا رہے تھے، انہیں اپنے معبود کا شکریہ ادا کرنے کے لئے زبان نہیں ملتی تھی جس نے ان کو شیطان سے بچائے رکھا تھا ـــــــ پورے شہر میں اعلان ہو گیا کل عید ہے گھروں میں تیاریاں ہونے لگیں، بچے بچیاں خوشی سے بے خود ہونے لگے۔ بڑے بوڑھے بھی عید کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن بچوں اور بڑوں کی تیاریوں میں فرق ہے۔ بچے اپنے کپڑے درست کر رہے ہیں جوتوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں سوچ رہے ہیں کل کتنی عیدی ملے گی اسے کہاں خرچ کیا جائیگا، اور بڑے ـــــــ؟ تو وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ محلے میں کون کون لوگ ایسے ہیں جو سال کے سال بھی اس قابل نہیں کہ عید کے روز خوش ہو سکیں، ان کی فہرستیں بن رہی ہیں ان کے لئے سامان خریدا جا رہا ہے ـــــــ ان بے چاروں کو خبر بھی نہیں وہ اپنے معبود کی بارگاہ میں سر جھکائے گڑگڑا کر دعائیں کر رہے ہیں کہ بارالٰہا آج سال کے سال تو شرم رکھ لے ہم بڑے لوگ تو جیسے تیسے عید گزار لیں گے لیکن ان بچوں کو کیا جواب دینگے جو کل کے وعدہ پر سو رہے ہیں۔ وہ میلے کپڑے بھی تو نہیں جو انہیں پہنا دیئے جائیں گے۔ خداوند تو جانتا ہے کہ جو ان کے بدن پر ہے بس یہی ان کی ملکیت ہے۔ کیا عید کے دن بھی یہ میلے اور پھٹے کپڑے پہنیں گے وہ دعا مانگ ہی رہے ہیں کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے یہ اٹھ کر کھولتے ہیں تو محلے کے ایک ضعیف آدمی موجود ہیں۔ ان کی بغل میں ایک گٹھری ہے جس میں کپڑے اور کھانے کا سامان ہے اور کچھ نقد ہے وہ خاموشی سے نگاہیں جھکا کر دیدیتے ہیں اور یہ کانپتے ہاتھوں پلکوں پر لرزتے آنسو، اور کچھ کہنے کی کوشش میں کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ لے لیتے ہیں ـــــ نہ انہیں کچھ بتانے کی ضرورت اور نہ انہیں رسمی شکریہ کی حاجت ـــــ انہیں ابھی سامان کو ٹھیک کرنا ہے اور انہیں دوسرے بہت سے لوگوں کے یہاں جانا ہے۔ اتنا وقت کہاں کہ ہر دروازہ پر رسمی سازی کی گفتگو کریں، ـــــ کل صبح ہی تک کا تو وقت ہے!

رات دھیرے دھیرے گذرتی جاتی ہے اور غریبوں کے یہاں امیروں کے گھروں سے آہستہ آہستہ سامان پہونچ رہا ہے، ہر ایک کی دعائیں مقبول ہو رہی ہیں۔ آپس میں باقاعدہ چندہ کر کے بھی دیا جا رہا ہے اور خاموشی سے بھی لوگ رقمیں لا کر دے رہے ہیں۔ آخر عید میں بچے صرف کپڑا جوتا اور سویاں ہی تو نہیں مانگتے۔ عید ہر روز آتی نہیں نہ ہر روز بچوں کو عید ملتی ہے آخر کل عیدی بھی تو دینی ہوگی اس کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ـــــ؟ وہ بھی محلے کے ہمدرد لوگوں نے چپکے چپکے لا کر جمع کر دیا۔

عید کی صبح آئی اور اس شان سے آئی کہ کل کے ڈوبنے والے سورج نے جن لوگوں کو اپنی حکومت میں غریب دیکھا تھا جن کے گھر میں چولہے کو ٹھنڈا دیکھا تھا وہ لوگ آج اس کی مملکت سے غائب تھے آج ہر گھر میں چولہا جل رہا تھا۔ ہر مکان سے دیگچی اور کفگیر کے کھڑکھڑانے کی آواز آ رہی تھی۔ فضا میں میٹھی اور نمکین سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ آج کسی گھر

ٹھکانہ تھا آج کوئی بھوکا نہ تھا۔ ہر ایک کے بدن پر صاف کپڑے تھے، ہر ایک کے پیروں میں جوتا تھا، ہر ایک کا پیٹ بھرا ہوا تھا ہر ایک خوش تھا۔ آج سچ مچ ظلم کو دیس نکالا مل چکا تھا ——— سورج ذرا اور بڑھا لوگ مل جل کر عیدگاہ کی طرف چلے سب پیدل ایک ساتھ چل رہے ہیں محلے کے امیر و غریب سب کے سب کاندھے سے کاندھا ملائے ہوئے ہیں۔ زبان پر خدا کا شکر ہے ہر ایک معبود کی بارگاہ میں سر جھکا کے غلاموں کی طرح چلا جا رہا ہے۔ لوگ عیدگاہ پہنچ گئے ——— جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا نہ بڑوں کے لئے کوئی جگہ مخصوص ہے نہ چھوٹوں کے لئے صف متعین۔ امیر و غریب دولتمند فقیر سب کے سب ایک صف میں شانہ سے شانہ ملائے بیٹھے ہیں سب کے سر جھکے ہوئے ہیں، جماعت ہوتی ہے بغیر کسی امتیاز کے لوگ مل جل کر کھڑے ہو جاتے ہیں عجیب خوشکن منظر ہے۔ غالباً یہی دیکھ کر شاعر نے کہا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نماز ختم ہوئی لوگ خاموش بیٹھے رہے، امام منبر پر چڑھا، اس نے عید کا خطبہ دیا لوگوں نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ سنا جس سکون اور اطمینان سے نماز پڑھی تھی۔ خطبہ ختم ہوا تو ایسا معلوم ہوا جیسے مردوں میں جان آگئی۔ بڑے بوڑھے اپنے ہم عمروں کو عید کی مبارکباد دے رہے ہیں گلے مل رہے ہیں۔ بچے بچوں سے گلے مل رہے ہیں عید ملنے میں کوئی تفریق نہیں، کوئی ترتیب نہیں، بلا امتیاز جو سامنے پڑ گیا اس سے گلے ملے اور خلوص و دل سے ملے اس سے فراغت ہوئی تو گھروں کو چلے ———

اپنے اپنے گھر پہنچے۔ یہاں بہو بیٹیاں اپنے بزرگوں کو سلام کرنے کے لئے جمع ہیں ایک دوسرے کو مبارکبادیاں دی جا رہی ہیں۔ خوشی خوشی عیدیاں وصول کی جا رہی ہیں۔ ماں باپ بچوں کی چہلیں دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھوڑی دیر بعد محلے ٹولے کے لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے گھروں پر آنے لگے۔ ہر ایک کی میٹھی اور نمکین چیزوں سے تواضع کی جا رہی ہے۔ کل رات جن دولت مندوں نے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کی تھی وہی دولت مند آج ان غریبوں کے مکان پر عید ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ اچھی باریک خوشبودار سویاں کھانے والے کام و دہن یہ موٹی

اور بدذائقہ سویاں ذوق سے کھا رہے ہیں گویا ہمیشہ یہی کھاتے آئے ہیں۔ آخر ان غریبوں کا بھی تو دل رکھنا ہے۔

اور یہ عید کا دن اس طرح گذر گیا انسانی برادری میں کوئی تفریق نہیں سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، یہاں نہ کوئی امیر ہے اور نہ غریب سب کے پیٹ بھرے ہیں، سب کے تن ڈھکے ہیں اور سب کے دل آسودہ ہیں۔

——————— یہ "جب" تھا

اور اب ——— !

شام کا وقت ہے ماہ رمضان کی ۲۹ ویں تاریخ ——— لیکن چاند دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ۸ ، ۹ بجے تک ریڈیو سے خبر آجائیگی کسی کو فکر بھی نہ ہوئی اور چاند دیکھنے کا وقت گزر گیا۔ لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول رہے اور ہمارا آخر شہر! آخر مشغول زندگی ہے چاند کو تلاش کرنے کا وقت کہاں سے آئے۔ شام کا وقت تو اتنا گھرا ہوا ہوتا ہے کہ دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی۔ کلب سے، فیلڈ سے، کارخانوں سے اور دفتروں سے تھکے ماندے آتے ——— محنت زیادہ کرنی ہوتی ہے اس لئے روزہ کس طرح رکھا جا سکتا ہے ——— نہا دھو کر کپڑے بدلے، ابھی چائے پی رہے تھے کہ چاند دیکھنے کا وقت آگیا۔ بھلا سوچئے تو ذرا یہ "چاند صاحب" کی کتنی بڑی بدذوقی ہے، آخر تمام دن پڑا ہوا ہے۔ پوری رات پڑی ہوئی ہے صبح ۹ بجے نکل آتے ہوتے ہر ایک ان کو دیکھ بھی لیتا اور ان کا دل بھی رہ جاتا اب اس وقت تو ان کو وہی لوگ دیکھیں گے جن کے پاس وقت بہت ہے۔ ——— شام سے رات ہوئی، اب مسلمان اتنے گئے گذرے بھی تو نہیں کہ شام کو چاند نہیں دیکھا تو رات کو چند منٹ نکال کر ریڈیو پر نہ سن لیں۔ مکانوں میں سب لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھے ہیں، ہوٹلوں میں لوگ ریڈیو پر کان لگائے بیٹھے ہیں ——— پکا گانا ہو رہا ہے۔ استاد لوگ گلے بازی کا کمال دکھا رہے ہیں بس ان کے گانے کے بعد چاند کا اعلان ہوگا۔ گانا ختم ہوا، اناؤنسر نے اعلان کیا ——— یادپور ——— گڑھ وغیرہ سے اطلاعیں ملی ہیں کہ لوگوں نے آج چاند دیکھ لیا ہے کل عید الفطر کی پہلی تاریخ ہے ——— لوگ خوشی سے اچھل پڑے کل عید ہے ——— آخر کیا ہوا اگر رمضان کے دنوں میں ہوٹلوں کے پردوں کو گوارا کر جاتے اور سگریٹ پی تھی ——— اب مسلمانوں کا ایمان اتنا گیا گزرا تو نہیں ہے کہ عید کا بھی استقبال

نہ کر سکیں۔ عید ہر روز تو آتی نہیں کہیں سال میں ایک دن عید ہوتی ہے یہ کچھ رمضان تو ہے نہیں کہ جب یہ شیخ صاحب آ گئے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے، ——— ایک، دو، تین، چار، ——— آخر کہاں تک عزت کی جائے۔ بلایا ہوا مہمان بھی، تیسرے سے چوتھا دن ہوا اور کھلنے لگتا ہے یہ بن بلائے مہمان ——— ایک نہ دو پورے تیس دن تک نکلے ہی نہیں رہتے ہیں ——

صبح ہوئی تو عید ہے۔ عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سویاں بھونی جا رہی ہیں۔ کپڑوں کا جوڑ ملایا جا رہا ہے۔ مہندی لگائی جا رہی ہے۔ ہر طرف لوگ خوش ہیں ——— عید کی خوشی میں ریڈیو کا پروگرام بھی کوئی نہیں سن رہا ہے ریڈیو کھلا ہوا پورے گھر میں نغمہ بکھیر رہا ہے لیکن ——— کون سنتا ہے فغاں درویش !

اور پڑوس میں کچھ گھر ایسے بھی ہیں جن کے یہاں آج رات کھانا صرف اس لئے کھایا گیا ہے کہ کل عید کے دن چولہا بالکل ٹھنڈا نہ رہے، بچے نئے کپڑوں کے لئے بلک بلک کر سو گئے ہیں اب مجبور و لاچار ماں ان کے پرانے کپڑے ان کے بدن سے اتار کر دھیرے دھیرے دھو رہی ہے کہ کہیں آواز سے وہ جاگ نہ جائیں ——— باپ کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھا ہے، سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے اور وہ اٹھ کر چلنے لگتا ہے۔ بیوی پوچھتی ہے "کہاں ہے" لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا ——— اور تھوڑی دیر بعد اسی طرح پژمردہ اور غمگین واپس آتا ہے —— بیوی کپڑا دھونا چھوڑ کر قریب آ جاتی ہے اور پوچھتی ہے "کہاں گئے تھے؟" محلہ کے شیخ صاحب کے پاس گیا تھا ——— شوہر جواب دیتا ہے۔

کیوں ——؟

میں نے سوچا کل عید ہے اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے آخر شیخ صاحب عید کے دن فطرہ نکالیں گے، ہم بھی فطرے کے مستحق ہیں جا کر مانگ لوں۔

تو فطرہ انھوں نے دیا ——— بیوی نے پرامید ہو کر پوچھا۔

نہیں ——— اور بیوی کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے شوہر نے اس کے دماغ پر گھونسہ مار دیا ہو۔

کیوں ——— اس نے بہت ہی مرے ہوئے لہجے میں پوچھا

کہنے لگے ——— تم موٹے تازے ہٹے کٹے ہو۔ تمہیں میں فطرہ نہ دوں گا۔ میں نے کہا شیخ صاحب میں فقیر نہیں ہوں۔ کارخانے میں ملازم تھا لیکن اس قصور پر ٹھیکیدار نے پچھلے ماہ مجھے نکلوا دیا کہ میں اس کی بیٹی کی شادی میں اس کے حسب منشاء اس کو چندہ نہ دے سکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کارخانے کے ملازم کی آمدنی کتنی ہوتی ہے۔ جو کچھ دس پانچ روپیہ تھا وہ اس بے کاری کے دنوں میں خرچ ہو گیا۔ مسلسل ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں لیکن اب تک کہیں کام نہیں ملا۔ اب اس وقت میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ بچے گھر میں بھوکے ننگے سوئے ہیں۔ کل عید کا دن ہے۔ آپ خود ہی سوچئے مجھ سے زیادہ فطرہ کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے دیکر میرے پورے خاندان کی مدد کیجئے ——— وہ کچھ سوچ کر بولے۔ اچھا کل صبح ۸، ۹ بجے ڈیوڑھی پر آنا اسی وقت فطرہ تقسیم ہو گا تم بھی اپنا حصہ لیجانا ——— یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں بولا شیخ صاحب میں بھیک منگا نہیں ہوں، خواہ فاقہ کرتے کرتے مر جاؤں لیکن دن کی روشنی میں میرا ہاتھ نہ پھیل سکے گا، اسی لئے رات کے اندھیرے میں آپکے پاس آیا ہوں، جو کچھ آپ مناسب سمجھیں اسی وقت دیدیجئے ——— یہ سن کر وہ بہت جھنجھلائے اور کہنے لگے :

"اچھا آشریف لیجائیے دن کو شرم آتی ہے اور رات کو مانگنے چلے آئے ہو نہ گڑ کھائیں اور گل گلوں سے پرہیز ——— معاف کیجئے، اگر آپ کو فطرہ لینا ہے تو کل ڈیوڑھی پر آئیے۔ اگر میں یونہی رات کے اندھیرے میں سب کو تقسیم کر دوں تو کل صبح جب کہ خان صاحب، میر صاحب اور ملا صاحب کی ڈیوڑھیوں سے فطرہ تقسیم ہو گا اور مانگنے والوں کی ایک فوج جمع ہو گی تو کیا میں اپنی ڈیوڑھی کی بے عزتی کراؤں گا، باپ دادا کی ناک کٹواؤں گا کہ جن کی ڈیوڑھی پر عید کے دن سینکڑوں منگتے جمع ہوتے آج وہاں الو بول رہا ہے ——— میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کی وجہ سے میں ہم چشموں میں ذلیل نہیں ہو سکتا، اگر فطرہ درکار ہے تو کل آ کے لے جائیے گا۔"

اس کے بعد میں کیا بولتا چپ چاپ چلا آیا۔

صبح ہوئی، عید کی صبح ——— پورے شہر پر خوشی و غم کے بادل چھائے تھے کہیں مسرت تھی کہیں رنج ——— کہیں آہ تھی کہیں واہ ——— گویا اس مصرع کی مکمل تفسیر تھے

"جہاں بجتے ہیں نقارے وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں"

لوگ عید کی نماز کے لئے چلے ــــــ بڑے بڑے لوگ موٹروں اور دوسری سواریوں سے چلے گئے کچھ لوگ پیدل بھی چل رہے ہیں ــــ زبان سب کی چل رہی ہے لیکن، الفاظ جدا جدا ہیں ــــ اللہ کے دربار میں سجدہ شکر ادا کرنے جا رہے ہیں اور بولیاں بھانت بھانت کی ہیں ــــ تمہارے میاں وس لونڈیا کی کیا بات ہے۔ لالائی قسم میں نے صبح اس کو بھنے ٹھنے اپنی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا، بس کیا بتاؤں کلیجے پر سانپ لوٹ کر رہ گیا ــ ظہورے بھائی ہوت، ظہورے بھائی، تم نے جو مرغ خریدا تھا اس کا کیا ہوا، کل پالی میں لا رہے ہو نا؟ ــــ کیا بتاؤں میرے یار وہ تو آج کل بیمار ہے ــــ ہے ہے کیا ہوا اس کو؟ ــــ کچھ بھی تو نہیں، بیچارہ رات کو اچھا بھلا سویا تھا صبح اٹھا تو بیمار ــــ کیوں یہ چپکے چپکے شادی رچالی اور دوستوں کو خبر بھی نہ کی ــــ ارے بھئی کیا بتائیں وقت ہی کچھ ایسا آن پڑا تھا کہ بس چٹ منگنی پٹ بیاہ ــــ اجی حضرت دیکھئے گا اگر یہ حکومت رعایا کے پیٹ بھرنے تن ڈھانکنے کا انتظام نہیں کرتی تو اگلے الکشن میں یہ کبھی بھی نہیں جیت سکتی وہی جیتیں گے جو بھوکوں کا پیٹ بھر سکیں ننگوں کو کپڑا پہنا سکیں ــــ آپ کا مطلب ہے سوشلسٹ ــــ مطلب وطلب تو میں جانتا نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جو بھی ان باتوں کو کریگا وہی جیتے گا ــــ حضور نواب صاحب پچھلی مرتبہ عید پر تو آپ کے یہاں بہت بڑا جلسہ ہوا تھا اس بار بھی ہم لوگ امید رکھیں ــــ آج جا کر کل تو عید آنے کی نہیں ــــ بھائی مجھے تو معلوم نہیں میر صاحب سے پوچھو سب انتظام انہیں کے سپرد ہے ــــ حضور سب ٹھیک ٹھاک ہے میں جہاں کو پیشگی دے چکا ہوں عید کی وجہ سے بہت مشکل سے راضی ہوئیں انہیں تو خان صاحب لئے جا رہے تھے لیکن انہوں نے جب آپ کا نام سنا تو کچھ سوچ کر راضی ہو گئیں ــــ ہوٹل کو کھانے پینے کا آرڈر دیدیا ہے"

عیدگاہ آئی، لوگ مسجد میں جا کر بیٹھے۔ مسجد کمیٹی کی طرف سے پوری مسجد میں جا نمازیں بچھی تھیں لیکن ایک چادر پر نواب صاحب کے کپڑے میلے نہ ہو جائیں اس لئے موٹر سے مخملی جانماز اتار کر لائی گئی اور نواب صاحب اس پر بیٹھے ہر نظر بہت عزت ... حسب حیثیت جانمازیں بچھا رہے ہیں ... شغل ... ہیں۔ "نمازیں" کے نوٹ ... جا رہے ہیں

امام نے سلام پھیرا اور لوگ اس طرح گھبرا کر اٹھے گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہو امام منبر پر کھڑا خطبہ دے رہا ہے اور لوگ چیختے چلاتے شور و غل مچاتے دھکا پیل کرتے ہوئے باہر چلے جا رہے ہیں۔ ــــ باہر ایک میلہ لگا ہوا ہے۔ پھلکیاں مٹھائیاں بک رہی ہیں۔ کھلونے بک رہے ہیں تماشہ ہو رہا ہے۔ لوگ ہر خوانچہ والے پر ٹوٹے جا رہے ہیں۔ ان کا انہماک دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے گویا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ دوگانہ ادا کرنے نہیں۔

نماز ختم ہوئی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر آئے۔ اب تفریح کا پروگرام بن رہا ہے۔ کوئی نواب صاحب کے جلسہ میں مدعو ہے کوئی خان صاحب کے یہاں بلایا گیا ہے ــــ تھیٹر سینما کے پروگرام پوچھے جا رہے ہیں آپس میں "شہناز لالہ رخ کے کاشانہ" کے لئے وقت متعین ہو رہا ہے

ــــ یہ "اب" ہے

لیکن وقت گذرتا جا رہا ہے، عید کا دن دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے اور رات آ رہی ہے ان کے لئے بھی جنہوں نے اپنی دانست میں بہت ہی پر لطف عید گزاری، اور ان کے لئے بھی جن کا یہ سال کے سال کا دن بھی روتے گزرا ــــ اور ہر رات کے بعد صبح آتی ہے آج رات کے بعد بھی صبح آئیگی لیکن کون جانتا ہے کہ وہ صبح کیسی ہوگی اور کس کے حق میں صبح ہوگی ایک روشن اور منور صبح، اور کس کے حق میں کالی اور ڈراؤنی رات سے بھی بڑھ کر اندھیری اور تاریک صبح ×

(بشکریہ "نغیر" لکھنو)

عمران اعظم انصاری

تاج محل

(تعمیری نقطۂ نگاہ سے)

وہ دور افق پر دوڑ گئے لہراتے ہوئے کالے بادل
وہ برقِ تبسم لہرائی ، وہ چاند نے سرکایا آنچل
وہ سروِ رواں دوشیزہ چلی شانے پہ لئے جل کی چھاگل
وہ چھم سے بنات النعش اٹھیں، وہ بجنے لگی چھم چھم پائل
اے دوست! ذرا چل آج کی شب جنگل میں منائیں گے منگل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا جمنا کے کنارے تاج محل

وہ تاج محل، وہ ہفت عجائب میں سرتاج درِ رُج رواں
وہ تاج محل، حوریں بھی جسے دیکھیں تو کہیں جنت ساماں
وہ تاج محل، وہ صنعتِ انساں یعنی کوئی تصویرِ بتاں
وہ تاج محل، وہ تعبیرِ محبت یعنی کہ خوابِ شاہجہاں
وہ تاج محل، وہ ہند کا دل، کھلتا ہوا اک سنگین کنول
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا جمنا کے کنارے تاج محل

وہ شاہجہاں، مغلِ اعظم ، وہ ایک شہنشاہِ عالم
وہ شاہجہاں، امن و انصاف میں گنگا جمنا کا سنگم
وہ شاہجہاں، اتر، دکھن، پورب، پچھم جس کا پرچم
وہ شاہجہاں، اب تاج میں ہے ممتاز کا سرگرمِ ہم
وہ تاج محل، من کا آنسو، ممتاز محل من گنگا جل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا، جمنا کے کنارے تاج محل

ممتاز محل، وہ تخت نشیں، وہ تاج نگیں، وہ لعلِ جبیں
ممتاز محل، وہ زہرہ جبیں، وہ لعبتِ چیں، وہ حور زمیں
ممتاز محل، وہ خلوت بیں، وہ جلوہ گزیں، وہ عصمت دیں
ممتاز محل، سرد یقیں، مرمر کا یہ ملبوس سنگیں

تلوار کی کاٹ سے بہتر تھا، ممتاز کی آنکھوں کا کاجل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا، جمنا کے کنارے تاج محل

تسلیم کہ یہ تاریخِ جہاں کا ایک اچھوتا باب سہی
تسلیم کہ وہ حقیقت میں اک درثۂ شاہی خواب سہی
تسلیم کہ صنعت کاری میں بے مثل سہی، نایاب سہی
تسلیم کہ ارضِ وطن پر یہ اک مہر سہی، مہتاب سہی
باوصفِ ہمہ اوصاف مگر اک مجھ کو نظر آتا ہے خلل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا جمنا کے کنارے تاج محل

تخلیق کیا جن ہاتھوں نے کیوں تاج پہ انکا نام نہیں؟
تحقیق بہت کچھ باقی ہے تصدیق ابھی تک عام نہیں
محنت کا صلہ دینا ہی فقط اے دوست کوئی انعام نہیں
فنکار کا جب تک نام نہ ہو وہ کام مہذب کام نہیں
مُردہ باد اے طوفانِ اجل، زندہ باد اے یارانِ عمل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا ، جمنا کے کنارے تاج محل

جو مسندِ زر پر بیٹھے ہیں، مسند سے وہ جنبش فرمائیں
مزدور ہے گردش میں بہت، زردار بھی گردش فرمائیں
عمرانؔ! وہ اب تاریخِ وطن پر اتنی نوازش فرمائیں
تاریخ نگاروں سے کہہ دو، تصحیح نگارش فرمائیں

وہ ہم ہیں کہ جب مل بیٹھے ہیں تو بخش دیئے ہیں تاج محل
وہ سینۂ مشرق پر اُبھرا، جمنا کے کنارے تاج محل

امام الدین رام نگری •

روداد ِ چمن •

نہ کلیوں کے سینے میں جوشِ بہاراں، نہ پھولوں کے چہرے پہ کیفِ بہاراں
غم آگیں غم آگیں ہیں نرگس کی آنکھیں، سنبل کی زلفیں پریشاں پریشاں
گرجتے ہیں بادل، کڑکتی ہے بجلی، لپکتے ہیں کوندے، بھڑکتے ہیں شعلے
ہے سرو و صنوبر پہ سکتہ ساطاری، گل و یاسمن ہیں ہراساں ہراساں
گلستاں کے ماحول میں زندگی جس طرح پہلے خفتہ تھی، خفتہ ہے اب بھی
نہ آموں کی ڈالوں پہ کوئل کی کوکو، نہ پھولوں کی شاخوں پہ بلبل غزلخواں
مناتے ہیں تقریبِ جشنِ بہاراں، مگر ہے فضائے چمن کا یہ عالم!
کہ رنگِ بہاراں، نہ حسنِ بہاراں، نہ کیفِ بہاراں، نہ جوشِ بہاراں
یہ سن سن کے خوش ہو رہے تھے عنادل کہ اب ختم ہونے کو ہے دورِ گلچیں
یہ کس کو خبر تھی کہ خود باغبانوں کے ہاتھوں سے تاراج ہوگا گلستاں
جسے سب سمجھتے ہیں پھولوں کا موسم، وہ دراصل پھولوں کا موسم نہیں ہے
بہارِ چمن سب سمجھتے ہیں جس کو، حقیقت میں ہے وہ فریبِ بہاراں
ہمارے چمن کے مقدر میں پہلے نہ امن و سکوں تھا نہ اب عافیت ہے
خزاں تو خزاں تھی بہاروں میں بھی ہے کبھی برقِ باراں کبھی شورِ طوفاں
جو ہے بلبلوں کی نواؤں پہ بندش تو رودادِ گلشن بیاں کیا نہ ہوگی
گزرتی ہے جو لالہ و گل پہ وہ ان کے پژمردہ چہروں سے خود ہے نمایاں
وہ بادل ہی برسا نہیں اس چمن پر جو گلشن کو دراصل گلشن بنا دے
چلی وہ ہوا ہی نہیں اس چمن میں جو خوشبو سے دشت و دمن کو بسا دے

(معیار)

ابوالخطیب •

یہ کون جاگا؟

(مسلسل ناول)

(۲) (گذشتہ سے پیوستہ)

اکمل کی روش بدستور قائم رہی۔ اس گفتگو کے چند روز بعد تک تو امّی نے اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ کوئی بات کہنا بھی ہوتی تو بچیوں کو بھیج دیتیں۔ لیکن اکمل کا رویّہ ماں کی اس ناراضگی سے بھی متاثر نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد پھر امّی نے سوچنا شروع کیا کہ میرا بڑھاپا جیسے ہوگا کٹ ہی جائے گا۔ اگر وہ میری بات نہیں مانتا تو وہ جانے اور اس کا کام۔ لیکن یہ بد دماغ لڑکیوں کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کیوں خراب کرنا چاہتا ہے آخر ان کا کیا ہوگا؟ یہ سارے سوالات ماں کو پریشان کرتے رہتے۔ وہ گھبرا جاتیں اور دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرتیں کہ بیٹے کو وہ عقل دے۔ اب انھوں نے نماز پڑھنا بھی شروع کردی۔ غم کو بھلانے کے لئے وہ ادھر ادھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتیں۔ صبح فقیر دروازے پر گاتا آتا تو اب امّی اس سے گیت سنتیں۔ ان گیت میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہوتا۔ اور دوسری دنیا کی تیاری کا خیال ملتا تو امّی گھبرا جاتیں۔ اس لئے اب انہوں نے صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھنا بھی شروع کردیا۔ اس خضوع و خشوع میں انھیں اب اپنے پیر بھی یاد آنے لگے۔

امّی کو اس حادثہ کے بعد اپنے آخری وقت کا بڑا خیال رہنے لگا۔ خیرات و صدقات اور نیاز نذر پر زیادہ توجہ صرف ہونے لگی۔ بچوں کے مستقبل کا خیال بھی تو ان کی جان کے ساتھ تھا لیکن اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ اس لئے وہ بھی اللہ کے سپرد کردیں۔ اکمل گھر میں آتا، ماں سے نہ بولتا تو وہ بڑی بے چار گی سے اسے دیکھتیں اور ان کا دل مسوس کر رہ جاتا کہ میرے آخری وقت میں یہ کیا ہو رہا ہے کہ مجھے اب بھی چین نہیں ——— بیٹا اگر اس لائن پر چلنا نہیں چاہتا ہے تو اس کا عذاب میں اپنے سر کیوں لوں۔ اس خیال نے امّی کے ذہن میں جڑ پکڑ لی۔ اور وہ اب اکثر انھیں پریشان کیا کرتا۔ اس وقت انھیں بڑی تکلیف ہوتی۔ جب ان کی دونوں بچیاں بن سنور کر لاتے پر بیٹھنے کے لئے "حسنِ بازار" بن جاتیں۔

یہ سلسلہ اب موجودہ ذہنی کشمکش کے ساتھ میں چلتا رہا۔ اکمل کبھی گھر میں ہوتا بھی تو بہنوں کو بنتے سنورتے دیکھ کر جلدی سے وہاں سے نکل جاتا کیونکہ اس کی آنکھیں اس منظر کی تاب نہیں لاسکتی تھیں۔ پہلے جب اس طرح اُٹھ کر چلا جاتا تو امّی اس پر کوئی توجہ نہ دیتیں، بلکہ اس حرکت کو اس کا لڑکپن سمجھتیں لیکن اب بیٹے کو اس طرح گھر سے سر جھکائے نکلتا دیکھ کر ان کا دل رونے لگتا، اور وہ بے تاب ہوجاتیں اس وقت ان کا جی چاہتا کہ اسے روک لیں لیکن اسے جو جاتا گیا، وہ کہاں رُکتا۔ ایک دن امّی عصر کی نماز پڑھ کر مصلّے پر بیٹھی ہوئی تھیں ان کی بچیاں مقررہ وقت پر بازار جانے کے لئے سیڑھیوں سے اتر رہی تھیں کہ امّی کے دل کو ایک زور کا دھچکا سا لگا طبیعت میں کچھ کراہت پیدا ہوئی اور ان کا جی چاہا کہ انھیں روک لے۔ ابھی وہ کچھ ہی سیڑھیاں اتری ہوں گی کہ امی چلائیں :

"اختر شمیم اب بازار نہ جاؤ ——— اب تم کبھی بازار نہ جاؤگی۔"

بچیوں نے صرف پہلے فقرے کو سنا اور اوپر چڑھ آئیں: "امّی کیا ہوا؟" دونوں لڑکیاں ماں کے پاس آگئیں۔

"اب تم بازار نہ جاؤگی" اس فقرے کو سن کر چھوٹی لڑکی نے تعجب سے اپنی بڑی بہن کی طرف بات کو سمجھنے کے لئے دیکھا۔ بڑی بہن صرف تشکر آمیز انداز میں مسکرادی کیونکہ اس فقرے کا پورا پس منظر اس کے ذہن میں تھا اور وہ اس زندگی کو خود بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ چھوٹی بہن اس مسکراہٹ سے بھڑک اٹھی اور ٹھنک کر برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ اور آئینے کے سامنے اپنے سنگھار کو دیکھنے لگی۔

"بیٹی! اس چوٹی اور کانٹوں کو کھول دے۔ تیرا بھیا ان باتو

کو پسند نہیں کرتا اور یہ ہے بھی برا کام۔"

شمیم نے اب بات کو سمجھا اس کے چہرے پر ناگواری کی کئی لکیریں ابھر آئیں اور اسے ایک دھکا سا لگا۔ کیونکہ اب اسے اس خوبصورت سیٹھ کے لڑکے سے ہنسنے بولنے کا موقعہ نہ ملے گا۔ اسی موڈ میں جھنجھلا کر اس نے بڑی لاپرواہی سے اپنے کپڑوں کو اتارا اور سامنے مسہری پر پھینک دیئے۔

"میری بچی تو نے اچھا کیا۔ اس زندگی کو ہمارے گھر سے اب اسی طرح رخصت ہو جانا چاہیئے۔" امّی نے بڑے اطمینان سے شمیم سے کہا۔ شمیم اور بھی بھن گئی۔ اس نے نفرت سے ماں کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔

رات اکمل گھر آیا۔ ماں اور بڑی بہن اس کا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ اکمل نے کمرے میں آکر بتّی جلائی اور اختر کو آواز دی۔ اختر پانی لیکر اپنے بھائی کے پاس آئی اور مسکراتے ہوئے اسے پانی دیا۔ بہن کے ہاتھ سے پانی لینے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ارے آج تو ہنس کیوں رہی ہے؟" اکمل نے ذرا تعجّب سے پوچھا۔

"امّی نے بازار جانے سے قطعی منع کر دیا۔"

"اچھا!" اس لفظ کے ادا کرتے ہی اکمل کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔ گلاس فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ ماں گھبرا کر اندر آئی۔ اکمل کو دیکھا اس کے چہرے پر مسرت امنڈ آئی ۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے بہن خاموش کھڑی تھی۔ ماں کو قریب آتے دیکھ کر وہ اس سے چمٹ گیا اور رونے لگا۔

شمیم و اختر شریف بچیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہیں۔ استاد جی کو بھی امّی نے منع کر دیا۔ اس نے برادری میں ایک طوفان کھڑا کیا امّی کے پاس ان کے رشتے دار آئے۔ انھیں لاکھ سمجھایا بجھایا لیکن امّی نے کسی ایک کی بات نہ مانی اور سب سے ایک ہی بات کہی: "میرا بیٹا اس زندگی کو پسند نہیں کرتا اور میرا بھی آخری وقت ہے۔ آخر میں بھی آخرت کے لئے کچھ کما لوں۔"

تھوڑے دنوں کے بعد ایک پردہ نشین خاتون بچیوں کو قرآن کی تعلیم دینے گھر آنے لگی۔ گھر کی اس غیر متوقع تبدیلی سے اکمل کو بڑا اطمینان ہوا اور مسرت بھی اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو برسوں کی لعنت تو گھر سے دور ہوئی۔ اب وہ پھر ہشاش بشاش رہنے لگا۔ لوگوں سے ملنے کی بھی اس میں خواہش پیدا ہوئی تاکہ انھیں بتایا جائے کہ بدکاری کی لعنت اس کے گھر سے دور ہو گئی۔ اب وہ اپنے پہلے دوستوں میں گیا۔ ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوا۔ انھیں یہ بھی بتایا کہ اس کا گھر اب بدکاری کی گندگی سے پاک ہو چکا ہے۔

اس پر لوگوں نے خوشی و مسرّت کا اظہار کیا لیکن جب نئے لوگوں سے اس کے دوست ملتے تو اس کے تعارف میں اس برابری اور احترام کا ثبوت نہ دیتے جس طرح ایک انسان دوسرے انسان سے فطری طور پر متوقع ہوتا ہے۔ اس کا دل مرجھا کر رہ جاتا۔ انسانوں میں دوبارہ ملنے کے بعد اس نے اس غیر انسانی سلوک کے علاوہ یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے دوست خاص صحبتوں میں اسے نہیں لے جاتے۔ اپنے گھروں پر اسے بلانے سے کتراتے صرف ظاہری رکھ رکھاؤ تک اپنی دوستی کو برقرار رکھتے۔ اس طرح خلوص اور اجتماعی محبّت کے لئے وہ تڑپتا ہی رہا کبھی کبھی اس کے یار دوست کسی ریستوران میں بیٹھ کر دنیا بھر کی باتوں میں مصروف ہوتے تو کوئی منہ پھٹ اور بد اخلاق اپنے کمین جذبات کو مطمئن کرنے کے لئے مسکراتے ہوئے اکمل پر بھی دو چار چھینٹے پھینک کر خود ہی ہنستا رہتا۔ "ابے ہے تو تو رنڈی کی اولاد، تیرا کیا ٹھیک؟" یہ بات کیونکہ مذاق میں ہوتی اس لئے اکمل جواباً مسکرا دیتا لیکن اس لمحہ کیا اس کا دل بھی مسکراتا؟ ——— نہیں بلکہ وہ اس وقت ایسا محسوس کرتا جیسے کسی نوک دار اوزار سے اس کے کلیجے کو پکڑ کر کھینچا جا رہا ہو۔

وہ پھر رگ و شجر کی طرف لوٹ گیا۔ سوسائٹی سے پھر اس کی طبیعت اُچٹ گئی اس حالت میں اسے پھر ایک سال گذر گیا ماں نے گھر سے جاتے ہوئے اسے پھر روکا اور بٹھا کر پوچھا: "بیٹا! اب کیا بات ہے، ہماری روش تو بدل گئی لیکن تمھارا رویّہ پہلے جیسا ہی ہے۔ اب کونسی

قربانی اور چاہتے ہو؟"

"امّی!۔۔۔ اکمل کوئی بات کہنا ہی چاہتا تھا کہ ماں نے اسے روک کر پھر کہا۔

"بیٹا! آگے روٹی کہاں سے چلے گی تو 'بی۔اے' ہی کر لے، ورنہ اس دنیا میں ہمیں کوئی بھیک بھی نہیں دیگا۔ ذرا ان بہنوں کا خیال کر جو اس راستے پر چل پڑیں ہیں جو تجھے پسند ہے"۔

ماں کی اس بات نے اسے پھر ایک دھکا سا دیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ معاً یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا کہ ایسے زندگی کیسے کٹے گی۔ اپنے لئے اسی دنیا میں کوئی جگہ پیدا کر اور ان برائیوں سے لڑ جو تجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔

یہ سارے سوالات اسکے ذہن کے دروازوں پر اس طرح پے در پے پڑے جیسے کوئی بند کواڑوں پر دستک دے رہا ہو اس ذہنی مجادلے سے اس کا ماتھا گرم ہو چکا تھا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر رہے تھے۔ نتھنوں میں بھی ابھار آ چکا تھا اور وہ اپنے چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گولی کھایا ہوا شیر شکاری کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی زبان پر ایک حرف تک نہ آیا تھا۔ ماں کچھ دیر تک تو جواب کا انتظار کرتی رہی لیکن۔۔۔۔ جب اکمل کچھ بھی نہ بولا تو اس نے پھر کہا:

"بیٹا! کیا سوچا، جواب دو۔ یہ نیا کیسے پار ہوگی؟"

اس مرتبہ بھی اکمل کی زبان نہ ہلی صرف آنکھوں سے دو آنسو نکل کر لبوں تک پہونچ کر ٹھوڑی پر پھیل گئے اور ایک دائرہ سا بنا لیا۔ ان آنسوؤں نے ماں۔۔۔۔۔۔ کو بھی آبدیدہ کر دیا اور وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر اکمل کے چہرے کو تکتی رہی۔ اکمل نے کسی قسم کی آہٹ پاکر ماں کو دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری تھا، ماں کو اپنی خاطر روتا دیکھ کر وہ تڑپ گیا اور بے قرار ہو کر بولا:

"امّی وہی ہوگا جو تم کہوگی"

ماں یہ سنکر گھگیا کر رو دی اور اکمل کو اپنے کلیجے سے لگا لیا

"میرے لال ہماری امیدوں کا تو ہی سہارا ہے"

(باقی آئندہ)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے:۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جون ۱۹۵۵ء کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہِ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی، پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم: مینیجر "مشیر" کراچی

نمبر	نام	نمبر	نام
۲۱۴۵	ایم باغ علی صاحب لاہور	۲۱۹۳	ایس قمر التوحید گیا (بھارت)
۲۱۵۰	حاجی علی احمد عبد اللہ جان کراچی	۲۳۰۴	رشید احمد صاحب چٹاگانگ
۲۱۵۱	شیخ محمد صاحب کراچی	۲۳۵۰	مرزا شیر محمد صاحب لاہور
۲۱۵۶	بیگم نگہت طیب صاحبہ لاہور	۲۳۵۱	وحید الدین خان صاحب اعظم گڑھ
۲۱۵۷	فیاض احمد نوزی لاہور	۲۳۵۴	ضیا احمد صاحب کراچی
۲۱۶۰	عبد الرزاق خاں مظفر گڑھ	۲۳۵۶	ثریا کشور عبید صاحبہ کراچی
۲۱۶۱	ذکریا سلطانہ صاحبہ لائل پور	۲۳۵۷	محمد احمد خان صاحب شاہ گنج
۲۱۶۳	ہمشیرہ محمد عرفان صاحب ٹھٹھہ	۲۳۵۸	مظفر علی صاحب اسٹور (گلگت)
۲۱۶۸	ڈاکٹر غلام رسول صاحب سندھ	۲۳۵۹	چودھری محمد علی صاحب سرگودھا
۲۱۷۵	غازی محمد اشرف صاحب جہلم	۲۳۶۱	چودھری نذیر احمد صاحب منٹگمری

رشید احمد ●

کرنل کی موت

کیا تم نہیں جانتے کہ اس عورت نے تمہارا اس وقت ساتھ دیا۔ جب تم لفٹیننٹ کرنل نہیں تھے بلکہ ایک معمولی آفیسر تھے۔ بوڑھے باپ نے لرزتے ہوئے لہجہ میں اپنے بیٹے کرنل کو کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ لڑکی اپنی خانہ داری کی زندگی کے لئے کافی تعلیم یافتہ ہے۔ کیا تمہیں اتنی تمیز بھی نہیں کہ یہ اس آوارہ خاتون سے زیادہ حسین ہے جس پر تم لٹو ہوئے پھرتے ہو" بوڑھے باپ نے پے در پے سوالات کئے اور وہ اور بھی ترش ہو کر بولا۔

"کیا تم ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو جنہوں نے برادری بھر میں چھان بین کر کے تمہاری شادی کی تھی؟ لیکن تم اس وقت لفٹننٹ کرنل نہیں تھے اس وقت تم صرف زیدی تھے" بوڑھے کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

سب کچھ ٹھیک ہی بابا۔ کرنل نے جواب تک خاموش تھا۔ جواب دیا "میرے لئے اب ناممکن ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسی عورت سے بندھا رہوں جو سوسائٹی میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کلبوں میں میرے ساتھ نہیں جا سکتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے دوستوں سے بھی نہیں مل سکتی"

میں تمہاری اس ذہنی مفلسی کو خوب سمجھتا ہوں زیدی میں نے ساری عمر بھیڑیں نہیں چرائی ہیں میں کیپٹن ریٹائرڈ ہوں۔ اور یہ تمہارے خیال کے مطابق تمہاری جاہل ماں میری ہر زمانے میں کامیاب رفیقہ حیات رہی ہے۔ اس وقت بھی آفیسرز میس تھے۔ کلبیں تھیں لیکن ہم باوجود محکوم ہونے کے اس سطح پر نہیں گرے تھے جہاں اب تم پہنچ گئے ہو۔ یہ کلبیں یہ ڈانس اور یہ بیڈ منگ پول ساری عمر میسر نہیں آیا کرتے۔ وقت پاؤں کے نیچے سے یوں پھسل جاتا ہے کہ پتہ نہیں چلتا۔

کرنل نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اباجان یہ پرانی باتیں ہیں۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے اسے ہزاروں برس پیچھے دھکیلا نہیں جا سکتا"

یہ صحیح ہے زیدی کیپٹن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "صداقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں انہیں کبھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور اسی جذبے نے تقسیم کے چند ماہ بعد چھاؤنیوں میں مساجد کی بنیاد ڈال دی۔ لیکن تم اب اس سارے جذبے پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟" بوڑھا کیپٹن سنبھل کر بیٹھ گیا۔

میں اس ماحول سے کیسے بھاگ جاؤں ابا۔ کرنل کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔

ہاں یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ بیٹا۔ آرمی آفیسر دھڑا دھڑ میمیں لئے چلے آ رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر تمہارے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہو گا اور تم نے بھی ایک میم تلاش کر لی۔ تم ابو عبداللہ امیر ہسپانیہ کے آنسو بھول گئے جو اس نے شہر کی چابیاں انگریزوں کو دیتے ہوئے بہائے تھے۔ انہیں آوارہ منش عورتوں نے اس قوم کو ہمیشہ ذلیل کیا۔ مسلمان کیا ہر قوم عیاشی میں مبتلا ہو کر حاکم سے محکوم بن گئی اور تم تو ابھی پاؤں پر کھڑے بھی ہونے نہیں پائے۔ بوڑھا کیپٹن بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر کبھی نہیں لوٹا۔

کرنل زیدی اور مس زرینہ کا سول میرج ہو گیا۔ وہ ایک وکیل کی گریجویٹ لڑکی تھی اب یہ نیا جوڑا رونق محفل تھا۔ بیگم زیدی کے قہقہے کلب میں گونج رہے تھے اور کرنل اپنی نئی بیوی کی ہر دلعزیزی پر بہت خوش تھا۔ وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر شہر کی پر رونق سڑکوں پر سر شام گھومتے۔ شادمانیاں اور کامرانیاں قدم قدم پر ان کا استقبال کر رہی تھیں جلسے پارٹیاں۔ سینما۔ گھوڑ دوڑ۔ پکنک اور سیر و شکار انکے محبوب مشغلے تھے سڑکوں پر ادھر ادھر گھومنے والے شہری اپنی وضع قطع کے لحاظ سے ان کے نزدیک غیر تہذیب یافتہ اور پرانے دقیانوس قسم کے لوگ تھے۔ صرف وہی لوگ قابل التفات تھے جو جدید تہذیب سے ان کے خیال میں بہرہ ور تھے رفتہ رفتہ چھاؤنی ایسے جوڑوں سے بھر گئی۔ پرانی

بیویاں دیہاتوں کی چاردیواری میں قید ہوگئیں اور ان کی جگہ نئی میموں اور بیگمات نے لے لی۔ بیگم زیدی بہت خوش تھی اس کا حلقہ احباب وسیع ہوگیا تھا۔ سب چھاؤنی جدید تہذیب سے بھرپور تھی۔ آفیسرز کلب رشک گلزار بنا ہوا تھا۔

نئے نئے جوش میں جو مسجدیں چھاؤنیوں میں بن چکی تھیں ویران ہو رہی تھیں۔ سوائے ان سپاہیوں کے جو اپنی ترقی کے لئے خدا کے حضور میں دعا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہوتے تھے نمازی غائب ہو گئے

وقت کا چکر پورے زور میں گھوم رہا تھا۔ کرنل زیدی کی کار مری سے واپس آتے وقت ہوا سے باتیں کرتی ہوئی لڑھک گئی۔ کرنل اس حادثے میں بری طرح زخمی ہوگیا۔ سر پر ایسی شدید ضرب آئی کہ سارا جسم تندرست ہونے کے باوجود دماغی توازن درست نہ ہو سکا اور کبھی کبھی اسے ایسا دورہ اٹھتا کہ مرگی کی سی صورت پیدا ہوجاتی۔

اب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوچکا تھا۔ بیگم زیدی کے لیے یہ انقلاب بالکل غیر متوقع تھا۔

اس کی زندگی پھیکی پھیکی سی ہوگئی۔ اس کا بنگلے میں دم گھٹنے لگا۔ اسے یہ توقع ہی نہ تھی کہ اس کی تھرکتی ہوئی اداؤں اور بے چین تمناؤں کا یوں خون ہوگا۔

اس کی پختہ عادت نے کروٹ لینا شروع کی اور رفتہ رفتہ اس نے سوسائٹی میں دوسرے دوست تلاش کر لئے محبت کی راتیں مختصر اور دن لمبے ہوتے ہیں وہ گھر میں بے چین سی رہتی اور رات پہر دن تک کلب کے مشاغل سے لطف اندوز ہوتی۔

کرنل کو بیگم کی بے رخی کا احساس ہو رہا تھا اور اب تو اسے یقین ہو گیا جب اسے اس نے میجر خالد کی فوٹو کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا۔ کرنل زیدی کو یقین کر لینے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ زرینہ نے سول میرج ایک کرنل کے ساتھ کیا تھا۔ زیدی سے نہیں۔

آج جب کرنل نے زرینہ سے نرم سے انداز میں شکایت کرنی چاہی کہ وہ اس کی خبرگیری میں غفلت برتتی ہے تو وہ آگ بگولا ہوگئی اور ایک ہی سانس میں کہتی ہوئی چلی گئی "تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے تو کیا میں بھی پاگل ہوجاؤں۔ میں اپنے ارمانوں کا خون نہیں کرسکتی تمہیں اگر تیمارداری کی ضرورت ہے تو ایک نوکر رکھ لو۔"

اگلے دن خانساماں نے کرنل زیدی کو بتایا کہ میم صاحبہ میجر خالد کے ساتھ سینما میں بیٹھی تھیں۔ کرنل پر سکتہ طاری ہوگیا ایک کپکپی سی لگ گئی اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ وہ تمام عزیزوں سے پہلے ہی کٹ چکا تھا اس کی سوسائٹی اس کی بیوی کی مرہون منت تھی اس کا ماحول تنگ ہوگیا اور اب بیوی کی بے رخی نے اُسے اور بھی مایوس کردیا وہ مختصر سا سامان لے کر رات کی خاموشی میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اب لے دے کر صرف ایک شخص پر اسے امید تھی کہ وہ شاید اسے سہارا دے۔ وہ کراچی کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ جس کو جنگ کے دوران اس نے لاکھوں روپے کا فائدہ پہونچایا تھا۔ وہ تاجر اس وقت اس کا بھائی بنا ہوا تھا۔ اس نے خیال کیا شاید وہاں مجھے کوئی سکون مل سکے۔

ٹرین لحظہ بلحظہ کراچی کے نزدیک آرہی تھی اور کرنل زیدی کو اپنے وہ شاہانہ استقبال یاد آرہے تھے۔ جب وہ نارتھ زون کی ملٹری سپلائی کا واحد انسپکشن انچارج تھا۔ اس نے لاکھوں روپے کے غلط سامان پر مہر تصدیق ثبت کر کے اس تاجر کی الماریاں نوٹوں سے بھر دی تھیں۔ جب کبھی وہ وہاں جاتا تھا تو میلوں آگے آکر اس کا استقبال کیا جاتا۔ سیر و شکار کے شاہانہ سامان کئے جاتے اور تاجر اس کے پیچھے بھائی جان بھائی جان کہتے ہوئے چکر کاٹا کرتا اس کے ہر اشارے کی فوراً تعمیل کی جاتی۔ وہ اب بھی اسی تصور میں تھا۔ غالباً اب بھی اس کی خدمت کے لئے نوکر موجود ہوں گے اس کو اسٹیشن پر ملنے کے لئے مسٹر حنیف خود کھڑا ہوگا۔ کیونکہ روانگی سے پہلے ریلوے اسٹیشن سے وہ تار دے چکا تھا۔

گاڑی کراچی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آکر رکی۔ کرنل زیدی نے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا اس کی نظریں غیر مانوس چہروں پر سے ٹکرا کر واپس آگئیں اور وہ کچھ نیم جان سا ہو کر پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ ایک شخص نے نزدیک آکر ذرا تامل کرتے ہوئے دریافت کیا

"کیا آپ کرنل زیدی ہیں"

کرنل کی جان میں جان آگئی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا "ہاں کیا تم کو مسٹر حنیف نے بھیجا ہے" کرنل نے فوراً دوسرا سوال کیا

ہاں جناب۔ میں ان کا ڈرائیور ہوں! کرنل کو اور بھی اطمینان

ہوگیا کہ اس کو لینے کے لئے کار موجود ہے۔

پندرہ منٹ کے بعد کرنل زیدی مسٹر حنیف کے پاس پہونچ گیا مسٹر حنیف کرنل سے بغلگیر ہوا تھوڑی دیر ادھر ادھر باتیں ہوتی رہیں اور اس کے بعد کرنل کو ڈرائیور بنگلے پر چھوڑ آیا تھا۔

کرنل کو اب قدرے اطمینان سا تھا کبھی کبھار اسے دورہ ضرور پڑتا لیکن اس کی خبرگیری ہورہی تھی کرنل کا قیام جوں جوں طول پکڑتا گیا مسٹر حنیف کی گرمجوشی ٹھنڈی پڑتی گئی۔ بنگلے کے ملازم اس کی پرواہ تک نہ کرتے اور کرنل کی شکایت کا بھی مسٹر حنیف کوئی نوٹس نہ لیتا۔ رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آگیا کہ کرنل کو شہر کے باہر کارخانے کے ایک کوارٹر میں منتقل کردیا گیا۔

کرنل کو اب دنیا کی ناپائیداری کا بری طرح احساس ہورہا تھا۔ تمام سابقہ زندگی سینما کی سلائیڈ کی طرح اس کے تصور میں متحرک ہوتی اس کا اب کوئی دوست نہ تھا اور نہ کوئی سہارا۔ چونکہ اقتدار اس سے چھن چکا تھا اور سب احباب اقتدار اور عیش کے ساتھی تھے۔

اسے بچپن کا وہ معصوم زمانہ یاد آرہا تھا۔ جب وہ گاؤں کے چھوکروں کے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا پھر جب وہ سکول میں پڑھتا تھا تو اس کے ساتھی اسے زیدی زیدی کہہ کر پکارا کرتے۔ ان میں کتنا خلوص تھا۔

اور وہ بغیر کسی غرض اور لالچ کے اس کے دوست تھے۔ وہ خود ان سے دور رہا چکا تھا۔ اتنی دور جہاں سے واپس ہونا اس کے لئے مشکل ہوگیا۔ وہ کرنل ہوگیا تھا اور وہ دیہاتی اب اس کے نزدیک گنوار تھے۔ اس لئے وہ گاؤں بھی چھوڑ دیا جہاں ایک وسیع مکان میں اب بھی اس کا بوڑھا باپ بیٹھک میں حقہ پی رہا ہوگا اور گاؤں کے بڑے بوڑھے اس سے پہلی بڑی جنگ کی باتیں سن رہے ہوں گے۔

اسے ایک دھکا سا لگا۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بیوی زرینہ میجر خالد کے ساتھ لندن کے ہوائی اڈے پر کھڑی آسمان پر اڑتے ہوئے طیاروں کو دیکھ رہی تھی اور اس کا فوٹو اخبار کے پہلے صفحہ پر نمایاں تھا۔ وہ عورتوں کی نمائندگی اس وفد میں کررہی تھی۔

اس کی بیوی اپنے پورے کیریکٹر کے ساتھ اس کے سامنے گھوم گئی۔ وہ بیہوش ہوگیا۔ یہ دورہ آخری ثابت ہوا اور کرنل کی روح قفس عنصری سے آزاد ہوگئی۔ وہ کوارٹر کے باتھ روم میں مرا پڑا تھا۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی۔ ملازم نے بہت دیر گذرنے پر جب معلوم کرنا چاہا تو وہاں قصہ ہی تمام ہوچکا تھا۔

مسٹر حنیف کو ٹیلیفون کیا گیا اور کرنل زیدی کے باپ کو تار دیا گیا بوڑھے کپتان نے جواب دیا۔ "وہ میرے نزدیک کبھی کا مرچکا ہے" آج نہ کوئی گارڈ آف آنر پیش کیا گیا اور نہ فوجی بینڈ نے ماتمی سلامی ہی دی۔ کوئی آنسو اس کی قبر پر نہ گرا۔ اور کوئی ہاتھ اس کی مغفرت کے لئے نہ اٹھا۔

یہ اس کرنل کی موت تھی۔ جسے کارخانے کے چند مزدوروں نے آخری آرامگاہ میں پہونچادیا۔

اسرار احمد سہاوری

جنسی تحلیلِ نفسی

انسانیت کے ماحول میں جنسیت کی فراوانی کی وجہ سے اگر اس دور کو جنسیت کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ جنس فروشی کا آج یہ عالم ہے کہ جدھر نظر اٹھائیے جنسی جذبات کو بھڑکانے کے سامان مہیا نظر آئیں گے ایک چھوٹے سے پنواڑی کی دوکان سے لے کر سینما ہال تک ہماری آبادیاں ایسے نگار خانے بن گئی ہیں جہاں قدم قدم پر ایسی تصاویر نظر آتی ہیں جو جنسی جذبات کو ہیجان میں لانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ ہمارے ادب میں تمام اخبار، رسالے میگزین انتخابی مجموعے سوائے معدودے چند کے ایسا ادب اور ایسی تصاویر شائع کرتے ہیں جو جذبات میں جنسی تحریک پیدا کرتے ہیں ہمارے ادب میں سب سے زیادہ کتابیں وہ شائع اور فروخت ہوتی ہیں جن میں جنسی کیفیات کا سب سے زیادہ اور موثر ذکر ہو اشعار اور گانے وہی سب سے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں جن میں ہیجانی کوائف کی آتش انگیزی موجود ہو۔ سینما کا تو اس جگہ ذکر ہی فضول ہے اس لئے کہ اس کی تو بنیاد ہی جنسی آوارگی۔ اشتعال انگیزی۔ عریانی۔ اور اخلاقی تباہی پر رکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوموں کے اخلاق کو تباہ کرنے میں سب سے بڑا حصہ ہمارے ان نگار خانوں کا ہے۔ انتہا یہ کہ خدا ترسی۔ ہمدلی ایثار اور بے لوث خدمت کے جذبات کو جنسی خواہشات اور داعیات نے بالکل مغلوب اور کمزور کر دیا ہے۔ اگر ہمیں سیلاب زدہ لوگوں کے لئے چندہ کرنے کی ضرورت ہو کسی قومی کام میں سرمایہ مطلوب ہو جہاد کے لئے سامان کی تیاری کرنا پڑے۔ بیماری کے لئے اسپتال اور اپنے بچوں کے لئے تعلیمی درسگاہیں کھولنے کا خیال پیدا ہو اور عوام سے خیرات کے طور پر کچھ طلب کرنا چاہیں تو ہمیں پہلے عوام کے جنسی اور جمالیاتی ذوق و طلب کی تسکین کا سامان مہیا کرنا پڑتا ہے۔

جنسی جذبہ انسانی خمیر میں شامل ہے۔ انسان متعدد اور مختلف جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے۔ منجملہ ان جذبات کے جنسی طلب بھی ایک کیفیت مزاجی ہے جو کہ اپنی ذات میں انتہائی قوی ہے۔ دنیاوی زندگی کے لحاظ سے بقائے نسل اور حفاظتِ نوع اہم ترین چیز ہے اسی لحاظ سے داعیات جنسی کو قوت اور استیلا عطا کیا گیا ہے اور یہ عطا عینِ مصلحت اور خوش تدبیری پر منحصر ہے۔ لیکن فطرت نے انسان کو صرف جنس کا پتلا ہی نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے خمیر میں اور بہت سے داعیات بھی رکھے ہیں جن کے نشو و نما اور بقا کے بغیر ہماری زندگی اتنے ہی بڑے خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے جتنا بڑا خطرہ جنسیت کے کلی فقدان سے پیدا ہو جاتا ہے اب ان مختلف النوع داعیات و جذبات کو بیک وقت بروئے کار لانے کے لئے اور ان کو صحیح مقام پر رکھ کر ان کا نشو و نما قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان سب کی کارگردگی کی حدود مقرر کر دی جائیں۔ اور خصوصاً انسانی زندگی کی سماجی پیچیدگی کی وجہ سے اس میں توازن قائم رکھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ان میں سے ہر جذبہ اور خواہش کی تکمیل کی بالکل واضح اور صاف حدود متعین کر دی جائیں تاکہ یہ ایک دوسرے کے حلقے میں دست اندازی اور ترکتازی نہ کر سکیں۔ اگر ہم اپنے مصنوعی اصول و قوانین سے ان قدرتی ضوابط کی حدود کو توڑیں گے اور ایک جذبے کو دوسرے جذبے پر ظلماً حادی کر دیں گے تو وہی نتائج برآمد ہوں گے جو قانونِ فطرت سے بغاوت کرنے کے بعد آج تک پیدا ہوتے رہے ہیں اور جن کی عبرتناک مثالوں سے انسانیت کی تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں اور جن کی مثالیں اور نتائج ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے معاشرتی خلفشار کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ان اصولوں کو توڑ کر ہم اپنے معاشرے میں توازن ہرگز برقرار نہیں رکھ سکتے اور جو معاشرہ توازن و توافق پیدا نہ کر سکے یا اس کو قائم نہ رکھ سکے وہ خود بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا

جنسی آوارگی کا یا اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کا سب سے زیادہ تباہ کن اثر ہمارے معاشرے پر یہ پڑا ہے کہ ہماری نگاہوں

اور خاندانی زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور جن ممالک میں کلیۃً تباہ نہیں نہیں ہوئی وہاں بڑی تیزی سے تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اول تو لوگ شادی سے اور خانگی زندگی کی ذمہ داریوں سے ہی پناہ مانگتے ہیں اور اگر کسی مجبوری سے شادی کر بھی لیں تو بچوں کی پیدائش کو روکنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو بچوں کو انتہائی بددلی سے پرورش کرتے ہیں۔ بچے ان کے لئے آفت جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی آوارگی اور آزادی میں ایک زبردست روڑا بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کی رنگینی اور دلچسپیوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی نے اپنے نوزائیدہ بچے کو دیوار سے مار کر ہلاک کر دیا اور عدالت میں بیان دیا کہ کوئی اپنی زندگی۔ حسن و شباب اور خوشی کے دشمن کو پرورش کر سکتا ہے جو میں ہی اس کو خون جگر پلا کر پالتی۔ میں اس کو گود میں لے کر باہر نکلتی تو کون نوجوان میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتا۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو خود پرورش کرنا بھی مناسب خیال نہیں کرتے بلکہ سرکاری یا نجی پرورش گاہوں میں بھیج دیتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بچے کے باپ کو اپنی بیوی پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ بچہ میری اولاد نہ ہو کسی دوسرے شخص کی اولاد ہو اس بنا پر دل لگا کر اس کی پرورش کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ دوسری طرف ماں کو اپنی جنسی آوارگیوں سے مہلت نہیں ملتی جو اس ناخواندہ مہمان کی خاطر اپنا خون پسینہ ایک کر دے اور اپنی تمام دیگر خواہشات کو اس پر سے قربان کر ڈالے اس جگہ میں ایک امریکن پروفیسر کے ایک مضمون کا حوالہ دوں گا جس نے امریکہ کی خانگی زندگی کا مرقعہ بڑے عبرت خیز اور دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے امریکہ کی معاشرت کی مثال دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ ہمارا اپنا ملک بھی امریکہ کی معاشرت اور سیاست کا پیروی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر یہ کوششیں بارآور ہو گئیں تو ہمارا اپنا معاشرہ بھی چند دنوں میں امریکہ جیسا معاشرہ ہی ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاشرے اور تہذیب کی نقل کرنے والے اندھی تقلید نہ کریں۔ زندگی کے جن صولوں سے امریکہ والے خود توبہ کر رہے ہیں ان کو اپنے اوپر مسلط کرنا انتہائی نادانی ہوگی۔ اس شخص سے زیادہ کون احمق ہوگا جو دوسروں کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر عبرت نہ حاصل کرے اور خود دانستہ اس مصیبت میں گرفتار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا فعل تو یقیناً خودکشی کا ہی مترادف ہو سکتا ہے۔ صحیح طریقہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ جو بے عیب قسم کی خوبی نظر آئے اس کو اپنا لیا جائے دوسری نقصان دہ چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔ مثلاً ان کی ایجادات۔ تعلیمی شغف۔ وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان چیزوں کو اپنا لیا جائے لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ ان کی طرح اخلاقی قدروں کو بھی بدل ڈالیں۔ معاشرت کے صولوں میں بھی انقلاب برپا کر دیں۔ سیاست کا نقشہ بھی نیا تیار کر ڈالیں۔ غرضکہ اپنی ہر چیز کو ناقص سمجھ کر ترک کر دیں اور آنکھیں بند کر کے ان کی ہر چیز کو اعلیٰ سمجھ کر اختیار کرتے چلے جائیں یہ تو ذہنی غلامی اور مرعوبیت کی بدترین مثال ہوگی

پروفیسر فلٹن اپنے مضمون "آزادی کی لعنت" میں امریکہ کی خاندانی زندگی کی تباہی کے سلسلے میں لکھتے ہیں "اگر کسی معاشرے میں میاں بیوی کی محبت خودغرضی پر مبنی ہو کر رہ جائے۔ اور ایک دوسرے کے لئے ایثار کا جذبہ ختم ہو جائے تو ایسے ملک میں جلدی ہی مزدور اور سرمایہ داران میاں بیوی کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں گے۔ دونوں سماجی زندگی کو تباہ اور معاشرتی سکون کو برباد کر ڈالیں گے۔ قوم کے مستقبل کا اندازہ حال کی خاندانی زندگی سے بالکل صحیح طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ جو کچھ پہلے پہل گھروں میں ظہور پذیر ہوگا وہی کچھ مدت کے بعد کانگریس اور عدالات عالیہ میں نظر آئے گا۔ جب ہماری ازدواجی زندگی کا یہ حال ہو کہ طلاقوں کی شرح پچاس فیصدی ہو جائے۔ تو ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ ہماری معاشرت کو گھن لگ چکا ہے کہ ہمارے یہاں عام صحت کا یہ عالم ہو چکا ہے کہ فوجی بھرتی کے وقت پچاس فیصدی نوجوان اعصابی بیماریوں کی وجہ سے رد کر دیئے جاتے ہیں۔ شراب نوشی کی وجہ سے دماغی بیماریاں پانچ سو فیصد بڑھ گئی ہیں۔ پچاس فیصدی طلاقیں محض اس لئے ہو جاتی ہیں کہ شادی کے بعد اولاد پیدا نہیں ہونے دی جاتی۔ اولاد ہی ایک ایسی زنجیر ہے جو ماں باپ کو مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ جکڑا دیتی ہے۔ اگر امریکہ نے خاندانی زندگی کی طرف سے اپنا رویہ نہ بدلا تو یقینی ہیبتناک نتائج برآمد ہوں گے۔ سب سے پہلے تو امریکن قوم ..... غداروں

کی قوم ہو جائے گی۔ اگر امریکہ کے شہری تا زیست رفاقت نباہنے کے سنجیدہ اور سنگین وعدے کا ایفا نہیں کر سکتے اور ذرا سی بات پر اس رشتہ کو توڑ کر ایفائے عہد سے منہ موڑ لیتے ہیں تو یقینی بات وہ وقت دور نہیں جب یہ شہری اپنے وطن سے کئے ہوئے وعدوں کو بھی توڑ کر پھینک دیں گے اور ملک و قوم سے غداری کرنے میں ذرا شرم اور باک محسوس نہیں کریں گے۔ جہاں کہ مسٹر براون ہمیشہ مسز وائٹ بننے کے لئے تیار رہیں۔ وہاں ایک امریکن کو روسی بن جانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔ جو لوگ اپنے گھروں کے غدار ہیں وہ یقینی کل کو قوم اور وطن کے غدار بن کر رہیں گے۔ دوسرا خطرہ جس سے قوم دوچار ہوگی وہ یہ ہے کہ جو لوگ گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے عادی نہیں رہیں گے وہ آزمائش کے وقت بڑی مصیبت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ ان کی طبیعتیں اس قدر نازک ہو جائیں گی کہ ذرا ذرا سی قربانی ان کے لئے پہاڑ ہو جائیں گی۔ اور ایسی کم ہمت قوم اپنی آزادی تو درکنار زندگی بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔"

جنسیات کو سب سے زیادہ شغف سے جس شخص نے موضوع سخن بنایا ہے وہ غالباً فرائیڈ ہے۔ اس نے اعصابی کمزوری یا عصبائیت کے مرض کی تشخیص اس بنیاد پر کی کہ بچوں میں پیدائش کے چند ماہ کے بعد ہی جنسی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بچہ ماں کا دودھ پیتے وقت جنسی لذت حاصل کرتا ہے۔ پھر دو تین برس کے بعد لڑکی جنسی طور سے باپ کی طرف کشش محسوس کرتی ہے اور لڑکا ماں کی طرف۔ پھر جب بچوں کو سمجھ پڑتی ہے تو بچے اس کشش کو دبا دیتے ہیں چونکہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے اس رجحان کو اچھی اور پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا آہستہ آہستہ یہ داعیہ لاشعور یا تحت الشعور کے مقامات میں جا پڑتا ہے اور کبھی کبھی خوابوں میں جبکہ شعور پر کوئی رواجی یا اخلاقی پابندی نہیں ہوتی تو بروئے کار آجاتا ہے۔ فرائیڈ کے شروع شروع کے زمانے کے خیالات یہ ہیں کہ عصبائیت کی تمام بیماریاں اسی جنسی جذبے کو دبا دینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ان جذبات کو نفسیاتی طور پر ابھار کر ان کی تسکین کا سامان مہیا کر دیا جانے یا ان کو کسی دوسرے معینہ کام کی جانب متوجہ کر دیا جائے تو مریض صحتیاب ہو سکتا ہے۔ اس توجہ کو کسی اچھے کام کی طرف لگا دینے کا نام ترفیع جنسی (sublimation) کا نام دیا گیا ہے فرائیڈ نے جنس کے معاملے میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ انسان کی پوری زندگی پر اس کو حاوی کر دیا۔ اس کے خیال میں ہمارا ہر کام کسی نہ کسی پہلو سے جنس کے جذبات سے متاثر ہوتا ہے لیکن بعد میں فرائیڈ کے ہم پلہ ماہرین نفسیات نے اس کے اس دعوے کی شدت سے مخالفت کی۔ ان مخالفین میں. یونگ۔ ڈگل۔ ایڈلر۔ وغیرہ ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد فرائیڈ کو اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنی پڑی اور اس نے یہ تسلیم کیا کہ ہمارے خمیر میں صرف جنس کا جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ دوسرے داعیات بھی ہیں جو اپنے اپنے حلقہ کارکردگی میں اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور ان کی اہمیت بھی نتائج کے لحاظ سے کم نہیں ہے جنگ اور ڈگل وغیرہ نے فرائیڈ کی اس مسئلہ میں بھی مخالفت کی ہے کہ بچوں میں پیدائش سے جنسی میلانات اسی قسم کے پائے جاتے ہیں جس قسم کے کہ ایک بالغ انسان میں پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جنسی میلانات بالقوۃ تو بچوں میں موجود ہوتے ہیں لیکن بالفعل ان کا اظہار سن بلوغ کے قریب ہی پہونچکر ہوتا ہے اور اگر کچھ جنسی میلانات سے ملتے جلتے علامات نظر آتے ہیں تو وہ اس قوتِ زندگی کے علامات ہوتے ہیں جو تمام میلانات اور داعیات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ میلانات علیحدہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور اپنا مقام علیحدہ حاصل کر کے نشو و نما پاتے ہیں اور ایک خاص عمر میں پہونچکر بالکل واضح اور کافی حد تک قوی ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ فرائیڈ سے اس معاملے میں بھی اختلاف رکھتے ہیں کہ لڑکا بچپن ہی سے ماں کی طرف اور لڑکی باپ کی طرف جنسی میلانات رکھتی ہے ان لوگوں کا خیال ہے فرائیڈ کا یہ دعویٰ اس کے تمام دعاوی کے لحاظ سے انتہائی لچر اور کمزور ہے فرائیڈ کے اس دعوے کا اور کوئی اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اتنا ضرور ہے کہ اب مغربی ممالک میں خصوصاً باپ اور بیٹی کے درمیان جنسی تعلقات کا مفہوم اس قدر شرمناک اور بھیانک نہیں رہا جتنا کہ فرائیڈ کے اس اعلان سے پہلے تھا۔ گو فرائیڈ نے بار بار اعلان کیا ہے کہ تحلیل نفسی سے اور ایک حقیقت کو معلوم کر لینے سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اخلاقی طور پر بھی اس کا جواز مہیا کر لیا جائے۔ اور یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ لڑکی پیدائشی

طور پر باپ کی طرف جنسی رجحان رکھتی ہے یہ جائز قرار دے لیا جائے کہ ان دونوں کے جنسی تعلقات جائز ہو گئے۔ بلکہ اس نے تو "تحلیل نفسی پر ابتدائی خطبات" میں علی الاعلان تسلیم کیا ہے کہ میری کسی تحریر کا یا تحلیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں اس کو اخلاقی طور پر بھی جائز سمجھتا ہوں مثلاً اگر میں یہ کہتا ہوں کہ اعصابی کمزوری جنسی جذبات کو دبا دینے سے پیدا ہو جاتی ہے تو میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اس آگ کو ٹھنڈا کیا جائے بلکہ میں اس معاملے کو قطعی مریض پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود کوئی جائز اور مناسب طریقہ سوچ کر اس پر عمل کرے۔ لیکن یہاں وہ مثال صادق آگئی کہ دیوانہ را ہوئے بس است۔ فرائیڈ کا اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ لوگ جنسی تسکین کے ذرائع کی طرف دوڑ پڑے۔ ادھر جب تجارت پیشہ لوگوں نے اور تجارت پیشہ حکومتوں نے دیکھا کہ جنسی جذبات میں آگ لگی ہوئی اور اس وقت انسانی زندگی کا یہ پہلو انتہائی کمزور ہو گیا ہے تو انھوں نے اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جنسی جذبات کو اور بھڑکا بھڑکا کر اور اس کے تسکین کے سامان فراہم کر کے لوگوں کو خوب لوٹا اور ان کی جیبیں خالی کیں۔ اس بے عزتی کی کمائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اب جنسی خواہشات کے منہ میں لگام دینا محال ہو گیا ہے۔ اور اب جنسی آوارگی کے پھل ناجائز بچوں کی صورت میں۔ گھریلو زندگی کی تباہی کے رنگ میں۔ باپ اور بیٹیوں کے ناجائز تعلقات کی شکل میں۔ عورتوں کے کتوں کے ساتھ جنسی تعلقات کے طور پر سامنے آرہے ہیں۔ آگے آگے دیکھئے اور کیا ہوتا ہے۔ لوگ جنسی خواہشات پر ایک ساتھ ایسے ٹوٹ پڑے ہیں جیسے مدتوں سے کسی سہارے کی تلاش میں تھے اور وہ سہارا انہیں فرائیڈ کی تحلیل نفسی اور جنسی میلانات کے متعلق تحقیقات کرنے سے مل گیا۔ حالانکہ فرائیڈ نے ان نتائج کا قطعی حامی نہیں اور نہ کوئی صحیح عقل رکھنے والا انسان اس قسم کی بے راہ روی کو برداشت کر سکتا ہے۔ فرائیڈ اپنی کتاب "تحلیل نفسی پر ابتدائی خطبات" میں لکھتا ہے:

"آپ لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ تحلیل نفسی کے اصولوں کے مطابق تندرستی آزادانہ اختلاط جنسی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن یہ تحلیل پر ایک انتہائی بدنما داغ ہوگا اور اگر وہ عام اخلاقی اقدار کی مخالفت کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تحلیل ایک شخص کو یہ حق دیگر بہت سے لوگوں کے حقوق کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ یہ انتہائی لغو اور بیہودہ سی بات ہوگی اگر تحلیل نفسی آپ لوگوں کو جنسی آزادی کی اجازت دیدے۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور آپ کو قطعی غلط معلومات فراہم کی گئی ہے اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ تحلیل کا کام آپ کی زندگی کے لئے کوئی لائحہ عمل یا اصول معاشرت قائم کرنا ہے۔ ہم تو صرف ایک مرض کی اور اس کے علاج کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں۔ اب اس علاج کے ذرائع حاصل کرنے کا کام مریض کا ہے وہ جو ذرائع مناسب سمجھے اختیار کرے۔ میں یہاں یہ بات بھی ظاہر کر دوں کہ ہمیں جنسی انضباط اعصابی بیماریوں کے پیدا کرنے کا سبب ٹھہرانے کے سلسلے میں مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور نہ ہر اعصابی مریض جنسی تسکین سے اچھا ہو سکتا ہے۔ یہ علاج بہت کم تعداد کے لئے راس آسکتا ہے۔"

میں نے اس سے پہلے ترفیع جنسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ جنسی داعیات کی قوت کو کسی مفید کام کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے بہت اچھے اور مفید نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ اس مسئلہ پر فرائیڈ نے بہت زور دیا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ فرائیڈ کے فلسفہ جنس میں یہی سب سے زیادہ مفید اور کام کی چیز ہے۔ جنگ۔ ڈگل اور ایڈلر وغیرہ نے اس فلسفہ کو تسلیم ضرور کیا ہے لیکن اتنی قوت اور شغف کے ساتھ پیش نہیں کیا کہ جتنا کہ فرائیڈ نے۔ فرائیڈ کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے کام کئے گئے ہیں ان میں جنسی جذبات کی ترفیع کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس کے نزدیک اگر جنسی داعیات کی پوری تسکین کر دی جائے تو پھر انسان کسی اہم اور بڑے کام کی طرف اقدام نہیں کر سکتا۔ ان جذبات کی تسکین کے بعد آدمی کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ ولولہ اور جوش سرد پڑ جاتا ہے اس لئے انسانی زندگی میں حرکت ترقی۔ جوش اور قوت برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے جنسی جذبات کی مکمل تسکین نہ ہو۔ اس کی آنچ سے اس میں آگے بڑھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ دیکھئے فرائیڈ نے کیا کہا تھا اور اس کے سننے والوں نے اپنی

ہوسناکی کی بنا پر اس کے قول سے کیا نتائج برآمد کرلیتے۔ کس طرح لوگ ہر بات سے اپنے مطلب کے نتائج برآمد کر لیتے ہیں۔ ڈگل نے جنسی بے راہ روی کے سلسلے میں اپنی ایک کتاب میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

وہ شخص جو خود کو جنسی بے راہ روی سے تباہ کرلے بڑا بدقسمت ہے۔ اس سے زیادہ نفرت انگیز حرکت اور کیا ہو سکتی ہے۔ عیاشی میں لطف کے بلند بانگ دعوے انتہائی لغو اور کم وزن ہیں ہم آج کل عیاشی کی طرف اس لئے مائل نہیں ہوتے کہ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں بلکہ غرض مند لوگ بڑی بے غرتی سے ہمارے جنسی میلانات کو مصنوعی طور پر بھڑکا دیتے ہیں تاکہ ہمیں بیوقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کرسکیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اختلاط جنسی ایک سخت تکلیف دہ چیز ہے جس کو ہم وقتی طور پر جوش اور گرمی کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے اس کو لطف کہنا سخت نادانی ہے۔ خصوصاً اس معاملہ میں زیادتی کرنا تو سخت اذیت دہ اور نتائج کے لحاظ سے سخت تباہ کن ہے۔ اس سے اگر کچھ لذت حاصل کیجا سکتی ہے تو اسی طرح کہ اس کو کچھ حدود کا پابند بنایا جائے۔ اس کو پوری طرح قابو میں رکھا جائے اور اگر ہو سکے تو اس قوت کو کسی مناسب کام کی طرف منعطف کردیا جائے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بقائے نسل کے لئے ایک فریضہ ہے جو ہم پر قدرت کی طرف سے عائد کردیا گیا ہے اور چونکہ بقائے نسل قدرت کا ایک اہم منشا تھا اس لئے اس میں بھی ایک قسم کی کشش پیدا کردی ہے جو کہ انسان پر وارفتگی طاری نہ ہوتی تو انسان اس تکلیف کو غالباً برداشت بھی نہ کرسکتا۔ گویا یہ بھی ایک نشہ آور دوا ہے جو آپریشن سے پہلے استعمال کرلی جاتی ہے۔ ورنہ ایک سخت فرض کی ادائیگی سے اور لذت سے کیا علاقہ۔

یہاں میں فرائیڈ کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے مشہور نظریئے یعنی بچے کا اپنی مخالف جنس کی طرف مائل ہونے کا (Oedipus Complex) ذکر میں اس سے پہلے کرچکا ہوں۔ فرائیڈ کا خیال یہ ہے کہ جب نوعمر بچے یا عمر رسیدہ والدین ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ کر جنسی میلانات کا احساس کرتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بچہ یا والدین اپنے اس جنسی میلان کو قبیح سمجھ کر دبا دیتے ہیں۔ اور وہ احساس تحت الشعور میں چلا جاتا ہے لیکن خواب میں جبکہ شعور ان پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، تو دبی ہوئی خواہش ابھر آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ زبردست غلط فہمی ہے۔ اس میں فرائیڈ اس وجہ سے مبتلا ہوا کہ چند لوگوں کے خواب معلوم کرکے اس نے اپنی مرضی کا نتیجہ نکالنے میں جلدبازی سے کام لیا۔ جنگ اور ڈگل کو بھی فرائیڈ سے یہی شکایت ہے کہ وہ کسی خاص واقع سے اپنے مطلب کا نتیجہ برآمد کرنے میں بہت جلدبازی سے کام لیتا ہے۔ ایک فعل کے متعدد اسباب ممکن ہو سکتے ہیں لیکن وہ یہی نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ فعل جنسی جذبہ کی وجہ سے عمل میں آیا۔

یہی مثال اس کی اس نظریئے Oedipus Complex میں صادق آتی ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ خواب میں بالائی شعور تو ساکن ہو جاتا ہے اور تحت الشعور بروئے کار آجاتا ہے۔ جب تحت الشعور میں کیفیت مزاجی کی وجہ سے اخلاط کے توازن میں کمی و بیشی کی وجہ سے جنسی طاقت یا جذبہ زیادہ ابھر آتا ہے۔ تو کسی مفعول کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اب ایسی حالت میں تحت الشعور کسی مانوس چیز کو اکثر و بیشتر گھسیٹ لاتا ہے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو۔ اس پر ہمارے کسی رشتے کی کسی پابندی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ سماجی پابندیوں کا خیال نہیں کرتا۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ہماری خواب میں ایسی کوئی چیز شاذ ہی آتی ہے جس کے متعلق ہم نے کچھ سنا ہو یا جس کو ہم نے دیکھا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس بات کا التزام نہیں ہوتا کہ بیٹا ماں کو اور بیٹی باپ کو ہی خواب میں دیکھے۔ بلکہ ماں۔ بہن۔ بیوی۔ دور کا کوئی رشتہ دار۔ کوئی اپنا ہم جنس بلا امتیاز اکثر خواب میں آجاتے ہیں حتیٰ کہ انسان کبھی کبھی کسی جانور کو مفعول کی حیثیت سے خواب میں دیکھ لیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ تو نکالا جا سکتا ہے کہ خواب کی حالت میں جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ خواہ وہ دبی ہوئی خواہش ہو خواہ اخلاط کا ایک خاص تناسب وقتی طور سے مزاج میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہو اور اس خواہش کی تسکین کے لئے تحت الشعور فوری کوئی تدبیر کرتا ہے لیکن اس وقت یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ بیٹا اپنی ماں کو ہی خواب میں دیکھے یا بیٹی اپنے باپ کو ہی خواب میں دیکھے۔ اگر ——

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر دیکھئے)

اسد مرزا پوری •

تلاطم

یہ دور جب ساز گار ہوگا کچھ اور رنگ بہار ہوگا
چمن پہ چھائے گا ایسا عالم گلوں پہ دونا نکھار ہوگا

بہار میں بھی جو پھول اندیشۂ خزاں کا شکار ہوگا
تمھیں خبر بھی ہے اہل گلشن وہ حاصل صد بہار ہوگا

نظام اپنے چمن کا کب تک یہ دیکھنا ہی رہیگا برہم
کبھی تو بدلے گا یہ زمانہ کبھی تو جشن بہار ہوگا

وفا کی دنیا جو پوچھیے سچ تو صرف دل سے نگاہ تک ہے
زباں نے تائید جس کی کردی وہ عہد کیا استوار ہوگا

حدود انسانیت سے صد حیف نوع انساں گذر رہا ہے
زمانے والے ہوئے ہیں جب یوں زمانہ کیا ساز گار ہوگا

گھنے اندھیروں کی چادروں میں چھپا ہوا ہے جمال جسکا
دکھائے قسمت تو ایک دن پھر وہی چمن جلوہ بار ہوگا

کچھ ایسا موجوں نے رنگ بدلا کہ ساحلوں پر بھی ہے تلاطم
بھنور کی زد سے بچائیں کیسے سفینہ اب کیسے پار ہوگا

وفا کا تو خیر تذکرہ کیا نہیں مروت بھی اب کسی میں
وطن میں رہ کر بھی کیا خبر تھی کوئی غریب الدیار ہوگا

اسدؔ ہوں میں بندۂ محبت مجھے ہو ناز اپنی سادگی پر
وہ ہر قدم پر فریب دیں گے مگر مجھے اعتبار ہوگا

دارؔ کاشمیری •

جامِ غمِ حیات

جب سے نگاہِ لطف و کرم اس نے پھیر لی
بڑھتی چلی گئی ہے مرے دل کی بیکلی

اے مطرب حیات کوئی نغمۂ الم
تاریکیٔ حیات میں ہو غم کی روشنی

جامِ غمِ حیات کے پینے میں عذر کیا
جامِ غمِ حیات میں ہے لطفِ زندگی

اے دارؔ ایسے یار کی صحبت کو کر تلاش
جو دشمنی کے بھیس میں کرتا ہو دوستی

رحمٰن شاد اسلامیہ کالج (گوجرانوالہ)

رنگ رلیوں سے بھرپور عید آگئی
لوگ خوشیوں بھرے گیت گانے لگے
عیش و عشرت کے فانوس جلنے لگے
گنبدِ سیم و زر جگمگانے لگے

* * *

شیش محلوں میں شمعیں فروزاں ہوئیں
آج پھر عشرتیں جلوہ گر ہو گئیں
کتنی بہنوں کے چہروں کی رعنائیاں
مال و دولت کی جھنکار میں کھو گئیں

* * *

کتنے لوگوں کے ہونٹوں کی شادابیاں
رد و افلاس کی آگ میں جل گئیں
کتنے سینوں میں ارماں مچلتے رہے
لتنی آہیں دلوں میں سلگتی رہیں

آج بھی آدمیت کی آہ و فغاں
عیش و عشرت کے پردوں میں مستور ہے
بیکسوں کی سسکتی ہوئی زندگی
اپنی دھرتی کے سینہ پہ ناسور ہے

* * *

ہم ابھی عید کیسے منائیں کہ جب
ہم زبوں حال و مظلوم و مجبور ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
لوگ لاچار و مغموم و رنجور ہیں

* * *

ہم یہ عیدِ مسرت منائیں گے جب
یہ سسکتے ہوئے لوگ مسکائیں گے
جبکہ ہر سمت اسلام چھا جائے گا!
عدل و انصاف کے دن پلٹ آئیں گے

قیصر فخری

مقدس زخم

داس نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے سہارا دیکر بائیں بازو کو اوپر اٹھانا چاہا۔ لیکن جلد ہی اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوگیا کہ یہ بازو بغیر کسی سہارے کے حرکت کر سکتا ہے۔ اور ایک گونہ طمانیت کے ساتھ اس نے اپنی کلائی کے زخم کو دیکھا۔ زخم اپنی جگہ موجود تھا۔ لیکن سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کا دباؤ پڑنے کے باوجود اس میں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ داس نے اسے اور زیادہ سختی کے ساتھ دبایا۔

مہینے کے اولین دنوں میں کا چاند نہ جانے کب کا روپوش ہو چکا تھا۔ لیکن داس کو تاحدِ نگاہ تمام چیزیں چاندنی کے پانی میں ڈھلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دور تک ریت کا سفید سمندر نقرئی موجیں مارتا چلا گیا تھا اور جگہ بجگہ کھجوروں کے درخت اس سمندر کی سطح سے سیمابی فواروں کی طرح اچھل رہے تھے۔ داس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا فضا میں ایک قسم کی نورانی چمک تھی۔ لیکن آنکھوں کو تکلیف پہنچانے والی چکاچوند کے بغیر! اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ برف ٹپکا رہا ہے۔

اور ایک بار پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کو دیکھا ـــ کلائی پر "پہنچے" سے ایک ذرا اوپر، عین اُس جگہ جہاں اس کے ہاتھ کی سب سے زیادہ ابھری ہوئی نیلی دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی، سوا دو انچ لمبا اور تقریباً تین سوت چوڑا گھاؤ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ داس بھی مسکرا دیا۔ زخم میں تکلیف نہیں تھی۔ میٹھے میٹھے درد جیسی لذت تھی، اور پھر اس کے کنارے بالکل سفید ہو رہے تھے۔ داس کو ایسا محسوس ہوا گویا اس زخم سے بھی روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔

اور جب وہ مسکرایا تو اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اوپری ہونٹ میں کچھ گدگدی سی ہوتی ہے ـــــ کیونکہ اس کے نچلے ہونٹ کا صرف ایک سرا اس کے اوپری ہونٹ سے ملا تھا۔ اور جب اس نے دوسرے سرے پر زبان پھیرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھا اس طرف کے تین یا چار دانت بھی اپنی جگہ نہیں تھے۔ آخری بار بیہوش ہونے سے پہلے داس کو اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کے زخم کے بارے میں اچھی طرح علم تھا۔ لیکن یہ اس کے ہونٹ اور دانت کو کیا ہوا! ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں تمام واقعات دہرانے شروع کر دیے۔

راولپنڈی اور بچپن کے رنگین ایام۔ گارڈن کالج اور طالب علمانہ زندگی کے دلچسپ تفریحی مشغلے۔ آکسفورڈ اور وہاں کی مصروفیات، اور پھر برلن ـــــ ہاں برلن اور ہیوبرٹ ڈسنے۔

یہ ہیوبرٹ کس قدر عجیب و غریب شخص تھا۔ اول درجہ کا علمی انسان اور پرلے درجے کا یہودی! اور اس میں قوت بیان کس بلا کی تھی، الفاظ کو وہ اپنے دماغ کے کارخانے میں بناتا نہیں تھا بلکہ وہ خود بخود اسکی نوک زبان سے حسبِ ضرورت ٹپک پڑتے تھے! اپنے منطقی اندازِ بیان اور گرم گرم جملوں کے ساتھ جب وہ کسی موضوع پر بولنا شروع کرتا تو بس بولے ہی چلا جاتا۔ یہ صرف اس کی چرب زبانی یا پھر خلوص کا نتیجہ تھا کہ بنو اسرائیل سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ ہیوبرٹ کی صیہونی تحریک سے متاثر ہو گیا تھا۔

"میں خود بھی تمہاری جیسی ایک تحریک کا رکن رہا ہوں ہیوبرٹ!" اس نے کہا تھا "ہمارا اور تمہارا دشمن ایک ہے، ہم اُسے اپنے وطن سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں جہاں اس نے قطعی ناجائز طور پر قدم جما لئے ہیں اور تم اسے اس کے اپنے وطن سے ناپید کر دینا چاہتے ہو۔ بہرحال ایک مشترک طاقت کے خلاف میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"ہم کسی کو کسی کے وطن سے ناپید نہیں کرنا چاہتے" ہیوبرٹ نے کہا تھا "ہم صرف اپنی قوم کے لئے ایک جائے پناہ چاہتے ہیں۔ اور تم

دیکھو گے کہ ہم نے وہاں دنیا کے لئے کیسی مثالی حکومت قائم کی ہے۔ ہمارا وطن دنیا میں پہلی بار صحیح جمہوریت کا تصور پیدا کریگا۔"

"ہمارے اور تمہارے مقاصد میں اختلاف نہیں، ہیوبرٹ!" اس نے جواب دیا تھا "لیکن تم میرے اندر غلط تصورات پیدا کرنے میں کوشش کر رہے ہو، میرے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ تم میرے دشمن کو اس کے [illegible] ہو [illegible] تمہارے طرز حکومت اور [illegible] ممالک سے [illegible] دلچسپی نہیں [illegible] امریکہ اور برطانیہ کی حکومت [illegible] تمہاری تحریک کا [illegible] کی جمہوریت [illegible] کس طرح کر سکتا ہوں۔"

امریکہ اور برطانیہ [illegible] غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے" ہیوبرٹ نے کہا تھا "امریکہ میں [illegible] دونوں کی [illegible] موجود ہیں [illegible] کے سرپرست رکھو ہماری تاریخ [illegible] پڑتی ہے اور امریکہ [illegible] مشینری کو متحرک رکھو [illegible] ہماری قوم کے ذی اثر افراد موجود ہیں [illegible] برطانیہ عرب ممالک کے درمیان ہمیشہ ایک ایسی ریاست قائم کئے رکھنے کے حق میں ہے جو ان ممالک کے گلے میں ہمیشہ ایک ہڈی کی طرح اٹکی رہے اور [illegible] تو وہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل جیسی ایک زبردست طاقت کے [illegible] صرف امریکہ اور برطانیہ کا سایہ برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ [illegible] کے باوجود وہ ہماری دشمنی [illegible] نہیں چاہتا لیکن ہم ان [illegible] ایک کی بھی بننے کے لئے تیار نہیں ہیں ----

[illegible] فلسطین پہنچ کر ہماری [illegible] مدد کر سکو گے عملی [illegible] ہماری قوم کا [illegible] کوئی آدمی نہیں کر سکتا۔ اور تم فلسطین کے ساحل پر قدم رکھتے ہی دیکھ لو گے [illegible] ہماری آزاد ریاست قائم ہے داخلی، یا خارجی کسی بھی اعتبار سے [illegible] کسی بیرونی قوت کے زیر اثر نہیں ہے"

اور فلسطین کے ساحل پر قدم رکھتے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ واقعی اسرائیل کی آزاد ریاست قائم ہے، اور داخلی یا خارجی کسی بھی اعتبار سے یہ ریاست کسی بیرونی قوت کے زیر اثر نہیں ہے، کیوں کہ وہاں سرے سے کوئی بیرونی قوت موجود ہی نہیں ہے تل ابیب کی گلیاں، سڑکیں اور بازار ہر جگہ [illegible] چہرے نظر آ رہے تھے۔ جرمن، [illegible] پول، انگریز، امریکن، سوئز، فرانسیسی، ولندیزی، رومانوی، بلغاری، کوئی مقامی رنگ نظر ہی نہ آتا تھا اور جب ماحول میں کوئی مقامی رنگ ہی نہ ہو تو پھر کسی بیرونی قوت کے زیر اثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"السلام علیکم" کسی نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ اور اس نے چونک کر گردن موڑی۔ فضا میں اسی طرح نورانی چادریں تنی ہوئی تھیں اور آسمان پر ستارے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ نور کے دھندلکے میں دو سفید پوش [illegible] سیمابی چادروں میں ملبوس آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ یقیناً کوئی عرب ہوں گے

"وعلیکم السلام" اس نے بھی [illegible] قرأت کے ساتھ جواب دیا۔ سیمابی چادروں میں ملبوس دونوں شکلیں اس کے قریب ہی دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔ "یہ آپ کے چہرے پر زخم کا نشان کیسا ہے" ان میں سے ایک نے پوچھا "ہم دونوں کافی دور سے اس روشنی کی مدد لیتے ہوئے آئے ہیں"

"کچھ نہیں" اس نے جواب دیا۔ "نہایت معمولی سا زخم ہے اور اس میں کوئی تکلیف بھی نہیں ہو رہی ہے۔"

"لگا کس طرح" اس نے ایک بار پھر دریافت کیا "کیا تم نے جہاد میں حصہ لیا تھا"

"نہیں" اس نے کوشش کرنے کے باوجود جھوٹ نہیں بول سکا آج سے پہلے اس نے مسلسل کئی سال جھوٹ بولے تھے۔ اور عربوں کے مختلف گروہوں کے سامنے خود کو ہمیشہ ایک مجاہد ہی ثابت کیا تھا لیکن آج اس کی زبان اس کے قابو میں نہیں تھی "اس زخم کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں کہ کس طرح میرے چہرے پر آ گیا البتہ یہ کلائی کا زخم" اس نے کلائی اوپر اٹھاتے ہوئے دکھایا [illegible] وقت [illegible] زخم اسی طرح نور کی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

"مرحبا!" اس نے کہا "یہ زخم تمہارے کس طرح لگا؟"

اور جیسے کوئی اندرونی طاقت خود بخود اس سے کہلوانے لگی:-

"میں تل ابیب سے ہدایات لیکر شیب ابو موسیٰ نامی گاؤں میں گیا تھا" اس نے کہنا شروع ہو گیا "اس گاؤں کے بارے میں اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔ کہ وہاں کچھ عربوں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر چھپا رکھے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ یہودیوں نے اور دوسرے عرب دیہات کی طرح اس گاؤں میں آگ نہیں لگائی تھی ہمارا خیال تھا کہ اس گاؤں کی تمام آبادی کو قتل کرنے یا گاؤں سے نکال دینے

سے پہلے ان اشخاص کو زندہ گرفتار کر لینا بہت ضروری ہو جو مصر یا شرق اردن سے نامہ و پیام کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح عربوں کی اور دوسری خفیہ تنظیموں کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ اس قریہ میں پہنچ کر میں نے خود کو پاکستان سے آیا ہوا ایک مجاہد رضا کار ظاہر کیا اور ان لوگوں کو بتایا کہ کن کن مشکلات سے گزر کر میں نے مصر اور اسرائیلی حکومت کی سرحد پار کی ہے اور کس طرح مصر سے کچھ ضروری پیغام تل ابیب تک لیجانے کے لئے میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ گاؤں کے سادہ لوح باشندوں نے میری بے انتہا خاطر و مدارات کی اور مجھے گاؤں کے سب سے زیادہ بوڑھے شیخ حسین کے گھر ٹھہرا دیا۔ بوڑھا شیخ حسین بہت ہی شفیق اور مہربان عرب تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک پیار بھرا تبسم بکھرا رہتا تھا۔ اس پرمحبت چہرے کو بھولنا میرے بس میں نہیں۔ آہ! کوشش کے باوجود میں ان شفیق نگاہوں اور مسکراتی ہوئی آنکھوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔"

دونوں عرب سر جھکائے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔ داس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پھر بولنا شروع کیا۔

"شیب ابو موسٹی میں گنتی کے چند آدمی باقی رہ گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد پناہ گزینوں کے کسی قافلے کے ساتھ شرق اردن کی طرف بھیجدی گئی تھیں اور کچھ اس قسم کی خبریں بھی موصول ہوئی تھیں کہ یہ قافلہ بیر مسعب کی چوکی پر اسرائیلیوں نے تباہ کر دیا ہے۔ بہرحال گاؤں کی باقی ماندہ آبادی کو اپنے خاندان والوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکتی تھی اور وہ بیحد مضطرب تھے۔ شیخ حسین بھی اپنے بڑے لڑکے مقبل اور اس کی بیوی بانکہ کے لئے کافی بے چین تھا۔ لیکن میں بھی چونکہ بظاہر مصر سے آرہا تھا اس لئے انہوں نے مجھ سے اس قافلہ کے بارے میں چنداں سوالات نہیں کئے۔ شیب ابو موسٹی میں ایک ہی مسجد تھی۔ رات کے وقت عشاء کی نماز کے بعد گاؤں کی بچی کھچی آبادی کا ایک جلسہ اس مسجد میں ہوا۔ شیخ حسین نے اپنے گاؤں والوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں ایک پاکستانی رضاکار ہوں اس لئے حکومت مصر کا ایک اہم پیغام لے کر میرا تل ابیب جانا بہت ہی زیادہ خطرے کا موجب بن سکتا ہے اس نے کہا کہ ہم عرب باشندوں کے لئے ایک انتہائی شرمناک بات ہے کہ ہمارا ایک غیرملکی مجاہد اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر موت کے منہ میں چلا جائے اور ہم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھتے رہیں۔ شیخ حسین کی تقریر سن کر گاؤں کے دو نوجوان میری بجائے میرا پیغام لے کر تل ابیب جانے پر رضامند ہو گئے۔ ان میں ایک شیخ حسین کا اپنا لڑکا ظہیر تھا اور ایک دوسرا ثابت نامی آدمی تھا ــــــــــ میں اپنے ساتھ ایک جعلی دستاویز لے کر آیا تھا جو میں نے ان کے حوالے کر دی اور کہدیا کہ یہ بات مجھے خود نہیں معلوم ہے کہ یہ پیغام تل ابیب میں کس جگہ پہنچانا ہے کیونکہ مصر سے مجھے صرف اتنی ہی ہدایات ملی تھیں کہ تل ابیب کے بیچ والے چوراہے کے قریب گولڈن فیئر نامی ریسٹوران میں مکتوب علیہ خود ہی مجھ سے ملاقات کریگا۔ اس پر ان دونوں جوانوں نے کہا "کہ آپ بالکل فکر ہی نہ کیجئے ہم تل ابیب میں کام کرنے والی خفیہ عرب جماعتوں میں سے ایک بخوبی واقف ہیں اور وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کر کے اسی رات رخصت ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے گھر جا کر لباس وغیرہ تبدیل کرنے میں بہت کم وقت لگایا ہوگا۔

مسجد سے گھر آکر میں نے رات کو کھانا کھایا۔ اور پھر اس کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ جو شیخ حسین نے میرے لئے خالی کر دیا تھا۔ شیخ نے میرے لئے کافی آرام دہ بستر کا انتظام کیا تھا۔ لیکن اس رات مجھے اطمینان کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ رہ رہ کر مجھے ان دو نوجوان لڑکوں کا خیال آرہا تھا۔ جو اپنی جانب سے صرف میری جان بچانے کے لئے خود موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا ان دو دلیر اور معصوم لڑکوں کو جان بوجھ کر مصیبت میں پھنسا دینا میرے لئے مناسب ہے۔ ان دو معصوم نوجوانوں نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہیں اپنے وطن سے محبت تھی۔ اور وہ اس سرزمین کو اجنبیوں کے لئے خالی کر کے بھاگنا نہیں چاہتے تھے جس کے چپے چپے پر ان کے آباؤ اجداد کے قدموں کے ان گنت نشان موجود تھے۔ جہاں سینکڑوں سال سے ان کے آباؤ اجداد دنیا میں آنکھ کھولتے زندگی گذارتے اور دفن ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ ان کا اپنا وطن تھا۔

لیکن جب کافی رات گذر گئی تو میں اپنے بستر سے اٹھا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق رات کے اندھیرے میں پہرے سے بچتا بچاتا میں پیدل چلتا ہوا قریب کے ایک نخلستان پہنچ گیا۔ جہاں پر پروگرام کے مطابق مجھے اسرائیلی فوج کی خفیہ سروس کے ایک سارجنٹ سے ملاقات کرنا تھی اور اسے اطلاع دینا تھی کہ کس شکل و شباہت کے دو آدمیوں کی تل ابیب میں نگرانی کی جائے ظہیر اور

ثابت کا بیچا کہ کے تل ابیب کی حکومت عربوں کی خفیہ تحریک کا کم از کم ایک سرا تو ضرور ہی پکڑ سکتی تھی۔

لیکن جب نخلستان پہنچا تو اسرائیلی فوج کے سارجنٹ کو کوئی ایک بات بھی نہ بتا سکا۔ کیونکہ یہ سارجنٹ ایک چھوٹے سے اور غالباً خشک کھجور کے درخت کے قریب بیجان پڑا تھا اور کسی قسم کی خفیہ یا ظاہرا اطلاع یں قطعاً دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو دیکھا اس کے سینے میں خنجر کا صرف ایک گھاؤ تھا اس کی مٹی میں کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے پہلے ہی کوئی اس کی تلاشی لے چکا ہے۔

میں ابھی اس کی لاش کا معائنہ ہی کر رہا تھا کہ کسی نے زور سے ہتھیار اٹھانے کو کہا۔ اور میں نے فوراً آواز کو پہچان لیا۔ "کون ہے شیخ حسین؟" میں نے پوچھا اور ساتھ ہی شیخ حسین میرے نزدیک آگیا۔ اس نے کہا:

"معزز مہمان! ہمیں رات کے وقت گاؤں کی حفاظت کے لئے طلایہ گردی کرنا پڑتی ہے۔ آج میرے پہرے کا دن تھا۔ میرے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہو رہے تھے جنہیں شاید وہ رات کے اندھیرے میں دیکھ نہیں سکا۔ لیکن اگر میں بولتا تو یقیناً وہ میرے لہجے میں گھبراہٹ کا منظر محسوس کر لیتا۔ میں رات کے اس حصہ میں یہاں نخلستان بلا وجہ آجانے کے بہت سے مختلف وجوہ جواز سوچ چکا تھا لیکن ان میں سے ایک بھی وجہ مناسب نہیں تھی۔ شیخ نے مجھ سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی بھی نہیں اور یہی وہ بات تھی جس نے مجھے اور زیادہ مشکوک کر دیا۔ یقیناً وہ معاملے کے اس پہلو کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔"

گھر کی طرف واپس جاتے وقت راستے میں ہمیں اسی گاؤں کا ایک دوسرا آدمی خلیل طا خلیل نے ہمیں دور ہی سے للکارا۔ اور شاید اپنی بندوق بھی ہماری طرف سیدھی کر لی، لیکن شیخ حسین نے جلد ہی اپنا نام بتا کر اس کی تسلی کر دی۔ اس نے چیخ کر کہا۔" اور یہ میرے ساتھ ہی ہمارا معزز مہمان ہے جو محض جہاد کے جذبہ میں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور یہاں آگیا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ تیز تیز لیکن بڑی مدھم آواز میں گفتگو کرتے ہوئے گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ شیخ کی گفتگو سے اتنا اندازہ تو میں نے لگایا کہ اسے ابھی تک میری جانب سے کوئی شبہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے خیال میں میں بھی اس کی طرح صرف گاؤں کی حفاظت کے خیال سے ویرانوں میں چکر لگاتا پھر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی میری عربی بولنے اور سمجھنے کی مشق اتنی زیادہ تو نہیں تھی کہ میں ان کی گفتگو کا ایک ایک حرف سمجھ لیتا۔ خاص طور سے جب وہ کافی رازدارانہ لہجہ میں ایک دوسرے کے کان کے قریب منہ لاکر کوئی بات کہتے تھے۔ تو میرے دماغ میں خوف کی ایک تیز لہر سی دوڑ جاتی تھی۔

اور آپ غور کریں تو آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ میرا یہ خوف کچھ بے جا نہیں تھا۔ گھر آنے کے بعد شیخ حسین کو اپنا آرام کرنے کے کمرے میں چلا جانا چاہیئے تھا لیکن وہ نہیں گیا اور اسی طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے میرے کمرے میں چلا آیا۔ اور میرے اپنے پلنگ پر بیٹھ جانے کے بعد خود بھی پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

"معزز مہمان!" اس نے بغیر کوئی تمہید باندھے ایک لمبی تقریر کے آغاز جیسے انداز سے کہا۔" تم اس وقت تک بڑے حیران ہوتے رہے ہو گے نہیں ہوتے رہے ہو؟"

میں اس کے پلنگ سے اٹھنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ تاکہ ٹانگے پھیلا کر راستے کی تھکن کو دور کر سکوں لیکن اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

حیران ——— ؟ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ" اس نے کہا۔" اس لئے کہ ابھی ابھی میں نے عربی لباس میں ایک یہودی اس تنگ نخلستان میں دیکھا اور بغیر کسی لمبی تفتیش میں لگنے کے فوراً ہلاک کر دیا لیکن تم ایک اجنبی کی حیثیت سے یہاں آئے اور ہم نے نہ صرف تمہیں مہمان بنا کر رکھا بلکہ صرف تمہارے کہنے پر اپنے گاؤں کے دو نوجوان تل ابیب بھیج دیئے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا گلا پکڑ لیا ہے بڑی مشکل سے میں نے کہا۔" تو کیا . . . . کیا آپ مجھے "

معزز مہمان! شیخ حسین میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا۔" ہو سکتا ہے کہ آپ یہودیوں کے بھیجے ہوئے یہاں آئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آپ کا جذبہ جہاد ہو جو آپ کو ایک رضا کار کی حیثیت سے یہاں تک لے آیا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کس حیثیت اور کن ارادوں کے ساتھ اس گاؤں میں آئے ہیں۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ اپنی تمام چرب زبانی کے باوجود میں اس وقت گونگا بن کر رہ گیا تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر شیخ نے پھر اپنی

تقریر شروع کر دی۔

"اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہماری حماقت نہیں تھی جو مکمل تحقیق و تفتیش کئے بغیر آپکو اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ لیکن معزز مہمان ہمیں اپنے مہمانوں کی شک کی عادت نہیں ہے۔ ہم نے اپنے گاؤں کے دو نوجوں کو ایک نیک مقصد کے لئے موت کی طرف دھکیلا ہے۔ اگر آپ واقعی مصر سے کوئی پیغام لے کر آئے ہیں تو مرحبا ——— آپ کا یہ پیغام انشاء اللہ اس وقت تک تل ابیب پہنچ گیا ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی نیت نیک نہیں تھی اور آپ یہودیوں کے بھیجے ہوئے یہاں آئے تھے ——— تب بھی آپ ہمارے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس کوئی وائرلیس نہیں ہے جس کے ذریعہ آپ تل ابیب والوں کو ظہیر اور ثابت کے بارے میں کوئی اطلاع دے سکیں۔ اور معزز مہمان! اس وقت میں صرف ایک اخلاقی گناہ کا اعتراف کرنے کے لئے یہاں آپکے کمرہ میں آگیا ہوں۔ خلیل آج رات بھر آپکے کمرہ کا پہرہ دیتا رہا ہے۔ وہ آپ کا تعاقب کرتا ہوا ہی اس نخلستان تک پہنچا تھا ——— میں نے اس یہودی جاسوس کو ہلاک کرنے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ کاش میں نے اسے ہلاک کرنے سے پہلے کچھ دیر انتظار کیا ہوتا۔ اس کے بعد آپ کی جانب سے ہم لوگوں کے تمام شکوک رفع ہو جاتے۔ اگر آپ اس سے ملاقات کر لیتے تو یقیناً آپ یہودیوں کی صف میں شمار کر لئے جاتے ورنہ پھر کم از کم ہم اس شبہ کے گناہ سے حاصل کر لیتے۔ بہرحال چونکہ آپ نے اس یہودی جاسوس سے ملاقات ہی نہیں کی ہے اس لئے اتنا تو اطمینان ہمیں ہے کہ ظہیر اور ثابت کو کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔ یقیناً اسرائیلی حکومت تل ابیب کی گلیوں میں اس وقت دو خاص شکل و صورت کے نوجوان کو تلاش نہیں کر رہی ہوگی۔ اور معزز مہمان بہرحال . . . .

"آپ مجھے میرے نام سے پکاریے" بڑی مشکل سے میں نے خود کو بولنے کے قابل بنایا۔ "میرا نام ہاشمی ہے"

"ہاشمی صاحب" اس نے کہا "بہرحال مجھے امید ہے کہ آپ ہماری ان بداخلاقیوں کا چنداں خیال نہیں کر رہے ہوں گے۔ آپکو ہماری مجبوریوں کا اچھی طرح علم ہے۔ اس سرزمین میں ہمارا ایک ایک سانس اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک جہاد ہے اور میدان جہاد کی بہت سی نفسانی لغزشوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔"

شیخ حسین کی گفتگو میں اس قدر خلوص اور اس قدر صداقت تھی کہ دل ہی دل میں میں اس کا قائل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے لہجہ میں ہیرو بننے جیسا زور اور الفاظ کا ڈرامائی پن نہیں تھا بلکہ سارے الفاظ میں ایک پر محبت خلوص تھا۔ جو سننے والے کے سینہ میں ایک ہلکا سا تموج پیدا کر دیتا تھا۔ تقریباً ساری باقیماندہ رات اس نے مجھ سے باتیں کرتے گزار دی اور جب صبح ہوئی تو میں اپنے سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں ایک عظیم انقلاب محسوس کر رہا تھا۔ شیخ حسین نے مجھے قرآن شریف کی ایک آیت سنائی جس کی رو سے بنو اسرائیل خدا کی ایک ایسی دھتکاری ہوئی قوم قرار دیئے گئے تھے جس کے لئے دنیا میں اللہ نے کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی تھی جسے وہ اپنا وطن کہہ کر پکار سکیں۔ اور مجھے بتایا کہ بنو اسرائیل سے صرف یہودی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ ہر قوم بنو اسرائیل ہے جو جھوٹ بولتی ہے اللہ کے بھیجے ہوئے ہادیوں کو جھٹلاتی ہو انہیں سولی پر چڑھا دیتی ہو۔ بادشاہوں اور رئیسوں کے پیچھے چلتی ہو۔ تنظیم اور حسن انتظام کی صلاحیتوں سے عاری ہو۔ اچھی باتوں سے بھاگتی ہو اور ہر اس چیز کو اپنا شعار بنا لیتی ہو جسے دنیا کا ہر ذی ہوش آدمی برائی کہہ کر پکارتا ہو۔ شیخ حسین نے کہا کہ قرآن شریف میں بنو اسرائیل کا لفظ ہر جگہ ایک ایسی ہی قوم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور اب اگر یہ خرابیاں خود مکہ اور مدینہ کے مسلمانوں میں پیدا ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے بنی اسرائیل کے معنی اور ان کی سزا نہیں بدلے گا۔ شیخ حسین نے بتایا کہ ان کے خیال سے یہودی آج بھی اتنے گناہ گار ہیں جتنے پہلے تھے لیکن انہوں نے کم از کم ایک خوبی جو اللہ کے نزدیک بھی بہت مستحسن ہے اور جسے اللہ تعالیٰ مومن کی پہچان بتاتا ہے۔ یعنی تنظیم اپنالی ہے اور ان کی موجودہ کامیابیوں کا راز اسی تنظیم میں ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ وہ ابھی تک اس سرزمین میں صرف اس لئے ٹھہرا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی اب مسلمانوں کو بنو اسرائیل کی صف میں گننا شروع کر دیا ہو تو پھر دنیا میں کسی بھی حصے میں مسلمان آزادی کی سانس نہیں لے سکتے اور اگر یہ یہودی آج بھی یہودی ہیں تو انشاء اللہ ان کا یہ اقتدار عارضی ثابت ہوگا اور لاکھوں شہیدوں کا خون ایک نہ ایک دن رنگ لائیگا۔ اور یہ اسے پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کا خون رنگ لائے گا کیونکہ یہودی ظالم ہیں اور بے گناہ مسلمانوں کے خون سے

ہولی کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے ایک بے بس بسائی قوم کے گھروں میں آگ لگانا شروع کردی ہے اور انہیں ان کے آباؤ اجداد کی زمینوں سے باہر دھکیل دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ظالم کی رسی زیادہ عرصہ دراز نہیں کرتے۔"

شیخ کی اس گفتگو نے میرے اوپر ایک خاص اثر کیا۔ جیسا کہ میں نے جرمنی اور پھر تل ابیب کے اخباروں کے ذریعہ معلوم کیا تھا میرے اپنے وطن میں بھی ایک قوم کو اس کے آباؤ اجداد کی زمینوں سے بے گھر کیا جا رہا تھا ان کے گھروں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ میں خود وطن کی سب سے زیادہ سازشی تحریک کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا۔

اور میرے دل میں آیا کہ میں اس نیک طینت شیخ کو بتا ساری کچی حقیقت بتا دوں۔ اس سے چیخ چیخ کر کہوں کہ اے شیخ۔ میں خود بھی ایک ایسی ہی تحریک کا نمائندہ ہوں جس کا مقصد اول اور آخر ظلم اور محض ظلم ہے اپنی ساری زندگی میں اپنے معصوم پڑوسیوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے منصوبے بناتا رہا ہوں۔ تیرے وطن آکر بھی میں نے کچھ کم مظالم نہیں کئے ہیں۔ شیب ابو موسیٰ جیسے کتنے ہی گاؤں میں نے اپنے ہاتھ سے جلائے ہیں اور اے سادہ لوح بزرگ اگر تجھے یہ خیال ہے کہ تیرے گاؤں کے وہ دونوں دلیر لڑکے موت کے منہ سے بچ گئے ہیں تو آہ، تیرا یہ خیال غلط ہے تل ابیب کے جس ہوٹل کا میں نے ان دو لڑکوں کو پتہ بتایا تھا وہ حکومت کا ہوٹل ہے۔ وہ لڑکے یہودیوں کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور اگر ایک یہودی جاسوس کو قتل کرکے تو اس گاؤں سے محفوظ سمجھتا ہے تو افسوس تیرا خیال بھی غلط ہے اس یہودی جاسوس کے صحیح وقت پر واپس نہ پہنچنے پر اسرائیلی حکومت میں جو زلزلہ آئے گا اس کی روک تھام تیرے امکان سے باہر ہے۔ اے کاش! اے معصوم فرشتے! تو یہاں سے فرار ہو جاتے اے کاش!

اے کاش میں یہ سب کچھ اس سے کہہ سکتا۔ ـــــــ لیکن گاؤں کی واحد مسجد سے سحر کی اذان کی صدا بلند ہوئی اور ابھی موذن نے صرف پہلی بار اللہ اکبر کہا تھا کہ ایک بھیانک آواز کے ساتھ کسی توپ کا گولہ پھٹا۔

"ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاشمی!" شیخ نے کہا: "یقیناً یہ حملہ ان کی باقاعدہ فوج نے کیا ہے۔ یہ توپ ان کے طوائی رضاکاروں کی نہیں ہے۔ ـــــــ ہمارے پاس صرف تین بندوقیں اور ایک اس یہودی سارجنٹ سے چھینا ہوا پستول ہے اس گاؤں کے تین بار تلاشی لی جا چکی ہے۔"

شیخ کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان جھلک رہا تھا کہ میں اس کی طرف زیادہ عرصہ دیکھ بھی نہیں سکا۔

"لیکن" میں نے کہا

"آؤ، نماز کے لئے چلو۔ اذان ہو رہی ہے۔"

ہم شیخ کے مکان سے نکل کر ابھی چند قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ توپ کا ایک گولہ اس مکان کی پچھلی منزل کی طرف آکر گرا اور ہم مسجد میں داخل ہوتے وقت تک مکان کے ملبے کے گرنے کی آواز سنتا رہا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ایک ایسا رعب و جلال اس کی فضا پر طاری تھا کہ بار بار میرا دل چاہنے لگا کہ کاش میں بھی ان نمازیوں کی طرح اس وقت سچے دل سے اپنے معبود کے سامنے جھک رہا ہوتا۔ نماز ختم ہونے کے بعد شیخ نے اور دوسرے تمام لوگوں نے ساتھ مل کر خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر آخری وقت تک اسلام پر قائم رہنے کی دعا مانگی اور پھر یہ لوگ اپنی اپنی تلواریں، بندوقیں اور پستول لے کر باہر نکل پڑے۔ میں نے شیخ کو کھلے میدان میں نکل کر لڑنے سے منع کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں نے اپنا راستہ دیکھ لیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آج میرا معبود مجھ پر بے انتہا مہربان ہے۔

میں نے گاؤں کے تمام مسلمانوں کو ایک ایک کرکے یہودیوں کی گولیوں سے ہلاک ہوتے دیکھا۔ میں نے شیخ حسین الخلیل کو یہودیوں کی توپ کے نزدیک پہنچتے اور زخم کھا کر گرتے دیکھا اور پھر میں نے یہودیوں کو اس گاؤں کے بچے کھچے مکانوں میں آگ لگاتے دیکھا اور پھر میں نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے ایک یہودی لفٹیننٹ کو کھڑے دیکھا۔

"ارے۔ آپ ابھی تک زندہ ہیں" اس نے کہا "ہم نے آپ کا اور سارجنٹ یعقوب کا انتقام لینے ہی کے لئے تو اس گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ وہ آپ کے بھیجے ہوئے دونوں کتے تو بالکل بیکار ثابت ہوئے۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس سفاک یہودی کا پستول چھین کر اس کے حلق میں ایک ساتھ کئی گولیاں اتار دوں لیکن میں نے جبراً اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ پیدا کرکے اس سے پوچھا۔

"تو کیا آپ نے ان دو عرب نوجوانوں کو گرفتار کر لیا"

"گرفتار کرلیا!" اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا" واہ واہ۔ ہم نے انہیں ختم بھی کر ڈالا!"

"ختم کر ڈالا!"

"اور کیا۔ وہ کچھ بتاتے ہی نہیں تھے۔ تم نے انہیں گولڈن فیسٹ ہوٹل میں جانے کی ہدایت دی ہوگی ہونا ــــــ؟ مگر وہ بدمعاش وہاں نہیں گئے اور اس لئے تو ہمیں شک ہوا کہ ان لوگوں نے شاید تمہارے اوپر یقین نہیں کیا ہے اور . . . . اور شاید تمہیں مار ڈالا ہے۔ وہ دونوں ایک ایسی گلی کے چکر لگا رہے تھے۔ جہاں اب سے کچھ عرصہ پہلے عرب رہا کرتے تھے یا آخر ہم نے انہیں گرفتار کرلیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے رائفل کا کندا مار مار کر ان دونوں کی کھوپڑیاں توڑ دیں۔ لیکن انہوں نے کوئی ایک بات بھی اپنے منہ سے نہیں نکالی۔ حد ہوگئی۔ ہا۔ ہا۔ انھوں نے یہ تک نہیں بتایا کہ تم ان کے گاؤں میں آکر ٹھہرے ہو۔ بس دونوں ایک ہی بات دہراتے چلے جاتے تھے: اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله۔

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله۔ میں نے پہلی بار صمیم قلب کے ساتھ اپنے دل ہی دل میں دہرایا۔ اور اس سے پوچھا۔ یہاں ایک بوڑھا شیخ حسین رہتا تھا اس کا ایک بیٹا مقبل ایک قافلہ کے ساتھ شرق اردن کی طرف گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ کہیں راستہ میں گرفتار ہوجاتا تو اس کے ذریعہ بہت سی باتیں معلوم ہوجائیں۔

"مقبل" اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا" اسے گرفتار کرکے ہی تو ہمیں اس گاؤں کے بارے میں شک ہوا تھا۔ شرق اردن کی طرف جو ہماری آخری چوکی ہے اس کے پہریداروں نے اس سے پوچھا۔ تم اپنا وطن کیوں چھوڑ بھاگ رہے ہو؟ جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا؟ کہنے لگا جہاد کرنے کے لئے ہمارا پہریدار بھی مسخرا تھا۔ کہنے لگا۔ ہم کافر تو اس سرزمین میں رہے جاتے ہیں، وہاں جہاد کس سے کروگے۔ تو پتہ ہے کیا کہا۔ کہنے لگا کہ یہاں تمہاری حکومت ہے اور یہاں تمہارے خلاف لڑائی لڑنا بغاوت ہے جہاد نہیں ہے۔ ہم یہاں سے نکل کر کسی دارالاسلام پہنچیں گے اور پھر اس طرف حملہ کریں گے ہماری چوکی والوں نے قاعدے کے مطابق اس پورے قافلہ کو قتل کردیا ہے۔ مقبل اور اس کی بیوی اور دو چار دوسرے مشتبہ آدمیوں کو گرفتار کر رکھا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کے متعلق تل ابیب کو ایک کھلی رپورٹ بھیجی ہے۔"

اس انکشاف کے ساتھ ہی میں تل ابیب واپس گیا اور وہاں کے حکام پر میں نے زور دیا کہ عرب اور کی رہی سہی سازشی قوتیں ختم کرنے میں نے میرا مقبل سے ایک بار ملاقات کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تل ابیب سے اجازت نامہ لے کر میں سیدھا اس سرحدی چوکی پر پہنچا۔ مقبل اور اس کے ساتھیوں کو جن میں چند عورتیں بھی شامل تھیں ایک ہی تنگ سی کوٹھڑی میں قید کر کے رکھا گیا تھا جاتے ہی میں وہاں کی چوکی کے افسر اعلیٰ سے ملا جس نے میرا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ اسی دن دو سپاہیوں کے ساتھ قیدیوں کے خیمہ میں پہنچا یا گیا۔ اس خیمہ کے باہر چاروں طرف پہرا لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ قیدیوں کے ہاتھ پیر رسیوں میں بندھے ہوئے نہ تھے۔

مقبل اپنی بیوی کے قریب ہی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے سر کی جنبش سے اپنے ساتھی سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ اب وہ باہر چلے جائیں۔ کیونکہ میں ان قیدیوں سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ایک سپاہی تو چلا گیا۔ دوسرا بھی باہر جا رہا تھا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا واپس مڑا اور مقبل کے قریب پہنچ کر ایک زبردست ٹھوکر اس نے مقبل کے سر میں ماری۔

"عرب کتے" اس نے کہا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اس کی یہ مسکراہٹ میرے لئے اور بھی زیادہ ناقابل برداشت تھی لیکن میں نے غصہ پر قابو پاتے ہوئے اسے نرمی سے بتایا کہ وہ اس وقت باہر چلا جائے کیوں کہ مجھے ان قیدیوں سے اس وقت انتہائی ضروری گفتگو کرنی ہے۔

اس یہودی کے جانے کے بعد میں نے مقبل سے بہت مختصر گفتگو کی لیکن اسے اچھی طرح بتادیا کہ میں اس کا دوست ہوں اور اس کی رہائی کے لئے حتی الامکان کوشش کررہا ہوں۔

باہر نکل کر چوکی کے افسر اعلیٰ کو میں نے اطمینان دلایا کہ یہ عرب جاسوس کوئی بہت زیادہ سمجھدار جاسوس نہیں ہے اور یقیناً میں دو ایک روز میں اس سے سارا راز قبول والوں گا۔

لیکن دوسرے ہی دن اچانک شرق اردن کی طرف سے کچھ مسلح

اٹھنے کی کوشش کی لیکن اچانک ایک دوسرا یہودی خیمہ کے اندر داخل ہوا اس نے چیخ کر کہا! "حملہ آور آگئے بھاگئے" اور ساتھ ہی افسر کے اشارے پر سنگینیں اٹھا کر میری طرف دوڑا۔ ہاں مجھے یاد آگیا ہے۔ میرے چہرے کا یہ زخم ......"

"داس" اس عرب نے کہا۔ "ہم اس زخم کا راز جانتے ہیں۔ اس کے تقدس سے بھی واقف ہیں۔ ہم صرف تمہارے منہ سے کچھ سننا چاہتے تھے لیکن کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ؟"

داس نے غور سے اس عرب کی طرف دیکھا اور اچانک چیخ کر بولا "کون شیخ حسین !"

(بشکریہ "چراغ راہ")

راغب مرادآبادی

○

من و تو کے ہیں جھگڑے جب تک امیدوں نے گھیرا ہے
اُمیدیں گر نہ ہوں دل میں تو میرا ہے نہ تیرا ہے
کہاں سے آگئیں اس خاکداں میں رونقیں اتنی
یہ کس نے لالہ و گل ماہ و انجم کو بکھیرا ہے
اجل اک رات ہے ڈھلتی ہوئی راہِ محبّت میں
گزر جا اس سے ہنستے کھیلتے آگے سویرا ہے
کہاں کی موت، کیسی زندگی، غم کیا ہے، عشرت کیا
ان اوہامِ غلط نے فکرِ انسانی کو گھیرا ہے
کہاں سے جذبۂ شوق آ گئی اتنی کشش تجھ میں
نہ سمجھا آج تک جس نے مجھے اپنا، وہ میرا ہے
ہر اک ذرّے میں دیکھے ماہ و انجم بھی تو کیا راغبؔ!
وہی خامی بصیرت میں وہی دل میں اندھیرا ہے

افتخار اعظمی

○

بہت بلند ہے شاید مرا مذاقِ جنوں
بُتِ فرنگ کا ہرگز چلا نہ مجھ پہ فسوں
جو راز ہائے محبت ہیں میرے سینے میں
غمِ حیات سے فرصت ذرا ملے تو کہوں
تری تلاش میں جانے کہاں کہاں میں پھرا
تری تلاش میں لیکن کہیں ملا نہ سکوں
حریمِ حسن میں پاکیزگی ہی شرطِ نظر
ادب شناسِ محبت ملے تو اس سے کہوں
بھٹک رہا تھا جہاں کاروانِ عقل و خرد
چراغِ راہ بنا ہے وہیں پہ میرا جنوں
بہار و برق نے مل کر چمن کو پھونک دیا
مرے ندیم! بتا اب کہاں میں جا کے رہوں
شبِ حیات کو بخشوں گا میں فروغِ سحر
کہ میرے دل میں ہے روشن چراغِ سوز دروں
"بتانِ ہند" کو پوجوں تو کوئی کچھ نہ کہے
بڑا ستم ہے، اگر بندۂ خدا میں بنوں
(نئی نسلیں)

سید فضا جالندھری

موسم گل میں یہ کہہ دے کوئی دیوانوں سے
چاک دامن کے ملیں بڑھ کے گریبانوں سے

شکوہ سنج آج ہیں ساحل نگہبانوں سے
وہ سفینے بھی جو ٹکراتے تھے طوفانوں سے

اب دلوں کو ہے نئی کاوشِ پنہاں کی تلاش
جی بہلتا ہی نہیں عشق کے افسانوں سے

نگہ ساقیِ مے خانہ کا اف رے اعجاز
شیشے جھک جھک کے گلے ملتے ہیں پیمانوں سے

نہ محبت نہ عنایت نہ ارادت نہ سکوں
دہر آباد ہے اس رنگ انسانوں سے

دمبدم شمع کی موہوم تجلی کے لئے
رات پروانے الجھتے رہے پروانوں سے

تشنہ کامی ہو جہاں موسم گل میں بھی وہی
فائدہ کیا ہے اس انداز کے میخانوں سے

زندہ رہنے کا سلیقہ ہمیں آیا نہ فضا
زندگی ناپتے ہیں وقت کے پیمانوں سے

رعنا ظفر

نہ اب حرم ہے نگاہوں میں اور نہ بتخانے
یہ کونسا ہے مقام جنوں خدا جانے

جنونِ شوق ہے مستغنیٔ رسوم و قیود
اسیرِ کش مکش این و آں ہیں فرزانے

چمن پہ غور کیا جس نگاہ سے برسوں
اسی نگاہ سے دیکھے ہیں میں نے ویرانے

ہوئی جو صبح تو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں
غرض کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے پروانے

خرد کی مصلحت اندیشیاں ارے توبہ
چلی ہے دل کو محبت کے راز سمجھانے

فروغ صبح کو دیکھا ہے جلوہ گر تجھ کو
کیا ہے ذکر ستاروں سے تیرا رعنا نے

عبداللہ المحمود

روس میں اسلام

واقعات و حقائق کی روشنی میں

روزہ کے متعلق ایک روسی شاعر کی نظم ملاحظہ فرمائیے:-

"آج ہماری تعطیل ہے۔
ہم اسے روزہ کے نام سے پکارتے ہیں۔
اور ماضی بعید میں یہ کیسی عجیب تعطیل تھی۔
گھربار تج کے کھیتوں سے دور
تمام دن مسجدوں میں گھٹنے جھکائے کھڑے رہتے تھے
اب کس کے پاس روزے کی بابت سوچنے کا وقت ہے؟"

دیکھا آپ نے؟ یہ ہے ترقی پسندی، جس کا حصول اشتراکیت کی بدولت ہوا ابھی کیا ہوا ہے۔ آگے اور دیکھئے ان سب احکامات خداوندی کے بعد خود خدا اور رسول کا نمبر آتا ہے۔ اگرچہ ان خرافات کو نقل کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی لیکن "نقل کفر کفر نباشد" کے بموجب، اور اس لئے بھی کہ شاید مضمون نامکمل رہ جائے، دو تین مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

منور شور کے ایک مشہور شاعر اپنی نظم "خطاب بہ رسول" میں کہتا کر

تم کہتے تھے تاج نہیں گریں گے
وہ گر گئے
تم کہتے تھے تخت نہیں ہلیں گے
وہ ہل گئے
تم کہتے تھے قرآن کے الفاظ ابدی ہیں
ہماری عورتیں بے پردہ نہیں ہونگی
وہ بے پردہ ہو گئیں
تم کہتے تھے مسجدیں کبھی خالی نہیں ہونگی
اسلام ہمیشہ حکمراں رہے گا۔

"بمشکل"۔

ایک شاعر منظوم مکالمے میں ایک فرد کی زبان سے کہلواتا ہے:-

"یہاں کسی ملا، امیر یا نواب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔
ہمیں کوئی خدا داد نہیں چاہیئے، اور نہ اس کے کسی گماشتہ کی زمین کے کسی حصہ میں ضرورت ہے"۔

ایک مسلمان ادیب صدرالدین یمنی اپنے بھائی کی وفات پر ایک نظم لکھتا ہے جس کے آخر میں وہ چلاتا ہے۔

"اے آسمانوں کے مالک، تم ہی، ہاں، صرف تم ہی، اس جرم کے مرتکب ہو"! (نعوذ باللہ من ذالک الخرافات) اور جب آسمانوں سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ پکار اٹھتا ہے: "ہاں یہ خالی خولی آسمان گونگا ہے"۔

انقلاب کے اولین سالوں میں وہ خدا کو پکارتا ہے:-

"اے خدا! محلوں کی چھتیں توڑ ڈال۔
بدمعاش نوابوں کے تاج زمین پر اتار پھینک!
اے خدا ہمیں ہولناک قید سے نجات دلا،
اور رعشہ براندام نوابوں کو اپنے غلاموں کے سامنے سرنگوں کر دے"

دو سال بعد جب اس کی دعا مستجاب ہوئی زبردست زبردست ہو گئے اور محلوں کی چھتیں واقعی چرچراتی ہوئی نیچے آ رہیں، تو وہ کہنے لگا:-

"یہ اللہ کا کام نہیں، اللہ کو اس کاروبار سے کیا سروکار"!

اپنی تازہ تحریروں میں یہی لکھتا ہے: "معجزہ اللہ اور اس کے رسول کا نہیں، بلکہ مزدوروں کے زور بازو کا نتیجہ ہے"۔

سب سے آخر میں اپنی عینی شہادت دینا نامناسب نہیں سمجھتا جب میں مسجد عبداللہ (اللہ آباد) میں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھا۔ تو ایک ناٹک

مسلمان سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سب واقعات جو اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس نے آپ بیتی کے طور پر سنائے تھے۔ ہزارہا دقتوں سے وہ اور اس کے خاندان کے تقریباً چالیس افراد کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر کے کشمیر تک آنے میں کامیاب ہو سکے، لیکن جب وہاں بھی پاک و ہند کے مناقشے میں تاخت ہوئی تو وہ بیچارا کلکتہ کی طرف چل نکلا۔ میرا خیال ہے اسے ہجرت کا ضرور ثواب ملے گا۔

شاید یہ تاریخ چند سال پہلے کی ہو۔ روسی دنیا کا تازہ ترین شاہکار کمیونسٹ ریڈیو کا اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ ملاحظہ ہو۔ میں پوری خبر ہی ذیل میں درج کئے دیتا ہوں :۔

"لاہور ـــــــ . نگ آباد کے کمیونسٹ ریڈیو نے اسلام کو رجعت پسند اور ساتویں صدی کے عرب جاگیرداروں کا آلہ کار قرار دیا ہے۔ ریڈیو کی بات چیت کا عنوان "اسلام اور اس کا رجعت پسندانہ کردار" تھا، اور وہ غیر ملکی سامعین کے لئے نہیں تھا۔ اس بات چیت میں مخالف مذہب مہم کا کھلم کھلا . . . اعلان کیا گیا، اور کہا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہے، لیکن وہ ہر فرقہ پرست کی مخالف ہے ہماری پارٹی ہر قسم کے نظریے کے خلاف ناقابل مفاہمت مہم چلا رہی ہے۔ آئین کی دفعہ ۱۲۴ میں نہ صرف مذہبی عقائد میں کلی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے بلکہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی بھی پوری آزادی عطا کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے خلاف مہم چلائی جا سکتی ہے۔ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ماضی کی ایک فرسودہ یادگار مذہبی عبادت ہے، تشریح کی گئی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اپنے تمام ذرائع و وسائل سے کام لے کر مذہب کے خلاف بے رحمانہ جنگ کرتی رہی ہے اور اس کی یہ جنگ اب بھی جاری ہے۔ وسطی ایشیا میں اسلام کو تلوار اور آگ کے ذریعہ پھیلایا گیا اور تب ہی عوام کے دشمن اس مذہب کو اپنی آزادی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اسلام عورتوں پر اقتصادی اور سیاسی ظلم کو روا رکھنے کو بھی درست سمجھتا ہے، جس کا نشانہ عورتیں صدیوں سے بنی ہوئی ہیں۔ مزید کہا گیا کہ عربی رسم الخط کی وجہ سے ترکمان سوویٹ عوام کے بالعموم اور خاص کر روسی عوام کی جمہوری ثقافت کی ترقی میں ناکامی ہوئی۔ اسلامی عقائد و اعمال کے بارے میں کہا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی لوگوں کے ذہن کو اس زہر سے محفوظ رکھنے کا عزم کر چکی ہے۔ جو لوگ ملاؤں کے کہنے پر مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں۔ مزدوروں کو دفن کرتے ہیں، مذہبی رسومات کو ادا کرتے ہیں۔ مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں، وہ رجعت پسند ہیں۔ اسلامی رسومات ادا کرنے والے لوگ پسماندہ ہیں۔ نشریہ میں کارکنوں پر زور دیا گیا کہ وہ ملک میں اسلام کے خلاف مہم تیز کر دیں! لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ سوویت حکومت ترکمانی مزدوروں کی بھاری اکثریت کو مذہبی غلامی سے آزاد کر چکی ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ عیدیں اور مذہبی تہوار اب نہیں منائے جاتے"

(بشکریہ "مقاصد")

بندو گھوش
مترجمہ: محمد ادریس الحق

اور ــــــ وہ مرگئی

صبح کے وقت ٹرام پر میں اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ عام طور سے صبح اور شام ٹرام میں کافی بھیڑ رہتی ہے، سکنڈ کلاس میں ٹکٹ کاٹ رہا تھا۔ ایک چھوٹا لڑکا جس کی عمر تقریباً چھ سال ہوگی میری نظروں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ سکنڈ کلاس میں زیادہ تر چور، پاکٹ مار اور اسی قسم کے دوسرے لوگ سفر کرتے ہیں۔ سکنڈ کلاس کی نوکری میں روزآنہ نہ جانے کتنے لوگوں سے گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ اور کبھی کبھی تو مار پیٹ تک نوبت آجاتی ہے۔ آج کل کا وقت ایسا ہے کہ دل میں درد رکھنے کے باوجود کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرسکتا، کیونکہ اگر کسی کے ساتھ ہمدردی کروں تو نوکری جاتی ہے۔ میں نے لڑکے کو پکڑ کے دریافت کیا۔

"تمہارا ٹکٹ کہاں ہے؟"

وہ مسکرانے لگا۔ میں نے پھر کہا۔

"ہنستے کیوں ہو؟ ٹکٹ لاؤ"

"نہیں ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ہے؟" میں نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ جنگ کے بعد سے نہ جانے کہاں سے ایسے لڑکوں کی تعداد بڑھ گئی ہے کہ روزآنہ پریشان کرتے ہیں۔

میں نے غصہ میں اس کا کان پکڑ کر کہا:

"پیسے نہیں ہیں تو ٹرام پر کیوں چڑھا؟"

لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اتر جاتا ہوں"

"میں تجھے اترنے سے پہلے ہی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"

میرے اس جملے پر ٹرام کے دوسرے مسافروں نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"کل یہ لڑکے بڑے ہو کر پاکٹ مار بنیں گے"

ایک مسافر نے لڑکے سے پوچھا۔

"تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟"

"ماں باپ" کا نام سن کر لڑکا غصہ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

جگو بازار کے قریب ٹرام رکی۔ میں نے اسے دھکا دے کر نیچے اتار دیا۔ وہ کچھ دور جا کر مجھے گالیاں دینے لگا۔ ٹرام چل پڑی۔ لڑکا ٹرام کے ساتھ کچھ دور تک دوڑتے ہوئے مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں نے اس لڑکے کو پہچان لیا۔ ٹرام کے کچھ مسافروں نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکا بچھو معلوم ہوتا ہے"

ایک نے کہا۔

"ہوگا نہیں ایسے لڑکوں کا ماں باپ کا ٹھیک نہیں ہے"

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں اس کی ماں اور باپ دونوں کو جانتا ہوں"

جب سے مجھے کنڈکٹری کی نوکری ملی ہے اس وقت سے میں اسکی ماں اور باپ کو جانتا ہوں۔ ۴۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی دفتر میں بابو بننے کی کوشش کی۔ مگر قسمت نے کنڈکٹر بنا دیا۔ اسی زمانے میں انقلابی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ہر طرف سے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ ۴۲ء کے بعد ۴۳ء کا آغاز ہوا۔ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اسی زمانہ میں قحط نے بھی اپنا بھیانک چہرہ دکھایا۔ ہزاروں لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ میں کافی محنتوں سے کام کر رہا تھا۔ ایک دن بارش بہت زوروں پر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے ٹرام میں بھیڑ نہیں تھی۔ مجھے کچھ فرصت ملی۔ میں ٹرام کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پرنو تھیٹر کے پاس ٹرام رکی۔ وہاں سے ایک تیرا چودہ سال کی لڑکی ٹرام پر سوار ہوئی۔ بارش اور ہواؤں سے بھونے لگی۔ ٹرام کی تمام کھڑکیاں بند ہو گئیں

ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکی کی طرف ٹکٹ کاٹنے بڑھا۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں اسے پہچانتا ہوں۔ خیال آیا کہ یہ لڑکی او ہر کئی دنوں سے روزانہ شام کے وقت ٹرام پر جاتی ہے۔ لڑکی کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ مگر اس کے چہرے پر رونق نہیں۔ دبلا پتلا جسم۔ معمولی سی رنگین ساڑی۔ چہرے پر معمولی دام کے پوڈر لگے ہوئے تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر کوئی کشش نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس کے بیٹھنے کا طریقہ کچھ ایسا تھا کہ ٹرام کے تمام مسافر اس کی طرف بار بار دیکھ رہے تھے۔ جب ٹرام عجائب گھر کے پاس پہنچی تو لڑکی اوسراؤ سر دیکھ کر اتر گئی۔ سکنڈ کلاس کے بوڑھے مگر تجربے کار انسپکٹر صاحب نے کہا:

"دیکھو وہ اتر گئی"

"کون انسپکٹر صاحب؟" میں نے پوچھا۔

انسپکٹر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم۔ تمہارے ملک کی یہ لڑکیاں روزانہ اس طرح تمام رات شہر میں گھوم گھوم کر عزت بیچتی ہیں مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آخر میں سڑک کے کنارے جان دیتی ہے اور تم جتنے ملک کے نوجوان تمام رات چادر تان کر اپنے گھروں میں سوتے رہتے ہو" ابھی انسپکٹر نے اتنا کہنے پایا تھا کہ گاڑی دھرم تلہ پہنچ گئی۔ انسپکٹر ٹرام سے اتر گیا۔ گاڑی پھر چل پڑی مگر اس کی ایک ایک بات ہمارے دماغ میں چکر کاٹ رہی تھی۔ مجھے اس کی باتوں سے لڑکی پر بہت غصہ آرہا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکی روزانہ شام کو یہاں سے ٹرام پر چڑھ تی۔ عجائب گھر کے پاس اتر جاتی، رات کے گیارہ بجے واپس ہوتی اسی طرح کچھ دن گذر گئے۔

ایک دن شام کو میری ڈیوٹی نہیں تھی۔ میں شام بازار سے رات کے دس بجے واپس آرہا تھا۔ دھرم تلہ آکر تا لیگنج کے ٹرام کا انتظار کرنے لگا یکایک لڑکی پر نظر پڑی۔ ایک کونے میں کھڑی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ خیال ہوا کہ دیکھوں یہ کہاں جاتی ہے۔ کچھ لوگ ٹرام کا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکی سے کچھ فاصلے پر ایک ہندوستانی نوجوان منہ میں سگریٹ لگائے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ دو چار ہی منٹ بعد وہ نوجوان "کرزن گارڈن" کی طرف بڑھنے لگا۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی، اتنے میں ایک ٹرام آئی بہت سے لوگ ٹرام پر سوار ہو کر چلے گئے۔ میں بھی لڑکی کے پیچھے چلا لڑکی گارڈن کے اندر جاکر نوجوان کے ساتھ شامل ہو گئی اور اندھیرے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اسی جگہ ٹھہر گیا اور دیکھنے لگا۔

اس کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انسپکٹر کی تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آنے لگیں، میرا سارا جسم غصہ سے کانپنے لگا۔ خون میں تیزی پیدا ہو گئی مگر اس کے باوجود کچھ نہ کر سکا اور واپس ہو لیا۔

کچھ دن بعد میں ایک روز شام کو اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ وہ لڑکی ٹرام پر سوار ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے غصہ ضرور آیا مگر کرتا بھی کیا۔ ملک کی حالت خراب تھی ایک دن میں تمام برائیاں کیسے ختم ہوتیں میں یہ سوچتا ہوا اس کے پاس پہونچ کر ٹکٹ مانگا۔ اس نے مجھے دونی دیتے ہوئے کہا۔

"ایک ٹکٹ دھرم تلہ"

میں نے ٹکٹ اسے دیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں پہچانتا ہوں"

اس نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر پوچھا

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے غصہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آپ نام پوچھنے والے کون ہوتے ہیں؟، جائیے ٹکٹ کاٹئے۔

لڑکی ابھی اتنا کہنے ہی پائی تھی کہ ایک نوجوان مسافر نے کہا۔

"آپ اس قدر سوال کیوں کر رہے ہیں"

لڑکی نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت گرا ہوا انسان معلوم ہوتا ہے"

نوجوان نے لڑکی کی باتوں کو سن کر مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا

"خبردار! پھر کسی شریف عورت سے ایسا سوال نہ کرنا"

میں اپنی اس بے عزتی کو برداشت کرتے ہوئے ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ جگو بازار کے قریب وہ لڑکی نوجوان کو دیکھتے ہوئے اتر گئی۔ وہ نوجوان بھی اسی جگہ اتر گیا۔ اس کے بعد میں اسے برابر دیکھتا، کچھ روز بعد وہ لڑکی اور نظر نہیں آئی۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہوا ۱۹۴۳ء کے بعد ۱۹۴۴ء کا نیا سال شروع ہوا۔ جنگ پہلے کے مقابلے میں اور تیز ہو گئی۔ قحط بھی کسی حد تک کمی ضرور ہوئی تھی مگر اس نے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ

دیا تھا سینکڑوں عورتوں نے بھوک کی آگ بجھانے کے لئے اپنی عزت
تک کو قربان کر دیا مگر قحط نے انہیں بھی نہیں چھوڑا ہماری نظروں کے
منے ہزاروں لوگ دم توڑ رہے تھے مگر میں کچھ نہ کر سکا۔

ایک نہیں کئی انقلاب آئے مگر ٹرام اپنی اس رفتار سے چلتی رہی
ں اسی سکنڈ کلاس میں ٹکٹ کاٹتا رہا۔ پچاس روپے کی نوکری کے لئے
نہ کتنے لوگوں سے گالیاں سنی پڑتیں کبھی میں نے اپنی زندگی میں موسم
ہیں دیکھا اور دیکھتا بھی کیسے۔ غلامی کی مضبوط اور بھاری زنجیر جو گلے
پڑی تھی۔

سردی کا موسم شروع ہوا۔ میں اپنی ڈیوٹی کرتا ہوا الگن روڈ پہنچا تھا
م رکی۔ معلوم ہوا کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔ کچھ دیر تک ٹرام رکی رہی پھر
ڑی۔ ٹھیک اسی وقت ایک لڑکی ٹرام پر سوار ہوئی، جب میں اس
س ٹکٹ کے لئے گیا تو دیکھا یہ وہی لڑکی ہے۔ مگر اب اس کے اندر
بدیلی آ چکی ہے۔

اس نے مجھے ایک دونی دیتے ہوئے کہا۔

"ایک ٹکٹ پانچ پیسے کا دو"

اس کی آواز بھی بدل چکی تھی۔

"کہاں تک جانا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹکٹ دیجئے"

میں ٹکٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور سوچنے
لوم ہوتا ہے اب اس کا کاروبار تیزی سے چل رہا ہے۔ اس کے چہرے
ب خاص قسم کی تبدیلی آ چکی تھی اسے دیکھ کر لوگ آسانی سے معلوم
ے تھے کہ یہ کون ہے۔ کچھ دور جا کر وہ اتر گئی اور فسٹ کلاس میں جا بیٹھی
ینے پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر میں سکنڈ کلاس کا کنڈکٹر کیوں بنا۔

کئی دن بعد گریا پاٹ سکشن میں مجھے فسٹ کلاس کنڈکٹر کی ایک
جگہ ملی۔ میں بہت خوش ہوا اور بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ
نے لگا۔

سردی کے بعد گرمی آئی۔ ایک دن میں نے اپنی ڈیوٹی کرتے ہوئے
یکھا اور سوچنے لگا آخر وہ اس طرف کیسے آئی؟ پہلے کے مقابلہ میں اب

کافی بدل چکی تھی جسم پر سلک کی ساڑی، پیروں میں کریپ سول جوتے ہاتھ اور
گلے میں سونے کے زیورات ایک نوجوان کو ساتھ لئے ہوئے ٹرام پر سوار ہوئی
نوجوان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت بڑا "بلیک مارکیٹر" ہے۔

میں نے جا کر کہا۔

"ٹکٹ"

لڑکی نے اپنے بیگ سے ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر جونہی
میری طرف دیکھا ایک منٹ کے لئے وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر اپنے نوٹ
میرے حوالے کرتے ہوئے کہا

"دو ٹکٹ چورنگی"

میں نے نوٹ واپس کرتے ہوئے بولا۔

"چینج نہیں ہے"

اس نے نوٹ واپس لیتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے"

میں اپنی اس بے عزتی کو نہیں بھولا تھا جو کچھ روز پہلے سکنڈ کلاس
میں اس نے کیا تھا۔ میں یہ سوچنے لگا آج بدلہ لوں گا۔ اسے ٹرام سے اتار دونگا
یہ سوچ کر میں نے کہا۔

اگر چینج نہیں تھا تو ٹرام پر کیوں سوار ہوئی؟"

"زبان سنبھال کر بولو" اس نے کہا۔

"زبان سنبھلی ہوئی ہے" جونہی میں نے کہا تھا کہ وہ نوجوان نے مجھے
گالیاں دیتے ہوئے ایک تھپڑ رسید کیا۔ ٹرام میں ایک ہنگامہ ہو گیا انسپکٹر
صاحب بھی فوراً پہونچ گئے۔ ٹرام کے تمام لوگوں نے مجھے ہی قصوروار قرار دیا
پچاس روپے کی نوکری بچانے کے لئے مار کھا کر بھی ان لوگوں سے معافی
مانگنی پڑی۔ کیوں کہ میں ایک غریب کنڈکٹر تھا۔ دنیا انسان کی نہیں دولت
کی قدر کرتی ہے۔ اگر چور کے پاس بھی پیسے ہوں تو سماج اس کی قدر کرتی ہے
میری ہستی بھی کیا پچاس روپیہ کا ایک معمولی کنڈکٹر معافی نہیں مانگتا تو اور
کیا کرتا۔ معافی مانگنے پر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ مگر میں اپنی اس بے عزتی کو
بھول نہ سکا۔ انسپکٹر کی ایک ایک بات مجھے یاد آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ
ایسی عورتوں کی مدد کرنا پاپ کو اور بڑھاتا ہے۔

اب وہ برابر اسی جگہ سے ٹرام پر سوار ہوتی۔ ایک دن میں نے

اس کی مانگ میں سیندور دیکھا۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ یہ آوارہ عورت کی مانگ میں سیندور کیسے؟ پہلے کے مقابلہ میں وہ اب ٹرام پر سوار ہو کر بہت زیادہ بولتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر غائب ہو گئی۔ میں برابر سوچتا کہ آخر وہ گئی کہاں؟۔

۴۴ء کے بعد ۴۵ء آیا۔ میری زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ مجھے پھر سکنڈ کلاس میں تبادلہ کر دیا گیا۔ ایک روز شام کو اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ وہ لڑکی گود میں ایک بچہ لئے ہوئے ٹرام پر سوار ہوئی۔ اب اس کی صحت بگڑ چکی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ایک آہ بھرنے کے بعد سوچنے لگا کہ میں کب اس سے بدلہ لوں گا۔ لڑائی ختم ہوئی، بیکاری بڑھنے لگی۔ بڑے بڑے کارخانے بند ہونے لگے۔

۴۶ء کا دور شروع ہوا۔ ایک دن وہ پھر گاڑی پر سوار ہوئی مگر آج اس کے ساتھ وہ نوجوان نہیں تھا۔

میں نے اس کے سامنے جا کر کہا۔

"ٹکٹ"۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے بیگ سے پیسے نکال کر کہنے لگی۔

"ایک ٹکٹ بھوانی پور"

میں نے طنز کرتے ہوئے کہا

"چونگی نہیں"!

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

میں نے پھر سوال کیا۔

"وہ نوجوان کہاں ہے؟"

"کون؟" اس نے دریافت کیا

"وہی جو آپ کے ساتھ رہتے ہیں" میں نے بتایا

"وہ تو ہمارے شوہر ہیں"

"آج وہ کہاں گئے؟" میں نے پھر دریافت کیا

"نوکری پر!" اس نے کہا۔

میں نے پھر طنز کرتے ہوئے کہا۔

نوکری پر یا چھوڑ کر بھاگ گئے!"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے غصہ میں کانپتے ہوئے کہا۔

میں خاموش ہو گیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ آج اس کے جسم پر نہ گہنے تھے اور نہ ہی سلک کی ساڑی۔ میں اس کے متعلق اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آخر بات کیا ہے کچھ ہی دنوں کے بعد کلکتہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے لگے۔ ۴۶ء کے بعد ۴۷ء کا آغاز ہوا ملک کو تقسیم کرنے کے نعرے بلند ہونے لگے میری نوکری کو بھی پانچ سال ہو گئے تھے مگر اب تک اپنی شادی نہ کر سکا۔ کرتا بھی کیسے پچاس روپے کی نوکری میں خود کھاؤں یا بیوی کو کھلاؤں۔

ایک دن پھر اس لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ ٹرام پر سوار ہو کر دھرم تلہ جا رہی تھی آج اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ دھرم تلہ پہنچ کر وہ اتر گئی پھر کچھ دنوں تک نظر نہیں آئی ٹرام جب شام کو ہوا کے تیز اور طاقت ور جھونکوں سے ٹکراتی ہوئی چورنگی اور دھرم تلہ سے گزرتی تو میں اکثر اس کے متعلق سوچتا نہ جانے وہ آجکل کہاں ہے جنگ ختم ہوا۔ دن گزرنے لگے۔ ٹرام اپنی اس رفتار کے ساتھ چلتی رہی۔

۴۸ء کے بعد ۴۹ء کا دور شروع ہوا۔ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا ٹرام میں بھیڑ کم تھی۔ طوفان زوروں پر تھا۔ بارش ہونے والی تھی مگر ٹرام کو طوفان یا بارش کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک عجائب گھر کے پاس گاڑی رکی ایک عورت ٹرام پر سوار ہوئی۔ میں ٹکٹ کے لئے اس کے پاس گیا

"ٹکٹ لاؤ" کہہ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"پیسے نہیں ہیں" اس نے جواب دیا۔

ٹرام اپنی پوری رفتار کے ساتھ ہوا کو چیرتی ہوئی چورنگی سے گزر رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ تو وہی لڑکی ہے۔ یکایک میرے منہ سے نکلا۔

"تم ہو؟" آج بدلہ لینے کا اچھا موقع ملا ہے۔ میں سوچنے لگا۔

میں نے پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"یاد نہیں ہے ایک دن تم نے میری بے عزتی کرائی تھی"

اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا بھائی"

"بھائی" جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑی مار دی۔

"آج کچھ نہیں ملا۔ گھر میں لڑکا بیمار ہے" کہکر وہ اس طرح کھانسنے لگی جیسے دق کے مرض میں مبتلا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اچھا چلو"

آج وہ اس کے جسم پر سلک کی وہ ساڑھی تھی، نہ چہرے پر پوڈر [illegible] بکھرا ہوا تھا۔ بھکارن کی سی حالت میں تھی۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوکر اس [illegible] پر غور کرنے لگا۔ اس چھ سال کی مدت میں اس کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کا نام "باسونا" تھا۔ وہ ایک معمولی چھتا گسری کی لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے۔ وہ اپنے بہن کے پاس رہتی تھی۔ بہنوئی بھی مر چکا تھا۔ بہن کے تین بچے تھے اسے مجبوراً پیشہ کے لئے نکلنا پڑا۔

باسونا کی ایک بلیک مارکیٹیر سے محبت ہوگئی۔ کچھ دنوں تک مزے لوٹ کر وہ چلتا بنا۔ اب وہ ایک بچہ کی ماں بن چکی تھی۔ بہن سے جھگڑا کرنے کے بعد وہ علیحدہ ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی شام کو جایا کرتی تھی مگر اب اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کے جسم کو گھن لگ چکا تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی کلی گھاٹ پہنچ گئی۔

اس نے اترتے ہوئے کہا۔

"جاتی ہوں بھیا"

ٹرام پھر چل پڑی۔ ٹرام کی تیز رفتار سے جو آواز نکل رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہے۔

"جاتی ہوں بھیا"

اس کے بعد دو مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی۔ لڑکا بھی اب بڑا ہوچکا تھا [illegible] ہسپتال سے واپسی پر وہ میری گاڑی پر سوار ہوئی۔ آج اس کا چہرہ [illegible] ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دو چار گھنٹے کی مہمان ہے۔

لڑکا بار بار اس سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ کھانا دو" "مجھے بھوک لگی ہے۔ کھانا دو۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دور جاکر اتر گئی۔

دوسرے دن میں اپنی ڈیوٹی کرتے ہوئے جیب "پربو تھیئٹر" کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہی لڑکی بھیک مانگ رہی ہے۔ ٹرام چل پڑی۔ نہ جانے کتنی بات اس کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر چھ ماہ تک وہ نظر نہیں پڑی۔ ایک دن صبح کے وقت میں اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ ایک سپاہی اس لڑکے کو لئے ٹرام پر سوار ہوا۔ ایک مسافر نے دریافت کیا۔

"کیا اس نے چوری کی ہے؟"

پولیس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اس کی ماں مر گئی ہے۔ اسے یتیم خانے لئے جا رہا ہوں۔"

دوسرے مسافر نے پوچھا۔

"اب اس لڑکے کا کیا ہوگا؟"

پولیس نے پھر جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"اس کی خالہ زندہ ہے۔ اس کے پاس رہے گا۔"

یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ آخر وہ مر گئی۔ اس کی ایک ایک بات مجھے یاد آنے لگی۔ وہی لڑکا چند منٹ قبل مجھے گالیاں دیکر ٹرام سے اتر گیا وہ کہاں رہتا ہے؟ سڑک کے کنارے۔ فٹ پاتھ پر!

آواز اور لہجہ

بات کرنے میں ہمارا لہجہ ہماری اندرونی کیفیات کا پوری طرح آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب گھبرائے ہوئے اور پریشان ہوتے ہیں تو یہ پیمانہ اوپر ہوجاتا ہے۔ جب مضمحل اور الجھن میں ہوں تو پیمانہ نیچا ہوجاتا ہے۔ بات کرنے میں ہمارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بخارات کی طرح گرم بھی ہوسکتے ہیں اور برف کی طرح سرد بھی ہمارے الفاظ آواز کا لہجہ جس میں ہم ان الفاظ کو ادا کرتے ہیں انہیں الفاظ میں کامیابی اور ناکامی دونوں کی نشاندہی کرسکتا ہے۔

اس وقت جب فضا سازگار نہ ہو حالات اعتدال پر نہ ہوں ذرا دیر کے لئے خاموش رہ کر اپنے گرد وپیش کی انسانی آوازوں کا جائزہ لیجیے پھر دیکھیے آپ ان آوازوں سے کتنے مختلف اقسام کے لہجوں کی فہرست بنا لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک سے الگ الگ انسانی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے مثلاً آپ کو غصہ کی آوازیں سنائی دیں گی۔ بے رحمانہ، اونچی اور دوڑاک پھر شاید پھسی پھسی آوازیں کانوں تک پہنچ جائیں۔ بزدلانہ، کمزور اور بے ربط پھر غمزدہ آواز بھی ہوتی ہے۔ رنجور، مری مری اور مستعار ان میں مشتعل آوازیں ہونگی حساس، پرغرور اور بھری ہوئی، جھنجھلاہٹ کی آوازیں۔ بے صبر، بے رحم اور تہمت طراز سرکش آوازیں، منافرانہ، تلخ اور مبارزت طلب اور بے تکی آوازیں بھی۔ جھوٹی، کینہ، صفت اور حقارت آمیز وغیرہ وغیرہ

آپ ان لہجوں کا اندازہ کرسکتے ہیں جن سے اکڑخوں، رضامندی اور بے یقینی کا اظہار ہوتا ہے انسانی جسم کے کسی نازک ارتباط کے ذریعہ دماغ اور آواز تحاد کے ایک ایسے حیران کن رشتہ میں منسلک کردیئے گئے ہیں کہ جس سے باطنی جذبات کی پوری طرح عکاسی ہوجاتی ہے اچھے اور برے دونوں۔ کاش ہم جان لیتے کہ ہماری آواز کا لہجہ دوسرے لوگوں کی بھلائی اور خوشی پر کس حد تک اثرانداز ہوتا ہے تو ہم ضرور کوشش کرتے کہ آواز کا لہجہ ہر وقت عمدہ اور مسرور کن رہے۔ یہ اس وقت بھی ممکن ہے جب ہم اندر سے خوش نہ ہوں۔

ملٹن نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے جس کی "مسحور کن آواز" کھول دیا کرتی تھی "ان تمام گرہوں کو جو میل و محبت کی پوشیدہ روح کو باندھ رکھتی ہیں" شیکسپیر کے ڈراموں میں ایک ایسا کردار بھی ہے جس کی "آواز ہمیشہ نرم نازک اور باریک ہی تھی جو نسوانیت کے لئے نہایت عمدہ چیز ہے" ہومر اپنی اوڈیسی میں ایک ایسے شخص کا ذکر کرتا ہے "جس کی آواز کا اثر کانوں پر ایسا خوشگوار ہوتا تھا کہ اس کے خاموش ہوجانے کے بعد بھی دیر تک سننے والا ایسا محسوس کرتا تھا کہ آوازیں آرہی ہیں" انجیل میں خدا کی آواز کو "کئی پانیوں کی آواز سے تشبیہہ دی گئی ہے"۔

آپ کا شوہر آپ کی بیوی آپ کے پڑوسی، آپ کے ساتھ کام کرنے اور اٹھنے بیٹھنے والے سب جانتے ہیں کہ آپ کس طرح محسوس کر رہے ہیں اور بولنے کے وقت آپ کی مزاجی کیفیت کیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ گھر کے پالتو جانور اور چڑیاں بھی آپ کے لہجے سے سمجھ لیتے ہیں کہ آپ کی مزاجی کیفیت کیا ہے اگر آپ لوگوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ آپ خودغرضی پر فتح پاچکے اور کامیاب ہوچکے ہیں تو آپ کے لئے بہتر ہے کہ اپنی آواز کے لہجہ کا ہمیشہ خیال رکھیں۔ آپ کی آواز سے بہتر آپ کے کردار کا آئینہ اور آپ کے جذبات کا پیمانہ کوئی نہیں ہے۔

اعلان

ایک صاحب کو جون ۱۹۵۲ء کے "مشیر" کی دو کاپیاں درکار ہیں۔ اگر کوئی صاحب ہدیتہً یا قیمتاً دے سکتے ہوں تو دفتر "مشیر" کو مطلع فرمائیں یا بھیجدیں۔ تمام ضروری اخراجات ادا کردیئے جائیں گے۔

"مینیجر"

ضحٰی

تجلّیوں کا قافلہ

اٹھو اٹھو کہ آسماں پہ چھا گئی سیہ گھٹا
گھٹا کی گود میں مچل اٹھی ہر عنبریں فضا
نسیم بحر تند و تیز
شریر شوخ و فتنہ خیز
ربابِ نیم شب پہ بے خودی کا گیت گا گئی
کلی کلی کو برملا شگفتگی سکھا گئی
روش روش چمن چمن
اُبل رہا ہے بانکپن
امڈ امڈ کے آ رہی ہے دشت و کوہ سے صدا
جراحتِ دل و جگر کا آج مل گیا صلہ

(۲)

سنو! سنو! کہ کہکشاں سنا رہی ہے داستاں
وہ داستاں کہ ہم جسے کہیں حدیثِ کن فکاں
ہمارے دل کے ساز کی تھی اصل میں جو آہ و فغاں
فضا کا قلب چیر کر
پہنچ گئی جو عرش پر
پلٹ کے آ گئی زمیں پہ نغمگی لئے ہوئے
حیات کے لئے نوید سرمدی لئے ہوئے
خدا کے عرش سے خدا کی روشنی لئے ہوئے
سنور گئے ہزار طور
بکھر گیا تمام نور!
افق افق پہ زندگی کا شور گونجنے لگا
نمود کی تجلیوں کا قافلہ رواں ہوا
پکارتا حیات کو
جہانِ ممکنات کو
تراشتا قدم قدم پہ آپ اپنی منزلیں
نکھارتا وجود کی نئی نئی...... حقیقتیں!!
سمیٹتا ہوا جہانِ عشق و حسن کی حدیں

(۳)

چلو چلو کہ کائنات کے ہو تم ہی نقش گر
نسیم خلد ہے تمہارے کارواں کی ہم سفر
تڑپ رہے ہیں نیم شب میں آج سینکڑوں قمر

کپاس کے سفید پھول پر ہیں شبنمیں گہر
گہر ہیں کتنے آبدار
ان پہ مہر و مہ نثار

یہ پانچ ندیوں کا دیس، عشق کی یہ سرزمیں
فضا میں اس کی عطر ہے ہوا میں اس کی انگبیں
کنارِ راوی چناب فرش خاک مخملیں!
خرام رودِ سندھ ہے کہ ایک رقص مرمریں

یہ رقص پر شباب ہے
شباب لاجواب ہے

قراقرم کی چوٹیوں پہ جھومتے ہیں برگ و بار
بلندیوں پہ کند[1] کی مچل رہے ہیں آبشار
پہاڑیوں پہ چاٹگام کی ہے زر بکف بہار
ابھر رہے ہیں دشت میں نئے نئے سے لالہ زار

انھیں ابھارتے چلو
رہینِ جستجو رہو!!

کہ جستجو ہے زیست کے تمام درد کی دوا
اسی سے کائنات کی حقیقتوں کا رابطہ

(۴)

حقیقتوں کے تاجدار
زندگی کے سحرکار

زندگی کے راستے میں پیچ و خم بھی آئینگے
ہر ایک خم پہ کچھ قدم تمہارے ڈگمگائینگے

کہ وہ امیرِ کارواں
ہے محوِ خوابِ جاوداں

مگر وہ چشمِ محوِ خواب اب بھی بے خبر نہیں
وفا پرست ہو جو تم تو کچھ تمہیں خطر نہیں

وفا کا وقت ہے اٹھو
پیامِ عشق کا سنو

کہ تاج و تخت سے بلند ہے تمہارا حوصلہ
خدا کی اس زمین پر ہو تم ہی نائبِ خدا
یہی تمہاری ابتدا، یہی تمہاری انتہا

(بشکریہ "ماہِ نو" استقلال نمبر ۱۹۵۱ء)

---

[1] کند۔ شمالی بلوچستان کا ایک پہاڑی سلسلہ

زرین عذرا

کیا آپ کا بچہ ڈرتا ہے؟

بچہ کی زندگی کے ابتدائی چند سال بہت اہم ہوتے ہیں، کیونکہ یہ ایک شخصیت کی بنیادیں رکھنے کا دور ہوتا ہے اگر والدین اس زمانہ میں لاپرواہ ہوئے تو شرم، جھجک اور ہزار ہا قسم کے بیجا خوف پیدا ہو جاتے ہیں جن کے اثرات زندگی بھر نہیں مٹتے۔

یوں تو ہر بچہ دو باتوں سے ڈرتا ہے خوفزدہ، بلند آوازوں سے اور جسمانی توازن کھو دینے سے ان باتوں کے علاوہ بچہ جن باتوں سے بھی ڈرتا ہے، سب مصنوعی طریقوں سے پیدا ہوتی ہیں بچہ کے گرد و پیش میں کچھ چیزیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن سے بچہ خوف کے زیر اثر ہو جاتا ہے۔

فرض کیجئے آپ کا بچہ گھر کے باہر کھڑا ہے کہ ایک کتا بھونکتا ہوا جھپٹتا ہے تو بچہ صرف اس مخصوص کتے سے ڈرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ تمام کتوں سے بلکہ ان تمام کتے سے مشابہ تمام جانور اس کے دل میں خوف پیدا کر دیں گے۔ حالانکہ اس حادثہ سے قبل وہ ان جانوروں سے مانوس ہی کیوں نہ ہو۔ خوف ایک متعدی بیماری ہے۔ اگر والدین خود کسی چیز سے خائف ہیں اور بچہ پر اس کا اظہار کر دیتے ہیں تو یہ بیماری، یہ خوف بچہ کو بھی نہ چھوڑے گا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ بچہ کو کسی چیز سے ڈرنا ہی نہیں چاہیئے۔ نہیں چاہیئے ہے۔ بچہ کو چند باتوں سے ڈرنا سکھنا چاہیئے۔ مثلاً، آگ سے بچنا بھی ہے ساتھ ہی ساتھ بچہ کو یہ بھی سیکھنا ہے کہ نامناسب ہے یا دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا غیر انسانی حرکت ہے ابتداً بچہ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ چوری کرنا یا ناجائز قبضہ کرنا کیوں بری بات ہے اس عمر میں یہ سمجھانے کی کوشش کرنا فضول بھی ہے۔ اس وقت صرف اسے منع کیجئے۔ فرض کیجئے کہ بچہ کوئی چیز چرانے کی کوشش کر رہا ہے تو اس ارادہ کو چوری سے قبل ہی ڈانٹ کر ختم کر دیجئے۔ اس سے بچہ کے ذہن میں چوری کے فعل اور آپ کی خفگی میں ایک واسطہ قائم ہو جائے گا بچہ کو غصہ سے ڈانٹنا ڈپٹنا اچھی بات نہیں۔ لیکن اگر آپ کچھ سکھلانے کے لئے یا کسی بات سے احتراز کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔

بیجا خوف پیدا کرنے کا دوسرا محرک "ایسا نہ کرو" کا حکم ہے۔ آپ ہی بتایئے۔ آپ دن میں کتنے بار اپنے بچہ پر "ایسا نہ کرو، وہ نہ کرو" کے جملوں کی بوچھار کرتے ہیں؟

اسی طرح بہت سے والدین بچہ کی ناشائستہ حرکت پر سزا اسے کمرہ میں بند کر دیتے ہیں یا گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں بچہ ذہنی طور ہی سے نہیں۔ ہمیشہ کے لئے والدین سے ایک دوری سی محسوس کرتا ہے جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ بچہ فطری طور پر دو چیزوں سے ڈرتا ہے ایک بلند آوازوں سے، اور دوسرے جسمانی توازن کھونے سے۔ بلند آوازیں والدین کی چیخوں میں سما جاتی ہیں۔ وہ بچے جن پر اکثر بیشتر والدین چیختے رہتے ہیں کچھ تو سمجھتے ہیں کہ وہ چیخنے چلانے پر مجبور ہیں کیونکہ بچہ کسی طرح سنتا ہی نہیں۔ ایسے والدین کا یہ عذر بے معنی ہے۔ اگرچہ بچہ چیخ پکار کے بغیر قابو میں نہیں آتا، تو سمجھئے کہ والدین ہی میں کسی چیز کی کمی ہے۔

یہ مانا کہ آج کی مصروف دنیا میں ہر وقت فضا میں ایک شور، ایک غوغا مچا رہتا ہے اور آپ بچوں کو ان آوازوں سے نہیں بچا سکتے، مثلاً کوئی آتا ہے، تو دروازہ زور سے کھولتا ہے یا آندھی چلتی ہے کھڑکیوں کے پٹ کھلتے ہیں یا آسمان پر بجلیاں شور مچاتی گرجتی ہیں۔ بچہ سوتے سوتے ان آوازوں سے چونک پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان آوازوں پر آپ کا کوئی قابو نہیں۔ اگر آپ ان آوازوں کو نظر انداز کریں گے تو بچہ آپ کی دیکھا دیکھی خود بھی ان آوازوں سے خائف نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی تسلی کے لئے اسے سمجھا بھی دیجئے۔

لیکن آپ کی احتیاط کے باوجود بھی اگر کچھ بیجا خوف اس کے دل میں گھر کر جائیں۔ تو آپ ان کو دور کرنے کے لئے کیا کریں گے؟ کیا کر سکتے ہیں؟

کبھی کبھی تو اسے سمجھانے بجھانے سے ——— کہ خوف کی کوئی بات نہیں۔ بچے کے خوف ختم ہو جاتے ہیں اور کبھی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ ایک طریقہ استعمال کریں سمجھانے کے بجائے ہنسیئے اور کوشش کیجئے کہ وہ بھی اس ہنسی میں آپ کا ساتھ دے لیکن ایک احتیاط کیجئے کہ اسے یہ نہ محسوس ہو کہ آپ اس پر ہنس رہے ہیں۔ یا دوسروں کے سامنے اس کے ڈر کا مذاق اڑا کر اسے خود حساس نہ بنا دیجئے۔

ایک اور طریقہ ممکن ہے۔ کوشش کیجئے کہ بچہ خوفزدہ چیزوں کو اس وقت دیکھے جبکہ وہ خوش ہو مثلاً کھانا کھاتے وقت یا کھیلتے وقت، خوف کے آثار جیسے ہی ظاہر ہوں، خوفزدہ چیزوں کو ہٹا دیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کا بچہ جانوروں سے خائف ہے، اس خوف کے دور کرنے کے لئے کھانا کھاتے وقت ان جانوروں کو سامنے لائیے! دریچہ سے کچھ دور کے فاصلے پر کھڑا کر دیجئے۔ ان کے دوسرے اوقات میں ایسے جانوروں کو نہیں دیکھنا چاہیئے اس طرح کئی دن تک ایسا کرتے رہیئے۔ خوف رفتہ رفتہ دور ہو جائے گا

اگر وہ اندھیرے خائف ہے تو اس کو اندھیرے میں سو دیجئے ہلکی روشنی کرتے رہیئے۔ کچھ عرصے کے بعد روشنی اور بھی مدھم کر دیجئے اور اس طرح رفتہ رفتہ اندھیرے کو بڑھاتے رہیئے۔ جب بچہ اس کا عادی ہو جائے تو بتیاں گل کر دیجئے۔

ممکن ہے بہت سے والدین نفسیات کے ان اصولوں کو بیکار سمجھتے ہوئے ان کی پرواہ نہ کریں اور سوچیں کہ خود انہوں نے بچپن ان نفسیاتی اصولوں کے بغیر گذارا ہے اور ان میں کوئی خوف پیدا نہیں ہوا۔ ایسے والدین سے گذارش ہے کہ وہ ایک بنیادی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

آج کی دنیا پچاس برس پہلے کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ سائنس کی روز افزوں ترقی دن رات دنیا کے چولے بدلتی جا رہی ہے۔ بچے کو اس دنیا میں رہنا ہے۔ آپ اس کی پرورش بھی ان نئے اصولوں پر کیجئے جو اس نئے ماحول کے قابل بناتے ہیں۔

(بشکریہ "نفسیات")

جناب عرش مونگیری صاحب کی خدمت میں!

آپ کی مرسلہ نظم "حیاتِ نو" ہم نے "مشیر" کے مئی ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع کی تھی لیکن ہمیں جناب فروغ احمد صاحب نے ڈھاکہ سے خط لکھا ہے کہ وہ نظم ان کی ہے اور آپ نے اس کو اپنے نام سے چھپوالیا ہے ہم جناب فروغ احمد صاحب کا خط بعینہٖ شائع کر رہے ہیں۔ آپ بھی اس کو پڑھیں اور خط کے آخر میں جناب فروغ احمد صاحب نے آپ کے "تخلص" کے متعلق مشورہ دینے کے بعد ہم سے سوال کیا ہے کہ ہمارا کیا خیال ہے؟ ہمارے خیال میں اس کا جواب بہتر طور پر آپ ہی دے سکتے ہیں چنانچہ ادارہ "مشیر" آپ سے سوال کرتا ہے کہ فروغ احمد صاحب کے مشورہ کے متعلق جناب کا کیا خیال ہے؟

(ادارہ)

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مشیر کے پرچے آپ کی عنایت سے ہر ماہ پہنچ رہے ہیں شکریہ ——— مئی ۵۵ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۵ پر "حیات نو" کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی ہے، وہ دراصل میری ہے کسی "عرش مونگیری" صاحب نے جو اتفاق سے میرے ہم وطن ہیں اور سید پور رنگپور میں قیام فرماتے ہیں۔ یہ نظم کہیں سے حرف بحرف نقل کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ ۳۹ء، ۴۰ء میں اس نظم کو میں نے ایک مشاعرے میں پڑھ کر سنایا تھا ان دنوں ہم لوگ بچپن کا ایک ادبی کھیل کھیلتے تھے "ہماری دنیا" کے نام سے ہم ایک قلمی جریدہ نکالتے تھے یہ نظم "حیات نو" "ہماری دنیا" کے کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی وہ نظم میری ذاتی نوٹ بک میں بھی درج ہے۔ بارہا میں نے سوچا کہ نظر ثانی کر کے اسے کچھ اور دائمی رنگ دوں لیکن اس کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔ اب جوں کی توں یہ چیز "عرش" صاحب کو پسند آگئی ہے۔ یہ عرش صاحب پہلے بھی ایک بار میری ایک چیز پسند فرما چکے ہیں۔ میری "عید سے متعلق" ایک نظم کو انہوں نے ڈھاکہ کے ایک روزنامہ کے "عید نمبر" میں چھپوا دیا ہے۔ جب میں نے داد دی تو انہوں نے بڑی خجالت کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں وہ ناشناس نہیں ہے تھے "گرد" تخلص فرماتے تھے اب وہ "عرش" ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ مناسب تخلص "فرش" ہی ان کے لئے ہو سکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

والسلام — فروغ احمد

تذکرے اور تبصرے

"ہمارا دفاع"

میجر جنرل محمد اکبر خاں

سائز ۲۲×۱۸/۸ ۳۱۰ صفحات، سفید کاغذ، مجلّد، خوبصورت گرد پوش، قیمت پانچ روپے صہ

ملنے کا پتہ :۔ فیروز سنز ۔ لاہور، پشاور، کراچی

اس سے پہلے میجر صاحب موصوف کی دو کتابیں "حدیثِ دفاع" "اسلحہ جنگ" قارئینِ "مشیر" سے متعارف کرائی جاچکی ہیں؛ خوشی ہے کہ پیشِ نظر کتاب بھی پہلی دونوں کتابوں سے کچھ کم ... ہے

فی الحقیقت میجر صاحب نے ان تین کتابوں کا سیٹ تیار کرکے ... پر جامع معلومات کا ذخیرہ فراہم کردیا ہے۔ "ہمارا دفاع" اس ... کی آخری کڑی ہے اور "ہمارے" ہی لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں ... مصنف نے پاکستان کے مخصوص حالات کو سامنے رکھکر اس کے ... پر بحث کی ہے اور عملی تدابیر بتائی ہیں۔ جگہ بہ جگہ دیئے ہوئے ... رنگین نقشوں نے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ وطنِ عزیز پاکستان کی حفاظت اور اسکا ... ہر سچے پاکستانی مسلمان کا مقدس فرض ہے؛ اور اس کی خاطر خواہ ... کے لئے اس سلسلے کی معلومات اور تربیت ناگزیر۔ اس اہم ... کو پورا کرنے میں یہ کتابیں غیر معمولی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ... صاحب موصوف قابلِ تحسین ہیں کہ انھوں نے یہ کتابیں لکھیں اور ... سنز بھی مبارکباد کہ انھوں نے ایسی کتابیں اس اہتمام سے شائع کیں

"...عفت"

مرتبہ : حمیدہ بیگم ، رخشندہ کوکب

سائز ۲۲×۱۸/۸ ۹۶ صفحات ، سفید کاغذ

خوبصورت سرورق قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ : ادارۂ خواتین ، اچھرہ ، لاہور

تعلیم انسانی زندگی کو بنانے اور سنوارنے ہی کے لئے ہوتی ہے اور اگر تعلیم سے یہ مقصد پورا نہ ہو، تو . . . . اسے کیا کہئے

آج ہماری سوسائٹی میں تعلیم کی کمی کا احساس اور اس کمی کو پورا کرنے کی کوششیں بہت کچھ بڑھتی جارہی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم سے ہماری نسلوں کو نفع کم پہونچ رہا ہے اور نقصان زیادہ موجودہ تعلیم نے ہم پر دو بڑی لعنتیں مسلط کی ہیں : ایک خدا ناشناسی اور دوسری خود ناشناسی ۔ بالخصوص عورتوں کے معاملے میں ۔ اوّل تو تعلیم ہی نہیں ہے، پھر جو کچھ ہے، وہ وجہ بے عملی اور سبب "نامسلمانی" ——— اکبر اور اقبال کی دور رس نگاہیں یہی دیکھکر پرنم ہوئی جاتی تھیں۔

اب اس صورتِ حال کے جہاں دوسرے بہت سے اسباب ہیں۔ وہاں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے وہ یا تو مقصدی نہیں ہوتا، یا پھر کسی غلط مقصد کا آئینہ دار ہوتا ہے کتابوں اور رسالوں کی کمی نہیں؛ لیکن ہمارے معاشرے کی تعمیر میں کتنا حصہ ہے، یہ ایک افسوسناک اور ناقابلِ فراموش حقیقت ہے

ایسے میں وہ نفوس ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں، جو کہ اس اس سیلابِ بے دینی و بد دینی میں مسلمانوں کو نشانِ منزل دکھانے کی کوشش کرتے ہیں ہمیں نہایت مسرت ہے کہ پیشِ نظر مجموعہ اسی نقطۂ نظر سے مسلم خواتین کے لئے تیار کیا گیا ہے، اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے، قابلِ قدر ہے۔ ہمارے سامنے "عفت" کا دوسرا شمارہ ہے۔ جس میں فکر انگیز مقالے بھی ہیں، مقصدی اور تعمیری افسانے بھی، ولولہ انگیز نظمیں بھی ہیں اور پاکیزہ غزلیں بھی!

ادارۂ خواتین نے مجموعۂ مضامین کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے؛ اور ادارہ کے اس اقدام سے اسلام پسند عناصر کی خواہی

توقعات وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ادارہ کے کارکنوں کو عزمِ صمیم اور اس کی کوششوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔

"کاروانِ حجاز" ماہرالقادری

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۷۳ صفحات سفید کاغذ مجلّد مع خوبصورت گردپوش ۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ : مکتبۂ 'فاران' کراچی

"حال" و "قال" کا فرق سنا کرتے تھے ۔ مدتیں گزریں مگر بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ فکر کی پختگی بہت کچھ اپنے ساتھ لائی ، اور معلوم ہوا کہ مریضوں کی دیکھ بھال پر لکچر دینے والے سرجن اور تیماردار ماں میں کتنا فرق ہوتا ہے ، کتنی ہی باتیں ہیں ۔ جو تقریروں سے دل میں نہیں اترتیں ، بحث سے سمجھ میں نہیں آتیں ، لیکن جب لپنے پر گزرتی ہے ، تو دل کی آنکھیں وا ہو جاتی ہیں ، اور وہ کچھ بھی نظر آنے لگتا ہے ، جو کبھی دکھائی نہ دیتا ——— یہ روزہ ، یہ نماز حج و زکوٰۃ بظاہر محض پابندیاں ہیں ۔ جو شارع علیہ السلام کی طرف سے لگائی گئی ہیں ، لیکن اگر کھلے دل سے ان "پابندیوں" کو [illegible] کیا جائے اور دل میں جگہ دی جائے ، تو واقعہ یہ ہے کہ دل کی دنیا بدلنے لگتی ہے ۔

ماہرالقادری اگر حج کو نہ جاتے تو شاید کبھی ایسی چیز [illegible] نہ لکھ سکتے ——— کہاں فکر کی پرواز ، اور کہاں وجدان [illegible] پہونچ ——— انھیں خدا نے توفیق دی ۔ خود روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے اور دیدۂ و دل روشن کر کے لوٹے ۔ ان پر جو کچھ گزرا اسے قلمبند کرتے گئے ——— وارداتِ قلب تھی ، جو تحریر میں ڈھلتی گئی ۔ "بات جو دل سے نکلتی ہے ، اثر رکھتی ہے" [illegible] گزری تھی ۔ کیفیت ہم پر بھی طاری ہونے لگتی ہے ۔ یثرب [illegible] اور ماہر کی حدی خوانی !

"کاروانِ حجاز" حجاز کے سفرناموں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ، جس میں کیفیتِ واقعات کے ساتھ ساتھ زبان کی [illegible] اور بیان کی حلاوت بھی ملتی ہے ——— نظموں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جذبات مستزاد ۔ بس پڑھا کیجئے اور سنا کیجئے ۔

(ج ۔ ق)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

Monthly "MUSHIR" Karachi.

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء

قیمت فی پرچہ پاکستان -/۸/-

بھارت -/۱۰/-

مرتبہ
رشید الغفور بیگ

E MUSHIR KARAC

بلند معیاری

ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی اد

پاکستان کا واحد پاکیزہ اُردو ڈائجسٹ

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون: ۷۹۲۳

★

جلد: ۶ ——— شمارہ: ۷

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء

٭ ٭ ٭

مُرتّبہ

عبد الغفور بیگ

●

بدلِ اشتراک:-

پاکستان : سالانہ : پانچ روپے : فی پرچہ : آٹھ آنے

بھارت : سالانہ : چھ روپے : فی پرچہ : دس آنے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ:-

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی) بھارت

(پرنٹر پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی سے شائع کیا۔)

ترتیب

اداریہ

نقد و نظر

تخئیل و تحقیقت

تلخ و شیریں

سازِ آہنگ

رنگ و لو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غور و فکر کا مرحلہ کب آئیگا؟

گورنر جنرل نے اپنے ۲۴ اکتوبر والے اعلان کے ذریعے جب یہاں کے دستور، دستور ساز اور مرکزی وزارت کی بساط لپیٹ دی اور چند افراد کے رد و بدل سے مرکز میں نئی وزارت مرتب کی گئی۔ تو ملک میں ایک شور و غوغا بلند ہو گیا کہ اب پاکستان کو وہ ناخدا میسر آ گئے ہیں جو اسے قعر تنزل سے نکال کر اوج ثریا تک پہنچا دیں گے۔ خوشامدی پریس نے بھی بعض نئے وزراء کو مختلف خطابات سے نواز کر یہ کہنا شروع کیا کہ اب اس ملک کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھے گا۔ جمہوریت نیابتی ادارے ــــ اور عوام کی حق رائے دہی کے سلسلے میں ایسے ایسے نظریات پیش کئے گئے جن کا جواب دنیا کے سیاسی لٹریچر میں نہیں مل سکتا۔ وزراء نے بڑے زور شور سے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ اب ملک کا دستور بھی صحیح خطوط پر بن جائے گا۔ سیاست کو بھی ناپسندیدہ اور ملک دشمن عنصر سے پاک کر دیا جائے گا۔ اور اقتصادی معاملات کو بھی اس ڈھب پر استوار کیا جائے گا کہ یہاں خوش حالی کا دور دورہ ہو اور ہر شخص اپنی بنیادی ضروریات زندگی حاصل کر سکے۔

ہم نے انہیں دنوں یہ عرض کیا تھا کہ یہ سب دعوے اور مقاصد ایسے ہیں جن پر ایک دنیا کا اتفاق ہے حتیٰ کہ دنیا میں اس وقت جو متحارب ضابطہ ہائے حیات پائے جاتے ہیں وہ بھی سب ایسے ہی الفاظ میں اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہیں، اور مختلف ممالک میں جب جماعتیں انتخابات لڑتی اور اپنے منشور عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں تو وہ بھی انہی مقاصد کی رٹ لگاتی ہیں۔ لیکن اصل فرق طریق کار کا ہوتا ہے اور ہر جماعت کے پروگرام کا صحیح اندازہ اس کے طریق کار سے ہی لگایا جاتا ہے۔ مثلاً ملکی معیشت کو لے لیجئے۔ سب جماعتیں یہ کہیں گی کہ ہم ہر شہری کے لئے ملکی وسائل کے مطابق ضروریات زندگی فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ایک کمیونسٹ یہ مقصد تمام وسائل پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیکر حاصل کرے گا۔ ایک جمہوریت پسند اپنے اسی مقصد کو آزاد معیشت کے تحت پورا کرنے کی کوشش کرے گا اور ایک فسطائی اگرچہ انفرادی ملکیت کی اجازت دیگا لیکن وہ سارے وسائل پیداوار اور معیشت کے دائرے کے اندر کی تمام سرگرمیوں کو حکومت و ریاست کے آہنی اقتدار کے شکنجے میں کس کر ہی مقصد کے حصول کی کوشش کرے گا۔ گویا مقصد اور نصب العین ایک ہے لیکن لائحہ عمل مختلف اور لائحہ عمل ہی دراصل جماعتوں اور حکومتوں کے پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی بنا پر بالعموم جماعتوں کو عوام کی تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نئے حکمرانوں کے پاس ــــ اگر انہیں نیا کہا جا سکتا ہے تو کیونکہ ہماری نگاہ میں تو تصورات، اخلاق اور سیرت و کردار کی حیثیت سے یہ سب حضرات سیاستدانوں کی اسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں جس سے گزشتہ سات آٹھ سالوں میں پاکستان کو سابقہ پیش آتا رہا ہے ــــ ہمیں کوئی ایسا پروگرام نظر نہیں آتا جس پر چل کر یہ لوگ اپنے ان مقاصد کو حاصل کر سکیں گے لیکن اس زمانے میں سیاستدانوں کے بیانات اور خوشامدی پریس کی واہ واہ نے ملک کی فضا میں ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اس وقت نئے حکمرانوں کے جن متوقع کارناموں پر گفتگو کی جاتی تھی وہ ابھی مستقبل کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔ لیکن اب جبکہ ان لوگوں کو ملک کی زمام کار سنبھالے سات آٹھ ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ حالات کا جائزہ لے کر متعین کر سکیں کہ ملکی حالات میں کوئی اصلاح

ہوئی ہے یا نہیں، یا اگر فی الحال کوئی واضح نتائج نہیں نکلے تو کیا حالات کا رخ یا رجحان ایسا ہے جس سے کسی اصلاح کی توقع کی جا سکے ہمیں نہایت افسوس سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حالات پہلے سے کچھ خراب ہی ہوتے ہیں، بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

دستوری اور وزارتی اکھاڑ پچھاڑ میں سب سے نمایاں حیثیت دستور یہ کے مسئلے کو دی گئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ پہلے لوگوں نے دستور کے معاملے کو بازیچۂ اطفال بنا لیا تھا۔ اب ہم ایسے اہل تر لوگوں کو سامنے لائیں گے جو ملکی دستور جلد سے جلد بنا دیں اور ان ریشہ دوانیوں۔ جوڑ توڑ اور سیاست بازیوں میں نہ الجھیں جو لگلے لوگوں کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ لیکن ہم جب دستور یہ کے انتخابات پر جن کے سلسلے میں آج کل دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ نظر ڈالتے ہیں تو آثار ایسے دکھائی دیتے ہیں جن سے حالات میں پہلے سے بھی زیادہ بگاڑ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اول تو بہت سے وہی لوگ دستور یہ میں لئے جا رہے ہیں جو پرانی میں بھی موجود تھے۔ ملک میں مرکزی حکومت کے بزرگوں جن سے ملک کی سیاست کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی توقعات وابستہ کی گئی تھیں۔ اور صوبائی سیاست کے مختلف دھڑوں میں وہ رسہ کشی چل رہی ہے جس سے ایک محب وطن کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ ان مرکزی وزرا کو جو وزارت ملنے پر اپنی پاکدامنی کا خود ہی ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے، دستور یہ میں نشست حاصل کرنے کے لئے وہ پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں جس سے خودداری اور اصول شناسی کی مٹی پلید ہو گئی ہے۔ صوبائی وزارتوں میں اس نقطۂ نظر سے رد و بدل کیا جا رہا ہے کہ مرکزی وزرا کو کسی نہ کسی طرح دستور یہ میں جگہ مل جائے۔

مجموعی حیثیت سے ملک کی سیاسیات میں دھڑے بندیاں، مفاد پرستیوں اور اصول شکنیوں کا اسی طرح دور دورہ ہے۔ بلکہ ان دور یہ باتیں اور زیادہ نمایاں ہو گئی ہیں۔ اور ہماری مرکزی قیادت بھی ان میں دل کھول کر حصہ لے رہی ہے۔

ایک یونٹ کی سکیم کے متعلق بھی بڑے بڑے دعوے کئے گئے تھے۔ اور اسے صوبائی تعصبات کے لئے تریاق قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

ملکی معیشت کی اصلاح کے لئے تمام دعاوی کے باوجود ابھی تک ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا۔ گرانی اسی طرح اب بھی موجود ہے جس طرح اس سے قبل تھی۔ سرمایہ داروں اور بڑے بڑے کارخانہ داروں کو وہی مراعات حاصل ہیں جو موجودہ دور سے قبل انہیں حاصل تھیں۔

ملک کی خارجی سیاست میں بھی اس گروہ کو مکمل ناکامیابی ہوئی ہے۔ کشمیر کے مسئلے میں ہماری شکست اور نامرادی اب اتنی نمایاں ہو گئی ہے کہ بھارتی پریس نے تو کھلے الفاظ میں کہنا شروع کیا ہے کہ کشمیر بالفعل اب ہندوستان کا ایک جزو ہے۔ اور ہمارے پریس میں اس کے متعلق ایک عام مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ہماری رائے میں یہ حالات عوام اور بالخصوص ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو اس ملک کی قسمت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کیا اس ملک کو ان لوگوں کی کش مکش اقتدار ہوس پرستیوں اور اصول ناشناسیوں کا شکار رہنے کے لئے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا ہے یا یہاں کے حالات کے اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو جانا ہے؟ آخر مختلف سیاسی دھڑوں کو یکے بعد دیگرے آزمانے کا یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ یہاں جو بھی نیا گروہ آیا ہے۔ اس سے توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔ لیکن جب وہ حوادثات زمانہ کا شکار ہو گیا تو اس کے جانشینوں کو مرکز توقعات بنا لیا گیا۔ اس کھیل تماشے سے اس ملک کو جو عظیم نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کے صحیح شعور کی ضرورت ہے ورنہ قانون قدرت کے تحت اس بے شعوری کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

(بشکریہ "تسنیم")

رفعت سروش •

منظوم افسانہ

نئی بہار

کردار

خزاں ——— بہار

(سرسبز و شاداب گلستان میں تند و تیز ہواؤں کے ساتھ رقص کرتی ہوئی خزاں آتی ہے)

اس کا گیت

میں فصلِ خزاں ہوں، میں فصلِ خزاں ہوں
بیابانِ دہر کی حکمراں ہوں
ہنسی سے عداوت تبسم سے نفرت
کہ سوزِ مسلسل ہے میری طبیعت
میں کانٹوں کی دلدار، پھولوں کی دشمن
کہ خارِ مغیلاں ہے اور میرا دامن
مرے تاجِ شاہی کی زینت ہیں کانٹے
مری تیغ کے شان و شوکت ہیں کانٹے
میں آئی ہوں گلزار پر راج کرنے
بہارِ گلستاں کو تاراج کرنے!
میں گلشن کی تابندگی چھین لوں گی
مہکتی ہوئی زندگی چھین لوں گی

بہت طنز کرتے ہیں ویرانیوں پر
شگوفوں کی نازک ہنسی چھین لوں گی
یہ خوشبو! یہ تیور! یہ رنگین پیکر
گلِ تر کی عشوہ گری چھین لوں گی
مرے سامنے آنکھ اٹھائے تو نرگس
نگاہوں کی جادوگری چھین لوں گی

بہت ناز کرتی ہے سوسن زباں پر
زباں کھینچ لوں گی، خودی چھین لونگی
بہت سر اٹھاتے ہیں شمشاد و سنبل
میں اک آن میں خودسری چھین لوں گی
میں دیکھوں گی کس طرح کھلتی ہیں کلیاں
ہر اک شاخ سے غنچگی چھین لوں گی
یہ مٹی کا جسم اور یہ پوشاک مخمل!!
زمیں سے میں روئیدگی چھین لوں گی

دوسرا منظر:- (طوفانی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور خزاں

گلستاں کی رنگینیوں پر چھا جاتی ہے)

خزاں:۔

یہ میری سطوت شاہی یہ میرا جاہ و جلال
کہ خار زار بنا گلستانِ حسن و جمال
بہار حرفِ غلط بن کے رہ گئی ہے آج
نمودِ حسن کا انجام ہے شکست و زوال
تمام منظرِ عالم ہیں تلملائے ہوئے
یہ کون دھوپ میں بیٹھا ہے سر جھکائے ہوئے

باغباں:۔

میں باغباں ہوں

خزاں:۔

——یہاں کس خیال میں گم ہو؟
غمِ بہار کو سینے سے ہو لگائے ہوئے

باغباں:۔

گذر گئیں جو بہاریں اب ان کا ماتم کیا
کھلا سکی ہے کبھی پھول چشمِ پُرنم کیا
حیات گرم نفس ہے میں سوگوار ہوں کیوں
اسی زمیں پہ نیا گلستاں کھلاتا ہوں

خزاں:۔

نئی بہار نیا گلستاں ہے خواب و خیال
زمینِ گل کو کیا میں نے اس قدر پامال
کہ اب نگارِ سمن ہے نہ گیسوئے سنبل
تڑپ رہا ہے فضاؤں میں نالۂ بلبل
مٹا چکی ہوں جہاں سے میں قدر...
بہا چکی ہوں زمیں پہ میں خونِ لال...

باغباں:۔

یہ خونِ لالہ و گل اک بہارِ تازہ ہے
خزاں نشاطِ گلستاں کا پیش خیمہ ہے
مری تجسسِ پیہم کا کاروانِ شوق
بہار بنکے مرے مرحلوں سے گذرا ہے
ابھی یہ جہدِ تسلسل ہے مائلِ تخلیق!!
ابھی تو زیست کو کچھ اور بھی سنورنا ہے
دھڑک رہی ہے ہر اک شے میں انقلاب...
حیات، روزِ تنوع کے گیت گاتی...
یہ کائنات تمنا، یہ آتشِ سیّا...
بدلتے وقت کے سانچے میں ڈھلتی جاتی...
زمیں کے ہونٹوں پہ نغمے ہیں آفرینش...
بہار بطنِ گلستاں میں مسکراتی...

خزاں:۔

——یہ میری فتح کی توہین کر رہے ہو تم

باغباں:۔

غرورِ فتح! تمھاری بساط ہی کیا ہے
ترا وجود نقابِ بہارِ رنگیں ..... تھا
وہ آئی جھوم کے! اٹھلا کے موجِ بادِ صبا
ادھر نقاب اٹھا موسمِ بہار آیا
خزاں کے دورِ جنوں کا طلسم ٹوٹ گیا

چلی انگڑائیاں لیتی ہوائیں!
مبارک ہو مبارک بوستاں کو!
سرکتے آنچلوں کی آڑ لے کر
بہاریں جھانکتی ہیں گلستاں کو
یہ دوشیزہ بہاروں کی ادائیں!
گلستاں در گلستاں رقصِ سنبل

فضائے خوش نظر نکہت بداماں
خیاباں در خیاباں پرچمِ گل!
ہوا سنکی تو غنچوں نے صدا دی
بہارِ آفرینش جاوداں ہے
کھِلا جو پھول دامن سے صبا کے
دلِ انساں ہے ، مہرِ گلستاں ہے

رئیس باغی •

آہنگ

(تضمین بر غزل علامہ اقبالؒ)

لامات امن واماں اور بھی ہیں
ں کارواں ، کارواں اور بھی ہیں
ں اور بھی آسماں اور بھی ہیں
اروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ کیوں دردِ پنہاں یہ کیوں سوزِ پیہم
ہر اک سمت شیون ہر اک سمت ماتم
یہ حیراں نظر کیوں یہ کیوں آنکھ پُرنم
"اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم"
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

راگ چھیڑیں نئے گیت گائیں
رگام خوابیدہ جلوے جگائیں
ں پھول کے روپ میں مسکرائیں
زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

عرب میں عجم میں بھی ہے نام تیرا
ہر رفعت دُر آغوش ہر گام تیرا
بھریں دم نہ کیوں سب در و بام تیرا
"تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا"
"ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں"

افطرت سنبل و ناز بو پہ
ب، جگمگا جادۂ جستجو پہ
در ہر اک آرزو آرزو پہ
عت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر"
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

حجاز و عرب میں الجھ کر نہ رہ جا
تو نسل و نسب میں الجھ کر نہ رہ جا
جنونِ طرب میں الجھ کر نہ رہ جا
"اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا"
"کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں"

نئی روح ہے اب مذاقِ کہن میں
نئے خم ہیں زلفِ شکن در شکن میں
چلے آئے سب حلقہ ہائے رسن میں
"گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
تنہا ... اے مرے راز دا ... اور بھی ہیں"

غمِ دل، غمِ جہاں

انور عنایت اللہ

یوسف نے دراز کھولی اور اپنا بٹوہ نکالا۔ پانچ کا نوٹ غائب تھا اسے یکایک یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کئے کرائے پر اس کی ساری محنت پر پانی پھر گیا ہو۔ امید کی وہ مبہم سی کرن جواب تک باقی تھی۔ وہ یکایک غائب ہو گئی۔ اور یوسف کا جی بیٹھ گیا۔

گھر میں آج دوپہر سے کوئی نہ تھا۔ پڑوس میں شادی ہو رہی تھی صفیہ صبح سے وہیں تھی۔ شاید وہاں شادی بیاہ کے گیت گائے جا رہے تھے ڈھولک کی تھاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔ ان گیتوں کی دھیمی سی آواز آ رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً دبے دبے سے جواں سال قہقہے سنائی دیتے۔ ان قہقہوں میں یقیناً صفیہ کا قہقہہ بھی شامل ہوگا۔ یوسف نے سوچا۔ اس کی عزیز کی سہیلی کی شادی ہو رہی تھی۔ آج صبح سے وہ بے حد خوش تھی۔ لیکن میں کس قدر داس ہوں۔ یوسف نے دور خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔ ساری رسوم شام تک مکمل ہو جائیں گی۔ پھر صفیہ کو یکایک میری یاد ستائے گی اور وہ چپکے سے لوٹ آئے گی۔ اور پھر؟؟ کیا میں اُسے بتا بھی سکوں گا کہ تم جیتیں میں ہارا صفو۔ میری ساری کوششوں پر پانی پھر گیا۔ آج افضل نے بھی وہی کیا جو ھی ساجدہ نے کیا تھا اور شمّو نے کیا تھا۔ اور اس سے پیشتر بہت پیشتر یونس ز کیا تھا۔ یونس نے، میرے سگے بھائی نے۔ جو آج پانچ سال سے نہ جانے کہاں بس حال میں ہے!!

بھائی کی یاد کے ساتھ، آج برسوں کے بعد اس کی آنکھیں آبدیدہ ئیں۔ اور دو آنسو لڑھک کر اس کی قمیص میں جذب ہو گئے آج اس کے سے کوئی بڑی رقم نہیں غائب ہوئی تھی۔ اس رقم کا اسے مطلق غم نہیں تھا تو اس بات کا غم تھا کہ آج ایک بار پھر اس کے آدرشوں نے مات کھائی بار پھر اسے قدرت نے احساس دلایا کہ دنیا میں بدی کی قوتوں کا مقابلہ ان نہیں، برائی کو، باطل کو۔ محبت اور خلوص، انسانی ہمدردی اور لہ سے نہیں ختم کیا جا سکتا۔ شاید بھائی کی یاد سے زیادہ یہ احساس شکست تھا جس کی وجہ سے پچھلے پانچ برس میں کئی بار، اس کی آنکھوں سے چپکے چپکے آنسو بہے تھے عجز و بے چارگی کے آنسو، جن سے اب کسی کو ہمدردی نہیں تھی۔ جن کی اب کوئی قیمت نہیں تھی۔

افضل سے اُسے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا رویہ اوروں سے مختلف تھا۔ اس سے پہلے دو بار زک اٹھانے کے بعد یوسف نے افضل کو اس گھر میں ملازم کی بجائے اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رکھا تھا شمّو اور ساجدہ مزدور بچے تھے۔ اسی لئے وہ نوکروں کی طرح رکھے گئے تھے لیکن افضل تو اسے پہلے ہی دن، کھاتے پیتے گھرانے کا بدقسمت لڑکا معلوم ہوا تھا وہ شام یوسف کو خوب یاد تھی۔ ابھی چھ ہی مہینے پہلے کی تو بات تھی۔ صبح سے تاریک بادل منڈلا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور سردی یکایک بڑھ گئی تھی۔ شام کو یوسف دفتر سے نکلا۔ اور تیزی سے بس اسٹینڈ کی طرف چلا لیکن راستہ ہی میں بارش شروع ہو گئی تو اس نے بھاگ کر قریب کی ایک بلڈنگ میں پناہ لی۔ بارش کی وجہ سے وہاں اور کئی راہ گیر کھڑے تھے۔ وہیں ایک کونے میں اسے ایک لڑکا نظر آیا جو بارش میں بری طرح بھیگ گیا تھا اور اب ایک طرف دبکا بیٹھا تھا۔ جھومتے ہوئے بادلوں اور موسلادھار بارش کی وجہ سے وقت سے پہلے تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اس لئے اس نیم تاریک ماحول میں یوسف کو لڑکے کی شکل نہیں نظر آئی۔ بارش کچھ کم ہو گئی تو جن لوگوں کے پاس چھتریاں تھیں۔ وہ یکے بعد دیگرے چلے گئے لیکن یوسف وہیں رکا رہا۔ بارش کی وجہ سے بسیں بڑی دیر دیر سے آ رہی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا کھڑا تھا کہ کسی نے آہستہ سے اس کی آستین کو کھینچا۔

"بھائی جان ——— بہت بھوکا ہوں۔ صرف ایک روٹی کا سوال ہے"

یوسف نے مڑ کر دیکھا تو اسے وہ لڑکا نظر آیا جو اب تک ایک کونے میں بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ اب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا

نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی آج کئی برس کے بعد یکایک اسے یونس شدت سے
یاد آگیا۔ اور وہ بے چین ہو گیا۔ وہ تقریباً اسی عمر کا تھا جب اس منحوس رات کو یونس
سے وہ جرم سرزد ہو گیا تھا۔ اور بھائی نے اپنی تمام تر محبت کے باوجود اسے اسی
رات گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ بالکل یہی خدوخال، ایسا ہی گورا رنگ ——
—— اور —— بولنے کا انداز بھی یہی۔ آج پورے ساڑھے چار سال
بعد اس بھیک منگے لڑکے سے "بھائی جان" سن کر نہ جانے کیوں وہ
بے تاب ہو گیا۔ اور اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا۔ تیرہ چودہ سال کا
اچھا ناک نقشہ۔ سر پر بڑے بڑے بے ہنگم بال جسم پر ایک میلی سی قمیص۔
جو جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ ایک آستین پھٹ کر نیچے لٹک رہی تھی اور دوسری
بازو پر سے غائب تھی۔ مٹیالے گندے پائجامے پر گھٹنوں تک کیچڑ کے بدنما
دھبے تھے اور پیروں میں پھٹے ہوئے چپل۔

"صرف ایک روٹی کا سوال ہے بھائی جان۔ میں نے کل رات سے کچھ
نہیں کھایا۔"

اس نے یوسف کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔

"پھر بھائی جان؟" —— یوسف بے چین ہو گیا۔ اور اس نے
چپکے سے اٹھنی نکالی اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دی اور پھر کہا۔

"تم کہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ محنت مزدوری سے انسان
پیٹ پال سکتا ہے۔"

"محنت مزدوری ملتی کہاں ہے صاحب؟ بوجھ مجھ سے اٹھایا نہیں
جاتا کوئی ہنر مجھے آتا نہیں۔ رکشہ چلانے کی کوشش کی لیکن لائسنس نہیں
ملا۔ گھروں میں بغیر سفارش اور سرٹیفکیٹ کے کوئی ملازم نہیں رکھتا۔ سامنے
بلڈنگ بن رہی ہے۔ وہاں کچھ دن پتھر ڈھوئے لیکن کل ہاتھ میں موچ آگئی
تو ٹھیکیدار نے مجھے علیحدہ کر دیا۔ میں کل رات سے بھوکا تھا۔ آپ نے اٹھنی دے کر
احسان کیا ہے —— دو وقت کی روٹی مل جائے گی ——
خدا آپ کو اس کا صلہ ضرور دیگا بھائی جان۔"

اس نے آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا —— "پھر بھائی
جان؟" —— بے اختیار یوسف کا جی چاہا کہ جھنجھلا کر اس سے کہے —— خدا
کے لئے بس بند کرو۔ میں تمہارا بھائی نہیں۔ میں کسی کا بھائی نہیں۔ بار بار
بھائی جان کہہ کر میرے کانوں میں زہر نہ ٹپکاؤ۔ اگر اب کی یہ لفظ تمہارے
منہ سے نکلا تو ایک طمانچہ لگا کر اٹھنی چھین لوں گا۔

یوسف نے دیکھا۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔

"تمہیں نزلہ اور کھانسی ہے۔ گھر جا کر کپڑے کیوں نہیں بدلتے؟ تم
بری طرح بھیگ گئے ہو۔" یوسف کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"میرا گھر کہاں ہے صاحب۔ میں تو فٹ پاتھ پر سوتا ہوں۔ سردیاں
گرمیاں فٹ پاتھ پر گذر دیں۔ ہاں بارش میں یہاں زینے کے نیچے پناہ لینی
پڑتی ہے۔ میں نزلہ کھانسی سے نہیں ڈرتا۔ کل تک آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائیگا"
اس نے جواب دیا۔

اس پر نہ جانے کیسے یوسف نے کہا۔

"تم میرے یہاں کام کرو گے؟ مجھے اپنے بچے کے لئے ایک ملازم لڑکے
کی ضرورت ہے۔"

وہی پرانا سوال۔ جو آج تیسری مرتبہ دہرایا گیا تھا۔ اس سوال کے
فوراً بعد یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ساجد کی بے ایمانی اور نمک
حرامی کے بعد اس نے توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کسی ملازم کے لڑکے کو گھر میں قدم
رکھنے نہیں دیگا۔ اس نے تو سفینہ سے بھی وعدہ کیا تھا کہ اس کے سارے تجربے
اب ختم ہو گئے۔ اب کوئی لڑکا اس گھر میں نہیں آئیگا۔ زندگی پھر نہیں آئے گی۔
اس وعدے کو ابھی دن کتنے ہوئے تھے —— یہی کوئی پانچ ہفتے۔
اور اب وہ اس انجان لڑکے سے کہہ رہا تھا —— میرے یہاں کام کرو گے؟
لعنت ہے تمہاری نرم دلی پر یوسف میاں۔ ہوش کے ناخن لو۔ وہ انسان
ہی کیا جو اپنی پچھلی ٹھوکروں سے نصیحت نہ حاصل کرے لیکن اب تو تیر کمان
سے نکل چکا تھا۔ اور وہ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"ملازمت؟ آپکے یہاں؟ لیکن میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں
ہے صاحب۔ یہاں مجھے کوئی جانتا بھی نہیں لیکن میں چور نہیں ہوں صاحب
اچھے گھر کا ہوں۔ میں دن رات محنت کروں گا۔ اور آپ کی اور بیگم صاحب کی
اور ننھے میاں کی خدمت کروں گا —— بس مجھے کہیں رہنے کو ٹھکانہ
مل جائے۔"

اس کی آواز میں التجا تھی۔ اور اب وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اس
کی خوشامد کر رہا تھا۔ یوسف کو اس نیم تاریک ماحول میں اس کی آنکھوں میں
ایک عجیب بیچارگی نظر آئی۔ وہ عجیب رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا

انور عنایت اللہ

غمِ دل، غمِ جہاں

یوسف نے دراز کھولی اور اپنا بٹوہ نکالا۔ پانچ کا نوٹ غائب تھا سے یکایک یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کئے کرائے پر اس کی ساری محنت پانی پھر گیا ہو۔ امید کی وہ مبہم سی کرن جو اب تک باقی تھی۔ وہ یکایک تب ہوگئی۔ اور یوسف کا جی بیٹھ گیا۔

گھر میں آج دوپہر سے کوئی نہ تھا۔ پڑوس میں شادی ہو رہی تھی فیہ صبح سے وہیں تھی۔ شاید وہاں شادی بیاہ کے گیت گائے جا رہے تھے ولک کی تھاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔ ان گیتوں کی دھیمی سی آواز آ رہی ۔ وقتاً فوقتاً دبے دبے سے جواں سال قہقہے سنائی دیتے۔ ان قہقہوں میں صفیہ کا قہقہہ بھی شامل ہوگا۔ یوسف نے سوچا۔ اس کی عزیز کی سہیلی شادی ہو رہی تھی۔ آج صبح سے وہ بے حد خوش تھی۔ لیکن میں کس قدر ں ہوں۔ یوسف نے دور خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔ ساری رسوم ہتک مکمل ہو جائیں گی۔ پھر صفیہ کو یکایک میری یاد ستائے گی اور وہ چپکے لوٹ آئے گی۔ اور پھر؟؟ کیا میں اُسے بتا بھی سکوں گا کہ تم جیتیں میں ہارا ۔ میری ساری کوششوں پر پانی پھر گیا۔ آج افضل نے بھی وہی کیا جو سا بعد نے کیا تھا اور شمو نے کیا تھا۔ اور اس سے پیشتر بہت پیشتر یونس تھا۔ یونس نے، میرے سگے بھائی نے۔ جو آج پانچ سال سے نہ جانے کہاں حال میں ہے!!

بھائی کی یاد کے ساتھ، آج برسوں کے بعد اس کی آنکھیں آبدیدہ ۔ اور دو آنسو لڑھک کر اس کی قمیص میں جذب ہو گئے۔ آج اس کے سے کوئی بڑی رقم نہیں غائب ہوئی تھی۔ اس رقم کا اسے مطلق غم نہیں تھا س بات کا غم تھا کہ آج ایک بار پھر اس کے آدرشوں نے مات کھائی پھر اسے قدرت نے احساس دلایا کہ دنیا میں بدی کی قوتوں کا مقابلہ نہیں، برائی کو، باطل کو۔ محبت اور خلوص، انسانی ہمدردی اور سے نہیں ختم کیا جا سکتا۔ شاید بھائی کی یاد سے زیادہ یہ احساس شکست تھا جس کی وجہ سے پچھلے پانچ برس میں کئی بار اس کی آنکھوں سے چپکے چپکے آنسو بہے تھے عجز و بے چارگی کے آنسو جن سے اب کسی کو ہمدردی نہیں تھی۔ جن کی اب کوئی قیمت نہیں تھی۔

افضل سے اُسے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا رویہ اور لوگوں سے مختلف تھا۔ اس سے پہلے دو بار زک اٹھانے کے بعد یوسف نے افضل کو اس گھر میں ملازم کی بجائے اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رکھا تھا شمو اور ساجد مزدور بچے تھے۔ اسی لئے وہ نوکروں کی طرح رکھے گئے تھے لیکن افضل تو اسے پہلے ہی دن، کھاتے پیتے گھرانے کا بد قسمت لڑکا معلوم ہوا تھا وہ شام یوسف کو خوب یاد تھی۔ ابھی چھ ہی مہینے پہلے کی تو بات تھی صبح سے تاریک بادل منڈلا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور سردی یکایک بڑھ گئی تھی۔ شام کو یوسف دفتر سے نکلا۔ اور تیزی سے بس اسٹینڈ کی طرف چلا لیکن راستہ ہی میں بارش شروع ہو گئی تو اس نے بھاگ کر قریب کی ایک بلڈنگ میں پناہ لی۔ بارش کی وجہ سے وہاں اور کئی راہگیر کھڑے تھے۔ وہیں ایک کونے میں اسے ایک لڑکا نظر آیا جو بارش میں بری طرح بھیگ گیا تھا اور اب ایک طرف دبکا بیٹھا تھا۔ جھومتے ہوئے بادلوں اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے وقت سے پہلے تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اس لئے اس نیم تاریک ماحول میں یوسف کو لڑکے کی شکل نہیں نظر آئی۔ بارش کچھ کم ہوگئی تو جن لوگوں کے پاس چھتریاں تھیں۔ وہ یکے بعد دیگرے چلے گئے لیکن یوسف وہیں رکا رہا۔ بارش کی وجہ سے بسیں بڑی دیر دیر سے آ رہی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا کھڑا تھا کہ کسی نے آہستہ سے اس کی آستین کو کھینچا۔

"بھائی جان ——— بہت بھوکا ہوں۔ صرف ایک روٹی کا سوال ہے۔"

یوسف نے مڑ کر دیکھا تو اسے وہ لڑکا نظر آیا جو اب تک ایک کونے میں بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ اب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا

نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی آج کئی برس کے بعد یکایک لمبے یونس شدت سے یاد آگیا اور وہ بے چین ہو گیا۔ وہ تقریباً اسی عمر کا تھا جب اس منحوس رات کو یونس سے وہ جرم سرزد ہو گیا تھا اور بھائی نے اپنی تمام تر محبت کے باوجود اسے اسی وقت گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ بالکل یہی خدوخال، ایسا ہی گورا رنگ ——— اور ——— بولنے کا انداز بھی یہی۔ آج پورے ساڑھے چار سال کے بعد، اس بھِک منگے لڑکے سے "بھائی جان" سن کر نہ جانے کیوں وہ کانپ گیا۔ اور اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا۔ تیرہ چودہ سال کا سن، اچھا ناک نقشہ۔ سر پر بڑے بڑے بے ہنگم بال جسم پر ایک میلی سی قمیص۔ کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ ایک آستین پھٹ کر نیچے لٹک رہی تھی اور دوسری کہنیوں پر سے غائب تھی۔ مٹیالے گندے پاجامے پر گھٹنوں تک کیچڑ کے بدنما داغ تھے اور پیروں میں پھٹے ہوئے چپل۔

"صرف ایک روٹی کا سوال ہے بھائی جان۔ میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔"

اس نے یوسف کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔

پھر بھائی جان؟؟ ——— یوسف بے چین ہو گیا۔ اور اس نے جیب سے اٹھنی نکالی اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دی اور پھر کہا۔

"تم کہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ محنت مزدوری سے انسان پیٹ پال سکتا ہے۔"

"محنت مزدوری ملتی کہاں ہے صاحب؟ بوجھ مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا، کوئی ہنر مجھے آتا نہیں۔ رکشہ چلانے کی کوشش کی لیکن لائسنس نہیں۔ گھروں میں بغیر سفارش اور سرٹیفکیٹ کے کوئی ملازم نہیں رکھتا۔ سامنے سڑک بن رہی ہے۔ وہاں کچھ دن پتھر ڈھوئے لیکن کل ہاتھ میں موچ آگئی۔ ٹھیکیدار نے مجھے علیحدہ کر دیا۔ میں کل رات سے بھوکا تھا۔ آپ نے اٹھنی دے کر احسان کیا ہے ——— دو وقت کی روٹی مل جائے گی ——— خدا آپ کو اس کا صلہ ضرور دیگا بھائی جان۔"

اس نے آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا ——— "پھر بھائی جان؟؟" ——— بے اختیار یوسف کا جی چاہا کہ چیخ کر اس سے کہے ——— خدا کے لئے بکواس بند کرو۔ میں تمہارا بھائی نہیں۔ میں کسی کا بھائی نہیں۔ بار بار بھائی جان کہہ کر میرے کانوں میں زہر نہ ٹپکاؤ۔ اگر اب کی یہ لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو ایک طمانچہ لگا کر اٹھنی چھین لوں گا۔

یوسف نے دیکھا۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔

"تمہیں نزلہ اور کھانسی ہے۔ گھر جا کر کپڑے کیوں نہیں بدلتے؟ تم بری طرح بھیگ گئے ہو۔" یوسف کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

میرا گھر کہاں ہے صاحب۔ میں تو فٹ پاتھ پر سوتا ہوں۔ سردیاں گرمیاں فٹ پاتھ پر گذار دیں۔ ہاں بارش میں یہاں زینے کے نیچے پناہ لینی پڑتی ہے۔ میں نزلہ کھانسی سے نہیں ڈرتا۔ کل تک آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائیگا اس نے جواب دیا۔

اس پر نہ جانے کیسے یوسف نے کہا۔

"تم میرے یہاں کام کرو گے؟ مجھے اپنے بچے کے لئے ایک ملازم لڑکے کی ضرورت ہے۔"

وہی پرانا سوال۔ جو آج تیسری مرتبہ دہرایا گیا تھا۔ اس سوال کے فوراً بعد یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ساجد کی بے ایمانی اور نمک حرامی کے بعد اس نے توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کسی ملازم لڑکے کو گھر میں قدم رکھنے نہیں دیگا۔ اس نے توصیفہ سے بھی وعدہ کیا تھا کہ اس کے سارے تجربے اب ختم ہو گئے۔ اب کوئی لڑکا اس گھر میں نہیں آئیگا۔ زندگی بھر نہیں آئے گا۔ اس وعدے کو ابھی دن کتنے ہوئے تھے ——— یہی کوئی پانچ ہفتے۔ اور اب وہ اس انجان لڑکے سے کہہ رہا تھا ——— میرے یہاں کام کرو گے؟ لعنت ہے تمہاری نرم دلی پر یوسف میاں۔ ہوش کے ناخن لو۔ وہ انسان ہی کیا جو اپنی پچھلی ٹھوکروں سے نصیحت نہ حاصل کرے لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اور وہ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"ملازمت؟ آپکے یہاں؟ لیکن میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے صاحب۔ یہاں مجھے کوئی جانتا بھی نہیں لیکن میں چور نہیں ہوں صاحب اچھے گھر کا ہوں۔ میں دن رات محنت کروں گا۔ اور آپ کی اور بیگم صاحب کی اور ننھے میاں کی خدمت کروں گا ——— بس مجھے کہیں رہنے کو ٹھکانہ مل جائے۔"

اس کی آواز میں التجا تھی۔ اور اب وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اس کی خوشامد کر رہا تھا۔ یوسف کو اس نیم تاریک ماحول میں اس کی آنکھوں میں ایک عجیب بیچارگی نظر آتی۔ وہ عجیب رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا

آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں ـــــ خدا کے لئے مجھے سہارا دو ـــــ اگر تم نے بھی مجھے سہارا نہیں دیا تو جس طرح میں فٹ پاتھ پر پیدا ہوا تھا اسی طرح فٹ پاتھ پر بھیک مانگ کر سردیوں میں ٹھٹھر کر، بارشوں میں بھیگ کر چپ چاپ مر جاؤں گا اور پھر یکایک یوسف کے سامنے صفیہ کا چہرہ آگیا۔ جو اپنے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لئے کہہ رہی تھی ـــــ یو آر اے لٹ ڈارلنگ (You are a little darling) ـــــ پھر ایک بھک منگے کو ساتھ لے آتے؟ ـــــ یہ بھی وہی کرے گا جو اس کے دو بھائی اس سے پیشتر کر گئے ہیں:

اس خیال سے یوسف کو خفت سی محسوس ہوئی لیکن اس بیمار لڑکے کی آنکھوں کا عجز اور اس کی بے چارگی کے آگے یہ خفت نہ ٹک سکی۔ اور اس طرح افضل اس کے گھر آگیا۔

کمرے کی عجیب خاموش فضا میں سرنگوں بیٹھے بیٹھے آج اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے واقعی یہ آخری تجربہ ہو۔ اس نے افضل کے لئے وہ سب کچھ کیا تھا جو اپنے سگے بھائی کے لئے کر سکتا تھا۔ اس کے لئے نئے کپڑے بنوائے اسے اچھا سے اچھا کھانا ملنے لگا۔ وہ اسے ہر روز بلاناغہ ایک گھنٹہ پڑھانے بھی لگا۔ سیر و تفریح کے لئے اسے وقتاً فوقتاً پیسے بھی ملنے لگے۔

اسے پڑھاتے ہوتے اکثر یوسف کے ذہن میں ماضی کی بیشمار یادیں ابھر آتیں، اور اسے شدت سے یونس یاد آجاتا ـــــ اس کا بھائی ـــــ جو نہ جانے اب کہاں تھا۔ بھائی کی محبت اب بھی کہیں چھپی بیٹھی تھی۔ صفیہ کو شاید اس کا احساس تھا کہ بھائی کو کھو کر، یوسف کی محبت نے، اس کی انسان دوستی نے اب ہمہ گیر وسعت اختیار کرلی ہے! اب اس کے دل میں صرف بھائی کا غم نہیں تھا بلکہ ہر اس مصیبت زدہ، بے بس کمزور ہستی کا غم تھا جس کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتا جس کے غموں میں شریک ہو کر انہیں گھٹا نہیں سکتا۔ ان کے دکھ درد مٹا نہیں سکتا۔ صفیہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کون سے جذبے کے تحت بے اختیار سا ہو کر، غریب مصیبت زدہ لڑکوں کو اب تک گھر لاتا رہا ہے افضل تو تیسرا لڑکا تھا۔ اس سے پیشتر شمو اور ساجد نے تو اس کی مہربانیوں کا خوب صلہ دیا تھا ایک نے پوری تنخواہ پر ہاتھ صاف کیا تھا! اور دوسرے نے اس کے پیار کر قلم پر ـــــ قسمت کی یہ کیسی ستم ظریفی؟ ان کے چلے جانے کے بعد یہی سوال بار بار اس کے ذہن میں ابھرا تھا ـــــ کیوں، آخر کیوں؟

کیا صفیہ ٹھیک کہتی تھی کہ گٹر سے نکلی ہوئی چیز ہمیشہ گندی ہی رہے گندی نالیوں کے یہ کیڑے اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں وہاں سے باہر نکا صحت مند صاف آب وہوا میں ان کی پرورش کی جاتے۔ وہ یا تو فوراً دم دیں گے یا پھر موقع پاکر، اولین فرصت میں دوبارہ وہیں جاکر دم لیں گے۔ لیکن کتنا غلط فلسفہ تھا یہ ـــــ یہ ساجد اور شمو اور افضل۔ ان کی پرورش تو فٹ پاتھ پر ہوئی تھی۔ لیکن اس کا اپنا بھائی ـــــ یونس جس کی رگوں میں وہی شریف خون دوڑ رہا تھا جو اس کی اپنی میں تھا۔ اسے تو گٹر سے نہیں نکالا گیا تھا اسے تو گندی نالیوں سے دور تک واسطہ نہیں تھا پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے بھی وہی کیا جو ساجد اور شمو نے آج افضل نے کیا تھا۔ بھائی کے جرم پر غصہ سے پاگل ہو کر اسے گھر سے نکالا کر اس نے بے اختیار صفیہ کی آغوش میں پناہ لی تھی۔ اور غم سے نڈھال ہو کر کہا تھا ـــــ میں نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی مجھے اتنی سزا ملی؟ اسے آخر یہاں کیا تکلیف تھی کہ اس نے اپنے مستقبل سے آنکھیں بند کئے، میری عزت کو سر بازار بیچ دیا تھا اور اس کے ضمیر نے اسے ٹوکا تک نہیں تھا ـــــ کیا یہ بھی مشیت تھی؟

اس کا صفیہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے گھر سے نکالتے ہوتے ایک لمحہ کے لئے یوسف کے دل نے پوچھا تھا کہ اس تمام تر تباہی کا ذمہ دار کون ہے؟ کم سن ناتجربہ کار یونس۔ یا ہمارا یہ ماحول جو جو پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس بات کو ختم نہیں کرتا جو انسان کو چوری پر مجبور کرتے ہیں۔

بھائی کو وہ گھر سے باہر نکال رہا تھا ـــــ بے رحم دیکھ، تاکہ اس کا ماحول اس سے اور چوریاں کرلے۔ اسے گھر سے نکالنے کے بعد مہینوں اس کے ذہن میں یہ سوال ٹھہرا رہا تھا۔ کیا اسے یوں گھر سے نکال کر اس نے صحیح قدم اٹھایا تھا؟

اس کا جواب اسے آج تک نہیں ملا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ اور صفیہ، ایک دوسرے کے غم میں کھوتے۔ گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے تھے اور دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس تباہی کا ذمہ دار کون تھا ـــــ اس کے والدین جنہوں نے بچپن سے اس کے ساتھ بے جا سختی کی۔ یوسف جس نے بھائی کو والدین کی سختیاں جھیلتے دیکھ کر اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ اور اسے اپنی محبت سے اپنے خلوص سے جیتنے کی کوشش کی تھی۔ ان برائیوں کا خاتمہ

کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو والدین کی بے جا سختی کی وجہ سے کمسن یونس کے خود سر ذہن میں چپکے چپکے پرورش پا رہی تھیں۔ کیا اس کا طریقہ کار غلط تھا؟ یوسف نے سوچا یقیناً غلط ہوگا۔ ورنہ یونس، بھائی کو یوں ذلیل نہ کرتا۔

بھائی کی یاد نے یوسف کو بے چین کر دیا۔ اور وہ اٹھکر ٹہلنے لگا۔ اس کے قدم خود بخود اسے اس چھوٹے سے کمرے کی طرف لے گئے جہاں آج صبح تک افضل رہتا تھا۔ شاید دل کے کسی گوشے میں اب بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید روپے صفیہ نے لئے ہوں۔

افضل کا ٹرنک ایک طرف جوں کا توں رکھا تھا۔ اس کا بستر ابھی وہیں تھا۔ دیوار پر اس کی بش شرٹ اور پتلون لٹک رہی تھی۔ اس کے چپل ایک طرف رکھے تھے۔ اس کی تمام چیزیں حسب دستور اپنی جگہ پر تھیں۔ یہ دیکھ کر یوسف کی ہمت بندھی۔ اتنی جلدی کسی کے متعلق رائے قائم کر لینا کس قدر غلط ہے اس نے سوچا۔ وہ یقیناً صفیہ کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ روپے صفیہ نے لئے ہوں گے۔ بس وہ اب آتی رہی ہوگی اور اس کے عقب میں حسب دستور منہ کو پشت پر اٹھائے ہوئے افضل ہوگا۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ کمرہ بند ہی کر رہا تھا کہ صفیہ آ گئی۔ لیکن وہ تنہا تھی ـــــ

"اچھا ہوا تم جلدی آ گئے۔ ـــــ تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں چائے لے آتی ہوں۔" وہ بولی۔

"افضل کہاں ہے؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

صفیہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ خاموش ڈرائنگ روم میں پہونچا۔ اور آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے نیم دراز ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد صفیہ چائے لے آئی۔ آج خلاف معمول وہ بھی کچھ خاموش خاموش سی تھی۔ دونوں چپ چاپ چائے پینے لگے۔ یوسف بظاہر خاموش تھا لیکن اب اس کا اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھدی۔ اور آہستہ سے پوچھا۔

"تم نے میرے بٹوے سے روپے تو نہیں نکالے؟"

"روپے؟ نہیں! لیکن تم بٹوا کہاں چھوڑ گئے تھے۔" صفیہ نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

"صرف پانچ کا ایک نوٹ غائب ہے ـــــ میں آج جلدی میں بٹوا دراز میں بھول گیا تھا ـــــ ایک بات بتاؤ صفیہ ـــــ کیا افضل صبح سے غائب ہے؟"

"صفیہ اب کے بھی خاموش رہی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ہاں وہ بھی وہی کرے گا جو اس سے پہلے اوروں نے کیا تھا۔

"چالیس روپے تھے بٹوے میں ـــــ صرف ایک پانچ کا نوٹ غائب ہے" یوسف نے صفیہ کو خاموش دیکھ کر کہا۔ اور وہ نڈھال سا ہو کر سرنگوں بیٹھ گیا چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اس نے صفیہ کا ہاتھ شانے پر محسوس کیا۔ اور دوسرے لمحے اسے یوں لگا جیسے وہ کہیں دور سے بول رہی ہو۔

"بس ـــــ اتنی سی بات کا اتنا اثر لے رہے ہو۔؟ ـــــ گندی نالیوں کے یہ کیڑے یہاں نہیں رہ سکتے۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ نقصان صرف پانچ کا ہوا، میں بھی آج عجلت میں اتنا بڑا ٹرنک کھلا چھوڑ گئی تھی جس میں میرے سارے زیورات ہیں۔ اللہ نے بڑا رحم کیا۔ ہر چیز محفوظ ہے وہ تو صبح دس بجے کا غائب ہے ـــــ اب اٹھو بھی ـــــ چلو کپڑے بدل لو۔ کوئی اچھی سی پکچر دیکھ آئیں۔" صفیہ بولی۔

"نہیں صفیہ ـــــ آج نہیں۔ آج کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا"

"کیوں؟ کیا اس لئے کہ پانچ روپے جاتے رہے؟" صفیہ نے ضدی بچوں کی طرح پوچھا۔

"نہیں صفیہ ـــــ بلکہ اس لئے کہ آج میرے ارادوں نے میری توقعات نے ایک بار پھر شکست کھائی ہے۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ ماحول انسان کے کردار کو کبھی نہیں بدل سکتا۔

یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا چلو۔ یہاں سے نکل چلیں آج کی شام گھر سے دور گذارنا چاہتا ہوں جہاں میں سب کچھ بھلا سکوں۔

اور صفیہ نے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھا وہ بیحد مضطرب تھا وہ کپڑے بدلنے چلی گئی تو یوسف نے کپڑے بدلے، اور بٹوا لینے کیلئے بڑے کمرے میں پہنچا میز کی دراز کھولی بٹوے سے قریب چاندی کے چار روپے اور کچھ نقدی پڑی تھی اسے عقب میں آہٹ سنائی دی تو وہ مڑا۔ دروازے پر افضل کھڑا تھا میلی قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی ایک آستین پھٹ کر نیچے لٹک رہی تھی اور دوسری کہنیوں پر سے غائب تھی یوسف کو دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔

(باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھئے)

جگدیش چندر

ایکسیڈنٹ

وہ بے خوابی اور درد کا بوجھ اٹھائے تھکاوٹ کی زنجیروں کو کھینچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور کرسی پر گر پڑا۔ وہ میز پر جھک گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے کوئی اس کے ہوش و حواس چرا رہا ہو۔ اس نے سامنے پڑے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھا لیکن اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ ان پر دستخط کر دے اس کی آنکھوں میں تاریکی پھیلنے لگی۔ جب سپاہی نے ایڑی سے ایڑی ٹکرا کر اسے سلوٹ کیا تو وہ بڑبڑا کر اٹھا اور لال پیلی آنکھیں کھول کر اس طرح دیکھا جیسے کسی دشمن کو گھور رہا ہو۔

"کیا ہے؟" اس نے تلخی سے کہا

"صاحب۔ دستخط کر دیں تو کاغذات اٹھا کر لے جاؤں"

اس نے کاغذات پر نظر دوڑائی اور اس طرح منہ بنا لیا جیسے کڑوی گولی کھائی ہو۔

"قلم دوات لاؤ"

سپاہی قلم دوات لے آیا۔

"صاحب۔ یہ اس قتل کی تفتیش کے کاغذات ہیں"

اس نے چند لمحوں کے لئے کاغذات پر دیکھا اور پھر قلم کا گلا دبوچ کر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دیں۔ سپاہی کاغذات اٹھا کر چلا گیا تو وہ پھر میز پر جھک گیا اور اپنے دماغ پر زور دینے لگا۔

"پانچ دن اور پانچ راتیں یعنی کہ......" وہ ان دنوں کے گھنٹے بنانا چاہتا تھا لیکن دماغ نے ساتھ نہ دیا تو وہ پھر سوچنے لگا۔

"پانچ دن اور پانچ راتیں...... اگر مشین بھی لگاتار چلتی رہے تو آخر خراب ہو جاتی ہے...... لیکن میں نے مسلسل...... ایک منٹ آرام کئے بغیر سفر کیا...... گولیاں چلائیں اور دلدلوں میں پڑا رہا...... جیتے جی جہنم کا نظارہ دیکھ لیا۔ وہ آگے نہ سوچ سکا جیسے وہ پتھروں کے بہت بڑے ڈھیر کے نیچے دب گیا ہو۔

اس کا دماغ کھنڈر مکان کی طرح ہو گیا جس میں کچھ ٹوٹی پھوٹی ادھوری یادیں تھیں لیکن ایک خیال سے وہ یادیں جھٹ مکمل ہو گئیں۔ اور دم اس کے جسم میں طاقت آ گئی جیسے طاقت کا انجکشن دے دیا گیا ہو۔

"گھر...... بیوی...... اور بچہ" وہ تھکاوٹ کی زنجیروں توڑتا ہوا آگے بڑھا اور ہینگر سے اتار کر اور کوٹ پہننے لگا جیسے بیٹھا پر کوئی بوجھ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل آیا۔ منشی کوئی اور کاغذات نہ اٹھا لائے۔ قدم اس کے احساس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ جھنجھلا کر دوڑنے لگا اور شیڈ میں سے موٹر سائیکل نکال لی۔ اس نے کئی دفعہ کِک لگائی لیکن ہر بار بیمار کتے کی طرح وہ گر گر...... گرر کر کے رہ جاتی۔ اس نے سپاہی کو آواز دی۔ اور جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کر دیا موٹر سائیکل کو...... یہ اسٹارٹ کیوں نہیں ہوتی"

سپاہی نے بڑھ کر موٹر سائیکل اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور زور سے ایک لگائی۔ موٹر سائیکل زور زور سے پھٹ پھٹ کرنے لگی۔ جیسے کہ اس کی کمزوری کا کھلکھلا کر مذاق اڑا رہی ہو۔ اس نے کھسیا کر سپاہی کی طرف دیکھا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ وہ بڑی سڑک پر ہو لیا اور موٹر سائیکل تیز کر دیا۔ جوں جوں وہ گھر بیوی اور بچے کے بارے میں سوچتا تھا موٹر سائیکل کی رفتار بڑھتی جاتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ حیرت انگیز رفتار اور موٹر سائیکل کی دھاڑ پر حیران اور پریشان بھی ہوا لیکن اس کے خیالات پھر گھر پر مرکوز ہو گئے...... یہ چوک گزر گیا...... یہ پل نکل گیا۔ اس نے رفتار اور بھی تیز کر دی اور موٹر سائیکل ڈاک خانہ کی ہیبت اور دیو قامت بلڈنگ کو ایک پل میں پیچھے چھوڑ گئی۔ بڑی سڑک چھوڑ کر وہ گھر کی طرف مڑا۔ گلی کے دو رویہ مکان جب کہ سو رہے تھے اور لیمپ پوسٹ چست اور چوکے سپاہیوں کی طرح پہرہ دے رہے تھے۔ پھر سے تھکاوٹ۔ درد اور بے خوابی کا احساس اس

کے دماغ میں خنجر کی طرح چبھا اور ہاتھ ایکسیلیٹر کو پیچھے کھینچنے لگے۔ جوں جوں یہ احساس شدید ہوتا جاتا تھا موٹر سائیکل کی رفتار کم ہوتی جاتی تھی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ شریفوں کی اس بستی میں وہ ان کا آرام اور سکون چھیننے کے لئے گھس آیا ہے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بجلی کی پیلی روشنی میں سفید مکان دن بھر رو دینے کے بعد ادنگھتی جوان بیوہ کی طرح معلوم پڑتا تھا۔ سائیں سائیں کی آواز اس طرح آ رہی تھی جیسے سارا ماحول گہری نیند میں ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا ہو۔ وہ دروازے کے ساتھ بیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ اس پرسکون اور خواب آلود ماحول کو بھونچال کے جھٹکے کی طرح منتشر کرنے یا کسی بے ماں باپ کے بچے کی طرح بھٹکتا پھرے۔ اس نے جی کڑا کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ بے مخصوص انداز میں دستک دے اور ہلکی سی سیٹی بجائے لیکن لبوں اور انگلیوں نے ساتھ نہ دیا تو اس نے تھپ تھپ دروازے پر ہاتھ مارا اندر ایک دم بتی روشن ہوئی۔ جیسے کوئی دستک کا منتظر بیٹھا ہو۔ اس کا دل اور بھی ڈوب گیا۔ اندر سے ایک ہلکی اور افسردہ سی آواز آئی۔

"کون ؟"

"میں ہوں" اس کی آواز دھوکہ دے رہی تھی۔

کنڈی اتر گئی۔ وہ دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ زبل نے نظریں پھیر کر اس کی طرف دیکھا اور پھر لپک کر اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے ڈیوڑھی میں چاروں طرف دیکھا تو سارا ماحول روٹھا روٹھا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ روم کی بتی جلا کر دروازہ کھولا تو ہلکی سی بدبو نے اس کے ناک پر چپت ماری۔ رسوئی کے اندر جھانکا تو احساس ہوا جیسے کوئی اژدہا خواب دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اسو لینے کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس نے کمرے پر چاروں طرف دیکھا وہ خالی خالی سا محسوس ہوا۔ اور سب چیزیں اس طرح پڑی تھیں جیسے سوگ منا رہی ہوں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان پانچ دنوں میں گھر کی زندگی بدل گئی ہے۔ وہ اپنے بستر کی طرف بڑھا اور دھپ سے اس پر بیٹھ گیا اور زبل کی طرف دیکھنے لگا جو گھٹنوں میں سر دبائے بچے کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ کئی منٹ تک لگاتار اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن وہ بے حس اور منجمد بیٹھی رہی۔ اسے غصہ آنے لگا کہ وہ کتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے۔ اور وہ برف کی سِل کی طرح خاموش اور سرد بیٹھی ہے۔

"اس وقت تو گھر اور تھانے میں کوئی فرق نہیں۔ بس ایک جگہ شور اٹھتا رہتا ہے اور اس جگہ مکمل خاموشی ہے" لیکن دوسرے لمحے میں سوچنے لگا کہ اس میں زبل کا کیا قصور ہے۔

میں تو جانے سے پہلے گھر تک نہ آ سکا۔ سپاہی کے ہاتھ ہی اطلاع بھجوا دی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور" اس نے پھر زبل کی طرف دیکھا اور اس کے سوتے ہوتے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے دھکا سا لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کے تھانے کا قصہ کیسے شروع کرے ایسی سنسنی خیز بات سنائے کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"اس دفعہ بڑے کایاں ملزموں سے واسطہ پڑا تین دن دونوں اطراف سے گولیاں چلتی رہیں۔ دلدلوں میں پڑے رہے۔ کئی بار میں بال بال بچا لیکن بچ کر کہاں جاتے۔ آخر پکڑے ہی گئے"

اس نے اپنی بات کا اثر معلوم کرنے کے لئے زبل کی طرف دیکھا لیکن وہ کمرے کا بے جان حصہ بنی رہی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر کہنے لگا۔

"کل پریزیڈنٹ کا جلوس نکلا ہوگا۔ گیا تو دیکھنے گئی تھی۔ میں تو خود لے جاتا لیکن کیا کرتا ڈیوٹی جو لگ گئی تھی۔ سنا ہے بڑا اچھا جلوس تھا۔ پڑوسیوں کے ساتھ چلی جاتی" وہ جلوس کے قصیدے گاتا رہا لیکن وہ پانی کی دھار کی طرح پتھر سے بہہ گئے۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گھومنے لگا اور پھر اسی کی چارپائی کے قریب رک گیا۔ وہ بچے کے چہرے پر سے لحاف کا پلو اٹھانے لگا تو زبل نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہماری قسمت میں تو آرام نہیں ہے۔ اس بچے کو تو سونے دو"

"جیسی تمہاری مرضی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہو تو سانس کی آواز بھی نہ آنے دوں"

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

وہ واپس اپنی چارپائی پر جا بیٹھا اور کوٹ اتار کر میز پر پھینک دیا۔ بوٹ اتار کر وہ پاؤں کی انگلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"پانچ دن کے بعد بوٹ اتار رہا ہوں۔ انگلیاں کچے گوشت کی طرح ہو گئیں ہیں" وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔

سارا جسم کانچ کا بن گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جوڑ جوڑ الگ ہو جائیگا

آنکھوں میں بے خوابی کی ریت چبھ رہی ہے۔ اور اپنا تھانے اور گھر کہیں بھی کوئی غمگسار نہیں۔"

نرمل نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گرم پانی لے آئی۔ اس نے پاؤں گرم پانی میں رکھ دیئے۔ اس کے لمس سے راحت محسوس ہونے لگی اور اس کی تھکن اور درد اس میں گھل ہونے لگے۔ اس نے نرمل کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا۔

"اس گھر میں تو تمہارا کوئی غمگسار نہیں میرا ہاتھ کیوں پکڑ رہے ہو۔" وہ نیچے بیٹھ کر اس کے تلوے سہلانے لگی۔

"بس کب آئے تھے۔"

"ابھی کوئی آٹھ بجے۔ گھر آنے لگا تو انسپکٹر نے بلا لیا۔ کہنے لگا تفتیش کے کاغذات کی تیار کرتے جاؤ۔ کیا کرتا۔ یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑا۔" اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں جھلکنے لگیں۔

"رات بھی وہیں سو جاتے۔ آدھی رات کے وقت بھی گھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

نرمل اس کے پاؤں کی انگلیوں پر تیل کی مالش کرتے ہوئے کہنے لگی

"تمہیں کیا پتہ کہ یہ پانچ دن میں نے کس طرح گذارے ہیں۔ نہ دن آرام نہ رات میں چین۔ سفر کرتے کرتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے جھاڑیوں اور پتھروں میں لیٹنا پڑا۔ کھانا مل گیا تو کھا لیا ورنہ پتھر پر پیٹ رکھ کر گولی چلاؤ۔ معلوم نہیں سانس کی ڈوری کس طرح قائم رہ جاتی ہے۔"

"یہ باتیں اپنے افسروں سے کہو نہ مجھ سے کہنے سے کیا فائدہ۔ باقی لوگ بھی تو تھانے میں ہوں گے۔"

"باقی لوگوں کی مت پوچھو۔" اس نے لمبی آواز میں کہا۔

نرمل نے اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے کہنے لگی۔

"ذرا شیشے میں اپنا حلیہ بھی دیکھا۔ ڈاڑھی بڑی ہوئی ہے۔ بال الجھے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہو۔"

"لو تم اپنی شکل تو دیکھو۔"

"میری ایسی شکل تو تمہارے کارن ہوئی ہے۔ میں کوئی جان بوجھ کر تھوڑے ہی کرتی ہوں۔"

اسے ایک دھکا سا لگا۔ اور نرمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم نے ان دنوں میں کتنی بار کھانا کھایا؟"

"روز کھائی تھی۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تمہاری یہ بات بالکل پسند نہیں۔ کوئی رسم و روایت کے پیچھے جان تھوڑے دیدیتا ہے۔ مرد گھر میں نہ ہو اور اچھی طرح کھانا نہ کھاؤ۔" وہ جذبات کی رو میں بہت کچھ کہہ گیا اور جب پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ محض رسم یا روایت نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی اور جذبہ ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور نہ سمجھ پایا کہ اس جذبے کی کس طرح قدر کرے۔

نرمل کھانا لے آئی۔ اس نے تھال لے کر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"آؤ۔ تم بھی کھانا کھاؤ۔"

"نہ۔ میں کھا چکی۔"

اس نے اسے گھسیٹ کر پاس بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے منہ میں نوالے ڈالوں گا۔" اس نے اپنا نوالہ نرمل کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ نوالے ڈالنے کی کوشش کرتا اور وہ منہ چھپاتی رہی۔ کتنی دیر تک وہ یہ کھیل کھیلتے رہے اور کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد نرمل بچے کے پاس گئی اور اسے جگانے لگی

"اٹھو پپو" تمہارے پتا جی آئے ہیں۔

"سونے دو۔ کیوں تنگ کر رہی ہو۔"

"نہ جگاؤ پپو کو۔" اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پپو کو جھنجھوڑ دیا۔ یہ کیا کرنے لگی ہو۔ جگاؤ نہ اسے۔" وہ بستر سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا اور پپو کے گدگدی کرنے لگا۔ وہ اوں ... آں کر کے سوتا رہا لیکن جب اس نے اس کے پیٹ پر منہ رکھ کر پڑپڑوں کی آواز نکالی تو وہ ہنس پڑا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پپو نے اس کی طرف دیکھا لیکن بازو اپنی ماں کی طرف بڑھا دیئے۔

"اچھا بیٹا تم بھی ناراض ہو۔" وہ سر جھکا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور

رف دیکھنے لگا۔ وہ بھی دیکھتا رہا اور پھر اس کی طرف بازو بڑھا دیے
نے اسے سینے سے لگا لیا اور ماتھا چوما اور اس طرح راحت محسوس
ہ لگا جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو دمکتی ہوئی انگیٹھی مل گئی ہو
پھر وہ اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ نرمل اس کے سر میں تیل کی
کرنے لگی۔ پپو اس کے پیٹ پر اچھلنے لگا۔
"تل گھوڑے تل!"
"گھوڑے کی لگام بھی پکڑ لو" نرمل نے پپو کے ہاتھ اس کی مونچھوں
رف بڑھا دیے۔
"نہیں بیٹا لگام ادھر ہے۔ اس نے تھوڑا اٹھ کر نرمل کی چوٹی
س کے ہاتھ میں تھما دیا" وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
"اچھا۔ اب آپ سو جائیں۔ اتنے دنوں بے آرامی میں کاٹے ہیں
نے کہا۔
کون کہتا ہے میں تھکا ہوا ہوں مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میرے ساتھ
کرو نہ" وہ پپو کو چھیڑنے لگا۔ نرمل سے مذاق کرتا رہا۔ اس نے جی
باتیں کیں اور خوب ہنسا۔ پچھلے پانچ دنوں کی زندگی کو تو وہ بھول گئے

اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی کا پھر سے تسلسل قائم ہو گیا۔
"اور کوئی بات" اس نے پوچھا۔
"کوئی خاص بات نہیں ہے" نرمل کا یہ جواب سن کر اس نے پہلو
بدل لیا۔ اور پپو کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اس کی پلکیں پتلیوں پر جھک گئیں
اور چند لمحوں بعد اس کی متوازن سانس سنائی دینے لگی۔ نرمل نے آہستہ
سے اس کا سر سرہانے رکھ۔ لحاف ٹھیک کر دیا۔ وہ ایک ایک کر کے بتیاں
بجھانے لگی۔ تاکہ اندھیرے کا سرمہ ان کی آنکھوں کو راحت دے سکے۔
جب وہ آخری بتی بجھانے لگی تو دروازے پر زور کی دستک
ہوئی۔ وہ چونک کر رہ گئی۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے آنکھیں
کھولیں تو ان سے جیسے خون ٹپک رہا تھا اسے بے حد غصہ آیا اور
اس نے غرا کر پوچھا۔
"کون ہے؟"
"صاحب۔ آپ کی بیٹ (Beat) میں ایسی ڈنٹ ہو گیا
ہے انسپکٹر صاحب نے کہا ہے کہ آپ فوراً موقعہ پر پہنچ جائیں۔"
(بشکریہ "مشرب")

ماہنامہ "مشیر" کراچی

مئی سنہ ۱۹۵۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مطمئن کر دینے والے دلائل، پاکیزہ معیار ا
حسین و دل آویز کتابت و طباعت نے اسے ملک کے مشاہیر جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ اب تک
اپنا اچھا خاصا حلقہ بنا چکا ہے، اور تجارتی حلقوں میں پورے انہماک سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ آپ کی صنع
حرفت اور شہرت کا ایک سریع الاثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

نرخنامہ اشتہارات

نمایاں مقامات

	اتفاقیہ	مشروط
سرورق آخری صفحہ	۱۲۵ــ۰ــ۰=	۱۰۰ــ۰ــ۰
سرورق صفحہ نمبر دو یا تین	۱۰۰ــ۰ــ۰=	۸۰ــ۰ــ۰

عام مقامات

	اتفاقیہ	مشروط
سالم صفحہ	۶۰ــ۰ــ۰=	۵۵ــ۰ــ۰
نصف صفحہ	۳۵ــ۰ــ۰=	۳۰ــ۰ــ۰

منیجر، شعبۂ اشتہارات، ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی

ابنِ مریم ◦

مہاجر بستیاں

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم

مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل مجہول ، نظر تنگ ، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم
ایک اک دوش کہ پشتارۂ غم سے بوجھل
ایک اک رگ کہ رمِ قطرۂ خوں سے محروم
ایک اک دل میں دہکتے ہوئے دوزخ لاکھوں
اور آنکھیں کہ بسائے ہوئے خلدِ معدوم
کچھ نہیں فکر بجز نانِ جویں —— نانِ جویں
اور ہو گی بھی تو کیا حاجتِ قلبِ مرحوم

شام ہوتی ہے تو پھر صبح کی بھوکی قبریں
چاٹ جاتی ہیں ہر ایک سایۂ دہر نقشِ قدوم

عمر تا عمر اسی طرح سے کٹ جاتی ہے
اپنی آنکھوں میں لئے گمشدہ منزل کی تلاش
اپنے سینے سے لگائے ہوئے محبوب کی لاش
زندگی موت کی گودی میں سمٹ جاتی ہے!

(بشکریہ افکار)

———•••———

امۃ الوحید سیّالہ ●

سفید قبریں

"اوہ ــــــــ غضب ہوگیا چھوٹی بہو ــــــ" اماں جی کی غیر متوقع بوکھلاہٹ پر سہیلہ چونک پڑی۔ وہ اوپر سیڑھی والی دیوار پر دھوپ میں بکھرے ہوتے اپنے کپڑوں کو افسردہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "بہو کپڑے الگنی پر کیوں نہیں ڈالے گئے ـــــــ؟" انہوں نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

اماں جی نے نماز جمعہ پڑھنے جانے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالا تو وہ پانی کی دیگچی چولھے پر چڑھا کر غسل کی تیاری کرنے لگی۔ کلّو بھاگتا ہوا آیا۔
"چھوٹی بیگم ــــــــ اماں جی باہر بلا رہی ہیں!"
ابھی ابھی تو کہیں وہ ان کے کاموں سے فارغ ہوئی تھی۔ کام بھی بے پناہ بخدا، آکاش بیل کی طرح پھیل جانے والے۔ قہر درویش برجان درویش۔ کوئی مصلحت سمجھ کر اس نے کچھ کام اپنے ذمے لے لئے تھے۔

اماں جی کے زہد و تقویٰ کا کافی شہرہ تھا۔ شہر بھر میں نہ سہی۔ آدھے شہر میں ہی سہی۔ پرہیزگاری کا عالم یہ کہ ایک دفعہ وکیل صاحب کے گھر سے لوٹتے ہوتے مائی تاجن اماں جی کو چھوٹے راستے کے پیش نظر دھوبی گھاٹ کے قریب سے گذار لائی۔ اچانک نگاہ جو پڑی تو اماں جی کی طبیعت میں گرہ بندھ کر رہ گئی۔ کھلی ہوئی دھوپ میں۔ گھاس پر بکھرے ہوئے ایک رنگین کپڑے کے بالکل ہی قریب گوبر کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔ پھر اماں جی کے کپڑے دھوبی کے پاس دھلنے کو نہیں گئے۔ یہاں تک کہ اس دن گھر پہنچ کر پہلا کام یہی کیا گیا، کہ اماں جی نے دھوبی کے دھلے ہوئے سب کپڑے ٹرنک سے نکلوا لئے کہ "جانے کس کس کپڑے پر کہاں کہاں کوئی نجاست لگی پڑی ہو۔ روزانہ سات آٹھ مرتبہ (یعنی مع تہجد و اشراق اور نوافل وغیرہ کے) خدا کے حضور کھڑا ہونا" اور پھر حسب معمول اپنی نگرانی میں مائی تاجن سے سارے کپڑے نل کے کھلے پانی کے نیچے دھلوا ڈالے۔ تاجن پر بھی اماں جی کو کب اعتماد تھا۔ ابھی جب دھوبی کی چھوا چھو کے قریب سے گذر ہوا۔ بکثرت پانی بہہ جانے کے باعث دور دور تک کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ تاجن نے شب سے جو پاؤں کیچڑ میں پٹخا۔ تو غلیظ و ناپاک چھینٹیں قمیص کے گریبان اور آستین تک اچھل پڑیں۔ اماں جی کو غصّہ بھی آیا، رنج بھی ہوا۔ تاجن پر برس پڑیں "کمبخت ــــــــ فرشتوں کی لعنت کہیں مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرو تو پاکی ناپاکی کی کچھ سمجھ آئے۔ کبھی خدا کے حضور کھڑا ہونا ہو۔ تو یہ بے احتیاطیاں نہ ہوا کریں۔ خود اماں جی پر کوئی چھینٹ پڑتے پڑتے رہ گئی تھی۔ پھر بھی وہ کپڑے یونہی جسم پر رکھنے کو دل نہ جما۔ غسل کر کے کپڑے بدل لئے۔

سہیلی کی شادی ہوئی تو نل کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی پائنچوں کو ذرا اوپر اٹھا لینے کی ادا اماں جی کو کچھ بھا گئی۔ بڑی بہو کی پاکی ناپاکی کے معاملے سے تو وہ سخت نالاں تھیں۔ مجھلی بہو کی کوئی محتاط نہ واقع ہوئی تھی۔ پھر کم تیسم اپنی نگرانی میں مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے کام کرانے سے بدن ٹوٹنے لگتا۔ پھر وقت کے حرج ہو جانے سے عبادت میں بھی کمی کا خلل پڑتا۔ کم ہدایات دیگر سہیلہ کو اپنے ایسے کاموں کی نگرانی بنا دینے میں اماں جی کو سہولت محسوس ہوئی۔ دل بھی کچھ جم گیا۔

موسم سرما کا مختصر سا دن۔ جمعہ کا روز۔ اماں جی کے کام اس روز یونہی کافی پھیل جاتے تھے۔ مگر موسم سرما میں کیا کہنے۔ گرمیوں میں تو وہ پٹڑے پر بیٹھ کر نل کے نیچے غسل کر لیا کرتیں لیکن اب گرم پانی سے غسل ہوگا تو پورے اہتمام سے۔ پانی گرم کرنے کی دیگچی اور دونوں بالٹیاں خصوصیت سے منجھوا دھلوائی گئیں۔ غسل، تیل، کنگھی غرضیکہ ہزار مشکل کہیں تیاری ہوئی۔ پھر ہی میلے جوڑے کو دھلوانا۔ دھلوانے اور الگنی پر ڈلوانے کے ہزار اہتمام خدا کر کے وہ رخصت ہوئیں۔ تو سہیلہ جلدی جلدی غسل کی تیاری کرنے لگی۔ ذرا سی اماں جی کے بلانے اور واپس لوٹ آنے کی اطلاع پا کر وہ گھبرائی سی بجلی ہوئی باہر آئی کہ آخر کیا وجہ ہوئی؟ صحن میں اماں جی پائنچے اٹھاتے بوکھلائی کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر آدھے پونے الفاظ نکلنے لگیں "کیا بتاؤں چھوٹی

ــــ کمبختوں پر خدا کی مار ــــــ تم جانو سڑکوں پر جگہ جگہ کیچڑ،
بر لیٖد ــــــ پائینچے اٹھاتے ہوئے چلا کروں۔ ــــــ
ں گندے نالے کے قریب سے جو گذرنے لگی ہوں، تو اللہ کی پھٹکار
ں ذلیل لونڈے پر۔ جانے نالے میں اینٹ پھینکی کہ۔ دڑا۔ سارا پانی اُچھل
کپڑوں پر۔ ــــــ "بے بس سی ہو کر وہ خاموش سی ہو گئیں۔ پھر
یعت کی نزاکت پر قابو پاتے ہوئے کہا "بہو ــــــ اب جلدی
سے مجھے تیار کرا دو۔ جمعہ کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے ــــــ" بہو نے
ر آنچ تیز کرنے کے لئے چولھے کے قریب بٹھا دیا۔ تاکہ پانی جلد گرم ہو جائے
ں تاجن کو ہدایت کی کہ جلدی سے غسل خانے میں انتظام مکمل کر دے۔ اور خود
ٹرنک سے دوسرے کپڑے نکال کر شلوار میں جلدی جلدی ازاربند ڈالنے لگی
کپڑے کھونٹی پر ٹانگ کر اس نے اماں جی کو غسل خانے میں بھیج دیا۔
پھر تاجن کو کہا "ماسی جی اب اماں جی کے کپڑے دھو ڈالئے۔ وقت دیکھا
ان کے جانے کے بعد خود غسل کر کے نماز جمعہ پڑھنی غیر ممکن بھی معلوم ہوئی
ں خیال سے کہ اب تو نماز یونہی ادا کرنی پڑے گی۔ وہ غسل کی تیاری کرنے
بجائے اماں جی کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

یوں تو اماں جی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے درس عبرت
ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھی سوچ کی گردش زیادہ تیز ہو جایا کرتی۔ خصوصاً اس
ن کا شدت احساس جبکہ جمعہ کے روز گرمیوں کی جلتی ہوئی دوپہر اور
نچ پہر کے دن میں اماں جی نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ یا ہو گیا تھا، جمعہ کا روزہ
اماں جی کا شاید ہی چھوٹ جائے۔ ورنہ دانستہ چھوڑنے کا کبھی تصور بھی
آسکتا تھا۔ اس روز سورج نے بھی بڑی فراخی سے گرمی اگلی۔ اماں جی
بکے سے سارا دن برقی پنکھے کے نیچے لیٹی رہیں۔ تب بھی حالت کا غیر ہو جانا
نہ رکھا۔ اور وہاں تو اس روز کاموں نے بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ آج سے
ان ہیں کہیں زیوروں اور کمیشنوں کا معاملہ اٹھ سکا۔ پھر روپے پیسے کا
ساب کتاب بھی مکمل کروانا تھا۔

اماں جی کی دولت بھی اچھی خاصی تاریخ رکھتی تھی تقسیم ملک سے قبل
ہیں ماہ بماہ کمیشن مل جایا کرتی تھی۔ اور اصل زر بحفاظت کسی چور ڈاکو
کے کھٹکے کے بغیر بینک میں محفوظ پڑا تھا جب اماں جی کے دور کے رشتے
ابر خود دار تاجر بھتیجا اس سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ تو کسی نے مدافعت

کی: "یہ سود ہوا نہ کہ کمیشن۔ ؟"

اماں جی نے پڑھے ہوئے سبق کے مطابق منطق جھاڑی "کیوں
یہ سود کیوں ہوا آخر؟ بینک والے کمیشن لے کر تاجروں کو روپیہ دیتے ہیں
اور ہمارے روپے پر ہمیں کمیشن دیتے ہیں۔ یہ تو تجارتی اصول ہیں۔ تاجر
ہمارے روپے سے تجارت کر کے نفع نہیں کماتے کیا؟ جو ہم کمیشن نہ لیں"
فسادات کے دنوں میں اماں جی کو بڑا خطرہ محسوس ہوا۔ تمام دولت منگوا کر
تجوریوں میں مقفل کر لی۔ یوں بھی وہ اپنی حفاظت میں روپیہ رکھنے کو ترجیح
دیتی تھیں۔ نہ ہی کسی کو پتہ چلے کہ کتنا ہے کتنا نہیں وہ تو کمیشن کے لالچ اور
چوری ڈاکے کے خوف سے آدھی چوتھائی بینک میں رکھوا دی تھی۔ اور کہہ دیا
"بس یہی سب کچھ ہے" اگرچہ جاننے والے جانتے تھے کہ سب کچھ صرف
یہی نہیں ہے۔

دولت کونسی آسانی سے پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لاپرواہی
اور غفلت سے کام لیا جائے خدا جانے اماں جی کے والد نے کس کس طرح
کن کن جتنوں سے یہ روپیہ جمع کیا ہوگا۔

کل دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی بہن عالم شباب میں ہی دو لڑکیاں ایک
ڈیڑھ برس کی دوسری دو ماہ کی چھوڑ کر چل بسی۔ بہنوئی چار ماہ پہلے ہی دنیا
سے کوچ کر چکے تھے۔ اماں جی نے دونوں بچیوں کو پرورش کیا۔ پھر دونوں کی
شادیاں کیں۔ اب ان کا حصہ اماں جی کے پاس کاہے کو بچا تھا۔ کوئی ذرا
حساب کتاب کرے تو دونوں کے اخراجات ان کے حصے سے کچھ بڑھ ہی
جاتے۔ میاں جی کی زندگی میں تو خود اماں جی کے پاس روپے پیسے اور ہر قسم
کی ہزاروں چیزوں کے تحفے ہی آتے رہتے تھے۔ وہ کوئی منہ سے تھوڑی
مانگتے تھے۔ جو رشوت ہوتی۔ لوگ ہزار منت و سماجت سے اپنے کام
نکلواتے تھے۔ اور خود ہی اپنی خوشی سے تحفے دیدے جاتے۔ اماں جی
سگھڑ گرہستی، ان دونوں میاں جی کی تنخواہ سے سہ چہار گنا روپیہ
جمع کرتی رہیں۔ بس ان کے پاس تو کچھ وہی جمع شدہ روپیہ، پھر میاں
جی کی وراثت کا حصہ اور اپنے والد کی دولت میں سے خود اپنے حصہ
کا روپیہ۔ نہ کہ اب تک بھانجیوں کا حصہ ہی پڑا ہوا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد امن و امان قائم ہو گیا۔ تو اماں جی دوبارہ بینک
میں روپیہ رکھانے پر آمادہ نہ ہو سکیں۔ کہ دو جانے کب کوئی برا وقت

آبیٹے۔ ایسے زمانہ میں تو پیسہ ہاتھ ہی میں اچھا۔" تاہم کمیشن کا انہیں قلق بھی تھا۔ یوں قرض مانگنے والے تو بہت آیا کرتے۔ مگر وہ کبھی پائی دینے کی بھی قائل نہیں ہوئیں۔ البتہ کسی بہت ہی معتمد شخص کی سخت ضرورت پر زیور وغیرہ رکھکر کچھ روپیہ دیدیا کرتیں تھیں بس خیال آیا۔ کہ یوں تو کمبخت لوگ زیور رکھ کر مدتوں روپیہ واپس نہیں کرتے۔ کہ چلو زیور حفاظت سے پڑا ہوا ہے۔ کون سا مول پورا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ پھر ہم ہی کیوں اتنا پیسہ قید کرا کے خسارہ اٹھاتے رہیں! آخر کیوں نہ کمیشن لگا دیا جائے۔ یہ لوگ روپیہ لے جا کر اپنی ضرورتیں پوری نہیں کرتے کیا! اور ہماری دولت کوئی ملّت کی ٹھیکر ہے "! پھر کیا تھا۔ اس پر عمل شروع ہو گیا۔ اور بینک کی شرح فیصد کے حساب سے کمیشن لگا دیا گیا۔ اور ہر غریب اور بیوہ عورت کو ضرورت کے وقت چھوٹے چھوٹے زیور رکھ کر روپیہ لے جانے میں آسانی محسوس ہوئی کون انہیں بینکوں سے لا کر دیتا ہے۔

اس جمعہ کے روز زیوروں اور کمیشنوں کا حساب کتاب ہوا تو سہیلہ بھی زیبت بیٹھی رہی۔ یہ حساب کتاب منجھلی بہو کے ذمے تھا۔ جلتی ہوئی دوپہر کا روزہ، پیاس سے اماں جی جاں بلب ہو گئیں۔ لینے دینے والی عورتوں کو بھی ماننے کیا سوجھی اس دن کہ موسلا دھار بارش کی طرح برس پڑیں۔ کچھ نے یشن ادا کر کے زیور چھڑائے۔ کچھ رکھانے آگئیں۔ دراصل شادیوں کا موسم تھا کسی کو روپے پیسے کی ضرورت تو کسی کو شادی بیاہ میں زیور پہن کر جانے کی ضرورت۔ پانچ سات کے تو کمیشن بڑھتے بڑھتے مول ہی پورا ہو چکا تھا۔ رکی بھنگن کی لڑکی کے بندے بھی کمیشن میں ہضم ہو چکے تھے۔ سہیلہ احساس دبا نہ سکی۔ اور عرض کی "اماں جان اپنی بھنگن سے تو کمیشن نہ لیا جائے؟" اماں جی نے مفتیانہ شان سے فرمایا "اے بہو تم جانو یہ غریب مذہب کے ہیں ان کا مال ہاتھ آئے تو جیسے (رفع) ہے۔ کہیں اور بندے رکھتی تو کمیشن نہ دیتی"! اسے محسوس ہوا کہ پہاڑ جیسے بوجھ تلے دبی چلی جا رہی ہو مرے ہی لمحے وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اماں جی کی نماز جمعہ بھی اس دن قضا ہو گئی۔ ان کے لئے یہ حادثہ بڑا جانکاہ تھا۔ جوں توں کر کے ظہر کی نماز ادا کی۔ اور پھر تلافی مافات کے خیال سے نہ معلوم کتنی رکعت نفل ادا کئے۔ گرمی کی تیزی سے پہلے ہی بھن رہی تھیں حساب کتاب کی کھکیر اور نوافل کی تھکاوٹ سے بس کچھ نہ پوچھئے کیا حال ہوا

وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی ہوئی کھولتی رہی۔ ادا مرد تو اہی کی پابندی بس یہیں تک۔ اس شکل وصورت میں! ہر طرح کے ناجائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کی تو کھلی چھٹی مل گئی ہو گی شاید! پیاس سے جان ہلکان ہوئی جاتی ہو پھر چند گھونٹ کمیشن پانی نہیں پیا جا سکتا کیا! یوں تو پیٹ میں بھی ہر نوالہ پاک و صاف کر کے ہی اتارا جاتے۔ ہزار چھان بین سے تو کہیں گندم پاک متصور ہو۔" ہوا یوں کہ ایک بار گندم بھی .... زیادہ مائی تاجن و دو چار عورتیں چھان پھٹک کے لئے بلا لائی گندم چھاننے والی بڑھیا کی بار بار ناک بہہ نکلتی۔ بڑھیا کبھی دائیں ہاتھ سے کبھی بائیں ہاتھ سے ناک صاف کر لیتی! اور پھر گندم چھاننے لگتی۔ اماں جی نے جو دیکھا تو جی بیزار ہو گیا ڈانٹ کر کہا "اے کمبخت بڑھیا۔ ناک صاف کرتی ہو تو ہاتھ دھو کر دوبارہ گندم کو لگایا کر ــــــ" بڑھیا بھی عجیب اناپ شناپ واقع ہوئی تھی وہ اماں جی کے مزاج کو کیا جانے۔ لاپرواہی سے بولی "بی بی جی ناک صاف کر کے کون چھانتے، پھٹکنے، پیسنے والے ہاتھ دھویا کریں ہیں۔ سوکھی جو ہے گی"! اماں جی کو غصہ آ گیا "کمبختوں پر خدا کی پھٹکار ــــ جانے یہ اجڈ لوگ کیسی کیسی گندگیاں ہمیں کھلاتے پلاتے دیتے ہیں"! بڑھیا کھوئی کھوئی سی ہو گئی۔ پھر کہنے لگی "بڑی بی بی جی ذرا کبھی کھلیان میں جا کر دیکھیے ہیں یا ڈنگر مویشی ہوتے ہیں گوبر کرتے ہیں ــــ سوکھی چیز ہے گی۔ اللہ میاں کی پاک دھوپ لگے ہے"! لیجئے اور انکشافات ہوتے۔ اماں جی کی طبیعت متلانے لگی۔ قے آتے آتے رکی جوں توں کر کے اندر کمرے میں پلنگ تک پہنچیں۔ پھر اس بات پر سوچنے کی انہیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ اب گندم دھلوا کر پسوائی جاتے گی۔ بیچیری میں جو ہو چکا۔ سو ہی کیا کم ہے مگر پیسنے والے بھی تو یہی لوگ ہیں جو بار بار ناک صاف کر کے ہاتھ دھوئے بغیر لگا دیتے ہیں۔ بالآخر اپنی نگرانی میں چکی میں آٹا پسوانے سے یہ مسئلہ حل ہو سکا۔

سہیلہ نے جس طرح اماں جی کے دوسرے حالات زندگی سن رکھے تھے اس طرح یہ بھی سنا ہوا تھا۔ دونوں بہوئیں اتنی کھکیڑ اٹھانے کو مانیں نہ، تو اماں جی نے صرف اپنے لئے اہتمام کر لیا تھا۔ اسی دن سے ایک عورت مقرر تھی۔ گندم دھلتی۔ دھوپ میں چارپائی پر دھلی ہوئی پاک چادر بچھا کر سوکھنے کے لئے ڈالی جاتی! اور پھر ململ کا پاک دھلا ہوا۔ دوپٹہ

ن دیا جاتا۔ تاکہ مکھیاں گندگی نہ لا ڈالیں۔ پھر نگرانی کے ساتھ چکی میں پسوائی
جاتی۔ پیسنے والی کو ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آتی تو نالی میں ناک
صاف کرکے اور ہاتھ دھو کر دوبارہ لگانے کا حکم تھا۔ اماں جی کا کھانا پکانے
میں بھی یہی احتیاط ملحوظ رکھی جاتی۔

آج پھر اسے احساس ہو رہا تھا کسی شریر لونڈے کے ہاتھوں
پر کیچڑ کے چھینٹوں کے پڑ جانے سے یہ بوکھلاہٹ۔ اتنی گھبراہٹ اور میدان
میں نکل گئی ہیں۔ ذرہ ذرہ سی گندگیوں اور غلاظتوں سے دامن کو بچائے رکھنے
کے لیے متنبہ کرتا رہتا ہے۔ خصوصاً اس گندے ماحول میں۔ جبکہ ذرا سی
بے احتیاطی اور بے خبری میں دامن ناپاک ہو سکتا ہے۔

سیڑھیوں کے قریب کھڑی کوئی عورت مائی تاجن سے کہہ رہی
تھی۔ یہ ہے اماں جی کی چھوٹی بہو ——— میری اونڈیا کہے تھی کہیں
چھوٹی بیگم گھر میں اکیلی ہوں۔ تو دور کنوئیں سے پانی نہیں لانا
نل سے کتنا پانی بھر لو وہ کچھ نہیں کہتیں۔ یہ اماں جی جو خفا ہوتی ہیں
ڈھیلا ہے۔ اور بڑی دونوں بیگمیں بھی اماں جی کے نام سے ڈرا دیا کرتی
ہیں اماں جی ہیں بڑی نیک۔ مگر"

بھنو ——— عزیزوں کا تو ہر زمانہ یہی حال رہا ہے"
بات سنے بغیر ہی جواب دیدیا "یہی تھوڑا ہے کیا کہ اماں اتنی نیک
پرہیزگار ہیں"

سہیلہ اپنے خیال میں کھڑی تھی۔ کہ اماں جی غسل خانے سے نکلتے ہی
کی والی دیوار پر دھوپ میں بکھرے ہوئے اپنے کپڑے دیکھ کر بوکھلا
اس نے آہستگی سے کہا "اماں جی الگنی پر تو آپکے پہلے ہی کپڑے بہت سیلے
ہیں۔ پھر وہاں دھوپ بھی بالکل نہیں رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ مائی
پر دیوار پر دھوپ میں ڈال آئیے"

"دے ——— بہو ——— اماں جی نے سر پکڑ لیا" تم نہیں
بیت الخلاء میں آتے جاتے کمبخت بھنگن اس دیوار پر روزانہ
مٹی آیا کرے ہے اسی لئے تو میں الگنی پر کپڑے ڈلواؤں کہ دیوار و
ناپاکی کا کیا اعتبار ——— جاؤ تاجن کپڑے اتار لاؤ۔ کھڑی
تکتی ہو"

مائی تاجن اوپر سے کپڑے اتار لائی۔ تو حکم دیا گیا "ان پر سے اچھی
طرح پانی بہاؤ ———" خود اماں جی الگنی پر سیلے کپڑے دیکھنے کو آگے
بڑھیں تو سہیلہ احساس کو دباتے ہوئے سیلے کپڑے کھسکانے لگی۔ تاکہ دھوپ
کپڑے ڈالے جائیں۔ دفعتاً اماں جی کی نگاہ الگنی پر مکھیوں کے فضلے پر
پڑی تو انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر سر پیٹ لیا "بس۔ بس۔ بہو۔ کافی
ہو چکی۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ اپنی نگرانی میں تو میں نے کبھی بھی الگنی صاف
کرائے بغیر کپڑے نہ ڈلوائے تھے۔ اب میں جانوں ——— میری بے
خبری میں اتنی بے احتیاطیاں؟ قہر خدا کا! یوں ہوتا رہا ہے۔ تو پھر تم
چیزوں کو بھی کہاں کلمہ پڑھ کر دھلائی ہی ہوگی۔ ہائے افسوس میری سستی
جانے ——— مجھے کیا کچھ کھلایا پہنایا جاتا رہا" وہ خاموشی سے وہاں سے
کھسک گئی ———

آہ! اوپر سے سفیدی پھری ہوئی قبریں اندر سڑی ہوئی ہڈیاں!

(بشکریہ "چراغ راہ")

بقیہ "غم دل۔ غم جہاں" صفحہ (۱۱):۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے بھائی جان۔ میں نے صرف
پونے سات آنے خرچ کئے ہیں" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا
یکایک یوسف کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے اُن بہت سارے سوالات
کا جواب مل گیا ہو۔ جو یونس کے جانے کے بعد اب تک اسکے ذہن میں آ رہے
تھے (بشکریہ "افکار")

شوکت تھانوی •

اپوا

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
مگر ہے شاعرِ رنگیں بیاں کا قافیہ تنگ

کہ یہ غریب تو شوہر ہے اور شاعر ہے
وہ لیڈرانی ہے اپوا کی بلکہ ممبر ہے

اسے ہے فکرِ سخن اور اُسے ہے قوم کی فکر
غرض کہ بچوں کا آنا نہیں کہیں بھی ذکر

یہ بچے وہ ہیں کہ جن کا نہیں ہے کوئی کفیل
کہ ماں ہے بحرِ رجز اور باپ بحرِ طویل

سیاسیات میں خدمت نے پائی یہ عظمت
سوائے اپنے ہی بچوں کے "مادرِ ملت"

نظر نہ آئے گی گھر میں کبھی یہ گھر والی
کہ اس کے پیشِ نظر قوم کی ہے بدحالی

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
یہ پرس اُٹھا کے چلی جس کی کوئی ساس نہ نند

نتیجہ یہ ہے کہ بچوں میں عین غین ہوں میں
کہ صرف باپ نہیں بلکہ والدین ہوں میں

ہر ایک بحر میں لوری انھیں سناؤں گا
یہ روتے جائیں گے میں گنگنائے جاؤں گا

کسی کے واسطے لاؤں گا دودھ کی شیشی
کسی کو گود میں لے کر بجاؤں گا سیٹی

کوئی جو گود میں چڑھ کر کرے بداخلاقی
تو اس سے عارضی صورت میں ہو گی ناچاقی

رہے گی ساتھ ہی فکرِ سخن مگر جاری
کہ شاعری تو ہے دراصل ایک بیماری

مگر کہے تو کوئی کس طرح کہے اشعار
بنے ہوئے ہیں یہ بچے نتیجۂ افکار

(بشکریہ حریم)

———— • • • ————

رقیہ علامہ خلیل عرب

تعدّد ازدواج

اسلام سے پہلے اور اب بھی ہر جگہ مردوں کو علانیہ اور چوری چھپے ناجائز تعلق رکھنے کے مواقع میسر آتے رہتے ہیں۔ سماج اگر اس طریقے کو پسند نہ کرے تب بھی مرد ذات کہہ کر تمام عیاشیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے نام نہاد متمدن ممالک میں تو آج بھی بعض جگہ ہوٹلوں دفتروں اور مخصوص پبلک مقامات پر ڈانس وغیرہ کی محفلوں میں روزانہ دوستیاں اور عیاشیاں ہوتی رہتی ہیں نوابوں اور بادشاہوں کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں حرم کے اندر اور باہر ان کی سینکڑوں ناجائز عورتیں اور ناجائز اولادیں موجود رہتی ہیں۔ [illegible] ہے کہ سگریٹ کیس کی طرح سامنے رہنے والی بیگم یا بیوی ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے پر دل بہلانے کا سامان ہر جگہ ملتا ہے اور کوئی انسانی طاقت اس پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ کنٹرول کرنے والی طاقت تو خود بھی خواہشات کا شکار ہے اور معاملے کے دوسرے پہلو پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ایک مرد کو قدرت نے اتنی طاقت اور استطاعت بخشی ہے وہ ایک سال میں اوسطاً ایک کی بجائے ۳ بیویوں کا شوہر بن سکتا ہے جب کہ عورت ایک سال میں دو بچوں کی ماں بننے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ ایسی صورت میں سوسائٹی کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ جب چوری چھپے لاتعداد بدمعاشیاں برداشت کر لیتی ہے تو بیویوں کی ایک اوسط محدود تعداد کو ناجائز کیوں قرار دیتی ہے!

کم استطاعت اور زیادہ مصروف مرد عموماً ایک شادی پر اکتفا کرتے ہیں زیادہ دولت مند اور تندرست شادی کی زیادہ خواہش رکھتے ہیں اور ایسی عورتیں بھی موجود ہیں جو شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن سوسائٹی کے ڈر سے چوری چھپے بداخلاقی کا شکار ہوتی ہیں۔

جس طرح مردوں کے حالات مختلف ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے حالات بھی یکساں نہیں ہوتے۔ (۱) عورتوں کی کثرت۔ (۲) جنگی حالات میں مردوں کی اموات (۳) اتفاقیہ بیوگی (۴) ناکام شادی (۵) موزوں رشتے نہ ملنے کی وجہ سے عورتوں کی ایک تہائی یا نصف تعداد مجرد اور معطل زندگی گزار دینے پر مجبور ہوتی ہے عموماً عورتیں ناکام شادی اور بیوگی کے بعد دوسری شادی پسند نہیں کرتیں پھر بھی سب یکساں نہیں ہوتیں تو یہی وجہ ہے کہ اخلاقی لغزشیاں زیادہ ہوتی ہیں طلاق والی اور بیوہ ناطاقتی کے باوجود روٹی کمانے کی زحمت گوارا کرتی ہیں۔ کیا حالات ایسے نہیں ہیں جن میں ایک سے زیادہ شادی کا جواز منظور کیا جائے بلکہ ہنگامی حالات کے لئے پہلی اور دوسری وجہ جو ہم نے بیان کی ہے اس کے تحت کثرت ازدواج کو روکنے کی بجائے کم از کم ایک محدود تعداد تک شادیاں کرنا قانوناً جاری کیا جائے۔ ورنہ عورتوں کی کثرت اور جنگ کے نتائج سے مردوں اور عورتوں کو اخلاقی و نسلی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تعدد ازدواج کی مخالفت عموماً عورتوں کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے شوہر کی محبت میں کسی اور کو شریک نہیں دیکھ سکتیں۔ اور یہ جذبہ مردوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے غیرت دار مرد اپنی بیوی کی طرف کسی اور کو محبت سے دیکھتے ہوئے دیکھ لیں تو اس کے لئے قتل سے کم سزا تجویز نہ کریں لیکن نتیجے تک پہنچنے میں اگر صبر و تحمل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرد کا یہ جذبہ عورت کے جسم و جان کی حفاظت کرتا ہے لیکن جائز تعلق کی صورت میں عورت کا یہ جذبہ ایک وقتی خوش فہمی ہے عورت چاہتی ہے کہ وہ مرد کو اس کے تمام منافع سمیت اپنے ہی لئے وقف رکھے اور اس کی ہم جنس سوت بن کر اس کے سامنے نہ آئے۔ لیکن وہ آنے کی سامنے نہیں آتی ہے۔ تو چھپ کر آتی ہے۔ بلکہ لانے والا لاتا ہے تب ہی وہ آتی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ جائز طریقے پر آتی تو منافع میں برابر شریک ہوتی لیکن چھپ کر آنے میں مرد کی محبت اور دولت بیدریغ برباد ہوتی ہے عورتوں کی طرف سے زیادہ شادیوں کی مخالفت کی دوسری اہم وجہ یہ ہو کہ ہزار مرد میں شاید ہی ایک ایسا ہو جو انصاف اور اعتدال پر قائم رہ سکے۔

عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ مرد دو بیویوں میں انصاف نہیں کرتے اور ایسی صورت میں کبھی پہلی بیوی اور کبھی دوسری کو اپنی توجہ التفات اور منافع سے محروم رکھتے ہیں جس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اسی کو جلانے ستانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی تدبیریں اختیار کرتے ہیں جس سے وہ غمگین رہتی ہے۔

اسلام میں ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمام مردوں کے لئے نمونہ ہے حضور اقدس تمام بیویوں میں انصاف فرماتے اور ان سے باعزت برتاؤ کرتے اور انہیں ہر طرح خوش رکھتے تھے امہات المومنین میں سے ایک نے دوسری کو یہودیت کا طعنہ دیا تو حضور نے تادیب کے طور پر طعنہ دینے والی سے عرصہ تک بات نہیں کی۔ ایک دفعہ قافلے میں چلتے ہوئے اونٹوں کی تیز رفتاری سے سواریاں گر گئیں صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھانے کے لئے بڑھے آپ نے خود اٹھتے ہوئے فرمایا پہلے عورتوں کا خیال دیکھو۔ حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ کی اثر انگیز آواز سے اونٹ تیز چلنے لگے۔ عورتوں کا خیال دلاتے ہوئے فرمایا ان نازک آبگینوں کے خیال سے اونٹوں کو آہستہ ہانکو حضور اپنی بیویوں کی تفریح طبع کا بھی خیال رکھتے تھے۔

حضور اقدس کی زندگی کا ہر عمل جب کہ انسانیت کا مایہ اور دین کی فطرت کا عملی درس تھا۔ تو چار سے زیادہ بیویوں میں بڑی انصاف کی بکثرت مثالیں دوسرے انسانوں کے لئے آسانیوں سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تمام انسانوں کو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ بلکہ سچ بات تو یہی ہے کہ اسلام نے نہایت موثر اور دلنشیں پیرائے میں مردوں کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے سے روک دینا چاہا ہے لیکن یہ کہہ کر نہیں منع کیا کہ ایک سے زیادہ بیوی نہ رکھو۔ بلکہ مردانہ نفس کی وہ گہرائیاں جہاں زیادہ شادیوں کی طلب کا طوفان اٹھتا ہے انہیں گہرائیوں پر دستک دیکر زوردار الفاظ میں یہ فرمان پہنچایا ہے کہ فان خفتم الا تعدلوا فواحدہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ بھی ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے۔ تو ایک ہی بیوی رکھو یعنی ایک سے زیادہ بیویاں رکھ کر بے انصافی کا وبال اٹھانا اور ظلم کر کے ہمیشہ کی دوسری زندگی میں بے چین رہنا انہیں حد سے گزرے ہوئے نادانوں کا کام ہو سکتا ہے جو ذرا سے فائدے کے لالچ میں نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے سے پہلے اپنا نفع و نقصان ہی سوچ لو ایسا تو نہیں کہ تمہیں اپنی طرف سے بے انصافی کرنی پڑے اگر تمہیں اپنی طرف ایسا گمان یہی ہے۔ تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک وقت میں ایک بیوی رکھنے کی ترغیب دیتا ہے اسلام نے ناجائز قطعی حرام قرار دیا ہے اس لئے ضرورت اور حالات کے تحت مردانہ نفس کے فطری تقاضوں کو تسلیم کرتے ہوئے ایک سے زیادہ شادی کو عدل سے مشروط کر دیا اسی کے ساتھ عورت کو مظلوم ہونے کی صورت میں چارہ کی اجازت دیدی ہے

اور ہم یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی حدیثوں میں عورتوں کے لئے زیادہ تر آسانیاں ملتی ہیں اس سے قبل زیادہ شادیوں کے بارے میں ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا مقصد یہ ہے:۔

(۱) افزائش نسل میں مردانہ استطاعت کا جائز حد تک لحاظ حقوق انسانی کی حفاظت کے مترادف ہے۔

(۲) جنگی حالات عورتوں کی کثرت اور دیگر ضروریات کے پیش نظر تعدد ازدواج کو قانوناً ممنوع قرار دینا معاشرہ پر ظلم ہے اور ایک فریق کی حق تلفی ہے۔

(۳) صرف تفریح طبع کے لئے غیر محرم عورتوں کے ملنے جلنے یا تعلق قائم کرنے میں عورتوں پر زد پڑتی ہے اور چونکہ بیوی کے سوا دوسری عورت سے ذرا بھی تعلق حرام ہے اس لئے عدل سے مشروط کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو عورتیں بھی اس میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔

"لوگو! اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیم لڑکیوں میں انصاف نہیں رکھ سکو گے تو اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب میں برابری کا برتاؤ نہ کر سکو گے تو اس صورت میں ایک ہی پر اکتفا کرنا یا جو لونڈی تمہارے قبضے میں آ جائے اس پر قناعت کرنا۔ نامنصفانہ برتاؤ سے۔ یہ تدبیر زیادہ قرین مصلحت

اور عورتوں کو ان کے مہر بخوشی دیدیا کرو۔ پھر اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ چھوڑ دیں تو اسے تم صرف کر سکتے ہو۔"

(سورہ نساء، پارہ چار)

اور لوگو! خواہ تم کتنی ہی کوشش کرو کہ کئی بیبیوں میں برابری کرو لیکن یہ تم سے نہ ہو سکے گا بالکل ایک ہی طرف نہ جھک کہ دوسری کو چھوڑ دو اور وہ لٹک رہے (معلق) اور اگر آپس میں موافقت کر سکو تو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے بچے رہو اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور اگر میاں بیوی میں اصلاح کی کوئی صورت نہ بن پڑے اور ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ (خزانہ غیب سے) دونوں کو بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کے ہاں بڑی گنجائش ہے اور اس کی تدبیر بڑی محکم تدبیر ہے (سورہ نساء پ ۵)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک نسلی و اجتماعی مفاد کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ انفرادی حقوق اور شخصی اخلاق و کردار کی کس قدر اہمیت اور کتنا لزوم ہے۔ اس لئے کہ فرد سے جماعت مبنی ہے اگر فرد کی نجی زندگی صاف و پاکیزہ نہیں ہے تو پوری قوم اور معاشرہ بھی قابل اعتماد نہیں ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سب انسانوں کے لئے نمونہ عمل ہے فرض کرو کہ دل میں ایک بیوی کی محبت زیادہ ہے پھر بھی وہ معاملہ برتاؤ مخاطبت لین دین میں کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا جس سے فرق ظاہر ہو ورنہ آخرت میں پکڑ ہوگی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اقدس اپنی بیویوں میں باری کی رعایت کرتے اور نوبت پر انصاف فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ خداوندا میری تقسیم ہے اس میں جس کا میں اختیار رکھتا ہوں تو مجھے اس چیز کے بارے میں آپ ملامت نہ کیجئے جس کا آپ اختیار رکھتے ہیں اور میں نہیں رکھتا۔

(ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی)

بیوی کے لئے رہنے کی جگہ کا انتظام کرنا شوہر کے ذمے ہے اور اگر میاں بیوی کے تعلقات خراب ہو کر طلاق تک نوبت پہنچے تو طلاق مکمل ہونے تک عورت کا حق ہے کہ اسے مرد کے مکان میں یا جو اس نے عورت کے لئے خوشگوار زمانے میں پہلے سے دیا گیا ہے اس میں رہنے دے اپنی طرف سے ایسی کوئی تدبیر بھی نہیں کر سکتا جس سے عورت کو تنگ کر کے اس کو گھر سے ہٹانے کی نیت معلوم ہو۔

مطلقہ عورتوں کو (عدت کے لئے) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہو۔ اور ان پر سختی کرنے کے لئے ان کو ایذا نہ دو۔ طلاق کے زمانہ میں عورت نے اگر علانیہ بدکاری کی تو مرد اس کو مکان سے نکال سکتا ہے (سورہ طلاق ع ۲۰)

(مسلمانو! عدت میں) عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں۔ مگر یہ کہ کھلم کھلا کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں تو ان کو نکال دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(بشکریہ "دعوت")

ابوالمجاہد زاہد •

پَرْدَہْ

مجھ کو بے پردہ نکلنے پہ نہ مجبور کرو

اے مرے ہمدم و دمساز رفیق دسرتاج
آپ کہتے ہیں کہ پردہ تو ہے فرسودہ رواج
میں سمجھتی ہوں کہ پردہ ہے خواتین کی لاج

شرم و غیرت کے کچلنے پہ نہ مجبور کرو

قدر نسوانیتِ زن کی انھیں کیا معلوم

اپنے جلوؤں کی نمائش پہ جو اترا تی ہوں
اپنی غیرت کو جو بازار میں لے آتی ہوں
خود ہوسناک نگاہوں میں الجھ جاتی ہوں

رنگ پاکیزگی حسن سے جو ہوں محروم

بے حجابانہ پھروں سیر گھوں میں تن کر

میرے دمساز! کبھی ہو نہ سکے گا ایسا
اپنی عفّت کو کروں خود ہی ذلیل و رسوا
دین فطرت کے تقاضوں کو بھلا کر توبہ!

میں بھی سڑکوں پہ چلوں "مردِ مونث" بنکر

اپنی خود داری و غیرت کو نہیں کھو سکتی
میرے سرتاج میں بے پردہ نہیں ہو سکتی!

(بشکریہ معیار)

ظفر رحیم

تصوّر سے خود کلامی تک

پرائیوٹ فرم کے مالک نے جب دفتر کے کلرک افضل قریشی کو "فول" بیوقوف کہا تو افضل نے اسے گدھا کہدیا۔ مالک نے فائل زمین پر پھینکدی ...پ شدہ اوراق چاروں طرف بکھر گئے۔ افضل نے بڑی بے نیازی سے دوسری طرف منہ اٹھالیا۔ اس لاپرواہی پر "مالک" نے نہ جانے کیا کہا کہ افضل ...ں کے ہینیٹر رسید کردیا۔ افضل کو اپنی نوکری کی کوئی فکر نہیں ہے۔ آخر ...ے پاس کرنا خالہ جی کا گھر تو نہیں۔ اس کی اس جسارت پر دفتر کے ...سے بابوؤں نے افضل کو سر پر اٹھالیا۔ وہ اوپر اٹھتا گیا۔ شور تیز ہوتا گیا ...تب ہوش آیا تو وہ سڑک پر اپنی سائیکل کے نیچے پڑا تھا۔ سڑک پر تیز ...کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ ایک دودھ والے گوجر سے بے خیالی ...الجھ گیا تھا۔ چار بج چکے تھے اور گنجے سر اور جھکی کمر والے بابوؤں کا تانتا ...ندھا ہوا تھا۔ افضل نے بڑی بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔ گوجر نے ...کے دبلے پتلے جسم کو بڑی حقارت سے معاف کردیا۔ اور بغیر کچھ کہے سنے ...بڑھ گیا۔ افضل نے سائیکل سنبھالی۔ کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ اگلے پہیے ...ہینڈل کو سیدھا کیا۔ اور آگے روانہ ہوگیا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے اس ...کانوں میں وہ گالی گونجی جو فرم کے مالک نے اس کے ذہن پر ثبت کر دی تھی۔ ...کسمساکر چپ چاپ اپنی میز کی طرف چلدیا تھا۔

تصور اور خود کلامی کے سنگم پر ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا بہت ...ن ہوتی ہے۔ اور انتہا کہاں ہوتی ہے۔ اس کے متعلق کوئی واقعی رائے ...رنا بہت مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ تصور کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ...بیٹھے بیٹھے غائب ہوجاتا ہے۔ صرف ایک ساکت صامت جسم رہ جاتا ...آنکھیں کسی ایک نقطہ پر جم جاتی ہیں۔ یہ نقطہ آپکے قلم کی نوک بھی ...ہے۔ اور ٹرنک پر رکھی ہوئی کتاب کا سرورق بھی۔ اور دماغ کے ...زے کھل جاتے ہیں تصویریں آہستہ آہستہ داخل ہوتی ہیں۔ اپنا اپنا ...میک اپ کئے اور رنگ برنگ لباس سجائے۔ یہ تصویریں بڑی ترتیب سے ...ے ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ ... مزے کا مکالمہ ادا کرتی ہیں ... کھیل شروع رہتا ہے۔ اور اپنے عروج کی طرف بڑھتا ہے! در اب خود کلامی کی ابتدا ہوتی ہے کہ یہ ساکت صامت جسم بھی ان تصویروں کے ساتھ آہستہ آہستہ اسٹیج پر آجاتا ہے۔ مکالمے شروع ہوجاتے ہیں۔ آواز اونچی ہوجاتی ہے اور ہاتھ ہلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ منہ بگڑنے لگتا ہے اور جب آپ کو ہوش آتا ہے تو قلم کا نب ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اور کتاب ٹرنک سے نیچے پڑی ہے جو لکھتا ہے کہ اس کا سرورق بھی پھٹ چکا پھر دنیا کی وہ ساری مسرتیں جو ہمیں حاصل نہیں ہوتیں تصویریں پکے آم کی طرح ہماری گود میں گر پڑتی ہیں اور دنیا بھر کی وہ باتیں جو ہم نہیں کرسکتے۔ وہ ساری خالص مغلظات جو آپ یا ہم اپنے آفیسروں کے منہ پر نہیں بک سکتے۔ خود کلامی میں لپٹی لپٹائی دماغ کے کسی کونے سے یوں پھسلتی چلی آتی ہیں۔ جیسے صابن ہاتھ سے پھسل کر غسلخانہ کے چکنے فرش پر گرتا ہوا بدرو میں جا پڑتا ہے اور آپ ٹاپتے رہ جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تصور اور خود کلامی کا لطف ہر ایک کو یکساں حاصل نہیں ہوسکتا۔

اگر کوئی قوم فخریہ یہ کہہ سکتی ہے کہ اس نے خود کلامی کی صنف کو ترقی دی ہے اور اس میں نئے نئے تجربات کئے ہیں تو وہ قوم کلرک ہے۔ قوم کے نام پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ قبل اس کے کہ صابن آپکے ہاتھوں سے نکل جانے میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار کردوں گا۔ کہ دنیا جہاں کی آبادی میں صرف تین قومیں بستی رہتی ہیں۔ یعنی فرم کا مالک، کلرک افضل اور دودھ والا گوجر، ویسے یہ دریافت نئی نہیں ہے۔ پچھلی صدیوں میں کئی ایسے بزرگوار قسم کے لوگ گذرے ہیں جو اپنی اس تلاش پر بغلیں بجا چکے ہیں اور بہت سے ایسے بھی گذرے ہیں جو بغلیں جھانک چکے ہیں۔ تو جناب کلرک بھائیوں نے اس صنف میں جو کمال حاصل کیا ہے وہ کسی طرح بھی انور کمال سے کم نہیں ہے۔

یہ لیجئے ایک صاحب آرہے ہیں شام کے وقت بچی بچائی سبزی سستے داموں خرید کر لئے جارہے ہیں اور بڑبڑاتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ اور ہاتھ

بھی پھینک رہے ہیں۔ خدا کے لئے یہ نہ سوچئے گا کہ یہ ابھی پاگل خانے سے رہا کئے گئے ہیں۔ نہیں نہیں! یہ میٹرک پاس، پانچ بچوں، ایک بیوی اور ایک عدد کلرکی کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ یہ سڑک پر چلتے ہوئے بڑبڑا نہیں رہے تھے بلکہ اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے

میں تجھ سے اور تیرے ان سپاہی بچوں سے تنگ آگیا ہوں۔ جو بغیر کسی تکلف کے لائن لگاتے چلے جا رہے ہیں۔"

بیوی نے کہا "شرم نہیں آتی .... دو سوکھی روٹیاں کیا کھلاتے ہو۔ حاتم کی قبر پہ لات مارتے ہو۔" "میں کہتا ہوں" دن بھر دفتر میں صاحب کی غلامی کروں۔ شام کو تمہاری ہنڈیا کے لئے ترکاری خریدتا پھروں۔ آخر یہ فوج کونسا درجہ شہادت حاصل کرنے کے لئے ریزرو کی جا رہی ہے۔"

"خدا کے لئے زبان کو لگام دو نہیں تو ناس ماری ترکاری چولہے میں پھینک دوں گی۔"

"تم تو مجھے بھی چولہے میں جھونک دو گی۔"

"میں کہتی ہوں۔ بکواس بند کرو۔"

"میں ..... یعنی میں بکواس کر رہا ہوں۔"

"تم چیل کی طرح چلا رہے ہو۔" "تم ..... تم۔" "تم ..... تم۔"

پھر یہ جو بوٹ کا ہاتھ انہوں نے ہوا میں چلایا تھا وہ دراصل ایک تھپڑ تھا بیوی کے گالوں کی خبر لانے کے لئے تھا۔ بیوی چلائی .... زدہ ہے .... جی نہیں یہ بیوی کی چیخ نہیں تھی۔ بلکہ ایک چیل تھی جو تھیلے گھونگھٹ سے گوشت کی ایک بوٹی کے چھال جہاں آرا کو دیکھ لا سہ اپٹی تھی۔ اور تھیلا مع سبزی اور گوشت کے سڑک پر روانگی رجسٹر کی طرح کھلا پڑا تھا۔ اور چیلیں چاروں طرف سے یوں اڑاتے لے رہی تھیں جیسے غالب کے دیوان سے یہ مصرع پڑھ آئی ہوں "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے۔"

لیکن آپ یہ نہ سوچیں کہ آخر خود کلامی سے متعلق ہی میں اتنی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔

بات یہ ہے کہ تصور کے بارے میں زیادہ کچھ عرض کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ غالب کے کسی مصرعہ پر غزل کہنا۔ میں شکر کرتا ہوں کہ خوش قسمتی سے میں شاعر نہیں ہوں اور بدقسمتی سے آپ غالب نہیں ہیں۔ ہم دونوں کے یکجا ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ آپ تصور کے معنی جس قدر جانتے ہیں مجھے اس پر قطعی اطمینان اور بھروسہ ہے۔ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہی خود کلامی۔ تو اس لنکا میں کیا جوان بوڑھے کیا جورو والے اور کیا کنوارے سب باون گز کے ہیں۔ شرط صرف درجہ کی ہے۔ ان سے ملئے۔ یہ کنوارے ہیں۔ نک سک سے درست، رنگ امریکی، چال افریقی۔ بال دلیپ کمار اور پتلون راج کپور، دل لارڈ بائرن اور تمنائیں واجد علی شاہ۔ ڈبیا گولڈ فلیک سگریٹ کی تار کی کرسی پر بیٹھے ہیں اور سگریٹ کے غلیظ دھوئیں میں اپنی امی محبوبہ کے لئے سوچ رہے ہیں جسے بیوی بنانے کا ارمان ہے۔ وہ ان سے باتیں کر رہی ہے۔

"ذرا اس ریڈیو کا سوئچ آن کر دیجئے۔ فرمائش ہونے والی ہیں...

میں نے بھی ایک فرمائش بھیجی تھی۔ اپنا نیا دوست ریڈیو کا سوئچ صرف دو انگلیوں سے آن کر دیتا ہے۔ دارجلنگ چائے کی ایک چسکی لے کر دو نیچے ایرانی قالین پر رکھی ہوئی فروٹ کی میز رکھے ہوتے ایش ٹرے میں "بلیک کیسل" کے سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہے۔ ریڈیو گرم ہو رہا ہے۔ فرمائش شروع ہو رہی ہے !

"میں نے کہا وہ سندے پھر نہ بک جائیں! آپ نے کل رات بھی وعدہ کیا تھا" سگریٹ ایش ٹرے میں یہ احتیاط محفوظ کر کے رات کے وعدہ کی رات کی روشنی میں، رات کی طرح تجدید کر دی جاتی ہے۔

"کل ضرور لا دوں گا۔"

"بھولئے گا نہیں۔"

"کمال ہے۔ تمہارے ان خوبصورت ہونٹوں سے نکلی فرمائش کبھی یونہی رہ سکتی ہے۔" دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

"اچھا اب ہمیں اس طرح نہ گھوریئے۔"

"دراصل تم اتنی حسین ہو کہ .... میں کیا کہوں یہ تمہارا دودھ جیسا جسم اور یہ عنابی ہونٹ ...... " سگریٹ سلگ رہا ہے اور دھوئیں کی لکیروں میں ایک بھرپور جسم جنم لے رہا ہے۔

"تم کتنی اچھی ہو .... ہمارا یہ چھوٹا سا مکان کتنا اچھا ہے یہ پھول .... یہ چاند۔ اور تم ... دنیا کتنی پرسکون ہے۔"

پرسکون دنیا میں ایک پتھر گرتا ہے۔"

"بابو جی پیسے۔"

"ایں؟"

"پیسے بابو جی اب تو آپ اس سڑک سے بھی نہیں گزرتے۔"

"یہ .... وہ ...... میں ..... بات یہ ہے میں
ور چلا گیا تھا ...... آج ہی لائل پور سے آیا ہوں ......
روز اور صبر کرو۔"

"اب کہ نہ لائل پور چلے جانا ورنہ پھر مجھے لائل پور بھی جانا پڑے گا
دو اور چار چھ روز کے بعد آ کر لے جاؤں گا" پیسے لے جانے پر زور دیتا
کا اندر چلا جاتا ہے۔ اور آپ یقین کریں کہ اپنا ہیرو دونوں ہاتھ چھوڑ کر
دل سے دعا مانگتا ہے۔

"یا اللہ پاک ..... یا میرے مولا زیادہ نہیں صرف ایک ہزار
ہزار نہیں تو پانچ سو ہی دلا دے .... بس یہ معمہ بالکل صحیح
تو پچاس روپے غریبوں میں مفت بانٹ دوں گا ....
پانچ سو دلا دے .... یہ شمع معمہ خالی نہیں جاتے میرے
" سجدے میں گر پڑتا ہے۔ خضوع و خشوع سے دعا مانگنے کے بعد
روپیہ میں اپنا قلم بیچتا ہے اور ایک روپیہ کسی دوست سے ادھار
اور ڈھائی روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شمع معمہ دہلی روانہ کر کے وہ
کا منتظر ہو جاتا ہے۔ معجزے جو اس سرزمین پر نہیں ہوتے بعض
کاٹیاں معمہ حل کرنے والے معمہ اور معجزے کی لفظی بازیگری سے یہ
کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر معجزہ ہو سکتا ہے۔ تو معمہ سے
نہیں۔

بہرحال مجھے اس بازیگری کے متعلق زیادہ کچھ علم نہیں میں تو صرف
تا ہوں کہ خود کلامی بڑی عجیب و غریب شے ہے۔

ہزاروں مسئلے چٹکیوں میں حل ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کی
ندگی کے چٹیل لق و دق میدان میں چند امیدوں کے پھول کھلتے ہیں
دل کے جھرنے رواں ہو جاتے ہیں۔ دل کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو سکون
افضل قریشی کے مالک کا مسئلہ بالکل الگ ہے یہ مالک اسی قسم کے
کی طرح اس کیوپڈ کے تیروں کا شکار بہت کم ہوتا ہے۔ اگر کبھی سٹہ میں

نمبر غلط ہو گیا۔ یا ریس میں بجائے "ہولٹ" کے "ہر دم بہار" اول آ گیا، یا ریس کے
بنگلہ والے نے ساتویں شادی کر لی تو تھوڑی دیر کے لئے یہ کیفیت پیدا
ضرور ہو جاتی ہے جو اپنی انتہا کو نہیں پہنچ جاتی۔ اور اگر پہنچتی ہے تو اس
میں وہ زندگی نہیں ہوتی جو افضل صاحب محسوس کرتے ہیں۔ رہا گوجر کا
معاملہ تو بقول سعادت حسن منٹو مرحوم بڑا ظالم معاملہ ہے۔ ایک مرتبہ ہوا یوں
کہ گوجر بھائی کے دودھ کے روپے سونار روڈ کے ۲۲ نمبر کوٹھی والے ٹھیکیدار کی طرف
بہت نکل گئے۔ روپے کچھ اس قدر آگے نکل گئے کہ گوجر گر دپلے کے لئے کوٹھی کے
دروازے پر ٹھہر گیا۔ نوکروں نے بہت کہا کہ ٹھیکیدار بہت ظالم ہے جان بچا کر
لے جاؤ تمہارے دو ایک مرتبہ پیسے مانگنے پر وہ پہلے ہی چڑھ گیا ہے
دو ایک سال ٹھہر جاؤ الکشن میں کامیاب ہو گیا تو چڑ دور ہو جائے گی تب
روپے لے جانا۔ ہمارے افضل صاحب ہوتے تو اپنے چھوٹے سے دبلے پتلے
جسم پر نظر ثانی کرتے اور گھر واپس آ کر پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے ٹھیکیدار کی
وہ خبر لیتے کہ خود کلامی کا حلیہ بگڑ جاتا۔ لیکن معاملہ گوجر کا تھا وہ دروازہ پر
کھڑا رہا پھر وہیں زمین پر یوں بیٹھ گیا جیسے قالین بچھا دیا گیا ہو جب
پورے دو گھنٹے گذر گئے اور کوئی بھی اس کی مزاج پرسی کو نہیں آیا تو گوجر
نے سامنے پنواڑی سے دو پیسہ کا سگریٹ خریدا اور واپس آ کر پھر وہیں بیٹھ
گیا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر دروازہ کھلا اور ٹھیکیدار کی کار سڑک پر پھر
سے اڑ گئی۔ وہ چپ چاپ گھر واپس لوٹ گیا۔ دوسرے روز وہ آیا اور
چپ چاپ اندر چلا گیا یعنی ڈرائنگ روم میں جہاں ٹھیکیدار چند نئے
ٹنڈروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے اسے بدتمیز اور الو کا پٹھا کہا گوجر نے
کہا گالیوں سے بات نہ ہو تو بہتر ہے۔ ٹھیکیدار اندر گیا گوجر اسی طرح کھڑا
رہا اور پیسہ مانگنے پر حسب معمول اس نے گوجر کو بیٹی کی بھی گالی دی۔ اور
تب تک نوکر آئیں آئیں ٹھیکیدار کا منہ ٹیڑھا ہو چکا تھا قمیص پھٹ چکی
تھی اور اس کے سامنے کے دو دانت پالش شدہ میز پر پڑے تھے اور قریب
میں ٹھیکیدار کی تصویر فریم میں جڑی دانت نکالے ہنس رہی تھی اور وہ خود
کٹے ہوئے بھینسے کی طرح قالین پر پڑا چیخ رہا تھا۔ پولیس آئی اور گوجر کو تھانے
لے گئی اسے روپیہ وصولی کے اس نئے طریقہ کی ایجاد کے انعام میں سال بھر
کی قید بامشقت ہو گئی۔ کہتے ہیں جب وہ ایک سال کی مہمان داری سے
فراغت پا کر واپس نکلا ہے تو سیدھا سونار روڈ کوٹھی نمبر ۲۲ پہنچا اور اپنے

ذرا سے پہلے روپے ادا کر دیے گئے۔

تھوڑا سا نہیں بلکہ بہت واضح قسم کا فرق ہے جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ ذاتی طور پر میں تصویر اور خود کلامی کی اس صنف کا عاشق ہوں۔ اس لیے سستا اور دلخوشکن عشق بیسویں صدی والے ایٹم بم کے اس دور میں ملنا بہت مشکل ہے۔ میں خود کلامی اور تصویر کو زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری خیال کرتا ہوں جتنا آپ فاؤنٹن کے لئے سیاہی کو اور جوار کی روٹی کے لئے سرسوں کے ساگ کو......آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ میں نے افضل صاحب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور یوں جانبداری کا شکار ہو گیا ہوں۔ دراصل افضل صاحب کے متعلق مجھے کچھ زیادہ ہی علم ہے۔ مالک کے متعلق میری معلومات اتنی ہی ہیں جتنی آپ کی بالم کے جوتوں کے متعلق اور گوجر بیچارہ......میں نے آجتک صرف دودھ پینے پر قناعت کی ہے اور وہ بھی چائے میں۔ دودھ دوہنے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

(بشکریہ "امروز")

شمیم جاوید •

ماحول

یہی بے باک دوشیزہ جواب اٹھلا کے چلتی ہے
بہت معصوم تھی کل تک، بہت نادان تھی کل تک

سلیقہ بھی نہ تھا اس کو کتابیں لیکے چلنے کا
یوں ہر ہر گام پر انداز سے پہلو بدلنے کا!
نہ ہونٹوں پہ لپ اسٹک تھی، نہ رخساروں پہ غازہ تھا
بھلا کیا زندگی تھی اس کا ہر انداز سادہ تھا
دوپٹے کو نہ ڈھلکاتی تھی یہ رہ رہ کے سینے سے
کبھی خوشبو نہ آتی تھی لونڈر کی پسینے سے
اسے آتا نہ تھا بے باک فقروں کو سمجھ لینا!
سیہ برقعہ میں یہ ملبوس زندہ لاش تھی گویا
نہ باتوں میں لگاوٹ تھی، نہ چہرہ پر تبسم تھا
نہ اس کا کوئی ساتھی تھا، نہ اسکا کوئی محرم تھا
نظر نیچی کیے اکثر گذر جاتی تھی راہوں سے
بھلا کب باخبر تھی گرم نظروں سرد آہوں سے
بہت معصوم تھی کل تک بہت نادان تھی کل تک

اسے کب تھی خبر کہ کوئی کالج کا جواں لڑکا
تعاقب میں ہمیشہ اسکے گھر سے ساتھ چلتا ہے
اسے کب تھی خبر کیوں موڑ پہ موٹا سا حلوائی
ہمیشہ دیکھتا ہے اس کو جب بھی ہات ملتا ہے
یہ نغمہ سے واقف تھی، نہ نغمہ کے تاثر سے
اس ہوٹل کے مالک سے جو اکثر دیکھ کر اس کو
گراموفون پر فوراً یہ نغمہ چھیڑ دیتا ہے

"محبت کرنے والوں کا تڑپنا کس نے دیکھا ہے"

سر بازار دیواروں پہ بازاری حکیموں کے
یہ کب واقف تھی، خفیہ اور رنگیں اشتہاروں سے
نہ یہ نقاد تھی فلموں کی اور نہ ڈانس کی ماہر
اسے کچھ مس نہ تھا تہذیب حاضر کے اداروں سے
بہت معصوم تھی کل تک بہت نادان تھی کل تک

○

مگر ہر گام پہ بے باک و آوارہ جوانوں نے
ہر اک ہوٹل سے اٹھتی فلم کی رنگین تانوں نے
کئی کالج کے لڑکوں نے، کئی رنگیں فسانوں نے

دوکانوں، ہوٹلوں کے مالکوں نے اشتہاروں نے
کبھی فلمی نمائش نے، کبھی مینا بزاروں نے
کبھی کچھ بیگموں کے نیم سرکاری اداروں نے
لپ اسٹک، پاوڈر، موباف، لہراتے غراروں نے
اسے بے باک کر ڈالا!
اسے چالاک کر ڈالا!
بہت معصوم تھی کل تک
مگر عیّار ہے اب تو!
نئی تہذیب کا اک جاگتا شہکار ہے اب تو
یہی بے باک دوشیزہ جواب اٹھلا کے چلتی ہے

○

عمرانؔ انصاری •

(جو سمجھ لے اس کے نام)

امیروں میں رہ کر غریبوں کے شاعر، غریبوں کا خونِ جگر بیچتے ہیں
یہ دلاّلِ ناداں، بھری انجمن میں حسینوں کا حُسنِ نظر بیچتے ہیں!
نہیں آج دُنیا میں بردہ فروشی تو کرتے ہیں یاروں میں جلوہ فروشی
کہ خود حسنِ یوسف کو بن کر زلیخا یہ کہیئے بنوعِ دگر بیچتے ہیں!!
یہ جنسی مریضوں کی چارہ گری کو سناتے ہیں غزلوں میں جنسی فسانے
کہ عُریاں مضامین سے ورغلا کر خود اپنی ہی زُلف و کمر بیچتے ہیں!
اترتے ہیں فطرت کی گہرائیوں میں تو کرتے ہیں فطرت سے بھی سودے بازی
نوائے سحر، رونقِ ماہ و پرویں، نہیں بیچ سکتے، مگر بیچتے ہیں!
عوامی تلاطم کا لے کر سہارا، بہاتے ہیں اپنے مقاصد کا دھارا
دکھاتے ہیں ہاتھوں کی ایسی صفائی، خذف کو بجائے گہر بیچتے ہیں!
یہ پہلے ہی بازارِ عقل و خرد میں، لگے ہاتھوں عشق و جنوں بیچ آئے
بچی تھی خودی تو خدائی کے ہاتھوں خودی کو بھی المختصر بیچتے ہیں!
یہ ہیں چند مٹھی بھر انسان لیکن کیا کرتے ہیں سارے عالم سے چندے
کہیں سے سفر خرچ کرتے ہیں حاصل، کہیں جا کے زادِ سفر بیچتے ہیں!
یہ مزدور مزدور کی رٹ لگا کر خود اپنی نظر سے گراتے ہیں خود کو
کہ سستی سی شہرت کے سِکّوں کی خاطر متاعِ گراں دربدر بیچتے ہیں
بزرگوں سے کرتے ہیں بیزار سب کو مٹاتے ہیں اپنے ہی شعر و ادب کو
بہر گام انسان کا نام لے کر، یہ انسانیت کی ڈگر بیچتے ہیں
بس عمرانؔ ان کو کبھی ان سے ہٹ کر تماشائے اہلِ ادب دیکھتا ہوں
اگر مجھ کو غم ہے تو اتنا ہی غم ہے کہ جنسِ ہنر، بے ہنر بیچتے ہیں

ایم میرزا

ہاتھی کے دانت

اس سب ڈویژن کا اختر پہلی دفعہ معائنہ کرنے آیا تھا۔ ڈویژن
ں تبدیل ہوکر آتے ہوئے اسے ابھی زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ کام بہت
ڈنگ پڑا ہوا تھا۔ دوسرے اس نے اس نئے ماحول کو ابھی اچھی طرح
کھا نہ تھا اس لئے اسے آتے ہی سب ڈویژن کے معائنہ کا وقت نہ ملا
تھا ـــــ اسٹینو نے پہلے اطلاع بھیجدی تھی۔ اور وہ اختر کے
کم کا منتظر تھا اسٹینو کے بار بار یاد دلانے پر اس نے وقت نکال ہی لیا
ٹینو کا خیال تھا کہ وہ صبح کی پہلی گاڑی سے اختر کے ساتھ ہی سفر کریگا
اختر نے اسے اپنے پروگرام کا حال نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اسے
سب ڈویژن میں ہی ملے۔ اس کے بعد اس حکم سے اسٹینو کو حیرانی ہوئی
یہ کیسے صاحب بہادر ہیں۔ نہ اپنی رہائش کے متعلق مشورہ کیا ہے اور
ورنہ مجھ سے وہاں کے ماحول کے متعلق زیادہ پوچھ گچھ کی ہے
بھی نئے آئے ہیں نا ـــــ اسی لئے ذرا کھچے کھچے سے رہتے ہیں خیر
ئی بات نہیں ـــــ سب ڈویژن کا عملہ خاطر و مدارات کرنے میں بہت
مشہور ہے۔ صاحب بہادر کی آنکھیں کھل جائیں گی۔" اس نے صبح
کی گاڑی سے جانے کا ارادہ کرلیا۔ ـــــ اختر ایک با اصول
دمی تھا۔ وہ ناجائز طور پر دوسروں پر دباؤ ڈال کر اغراض پوری کرنے
روادار نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ اپنی خاطر تواضع کے عوض دوسروں
کوتاہیوں کو نظر انداز کردے۔ وہ شام کی ٹرین سے سوار ہوگیا۔ راستے
میں اس نے جانچ پڑتال کا ایک خاکہ بنالیا تھا۔ اور اس کے تحت اس
معائنہ کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اسٹیشن پر اتر کر وہ بیگ پکڑے باہر
آیا۔ اسٹیشن کے آس پاس کی چند دکانیں کھلی تھیں اور بازار بند ہوچکے
ے۔ ایک کوچوان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔ کوچوان نے
آکر پوچھا: "حضور ٹانگہ چاہیئے" اختر نے پوچھا "کیا یہاں شریف
لوگوں کے ٹھہرنے کی کوئی جگہ ہے؟" کوچوان خوشامدانہ لہجے میں بولا

"کیوں نہیں حضور! متین ہوٹل اپنی شرافت کی وجہ سے بہت مشہور
ہے۔ ایک بار وہاں قیام کرنے سے کبھی بھی اس کی یاد بھلائی نہیں جاسکتی
عموماً شریف لوگ وہیں پر ٹھہرتے ہیں۔" کوچوان کے لہجے میں ایسی بناوٹ
پیدا ہوگئی تھی۔ جیسے وہ متین ہوٹل کا ایجنٹ ہو ـــــ اختر پچھلی
سیٹ پر بیٹھ گیا ـــــ کوچوان نے گھوڑے کی پیٹھ کو تھپتھپایا
اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں سنسان بازار میں قہقہوں کی طرح
بکھرنے لگیں ـــــ بڑے چوک میں ٹانگہ رک گیا۔ اختر نے نظریں اوپر
اٹھادیں۔ سامنے دو منزلہ بلڈنگ کی پیشانی پر بجلی کی روشنی میں متین ہوٹل
کے سیاہ حروف چمک رہے تھے۔ ٹانگہ سے نیچے اتر کر اختر نے کرایہ ادا کیا
اور ایک بار پھر نظریں اٹھا کر بورڈ کی طرف دیکھا "متین ہوٹل اینڈ
ریسٹورنٹ ـــــ شرفا کے لئے بہترین قیام گاہ۔" اختر مطمئن انداز
سے اندر داخل ہوا۔ ہوٹل کا عملہ تھک کر آرام کر رہا تھا۔ منیجر کو جگایا گیا
اور دوسری منزل پر کمرہ نمبر ۵ اختر کو دکھایا گیا۔ کمرہ خوب صورت فرنیچر
سے سجا ہوا تھا۔ اختر نے کمرہ پسند کرلیا۔ اور لباس تبدیل کرکے مسہری پر
لیٹ گیا۔ نیند سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ اونگھ ہی
رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نیم خوابی کی حالت میں اختر نے
اس آواز کو خواب کا دھوکا سمجھا۔ کسی نے زور سے دروازہ پر ہاتھ مارا۔
اور اختر نے آنکھیں کھولدیں۔ اسے ایک نسوانی مخمور آواز سنائی دی۔
"رضی ڈارلنگ اتنی جلدی سوگئے۔ ابھی تو ایک بجا ہے"
اختر کی پیشانی پر بل پڑگئے۔ اس نے اٹھ کر بتی جلائی۔ دروازہ کھولا۔
اور بدبو کا تیز بھبکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا۔ ایک خوبصورت نوجوان
عورت نیم برہنہ بھڑکیلے لباس میں دروازہ پر کھڑی تھی۔ اختر کو دیکھکر
اس نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا: "اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ آج ہی یہاں
آئی ہوں۔ اس لئے غلط دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آپ کو بہت تکلیف

اٹھانی پڑی ہی" کوئی جواب دیئے بغیر اختر نے دروازہ بند کر دیا۔ اسکی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ بجلی بجھا کر جب وہ لیٹا۔ تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک غیر محفوظ مقام پر پڑا ہو۔ اور ہر لمحہ کسی انجانے خطرے کا ڈر ہو ———— نیند اس کی پلکوں پر ناچ رہی تھی لیکن ایک عجیب سی الجھن نے اسے گھیر رکھا تھا۔ رہ رہ کر اسے بدبو کا خیال آ رہا تھا۔ ہوٹل کی پیشانی پر چمکتے ہوئے سیاہ حروف اندھیرے میں اسے انگاروں کی مانند دہکتے نظر آ رہے تھے ———— صبح اس کا جی چاہا کہ منیجر سے رات کے واقعہ کا ذکر کرے۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ اس نے سوچا "ہو سکتا ہے۔ میرا قائم کیا ہوا نظریہ غلط ثابت ہو۔ اور وہ عورت واقعی ایسی نہ ہو۔" ———— منیجر کے چہرے پر پر وقار سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے بے قاعدہ باتوں کے لئے اس کے پاس ذرا بھی وقت نہ ہو۔ شرفاء کی قیام گاہ میں فضول باتوں پر دھیان بھی تو نہیں دینا چاہیئے

اختر تانگے پر سوار ہو کر سب ڈویژن پہنچ گیا۔ اس کے یوں وقت پہ پہنچنے کا کسی کو وہم تک نہ ہو سکتا تھا۔ سب ڈویژنل آفیسر کا خیال تھا کہ پہلے صاحب بہادروں کی طرح اختر یا تو صبح کی ٹرین سے سوار ہو گا۔ اور یا کوئی پہر بارہ بجے کے قریب آئے گا۔ مگر اختر کے پورے وقت پر پہنچ جانے سے رحمان کچھ گھبرا گیا تھا۔ چپڑاسی نے جب اسے کوٹھی پر اطلاع دی۔ تو حیران رہ گیا۔ جلدی سے دفتر میں آیا۔ اور مجرمانہ انداز سے اختر کے سامنے بیٹھ گیا ———— اختر نے حاضری کا رجسٹر پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپکے دفتر کا وقت شاید گیارہ بجے ہے۔ ابھی میں نے آرڈرز کی فائل کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ اسی لئے میں جلدی پہنچ گیا ہوں!" رحمان اس طنز سے اور زیادہ گھبرا گیا۔ اسے اختر ایک عجیب انسان نظر آیا۔ بات کا رخ پلٹنے کی خاطر اس نے چپڑاسی کو چائے لانے کے لئے کہا۔ اختر بولا۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں چائے ہوٹل سے پی کر آ رہا ہوں ———— اور ہاں ———— کیا میرا اسٹینو پہنچ چکا ہے "۔ "جی نہیں"۔ رحمان نے دھیمی آواز میں کہا۔ اختر نے حاضری کا رجسٹر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ اس کے آنے تک میں ضروری کاغذات کا خود ہی معائنہ کر لوں گا"۔ رحمان اٹھ کر اسٹاف کے کمرے کی طرف گیا۔ ریکارڈ کیپر ابھی تک نہ آیا تھا۔ رحمان کو اس پر غصہ آگیا۔ کمبخت کو میری عزت کا ذرا بھی پاس نہیں ———— مجھے فائلوں کا بھی یاد نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ سب ڈویژن کا انچارج ہوتے ہوئے بھی میں معمولی باتوں کو یاد نہیں رکھ سکتا۔" ———— غصے سے دانت کچکچاتا وہ اختر کے پاس آ گیا۔ اس کے ریک میں فائلوں کا ڈھیر لگا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ وہاں پڑی رحمان کی توجہ کی منتظر تھیں۔ اختر نے کمرے کا جائزہ لیکر پوچھا "اس سب ڈویژن میں کام زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے آپ کو!" "— الفاظ رحمان کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ اب اسے اسٹینو پر غصہ آیا جس نے اسے بروقت اختر کی عادات کا حال نہ لکھا تھا۔ پہلے صاحب بہادر عموماً یہاں پہنچتے ہی ساتھ کوٹھی میں چلے جاتے تھے۔ چائے کھانے سے فارغ ہو کر چند منٹوں کے لئے دفتر میں آتے تھے۔ رحمان کے ٹیلیفون کرنے پر شہر کے کئی معزز لوگ آ جاتے تھے۔ ان کے پروگراموں سے صاحب بہادروں کو معائنہ کا وقت ہی ملتا تھا۔ اسٹینو کے خود ہی رپورٹ مرتب کر کے دستخط کرا لیتا تھا۔ بات ختم ہو جاتی تھی۔ مگر اختر نے خلاف توقع آتے ہی چائے پینے ضروری کاغذات دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اور رحمان ایک نئی الجھن میں پھنس گیا تھا ———— اختر ریک میں رکھی ہوئی فائلوں کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ اور متحیر لہجے میں پوچھا "بہت فائیلوں پر آپنے ابھی تک کوئی ریمارکس نہیں دیئے۔ بہت دنوں ان پر کوئی ایکشن نہیں ہوا۔ کیا آپ بیمار تو نہیں رہے۔" "جی ہاں کچھ دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بیماری کی حالت میں کام کرتا رہا ہوں"۔ رحمان نے اس بہانے کو ایک کارآمد سہارا سمجھا "بہت خوب محنتی افسروں کے لئے ترقی کے بہت امکانات ہیں!" رحمان نے بناوٹی لہجے میں کہا "آپ جیسے بزرگوں کی نظر عنایت کی ضرورت ہے" ———— اختر نے ایک فائل کے اوراق الٹتے ہوئے پوچھا "کب سے آپ یہاں پر ہیں!" "تقریباً دو برس سے"۔ اوہو۔ دو برس ———— اہل شہر سے خوب دوستی پیدا ہو گئی ہو گی۔ اتنے لمبے عرصے میں۔ آپنے محکمہ کے وقار کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔ رحمان خاموش رہا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اختر کی نظریں اسکی

طرح اس کی زندگی کے تمام زاویوں میں گھوم رہی ہیں ـــــ اس
گھنٹی بجائی۔ چپڑاسی کے اندر آنے پر اس نے کہا:" ریکارڈ کیپر کو بلالاؤ"
ریکارڈ کیپر آگیا تھا۔ اور وہ بھی بہت سہما ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے وہ کمرے
داخل ہوا۔ رحمان نے اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر کہا
بانہ گوشواروں۔ اور اخراجات کی فائلیں لے آؤ۔" اور پھر ریکارڈ
کے ساتھ خود بھی باہر آگیا۔ اس کے کمرہ میں آکر اس نے اسے دبی آواز
خوب ڈانٹا۔ ریکارڈ کیپر کے لئے اس کا رویہ حیران کن تھا ـــــ
کے باہر ایک ٹانگہ کھڑا ہوگیا۔ اسٹینو کو نیچے اترتے دیکھ کر رحمان لمبے
ڈگ بھرتا۔ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اسے سراسیمہ دیکھ کر اسٹینو نے پوچھا
رحمان صاحب خیریت تو ہے؟" رحمان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا
صاحب بہادر پورے وقت پر پہنچ گئے تھے۔ عجیب طبیعت کے
ہیں۔ جب سے آتے ہیں ایک بات بھی ڈھنگ سے نہیں کی"ـــــ
ہوئے تسلی دی رحمان صاحب۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں شکل
ایسی ہے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔"
اس سے رحمان مطمئن نہ ہوسکا ـــ اس کے اندر چھپا ہوا چور اسے
خوفزدہ کررہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا رحمان نے انتظام کیا تھا
اختر نے اسے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ وہ کھانے اور رہائش کا الاونس
ہے اور کوئی ناجائز قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ـــــ اختر کھانا
نے کی خاطر ہوٹل میں آگیا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے وقت اچانک
کی نظر دروازے کے دائیں طرف لگی ہوئی ساگوان تختی پر پڑی۔ جس
پر جلی حروف میں لکھا تھا "کسی فاحشہ عورت کا ہوٹل میں لانا منع
ہے" ـــــ بہت خوب۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے" ـــــ
اسے یقین ہوگیا کہ رات کو واقعی اسے دھوکا ہوا تھا۔ اس نے کمرہ
میں ہی کھانا منگوالیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ نیچے اتر رہا تھا کہ سیڑھیوں
پر رات والی عورت کا سامنا ہوگیا۔ وہ اوپر آرہی تھی۔ اس کا لباس
لیلا اور جاذب نظر تھا۔ اس عورت نے اختر کو دیکھ کر نظریں جھکالیں
ایک طرف ہوکر کھڑی ہوگئی۔ اختر کو اس کے اس انداز سے یوں محسوس
ہوا جیسے اس عورت نے اسے پہچان کر ندامت کے تلخ احساس سے
شرافت کا ثبوت پیش کیا ہو۔ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے مسور کن
خوشبو سے اس کے جذبات میں ایک گدگدی سی پیدا ہوئی۔ آخری
سیڑھی پر پہونچکر یونہی اس نے اوپر نگاہ کی۔ وہ عورت مسکرا رہی تھی۔
اختر واپس سب ڈویژن میں آگیا۔ وہ آج ہی معائنہ ختم کرنے کا ارادہ
رکھتا تھا۔ کوئی کام بھی اسے درست نہ معلوم ہورہا تھا۔ بہت سے ایسے
کام جنہیں بہت پہلے ختم ہوجانا چاہیئے تھا۔ ابھی تک التوا میں پڑے تھے
اختر بڑے سلجھے ہوئے انداز میں رحمان کو اس کی کوتاہیوں سے آگاہ
کررہا تھا۔ اور رحمان کی روح لرز رہی تھی۔ اس کے سینے میں بددعا کا ایک
طوفان امڈ آیا تھا۔ اختر کی عدم موجودگی میں اس نے شہر کے کئی کارآمد
معزز لوگوں کو اختر کی آمد کا حال بتایا تھا۔ اور انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ دفتر
آکر اختر سے اس کا پیچھا چھڑائیں۔ دوپہر کے بعد دو تین کاریں دفتر کے
سامنے کھڑی ہوگئیں۔ رحمان نے معززین کا اختر سے تعارف کرایا۔ اختر
بڑے تپاک سے ملا لیکن اس نے کام بند نہ کیا۔ معززین نے اسے اپنی
باتوں میں الجھانے کی بہت کوشش کی۔ رحمان کے کام کی تعریفیں کیں
مگر اختر ان کی باتوں کا معقول جواب دیتا رہا۔ اور حساب کی جانچ پڑتال
کرتا۔ شام کے کھانے کی اسے دعوت دی گئی لیکن اختر نے کسی کی دعوت
قبول نہ کی۔ اس نے صاف طور پر کہدیا۔ کہ وہ سرکاری دورے پر آیا ہے
جب سیر کی غرض سے یہاں آئے گا۔ تو شکریہ کے ساتھ ان کی دعوتیں
قبول کرے گا ـــــ چھٹی کے بعد اس نے اسٹینو کو اپنے ساتھ
ہوٹل میں قیام کرنے کے لئے کہا۔ اسٹینو نے جواب دیا" کہ وہ یہاں اپنے
ایک عزیز کے پاس ٹھہرا ہے ـــــ اختر اکیلا ہی ہوٹل میں
آگیا ـــــ دن بھر کی کارگزاری کا خاکہ بناتا رہا۔ سب ڈویژن کے
کام کے متعلق ایک تعمیری پلان بناتا رہا۔ اور جب اس نے زیادہ تھکاوٹ
محسوس کی۔ تو تازگی حاصل کرنے کی خاطر باہر آگیا۔ یہاں پر اس کا کوئی واقف
کار نہ تھا۔ اور جن سے آج تعارف ہوا تھا۔ ان کی خوشامدانہ باتوں سے
اغراض کی بو آتی تھی۔ اور ایسے لوگوں سے وہ ہمیشہ دور بھاگتا تھا کھلی سڑک
کے فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے وہ قدرت کی رنگینیوں میں نظریں ڈبونے لگا
سینما ہاوس کے سامنے پہونچکر وہ رک گیا۔ فلم اس کے مطلب کی دکھائی
جارہی تھی۔ وقت گزارنے کے لئے وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں پہنچ گیا۔ ایک
الگ جگہ پر بیٹھکر اس نے سرسری طور پر ہال کا جائزہ لیا۔ اور پھر اس کی نظریں

میں سب ڈویژن کی ابتری کا خاکہ کھنچ گیا ——— فلم شروع ہوگئی ——— چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ اور دو سائے اندر داخل ہوتے۔ چند لمحے دروازے کے پاس ٹھہر کر انہوں نے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر وہ اختر کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اختر نے دونوں کو پہچان لیا تھا۔ ایک رحمان تھا۔ اور دوسری ہوٹل والی عورت تھی۔ ان کے ایک ساتھ آنے سے اختر کو سخت تعجب ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ ہوٹل میں قیام کرنے والی عورت کا رحمان سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ تھوڑے وقفہ بعد یہ عقدہ خود بخود حل ہوگیا رحمان دبی آواز میں کہہ رہا تھا کہ "اختر میری سب ڈویژن کا معائنہ کرنے آیا ہے۔ بڑا اکھڑ قسم کا آدمی ہے میں نے اسے پھسلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ میں نے جب معلوم کیا کہ وہ تمہارے ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ تو ایک اطمینان حاصل ہوا کہ جو کام مجھ سے نہ ہوسکا۔ وہ تم ضرور سرانجام دوگی۔ کسی طرح اسے اپنے حسن کے جادو سے مسحور کردو۔ ورنہ میرا پتہ کٹ جائیگا" ——— اختر کا خون کھولنے لگا وہ زیادہ دیر تک ان کی باتیں نہ سن سکا اٹھکر آگیا۔ گھڑی میں وقت دیکھا اور سوچنے لگا "معائنہ تقریباً ختم ہوچکا ہے ——— اب یہاں ٹھہرنا فضول ہے۔ ابھی آخری گاڑی کے چھوٹنے میں وقت ہے کیوں نہ اسی پر گھر پہنچ جاؤں"۔ ہوٹل میں واپس آکر اس نے حساب چکایا۔ اور بیگ پکڑ کر باہر آگیا۔ اس نے پلٹ کر دروازہ کے دائیں طرف لگی ہوئی تختی کی طرف دیکھا سنہری حروف چمک رہے تھے۔ "کسی فاحشہ عورت کا ہوٹل میں لانا منع ہے"۔ اور اختر نے ایک عجیب جذبے کے تحت اس کے نیچے پنسل سے لکھدیا "کیوں کہ ہوٹل کا منیجر فاحشہ عورتیں خود سپلائی کرتا ہے"۔ ———

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے:

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جولائی ۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہورہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا ——— منتظر کرم: منیجر "مشیر" کراچی۔

۲۰۰۰ مستری محمد عثمان کراچی
۲۰۰۲ عبدالطیف اینڈ کو میمن سنگھ
۲۰۰۴ عبدالغفور بھٹی (گوجرانوالہ) ہنڈی پر
۲۰۱۰ سیٹھ بشیر احمد ڈار گوجرانوالہ
۲۰۱۵ محمد اکبر خاں سلیمان زئی ہزارہ
۲۰۲۹ ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی کراچی
۲۰۳۰ میاں جمیل الرحمٰن پشاور
۲۰۳۶ محمد سلیم دکاندار سرگودھا
۲۱۵۹ محمد رفیق قریشی لاہور
۲۱۶۶ حفیظ الرحمان کراچی ۵
۲۱۷۴ وسیم حامد رضوی کراچی
۲۱۷۶ احمد خاں صاحب عباسی چنیوٹ
۲۱۸۱ امان اللہ صاحب ڈیرہ اسماعیل خان
۲۱۹۴ ثناء اللہ صاحب پاکپٹن
۲۳۵۵ بشیر انصاری گوجرانوالہ
۲۳۶۰ بجلی الیکٹرک ورکس گوجرہ (لائل پور)
۲۳۶۲ محمد نواز ملک صاحب منٹگمری
۲۳۶۴ مشتاق احمد صاحب ساقی لاہور
۲۳۶۶ اللہ دتہ صاحب پہلوان جلال پور
۲۳۶۷ ہیڈ ماسٹر صاحب چھچھرو (تھرپارکر)
۲۳۶۸ عبدالباری صاحب سعید پور رنگ پور
۲۴۴۰ ساجدہ خاتون صاحبہ (بھارت)
۲۴۶۵ صدیق احمد صدیقی کالو کے (گوجرانوالہ)

شوکت تھانوی

یہ اقبالیے

آغا کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ بھلے آدمی دنیا میں ہزار قسم کی باتیں ہیں۔ سیاسی مباحث ہیں۔ دوستوں کی غیبت ہے۔ ذاتی عشق و محبت کے افسانے ہیں۔ حسن کی داستانیں ہیں۔ موسم کا حال ہو مختصر یہ کہ احباب کے سر کھانے کے لئے بے شمار بہانے ہیں۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ اپنے ادبی وجدان کا سکہ جمانے کے لئے خواہ مخواہ شعر و ادب میں بھی دخل در معقولات فرما کر دوسروں کی زندگی عذاب کر دیں۔ مگر وہ بندۂ خدا نہ ماننا تھا نہ مانا اور جس طرح ایک زمانے میں اپنی غالب پرستی کے بدولت غالب کے نام سے بیزار کر چکا تھا کچھ وہی طریقہ اقبال کے سلسلہ میں اختیار کر لیا کہ جب دیکھئے نہایت بھونڈے طریقہ پر اقبال کا ذکر اور کلام اقبال کے چرچے۔ بیٹھے ہوتے خواہ مخواہ جھوم رہے ہیں اور بعض اپنا شعری بھرم قائم کرنے کے لئے اقبال اور اس کے کلام سے اختلاج پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ آخر کار اس بدتمیز انسان نے یہ حال کر کے چھوڑا کہ ادہر اس نے اقبال کا نام لیا اور معلوم ہوا کہ جیسے جنون کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس قسم کے موقعوں پر جی چاہتا ہے کہ سہ منزلہ سے پھاند کر جان دیدیں ریل کی پٹری پر سر رکھکر کسی ٹرین کا انتظار کریں۔ یا خودکشی کے بجائے ان حضرت پر قاتلانہ حملہ کر دیں۔ موت تو برحق ہے ہی۔ پھانسی کے سلسلہ میں ہی یعنی یہ بیہودگی ملاحظہ ہو کہ آپ کی طبیعت کو شعر و شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں سخت نامعقول واقع ہوتے ہیں آپ اس سلسلہ میں کسی قوالی کی محفل میں چلے جائیں تو وہی شعر آپ کو یاد رہ جاتا ہے جو سب سے زیادہ مہمل ہو چونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اقبال سنجیدہ اور سمجھدار طبقہ کا شاعر ہے لہذا آپ اپنے کو سنجیدہ اور سمجھدار ثابت کرنے کے لئے جب دیکھئے کلام اقبال پر وجد کیا کرتے ہیں۔

نہایت بدتمیزی کے ساتھ جھومتے ہوتے باہر سے تشریف لائیں گے ایک طرف اچھال کر پہلے تو سیٹی بجا بجا کر کچھ گاتے رہیں گے اس کے بعد لمبا سانس لے کر زانو پر ہاتھ ماریں گے اور پھر فرمائیں گے۔ کیا کہتا ہے ظالم! کہتا ہے:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

دیکھا آپ نے "کیا بات کہدی ہے"

عرض کیا "کہی ہوگی کوئی بات۔ تم تو وہ چیز سنادو۔

خدا نے تجھ کو بنایا ہے نازنیں قاتل
ادا کی تیغ ہے موزوں تری کمر کے لئے

بڑی حقارت سے بولے "لاحول ولاقوۃ" چہ نسبت خاک را با عالم پاک معلوم بھی ہے میں نے کس کا شعر پڑھا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ہر یہ شعر واقعہ تو یہ ہے کہ اردو نے بھی کیا شاعر پیدا کیا ہے یعنی:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ"

عرض کیا "کوئی بات بھی ہو۔ ٹوٹنے دو ڈالی کو شجر سے۔ تم تو مجھکو وہ غزل سنادو۔ کیا تھا اس کا مطلع؟ ہاں

علاج کی نہیں حاجت دل و جگر کیلئے
بس اک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لئے

نہایت ناسمجھ جان کر بڑے تمسخر سے بولے "آپ بھی عجیب چیز واقع ہوئے ہیں۔ ارے صاحب جس کلام کا اس وقت میں لطف حاصل کر رہا ہوں وہ چیز ہی کچھ اور ہے"

عرض کیا "مثلاً کیا چیز ہے وہ کلام؟"

کہنے لگے "شاعر کہتا ہے کہ وہ ڈالی جو فصل خزاں میں شجر یعنی درخت سے ٹوٹ گئی اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ موسم بہار میں درخت سے علیحدہ رہکر پھر ہری ہو سکے۔ یعنی وہ درخت کی بہار میں اب شریک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ تو ٹوٹ گئی۔ گویا الگ ہو گئی۔ علیحدہ ہو گئی"

عرض کیا "تو آخر کون سا تیر مارا ہے آپکے شاعر نے۔ سب ہی

جانتے ہیں کہ جو ڈالی درخت سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ وہ پھل پھول نہیں لاتی بلکہ ایندھن کے کام میں لائی جاتی ہے۔ کلام تو اس کو کہتے ہیں۔ بھئی کیا بات کہدی ہے:-

ادا کی تیغ ہے موزوں تری کمر کے لئے

ذرا تصور کیجئے کسی پتلی سی کمر کا جو پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح لچک رہی ہو۔ اس کے لئے شاعر نے تیغ بھی تجویز کی تو ادا کی۔ شاعری اس کو کہتے ہیں۔ اور یہ شعر کہلاتے ہیں جیسا کہ شعر، یاد ہے جو اس دن تم شعر پڑھ رہے تھے۔ کیا کہنا ہے اس کا ؎

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آپکے پاؤں کے نیچے دل ہے

"اک ذرا" کیا زبان ہے۔ "زحمت ہوگی" کیا تکلف ہے اور کیا تہذیب ہے۔ وہ ہی ٹکسال کی ادبیات کیا انکالی ہے۔ اس تمام تہذیب و تکلف کے بعد کہ ؎ "آپکے پاؤں کے نیچے دل ہے"۔

"کس قدر عجیب و غریب پامالی ہے"۔

تیوری پر بل ڈال کر اٹھے۔ "سخت گھامڑ ہیں آپ"۔ اور ٹوپی اٹھا کر پھر سیٹی بجاتے ہوتے روانہ ہو گئے وہ خیر دفع ہوتے مگر ذرا غور تو کیجئے کہ دماغی توانائی کتنی دیر کے لئے خراب کر گئے کوئی پوچھے کہ آپ کا اقبال غریب نے کیا بگاڑا ہے کہ آپ اس کی یہ حماقت آمیز پرستاریاں کر کے اس کے نام سے دوسروں کو ڈرانے اور بہکانے لگے ہیں۔ آپ میونسپل کارپوریشن میں ٹیکس انسپکٹر نسلوں سے آپکے خاندان میں ادبیات کے سلسلہ میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے بڑی مشکل سے آپ کی سمجھ میں نظم اور غزل کا فرق اس وقت آیا ہے جب گھنٹوں سر کھپانے کے بعد آپ کو بتایا گیا ہے کہ قوالی کی محفل میں قوال جو چیز گا رہا تھا وہ نظم نہیں بلکہ غزل تھی۔ غزل کی تعریف یہ ہے اور نظم اس کو کہتے ہیں اور اب جناب کا عالم یہ ہے کہ اقبال شناسی کے دعویدار ہیں۔ پہلے آپنے رنگ محفل یہ دیکھا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ غالب کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا آپنے بھی کچھ وقت دیکر غالب کے دو چار شعر یاد کر لیے تھے اور جب دیکھئے بات بات پر غالب کا حوالہ دیکر اس سلسلہ کا تمام کیف ختم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ غالب سے طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ ادہر ان حضرت نے غالب کا نام لیا اور یہاں طبیعت مشتعل ہوئی کہ کر دو اس شخص پر حملہ یا بھاگو یہاں سے گریباں پھاڑ کر۔ غالب کے نام سے جی متلانے لگا وحشت سی ہوتی تھی کلام غالب سن کر ایک آدھ مرتبہ پیار سے دیکھو بھائی آغا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ اور تم ہو۔ مگر اس نامراد دوستی کا اتنا بڑا ٹیکس تو نہ لو کہ ہمارے ذوق سلیم عنایات سے قابل توجہ محکمہ حفظان صحت بنا دو۔ غالب کو تمہارے سمجھ نہیں سکتے تم تو ذرا کسی اور کی پھڑکتی ہوئی غزلیں گانے اور کے لئے یاد کر لو۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ کوئی حکیم نے تو نسخہ لکھا نہیں ہے کہ آپ غالب کے ناقص بن کر اپنے کو نمایاں کریں۔ غالب تو نمایاں ہوتا نہیں اور نہ خود آپ نمایاں ہوتے ہیں البتہ کی حماقت ضرور اجاگر ہو جاتی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کی بات اس قدر اشتعال انگیز ہوتی ہے کہ کسی دن فوجداری کی نوبت آجاتی مگر اس سمجھانے کے باوجود جب وہ نہ مانے تو ایک مرتبہ ذرا سختی سے کو نوٹس دیا اپنے خاندانی جلال کے حوالے دیئے کہ ہم لوگ کس طرح آ مرغا بنا دیا کرتے ہیں۔ اور فلاں بزرگ نے کس طرح ایک شخص کو فقط پھانسی پر لٹک جانا گوارا کر لیا تھا۔ مگر ایک بد مذاق اور کور ذوق کا برداشت نہ کی تھی اور جب اس دھمکی سے بھی کام نہ چلا تو تعلقات کر دیتے۔ دور کی صاحب سلامت باقی رہ گئی۔ روز کے بجائے ہفتہ ملنے لگے۔ پھر مہینہ میں ایک بار اور آخر کار اس دن ہمارے یہاں بہت بڑی دعوت تھی جب ان حضرت کو میونسپل کارپوریشن سے گیا ہے اور ان کو راولپنڈی میں محکمہ جنگلات میں کوئی جگہ ملی ہے دل خس کم جہاں پاک۔ کم از کم اب یہ غالب کے دھمکانے تو نہ آیا کریں گے۔ جو دو سال کے بعد آپ راولپنڈی سے پھر خدا جانے ہماری کن بداعمالیوں کا عذاب بن کر نازل ہوتے ہیں تو غالب کے بجائے آپ کو اقبال کا خبط ہائے یہ دو شاعر تھے جن سے ہماری تنہائیاں آباد تھیں۔ جن میں کھو کر خدا جانے ہم کیا کیا ڈھونڈا کرتے تھے۔ جن کو اپنا مخاطب اس وقت سمجھتے تھے جب کوئی اور مقابل نہ ہوتا تھا جن کو کبھی بحث میں اسی ڈر سے نہ لاتے تھے کہ خدا جانے کسی ناشناس کے بدولت ہم کو کون سی احساس پہنچ جاتے۔ غالب اور اقبال سے کیف حاصل کرنے کا مزہ کچھ چوری ہی آتا تھا مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہی دو شاعر ہم سے اس

چھین لئے جائیں مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ اس مرتبہ آغا صاحب راولپنڈی سے آکر غریب خانہ ہی پر ٹھہرے تھے۔ اور اب صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپکے احباب بھی ہر وقت ہمارے لئے عذاب جان بنے ہوئے تھے۔ ایک سے ایک عقل کا پیپر ویٹ۔ جب دیکھئے دھرا ہوا ہے اور یہی چرچے ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے ایک دن آغا صاحب اپنے حلقۂ احباب میں "میرا خیال تو ہے کہ اقبال کو دنیا ابھی اور سمجھے گی ہر روز اس کے کلام پر ایک نئے زاویئے سے روشنی پڑتی ہے اور کوئی نہ کوئی اپنا گوشہ نکل آتا ہے۔ ایک صاحب جو پائپ منہ میں لئے ہوتے بڑے بانگ درا لیے بیٹھے تھے کھنکھار کر بولے "اقبال وقت کا زندہ شاعر ہے اور اس کا کلام وقت کی آواز ہے۔ دیکھئے وہ کہتا ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

آغا صاحب نے جھوم کر کہا "بھئی ذرا پھر پڑھنا کیا بات کہی ہے، کیا زبان ہے۔ کیا واقعاتی شاعری ہے۔ ہاں کیا ہے۔ سچ کہہ دوں۔

ان حضرت نے پھر اس شعر کو پڑھ کر بڑی شاہین نما آنکھیں نکال کر فرمایا "جناب من ذرا دیکھئے تو یہی بات کتنی بڑی کہی ہے۔ بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ہندوستان سے مخاطب ہے۔ حالانکہ جس وقت یہ شعر کہا گیا ہے اس وقت پاکستان کا تخیل بھی عالم خواب میں نہ تھا مگر شعر کا اعجاز تو یہی ہے کہ وہ زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔ قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر آج کا ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ آج کے حالات کے مطابق ہے برہمن یعنی پنڈت نہرو۔ اب بتائیے ڈاکٹر اقبال کو یہ کب معلوم تھا کہ آزادی ہند کے بعد پنڈت نہرو ہی وزیر اعظم ہوں گے

ایک اور صاحب جن کی تصویر بال جبریل کے سر ورق پر ہونا چاہئے تھی مونڈھے پر ابھر کر بولے "نہیں صاحب یہ الہام ہے اور الہام کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی صداقت منوا لیتا ہے اب آپ کی اس تشریح سے شعر کا مطلب ہی بدل کر کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا چہرہ "پس چہ باید کرد" کی طرح بنا لیا۔

وہ پائپ والے صاحب میز پر گھونسہ مار کر بولے "کیوں نہ خدائے واحد کی پرستش ہو۔ جو نہ کبھی نیا تھا نہ کبھی پرانا ہو گا۔

آغا صاحب نے جھوم کر کہا "واہ بھئی سبحان اللہ کیا بات پیدا ہو گئی سچ کہہ دوں اے برہمن یعنی اے پنڈت نہرو اگر تم بُرا نہ مانو تو یہ حقیقت تم پر روشن کر دی جاتے ؎

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اور اسی لئے ہم نے اپنے واسطے ایک ایسا گوشہ ڈھونڈ لیا۔ جہاں پرانے بتوں کے بجائے اس کی پرستش ہو جو نہ نیا ہے نہ پرانا ہو گا

وہ صاحب اٹک کر بولے "میں کیا پیدا کروں گا کوئی بات شاعر مشرق نے دراصل یہی بات کہی تھی۔ ان کے کلام میں بے شمار شعر اسی قسم کے ہیں۔ جن کا مطلب کل کچھ اور تھا اور آج کچھ اور ہے اور پھر کل کچھ اور ہو گا۔ ہر زمانہ اس کلام کو اپنے حالات کے عین مطابق پاتے گا۔"

آغا نے کہا "یار ایک کام کرو تم۔ اقبال پر ایک آدھ کتاب لکھ ڈالو نا۔ مقدمہ میں لکھ ڈالوں گا" اور ہم سے کہا "کیا خیال ہے آپ کا"

عرض کیا "مقدمہ بازی تو انشاء اللہ ضرور ہو گی"

کہنے لگے "کیا مطلب؟"

عرض کیا "بھائی میرے! آخر انسان کب تک ضبط کر سکتا ہے کسی نہ کسی دن اس قسم کی باتوں پر سر پھٹول ہو جائے گی۔ پکڑ دھکڑ ہو گی۔ تھانہ اور کچہری عدالت تک نوبت پہونچے گی"

آغا صاحب نے سنجیدگی سے کہا "تم تو مسخرے ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ واقعی اقبال پر کام کرنے کی ضرورت ہے"

ہم نے اٹھتے ہوئے کہا "آپ لوگ یہ کام کیجئے میں ذرا سر میں تیل ڈلوا کر غسل کر لوں تو کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں کہ مجھکو آپ کے لئے مکان ڈھونڈھنا چاہیئے یا خود کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہیئے جہاں کوئی نہ ہو"

وہ تینوں حیرت سے دیکھتے رہ گئے غالباً پاگل سمجھے ہوں گے اور اگر یہ سمجھے تو سچ سمجھے۔

(بشکریہ "حریم")

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیئے (منیجر)

فضا جالندھری

بہار

پردۂ گل میں پھر ابھرا جوشِ پنہانِ بہار
ہر طرف گلشن میں پھر جاری ہے فرمانِ بہار

پھر دلِ پر آرزو جذبات سے لبریز ہے
پھر نظر کے سامنے برپا ہے طوفانِ بہار

پھر نسیمِ روح پرور کی ہے مستانہ روش
رشکِ میخانہ ہے پھر صحنِ گلستانِ بہار

پھر منور گوشہ گوشہ بزمِ امکاں کا ہوا
پھر چمن افروز ہے خورشیدِ تابانِ بہار

پھر نظر آنے لگے جلووں کے ہنگامے مجھے
پھر دلِ حیرت زدہ ہے محوِ عنوانِ بہار

ہر نفس اب کیوں نہ پیغامِ وداعِ ہوش ہو
یہ ہوائے سرد یہ عالم یہ طوفانِ بہار

ہر گل اک آئینہ ہے رعنائیِ مستور کا
محوِ جلوہ ہے نظر اللہ رے احسانِ بہار

احترامِ توبہ بھی اب اک خیالِ خام ہے
مستیاں برسا رہا ہے ابرِ بارانِ بہار

پتی پتی گوہر افشاں ڈالی ڈالی نور بار
روکشِ رعنائیِ جنت ہے دامانِ بہار

یہ نظر آتا ہے جیسے گردشِ میخانہ ہو
روحِ میخانہ حقیقت میں ہے عنوانِ بہار

موجِ بو آتش نفس ہر موجِ رنگ آتش بجاں
کس نے دیکھا ہے فضا یہ جوشِ طوفانِ بہار

حسرت بدایونی

لب پہ شکوہ ہے تو دل مائلِ فریاد بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے وہ دیرینہ کرم یاد بھی ہے

ملتفت میری طرف اب مرا صیاد بھی ہے
دلِ خود دار کہیں طالبِ امداد بھی ہے

آپ رُکتے ہیں تو کیا رُکنے سے مل جاتا ہے
قیدِ غم سے کوئی اس دور میں آزاد بھی ہے

کوئی موسیٰ نظر آتا ہے نہ اب کوئی خلیل
آج فرعون بھی نمرود بھی شداد بھی ہے

خواب میں جلتے ہیں اس طرح امیدوں کے چراغ
جیسے اجڑا ہوا گلشن مرا آباد بھی ہے

ایک بجلی کبھی نظروں سے گرا دو آ کر
منتظر چشمِ کرم کا دلِ برباد بھی ہے

کیوں نہ پھر موجِ تلاطم میں سفینہ ڈوبے
ناخدا کو کہیں اس وقت خدا یاد بھی ہے

دل گیا جان کی اب خیر مناؤ حسرت
وہ ستمگر ہے جفا پیشہ ہے جلاد بھی ہے

شاہد رام نگری •

جہنّم سے جنّت تک

آفتاب کی تمازت اور لو کے تھپیڑوں سے جھلستی ہوئی مدینۃ النبی ایک شام تھی۔

ریت کے اڑتے ہوئے بگولے تھک تھک کر صحرا کی آغوش میں سو چکے تھے اور تند و تیز ہوا کے بپھرے ہوئے جھکڑوں کی جگہ ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکوں نے لے لی تھی۔ آفتاب کی حدت اور تمازت سے مرجھائے ہوئے پھولوں کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔

نوچندی کا چاند کھجوروں کی شاخوں کو چھوتا ہوا اوپر اٹھتا آ رہا تھا اور چھٹکی چاندنی حسینہ شب کی زلفوں پریشاں چھپ ٹمک رہی تھی جنگ میں دھندلکوں پر غالب آتی جا رہی تھیں۔

غامدیہ نخلستان سے الگ کھجوروں کے ایک جھنڈ میں خاموش اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں دور خلا میں کھوئی ہوئی تھیں جیسے تلاش کر رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں کی سرمئی جھیل میں بھی خلا پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں چمک تھی۔ نہ چلبلاپن، نہ زندگی نہ کوئی جذبہ، جیسے وہ آنکھیں بینا کچھ کھو چکی ہوں اور اب ان میں کچھ پانے کی حسرت بھی باقی نہ ہو۔

نخلستان کے چشمے کے قریب ایک بھیڑ زور سے ممیائی۔ بھیڑ کی چیخ رات کی خاموشی کے سینے پر ایک لکیر بناتی ہوا میں گم ہو گئی۔

غامدیہ چونک اٹھی۔ اس نے اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں چاند اور اوپر اٹھ آیا تھا چاندنی بھی پہلے سے نکھر گئی تھی کھجور کی شاخوں سے چھن کر آتی ہوئی شعاعیں زمین پر روپہلی جالی سی بن رہی تھیں۔

غامدیہ سوچنے لگی۔ آج سے چھ مہینے پہلے بھی ایک شام تھی۔ چاند ابھی اوپر آ چکا تھا۔ ہوا کے لطیف جھونکے کھجور کی شاخوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی بسی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار اور پر کیف تھا مگر اس حسین اور پر کیف شام اسے کچھ دینے کی بجائے اس کا سب کچھ چھین لے گئی۔ جذبات کی ایک کروٹ ــــــــــ قدموں کی ذرا سی لغزش

جوانی کی ایک ہلکی سی ٹھوکر!

اور اس کے بعد گناہ اور معصیت کی مسلسل تاریکی۔ ایک طویل کرنٹ ایک مستقل گھٹن!

غامدیہ سوچتی جا رہی تھی۔ اس کی پلکیں نم ہو چکی تھیں۔ اس کا دل ندامت اور پشیمانی کے شعلوں میں جھلسنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے چھ ماہ پہلے کی اس شام کا منظر دھندلی تصویر کی طرح جھلک اٹھا۔

شام ہو چکی تھی۔ وہ چشمے سے پانی لے کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اچانک کھجوروں کے جھنڈ سے وہ الھڑ اور بے باک نوجوان اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی پشت پر خالی ترکش لٹک رہا تھا کمان شانوں سے جھول رہی تھی۔ الجھے ہوئے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسحور کن کشش تھی۔

غامدیہ کے قدم رک گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چند لمحے بعد نوجوان نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلا دو گی؟“

غامدیہ کچھ جھجکی، کچھ شرمائی اور کچھ سہمی۔ لیکن نوجوان کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش نے اسے مسحور کر دیا تھا ــــــــ“

”پی لو“ ــــــــــ غامدیہ نے مختصر سا جواب دیا، پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔

نوجوان نے اسے جھجکتے ہوئے دیکھ کر کہا راستے سے ہٹ کر ادھر آ جاؤ، کھجوروں کے پاس!“

غامدیہ کچھ بے بس سی ہو کر کھجوروں کی آڑ میں چلی گئی۔ نوجوان نے ترکش اور کمان اتار کر کھجوروں کی شاخوں میں الجھا دیا۔

غامدیہ گھڑا ہاتھ میں لے کر پانی پلانے لگی۔ نوجوان نے ہاتھ دھویا

چہرے کی گرد صاف کی چلو سے پانی پینے لگا۔ چشمہ کا صاف و شفاف اور شیریں پانی پھر پلانے والی غامدیہ جیسی، سیک اندام اور نازک بدن حسینہ! وہ پیتا ہی چلا گیا۔ تشنگی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

نوجوان جب پی کر سیر ہو چکا تو غامدیہ کا گھڑا تقریباً نصف خالی ہو چکا تھا۔ غامدیہ نے جب گھڑے کی طرف دیکھا سوچنے لگی۔ اب پانی لینے کے لئے چشمہ پر جانا ہوگا۔ خالی گھڑا لے کر گھر جاؤں گی تو ماں کو کیا جواب دوں گی؟

نوجوان غامدیہ کی کشمکش کو سمجھ گیا اس نے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں میں ابھی چشمے سے گھڑا بھر لاتا ہوں۔"

غامدیہ بولی "نہیں آپ رہنے دیجئے۔ میں خود ہی لے لوں گی۔"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور گھڑا اٹھا کر تیزی سے چشمے کی طرف چل دیا۔ غامدیہ بے بسی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اور سوچتی رہی کہ کتنا الھڑ بے باک اور حسین ہے یہ نوجوان! اس کی آنکھوں میں کیسی عجیب کشش ہے۔ اس کی گفتگو کا انداز کتنا پیارا ہے۔

غامدیہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی ہے۔

نوجوان جلد ہی پانی لے کر واپس آگیا۔ غامدیہ نے گھڑا اٹھا کر چلنا چاہا۔

"ٹھہرو ——— ابھی مت جاؤ۔" نوجوان بولا۔ اس کے لہجے میں تحکمانہ التجا تھی۔

"ابھی تو میں نے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔"

غامدیہ کے پاؤں زمین میں جم سے گئے۔ اس درخواست کو ٹھکرانے کی اس میں سکت نہ تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا ———

"مجھے دیر ہو رہی ہے ——— گھر والے پریشان ہوں گے۔"

نوجوان مسکرایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ——— "یہ کھجور کی شاخوں میں الجھا ہوا چاند، یہ سرگوشیاں کرتی ہوئی ہوا۔ یہ جذبات میں آگ لگا دینے والی لطیف خنکی، یہ چمکیلی ریت کا فرش۔ تم ان سب میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتیں۔ کیا تم ان سب کو ٹھکرا کے چلی جانا چاہتی ہو ———؟"

غامدیہ کو نوجوان کی باتیں بڑی پیاری معلوم ہوئیں اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں شہد انڈیل رہا ہو۔

نوجوان اس کے بالکل قریب آگیا۔ دونوں کی سانسیں دوسرے کو چھونے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکن ... کرنے لگے۔

نوجوان نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر آہستہ ... غامدیہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں بجلی کی سی ... خون رگوں میں بڑی سرعت کے ساتھ گردش کرنے لگا اس کے دھڑکن اور تیز ہو گئی، وہ از خود رفتہ سی ہونے لگی۔ دل و دماغ نشہ سا چھانے لگا۔

نوجوان سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا ——— تم رخساروں میں چاند سے زیادہ تابانی ہے تمہاری آنکھوں میں شراب خمار ہے تمہارے لبوں میں جاں بخش تازگی ہے تمہاری زلفوں میں مشک کی خوشبو بچی ہے تمہاری پیشانی طلوع ہوتی ہوئی صبح کی مانند روشن کتنی حسین ہو۔"

غامدیہ خود کو بھول گئی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے اس کے سینے میں شعلے لہرانے لگے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

شیطان در رکھڑ اپنی تدبیر کو کامیاب ہوتے دیکھ کر مسکرا مدینے کی مقدس سرزمین کو گناہ و معصیت سے آلودہ کر کے اسے بڑی ... ہو رہی تھی۔ یہ اس کی بہت بڑی جیت تھی کہ اس نے رسول اللہ کی ... فتح حاصل کی تھی۔

چند لمحے بعد غامدیہ نوجوان کے بازوں میں ... تھی۔ سر نوجوان کے چوڑے سینے سے لگا ہوا تھا۔ نوجوان کے لب ...

. . . .

جب وہ علیحدہ ہوئے تو غامدیہ بالکل لٹ چکی تھی وہ اپنی ... سے گراں بہا متاع کھو چکی تھی ——— ہاں اس کا شیشہ عصمت پاش پاش ہو چکا تھا۔ وہ شیشہ جو ایک بار ٹوٹنے کے بعد پھر نہیں جڑ سکتا۔

اور آج چھ مہینے بعد ——— جبکہ اس شام کی یادگار ... کے پیٹ میں اس کے گناہ کا زندہ ثبوت بن کر پرورش پا رہی تھی۔ وہ

چ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟

اس کا ضمیر اسے ہر وقت زہریلے ناگ کی طرح ڈستا رہتا۔ اس ...بی بار اپنے کو آمادہ کیا کہ رسول اللہ کے سامنے جا کر اعترافِ گناہ کر لے۔ مگر ...راستے کے قدم اٹھ اٹھ کر رک گئے۔

اس کی نگاہوں میں فضائیں لہراتے ہوئے ہاتھوں اور برستے ...ے پتھروں کا نقشہ گھوم جاتا، وہ گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ اتنے میں ...ں میں لعنت و ملامت اور لعن و طعن کے زہریلے تیر گھستے ہوئے ...وس ہوتے اور وہ تلملا کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیتی۔

وہ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی، جہنم کے لہراتے ہوئے شعلے اور بھنکا ...ے اژدہے پھر اس کا پیچھا کرنے لگتے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ ...اسے کچھ کہے دیتے لگتا۔ "دنیا کو تیرے گناہ کا علم نہیں ہے مگر دنیا کا خدا ...ے عمل سے بے خبر نہیں ہے۔ اس پر تو دنیا کے ذرے ذرے کی حالت ...ہے۔ تو اس سے اپنے گناہ کو کیسے چھپائے گی؟ ممکن ہے کہ تو اپنے ...پر پردہ ڈال کر دنیا کی چند روزہ زندگی آرام سے گذار لے لیکن جہنم ...عذاب سے کیسے چھٹکارا پا سکے گی؟ پتھروں کی بارش تجھے چند گھنٹوں میں ...ٹکڑے کر دے گی لیکن تیری آج کی خاموشی تیری ابدی زندگی کو جہنم کے ...لوں کی نذر کر دے گی جن سے تجھے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔

غامدیہ اسی شش و پنج میں اور ذہنی کشمکش میں جانے کتنی ...راتیں گذار چکی تھی۔ اسی کشمکش نے اس کی زندگی کو ایک مستقل ...ب بنا دیا تھا۔ اور پھر ایک لمحہ وہ بھی آیا جب اس نے پورے عزم کے ...یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ چند گھنٹوں کی تکلیف کو جہنم کی دائمی زندگی پر ...دے گی۔ وہ رسول اللہ کے سامنے حاضر ہو کر کھلے دل سے اپنے گناہ ...عتراف کر لے گی۔

دوسرے دن صبح نمازِ فجر کے بعد جیسا سورج اپنے چہرے سے ...دل کی نقاب اٹھا چکا تھا۔ غامدیہ آہستہ آہستہ مسجد نبوی کی طرف ...بڑھی۔ اس کے چہرے پر ببول کے پھولوں کی سی زردی تھی۔ پینگلاخ ...ٹوں جیسا سکون تھا۔ آنکھوں میں مضمحل متانت اور باوقار سنجیدگی ...اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ بہت تھکی ہوئی جیسے وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر کے بعد مسجد نبوی کا مقدس صحن اس کے قدموں کے نیچے تھا۔

اس مقدس فرش کی پاکیزگی اور عظمت کا تصور کر کے غامدیہ کانپ اٹھی۔ وہ سوچنے لگی۔ کاش آسمان ٹوٹ کر گر پڑتا۔ اور وہ یہیں ختم ہو جاتی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

صحابہ کرام کے حلقے میں اللہ کے رسول تشریف فرما تھے تاروں کے جھرمٹ میں ماہِ کامل جگمگا رہا تھا۔ چہرہ پر وقار و جلال تھا۔ ایسا وقار و جلال جس سے شہنشاہوں کے دل کانپتے تھے۔ پیشانی پر اجالا تھا ایسا اجالا جس سے دلوں کی تاریک دنیا میں روشنی سی پھیل جاتی تھی۔ سکون تھا جس سے امیدوں کی سوکھی ہوئی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی تھیں۔ آنکھوں میں رحمت و شفقت کی موجیں لہراتی تھیں۔ ایسی رحمت و شفقت جو ہر متنفس کے لئے عام تھی۔

چند لمحے بعد رسولِ خدا غامدیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ غامدیہ کی نگاہیں فرطِ ادب سے زمین بوس ہو گئیں، وہ پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔ رسولِ خدا نے دریافت فرمایا — "کیا بات ہے غامدیہ! کیسے آئی ہے؟"

"یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے"۔ — غامدیہ نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"افسوس ہے تیری ذات پر — جا واپس لوٹ جا۔ اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگ اور آئندہ کے لئے توبہ کر" رسول اللہ نے فرمایا۔

غامدیہ نے دوبارہ عرض کیا "کیا آپ ماعز بن مالک کی طرح مجھے بھی واپس لوٹا دینا چاہتے تھے؟"

رسول اللہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ نے دریافت کیا۔

"کیا تجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا ہے؟"

"ہاں، یا رسول اللہ! — اور اب گناہ کے شجر میں پھل بھی لگنے والا ہے" —

رسول اللہ نے اپنے سوال کو چار مرتبہ دہرایا۔ اور غامدیہ نے ہر بار اعتراف کیا — رسولِ خدا نے کچھ توقف کے بعد فرمایا "اچھا اس وقت لوٹ جا، بچے کی پیدائش کے بعد آنا"

غامدیہ واپس چلی آئی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا قلب طمانیت اور سکون کی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا جس آگ میں اس کا دل مہینوں سے جھلس رہا تھا۔ اس کی حدت کم ہو چلی تھی۔ غامدیہ پورے صبر و استقلال سے اور عزم و ثبات کے ساتھ آنے والے دنوں کا انتظار کرنے لگی۔ گذرتے ہوئے ایام ہفتوں اور مہینوں میں بدلنے لگے۔ اور آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس کے گناہ کی زندہ شہادت عالم وجود میں آ گئی۔

غامدیہ نے دربار رسالت میں اطلاع کرا دی۔ وہاں سے حکم ملا کہ جب تک بچہ دودھ نہ چھوڑ دے اس وقت تک انتظار کرے۔

ایک سال اور گذر گیا۔

شیطان جو اپنی شکست کے احساس سے تلملا رہا تھا غامدیہ کو ورغلانے کے لئے ہمیشہ اسے سبز باغ دکھاتا رہا۔ اس نے بار بار غامدیہ کو سمجھایا کہ تو ناحق اپنی جان گنوانے کا تہیہ کئے بیٹھی ہے۔ محمد کا مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلی جا، تیرے کتنے قدردان مل جائیں گے۔ زندگی اور سکھ اور آرام سے گذر جائے گی۔"

مگر شیطان کے بہکاوے ضمیر کی آواز پر غالب نہ آ سکے۔ ایمان کی روشنی پر نفس کی تاریکیاں قابو نہ پا سکیں۔ ہر بار اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جہنم کے ابدی عذاب سے دنیا کی چند گھنٹوں کی تکلیف کہیں بہتر ہے۔

چنانچہ ایک دن پھر سویرے اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور دربار رسالت کی جانب چل پڑی۔

رسول اللہؐ نے بچے کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ غامدیہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! بچے نے دودھ چھوڑ دیا ہے اور اب کھانا کھانے لگا ہے۔ آپ مجھے پاک فرما دیں"

رسول اللہؐ نے بچے کو ایک انصاری کے حوالے کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ایک گڑھا اتنا گہرا تیار کیا جائے جو غامدیہ کے سینے تک ہو۔ تھوڑی دیر بعد یہ گڑھا تیار ہو گیا۔

غامدیہ نے قبلہ رو ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے ——
میرے معبود! میں نے تیرے حکم سے انحراف کیا میں شیطان کے بہکاوے میں آ گئی۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے جا رہی ہوں۔ مالک میری توبہ قبول کر، اور میرے گناہ کو بخش دے!"

دعا مانگنے کے بعد غامدیہ پورے صبر و استقلال کے ساتھ گڑھے میں اتر گئی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا نہ پریشانی۔ بلکہ پر امید سکون تھا۔ رسول اللہؐ نے سنگساری کا حکم دیا۔ صحابہ کرام نے حکم کی تعمیل کی۔ ہر چہار جانب سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔

پھول سے رخسار، صبیح پیشانی، کنول سی آنکھیں، گلاب کی پتی سے ہونٹ، کالی گھٹاؤں جیسے بال سب پتھروں کی زد میں تھے۔ خون کی بوندیں اچھل اچھل کر اس کے زرد چہرے کو گلنار کئے دیتے رہیں مگر اس نے آہ و فغاں کی صدا بلند نہ کی۔ البتہ جب کوئی پتھر بہت زور سے لگتا تو اس کے ہونٹوں سے کراہ کی آواز نکل جاتی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"معبود! —— میری توبہ قبول کر لے ..... میرے گناہ کو بخش دے۔ مجھے جہنم کی آگ سے بچا لے"۔

شیطان اپنی شکست فاش پر سر بگریباں تھا۔ وہ حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی ہار پر ندامت و پشیمانی بھی تھی اور غامدیہ کے استقلال پر، اس کی قوت ایمانی پر حیرت بھی۔

پتھر برستے رہے۔

خالد بن ولید نے ایک بڑا پتھر دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ پتھر لگتے ہی خون کی تیز دھار چھوٹی چند قطرے خالد کے دامن پر بھی پڑ گئے۔ ان کو بڑا ناگوار معلوم ہوا۔ انہوں نے غامدیہ کو ایک بھدی سی گالی دی۔

رسول خدا نے فرمایا —— "خالد! خدا سے ڈرو، الیاس مت کہو، قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے غامدیہ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر خائن بھی ایسی توبہ کرے تو بخش دیا جائے گا۔"

غامدیہ کی پلکیں آہستہ آہستہ جھپکنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش رکنے لگی۔ اور آخر رفتہ رفتہ اس کے لب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

رسول خدا نے پانی منگوا کر وضو فرمایا۔ غامدیہ کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ اور اسے سپرد خاک کر دیا۔

پروفیسر مس چاند خورشید

بچّے اور کہانیاں

بچّوں کو کہانیاں سُننے کا شوق کیوں ہوتا ہے

ہر ملک اور ہر تہذیب میں کہانیاں سنانے اور سننے کا رواج چلا آتا ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اس بات پر غور کیا ہو کہ بچوں کو کہانیاں سننے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟ ماہرین نفسیات نے بھی اس سلسلے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا بچوں میں قوت تخیل یعنی خیال آرائی بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بچے میں یہ قوت یکساں طور پر موجود ہو بعض بچوں میں خیال آرائی کم ہوتی ہے اور بعض میں مقابلتاً زیادہ کہانیاں سننے اور سنانے کا تعلق تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔ بچے اصلی چیز اور چیز کے تصور میں تمیز نہیں کر سکتے کیونکہ بچوں کے دماغ میں ان کے جسم کی طرح ابھی پختگی نہیں ہوتی آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچہ گڑیا کو ایک سچ مچ کا بچہ تصور کر لیتا ہے اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے اسے کھلاتا ہے سلاتا ہے چنانچہ ہر وہ کام جو انسان کرتا ہے بچہ گڑیا سے بھی کرواتا ہے وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ گڑیا تو ایک بے جان چیز ہے۔ وہ باتیں نہیں کر سکتی لیکن جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ دماغی نشو و نما بھی مکمل ہو جاتی ہے اور نفسیاتی رو سے تقریباً پانچ سال کی عمر تک بچہ اصلی اور تخیلی اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا ایک مشہور مصنفہ لکھتی ہیں کہ جب وہ تین سال کی تھیں تو پتھروں کو اکثر ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا کرتی تھیں یہ سوچتے ہوئے کہ ان میں بھی جان ہے اور بیچارے پتھر انسانوں کی طرح ایک جگہ پر پڑے پڑے اکتا جاتے ہیں۔ بعینہٖ کہانیوں میں بھی بچہ تخیل کے ذریعے ایک غیر موجود چیز کو موجود سمجھ لیتا ہے اور کہانی سننے کے ساتھ ساتھ بچے کے دماغ میں واقعات کی تصویر سی کھنچتی چلی جاتی ہے جو حقیقی چیزوں سے کسی طرح کم جاندار نہیں ہوتی۔

انسانی جبلتیں بچپن سے ہی اپنا کام کرنے لگ جاتی ہیں کہانی سننے کا تعلق جبلی تجسّس سے بھی ہے بچے اپنے شوق تجسّس کو پورا کرنے کے لئے کہانی کی فرمائش کرتے ہیں یہ شوق تجسّس ہی تو ہے جو ہمیں اپنی معلومات بڑھانے میں مدد دیتا ہے کہانی کے ذریعے بچے کی پرواز خیال بھی بڑھتی ہے۔ بچہ جیسے ہی بولنا سیکھتا ہے اس کے ساتھ ہی کہانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہانی محض خیالی یا دیکھی ہوئی چیزوں کو لفظوں میں بیان کرنا ہے اور لفظوں کا تعلق خیالات سے بہت زیادہ قریبی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ الفاظ خیال انگیزی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ لفظ کو خیالات کے ساتھ وابستہ کرنے کا مادہ بچوں کو کہانی سننے پر مجبور کرتا ہے کہانی کے ذریعہ بچہ اپنے تخیلات کو اصلیت کا جامہ پہناتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لفظ جو بڑوں کے نزدیک مہمل ہیں بچوں کے لئے بہت معانی رکھتے ہیں۔ کوئی بچہ بسکٹ کو ٹو کہتا ہے اور کوئی بچی بلی کو داؤ کہتی ہے اب اگرچہ ہمارے لئے ان الفاظ کے کچھ معنی نہیں ہیں لیکن بچوں کے ذہن کے لئے ان معانی کی اہمیت ہو سکتی ہے اسی طرح بچہ بعض چیزوں کو خاص نام دیدیتا ہے اور ان کے ذریعے اپنا مقصد ظاہر کرتا ہے ایک دفعہ ایک خاتون اپنے بچے کو ایک نظم سنا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتی جاتی تھیں تھوڑی سی نظم سنانے کے بعد خاتون بولیں کہ میرے بچے یہ نظم بہت مشکل ہے میرے خیال میں تم اس کا مطلب نہ سمجھ سکو گے۔ بچہ بولا نہیں امی جان آپ اسکو صرف پڑھتے جائیے اور مطلب نہ سمجھائیے کیونکہ میں اس کا مطلب بخوبی سمجھتا ہوں اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بچہ اپنے خیالات کے مطابق لفظوں میں مفہوم تلاش کر لیتا ہے اور بڑوں کے بیان کرنے سے بچے کے خیالات کے تسلسل میں مداخلت ہوتی ہے۔

بچوں کی کہانی سنانے کی فرمائش کو ٹالنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے اور جب کہانی سنائی جا رہی ہو تو بچہ اپنی تمام تر توجہ کہانی پر مرکوز کر دیتا ہے یہاں تک کہ بعض بچے اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو بھی تھوڑی دیر

کے لئے بھول جاتے ہیں آخر کیوں؟ اس قدر محویت کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب ہمیں نفسیات کے مطالعہ سے مل جاتا ہے۔ کہانی سننے یا سنانے میں سب سے ضروری چیز کسی دوسرے کے جذبات و افعال ——— کو اپنانا ہے کہانی سننے میں بچہ کہانی کے افراد Identification سے اپنا موازنہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں ہم جبلی طور پر ہی دوسروں کے خیالات اور افعال کو اپناتے ہیں اور یہ جبلت بہت چھوٹی عمر میں ہی ظاہر ہوتی ہے تقریباً ڈیڑھ دو سال کی عمر سے ہی لڑکیاں اپنی ماں کے افعال و خواص کو اپنا شروع کر دیتی ہیں اور لڑکے باپ کے کردار کو اخذ کر لیتے ہیں۔ ایک چھوٹی لڑکی اپنی گڑیا کی اسی طرح دیکھ بھال کرتی ہے جس طرح اس کی ماں اس کی نگہداشت کرتی ہے۔

چنانچہ کہانی سنتے ہوئے بچہ اپنی شخصیت کو کہانی کے اہم افراد کی شخصیتوں میں بدلتا رہتا ہے کہتے ہیں کہ نپولین کو بچپن میں بہادروں کی اور جنگ و جدال کی کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا اور اکثر وہ بچپن میں ایسے کھیل کھیلتا جن میں جرنیل بنتا اور لڑائی کے مناظر دہراتا چنانچہ وہ جب بڑا ہوا تو ایک نہایت مشہور جرنیل ثابت ہوا۔ کہانی کے ذریعہ بہت سی نامکمل اور ناآسودہ خواہشات بھی پوری کی جاتی ہیں یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو چیز حقیقت میں حاصل نہیں ہو سکتی اسے تصور و تخیل کی دنیا میں پورا کیا جاتا ہے بچوں کا کہانیوں میں دلچسپی لینا اس بات کی دلیل ہے کہ بچہ کہانی کے افراد کی شخصیتوں کو اپنی شخصیت میں مدغم کرتا رہتا ہے اور جو کام وہ کرتے ہیں انہیں اپنے ہی کام خیال کرتا ہے اور خیالات کی پرواز اس بات میں اسے مدد دیتی ہے۔ دوسری بات انجذاب (Projection) ہے جس طرح ہم دوسروں کے جذبات و افعال کو اپناتے ہیں۔ اسی طرح اپنے خیالات و جذبات بھی دوسروں پر (Project) منجذب کر دیتے ہیں۔

بچپن کا زمانہ چونکہ زیادہ تر تخیلات کا دور ہے لہذا کہانی کے کرداروں کے افعال میں بچہ اپنی خواہشات کی آسودگی اور تکمیل سے مسرت حاصل کرتا ہے چنانچہ انسانی خواہشات تخیل کے ذریعہ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً ایک بچے کو مٹھائی کھانے کا بہت شوق ہے نتیجتاً وہ ایسی کہانی سننا پسند کرے گا جس میں مٹھائی کا تذکرہ آئے۔ کہانی میں بندر کا مٹھائی اٹھا کر لے جانا پھر مزے لے لے کر کھانے میں بچہ اپنی خواہش کی تکمیل پا لیتا ہے اور تسلی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح بچے کی اپنی مشکلات اور دلچسپیاں کہانی کے افراد کی مشکلات اور دلچسپیاں بن جاتی ہیں جن بچوں کو مار دھاڑ اور لڑائی کی کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے ان میں (Aggression) تشدد کا جارحانہ رجحان زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی جارحانہ ذہنیت کہانی کے افراد پر منجذب (Project) کرتے ہیں مثلاً کہانی میں کتے نے بلی کو مارا یا بلی نے چوہے کو پکڑ لیا تو بعض بچے اس پر بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کے اپنے تشدد کا رجحان پورا ہو جاتا ہے کہانی سننے میں تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ بچہ اپنی بعض صلاحیتوں کو جو نامکمل ہوتی ہیں پوری کر لیتا ہے (Adler) ایک مشہور ماہر نفسیات نے بچوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اس کا خیال ہے کہ انسانوں میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں ان کو وہ کسی نہ کسی طرح پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے لئے اگر وہ حقیقی مقصد حاصل نہ کر سکے تو انسان تخیل کی دنیا سے رجوع کرتا ہے اور تخیل کی غیر حقیقی دنیا میں اپنی کمی کو پورا کر لیتا ہے اپنی خامیوں کو پورا کرنے کی ایک مثال دن کے وقت خواب دیکھنا یعنی ہوائی قلعے تعمیر کرنا ہے اسی طرح کہانی میں بھی ہم کہانی کے افراد سے ایسے کام لیتے ہیں جو ہم خود نہیں کر سکتے۔ فرض کیجئے ایک لنگڑا انسان ایک بہت بہادر اور تندرست انسان کی کہانی سن کر بہت خوش ہوتا ہے اور اس طرح کہانی کے ہیرو میں وہ اپنی خامیوں کے پورا ہونے کی شکل میں اپنی کمی کے احساس کو دبا لیتا ہے (Adler) کہتا ہے کہ بچپن کے زمانہ میں (Urge Dominance) غلبہ حاصل کرنے کی خواہش ہی سے کمی پوری کرنے کے اس عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

یہ تمام باتیں ہیں جو ایک تسلسل اختیار کر کے بچے کے ذہن پر اس طرح اثر کرتی ہیں کہ بچہ کہانی کی رنگین دنیا میں حقیقی دنیا سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور کہانی سننا پسند کرتا ہے۔

کس عمر میں کیسی کہانی سنانی چاہیئے

چھوٹے بڑے ہر عمر کے بچوں کو کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے لیکن کہانی سنانے والے کے لئے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس عمر کے بچوں کو کس قسم کی کہانی سنائی جائے بچوں کو کہانی سناتے ہوئے عمر کا لحاظ

رکھنا بہت ضروری ہے جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ دماغی نشو و نما بھی ہوتی ہے چونکہ بچے کی جسمانی و ذہنی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی اس لئے کسی بسیط (Abstract) چیز کا سمجھنا بچے کے لئے بہت مشکل ہے بچوں کی پرواز تخیل بہت بلند ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر بچہ اپنے تخیل سے کام لے سکے۔ بعض بچوں میں قوت تخیل کم ہوتی ہے اور بعض میں زیادہ۔ چنانچہ کہانی سناتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ بچہ اپنی قوت تخیل سے کام لے سکتا ہے یا نہیں۔

جن بچوں کی قوت تخیل کم ہو انہیں ایسی کہانیاں سنانی چاہئیں جو اصلیت سے بہت زیادہ تعلق رکھتی ہوں۔ اور میرے خیال میں تو تقریباً ہر بچے کو ہی اصلیت سے تعلق رکھنے والی کہانیاں سنانی چاہئیں۔

کہانیاں سننا کہانی پڑھنے کی نسبت زیادہ پسند کیا جاتا ہے بچے تو بچے۔ بڑی عمر کے لوگ بھی اکثر کہانی سننا بہت پسند کرتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جس کا کہانی سنانے والے کو خیال رکھنا چاہئیے یہ ہے کہ کس قسم کی کہانی سنائے جائے۔ کہانیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جانوروں کی کہانیاں انسانوں کی کہانیاں پریوں اور جنوں کی کہانیاں، مزاحیہ کہانیاں۔ سراغ رسانی کی کہانیاں وغیرہ۔ چنانچہ کہانی سنانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئیے کہ بچوں کو کس قسم کی کہانی پسند ہے۔ ہر انسان کی دلچسپیاں اور پسندیدگیاں جدا جدا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہانی سناتے وقت بچوں کی دلچسپی اور پسند کا لحاظ رکھنا چاہئیے یعنی کہانی کا انتخاب بچوں پر چھوڑ دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچوں کی عمر کتنی ہے یعنی کسی خاص وقت پر کہانی سننے والے بچوں کی عمر کیا ہے؟ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ کہانی بچوں کی عمر اور سمجھ کے مطابق ہونی چاہئیے۔ کہانی نہایت سلیس اور سلجھی ہوئی زبان میں سنائی جائے مشکل الفاظ چھوٹی عمر کے بچے نہیں سمجھ سکتے کہانیوں میں زیادہ تر روزمرہ کے واقعات بیان کرنے چاہئیں اور ایسی چیزوں کا بیان ہونا چاہئیے جو بچہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کرتا ہے۔ مزاحیہ کہانی سناتے ہوئے۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ مذاق اس قسم کا ہو جسے بچہ سمجھ سکے اور اس سے لطف اندوز (Appreciate) ہو سکے کہانی سنانے والا کوشش کرکے نئے نئے الفاظ لائے تاکہ بچہ انہیں سیکھ سکے۔ کہانی کے ذریعے بچے کی زبان بھی سدھاری جا سکتی ہے۔

بہت چھوٹی عمر کے بچے یعنی دو سال سے چار سال تک کی زیادہ تر جانوروں میں دلچسپی لی جاتی ہے۔ اور ایسے بچوں کو ان کے ماحول سے تعلق رکھنے والے جانوروں کی کہانیاں سنانی چاہئیں بعض کتابوں میں کے لئے بلی۔ خرگوش۔ کتا بطخ وغیرہ جانوروں کی کہانیاں نہایت دلچسپ طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ کتابوں میں تمام تصویریں ہی تصویریں ہیں (Peter Rabit Books) اور تصویروں کے ساتھ نہایت سہل الفاظ میں ان جانوروں کے کام بیان کئے جاتے ہیں کہیں بلی کو پکار رہی ہے تو کہیں کپڑے دھو رہی ہے کہیں خرگوش کے بچے باغ میں کھیل رہے ہیں۔ دو تین سال کے بچے اڑتی ہوئی چڑیوں اور پرندوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ بلی اور کتے بھی بچوں کو بہت پسند ہوتے ہیں خاص طور پر خرگوش۔ چنانچہ چھوٹے بچوں کو کہانی کی صورت میں جانوروں کی زندگی کے متعلق بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے اس طرح سے ان کے تصور کو بڑھانے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

چار پانچ سال سے اوپر عمر کے بچے تقریباً ہر قسم کی کہانی سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ چار سال سے کم عمر کے بچوں کو جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں سنانی چاہئیے۔ کیوں کہ ان کی پرواز تخیل ابھی اتنی نہیں ہوتی کہ کسی ایسی چیز کو سمجھ سکیں جو کبھی نظر نہیں آسکی لیکن چار سال سے بڑی عمر کے بچوں کو ہم پریوں کی کہانی سنا سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں بچے سب سے زیادہ دلچسپی پریوں کی کہانی ہی میں لیتے ہیں۔ پریوں کی کہانی کے ذریعے ایک غیر مادی چیز اور غیر موجودہ چیز کو اصلیت کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کا تخیل بھی بڑھتا جاتا ہے۔ مزاحیہ کہانی بچے اکثر پسند کرتے ہیں اور بچوں کو ہنسانے کے لئے مزاحیہ کہانی سے زیادہ عمدہ کوئی ذریعہ نہیں۔

قدرتی مناظر اور قدرتی چیزوں کو کہانی کے طور پر پیش کرنا بھی ایک عمدہ شغل ہے۔ بچے اکثر قدرتی چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مثلاً اگر چھوٹی عمر کے بچوں کو چندا ماموں کی کہانی سنائی جائے۔ تو وہ اس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ایک دن شام کے وقت بچوں کو کہانی سنا رہی تھی کہ بچو! دیکھو چندا ماموں اور بادل میاں دو دوست تھے۔ چندا ماموں اور بادل

ں میں ایک دن دوڑ کی شرط لگی۔ بادل میاں چندا ماموں سے بڑھ گئے
ہ وغیرہ ایک بچی تھوڑی دیر چندا ماموں کی طرف دیکھتی رہی اور پھر کہنے
چندا ماموں اب بھی بادل کے پیچھے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ اور خوشی سے
ل بجانے لگی۔ یعنی کہانی سننے پر بچی نے چاند اور بادل کو غور سے دیکھا اور
سے معلوم ہوا کہ وہ سچ مچ چل رہے تھے۔ اس طرح سے کہانی کے ذریعہ بچے
شوق مشاہدہ بڑھتا ہے اور اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

آٹھ سال سے بارہ سال کے بچوں کو اکثر تاریخی کہانیاں، بہادری
کی کہانیاں اور سراغ رسانی کی کہانیاں پسند ہوتی ہیں۔ اس عمر میں ہماری
بلّیت تجسّس ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور یہ اسی کا تقاضا ہے کہ بچے
س عمر میں سراغ رسانی کی کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ جستجو کا مادہ ہی
تو ہے جو ہمیں اپنے گرد و پیش اور دور دراز کی چیزوں پر غور کرنے پر مجبور
کرتا ہے اور اسی کی بدولت دنیا میں بہت سی معلومات میں اضافہ
ہوا ہے۔ کولمبس اسی شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لئے دنیا کی سیر کو نکلا
اور اس نے امریکہ کا براعظم دریافت کیا۔

کہانی سناتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ لڑکے
اور لڑکیوں کو ذرا مختلف قسم کی کہانی سنائی جائے۔ بہت چھوٹی عمر میں لڑکے
اور لڑکیوں کو ایک ہی قسم کی کہانی سنا سکتے ہیں لیکن عمر کے ساتھ لڑکے اور
لڑکیوں کی پسند اور دلچسپیوں میں بھی فرق آنا شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں عملی
طور پر گڑیا میں دلچسپی لیتی ہیں۔ اور لڑکے زیادہ تر بہادری کی کہانیوں میں
دلچسپی لیتے ہیں رفتہ رفتہ لڑکی زیادہ تر گھریلو زندگی میں دلچسپی لینے لگے گی۔
اور لڑکا زیادہ تر بیرونی زندگی میں دلچسپی لے گا۔

کہانی سنانے کے لئے سب سے بہترین چیز اپنی زندگی یا کسی کی
زندگی کے واقعات سنانا ہے۔ اس طرح سے بچوں کی معلومات بھی بڑھتی
ہیں۔ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ خوف دلانے والی کہانیاں
بچوں کے لئے مفید نہیں ہوتی۔ کیوں کہ خوف جسمانی اور دماغی ہر دو لحاظ
سے نقصان دہ ہے۔ ماہرین نفسیات نے تجربوں کے ذریعے معلوم کیا ہے
کہ خوف خواہ کسی نوعیت کا ہو نظام ہضم پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔ اس
لئے بچوں کو خاص طور پر رات کو سوتے وقت جنوں اور دیوؤں اور خوف
دلانے والی کہانی کبھی نہیں سنانی چاہیئے کیونکہ اس طرح انہیں رات کو ڈراؤنے

خواب دکھائی دیتے ہیں۔

کہانیوں کے ذریعے ذہنی تربیت

کہانی سننا اور سنانا نہ صرف ایک دلچسپ شغل ہے اور بلکہ ذہنی
تربیت کا ایک معقول ذریعہ بھی ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت کچھ اس
طور پر ہوئی ہے کہ پیدائش کے وقت سے ہی بچہ خاص خاص صلاحیتیں
لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان قدرتی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا ہمارے
ماحول پر منحصر ہے۔

بچپن کے اولین مراحل ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ کس بچے میں
کیا صلاحیت اور اہلیت ہے۔ مثلاً جس بچے کو بڑے ہو کر مصور بننا ہو
تو وہ کاغذ پر یا زمین پر لکیریں کھینچتا رہے گا۔ اور اگر ان سے پوچھا جائے کہ
کیا بنا رہے تھے۔ تو وہ اپنی تصویر کو کوئی نہ کوئی نام بھی دیدیتے ہیں
مثلاً یہ کہ میں ایک گھوڑے کی تصویر بنا رہا تھا اسی طرح جس بچے میں
بڑے ہو کر انجینیر بننے کی قابلیت ہوتی ہے۔ وہ بچپن ہی میں چھوٹی چھوٹی
چیزیں بنانے میں دلچسپی لیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو بڑھایا کیسے جا سکتا ہے
اگر ہم ان پیدائشی صلاحیتوں کو بڑھنے کا موقع نہ دیں تو یہ صلاحیتیں
اسی طرح دبی کی دبی رہتی ہیں۔ اور بڑھنے نہیں پاتیں۔

فرض کیجیے ایک بچے کو کہانی لکھنے کا شوق ہے یعنی بچے میں
ایک مصنف بننے کی صلاحیت ہے لیکن اس کا ماحول اس قسم کا ہے
کہ بچہ اپنے اس شوق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے ایسے حالات میں بچے
کو تعلیم ہی نہ ملے۔ یا اسے بالکل معمولی قسم کی تعلیم حاصل ہو۔ تو اس صورت
میں وہ ایک کامیاب مصنف نہ بن سکے گا۔

ہمیں اپنے ذہن میں ایک قسم کا نقشہ بنا لینا چاہیئے۔ کہ بچے کی
تربیت اس طور پر کرنا ہے اور اسی منصوبے کے تحت بچے کے ماحول کو ڈھالنا
چاہیئے یا کم از کم ماحول کو بچے کی نشوونما کے لئے موزوں بنانا چاہیئے اسی
طرح کہانی کے ذریعے انسانی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا کام لیا جا سکتا ہے
یعنی اگر ہم چاہیں کہ بچہ مخصوص چیز میں دلچسپی لینا شروع کرے تو اس مقصد کو
کہانی کی صورت میں پیش کریں۔ بچہ اپنے آپ اس میں دلچسپی لینا شروع

کرنے لگا۔

مثلاً۔ کہانی کے ذریعے ہم انسانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق واقفیت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یعنی خانگی مذہبی۔ ملکی۔ ہر طرح کی تعلیم کہانی کے ذریعے دی جا سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک بچی کو کھانا پکانے میں دلچسپی ہے یا کسی لڑکے کو تعمیر کا شوق ہے۔ تو آپ اسے اس قسم کی کہانی سنائیں جس میں ان باتوں کا ذکر آئے۔ یا آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کوئی خاص کام سیکھے۔ تو اس کام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے آپ کہانی کو اس طرح پیش کیجئے کہ اس کام کا ذکر نہایت دل نشیں طریقہ پر کہانی میں آجائے۔ بچے کی دلچسپی خود بخود بڑھ جائے گی! اور کہانی کے ساتھ ساتھ بچے کے ماحول میں بھی ایسی چیزیں مہیا کیجئے جو اس شوق میں مدد دے سکیں۔

بچوں کی واقفیت بڑھانے کے لئے کہانی ایک عمدہ ذریعہ ہے اور کہانیوں کے ذریعے بچوں کو ایجادات و معلومات کی بابت بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ تصور کو بڑھانے کا ذریعہ کہانی سننا ہے۔ مصوری۔ موسیقی وغیرہ فنونِ لطیفہ میں خاص طور پر تصور کو بہت دخل ہے۔ جن بچوں میں قوتِ تخیل زیادہ پائی جائے۔ وہ نہایت کامیاب مصور یا موسیقار یا شاعر اور مصنف بن سکتے ہیں۔ کہانی سے ہم تفریح اور اصلاح دونوں کام لے سکتے ہیں۔ عام طور پر بچے سکول جانے سے گھبراتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سکول میں اساتذہ کا تعلیم دینے کا طریقہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے دماغوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس پر سکول کے مضمون بھی نہایت خشک قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہی سبق اگر کہانی کی صورت میں بچے کے سامنے پیش کئے جائیں تو بچہ ان میں زیادہ دلچسپی لے گا۔ اور اس کی توجہ خود بخود سبق کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ کہانی کی یہ خاصیت ہوتی ہے۔ کہ وہ ایک ٹھوس حقیقت کو نہایت دلچسپ صورت میں پیش کرتی ہے۔ اور اس طرح بچے کے لئے تفریح کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔

کہانی کے ذریعے بچوں کو اخلاقی تربیت دینے کے لئے نتیجہ خیز کہانیاں دلچسپ پیرائے میں بیان کی جاتی ہیں تاکہ بچہ تفریح کے ساتھ ساتھ ان سے سبق بھی سیکھے اور اس کی عادات و اخلاق کی اصلاح بھی ہو جائے۔ میرے خیال میں اخلاقی اصلاح کے لئے کہانی ایک نہایت موزوں ذریعہ ہے۔ خاص طور پر پریوں کی کہانی کے ذریعے ہم نیکی۔ سچائی۔ سخاوت۔ وغیرہ اوصاف بچوں میں پیدا کر سکتے ہیں۔ پریوں کی کہانی کے ذریعہ اخلاقی سبق دینے کی ایک مشہور مثال وہ کہانی ہے جس میں ایک رحم دل اور نیک دل لڑکی منہ سے بات کرتے وقت پھول جھڑتے تھے۔ لیکن اس کی سوتیلی جو بہت بدمزاج اور بیرحم تھی اس کے منہ سے بات کرتے وقت کیڑے مکوڑے نکلتے تھے۔ بچپن میں تقریباً ہر بچہ یہ کہانی سنتا ہے۔ بڑے ہو کر یہ سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ کہانی میں سچائی اور حقیقت کو بہت اچھے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دل کی بات منہ سے نکل جاتی ہے یعنی اس کہانی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر انسان کے دل میں اچھائی ہو تو اس کی ظاہری باتوں سے بھی اچھائی ہی ظاہر ہوتی ہے اور اگر باطن میں برائی ہو تو گفتگو سے اس برائی کا پتہ چل ہی جاتا ہے چنانچہ کہانی کے ذریعہ ہم بچوں کے سامنے حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ اور بڑے ہو کر بچہ خود بخود اس حقیقت کو جان جاتا ہے تمثیلی کہانیوں کی بہترین مثال انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ کی تمثیلیں ہیں چنانچہ کہانیوں اور تمثیلوں سے اچھے اخلاق کی تعلیم دینے میں حضرت عیسیٰ کو اولیت حاصل ہے۔ ان کی تمثیلوں کا پیرایہ اتنا دل نشین ہے سننے والا فوراً مقصد کو پالیتا ہے۔

(بشکریہ "ادب")

تاج الدین احمد رامنگری •

○

بہار پر متصرف ابھی خزاں ہے یہاں
فضائے صحنِ گلستاں دھواں دھواں ہی یہاں

کلی فسردہ، عنادل اداس گل غمناک
وہ کون ہے جو کہ مسرور شادماں ہے یہاں

اُٹھ اے ندیم کہ روشن کریں یقیں کے کنول
محیط چارطرف ظلمتِ گماں ہے یہاں

جو فن راہزنی میں کمال رکھتا ہے
خدا کی شان وہی میرِ کارواں ہے یہاں

ہیں بت تو چھائے ہوئے دہر پر مگر اے دوست
خلیل تیشہ بکف اب کوئی کہاں ہے یہاں

مذاقِ دید ہی باقی نہیں رہا ورنہ
جمالِ دوست تو ہر رنگ میں عیاں ہے یہاں

مری نظر سے کوئی کائنات کو دیکھے
تو ذرّے ذرّے میں پوشیدہ اک جہاں ہی یہاں

خرابِ شیشہ و ساغر جو ہیں وہ کیا جانیں
کسی کی مست نگاہی بھی مے فشاں ہی یہاں

فنا پذیر ہے ہر شے جہانِ ہستی کی
بس اک متاعِ محبت ہی جاوداں ہی یہاں

یہ کاروبار ہے عشق و وفا کا اے ناصح!
خیال سود نہ اندیشۂ زیاں ہے یہاں

نکل بھی حجلۂ مشرق سے اے نگارِ سحر
ترے فراق میں بیتاب اک جہاں ہے یہاں

قطعہ

سمجھ رہے ہو حقیقت جسے مجاز نہ ہو
کچھ اور سلسلۂ تیرگی دراز نہ ہو

سحر کے بعد بھی جو روشنی نہیں ہوتی
شعاعِ مہر کی ظلمت سے ساز باز نہ ہو

آزاد مظفر پوری

سُرخاب کے پَر

میں گلاب کے پھول توڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی "بابو تم کب آئے ؟" اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے "رجنی!" مجھے یاد آ گیا اور میں ایک دم پلٹ پڑا۔

رجنی! میں نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "اوہ! تو اتنی بڑی ہو گئی" اور وہ شرما کر سمٹ گئی۔ آج چار سال بعد میں اپنے مکان آیا تھا چار سال قبل یہی رجنی ایک معمولی سی بچی تھی! اور میں بھی اتنا سیانا نہ ہوا تھا آج رجنی کی شخصیت مجھے غیر معمولی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک عجیب ساجذ میرے دل میں پیدا ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے یونہی کھڑی رہتی اور میں اس سے باتیں کرتا ہوں۔ باتیں! بے کار باتیں، بے مقصد باتیں جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔ یونہی خواہ مخواہ۔ لیکن کرتا رہوں۔

"ہاں! رجنی تو اچھی ہے نا؟" میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تیری ماں کا کیا حال ہے اور ہاں مکھن کیسا ہے ؟"

"سب ٹھیک ہے بابو ؟"

"تو ادھر کس لئے آئی تھی" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ماں نے بھیجا ہے کہ سرکار۔ (رجنی کی ماں میرے اباجان کو سرکار کہا کرتی تھی) کے یہاں سے گیہوں کی پسائی کے پیسے لے آ" اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"کتنے پیسے باقی ہیں ؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"پانچ سیر گیہوں کی پسائی۔ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید کل دس پیسے ہوں گے بابو"

"ہیں! میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔" پانچ سیر گیہوں کی پسائی کے دس پیسے ؟"

"ہاں بابو" وہ فوراً بول پڑی۔ کیا بہت زیادہ ہیں ؟"

"زیادہ نہیں پگلی، میں نے پتلون کی جیب سے پرس نکالا اور پانچ پانچ کے دو نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

"یہ کیا ؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔ بابو تم نے مجھے یہ کیسے روپے دیئے ہیں ؟"

"جا لے جا۔ اپنی ماں کو دیدینا اور کہنا کہ پھول بابو نے دیئے ہیں"

"لیکن بابو اگر وہ پوچھے گی کہ کیوں دیئے ہیں تو میں کیا جواب دوں گی" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو روپے لے کر چل" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تیری ماں کو سمجھا دوں گا۔ رجنی چلی گئی۔

اور میں سوچ میں پڑ گیا

پانچ سیر گیہوں کی پسائی صرف دس پیسے! کم و بیش تین گھنٹے کی محنت و مشقت کا حاصل صرف دس پیسے! دس پیسے جنھیں میں پان کھا کر تھوک دیتا ہوں۔ دس پیسے جن سے میں گولڈ فلیک کے دو سگریٹ خرید کر پھونک دیتا ہوں۔ دس پیسے جن سے میں روزانہ ایک اخبار خریدتا ہوں۔ دس پیسے جن سے چائے کی ایک پیالی حاصل کرتا ہوں۔ نجانے دن بھر میں کتنے دس پیسے فضول خرچ کر ڈالتا ہوں لیکن .... یہی دس پیسے ایک غریب انسان کے تین گھنٹے محنت کرنے کا حاصل ہیں اُف!

میں کانپ اٹھا۔ میرا سر گھوم گیا اور میں پھول توڑے بغیر واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ کر اخبار الٹنے لگا۔

کنگ اسٹائل! ایک بڑا سا بگلہ مجھے اخبار کے ایک پورے صفحہ پر نظر آیا۔ دس پیسے! دس سگریٹ کی قیمت دس پیسے! اور دوسرے ہی لمحہ میں نے جھلا کر اخبار دور پھینک دیا "کمبخت!" میں بڑبڑایا جہاں دیکھو وہی دس پیسے" پھر مجھے اپنا ضمیر مجرم نظر آنے لگا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں خونی تھا۔ دنیا کی نظر میں نہیں۔ اپنے آرام و آسائش کی نظر میں نہیں بلکہ ایک انسان کی نظر میں۔ ایسا انسان جو واقعی انسان ہو۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا

کہیں پان کھا کر ایک غریب کی محنت و مشقت پر تھوک رہا تھا سگریٹ کا دھواں اڑا کر غریبوں کی مجبوریوں کا مذاق اڑا رہا تھا اور چائے کی پیالی میں کوئی بے لبس انسان کا خون بھر بھر کر پی رہا تھا۔ میں دنیا کے حالات جاننے کے لئے اخبار نہیں پڑھ رہا تھا بلکہ اپنے اطراف کے حالات پر پردہ ڈالنے کے لئے خود کو اخباروں کے پیچھے چھپا رہا تھا۔

"پھول... ابا جان نے پکارا اور خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا!

دس بج چکے ہیں اور اب تک تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا ابا نے ہمدردی سے کہا۔ اور ہاں اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ ذرا بستی میں گھوم پھر آؤ۔ چچا کل ہی سے تمہارے انتظار میں ہیں۔

اور میں ناشتہ کر کے چچا جان سے ملنے چلا گیا۔ بہت دیر تک ہم آدھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں چچی جان سے ملنے اندر چلا گیا۔ چچی جان خلاف توقع بڑی محبت سے پیش آئیں۔ ابھی چند ہی سال کی تو بات تھی جب گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے چچی جان سے میرے نشاط کے لئے میرے رشتہ کا محض تذکرہ کر دیا تھا اور چچی جان اس بات پر چراغ پا ہو گئی تھیں "بھلا کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے پھول میاں میں؟ دیکھو آئندہ اس قسم کی باتیں مجھ سے نہ کرنا" اور یہی چچی آج بات بات پر مجھ پر نثار ہو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ چچی جان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ایک جوان سی لڑکی نے ٹرے لا کر میرے سامنے رکھ دی میری نظریں غیر ارادی طور پر اٹھ گئیں۔ پھر میں نے چچی جان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

ارے تو بھول گیا۔ چچی جان نے میری حیران نظروں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اتنی جلد۔ صرف چار سال کے عرصے میں تو نشاط کو بھی بھول گیا۔

نشاط... میں گھبرا کر بولا۔ اتنی بڑی ہو گئی چچی جان؟ میں تو سمجھتا تھا ابھی گڈے گڑیا کا بیاہ ہی رچاتی ہو گی! میرے اس فقرہ پر نشاط شرما کر چچی کے پیچھے جا چھپی اور چچی جان نے مجھے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "ارے بڑا شریر ہے" کچھ دیر بعد مجھے رجنی سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور میں چچی جان سے اجازت لے کر رجنی کے یہاں چلا آیا۔

لکھن برگد کی پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً اسے اپنے پیروں تلے دبا دیا اور سلام کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، ہاں! وہ تقریباً چلایا۔ دیکھ پھول بابو آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے لئے چارپائی بچھا دی۔

رجنی اور بڑھیا دونوں باہر چلی آئیں۔ بڑھیا نے میری خیریت پوچھی اور مجھے اپنی جوان دعاؤں سے مالا مال کر دیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے پوچھا "رجنی کی ماں میں نے کچھ روپے بھجوائے تھے تم نے بُرا تو نہیں مانا؟ اور بڑھیا پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ رجنی جو پاس ہی کھڑی تھی۔ بول اٹھی "ہاں ماں! آج صبح جب میں گیہوں کی پسائی کے پیسے لینے گئی تو بابو باہر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر حال چال پوچھا اور دس روپے دیئے کہ اپنی ماں کو دیدینا میں نے اب تک وہ روپے اس ڈر سے نہیں دیئے کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔"

تو تو نے وہ دس پیسے مجھے کہاں سے لا کر دیتے؟" بڑھیا نے رجنی کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اوہ وہ! رجنی بولی۔ وہ تو میں نے لکھن بھیا سے مانگ کر تمہیں دیتے تھے کہ کہیں تم یہ سمجھو کہ پیسے نہیں ملے بڑھیا رجنی کے جواب سے مطمئن ہو گئی لیکن کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آئی۔ میں تاڑ گیا اور پوچھ بیٹھا۔

رجنی کی ماں کیا سوچ رہی ہے تو؟

نہیں بابو کچھ نہیں۔ اس نے اس طرح کہا جیسے میں نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا ہو۔

تو تو وہ روپے تیرے ہی تھے نا؟ میں نے اس کے دل ٹٹولنے کے لئے کہا۔ بیٹا! تم نے میری غربت پر ترس کھا کر وہ روپے دیتے ہیں۔ تم نے اپنی خوشی سے دیئے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں اسے واپس نہ کرتی لیکن تم سرکار کے مزاج سے خوب واقف ہو۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا تو پھر ہم لوگوں کی شامت آ جائے گی۔"

بڑھیا کے اس جواب سے میں بوکھلا سا گیا لیکن پھر ایک بار اور کوشش کی "تو یہ سب مت سوچ۔ ابا جان سے کون یہ باتیں کہے گا انہیں کیسے معلوم ہو سکے گا۔ میں نے اس کا شک مٹانے کے لئے کہا۔

"بیٹا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم ضد نہ کرو میں روپے نہیں لے سکتی۔ سرکار سے بھگوان بچائے۔"

بڑھیا کے اس صاف جواب پر آج پہلی بار مجھے ابا جان سے نفرت

محسوس ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ اپنی بے چا
مدردی پر، اپنے ابا جان کے ظلم پر۔ رجنی کے گھر والوں کی غربت پر، اپنے
ادر سماج کے کھوکھلے قوانین پر۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آزادی کے بعد انسان
انسان کا فرق مٹ جائیگا۔ ان کے مابین غیر ملکی اصولوں نے جو دوری
اکردی ہے وہ دور ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا تھا۔ آج بھی وہی
کار۔ وہی رجنی کے غریب گھر والے۔ وہی سرکار کا خوف اور وہی
بس و مجبور انسان۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کل ہم غیر لوگوں پر اس کا الزام
مرتے تھے اور آج اپنوں پر الزام؟ شراب وہی تھی پیمانہ البتہ بدل چکا
میں سوچ رہا تھا کہ دنیا نے اتنی ترقی کرلی لیکن بڑھیا جہاں تھی
ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی ڈیماکریسی، روس کا کمیونزم۔ بھارت کا سیکولرزم
پاکستان کا اسلام ازم۔ کوئی بھی ازم۔ بڑھیا کے دل سے سرکار کا ڈر نکالنے
لیے آگے نہ بڑھا تھا ——— میں نے حیرانی
سے رجنی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس
جذبات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید وہ بھی میرے چہرے سے
ری دلی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں دل برداشتہ ہوکر واپس چل پڑا۔ لکھن میرے ساتھ ہو لیا
ر رجنی اور بڑھیا مجھے مختلف نظروں سے تکتی رہیں۔ راستہ میں میں نے
ن سے رجنی کی شادی کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ لڑکے تو بہت سارے ملتے
ں لیکن تلک کے لئے بہت بھاری رقم مانگتے ہیں جو ان لوگوں کے بس سے
ہر تھا۔ لکھن نے کہا کہ وہ جو کچھ کماتا تھا اس سے بمشکل گھر بھر کا خرچ چل سکتا
تھا۔ پھر رجنی کے بیاہ کے لئے تو ہزاروں روپے کی ضرورت تھی مجھے دل
دل میں بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دور ساتھ چل کر لکھن تمباکو کے کھیت
طرف چلا گیا اور میں اپنے مکان پر لوٹ آیا۔

دو تین دن بعد چچا اور ابا جان کے درمیان میری اور نشاط کی شادی
متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ان لوگوں کی گفتگو
سلے لے کر سن رہا تھا۔ دل ایک انجانی خوشی سے جھوم رہا تھا یکایک
نئے خیال نے دل میں جنم لیا۔ مجھے رجنی یاد آگئی جس کی شادی محض اس
سے نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گھر والوں کے پاس اس کا بیاہ کرنے کے
لئے روپیہ نہیں تھا ——— رجنی اور نشاط

فطرت نے دونوں کو جوانی عطا کی تھی۔ کم و بیش ایک ہی طرح کے جذبات
دونوں کے دلوں میں موجزن ہوں گے لیکن پھر بھی کتنی دوری تھی دونوں
کے درمیان۔ ایک طرف چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی رجنی۔ دوسری طرف
زریں ملبوسات اور سونے چاندی سے لدی لدائی نشاط ایک طرف
نادار بڑھیا اور لکھن۔ دوسری طرف مالدار چچا اور امیر گھرانہ۔ ایک طرف تلک کے
بھاری رقم کی مانگ۔ دوسری طرف چچا جان کی دس ہزار کی پیشکش چچا جان
اپنی نشاط کے لئے شوہر خرید رہے تھے۔ لیکن رجنی کے لئے کون دولہا خریدتا
نشاط کی خواہشات کی تسکین کے لئے سونے چاندی کے کھلونے تھے لیکن
رجنی کو مٹی کا کھلونا بھی نصیب نہیں تھا۔ ہر عورت کا دل چاند جیسا ہوتا
ہے جس طرح چاند میں داغ ہوتا ہے اسی طرح عورت کے دل میں ایک
مرد کی خواہش، نشاط کی یہ خواہش پوری ہو رہی تھی لیکن رجنی.....
رجنی کا کیا ہوگا؟ معاً ایک نہایت ہی حسین ترکیب میرے ذہن میں
آئی۔ میں اگر اپنے آپ کو بیچ کر کسی کے لئے کچھ خرید لوں تو کیسا رہے؟
بہت اچھا۔ یہ دل کا جواب تھا۔ اور میں نے یہ سوچ لیا کہ چچا جان سے
مجھے جو دس ہزار روپے ملیں گے۔ وہ میں رجنی پر خرچ کر ڈالوں گا۔

بے اختیاری میں میں بھاگتا ہوا رجنی کے یہاں پہونچا اور بڑھیا اور
لکھن سے کہا کہ وہ جہاں تک ہو سکے رجنی کے لئے اچھا سا لڑکا پسند کریں اور مجھے
خبر دیں۔ شام کے وقت ابا جان نے میرا دل ٹٹولنے کے لئے مجھ سے نشاط
سے میری شادی کا تذکرہ چھیڑا۔ میں حامی بھرنے ہی والا تھا کہ مجھے چچی جان کا
کبھی کا بولا ہوا جملہ یاد آگیا" بھلا کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے پھول میاں
میں؟" میں سوچ میں پڑ گیا کہ آج سے یہی چار پانچ سال قبل جب میں صرف
میٹرک کا طالب علم تھا تو مجھ میں کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا تھا لیکن اب جب
میں گریجویٹ ہو چکا تھا تو چچی جان کو مجھ میں سرخاب کا پر لگا ہوا نظر آیا
اور اب وہ نشاط کے لئے یہی سرخاب کا پر حاصل کرنے کے لئے ناک رگڑ رہی
تھیں۔ اس وقت اگر میں انکار کر دوں تو پھر مجھے نشاط کا خیال آیا۔ اس
غریب نے تو میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ بزرگوں کے گناہ کی سزا اس کی اولاد کو دینا
سراسر ناانصافی ہے پھر یکایک رجنی کا خیال آیا۔ میں نے رجنی کی شادی کے
لئے لکھن وغیرہ سے صرف چچا سے ملنے والے روپیوں کے بل پر بات کی تھی
اگر میں نشاط سے شادی نہ کروں گا تو پھر رجنی کی شادی بھی ممکن نہیں۔ میرے

ذرا آہ ہی بھر لی۔

دو ہفتہ بعد نشاط کے ساتھ میری شادی ہو گئی اور حسب وعدہ چچا جان نے مجھے دس ہزار روپے دیئے۔ اس درمیان میں رجنی کے گھر والوں نے رجنی کے لئے ایک لڑکا پسند کر لیا تھا۔ ایک دن میں دولہن کے ساتھ خود بھی اس لڑکے کو دیکھنے گیا۔ وہ کسی اسکول میں ٹیچر تھا۔ گورا گورا منحنی سا، خوب صورت مجھے بھی بہت پسند آیا۔

ایک دن اباجان نے مجھ سے چچا کے دیئے ہوئے روپوں میں سے پانچ ہزار روپے طلب کئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے صاف صاف بتا دیا کہ میں اس سے رجنی کی شادی کروں گا۔

"کیا کہا؟ وہ گھر جسے، تم ایک کمینے کو اتنا سر چڑھاؤ گے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

نہیں اباجان میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ میں نے آپ سے بالکل صحیح کہا ہے۔"

"تو سنو" انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا "یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

اب مجھے بھی غصہ آ گیا۔ رجنی کی ماں کی باتوں سے پیدا شدہ نفرت نے مجھ میں بے پناہ جرأت دیدی تھی میں نے غصہ سے کہا۔

"ہو گی۔ اباجان یہ شادی ہو کر رہے گی۔"

"گستاخ، بے ادب!" اباجان نے کھولتے ہوئے کہا "جب تک میں زندہ ہوں یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر نشاط بھی آپ کی بہو نہیں رہ سکتی" میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "میں نشاط کو چھوڑ بھی سکتا ہوں۔"

"جھول تم پاگل ہو گئے ہو۔ تمہارا دماغ صحیح نہیں۔ تم خاندان کی ناک کٹوا دو گے۔"

"اگر آپ انسانیت کی ناک کٹوانے پر تلے ہوئے ہیں تو مجھے اپنے خاندان کی ناک کٹوانے میں خوشی ہو گی" میں نے اباجان کی دکھتی ہوئی رگ کو چھوتے ہوئے کہا "رجنی گاؤں کی ناک ہے ساری بہو بیٹیاں گاؤں کی ناک ہوا کرتی ہیں۔ اگر انہیں وقت پر سہارا نہ دیا گیا اور وہ بہک گئیں تو پھر ناک کہاں رہتی ہے؟ ساری بستی کی ناک کٹ جاتی ہے میں آپ کی جوان بھتیجی کو چھوڑنے پر آمادہ ہوں تو آپ کس طرح بلبلا رہے ہیں وہ اس لئے کہ وہ آپ کی عزیز ہے۔ آپ کے خاندان کی ہے لیکن رجنی ـــــــ کیا وہ جوان نہیں؟ کیا وہ آپ کی بھتیجی کے ساتھ بچپن میں نہیں کھیلا کرتی تھی؟ کیا اس کے دل میں جذبات نہیں! افسوس کہ آپ میں زمینداروں کے اندر کا انسان سو چکا ہے۔ اگر رجنی کی شادی ابھی نہیں ہو سکی اور وہ بھٹک گئی تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا؟ آپ . . . . اور اباجان وہاں سے خاموشی سے ہٹ گئے۔

پندرہ روز بعد رجنی کی برات آئی۔ شادی کا سارا انتظام میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رجنی کی شادی شاندار طریقہ پر انجام پا گئی رخصتی کے وقت میں تنہائی میں رجنی سے ملا۔ دلہن کے لباس میں وہ چاند کو شرما رہی تھی میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"پسند آیا دولہا؟" اور جذبات کی شدت میں رجنی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ـــــــ کچھ دیر بعد رجنی ڈولی میں سوار کرائی گئی۔ کہار آہستہ آہستہ میری نظروں سے دور ہو رہے تھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا اپنا خون، میری اپنی بہن مجھ سے دور ہو رہی تھی میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر بعد میں واپس ہوا تو صحن میں اباجان کھڑے تھے انہوں نے لپک کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا میرا دل بھر آیا تو تھا ہی، میں ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پڑا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اس دن جو باتیں میں نے تم سے کہی تھیں اس کے لئے بے حد شرمندہ ہوں"

اور میں خوش خوش اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر سونے کے لئے میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رجنی کی شادی کے متعلق سوچ سوچ کر مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

"کون سا تیر مارا تو نے! اس ملک میں رجنی جیسی ہزاروں جوان لڑکیاں اپنے والدین کی غربت کی وجہ سے اپنے جوان جذبات کا زہر پینے پر مجبور ہیں . . . جو یہ نہ کر سکیں گناہوں کے اتھاہ گڑھوں میں جا گریں۔ کچھ بازار حسن کی زینت بن بیٹھیں جہاں وہ مرد کو خریدنے پر مجبور نہیں بلکہ خود مرد ہی انہیں خرید کرتے ہیں ـــــــ ہزاروں رجنیاں اس ملک میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں انہیں کون سہارا دیگا؟ ان کے لئے کون پھول آئیگا؟"

اور مجھے جو خوشی ہوئی تھی وہ یکسر معدوم ہو گئی میری آنکھیں بھر آئیں اور میں تکیہ میں منہ ڈال کر کچھ سوچتا سوچتا سو گیا۔

ابوالخطیب

یہ کون جاگا؟

(مسلسل ناول)

(۳)

اکمل کا اخراج اسکول کی آٹھویں کلاس سے ہوا تھا اس لئے اس نے میٹرک کی تیاری کے لئے شہر کے ایک پرائیوٹ اسکول کی دسویں کلاس میں داخلہ لے کر امتحان کی تیاری شروع کردی حسب معمول وہ اسکول جاتا لیکن دل میں کوئی امید اور امنگ نہ تھی اس لئے پڑھنے میں وہ کوئی دلچسپی نہ لیتا اور اس بے دلی سے اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی کافی متاثر ہوئیں خصوصًا اس کی قوت حافظہ ہر وقت اس کا دماغ شل سا رہتا۔ اسی اثنا میں میٹرک کے دن بھی قریب آنے لگے تو اسے پھر ماں کے روپیوں کا خیال آیا جو وہ اس کی پڑھائی پر خرچ کر کے کسی امید میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن بے دلی اس سے دور نہ ہوئی اب صرف ایک مہینہ امتحان میں باقی تھا ماں پھر اس کے تصور میں آئی اور اس مرتبہ اسے جھنجھوڑ کر رکھدیا صرف ماں کے تصور نے اسے پھر پڑھنے پر آمادہ کیا دل میں لگن پیدا ہوئی اور بالآخر وہی محرک بن گئی اس لگن اور محنت سے اس کی ذہنی صلاحیتیں عرصے کی بے دلی اور ناامیدی کے بوجھ کو ہٹا کر کھلی فضا میں آ رہی تھیں اور اسے سامنے مستقبل پو کی طرح پھوٹتا نظر آ رہا تھا۔

علی گڑھ سے میٹرک کے امتحان میں اکمل کامیاب ہوگیا لیکن اسے تعجب اس پر ہوا کہ اس نے فرسٹ ڈویژن فرسٹ کیسے حاصل کرلی۔ اس غیر متوقع کامیابی نے حیرت کے بعد خود اعتمادی پیدا کی اور خود کو اس نے ایک ذہین آدمی تصور کیا۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں مسرت کا ایک انکھوا پھوٹا اور اس پر جھومنے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

اس دن کے بعد اس نے خود کو بڑی اہمیت دینا شروع کردی۔

آگے پڑھنے کے لئے اب اس نے کالج میں داخلہ لیا اتفاق کسی کام سے وہ پرنسپل صاحب کے آفس میں گیا انہوں نے بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور اکمل مسکرا کر سر جھکائے جوا

"آپکے والد صاحب کا نام —————— وہ کیا کام"

پرنسل صاحب نے پوچھا اس طرح جس طرح وہ دوسری باتیں کر

"خورشید" اکمل کے منہ سے بے ساختہ ماں کا نام نکل گیا

"میں والد صاحب کا نام پوچھ رہا تھا" پرنسپل نے ق مسکراہٹ آمیز حیرت سے کہا۔

اکمل سنبھلا فورًا اس پر گھبراہٹ چھا گئی اور اسے کچھ بسا لگا جب وہ دیر تک خاموش رہا تو پرنسپل صاحب نے پھر پوچھا۔

"اپنے والد صاحب کا نام بتانے میں اتنی دیر۔ ۔ ۔ آپ سوچ میں کیوں پڑ گئے"؟

"جی کچھ، (تھوڑی دیر ٹھہر کر) شریف الدین قریشی میرے کا نام ہے"۔

گھبراہٹ اس پر گھٹا کی طرح چھائی ہوئی تھی دماغ تھا پرنسپل صاحب کے دوسرے سوال نے اسے بہت ہی غمزدہ کرد کے ذہن میں اس کی والدہ کی بات ابھر کر آئی تو شریف الدین ق پیدا ہوا ہے ذہن میں اس نام کے آتے ہی اس نے فورًا کہا۔

"قوم" پرنسپل صاحب نے دلچسپی کی خاطر پھر ایک سوال کیا

"قریشی عرض کیا نہ نام کے ساتھ"۔ اس مرتبہ اکمل کے میں خفیف سی جھنجھلاہٹ تھی۔

اس دن کے بعد سارے کالج میں اکمل قریشی کے نام سے ہوگیا سارا کالج اسے قریشی صاحب قریشی کہتا تو وہ مسرت میں کر بیڑکی طرح جھومنے لگتا اور مسکراہٹ دیر تک اس کے چہرے سے

طرح چھوٹنے لگتی۔ کالج کی سرگرمیوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہتا ں سے اس کا دل اور بڑھ جاتا۔

شریف صاحب سے داخلے سے پیشتر اسے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ بے نوبت سے آدمی روز ہی اس کی ماں کے پاس آیا کرتے وہ کسی کسی دلچسپی لیتا پھر دلچسپی کا وہاں سوال ہی پیدا نہ ہوتا کیونکہ وہ اپنے مطلب لئے آتے انہیں اس گھر کی دلچسپی سے کیا غرض تھی۔

لیکن اب اس کے ذہن میں یہ بات پوری طرح بیٹھ گئی کہ میں یف صاحب کے نطفے سے ہوں ——— وہی میرے باپ ہیں اس ں نے اس کی پسرانہ محبت کو ابھارا اور اب اس میں شریف صاحب کی م کا جذبہ پیدا ہوا شریف صاحب اسے اب جہاں کہیں ملتے تو ڈ عظیم سے انہیں سلام کرتا دو ایک مرتبہ تو شریف صاحب نے اس ں سے کوئی اثر نہ لیا لیکن جب دن میں کئی کئی مرتبہ اس کے ں د تعظیم کا مظاہرہ ان کے سامنے ہو جاتا تو وہ چونکے اور ان کے ذہن یہ اندیشہ کھٹکا کہ کہیں اس کی ماں مجھے ٹھگنے کے لئے اسے یہ سب کچھ ں سکھا رہی۔ ان کا کیا ٹھیک ان پر کیا اعتبار۔ اس خیال نے شریف کے رسیئے پر بہت متاثر کیا وہ اکمل سے اب روکھے پن سے ملتے سلام ب تھی بڑی بے توجہی سے دیتے تاکہ یہ قریب نہ آپائے۔ جب گھر میں ں اکمل کی موجودگی کا کوئی خیال نہ کرتے بلکہ پہلے کی طرح اس کے ے اس کی ماں سے مذاق کیا کرتے اکمل کو بڑی غیرت آتی وہ نظریں رو ہاں سے چلا جاتا اور اس کو جاتے ہوتے دیکھ کر ماں بھی قدرے ندامت ں کرتی کالج کے رنگوں میں اب اس کا دل بہت لگنے لگا اپنا زیادہ انہی میں صرف کرتا۔

اچھے اچھے کپڑے بھی اس نے پہننا شروع کر دیئے اپنی لمبی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی بھی پہن لی۔ کلاس کی لڑکیاں اسے اب بڑے غور یکھتی رہتیں۔ اکمل جب کلاس میں داخل ہوتا تو آپس میں اس کی شارہ کر کے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ باتیں کیا کرتیں۔ اکمل ان اشاروں کو نہ سے تاڑ لیتا۔ گھنٹہ ختم ہو جاتا باہر پنواڑی کی دکان پر جاتا آئینے منے جا کر اپنے خد و خال دیکھتا پھر ہاتھوں سے بالوں کو درست کرتا یٹ مونہہ سے لگا کر پھر کالج میں آ کر کلاس کے سامنے ٹہلتا رہتا

اس انداز پر لڑکیاں ہلکے قہقہے مار کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتیں اکمل سر جھکا کر سگریٹ کے بچے ٹکڑے کو دو انگلیوں سے پکڑ کر ایک لمبا کش لیتا اور دھواں چھوڑ کر اس کی اوٹ میں سے ان لڑکیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور پھر جلدی سے آگے بڑھ جاتا اور مسکراتا رہتا۔ کالج اور خصوصاً لڑکیوں میں اس کی مقبولیت نے ایک تہلکہ مچا دیا اس کے حسن اخلاق نے سب کے دلوں کو متاثر کیا اور وہ خود بھی محنتی اور ذہین تھا اس لئے اور کوئی لڑکا اس سے مدد طلب کرتا تو اس خدمت کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتا کوئی اوباش لڑکا اگر کسی لڑکی پر آواز کستا تو اس کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا اکتفا صرف اس پر ہی نہیں کرتا بلکہ اس برائی کے خلاف دوسروں کے احساسات کو بھی طرح طرح سے بیدار کر کے بد اخلاقی کو مٹانے کی انتہائی کوشش کرتا۔

کالج کے پرانے غنڈے اپنی ہوا کو اکھڑتے دیکھ کر تشویش میں پڑ گئے تھے اور اکمل کو راستے سے ہٹانے کے لئے طرح طرح کے جتن سوچنے لگے ایک دن کسی خطرناک سازش کا پروگرام ان کے پیش نظر تھا لیکن ان میں سے کسی دور اندیش نے انہیں مشورہ دیا کہ کچھ کرنے سے پہلے یہ معلوم کر دکہ یہ ہے کون۔

"ہاں بالکل ٹھیک، ورنہ کہیں ہمارے ہی لالے نہ پڑ جائیں"۔

دوسرے دن سارے کالج میں یہ خبر بڑی سرعت سے پھیل گئی

"قریشی رنڈی والا ہے"۔

اکمل معمول کے مطابق بن سنور کر کالج آیا تو کچھ لڑکوں نے اسے دیکھا اور زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیئے اور حقارت سے موہنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لڑکیوں کے سامنے بھی آیا تو انہوں نے کوئی توجہ نہ دی، عام لڑکوں کے رویہ میں بھی پہلی سی بات نہ تھی دل پھر مرجھا کر رہ گیا اور ساری امیدیں اس کے دل سے چڑیوں کی طرح اڑ کر چلی گئیں اور غم و پریشانی نے اس کے حواس باختہ کر دیئے کلاس میں مرجھائے پھول کی طرح وہ جا کر اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھ گیا پروفیسر لیکچر دیتا رہا اور وہ سر جھکا کر ذہن کو دل کے قریب لے گیا۔

گھنٹہ ختم ہوتے ہی اس نے اپنی نوٹ بک اٹھائی اور بڑی لاپرواہی سے بغل میں داب کر گھر کی طرف چلنے لگا۔

"مسٹر قریشی ذرا سنئے" اسی کے ساتھ کلاس میں ایک دوسرا ہندو لڑکا اٹھا اور باہر آکر اسے آواز دینے لگا اکمل ٹھہر گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا کہ کون ہے جو اب بھی اسے پیار و محبت سے مخاطب کر رہا ہے۔

نمستے، چلئے ریسٹوران میں چائے پی جائے۔ اس لڑکے نے قریب آکر اکمل کی باہنہ پکڑ لی۔

"بھائی اس وقت میرا چائے کا موڈ نہیں" اکمل نے کہا۔

"قریشی سارا قصہ مجھے معلوم ہے میں اب بھی آپ کی اتنی عزت کرتا ہوں آپ منش ہیں، چلئے میری چائے کو نہ ٹھکرائیے۔"

اکمل نے آبدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا سنہا نے اس مرتبہ اسے گلے سے لگا لیا اور ریسٹوران کی طرف چلنے لگا دونوں ریسٹوران میں آگئے سنہا نے چائے کا آڈر دیا اکمل کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا بادام نما آنکھیں قدرے ماند پڑ چکی تھیں چہرے پر ایک خاص قسم کی اندوہناک سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور چائے کا کپ اس کے مونہہ سے لگا ہوا تھا۔

"قریشی صاحب آپ بہت سست ہیں" اتراتا نہیں لینا چاہیئے" سنہا نے کہا۔

"سنہا! سوسائٹی کا میرے لئے بہت بڑا سلوک ہے میں اس کا ایک شریف فرد بننا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے قبول نہیں کرتی، ہاں میں رنڈی کا لڑکا ہوں لیکن اس میں میرا کیا جرم ہے۔

یہ بات کہتے ہوئے اکمل کے گلے میں کانٹے پڑ گئے اور رنج و غم کے بوجھ سے اس کا دل بیٹھنے لگا اسی عالم میں اس کا دماغ پرنسپل صاحب کی طرف منتقل ہو گیا کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا تو وہ مجھے ڈبل ذلیل سمجھیں گے ایک یہ کہ میں نے ذات چھپا کر جھوٹ بولا اور دوسری ذلت یہ کہ میں رنڈی کا لڑکا ہوں۔"

دل دھک دھک کر رہا تھا آنکھوں میں آنسو اگر رہے تھے ردعمل کے طور پر کچھ دیر کے بعد اس میں غصہ پیدا ہو ——— ایسا غصہ جس میں دنیا کو بھسم کر دینے کا جذبہ ہو پھر اس کے ذہن میں اس کی ماں روتی ہوئی آئی جس نے اس کی خاطر اپنی پہلی زندگی ختم کر دی تو اس کے دل سے ایک آہ نکلی اور ضبط کر کے بیٹھ گیا۔

دوسرے دن یہ خبر شریف صاحب تک بھی پہونچ گئی وہ اور برہم ہوتے اور ان کے پہلے قیاسات کو اور تقویت ملی ایک نطفہ ان کی طرف منسوب کیا جائے یہ انہیں کسی طرح گوارہ نہ تھا پھر اکمل کی شکل و صورت بھی ان سے ملتی جلتی نہ تھی جس پر کچھ غور کیا تھا ان خیالات کا طوفان ابھی ان کے ذہن میں تھما بھی نہیں تھا اٹھے اور سیدھے اکمل کے گھر پہونچے۔

کمالو کہاں ہے کمالو (اکمل کو گھر پر کمالو کہا جاتا تھا) گھر میں گھستے ہی انہوں نے پوچھا۔

"باورچی خانے میں چائے پی رہا ہے" اکمل کی ماں نے جواب دیا اکمل نے شریف صاحب کی آواز سن کر اپنے قریب بیٹھی ہوئی بہن سے کہا۔

شمیم! امی نے کل گاجر کا جو حلوا تیار کیا ہے اسے شریف صاحب کے لئے ایک پلیٹ میں نکال دو اور ہاں ایک چائے کپ بھی تیار کر دو" بہن نے پلیٹ میں حلوہ رکھا اور چائے تیار کی اکمل دونوں چیزوں کو اٹھا کر اس کمرے کی طرف چلا جہاں شریف بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"السلام علیکم" اندر کمرے میں گھس کر شریف صاحب کو سلام کیا لیکن یہ سلام بڑی ذہنی کشمکش کے بعد اس کی زبان سے نکلا کیوں کہ اس کا دل تو آج انہیں چھوٹے ابا کہنا چاہتا تھا۔ (کیوں کہ شریف صاحب کے گھر پر ان کے بچے اسی نام سے انہیں پکارتے) لیکن شرم نے ایسا نہ کرنے دیا تو اس نے جھٹ سلام ہی کر دیا۔

"کمالو!" ذرا کرخت لہجے میں شریف صاحب اکمل سے مخاطب ہوتے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ان کی آنکھوں کو دیکھا جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور نفرت اور غصہ ان میں سے دھوئیں کی طرح اٹھ رہا تھا "تم کالج میں باپ کی جگہ میرا نام لکھاتے ہو"

"جی ——— مجھے امی نے ایسے ہی بتایا تھا" اکمل نے جواب دیکر آنکھیں نیچے کر لیں۔

شریف صاحب نے پھر اس کی والدہ کو بلایا۔

"بھئی خورشید! ذرا یہاں آؤ، یہ ذلیل کیسی، ہم نے تم سے

نے تعلق قائم نہیں کیا تھا کہ ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں
"کیا بات ہو گئی شیخ صاحب، ناراض کیوں ہیں آپ، اکمل کی ماں نے
دان میں سے ایک پان خود لگا کر پہلے کھایا دوسرا پان شریف صاحب
کے لئے لیکر کمرے میں آئیں سب سے پہلی نظر ان کی اکمل پر پڑی جو اداس
غمزدہ حالت میں سر جھکائے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا چائے اور حلوا اس
کے ہاتھوں میں تھے۔

"بھئی کیا بات ہے حلوا اور چائے کیوں نہیں کھاتے۔" میں پان
کے لئے ذرا دیر میں لگا کر لائی تھی۔"

"میں چائے اور پان تو بعد میں کھاؤں گا۔ پہلے اپنے پوت کے
کرتوت دیکھ لو کالج میں باپ کی جگہ میرا نام لکھا آیا ہے۔"

"تو کیا ہوا شیخ صاحب! ہے بھی تو آپ ہی کا۔" خورشید کے لہجہ
میں قدرے شکایت آمیز تلخی پیدا ہو گئی

"میرے سر پہ چپکو تم لوگوں کا کیا ٹھیک۔" شریف صاحب اور
برہم ہو گئے۔

خورشید اس غیر متوقع جواب سے سٹپٹا سی گئی۔ اس کیفیت میں
آنکھیں قدرے پھیل کر نیچی جھک گئیں جیسے وہ کچھ تلاش کر رہی ہوں اور
پھر وہ دوپٹہ سنبھالنے لگی۔ اس کیفیت میں اکمل نے ماں کو سر اٹھا کر
دیکھا تو اس کی خون میں ڈوبی آنکھیں نفرت اور غصے سے چمکنے لگیں جبڑے
کھڑے ہو گئے! اور نتھنوں سے سانس تیزی سے آنے جانے لگی اور
ہونٹ کانپنے لگے۔ ماں نے سر کا دوپٹہ سنبھال کر پھر اس بیچارگی اور
ملامت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اکمل کی آنکھیں اس
کیفیت کی تاب نہ لا سکیں اور وہ ایک دم جوالا مکھی کی طرح بھڑک اٹھا

"شریف صاحب اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے"

"خاموش بدتمیز" شریف صاحب ایکدم کھڑے ہو گئے

"یہ میرا گھر ہے ـــــ اور آپ کی شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ آپ
فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ ۔" آخری فقرہ کسی اندرونی کشمکش کی وجہ سے پورا
نہ ہو سکا۔

اور وہ کانپتا رہا ماں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا اور پھر شیخ
سے مخاطب ہوئی۔

"شیخ جی اس میں حرج ہی کیا تھا آخر عرصہ دراز تک میں جناب
کی خادم رہی۔ دنیا بھر کی وفا کے آپ دعوے کیا کرتے تھے اس وفا کے
ہی خیال سے تھوڑی دیر تک کے لئے اس بچے کو آپ اپنا تصور کر لیتے تو
اس کا دل رہ جاتا ـــــــ خیر چھوڑیئے آپ لوگوں میں اتنا
ظرف کہاں۔"

"امی، ہم ذلیل نہیں، ہم انسان ہیں ہمارے حقوق تمام انسانوں
جیسے ہیں۔"

"انسانی حقوق کے طلبگار کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ ایک شاہد بازاری
کا لڑکا ہے۔ اپنی بساط سے بڑھکر حقوق طلب کرنا خود فریبی میں مبتلا ہونا ہے" شریف صاحب نے جوت کی
"ہمارے گھر سے نکل اب یہ رنڈی کا اڈا نہیں۔" اتنا کہہ کر اکمل شریف
صاحب کو مارنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنے لگا اس جرأت کے بعد
شریف صاحب اس پر دبوچنے کے لئے جھپٹے تو اکمل جلدی سے دوسرے
کمرے میں دوڑا (جہاں اٹیک لٹکی ہوتی تھی) تو دہلیز سے ٹھوکر لگی گر پڑا
شریف صاحب نے ایک زور سے ٹھوکر ماری ذلیل۔ تو ذلیل ٹھوکر
کھا کر وہ ایک دم چپ ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ اٹھنے لگے۔

خورشید نے ایک چیخ مار کر اس پر گر پڑی ماں کی دردناک چیخ سن کر دوسرے
بچے بھی آگئے اور رونے لگے بیٹے کو اس حالت میں پا کر ماں کے ذہن میں کچھ بھی
نہ رہا وہ بیہوش پڑا تھا بدن میں اینٹھن پیدا ہو رہی تھی تو اس نے گھبرا کر روتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا

"ارے کیا دیکھ رہی ہے پانی لا ـــــ!"

انیس پانی کے لئے دوڑی شریف صاحب اس حالت کو دیکھ کر اپنے حواس کھو
بیٹھے تھے موقعہ پا کر فوراً مکان کے باہر نکل گئے ایک پتلی سی گلی میں غائب ہو گئے

اختر پانی لائی ماں نے اکمل کے چہرے پر چھڑکا دو تین چھینٹوں کے بعد
اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا ـــ "بیٹا تجھے کیا ہو گیا"
"امی اسے گھر سے نکال دو۔ بنیا دہ ـــ بھاگ گیا۔"

اچھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں ماں نے پھر منہ پر چھینٹا مارا تو اکمل نے
پھر آنکھیں کھول دیں اور کہا "میں ہوش میں ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھی
بیٹی کو بھائی کے پاس بٹھایا اور خود ڈاکٹر کے پاس گئی ـــــ ڈاکٹر آیا اس
نے نبض دیکھی حالات سنے اور اسکے بعد کہا ـــــ "اب اسے کوئی
صدمہ نہ پہنچنا چاہیئے ورنہ یہ اپنے حواس کھو دیگا یا پھر کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے گا

محمود پرویز کاوی •

شاہکار

ترقیوں کے دور کا ــــ عجب یہ شاہکار ہے
عجب یہ شاہکار ہے ــــ ترقیوں کے دور کا

خزاں سے بھی کثیف تر ــــ لطافت بہار ہے
فضائے علم و عقل میں ــــ غبار ہی غبار ہے
لباس شاہد یقین ــــ گماں سے تار تار ہے
خرد بھی مطمئن نہیں ــــ جنوں بھی دلفگار ہے
جلو میں امن و صلح کے ــــ صلائے کارزار ہے
خیال عجز و بندگی ــــ دماغ و دل پہ بار ہے
زر و ستم کی راہ پر ــــ حیات گرم کار ہے
کمال ظلم و جور کا ــــ حسین نام پیار ہے

حسین نام پیار ہے ــــ کمال ظلم و جور کا
عجب یہ شاہکار ہے ــــ ترقیوں کے دور کا

اکرام اللہ پوری •

○

بستی سے ویرانے اچھے
اپنوں سے بیگانے اچھے

اہل خرد اور جنگ کی باتیں
ان سے تو دیوانے اچھے

عشق میں اپنی جان پہ کھیلیں
انساں سے پروانے اچھے

یادِ ماضی سے کیا حاصل
بھولے ہوئے افسانے اچھے

شیشہ و ساغر سے اے ساقی
ظرفوں کے پیمانے اچھے

شیخ و برہمن دست و گریباں
مسجد یا بت خانے اچھے

خوف نہیں اکرام خزاں کا
بستی سے ویرانے اچھے

عارف سہارنی •

جھوٹے کہیں کے

اُن دنوں گراموفون کا ابھی رواج تھا ——— گرما کی
تعطیلیں ہوتے ہی میں دادا چوہدری کے پاس چلا گیا ——— اور
یہ فون بھی لے گیا۔ گاؤں کی سادہ فضائیں۔ پرخلوص ماحول۔ چاندنی
میں مکان کی چھت سے دور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان
نظر آنے والی پگڈنڈیاں۔ اور قریب ہی پانی سے بھرے تالاب میں
جگمگاتا ہوا چاند ——— اور سرسراتے کھیتوں کے پار چرواہے
کی بانسری کی رسیلی صدا جو فضاؤں میں ایک ارتعاش پیدا کر دے ...
گھر کے بچوں کو وفورِ مسرت سے کھانا تک بھول گیا۔ باجہ آگیا۔ باجہ
وہ گراموفون مشین کو دیکھ کر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو بتاتے
بجائیں گے آپ اس کو چچا میاں! جلدی بجائیے۔ ہمیں بہت
ہے ——— نسیم نے کہا ——— اور شمیم بولا "میں نے
بتایا تھا کہ میرے چچا آئیں گے تو باجہ لائیں گے ——— میں بالاؤ
——— ؟ چاند کی چاندنی میں باجہ خوب بجتا ہے ——— اور میں
تھک گیا ہوں نا سفر سے۔ اب آرام کر لوں ذرا ——— میں نے بچوں
——— اور وہ بڑے صبر اور جبر سے رات کا انتظار کرنے لگے۔
اور رات ہو گئی ——— بچوں نے اشتیاقِ آرزو کا دام پھیلا دیا
نے مسکرا کر مجھے کہا "بجاؤ باجہ پھر!" ——— اور میں نے صحن میں
دادا چوہدری کی طرف دیکھا ——— جو حقّہ کی نے منہ میں ڈالے
بیٹھے تھے ——— ہوں ——— طاہرہ مسکرائی اور بولی
میں ایک گر ——— ؟ سب سے پہلے کوئی نعتیہ ریکارڈ بجاؤ" ———
اس نے ہنس کر کہا۔
گراموفون ریکارڈ بجنے لگا ——— "زمانے
ہے نام محمدؐ" ——— اور ہماری توجہ
سے قطعی طور پر ہٹ کر دادا چوہدری کی طرف لگ گئی ———
کہ دیکھیں ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ گراموفون کو بہت برا خیال کرتے
تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جس گھر میں گراموفون ہو وہاں فرشتۂ رحمت
نہیں آتا اور اسے گھر میں رکھنا سور پال رکھنے کے مترادف ہے ———
طاہرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے اشارے سے بتایا کہ دادا چوہدری جھوم
رہے ہیں۔ بس ہم نے میدان مار لیا۔

باجہ بجنے لگا ——— آن کی آن میں ارد گرد کی چھتیں معصوم
قہقہوں۔ شرمیلی جوانیوں اور بڑھاپے کی ہوں ہوں کھوں کھوں سے معمور
ہو گئیں ——— طاہرہ ادھر اُدھر دیکھ کر بولی ——— "بھیّا تم کیا
آئے اونٹ آگیا ہمارے گاؤں میں" ——— اور پھر بچوں کی طرف دیکھ کر
سنجیدگی سے کہنے لگی "بھیّا تم نے اتنے چھوٹے بکس میں کتنے آدمیوں کو
بند کر رکھا ہے ——— تم آدمیوں کو مکھی بنا لیتے ہونا ——— ؟
تمہارے پاس بڑا جادو ہے یہ۔ شمیم اور نسیم کی آواز بڑی اچھی ہے ———
ان کو مکھی بنا کر بند کر دوگے نا باجے میں؟" ——— نسیم اور شمیم بھاگ گئے
اور وہ ہنس پڑی۔ آجاؤ ——— میں تمہیں مکھی نہیں بناؤں گا ———
یہ بڑی شریر ہے۔ میں نے ان سے کہا۔

اور پھر کافی وقت کے بعد گراموفون پکارنے لگا "زمینِ
فردوس پاکستان کی ہوگی زمانے میں"۔

سوئی چاندنی اچانک جھوم اٹھی۔ ——— ہوائیں یہ پیغام دور
دور تک لے گئیں ——— اور تصورات پر ایک حسین محویت چھا گئی
دادا چوہدری چونک پڑے طاہرہ نے انگلی کے اشارے سے مجھے بتایا اور
ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دادا چوہدری سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے چھت پر آگئے
اور بولے "یہ ریکارڈ دوبارہ سناؤ ——— ریکارڈ بجتا رہا۔ دادا
چوہدری جھومتے رہے ——— اُن کی نگاہوں میں مسکراہٹیں سما
جا رہی تھیں۔ اور جب گراموفون تھم گیا۔ تو انہوں نے حقہ اوپر منگوا لیا۔ اور

حقے کے سہارے لیٹے کش لگاتے ہوئے بولے "پڑھے لکھے میاں! مجھے بتاؤ کہ پاکستان کیا ہے جو کہ دن بن رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ "دادا چوہدری ہندوستان اب آزاد ہو رہا ہے کانگریس جو اس دیس کی نمائندہ جماعت ہے اور سوراج حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتی رہی ہے — اس میں بہت سے مسلمان شامل تھے —— جو ہر قسم کی قربانی دیتے رہے مگر آخر تجربہ یہ ہوا ہے۔ کہ ملک کا آزاد ہونا مسلمانوں کے لئے آسمان سے گر کر کھجور پر اٹک رہنے کے مترادف ہے —— ہندو مسلمانوں کو ان کے حقوق نہیں دیں گے۔ اور پھر ایک بار ان کو اچھوت بنا کر ان کا بلی دان دیں گے —— اور دادا چوہدری سوچو تو بھلا ایک غیور قوم جو ماسوا اللہ کسی کے آگے جھکنے سے قاصر ہے بھلا ایسی زندگی کس طرح گذارے اس لئے مسلمانوں نے ایک علیحدہ دیس کا مطالبہ کر دیا ہے جس میں مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ اس طرح ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائیگا۔ مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں کو ملا کر پاکستان نام دیں گے۔"

"کتنا پیارا نام ہے پاکستان" —— دادا چوہدری نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں دادا! پاکستان پاک لوگوں کا مسکن ہوگا میں نے کہا اور وہ کیا کہہ رہا تھا گراموفون —— "مسجدیں آباد ہوں گی نغمۂ توحید سے" —— دادا چوہدری نے کہا اور ان کی آنکھوں میں چمک آگئی ——

اور میں نے پھر کہنا شروع کیا —— "ہاں میرے دادا چوہدری پاکستان لا الٰہ کی گونج سے تخلیق ہو رہا ہے —— اس کی بنیاد اسلام کے مبارک نام سے رکھی جا رہی ہے —— یہ سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہوگی۔ یہاں کا نظام قرآنِ پاک کے ارشادات کے ماتحت ہوگا —— یہاں کی فضائیں خالقِ مطلق کی حمد پڑھیں گی —— یہاں کے چاند تاروں میں نورِ یزداں کا پرتو ہوگا مسجدیں پھر سے آباد ہوں گی —— اور دمِ سحر بلالِ حبشی کی اذان کا سوزِ محبت فضاؤں میں پھیل جایا کرے گا —— پھر ایک بار محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے بارگاہِ قدوس میں سر نیاز جھکا دیا کریں گے —— عدلِ فاروقی پھر جاگ اٹھے گا —— انصاف کا علم ہواؤں میں لہرائے گا۔ جھوٹ۔ فریب۔ اور لغزشیں بھاگ جائیں گی —— اس ملک پر خدا کی رحمتیں چھائیں گی اسلام کی عظمتِ رفتہ لوٹ آئے گی۔ طاغوتی طاقتیں نعرۂ حق سے دب جائیں گی —— بلا دادا چوہدری پاکستان کی سرزمین فردوس زار بن جائے گی —— توحید کے چراغ روشن ہوں گے۔ اور اللہ والے شرابِ عشقِ الٰہی سے سرشار پروانہ وار جانیں قربان کریں گے —— بے شک پاکستان بنائیں گے۔

بے شک —— بے شک ——

چوہدری نے جھوم کر جواب دیا۔

لیکن دادا چوہدری، طیبہ نے ایک اہم بات تو آپ کو بتائی طاہرہ نے شرارت سے میری طرف دیکھ کر کہا ——

بیٹی —— ! دادا چوہدری! آپ کو شکوہ ہے ناکہ ریل گاڑی میں لوگ حقہ پینے نہیں دیتے جب پاکستان بن جائے گا تو آپ حقہ آزادی سے لیجائیں گے —— اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دادا چوہدری نے اس کی پیٹھ پر ہلکا سا تھپڑ رسید کر دیا۔

چاندنی راتیں ابھرتی اور ڈھلتی رہیں —— گاؤں کی سادہ فضاؤں میں گراموفون کے نغمے گونجتے رہے —— اور شمیم اور نسیم ان کی نقل کرنے میں ماہر بن گئے —— دادا چوہدری ہر رات یہ سُن کر جھوم جھوم جاتے رہے —— زمین فردوس پاکستان ہوگی زمانے میں۔

اور پھر رخصتیں ختم ہوگئیں۔ میں واپس لوٹ آیا —— بعض وجوہ سے گراموفون مجھے وہیں چھوڑنا پڑا۔

اور —— سات سال بیت مجھے زندگی کہیں سے کہیں لئے پھری۔ دادا چوہدری بگڑ کر خط لکھتے کہ تم گھر کیوں نہیں آتے —— اور ایک روز دہ بھی آگیا جب میں دادا چوہدری کے پاس پہنچ گیا۔

اور رات کو —— نسیم اور شمیم کہہ رہے تھے کہ چچا

یڈیو کیوں ساتھ نہیں لائے ——— میں نے جواب دیا وہ
ی بیٹری پر چلتا ہے اور وہ چند روز سے ختم ہو گئی ہے - واہ بیٹری
ے ترکیا ہوا میں چراغ جلا کر لے آؤں گی - ہمسائے سے عائشہ نے
——— اور لڑکے ہنس پڑے (کیوں کہ اس دور میں اندھیری
میں ٹارچ سے روشنی کر کے گراموفون کی سوئی بدلتے اور ریکارڈ بدلتے
آؤ - پرانی یادیں دہرائیں ——— طاہرہ نے کہا ———
ے چھوٹے بچے کو چارپائی پر لٹا کر تھپکنے لگی - نسیم اور شمیم نیچے سے
وفون اٹھا لائے ——— بچھڑے ہوئے نغمے پھر میرے تصور
ہم آغوش ہو کر رومان بن رہے تھے اور میں گاؤں کی سادہ فضاؤں
میں سات سال پہلے کا کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا ———
دادا چوہدری بدستور صحن میں لیٹے ہوئے تھے -

طاہرہ نے ریکارڈ الٹ پلٹ کر ایک ریکارڈ نکالا
اور مشین پر رکھ دیا ——— وہی نغمہ گونج اٹھا "زمین
فردوس پاکستان کی ہو گی زمانے میں"

اور یہ سن کر دادا چوہدری نے کھانستے ہوئے بڑبڑا کر کہا
"جھوٹے کہیں کے ——— نہ جانے کیوں ———
اور طاہرہ گراموفون بند کر کے دور خلاؤں میں جھانک کر دیکھنے لگی ———
جیسے سات سال پہلے کے بکھرے نغموں سے اثر ڈھونڈ رہی ہو -

التماس ہے کہ ....

(۱) اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے - بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہو گی - نیز ادارہ مشیر ناقابلِ اشاعت مضامین
کسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھئے - (۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ
رکھئے - (۳) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے - (ایڈیٹر)

پاکیزہ اردو ادب و شاعری کا نایاب تحفہ

سالنامہ جامِ نَو ۱۹۵۵ء

اپنی تمام تر روایتی خوبیوں اور رعنائیوں کیساتھ اگست کے پہلے ہفتے میں

منظرِ عام پر آ رہا ہے

حسین سرورق بیش بہا مضامین و مقالات، دلچسپ افسانے و کہانیاں کیف آور نظمیں و غزلیں بینظیر لکھائی اور ستھری چھپائی کے ساتھ یہ نادر نمونہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہوگا ——— قیمت صرف ایک روپیہ

اس خاص نمبر میں ہند و پاک کے بلند پایہ اور نامور اہلِ قلم حصہ لے رہے ہیں، چند نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

نیاز فتح پوری	وحشت کلکتوی	آنند نرائن مُلّا	سراج لکھنوی	افسر ماہ پوری	عبدالحمید عدم
اسد ملتانی	ادیب سہارنپوری	شان الحق حقی	سلام سندیلوی	آسی رامنگری	عباس علی خاں بیخود
نازش حیدری	صبا اکبرآبادی	حسن عظیم آبادی	شجاعت علی سندیلوی	عزیز متھراوی	روشن نگینوی
عارف سہارنی	اقبال حیدری	ظفر ہاشمی	راغب مرادآبادی	قیوم نشاط	نسیم نبوی
ماہر علی شاکر	سیدہ اختر	ذکیہ سلطان حزیں	نعیمہ مسعود	نعیمہ محمودی	شکیلہ سحر ہاردئی
صادق القادری	فیروز نظر	قمر صدیقی	آزاد مظفر پوری	بلراج حیرت	جلی امروہوی
طاہر قادری	حیدر جعفری	ایم۔ اے باری خاں			

اپنی کاپی آج ہی اپنے مقامی ایجنٹ سے محفوظ کرا لیجئے یا اس نمبر کو مفت حاصل کرنے کیلئے ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء سے قبل مبلغ چار روپے ارسال کر کے مستقل خریدار بن جائیے

ترسیل زر کا پتہ
پاکستان میں : مینیجر جامِ نو ۶۷/۵ جیکب لائن، صدر، کراچی نمبر ۳
بھارت میں : محترمہ ذکیہ سلطانہ حزیں، قصر حزیں، امیر گنج، بھوپال، انڈیا

ایجنٹ حضرات : سالنامہ کے لئے اپنے آرڈر ۳۱ جولائی سے قبل روانہ کردیں اسکے بعد آنے والے آرڈر کی تعمیل قطعی ناممکن ہوگی۔

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
فرحت بخش اور مقو
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجیے
ذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

1955 Regd. No.

Monthly "MUSHIR" Karachi

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

اگست ۱۹۵۵ء
مشیر
THE MUSHIR KARACHI

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

پاکستان کا واحد پاکیزہ اُردو ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون: ۷۹۲۳

★

جلد: ۶ شمارہ: ۸

اگست ۱۹۵۵ء

★

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

اشتراک:

پاکستان: سالانہ: پانچ روپے ۔ فی پرچہ: آٹھ آنے

بھارت: سالانہ: چھ روپے ۔ فی پرچہ: دس آنے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ:

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور۔ یو۔پی (بھارت)

(پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ۔ کراچی سے شائع کیا۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نعیم صدیقی

۱۹۵۸ء کے اواخر میں حالات کے چرخے نے اچانک جو الٹی گردش شروع کی تھی اس کے ہر پھیر نے ہمیں نت نئے واقعات سے دوچار کیا ہے۔ اس دوران میں حالات کے ارتقاء کا کوئی اصولی رُخ باقی نہیں رہا۔ تغیرات کی کوئی سمت سفر متعین نہیں رہ گئی۔ سیاست کا جہاز لنگر اور بادبان دونوں سے محروم ہو چکا ہے۔ حیاتِ ملی کے کسی گوشے۔ دستوری مرتبے۔ پارلیمینٹری ہیئت۔ قانون و انصاف داخلہ و خارجہ پالیسی۔ میں حالت استقلال (Stable) دکھائی نہیں دیتی۔ حیات ملی کی ساری کی ساری متاع اس وقت ہوا کے رُخ بدلتے جھونکوں کے حوالے ہو چکی ہے۔ میدانِ کارفرمائی کے بڑے بڑے شہسواروں تک کا حال یہ ہو گیا ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔

تغیر قومی زندگی میں عین نشے مطلوب ہے کیونکہ ترقی اور خیر و فلاح اس کے بغیر ممکن نہیں لیکن بدقسمتی ہوتی ہے وہ قوم جس کے ہاں آنے کو تو تغیر ہر صبح اور ہر شام آ رہا ہو لیکن الٹا ہر بار وہ نئی پستیوں، نئی نامرادیوں، نئی پسپائیوں اور نئی پیچیدگیوں اور پریشانیوں کے سیلاب جلو میں لئے وارد ہو۔ افسوس کہ ہمارے ہاں پچھلے دنوں سے مدنیت و تغیر کا جو دور شروع ہوا ہے وہ اجتماعی ارادوں اور عوامی رجحانات اور قومی تقاضوں کی طلب کے تحت نہیں۔ بلکہ ان کے بالکل خلاف اور ان کے بالکل علی الرغم آیا ہے اور اس شان سے آیا ہے کہ اس نے آزادی کے مرتبے، جمہوری روایات، شہری حقوق، سیاسی اخلاق، ملی مقاصد، دستوری قدروں، انتظامی ڈھانچے، دفتری نظم و نسق، سب کو ہلا ہلا کے چھوڑا ہے۔ اس نے وہ بندھن ڈھیلے کر دیئے ہیں جن سے کسی قوم کی کتاب حیات کا شیرازہ بندھا رہتا ہے اس نے وہ روابط توڑ ڈالے ہیں جو معاشرے کے مختلف شیون و احوال کو اس کے ماضی اور مستقبل کے درمیان باہم دگر جوڑے رکھتے ہیں اور اس نے وہ بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں جن پر کسی قوم کی بین الاقوامی عزت اور ساکھ کھڑی ہوتی ہے۔

تاریخ پاکستان کا یہ دورِ تزلزل جو ہمارے سامنے ہے اس کے ظہور اور اس کے نشو و ارتقاء میں ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اس میں ایک پارٹ مسلم لیگ اور اس کی اصول و کردار سے محروم قیادت کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ بغیر کسی اجتماعی نصب العین کے محض حصولِ اقتدار کی کشمکش میں حصہ لینے والی متفرق سیاسی ٹولیوں کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ ابن الوقت قسم کی صحافت کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ جامد مذہبیت اوڑھنے والے دنیا طلب حضرات کا ہے اس میں ایک پارٹ ان لوگوں کا ہے جن کو محض اتفاقات زمانہ سے اقتدار حاصل ہو گیا ہے۔ اس میں ایک پارٹ مستقل ملازمتوں کے اونچے طبقے کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ قانون کے نمائندوں کا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایک پارٹ۔ اور بہت بڑا پارٹ۔ خود عوام کا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے درجے اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس تقدیر کے بنانے میں حصہ دار اور ذمہ دار ہیں جس سے آج ملک دوچار ہے اور جس کے برگ و بار خود ان حصہ داروں اور ان کی نسلوں کی ہی جھولیوں میں پڑنے والے ہیں۔

ہم یہاں ان حالات کا کوئی جامع تجزیہ تو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ ان کے چند عبرتناک پہلوؤں کو ضرور نمایاں کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک امر واقعہ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو قوت و اختیار کے آخری آمرانہ مراتب پر فائز ہوتے دیکھ کر ہمارے بزرگوں نے جو فولادی عزائم باندھے تھے ان کو حالات کی ٹھوکروں نے بالکل چورا چورا پر اس طرح چکنا چور کیا ہے جیسے وہ کانچ کی چوڑیاں ہوں۔ دنیا نے دیکھا کہ ان عزائم میں بار بار کس طرح ترمیم ہوتی چلی گئیں۔ اور دنیا دیکھ لے گی کہ مستقبل کے لئے جو بھی ارادے آج پیش کئے جا رہے ہیں ان کا حشر بھی یہی ہو کے رہے گا۔ پھر عبرت اندوز ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس غیر صحت مندانہ ماحول میں عہدے کی کسی کرسی کے طرف جو کوئی بھی لپکا ہے وہ کیسے کیسے وعدے کر کے اور کیسے کیسے بھروسے دلا کر لپکا ہے لیکن کرسی پر جا کر بیٹھتے ہی ان دعوؤں اور بھروسوں سمیت برسوں کے قائم شدہ نظریات اور دعوؤں اور مطالبوں کی آناً فاناً ایسی لاجواب کایا کلپ ہوتی ہے کہ ان حضرت کے بالکل نابینا عقیدت مندوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں ہیں۔ مدتوں سے کھیتے ہوئے سیاسی کردار جو قومی خدمات، جدوجہد آزادی اور قید و بند کی قربانیوں کے سنہرے تمغے زیبِ قبا کئے ہوئے تھے ان کا ملمع اقتدار کی کٹھالی میں پہلی آنچ کھاتے ہی کس بری طرح اترا ہے۔ پھر سبق حاصل کرنے کے لئے تیسرا قابل مطالعہ پہلو یہ ہے کہ کیسے بھانت بھانت کے لوگ جن کے درمیان کسی سیاسی

ہوڑ میں کا کوئی امکان عقلی موجود نہ تھا۔ تقدیر کے عطا کردہ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک ہی خوانِ یغما پر جمع ہو گئے اور کمال یہ کہ جن زبانوں نے کل تک اپنے کچھ حریفوں کو مذاق سے کم درجے کے کسی لفظ سے مخاطب نہیں کیا تھا دہ انہی کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہو گئیں لیکن دوسری طرف اس مصنوعی اتحاد کا ایک یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ دودن پردہ بھی ان انہی دیوں کے درمیان جب سے اب تک برابر چالیں چلی جا رہی ہیں اور بر سر عام بھی ہر ایک نے اپنی اپنی ڈفلی بجائی ہے اور اپنا اپنا راگ سنایا ہے۔ پھر جو گونا گوں بول بولے جاتے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک کی عمر نے وفا نہ کی بلکہ بڑے سے بڑے بول کا سکہ بھی ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ چل کر کھوٹا ہو گیا۔ ایک ایک کی کہی ہوئی باتوں کو اخبارات سے نکال کر نمبر وار نوٹ کیجئے اور پھر خود ہی معلوم کیجئے کہ کون سی بات کے دن چلی۔ چوتھا پہلو جس کا جائزہ لے کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یہ ہے کہ مفاد کی کشاکش بڑی تیزی سے اکابر کے طبقہ کا باہمی اعتماد ختم کئے دے رہی ہے۔ اس کشاکش کی موج جب اٹھتی ہے تو کبھی ۹۲ ء کا دارکر کے جمی جمائی اسمبلی کو اکھاڑ کے پرے پھینک دیتی ہے اور کبھی مرکز کے اشارے کے تحت کسی صوبائی وزارت کا تختہ الٹ دیتی ہے سندھ کے بعد اس کی ایک تازہ سنہری مثال وزارت پنجاب کی اکھاڑ پچھاڑ کا غیر متوقع واقعہ ہے پھر یہ عبرتناک منظر دیکھئے کہ اس طرح کی شبانہ روز کا عمل ظہور برآمد جب واقع ہوتا ہے تو چھوٹے چھوٹے لیڈر، صحافی اور ایم ایل اے حضرات کرسی پر آبیٹھنے والے صاحب منصب کے سامنے قصیدے اور سپاسنامے پیش کرنے لگتے ہیں اور کرسی سے اترنے والے کے خلاف ہجو گوئی کا ایک طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ اور آنحالیکہ کل تک وہ اس کے قصیدے کہنے میں رطب اللسان رہ چکے ہوتے ہیں۔ وہ آس پاس رات کی قلب ماہیت کی نفس حقیقت پر وہ کوئی پردہ بھی نہیں ڈال سکتے۔ اخلاق کی ادنیٰ ترین سطح سے بھی گرا ہوا یہ سیاسی کردار حکومتی تغیرات کے نمودار ہونے پر نہایت غیر شریفانہ فضا پیدا کر دیتا ہے۔ طرفہ یہ کہ سیاسی پارٹیاں۔ بمع حکومت پر فائز ہونے والی متعلقہ پارٹی کے۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے پڑی رہتی ہیں۔ جیسے یہ ان کا سرے سے موضوع توجہ ہی نہیں! ان حالات میں یہ بالکل واضح ہے کہ کسی کے پاؤں کے نیچے مضبوط زمین اب نہیں ہے۔ اب تو ایوانِ جاہ و منصب بالکل کارواں سرائے کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ مسافر نے رات گذاری، صبح کو کوچ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیّتِ الٰہی نے ہر گروہ اور ہر فرد کی حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قدرت کے ہاتھ نے تمام قابل ذکر عناصر اور ان کے اندر کی نمایاں شخصیتوں کو دور دور سے چن چن کر جمع کر لیا ہے اور اب ایک ایک ہستی کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے اسٹیج پر لایا جا رہا ہے اور اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ فکر و عمل اور ذہن و کردار کا جو کچھ سرمایہ تمہارے پاس ہے اسے سب کے سامنے کھول کر رکھ دو۔ اپنی صلاحیتوں کو گن گن کر اور ناپ کر اور تول کر بھری مجلس میں خود بتاؤ کہ تم کیا ہو اور کیا نہیں ہو۔ مشیت نے ہماری ٹکسال کے ایک ایک سکے کو جانچنے کے لئے سر بازار کسوٹیاں نصب کر دی ہیں اور کٹھالیاں آگ پر چڑھا دی ہیں۔ بالکل بیچ کھیت میزان لگ گئی ہے اور اقوال و اعمال تل رہے ہیں۔ دکھائی یہی دیتا ہے کہ اب کسی کا پردہ نہ رہے گا اور سارے بھرم کھل جائیں گے قوم جس جس کے بارے میں کسی دھوکے میں تھی اور جس جس سے وہ امیدیں وابستہ کر سکتی تھی اب ایسے لوگوں کے ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن بھی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے فاش کیا جانے لگا ہے۔ یہ طرزِ معاملہ قدرت ہمیشہ ایسے عناصر کے ساتھ کرتی ہے جن کی مہلت کار کے دن پورے ہو چکے ہیں۔

یہ مرحلہ بڑا سنگین اور دل ہلا دینے والا مرحلہ ہے لیکن غالباً اس میں خیر کا سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ پاکستان کے عوام کو خوش فہمیوں اور من سمجھوتوں اور وہم و وسوسوں کی تاریکی سے نکال کر حقیقت کے اجالے میں لایا جا رہا ہے جہاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ کون ان کی بگڑی بنانے میں ان کے کام آسکتا ہے اور کس کے ہاتھوں جو کچھ بن چکا ہے اس کے بھی تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے! اس اتمامِ حجت کے بعد عوام اپنا مستقبل اور اپنا انجام تجویز کرنے کے خود ہی ذمہ دار ہوں گے۔

یہ سوال بڑا قابلِ غور ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے قوم نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ ایسے حالات سے دوچار ہو۔ بخلاف اس کے لوگوں نے ہمیشہ اپنے ملک اور اپنی ریاست کے لئے اچھے مستقبل کا تصور کا باندھا ہے ان حالات کے پیش آجانے پر بھی کوئی ان سے خوش نہیں اور کوئی ان پر مطمئن نہیں۔ بلکہ ہر شہری کو ان کی وجہ سے اضطراب لاحق ہے اور بچہ بچہ ان سے نجات پانا چاہتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا اور جو کچھ ہم نہیں چاہتے وہی ہوتا ہے؟ اور جب یہ حالت ہے تو مایوسی کے گڑھے میں گر کر قومی خودکشی کر لینے کے سوا اور کون سا چارہ کار باقی ہے؟

بات یہ ہے کہ چاہے کوئی فرد ہو یا قوم ہر کوئی ہمیشہ اپنا بھلا ہی چاہتا ہے آرزوئیں ہمیشہ اچھی ہی باندھی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں میں رہنے والے بھی خواب ہمیشہ محلوں کے دیکھتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں نے بھی حسرتوں اور تمناؤں کی حد تک یہی چاہا ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین قوموں میں سے ایک ہوں۔ ہماری ریاست ایک ترقی پذیر اور خوشحال ریاست ہو۔ ہماری ملی آئیڈیالوجی ہمارے ہاتھوں جامۂ عمل پہنے۔ اسلامی دستور بنے اور قرآن و سنت کی اساس پر ہمارا محبوب نظامِ خیر و برکت کارفرما ہو اعلیٰ درجے کی جمہوری فضا یہاں قائم ہو جس میں ہمارے شہری حقوق محفوظ ہوں معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائے۔ ہمارے انفرادی و اجتماعی کیرکٹر ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ و مثال کا کام دینے والا ہو۔ ہمارا نظم و نسق خیانت۔ رشوت اور بے قاعدگیوں سے پاک ہو جائے ہمارے اوپر بے لاگ قانون کی عملداری ہو اور کوئی تاجر دستور کی حدود سے تجاوز نہ کر سکے۔ ہمارا بچھڑا ہوا کشمیر ہم سے آملے۔ ہمارے مہاجر بھائی مکمل طور پر بحالی کی منزل کو پہنچ جائیں اور بہترین باصول اور جید قیادت ہماری

منظم طاقت پاتا ہی ملے۔

مگر محض ان اچھی اچھی باتوں کو جاننے اور ان کی فہرست گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں میں گنوا تے رہنے سے ہزار برس میں بھی کوئی نتیجہ مطلوب برآمد نہیں۔ قومی خواہشوں اور تمناؤں اور مرادوں کے بر آنے کی کچھ شرائط ہیں۔ توفیق ایزدی کے بل پر جو کوئی ان شرائط کو پورا کرتا ہے اس کی آرزوئیں پھلتی پھولتی ہیں اور جو کوئی محض شیخ چلی کے سے خواب دیکھتا رہتا ہے وہ جب آنکھیں کھولتا ہے تو اس کے تعمیر کردہ شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

تو وہ شرائط کیا ہیں؟

قومی تمناؤں کے بار آور ہونے کی شرط اول یہ ہے کہ گوناگوں متفرق خواہشوں اور تمناؤں اور ضرورتوں کو کسی ایک اصول و تعمیری نصب العین کی شکل میں ڈھالا جائے۔ معاشروں کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے، مشکلات پر قابو پانے اور بہترین مستقبل حاصل کرنے کا یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ ایک جامع و ہمہ گیر نصب العین اختیار کریں اور ذہن و نگاہیں اس پر مرتکز ہو جائیں۔ اس نصب العین کے لئے ایک گہری محبت اور اس کی طرف بڑھتے چلے جانے کے لئے ایک عام ولولہ ہر طرف کارفرما ہو۔ کوئی رکاوٹ قوم اور اس کے نصب العین کے درمیان حائل ہو تو چاہے وہ کوئی غیر ملکی طاقت ہو، چاہے کسی طبقے کا مفاد ہو، چاہے وہ کسی صاحب منصب کا اقتدار ہو، چاہے وہ کوئی دستوری تقاضا ہو، اسے راستے سے ہٹا پھینکنے کے لئے اس سرے سے اس سرے تک بے چینی کی لہر دوڑ جائے۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم بے جڑ کی کوئی قوم نہیں ہیں بلکہ ہماری ایک مضبوط آئیڈیالوجی ہے اور وہ آئیڈیالوجی ہمیں ایک ایسا تعمیری نصب العین دیتی ہے جو ہماری ساری متفرق ضرورتوں اور تمناؤں کا جامع ہے۔ اس کو منتہائے نظر بنا کر ہم اگر متحدہ اقدام کریں تو ہم دنیا میں نہ صرف یہ کہ ایک آزاد، خود دار اور ترقی کرنے والی مضبوط قوم اور سلطنت کا ساتھ لے کر سکتے ہیں بلکہ امامت عالم اور مرکز انسانیت ہونے کا گم شدہ منصب دوبارہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا ایک قلیل عنصر ایڑی چوٹی کا زور اس بات پر لگا رہا ہے کہ قوم کسی طرح اسلامی نصب العین کو عملاً اختیار نہ کرنے پائے۔ پھر اس سے نیچے اتر کر ہمارے خوشحال طبقوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کو اپنی نوکری اور تنخواہ اپنی تجارت اور اپنے پیشے، اپنے سوشل سٹیٹس اور اپنی تفریحات سے آگے قوم کے بھلے برے سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ بالکل غیر جانبدار، غیر متعلق پڑے مگن ہیں۔ پھر ہمارے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ عوام کی بہت بڑی تعداد ہے جو اسلام اور اسلامی دستور اور اسلامی نظام حیات کے لئے ایک گونہ دلچسپی تو رکھتی ہے لیکن وہ بس حسرت و آرزو کی حد تک، اسے دل و جان سے اپنا محبوب نصب العین بنا کر متحرک نہیں۔ پھر آخر میں وہ حساس اور ذمہ دار عناصر ہمارے سامنے آتے ہیں جو اسلامی نصب العین کو واقعی نصب العین بنا کر اپنے حصہ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔

ہم موجودہ ناسازگار حالات کی خطرناکیوں کا واسطہ دلا کر ملک کے ایک ایک فرد سے اپیل کرتے ہیں متفرق خیالی تمناؤں کی سطح سے اوپر اٹھیں اور اسلامی، پاکوئی، تعمیری نصب العین اختیار کریں، خواہ کسی کوشش کے وہ نصب العین پر جمع ہوں، خواہ اپنے نصب العین پر دوسروں کو جمع کریں۔ بے نصب العینی کی پریشان حال زندگی اب ختم ہونی چاہیے۔ بے نصب العین قومیں چیونٹیوں جیسی کثیر تعداد میں ہو کر بھی بے تغیر پڑی رہتی ہیں اور تغیر ان پر آتا بھی ہے تو اور زیادہ پستی اور تباہی میں دھکیل دینے کے لئے آتا ہے۔

قوموں کی آزادی، ریاستوں کی ترقی اور معاشروں کے استحکام کے لئے دوسرا اہم لازمہ تنظیم ہے۔ حیات اجتماعی کا یہ اتنا بڑا تقاضا ہے کہ علمائے سیاست نے ریاست کے عناصر خمسہ میں اسے شمار کیا ہے۔ جس انسانی آبادی میں تعاون، ائتلاف، یکجہتی، ہم آہنگی اور تنظیم کے داعیات کارفرما نہ ہوں وہ اول تو ریاست کے مرتبے پر نہیں آ سکتی اور اگر بخت و اتفاق نے اسے اٹھا کر تخت آزادی پر بٹھا بھی دیا ہو تو وہ کسی بھی لمحے تخت پر سے اچانک گرے گی اور سیدھی غلامی کی گود میں جا پہنچے گی۔ اس کو غلام بنانے کے لئے باہر کی کوئی قوت خواہ مخواہ بھی متوجہ ہو تو اس کے اندر سے اس کے اپنے ہی فرزند اٹھیں گے اور اس کے سر سے تاج اقتدار اس کے کندھوں سے شاہی قبا، اس کے ہاتھوں سے عصائے سلطنت، اور اس کے قلمدان سے مہر فرمانروائی دیکھتے دیکھتے اچک لیں گے اور اس ساری متاع گراں بہا کو بیچ بٹا کر کھا پی جائیں گے۔ ایک غیر منظم قوم کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس کی آزادی پر ہاتھ صاف کرنے والی اندرونی طاقتیں جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو وہ خنجر کی دلیل سے بات کرتی ہیں۔ وہ تشدد کے قانون سے قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں، وہ سازش کے ذریعہ جڑیں پھیلاتی ہیں اور کسی کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ کروڑوں افراد کا غیر منظم انبوہ یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ منتشر افراد سیاسی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ محض بھیڑ بکریاں ہوتے ہیں۔ پڑھی لکھی اور ڈگریاں رکھنے والی بھیڑ بکریاں، فلسفی اور سیاست دان بھیڑ بکریاں، سوٹ بوٹ اور شیروانی پاجاموں میں ملبوس بھیڑ بکریاں! بڑے سے بڑے انبوہ گوسفنداں کے لئے یہ کافی ہے کہ کوئی بھی زید، عمر، بکر آمریت کا لٹھ کندھے پر رکھے نمودار ہوا اور ان کا چرواہا بن کر ان کو جدھر چاہے ہانک لے۔ وہ مزے سے ان کا دودھ پیئے۔ ان کا گوشت کھائے۔ ان کی اون سے قالین بنوائے اور ان کو اور ان کے بچوں کو قصابوں کے ہاتھ بیچتا ہے۔ بھیڑ بکریوں سے بغیر اس کے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ جو بھی کسی نہ کسی طرح ان کا چرواہا بن گیا ہو وہ اسی کے آگے گھٹنے ٹیک کر میا دیں۔

امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس، چین، انڈیا اور دوسری قومیں اگر ترقی کرتی ہوئی زندہ قومیں ہیں تو محض اس لئے کہ ان کی آبادیاں پارٹیوں کی شکل میں منظم

ں اور سالہا سال سے منظم چلی آ رہی ہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ مسلم لیگ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں کی برکت سے درہم برہم ہو چکی اس کی جگہ لینے کے لئے طالع آزما عناصر اصول، مقصد اور کردار کے بغیر گونا گوں ٹولیاں بنا کر اٹھے، لیکن عوام کو اپنی طرف جذب کرنے میں ناکام رہے۔ خود تو ناکام ہیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنا وقت اور اپنا زور صرف کر دیا کہ لوگ اگر ان کے ساتھ نہیں آ رہے تو کسی دوسری بہتر تنظیم سے بھی نہ جڑنے پائیں۔ یہ عناصر قوم کو ایک مستقل پریشانی و انتشار میں ڈال دینے پر تل گئے اب دیکھ لیجئے نتیجہ کیا ہے۔

اب وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہر شخص جو نکے اور اپنے آپ کو کسی منظم طاقت سے ملحق کرے۔ اپنے نصب العین کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ اس کے تقاضے موجود تنظیموں میں سے کس کے ساتھ پورے کئے جا سکتے ہیں پھر جس پر دل ٹھکے اپنے آپ کو اس کے شیرازہ میں پرو دیجئے۔ نصب العین اسلامی ہے تو جماعت اسلامی ایک مضبوط مرکز (Nucleus) کی حیثیت میں سامنے موجود ہے۔ اور قوم کے اجتماعی رجحانات کا اشارہ اب اسی طرف ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور نظم دکھائی دے تو اس سے جا ملئے۔ نصب العین اگر کوئی دوسرا ہو تو اس کے مطابق کوئی دوسری موزوں تنظیم ڈھونڈئیے۔ موجود تنظیموں میں سے کسی کے ساتھ ہم آہنگی (Compromise) ممکن نہ ہو تو بسم اللہ کسی نئی تنظیم کی بنیاد ڈالئے۔ بہرحال اب اس حالت انتشار کو ختم ہونا چاہئیے جو ایسے احوال کو پیدا ہونے کا موقع دیتی ہے کہ جن کے ہاتھوں نہ ہماری آزادی سلامت رہ سکتی ہے نہ ہمارے تعمیری منصوبوں اور ترقی کے عزائم کی خیر ہے۔

لیکن تنظیمی طاقت بغیر ایک موزوں لیڈر شپ کے نہیں ابھر سکتی اور وجود پذیر ہو بھی جائے تو کبھی ایک فعال طاقت نہیں بن سکتی۔ نصب العین اگر تنظیم کا تقاضا کرتا ہے تو تنظیم صاحب صلاحیت قائد مانگتی ہے۔ جیسے ایک آزاد سلطنت کے حصول کا نصب العین جب قوم نے اپنایا تو اس نے مسلم لیگ کی تنظیم کے تحت اپنے آپ کو سمیٹا اور قائد اعظم جیسی شخصیت کو رہنمائی کے منصب پر رکھا۔ اسی طرح اب اگر اسلامی آئیڈیالوجی پر معاشرہ کی تعمیر نو کا نصب العین قرار پایا ہے تو اس کے حصول کے لئے جہاں کسی موزوں نظام جماعت کی ضرورت ہے وہاں دوسری ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ یہ کام جس طرح کا لیڈر مانگتا ہے وہ دستیاب ہو۔

قوموں کی امامت اور سلطنتوں اور معاشروں کی تعمیر و ترقی کا کام جس نوعیت کا لیڈر مانگتا ہے اسکی پہچان یہ نہیں ہوتی کہ وہ بڑی چابکدستی سے کسی عہدے پر جا بیٹھا ہے اس نے کسی انتخاب میں حریفوں کو پچھاڑ کر اسمبلی کی نشست جیت لی تھی اس نے کوئی بیرج بنوا دیا ہے یا بجلی اور شکر کا کوئی کارخانہ کھلوا دیا ہے۔ یا وہ کوئی بڑی تیز طبع اور جاگیر دار ہے۔ قوموں کو بنانے والے لیڈروں میں دیکھنے کے پہلو یہ ہوتے ہیں کہ کیا وہ کوئی جامع اصول و نظریہ اپنے ساتھ رکھتا ہے کوئی قابل عمل پروگرام اس کے پیش نظر ہے۔ مضبوط کردار اس میں پایا جاتا ہے ثبات اور استقلال ہے قربانی دینے کا حوصلہ ہے۔ دیانت و امانت اور بے لوثی کی صفت ہے۔ اس معیار کا چراغ لیکر ڈھونڈئیے کہ آیا آپ کے آٹھ کروڑ افراد میں اس صلاحیت کا کوئی اکا دکا فرد ہاتھ آ سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی پست سے پست قوم شاید اتنی گئی گذری نہ ہو گی کہ وہ اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف اقدام کرنے کے لئے اپنی جماعت کا کوئی لیڈر نہ پا سکے۔ اتنے گئے گزرے یقیناً ہم نہیں ہیں لیکن مشکل جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اس متوقع پارٹ کا ادا کرنے والا ہے بھی تو آپ کا یہ پریس، آپ کے لیڈر اور آپ کے بعض کابر تک ہر ممکن تدبیر کے ذریعے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ قوم کسی ایسے شخص تک پہنچنے اور اس سے اپنے آپ کو مربوط نہ کرنے پائے۔

آپ کی ہمسایہ قوم کو جن چیزوں نے مسابقت حیات میں آگے کر دیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی کہ شروع سے اس نے ایک لیڈر کا دامن تھاما اور اسکے گرد سمٹ گئی۔ گاندھی جی سے ان کے فلسفے اور ان کے سیاسی طریق کار میں اگر ایک ایک جزئی اختلاف پر مختلف عناصر مخالفتیں برپا کئے رہتے۔ ہر ذہین آدمی ان سے حریفانہ اور رقیبانہ معاملہ کرتا اور پریس اگر شروع سے ان کا بائیکاٹ کرتا اور ان کا مضحکہ اڑاتا رہتا تو گاندھی جی قومی لیڈری کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود قومی ہیرو نہ بنتے مگر دوسری طرف قوم کبھی اس سطح پر نہ پہنچتی جس پر وہ آج ہے۔ اس ہمسایہ قوم کے بخلاف مسلمانوں کی یہ ایک مستقل کمزوری رہی ہے کہ وہ کسی ایک قیادت پر سمٹنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کا ہر ذہین آدمی اس جہاد میں رہتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوتے کوئی دوسرا شخص قومی قیادت کا مقام حاصل نہ کرنے پائے۔ قوم صرف ایک مرتبہ قائداعظم کے ساتھ جمع ہوئی اور اس کے نتیجے میں اسے پاکستان حاصل ہو گیا وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق پھر منتشر ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ پچھلی جدوجہد میں جو کچھ لیا تھا اس کی حفاظت بھی مشکل ہو رہی ہے۔

اب اگر زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس کمزوری کو دور کرنا ہو گا اور وقت متنبہ کر رہا ہے کہ اس کمزوری کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنا تو درکنار، اندیشہ ہے کہ فطرت کے بے لاگ قوانین آپ کو اٹھا کر پیچھے نہ پھینک دیں۔ موجودہ حالت انتشار اگر قائم رہے تو کسی نجات دہندہ ملت کی مسیحائی اور کسی محافظ قوم کی پاسبانی پاکستان کو خطرات سے نکال نہیں سکتی لیکن اگر حالت انتشار کی دلدل سے نکلنے کی عملی تدابیر خود قوم اختیار کر لے تو پھر آمریت پسند اور جاہ طلب حضرات کی مہلک سے مہلک وقتی کارروائیوں کے نتائج کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔ بقائے نام اور ترقی کے لئے اپنی فوری ضروریات کو پھر ذہن نشین کر لیجئے۔ ایک جامع تعمیری نصب العین۔ ایک مضبوط اصولی تنظیم۔ ایک صاحب کردار لیڈر!

(بشکریہ "ترجمان القرآن")

شمیم جاوید ●

جشن مناؤ

جشن مناؤ آزادی کے!
سورج نکلا، تارے ڈوبے
دور کہیں اندھیارے ڈوبے
ہنستی ہیں پُر نور فضائیں
جلووں سے معمور ہیں راہیں
سبز پھریرے جھوم رہے ہیں
چاند ستارے گھوم رہے ہیں
عہدِ ماضی خواب بنا ہے
ہر ذرّہ مہتاب بنا ہے
یہ جلسے، انبوہ، یہ کاریں
ہر سو ہیں رنگین بہاریں
آزادی کے نغمے گونجے
جشن مناؤ آزادی کے

●

وہ دیکھو بنگلے سے نکلی
ایک غریب مہاجر لڑکی
بکھرے بکھرے بال ہیں اُس کے
اشکوں سے تر گال ہیں اسکے
آنکھ میں آنسو، ہاتھ میں سکّے
جشن مناؤ آزادی کے

●

ننگے، مریل، سوکھے۔ بچے
فاقہ کش اور بھوکے۔ بچے
ننھّے ہاتوں کو پھیلائے
سمٹے سمٹے اور شرمائے
وہ دیکھو اس کار کے
جشن مناؤ آزادی

●

ہوائیں ہیں ترسی ترسی
آج ہے مقتولوں کی برسی
جو اس دن دنیا سے سدھارے
بے کس، بے بس ظلم کے مارے
کون اب انکی آس بندھائے
جشن مناؤ آزادی کے
آزادی کے جشن مناؤ
خوب پیو، ساغر چھلکاؤ
صبحیں اپنی، راتیں اپنی
اپنا وقت اور باتیں اپنی
مے اپنی، میخانے اپنے
ساقی اور پیمانے اپنے
تدبیریں، تقدیریں اپنی
ملت کی جاگیریں اپنی
کس کو فرصت، کون یہ سوچے
دین ہی کیا؟ اور دنیا کیا ہے؟
جشن مناؤ آزادی کے ـــــ جشن مناؤ آزادی کے

انتظار حسین •

آخری موم بتی

…مری پھوپھی جان کو تو بڑھاپے نے لیسے آلیا جیسے قسمت کے …وں کو بیٹھے بٹھائے مرض آدبوچتا ہے۔ دراصل میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی …ں لوگ اچانک کیسے بڈھے ہوجاتے ہیں۔ آدھی ڈھلی جوانی آتی ہے …ڑھاپا تو دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر آیا کرتا ہے۔ لیکن پھوپھی جان بڑھاپا …ں ہونہیں بڑھاپے نے انہیں آناً فاناً آن دبوچا۔ جوانی۔ جوانی سے …ا پاہم جس۔ وقت وہاں سے چلے ہیں تو اس وقت وہ اچھی خاصی تھیں …ی تپی کالے کالے چمکیلے گھنے بال۔ گٹھا ہوا دوہرا بدن۔ بھری بھری …ں میں سینے کی چوڑیاں۔ پنڈلیوں میں تنگ پائجامہ کا یہ حال کہ …سکتا۔ لباس انہوں نے ہمیشہ اچھا پہنا۔ وصلی کی جوتیاں بھی زیادہ …نہیں ہو پاتی تھیں۔ کہ بدل جاتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئی جوتی کی …دوسرے تیسرے دن ہی پنخ …ی بے تحاشا پان کھاتی تھیں …ے تحاشا باتیں کرتی تھیں محلے کی …والیوں کی صف اول میں …ما رہتا۔ نرے پہ تو بس ڈھا …بیٹھی رہتی تھیں۔ اور ادھار انہیں …رتا تھا۔ ذرا سی بات ہوئی کہ …ی طبیعت میں رنگینی تھی …راسی زرا چھالیا چکنا کھلاتیں …تھا کہ کھل کر بات کرتی تھیں …وساختہ مستی تھیں۔ ہاں میں …ستا اور بتا چلوں کہ پھوپھی جان میری سگی پھوپھی نہیں ہیں۔ اپنی والدہ …مجھے اگر غلط یاد نہیں رہا ہے۔ تو میرے مرحوم والد کے چچا زاد . . . . . .

یا خالہ زاد . . . . . . یا شاید پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی ہیں۔ ہمارے خاندان میں سب سے چھوٹے انہیں پھوپھی جان کہتے ہیں۔ اور شاید میری طرح کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ان سے ان کا کیا رشتہ ہے۔ ویسے خاندان میں سب ان کا پاس بھی کرتے تھے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ فسادات کے ماروں کی گنوروں کے ساتھ ہم بھی چلنے لگے تو پھوپھی جان سے خاندان کے ایک ایک شخص نے اصرار کیا کہ پاکستان چلی چلو۔ مگر ان کے دماغ میں تو یہ سمائی تھی کہ اگر وہ چلی گئیں تو امام باڑے میں تالا پڑ جائے گا۔ خیر یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ عزاداری کی ساری ذمہ داری اب تو خیر ان کے سر ہے ہی لیکن پہلے بھی اس کا انتظام وہ ہی کرتی تھیں۔ دراصل ہمارا جدی امام باڑہ اس کا ایک حصہ ہے۔ جہاں پھوپھی جان رہتی ہیں۔ محرم کے دنوں میں امام باڑے میں عزاداری ہوتی تھی اور پھوپھی جان کے گھر میں مہمانی۔ خاندان کے جو لوگ سرکاری ملازمتوں پر قریب و دور کے شہروں میں گئے ہوتے تھے وہ ان دنوں ضرور گھر کا پھیرا لگاتے تھے۔ اور جس کسی کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہ ملتی تھی وہ پھوپھی جان کے ہاں جا کر دھمی دے دیتا تھا۔ ہاں میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے گھر جا کے ٹھہرا۔ بات یہ ہے کہ میری خالائیں اور ممانیاں اتنی تھیں کہ مجھے یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ کس کے یہاں جا کر ٹھہروں۔ جس کے نہ ٹھہرو اسی سے بیر ہو۔ میں نے تو تنگ آ کر یہ دعا مانگنی شروع کر دی تھی کہ اللہ میاں

موم بتیوں کی ہلکی روشنی لپی ہوئی گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ لوبان سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا خوشبودار دھواں۔ ان سب چیزوں نے مل کر ایک پراسراری فضا پیدا کر دی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت میرے حواس پر چھاتی جا رہی تھی میں نے جلدی سے علموں کی زیارت کی اور باہر جانے کیلئے مڑا لیکن شمیم نے ٹوک دیا" بھائی جان۔ دعا تو مانگ لیجئے "

اس وقت میرے جی میں نہ جانے کیا آئی میں بے اختیار اس کے قریب پہنچ گیا اور آہستہ سے بولا "! ان علموں نے جب تمہاری دعا قبول نہ کی تو میری دعا کیا قبول کریں گے "

شمیم ایک دم سے سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں بولی " بھائی جان آپ تو بالکل وہابی ہو گئے "

میری خالاؤں اور ماموں اور چچاجیوں کی تعداد میں تھوڑی سی کمی کر دے، وہ کم تو نہ ہوئیں تتر بتر ہو گئیں۔ بہرحال دعا قبول ہوئی لیکن مسئلہ پھر بھی جہاں کا تہاں رہا۔ مجھے یہاں سے چلتے وقت ایک مرتبہ پھر یہ سوچنا پڑا۔ کہ ٹھکانہ کہاں ہے۔ اور اس دفعہ سوائے پھوپھی جان کے گھر کے اور کوئی ٹھکانہ ہی ذہن میں نہ آیا۔ میں ابھی کیا کہہ رہا تھا کہ پھوپھی جان بوڑھی ہو گئیں ہیں میں انہیں دیکھ کے چکرا سا گیا۔ بالکل ڈھل گئی ہیں۔ بال کھچڑی۔ چہرے پہ جھریاں نیچے کے دو دانت جھڑ گئے ہیں۔ سفید دوپٹہ اور ننگی کلائیاں رنڈاپے کے طفیل ہیں۔ ورنہ پہلے تو وہ رنگا چنا دوپٹہ اوڑھے رہا کرتی تھیں۔ اور شیشے کی رنگین چنسی پھنسی چوڑیاں ان کی کلائیوں میں کھنکا کرتی تھیں۔ سرورطہ پہ ہے مجھے یاد آیا کہ پھوپھی جان کا پان چھالیا کا خرچ اب بہت کم ہو گیا ہے ان کے گھر بیبیوں کا وہ جمگھٹا بھی تو نہیں رہتا۔ پان چھالیا کا خرچ آپ سے آپ کم ہو گا۔ اب ان کا سرلہ بھی کم چلتا ہے اور زبان بھی کم چلتی ہے۔

میں ہنس کے کہنے لگا "پھوپھی جان آپ تو بالکل ہی بدل گئیں کیسی ہے اب لڑائی بھی نہیں ہوتی۔"

پھوپھی تو کچھ نہ بولیں۔ ان کے نہ بولنے پہ بھی مجھے خاصی حیرانی ہوئی ہے شمیم بول اٹھی "لڑیں کس سے بھنڈیلیاں تو پاکستان چلی گئیں۔"

شمیم سچ کہتی تھی۔ اب تو اڑوس پڑوس میں شرنارتھی ہی شرنارتھی نے ہیں۔ برابر کے مکان میں پہلے بینڈرا دل والی رہتی تھی پھوپھی جان کی اس سے یا الٹرائی ٹھنی رہتی تھی۔ یا گاڑھی چھنتی تھی۔ اب وہاں ایک سردارنی رہتی ہے۔ اس سے پھوپھی جان یوں بھی ایک ذرا دب کر بات کرتی ہیں۔ پھر بڑی دقت یہ کہ سردارنی ٹھیٹھ پنجابی بولتی ہے اور پھوپھی جان اردو محاورے سے انحراف نہیں کرتیں کبھی کبھی حق ہمسائے کی ادا کرتے ہوئے سردارنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتی ہے اور پھوپھی جان ایک آدھ لفظ پنجابی کا استعمال کر لیتی ہیں لیکن یہ تو سمجھوتے کی بات ہوئی اور لڑائی سمجھوتوں میں تو نہیں لڑی جاتی سردارنی کا جسم ڈھل گیا ہے لیکن جواب تک بیتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ سردارنی کے لونڈے کو یہ چمک دمک ذرا سی بھی ورثہ میں نہیں ملی ہے وہ گورا چٹا ضرور ہے دودھ میں بھی نہیں کھیلتا لیکن اس کے چہرے پہ وہ شادابی پھر بھی نظر نہیں آتی جو اس عمر کے بچوں کے چہرہ پر کھیلتی نظر آیا کرتی ہے شاید یہ شادابی اور چمک دمک کا سارا قصہ مٹی ہی کا قصہ ہو۔ سردارنی کا بچہ اس مٹی کو بو باس سے غالباً ابھی مانوس نہیں ہوا ہے۔

ویسے یہ مانوس اور نامانوس کا سوال ہی ٹیڑھا ہے اب میں کیا کہوں یہ محلہ مانوس نظر آتا ہے اور اجنبیت کا احساس بھی ہوتا ہے اصل میں اپنے رنگ ڈھنگ عجیب ڈھب سے بدلا ہے۔ اس قصے سے منیندریں نہ اڑیں۔ مگر وہ عجیب طور ہی کی کہانی۔ پہلی نظر میں تو تبدیلی کا احساس خود مجھے بھی نہیں ہوتا تھا۔ میں صبح منہ اندھیرے گھر پہنچ گیا تھا اسے بھی عجیب بات ہی کہنا چاہئے کہ دنیا بدل گئی۔ ہمارے محلہ کا بلکہ ہمارے پورے نگر کا طور بدل گیا لیکن ریل کا وقت اب بھی وہی ہے۔ ریل اب بھی وہاں تڑکے ہی پہنچتی ہے۔ ریل کا وقت نہیں اور اسٹیشن والی سڑک نہیں بدلی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دونوں کو ایک ہی وضع پہ دیکھا اور اب بھی دونوں کی وہی وضع نظر آتی۔ سڑک جتنی پہلے تھی۔ اب اور خستہ ہو گئی ہے کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ یہ پتہ ہی نہ چلا کہ اکا آگے بڑھ رہا ہے یا پیچھے ہٹ رہا ہے۔ سامنے کئی اکے اور بھی چلے جا رہے تھے صبح کے دھندلکے اور اڑتی ہوئی گرد میں وہ بھی بس یوں نظر آتے تھے کہ چل نہیں رہے ہیں بلا چکر کھا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہموار سڑک آ جاتی اور سب اکے پوری رفتار سے دوڑنے لگتے ہیں۔ ان کے پہیوں کے بے ہنگم شور سے بے ہنگم اور میٹھا میٹھا ترنم پیدا ہوتا اور پوری پوری فضا پہ چھا جاتا۔ پھر پہیہ اچانک دھم سے کسی گڈھے میں گر پڑتا اور یوں معلوم ہوتا کہ اب الٹا اور اب الٹا۔ سڑک سے ہٹ کر ٹیلی گراف کے تار پہ ایک ننھا سا چڑیا اس کیفیت سے اپنی ننھی سی دم کو گردش دے رہی تھی گویا کسی نے پارہ بھر دیا ہے۔ لب سڑک ایک شیشم کا لمبا پیڑ کھڑا تھا جس کے سلسلے پتے چڑیوں کے میٹھا س بھرے شور سے بج رہے تھے لیکن چڑیا کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اکہ پھر تیزی سے چلنے لگا میٹھا س بھرا شور دھیما پڑتا گیا۔ دھیما پڑتا گیا اور صبح کے لمڈتے ہوئے دھیمے راگ میں حل ہو گیا۔ ہوا میں ایک مہک پیدا ہو چلی تھی سڑک سے لگی ہوئی مٹھن لال کی بغیچی تھی جہاں بیلا چنبیلی کے درخت سفید سفید پھولوں سے لدے کھڑے تھے۔ ان سے پرے ایک نیم کے نیچے رہٹ چل رہی تھی۔ چبوترے پہ لالہ مٹھن لال کھڑے تھے ننگے پیر ننگے سر۔ بدن پہ لباس کے نام ایک بدرنگ دھوتی گلے میں سفید ڈورا۔ ایک ہاتھ میں پیتل کی گڑوی دوسرے میں نیم کی دتون لالہ مٹھن لال کے طور اطوار میں ذرا بھی تو فرق نہیں آیا ہے اسی انداز سے سویرے منہ اندھیرے ٹٹی اور اشنان کو گھر سے نکل پہنچ پہنچے ہیں جنگل سے واپسی پر رہٹ پہ بیٹھ کر پیلی مٹی سے گڑوی مانجھتے

...یں۔ نیم کی دتون کرتے ہیں۔ اور جتنی دتون کرتے ہیں اتنا ہی تھوکتے ہیں۔ لالہ
...ن لال کی بغیچی سے بس ذرا آگے بڑھکر آبادی شروع ہو جاتی ہے بازار ابھی
...ند تھا۔ ہاں موتی حلوائی کی دکان کھل گئی تھی لیکن چولہا ابھی گرم نہیں ہوا تھا
...لیوں اور کچوریوں کی ابتدائی تیاری کے انتظامات ہو رہے تھے دکان کے
...امنے تھولوں دونوں۔ کلھڑوں اور اپلا کا ایک ڈھیر پڑا تھا جس پہ ایک
...ورکتے بڑی بیدلی سے منڈلا رہے تھے مہتروں نے جھاڑو کا سلسلہ ابھی بند
...نہیں کیا تھا سڑک پر جا بجا گرد اڑ رہی تھی اور اپنی گلی کے نکڑ پہ تو اتنی گرد تھی
...تھوڑی دیر تک کچھ نظر نہ آیا۔ بس ایک دھندلا سا سایہ حرکت کرتا دکھائی
...دیتا تھا کہ جب بالکل قریب پہنچ گیا تب مجھے پتہ چلا کہ یہ جھالو مہترانی ہے
...س نے مجھے بڑی رعونت سے دیکھا اور پھر جھاڑو دینے میں مصروف ہو گئی
...مجھے اس کی اس رعونت پہ پانچ چھ سال پہلے والا زمانہ یاد آگیا۔ میں اور
...حید اکثر علیگڈھ سے اسی گاڑی سے آیا کرتے تھے اور ہر مرتبہ جھالو مہترانی اسی
...دا سے جھاڑو دیتی نظر آتی۔ رعونت سے ہمیں دیکھتی اور پھر جھاڑو دینے...
...ن۔ وحید آجکل کراچی میں ہے۔ لیکن ہماری قوم نے ایسا چولا بدلا ہے کہ کچھ پہچانا نہیں
...جاتا ہے۔ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے اور کلفٹن میں رہتا ہے۔ پچھلے سال اتفاقاً
...اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بڑی گرمی میں باتیں کرتا تھا کراچی کی رونق
...قصیدے۔ تجارت کی نیرنگیوں کا احوال۔ وہ کہتا رہا میں سنتا رہا اس
...نئے رنگ کو دیکھکر میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ موٹر کی سواری پر منحصر نہیں وحید
...نے پہلا چولا ہی بدل گیا ہے امریکی طرز کی بشرٹ اور پتلون تو ظاہری ٹھاٹ باٹ
...ہے اس کا تو بات کرنے کا لہجہ تک بدل گیا ہے۔ بندرگاہ کراچی کی ہوا کی تاثیر
...سے میں ناواقف نہیں ہوں۔ وہاں مہاجر جس طرح چولا بدلتا ہے وہ یا تو کسی
...شپ یا ہوبرڈ پر اڑا لیتا ہے اور سمندر کی نم ہواؤں کے سہارے جیتا ہے یا پھر
...لیڈر بن کر موٹر میں گھومتا ہے لیکن وحید کی نئی وضع قطع دیکھ کر مجھے واقعی
...ت تعجب ہوا۔ میرا یہ عقیدہ رہا تھا کہ جسے علیگڈھ نہیں بگاڑ سکتا اسے دنیا
...کی کوئی برائی نہیں بگاڑ سکتی۔ میں اور وہ علیگڈھ ایک سال کے فرق سے
...گئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ میں میٹرک میں ایک سال لڑھک گیا تھا۔
...ایک سال بعد جب میں علیگڈھ پہنچا تو وحید میں مجھے ذرا بھی تبدیلی نظر نہ آئی
...کالی اچکن کے سوا اور کوئی چیز اسے علیگڈھ سے تحفہ میں نہیں ملی تھی اب
...بھی اسی محنت اسی ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ وحید کو ہماری کچھ بھی جانی

ہی نے پڑھایا لکھایا ہے۔ قصہ اصل یہ تھا کہ وحید کی شمیم سے منگنی ہو گئی تھی
اسے معمولی منگنی کبھی نہیں کہنا چاہیئے۔ یوں مجھے اب یہ لفظ استعمال نہیں کرنا
چاہیئے پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ کمبخت کو شمیم سے عشق تھا۔ اس کے لئے میری
دلیل یہ ہے کہ اگر یہ معمولی لگاؤ نہ ہوتا تو علیگڈھ میں جاکر اس کا زور ٹوٹ جاتا
علیگڈھ میں یاروں کا عجب طور تھا جس لڑکے نے امتحان کے ڈیڑھ دو
مہینے کسی لڑکی کو ٹیوشن پڑھا دیا اس سے اپنی لگاوٹ کا اعلان کر دیا۔ جو
لڑکا کسی نئے طالب علم کے ساتھ تین دن میرس روڈ پہ گھوم لیا اس کی خبر
مشتہر کر دی۔ علیگڈھ میں عشق کم عشق کا چرچا زیادہ تھا لیکن وحید نے لڑکیوں
کے ٹیوشن کئے اور مسلسل کئے لیکن اپنی آن قائم رکھی۔ ہفتے کی چھٹی آئی اور وہ
علی گڑھ سے رسہ تڑا کر بھاگا۔ ادھر شمیم بھی شاید اس کی باٹ ہی دیکھتی رہتی
تھی میں تو جب بھی وحید کے ساتھ گیا اس گلی سے گذرتے وقت یہی دیکھا کہ
اوپر کی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے شمیم اتنی حسین و جمیل تو نہ تھی کہ اسے حور
اور پری کہا جائے لیکن اس میں ایک عجیب سی کشش ضرور تھی۔ چھریرا بدن
لمبا قد، کھلتا ہوا رنگ، آنکھیں ...... مجھے ان آنکھوں کا ذکر زیادہ
زیادہ جوش سے کرنا چاہیئے۔ اگر اس کی آنکھیں ایسی نہ ہوتیں تو وہ معمولی شکل
و صورت والی لڑکیوں میں شمار ہوتی۔ شعر اور افسانہ قسم کی چیزوں سے
مجھے چونکہ کوئی ربط نہیں ہے اس لئے میرے ذہن میں کوئی خوب صورت تشبیہہ
نہیں آرہی۔ بس کچھ ایسا تاثر پیدا ہوتا تھا کہ کیوڑے سے بھری ہوئی دو پیالیاں
ہیں جو چھلک جانے کو ہیں۔ اس کی پتلیاں گردش کرتی ہوئی نہیں بلکہ تیرتی
نظر آتی تھیں۔ میں نے اسے کئی مرتبہ شلوار پہنے بھی دیکھا ہے لیکن شلوار تو وہ
شوقیہ پہن لیا کرتی تھی۔ اس کا روزمرہ کا لباس ڈھیلا پائجامہ تھا اور یہ واقعہ
ہے کہ ڈھیلا پائجامہ اس کے چھریرے بدن اور لمبے قد پہ خوب کھلتا تھا۔
پھولوں کی بڑی شوقین تھی گرمیوں میں صبح کے وقت میں جب کبھی پہونچ جاتا کے
یہاں گیا یہی دیکھا کہ شمیم بیٹھی بیلے کے پھول گوندھ رہی ہے۔ جتنے پھول کانوں
میں پہن سکتی تھی کانوں میں پہن لیتی تھی باقی کے گجرے پرو کر کے کمرے گھر ...
پہ پھیلا دیتی تھی۔

میں نے اگر ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے تو اس سے کوئی غلط فہمی پیدا
نہیں ہونی چاہیئے۔ شمیم زندہ ہے اصل بات یوں ہے کہ مجھے اپنا یہ پورا محلہ ہی
ماضی کا صیغہ نظر آتا ہے اب شمیم کو میں کیسے علیحدہ سمجھوں۔ اور پھر اب شمیم میں

وہ بات بھی نہیں رہی۔ اس میں جو ایک عجیب قسم کی لپک تھی اس نے ایک دھیمی دھیمی حزینہ کیفیت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ شمیم اب خاصی چھلک گئی ہے۔ اس کا چہرہ، جسم کچھ اور زیادہ بھرا بھرا نظر آنے لگا ہے۔ چہرہ کچھ سونت گیا ہے اور اس کی آنکھوں کی شادابی سے وہ کیوڑے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی یہ الگ بات ہے کہ اس کے جسم کی مہک کم نہیں ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں سے اب کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں اس کے لئے "افسردگی" کا لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ اس کی آنکھوں کی اس نئی کیفیت کے سلسلے میں مجھے یہ لفظ کچھ عامیانہ سا نظر آتا ہے لیکن کیا ضرورت ہے کہ میں کوئی تراشا ترشایا لفظ استعمال ہی کروں۔ دراصل اس گھر کی پوری فضا میں ہی ایک عجیب سی کیفیت رچ گئی ہے جسے میں لفظوں میں ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

پھوپھا کا انتقال ہمارے جانے کے تھوڑے دن کے بعد ہوا تھا۔ شاید اس گھر کا طور اسی وجہ سے بدل گیا ہے۔ ہمارے پھوپھا اچھے خاصے زمیندار تھے ان کے زمانے میں گھر میں ترکاریوں کی ریل پیل رہتی تھی کہ پھوپھی جان محلہ والیوں پہ خوب خوب عنایت کرتی تھیں اور پھر بھی ترکاری سوکھ سوکھ کے جاتی تھی۔ خربوزوں کی فصل پہ یہ عالم ہوتا کہ پھوپھی جان کے گھر کا آنگن بستی ہو جاتا۔ اور ادھر مینہ کا چھینٹا پڑا ادھر خربوزوں کی آمد بند اور آموں کے ٹوکرے کے ٹوکروں کی آمد شروع۔ بوندا باندی کا عالم ہے صحن میں پانی سے بھری ٹب رکھی ہے اور اس میں آم پڑے ہیں لیکن اب تو پھوپھی جان کے آنگن میں جھاڑو سی دلی رہتی ہے۔ نہ خربوزوں کے چھلکے نظر آتے ہیں۔ نہ آموں کی گٹھلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ نہ گوبی اور مولی کے پتے بکھرے ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت پھولوں کے آنے کا دستور بھی بند ہو گیا ہے۔ شمیم کے کانوں میں بس دو ہلکے پھلکے روپہلی بندے ہلکورے کھاتے رہتے ہیں۔ پھوپھی جان کے لباس میں تو خیر نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے لیکن شمیم بھی اب اتنی اجلی نہیں رہتی۔ اس تبدیلی سے قطع نظر مجھے تو شمیم کو وہاں دیکھ کر ہی تعجب سا ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ شمیم کی شادی ہو گئی ہے اور وہ وحید کے ساتھ کراچی میں ہے میں یہی تصور کر لیتا کہ شمیم کراچی سے آئی ہوئی ہے مگر اس کے چہرے پہ بھی تو اس آسودگی کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا جو شادی کے بعد لڑکیوں کے چہروں پہ پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

میں نے موقعہ پا کر بات چھیڑ دی "پھوپھی جان۔ وحید تو آجکل کراچی میں ہے نا؟"

پھوپھی جان اس وقت گیہوں صاف کر رہی تھیں۔ صحن میں بورا ٹاٹ بچھا ہوا تھا اس پہ گیہوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ اور پھوپھی جان چھاج میں تھوڑے تھوڑے گیہوں ڈال کر پھٹکتی جاتیں اور الگ الگ ڈھیر لگاتی جاتیں۔ فقرے کا ان پہ کوئی شدید ردعمل تو نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح کنکریاں بینتی رہیں۔ ہاں لہجہ میں فرق ضرور پڑ گیا۔ لہجہ کی یہ کیفیت غصے اور افسردگی کے بین بین تھی۔ کہنے لگیں "خاک ڈالو کمبخت پہ۔ ہماری بلا سے وہ کہیں ہو۔"

میں ادھر چکرایا۔ پہلے تو میں چپ رہا کہ پھوپھی جان خود ہی کھلیں گی مگر وہ تو اسی طرح گیہوں کے ڈھیر پہ جھکی رہیں۔ پھر میں نے ہی بات چلائی "شمیم" پھوپھی جان میری بات کاٹتے ہوئے بولیں "اے بھیا اس نے تو کراچی جا کے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ کوئی چلتی پھرتی مل گئی اس سے بیاہ کر لیا۔" انھوں نے چھاج اٹھایا اور آہستہ سے دو دفعہ گیہوں پھٹک کر پھر کنکریاں بینتی شروع کر دیں۔ کنکریاں بینتے بینتے اسی طرح چھاج پہ نظریں جمائے ہوئے وہ پھر بولیں "ڈر یا ہمارا تو لینا ہی کیا۔ رشتہ کو پڑھایا لکھایا، پالا پوسا۔ کیا اور اس نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا۔ . . . . یہاں سے کہہ کے گیا تھا کہ جاتے ہی خط بھیجوں گا۔ سے بھیا اس نے تو وہاں جاتے ہی ایسی کینچلی بدلی دنیا بھر کے فعل کرنے لگا۔"

پھوپھی جان چپ ہو گئیں۔ ان کی نظریں اسی طرح گیہوں کی ڈھیری پہ جمی ہوئی تھیں۔ ڈھیری کے دانوں کو آہستہ آہستہ پھیلاتیں، کریدتیں اور کنکریاں چن کر ایک طرف پھینکتی جاتیں۔ کنکریاں چنتے چنتے وہ پھر آہستہ سے ٹھنڈا سا سانس بھرتے ہوئے بولیں "خیر ہم نے جیسا کیا ہمارے آگے آئے گا۔" اور انہوں نے چھاج میں گیہوں ڈالے اور زور زور سے پھٹکنے شروع کئے "بالکل یہ گیہوں ہیں نرا کوڑا۔ آدھے تو مٹی ہوتے ہیں۔" اور انھوں نے اور زور زور سے گیہوں پھٹکنے شروع کر دیئے۔

میرا وہاں ایک ہفتے قیام رہا مگر پھر بھی یہ ذکر نہ نکلا۔ دکھتے ہوئے گھاؤ پہ ایک مرتبہ میں انگلی رکھ چکا تھا۔ دوبارہ اس کی جرأت نہ ہوئی۔ پھوپھی جان نے خود یہ ذکر چھیڑا نہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اسے بھول بسر گئی ہیں۔ ان کی چپ چاپ ان کے پورے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پھوڑا برابر ٹیس دیتا رہتا ہے۔ شمیم اس حد تک تو متاثر نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن

دیکھیے تو محرم کی کیفیت تو اس کی چال ڈھال سے بھی پیدا ہوتی تھی۔ اس گھر کی چہل پہل نہ جانے کہاں رخصت ہو گئی تھی۔ گھر میں سناٹے اور خاموشی سی چھائی رہتی۔ باتیں ہوتیں خاموشی کا تاثر اور گہرا ہو جاتا۔ کبھی کبھی ان اکثر بے معنی طور پر باورچی خانے سے صحن میں اور صحن سے کسی کمرے میں جاتیں اور خواہ مخواہ کی مصروفیتیں پیدا کرتیں اور یوں معلوم ہوتا کہ یہ پھوپھی جان نہیں ہیں بلکہ پھوپھی جان کا سایہ اس گھر پر منڈلا رہا ہے جیسے غم کی ایک لہر ہے جو گلی میں کھڑے نقش قدم کے ساتھ چلنے لگی ہو۔ یہ نظر آتا اور غائب ہو جاتا۔ بس خاموش رہتی۔

اسے پرمعنی سکوت کی ستم ظریفی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ میں اتفاق ہی کہوں گا کہ وہاں سے میری روانگی ٹھیک یکم محرم کو ہوئی۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ پچھلے سال چاند ۲۹ کا ہوا تھا۔ ۹ محرم کو ماتم کے دن پھوپھی جان نے شمیم اور امام باڑے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھیں۔ شمیم کو میلے سے زیادہ تو یوں بھی دلچسپی نہ تھی لیکن اب تو یوں معلوم ہوتا کہ اس نے اپنے آپ کو عزاداری ہی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ کس انہماک سے سارے کام کرتی تھی۔ پھوپھی جان نے تو بس دعا ہی کا کام کیا۔ باقی امام باڑے کو دیکھنے بھالنے کے، علم کو پاک کرنے، چاندنی اور جھاڑ فانوس کے صاف کرنے کے سب کام شمیم ہی نے کیے۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں نے کون کون پھوپھی جان کا ہاتھ بٹایا تھا اور آج سارا کام شمیم کر رہی تھی۔

میں ٹہلتا ہوا پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ قدم خواہ مخواہ اسٹیشن کی طرف اٹھ گئے۔ پلیٹ فارم پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پیڑوں کے دبے درختوں پر کہیں کہیں سنہری سی دھوپ دکھائی دیتی تھی۔ ایک درخت پر پرندے بیٹھے تھے جو مسلسل شور کیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی ان میں کا کوئی پھڑپھڑاہٹ کے عالم میں شاخ سے نکل کر فضا میں بلند ہوتا اور بیٹھے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر پھر شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کرتا اور کامیاب ہو جاتا۔ مجھے خیال آیا کہ آج غالباً چاند رات ہے اور محرم کی تقریب سے لوگوں کو آنا چاہیے۔ پہلے تو ہر سال یہی ہوتا تھا کہ چاند رات ہوئی، پردیس میں گئے ہوئے لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ اتنی دیر میں ریل کے آنے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر تک پلیٹ فارم کی خاموش فضا میں ایک گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ گاڑی آئی چند منٹ ٹھہری۔ آنے والے اترے۔ جانے والے سوار ہوئے جانی پہچانی صورت برابر والوں میں دکھائی دی نہ سامنے والوں میں گاڑی روانہ ہو گئی پلیٹ فارم خالی ہونے لگا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں پلیٹ فارم سے باہر نکل کر گھر کی طرف چلا۔

شام ہو چلی تھی۔ دن کا اجالا مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ تاشوں کی آواز نے گلی کی فضا میں ہلکی سی گرمی پیدا کر دی تھی۔ کلو اور شرافت تاشہ بجا رہے تھے۔ کلو جو لے پالک کا کام کرتا ہوا شرافت آج کل چکی کی پوکی پہ منشی لگا ہوا ہے ان میں تیسرا تاشا شرافت کے چھوٹے بھائی کے گلے میں تھا مگر اس کی قمچی بار بار غلط پڑتی تھی۔ تاشے کی گت بگڑ جاتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تاشہ بجنا شروع ہوا ہے۔ کچھ دیر میں اور لوگ نکلیں گے کسی کے گلے میں تاشہ ہو گا کوئی محض دیکھنے والا ہو گا اور پھر ایک لمبا جلوس بن جائے گا جو گلیوں اور محلوں میں گشت کرتا ہوا سارے امام باڑوں میں پہنچے گا اور محرم کی آمد کا اعلان کرے گا۔ ہر سال یہی ہوا کرتا تھا مگر بہت دیر ہو گئی اور تاشہ بجانے والے چند بچوں کے اس مختصر گروہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ایک بڑے میاں کہیں باہر سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ رہے تھے۔ تاشوں کو دیکھ کے بولے پوچھا "بھائی محرم کا چاند دیکھ لیا؟"

"ہاں جی دیکھ لیا" ایک چھوٹے سے لڑکے نے جواب دیا۔

بڑے میاں نے عاجزانہ ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند منٹ تک تاشے والوں کو تکتے رہے اور پھر لاٹھی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور گھر میں داخل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ کلو اور شرافت کے ہاتھ دھیمے پڑنے لگے۔ وہ آگے بڑھ لیے۔ آگے آگے شرافت اور کلو پیچھے چند بچے اور یہ جلوس گلی سے نکل کر کسی دوسری طرف مڑ گیا۔ گلی میں پھر خاموشی چھا گئی۔

میں جب گھر میں داخل ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ امام باڑے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بھائی لوگ اپنے اس پرانے اہتمام سے جگمگ کر رہے تھے۔ [illegible] جھاڑ فانوس جو جانے کب سے ٹنگے ہوئے تھے۔ منبر پر چڑھا ہوا غلاف بھی خاصا بوسیدہ نظر آتا تھا۔ اس کے بائیں سمت میں جو قالین بچھا ہوا تھا وہ بوسیدہ تو نہیں میلا ضرور ہو گیا تھا۔ شمیم اگر کی بتیاں جلا جلا کر طاق پر رکھ رہی تھی۔ سوز خوانوں میں اٹھ رہی تھی سر سے پیر تک اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ ڈھیلا پائجامہ، سیاہ قمیص، سیاہ جارجٹ کا دوپٹہ۔ شیشے کی نازک آسمانی چوڑیاں بیشک اس کی کلائیوں میں اچھی لگتی تھیں لیکن اس وقت تو اس کی ننگی گوری گوری کلائیاں اس سے بھی زیادہ دلکش نظر آ رہی تھیں

غلام عباس

دو تماشے

میں اور خان بہادر مرزا محبوب بیگ چاندنی چوک میں بوٹوں کی ایک دکان کے سامنے موٹر میں بیٹھے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنی عادت کے مطابق شان امارت دکھلانے کے لئے دکان کے مالک کو حکم دیا تھا کہ وہ بوٹ ہمیں موٹر میں لا لا کے دکھلائے۔ دکاندار اور اس کے سب کارندے اور گاہکوں کو چھوڑ کر ہماری موٹر پر ٹوٹ پڑے تھے۔

اتنے میں ایک ننھی سی لڑکی ایک بڈھے ضعیف اندھے کا ہاتھ پکڑے ہماری عالیشان موٹر کے پاس آکھڑی ہوئی۔ دونوں کے چہرے زرد تھے۔ اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑے ہوتے تھے۔ بال پریشان اور رنگ دھول میں اٹے ہوئے۔ ننگے پیروں پر میل کی پپڑیاں جمی ہوئی۔ میلے کچیلے اور بوسیدہ کپڑے۔ اور وہ اس قدر نڈھال کہ معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار کتوں نے ان پر حملہ کر دیا ہو۔ مگر کسی لطیفہ غیبی سے ان کی جان بچ گئی ہو۔ لڑکی کی عمر بمشکل چھ برس کی ہوگی۔ اس نے بڑی لجاجت سے یہ کہنا شروع کیا۔

"بابو جی ہم کل سے بھوکے ہیں۔ رام بھلے ہم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ ایک پیسے کے چنے لے دو بابو جی!"

اندھا لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اندھے پر ترس کر جانا بابا!"

ان دونوں کی صورتیں دیکھ کر مرزا صاحب نے انتہا درجہ کی بیزاری کا اظہار کیا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی بھیانک شکلیں دیکھ کر مرزا صاحب کی آنکھوں کو جو صرف حسن کو دیکھنے اور پرکھنے کی خوگر ہو چکیں تھیں سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔

انہوں نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ جاؤ جاؤ معاف کرو۔

لڑکی نے پھر کہنا شروع کیا۔

دیکھو بابو جی ایک [illegible] بابو جی ہم [illegible] یہ کہہ کر لڑکی نے [illegible] پیٹ کھال پیٹ [illegible] اور پیٹ پیٹھ سے لگ رہا تھا۔

مرزا صاحب نے ہنس کر مجھ سے کہا۔

"دیکھتے ہو بھیک مانگنے کے یہ کیسے کیسے ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن میں ان کے فریب میں نہیں آنے کا"

پھر انہوں نے کبڑے اندھے لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"بابا جاؤ، [illegible]"

[illegible] اس طرح ختم ہو کر مرزا صاحب [illegible] پیسہ [illegible] موٹر ڈرائیور [illegible]

آج روز شام [illegible] خان بہادر مرزا محبوب [illegible] کے ریزرو کلاس میں بیٹھے ایک ہندوستانی فلم دیکھ رہے تھے [illegible] کوئی خاص خوبی نہ تھی تو کچھ ایسا عیب بھی نہ تھا۔ یہ ایک [illegible] فلم تھا جس میں ہندوستان کی غربت اور [illegible] کھینچا گیا تھا۔

کسی شہر کے ایک غریب [illegible] کا الزام [illegible] بے گناہ کی خود داری اسے برداشت نہیں کر سکتی اور وہ [illegible] خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کی ایک لڑکی ہے جس کی ماں مر چکی ہے [illegible] اس کا بڈھا باپ یعنی لڑکی کا دادا ہے۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتے ہیں۔ جب مالک مکان کو تین مہینے تک کرایہ نہیں ملتا۔ تو وہ بڈھے کو سخت سست کہنے کے بعد [illegible] شام تک کرایہ ادا نہیں کر دیا۔ تو سامان مکان سے باہر پھینک دوں گا

یہ سُن کر دونوں دادا پوتی سہم جاتے ہیں۔ اور کراہتے کے سنبھلے
[illegible]کر نے شہر میں گدائی کے لئے جاتے ہیں
[illegible] پر ایک راہرو سے بڑی لجاجت سے کہتی ہے "بابوجی ایک
[illegible] زید ہم کل سے بھوکے ہیں"۔
سینما کے پردے پر جب تک یہ سین رہا۔ میں مرزا صاحب کو
[illegible] آہیں بھرتے سنا کیا۔ آخر وہ مجھ سے کہنے لگے۔
"[illegible] اپنا رومال تو دینا۔ میرا رومال نہ جانے کہاں گر پڑا!"
میں نے رومال دیدیا۔
جب [illegible] ہوا تو مرزا صاحب نے رومال مجھے لوٹا دیا۔ میں نے دیکھا
تو رومال تر تھا۔ اور مرزا صاحب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں
میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔
"ایں مرزا صاحب۔ رو رہے ہیں آپ کیا؟"
مرزا صاحب نے اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔
"نہیں تو . . . . میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ سرکار کو ایسے
دردناک کھیل دکھلانے کی اجازت نہیں دینی چاہئے تھی!"
(بشکریہ "چمنستان")

افاداتِ مسیح الملکؒ

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا "مکمل" دستور العلاج "
جس میں سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان
مع تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ قابلِ قدر
اور مفید کتاب ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی علا سے خریدیں

فیمیلن (نسائی خاص)
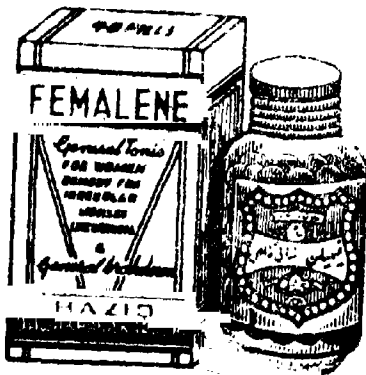
[illegible] گولیاں عورتوں کی تمام پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں
سیلان، ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے
[illegible] نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرارِ حمل کو مدد دیتی ہیں
[illegible] عورتوں کے لئے ایک ہربل ٹانک ہے جن کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام
[illegible] کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاطِ حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے
ان کے لئے بے حد مفید ہے۔
قیمت: مکمل کورس چالیس گولی برائے بیس یوم تین روپے چھ آنے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی علا سے طلب فرمائیں

بریگیڈیر گلزار احمد

سانجھے کی عزت

وہ صوبیدار صاحب جلال خاں کے پھاٹک پر پہنچ کر رُک سی گئی جیسے اس کے قدم کسی غیر مرئی زنجیر نے روک لئے ہوں۔

صوبیدار صاحب جلال خاں کی حویلی گاؤں میں سب سے بڑی تھی شمال کی جانب دو پسار، سامنے کشادہ برآمدہ۔ دونوں پہلوؤں میں سونے خانے" اور آگے پھیلا ہوا صحن جس کے مشرقی بازو پر مردانہ بیٹھک تھی صحن ہی میں قدِ آدم دیوار کھینچ کر دالان کے ایک حصے کو مویشی خانہ بنا لیا تھا جس میں صوبیدار صاحب کی کمیدیا گھوڑی سڈول سینگوں والی بھن بھنی بھینسیں اور دھنی نسل کے خوش وضع بیلوں کی جوڑی بندھی رہتی تھی۔ مکان عمدہ تراشے ہوئے سفید چونیے پتھر کے بنے تھے۔ اور گاؤں کے اچھے گھروں میں شمار ہوتے تھے۔

مگر اس وقت مکان کے اچھے بُرے ہونے کا سوال نہ تھا اس وقت صوبیدار صاحب جلال خاں کے گھر میں کہرام بپا تھا ابھی ابھی اطلاع ملی تھی کہ ان کا جواں سال اکلوتا لڑکا گشتاشب خاں قریبی قصبہ سے لوٹتے ہوئے دن دھاڑے قتل ہو گیا تھا۔ جوان، خوبرو، میٹرک پاس۔ کبڈی اور ہاکی کا معروف کھلاڑی۔ صوبیدار صاحب کے گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ گشتاشب میں اگر یہ خصوصیتیں نہ بھی ہوتیں تو کیا یہ کم تھا کہ صوبیدار صاحب کو اللہ نے بڑھاپے میں یہی ایک اولاد دی تھی یہی ان کی وسیع جائداد کا وارث تھا یہی ان کی تمام کائنات تھی۔ وہ اسی کے سہرے گانے میں تیاری میں تھے کہ زندگی کا سہارا اچانک چھن گیا تھا۔

نور بیگم پھاٹک پر رُکی ہی تھی کہ اندر سے صوبیدار صاحب کی بیوی کے دردناک بین کی آواز آئی۔

"ہائے میرے لال۔ میں نے تو تیری کیسی تیار کر رکھی تھی۔"

"ہائے میرے موتیوں ایسا بیٹا!"

"ہائے میرا گبھرو فرزند!"

اور فوراً بیگم یہ سُن کر جیسے بے قابو ہو کر یا جیسے اوپر جیسے قابو پاتے ہوتے اندر چلی گئی جہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اور گشتاشب کی ماں بیمار کی دیوار کے سہارے کبھی بیٹھ کر کبھی کھڑی ہو کر بین کر رہی تھی۔ نوجوان لڑکیاں ادھر اُدھر بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اور شادی شدہ ادھیڑ عمر عورتیں، جن کے بدن میں توانائی تھی صحن کے عین درمیان کھڑی ماتم کر رہی تھیں۔ نور بیگم نے اسی حلقۂ ماتم کا رُخ کیا۔ سر سے دوپٹہ اتار دیا اور ماتم کرنے والیوں تک پہنچتے پہنچتے اسی دوپٹہ سے اپنی کمر کو کس کر باندھ لیا۔ ایک ثانیہ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ ماتم کی تال میں فرق نہ آئے اور پھر ماتم میں شامل ہو گئی۔

"ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے!"

سینہ کوبی کی آواز گاؤں کے دوسرے سرے تک پہنچ رہی تھی جب سینہ درد کی شدت سے ہاتھوں کی چوٹ برداشت نہ کر سکتا تو منہ اور رخسار پر طمانچے مارنے لگتیں۔ اب ماتم کی آواز بھی مختلف ہو جاتی۔

"ہوئے۔ ہوئے۔ ہوئے۔ ہوئے!"

نور بیگم بظاہر بڑی تندہی سے ماتم میں شریک تھی۔ مگر اس کے اندر ایک ذہنی کش مکش برابر جاری تھی۔ اس کا ضمیر اسے وہاں سے بھاگ جانے کی تاکید کر رہا تھا لیکن اب وہاں سے نکل جانا بھی مشکل تھا۔ کچھ دیر کے بعد سب عورتیں تھک ہار کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگیں۔ لیکن مقتول کی والدہ برابر بین کئے جا رہی تھی۔

"میرے چاند جس نے تیرا خون پیا ہے میں اسی کا خون پیوں!"

خون کا لفظ سنتے ہی نور بیگم کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اپنی قمیص اور تہمد کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگی۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا!"

مگر وہ اپنی مرضی سے آئی بھی کہاں تھی۔ اسے تو اس کی ساس نے

...نے مجبور کیا تھا کہ وہ ماتم میں ضرور شریک ہو۔ سبھی نے کہا تھا۔
”...ی۔ خاندان کی رنجشیں اپنی جگہ مگر ماتم سلیقے کا ہوتا ہے“
...بھی ساتھ رہی تھی۔ بھاگ بھری کو ابھی تک اصل واقعہ کا علم نہیں تھا
...سے کچھ بتانا چاہتی تھی۔ چنانچہ ساس نے اسے جھڑک کر کہا۔
”...میرے ساتھ چلو۔ ان کا جوان بیٹا قتل ہو گیا ہے اگر لوگ ایک
دوسرے کا ماتم بھی چھوڑ دیں تو گاؤں کی زندگی کیسے چلے گی“، اور نور بیگم،
...ہوئے قدموں کے ساتھ ساس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔
نوراں باقی عورتوں کے ساتھ سیدزادے ... بیٹھ کر زمین پر بیٹھ
... رانوں کی باری تھی۔ وہ تھی ایک دوسرا اپنی رانوں پر مارنا اسے درد
... اسے خود بھی چوٹیں آئی تھیں۔ جن میں ایک ران پر
... سب میں نور بیگم نے دیکھا کہ گزشتہ شب کی ماں سردار بانو
سے اس کی ... کچھ کہہ رہی تھی۔ نور بیگم کے کان خود بخود ان کی باتوں پر لگ گئے
... کے باوجود وہ سردار بانو کی آواز سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
”نہیں یہ جھوٹ ہے ... اگر سچ بھی ہو تو اپنے بیٹے کے ماتم
...سے میں کسی کو اٹھ جانے کے لئے نہیں کہہ سکتی“
نور بیگم نے سوچا بات نکل گئی ... اس کی طرف اشارہ کرتا اور پھر
... وہاں سے نکالے جانے کا ذکر کرنا۔ بے معنی نہ تھا ... کا کوئی اور
مقصد ہی نہ تھا۔ اب وہاں اس کا بیٹھے رہنا ٹھیک نہ تھا۔ وہ بغیر سوچے
سمجھے اٹھی اور ... دیکھے بغیر جیسے ایک ... میں بہتی ہوئی
...سے نکل گئی گاؤں کی عورتوں نے پھاٹک تک اس کے قدموں کا
... آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا
اور ... دل ہی نگاہوں میں نہ معلوم کیا کچھ کہہ ڈالا۔
... جانتی تھیں کہ نور بیگم کے باپ غلام محمد کو صوبیدار جلال
خاں نے قتل کروایا تھا۔ بلکہ بعض لوگوں کو پورا شبہ تھا کہ صوبیدار جلال خاں
خود بھی قتل کرنے والوں میں شامل تھا
غلام محمد اپنے زمانے میں ”پیر کوڈی“ کا مانا ہوا کھلاڑی تھا۔ اُسے
اپنی جوانی اور طاقت پر بڑا زعم تھا۔ اسی زعم میں اس نے دو ایک مرتبہ جلال
خاں کی پارٹی کے لوگوں کی ہتک بھی کر دی تھی۔ جو ایک ایسا گناہ تھا جسے کوہستانی
لوگوں کی سنگلاخ زمین میں کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ ایک دن غلام محمد
کو موقع پا کر قتل کر دیا گیا۔

نور بیگم اس وقت دو سال کی بچی تھی اسے یہ واقعہ یوں تو کیا یاد
ہو سکتا تھا مگر اس کی ماں نے بچپنے ہی سے اسے باپ کے قتل کی ایک ایک
بات سے آگاہ کر دیا تھا اس کا باپ کیوں قتل کیا گیا؟ کہاں قتل کیا گیا؟ قاتل
کون تھے؟ یہ ایک ایسی داستان تھی جو نور بیگم کی زندگی میں شامل ہو گئی
نور بیگم کی ماں جب تک وہ زندہ رہی۔ نور بیگم کو ہفتے عشرے میں ایک
مرتبہ ضرور اس نالے پر لے کر جاتی جہاں اُس کا شوہر غلام محمد قتل کیا گیا تھا
اور ان پتھر کے ٹکڑوں کو دکھاتی جن پر نور بیگم کے باپ کا خون گرا تھا۔ اور
اپنی خورد سالہ بچی سے اکثر کہا کرتی۔

”نوراں! اگر تیرا کوئی بھائی ہوتا تو تیرے باپ کے قتل کا بدلہ لیتا۔ مگر
افسوس اس بدبختی کا نہ کوئی بھائی ہے نہ بیٹا“

ماں کے بعد خود نور بیگم بھی۔ اسی نالے اور ان پتھروں کی طرف اکثر
جاتی اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک ایک پتھر سے اُس کے باپ کی روح
قصاص کے لئے پکار رہی ہے۔

وہ اپنے دل میں اکثر آرزو کرتی۔

”اے کاش میں لڑکا ہوتی“

پھر کہتی۔ لڑکا ہونا تو اس کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر وہ لڑکوں کا
سا کام تو کر سکتی ہے! وہ انہیں خیالات میں بڑی ہو گئی۔ لڑکی سے جوان
ہوئی۔ پھر بیاہی گئی۔ اور اب ایک لڑکی اور دو لڑکوں کی ماں تھی۔

صوبیدار جلال خاں کے پھاٹک سے نکل کر وہ تیز تیز قدموں سے اپنے
گھر کی طرف جا رہی تھی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ دوڑی جا رہی تھی۔ ماتم میں سے
اٹھتے وقت اس نے عورتوں کی معنی خیز نگاہوں کو دیکھ لیا تھا اور تعاقب
کرنے والوں کے مفہوم کو بھی بھانپ گئی تھی۔ جیسے پورے گاؤں کی نظریں
اس کی پیٹھ کو چیر کر اُس کے دل کا راز معلوم کر رہی ہیں۔ اس کے سینے کے
اندر جذبات کے تلاطم کو دیکھ رہی ہیں۔

”مگر اس میں راز کی کیا بات ہے“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

”آخر میں نے اپنے باپ کے راز کا بدلہ ہی تو لیا ہے“

وہ گھر پہنچی ہی تھی کہ اس کی ساس بھاگ بھری بھی ہانپتی آ پہنچی۔

”نوراں! نوراں!“

نوراں بُت بنی خاموش کھڑی تھی۔

"نوراں! میں کہتی ہوں۔ تو بولتی کیوں نہیں؟"

نوراں پھر خاموش رہی۔

"نوراں تیرا ستیاناس! میں پوچھتی ہوں۔ یہ گاؤں والیاں کیا کہہ رہی ہیں؟"

"گاؤں والیاں سچ کہہ رہی ہیں" نوراں بولی۔

بھاگ بھری یہ سُن کر چپ ہو گئی جیسے کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ اس کے بھائی، نوراں کے باپ۔ بھاگ بھری یہ سُن کر چپ ہو گئی جیسے کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ اس کے بھائی، نوراں کے باپ کو قتل ہوتے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ اس کے ماں جائے کا بدلہ لیا جائے کہ ان کو ہساروں کی زندگی میں اس سے بڑی توہین، اس سے زیادہ بے بسی اور کچھ نہیں سمجھی جاتی ہے کہ کوئی خاندان اپنے مقتول کا بدلہ نہ لے سکے

"مگر تو نے اپنے خاوند سے کیوں نہ کہا" بھاگ بھری فکرمندی اور جھلاہٹ کے ملے جلے لہجے میں بولی۔

"پھوپھی میں نے ان سے کئی مرتبہ کہا۔

"تو پھر؟"

"مگر وہ آمادہ نہ ہوا میں نے بارہا کہا میرا باپ قبر میں سے قصاص کے لئے پکار رہا ہے لیکن اکرم کا لیا کہتا ہماری باہیں کمزور ہیں۔ پھوپھی! جب مرد کمزوری دکھائیں تو عورتوں کو مردوں والے کام کرنے ہی پڑتے ہیں۔ پھوپھی! آج اگر کوئی میرا بھائی ہوتا . . . . . ."

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہی نور بیگم رو رہی تھی جو ابھی دو تین گھنٹے پہلے ایک زور آور کبھرو نوجوان کو قتل کر چکی تھی جس نے اسکی کلہاڑی چھین کر دو وار ہوں میں اسے ختم کر دیا تھا! بھاگ بھری پر بھی ایک گہری افسردگی طاری تھی! اسے یہ افسوس نہ تھا کہ نوراں نے قتل کیوں کیا ہے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ اس کی بھتیجی کو سزائے موت دی جائے گی۔ خاندان کی لاج پر حرف آئیگا جو جان سے زیادہ عزیز تھی۔

چڑیل تو نے یہ نہ سوچا کہ تجھے تھانے جانا ہو گا کچہری چڑھنا ہو گا باپ دادا کی رکھی ہوئی عزت برباد ہو گی۔"

نور بیگم خاموش رہی۔ اس نے کوٹھے پر سے کئی مرتبہ تھانہ والوں کو ملزم لے جاتے دیکھا تھا۔ لڑائی جھگڑے۔ مار دھاڑ قتل وغیرہ کے واقعات اس علاقہ میں عام ہوتے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ آج تک ان وارداتوں میں کوئی عورت ماخوذ نہ ہوتی تھی مردوں کے ہوتے ہوئے عورتوں کا ایسے کاموں میں کیا دخل ہو سکتا تھا کبھی کبھار کوئی عورت اغوا کے سلسلے میں تھانہ کچہری میں جاتی تو جاتی مگر خاندانی لڑکیاں اغوا بھی نہیں ہوتی تھیں۔ یہ نیچ اور کمینوں کا کام تھا۔

"تھانہ، کچہری، سپاہی"

اس خیال سے نور بیگم لرز اٹھی۔ اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ سوچنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"پھوپھی! اکرم کے ابا سے کہو کہ وہ مجھے مار ڈالے۔"

"ہاں تجھے مار ڈالے اور آپ پھانسی پر لٹک جائے" ساس نے جل کر کہا "اور پھر دنیا کہے نہ معلوم کیوں اپنی بیوی کو قتل کیا نا ں نا ں۔ نوراں اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔ کیوں؟"

نوراں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ذہن جواب دینے سے قاصر تھا بلکہ اسے تو اپنی ساس کی موجودگی کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی کہ تھانے والوں کے سامنے جائے گی تو وہ لوگ کیسے بھانت بھانت کے سوال پوچھیں گے؟ کچہری چڑھے گی تو اُسے کیسے کیسے لوگوں کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ جس کی غیرت نے کبھی کسی غیر مرد کی ایک کھُردری نظر کو بھی برداشت نہیں کیا اسے اب کیا کچھ نہیں برداشت کرنا پڑے گا؟ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے بدن پر ایک چیتھڑا بھی نہ تھا۔ اور ہزاروں لاکھوں لوگ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ گاؤں والے تو شاید خوش ہوں، دشمنوں کو طعنے دینے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

کیوں نہ وہ ان سب کو قتل کر دے؟ وہ سوچنے لگی۔

موت۔ قتل۔ خون۔ اس خیال نے اس کے بدن میں بجلی کی ایک رو سی بھر دی۔ اس کا خون پھر اپنی رفتار پر آ گیا۔ اس کا ذہن اس زمانہ کی طرف پلٹ گیا جس میں وہ انتقام کے منصوبے باندھا کرتی تھی۔ وہ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ کس طرح وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکتی ہے اسے یاد

تھیں جب وہ اپنے والد کے قتل ہونے کے مقام پر جایا کرتی تھی۔ تو کس طرح ان پتھروں کو دیکھ کر، جن پر اس کا خون گرا تھا۔ وہ دیوانی ہو جاتی تھی۔ اور کس طرح یہ تمنا اس کے سینے میں جاگ اٹھتی تھی کہ وہ انہیں پتھروں کو قاتلوں کے خون سے آلودہ کرے۔

صوبیدار جلال خاں کے خانوادے کے خون سے ان پتھروں کے ساتھ ساتھ اپنی پیاس کو بھی بجھائے۔ جہاں جہاں اس کے باپ کے اعضا کاٹ کر پھینکے گئے تھے وہ بھی وہیں اپنے شکار کے اعضا کاٹ کر پھینکے گی۔ "بابا" کو کلہاڑی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ بھی کلہاڑی ہی سے قتل کرے گی۔ اس لئے کلہاڑی چلانے کی مشق شروع کر دی تھی۔ پھلاہی کہو۔ اور بیر کی لکڑی بڑی سخت جان ہوتی ہے مگر نور بیگم نے کلہاڑی چلانے میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ کلہاڑی کی ایک ہی ضرب میں سخت سے سخت لکڑی کو چیر کر رکھ دیتی۔ نور بیگم ان خیالات میں اسی طرح بہی چلی جا رہی تھی کہ جس طرح کوئی ہلکی پھلکی کشتی طوفانی موجوں میں ڈوبتی ابھرتی چلی جا رہی ہو۔ وہ کسی ایسے مجرم کی طرح گذشتہ یادوں سے دل بہلا رہی تھی جسے موت کی سزا مل چکی ہو اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں شمار کر رہا ہو۔ اس کی موت بھی تو قریب تھی۔ جسمانی موت مگر یہ کوئی بڑا اندیشہ نہ تھا۔ جسم کی موت کو تو اس سرزمین میں کوئی وقعت ہی نہیں دی جاتی البتہ اپنی شرم، حیا، عزت، غیرت اور شرافت کی موت کا احساس ایک اندھیرے خوفناک غار کی طرح منہ کھولے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ اس سے بھاگ رہی تھی۔ اپنے خیالوں کی پناہ لے رہی تھی۔

نور بیگم انہی تصورات میں کھوئی ہوئی گذشتہ یادوں کو تازہ کر رہی تھی۔ مستقبل اگرچہ کربیہہ اور بھیانک تھا مگر وہ اپنے کئے پر پشیماں نہ تھی۔ اگر اس کی کوئی آرزو تھی تو یہ کہ جان تو جنتے مگر آن نہ جانے۔ بے عزتی موت سے زیادہ کھٹن تھی۔

ادھر فریق مخالف کے آدمی اس اثنا میں گشتا شب کی جوان لاش کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ جسیم، قد آور، مضبوط بدن، قوی دست بازو، سر پر پٹھے دار لمبے بال۔ اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں۔ ان میں سے اکثر جوابی دھاوے کے واسطے چھ چھ سات سات فٹ کے لوہے میں گندھی ہوئی لاٹھیوں اور نیزوں کی نوک دار سیک کلہاڑیوں سے لیس ہو کر آئے تھے۔ پگڑی کا ایک پل ٹھوڑی کے نیچے سے گزر کر منڈاسا، کسا ہوا چہرے پر غم و غصے کی چھوکڑ

آثار اور لال سرخ آنکھوں میں خون پی جانے کی آرزو، انتقام اور فوری انتقام کی آگ۔ ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ اتنے میں صوبیدار صاحب جلال خاں بھی پہنچ گئے۔ جوان اکلوتے بیٹے کی لاش سامنے پڑی تھی مگر داد ہے ہمت و استقلال کو بوڑھے صوبیدار کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی گرنے نہیں پایا۔ بیٹے کے غم کے لئے ابھی زندگی کی بہت سی طویل و بے بہار راتیں موجود ہیں۔ جن میں بوڑھا باپ مرنے کی دعائیں کرے گا اور زندگی طویل ہوتی جائے گی۔ تفکرات کے لئے ابھی قتل کا الٹا دینے والا مقدمہ پڑا تھا جس میں صوبیدار صاحب کو پانی کی طرح دولت بہانی ہو گی۔ اور اگر ملزم بری ہو گئے تو پھر خود ان سے انتقام لینے کا سوال باقی تھا۔ سردست تو انہیں بہت سی دوسری باتوں پر غور کرنا تھا۔

صوبیدار صاحب کے آنے پر برادری کے آدمی جو ادھر ادھر پتھروں پہ بیٹھے تھے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سبھی قسم کے لوگ تھے۔ کچھ کھیتوں میں ہل چھوڑ کر آ گئے تھے۔ کچھ ادھر ادھر سے لگے بندھ گئے تھے۔ بعض ایسے تھے جو فوج سے رخصت پر گھر آئے ہوئے تھے۔ ان کے پوشش اور چہرے مہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ فوج میں ملازم ہیں۔ صوبیدار کے سامنے واقعے کی تفصیلات پیش کی گئیں۔ محبوب موچی واردات کا عینی گواہ تھا۔ وہ چشمے کے پاس کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ واقعہ بیان کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ میرے سامنے نور بیگم دختر غلام نے چھوٹے راجہ سے کلہاڑی چھین کر۔

نور بیگم کا نام سنتے ہی صوبیدار صاحب بول پڑے۔

"کون نوراں!"

"جی ہاں" محبوب موچی نے جواب دیا "نوراں"

"باپ کا بدلہ لیا ہے اس نے" کسی اور نے لقمہ دیا۔

صوبیدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے قتل کی باقی تفصیلات معلوم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ جیسے معاملات کے دوسرے پہلو ابھر کر ان کے سامنے آ گئے ہوں۔

"ان کے کون کون سے مرد آج گاؤں میں موجود ہیں" صوبیدار بولے "کیوں؟" ان کے چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تھانہ میں رپورٹ دینی ہو گی"

"نہیں ہم تو ڈھول بجا کر ابھی دھاوا بولتے ہیں" چھوٹے بھائی

نے طیش کے ساتھ کہا۔

"نہیں اس کا موقعہ نہیں۔ اب تھانے ہی میں رپورٹ کرنی چاہئیے اور رپورٹ میں قاتل کے طور پر ان کے مردوں ہی کا نام لکھوانا ہوگا۔" محمد سرور صوبیدار صاحب کا بھانجہ تھا اور کالج سے چھٹی پر آیا تھا۔ اس مصلحت کو نہ سمجھ سکا۔ تعجب کے ساتھ بولا:

"مگر ماموں جان قتل تو نوراں نے کیا ہے"

"تو پھر کیا ہوا؟"، صوبیدار صاحب نے کہا

"لیکن اس نے قتل کیا ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیئے"

"مگر نوراں عورت ہے"

"عورت ہے تو ہوتی رہے۔ وہ خونی قاتلہ بھی تو ہے"

"تم نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔ صوبیدار صاحب جلال قدر کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

نوراں عورت ہے۔ اس گاؤں کی عورت۔ ہم سب کی بیٹی۔ اور گاؤں کی عورتوں کی عزت سانجھے کی عزت ہوتی ہے"

(بشکریہ "ریڈیو پاکستان راولپنڈی")

شاذ عارفی •

بیٹے کی شادی

...ہزار تخمینہ کم سے کم چڑھاوے کا
...ں اور کیا لاتا زیور کم چڑھاوے کا
...شعیب کی امّی کون غم چڑھاوے کا
باغ و قطعہ آراضی جا کے رہن رکھتا ہوں

گر بجن سے بارہ سو سود پر منگالیں گے
دو ہزار سے اوپر بچے پاس کے ملالیں گے
رنگ بھی رچالیں گے، ناک بھی بچالیں گے
دل سماج کا بھر جائے دیکھنا وہ دعوت دوں

...تمام شادی میں ہم ذرا جو چوکیں گے
...و بنائیں گے باتیں، سو جنم میں تھوکیں گے
...نکتہ چینوں کے وہ نہیں کراوکیں گے
دوستوں کا یہ عالم دشمنوں کو کیا کوسوں

رہن سے نبٹنے کا غم ابھی سے کیوں آخر
جو کہی سواڑ دھنگی، میں حیات ہوں آخر
نوج کیا میں لونڈی ہوں کیوں نہ لٹائے دوں آخر
کل کی بات ہی جھومر میرا رہن ہی تھا کیوں؟

...نا رہی ہو پھر دل میں رہن کی صدا گونجی
...ں رکیاتے ہیں اپنی بات پر کیوں جی؟
...غ و قطعہ آراضی" آپڑے تو کیا پونجی
چھ ہزار کم کیوں ہیں لو میں تم کو سمجھاؤں

پٹیوں پہ کھچڑی سر۔ اور بری سا جچتا ہے
یہ خضاب رہنے دو، کہہ رہے تھے اچھا ہے
کہہ سکوں گی کس کس سے "اے بہن یہ نزلا ہے"
جانتی ہیں "اناجی" کون سن کی پیدا ہوں

اب انہیں بھی لے دوڑیں اپنی ہمنوائی میں
اور بات مطلب کی ڈال دی کھٹائی میں
حق نہیں ادھیڑوں کو بزم خودنمائی میں
بزم خودنمائی سے تم کھنچو تو میں بچ لوں

گھٹ گئی مری بچی ہٹ تو جا ترے وارے
"اے بوا میرا آنچل" "اے سکھی مری ساڑی"
"توی اور بنت" چرمر ہو گئی خدا مارے
پھوڑ دوں ترے دیدے گھورنے کا بدلہ دوں!

ہاں تو "بینڈ باجا" بھی آچکا۔ براتی بھی
مستعد ہے آتشباز "شیخ شب براتی" بھی
تھم گئی "رقم پیشہ" ناچتی بھی گاتی بھی
عورتوں سے تم بھگتو میں سواریاں بھیجوں

"ٹھہر یار جھنڈے خاں"! یہ برات دیکھیں گے
ٹھاٹ دار باجے کی کائنات دیکھیں گے
جھانکتے ہوئے جلوے "پانسات" دیکھیں گے
موت آئی ہے سالے؟ تو ٹھہر میں چلتا ہوں

کیوں بھری چلی جائیں۔ رتھ ہے جیل تھوڑی ہے
کیوں ٹھنسی چلی جائیں۔ رتھ ہے ریل تھوڑی ہے
ہاں لدی چلی جائیں۔ رتھ ہے کھیل تھوڑی ہے
"بیٹھ اے سلمیٰ بیٹھ! رو رہی ہے تھپڑ دوں!"

مہر چاہیئے اتنا جو ادا نہ ہو پائے
چاہیئے شرافت کی انتہا نہ ہو پائے
روز خانہ جنگی ہو، فیصلہ نہ ہو پائے
ورنہ سو طلاقیں ہوں حاضرین محفل کیوں؟

ڈیڑھ سو کی آمد میں کب تھا دم درود اتنا
بل فلاں فلاں اتنا "گر بچن" کو سودا اتنا
ختم رہن کی مدت صرف "ہست و بود" اتنا
"تار تار گھر بھر کا" لاؤ بیچ آتا ہوں!

(بشکریہ ہمایوں)

عادل رشید

ادب یا پیٹ

> ہمارا ایک بھی ڈائیلاگ ایسا نہیں تھا جس پر دوجوٹیا صاحب نے اصلاح نہ فرمائی ہو، اور اُن کی ہر اصلاح پر تماشائی مارے ہنسی کے دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور جوش سے تالیاں بجا رہے تھے ... اور ہم خون کے گھونٹ پی رہے تھے!

ہمیں آئے ہوئے ابھی کوئی آٹھ ہی دس دن ہوئے تھے کہ ایک دن صبح جو ہماری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ نورالہٰی صاحب تشریف لائے ہیں۔ نوکر انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میرے لئے بیڈ ٹی لیکر آیا تو اس نے یہ اطلاع دی اور ہم نے ازراہ دوستی نوکر سے کہا کہ نورالہٰی صاحب کو ہمارے پاس اندر بھیجدو۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام بھئی ـــــ ہم نے نورالہٰی صاحب سے مصافحہ کیا۔

"فرمایئے۔ یہ آج اتنی صبح کیسے زحمت فرمائی آپ نے؟"

"کنوئیں کا پیام لے کر آیا ہوں پیاس کے پاس"

"یعنی ـــــ!"

"یعنی یہ کہ آپ کو سیٹھ گنگھل داس دوچوٹیا نے بلوایا ہے"

"یہ کس قسم کے سیٹھ ہیں بھئی"

"فلم کے سیٹھ ہیں یہ۔ ایکٹر بھی ہیں اور پروڈیوسر ڈائرکٹر بھی"

"اچھا ـــــ!"

"جی ـــــ!" نورالہٰی صاحب اکڑ گئے "کل ہی بات ہوئی تھی آپ کی وہاں"

"پھر ـــــ!"

"پھر کیا ـــــ" نورالہٰی صاحب چٹکی بجا کر بولے "تیار ہو جایئے جلدی سے۔ اور یہ سمجھ لیجئے اچھی طرح کہ کام بن گیا آپ کا"

اور ہم نوکر کو میز پر ناشتہ لگا دینے کے احکامات صادر فرماتے ہوئے سے باتھ روم میں گھس گئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر جب ہم ٹب میں نہانے کے لئے گھسے تو ہمیں سچ مچ اپنی قسمت پر رشک آنے لگا اور پانی کا فوارہ کھولتے ہوئے ہم نے سوچا کہ اب ہم فلمی دنیا میں انقلاب برپا کر کے ہی دم لیں گے۔ بس موقع ملنے کی دیر تھی۔ جلدی جلدی سے نہا دھو کر ہم باہر نکلے۔ لباس تبدیل کیا۔ اور پھر ہم بن سنور کر ناشتے کی میز پر آگئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ نورالہٰی صاحب آدھے سے زیادہ ناشتہ پہلے ہی چٹ کر چکے ہیں اور اب وہ کیلوں سے اپنا دل بہلا رہے ہیں۔

"کیا بہت جلدی ہے آپ کو نورالہٰی صاحب" ہم نے تفریحاً سوال کیا۔

اور وہ بڑے اطمینان سے میز پوش کے کونے سے جھک کر اپنا مونہہ صاف کرتے ہوئے بولے "بھئی اس ناشتہ کی الجھن میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو، وہ گنگھل داس صاحب کے یہاں کا جو ناشتہ رہے گا اپنا۔ خیر کوئی بات نہیں" وہ جلدی سے بول پڑے "بس اب چلئے جلدی سے"

"آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے" ہم نے ٹوسٹ پر جام لگاتے ہوئے پوچھا

"یہ فلم کا معاملہ ہے جناب" جیسے کہ وہ ہمارے اس نامعقول سے سوال پر جھنجھلا گئے ہوں "کیا پتہ کوئی دوسرا ٹپک پڑے۔ یا گنگھل داس صاحب دوچوٹیا اپنا ارادہ ہی بدل دیں، ایک سرے سے"

"اچھا !"

"اور نہیں تو کیا" وہ پورے وثوق کے ساتھ بولے "یہاں جوتیوں میں دال بٹتی ہے"

اور پھر ہم بغیر پورا ناشتہ کئے ہوئے جناب گنگھل داس دوچوٹیا صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک خلیفہ اور

گندی سی بلڈنگ کے چوتھے فلور پر پہنچکر نورالٰہی صاحب نے ایک دروازے پر دستک دی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک گھاٹن عورت اپنی میلی اور گندی سی ساڑھی اوپر تک چڑھائے دروازہ کھول کر سامنے کھڑی ہو گئی "ترالا کاہے پائی جے۔ (یعنی تمہیں کیا چاہئیے)

"سیٹھ سے ملنے کا ہے اپن لوگ کو" نورالٰہی صاحب نے گویا گوہر افشانی فرمائی۔ اور اس گھاٹن عورت نے دروازے کے سامنے سے ذرا سا ہٹ کر گویا ہمیں اندر آنے کی اجازت دی۔ اور ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف اشارہ کرکے بولی "اکڑے بسا" (یعنی یہاں بیٹھو) اور ہم گویا اس کمرے میں آکر دو میلی کچیلی کرسیوں پر بس گئے۔

"سیٹھ گنٹھل داس دوچوٹیا بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں" نورالٰہی صاحب نے گویا ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی "انصاف کی توپ بنا چکے ہیں اور اب "تقدیر کی توپ" بنا رہے ہیں اور ان کی "تصویر" پریم کی توپ نے تو کلکتہ میں تو بہ بلوا دی تھی لوگوں کو، پبلک نے دیوانہ وار خیر مقدم کیا تھا اس تصویر کا"

"تو گویا یہ گنٹھل داس صاحب فلمیں نہیں بلکہ توپیں تیار کرتے ہیں"

ہم نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "اب کون سی توپ کی باری ہے"

"غریب کی توپ کی" اور نورالٰہی صاحب نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ہمیں بتایا "اب ہی "غریب کی توپ" کے مکالمے لکھنے ہیں آپ کو کہ اتنے میں ایک کالا اور بھدا سا بدہیبت قسم کا آدمی کمرہ میں داخل ہوا اور ہم سمجھے کہ ضرور یہ شخص اس گھاٹن عورت کا شوہر ہے کہ نورالٰہی صاحب فوراً گڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے "نمستے سیٹھ صاحب"

اور وہ اس سلام کا جواب اپنی گردن کی ایک خفیف سی جنبش سے دیتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے کہ نورالٰہی صاحب نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے گویا کانا پھوسی کے طور پر ہمیں بتایا کہ یہی ہیں گنٹھل داس صاحب دوچوٹیا اور ہم اس اتنے بڑے راز کے انکشاف پر کچھ سراسیما سے ہو کر گھبرا گئے اس لئے کہ ہم نے ان گنٹھل داس صاحب دوچوٹیا کو اس گھاٹن عورت کا شوہر سمجھتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لہٰذا ہم نے دیر آید درست آید والی بات کے پیش نظر انہیں جھٹ سے سلام کر لیا "گڈ مارننگ مسٹر دوچوٹیا"

اور جواب میں انہوں نے ہمیں بغور دیکھا اور قبل اس کے کہ ادھر سے استفسار کی زحمت اٹھائی جاتے نورالٰہی صاحب دوبارہ کرسی پر سے اٹھے اور سے بولے "آپ ہی ہیں مسٹر عادل رشید یعنی یہ کہ ہندوستان کے بہت بڑے لیکھک یعنی جنہیں کہ آپ نے بلوایا ہے"

"اوہ ـــــــ !" وہ تھوڑا سا مسکرائے۔

"ہم سالا تم سے مل کر بہوت کھوش ہوا"

"جی! ہمیں بھی مسرت ہوئی ہے آپ سے مل کر"

"اپن کو ایک پھلم کا ڈائیلاگ لکھوانے کا ہے" گنٹھل داس صاحب چوٹیا بولے "یہ نورالٰہی سالا اپن سے تمہارا بہوت تعریف کیا ہوتا کہ تم سالا گجب کے لکھتے ہو"

"جی ـــــــ !" ہم نے گویا خاکساری فرمائی "ابھی یہ تو عنایت نورالٰہی صاحب کی۔ قدر دانی ہے ان کی ورنہ ہمیں کیا آتا ہے"

اور ہمارے اس انکسار پر ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ تیوریوں پر بل ڈال کر نورالٰہی صاحب پر برس پڑے "کیوں! نورالٰہی تم تو ہم سے بولا تھا کہ یہ صاحب گجب کے ڈائیلاگ لکھتا ہے۔ بڑا نام اس کا لٹریچر میں"

"جی ہاں، جی ہاں" نورالٰہی صاحب سچ مچ گھبرا گئے "یہ بڑے لائق آدمی ہیں صاحب"

"مگر یہ تو خود بولتا ہے کہ اسے کچھ لکھنا وکھنا نہیں آتا"

اور اب ہم معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر کچھ گڑبڑا سے گئے کہ اتنے میں نورالٰہی صاحب نے ہمیں بڑی زور سے گھورا اور وہ بڑبڑائے "سارا معاملہ خراب کر دیا آپ نے" اور پھر وہ گنٹھل داس دوچوٹیا کی طرف مخاطب ہوئے "ارے صاحب یہ تو بڑے ادیب ہیں خاکساری فرما رہے ہیں آپ۔ ورنہ کہتا ہوں کہ ان کا جواب نہیں ہے۔ پورے ہندوستان میں۔ دو درجن سے زیادہ تو کتابیں لکھی ہیں آپ نے اور ان کی یہ کتابیں بہت پسند کی گئی ہیں سارے دیش میں"

"جی ہاں ـــــــ" اب سارا معاملہ ہماری سمجھ میں آچکا تھا اور ہم چکے "وہ تو ہم نے یونہی کہہ دیا تھا آپ سے گنٹھل داس صاحب ورنہ ہم تو عرض کرتے ہیں آپ سے کہ یہ ہندوستان کے سارے لیکھک پانی بھرتے ہیں ہمارے سامنے ایک ایک ناول کے بیس بیس اڈیشن چھپ چکے ہیں اور ہم

ہمارے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور چیک بک نکالے ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں ہاتھ باندھے۔ ہم آپ کی فلم کے ڈائیلاگس میں جان ڈالدیں گے۔ یہ فلم انڈسٹری انقلاب کے لئے ہمارا ہی انتظار کر رہی ہے۔ اگر ایک ایک ڈائیلاگ پر پبلک تالیاں نہ بجائے تو مونہہ پر تھوک دیجئے گا ہمارے ——"

ہم ایک سانس میں زمین سے آسمان کے قلابے ملاتے چلے جا رہے تھے اور ادھر گنگھل داس دوچوٹیا صاحب کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور نورالٰہی صاحب ہماری سوجھ بوجھ اور سمجھ کے دل سے قائل ہو گئے تھے گنگھل داس دوچوٹیا صاحب یکبارگی تڑپ کر بولے "دیا ہوگے ایک فلم کا

"اسی ہزار —— !"

ہم زمین و آسمان ایک کرتے پسلے ہی ہوتے تھے کہ ہماری اس مانگ پر گنگھل داس دوچوٹیا کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں اور نورالٰہی صاحب نے ہمیں زور سے گھورا۔ اور ہم یہ سمجھ کر کہ شاید کچھ کسر رہ گئی ہے ڈینگ مارنے میں جھٹ سے اسی ہزار کا دگنا کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نورالٰہی صاحب خود ہی بول پڑے "ارے آپ جو مناسب سمجھیں دے دیجئے گا سیٹھ صاحب یہ عادل رشید صاحب اپنے دوست ہیں۔"

"نہیں جی ہم اسی ہزار سے ایک دھیلا بھی کم نہ لیں گے۔"

"نہیں بھئی۔ سنو تو سہی" نورالٰہی صاحب کو اب ہماری شیخی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دراصل ہماری بات کاٹنا چاہ رہے تھے کہ ہم کچھ نہ سمجھ کر پھر تڑپے "ہندوستان بھر کلمہ پڑھتا ہے اپنا۔ اور یہ اسی ہزار تو"

"دیکھئے مسٹر ——" گنگھل داس دوچوٹیا نے ہماری بات ٹالی "پہلے ناشتہ کر لو اور پھر یہ معاملہ ہم طے کر والیں گے۔"

"مگر ناشتہ کی ضرورت بھی کیا ہے" ہم نے دوچوٹیا صاحب سے معذرت کی "ہم ناشتہ کر چکے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ تھوڑا سا اور سہی۔" نورالٰہی صاحب نے گویا ہمیں سمجھانا چاہا "حرج ہی کیا ہے اس میں۔ ایک پراٹھا اور ——"

"پراٹھا آج نہ ملے گا ——" گنگھل داس دوچوٹیا نے بات ختم کی "کارن کہ اسپا کا دھندہ ہو گیا آج۔ کھیڑا (ناغہ) کر دلا ہی سالا نے آج تو تم ٹباٹ دالوا کے ساتھ کاندے (پیاز) کی چٹنی اڑاؤ ——"

"مگر —— "

نورالٰہی صاحب نے ہمارے کان کے قریب اپنا مونہہ لاکر پھر دبا دیا تھا "اب چپ بھی رہئے گا آپ کہ نہیں۔ یہ ناشتہ کی میز دراصل معاملہ پکا ہونے کی پہلی کڑی ہے۔ گول ہو جائیے اب۔"

اور ہم نورالٰہی صاحب کو اپنا اڈوائزر سمجھ کر بالکل گول ہو گئے ناشتہ کی کوئی خاص میز ویز نہیں تھی۔ وہیں اسی جگہ ایک چھوٹی میز پر اسی گھاٹن عورت نے تین چھوٹی چھوٹی سی شیشے کی طشتریوں میں کچھ لاکر رکھ دیا اور پھر گرم گرم چائے بھی اسی جگہ آ گئی۔ اور دوچوٹیا صاحب بغیر کچھ کہے سے طشتری ہاتھ میں لے کر شروع ہو گئے۔

"ہاں تو منشی جی۔ انہوں نے بات نکالی "پھر تم سالا کیا لوگے۔"

گویا یہ ٹیبل ٹاک شروع ہوئی تھی اور ہم گنگھل داس دوچوٹیا صاحب کی اس گوہر افشانی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے کہ نورالٰہی صاحب نے موقع کی نزاکت کو بڑی صفائی سے بھانپ لیا اور بولے "یہ سیٹھ صاحب معاملے کے بڑے کھرے ہیں۔ آجتک کسی کو ——"

"اپن سالا نے آجتک کسی کو ایک دھیلا بھی نہیں مارا منشی جی" وہ چہکے "کلکتہ سے لیکر بمبئی تک اپنا نام کا سکہ چلتا ہے اس تمہاری قلم لائن میں۔"

"مگر ہم منشی نہیں ہیں دوچوٹیا صاحب" ہم دراصل اس لفظ منشی سے بری طرح چڑ گئے تھے۔

"پھر ——" ٹباٹ دالوا کا آدھا لقمہ ان کے حلق میں پھنس کر رہ گیا "پھر تم کیا ہو۔"

"آپ بہت بڑے رائٹر ہیں سیٹھ صاحب" نورالٰہی صاحب نے گویا ہماری وکالت کی۔

"پھر اپن سالا کیا حجام بولتا ہے ان کو" دوچوٹیا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے چائے کا ایک گھونٹ بھرا "ہم سالا رائٹر کو منشی بولتا ہے۔"

"مگر ہمیں اس لفظ سے چڑ ہے بالکل" ہم واقعی اس سے چڑ گئے تھے۔

"تو ہم تم کو منشی نہ بولے گا بابا" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے "کان پکڑتا ہے ہم اپنا۔ کارن کہ تم بڑے لکھنے والے ہو دیکھنے سے۔"

اور ہم گنگھل داس دوچوٹیا صاحب کی اس صلح پسندی پر دل سے قائل ہو گئے ان کے۔ اور ہم نے دل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"پھر ـــــــ" وہ بولے "بولو کیا لوگے ایک فلم کا"

"گھر کی بات ہے سیٹھ صاحب" نور الٰہی صاحب جلدی سے بول پڑے "اور یہ عادل رشید صاحب بڑے دوست قسم کے آدمی ہیں۔ جو مناسب ہوگا اسی میں معاملہ طے سمجھئے"

"مگر اپنے کو کھلا سا منگتا ہے"

"ہم بھی ہزار لیں گے۔ اس لئے کہ اپنے نام کا سکہ چلتا ہے ادب میں"

"اور ہم چالیس ہزار میں پوری فلم ڈلوا دیتا ہے" عادل رشید صاحب

دو دچوٹیا صاحب مسکراتے "تم فلم لائن کو آخر سمجھتا ہے۔ بابا"

"یہ اپنے عادل رشید صاحب اسے الہ دین کا چراغ سمجھے ہوتے ہیں" نور الٰہی صاحب نے گویا بات نکالی۔

"مدلب شاب" دوچوٹیا صاحب اب گویا ہم سے بالکل ہی بے تکلف ہوکر اپنے اصلی رنگ میں آچکے تھے "یہ فلم لائن سٹہ سری جوا ہے جوا۔ اور تم اس سالی لائن کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھکر بڑی بھول کر رہے ہو دوست"

اچھا ـــــ!

"اور نہیں تو کیا۔ اس میں سالی میں دھرا ہی کیا ہے۔ لگ گیا تو تیر نہیں تو کچھ نہیں۔ بس بارہ تیرہ ڈبے ہی ہاتھ میں آتے ہیں اپنے"

"پھر ـــــ!"

"پھر کیا ـــــ" وہ اپنی قمیص کے دامن سے اپنا مونھ صاف کرتے ہوتے بولے "ہمارا اسٹاف پھر گیا ہے اس کارن "غریب کی توپ" بنانے لگا ہے بابا۔ بہوت کھرچہ ہونے کا ہے اس میں۔ اور سنا ہے کہ تم غریبوں کے لئے لکھتے ہو اس لئے سوچا کہ اس "غریب کی توپ" کا ڈایلاگ تم سے ہی لکھوالیں۔ ایسا ایسا ڈایلاگ لکھو کہ غریبوں کی جیبیں کٹ جائیں اس فلم میں۔ لوٹ لو سالوں کو۔ اور ہاں اس فلم کا ما بجہ ہم تم کو اڑھائی سو روپیہ دے ڈالیں گا"

"اڑھائی سو ـــــ!" ہمارا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور ہم نے سوچا کہ یہ دوچوٹیا صاحب بڑے گھاگ قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ہمارے رعب کا کوئی اثر نہیں ہوا ان پر۔ کہاں بیس ہزار کی ڈینگ اور کہاں اڑھائی سو کی پیشکش اور ابھی ہم کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ نور الٰہی صاحب بولے "کیا سوچ رہے ہیں آپ عادل رشید صاحب یہ تو بہت بڑا آفر دیا ہے سیٹھ جی نے آپ کو نہیں تو اس بمبئی میں پچیس تیس روپیہ ماہوار پر ڈایلاگ لکھنے کے لئے مستقل لکھنے والے مل جاتے ہیں۔ وہ جیتا صاحب ہی کو لے لو کتنے مشہور ہیں اس لائن میں اور لیتے کیا ہیں ایک فلم کے صرف چار سو روپے"

"ٹھیر بابا" گٹھل داس دوچوٹیا صاحب بولے "تم پورے تین سو لے لینا"

اور پھر بڑی لمبی بحث کے بعد معاملہ پورے چار سو پر آکر رک گیا۔ اور ہم نے بھی یہ سمجھکر کہ یہ پہلا معاملہ ہے فلم لائن میں یہ آفر قبول کرلیا گٹھل داس دوچوٹیا صاحب نے ہمیں دل کھول کر مبارکباد دی اور خوب خوب گلے ملے ہم سے اور مبارک سلامت کا یہ سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔ ایک روپیہ بطور ایڈوانس ہمیں اسی وقت مل گیا۔ سوا پانچ آنے کی جلیبیاں منگاکر دوچوٹیا صاحب نے اسی وقت غریبوں میں تقسیم فرمادیں۔ ایک ایک جلیبی سے ہمارا مونہہ بھی میٹھا کرایا گیا۔

اور پھر دوسرے ہی دن سے اس "غریب کی توپ" کا آغاز شروع ہوا۔ اور ہم باوجود انتہائی کوشش کے اس بکواس قسم کی کہانی اس کے بیہودہ اور لغو قسم کے مکالموں سے کوئی سمجھوتہ نہ کرسکے نتیجہ تھا۔ وہی ہوا جو چوٹیا صاحب چاہتے تھے۔ تمام ہمارا لکھا مگر مکالمے کے لیے تھے۔ اور ہم تنگ آکر اس ماحول سے دو تین ہفتوں میں دور بھاگ گئے۔ البتہ معاہدے کی پوری رقم گٹھل داس دوچوٹیا صاحب نے ہمیں دیدی۔ اور کم از کم اس بات پر ہم ان کی ایمانداری کے دل سے قائل ہوگئے۔

اور اس وقت جبکہ بمبئی میں اس فلمی ماحول سے تنگ آکر الہ آباد واپس آچکے تھے۔ ہماری نظر ایک دفعہ ایک پوسٹر پر پڑی معلوم ہوا کہ گٹھل داس دوچوٹیا صاحب کی فلم "غریب کی توپ" بہت مقامی سینما شمبھو پلیس میں آنے والی ہے۔ اور نہ جانے کیوں ہم فلم کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

شمبھو پلیس کا پورا ہال تماشائیوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا باہر لوگوں کی ہڑبونگ جاری تھی کہ تیسری گھنٹی پر ہال میں اندھیرا چھا

دل نے زور زور سے پڑھا "غریب کی توپ" اور ہم "شمع" جو بلیسی کی سب سے پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ پبلک کو کس قدر عقیدت ہے دان گھٹل داس دوچوٹیا صاحب سے! اور واقعی دوچوٹیا صاحب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے ہم اس وقت دل سے قائل ہو گئے اور ابھی ہم دوچوٹیا صاحب کی عظمت کے دل سے قائل ہو ہی رہے تھے کہ اسکرین پر ہمارا نام آیا "ڈائیلاگس بائی عادل رشید" اور نہ جانے کیوں ہمارا دل دھڑکنے لگا۔

اور پھر فلم شروع ہوئی گھٹل داس دوچوٹیا صاحب کو لطف پہیرو بنکر تماشائیوں نے خوب زور زور سے تالیاں بجائیں اور ادھر دوگوہر ثانی فرمانے لگے "غریب کا کھون کھون نہیں کیچڑ ہے نالی کا اور تمہارا دل سوکھ دسیبوں کی لالی سے" لوگوں نے اس ڈائیلاگ پر تالیاں بجائیں اور ہم مارے حیرت کے اپنا منہ کھول کر رہ گئے۔

ہمارا ایک بھی ڈائیلاگ ایسا نہیں تھا جس پر دوچوٹیا صاحب نے اصلاح نہ فرمائی ہو۔ اور ان کی ہر اصلاح پر تماشائی مارے ہنسی کے دہرے ہوتے جا رہے تھے جوش سے تالیاں بجا رہے تھے اور ہم خون کے گھونٹ پی پی کر یہ سوچ رہے تھے کہ کیا واقعی یہ گھٹل داس دوچوٹیا صاحب ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔

بڑی گومگو اور حیرت واستعجاب کے عالم میں فلم دیکھ کر ہم گھر واپس آگئے "غریب کی توپ" الہ آباد میں بڑی کامیابی کے ساتھ چلتی رہی اور ہم یہ سوچتے رہے کہ کیا عوام اسی قسم کی لغو، سستی اور گھٹیا چیزوں کو پسند کرتے ہیں کہ اچانک ایک دن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بمبئی اور کلکتہ کی کئی فلم کمپنیوں کے آفر ہماری میز پر پڑے ہوتے ہمارا منہ چڑا رہے تھے یعنی بمبئی کے ایک انگریزی فلمی ماہنامہ نے لکھا تھا کہ "غریب کی توپ" کی کامیابی کا سہرا ہمارے سر ہے۔ اور ادھر ایک نیم ادبی رسالہ نے لکھا تھا کہ ہمیں "غریب کی توپ" کی تخلیق پر ڈوب مرنا چاہئے۔ ادب کا جنازہ نکال دیا ہم نے۔

ہم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے ـــــ اور ہم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر سوچنا شروع کر دیا۔ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کس چیز کو ہم اہمیت دیں ادب کو یا فلم۔ اس ادب کو جس سے روٹی نہیں ملتی صرف واہ واہ ملتی ہے اور فلم جس سے روٹیوں کا سہارا ہے واہ واہ سے پیٹ نہیں بھرتا اور روٹیاں پیٹ بھرتی ہیں

اور سچ مانئے کہ ہم اس دن سے لیکر آجتک اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں اور اب ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہم آپ سے مدد لیں ـــــ کیا آپ مدد کریں گے ہماری

(بشکریہ "شمع")

التماس ہے کہ......

(۱) اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ نیز ادارہ "شیر" ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ۲۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔ ۳۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ (ایڈیٹر)

احمد پرویز •

تم ہی سوچو!

(اس ساتھی کے نام جو راہِ حق کے پہلے ہی مرحلے میں ایک عارضی کش مکش سے متاثر ہو کر پیچھے رہ گیا)

سوچتے ہوگے وہ قربت وہ رفاقت نہ رہی
سوچتے ہوگے کہ باہم وہ عنایت نہ رہی
سوچتے ہوگے وہ پہلی سی محبت نہ رہی
تم ہی سوچو! کہ یہ دُوری ہوئی پیدا کیونکر
تم ہی سوچو! کہ محبت ہوئی رسوا کیونکر

غیر ممکن! پلٹ آؤں میں تمہاری خاطر
یا کھڑا اشک بہاؤں میں تمہاری خاطر
آتشِ شوق بجھاؤں میں تمہاری خاطر
بھول جاؤں بھلا منزل کا تقاضا کیونکر
تم ہی سوچو! کہ محبت ہوئی رُسوا کیونکر

تم نے مجبورِ محض بن کے عہد توڑا ہے
تم نے غیروں کیلئے اپنوں سے منہ موڑا ہے
تم نے باطل کے لئے دامنِ حق چھوڑا ہے
سوچتا ہوں، یہ کیا تم نے گوارا کیونکر
تم ہی سوچو! کہ محبت ہوئی رسوا کیونکر

حیف وہ راہ! کہ جس راہ پہ مائل تم تھے
حیف وہ تیر! کہ جس تیر کے گھائل تم تھے
سوچتا ہوں، کہ میری راہ میں حائل تم تھے
ہر قدم بڑھ چلی منزل کی تمنا کیونکر
تم ہی سوچو! کہ محبت ہوئی رسوا کیونکر

راہ اپنی بڑی مشکل سہی، دشوار سہی
راہ میں خار سہی۔ سینکڑوں آزار سہی
راہ میں کشمکش طوق سہی، دار سہی
کچھ سہی! پھونک دوں اس عزم کی دنیا کیونکر
تم ہی سوچو! کہ محبت ہوئی رسوا کیونکر

مشیر الحق بحری آبادی •

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے!

یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی پانی پت کے نام سے کان آشنا ہوتے تھے۔ کیوں کہ تاریخ ہند کی پہلی کتاب ہو یا آخری کے صفحات پانی پت کے ذکر سے خالی نہیں ہو سکتے۔ اور پانی پت تصور کے ساتھ نظروں کے سامنے وہ تاریخی میدان آجاتے ہیں جہاں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوتے تھے۔ جہاں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دیکر تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ بظاہر وہ بابر و ابراہیم کی جنگ تھی لیکن درحقیقت وہ جنگ تھی دو تہذیبوں کی، ٹکراؤ دو تمدنوں کا۔ تصادم تھا دو نظریات کا۔ اسی میدان میں چشم فلک نے درہمو بقال کا ڈرامہ بھی دیکھا، اور یہیں "مرہٹہ اسپائر" کا خواب پریشاں ہوا۔ اسی میدان میں ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ فتح و شکست قلت و کثرت پر منحصر نہیں۔ فتح کے لئے ضرورت ہے لگن کی، شوق کی، تجربہ کی اور ہمت کی۔ حاجت ہے عزم صمیم کی اور نظر دوربین کی۔ قلب حاضر اور دماغ بیدار کی! ——— اسی تاریخی میدان کو دیکھنے کا شوق تھا یا ذوق کہ ۱۲ر نومبر ۶۲ء کو جامعہ ملیہ دہلی کے شعبہ تاریخ کے کچھ طالب علموں نے رخت سفر باندھا۔ صبح ۸ ½ بجے "جامعہ لاری" جا رہی تھی معاویہ کے مولد کی طرف ——— ہم اپنے پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے لال قلعہ کو، جامع مسجد کو، ہمایوں کے مقبرہ کو تاکہ وہ جگہ دیکھیں جہاں ان عمارتوں کی بنیاد پڑی تھی، جس جگہ نے مغل آرٹ کو روشناس کرایا۔ اگر بابر نے فتح نہ پائی ہوتی تو آج نہ لال قلعہ ہوتا نہ جامع مسجد، نہ فتح پور سیکری، ——— نہ اورنگ آباد بستا نہ شاہجہاں آباد، نہ اکبر آباد نہ شکوہ آباد ——— نہ تزک بابری لکھی جاتی نہ تزک جہانگیری، نہ شاہنامہ مرتب ہوتا نہ فتاوی عالمگیری ——— نہ تان سین کی راگنی ہوتی نہ سرمد کا نعرۂ مستانہ، نہ راجہ ٹوڈرمل کا بندوبست ہوتا نہ ابوالفتح کی طبابت ——— نہ فیضی کی بے نقط تفسیر ہوتی نہ ملا بدایونی کی منتخب التواریخ، نہ سنسکرت کا عالم داراشکوہ ہوتا نہ فارسی کی شاعرہ زیب النساء مخفی ——— اسی پانی پت کی طرف جس نے ہندوستان کو یہ انمول رتن دیئے لاری بھاگی جا رہی تھی۔ مرحوم رفیع احمد قدوائی کے ڈرائیور کے بارے میں سنا ہے کہ وہ انہیں موٹر میں بٹھا کر دنیا و مافیہا کو بھول جاتا تھا یا پھر اپنے لاری ڈرائیور نور الدین کو دیکھا جس کی لغت میں "سست رفتاری" کوئی لفظ نہیں۔ لاری کی تیز رفتاری اور اپنی بے دست و پائی پر غالب کا یہ شعر یاد آ رہا تھا ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تھوڑی دیر میں لاری پانی پت پہونچ گئی ——— دیکھئے وہ رہا سامنے پانی پت کا تاریخی میدان اور ابراہیم لودھی کا مقبرہ ——— نہیں بلکہ قبر! ایک سطح اونچا چبوترہ اس پر کھلے آسمان کے نیچے پختہ قبر ——— یہ اس بادشاہ کی قبر ہے جس نے ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھیوں سے اسی میدان میں بابر کا مقابلہ کیا تھا۔ ۲۱ر اپریل ۱۵۲۶ء کو بابر جب پانی پت پہونچا تو اس کے ساتھ فوجی اور غیر فوجی سب ملا کر کل ۱۲ ہزار نفوس تھے لیکن جدت و قدامت، تجربہ کاری اور ناتجربہ کاری ہر دلعزیزی اور غیر ہر دلعزیزی کے ٹکراؤ کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہی اس وقت بھی نکلا۔ ہم اس نوجوان اور ناتجربہ کار بادشاہ کی قبر پر کھڑے تھے جو اپنے سامنے کسی امیر و وزیر کے بیٹھنے کا روادار نہ تھا جس نے لودیوں میں سب سے پہلے تخت شاہی کو رواج دیا اور امراء کو دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنے پر مجبور کیا۔ قبر کے سرہانے لگے ہوئے کتبہ نے بتایا کہ اس کی دوبارہ مرمت ۱۸۶۶ء میں ہوئی ہے۔ یہ اگر صحیح ہے کہ مرنے کے بعد روحوں کا تعلق اس مادی دنیا میں باقی رہتا ہے تو عالم ناسوت میں اپنی ویران قبر دیکھ کر ابراہیم لودھی کی زبان سے ضرور نکل جاتا ہوگا ؎

بر مزار ما غریباں نے چراغے نہ گلے
نے پر پروانہ سوزد نہ صدائے بلبلے

قبر پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑاتے تو ایک طرف پانی پت کی عمارتیں نظر آئیں گی اور تین طرف میدان ——— وہ تاریخی میدان ——— جو اب کھیت بن چکا ہے۔ قبر کے قریب ہی ایک شکستہ دروازہ ہے۔ کابل بلاغ کا مغربی دروازہ۔ شمشیر دستان سے فراغت کے بعد "طاؤس رباب" کا وقت آیا تو بابر کی زبان سے نکلا۔ "ایں جا قابل بلاغ است" اور ان الفاظ نے "کابل بلاغ" کی شکل اختیار کر لی۔ وہ باغ تو اب تاریخ کی کتابوں میں ہے لیکن اس کا مغربی دروازہ ابراہیم کی قبر کے پاس ہے۔ اس دروازہ کی چھت پر کھڑے ہو کر ہم نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ مگر کھیتوں کے سوا وہاں اور کیا تھا! یا پھر سامنے ایک دوسرا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ باب فیض۔ سنہ ۱۱۴۹ھ میں نواب صادق علی خاں کا تعمیر کرایا ہوا شکستہ باب فیض!

لاری باب فیض سے گزرتی ہوئی پانی پت شہر میں داخل ہوئی پانی پت ہمارے لئے لاکھ متعارف سہی لیکن ہم تو اس کے لئے اجنبی تھے کہاں جاتے اور کس طرف سے دیکھنا شروع کرتے، اس لئے مولانا القاسم صاحب پانی پتی ——— اب پانی پت کے واحد سلمان ——— سے ملاقات ضروری تھی۔ لاری ایک طرف کھڑے کرا کے ضیاء[1] صاحب اور سنہا[2] صاحب۔ دو ایک لڑکوں کو ساتھ لے کر مولانا کے یہاں تشریف لے گئے ——— وہ لوگ تو مولانا کے یہاں گئے لیکن یہاں ہمیں ذوق دشت نوردی نے لاری سے اتار شیخ احمد حسن متوفی سنہ ۱۹۰۵ء کی خانقاہ میں پہونچا دیا۔ جی ہاں آج سے ۵۰ برس پہلے کی خانقاہ لیکن اب گجرانوالہ سے آئے ہوئے ایک شخص کا "مکان"

ضیاء صاحب اور سنہا صاحب کے واپس آنے پر جب ہم لوگ میونسپل پارک کے سبزہ پر "لذت دکام و دہن کی آزمائش" سے پار اترے تو معلوم ہوا کہ بارہ بج گئے ہیں۔ چند ہی گھنٹوں میں پانی پت کو دیکھنا تھا اس لئے دو گھنٹے کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو اجازت دیدی گئی کہ وہ جہاں چاہے جائے اور جو جی میں آئے دیکھے ——— ہم چند لڑکے ایک اصلاً دہلوی لیکن نسلاً پانی پتی "خواجہ" کی رہنمائی میں پانی پت دیکھنے چلے انقلاب زمانہ تھے اپنے وطن میں ایسے اجنبی تھے کہ جسے وہ مسجد بتلاتے وہ مقبرہ نکلتا اور جسے مقبرہ کہتے وہ مدرسہ ——— ہم چلتے رہے اور بلند ہوتے رہے۔ اور اوپر پہنچکر معلوم ہوا کہ پانی پت وہ شہر ہے "زمیں جس کی چہارم آسمان ہے"۔ پہاڑی پر بسا ہوا ایک علاقہ، جہاں کمبل بنے جا رہے تھے اور لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ جہاں تھانہ بھی تھا اور الکڑک آفس بھی ——— لیکن ذرا آگے بڑھکر "فلسفہ کمال و زوال" کا مطلب سمجھ میں آنے لگا۔ اور معلوم ہوا کہ دلی اور نئی دلی کی طرح پانی پت کے بھی دو حصے ہیں: "اپر پانی پت" اور "لوئر پانی پت" اب ہم پھر نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ نیچے بہت نیچے۔ نشیب میں جہاں بازار ہے جہاں کبھی بالائی بکتی تھی ——— رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

میں نے ماضی بعید کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ پانی پت میں بالائی اس وقت ہوتی تھی جب آپ بازار سے، مرچ کی جگہ مرچ اور نمک کی جگہ نمک خریدتے تھے لیکن آج آپ ہلدی کے نرخ پر پسی ہوئی اینٹ اور سوڈے کے بدلے کھریا خریدتے ہیں اور کھاتے ہیں تو پھر اس شرفا گردی کے دور میں بیچاری بالائی اصحاب ہوس کا کہاں تک مقابلہ کر سکتی تھی۔ خیر یہ تو مقطع میں ایک بات آ پڑی تھی ورنہ ذکر ہو رہا تھا بازار کا جس میں پتلی سڑک ہے۔ کہیں اونچی کہیں نیچی ——— پانی پت میونسپل بورڈ کی محرم راز گھومتے پھرتے، لدے پھندے جب ہم لوگ واپس لاری پر پہنچے تو معلوم ہوا بقیہ لوگ مولانا القاسم اللہ صاحب کے یہاں گئے ہیں ——— دو بجنے بجاتے تین بج چکے تھے۔ لوگ مولانا کے "دولتکدہ" پر پہونچے تو معلوم ہوا بات کچھ بھی نہیں صرف چائے بنی ہے ——— چائے بلکہ پرتکلف چائے کے بعد ہم لوگ مولانا کے ساتھ گھر سے باہر آئے۔ دو تین آڑی ترچھی گلیوں کو پار کر کے شیخ جلال الدین محمود کبیر الاولیا کے مقبرہ پر پہنچے۔ یہ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کے خلیفہ شیخ صابر کلیری کے خلیفہ تھے۔ خاندانی سلسلہ حضرت عثمان غنی رضہ سے ملتا ہے۔ بہت بڑے بزرگ اور بہت

---

[1] ضیاء الحسن فاروقی ایم۔ اے، سابق مدیر مدینہ لکچرار تاریخ و سیاسیات جامعہ کالج۔

[2] ٹی، آر، سنہا، ایم۔ اے لکچرار تاریخ و سیاسیات جامعہ کالج

بڑے مہمان نواز تھے۔ صبح و شام سینکڑوں آدمیوں کو ہر روز کھانا کھلاتے تھے۔ صوفیانہ مضامین پر مشتمل ان کی ایک بہت عمدہ تصنیف "زاد الابرار" ہے جو مولانا عبدالحق مصنف اخبار الاخیار کے بقول "صوفیانہ مضامین کی عمدہ کتاب ہے" ۱۳ ربیع الاول ۷۶۰ھ کو آپ کا انتقال ہوا آپکے مزار کے دائیں بائیں آپکے دو صاحبزادوں کا بھی مزار ہے۔ داہنی طرف شیخ شبلی ہیں اور بائیں طرف خواجہ ابراہیم ——— مقبرہ سے متصل، حدود خانقاہ میں ہی ایک مسجد ہے۔ کچھ خاص خوب صورت تو نہیں لیکن اپنی ایک خصوصیت میں بے مثل! پوری مسجد سایہ اصلی کے حساب سے بنی ہوئی ہے — نہ جاننے والوں کے لئے اس میں کوئی ندرت نہیں لیکن اس صنعت پر جھوم جھوم جائیں گے وہ لوگ جو "جنتر منتر" کے دیوانے ہیں۔ خانقاہ کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا مکتب بھی ہے جس میں اس وقت ایک حافظ اور دس بارہ بچے تھے۔ مولانا لقاء اللہ صاحب نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں کے تمام مکاتب و مدارس بند ہو گئے تھے لیکن ادھر دو ایک برس سے باہر کے دو ایک مسلمان گھرانے اپنے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں یہ انہیں کے بچے ہیں اور دو چار بچے قرب و جوار کے دیہاتوں سے آتے ہیں۔ ہم صبح سے اب تک جس ماحول میں گھوم رہے تھے اس میں وہ چھوٹا سا مکتب شمع امید معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مستقبل میں حفاظت قرآن کا مرکز بنا ہوا نظر آرہا تھا۔ ان بچوں کو تلاوت قرآن کرتے دیکھکر مجھے رہ رہ کر ارشاد باری تعالیٰ: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون: ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ یاد آرہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب پانی پت میں صرف ایک مرد مسلمان رہ گیا تھا تو کون کہہ سکتا تھا کہ چند ہی برسوں میں پھر یہاں کے بام و در میں قرآن کی آواز گونجے گی۔ ذالک فضل اللہ

خانقاہ سے باہر آئے تو راستہ میں ایک مقفل احاطہ کا تعارف مولانا نے "قاضی ثناء اللہ کے مزار کا احاطہ" کہہ کر کرایا۔ کتنا چھوٹا سا تعارف ہے اور کتنی جلد ختم ہو گیا لیکن سوا سو برس پہلے کے ان مولانا ثناء اللہ کی دس جلدوں میں مرتب کی ہوئی "تفسیر مظہری" تو ختم نہیں ہوئی "مالابد منہ" کے اوراق تو ثابت ہیں ——— کنجی موجود نہیں تھی اس لئے ہم لوگ آگے بڑھے اور ایک دوسری بلند و بالا عمارت کے سامنے پہونچے —

پرانے طرز کی حویلی نما عمارت ——— چھوٹے دروازے سے گزر کر جب ہم لوگ وسیع و عریض عمارت میں داخل ہوتے تو احساس ہوا کہ "آب حیواں درون تاریکیست" یہ وہ خانقاہ تھی شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کی۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے اور بائیں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آتے ہیں۔ جن میں کبھی طالبان طریق ہدایت اور سالکان راہ طریقت کا جمگھٹ رہتا ہوگا لیکن آج ان میں زنانہ میونسپل اسکول قائم ہے لڑکیاں صبح سے شام تک سبق یاد کرتی ہیں اور املا لکھتی ہیں — کل جہاں راہ سلوک طے کرائی جاتی تھی آج وہاں پیمائش بحر و بر ہوتی ہے۔ کل جہاں تصوف کے مسائل سمجھائے جاتے تھے آج وہاں ریاضی کے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ کل جہاں بحر معرفت کے تذکرے تھے آج وہاں بحر قلزم کی باتیں ہیں کل جہاں کے بام و در میں "ہو حق" کی صدا گونجتی تھی آج وہاں " حق" غائب اور "ہو" حاضر ہے ——— دروازے کے باہر دائیں طرف ایک مسجد ہے جو آج محلہ اور اسکول کے بچے بچیوں کے کلب کی حیثیت رکھتی ہے جس میں لڑکے کبڈی کھیلتے ہیں، کشتی لڑتے ہیں، ورزش کرتے ہیں اور لڑکیاں ہنڈکلیاں پکاتی ہیں گاتی ہیں بجاتی ہیں اور خدا جانے کیا کیا کرتی ہیں۔ مسجد کے فرش و ممبر گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ عصر کا وقت ہو گیا تھا اس لئے رومال سے فرش جھاڑ کر ہم لوگوں نے وہیں بارگاہ خداوندی میں سر جھکا دیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے دنوں کے بعد اس وقت مسجد سچ مچ "مسجد" بنی تھی۔

خانقاہ کے شمالی حصہ میں شیخ بو علی قلندر کا مقبرہ ہے۔ مرصع اور مطلا مقبرہ۔ ہم جب صحن پار کر کے مقبرہ کے حدود میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہماری نظر دروازہ پر لگے ہوئے کتبہ پر پڑی جس پر خوشخط اور جلی حرفوں میں کندہ تھا:

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود ——— سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

امام ابو حنیفہ کے خاندان کا یہ مرد قلندر ۶۰۲ھ میں پانی پت میں پیدا ہوا اور ۳ رمضان ۷۲۴ھ کو ۱۲۲ برس کی عمر میں اپنے خالق سے جا ملا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علوم عقلیہ اور نقلیہ میں دستگاہ بہم پہونچائی اس کے بعد تصوف کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو معلوم ہوا کہ کتابوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مطالعہ سے جی اچاٹ ہو گیا۔ طبیعت بے چین

رہنے لگی اور کتابوں کی طرف دیکھنا بھی گراں گذرنے لگا۔ کیونکہ ؎

سب کتابوں کے کھل گئے معنی ——— جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

اور ایک دن اسی حالت جذب میں تمام کتابیں دریا برد کر کے مولانا روم کے اس شعر کو سچ کر دکھایا ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن ——— او ر دل را جانب دلدار کن

قلندر صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ اختیار الدین کے نام ہے جس میں عشق و محبت کی زبان میں توحید و رسالت، ترک دنیا اور طلب آخرت پر بہت والہانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مقبرہ بہت ہی خوبصورت بنا ہوا ہے جسے وزیر جہانگیر مقرب خاں کے لڑکے والا جاہ رزق اللہ خاں نے ۱۰۷۱ھ میں مطابق ۱۶۶۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ میں داخل ہوتے ہی مغل آرٹ کا "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔ دیواروں اور چھتوں کے کام پر نظر ڈالیے تو دیوان خاص (لال قلعہ) کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اس مقبرہ کی سب سے خاص چیز اس کے ستون ہیں۔ آٹھ عدد کسوٹی پتھر کے ستون ——— گول، ستواں اور سیاہ ستون۔

مقبرہ کے اندر جلال تھا عظمت تھی۔ رعب تھا ہیبت تھی۔ اور ہم اس عالم میں قلندر صاحب کی سیپ سے بنی ہوئی قبر پر کھڑے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ حجرے سے ملحق ایک دوسرا حجرہ ہے جس میں ان کے خادم مبارک خاں کی قبر ہے جو ۹ جمادی الثانی ۱۰۸۹ھ کو رخصت ہوئے تھے۔

اس مقبرے سے ملحق ایک دوسرا مقبرہ جہانگیر کے وزیر نواب مقرب خاں کا ہے جن کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا تھا۔ نواب صاحب کی قبر سے ملی ہوئی ان کے خاندان کے لوگوں کی قبریں ہیں۔ انہی میں ان کے خاندانی حکیم حکیم سکھوا کی بھی قبر ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ شاہوں اور وزیروں کے ساتھ حکیم کے ذکر کی کیا ضرورت! ٹھیک ہی [illegible] مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی اور آپ سن کر متحیر رہ جائیں گے کہ ان حکیم صاحب کی پوری قبر زہر مہرہ کی بنی ہوئی ہے ——— شاید ہی کہیں کوئی اور ایسی قبر ہو ——— اب انصاف کیجئے کیا حکیم صاحب کی قبر بھولی جا سکتی ہے۔

وہ سامنے دیکھئے صحن کے دوسری طرف! جی ہاں وہی، لوہے کی ٹوٹی ہوئی جالیوں میں گھری ہوئی جو قبر ہے وہ آپ جانتے ہیں کس کی ہے؟ ——— یہ سوا گز زمین خواجہ الطاف حسین حالی کی ہے۔ [illegible] کی قبر پر نہ سایا ہے نہ سائبان۔ نہ خوشبو ہے نہ اگردان۔ نہ کتبہ نہ قرآن۔ کوئی رہبر کامل ساتھ میں نہ ہو تو آپ آب حیوان سے تشنہ لب ہی لوٹ آئیں۔

جائے عبرت مقام فانی ہے!

یہ حالی کی ویران قبر نہیں۔ انسانوں کے ذوق سلیم کا مقبرہ، مذاق شعری کا مدفن ہے "دیدہ عبرت نگاہ ہو" تو یہاں علم و فن اپنی کس مپرسی پر سینہ کوبی کرتے دیکھے جا سکتے ہیں"۔ گوش حقیقت نیوش ہو تو یہاں فکر و فن کے نالے سنے جا سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عالم رنگ و بو میں ایک حالی ہی کا حال پتلا نہیں بلکہ ان کے استاد غالب بھی تو زمانہ کی سرد مہری سے مغلوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پارس کی صحبت میں پتھر سونا بن جاتا ہے لیکن غالب ایسے بد قسمت کہ نہ زندگی میں "سلطان الہند" سے کچھ حاصل کر پاتے اور نہ مر کر "سلطان الاولیا" سے کچھ لے پائے ——— تہی دستان قسمت را چہ سود از "صحبت کامل"

کتنی مشابہت ہے استاد و شاگرد کی زندگی میں۔ حالی و غالب دونوں کے دونوں ایسی خانقاہوں میں بے نام و نشان پڑے ہیں جہاں بڑے بڑے لوگ اپنی گردنیں جھکانے آتے ہیں اور لاکھوں لٹا جاتے ہیں[1]۔

مقبرہ سے جب ہم باہر آئے تو سورج پیلا پڑ چکا تھا۔ سامنے بابر کی مسجد پیلی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ لاری اسی مسجد کی طرف جا رہی تھی لیکن پہیے کی ہر گردش پر یہ احساس ہوتا تھا کہ شاید اس تاریخی میدان میں ہم لوگوں کی بھی یادگار رہنے۔ زیادہ سے زیادہ ۲، ۳ فرلانگ کی مسافت تھی لیکن بارہا یہ محسوس ہوا کہ لاری اب الٹی کہ تب الٹی۔ بہزار خرابی ہم لوگ بابر کی تاریخی مسجد پر پہنچے۔ ہر چہار طرف دہی تار

---

[1] ۱۹۶۹ء غالب کو تو راس آیا اور "غالب سوسائٹی" نے غالب کے شایان شان مقبرہ بنوانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

حالی کے حال پر دیکھیں کب توجہ ہوتی ہے!

میدان ــــــ بلکہ تاریخی کھیت ــــــ تھا اور بیچ میں مسجد بابری
سر اٹھائے کھڑی تھی۔ پہلے یہاں کابل باغ کا ایک حصہ تھا لیکن اب
تو وہاں مسجد اور کھیتوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو ربیع الاول ۹۳۲ھ میں تعمیر
ہوئی تھی مسجد کے صحن میں ایک کنواں ہے جو اینٹوں سے پٹ گیا ہے کہا جاتا
ہے کہ اس کنوئیں کا پانی تلی کے مرض میں بہت مفید ہے مسجد کا درمیانی بڑا
قبہ ابھی تک صحیح سالم ہے۔ اس کے داہنی طرف اس درمیانی قبہ سے چھوٹے
لیکن پھر بھی بہت بڑے بڑے سہ قبے ہیں۔ بائیں طرف کا پورا حصہ مسمار
ہو چکا۔ مسجد کے اندر محرابوں پر کلام پاک کی آیتیں کندہ ہیں۔ اندر سے
چھت اتنی اونچی ہے کہ بلا مبالغہ دیکھنے کے لئے ٹوپی سنبھالنی پڑتی ہے۔

مسجد سے باہر آکر معلوم ہوا کہ ایک میدان ابھی اور باقی ہے۔ پانی پت
کی تیسری لڑائی کا میدان ــــــ کالا آم ــــــ جہاں فتح کی یادگار
میں ایک مینار کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ لیکن ہم وہاں نہ جا سکے
کیوں کہ راستہ خراب اور وہ ایسی ضروری بھی نہ تھی۔

اب ہم دہلی کو واپس آرہے ہیں۔ پانی پت کی اونچی نیچی سڑکوں کو
پار کرکے جب ہم شیر شاہ کی گرینڈ ٹرنک روڈ پر پہونچے تو راستہ میں حالی
ہائی اسکول پر مغرب کی نماز کے لئے لاری روکی گئی۔ اوہ غلطی ہوئی۔ یہ
باتیں جب کی ہیں آتش جواں تھا۔ اب تو اس اسکول کا نام "آریہ ہائی اسکول"
ہے اور اسی سے ملحق آریہ کالج۔

ــــــ انقلابات ہیں زمانہ کے!

اسکول کا ذکر آگیا تو یہ بھی سن لیجئے کہ اس وقت پانی پت میں
لڑکوں کے چار ہائی اسکول، آریہ ہائی اسکول، جین ہائی اسکول، سناتن دھرم
ہائی اسکول اور اندر بھان بھراتری ہائی اسکول ہیں۔ ایک کالج آریہ کالج ہے
لڑکیوں کے لئے دو ہائی اسکول گورنمنٹ ہائی اسکول اور آریہ ہائی اسکول ہیں
آبادی تمام کی تمام مقامی اور باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں پر
مشتمل ہے۔ مولانا لقاء اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ پانی پت کے اصل باشندوں
میں ان کے علاوہ اب وہاں کوئی نہیں۔ ان کے بال بچے بھی جا چکے ہیں دو ایک
برس سے مرادآباد، بجنور اور قرب و جوار کے دو ایک مسلمان گھرانے وہاں کاروبار
کے سلسلے میں آکر بس گئے ہیں۔ مجھے بار بار میں "محمود منزلیں" اور "نفیس منزلیں"
تو بہت سی نظر آئیں لیکن محمود و نفیس کہیں دکھائی نہ دیئے۔ کہیں کہیں تو ایسا
بھی ہوا کہ کسی عمارت کو دیکھ کر میں بے اختیار بول اٹھا "مسجد" لیکن
فوراً تنبیہہ کی گئی "یہ مسجد نہیں" کیا ہے اور کیوں ہے؟ نہ میں اس کی تشریح
کرسکتا ہوں۔ نہ آپ سن سکتے ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ چپ بھی
نہیں رہا جاتا ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(حلقۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ کالج میں پڑھا گیا)

آل احمد سرور

دو قدریں

(کمیونزم اور اسلام کا ایک تقابل ۔ ش ۔ ح)

میں نے فطرت کے گلستاں سے چنے ہیں کچھ پھول
تم کو اصرار کہ یہ پھول نہیں کانٹے ہیں

وہ ستارے ہیں تمھارے لئے خوابوں کا طلسم
میں نے جو اپنے شبستاں کے لئے چھانٹے ہیں

تم سرِ میکدہ ہر شام لٹا دیتے ہو
نور و ظلمت کی کشاکش کا بھرم ہے مجھ سے

منہ تکا کرتے ہو تم اہل کرم کا ہر روز
رونقِ بارگہِ اہلِ ستم ہے مجھ سے

تم مرے خوابوں پہ ہنستے ہو مجھے رنج نہیں
انھیں خوابوں سے حقائق کے دئے جلتے ہیں

کبھی اس وادی میں گلگشت کو آنا ہو تمھیں
آج خاروں پہ جہاں اہل جنوں چلتے ہیں

اہل ثروت کے تبسم کے پجاری ہو تم
دولتِ اہل نظر سوز و گداز پیہم

لوریاں دیں تمھیں ساحل کے نگہبانوں نے
اور طوفاں کا ہوا میرے سفینے پہ کرم

ہر روش پہ تمھیں ایک اور گلِ تر کی تلاش
اور نگہ داریٔ آدابِ چمن میرے لئے

ڈھونڈتے پھرتے ہو ہر شمع میں تم کوئی کرن
شکنِ گیسوئے لیلائے وطن میرے لئے

میں بصیرت کا پجاری ہوں، مسرت کا نہیں
میرے ہونٹوں پہ تبسم نہیں فریاد سہی

مجھ سے آزادیٔ افکار جواں ہوتی ہے
تم تو زناریٔ اوہام ہو، آزاد سہی

کتنے میخانوں کے در میرے لئے بھی وا تھے
تشنگی میری فضیلت ہے، مقدر تو نہیں

کاغذی پھولوں کی جنت سے مجھے کیا لینا
میرے افکار کی جنت کے برابر تو نہیں

اہلِ ظاہر مری مستانہ روی کیا جانیں
راستہ جاتا ہے یہ دار و رسن سے ہو کر
میری خوشبو اسے کچھ دیر کو یاد آئے گی
جو بھی گذرے گا کبھی میرے چمن سے ہو کر

(بشکریہ شاہراہ)

شوکت تھانوی •

عالیجاہ

اب کسی کو کیا معلوم کہ ان ہی ذروں میں کیسے کیسے آفتاب پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً غریب خانے کے قریب ہی ایک کوٹھی پر عالی جاہ کا قبضہ ہے۔ بظاہر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہوں گے کوئی یہ بھی مہاجر اور مہاجر ہونے کی وجہ ہی سے کم نہیں بتاتے اسی طرح عالی جاہ کو بھی سمجھتے ہوں گے۔ مگر عالی جاہ یقیناً دوسرے مہاجرین سے مختلف ہیں بات ہوتے ہیں۔ آپنے کوئی کارخانہ الاٹ کرانے کی کوشش کبھی نہیں کی کسی دکان کا مطالبہ کبھی نہیں کیا۔ کوئی زمین کسی سے نہیں مانگی۔ حد یہ ہے کہ کوئی مکان بھی باقاعدہ آپکے نام الاٹ نہیں ہوا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ اگر کچھ الاٹ کراتے۔ چھوڑ کر آئے ہیں تخت و تاج وہ تو یہاں الاٹ ہونے سے رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ عالی جاہ کی حیثیت اور مرتبہ کو دیکھتے ہوئے دو چار شہروں کو ملا کر ایک مملکت بنا دی جاتی اور اس کی فرمانروائی آپ کے نام الاٹ کر دی جاتی۔ مگر پاکستان سے اس بات کی توقع کی امید ہی بیکار سمجھ کر آپ تو اپنے دربار ہی کے ساتھ خاموش بیٹھے ہیں۔ جب کوئی بھولا بھٹکا آپ کے دربار میں باریاب ہو جاتا ہے تو عالی جاہ اس کو اپنا افسانہ سنا دیتے ہیں۔

محلے کے متعدد لوگ شرف باریابی حاصل کر کے لوٹے اور اس دربار کے عجیب عجیب افسانے ساتھ لائے کسی نے کہا سلطنت جانے کا اثر دماغ پر بھی ہے۔ کسی نے سرے سے سلطنت ہی کو واہمہ قرار دیا کسی نے کہا۔ حالات نے بدل یا بھولے مگر دلچسپ بیحد ہیں کسی نے اس بنا میں دربار کا نقشہ ایسا کھینچا کہ آخر ایک دن ہم کو بھی باریاب ہونا ہی پڑا۔ جو صاحب ہم کو لیکر گئے تھے وہ پہلے ہی سے بتا چکے تھے کہ شاہانہ احترام مبالغہ کی حد تک کرنا پڑے گا ورنہ عالی جاہ اصل رنگ میں اپنے کو پیش نہ کر سکیں گے اور باریاب ہونے کا کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوسکے گا لہٰذا ہم خاص درباری بن کر حاضر ہوتے تھے اس وقت قصر سلطانی کے سبزہ زار کے ساتھ ایک آوارہ گائے گستاخیاں کرنے میں مصروف تھی اور ایک فاقہ زدہ کتا دیوان عام کی شکستہ سیڑھیوں پر پڑا سو رہا تھا۔ باقی ہر طرف سناٹا تھا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ باریابی کی اطلاع حرم سرا میں کیوں کر پہنچائی جائے تھوڑی ہی دیر میں روزی اور موت دونوں سے بیگانہ ایک بزرگ قریب ہی رینگتے ہوئے نظر آئے تو ہمارے ساتھی نے بڑھکر پوچھا۔

"سرکار تشریف رکھتے ہیں"

بڑے میاں کو گویا ایک دم یاد آگیا کہ یہ قصر سلطانی ہے۔ چنانچہ مقربین خاص کے انداز میں کہا "حضور حمام فرما رہے ہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں خدام سے اطلاع کرانے کی کوشش کرتا ہوں"

برآمدہ میں دو تین معمولی کرسیاں اور ایک خاص کرسی پڑی ہوئی تھی ہم لوگ نہایت ادب سے خاص کرسی کے سامنے معمولی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں پہلے مراد آبادی خاصدان آیا پھر عظیم الشان دخانی حقہ آیا اور تیسری مرتبہ انہی بڑے میاں نے آکر اطلاع دی "سرکار تشریف لا رہے ہیں"

ہم سرو قد کھڑے ہو گئے۔ عالی جاہ نہایت سادہ لباس میں یعنی ململ کا کرتا۔ چوڑی دار پاجامہ۔ سفیدی پھرا ہوا دیسی جوتا پہنے شاہانہ وقار کے ساتھ برآمد ہوئے۔ ہم لوگوں نے سینہ پر ہاتھ رکھکر سر کے خم سے تعظیم دی اور عالی جاہ نے اپنی خاص کرسی پر جلوس فرماتے ہوئے ہم لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ فرمایا اور ہمارے ساتھی سے ازراہ لطف خسروانہ اس ہیچمدان کے متعلق دریافت فرمایا۔

"آپ کی تعریف"

ان صاحب نے دست بستہ عرض کیا "یہ بھی حضور ہی کے زیر سایہ اسی محلے میں رہتے ہیں۔ میں نے عالی جاہ کا ذکر کیا تو شرف باریابی کے لئے بے قرار ہو گئے۔ عالی جاہ نے شاہانہ دبدبہ کے ساتھ فرمایا "اب آئے ہیں آپ جب میں کسی قابل نہ رہا۔ نہ آپ کو خلعت دے سکتا ہوں نہ جاگیر

دیکھئے اس غربت میں خود کس طرح پڑا ہوں۔ حالانکہ اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے مگر طبیعت گوارہ نہیں کرتی۔ ابھی کل کی بات ہے مرکزی حکومت کا اشارہ پاکر ایک اعلےٰ سرکاری عہدیدار میرے پاس آئے تھے۔ اور مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ حضور کی آسائش کیلئے ہم کیا انتظام کر سکتے ہیں۔ جو حکم دیں وہ کیا جائے۔ میں نے کہدیا کہ میاں جاؤ اپنا راستہ لو مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہارے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی آسائش کی بھیک مانگوں گا۔

عرض کیا "حضور نے بالکل درست فرمایا۔ جہاں تک اگر حضور چاہیں تو اس سے اچھی کوٹھیاں سجی سجائی خدمت عالی میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

عالی جاہ نے کچھ اور بھی عالی جاہ بن کر ارشاد فرمایا "حضرت کوٹھیاں تو میں نے چھ لپنے لئے مختلف مقامات پر لے کر رکھی تھیں۔ ایک ... دہلی میں ایک کوہ مری میں دو کراچی میں ایک پشاور میں کہ خدا جانے کہاں رہنا پڑے۔ میں دہلی میں بیٹھے ہی بیٹھے اس ہنگامہ سے پہلے ہی تمام انتظام کر رہا تھا مثلاً اس لاہور ہی کی کوٹھی کے لئے میں نے پچاس لاکھ کے تو صرف قالین دہلی سے بھیجے تھے اس کے علاوہ فرنیچر میں چاندی کا صوفہ سیٹ ظروف میں چاندی سونے کے برتن۔ چار موٹریں۔ آٹھ گھوڑے اور چالیس ہزار نایاب کتابوں کا ایک مکمل کتب خانہ یہ سب کچھ یہاں لوٹا گیا۔

عرض کیا "جان کا صدقہ گیا سرکار۔"

عالی جاہ نے بڑی سیر چشمی سے فرمایا "خیر اس کا تو ملال نہیں کہ اتنا قیمتی سامان گیا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ پاکستانی حکام نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا۔ مثلاً مجھ کو یقیناً یہ امید نہ تھی کہ میرا سامان عام شہریوں کی طرح لوٹا جائے گا۔ یہ حکومت کا فرض تھا کہ میری کوٹھی پر باقاعدہ پہرا بٹھایا جاتا کہ بھئی یہ شاہی خاندان کے ایک رکن کا مکان ہے۔ چنانچہ اب جو میں یہاں آیا۔ تو میدان صاف تھا۔ نہ کھانے کے لئے برتن نہ بیٹھنے کے لئے فرنیچر۔"

ہمارے ساتھی نے عرض کیا "شاہزادوں اور شاہزادیوں کو تو بیحد تکلیف ہوئی ہوگی۔"

عالی جاہ نے فرمایا "ایسی ویسی تکلیف۔ خدا کی شان نظر آتی تھی کہ وہ بچے جن کے فرش مخمل پر پیر پھسل جایا کرتے تھے اس فرش زمین پر خاک بسر بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے خدام کو شہر بھیجا جلدی جلدی کچھ قالین کچھ برتن چالیس پچاس ہزار روپیہ صرف کر کے منگاتے تو کچھ کام چلا۔ مگر تنگ مسافرت کا وہی عالم ہے۔

بڑے میاں نے دست بستہ عرض کیا "سرکار عالیہ نے [illegible] فرمایا ہے کہ اس وقت خاصہ میں کیا تیار کیا جائے۔"

عالی جاہ اس بے محل سوال پر کچھ گڑبڑا سے گئے۔ مگر فوراً ہی کو سنبھال کر ارشاد فرمایا "کبھی مرغن کھانا نہ کھاتے کھاتے طبیعت گھبرا [illegible] گئی ہے۔ مرغ اور بٹیر ہرگز نہ ہوں۔ کل موتیا پلاؤ پکایا ہے اور صبح گلابی بریانی اس وقت تو گوشت میں ٹنڈے ڈلوا دیئے جائیں میرے لئے [illegible] کے لئے جو بیگم صاحبہ مناسب سمجھیں تیار کرا دیں۔"

بڑے میاں نے دبی زبان سے عرض کیا "سرکار گوشت [illegible] گوشت دینے سے انکار کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ پچھلا حساب صاف [illegible]

عالی جاہ کچھ اور بھی گھبرا گئے مگر خاندانی رئیس ٹھہرے [illegible] پر بل ڈال کر بولے "کیا مطلب؟ گویا اس ڈیوڑھی پر یہ ٹکے کا [illegible] کا حساب کیا جائے کہہ دینا اس سے کہ ہمارے یہاں ماہانہ حساب [illegible] ہے۔ دوسرے اس قسم کی باتیں مجھ سے کیوں کرتے ہو۔ داروغہ مطبخ کی مرض کی دوا ہے۔

بڑے میاں آج بھانڈا پھوڑنے پر تلے ہوتے تھے کہنے لگے "کون داروغہ سرکار۔"

عالی جاہ نے چیں بجبیں ہو کر فرمایا "کوئی نہیں آپ تشریف لے جائیں اور آئندہ میرے پاس آکر ایسی باتیں کبھی نہ کریں۔"

بڑے میاں جز بز ہو کر کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے تو عالی جاہ نے ارشاد فرمایا "یہ بڑے میاں ابا جان کے زمانہ سے ہمارے یہاں ہیں [illegible] اب دماغ جواب دے چکا ہے۔ ان کی ہر بات ہم لوگوں کو سننا پڑتی ہے [illegible] میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس عالم میں یہاں آکر جب سے پیر جمائے اور [illegible] رفتہ رفتہ یہاں سے لیکر کراچی تک یہ خبر پھیلنے لگی کہ میں یہاں آکر اس طرح پڑا ہوں اور لگے گھوڑے دوڑنے ادھر سے لے کر ادھر تک کراچی کے یہاں کے حکام تار آتے کہ دیکھو کہیں ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب روز کسی نہ کسی افسر کا موٹر کھڑا ہے کہ حضور کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔ مگر میں ان بچے

جی

[illegible] بتاتا ہوں کہ میں نے ہندوستان میں پٹیل صاحب تک کا احسان
لیا

[illegible] کیا "کیا پٹیل صاحب نے بھی یہ سعادت حاصل کرنا چاہی تھی۔

[illegible] نے فرمایا "صاحب جب میں نے وہاں کے معاملات بگڑتے
[illegible] رفتہ رفتہ اپنا سامان ادھر بھیجنے لگا۔ یہ خبر سردار پٹیل صاحب کے
[illegible] ایک دن ان کا ایک خط آیا۔ کہ عالی جاہ "میری حکومت کو
[illegible] حرکت کچھ مشکوک سی محسوس ہو رہی ہے اور شبہ کیا جاتا ہے
[illegible] ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ حکومت
[illegible] کرنے کے لئے آنجناب اپنی صفائی پیش کریں گے"

[illegible] "طرز تخاطب تو نہایت شریفانہ تھا"

عالی جاہ نے فرمایا "حفظ مراتب کا ان لوگوں نے برابر خیال رکھا
[illegible] بعد ہی میں سمجھ گیا۔ کہ اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہو
[illegible] مجھ سے ہو نہیں سکتا تھا کہ صفائی پیش کرتا پھرتا اور آثار یہ تھے
[illegible] دوسرے والیان ملک کی طرح نظر بند کر دیا جاتا۔ لہٰذا میں تو بس
[illegible]

[illegible] دھوبی کو دیکھ کر عالی جاہ نے نعرہ بلند کیا۔ "اسے کوئی ہے
[illegible] دھوبی کو حاضر کیا جائے"

دھوبی نے خود ہی عالم پناہ کی آواز سن کر کہا "کیا مجھ سے کچھ کہا"
عالی جاہ نے شرف ہم کلامی عطا کرتے ہوئے فرمایا "کہنا یہ تھا تم سے
[illegible] دھلائی میں ایک آدھ کپڑا گم کرتے ہو۔ اس دھلائی میں میرا
[illegible] کرتہ تم سے گم گیا ہے۔ جو کسی طرح ڈھائی تین سو روپیہ سے
[illegible]"

دھوبی نے تعجب سے پوچھا "صرف کرتہ ڈھائی تین سو روپیہ کا میں
[illegible] تک جتنے کپڑے دھونے کو لے گیا ہوں وہ سب ملا کر بھی
[illegible] کے نہ ہوں گے۔

عالی جاہ نے ہمارے ساتھی سے کہا "ذرا آپ اس کو یہ بتا دیں کہ یہ
کس سے بات کر رہا ہے"

دھوبی نے بھی غیر درباری انداز سے کہا "اللہ آپ سے بات کر رہا
ہوں میاں جی۔

آپ کا کرتہ پچھلی دھلائی میں دوسرے گھر کے کپڑوں میں لگ گیا
تھا جس کی ایک آفت آپ نے مچا دی تھی۔ اب کی میں نے لا کر گھر میں دے
دیا ہے۔ موٹے ڈوریے کا پھٹا پرانا کرتا ہے۔ آپ نے کہہ دیا ایک دم سے
ڈھائی تین سو کا کرتہ۔

عالی جاہ نے چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے ارشاد فرمایا "میری ہی
غلطی تھی کہ میں نے تم سے بات کی۔

دھوبی نے کہا "غلطی تو میاں جی میری تھی کہ میں نے آپ کے یہاں
کپڑے دھونے شروع کئے۔ اب آخر میرا قصور کب بخشا جائے گا اور دھلائی
کا حساب کب ہو گا۔

عالی جاہ نے ترش روئی سے ارشاد فرمایا "بھئی تم سخت گستاخ
معلوم ہوتے ہو۔ میں اس قسم کی باتوں کا عادی نہیں ہوں۔

دھوبی نے ترکی بہ ترکی کہا "یہ تو مجھے خود اندازہ ہو گیا ہے کہ
آپ دام دینے کے عادی نہیں معلوم ہوتے۔ مگر مجھ سے بھی سن لیجئے کہ اب
کپڑے اسی وقت میسر ہوں گے جب یہاں سے آئیں گے۔ جب ایک ایک پیسہ مجھ کو
مل جائے گا"

عالی جاہ اس وقت جس ضبط و تحمل سے کام لے رہے تھے اس
کا اندازہ ہم حاضرین دربار کر رہے تھے کہ اللہ اللہ کتنا بڑا ظرف ہے اس دو دمان
شاہی کا۔ کچھ کہنا چاہا کچھ ضبط کیا۔ ہونٹھ کانپے۔ سارے جسم پر لرزہ سا طاری
ہوا۔ مگر آخر کار ایک تبسم کے ساتھ صرف یہ ارشاد فرمایا کہ
"اچھا بھائی۔ اچھا۔ تم جیتے ہم ہارے"

دھوبی خدا جانے بارگاہ خسروی میں کیا کیا گستاخیاں کرتا ہوا چلا گیا
عالی جاہ کچھ دیر سناٹے میں رہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر بولے
ہاں صاحب تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہاں آنے کو تو آ گیا مگر یہاں
کا تو حال ہی عجیب دیکھ رہا ہوں۔ ہر صاحب اقتدار اس کا منتظر ہے کہ اس
کے پاس جاؤں اور کوئی غرض بیان کروں۔ مگر جناب رسی جل جاتی ہے
مگر اس کا بل تو نہیں جاتا۔ میں نے بھی قسم کھا لی ہے کہ کسی کے پاس نہیں
جاؤں گا۔ مجھ سے اکثر حکام نے آ کر کہا کہ فلاں منسٹر صاحب آئے ہوئے
ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ جس کو ملنا ہو یہاں آئے اور
آ کر دیکھے کہ میں کس عالم میں پڑا ہوا ہوں۔ مجھے ضرورت نہیں کہ میں کسی

کے دروازے پر جاؤں۔ بات یہ ہے کہ عزت کچھ اگر باقی ہے اب بھی تو وہی آن بان اور یہی وضعداری ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہز ہائنس نواب صاحب کشتور مجھ سے ملنے آئے تھے گلے مل کر دیر تک روتے رہے روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آنکھیں سوج گئیں۔ میں نے کہا پاگل ہو گئے ہو۔ بقول شخصے "یوں کہیں مردے بھی روتے ہیں" تو کہنے لگے کیا عرض کیا جائے بھائی جان تاج گیا۔ تخت گیا۔ حکومت گئی۔ خزانہ گیا۔ رہ گئی تھی صرف لفظی عزت اب اس کی بھی خیر نہیں۔ چنانچہ گورنر نے پچھلے دنوں جو خط لکھا ہے اس میں نہ ہز ہائنس نہ عالی جاہ نہ اعلیٰ حضرت بلکہ محض مائی ڈیر نواب صاحب۔ اب بتائیے کہ اگر نواب صاحب کشتور کی طرح کسی نے مجھ کو بھی مائی ڈیر نواب صاحب لکھ دیا کبھی تو میں کیا کروں گا۔

عرض کیا "حضور والا ان امور کا تو بہر حال فیصلہ کرا لینا چاہیے حکومت سے کہ اب آپ لوگوں کی حیثیت سرکاری طور پر کیا ہو گی۔

عالی جاہ نے ارشاد فرمایا۔ اب نہیں۔ حضرت یہ فیصلہ تو ہم کو پہلے ہی کرا لینا چاہیے تھا۔ جب برٹش گورنمنٹ نے ہم سے پوچھا تھا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو اختیارات آپکے آباؤ اجداد کے لئے تھے وہ اب واپس کر دیئے جائیں۔ مطالبہ کیا جا رہا ہے پاکستان کا۔ اب آپ بتلائیے کہ حکومت آپ کو دی جائے یا پاکستان مانگنے والوں کو۔ تو جناب ہم نے فوراً لکھ دیا کہ پاکستان اور ہم الگ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے اس جواب پر پاکستان بنا دیا گیا اور اب ہم ہیں کہ ع

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

عین اسی وقت ایک کابلی خان "السلام علیکم" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت عالی جاہ کا رنگ کچھ اس صفائی سے اڑا کہ عالی جاہ دیر تک اپنے کو سنبھال نہ سکے آخر خاں نے خود ہی متوجہ کیا۔

"آج کا وعدہ تو ٹھیک رہے گا نواب صاحب"

عالی جاہ نے گڑبڑا کر فرمایا "میں ابھی بات کرتا ہوں آپ سے خانصاحب ذرا آپ لوگ تشریف لے جائیں تو اطمینان سے بات ہو"

خاں نے نہایت بے تکلفی سے کہا "ان کے جانے کی کیا بات ہے آج تو یہ بات چار آدمیوں کے سامنے ہو گی۔

عالی جاہ نے تذبذب سے لجاجت سے کہا "نہیں خاں صاحب یہ میری اور آپ کی ہے اور سب سے کیا مطلب؟"

خاں نے کہا "اور سب سے مطلب یہ کہ یہ لوگ بھی انصاف کریں آخر میں کب تک تمہاری باتوں میں آتا رہوں نہ تم اصل دیتے ہو نہ سود دیتے ہو۔ ایک مہینہ کے لئے تم نے روپیہ لیا تھا۔ بنتے ہو بڑے نواب صاحب اور سو روپیہ کا سود تک نہیں دے سکتے۔ ہم تو آج لے کر جائیں گے پائی پائی"

عالی جاہ نے نہایت بیہودہ قسم کی انگریزی میں ہم لوگوں کو سمجھایا کہ دراصل یہ رقم عالی جاہ نے اس خان سے لیکر کسی اور مہاجر کو دلوائی تھی خیر اتنی بات تو ہم لوگ بغیر اس غلط انگریزی کے بھی صحیح سمجھ لیتے کہ اتنا بڑا عالی جاہ اتنی معمولی رقم یوں قرض نہیں لے سکتا۔ ہمارے ساتھی نے خان سے کہا "خاں صاحب اتنی سی رقم کے لئے آپ اتنے بڑے آدمی پر تقاضا کیوں نہیں کرتے"

خاں نے بگڑ کر کہا "او ہم جانتے ہیں۔ کتنا بڑا آدمی ہے پچیس پچیس روپیہ کرکے چار دفعہ قرض لیا۔ ہماری خوشامد کی۔ ہاتھ جوڑے کہ آج راشن نہیں۔ آج یہ نہیں کل وہ نہیں۔

عالی جاہ نے جلدی سے کہا "خیر ان باتوں سے کیا غرض ... روپیہ معہ سود کے کل ہی میں تم کو دیدوں گا۔ میں خود اس قسم کا روپیہ رکھنا نہیں چاہتا تھا ورنہ میں ایسے تقاضوں کا عادی ہوں۔

خاں نے کہا "کل کا بہانہ آج نہیں چلے گا آج بہت دنوں کے بعد باہر بیٹھے ملے ہو۔ میں تو اسی وقت سر توڑ کر روپیہ لے لوں گا۔"

عالی جاہ نے ہمارے ساتھی سے کہا "ذرا ان سے یہ بتا دیجئے کہ یہ آپ کیا بات کر رہے ہیں" خانصاحب نے اپنی لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ہم کس سے باتیں کر رہے ہیں اور آج ہم یہ بات پوری کر کے اٹھیں گے ہمارا روپیہ نکالو تم اسی وقت۔"

عالی جاہ نے اس نازک موقعہ پر بھی شاہانہ دبدبہ سے کہا "اس وقت تو میرا منشی بھی موجود نہیں۔"

خاں نے گستاخی سے کہا "ایک بھائی تمہارا منشی بن جاتا ہے ایک ماموں تمہارا داروغہ بنتا ہے اور تم نواب بنے گھوڑے کی پلی باندھا کرتے ہو۔"

ہمارے ساتھی نے خاں صاحب سے کہا "باادب باملاحظہ ہوشیار"

عالی جاہ نے ہم لوگوں سے کہا "آپ لوگ اس قصّہ میں نہ
یں پھر کسی وقت ملاقات ہوگی" اور ہاتھ ملاکر ہم کو رخصت کرنا چاہا
ں پٹھان نے ہم کو روکتے ہوئے کہا "نہیں بھائی تم لوگ جا نہیں
ے ہمارا فیصلہ کرکے جاؤ"۔

ہم نے عرض کیا "خانصاحب اپنا فیصلہ آپ خود ہی کریں ہم تو
عالی جاہ کی رعایا میں سے ہیں ان کا ساتھ دیں گے"۔ اور بمشکل اس دربار
سے رخصت ہوسکے۔ امید ہے کہ بعد میں عالی جاہ کی تاجپوشی بھی
ہوئی ہوگی۔

(بشکریہ "حریم")

سعادت حسن منٹو

منظور

جب اُسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی رات اسے آکسیجن پر رکھا گیا۔ جو نرس ڈیوٹی پر تھی اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صبح سے پہلے پہلے مر جائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی کبھی زور زور سے پھڑ پھڑاتی اور کبھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد چلتی تھی!

پسینے میں اس کا بدن شرابور تھا۔ ایک لحظہ کے لئے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا کبھی اس کروٹ لیتا کبھی اس کروٹ۔ جب گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا ہلدی کے گابھے کی طرح زرد تھا! آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ ناک کا بانسا برف کی ڈلی۔ سارے بدن پر رعشہ تھا!

ساری رات اس نے بڑے شدید کرب میں کاٹی! آکسیجن برابر دی جا رہی تھی۔ صبح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نڈھال ہو کر سو گیا۔

اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے۔ جسے کورونری تھرومبوسس کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔

جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگا دیئے گئے۔ اُس کے دل میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ شانوں کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ جیسے رات بھر ان کو کوئی کوٹ رہا ہے جسم کی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی۔ مگر نقاہت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ویسے اسکو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں۔ آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔

اس کی عمر بتیس برس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی ایسی راحت نہیں دیکھی تھی جو اس وقت میں اسے یاد آتی۔ اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی بس وہ ایسے ہی ادھر اُدھر کی ٹھوکریں کھاتا اس عمر تک پہنچ گیا تھا اور ایک کارخانہ میں ملازم ہو کر پچیس روپے ماہوار پر انتہا درجہ کی افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

دل میں ٹیسیں نہ اٹھتیں تو وہ اپنی تندرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ صحت اس کی کبھی اچھی نہیں تھی کوئی نہ کوئی عارضہ سے ضرور لاحق رہتا تھا۔

شام تک اُسے چار ٹیکے لگ چکے تھے آکسیجن ہٹائی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا۔ اس لئے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ ایک بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ نرسیں اپنے کام میں مشغول تھیں اس کے داہنے ہاتھ نو دس برس کا ایک لڑکا کمبل میں لیٹا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"السلام علیکم" لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔

نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لہجہ سے متاثر ہو کر جواب دیا "وعلیکم السلام"

لڑکے نے کمبل میں کروٹ بدلی "بھائی جان اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

نئے مریض نے اختصار سے کہا "اللہ کا شکر ہے"

لڑکے کا چہرہ اور زیادہ تمتما اٹھا "آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام" نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا "میرا نام اختر ہے"

"میرا نام منظور ہے" یہ کہہ کر اس نے ایک دم کروٹ بدلی اور نرس کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی "آپا۔ آپا جان!"

نرس رک گئی۔ منظور نے ملتے ہی ہاتھ اٹھا کر اس کو سلام کیا۔
نرس قریب آگئی اور اس کو پیار کرکے چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد اسسٹنٹ ہاؤس سرجن آیا۔ منظور نے اس
کو بھی سلام کیا "ڈاکٹر جی السلام علیکم"۔
ڈاکٹر سلام کا جواب دیکر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا۔ جو ہسپتال کے بارے
میں تھیں۔

منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے دلچسپی تھی اس کو معلوم تھا۔
کس کی حالت اچھی ہے کس کی حالت خراب ہے۔ کون آیا ہے۔ کون گیا
ہے۔ سب نرسیں اس کی بہنیں تھیں اور سب ڈاکٹر اس کے دوست
مریضوں میں کوئی چچا تھا کوئی ماموں اور کوئی بھائی۔
سب اس سے پیار کرتے تھے اس کی شکل وصورت معمولی تھی
مگر باتوں میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تماہٹ کھیلتی
رہتی۔ اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا
تھا۔ بہت زیادہ باتونی تھا مگر اختر کو حالانکہ وہ دل کا مریض تھا۔ اور اس
مرض کے باعث بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اس کی عادت کھلتی نہیں تھی۔
چونکہ اس کا بستر اختر کے پاس تھا۔ اس لئے وہ تھوڑے تھوڑے
وقفوں کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا۔ جو چھوٹے چھوٹے معصوم
جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

"بھائی جان آپ کے بہن بھائی ہیں"
"میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں"
"آپ کے دل میں اب تو درد نہیں ہوتا"
"مجھے معلوم نہیں دل کا درد کیسا ہوتا ہے"
"آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے" دودھ زیادہ پیا کریں"
"میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں گا۔ وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے"
بڑا ڈاکٹر بھی اسے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راونڈ پر آتا تو کرسی
منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا۔ اور اس کے ساتھ ادھر ادھر
کی باتیں کرتا رہتا۔

اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لئے آتا تھا
افراتفری کے عالم میں اس کے لئے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر
اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور
برقعہ اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔

اختر نے اسی وقت اس سے دلی رشتہ قائم کر لیا تھا جب
اس نے اس کو سلام کیا تھا اس سے باتیں کرنے کے بعد یہ رشتہ اور بھی مضبوط
ہو گیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقعہ ملا تو
اس نے محسوس کیا کہ اس کو جو افاقہ ہوا ہے منظور ہی کا معجزہ ہے۔
ڈاکٹر جواب دے چکے تھے وہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان تھا منظور
نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تھا تو اس کی نبض قریب
قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ خدا
اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بچ گیا لیکن
اس کو یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ اس کا
مرض بہت مہلک تھا۔ بہرحال اب اس کے دل میں اتنی خواہش ضرور پیدا
ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشتہ فوراً نہ ٹوٹ جائے
دو تین روز گذر گئے۔ منظور حسب معمول سارا دن چہکتا رہتا تھا۔
کبھی نرسوں سے باتیں کرتا کبھی ڈاکٹروں سے اور کبھی جمعداروں سے یہ بھی اس
کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بدبودار فضا کا
ہر ذرہ اس کا دوست ہے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا ہے۔ فوراً اسکی دوست
بن جاتی ہے۔

دو تین روز گذرنے کے بعد اختر کو جب معلوم ہوا کہ منظور کا نچلا
دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا لیکن اس کو حیرت بھی ہوئی کہ
اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیوں کر رہتا ہے۔ باتیں جب
اس کے منہ سے بلبلوں کی مانند نکلتی تھیں۔ تو انہیں سنکر کون کہہ سکتا
تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بیجان لوتھڑا ہے۔
اختر نے اس سے اس کے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی اس لئے
کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی جس سے
وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا لیکن اسے کسی اور ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ
منظور ایک دن جب کھیل کود کر واپس آیا تو وہ ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جس
کے باعث ایک دم اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔

ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ ان کو بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں کا علاج کرایا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ڈاکٹروں کا سہارا لیا۔ مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر انہوں نے اسے ہسپتال میں داخل کر دیا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہو تا رہے۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہوگا۔ مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لئے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ ان کو حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا ہے۔ اس لئے کہ اس پر فالج کا حملہ بہت شدید تھا جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل بیکار کرنے کے علاوہ اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضا جھنجھوڑ کر رکھ دیئے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اس سے پیار کرتے تھے اس لئے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گر اپنی اس شدید علالت سے سیکھا تھا اس کے معصوم دماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا۔ کہ اس کا دکھ دب جاتے۔

اختر پر پھر ایک دورہ پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا۔ مگر اس نے صبر اور تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے دکھ درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سو فیصدی یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ مگر معجزہ رونما ہوا اور جب رات کی ڈیوٹی پر متعین نرس نے صبح سویرے اس کو دوسری نرسوں کے سپرد کیا۔ تو اس کی گرتی ہوئی نبض سنبھل چکی تھی۔ وہ زندہ تھا۔

موت سے کشتی لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر جب وہ سونے لگا تو اس نے نیم مندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا جو محوِ خواب تھا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور اور نحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔

جب اٹھا تو منظور چہک رہا تھا۔ اس کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا۔

"آپا! اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

"سونے دو۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انہیں دوا دیجئے۔"

"اچھا دے دوں گی۔"

"منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں بہت خوش ہو کر اس نے بآواز بلند کہا۔

"السلام علیکم۔"

اختر نے نقاہت بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

"وعلیکم السلام۔"

"بھائی جان! آپ بہت سوئے۔"

"ہاں۔ شاید۔"

"نرس آپ کے لئے دوا لا رہی ہے۔"

اختر نے محسوس کیا کہ منظور کی باتیں اس کے نحیف دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چڑیا کی طرح چہکنے چہکانے لگا اس نے منظور سے پوچھا۔

"اس مرتبہ بھی تم نے کیا خدا سے دعا مانگی تھی؟"

"میں روز روز دعائیں نہیں مانگا کرتا۔ ایک دفعہ مانگ لی بس کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس کے لہجہ میں یقین تھا۔

اختر نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"تم دوسروں سے کہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ خود کیوں نہیں ٹھیک ہو کر اپنے گھر جاتے؟"

منظور نے تھوڑی دیر سوچا۔

"میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے۔ دیکھئے نا اب میں اوپر اور نیچے کھسک سکتا ہوں۔"

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا۔

واہ۔ منظور میاں واہ۔ ایک مہینہ کیا ہے۔ یوں گزر جائے گا۔"

چٹکی منظور نے بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔

ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید نہیں تھے۔ اب اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا سا تناؤ بھی نہ

تھا۔ دل کی رفتار ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا۔ کہ وہ بچ کیسے گیا۔

اختر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کو بچانے والی چیز کوئی انجکشن نہیں تھا۔ کوئی دوا نہیں تھی۔ وہ منظور تھا مفلوج منظور۔ جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا اور جس کو یہ خوشی تھی کہ اس گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظروں میں مسیحا کا رتبہ رکھتی تھی۔ کہ اس نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی تھی۔ اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کالے بادل ہٹا دیئے تھے جن کے سایہ میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ اس کی قنوطیت رجائیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کو زندہ رہنے سے دلچسپی ہو گئی تھی وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر اسپتال سے باہر نکلے اور ایک نئی صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کرے۔

اس کو بڑی الجھن ہوتی تھی۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ منظور ویسے کا ویسا ہی ہے اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز مالش ہوتی تھی۔ بجلی لگائی جاتی تھی۔ ٹیکے دیتے جاتے تھے۔ دوائیاں پلائی جاتی تھیں۔ مگر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا اس کی خوش رہنے والی طبیعت شگفتہ سے شگفتہ تر ہو رہی تھی۔ یہ بات اختر کے لئے حیرت اور الجھن کا باعث تھی!

ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ:-

"اب وہ اسے گھر لے جائے۔ کیوں کہ اس کا علاج نہیں ہو سکتا"

منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اب اس کا علاج ہسپتال کے بجائے گھر پر ہوگا۔ اور وہ جلد تندرست ہو جائے گا۔ مگر اسے سخت صدمہ پہنچا وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔

اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہاں میں اکیلا رہوں گا۔ ابا دکان پر جاتے ہیں۔ اماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہیں میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا۔ کس سے باتیں کیا کروں گا"

اختر نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔

"تم اچھے جو ہو جاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکول جایا کرنا"

"نہیں۔ نہیں"

منظور نے کمبل سے اپنا سدا مسکرانے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔ اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چمکارتا پچکارتا رہا آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدل لی۔

شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اس کی ریلیز کا آرڈر دیدیا ہے۔ وہ صبح جا سکتا ہے۔

منظور نے سنا تو بہت بہت خوش ہوا۔ اس نے اتنی باتیں کیں کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو۔ ہر اسٹوڈنٹ کو ہر جمعدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔

رات کو بھی وہ اختر سے دیر تک خوشی سے بھرپور ننھی ننھی معصوم باتیں کرتا رہا۔ آخر سو گیا۔ اختر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہوگا۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی دوا موجود نہیں جو اس پیارے بچے کو تندرست کر دے۔ اس نے اس کی صحت کے لئے صدق دل سے دعائیں مانگیں مگر اسے یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی۔ اس لئے کہ اس کا دل منظور کا سا پاک دل کیسے ہو سکتا تھا۔

منظور اور اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوتے اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ صبح وہ اس کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اس کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی السلام علیکم سننے سے پہلے ہی مر جاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کردہ تھی۔ وہ کس منہ سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے جائے گا۔

سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ نرسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی... چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس کے بجائے ایک بوڑھا ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لحظہ کے لئے اختر پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ ایک نرس پاس

سے گذر رہی تھی، ان سے اُس نے قریب قریب چلا کر پوچھا۔
"منظور کہاں ہے؟"
نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے افسوسناک لہجہ میں جواب دیا۔
"بیچارہ۔ صبح ساڑھے پانچ بجے مرگیا۔"

یہ سُن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا کیونکہ اس کی جگہ لینے والا مریض داخل کر لیا گیا تھا۔
(بشکریہ "فنکار" دہلی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۴ سے آگے)

پہلی یہ کہ رحمٰن شاد پھر ایک بار اصل بحث کی طرف توجہ دیں اور صحیح انداز میں سمجھیں، دوسری یہ کہ کوثر نیازی پر انور صدیقی کی تنقیص اگر صرف رحمٰن شاد کی ڈھارس بندھانے کے لئے ہے تو یہ انداز صالح نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مطالعہ خود کسی طرح کی مرعوبیت کی غمازی کرے۔ اگر ان باتوں میں آپ کوئی وزن محسوس کرتے ہیں تو ان کو رحمٰن شاد، انور صدیقی اور کوثر نیازی تک پہونچانے کا ذریعہ مہربانی فرما کر پیدا کر دیجئے۔

ادھر ایک عرصہ سے میں "مشیر" کے انداز ترتیب سے بے حد مایوس ہوتا جا رہا ہوں۔ اول تو اسلام پسند حلقہ کی طرف سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی توجہات ہٹتی جا رہی ہیں اور اگر کسی قدر باقی ہیں تو اس میں توجہ اور دلچسپی نہیں محسوس ہوتی ہے کیونکہ جو کچھ آپ اس حلقہ سے انتخاب کرتے ہیں وہ کافی پست ہوتا ہے۔ معیاری اور اعلےٰ چیزیں آپ نمعلوم کس مصلحت کے تحت نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس حلقہ کے باہر سے جو چیزیں آپ لیتے ہیں وہ بھی بے حد معمولی ہوتی ہیں بعض اوقات تو وہاں سے ایسی چیزیں اخذ کر لاتے ہیں جو مقصد کے لحاظ سے انتہائی مضرت رساں ہوتی ہیں اس کے ثبوت میں ہم "روح انتخاب نمبر" کا نام لے سکتے ہیں کہ جو ایک ایسا … ہے جس پر لیبل تو "روح افزا" کا ہے لیکن اس کے اندر کی سیال "روح فرسا" بھی نہیں! کاش آپ اس کے انتخاب میں خصوصی دلچسپی لے سکتے اور اب جب آپ نے اسے خاصا گراں کر دیا ہے ایسے گراں قدر بنانا آپ پر اور بھی لازمی ہوا۔

تعجب ہے کہ آپ کو جلیل صاحب کا ایسا جوہر قابل مل گیا ہے اور آپ اس سے (یعنی ان سے) مشیر کی ادارت کے سلسلہ میں کام لینے کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ نہیں کچھ تو کم از کم ان کے اپنے مخصوص انداز تحریر میں کوئی چیز ہر ماہ شریک اشاعت کیا کریں۔ ہم ایسے مشتاقان دید کے لئے یہی کسی حد تک آسودگی کا باعث ہوگا۔

امید ہے کہ آپ میری گزارشات پر توجہ فرمائیں گے۔ میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو بے دریغ تحریر فرمائیں۔ والسّلام: ابنِ فرید

"پارٹی کا وقت"

بیگم اپنی سالگرہ کی پارٹی کے لئے دعوتی رقعہ کا مضمون لکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دعوتی رقعہ پر وقت "آٹھ سے دس بجے تک" لکھنا چاہیئے۔ مگر اس کے خاوند نے اعتراض کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے مہمانوں کو ہدایت کر رہے ہیں کہ وہ دس بجے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ اس لئے طے ہوا کہ دعوتی رقعہ پر وقت صرف "آٹھ بجے" لکھنا چاہیئے۔ اور جب مہمان فارغ ہو جائیں چلے جائیں۔

مگر پارٹی کے روز رات کے بارہ بج گئے اور محفل ابھی تک گرم تھی۔ ایک بجے کے ذرا بعد پولیس آگئی۔ ہمسایوں میں سے کسی نے پولیس کو شکایت کی تھی کہ "شور و غل سے ان کی نیند حرام ہو رہی ہے۔ اس ہنگامے کو بند کرنا چاہیئے۔" میزبان بہت سٹ پٹایا۔ "میرے ہمسایوں میں سے کوئی ایسی شکایت نہیں کر سکتا۔ یہ غلط ہے۔" اس نے پولیس سارجنٹ سے کہا۔ مگر شکایت ہوئی تھی اس لئے پولیس سارجنٹ اس محفل کو اب ختم کرنے کے لئے مصر تھا۔ اور محفل ختم کرنی پڑی جب آخری مہمان بھی جا چکا تو بیگم نے اپنے خاوند سے حیرت سے پوچھا "کونسا ہمسایہ ہو سکتا ہے جس نے ہمارے خلاف رپورٹ کی ہے" اس کے تھکے ماندے خاوند نے نہایت پژمردگی سے کہا "میں نے خود کی تھی۔"

ظہیر کاشمیری •

اپنی تخریب کر رہے ہیں ہماری وحشت کا کیا ٹھکانہ
...نہ بجلی نہ ہو تو خود ہی اُجاڑ دیتے ہیں آشیانہ
...بت تلاش کرنے چلے تھے لیکن یہ کیفیت ہے
...جھکی مضمحل نظر سے جھلک رہا ہے غمِ زمانہ
...ہو یا آمدِ سحر ہو میری خلش مٹ سکے تو جانوں
...لبوں پر لرز رہا ہے ابھی وہی نالۂ شبانہ
...حسن قدیم اپنے پرانے تیور بدل چکا ہے
...ہی دل گرفتگی ہے، مگر وہی عشق کا فسانہ
...صحن گلستاں میں یہ حال ہوگا کلی کلی کا
...نے گلچیں سے بھول کر بات کی بہ اندازِ مجرمانہ
...ذوقِ تلاش ہر ایک راستے سے گذر چکا ہے
...ی تک جبین سجدہ سے دور ہے سنگِ آستانہ

(بشکریہ سویرا)

معین احسن جذبی •

جاگ اے نسیم! خندۂ گلشن قریب ہے
اٹھ اے شکستہ بال! نشیمن قریب ہے

تاریک رات اور بھی تاریک ہو گئی
اب آمد آمدِ مہِ روشن قریب ہے

لَو دے اٹھا ہے سازِ جفا کا ہر ایک تار
ہنگام رقصِ آتش و آہن قریب ہے

ایوان و پاسباں کے حجابات بے محل
اس دستِ شوق سے ترا دامن قریب ہے

ہر سانس انتشارِ فراواں سے بیقرار
اس کارواں سے کیا کوئی رہزن قریب ہے

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

(بشکریہ نقوش)

آغا ناصر

مہمان

کردار

بابا............ایک بوڑھا
نوری............اس کی بیٹی
بختاور............ایک اجنبی مہمان
اور گاؤں کے چند اور لوگ

پہلا سین

موسم سرما کی ایک طوفانی رات۔ آسمان پر سیاہ بادل گرج رہے ہیں۔ زخمی شیروں کی طرح بپھری ہوئی ہوائیں چنگھاڑتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ بجلی کی چمک میں آموں اور امرودوں کے باغات سے گھرا ہوا ایک گاؤں نظر آتا ہے۔ پہاڑوں کی تیز بارش اور اولوں سے ٹھٹھر کر ہر شئے سکڑی ہوئی خاموش کھڑی ہے بھیگے ہوئے کچے پکے مکانوں پر رات کی سیاہی بکھری ہوئی ہے باہر بارش ہے برف ہے ہوائیں ہیں طوفان ہیں اور گاؤں کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں سکون ہے گرمی ہے آرام ہے ———— اور آتشدان کے نزدیک بیٹھا ایک اسّی سالہ بوڑھا جانے کیا سوچ رہا ہے

بابا :- نوری ———— نوری بیٹی!

نوری :- (دور سے) آئی بابا ———— ! (داخل ہوتی ہے) آپ نے مجھے پکارا بابا؟

بابا :- ہاں بیٹی ———— آتشدان میں تھوڑی سی لکڑیاں اور ڈال دو ———— بارش کچھ ہلکی ہوئی؟

نوری :- نہیں تو ———— کچھ اور تیز ہوگئی ہے۔ اب تو اولے بھی پڑنے شروع ہوگئے۔

بابا :- خدا اپنا رحم کرے بادو باراں کا ایسا شدید طوفان گذشتہ بیس سال سے نہیں آیا۔

نوری :- کیا بیس سال پہلے کبھی ایسی بارش ہوئی تھی؟

بابا :- ہاں! آج سے پورے بیس سال پہلے ایسا ہی شدید [طوفان آیا تھا] اس نے کتنے ہی (بہت) گھروں کو اجاڑ دیا تھا ان دنوں [میں] فوج میں تھا۔ اسی موقعہ پر میں نے راجہ کے اکلوتے [بیٹے کی] جان بچائی تھی۔

نوری :- جان بچائی تھی؟ ———— کس طرح؟ ————

بابا :- راجکمار اپنے چند دوستوں کے ہمراہ شکار [کھیلنے] میں آیا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ لوٹتے [وقت طوفان] نے آگھیرا۔ آندھیوں سے بڑے بڑے قد آور درخت [ٹوٹ] کر گرنے لگے آسمان سے برف کے ٹکڑے پتھروں کی [طرح گرنے] شروع ہوگئے تھے اور اس وقت ہم راہ میں تھے [راجکمار] کے تمام احباب جدھر منہ اٹھا بھاگ گئے۔ اور وہ ایک [درخت] سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا۔ تب میں نے اسے اپنے گھوڑے پر [بٹھایا] اور بمشکل تمام محل تک پہنچا اس کے صلہ میں راجہ نے مجھے [دو] گلدان انعام میں دیئے تھے۔

نوری :- وہی قیمتی گلدان جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا [ان] انمول گلدانوں کی وجہ سے بستی کے لوگ ہمیں رشک [کی نگاہ سے] دیکھتے ہیں۔

بابا :- (ہنستا ہے) ہاں ———— کس قدر سردی [ہے] ذرا آگ اور دہکا دو۔

ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدھی رات گزر گئی ہو ایسی اندھیری اور خطرناک راتوں میں اگر کوئی...

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

شاید کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے (پھر آواز آتی ہے)

ـــــ لیکن کون ہو سکتا ہے اس وقت؟

ـــ کوئی ہمسایہ ہو۔ کوئی چیز مانگنے آیا ہو۔ میں دیکھتا ہوں

(ہمیں کی چپ ...... دروازے کے قریب آکر) کون ہے؟

ایک مسافر! ـــــــ

مسافر؟ ـــــ اتنی رات گئے؟

(کانپتے ہوئے) ہاں! .... میں راہ بھٹک گیا ہوں۔

خدا کے لئے دروازہ کھول دیجئے میں سردی سے مرجاؤں گا۔

(دروازہ کھولتا ہے) اچھا! آؤ۔ اندر آجاؤ۔

(ایک نوجوان اندر داخل ہوتا ہے جس کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور وہ سردی سے کانپ رہا ہے۔)

اوہ! تم تو بالکل بھیگے ہوئے ہو ـــــ لو یہ چادر لو تم پہلے کپڑے تبدیل کرلو پھر آگ کے پاس بیٹھ کر گرم ہو لینا ـــــ میں سامنے کے کمرے میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

شکریہ ...... !

(بابا کمرے میں داخل ہوتا ہے)

کون ہے بابا؟

ایک مسافر ہے۔ بیچارہ تاریکی میں راہ بھٹک گیا ہے۔

لیکن وہ ہے کون؟ کہاں سے آرہا ہے۔

میں نے یہ کچھ نہیں پوچھا۔ بیچارہ سردی سے بری طرح کانپ رہا ہے۔

لیکن بابا اس طرح کسی اجنبی کو گھر میں بلا لینا اچھا نہیں۔

بابا: ایسی باتیں نہ کرو بیٹا! ایسا نہ کہو وہ ہمارا مہمان ہے خدا جانے وہ کہاں سے آرہا ہے کیا معلوم بھوکا بھی ہو ـــــ جاؤ تم جاکر باورچی خانے میں کھانے پینے کا سامان تلاش کرو۔ جاؤ بیٹی مہمان کی تواضع کرنا ہمارا فرض ہے ـــــ جاؤ......

(نوری چلی جاتی ہے بختاور داخل ہوتا ہے)

بختاور: میں آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں ....؟

بابا: شکریہ؟ ـــــ اس میں شکریئے کی کوئی بات نہیں ہے یہاں آؤ۔ آگ کے قریب آکر بیٹھ جاؤ۔

بختاور: اگر آپ مجھ پر رحم کھاکر پناہ نہ دیتے تو صبح ہونے تک میں ضرور سردی میں اکڑ کر مرجاتا اور سورج کی روشنی میں لوگ میری نعش کسی برساتی نالے میں تیرتی ہوئی دیکھتے ـــــ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔

بابا: مجھے تکلف کی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں ـــــ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟

بختاور: جی نہیں ـــــ لیکن تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اس وقت کھانے کی بالکل خواہش نہیں ہے۔

بابا: کوئی تکلیف نہیں ـــــ میں ابھی کچھ منگاتا ہوں (آواز دیتا ہے) نوری! .... نوری بیٹی! دیکھو مہمان بھوکا ہے۔ تم نے اس کے کھانے کے لئے کچھ کیا۔

نوری: (داخل ہوتی ہے) ہاں، چند روٹیاں اور شوربہ اور تھوڑا سا خشک میوہ۔

بابا: اور تھوڑا سا قہوہ بھی۔ سردیوں میں قہوہ ضرور پینا چاہیئے۔

بختاور: لیکن آپ میری وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں کسی چیز کی تکلیف نہ کریں۔

بابا: میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ مجھے اس قسم کی گفتگو سے سخت نفرت ہے ـــــ کیا اگر تمہارے گھر کوئی مہمان آجائے تو تم اسے بلا کچھ کھلاتے پلاتے رخصت کردوگے۔

بختاور: میرے گھر؟

بابا: ہاں ـــــ کیوں، سوچنے کیا لگے؟ ـــــ تمہارا گھر کہاں ہے؟ ـــــــــ

بختاور: میرا گھر ـــــ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔

بابا: کوئی گھر نہیں ہے؟ ـــــ تمہارے ماں باپ؟ بیوی بچے بھائی بہن ـــــ کوئی نہیں ہے؟ ـــــــــ

بختاور : کوئی بھی نہیں ——— میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔

بابا : پھر تم کرتے کیا ہو ——— ؟

بختاور : کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی شہر شہر، گاؤں گاؤں، بستی بستی پھرتا رہتا ہوں۔

بابا : تو تم یہاں کس سلسلے میں آتے تھے؟

بختاور : بس اسی طرح چلتا پھرتا ادھر نکل آیا۔ شاید کوئی روزگار مل جائے

بابا : تم کوئی ہنر جانتے ہو؟

بختاور : نہیں۔ میں نے تمام عمر کوئی ہنر سیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ ناکام ہوا۔ پہلے میری ماں نے مجھے اسکول بھیجا تاکہ میں پڑھ لکھ سکوں لیکن وہاں میرا جی نہیں لگا۔ ماں کی موت کے بعد باپ نے زبردستی ایک چمڑے کے کارخانے میں کام سیکھنے کے لئے چھوڑا لیکن میں بھاگ آیا۔ پھر ایک درزی نے کئی مہینے مجھے کپڑے سینا سکھائے لیکن میں وہ بھی نہیں سیکھ سکا اور اب ایک نیا ہنر ———

(نوری کھانا لیکر داخل ہوتی ہے)

بابا : اچھا تم کھانا کھاؤ۔ جاؤ نوری جب قہوہ دم ہو جائے تو دے جانا ———

(نوری چلی جاتی ہے)

بختاور : یہ آپ کی لڑکی ہے؟

بابا : ہاں۔ اس کی ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔

بختاور : تو پھر آپ دونوں اس مکان میں تنہا رہتے ہیں؟

بابا : ہاں ——— تم نے ہاتھ کیوں روک لیا۔ کیا روٹی کی اور ضرورت ہے؟ ———

بختاور : ہاں ——— میں چار وقتوں سے بھوکا ہوں۔

بابا : تو پھر تم تکلف کیوں کر رہے تھے ——— ؟ ٹھہرو میں کچھ اور لے کر آتا ہوں۔

بابا باہر نکل جاتا ہے بختاور جلدی سے اٹھ کر کارنس پر رکھے ہوئے گلدان اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے اتنے میں بابا پھر داخل ہوتا ہے۔

بختاور : (گھبرا کر) وہ! آپ ——— ؟ روٹی لے آئے؟ ———

بابا : ہاں نوری لا رہی ہے۔ کیا تم گلدان دیکھنے لگے تھے؟ یہ انمول گلدان ہیں راجہ نے مجھے انعام دیئے تھے۔ (نوری داخل ہوتی ہے) ذرا مہمان کو گلدان تو اٹھا کر دکھاؤ نوری۔

نوری : (گلدان اٹھا کر لاتی ہے) یہ دیکھئے۔

بختاور : بہت خوب۔ واقعی انمول ہیں۔ کوئی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔

بابا : ہاں اس میں ایسے قیمتی جواہرات جڑے ہیں جن کی قیمت یا راجہ مہاراجہ ہی ادا کر سکتے ہیں۔

بختاور : لیکن .... لیکن ...... کیا یہ یونہی طرح کارنس پر رکھے رہتے ہیں؟

بابا : (ہنس کر) ...... حرج ہی کیا ہے۔ یہاں آ کون سکتا ہے

بختاور : پھر بھی اتنی قیمتی چیز کو اس طرح رکھنا کچھ ٹھیک نہیں۔

بابا : کوئی بات نہیں ——— کوئی خطرہ نہیں۔ لو نوری بیٹی انہیں کارنس پر رکھ دو۔

بختاور : آپ کو ضرور احتیاط برتنی چاہئے۔ آفتیں اور مصیبتیں ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔

بابا : لیکن مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ تم کھانا کھا چکے؟

بختاور : جی ——— آج ایک عرصے کے بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا ہے۔

بابا : بس اب تم سو جاؤ۔ میں اور نوری ساتھ والے کمرے میں سوتے ہیں اگر تمہیں پھر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں پکار لینا۔

بختاور : نہیں نہیں شکریہ۔ مجھے رات میں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ لوگ اطمینان سے سو جائیں۔ شب بخیر ———

نوری اور بوڑھا ساتھ والے کمرے میں آجاتے ہیں۔

نوری : بابا ——— !

بابا : کیا ہے ——— ؟

نوری : تم نے مسافر سے پوچھا نہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

بابا : وہ بڑا عجیب سا آدمی ہے کہتا ہے میں کچھ نہیں کرتا ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔

نوری : پھر وہ یہاں کیوں آیا ہے؟

: نوکری کی تلاش میں در بدر مارا مارا پھرتا ہے۔ گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ طوفان نے آگھیرا اور وہ راہ بھٹک کر ادھر آ نکلا۔

ی : تم نے غلطی کی بابا۔ وہ گلدان اسے نہیں دکھانے چاہیئے تھے اگر وہ چور ہوا تو ....؟

: خاموشی ......! ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، وہ ہمارا مہمان ہے۔

ی : لیکن مجھے ڈر لگتا ہے بابا۔ تم نے غور نہیں کیا وہ گلدانوں کو کس بری طرح گھور رہا تھا اور اس کی کمر میں ایک بڑا سا چاقو بھی بندھا ہوا ہے۔

: دربدر کی ٹھوکریں کھانے والے انسان اپنی حفاظت کے لئے ضرور ایسی چیز ساتھ رکھتے ہیں تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ وہ ہمارا کس قدر احسان مند ہے۔

ی : کچھ بھی ہو مجھے وہ اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا جب وہ بولتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو اس کی آنکھیں کس قدر خطرناک ہیں۔

: تو بڑی شکی ہے اب سو جا میں سمجھتا ہوں وہ جیسا بھی ہے مفلسی ہر آدمی کی شکل خطرناک بنا دیتی ہے غریب کو دنیا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے سن نوری! وہ بیچارہ مفلس ہے نا اسی لئے اس میں دنیا کا ہر عیب دکھائی دیتا ہے اگر اس کے پاس دولت ہوتی تو کوئی اس سے نفرت نہ کرتا کوئی اسے چور نہ کہتا ...... نوری سو گئی کیا اچھا .....!

دوسرا سین

طلوع صبح کا وقت رات بھر برسنے والے بادل لٹے ہوئے قافلوں کی طرح بے سر و سامان ہو کر واپس لوٹ رہے ہیں گاؤں کی ساکت فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے سونے والے بیدار ہو رہے ہیں گاؤں کے کنارے والے مکان میں نوری اور اس کا باپ ....

: نوری! ــــ اٹھ جا نوری بیٹا ــــ صبح ہو گئی۔

: آں ......! (انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھتی ہے)

: دیکھو آسمان بالکل صاف ہو گیا ہے۔ رات کتنی طوفانی اور ہیبت ناک تھی اور صبح کس قدر خوشگوار ہے۔

نوری : ہاں اب تو بادل کا ایک ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ آسمان بالکل نیلا ہو گیا ہے۔

بابا : ہاں ــ بالکل تیری آنکھوں کی طرح نیلا

نوری : مہمان جاگ گیا کیا؟

بابا : معلوم نہیں ــــ ابھی اسے سونے دو وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ تم جاکر ناشتہ تیار کرو اور ہاں سنو! اس کے غسل کے واسطے پانی بھی گرم کر دینا۔ (بابا صحن کی طرف چلا جاتا ہے)

نوری : (آہستہ سے) ناشتہ تیار کرو، پانی گرم کرو، وہ تھکا ہوا ہے اسے سونے دو۔ ہونہہ۔ تم بھی کتنے عجیب ہو۔ میرے بابا کس قدر رحمدل۔

بابا : (دور سے) نوری ــــ! (نوری: یہ دروازہ کھلا ہوا کیوں ہے)

نوری : (گھبرا کر) ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا ہے؟

بابا : ہاں۔ شاید رات جب مسافر آیا تو میں بند کرنا بھول گیا۔ تم کہاں جا رہی ہو؟ ارے اس کے کمرے میں نہ جاؤ۔ اسے سونے دو بیٹی۔ نوری۔

نوری : (کمرے میں سے) بابا...... بابا۔ مہمان چلا گیا ــــ مہمان بھاگ گیا بابا ــــ!

بابا : کیا ــــ چلا گیا؟

نوری : ہاں ــــ کس قدر بدتہذیب تھا وہ احسان فراموش بغیر ملے ہی چلا گیا۔

بابا : نہ نہ ایسے نہ کہو۔ وہ ہمارا بے حد شکر گزار تھا اسی لئے چلا گیا کہ کہیں ہم اس کے لئے کچھ اور نہ کریں۔

باہر سے ہلکے ہلکے شور کی آواز آتی ہے کوئی دروازہ پر دستک دیتا ہے۔

بابا : کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ چلو دیکھیں ذرا چل کر

نوری : چلئے ــــ نہ جانے کون ہے ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے لوگ ہیں۔

دروازے کے سامنے چند لوگ کسی کو پکڑے کھڑے ہیں۔

آواز ۱ :- وہ تو کہو کہ خیر ہی ہوئی کہ دیکھ لیا۔ ورنہ اس کے بھاگ جانے میں کیا شبہ تھا۔

آواز ۲ :- بیچارے کاکا تو عمر بھر روتے۔

آواز ۳ :- لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں تک اس کی پہنچ کیسے ہوئی۔ لو وہ کاکا آگئے۔

آواز ۱ :- مبارک ہو کاکا۔ بڑی قسمت والے ہو۔ ورنہ لٹ گئے ہوتے آج۔

بابا :- بات کیا ہے کیا کہہ رہے ہو تم لوگ؟ ——

نوری :- (تعجب سے) بابا —— وہ —— مہمان ....!

آواز ۲ :- (بختاور کی طرف اشارہ کرکے) یہ دیکھو کاکا چور پکڑا ہے۔

بابا و نوری :- (تعجب سے) چور!

آواز ۳ :- ہاں ہاں چور۔ آپ کے گلدان چرا کر لئے جا رہا تھا۔

نوری :- گلدان ..... ؟ .... بابا .... ؟

آواز ۱ :- وہ تو کہو کہ مجھے شک پڑ گیا۔ سویرے سویرے اس طرح ایک اجنبی کو دیکھ کر۔ ورنہ لے ہی گیا ہوتا۔

آواز ۲ :- چور! لٹیرا!

بابا : نہیں۔ تم سب غلطی پر ہو۔ یہ چور نہیں ہے۔

آواز ۱ :- چور نہیں ہے؟

بابا :- ہاں! میں نے گلدان اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے اسے چھوڑ دو۔

نوری :- بابا ....!

بابا :- تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ ....!

آواز ۳ :- چلو بھیا۔ ہم لوگوں نے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔

(سب چلے جاتے ہیں)

بختاور :- (بھرائی ہوئی آواز میں) مجھے معاف کر دو بابا۔ میں کس قدر ذلیل ہوں کتنا احسان فراموش ہوں آپ نے مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہ کر دیا۔؟

بابا :- اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم یہ نیا ہنر سیکھو!

نوری :- اور پھر تم ہمارے مہمان بھی ہو ——

بابا نوری کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور تینوں گھر میں داخل ہو جاتے ہیں +

(بشکریہ "الشجاع")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے :-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اگست ۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم: منیجر "مشیر" کراچی۔

۲۰۰۵	فرخندہ صاحبہ کراچی	۲۱۸۲	ایم اے چندریگر کراچی	۲۲۶۶	ظفر اقبال میاں چنوں	۲۳۷۷	ایس ایم اقبال حسین میمن سنگھ
۲۰۳۵	مرزا عبدالغفور مسرور	۲۱۸۳	شفیق احمد کوٹری	۲۳۶۹	ثناء اللہ گورائیہ	۲۳۷۹	نثار احمد خاں جورا
۲۰۳۶	چوہدری محمد اسماعیل خاں کراچی	۲۱۸۵	اشفاق حسین مشرف حسین	۲۳۷۰	عبدالقیوم چیہ کنڈہ	۲۳۸۰	بشیر احمد حکیم پور کھیری
۲۰۴۲	عارف سہارنی کوٹو تاررو	۲۱۸۸	دفتر جماعت اسلامی۔ ہوتی	۲۳۷۱	نذیر احمد قریشی ملتان	۲۳۸۱	بیگم امیر علی عبداللہ پور
۲۰۵۸	ضیاء محمد صاحب کنجاہ	۲۱۸۹	سردار غلام محمد خاں دہریک	۲۳۷۳	محمد سالم منڈی چشتیاں	۲۳۸۲	رابعہ جھنگ مگھیانہ
۲۰۹۴	نور محمد پاکپٹن	۲۱۹۲	فریح اللہ نارو وال	۲۳۷۴	افتخار احمد خاں رام پور	۲۳۸۳	ثریا جبیں جھنگ مگھیانہ
۲۱۲۴	اسماعیل نواب اینڈ سنس	۲۱۹۵	نثار احمد پاکپٹن	۲۳۷۵	فیض احمد فاروقی کراچی	۲۳۹۱	محمد صدیق ارشد
۲۱۷۹	فیض محمد صاحب احمد نگر	۲۲۰۰	محمد اسحاق منڈی بہاؤالدین	۲۳۷۶	بشیر احمد جھنگ	۲۴۸۴	شوکت علی خاں کوئل در

سلیم احمد •

سرت پسماندگاں کی یاد میں یوں کھو گئے
ل منزل کا رمنزل سے بھی غافل ہو گئے

کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل
ے ...ت کیا ترے ہنگامہ آرا سو گئے

فلے لٹتے بھی ہیں، مٹتے بھی ہیں، بڑھتے بھی ہیں
سرت ان پر ہے جو منزل پر پہنچ کر کھو گئے

بزمِ فطرت میں بھی کوئی غمگسارِ دل نہیں
داستانِ غم کے چھڑتے ہی ستارے سو گئے

سوز و سازِ عشق کو سمجھے کوئی اتنا نہیں
عشق کے احوال پر کچھ ہنس گئے کچھ رو گئے

ہم تو سمجھے تھے بہل جائیں گے باتوں میں سلیم
وہ تو اس کے ذکر سے کچھ اور چپ چپ ہو گئے

(بشکریہ نیا دور)

محسن بھوپالی

خودی کو بیچ کے آئے بڑا کمال کیا!
بہار مانگ کے لائے بڑا کمال کیا!

اسیرِ دامِ ہوس خونِ دل تو کیا دیتے
جلے چراغ بجھائے بڑا کمال کیا

ترس رہی ہے نظر سیرِ گل کو نکتہ ورو
چمن میں دام بچھائے بڑا کمال کیا

ملا عروج تو تمیزِ نیک و بد نہ رہی
خلا میں تیر چلائے بڑا کمال کیا

جنونِ شوق کی کم ظرف داد دے نہ سکے
خرد کے دام بچھائے بڑا کمال کیا

بلونت سنگھ

تعویذ

"چار نمبر صاحب دو روپے مانگتے ہیں"

بیرے کا مطلب یہ تھا کہ جو صاحب کمرہ نمبر ۴ میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ دو روپے طلب کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا کہ یہ شگوفہ کیسا؟ جو مسافر ہوٹل میں قیام پذیر ہوں اس سے ہم روپیہ وصول کرنے کے عوض الٹا ہمی کو اپنی گرہ سے روپے ادا کریں۔

میں نے بوٹوں کے تسمے کستے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

"وہ تار دینا چاہتے ہیں"

"کہاں؟"

"ہم کا جانی ———— حجور"

بیرے کے اس جواب سے جھنجھلاہٹ تو ہوئی۔ لیکن اس سے زیادہ بات چیت کرنی فضول تھی۔

"اچھا تم جاکر کہو کہ خود مالک آ رہے ہیں"

کچھ تو کام مندا ہو رہا تھا اور کچھ اس قسم کے مسافر پریشانی کا باعث ہوتے تھے لیکن ہوٹل کا بزنس ایسا کہ ہر قسم کے انسان سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔

نیچے پہنچ کر میں نے ملازم سے کہا۔ کہ "چار نمبر صاحب کو دفتر میں ہی بلا لاؤ۔ پھر میں نے منیجر کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔

یہ کس قسم کا مسافر ہے؟"

منیجر نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا "مسلمان ہے"

منیجر کا لب ولہجہ عجیب تھا۔ اس کا جواب بھی خلاف امید تھا قدرے تامل کے بعد اس نے کہنا شروع کیا "اجی بڑا رعب گانٹھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں بہت پرانا آنے والا ہوں۔ بڑی نکتہ چینی کرتا ہے اور اپنے آپ کو کسی راجہ صاحب کا ...... نہ جانے کیا بتاتا ہے"

میں نے اس کی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ ہوٹل میں اکثر رعب گانٹھنے والے حضرات آیا کرتے تھے۔ مجھے ان سے نپٹنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اسی اثنا میں حضرت موصوف آ گئے۔ ان کی صورت خلاف امید بالکل ندوی قسم کی دکھائی دی۔ پچاس برس کے قریب سن۔ ناٹا قد داڑھی مونچھ غائب۔ یہاں تک کہ ابرو کا بھی صفایا کر ڈالا تھا۔ اور ان پر یورپین لیڈیز کے مانند آئی برو (EYE BROW) پنسل سے خطوط کھینچ دیئے گئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل۔ پتلیاں رقصاں۔ بند گلا کوٹ پتلون نما پائجامہ صورت مضحکہ خیز۔ لیکن تیور سنجیدہ تھے۔

آتے ہی بھرپور آواز میں بولے "آداب عرض کرتا ہوں" میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ تشریف رکھیئے آپ نے سر تسلیم خم کیا اور پھر تشریف فرما ہو گئے۔

میں کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ وہ بول اٹھے۔

"مائیں (یعنی میں) ...... آپ کو پہچانتا ہوں۔ آپ ... آپ شاید مجھے نہیں پہچانتے۔ مائیں اکثر آپ کے یہاں قیام پذیر ہوتا ہوں۔ آپ کے منیجر بھی نے آتے ہیں ...... اتفاق کی بات مائیں جب کبھی آیا تو معلوم ہوا کہ حضور باہر تشریف لے گئے ہیں"

"جی ہاں بعض اوقات میں باہر بھی چلا جایا کرتا ہوں"

"زہے نصیب آج آپ کی زیارت حاصل ہو گئی۔ میرا نام شاہا ہے"

شاہا عجیب نام تھا شاید اس کے نام نے میں غلطی ہوئی ہے کچھ "آپ کا نام شاہ ہے"

"جی نہیں شاہ نہیں۔ شاہا۔ شاہ اور ہا۔ شاہا"

"اچھا تو شا...... ہا صاحب آپ نے مجھے دفرمایا تھا"

"جی جی جی ...... میں پانگرے سرکار نے نکم سے تعنو گیا تھا وہاں سے یہاں آیا ہوں۔ حضور پانگرے سرکار کو ایک باورچی"

"یہ بانگڑے صاحب کون ہیں؟"

"آپ بانگڑے صاحب کو نہیں جانتے؟ نہیں آپ نہیں جانتے بانگڑے لکشمن پور ریاست کے راجہ۔ اب تو دیسی راج میں ان کی ریاست ختم ہو گئی۔ ورنہ انگریز کے راج میں دُور دلایت تک ان کی دھوم تھی۔ ان کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب انہوں نے کئی قسم کے کارخانے اور ملیں جاری کر دی ہیں۔ جن کے ذریعے سے انہیں لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے ہر ماہ۔ ہیں تو ہندو لیکن تعصب چھو کر نہیں گیا۔ سنہ ۴۷ء میں فسادات ہوئے لیکن ہم ہمیشہ سرکار کے ساتھ رہے۔ کیا مجال جو بال بیکا ہوا ہو۔ بہت ہی سرکار صحیح معنی میں گریٹ ــــ GREAT میں"

یوپی میں سرچھوٹا بڑا زمیندار راجہ کہلاتا تھا۔ اس لئے مجھے ان سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے مطلب کی بات دریافت کی "تو آپ......"

"جی میں سرکار کا مصاحب ہوں۔"

اس پر میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اس کا لب و لہجہ یک گونہ ضرور تھا لیکن شخصیت ایسی نہیں تھی کہ...... یا پھر صورت سے راجہ صاحب کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں ان مصاحبین میں سے ہوں"

"آپ کا کام کیا ہوتا ہے؟"

"یہی سرکار کا دل بہلانا۔ چٹکلے سنانا۔ انہیں خوش رکھنا...... جی تو کا مطلوبہ بادری مجھے یہاں مل گیا تھا۔ میں نے روپے کے لئے ایک خط لکھا تھا لیکن روپیہ ابھی تک نہیں آیا...... اگر دو روپے دیجیئے تو ایک تار روانہ کر دوں۔"

اس قسم کے مسافر ہمیشہ مشکوک ہوا کرتے ہیں۔ میں سوچ میں تھا انہوں نے فوراً کہا "میں تار کا مضمون لکھے دیتا ہوں آپ ملازم سے تار دلوا دیں بس۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں ہے بانگڑے سرکار تار دیکھتے ہی روپیہ بھجوا دیں گے۔"

اس کے اس بیان سے سچائی کی بو آئی۔ میں نے سوچا دو روپے سے کیا ہوتا ہے۔ اتنا سا اعتبار کر لینے میں کیا حرج ہے۔

ملازم کے چلے جانے کے بعد شاہا صاحب نے گفتگو جاری رکھی۔

"سردار صاحب، آپ کو دیکھ کر مجھے ایک اور سردار صاحب یاد آ رہے ہیں"

میں چپ رہا لیکن شاہا صاحب جاری رہے۔

وہ بانگڑے سرکار کے دوست ہیں۔ وہ بھی کسی سکھ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ہی کا سا ڈیل ڈول۔ یہ بھرپور اور پُر رعب چہرہ مضبوط جسم آپ ہی کے ہم عمر۔ کیوں صاحب آپ کی عمر دریافت کر سکتا ہوں"

میں نے خشک لہجے میں جواب دیا "یہی پچاس سال کے لگ بھگ"

"تعجب تعجب! حالانکہ آپ کی اتنی عمر ظاہر نہیں ہوتی۔"

"اٹھائیس برس کا تو میرا لڑکا ہے۔"

"اچھا تو چھوٹے حضور کیا کرتے ہیں؟"

"وہ منڈی میں ہے اس سے چھوٹا جہاز رانی سیکھ رہا ہے۔ اور اس سے بھی چھوٹا ابھی پڑھتا ہے۔"

"خوب خوب۔ اللہ نے صاحبزادیاں کتنی عطا فرمائی ہیں؟"

"اس باب میں سخت بدنصیب واقع ہوا ہوں۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی بچپن میں مر گئی۔"

"اللہ کی دین ہے اللہ کے کام نیارے ہیں۔ جن سردار صاحب کا ذکر میں کر رہا ہوں ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی...... صاحب آپ ان کے ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ جناب وہ زمین پر کھڑے ہو کر شیر کا شکار کھیلتے ہیں۔ بانگڑے حضور ان سے کہا کرتے ہیں اے سردار صاحب آپ تو خود ہی شیر ہیں۔ ہا ہا ہا!"

دو دن گزر گئے۔ بانگڑے سرکار نے تار کا جواب تک نہ دیا۔ روپے بھیجنے تو رہے درکنار۔

میں شاہا کے کمرے کے آگے سے گزرا تو خیال آیا کہ اس سلسلے میں پوچھ گچھ کر لوں میں عموماً مسافروں کے کمروں میں جانے سے احتراز کرتا ہوں لیکن یہ معاملہ ذرا مشکوک تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے میں نے آواز دی۔

"شاہا صاحب"

اندر شاہا صاحب تہبند لہراتے دکھائی دیئے۔ مجھے دیکھتے ہی فرش پر بچھ گئے۔ باچھیں چر گئیں "آیئے آیئے تشریف رکھئے"

ادھر ادھر کی سرسری باتوں کے بعد میں نے کہا "آپ کا بل بڑھ

رہا ہی تار کا جواب بھی نہیں آیا۔"

"کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ہے سرکار شکار پر چلے گئے ہیں۔"

"اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ بہت دنوں تک نہیں آسکیں گے۔"

"جی نہیں، ایسی بات نہیں ہے کہ سرکار جنگلوں میں مارے مارے تھوڑے ہی پھرتے ہیں وہی راجاؤں والا حساب ہے جنگل میں کل انتظامات ہو جانے کے بعد حضور جاتے ہیں اور دو دن دھائیں دھائیں کر کے لوٹ آتے ہیں۔"

یہ گویا اشارہ اس امر کی طرف بھی تھا کہ میں شاہانہ طور طریقوں سے واقف نہیں ہوں۔ سچ مچ اس کا بات چیت کا انداز بڑا دلکش تھا آنکھوں اور ابروؤں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ ہنستے تو مضبوط پیلے دانت اور بدرنگ مسوڑے نمایاں ہو جاتے لیکن اس وقت میرا دھیان ان کی باتوں کی جانب نہیں تھا بلکہ اب میں ان کی کرسی کے پیچھے بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی عمر بمشکل بارہ برس کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس قدر سنجیدہ مانو ساٹھ برس کی بڑھیا ہو۔ اس کا رنگ ذرا کھلتا ہوا سانولا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور دادی کی جھلک ہونٹ ترشے ہوئے۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں۔ البتہ پرکشش ضرور تھی۔

میرے دریافت کرنے پر شاہا نے سر گھما کر بچی کی طرف دیکھا "میری بچی۔ بیٹا اٹھو سلام عرض کرو۔"

اس پر بچی اٹھ کر مودبانہ کھڑی ہوگئی اور اپنا دبلا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر شستہ لہجہ میں بولی "سلام عرض کرتی ہوں۔"

مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ سوچا باپ نے بچی کو اچھی تربیت دی ہے میں نے اس کے کمزور شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کھینچا اور اس کی پیشانی چوم کر بولا "تم تو بڑی پیاری بچی ہو۔" شاہ صاحب مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔

اس پر شاہا نے دعا مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی گھٹ سے اوپر کو چڑھ گئیں اور نصف حد تک غائب ہو گئیں۔ پھر اس نے بڑے درد ناک لہجے میں کہا "یا اللہ! یا رسول پاک تیرا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔"

شاہا اسی انداز میں بیٹھے کچھ دیر تک آسمان کی جانب تکتے رہے پھر انہوں نے پلکوں کو جلد جلد جھپکایا جیسے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "سردار صاحب، یہ بچی فرشتہ ہے فرشتہ۔"

میں نے ایک بار پھر بچی کے معصوم چہرے کا جائزہ لیا اور تہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک بے شک"

دن گزرتے گئے۔ شاہا کا بل بڑھتا جا رہا تھا میں اکثر ان کی بچی عائشہ سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت پیاری لگتی تھی میں شاہا سے کہا کرتا تھا "کاش میری بھی ایسی بچی ہوتی۔ شاہا باتوں کے بادشاہ تھے وہ صرف ہاں میں ہاں ملاتے بلکہ نوبت کہیں سے کہیں پہنچا دیتے یہاں تک کہ یہ یاد ہی نہ رہ جاتا کہ اصل بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔"

ایک روز مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے زور پر اظہار تاسف کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا "یہی وجہ ہے کہ دنیا ہے ۔ ۔ ۔ تے نئے بگڑ رہی ہے حالانکہ ہم حبیب اللہ کے پیاروں اور نبیوں کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کسی کو کیا کہوں۔ خود مسلمان وہ مسلمان نہیں رہے۔ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات ملاحظہ فرمائیے تو حیران و ششدر رہ جائیے۔ حضور کی زندگی مبارک کا ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کرتا ہوں حضور کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ایک خاص کوچے سے ہوتے ہوئے گھر لوٹ آتے تھے۔ وہاں ایک بدباطن خاتون رہتی تھی۔ وہ حضور کی تعلیمات کو نعوذ باللہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اور اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت ادھر سے گذرتے تو وہ خبیثہ مکان کی کھڑکی میں سے کوڑے کا بھرا ہوا ٹوکرا حضور پر دے مارتی۔ مصاحبین مارے غضب کے کانپنے لگتے لیکن آنحضرت ان کو روکتے اور کمال ضبط سے کام لیکر اپنے لبادے اور ریش شریف کو کوڑے کرکٹ سے پاک کرتے اور آگے بڑھ جاتے ایک روز ایسا ہوا کہ ان پر کوڑے کا ٹوکرا نہیں پھینکا گیا۔ آنحضرت کے قدم رک گئے اور انہوں نے مصاحبین میں سے ایک کو اشارہ کیا کہ معلوم کرو آج خاتون موصوفہ نے عنایت کیوں نہیں کی۔ مصاحب خبر لایا کہ آج اس خاتون کا انتقال ہو گیا ہے۔"

یہ کہکر شاہا نے پرآب آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آپ کو معلوم ہے اس پر آنحضرت نے کیا کہا؟ ——— آنحضرت بنفس نفیس تعزیت کے لئے مکان پر چڑھ گئے"

اس کے بعد شاہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

خود میری آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔

کیا آج کل کی دنیا میں کریکٹر کی ایسی اعلیٰ مثال ڈھونڈنے سے بھی مل سکتی ہے؟

عائشہ کی موجودگی اور شاہا سے اس قسم کی باتوں کا نتیجہ تھا کہ میں نے بل کی ادائیگی کے لئے سختی سے تقاضا نہیں کیا۔ یوں بھی مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہا محجوب ہو کر اظہار تاسف کرنے لگتا۔ نہ جانے سرکار خاموش کیوں ہیں۔ سرکار نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا ممکن ہے سرکار طویل دورے پر چلے گئے ہوں۔ سردار صاحب! سرکار نے بڑا اعلیٰ دماغ پایا ہے انہوں نے پہلے سے بھانپ لیا تھا کہ حکومت ہند ریاستوں کو ختم کر دے گی — چنانچہ انہوں نے ایسے کاروبار شروع کر دیے کہ ماہانہ لاکھوں کی آمدنی پیدا کر رہے ہیں"

غرض اسی طرح کیارہ دن بیت گئے

ایک روز دوپہر کے وقت میں ان کے کمرے کے آگے سے گزرا تو ان کا دروازہ نیم وا پایا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دستک دی "شاہا صاحب ہیں کیا؟

قدرے سکوت کے بعد عائشہ کی شیریں آواز سنائی دی " ابا باہر گئے ہیں"

میں نے اندر جھانک کر دیکھا کہ عائشہ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر دو زانو بیٹھی ہے۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

"کیا تم نماز بھی پڑھ لیتی ہو؟"

"جی نہیں" اس نے شرما کر جواب دیا۔ ابا نے سکھائی ہی نہیں۔ لیکن میں دو زانو ہو کر خدا سے دعا مانگ لیتی ہوں"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے عائشہ کو اپنے قریب بلایا اور پیار سے پوچھا "اچھا تو تمہیں نماز پڑھنے کا بہت شوق ہے"

جی" اس کی آواز بے حد شیریں اور لب و لہجہ بہت پیارا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس کے ٹھنڈے رخسار کو چوم لیا اور کہا " عائشہ تم ہماری بیٹی بن جاؤ"

"بہتر"

مجھے اس کا لفظ "بہتر" کہنے کا انداز بہت بھلا معلوم ہوا۔ پھر ہم تمہیں نماز پڑھنے کا طریقہ سکھانے کے لئے کسی اچھے مولوی صاحب کو بلا دیں گے"

"بہتر"

" بھئی یوں نہیں۔ ہمارا دل خوش کرنے کی باتیں نہ کرو۔ سچ کہو ہماری بیٹی ہو نا تم؟"

"جی بالکل" اس نے قطعاً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی شام شاہا صاحب مجھے الگ ایک گوشے میں لے گئے اور بولے "میں بے حد شرمندہ ہوں، نہ جانے اب تک روپے کیوں نہیں آئے۔ زیادہ عرصے تک یہاں رہنا میرے لئے دوبھر ہو رہا ہے۔ ایک تجویز عرض کروں؟"

یہ کہکر شاہا نے کمال پرخلوص انداز سے میری جانب دیکھا میں سمجھ گیا کہ اب چڑیا پھر سے اڑنا چاہتی ہے۔ شاہا صاحب بولے۔

"آپ اجازت دیں تو میں لوٹ جاؤں۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کے روپے بھجوا دوں گا"

میں سوچ میں ڈوب گیا ایسے نازک موقعہ پر مجھے کیا کرنا چاہئے قانون کا سہارا لینا بیکار تھا۔ نہ شاہا صاحب کے پاس قیمتی سامان ہی تھا وہ پھر بولے۔

"سردار صاحب۔ ایک زحمت اور دوں گا۔ ریلوے کا کرایہ ادا کرنا ہو گا"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر کمال خلوص سے مجھ سے نظریں ملائیں۔

"مانتا ہوں درحقیقت بہت شرمندہ ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ میرا اعتبار کر سکتے ہیں"

تجربہ یہی کہتا ہے کہ ایسے موقعہ پر ایک دمڑی تک وصول نہیں ہو سکتی مجھے ننانوے فیصدی یقین تھا کہ اب یہ روپے مجھے نہیں مل سکیں گے

لیکن بزنس جو ہی تو ہے۔

سردار صاحب! میری ننھی بچی کا ہی خیال کیجئے۔"

میں رضامند ہو گیا۔

اس پر شاہ نے جیب میں سے سلولائیڈ کی بنی ہوئی پیلے رنگ کی ایک ڈبیہ نکالی اور پھر میری جانب پر آب آنکھوں سے دیکھ کر اسے آگے بڑھایا۔ "لیجئے درویش کی نشانی اس میں ایک تعویذ ہے اسے سنبھال کر رکھیے۔ اللہ بہت دیگا۔"

یہ سن کر میں رکا۔ سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ محض "درویش کی نشانی" میرے پاس رہ جائے اور درویش کا کچھ پتہ ہی نہ چلے۔ چنانچہ میں نے ڈبیا کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھئے شاہ صاحب! بزنس بزنس ہی ہے۔ تعویذ رہنے دیجئے میں بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ جاتے ہی میرا روپیہ مجھکو روانہ کر دیجئے گا۔"

"انشاءاللہ! انشاءاللہ! آپ کا روپیہ فوراً روانہ کر دینا تو میرا فرض ہے اور آپ دیکھئے گا کہ میں اپنا فرض کس طرح پورا کرتا ہوں۔ رہا یہ تعویذ تو اسے محض درویش کی نشانی سمجھ کر قبول فرمالیجئے۔ آپ اس کی تاثیر دیکھکر حیران رہ جایئے گا۔"

میں اس فضول حرکت پر ہچکچا رہا تھا۔ لیکن شاہ نے بصد اصرار ڈبیا میرے ہاتھ میں تھما دی۔

اس رات شاہ صاحب نے مبلغ بیس روپے نقد مجھ سے لئے اور بل چکانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

دن گزرتے گئے۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ شاہ صاحب تو گویا ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

البتہ ایک بات بہت عجیب معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب سے وہ تعویذ ہمارے قبضہ میں آیا تھا آمدنی سچ مچ بڑھ گئی تھی دکانداری چمک اٹھی تھی! کہتی تھی کہ یہ اسی تعویذ کی برکت ہے لیکن میں اسے محض اتفاقی امر سمجھتا۔ شاہ ایسے آدمی میں یہ کرامت کہاں سے آسکتی تھی۔

شاہ کے دیتے ہوئے پتے پر چند خطوط لکھے گئے۔ جواب ندارد۔ بچپن روپے کا معاملہ تھا سوچا قانونی چارہ جوئی کی جائے اور نہیں صاحب کو پریشان ہی کیا جائے۔

وکیل سے مشورہ لینے سے پہلے میں بیوی کے پاس پہنچا۔

"وہ تعویذ لائیے ذرا!"

بیوی نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے تعویذ ڈبیا بڑھا دی اور کہا۔ "دیکھتے کیا ہیں اس میں آیت لکھی ہوگی کوئی!"

میں نے کچھ کہے بغیر کاغذ کھولا۔ یہاں تک کہ فل اسکیپ کاغذ میری نظروں کے سامنے تھا جس کے بیچوں بیچ لکھا تھا:۔

"کہیے کیسا بنایا ——— آپ کا شاہ!"

یہ بات کوئی غیر متوقع نہیں تھی۔ بیوی کا خلوص اور تعویذ کی حقیقت پر میں ایک فلک شگاف قہقہہ لگانے ہی کو تھا کہ کاغذ کے ایک کونے میں ٹیڑھی میڑھی عبارت دکھائی دی۔

"میں اپنے خدا سے ہر روز آپ کے حق میں دعا مانگا کروں گی عائشہ"

میرا قہقہہ حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے قانونی چارہ جوئی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے تعویذ بیوی کی جانب بڑھایا تو وہ بولی "کیوں آیت ہی لکھی ہے نا؟"

"بیشک!" میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

(بشکریہ "نورنگ")

"معذرت"

ایک رات ایک پولیس سٹیشن پر ٹیلیفون آیا۔ کوئی شخص نہایت گھبراہٹ سے کہہ رہا تھا: "میری موٹر کار کا اسٹیرنگ وہیل۔ بریک پیڈل کلچ ہینڈل ایکسلیٹر اور ڈیش بورڈ سب چوری ہو گئے ہیں۔" ڈیوٹی سارجنٹ نے اس کا پتہ نوٹ کر لیا اور کہا۔ "میں ابھی آکر تحقیقات کرتا ہوں۔"

سارجنٹ اپنی سائیکل سنبھال باہر نکل ہی رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ وہی آواز ہچکچا کر کہہ رہی تھی۔ "معاف کرنا میں غلطی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔"

گوپال متل •

تلنگانہ

(۲۳ سابق کمیونسٹوں کے بیان سے متاثر ہو کر)

انظر تو ملاؤ عظیم فنکارو!"
زعم خویش عوامی ادیب تھے تم لوگ
دیکھ لو کہ دہکتا ہوا جہنم ہے
انقلاب کے جیسے نقیب تھے تم لوگ

جس انقلاب کو کہتے تھے تم پیمبر امن
اُس انقلاب نے فتنے جگائے ہیں کیا کیا
یہ جن عوام کے حق میں تھا آیۂ رحمت
انہی عوام کو چرکے لگائے ہیں کیا کیا

ان جاؤ اگر صاحبِ ضمیر ہو تم —!
اک زیبِ نظر کا شکار تھے تم لوگ
نہیں تو زمانہ پکار اٹھے گا!
بدحال تھے، فتنہ شعار تھے تم لوگ

(بشکریہ تحریک)

جگن ناتھ آزاد •

○

کیا تمنائے دلِ خاک ہے خاموش رہو
آج ماحول خطرناک ہے خاموش رہو

دردِ سینے کا سبب اس کا ہی یا جوشِ بہار
کس لئے سینۂ گل چاک ہے خاموش رہو

رازدارو! یہ کہیں راز نہ رسوا ہو جائے
کس لئے دل مراغم ناک ہے خاموش رہو

نطقِ بے باک زمانے میں بڑی شے ہے مگر
وقت کچھ اور بھی بے باک ہے خاموش رہو

عنبر و عود کا ہر سمت دھواں ہے ورنہ
یہ فضا آج بھی ناپاک ہے خاموش رہو!

(ماحول)

ابوالخطیب

یہ کون جاگا؟

(۴) (مسلسل ناول)

کالج میں جانا اس نے پھر بند کر دیا اب وہ اکثر تنہائی میں اپنا وقت گزارتا اور اب وہ ہر اس شخص کو دیکھ کر پھڑک اٹھتا جسے ٹھاٹ باٹ میں دیکھتا۔ اس میں چڑچڑاپن بھی پیدا ہوگیا اور قوت برداشت بھی کمزور پڑگئی کبھی کبھار کوئی پہلا بے تکلف ملاقاتی اسے مل جاتا اور مذاق میں رنڈی والا کہہ دیتا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا اور اس پر وہ باز کی طرح جھپٹتا خود دبلا پتلا تھا بدن میں جان زور آزمائی کے لئے نہ تھی اس لئے مخاطب کو تکلیف دینے کے لئے طرح طرح کی اذیت ناک باتیں کرتا اور جب اس کے مخاطب کے ماتھے پر ان باتوں کی وجہ سے کچھ شکنیں پڑجاتیں تو اس کو اطمینان ملتا اور وہ اپنے دل ہی دل میں کہتا کہ جس آگ میں میں جل رہا ہوں اب یہ بھی اسی آگ میں جل رہا ہے۔

تھوڑے دنوں کے بعد تنہائی سے بھی اس کی طبیعت گھبرانے لگی تو وہ مطالعے کی طرف پھر متوجہ ہوا اور کثرت سے ایسے لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھنے لگا جنہوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے تھے اور اب ان کتابوں سے جی اکتا جاتا تو نفسیات پر کتابیں شروع کر دیتا۔

اس مرتبہ طرح طرح کے مطالعے نے اس میں پھر انسان کے بجائے انسانی تخلیقات سے دلچسپی پیدا کر دی تھی اس لئے اب وہ ان تخلیقات کے مشاہدے کے لئے ادھر ادھر گھومتا پھرا کرتا، اس کے بعد پھر تنہائی۔

اس تنہائی میں انسانوں کا سلوک اسے پھر یاد آجاتا۔ تو اسکا جذبہ انتقام ابھر آتا۔ اس انتقامی آئینے میں ہر انسان اسے کوئی نہ کوئی جرم کرتا نظر آتا تو اسے سکون ملتا۔ اور وہ پھر اپنے زخم کھاتے ہوئے دل سے کہتا۔ ذلیل! میں نہیں بلکہ یہ ہیں جو عجیب الطرفین ہو کر بھی آپس میں خلوص اور محبت سے اپنے معاملات کرتے ہیں۔ ان تصوری لمحات میں اسے بڑا مزا آتا۔ اس لئے اپنے تصور کی دنیا کے لئے وہ پھر سماجی زندگی میں آیا تاکہ یہاں سے مزید برے انسانوں کے کردار وہ اپنے تصور لے جا کر ان کے جرائم کا مطالعہ کرے اور خود کو مطمئن کرے۔

اس ذوق و طلب نے اسے ایک ایسا حلقہ مہیا کر دیا جو خود سماج سے فرار حاصل کر کے اپنی صحبتوں میں انسان اور سماج کے بخئے ادھیڑتے اور قہقہے لگاتے۔ اکمل بھی ان لوگوں میں بیٹھ کر انسانی جرائم کی داستان سناتا تو وہ سب ایک آواز ہو کر کہتے نیکی اور شرافت سب ڈھونگ ہے انسان فطری طور پر ایک کمین اور خونخوار جانور ہے اگر اس دنیا میں عیش آرام سے زندگی گزارنا چاہتے ہو تو ہر طریقے سے طاقت اور دولت حاصل کرو۔ اکمل یہ بات سنتا تو اس میں کڑھن پیدا ہوتی اور اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ ان لوگوں کو ایسی باتیں کرنے سے منع کر دے۔ لیکن ایسا کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی اور وہ اپنے اندر ایسی باتیں سننے سے ہر بیزاری ابھرتی محسوس کرتا اور اس کے اندر ایک اکتاہٹ پیدا ہو جاتی تو وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس منگا کر پیتا اور اپنی توجہ ضمیر سے ہٹا کر کسی اور طرف کر لیتا۔

طرح طرح کی بے میل کتابیں پڑھ کر اس نے خود ایک نفسیاتی تجزیہ تخلیق کیا اس کے ملنے والوں کو اس کا علم ہوا تو اس کے گرد وہ پھر جمع ہوگئے اپنی اپنی مشکلات اور ذہنی الجھنیں اس کے سامنے رکھتے وہ سب کا تجزیہ کرتا تو وہ سب کو بتاتا اور اس کے ساتھ یہ بھی مشورہ دیتا کہ اپنے سماجی تعلقات کی بنیاد خلوص و محبت پر رکھو تمہاری ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

مختصر یوں سمجھئے کہ نفسیات کے مطالعے نے اس کے شعور کو تو بہت سی پیچیدگیوں میں تو ڈال دیا تھا لیکن یہ پیچیدگیاں اس کی فطرت کی بگاڑ کو مسخ نہ کر سکیں وہ برابر ہر صورت میں مساویانہ سلوک کا مطالبہ کرتی رہی

اکمل شعوری طور پر اپنے نفسیاتی تجزیئے میں موقعہ محل کا کوئی خیال ر رکھتا کیونکہ اس طرح اپنے ملنے والوں کو وہ ذلیل ثابت کرکے انہیں احساس الت میں مبتلا کرکے اپنے نفس کو مطمئن کیا کرتا تھا لیکن دوسری طرف اس کے س عمل سے لوگ بھاگنے لگے اس سے ملنے ہی سے کتراتے تو وہ خوشی میں مسکراتا اور سوچتا رہتا اس طرح زندگی گذارتے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا یہ اذیت پسندی فوری طور پر تو اسے خوش کر دیتی لیکن انسانوں سے الگ ہو کر جب وہ لوگوں کے مایوس چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتا تو اس وقت اسے اپنی حالت یاد آجاتی تو اسی لمحے اس میں ردعمل کے طور پر اس اذیت پسندی سے نفرت ہونے لگتی اپنے اندر وہ اس فعل سے کراہت اور بے چینی کی ملی جلی کیفیت محسوس کرتا اور دیر تک یہ کیفیت جب اس پر چھاتی تو وہ اس ملامت سے متاثر ہو کر اپنے دل میں ارادہ کر لیتا۔ کہ اب وہ انسانوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک آئندہ نہ کریگا اس کے بعد اس میں پھر پیار و محبت کے جذبات امڈ آتے۔ تو وہ جلدی سے اپنے گھر جاتا اور اپنی ماں اور بہنوں سے پیار و محبت کی باتیں کرکے اپنے ضمیر کو تسکین دیتا اس طرح اس کے اندر کی آگ دب جاتی۔

نفسیاتی تجزیئے سے بھی اب اس کی طبیعت اکتانے لگی اور اب دھیرے دھیرے اس میں اذیت پسندی کا جذبہ کمزور پڑنے لگا اور وہ لوگوں سے محبت اور احترام سے ملتا لیکن سوسائٹی کے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی جب وہ اسے دکھ پہنچاتی تو وہ پھر وہاں سے بھاگتا اور تنہائی میں سر جھکا کر اپنے ضمیر سے پوچھتا "بتا اب میں کیا کروں"۔

اکمل کو اس کا جواب کون دیتا۔ مطالعہ تو اس کا ایک معمول بن ہی گیا تھا گھر کے علاوہ شہر کی لائبریری میں وہ پہونچ جاتا اور گھنٹوں وہاں پڑھا کرتا ایک دن ابراہیم لنکن کی سوانح عمری کی اسے ضرورت تھی لائبریری پہنچا معلوم ہوا کہ کتاب نہیں ہے اور وہ ——— الماری کے پاس کھڑا ہو کر کتابوں کو اٹھا اٹھا کر الٹتا پلٹتا رہا۔ ہر کتاب کے دو چار صفحوں پر نظر ڈالتا اور رکھ دیتا اسی الٹ پلٹ میں صحابہ رسولؐ کے حالات پر ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی اسے کھولا صفحے اس کے بھی الٹے پلٹے طبیعت لگی تو وہیں کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور اسے پڑھنے لگا۔

یہ کتاب کیا تھی ایک دنیا تھی جس میں رہنے بسنے والے بڑے اطمینان سکون اور مستعدی سے اپنے اپنے فرائض انجام دیکر نہایت درجہ شریفانہ زندگی گذار رہے تھے ان کی سادہ زندگی میں خلوص و محبت ایثار اور وفا جگنوؤں کی طرح اسے گردش کرتے نظر آتے وہ بڑے غور سے ان کے سماجی تعلقات کو دیکھتا اور پرکھتا اس زندگی کو دیکھنے کے شوق میں وہ صفحے پر صفحے الٹ رہا تھا اور یہ دنیا اس وقت اسے ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ کسی ریل کے ڈبے میں بیٹھا اسلام کے عہد زریں سے گذر رہا ہو۔ عدالت کے معاملات، تجارت، بوڑھے بچوں اور جوانوں کے عزائم ہرے بھرے نخلستان۔ سرشاری میں ڈوبے حدی خواں گاتے اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے جا رہے تھے اسی جائزے میں جنگ کا میدان بھی اسے ملا۔ جہاں تین زخمی پڑے کراہ رہے تھے پیاس سے ان کے حلق خشک تھے اور وہ پانی طلب کر رہے تھے ایک شخص پانی لے کر آتا ہے اور زخمی کو پیش کرتا ہے تو اسے دوسرے بھائی کی آواز آتی ہے تو وہ کہتا ہے پہلے پانی اسے پلاؤ وہ شخص پانی لے کر دوسرے کے پاس جاتا ہے تو وہ تیسرے کی آواز سنتا ہے وہ کہتا ہے کہ تیسرے کو پلاؤ وہ پانی لے کر تیسرے کے پاس پہنچتا ہے لیکن وہ دم توڑ دیتا ہے۔ یہ واقعہ ایک سینما کے فلم کی طرح اس کے ذہن سے گذر رہا تھا اور مطالعے کے انہماک میں ڈوب کر وہ خود اس میدان جنگ میں پہونچ گیا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس نے دم توڑ دیا تو اسے ایک چوٹ لگی تو لگے زخمی کی حالت معلوم کرنے کے لئے اس نے دوسری سطر پڑھی کہ دیکھیں اس کا کیا ہوا تو اگلی سطر میں اس نے اسے بھی ابدی نیند سوتا پایا وہ مایوس ہو گیا۔ اور بڑی بے دلی سے اگلی سطریں پڑھنے لگا کہ دیکھو تیسرے کا کیا ہوا لیکن اس پانی پلانے والے کے واپس ہونے سے پیشتر ہی تیسرا بھی دم توڑ چکا تھا۔ تینوں کو اس حالت میں دم توڑتا دیکھکر اس کا دل مجروح ہو گیا اور اگلے صفحات کو پڑھنے کو اس کا جی نہیں چاہا کتاب بند کرکے وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسلام نے ایک معمولی آدمی کو اس بلندی پر پہونچا دیا کہ نزع کی حالت میں بھی اصول و محبت سے باز نہ آیا۔ اتنا گہرا رنگ خود غرضی نے ذرا بھی سر نہ نکالا کتاب کو پڑھنے کی اس میں پھر خواہش پیدا ہوئی اس نے مطالعہ شروع کیا۔ کتاب کی اگلی سطور اسے وقت کے خلیفہ کی زندگی پیش کر رہی تھیں خلیفہ ایک معمولی لباس میں مسند خلافت پر بیٹھا بیت المال کے حساب کی جانچ کر رہا تھا اس کے پاس اس تاریکی میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا جس کے اجالے میں وہ حساب کتاب کر رہا تھا۔ لیکا یک ان کی بیوی آتی ہے کوئی بات کرتی ہے

جلیل فاروقی

خاندان

ہمارے وطن کے لوگوں نے اپنا نظریہ زندگی بدل لیا ہے۔ آج کے لوگ وہ نہیں جو ہم سے پہلے تھے۔ جو باتیں ہماری نظر میں اخلاق تھیں آج وہ عین بداخلاقی سمجھی جاتی ہیں۔ آج ہم اپنے بزرگوں کے رکھ رکھاؤ۔ وضع قطع۔ کھانا پینا ہر چیز پر معترض ہیں۔ اور باتوں کو تو چھوڑیئے اس لئے کہ وہ زیر بحث مضمون سے دور لیجانے کی مترادف ہونگی۔ میری خواہش ہے کہ آپ کے سامنے خاندان کی موجودہ ہیئت پر روشنی ڈالی جائے۔ اور اس امر پر غور کیا جائے کہ موجودہ شکل ہمارے لئے اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے۔ اجمالی طور سے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ہر خاندان میں ایک عام بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس وقت خاندان کی شکل نہ تو مشترکہ خاندان جیسی ہے اور نہ انفرادی خاندان جیسی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصور کی، پختہ زنارکی جس نے خاندان کو نہ مٹنے والی صلاحیت بخشی تھی۔ انقلابات زمانہ کی نظر ہو گئی۔ آج ہر خاندان میں ایک بے چینی ہے۔ ہر فرد دوسرے کا شاکی ہے۔ ایک کہتا ہے کچھ اور دوسرا کرتا ہے کچھ۔

معاشرہ میں خاندان کی اہمیت سے کوئی منکر نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں خاندان کے کام دوسری جماعتوں اور انجمنوں نے لے لئے ہیں وہاں بھی اس کی حیثیت نمایاں ہے۔ کم از کم وہاں بھی خاندان کے بنیادی کام مثلاً بقائے نسل کا انتظام۔ خواہش جنسی کی تکمیل اور بہترین گھریلو ماحول کا بہم پہنچانا اب تک کے خاندان کے اہم کام سمجھے جاتے ہیں۔ خاندان قوم کے لئے آغوش مادر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جب خاندان مادرانہ فرائض سے نابلد ہو تو اس وقت نتیجہ ظاہر ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے اسے اس سلسلہ میں اہم قدم اٹھانے ہونگے۔ ایک جامع تصور پیش کرنا ہوگا۔ آخر اس نئی قوم کو بے نتھے بیل کی طرح تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ انیسوی صدی تک ہمارے خاندان کی ایک مستقل حیثیت تھی۔ مرد ایک اہم حیثیت کا مالک تھا۔ خاندان کا حاکم اعلےٰ اور ماں اس کی محکوم۔ لوگ شاید ایک حد تک مفکر روشیو کے نظریہ کے قائل تھے۔ کہ عورتیں دنیا میں مردوں کو کہلانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ ان کا کام بچے پیدا کرنا تاکہ بقائے ہو سکے اور گھر کی گرہستی میں ایک اہم حصہ لینا تھا۔ تاکہ وہ اپنے شو کو راضی رکھ سکیں۔ یہاں پر واضح کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندان کی شکل اس سے مختلف ہے ہندو ... نسلی رنگ سے ہند مسلمانوں کے نظریہ خاندان پر گہرا اثر چھوڑا۔ نتیجہ کے طور پر خاندان عین اسلامی نہیں رہ سکی) جب ایک چیز قسمت کے نام سے موسو جانے تو ظاہر ہے کہ کسی قسم کی بے چینی کا ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ انگر کے آنے سے قبل یہاں کا ہر خاندان نہایت اطمینان کی زندگی بسر کر تھا۔ آج کی طرح بات بات میں نزاعی مسئلے پیدا نہیں ہوتے تھے۔ وجہ کہ دونوں اپنی اپنی حدیں جانتے تھے۔ لیکن انگریزوں کا آنا غضب ہو اٹھارویں صدی کے بعد سے ان کے یہاں خاندان کا ڈھانچہ دوسری طر کا بن گیا تھا۔ وہ اسی تصور کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ ان کے تصور کے مطابق میاں بیوی کا درجہ برابر ہے۔ عورتیں بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں اور نہ گھر کی بھٹی میں جھونکنے کا ایندھن بلکہ ان میں ہر طرح کی اہلیت ہے کہ وہ مردوں کے دوش بدوش چل سکیں وہ اپنی صلاحیتیں گھر ہی میں کیوں محدود رکھیں۔ وہ کیوں نہ ملکی و ملی مسائل میں حصہ لیں یہ تصور گھر کی چار دیواری میں بھی پہنچا کسی کو بات اچھی لگی اور کسی کو بری جوان طبقہ تو ہر نئی بات تحریک پر لبیک۔ کہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اپنے دل کے ارمان اپنے خاندان کے بزرگوں کے سامنے کیسے پورے کئے جائیں مگر حسن اتفاق بھارت اور پاکستان کا عالم وجود میں آنا ان لوگوں کے لئے رحمت بن گیا۔ بزرگ تو اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیوں کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں

سے تھے جو اس قید و بند کی زندگی سے عاجز آچکے تھے۔ چنانچہ اپنی رزوں کی تکمیل کے لئے اپنے بزرگوں کے وطن کو چھوڑ آئے۔ اب ڈر کا ہے امن ہائی کرد۔ کون روکے گا۔ اور کون دیکھے گا۔ جذبات کی شدت تھی۔ لوئی ٹھوس لائحہ عمل تجویز نہیں کرسکے چنانچہ بھٹکنے لگے۔ جو رنگ جس کی سمجھ ں آیا اختیار کرلیا۔ پاکستان کے کسی شہر کی سڑک سے گذر جائیے۔ آپ نے بات دیکھی ہوگی۔ کہ موٹر یا رکشے میں ایک محترمہ تو برقعہ میں تشریف رہی ہیں تو دوسری محترمہ دوپٹہ سے بھی بے نیاز ہیں۔ گالوں پر سرخی اور ڈر کی تہ جمی ہے۔ دعوت نظارہ دی جارہی ہے اور کچھ محترمائیں۔ ع۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کہ مصداق برقعہ تو اوڑھتیں یں لیکن نقاب کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ شو پنگ کرنے تشریف ئی ہیں آپ نے غور کیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان میں بہت سی وہ دیویاں یں جن کے لئے ریل تک بالی جاتی تھی۔ دونوں طرف سے چادریں تانی اتی تھیں اور کبھار منہ پھیر لیتے تھے۔ صرف ان محترماؤں پر ہی عتاب یوں نازل ہو کسی سڑک پر "آوارہ" اسٹائل کے مسٹر پر نظر کیجئے اور دوسرے دنے میں ایک شیر دانی باز کو بھی دیکھئے۔ یہ سب شکلیں دیکھ کر آپ کو یقین وجلا ہوگا کہ آپس میں کسی قسم کا بھی اتفاق نہیں پایا جاتا۔ ہر ایک کے مزاج ں بڑا تضاد ہے۔ یہ کام تو عمرانیات کے ماہروں کا ہے کہ وہ اس مسئلہ غور کریں۔ اور بتائیں کہ پاکستان میں خاندان کی کیا شکل ہونی چاہیئے۔ اور نظاروں کو روکنے کے لئے مؤثر قدم اٹھائیں۔ زیر بحث مضمون میں میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ہر خاندان میں جو تضاد پیدا ہوگیا ہے اس پر روشنی ڈالدی جائے۔ روزآنہ اخباروں میں اغوا۔ زنا۔ اور قتل کے واقعات پڑھتے ہونگے آپ ابھی اندازہ کرچکے ہونگے کہ یہ واقعات اونچے طبقہ سے لے کر نیچے طبقہ تک ہو رہے ہیں۔

غور کیجئے ساری بات سمجھ میں آجائے گی اور آپ میری طرح یہ ننے پر مجبور ہونگے کہ جو طریقہ پہلے رائج تھا اس کے درہم برہم جانے کی وجہ سے یہ عام بے چینی پیدا ہوگئی ہے میں یہ نہیں کہ رہا وں کہ پہلے کا نظام خاندان اچھا تھا اور اس کو اپنایا جائے بلکہ میرا طلب یہ ہے۔ کہ ہر وہ طریقہ جو پہلے سے رائج چلا آتا ہے۔ اس کو لوگ استعمال کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتے چونکہ لوگ عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے بے چینی کا گذر نہیں ہوتا اور اس کی جگہ لینے کے لئے تاوقتیکہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ صالح نظام نہیں پیش کیا جائے حالت بجائے سدھرنے کے اور خراب ہوگی۔ انقلاب مصر کی مثال لیجئے فاروق کو ہٹا دیا گیا۔ انقلابی حکومت برسر اقتدار آئی چونکہ ان کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام نہیں تھا اس لئے عوام کو شاہ فاروق کے دور کے برابر بھی سکون نہیں دے سکے ہمارے ہاں خاندان پر یہی قسم کی مصیبت آئی ہماری اولعزمی نے ہم کو مجبور کیا کہ پچھلے طریقہ کو چھوڑ دیں اور خاندان کے اس نقشہ کو مٹا دیں جسے ہمارے آبا و اجداد نے نہایت محنت سے تیار کیا تھا۔ چنانچہ ایسا کیا۔ لیکن منزل کا تعین تھا نہیں اب بھٹک رہے ہیں

میری غرض صرف یہ ہے کہ بہت جلد ہم کو خاندان کی ایک حقیقی شکل تیار کرلینی چاہیئے۔ ورنہ جو نسل پیدا ہوگی۔ اس کی تباہی کی ذمہ داری ہم سب پر ہوگی۔ کیوں کہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ الجھنوں اور پریشانیوں کے زمانہ میں جو اولاد بھی پیدا ہوگی الجھنیں اور پریشانیاں اس کی رفیق ہوں گی۔

شادی کے مسئلہ کو لیجئے شادی کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ایک بہترین رفیق کی تلاش کی جائے لیکن موجودہ حالات میں یہ کیسے ممکن ہے . . . ؟ ہم نے کوئی نظام خاندان تو اپنایا نہیں ہے۔ ہر گھر اپنے بچوں کی تربیت اپنے اپنے رنگ میں کر رہا ہے۔ کسی کا رخ مشرق کی طرف ہے تو کسی کا مغرب کی طرف۔ اب آپ جیون ساتھی کی تلاش کے لئے گھر گھر پھریئے اخباروں میں اشتہار دیجئے لیکن آپ کی پسند ناپید ہے کیونکہ آپ کی تربیت دوسری طرز پر ہوئی ہے۔ اور آپ کی ہونے والی کی تربیت دوسری طرح کی۔ فطری تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے آپ کسی ایک پر اکتفا کریں گے۔ ایک دو مہینے بعد عدالت کا دروازہ آپ کی طرف سے یا پھر آپ کے رفیق کی طرف سے کھٹکایا جائے گا۔ کہ میری گذر اس سے نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس کے خراٹے رات کی نیند حرام کئے ہوئے ہیں یا پھر یہ سگریٹ پیتا ہے وغیرہ (یہ ایک حقیقت ہے کہ طلاق کے واقعات آج کل بہت بڑھ گئے ہیں۔ خراٹے یا سگریٹ وجہ طلاق نہیں ہیں۔ بلکہ وجہ طبیعتوں کا اختلاف ہے اور جس کی اصل وجہ تربیت ہے۔ جو ہر گھر میں مختلف تصوروں کو سامنے رکھ کر کردی

جاتی ہے۔ یہ ناگوار واقعات اس وقت تک ہوتے رہیں گے جب تک ہم کسی ایک نظام کو اپنا نہ لیں۔

مغربی ممالک کی طرح ہمیں اپنی توجہ زیادہ تر کلبوں اور ہوٹلوں میں رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیوں کہ وہاں تو سب کی تفریح کا سامان ہوتا ہے۔ اور اپنی قوم کا مزاج ان چیزوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا ہم لوگوں کے خیال میں عام دعوتیں اور عام تفریحیں ایک عرصہ تک مزا نہیں دے سکتیں۔ قلب و دماغ کو سکون صرف خاندان میں ملتا ہے یہی کوئی بات ہوتی کہ — ع۔ کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں خاندان کے فرائض انجمنیں بہت خوبی سے انجام دے رہی ہیں۔ مثال کے طور پر زچہ بچہ کے ہسپتال۔ بچوں کی پرورش گاہیں اور دوسری سہولتیں۔ پھر بھی ہم ان کے نظریہ خاندان کو پوری طرح اپنا نہیں سکتے اس لئے کہ ہمارے سامنے ان کے معاشرے کے تلخ تجربات موجود ہیں اور وہاں کے لوگوں کی یہ آواز بھی سننے میں آنے لگی ہے کہ عورتوں اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔

میری رائے میں خاندان کی حقیقی شکل تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے ضابطہ حیات کو مدنظر رکھیں کیونکہ اس میں عورت اور مرد کے تعلقات اور ان کی حدیں نہایت تفصیل سے پیش کی گئی ہیں یہاں نہ تو مرد کو انتہائی افضلیت دی گئی ہے کہ ہر وقت جو تم پیزار کی نوبت رہے اور نہ عورت کو اتنی آزادی کے تہذیب انسانی قبر کی راہ لے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۹ سے آگے)

تو وہ چراغ بڑھا دیتا ہے وہ پوچھتی ہے کہ ایسا کیوں تو جواب دیا جاتا ہے کہ ذاتی معاملات میں بیت المال کا تیل صرف نہیں ہونا چاہیئے پھر اس نے کتاب کو بند کر دیا —— اور سر جھکا کر یا تھا مسلتے ہوئے سوچتا رہا —— اخلاق کے اس اونچے معیار پر ایک عام آدمی کیسے چڑھ سکتا ہے، پھر اسے پانی کی طلب محسوس ہوئی تو کرسی سے اٹھا اور باہر جاکر صراحی سے پانی لے کر پیا کچھ دیر تک وہیں صحن میں ٹہلتا رہا کتاب کو ختم کرنے کی اس میں ایک دھن پیدا ہو چکی تھی اس لئے کچھ دیر سستا کر پھر وہ اسی کرسی پر بیٹھکر کتاب کھول کر بیٹھ گئے

اب ایک اور خلیفہ اسے رات کی تاریکی میں پہرہ دیتا نظر آتا ہے تو اسے اپنے وہ دن یاد آجاتے ہیں جب وہ بھی فقیروں اور اپاہجوں کے لئے گھر گھر روٹیاں مانگا پھرتا تھا اس تقابل سے اس میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے یہ جذبہ مجھ میں بچپن میں ہی ڈال دیا تھا۔

لائبریری کا ٹائم ختم ہو گیا اس کی اطلاع گھڑی کے گھنٹے نے دی اسے بڑا افسوس ہوا کیونکہ کتاب کے ابھی کچھ ہی صفحات سے وہ گذرا تھا۔

گھڑی کے گھنٹے بج رہے تھے اور وہ کتاب کو بند کرکے خیالوں میں ڈوب رہا تھا گھنٹوں کی گونج میں اس عہد کے مظاہر کے تاثر سے اس میں بیچارگی اور رد دینے کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اس کا دل اسے کہہ رہا تھا کہ تو نے اس عہد میں کیوں نہ جنم لیا یہ سوچ دھیرے دھیرے اسکے ذہن کے تاریک خانوں کی طرف رینگ رہی تھی ذہن میں اس حرکت کے ساتھ وہ اپنے اندر ایسا بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دل کو کھرچ کر اس پر لکیریں ڈالی جا رہی ہیں اور خاص مسرور کیفیت دھوئیں کی طرح اس میں رہی ہے جس سے اسے خاص پاکیزہ لطف آ رہا ہے چند لمحوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اندر داخل ہو گئی ہے اور اس کا ضمیر پہلے سے زیادہ دار ہو گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

بلا تبصرہ

خطوط

مدیر محترم - سلام مسنون -

...ہجہ کے شمارے میں انور صدیقی صاحب کا تبصرہ نما خط شائع ہوا جس
...یک پرانے مباحثہ کو پھر تازہ کر دیا - میں انتظار کرتا رہا کہ اس کے بعد کوئی حضرت
...گی سے مسئلہ پر روشنی ڈالیں لیکن درمیان کے دو شماروں میں اس سلسلہ
...کوئی خط شائع نہ ہوا - مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ آخر ایسے مسئلہ کو نا قابلِ اعتنا
...سمجھا گیا ہے جس میں ایک ادیب کے لئے بدگمانی اور دوسرے کی غلط ترجمانی
...ہوتی ہے - اسی عرصہ میں ماہنامہ کے منیجر جناب جلیل خاں صاحب سے ملاقات
...ہوئی ان سے جب استفسار کیا تو جواب بڑا دل شکن ملا - یعنی یہ مذاکرہ بجائے
...کے تخریب کا موجب بن گیا ہے - لوگوں نے ایک دوسرے کی مخالفت اور
...نفرت کے بڑے ہی تلخ و ترش خیالات کا اظہار کیا - دیں اب ان لوگوں کے
...نے میں کیا کہوں جو دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں ------
...ب مصلح ہی مفسد ہو جائے تو اصلاح کی توقعات کیوں کر باقی رہ سکتی ہیں؟

کوثر نیازی کے جواب میں رحمٰن شاد کے خط نے اس مسئلہ میں میری دلچسپی
...دل روز سے ہی مہمیز کر دیا تھا - میں نے پہلے بھی اس سلسلہ کو غور سے پڑھا تھا
...انور صدیقی کے خط کے شائع ہونے کے بعد میں نے پھر تمام شمارے ایک بار
...نے سامنے پھیلا کر رکھے اور اب اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جس
...میں بالآخر پہنچا ہوں -

مسئلہ کی نوعیت سے آگاہی کی خاطر ہمیں ایک بار پھر رحمٰن شاد کی نظم
...ات کا مطالعہ کرنا پڑے گا - کوثر نیازی نے اس نظم کے پہلے شعر پر گرفت
...تھی کہ "ان کی زبان و بیان میں ترقی پسندی بری طرح سرایت کرتی چلی
...رہی ہے - مثال کے طور پر پہلے بند کے پہلے ہی شعر کو ملاحظہ فرمائیے" ؎

ظلمتِ شب کی مہکتی ہوئی تاریکی میں
میں نے ہنستے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی

اول تو ظلمتِ شب کی تاریکی ہی بھلتے مہربانی فرما کر، کی طرح ایک
عجیب و غریب لفاظی ہے لیکن اس پر مہکتی کے اضافے نے تو کمال ہی کر دیا کہ
خدا جانے شاعر صاحب کون سے دیس میں بستے ہیں کہ جس کے اندھیروں میں
بھی مہک پائی جاتی ہے" -

★ ابنِ فرید

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گرفت زبان و بیان کی
ہے فکر و خیال سے تعارض کرنا دراصل مکتوب نگار کا مقصود نہ تھا - البتہ لہجہ
تنقید کا نہیں تنقیص کا ہے لیکن رحمٰن شاد صاحب نے ان سطور کا مواخذہ اپنے
چوتھے اور پانچویں بندوں کے ان دو اشعار کے ذہنی پس منظر میں کیا ؎

۱ اب بھی مفلس کی جوانی کا لہو بکتا ہے
اب بھی جمہور کی عزت کے کفن بکتے ہیں

۲ مسکراؤ شبِ ظلمات میں رونے والو
دردِ افلاس کی یہ رات گذر جائے گی

اس کا حل انھوں نے یہ پیش کیا ہے ؎

انقلاب آئے گا مشرق کے سکوں زار و میں
تیرہ و تار فضاؤں میں چراغاں ہوگا
دستِ اسلام میں باطل کا گریباں ہوگا
غم نصیبوں کے غم و درد کا درماں ہوگا

اس بند میں ترقی پسندانہ نعرہ بازی پوری طرح جھلک رہی ہے - یہ ایک
حقیقت ہے خواہ اس کے قبول کرنے کے لئے بعض حضرات تیار نہ ہوں کہ
اسلام کا مطمحِ نظر یہ دنیا نہیں آخرت ہے - اور وہ اس کے ہی احسن طریق پر
حصول کے لئے معاشرہ کو اصلاح کی طرف گامزن کرتا ہے - محض افلاس اور
غم نصیبی دور کر دینے سے آرزوئے مسلم برنہ آئے گی - بلکہ اس کے لئے متوازن
اور ہمہ صفت معاشرہ قائم کر کے اخروی کامیابی کے لئے آسانیاں فراہم
کرنا ہوگا - اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اسلامی معاشرہ افلاس دور
کرنا ضروری نہیں سمجھتا - نہیں! بلکہ یہ بنیادی چیز نہیں - اسلام جس انداز سے

معاشرہ میں تبدیلی لانا چاہتا ہے وہ جب پردہ امکان پر نمودار ہوجائے گی تو تمام دوسری جبار چمگادڑوں کی طرح افلاس اور غم بھی دور ہوجائے گا۔

پھر بھی موضوع کے معاملہ میں رحمٰن شاد پر نہ میں کوئی پابندی عائد کرنا چاہتا ہوں اور نہ شاید کوثر نیازی نے کی ہے اگر وہ کوثر نیازی کے خط کا محولہ بالا اقتباس پھر پڑھیں تو وہ مکتوب نگار کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ ترقی پسندی سے ان کی مراد کیا ہے عجیب غریب محاورے، بے معنی الفاظ اور چند نعروں کے مترادف اصطلاحات مثلاً افلاس، بھوک، غم و درد، بے چارگی وغیرہ کا کثرت سے استعمال کرنا ترقی پسندوں کا وطیرہ ہے۔ ایک زمانے میں یہ بیان اور یہ الفاظ اپنے اندر بڑی اثر انگیزی رکھتے تھے لیکن اب ترقی پسندوں کے مخصوص کردار نے ان کی بے اثری کو عام کردیا ہے۔ اگر رحمٰن شاد اس کا صحیح معنوں میں جائزہ لیں تو ان کو اپنے اسلوب اور اپنے بیان کے لئے نئی زبان کے اختراع اور اس کے استعمال کی اہمیت کا احساس ہوجائے گا کوثر نیازی نے مدیر حضرات کو اشارتاً جو مشورہ دیا ہے اس سے کم از کم میں اسی طرح کی بات سمجھا ہوں۔

کوثر نیازی کی لفظی گرفت ایک طرف اور رحمٰن شاد کی وضاحت فکر دوسری طرف مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز تو انور صدیقی کا خط ہے جس میں ایک ایسا تنقیدی اور مفاہمتی لہجہ پایا جاتا ہے کہ جو شاید رحمٰن شاد اور کوثر نیازی، دونوں میں سے کسی کو بھی مطمئن نہ کرسکے۔ اور ہم ایسے قارئین کو عجوبگی میں مبتلا کردے۔ اس خط کے خاص خاص کھٹکنے والے داعیات یہ ہیں:۔

۱۔ ان (رحمٰن شاد) کی فکر کو کسی صورت میں ترقی پسند نہیں کہا جاسکتا (لیکن دوسرے ہی جملے میں) البتہ رحمٰن شاد کی بعض بعض نظموں میں ساحر اور کیفی اعظمی کی نظموں کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

(۳) کوثر نیازی کی غزل پڑھ کر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک خاص نظام فکر کے لئے غزل کو آلے کے طور پر استعمال کررہے ہیں۔ ان کے یہاں وہی جذبات ملتے ہیں جو دوسرے بے مقصد غزل گویوں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

(؟) کوثر کے یہاں عشق کا وہ اسلامی تصور کبھی نہیں ملتا جس کے ذریعہ معرکۂ بدر و حنین بھی عشق بن جاتا ہے اور مہ و نجوم بھی اس کے نخچیر ہوجاتے ہیں۔

(۴) ان (کوثر نیازی) کی غزلوں میں فیض کی غزلوں کا روحانی دھندلکا نظر آتا ہے اور اسے ہم ایک معمولی تجزیئے کے بعد کورانہ تقلید کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

پہلے اور چوتھے اقتباسات کے بارے میں تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ خود انور صدیقی اپنے ادیبوں کا مطالعہ Detachment کے ساتھ نہیں کرتے ہیں وہ تقابلی مطالعہ Comparative Study کے اس قدر قائل ہیں کہ کسی نہ کسی میں کسی نہ کسی کی مماثلت ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ تنقید اور مطالعہ کا یہ انداز بعض اوقات خود اپنی ذہنی مرعوبیت کی غمازی کرنے لگتا ہے۔ اور وسعتِ مطالعہ کے اظہار کے بجائے ذہن کی تنگ دامانی کا مظہر بن جاتا ہے حالانکہ ہم انور صدیقی کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کرتے لیکن انکے تنقیدی شعور کے لئے قوتِ فیصلہ اور معیارِ انتقاد کا یہ فقدان سم قاتل ثابت ہوسکتا ہے۔

دوسرے اقتباس کے بارے میں انور صدیقی سے خاص طور پر یہ کہا جائے کیونکہ وہ غزل گو بھی ہیں اور کسی ادب کی اہمیت کے قائل بھی شفیق صدیقی کا یہ شعر پیش کرکے

جب سامنے تم آجاؤ گے خود داد بصیرت لے لیں گے
آوارہ پھریں ڈھونڈیں نظریں یہ اہل نظر کا کام نہیں

انھوں نے یہ جسارت کرنے کا موقع فراہم کردیا کہ کوثر نیازی کا بھی صرف ایک ہی شعر پیش کردیا جائے۔ جو دو شعر کے فنی تقابل سے قطع نظر، ان کے تصور زندگی کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں

ہم آبلہ پایانِ رہِ شوق وفا کی
ہر وادیٔ پرخار کو گلنام کریں گے

اور اگر اس سے بھی زیادہ وضاحت کی ضرورت ہو تو یہ مقطع مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کافی ہے

کوثر یہ جہاں بھر کے خداؤں کو سنا دو
ہم پیرویٔ مسلکِ اسلام کریں گے

کوثر نیازی کے یہاں یاسیت ضرور پائی جاتی ہے لیکن اسے قنوطیت کہنا بھی درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اس یاس کے پس پردہ کیف اور سوز بلند نظر آتا ہے۔ یہ یاسیت اور محبت کی کسک کا احساس کوثر نیازی کا خاص مزاج ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوثر نیازی کا عشق اسلامی نہیں ہے غیر ہمدردانہ ہے۔

اس خط کو لکھتے وقت میرے سامنے دو باتیں خاص طور سے ہیں

(بقیہ صفحہ ... دیکھئے)

ستمبر ۱۹۵۵ء

قیمت فی کاپی ۸ آنہ

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

HE MUSHIR KARACHI

بُلند معیاری

ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی

مشہور اور مقبول عام

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون: ۷۹۲۳

جلد: ۶ شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۵۵ء

مرتبہ: عبدالغفور بیگ

ترتیب —— ستمبر ۱۹۵۵ء

بدل اشتراک:

پاکستان، سالانہ: پانچ روپے ÷ فی پرچہ: آٹھ آنے

بھارت: سالانہ: چھ روپے ÷ فی پرچہ: دس آنے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ:

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور، یوپی (بھارت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

سبدِ گُل

یہ مقولہ کہ "ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے" بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اور وہ طبقے جن کو "رجعت پسندوں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ بھی "ادب برائے ادب" کی اصطلاح کو استعمال کرنا باعثِ تضحیک سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات تو صاف ہے کہ ادب زندگی کا عکاس، زندگی کا ترجمان اور زندگی کا نمائندہ ہے۔ مگر جہاں یہ بات صاف ہوتی ہے وہاں الجھن بھی جاتی ہے۔ چونکہ زندگی کو ادب میں شامل کرتے ہی زندگی کی تمام چھوٹی بڑی پیچیدگیاں (Complexes) بھی ادب میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر یہ سوال بھی فوراً پیدا ہوتا ہے کہ ان پیچیدگیوں کو من وعن ادب میں پیش کر دیا جائے یا تحلیل و تجزیہ کرنے کے بعد ان کے اثرات کو قلمبند کیا جائے۔ اور پھر یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ ادیب زندگی کی کن اقدار کو مطمحِ نظر بنائیں۔ چونکہ زندگی بذاتِ خود اجتماعی اکائی ہے اور مختلف شعبوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان شعبہ ہائے زندگی میں کون سے شعبے اہم ہیں اور کون سے غیر اہم اور پھر یہ کہ اپنی تخلیقات کے دوران میں ادیب پر کون سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کون سے خار زار ہیں جن سے اسے اپنا دامن بچانا چاہیئے اور کون سے پھول ہیں جنہیں چننا چاہیئے۔ کن اقدار کو اپنانا اور کن اقدار کو رد کرنا چاہیئے۔ یہاں جملہ مسائل اٹھانے سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں ادیبوں پر چند کلیات ٹھونسنا چاہتا ہوں اور انھیں ایک خاص کٹہرے میں محبوس کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ مسائل وہ بنیادی مسائل ہیں کہ جن کو اچھی طرح سمجھنے اور سوچنے کے بعد ادیب اپنی مخصوص راہ متعین کر سکتے ہیں اور اپنے فن کو چلا سکتے ہیں جس طرح کسی بچے کی ذہنی نشو و نما (Mental development) کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا فطری رجحان (aptitude) مدِ نظر رکھ کر تربیت دی جائے اسی طرح ادیبوں کے لئے بھی یہ فطری رجحان ضروری ہے۔ اس فطری رجحان کو سمجھنے کے بعد جو راہ متعین کی جائے گی وہ حقیقتاً صحیح راہ ہوگی۔ اور اس طرح ادیب کی صلاحیتیں پورے طور سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ اگر ہم ہند و پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں کی ادبی زندگی کی چھان بین کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان کی ادبی شہرت اپنے منتہا پر اسی وقت پہنچی ہے جب ان کی تخلیقات ان کے فطری رجحانات سے ہم آہنگ ہوئیں۔ ہمارے بعض ادیبوں میں بہت پرانا اور پختہ کار ہونے کے باوجود غیر معروف ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور کسی ایک صنف کو جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہو نہیں اپنا سکے ______ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیتیں (Talents) مختلف دھاروں (Channels) میں بٹ کر اپنا وہ تاثر قارئین پر نہیں چھوڑ سکیں جو دوسری صورت میں چھوڑ سکتی تھیں۔ تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر ادیب کو اپنی چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کا محاسبہ کرنا چاہیئے اور ایک خاص صنف کو اپنانے کی سعی کرنی چاہیئے یعنی اگر کسی میں افسانہ نگاری کی صلاحیت و رجحان ہے تو مقالہ نگاری سے اسے تائب ہو جانا چاہیئے اور اگر کسی میں شدتِ قوتِ فکر کی فراوانی ہے تو اسے افسانہ نگاری کی پُر پیچ وادی میں قدم نہیں رکھنا چاہیئے ______ اسی طرح یہ فارمولا مختلف اصناف

... اندکیا جا سکتا ہے۔

ہاں تو ذکر تھا ادب اور زندگی کا ـــــ اور زندگی کی پیچیدگیوں کا ـــــ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے۔ مگر زندگی کی اس حرکت کا راستہ خطِ مستقیم کی صورت میں نہیں بنتا۔ بلکہ ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا بنتا ہے ـــــ زندگی مختلف واقعات و تغیرات سے مرکب ہے اور یہ واقعات اس تیزی سے وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ ادب کی صورت میں ان کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ادیبوں کا یہ کام نہیں ... کہ ... یا ... ڈمباکو لمبو کانفرنس کی تفاصیل قلمبند کریں ـــــ ادب کا کام روحِ عصر کو مقید کرنا ہے نہ کہ عصری واقعات کی پیش کش! یہ بات ... واضح ... ہے کہ ادب زندگی کی پیچیدگیوں (Complexes) کو من و عن پیش کر دینے کا نام نہیں بلکہ ان سے جو اثرات ... قبول کرتی ہے اس کو خاص سلیقے سے پیش کر دینا ہی ادب کا کارنامہ ہے ـــــ اب جس طرح زندگی میں تنوع ـــــ (Variation) پایا جاتا ہے اسی طرح انسانی فطرت میں بھی تنوع پایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے ادب میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ یہی تنوع ادب کی پستی یا برتری اعلیٰ اور ادنیٰ اقدار کا تعین کرتا ہے۔

انسانی فطرت کے متعلق علماءِ نفسیات کے مختلف مدرسہ ہائے فکر ہیں۔ (Lock) کہتا ہے کہ ہم اس دنیا میں بغیر کسی فطرت کے پیدا ہوتے ہیں اور ماحول کے اثرات ہماری فطرت کو خاص سانچے میں ڈھال دیتے ہیں یعنی جس طرح ہم بالکل عریاں حالت میں تولد ہوتے ہیں اسی طرح ہمارا ذہن بھی عریاں اور صاف (Blank) ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماحول کے اثرات مرتب ہو کر ہماری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ روسو کا خیال تھا کہ درحقیقت ہم نیک پیدا ہوتے ہیں اور ہماری فطرت میں صرف نیکی ہی شامل ہوتی ہے مگر ماحول ہماری نیک فطرت کو مسخ کر دیتا ہے ـــــ مگر جدید علماء نفسیات کا خیال ہے کہ ہم نیکی اور بدی کے امتزاج سے مرکب ہیں۔ جو بچپن میں فطری (Natural) ہوتی ہیں مگر بلوغت کے بعد خود ہماری حاصل کردہ (Acquired) ہوتی ہیں ـــــ یہ مسائل تفصیل چاہتے ہیں اور یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادیب اپنے اپنے فکر کے مطابق ادب کے موضوعات منتخب کرتا ہے۔ یہ انتخاب اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں اقسام کا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ زندگی کی اعلیٰ اقدار پر مشتمل ہے تو اعلیٰ ادب کی تخلیق کا باعث ہوگا اور اگر پست عناصر (Baser Elements) پر مشتمل ہوگا تو ادنیٰ اور پست ہوگا ـــــ ان اعلیٰ اقدار کو حاصل کرنا اور اپنانا ریاضت چاہتا ہے۔ ادب کی یہ اعلیٰ اقدار کیا ہیں ان پر انشاء اللہ آئندہ تفصیلی بحث کی جائے گی۔

● ـــــ شمیم جاوید

ہماری ڈاک“

ہم نے ابتدا ہی سے ”مشیر“ کو بے لاگ اور غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ”ہماری ڈاک“ کا سلسلہ بھی عام روش سے ہٹا ہوا ہے ... ”مشیر“ سے متعلق جو بھی خطوط موصول ہوئے ـــ جن میں مدح سرائی بھی ہوتی اور مرثیہ خوانی بھی ـــ ہم برابر شائع کرتے رہے، یہی سوچ کر کہ ... اپنی ... خیال اپنا اپنا“..... لیکن دکھ ہوتا ہے ـــ اور کیسے نہ ہو ـــ کہ ہمارے کرمفرما بعض مکتوب نگار حضرات کی توجہ ”مشیر“ اور ادب سے ہٹ کر بعض افراد پر جا ٹھہری۔ نتیجتاً کچھ دلوں کو ٹھیس لگی جس کا ہمیں افسوس ہے، اور ہم ایسے تمام احباب سے معذرت خواہ ہیں۔ لامحالہ یہ استدعا بھی کرنی پڑ رہی ہے کہ خطوط لکھتے وقت تنقید کو تنقیص سے پاک رکھا جائے، اور اتفاقی لغزشوں کو سراپا خطا اور عادتِ جرم کے رنگ میں نہ پیش کیا جائے کہ ”تعمیر“ ہمارا مقصود ہے، تخریب ہرگز نہیں ـــــ اس تجربہ کے بعد مجبوراً ہمیں اپنے اوپر بھی یہ پابندی عائد کرنا پڑ رہی ہے کہ آئندہ شائع ہونے والے خطوط سے غیر محتاط عبارتیں حذف کر دیں یا پھر انھیں سرے سے شائع ہی نہ کریں۔

ادارہ ”مشیر“

اختر الایمان

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسم خاکی
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حسن بے نام کے نظارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے
جوان دل کش حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی
کھلی ہوئی بد نصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی
اسی لئے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے، یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلادیں؟

فرمان فتح پوری •

شاعرِ سندھ

قابل اجمیری جنہیں حال ہی میں حکومت سندھ نے "شاعر سندھ" کے خطاب سے نوازا ہے اردو کے ان نوجوان و ہونہار شعرا میں سے ہیں جو ادبی حلقوں میں محتاج تعارف تو نہیں پھر بھی اگر ان کا نام کچھ لوگوں کے لئے نیا ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ آج کل زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی پروپیگنڈے کو بڑا دخل ہے جب تک کسی علمی و ادبی محاذ سے کمک نہ پہنچتی رہے کسی دیانتدار ادیب یا شاعر کا سامنے آنا محال ہے۔ قابل اجمیری اپنی ذہنی و فنی ترقی پسندیوں کے باوجود اپنی وضع قطع، طرز معاشرت اور ادب و اخلاق کے اعتبار سے قطعی مشرقی ہیں انہوں نے تشہیر و نمود کی نہ کبھی شعوری کوشش کی نہ کسی فرد یا جماعت سے بیجا حمایت کے متمنی رہے۔ قابل جس خطۂ زمین سے متعلق ہیں اسے بھی شعر و ادب کے لحاظ سے بنجر ہی کہنا چاہیے۔ حیدرآباد دکن، لکھنو، دہلی، لاہور جیسے ادبی مرکزوں سے اجمیر کا کیا تعلق، لہٰذا قابل کو عوام تک پہنچنے میں مقامی معاصرت واحباب کا سہارا نہ مل سکا ہے تو قابل کا جوہر قابل کہیئے کہ وہ بغیر کسی خارجی سہارے کے معروف ادبی دنیا تک پہنچ گئے۔ بات یہ ہے کہ قابل اجمیری زندگی کی قدروں کے اظہار و نمو میں صرف فطرت کی رہنمائی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وقت خود زندگی کے مختلف مظاہر دل پر کسی دن قطعی حکم صادر کرتا ہے جو جانبداری یا مصلحت اندیشی کے بجائے صداقت پر منحصر ہوتا ہے۔ چنانچہ قابل اجمیری اسی یقین کے ساتھ بڑی سنجیدگی و خاموشی سے عروس شعر کو سنوارنے اور سجانے میں مصروف ہیں کہ اگر ان کے کلام میں توانائی و دلکشی نظر آئی تو زمانہ خود اس طرف لپکے گا۔ ان کا خیال ہے کہ آرٹ جو زندگی کا حسین مظہر ہے۔ اس کی دلکشی کے لئے کسی خارجی امداد کی ضرورت ہے نہ اس کی قبولیت کے لئے پروپیگنڈے کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

نام و شہرت سے بے خبر دشت و جبل سے بے نیاز، جوشِ نمو میں چل پڑا نکہت گل کا قافلہ

ظاہر ہے ایسی صورتوں میں قابل اجمیری کا کچھ لوگوں کے لئے اجنبی ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہ صرف اپنے فن کے دم خم پر جینا چاہتے ہیں اور پہلے ہی تشہیر و نمود کے سہارے تلاش نہیں کرتے پچھلے سال انہیں شاعر سندھ کا خطاب دیا گیا اور ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ان کو کئی ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ بھی حکومت سندھ کی طرف سے منظور ہوا لیکن افسوس کہ یہ مسئلہ بھی سندھ کی سیاست کا جزو بن گیا اور حکومت سندھ نے اس سلسلے میں ابتک صرف کاغذی کارروائی کے علاوہ کوئی واقعی قدم نہیں اٹھایا۔ ہرچند کہ قابل اجمیری کئی سال سے مختلف امراض کا شکار ہیں پچھلے دنوں تو ان کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ بہرصورت جانبر ہو گئے لیکن ان کی صحت ابتک اعتدال پر نہیں آئی۔ اور ان کی ذات سے جن ادبی تخلیقات کی توقعات وابستہ ہیں ان بے سروسامانی معاشی بے اطمینانی اور مسلسل علالت کی وجہ سے پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ پھر بھی قابل نے اپنی تہی دستی و بے چارگی کا رونا کسی سے نہیں رویا کسی ادبی حلقے سے چندے یا کسی امداد کی گذارش نہیں کی حتیٰ کہ حکومت سندھ نے اپنے قول کو عملی جامہ پہنانے میں جو غیر معمولی تاخیر سے کام لے رہی ہے اس کے لئے بھی قابل نے کوئی شور نہیں مچایا۔ ظاہر ہے کہ قابل کو دنیا کس طرح جانتی۔ ذیل کے شعر سے قابل کی زندگی و کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے ؎

قابل کی شکستہ سالی کا احساس بھی ہو تو کیوں کر ہو
فریاد یہاں منظور نہیں انصاف وہاں دستور نہیں

حد یہ ہے کہ اگر ان کے احباب ان کی شکستہ حالی و بے بسی میں شریک بھی ہوتے ہیں تو قابل کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ وہ اپنی زندگی کی تلخیوں سے اپنے احباب کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ تلخ بنائیں وہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنے رنج سے دوسروں کو بھی رنجیدہ کریں۔ ان کے لئے یہ خیال اور روح فرسا ہے

کہ ان کی خستہ حالی ان کے احباب کے لئے غم اندوہ کا باعث ہو۔ لہٰذا وہ ....
حتی الوسع اپنے حالات پر خوش و قانع رہتے ہیں۔ اور اگر ان کی شب غم میں
کوئی غمخوار نظر آتا ہے تو وہ اس سے کیسے حوصلہ اور پیار سے کہتے ہیں کہ ؎

یہی تقدیر ہے ان کی یہی انجام ہے ان کا
یونہی جلتے ہیں پروانے۔ ستارو تم تو سو جاؤ

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ قابل کے کلام کی بہ نسبت ان کی زندگی سے
زیادہ قریب تھا۔ لیکن زندگی اور ادب دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں اب
اس تصوری تنقید کا دور گیا جب صاحب کلام کی شخصیت دور رکھ کر
صرف اس کے کلام کی تشریح و توضیح کو کافی سمجھا جاتا آج تو ادب کی
سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ کوئی ادب پارہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی کس
کس قدر اجتماعی ہے یا فنکار کے شخصی تاثرات، اجتماعی زندگی کے محرکات
و عناصر سے کس درجہ مطابقت رکھتے ہیں اس لئے زندگی الگ کر کے کسی
ادبی تخلیق کو پرکھنا کوئی منطقی جواز نہیں رکھتا اور صاحب کلام کو پرکھنے کے لئے صاحب
کلام کی شخصی زندگی پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اوپر چند سطروں میں
قابل کی زندگی کا جو مجمل خاکہ دیا گیا ہے اس سے اس قدر اندازہ ضرور ہوتا
ہے کہ قابل نے زندگی کی تلخیوں کو چکھا ہے وہ زندگی کی کتنی کروٹوں سے
واقف ہیں۔ وہ زندگی کی جس منزل تک پہنچے ہیں اس تک پہنچنے میں انہیں
کئی پر پیچ گھاٹیوں اور سخت برگوش ناہموار چٹانوں سے گذرنا پڑا ہے اور
چونکہ اس منزل میں مشاہدہ سے زیادہ تجربہ کی رہنمائی معاون رہی ہے
لہٰذا ان کے صرف شاعرانہ تاویل و حسن تعلیل کی شعبدہ بازیاں نہیں ہیں
بلکہ جوش سلیقگی و ظاہری رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر بات میں استدلال و خلوص
کا عنصر غالب ہے۔ وہ ہر دعوے کے لئے دلیل لاتے ہیں اور چونکہ ان کی دلیل
تجربوں سے مربوط ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے خیال کو دوسروں کے دل
میں آسانی سے اتار دیتے ہیں انہیں تجربہ نے بتایا کہ کوئی شخص رجائی زندگی
کے مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ کسی المیہ سے گذرا ہو اور چونکہ انھیں
تجربہ کو تخیل میں ڈھال کر بیان کر دینے کی فنکارانہ قدرت ہے اس لئے
انہوں نے کیسے دلکش انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ؎

لطف صبح نشاط مجھ سے پوچھ　　میں نے شام الم گذاری ہے

قابل کو بھی اوروں کی طرح زندگی بڑی عزیز ہے لیکن اسلئے نہیں
کہ وہ موت سے خائف ہیں۔ وہ ماحول کے دباؤ کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور
ناموافق ماحول کو تبدیل کر دینے کا بھی حوصلہ کرتے ہیں۔ ماحول و کلا
مطابقت کا یہ مطلب تو نہیں کہ ادب ماحول کا عکاس ہے اور بس
اگر انسانی زندگی کے ارتقا و نمو میں حارج ہے تو اس کی تبدیل و اصلاح
کی کوشش آج ادیب و شاعر کا فرض اولین ٹھہری ہے۔ حالی کا یہ قول
"چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"
ہر ماحول پر منطبق نہیں ہو سکتا بلکہ ہمیں کبھی کبھی اقبال کے قول "بازمانہ ستیز"
پر قدم بڑھانا ہوگا اور اس ستیزہ کاری کے لئے اچھے فنکاروں کی ضرورت
ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں چنانچہ قابل اجمیری سخت مصائب کے با
صرف اس خیال سے زندگی عزیز رکھتے ہیں کہ شاید ان کی زندگی سما
زندگی کو سنوارنے میں مدد دے سکے۔ کہتے ہیں ؎

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ　　زندگی کو مری ضرورت ہے

اس اعتماد کے ساتھ وہ ہر ناپسندیدہ ماحول کو بدل ڈالنے کیلئے عزم کرتا
عمل کی بھی دیتے ہیں ؎

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا　　آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

زندگی کی اس معرکہ آرائی میں وہ سعی خلوص پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ رزمگاہ
حیات میں وہ غالب کے اس قول سے متاثر ہیں کہ
"بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے"
بلکہ انھیں غالب کی یہ بات بھاتی ہے کہ "درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا" اسی لئے وہ مانگی ہوئی رہائی کو توہین بال و پر
سمجھتے ہیں اور مستعار روشنی سے اپنے شب غم کی تیرگی کو دور کرنا پسند نہیں کرتے
بلکہ بڑے حوصلے سے اپنی تیرہ بختی کو گلے لگائے رکھتے ہیں ؎

مجھے اپنی راتوں کی ظلمت ہے پیاری
ستاروں کی بخشی ہوئی روشنی سے

وہ کشت حیات کی شادابی کے متمنی ہیں لیکن اس شادابی میں صرف
اپنی محنت و کوشش کا سہارا لیتے ہیں خواہ انہیں زندگی کو لالہ زار کرنے میں
اپنے ہی خون سے سیراب کیوں نہ کرنا پڑے وہ گداگر و محتاج کی طرح در بدر
زندگی کی بھیک مانگنے کو تیار نہیں۔ زندگی انسان کا فطری حق ہے اور قابل
اس کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہیں ان میں ہر جبر کو آزادی میں اور ہر رنگ

کو خوشی میں بدلنے کا حوصلہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس علو ہمتی کا کیسے خوب صورت انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ ؎

روش روش پر میں زخم دل پر لہو چھڑکتا بھی جا رہا ہوں
یہ چمن کا فروغ قابل بہار پر منحصر نہیں ہے

بے کسی ہرچند کہ حوصلہ شکن ہوتی ہے۔ قوائے عمل کو معطل کر دیتی ہے لیکن قابل کے نزدیک بے کسی و مجبوری ہی سے اصل حیات کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جبر و یاس کے گہواروں ہی میں حیات خیز انقلاب پرورش پاتے ہیں جمہوریت کا آغاز و عروج درصل اسی جبر و یاس کا رہین منت ہے جس نے آدمی کو جینے کا احساس بخشا۔ لہٰذا قابل زندگی کی تگ و دو میں جھوٹی تسلیوں اور کھوکھلے سہاروں کی مدد نہیں ڈھونڈتے اور گندم نما جو فروش جمہوریت کے پرستاروں سے صاف کہہ دیتے ہیں ؎

بے کسی ہے بڑی امید میں ہیں | تم کوئی آسرا نہ دے جانا
کوئی احسان کر کے قابل پر | دوستی کی سزا نہ دے جانا

قابل اجمیری جہاں وقت کے تقاضوں اور زندگی کے عوامل کو شعر میں پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں، اسی طرح زبان کی صحت، بیان کی روانی اور اسلوب کی دلکشی پر بھی نظر رکھتے ہیں ان کے اسلوب میں جیسی ہمواری اور ترنم ملتا ہے وہ ان کے انفرادی مزاج کا نتیجہ ہے۔ ان کے اشعار میں وہی رجحانات کارفرما ہیں جو آج کم و بیش ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتے اس لئے کہ وہ تصوف و فن کے قائل ہی نہیں۔ وہ عام انسان کی طرح زندگی کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اپنے طور پر بیان کر دیتے ہیں اور یہی مخصوص طرز بیان زندگی کے تجربے کو نیا بنا دیتا ہے فنی نکات کے ساتھ وہ زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں اور اکثر پرانی باتوں کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ وہ نئی ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ انسان ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظریاتی طور پر کوئی ماحول اثرات سے خواہ کتنا ہی الگ رہے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ عملی زندگی میں ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

اور چونکہ جذبات متعدی ہوتے ہیں اس لئے ماحول کا اثر ذہن پر ضرور پڑتا ہے اور اس اثر سے بچنے کے لئے کوئی شعوری کوشش بھی کامیاب نہیں ہوتی قابل اس خیال کو اس طرح نظم کرتے ہیں ؎

ساقی بھی ہے ابر و جام بھی ہے اے ناصح مشفق تو ہی بتا
حالات کی رو میں بہہ جانا انسان کی فطرت ہے کہ نہیں

مصرعہ ثانی کتنا برجستہ و رواں ہے۔ اس کے ساتھ استفسار یہ لہجہ نے شعر میں عجیب اثر بھر دیا ہے۔

یہ بات بھی اکثر کہی جاتی ہے کہ زندگی امید پر قائم ہے۔ امید کا خاتمہ درصل زندگی کا خاتمہ ہے گویا امید ایک آفتاب ہے جو تمام فضائے حیات کو جگمگاتے رکھتا ہے۔ اس آفتاب کا ڈوبنا زندگی کا تیرگی و پستی میں ڈوب جانا ہے۔ قابل نے اس خیال کو کیسے اثر بھرے انداز میں بیان کیا ہے ؎

آ جائیے کہ یاس کے سائے نہ پھیل جائیں
امید آفتاب لب بام ہی تو ہے

ظاہر ہے بنیادی خیال کوئی نیا نہیں ہے لیکن ندرت بیان نے جدت کا پہلو بھی نکال لیا "آ جائیے" کے ٹکڑے میں جس حسرت کا اظہار ہے وہ محسوس کرنے کی بات ہے "یاس کے سائے" "پھیلنا" ایسی مضبوط رعایتیں جو قابل کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں امید کو آفتاب سے استعارہ کرنا تو کچھ مشکل نہ تھا لیکن اس ایک استعارہ سے "لب بام" کے ساتھ یاس کے لئے جو استعارہ پیدا ہو گیا ہے وہ بڑی فنکاری کا کام ہے۔

دام و نشیمن کے تذکرے بھی ہماری شاعری میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دو لفظوں اور ان کے دوسرے لوازم سے ہزاروں مضامین پیدا کئے گئے ہیں اور روایتی محبت سے لے کر زندگی کے حقائق تک کو اس پردے میں ہمارے شعرا نے بڑی کامیابی سے بے پردا کر دیا ہے قابل نے بھی ان علامتوں کی مدد سے ایک شعر کہا ہے ؎

ہم نشیمن سے دام تک پہنچے | شوخئ بال و پر نے لوٹ لیے

"شوخئ بال و پر" کی ترکیب و معنویت قابل کے فنی تصرف پر دال ہے۔ لفظ "شوخی" نے خود کردہ را علاج نیست "یا" اپنے ہاتھوں اپنی طبع تو برمن بلا شدی کا جو پہلو پیدا کر دیا ہے وہ زندگی کی حالیہ کروٹ کی طرف پوری طرح اشارہ کرتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ عاشق کو محبوب اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا

ہے عشق خود فراموشی زجاں سپاری کے ہمارے یہاں رہا کیا ہے۔ غالب نے صحیح کہا ہے کہ ؎ "جس کو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جاتے کیوں؟"
عاشق محبوب کی تمام جفاؤں اور بے اعتنائیوں کو کسی مصلحت پر محمول کر لیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ محبوب کو عاشق سے بے پناہ محبت ہے صرف رسوائی و بدنامی کے خوف سے وہ اس کا اظہار نہیں کرتا لیکن بعض وقت محبوب کے عام طرز عمل سے یہ محسوس کرتا ہے کہ محبوب صرف فریب دیتا ہے اور اس کو قابو لانا سخت دشوار ہے۔

مختلف اوقات میں مختلف خیالات کا تصادم عجیب ذہنی کشمکش پیدا کر دیتا ہے اور عاشق اسی پیچ و تاب میں مبتلا رہتا ہے۔ قابل نے اس تجربہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

سوچتا ہوں تو وہ جاں سے بھی زیادہ ہیں قریب
دیکھتا ہوں تو نظر آتے ہیں بیگانے سے

دنیائے محبت میں یہ بات بھی عام ہے کہ محبوب ہمیشہ عاشق کو جلاتا اور کڑھاتا ہے، ہر کام عاشق کی مرضی کے خلاف کرتا ہے۔ ملنا چھوڑ دیتا ہے نام لینا پسند نہیں کرتا۔ منہ چھپاتا ہے ظلم ستم ڈھاتا ہے تغافل و بے نیازی برتتا ہے اور اگر کوئی اس تغافل پر بھی مطمئن نظر آیا تو اس کا اطمینان قلب اڑانے کے لئے اس تغافل کو بھی ترک کر دیتا ہے اور ستانے کی کوئی دوسری صورت نکالتا ہے۔ غالب کے محبوب نے جب انہیں "حریف لذت آزار" دیکھا تو ستم سے کبھی ہاتھ کھینچ لیا اور غالب "واحسرتا" کہکر رہ گئے اور کبھی کبھی تو معشوق اس قدر "دشمن ارباب وفا" ہو گیا کہ غالب "جفا سے بھی محروم" ہو گئے قابل اجمیری نے محبوب کے اس تضاد پسندانہ مزاج کا مطالعہ کیا ہے اور ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ محبوب کا اپنی تضاد پسندانہ ادا پر قائم رہنا آسان نہیں بلکہ عاشق و محبوب دونوں کے لئے ایسا مسئلہ آن پڑتا ہے کہ حل کئے بغیر آگے بڑھنا محال ہے۔ کہتے ہیں ؎

تضاد جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تو ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے

غرض کہ قابل کے یہاں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو نئی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں چونکا دینے والے شعر ملتے ہیں جو ان کی سوجھ بوجھ اور فنی دسترس کا پتہ دیتے ہیں ابھی قابل نے اتنا کچھ نہیں کہا کہ ان کے مجموعہ کلام کو نظر میں رکھکر ان کا کوئی ادبی مرتبہ متعین کیا جائے یا کوئی فیصلہ کن بات ان کے فن کے متعلق کہی جا سکے۔ انہوں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں شعر کہنے کی فطری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اگر زندگی نے ان کا ساتھ دیا تو وہ ہمارے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ کریں گے۔ آخر میں چند شعر اور سن لیجئے :-

مجھی پہ اتنی توجہ مجھی سے اتنا گریز
مرے سلام سے پہلے مرے سلام کے بعد

ابھی تو تنقید ہو رہی ہے مرے مذاق جنوں پہ لیکن
تمہاری زلفوں کی برہمی کا سوال آیا تو کیا کرو گے

مجھے تو اس درجہ وقت رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو
مگر کچھ اپنے لئے بھی سوچا میں یاد آیا تو کیا کرو گے

(بشکریہ "مشرب")

آگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ستمبر ۵۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم: منیجر "شیرازہ"

نمبر	نام	نمبر	نام
۲۰۵۲	شاہدہ نسرین کراچی	۲۳۸۸	محمد کامل صاحب ...
۲۰۵۳	عبد الرؤف حیدر آباد سندھ	۲۳۸۹	رفیق احمد صاحب کراچی
۲۲۰۲	عبد الغنی صاحب لاہور	۲۳۹۲	علاؤ الدین ارشد گوجرانوالہ
۲۲۱۳	مولوی احمد دین صاحب کیمبل پور	۲۳۹۶	عابدہ سلطانہ کراچی
۲۲۲۳	عبد الرزاق ڈھاکہ	۲۴۰۳	عبد الحمید مردان
۲۳۷۲	محمود الحسن صاحب لاہور	۲۴۰۴	فاروق احمد خیر پور
۲۳۸۴	اقبال حسن زبیری کراچی	۲۴۰۵	مسز شوکت صاحبہ جہلم
۲۳۸۷	ایس۔ اختر صاحب گجرات	۲۴۴۱	عبد الغفور صاحب مظفر گڑھ

آلِ احمد سرورؔ

○

شانِ شہی نہ زلفِ شکن در شکن میں ہے — وہ بانکپن جو منصبِ دار و رسن میں ہے
دشت و دمن میں پھول کھلائے تو بات ہے — یہ کیا بہار ہے جو مقید چمن میں ہے
جو انگبیں سمجھتا ہے جامِ حیات کو — اس کا علاج تلخیٔ کام و دہن میں ہے
میرا لہو بھی کام کچھ آ ہی گیا ضرور — شوخی بلا کی آج ترے پیرہن میں ہے
ہم انقلاب چاہیں تو بڑھ جائے کچھ جمود — فتنہ گری نئی یہ سپہرِ کہن میں ہے
شاید کبھی ہمارے قفس تک بھی آئے گی — ناطورۂ بہار ابھی تک چمن میں ہے
عرفان و آگہی کے تقاضے بدل گئے — جادو عجیب اس نگہِ سحر فن میں ہے
کس کو سمجھائیں آج تسلسل حیات کا — دیکھو جسے اسیرِ جدید و کہن میں ہے
کیا دامِ خسروی سے رہا ہو نہ پائے گی — وہ سرکشی جو آرزوئے کوہکن میں ہے
تیرہ نظر اسے بھی سمجھتے ہیں اک غبار — تھوڑی سی روشنی جو سوادِ وطن میں ہے

پگھلے گی اے سرورؔ ہمالہ کی برف بھی
طوفاں تلاش وادیٔ گنگ و جمن میں ہے

———•••———

کنھیا لال کپور

مرزا ازبک

وہ جو شیخ سعدی نے کہا ہے "ہنر شو بیاموز" بالکل بجا کہا ہے۔ برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دو چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہو گئی۔ اور اُن کے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا۔ یا کچھ ادبی قسم کے لوگ جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے اب ذرا اچھی طرح جاننے لگے۔ اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کئے گئے جہاں شہر کے شرفاء دردِ سابھی موجود تھے اور کسی شخص نے از راہ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا تو ہمارا استقبال اس قسم کے کلمات سے کیا گیا

"مرزا ازبک ؟" کون ازبک ؟ کہیں وہی تو نہیں۔ جن کے پان بہت مشہور ہیں۔ اچھا کبھی چونا منڈی سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور ان کے پان کھائیں گے"

"اچھا تو یہ ہیں مرزا ازبک ! بخدا شکل وصورت سے بالکل ازبک نظر آتے ہیں۔ مشہور ادیب ہیں۔ ہم نے تو ان کا نام پہلی بار سُنا ہے"

آخر ایک دن جو اپنی گمنامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجہ کی حماقت ہے! اول تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے۔ اور پھر انہیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے۔ چند شعراء اور ادباء جنہیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے۔ یا کالج کے کچھ ذہین طلباء جنہیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے لیکن جو ادبی مضامین سرے سے ہی نہیں پڑھتے۔ دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل میں ہی لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتہ چلا کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ "فلم باز" اپنا ایکٹریس نمبر نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا "مس چنبیلی سے ملاقات" لو چھپنے سے ایڈیٹر "فلم باز" کو بھجوا دیا۔ چار پانچ دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط ملا۔ لکھا تھا:

"مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ پچاس روپے کا چیک بطور معاوضہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی "فلم باز" کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ اپنا فوٹو بھجوانے کی ضرور عنایت کیجئے گا"

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار منہ سے نکلا! "ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے اگر شروع سے فلمی رسائل میں لکھتے تو آج خاصے مالدار ہوتے"

ادبی مضامین کا اس فلمی مضمون سے موازنہ کیا۔ تو پتہ چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لئے گھنٹوں مغز پچی کرنی پڑتی ہے وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جا سکتا ہے "مس چنبیلی سے ایک ملاقات" کو ہی لیجئے۔ لکھنا ہی کیا تھا بس اتنا ہی کہ...... "بوٹا سا قد۔ چھریرا بدن۔ خوب صورت ناک نقشہ۔ مس چنبیلی واقعی مس چنبیلی ہے۔ وہ ایک نہایت پُر اسرار ایکٹریس ہے اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے وہ اپنی جلد کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے دیسی صابن کا استعمال کرتی ہے اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں۔ کیونکہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں صاف کرتی رہتی ہے۔ اسے عطر حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اس نے غلطی سے عطر حنا سونگھ لیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے پتہ چلا تھا کہ وہ عطر حنا نہیں تھا۔ کلوروفارم تھا۔

مس چنبیلی عموماً شام کا کھانا صبح اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی اور بینگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اُسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو۔ کھوٹے سکے خالی بوتلیں اور ٹوٹے لوٹے اکٹھا کرنے کا اسے بے حد شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ!"

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ جسے دیکھو "فلم باز" کا ایکٹریس نمبر ہاتھ میں لئے مبارکباد دینے چلا آ رہا ہے۔

... صاحب ۔ واہ! خوب مضمون لکھا ہے ۔ واللہ لطف آگیا
... سبحان اللہ! مضمون کیا لکھا ہے قلم توڑ کر رکھ دیا۔"

... کی بات ہے کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لئے کتھا مل چونا
... پر گئے ۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں پتو اڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھسر
... ایک آدھ منٹ کے بعد کتھا مل نے ذرا اونچی آواز میں کہا:

"... پوچھ لو نا۔ شرماتے کیوں ہو؟"

"... بات ہے بھئی ؟"

... کہا۔

"... بات پوچھنا تھی ؟"

"کہئے ۔"

"آپ مرجا آج یک ہیں نا ؟"

"... میں مرجا آریک ہوں ۔"

... بہت اچھا مجون ہے ۔ ہم نے اسے پڑھا تھا ۔ چنبیلی بہت
... ہم نے اپنی دکان میں چنبیلی ہی کی تصویریں لگا رکھی ہیں"
... اس مکان میں واقعی چنبیلی ہی چنبیلی نظر آتی ہے ۔ جیسے
... کتھا مل نے ... کرتے ہوئے کہا۔

"... صاحب ... کیجئے ۔ ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے ۔"

"... کیوں؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا ۔

"... رہنے دیجئے ۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں ۔ مس چنبیلی کو جانتے
... آپ ... کیسے ..."

... بلکہ کہنے لگا ۔

"... جب کبھی پان کا شوق فرمانا ہو تو ہمیں یاد فرمایئے گا ۔"

پان چباتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے کہ ایک حوالدار نے کہا

"... صاحب! ذرا ٹھہریئے تو"

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔ خدا خیر کرے کہیں اس
... گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ۔ کہیں اسے ہم پر جیل سے بھاگے
... کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا ۔

حوالدار صاحب نے کہا " میں پرسوں سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں
... آپ اتفاقاً مل گئے ۔"

"لیکن حوالدار صاحب ہم نے ...... ہمارا مطلب ہے کہ .....؟"

"جی اریک صاحب! حوالدار صاحب نے ہماری بات سُنی اَن سُنی
کرتے ہوئے کہا" آپ نے تو کمال کر دیا ۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے چنبیلی پر
بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں ۔ اور اتنی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے ۔"

مضمون کا ذکر سُن کر جان میں جان آئی ۔ وہ فرمانے لگے :

"آیئے نا ذرا غریب خانے تک ۔ چائے پئیں گے اور ساتھ ہی آپ سے
مس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے ۔"

میرے انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے یہاں لے گئے ۔ چائے پینے کے
دوران میں پوچھنے لگے :

"اریک صاحب! یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک
بار مس چنبیلی نے ایک چور پکڑا تھا ۔ کیا درست ہے ؟"

"جی ہاں بالکل درست ۔"

"لیکن وہ چور کون تھا ؟"

"چور کہاں تھا قبلہ! وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا"

"فاقہ زدہ شاعر؟"

"بے چارہ گھر سے بمبئی آیا تھا کہ فلموں کے گانے لکھے گا لیکن آپ جانتے
ہیں کہ بمبئی سے واقفیت کے بغیر کام کہاں ملتا ہے ۔ وہ ایک مہینے سٹوڈیوز
کی خاک چھانتا رہا ۔ اس اثنا میں جو پونجی گھر سے لایا تھا ختم ہو گئی ۔ آخر ایک
دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی ایک کُند سی تلوار لے کر رات کے ایک بجے
مس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا ۔"

"پھر؟"

"اچانک مس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی ۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھ
کھڑی ہوئی اور شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی ۔

"آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں ۔ شوق سے کیجئے ۔ ع
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے !

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا جو مس چنبیلی کو بروقت یاد آگیا
بس صاحب! شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سُنا تو غش غش کرنے لگا ۔ تلوار اس
کے ہاتھوں سے گر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

"مس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کُند تلوار اٹھائی اور شاعر پر دار کیا۔ بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ فوراً زمین پر آرہا۔ مس چنبیلی نے فتح منائی اور اس کے پٹھان ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں۔ صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"خوب۔ خوب۔ کمال کی دلیری دکھائی مس چنبیلی نے۔"

"جی ہاں!"

"اچھا آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ کیا قصہ تھا؟"

"صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے۔ پھر کبھی عرض کروں گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ہمسایہ ڈاکٹر منوہر لال تشریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے:

"قبلہ ازبک صاحب! آپ تو چھپے رستم نکلے۔ یہ آپ نے لکھنا کب سے شروع کیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ محض معلّم ہیں لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں یونہی شغل کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں۔"

"اچھا ازبک صاحب! یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مس چنبیلی صبح کا کھانا شام اور شام کا کھانا صبح کھاتی ہے۔ اس سے مس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہو جاتی۔"

"قبلہ یہ سب عادت پہ منحصر ہے۔ عادت اور مشق پر ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کرے تو کچھ عرصہ کے بعد اسے صبح و شام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"بہرحال میڈیکل نقطۂ نگاہ سے ذرا عجیب سا لگتا ہے۔"

"قبلہ! میڈیکل نقطۂ نگاہ کو رہنے دیجئے۔ یہ فلم لائن ہے۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔"

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجا لانے کے بعد کرسی پیش کی اور کہنے لگے

"ازبک صاحب! ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں ورنہ گستاخی کبھی نہ ہوتی۔"

"کون سی گستاخی قبلہ؟"

"پچھلے دنوں آپ شربت بنفشہ لینے آئے تھے اور ہم نے آپ سے پیسے لے لئے تھے۔"

"اس میں تو کوئی گستاخی نہیں۔ آخر پیسے تو آپ . . ."

"نہیں صاحب یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر آج اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ شربت بنفشہ ہی چاہیئے نا آپ کو؟"

"جی ہاں چار تولے دیجئے۔"

"تولوں کا حساب چھوڑیئے۔ ازبک صاحب! آپ بوتل ہی لے جائیے۔ ارے بھائی خیراتی لال! ازبک صاحب کو شربت بنفشہ درجہ خاص کی ایک بوتل لا دو۔"

"لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیئے۔"

"اجی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جائیے۔ واہ وا کیا مضمون لکھا ہے آپ نے!"

بوتل پیش کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ مس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں۔ "فلم باز" کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان پر پڑیا باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

ان کا شکریہ ادا کر کے گھر پہنچا۔ تو چند فلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں۔ بےچاری بےحد پریشان تھیں۔ اندر بہانی چاہتی تھی۔ ان میں سے ایک یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ اگر میں ایک کالی بلی مس چنبیلی کو بھجواؤں تو کیا وہ اسے قبول کرلے گی؟

دوسری کے پاس کھوٹے سکوں کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے مس چنبیلی کو نذر کرنا چاہتی تھی۔

تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ مس چنبیلی کون سا لپسٹک استعمال کرتی ہے۔

ان سب کو مناسب مشورے دیئے گئے۔ اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

اسی دن ایک مشہور ادبی رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ قاآنی بدایونی پر ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ اس لئے ہم انہیں ایک مضمون بعنوان "قاآنی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر" لکھ کر بھیجیں

بھجوادیں ہم نے جو انہیں جواب میں خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے:

"محترمی!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ادبی مضامین سے مدت سے تائب ہو چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سراسر تضیع اوقات ہے یہ مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر میں آپ کے رسالے کے لئے مضمون لکھوں گا تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کریں گے کہ مجھے رسالہ بھجوادیں گے۔ یا یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی خرید لوں گا رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھا کروں گا۔ پچاس روپے معاوضہ ملتا ہے۔ کھانے کو پان پینے کو شربت بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ نیز ہم سب سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں۔ صاف گوئی کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنے رسالے میں یہ اعلان شائع فرمادیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضا نہ کرے"

(نیاز مند مرزا گھڈ تیک)

(بشکریہ فروغ اردو لکھنؤ)

افاداتِ مسیح الملک

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا مکمل "دستور العلاج"
جس میں سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان مع تشخیص و علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے
قابلِ قدر اور مفید کتاب ہے، قیمت فی جلد: تین روپے آٹھ روپے
حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی ۲ سے طلب فرمائیں

ابن فرید •

جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی.....

"انسان اپنے تئیں ہمیشہ ایسا ہی
وہ انسان کو انسانیت کے پیمانے
ناپتا۔ ظاہری رکھ رکھاؤ ہی
سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ
کے سامنے ہمیشہ ہی خیرہ رہتی

صبح کو ہونے والی تقریب کے لئے ناشتہ کی میز ابھی تک تیار نہیں ہو پائی تھی، اس نے ایک بار پھر دریچہ پر پڑے ہوئے دبیز پردے کو ذرا سرکا کر باہر جھانکا۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے اور ہاتھوں کو چھوتا ہوا گھس گیا اس کی آنکھوں میں، اس کے کانوں میں اور اس کی ناک میں خنکی کی ایک ناگوار سی تحریک ہوئی۔ تاریکی ابھی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ "جہاں نما" کی چار دیواری کے نیچے سے گذرتی ہوئی شاہراہ پر برقی قمقمے ابھی تک یوں روشن تھے کہ فضا پر انتہائی سکوت اور جمود چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور شاہراہ کے اس پار دور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں ان جگنوؤں کی طرح چمکتے ہوئے برقی قمقموں کے باوجود نظروں سے اوجھل تھیں۔ باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور اندر ایک مصروفیت کا رکا ہنگامہ اور خود اس کے اندر بھی تو اس وقت مضطربانہ الجھن سی تھی۔ اس کے چہرے کو باہر کی ٹھنڈی ہوائیں خنک کرنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اس کے سینے کے اندر کی خلش نے ایک الاؤ سا جلا رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر تک دریچہ کے پردے کو پکڑے کھڑا رہا شاید وہ اس طفلانہ خوش گمانی میں مبتلا تھا کہ سپیدۂ سحر کی پہلی سیمیائی تحریر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے نمودار ہو جائے گی لیکن چند ساعتوں کے بعد اس نے جھنجھلا کر پردے کو گرا دیا اور بڑے ہی تھکے تھکے انداز میں ہال پر ایک نظر ڈالی ویٹرز بڑے انہماک سے اسپیشل ڈشیں تیار کر رہے تھے اور نگراں کی حیثیت سے اس کی وہاں موجودگی ضروری تھی۔

خلاف معمول نصف رات سے جاگنے کی وجہ سے اس کے پپوٹے بوجھل ہو گئے تھے۔ اور بوجھل پن سے آنکھوں میں بری طرح سے کچاؤ سی پیدا کر دی تھی۔ اس کا عضو عضو ٹوٹ رہا تھا اور جما ... نے اچھی خاصی بے کیفی پیدا کر دی تھی۔ رہ رہ کر اس کا دل یہی چاہ رہا تھا یہ سب کچھ چھوڑ کر ہال سے باہر نکل جائے اور کسی خاموش پرسکون پڑی ہوئی کوچ میں دھنس کر سو رہے سوتا رہے یہاں تک کہ صبح کی کرنیں اپنی لطیف سی گرمی کے ساتھ اسے گدگدائیں اور وہ پلکیں اور ساری تھکن دور ہو جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا وہ نہیں جا سکتا تھا صبح ہونے والی ناشتہ کی دعوت کو وقت پر اور اس سے پہلے ساری تیاریاں ہو جانا ضروری تھیں۔ اور پھر اس "جہاں نما" میں کہیں بھی تو کوئی پرسکون گوشہ تھا۔ "جہاں نما" خاموشی کے اتھاہ سمندر میں ایک ایسی کشتی تھی جس کا ایک ایک ذرہ جاگ اور وہ سب اضطراری طور پر چڑھتے سورج مکھی کے پھول کی نمائش کے ہونے والی صبح کی دعوت کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔

پھر رات سے اس ہال میں مقید رہنے کی وجہ ... تھکن اور اعصاب شکنی ہی مسلط نہیں ہو گئی تھی۔ بلکہ اس بے سامانیت کیفی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اس وقت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ اس ہال کے اندر برسہا برس سے مقید ہے اور دنیا سے اس قدر بے تعلق ہو چکا ہے کہ اب یہ خبر بھی نہیں کہ ہال کے باہر کیا ہے۔ اور اب اس کے اندر بری طرح یہ اشتیاق پیدا ہو رہا تھا کہ چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے باہر چلا جائے۔ مگر سارا کام ویٹرز پر چھوڑ کر احتیاط کے بالکل خلاف تھا رفتہ رفتہ اب اس کے اندر اس قدر اضطر

[illegible] وہ اس [illegible] ہال میں مسلسل ٹہل رہا تھا۔ کارنس کی اوٹ میں جلنے [illegible] قمقموں کی روشنی سے ہال ایک سفید دھند سے بھرا معلوم ہوتا تھا اور اس [illegible] کے باوجود ناپسندیدہ سی خلش اک گرمی پیدا کر رہی تھی۔ اس خلش [illegible] پورے ہال کا چکر لگایا۔ ناشتہ کی میز کے پاس سے گذرتا [illegible] کے قریب پہونچا۔ وہ آپس میں بڑے ہی تلخ انداز میں ایک دوسرے [illegible] ایک دوسرے سے مختلف چیزیں طلب کر رہے [illegible] سرعت سے کام کر رہے تھے۔ وہ بے ارادہ ان کے [illegible] کھڑا رہا۔ اتنے میں سلیم ہال میں داخل ہوا اور یوں اس نے اپنی دلی [illegible] دیا۔

"سلیم [illegible] ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔"

سلیم کو بڑے بھائی کا کہنا ماننا پڑا۔

اور وہ اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہال کے باہر نکل آیا۔ [illegible] برقی قمقموں کی خواب آلود روشنی اسے ابھی "جہاں نما" کے باہر اور "جہاں نما" [illegible] ہو رہی تھی۔ برآمدہ میں سے ہوتا ہوا وہ سامنے لان میں چلا گیا [illegible] کے نیچے جا بجا لگے ہوئے تھے اور اس کے باوجود کئی قمقموں سے [illegible] کا کام لیا جا رہا تھا۔ لان کے وسط میں مدور سیڑھی نما چوبی [illegible] بنایا جا رہا تھا۔ اس پر سفید پالش بڑی معصوم اثر انگیزی پیدا [illegible] رہی تھی۔ اس مدور ڈائس کے گرد کتنی ہی کرسیاں ایک دائرہ کی شکل میں [illegible] دی جا چکی تھیں۔ اور کتنی ابھی اتنی عجلت کے ساتھ ترتیب دی [illegible] رہی تھیں۔ کرسیوں کے دائرہ کے درمیان چار کشادہ راستے جن پر شوخ بانات [illegible] لگی تھی بڑی دلکشی پیدا کر رہے تھے۔ وہ وہاں کچھ دیر ٹہلتا رہا اور یونہی [illegible] تمام چیزوں کو دیکھتا رہا لیکن ایسی مصروف جگہ چند لمحوں کی بھی [illegible] کو غنیمت ہے۔

"[illegible] ذرا تم فہرست لیکر کرسیوں پر سلیپیں تو لگا دو جلدی سے" اس [illegible] چچا فضلی نے اس کے لئے کام ڈھونڈ نکالا۔

بے دلی کے ساتھ اس نے فہرست ہاتھ میں لے لی اور ایک سرسری [illegible] تمام ناموں پر ڈال گیا۔ ترتیب ثروت و مرتبہ ہی کے لحاظ سے تھی۔ تمام [illegible] بڑے لوگ اگلی نشستوں پر اور ان سے کم تر پچھلی نشستوں پر اسوقت [illegible] معلوم کیوں اس کے ذہن میں اس کے دوست توصیف کے جملے بازگشت کرنے لگے "انسان اپنے تئیں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ انسان کو انسانیت کے پیمانے پر نہیں ناپتا ظاہری رکھ رکھاؤ ہی اس کے لئے سب کچھ ہوتا ہے اس کی نگاہیں دولت کے سامنے ہمیشہ ہی خیرہ رہتی ہیں۔" لیکن وہ اس بازگشت کو اپنے ذہن میں قوت اختیار کرنے نہیں دینا چاہتا تھا اور نہ وہ اس کے لئے آمادہ تھا۔ ہال سے گلو خلاصی پانے کے بعد وہ وہاں اٹک جائے۔ اس لئے اس نے فہرست چچا فضلی ہی کے ہاتھ میں پکڑا دی اور بولا میں ہال میں جا رہا ہوں، وہاں سلیم کو کھڑا کر آیا ہوں" کہتا ہوا لان سے نکل آیا۔ لان کی اونچی قوت کے قمقموں کی روشنی "جہاں نما" کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ اور بہت سے ایسے سائے ان دیواروں پر نمودار ہو گئے تھے جو ان دیواروں کے لئے بالکل نئے تھے۔

ایک بار پھر وہ برآمدے سے ہوتا ہوا ہال کے سامنے آ گیا لیکن اس کی طبیعت نہ چاہی کہ وہ اتنی جلد ہال میں واپس چلا جائے۔ پھر ابھی وہاں سلیم تو موجود ہی ہوگا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ ہال سے کچھ ہٹ کر اس کے ڈیڈی جمالی کا کمرہ تھا۔ روشنی سینڈ بلاسٹ کے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی اس چیز نے روشنی میں ایک اسرار بھر دیا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر اس کے ڈیڈی نے پکارا۔

"کون ہے؟"

لیکن وہ بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گیا۔ سینڈ بلاسٹ کے شیشوں کی وجہ سے وہ خود بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اور کام سے بچ نکلنے کا یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اب وہ برآمدہ کی مشرقی حد پر پہونچ چکا تھا۔ وہاں سے برآمدہ مشرق کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ بھی غیر ارادی طور پر اسی سمت مڑ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اب وہ اس کمرے کے سامنے آ گیا جو ہمیشہ خالی پڑا رہا کرتا تھا۔ اور جیسے اس رات آرکسٹرا والوں کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ اس رات سے پہلے وہ کمرہ کباڑ خانہ تھا۔ اور اس رات کو وہ آرکسٹرا روم بن گیا تھا۔ اس کے دل میں شوق پیدا ہوا۔ وہ اس انقلاب کا نظارہ بھی کر لے۔ دروازوں کو کھولتا ہوا آہستہ سے وہ اندر داخل ہو گیا۔ مختلف سازوں کو درست کیا جا رہا تھا۔ تمام سازندے اپنی وردیوں کو بڑی احتیاط سے پہننے کی کاوش کر رہے تھے۔ تمام ایک سی وردیاں، تمام بے شکن وردیاں۔ اور ان کا افسر موسیقی کی دھن کے لئے اشارات کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس کو داخل ہوتے

ہوئے سے بنے دیکھا، لیکن اس کی طرف متوجہ کوئی نہ ہوا۔ ایسے موقع پر سازندے بڑی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں، اور ان میں ایک تکبر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ مختلف بگلوں، ٹرمپٹوں اور فلیوٹوں وغیرہ کی ہم آہنگ آواز سننے کے لئے ہر ایک ہی منہ اٹھائے ان کی طرف بھاگا چلا آتا ہے۔

جب وہ آرکسٹرا روم میں داخل ہوا تو نہ معلوم کیوں اسے اپنے اندر کچھ اس طرح کا احساس پیدا ہوتا ہوا معلوم ہوا جیسے وہاں آنے سے اس کا دل اور اچاٹ ہو گیا ہے اور اس کی بے کیفی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ چند سکنڈ میں ہی اس کی اکتاہٹ بے انتہا بڑھ گئی، اور کمرہ سے باہر نکل آیا۔ لیکن باہر نکلتے وقت وہ اپنے آپ کو قصد و ارادہ سے اس قدر خالی پا رہا تھا کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس دروازے سے نکلنے کے بعد اب وہ کدھر جائے گا۔

اس نے کچھ لمحے برآمدہ میں توقف کیا اس لئے نہیں کہ وہ کچھ سوچے، بلکہ بس یونہی اور پھر وہ برآمدہ کے جنوب کی طرف چلنے لگا۔ یہ برآمدہ "جہاں نما" کے عقب میں ختم ہوتا تھا جہاں ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا اور پائیں باغ کے مشرقی کونے پر مالی کا کوارٹر تھا۔ وہ برآمدہ کی حد پر پہونچ کر پائیں باغ کے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ "جہاں نما" کے عقب کے برقی قمقمے پائیں باغ کے پیڑوں اور نزدیک کے پودوں کی چوٹیوں کو منور کر رہے تھے لیکن پھر بھی تاریکی اور کہر کی وجہ سے روشنی بڑی دھندلی سی تھی۔ مالی کے کوارٹر میں شاید کوئی چراغ روشن تھا جس کی بہت ہی مدھم روشنی ایک زرد سا نقطہ نظر آ رہی تھی۔ ہاں وہ بھی تو جاگ رہا ہوگا۔ آج اسے بھی تو سفید وردی نما پوشاک ملی ہوگی۔ یہ اس کی ہی تو دن رات کی محنتوں کا پھل تھا کہ تاریکی دھند اور کہرے سے اٹی ہوئی فضا میں "جہاں نما" ایک ایسی کشتی بن گئی تھی جس کا ایک ایک فرد جاگ رہا تھا اور جس کے گوشہ گوشہ میں سے ٹکراتی ہوئی حرکت اور زندگی کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور آج نور میں پوری طرح نہائی جا رہی تھی۔ اس کے اندر مالی کی عظمت کا احساس جاگزیں ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اس کے کوارٹر کی طرف بے مقصد دیکھتا رہا۔

"اے مالی! دیکھو بچے کا بدن اور گرم ہو گیا" شاید یہ مالی کی عورت کی آواز تھی۔

"ہاں تو اسے ذرا اچھی طرح اڑھائے رکھنا" مالی نے پائیں باغ کے کسی گوشہ سے بڑے تاکیدی انداز میں جواب دیا۔

"لیکن پھر تو آ کیوں نہیں جاتا۔ اسے دیکھ تو لے" عورت نے [illegible] آمیز لہجے میں پھر پکارا۔

"میں آکر کیا دیکھ لوں گا۔ تو اسے ٹھیک سے اڑھائے رکھ۔ میں جلدی سے یہ گملہ تیار کر لوں وقت کم رہ گیا ہے نا"

سکوت اور خاموشی میں ان دور سے آنے والے جملوں نے اس کی بے کیفی میں اور اضافہ کر دیا۔ اور وہ اپنے اندر ایک طرح کی گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ پھر فوراً ہی اسے خیال آیا یہ "جہاں نما" کا عقب ہے اور وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

اب اسے پھر ہلکی ہلکی خنکی اور سینے کے اندر وہی ناپسندیدہ سی جلن محسوس ہونے لگی اور اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ بے خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں، اور اس کا دل بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ وہ کسی خاموش جگہ پڑی ہوئی کوچ میں دھنس کر سو رہے۔ اور صبح کی ہلکی ناچتی تھرکتی ہوئی روپہلی کرنوں کے ساتھ بیدار ہو۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس نے ایک لمبی سی جمائی لی۔ وہ اب پھر آرکسٹرا روم کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ مختلف سازوں کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر یہ آوازیں اس کے اندر ذرا بھی شگفتگی یا تازگی پیدا نہ کر سکیں اور وہ یہ سوچتا ہوا چلتا رہا کہ کیا واقعی موسیقی سفلی جذبات کی آسودگی ہے؟ اور کیا سفلی جذبات کی آبیاری انسانیت سے گرا ہوا فعل نہیں؟ ملی جلی تاریکی اور روشنی میں وہ برآمدے سے گذرتا ہوا۔ کمروں سے مصروفیت کے لہجے میں رچی ہوئی آوازیں آتی رہیں، اور کچھ مصروف لوگ اس کے پاس سے گذرتے رہے لیکن اس نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ چلتا رہا۔ اور ایک بار پھر وہ چکر کاٹ کر ہال کے سامنے آ گیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اوہ، ساڑھے چار؟ چلنا چاہیے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے" اس کے ہال میں داخل ہوتے ہی سلیم نے بے چینی سے کہا "بہت دیر کر دی آپ نے بھائی جان۔ اب آپ رکیئے یہاں میں جاتا ہوں"

"ہاں ہاں تم جاؤ" اس نے ایک مصنوعی بزرگی کے ساتھ کہا۔

ہال میں تقریباً ساری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ اور اب میز آراستہ
ہی تھی۔ چھری، کانٹے، چمچے اور پلیٹوں کے رکھنے کا ہلکا سا شور، اور
کے قدموں کی آوازیں اور ان کے فقرے ہال میں اس طرح گونج
ہے جیسے وہ کوئی فیکٹری ہو۔ وہ خالی الذہن سا یہ سب کچھ دیکھتا
ں ایک بار پھر وہ دریچہ تک گیا۔ پردہ کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ ایک خنک
پھر اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ دور پہاڑیوں کے نقوش اب سیاہی کے باوجود
بکھلاتے سے نظر آ رہے تھے۔ "جہاں نما" کی چہار دیواری کے پاس سے
دلی شارع کے برقی قمقموں کی روشنی اب اور بھی زرد پڑتی جا رہی تھی
اگی جس نے جمود اور خاموشی میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ اب رخصت
ں شارع پر چند ایک جدید نمونوں کی موٹریں یوں گذرتی ہوئی نظر
یں جیسے وہ مسطح شیشوں پر پھسل رہی ہوں۔ اور ان پر برقی قمقموں
واقعی پھسل رہی تھی۔ یقیناً یہ سب "جہاں نما" کے مہمان تھے جو
وڑے سورج مکھی کی پردہ کشائی میں شرکت کے لئے آ رہے تھے؟
نک شارع کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا
۔ موٹروں کے نمونے اور بھی نفیس اور خیرہ کن ہونے جا رہے تھے
مہمان تھے جن کا جہاں نما کے مکینوں نے بڑی گرمجوشی اور تپاک
خیر مقدم کیا ہوگا۔ اور اس خیر مقدم میں انکسار کی خوشامد بھی
ہی ہوگی۔ لیکن وہ اکا دکا جو سائیکلوں، تانگوں، اور معمولی قسم کی
میں آئے ہوں گے ان سے تو شاید جہاں نما کے کسی ذریعے ہاتھ
یا ہو گا اور وہ اپنا دعوت نامہ اس طرح دکھلا کر اندر داخل ہوتے
جیسے وہ اس شبہ کو دور کر رہے ہوں کہ وہ بن بلائے آئے ہیں۔
سے ہال سے چیزوں کو رکھنے اٹھانے کی آوازیں بہت کم آ رہی تھیں
آراستہ کی جا چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا واقعی ایسا ہی تھا۔ اس
باہر ہندوستانی گھڑی کی طرف دیکھا اور یقین کی خاطر آتشدان
پر گھڑی کی طرف نگاہ کی تقریب کا وقت بالکل قریب آ چکا
ں کو تقریب کی چہل پہل دیکھنے کا موقع فراہم کرنے کے لئے چچا
بل آ چکے تھے اس نے اپنے ہاتھوں کو آہستہ سے رگڑا اور پھر چہرے
اور ہال کے صدر دروازہ سے نکل کر پورٹیکو سے ہوتا ہوا لان
گیا "جہاں نما" کی چہار دیواری میں اس وقت متعدد موٹریں

کھڑی ہوئی تھیں، اور ان میں سے اکثر کے سوفر ان کے پاس ہی بڑے
ادب سے ایستادہ تھے جیسے وہ تحقیر کے مجسمے تھے جنہیں دولت، تکبر اور جھوٹی
خدائی نے نصب کر دیا ہو۔ مختلف مرد عورتیں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے
لان پر ادھر ادھر بے فکری کے ساتھ ٹہل رہے تھے ان کے قدموں کے نیچے
لان کا سبزہ اس طرح دب رہا تھا جیسے وہ ان کے قہقہوں، ان کی مسکراہٹوں
اور ان کی بے مقصد گپوں کے بوجھ سے کراہ رہا ہو۔ ہر طرف زرق برق
پوشاکیں نظر آ رہی تھیں۔ ہائی پاور کے دودھیا برقی قمقموں کی روشنی
ایک جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ کچھ لوگ اپنی جگہ پر بیٹھتے تھے اور پھر اٹھ کر
چلے آتے تھے۔ شاید بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تھے۔ اس لئے لان میں ٹہلنے لگتے
تھے جمالی فیملی ابھی تک گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ تقریباً سارے ہی
آنے والے آ چکے تھے لیکن ڈیڈی جمالی اور ان کی فیملی ابھی تک گیٹ پر موجود
تھے۔ گیٹ کے باہر پاس کی کوٹھیوں کے کوارٹروں کے بچے، عورتیں اور کچھ
مرد اس کے جھمیلے کو دیکھنے کے لئے آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں سے تحیر،
جھجک اور خوف کے آثار صاف نمایاں تھے اور باہر کھڑا ہوا چوکیدار آج اپنی
سوتی وردی میں جکڑا ہوا اور خنکی سے کپکپاتا ہوا انہیں برابر ہٹا رہا تھا
دھتکار رہا تھا اور گیٹ کے اندر کم حیثیت لوگ جمالی فیملی والوں سے بات کرنے
کا شرف حاصل کرنے کی خاطر جب کسی اور کے پاس جانے کی ہمت نہیں
کر پاتے تھے تو اس کے پاس ہی آ جاتے تھے اور بڑے ہی خوشامدانہ انداز
میں اس کی مزاج پرسی کرتے تھے اور وہ مسکراتا ہوا خشک انداز میں ان
کو چھوٹے موٹے جواب دیکر ٹال رہا تھا یہ ایک عجیب موقع تھا جب چھوٹے
چھوٹے افسر، تحصیلدار، ایس ڈی او وغیرہ احساس کمتری محسوس کرنے
کے لئے .... مجبور ہو گئے تھے اور ان کی پرانی ماڈل کی
موٹریں ان کے دامنوں پر شرمندگی کا داغ بن گئی تھیں۔ اور ان کی پوشاکیں
خواہ اپنی جگہ پر کیسی ہی ہوں لیکن ان کی خواتین اپنے پہناوے میں زیادہ کشش
نہ پا کر اخباری ایڈیٹروں اور فیکٹری منیجروں سے خوش گپیاں کرنے کے لئے
مجبور ہو گئی تھیں۔ اور وہ اس سارے منظر کو ایک زہرخند کے ساتھ دیکھ
رہا تھا۔

گیٹ کے باہر ننگے، خوفزدہ اور متحیر حیوان نما انسانوں میں
تحریک ہوئی۔ سب کائی کی طرح چھٹ کر سڑک کے کناروں پر چلے گئے اور

ہوئے سب نے دیکھا، لیکن اس کی طرف متوجہ کوئی نہ ہوا۔ ایسے موقع پر
ساز ندے بڑی اہمیت اختیار کرجاتے ہیں، اور ان میں ایک تکبر بھی پیدا
ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ مختلف بگلوں، ٹرمپیٹوں اور فلیوٹوں وغیرہ کی ہم
آہنگ آواز سننے کے لئے ہر ایک ہی منہ اٹھائے ان کی طرف بھاگا چلا
آتا ہے۔

جب وہ آرکسٹرا روم میں داخل ہوا تو نہ معلوم کیوں اسے اپنے اندر
کچھ اس طرح کا احساس پیدا ہوتا ہوا معلوم ہوا جیسے وہاں آنے سے اس
کا دل اور اچاٹ ہوگیا ہے اور اس کی بے کیفی میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے
چند سکنڈ میں ہی اس کی اکتاہٹ بے انتہا بڑھ گئی، اور کمرہ سے باہر نکل
آیا۔ لیکن باہر نکلتے وقت وہ اپنے آپ کو قصد وارادہ سے اس قدر خالی پا رہا
تھا کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس دروازے سے نکلنے کے بعد اب وہ کدھر
جائے گا۔

اس نے کچھ لمحے برآمدہ میں توقف کیا اس لئے نہیں کہ وہ کچھ
سوچے، بلکہ بس یونہی اور پھر وہ برآمدے کے جنوب کی طرف چلنے لگا۔ یہ
برآمدہ "جہاں نما" کے عقب میں ختم ہوتا تھا جہاں ایک چھوٹا سا پائیں
باغ تھا اور پائیں باغ کے مشرقی کونے پر مالی کا کوارٹر تھا۔ وہ برآمدہ کی حد
پر پہونچ کر پائیں باغ کے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ "جہاں نما" کے عقب کے
برقی قمقمے پائیں باغ کے پیڑوں اور نزدیک کے پودوں کی چوٹیوں کو منور
کر رہے تھے لیکن پھر بھی تاریکی اور کہر کی وجہ سے روشنی بڑی دھندلی سی
تھی۔ مالی کے کوارٹر میں شاید کوئی چراغ روشن تھا جس کی بہت ہی مدہم
روشنی ایک زرد سا نقطہ نظر آرہی تھی۔ ہاں وہ بھی تو جاگ رہا ہوگا۔ آج اسے
بھی تو سفید وردی نما پوشاک ملی ہوگی۔ یہ اس کی ہی تو دن رات کی محنتوں
کا پھل تھا کہ تاریکی دھند اور کہرے سے اٹی ہوئی فضا میں "جہاں نما" ایک
ایسی کشتی بن گئی تھی جس کا ایک ایک فرد جاگ رہا تھا اور جس کے گوشہ گوشہ
میں سے ٹکراتی ہوئی حرکت اور زندگی کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور آج نور میں
پوری طرح نہاتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر مالی کی عظمت کا احساس جاگزیں
ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اس کے کوارٹر کی طرف بے مقصد دیکھتا رہا۔

"اے مالی! دیکھو بچے کا بدن اور گرم ہوگیا ہے" شاید یہ مالی کی عورت
کی آواز تھی۔

"ہاں تو اسے ذرا اچھی طرح اڑھائے رکھنا" مالی نے پائیں باغ کے
کسی گوشہ سے بڑے تاکیدی انداز میں جواب دیا۔

"لیکن پھر کوئی تو آ کیوں نہیں جاتا۔ اسے دیکھو تو لے" عورت نے
آمیز لہجے میں پھر پکارا۔

"میں آکر کیا دیکھ لوں گا۔ تو اسے ٹھیک سے اڑھائے رکھ
جلدی سے یہ گملہ تیار کرلوں وقت کم رہ گیا ہے نا"

سکوت اور خاموشی میں ان دور سے آنے والے جملوں نے
بے کیفی میں اور اضافہ کردیا۔ اور وہ اپنے اندر ایک طرح کی گھٹن سی محسوس
کرنے لگا۔ پھر فوراً ہی اسے خیال آیا یہ "جہاں نما" کا عقب ہے اور
پاؤں واپس ہوگیا۔

اب اسے پھر ہلکی ہلکی خنکی اور سینے کے اندر وہی ناپسندیدہ
محسوس ہونے لگی اور اسے یہ بھی یاد آگیا کہ بے خوابی کی وجہ سے اس
میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں، اور اس کا دل بے اختیار یہی چاہتا تھا
کسی خاموش جگہ پڑی ہوئی کوچ میں دھنس کر سو رہے۔ اور صبح
ہلکی ناچتی تھرکتی ہوئی روپہلی کرنوں کے ساتھ بیدار ہو۔ اس احساس کے
ساتھ ہی اس نے ایک لمبی سی جمائی لی۔ وہ اب پھر آرکسٹرا روم کے
سے گذر رہا تھا۔ مختلف سازوں کی ہلکی آوازیں آرہی تھیں، مگر
اس کے اندر ذرا بھی شگفتگی یا تازگی پیدا نہ کرسکیں اور وہ یہ سوچتا
رہا "کیا واقعی موسیقی سفلی جذبات کی آسودگی ہے؟ اور کیا سفلی جذبات
کی آبیاری انسانیت سے گرا ہوا فعل نہیں؟" ملی جلی تاریکی اور روشنی میں
وہ برآمدے سے گذرتا ہوا۔ کمروں سے مصروفیت کے لہجے میں
آوازیں آتی رہیں، اور کچھ مصروف لوگ اس کے پاس سے گذر
لیکن اس نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ چلتا رہا۔ اور ایک بار پھر
کاٹ کر ہال کے سامنے آگیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی
میں وقت دیکھا۔

"اوہ، ساڑھے چار؟ چلنا چاہئے۔ اب وقت بہت کم
اس کے ہال میں داخل ہوتے ہی سلیم نے بے چینی سے کہا:
دیر کردی آپ نے بھائی جان۔ اب آپ رکئے یہاں۔ میں جاتا ہوں"
"ہاں ہاں تم جاؤ" اس نے ایک مصنوعی بزرگی کے ساتھ

ہال میں تقریباً ساری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ اور اب میز آراستہ کی جا رہی تھی۔ چھری، کانٹے، چمچے اور پلیٹوں کے رکھنے کا ہلکا سا شور، اور ویٹرز کے قدموں کی آوازیں اور ان کے فقرے ہال میں اس طرح گونج رہے تھے جیسے وہ کوئی فیکٹری ہو۔ وہ خالی الذہن سا یہ سب کچھ دیکھتا رہا لیکن ایک بار پھر وہ دریچہ تک گیا۔ پردہ کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ ایک خنک جھونکا پھر اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ دور پہاڑیوں کے نقوش اب سیاہی کے باوجود جھلملاتے سے نظر آ رہے تھے۔ "جہاں نما" کی چہار دیواری کے پاس سے گذرنے والی شارع کے برقی قمقموں کی روشنی اب اور بھی زرد پڑتی جا رہی تھی اور وہ تاریکی جس نے جمود اور خاموشی میں کافی اضافہ کر دیا تھا اب رخصت ہو رہی تھی۔ شارع پر چند ایک جدید نمونوں کی موٹریں یوں گذرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جیسے وہ مسطح شیشوں پر پھسل رہی ہوں۔ اور ان پر برقی قمقموں کی روشنی واقعی پھسل رہی تھی۔ یقیناً یہ سب "جہاں نما" کے مہمان تھے جو تیرہ انچ چوڑے سورج مکھی کی پردہ کشائی میں شرکت کے لئے آ رہے تھے۔ وہ کافی دیر تک شارع کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا۔ موٹروں کے نمونے اور بھی نفیس اور خیرہ کن ہوتے جا رہے تھے۔ ہاں یہ وہ مہمان تھے جن کا جہاں نما کے مکینوں نے بڑی گرمجوشی اور تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا ہوگا۔ اور اس خیر مقدم میں ایک طرح کی خوشامد بھی جھلک رہی ہوگی۔ لیکن وہ اکا دکا جو سائیکلوں، تانگوں اور معمولی قسم کی موٹروں میں آتے ہوں گے ان سے تو شاید جہاں نما کے کسی فرد نے ہاتھ بھی نہ ملایا ہوگا اور وہ اپنا دعوت نامہ اس طرح دکھلا کر اندر داخل ہوتے ہوں گے جیسے وہ اس شبہ کو دور کر رہے ہوں کہ وہ بن بلائے آئے ہیں۔

اب ہال سے چیزوں کو رکھنے اٹھانے کی آوازیں بہت کم آ رہی تھیں شاید میز آراستہ کی جا چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا واقعی ایسا ہی تھا۔ اس نے پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور یقین کی خاطر آتشدان پر رکھی ہوئی بڑی گھڑی کی طرف نگاہ کی۔ تقریب کا وقت بالکل قریب آ چکا تھا۔ اور اس کو تقریب کی چہل پہل دیکھنے کا موقع فراہم کرنے کے لئے چچا نئی ہال میں آ چکے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو آہستہ سے رگڑا اور پھر چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ہال کے صدر دروازہ سے نکل کر پورٹیکو سے ہوتا ہوا لان میں پہونچ گیا۔ "جہاں نما" کی چہار دیواری میں اس وقت متعدد موٹریں کھڑی ہوئی تھیں، اور ان میں سے اکثر کے شوفر ان کے پاس ہی بڑے ادب سے ایستادہ تھے جیسے وہ تحقیر کے مجسمے تھے جنہیں دولت تکبر اور مجبور خدائی نے نصب کر دیا ہو۔ مختلف مرد عورتیں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر لان پر ادھر ادھر بے فکری کے ساتھ ٹہل رہے تھے ان کے قدموں کے نیچے لان کا سبزہ اس طرح دب رہا تھا جیسے وہ ان کے قہقہوں، ان کی مسکراہٹوں اور ان کے بے مقصد گپوں کے بوجھ سے کراہ رہا ہو۔ ہر طرف زرق برق پوشاکیں نظر آ رہی تھیں۔ ہائی پاور کے دودھیا برقی قمقموں کی روشنی ایک جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ کچھ لوگ اپنی جگہ پر بیٹھتے تھے اور پھر اٹھ کر چلے آتے تھے۔ شاید بیٹھتے بیٹھتے اکتا جاتے تھے۔ اس لئے لان میں ٹہلتے تھے۔ جمالی فیملی ابھی تک گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ تقریباً سارے ہی آنے والے آ چکے تھے لیکن ڈیڈی جمالی اور ان کی فیملی ابھی تک گیٹ پر موجود تھے۔ گیٹ کے باہر پاس کی کوٹھیوں کے کوارٹروں کے بچے، عورتیں اور کچھ مرد اس کے میلے کو دیکھنے کے لئے آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں سے تحیر جھجک اور خوف کے آثار صاف نمایاں تھے اور باہر کھڑا ہوا چوکیدار آج اپنی سوتی وردی میں اکڑا ہوا اور خنکی سے کپکپاتا ہوا انہیں برابر ہٹا رہا تھا دھتکار رہا تھا اور گیٹ کے اندر کم حیثیت لوگ جمالی فیملی والوں سے بات کرنے کا شرف حاصل کر لینے کی خاطر جب کسی اور کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے تو اس کے پاس ہی آ جاتے تھے اور بڑے ہی خوشامدانہ انداز میں اس کی مزاج پرسی کرتے تھے اور وہ مسکراتا ہوا خشک انداز میں ان کو چھوٹے موٹے جواب دے کر ٹال رہا تھا۔ یہ ایک عجیب موقع تھا جب چھوٹے چھوٹے افسر، تحصیلدار، ایس ڈی او وغیرہ احساس کمتری محسوس کرنے کے لئے .... مجبور ہو گئے تھے اور ان کی پرانی ماڈل کی موٹریں ان کے دامنوں پر شرمندگی کا داغ بن گئی تھیں۔ اور ان کی پوشاکیں خواہ اپنی جگہ پر کیسی ہی ہوں لیکن ان کی خواتین اپنے پہناوے میں زیادہ کشش نہ پا کر اخباری ایڈیٹروں اور فیکٹری مینجروں سے خوش گپیاں کرنے کے لئے مجبور ہو گئی تھیں۔ اور وہ اس سارے منظر کو ایک زہر خند کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

گیٹ کے باہر ننگے، خوفزدہ اور متحیر حیوان نما انسانوں میں تحریک ہوئی۔ سب کائی کی طرح چھٹ کر سڑک کے کناروں پر چلے گئے اور

محافظ کاروں اور موٹر سائیکلوں کے درمیان وہ معزز مہمان آگیا جس کے انتظار میں پارٹی کے تمام لوگ ٹہل ٹہل کر اپنا وقت برباد کر رہے تھے۔ اور جمالی فیملی کو چند قدم پیچھے چھوڑ کر کار رکی۔ ڈیڈی جمالی اور ممی جمالی ان کے خیر مقدم کے لئے دوڑ کر اس طرح لپکے جیسے ان کے گلے میں خوشامد کا پٹہ پڑا ہوا اور اس میں زنجیر ڈال کر کھینچا جا رہا ہو اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اس طرح چمک رہی تھی جیسے ان کی باچھیں تر ہوں۔

آج پچھلے پہر سے اس کے ذہن میں اس طرح کے تاثرات کیوں ابھر رہے تھے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور پھر رہ رہ کے ذہن کے گوشہ میں توصیف کے پیکر کا ابھرنا اس کے لئے اور بھی اضطراب کا باعث تھا۔ وہ اسے کسی طرح اپنے تصور میں آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ نہ معلوم کیوں شاید وہ توصیف کی تنقیدوں کی تاب نہیں لا سکتا تھا اس کے فقرے اکثر اس کے لئے فسردہ کن ہوتے تھے۔ وہ انہیں سن کر کچھ مرجھا سا جایا کرتا تھا حقیقتیں اس کے سامنے کچھ اس طرح عریاں ہو کر آجاتی تھیں آجاتی تھیں کہ اس کو اپنے اس ماحول سے خوف سا معلوم ہونے لگتا جو اس ریت کے محل میں قائم تھا۔ اور پھر جب سے توصیف نے اس تقریب کے بارے میں کہا تھا "اچھا تم نے اپنے ان بتوں کو خوش کرنے کا موقع ڈھونڈ ھ ہی نکالا" یہ اس کے لئے اور بھی سوہان روح ہو گیا تھا، اور اس وقت یہی منظر اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور یہی وہ حقیقت تھی جس کو جھٹلانے کے لئے وہ توصیف سے پھر بھی الجھا تھا۔

جمالی فیملی نے اس معزز مہمان کو بڑے تپاک سے کار سے اتارا اور جسموں کو کافی خم دیتے ہوتے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ ہلکے ہلکے لان کی طرف چلنے لگا۔ اور وہ معزز مہمان ان کے درمیان سرو قد بن کر چلتا رہا۔ اور لان میں خوش گپیاں کرتے ہوئے ٹہلنے والے سب اپنی اپنی جگہوں پر پہونچ گئے اور آرکسٹرا والوں نے ڈرم پر ایک چوٹ دیکر ایک مدھم سی دھن کو فضا میں بکھیرنا شروع کر دیا اور تمام دوسرے مہمان ابھی تعظیماً کھڑے رہے یہاں تک کہ وہ معزز مہمان اپنی جگہ پر پہونچکر بیٹھ گیا پھر تمام لوگ بیٹھ گئے۔

پھر وہ معزز مہمان اٹھا، آرکسٹرا انسٹرکٹر نے اپنے پوائنٹر کو ہوا میں لہرایا۔ معزز مہمان نے سفید ڈائس پر چڑھ کر برقی قمقموں کی مانند پڑتی ہوئی دودھیا روشنی میں سفید ریشمی کپڑے کو پورسلین کے سفید گملے پر سے اٹھایا اور ساتھ ہی آرکسٹرا انسٹرکٹر نے اپنے پوائنٹر کو جنبش دی اور ایک بار پھر فضا میں ساز گونج اٹھے اور جمالی فیملی ڈائس کے نیچے کھڑی مسکرانے لگی یہاں تک کہ برقی قمقموں کی روشنی بالکل مدہم پڑ گئی وہ بجھا دیتے گئے اور مشرق کی طرف سے سورج کی سیمیائی کرنیں نمودار ہونے لگیں اور سوا ملکھی کے تیرہ انچ چوڑے پھول نے اپنے شرماتے، لجاتے ہوتے چہرے کو آہستہ آہستہ اٹھا کر سورج کے سامنے کر دیا۔ پھر پر جوش انداز میں تالیاں بجنے لگیں۔ اور پھر بینڈ بجنا بند ہو گیا۔

معزز مہمان ڈائس سے نیچے اتر آیا۔ جمالی فیملی اس کے ساتھ انتہائی تعظیم سے چلنے لگی اور دوسرے تمام مہمان بھی ہال کی طرف چل دیئے۔ ڈیڈی جمالی اور ممی جمالی اب آکر ہال کے دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے اور ہر داخل ہونے والے سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ البتہ یہ گرمجوشی ہر شخص کے عہدہ اور مراتب کے لحاظ سے تھی۔ یہاں تک کہ بالکل آخر میں داخل ہونے والے تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ہی مستحق رہ گئے تھے

اس نے ایک نظر اٹھا کر لان کی طرف دیکھا۔ مالی اپنی سفید وردی میں ملبوس سورج مکھی کے گملے کو اٹھا کر لئے جا رہا تھا۔ لان اجاڑ ہو چکا تھا وہ قہقہے۔ وہ خوش گپیاں اور وہ ہما ہمی ختم ہو چکی تھی اور اس کے تصور میں "بچے کا بدن گرم ہو گیا ہے" گونجنے لگا۔ اوہ، مالی کے اس سے رنگ چہرے کے پیچھے ان تاثرات کو پڑھ سکتا ہے جو اس وقت اس کے سینے میں پیدا ہو رہے ہوں گے۔ کون اس کشمکش کو دیکھ سکتا ہے جو اس ساز آہنگ اور اس سوز دیے کلی کے درمیان پیدا ہو رہی ہو گی! اور مالی کا بے رنگ چہرہ اور اس کی سفید بے داغ وردی جیسے اپنے پیچھے سارے اس ہیجان کو چھپائے ہوتے تھی۔ وہ خود بھی ایک تشنج سا محسوس کرنے لگا تھا کہیں یہ اس کے گوشے کی دنیا میں آنے والے طوفان سے پہلے کا سکون تو نہیں ہے آج وہ اپنے ایک داخلہ دیر داخلہ کو اپنے دوسرے داخلہ دیر داخلہ پر ترجیح دے رہا ہے۔ ایک جہاں نما کو رونق بخشتے ہوتے ہے۔ اس کی چہل پہل ہما ہمی اور رنگا رنگی میں اضافہ کر رہا ہے لیکن دوسرا جہاں نما کے عقب میں پڑا ہوا اس سرد بجھتی ہوئی صبح میں بخار کی حدت میں پھنک رہا ہے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک کو اپنی گود میں اٹھائے پھرے اور دوسرے کو

یونہی بخار میں پڑا ہوا پھنکنے دے۔

کچھ اس انداز سے سوچتے سوچتے جیسے اس کا دماغ بوجھل ہو چکا تھا۔ اس نے بیزاری کے ساتھ لان کی طرف سے نگاہ ہٹائی اور مڑ کر ہال کی طرف دیکھا۔ تمام لوگ داخل ہو چکے تھے۔ وہ بھی ہال کے اندر چلا گیا تمام لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ویٹرز یکے بعد دیگرے انواع و اقسام کے انگریزی ناشتے لا رہے تھے اور ہر ایک کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ اور پیانو فلیوٹوں، مختلف بگلوں کی دھنیں ہال میں ایک نشاط انگیز کیف پیدا کر رہی تھیں۔ وہ معزز مہمان ایک نمایاں جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ڈیڈی جمالی بار بار اس سے مودبانہ انداز میں کچھ پوچھتے تھے۔ ڈیڈی جمالی، جن کی گردن کو آج تک اس نے کسی اور کے سامنے جھکتے ہوئے نہ دیکھا تھا، اور اس وقت بھی دوسرے تمام مہمانوں کے ہونٹوں پر جمالی فیملی کے لئے پر تجسس کلمے تھے وہ اب بھی ایک دوسرے سے جمالی فیملی کے اس عجیب و غریب پھول کی تعریف کر رہے تھے اور ڈیڈی جمالی ان کی طرف سے اب بھی بے اعتنا تھے۔ مگر ڈیڈی جمالی کی پیشانی بھی کسی اور کے سامنے جھک رہی تھی۔

یہ چکر کیا ہے؟ یہ سلسلہ کیا ہے؟ کتنے ہی جمالی فیملی کی عظمت کے گن گا رہے ہیں اور جمالی فیملی پر تعظیم انداز میں کسی اور کے سامنے سرنگوں ہے۔ کسی اور کے سامنے کم تر ہے۔ اور معزز مہمان؟ کیا اس کی گردن کہیں بھی نہیں جھکتی۔ کیا اس کی نگاہیں کسی اور کے قدم نہیں چومتیں۔ کیا اس کا پر فخر سینہ کسی اور کے سامنے نہیں سکڑتا — کیوں نہیں؟ — وہ ایک دم سے چونک پڑا۔ اس کے اندر کوئی توصیف کے لہجے میں بول پڑا تھا اس نے ایک گھبراہٹ کے عالم میں چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کہیں بھی توصیف کا سایہ تک نہ تھا۔ پھر اس نے ایک پر اطمینان سانس لی لیکن ایک خلش اور ایک بے چینی اور بھی عود کر آئی تھی۔ یہ کتنے خدا ہیں جو ایک سائیکل سوار مہمان سے لیکر اس معزز مہمان تک بنے بیٹھے ہیں۔ اور یہ کتنی اغراض ہیں جو ان میں سے ہر ایک سے وابستہ ہیں اور پھر ان اغراض کے پورا ہو جانے کے بعد وہ اپنی خدائی کھو بھی تو دیتے ہیں۔ اور اس مقام سے آگے بڑھ کر بندہ و خواجہ کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔

وہ ایک اضطراب کے عالم میں ہال سے خاموشی کے ساتھ نکل آیا، اور لان میں پراگندہ ذہن کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ لان اجاڑ ہو چکا تھا۔ تمام کرسیاں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ یوں ہی کچھ دیر کے بعد جہاں نما بھی ویران ہو جائے گی۔ یہ چہل پہل ختم ہو جائے گی۔ معزز مہمان جا چکا ہوگا۔ جمالی فیملی کی خدائی واپس آ چکی ہوگی اور مالی اپنے بخار میں پھنکتے ہوئے بچے کے پاس مضطرب بیٹھا ہوگا۔

کیا یہی ہے حاصل اس تیرہ پشت چھوٹے سورج مکھی کے پھول کی نمائش کا جس کی متعدد تصاویر کل اخباروں کے صفحات کی زینت بنی ہوں گی۔　　(بشکریہ "نئی نسلیں")

م۔ نسیم

"فری لو"

(ساحر لدھیانوی کی "تاج" سے متاثر ہو کر)

بیاہ تیرے لئے ایک مظہرِ اُلفت ہی سہی تجھ کو اس رسم و روایت سے محبت ہی سہی
مری محبوب! کوئی بیاہ نیا کر مجھ سے

دیکھ! محبوب ہیں سب پھول ہر اک بھونرے کو مجھ سے ملنے سے تو ڈرتی ہو۔ مگر کیوں آخر؟
"عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو" "راہ فطرت" سے گریز اور یہ ڈر کیوں آخر؟

عہدِ کہنہ کے دھندلکوں میں بھٹکنے والی دورِ حاضر کے خیالوں کو تو دیکھا ہوتا!
پچھلی باتوں ہی کو معراج سمجھنے والی! سُرخ جنّت کے کمالوں کو تو دیکھا ہوتا!

ان گزشت لوگوں نے میری سی محبّت کی ہے (بوالہوس کہتے ہیں جو لوگ انھیں بکتے ہیں)
نہ گواہوں کی ضرورت نہ انھیں قاضی کی کیونکہ وہ لوگ "فری لو" پہ عمل کرتے ہیں

یہ ولیمے یہ مدارات یہ خطبے یہ نکاح ---! ہائے کب سے چلے آتے ہیں یہ جبری احکام"
اب انھیں چھوڑ کہ دنیا بھی انھیں بھول چکی ورنہ معلوم ہے ان سب کا المناک انجام

جنّتِ سُرخ میں جو لوگ ہیں محبوب عوام جانِ من! سوچ تو۔ کیا ان کو محبت ہی نہیں
ان کے اعمال میں بیاہوں کا کہیں نام نہیں کیا ترے دل میں ان اعمال کی وقعت ہی نہیں

ہم کو اس دین سے کیا فائدہ جس کا قانون
کاٹ ڈالے جو کہیں دیکھ بھی لے دستِ ہوس
آ۔ بغاوت کریں اس دور سے جب مذہب نے
ہم غریبوں کی محبت کو کیا تھا ... [illegible]

سعادت حسن منٹو

چچا سام کے نام دوسرا خط

مکرمی و محترمی چچا جان

تسلیمات ——— عرصہ ہوا میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا۔ آپ کی طرف سے تو اس کی کوئی رسید نہ آئی مگر کچھ دن ہوئے آپ کے سفارت خانے کے ایک صاحب جن کا اسم گرامی مجھے اس وقت یاد نہیں شام کو میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک سودیشی نوجوان بھی تھے۔ ان صاحبان سے جو گفتگو ہوئی وہ میں مختصراً بیان کر دیتا ہوں۔

ان صاحب سے انگریزی میں مصافحہ ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی چچا جان کہ وہ انگریزی میں بولتے تھے۔ امریکی نہیں۔ جو میں ساری عمر نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال ان سے آدھ پون گھنٹہ باتیں ہوئیں وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے جس طرح ہر امریکی پاکستانی یا ہندوستانی سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ میں نے بھی یہی ظاہر کیا ہے کہ مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے سفید فام امریکیوں سے مل کر کوئی راحت یا مسرت نہیں ہوتی۔

آپ میری صاف گوئی کا برا نہ مانیے گا۔ پچھلی بڑی جنگ کے دوران میں میرا قیام بمبئی میں تھا۔ ایک روز مجھے بمبئے سنٹرل ریلوے سٹیشن جانے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں وہاں آپ ہی کے ملک کا دور دورہ تھا۔ بچارے ٹامیوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ بمبئی میں جتنی اینگلو انڈین یہودی، اور پارسی لڑکیاں جو عصمت فروشی کو زانہ فیشن اختیار کئے ہوئے تھیں، امریکی فوجیوں کی بغل میں چلی گئیں۔

چچا جان، میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جب کبھی امریکہ کا کوئی فوجی کسی یہودن، پارسی یا اینگلو انڈین لڑکی کو اپنے ساتھ چمٹائے گزرتا تھا تو ٹامیوں کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے تھے۔

اصل میں آپ کی ہر ادا نرالی ہے۔ ہمارے فوجی کو تو یہاں اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ وہ اس کا آدھا پیٹ بھی نہیں بھر سکتی، مگر آپ معمولی چپراسی کو اتنی تنخواہ دیتے ہیں کہ اگر اس کے دو بیٹا ہیں تو وہ ان کو بھی ناک تک بھر دے۔

چچا جان، گستاخی معاف ——— کیا یہ فراڈ تو نہیں۔

آپ اتنا روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، لیکن آپ جو کام کرتے ہیں، اس میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نمائش ہی نمائش ہے ——— ہو سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں، مگر غلطیاں انسان ہی کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی انسان ہیں اگر نہیں ہیں تو میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میں کہاں سے کہاں چلا گیا۔ بات بمبئے سنٹرل ریلوے اسٹیشن کی تھی۔ میں نے وہاں آپ کے کئی فوجی دیکھے ان میں زیادہ تر سفید فام تھے کچھ سیاہ فام بھی تھے۔ میں آپ سے سچ عرض کر دوں کہ یہ کالے فوجی سفید فوجیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنومند اور صحت مند تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ملک کے لوگ اس کثرت سے چشمہ کیوں استعمال کرتے ہیں۔ گوروں نے تو خیر چشمے لگائے ہوئے تھے۔ لیکن کالوں نے بھی جنہیں آپ حبشی کہتے ہیں، اور بوقت ضرورت "لنچ" کر دیتے ہیں، وہ کیوں عینک کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب آپ کی حکمت عملی ہے۔ آپ ہم تک پانچ آنکھیں کے منگی ہیں اس لئے آپ

"ہو سکتا ہے کہ یہاں آپ کی عورتوں کی ٹانگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھی ٹانگیں ہوں۔ مگر چچا جان یہاں کوئی ان کی نمائش نہیں کرتا۔ خدا کے لئے یہ سوچئے کہ ہم صرف اپنی بیوی کی ٹانگیں دیکھتے ہیں، دوسری عورتوں کی ٹانگیں دیکھنا ہم اپنے آپ پر حرام سمجھتے ہیں ہم بڈھے، اور بھوڈو کس قسم کے آدمی ہیں۔"

چاہتے ہیں کہ وہ لوگ جنہیں آپ بڑی آسانی سے ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سلا سکتے ہیں اور سلاتے رہے ہیں۔ ایک موقعہ دیا جائے کہ وہ آپ کی دنیا کو آپ کی عینک سے دیکھ سکیں۔

میں نے وہاں کمپنے سنٹرل کے اسٹیشن پر ایک حبشی فوجی کو دیکھا۔ اس کے ڈنٹر، یہ موٹے موٹے تھے۔ وہ اتنا تنومند تھا کہ میں شرم کے مارے سکڑ کے آدھا ہو گیا لیکن پھر بھی جرأت سے کام لیا۔

وہ اپنے سامان سے ٹیک لگائے سستا رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔ میں نے بوٹ کے ذریعے سے آواز پیدا کی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے انگریزی میں کہا۔ جس کا مفہوم یہ تھا "میں یہاں سے گذر رہا تھا لیکن آپ کی شخصیت دیکھ کر ٹھہر گیا"۔ اس کے بعد میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اس کالے کلوٹے فوجی نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھا اپنا فولادی پنجہ میرے ہاتھ میں پیوست کر دیا۔ قریب تھا کہ میری ساری ہڈیاں چور چور ہو جائیں کہ میں نے اس سے التجا کی "خدا کے لئے —— بس اتنا ہی کافی ہے"۔

اس کے کالے کالے اور موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے ٹھیٹ امریکی لہجے میں مجھ سے پوچھا "تم کون ہو؟"

میں نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے جواب دیا "میں یہاں کا باشندہ ہوں۔ یہاں اسٹیشن پر نظر آ گئے تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ تم سے دو باتیں کرتا جاؤں"۔

اس نے مجھ سے عجیب و غریب سوال کیا "اتنے فوجی موجود ہیں تمہیں مجھ ہی سے ملنے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟"

چچا جان سوال ٹیڑھا تھا لیکن جواب خود بخود میری زبان پر آ گیا میں نے اس سے کہا "میں کالا ہوں، تم بھی کالے ہو۔ مجھے کالے آدمیوں سے پیار ہے"۔

وہ اور زیادہ مسکرایا۔ اس کے کالے اور موٹے ہونٹ مجھے اتنے پیارے لگے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں چوم لوں۔

چچا جان، آپ کے ہاں بڑی خوبصورت عورتیں ہیں۔ میں نے آپ کا ایک فلم دیکھا تھا۔ کیا نام تھا اس کا ہاں یاد آ گیا ——

"بیدنگ بیوٹی"۔ یہ فلم دیکھ کر میں نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ "چچا اتنی خوبصورت ٹانگیں کہاں سے اکٹھی کر لاتے ہیں۔"

میرا خیال ہے، وہ ڈھائی سو کے قریب تو ضرور ہوں گی چچا! کیا واقعی آپ کے ملک میں ایسی ٹانگیں عام ہوتی ہیں؟ —— اگر عام ہوتی تو خدا کے لئے (اگر آپ خدا کو مانتے ہیں) تو ان کی نمائش کم از کم پاکستان میں بند کر دیجئے۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں آپ کی عورتوں کی ٹانگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھی ٹانگیں ہوں۔ مگر چچا جان یہاں کوئی ان کی نمائش نہیں کرتا کے لئے یہ سوچئے کہ ہم صرف اپنی بیوی کی ٹانگیں دیکھتے ہیں، دوسری عورتوں کی ٹانگیں دیکھنا ہم اپنے آپ پر حرام سمجھتے ہیں —— ہم بڑے اور تھوڈوکس قسم کے آدمی ہیں۔

بات کہاں سے نکلی تھی کہاں پہنچ گئی۔ میں اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ چاہتا تھا کہ آپ ایسی ہی تحریر پسند کرتے ہیں۔

کہنا یہ تھا کہ آپ کے وہ صاحب جو یہاں کے قونصل خانے سے وابستہ ہیں میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے لئے ایک افسانہ لکھوں میں بہت متحیر ہوا۔ اس لئے کہ مجھے انگریزی میں لکھنا آتا ہی نہیں۔ میں نے ان سے عرض کی "جناب میں اردو زبان کا ادیب ہوں۔ میں انگریزی لکھنا نہیں جانتا"۔

انہوں نے فرمایا "مجھے اردو میں چاہیئے۔ ہمارا ایک پرچہ جو اردو میں شائع ہوتا ہے"۔

میں نے اس کے بعد مزید تفتیش کی ضرورت نہ سمجھی اور کہا "میں حاضر ہوں"۔

اور خدا واحد ناظر ہے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کے کہنے پر تشریف لائے ہیں اور آپ نے انہیں میرا خط پڑھا دیا تھا جو میں نے آپ کو لکھا تھا۔

خیر، اس قصے کو چھوڑیئے۔ جب تک پاکستان کو گندم کی ضرورت ہے میں آپ سے کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔ ویسے بحیثیت پاکستانی ہونے کے (حالانکہ میری حکومت مجھے اطاعت گذار نہیں سمجھتی) میری دعا ہے کہ خدا کرے کبھی آپ کو بھی باجرے اور "مکئی کے ساگ" کی ضرورت ہو اور میں اگر اس وقت زندہ ہوں تو آپ کو بھیج سکوں۔

اب سنیے کہ ان صاحب نے جن کو آپ نے بھیجا تھا، مجھ سے پوچھا "آپ ایک افسانے کے کتنے روپے لیں گے۔"

چچا جان، ممکن ہے آپ جھوٹ بولتے ہوں، اور آپ یقیناً بولتے ہیں بطور فن۔ اور یہ فن مجھے ابھی تک نصیب نہیں ہوا لیکن اس روز میں نے ایک ابتدائی طور پر جھوٹ بولا اور ان سے کہا "میں ایک افسانے کے لئے دو سو روپے لوں گا۔"

اب حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے ناشر مجھے ایک افسانے کے لئے زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس روپے دیتے ہیں۔ میں نے دو سو روپے تو کہہ دیا لیکن مجھے اس احساس سے اندرونی طور پر سخت ندامت ہوئی کہ میں نے اتنا جھوٹ کیوں بولا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

لیکن چچا جان مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب آپ کے بھیجے ہوئے صاحب نے بڑی حیرت سے (معلوم نہیں وہ مصنوعی تھی یا اصلی) فرمایا "صرف دو سو روپے — کم از کم ایک افسانے کے لئے پانچسو روپے تو ہونے چاہئیں۔"

اب میں حیرت زدہ ہو گیا کہ افسانے کے لئے پانچسو روپے — یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا لیکن میں اپنی بات سے کیسے ہٹ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے چچا جان، ان سے کہا "صاحب دیکھئے دو سو روپے ہی ہوں گے۔ بس اب آپ اس کے متعلق زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔"

وہ چلے گئے۔

دوسرے روز صبح سویرے جبکہ میں برآمدے میں شیو کر رہا تھا آپ کے وہی صاحب تشریف لائے۔ مختصر سی بات چیت ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا "دیکھئے۔ دو سو کی رٹ چھوڑیئے۔ تین سو کی لیجئے۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے" چنانچہ میں نے ان سے تین سو روپے لے لئے۔ روپے جیب میں رکھنے کے بعد میں نے ان سے کہا "میں نے آپ سے سو روپے زیادہ وصول کئے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اس میں کسی قسم کی ردوبدل کا حق بھی آپ کو نہیں دوں گا۔"

وہ چلے گئے۔ پھر نہیں آئے۔ چچا جان اگر آپ کے پاس پہنچے ہوں اور انہوں نے کوئی آپ کو رپورٹ پہنچائی ہو تو از راہ کرم اپنے پاکستانی بھتیجے کو اس سے ضرور مطلع فرما دیں۔

میں وہ تین سو روپے خرچ کر چکا ہوں۔ اگر آپ واپس لینا چاہیں تو میں ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے ادا کر دوں گا۔

امید ہے کہ آپ اپنی پانچ آزادیوں سمیت خوش و خرم ہوں گے

۳۱ لکشمی مینشنز ہال روڈ لاہور

آپ کا بھتیجا خاکسار سعادت حسن منٹو

(بشکریہ "نقوش")

جگر مرادآبادی

○

حسن کے نغمے بھی خاموش فغاں تک پہنچے
اب ترے حوصلے اے عشق یہاں تک پہنچے

جب ہر اک شورشِ غم ضبطِ فغاں تک پہنچے
پھر خدا جانے یہ ہنگامہ کہاں تک پہنچے

کیا تعجب کہ مری روحِ جواں تک پہنچے
پہلے کوئی مرے نغموں کی زباں تک پہنچے

آنکھ تک دل سے نہ آئے نہ زباں تک پہنچے
بات جس کی ہے اُسی آفتِ جاں تک پہنچے

بڑھ کے رندوں نے قدم حضرتِ واعظ کے لئے
گرتے پڑتے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

تُو جہاں پہ تھا بہت پہلے وہاں آج بھی ہے
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

جو زمانے کو بُرا کہتے ہیں خود ہیں وہ بُرے
کاش یہ بات ترے گوشِ گراں تک پہنچے

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

رہِ عرفاں میں ایک ایسا بھی مقام آتا ہے
ہر یقیں بڑھ کے جہاں وہم و گماں تک پہنچے

عشق کی چوٹ دکھانے میں کہیں آتی ہے
کچھ اشارے تھے کہ جو لفظ و بیاں تک پہنچے

کیا خبر تجھ کو جسے تو نے ہی بھڑکایا تھا
وہی اک شعلۂ نمناک کہاں تک پہنچے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
مرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

مرے اشعار میں جو آگ دبی ہے اے کاش
تجھ کو راس آئے ترے عزمِ جواں تک پہنچے

جلوے بیتاب تھے جو پردۂ فطرت میں جگر
خود تڑپ کر مری چشمِ نگراں تک پہنچے

(بشکریہ آجکل)

فضل من اللہ •

کٹی ہوئی جیب

رات بڑی ہی خوشگوار تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان میں ستارے یوں لگتے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں فضا میں خنکی تھی۔ دلنواز خنکی ——— اور خوشبو تھی! مدہم مدہم، میٹھی میٹھی خوشبو، اور میں چہل قدمی کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ میں سیر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سیر کے دن ز دسال بھی ہوتے ہیں باقی سارا سال کچھ اس کی یاد اور کچھ انتظار میں کٹ جاتا ہے۔

فیروز پور روڈ سے اچھرہ جانے کے لئے اچھرہ روڈ پر مڑیں تو سیدھے ہاتھ ایک کوٹھی کی لمبی دیوار دور تک چلی جاتی ہے یہ کوٹھی لالہ سوایا رام نے بنوائی تھی اس دیوار کے اوپر سے ہوتا ہوا بیری کا ایک پیڑ بھی ہے جو سڑک پر جھک لیا ہے جب میں اس پیڑ کے قریب پہنچا تو پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ نے خوشبو کو میرے قدم لینے بھیجا اور میں نے ایک روحانی سرور محسوس کیا۔ ایک ناقابلِ بیان روحانی سرور

اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہے اور آہِ رسا پیدا ہوئی ہے۔ اُف! کتنی دلدوز چیخ تھی وہ! میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں نے کانوں کو ہر طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کی مگر نہ میں کچھ سن سکا نہ دیکھ سکا۔ میں نے اس کو وہم سمجھ کر ذہن سے نکال دیا اور ابھی ایک قدم چلا ہی تھا کہ وہی سسکی ایک بار پھر میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کراہ میرے پاؤں کے قریب کہیں سے سنائی دی ہے۔ میں نے جوتوں پر نظر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے ایک چیتھڑے کے، یہ چیتھڑا کچھ جوتے کی نوک پر پڑا تھا اور باقی جوتے کے تلے پر تھا

میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا ... یہ ایک کٹی ہوئی جیب تھی!

یہ کٹی ہوئی جیب ابھی سسک رہی تھی۔

اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ چاند رات۔ یہ رومانی موسم اور کٹی ہوئی جیب۔ یعنی کوئی نسبت تو ہو۔ نقرئی قہقہے ہوں۔ ساغر کھنکتے ہوں۔ تذکرہ حسن و عشق ہو اور کوئی صاحب غزل مرصع پڑھتے پڑھتے مقطع عرض کر رہے ہوں ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

"کاش!" کٹی ہوئی جیب نے میرے استعجاب کو اور بڑھنے نہ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی "کاش میرا کوئی مزار ہوتا! اس مزار کے بالین سنگ مرمر کا ایک کتبہ ایستادہ ہوتا جس پر کوئی درد بھرا شعر کندہ کر کے گھروتا سے گزرنے والے وہ ہاتھ اٹھا کر ... فاتحہ پڑھتے جاتے کہتے یہیں اجنبی ستم رسیدہ ہمدردی اور دعا کے چند کلمات سے نوازتے جاتے مگر افسوس ....."

> "آدمی آدمی کو لوٹتا ہے، آدمی آدمی کی جیب سو روپ بدل کر کاٹتا ہے کبھی سوداگر کے بھیس میں کبھی جعلی اور کبھی عطائی حکیم اور ڈاکٹر کے بھیس میں کبھی حکومت کے بھیس میں کبھی محمہ کمپنی کے مالک کے بھیس میں ـــ سو روپ بدل کر مگر آدمی آدمی کو برا نہیں کہے گا۔ فقط چند لوگوں کو جیب کترا اور لٹیرا کہہ کر خوش ہو جائے گا۔"

اجنبی ستم رسیدہ!

اور اچانک میرے ذہن میں وہ الفاظ بھی آ گئے جو اس کتبہ میں ہو سکتے تھے۔

اجنبی!

اپنے قدموں کو روک ذرا!

سنتے جاؤ۔ یہ اشکوں بھری داستان؟

"اجنبی" کٹی ہوئی جیب نے کہا "میری کہانی سنو گے؟"

"کٹی ہوئی جیب کی کہانی" میں نے خود سے کہا اور پھر خود پر ہنس کر

کہنے لگا۔

"بڑی ستم ظریف ہے یہ قدرت - میر تقی میر کے راستے میں کاسہ سر رکھدیا اور عزیز احمد کی ملاقات جبکہ چاندنی اسی طرح چھٹکی ہوئی تھی در حبیب بہر حال دغا دینے پر تلی ہوئی تھی - زرین تاج سے کرادی ـــــ در میرے راستے میں ایک کٹی ہوئی جیب کہانی سنانے کے لئے بھیجدی"

اور پھر میں کہانی سننے اور کہانی لکھنے کے متعلق سوچنے لگا۔ کہانی لکھنا میرے لئے چنداں مشکل نہیں مگر اس وقت ہر کہانی لکھنے والے کے لئے مشکل پیش آتی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی عظیم مصنف ہو جب ایک اشکوں بھری داستان اسے سنائی جاتے اور وہ اس سے متاثر بھی اسی شدت سے ہو جس شدت سے کہ سنانے والا خود متاثر ہو ایسے عالم میں جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور پھر افکار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ اور اساتذہ فن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دیکھنا اگر واقعہ ہی کو افسانہ بنانا چاہو تو بخوشی ایسا کرنا مگر اس میں افسانویت ضرور پیدا کرنا یعنی جب تک سچ کے چہرۂ سادہ پر بناوٹ کا غازۂ رنگین نہ ملو گے کشش پیدا نہیں ہوگی ـــــ مجھے ایک کہانی سننا بھی تھی اور لامحالہ لکھنا بھی اور میں اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کٹی ہوئی جیب نے پھر مجسم التجا بن کر کہا ـــــ

"تو میری کہانی نہیں سنو گے، کیا حرج ہے آخر اسی میں؟"

"ضرور، ضرور" میں نے ذہنی کش مکش سے بچنے کے لئے کہا۔

کٹی ہوئی جیب نے اپنی کہانی شروع کردی۔

مجھے اپنے مالک سے جدا ہوتے چند گھنٹے ہوتے ہیں وہ گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں سے لاہور زمین کے الاٹ منٹ کے قضیہ کے حل کے سلسلہ میں آیا تھا۔ اس قضیہ سے نمٹ کر وہ اچھرہ میں اپنی بیٹی سے ملنے آیا تھا اس کا لڑکا اس کے ہمراہ تھا۔ باپ بیٹا جب یہاں اچھرا موڑ پر بس سے اترے تو میرے مالک نے جب جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ کچھ پھل خرید کر لے چلے تو اسکے چہرے پر مایوسی اور خوف کی زردی چھا گئی میں وہاں نہیں تھی۔ وہ یہ خبر بہ مشکل بیٹے کو سنا سکا اور بیٹے کی حالت بھی اس سے مختلف نہ رہی۔

میں اس وقت ایک جیب کترے کے قبضہ میں تھی جو قریب ہی ایک دکان پر بیڑی سلگا رہا تھا مگر اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔ سوائے جیب کترے کے نہ میرے مالک کو نہ اس سپاہی کو جو قریب ہی کھڑا تھا جیب کترا خوش پوش نوجوان تھا اس پر بھلا کون شبہ کر سکتا تھا؟

مجھ پر اس جیب تراش نے اس وقت ہاتھ صاف کیا تھا جب میرا مالک زمین کی الاٹ منٹ کے قضیہ سے فارغ ہو کر لاٹ صاحب کے دفتر سے باہر نکلا تھا اور آدمیوں کی بھیڑ میں بس سے سوار ہوا تھا۔ اسے بس میں جگہ حاصل کرنے کی فکر تھی۔ ہر شخص کو ہوتی ہے۔ اور اسے اپنے لڑکے کا خیال بھی تو تھا اگر وہ اس سے بچھڑ جاتا تو اس بہت بڑے بے رحم شہر میں اسے کون سنبھالتا ـــــ چنانچہ اس نے بیٹے کا ہاتھ بھی پکڑا اور بس کا دروازہ بھی اور میری اسے فکر نہ رہی اور اس جیب کترے کا کام بن گیا جو اس کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے اپنی جیب میں قید کر دیا تھا جو چھوٹی تھی، تنگ تھی اور گرم اور حبس میں میرا دم گھٹ گیا تھا میں نے کھلی ہوا میں زندگی بسر کی تھی۔ جس ٹرنک میں مجھے رکھا گیا وہ بھی کھلا تھا اور اس میں بھی ہوا آتی جاتی تھی۔ میرے مالک نے بوسکی کی گلابی قمیص پہن رکھی تھی جو شہر کی بوشرٹ اور دیہات کی قمیص کے درمیان ایک چیز تھی اور جس پر گاؤں کے درزی نے سوتی کپڑے کی جیب لگا دی تھی جب میرا مالک چلتا تو ہوا کے جھونکے مجھے بڑا ہی لطف پہنچاتے۔ اور یہاں میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میں چیخ رہی تھی بِسک رہی تھی۔ مگر اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی نہ جیب کترے کو نہ میرے مالک کو۔

پھر جیب کترا بیڑی سلگا کر اسی سڑک پر آیا اس نے جیب ٹٹولی دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور مجھے یہاں پھینک گیا"

آہ! مجھے تم سے . . . . "

میں نے دلی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا مگر یہ اظہار قبل از وقت تھا وہ فقط لینے کے لئے رکی تھی اس کی بات کہاں پوری ہوئی تھی۔

"سنو تو" اس نے کچھ اسی انداز سے کہا جیسے اس نے برسوں کا غم اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔

"ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے"

چودھری، میرا مالک جب گاڑی سے چلا تو وہ دو سو روپے لیکر چلا، گاؤں میں اس کی آٹے دال کی دکان تھی مگر زمیندار کو زمین سے جو محبت ہوتی ہے وہ اُسے بھلا بنیا کب بننے دیتی ہے۔ ہوشیار پور میں اس کی اپنی زمین موجود تھی اور اب وہ زمین حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس کا اُس نے

بند و بست کرلیا تھا۔ اسٹیشن پر پہونچکر اس نے پان کھایا اور پاسنگ شو کی ایک ڈبیا اور ایک بکس دیاسلائی کا خریدا اور ٹکٹ لے کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں وہ سگریٹ پھونکتا اور مسافروں کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہا۔ لڑکا بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ لاہور پہنچکر وہ ایک معمولی سے ہوٹل میں پہنچے۔ لڑکا پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور باپ بیٹے پر اپنی فیاضی کا سکہ جمانا چاہتا تھا چنانچہ جب ہوٹل کے نوکر نے اس سے پوچھا "کیا لاؤں ہو" تو اس نے ترنگ میں آکر کہا "جو مرضی چاہے لے آؤ۔۔۔" اور دو آدمیوں کے لئے چائے مانگی۔ اور جب وہ فارغ ہوئے تو بل مبلغ تین روپے کچھ آنے ادا کیا گیا۔ باپ تو خیر شہریار بن کر آیا تھا مگر بیٹے نے حیران ہو کر سوچا "بھوک کو بہلانے کے تین روپے اور کچھ آنے ؟"

ہوٹل سے نکلے تو تھوڑی دور گول چکر میں ایک مجمع نظر آیا۔ شوق تجسس اُسے وہاں کشاں کشاں لے گیا۔ ایک تانگہ کی گدیوں پر ایک پیٹی میں بہت سی شیشیاں پڑی تھیں اور ان کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ تھا۔ قندھاری انار کے دانوں کی طرح، ویسے ہی چہرے والا ایک شخص سیٹ پر کھڑا لکچر دے رہا تھا۔ لچھے دار تقریر ختم ہو رہی تھی اور اب مقرر طاقت کی اس دوائی کے فائدے اور ترکیب استعمال بتا رہا تھا۔۔۔ صاحبان۔۔۔۔؟" مگر اتنی لسانی کے باوجود جب مجمع حرکت میں نہ آیا تو اس نے پینترا بدلا۔۔۔

"صاحبان! بڑی بڑی مشینیں کام کرتے کرتے گھس جاتی ہیں تو ذرا غور کرو کہ آدمی کا کیا حال ہوتا ہوگا جو بہرحال فولاد کا بنا ہوا نہیں۔ کھایئے تو ہمارا شربت فولاد۔۔۔۔۔"

چودھری نے فقط یہی سنا اور اس کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی میکانکی طور پر اُس کا ہاتھ جیب کی طرف گیا۔ اس نے جیب سے سوا روپیہ نکالا اور ایک بوتل لے لی۔ اور پھر وہی بھیڑ چال۔

اور جب بھیڑ چھٹی تو ایک نوجوان دوسرے سے کہتا جا رہا تھا۔ "چار سو بیس ہیں چرکٹے، فائدہ ہوتے نہیں سالے ٹھگ ہیں ٹھگ، چار آنے کا سوا روپیہ بنا لیتے ہیں زبان کے زور پر۔"

مگر میرے مالک نے یہ ریمارک نہیں سنے اور وہ چل دیا۔

آگے چل کر ایک بازار میں آٹھ آنے کے عوض اس نے دو انگوٹھیاں خریدیں یہ طلسمی انگوٹھیاں تھیں جو دنیا کی ہر بیماری کے لئے موثر علاج کا حکم رکھنے کے علاوہ ہر طرح کی کامیابی کی کنجی بھی تھیں۔ مقرر نے اس کا ایک ایک فائدہ گنوایا تھا اور کہا تھا کہ ایک بزرگ کی خدمت کر کے اس نے یہ چیز حاصل کی ہے۔ تقریر کے تاثر کو چند گواہوں نے دو آتشہ کر دیا تھا جو نہ جانے کہاں سے آٹپکے تھے اور سبھی مسکرا مسکرا کر کہتے تھے کہ طلسمی انگوٹھی کو جیسا سُنا ویسا پایا۔ دو پیسے کی انگوٹھی جوتی میں جھوٹی گواہیوں اور چرب زبانی کے بل بک گئی۔

لاہور میں ایسے طلسمات بیسیوں ہیں۔ میرے مالک کی قسمت اچھی ہوتی تو وہ تانگہ پکڑ کر ڈسٹرکٹ کمشنر کے دفتر پہنچتا۔ مگر کچھ کرایہ بچانے کی خاطر اور کچھ بیٹے کو شہر دکھانے کی خاطر پیدل ہی منزل مقصود تک پہنچنے کا اس نے قصد کیا۔

ایک جگہ اس نے ایک طلسمی سرمہ خریدا جو آنکھوں کے ہر مرض کے لئے شافی تھا اور جس کا تجربہ بوڑھے حکیم صاحب نے عملاً کر کے دکھایا تھا کہ پانی کا ایک چھوٹا سا گلاس ایک سفوف پڑنے سے سُرخ ہو گیا مگر سُرمے کی ایک سلائی نے اسے پھر صاف کر دیا۔ میرا مالک اس "معجزے" سے کس طرح روگردانی کر سکتا تھا۔

چلتے چلتے وہ انارکلی پہنچ گیا اور کتابوں اور رسالوں کے ایک اسٹال پر آکر رک گیا اور اس نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور بیٹے سے پوچھا "وہی تو نہیں؟" لڑکے نے نام پڑھا اور اثبات میں جواب دیا۔ میرا مالک بس حرف شناس تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جنہیں تعلیم کی جگہ حسرت ملتی ہے، میرا مالک پہلی جماعت میں تھا کہ اسے مدرسہ سے اٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر پڑھ نہ سکا۔ البتہ اس کے شوق نے یہ صورت ضرور اختیار کی کہ کاغذ کا ٹکڑا خواہ غلاظت کے ڈھیر پر بھی ملتا تو بھی اٹھا لیتا اور عجیب عجیب شکلیں بنا کر پڑھنے والوں جیسا منہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی شوق کے ہاتھوں اسے اس رسالے سے تعارف ہوا تھا۔

نمبردار کا لڑکا اس کے ہاں ایک دن کچھ ردی اخبار اور رسالے دے گیا۔ عادت کے مطابق جب وہ مختلف رسالوں کو دیکھتے دیکھتے اس رسالے تک اور پھر رسالے کے آخر صفحے تک پہنچا تو پچاس ہزار روپے کے

نقد انعام" کے الفاظ پڑھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور دھڑکتے دل سے بیٹے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں جب وہ آیا تو اس نے اس سے کہا۔

"لیاقت علی ذرا یہ دیکھنا تو"

اور پھر لیاقت علی نے پڑھ کر اسے بتایا کہ یہ رسالہ دلی سے نکلتا ہے یہ اشتہار ایک معمہ کا ہے پھر اس نے معمہ کی تشریح کی اور بتایا کہ اگر حل صحیح نکل آئے تو پچاس ہزار روپے انعام ملتے ہیں۔ مگر اگر یہ غلط ہوا تو سوا روپیہ ہی جاتا ہے"

"ہرا جوا"

اس نے کچھ ایسے کہا جیسے کسی نے خنزیر کا نام لے لیا ہو۔

لیکن پھر نفرت کی تلخی آہستہ آہستہ مٹتی گئی۔ حتیٰ کہ اس نفرت کی یاد تک باقی نہ رہی اور اس کی جگہ نقد پچاس ہزار نے لے لی اور پھر وہ خواب دیکھنے لگا، ہوائی محل تیار کرنے لگا۔ بیٹے کو بیرسٹر بنانے اور بیٹی کا ٹھاٹھ سے بیاہ رچانے کے خواب!۔

اور پھر دلی سے اس پرچہ کا تانا بندھ گیا۔ پہلی منگوانے کے لئے اس نے بیٹے سے خط لکھوایا اور پھر وہی ملعون اور جانا پہچانا چکر چلا، وہی انتظار، وہی امید، اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات اور محرومی۔ ناامیدی اور گالیاں بک بک کر اور قسمیں کھا کھا کر توبہ کا اعلان۔

اور آج یہ توبہ ٹوٹ رہی تھی اب کے اس رسالے نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ میرا مالک ایک بار پھر خود فریبی کا شکار ہو گیا حقیقت پسند بننا کتنا مشکل ہے۔

پھر وہ بازار میں داخل ہو گیا اور مختلف چیزیں خریدنے لگا۔ لیاقت علی کے لئے بوٹ، کوٹ کا کپڑا، ہاجرہ کے لئے سلیپر، ننھے کے لئے کھلونے، ہری کے لئے دوپٹہ، حتیٰ کہ جب وہ بازار سے نکلا تو اس کے پاس سوا سو روپیہ کم ہو چکا تھا۔

زمین کا قضیہ چکانے کے لئے اس نے وکیل کیا اور پھر وکیل کی فیس کے علاوہ بھی خرچ کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اسے زمین سے محبت تھی اور وہ ہر قیمت پر زمین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گورنمنٹ اسے یہ زمین مفت واسطے نہیں دے رہی ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مشرقی پنجاب میں جو زمین وہ چھوڑ آیا ہے اسے وہ کھو چکا ہے۔ اور پھر بقول عقلمندوں کے کنوئیں میں ڈھیلا گرے تو سالم کیسے برآمد ہو، اور اب وہ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ اس کا کام ہو جائے گا۔ جب وہ گاؤں سے چلا تھا تو بھی یہی اطمینان لے کر چلا تھا وہ کہتا تھا کہ روپیہ سب کا بہنوئی ہوتا ہے اور ہمارے کام خود کرا لیتا ہے۔

اور جب وہ اس قضیہ سے فارغ ہو کر اچھرہ آنے کے لئے بس میں سوار ہوا تو میں اس سے جدا کر دی گئی ——— باقی تم کو معلوم ہے ہی۔

"لیکن" میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ میں پہلے جلد بازی کر کے پچھتا چکا تھا۔ جب میں دوبارہ جلد بازی کر کے اس سے ہمدردی جتاتا تو شاید وہ پھر برہم ہو جاتی لہٰذا میں نے اسے ذرا مانوس ہونا زیادہ مناسب سمجھا! وراس لیکن کے بعد کہا "لیکن تم تو بے جان کپڑے کی ایک بے جان جیب ہو تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں"

"یہ نہ کہو، جتنی جان مجھ میں ہے آدمی میں کہاں؟ میں آدمی کے دکھ درد کی شریک ہوں۔ سردی کی شدت میں اس کے ہاتھ گرم کرتی ہوں اور جب وہ مجھے نقدی سے پُر کرتا ہے تو اس کی خوشی میں اور جب مجھے خالی کر دیتا ہے اور مغموم ہو جاتا ہے تو اس کے غم میں شریک ہوتی ہوں، مجھے بے جان نہ کہو"

اب میں نے ڈرتے ڈرتے، جھجکتے جھجکتے ہمدردی کا اظہار کیا۔

وہ بھڑک اٹھی ——

"ہمدردی؟" اس نے چیخ کر کہا، اس چیخ کی کرختگی میں صدیوں کا غم جذب معلوم ہوتا تھا "آدمی بھی عجیب ہے تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور جیب کترے کو کوسوگے، سو گ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ احمق کہیں کے ....!"

میں نے اسے ٹوکنا چاہا مگر وہ بھڑک اٹھی۔ خفیہ آتش فشاں پہاڑ جب بھڑک اٹھے تو عافیت اسی میں ہے کہ آرام سے مر جائیے۔ چنانچہ میں بھی مجرموں کی طرح کھڑا آنکھیں جھکائے۔ سہما ہوا۔ اس کی چیخیں سننے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آدمی آدمی کو لوٹتا ہے، آدمی آدمی کی جیب سو روپ بدل کر کاٹتا ہے کبھی سوداگر کے بھیس میں، کبھی جعلی اور کبھی اصلی حکیم اور ڈاکٹر کے بھیس میں کبھی حکومت کے بھیس میں، کبھی معمہ کمپنی کے مالک کے بھیس میں ——

سو روپ بدل کر مگر آدمی آدمی کو برا نہیں کہے گا۔ فقط چند لوگوں کو جیب کترا ڈاکو، لیڈر الیکر خوش ہو جائے گا۔"

"آدمی آدمی کا گوشت کھاتا ہے۔ آدمی آدمی کو پھاڑ کھاتا ہے مگر وہ اس لئے گدھوں کو مردار خور اور چند جنگلی جانوروں کو درندہ کہا۔ سب سے بڑا مردار خوار سب سے بڑا درندہ تو آدمی خود ہے۔"

پھر وہ قہقہے لگانے لگی، اس کے قہقہے زہر میں بجھے ہوتے تھے۔ میں پانی پانی ہو اجا رہا تھا ——— آدمی کے کرتوت پر، اور سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ کٹی ہوئی جیب میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی کہانی میرے ذہن میں محفوظ تھی، موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی فضا معطر تھی۔ خوشگوار خنکی سے بھرپور تھی ——— آسمان کا نیلا رنگ بڑا ہی پیارا لگتا تھا اور پیلے نیلے آسمان میں ستارے ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں

(بشکریہ "معیار")

ابوالمجاهد زاهد

تہذیب

غلط روی کا تمدن ہے نام کیا کہیے
سحر کے بھیس میں رقصاں ہے شام کیا کہیے
ہوس ہے ایک فرسِ بے لجام کیا کہیے
بشر ہے مقتدیٔ بے امام کیا کہیے
بدی کے رعب سے لرزاں ہیں نیکیاں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست!

یہ بھیڑ حسن کی آراستہ دکانوں پر!
جوانیوں کی تجارت نگار خانوں پر!
یہ کھڑکیوں کے نظارے یہ وجد گانوں پر
یہ پاؤں زمینوں کی جانب یہ ہاتھ رانوں پر
یہ مال زادائیں یہ قدرداں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست!

یہ شاہراہوں پہ حسن رواں خدا کی پناہ!
کوئی ہے "آہ" کوئی "اُف" کوئی "معاذ اللہ"!
یہ رنگ رنگ کے جلوے یہ منچلوں کی سپاہ!
یہ ساڑھیوں کا تعاقب یہ جمپروں پہ نگاہ!
یہ شوخ بھونرے یہ طرار تتلیاں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست!

یہ قہقہے یہ تبسم یہ کاکل و رخسار!
یہ چال ڈھال یہ سج دھج یہ دعوتِ دیدار
یہ چست چست قمیصیں یہ چھاتیوں کا اُبھار
یہ عصمتوں کے جنازے، یہ عفتوں کے مزار

حیا و شرم کے ہونٹوں پہ ہے فغاں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست؟

یہ رنگ و نور سے بھرپور "کالجوں" کا نظام
یہ چھیڑ چھاڑ یہ فقرے یہ شوخیٔ دشنام
یہ تانک جھانک اشارے یہ نامہ و پیغام
یہ خواہشوں کی کنیزیں یہ جنسیت کے غلام

یہ مارکس اور فرائڈ کے مدح خواں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست؟

یہ آرٹ، یہ ادب و شعر کے حسیں انبار
یہ ناولیں، یہ ڈرامے فسانوی شہکار
یہ دیدہ زیب رسائل، یہ تیرہ دل اخبار
یہ ریڈیو، یہ سینما، یہ تھیٹروں کی بہار

شکر چڑھی یہ غلاظت کی گولیاں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست؟

ریا کی دھوم ہے قول و عمل میں ان بن ہے
فریب ایک "ہنر" اور جھوٹ ایک "فن" ہے
غرض یہ "خدمتِ انساں" کا رنگ و روغن ہے
حدیثِ مفلس و مزدور "ایک فیشن" ہے!

خلوص اور صداقت ہے بے اماں اے دوست!
یہی ہے آج کی تہذیبِ ضوفشاں اے دوست؟

غلام جعفر قاسمی

نیا نشہ

مشتاق عالم زمین دوز گاڑی سے اتر کر لفٹ کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا ابھی چار بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اور پارٹی چار بجے کے لگ بھگ تھی۔ لگ بھگ سے مراد یہ کہ اگر آپ چار بجے سے چند منٹ پہلے یا چند منٹ بعد پہنچیں تو یہ آداب کے منافی نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ نیم بے تکلفانہ دعوت تھی۔

لفٹ پر پہنچتے ہی مشتاق عالم نے ٹکٹ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا! اسے یاد آیا کہ وہ جلدی میں ٹکٹ نہ خرید سکا تھا! اسے کرایہ معلوم ہی تھا۔ چار پنس نکال کر ٹکٹ کلکٹر کو تھما دیئے۔ ٹکٹ کلکٹر نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ میزبان کا گھر اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ ان لوگوں کے ہاں وہ پہلے بھی ایک بار آچکا تھا اس بار وہ اکیلا تھا۔ اکیلے پارٹی میں شرکت تھی۔ مشتاق عالم نے آہستہ سے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ پل کی پل میں میزبان خاتون نے دروازہ کھولا۔ مسز آتھر ادھیڑ عمر کی آخری منازل طے کر رہی تھیں سر کے بال گھنے اور برفیلی چمک اور سپیدی لئے ہوئے تھے بڑھاپے کے تصور سے چہرے کی جلد کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ مگر پوڈر کی غیر مرئی حد تک باریک تہیں، نہایت خوش سلیقگی سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہونٹوں کی نیم مردگی کو لپ سٹک کی فانی سرخی کے دامن میں پناہ مل رہی تھی۔ لباس اور انداز وضعدارانہ تھے ———

"گڈ آفٹرنون، میڈم" ——— "گڈ آفٹرنون .... آپ ہیں مسٹر . . . . ؟"

"عالم" .... "بیشک بیشک، مسٹر عالم! مجھے معاف کیجئے گا۔ میرا حافظہ کمزور ہے کہتے آپ کیسے ہیں؟ آپ نے بڑی مہربانی کی کہ آج کی دعوت کے لئے وقت نکال سکے"

رسمی گفتگو کرتے ہوئے مسز آتھر مشتاق عالم کو مہمان خانہ میں لے گئیں۔ وہاں ایک عمر رسیدہ اور بہت موٹی انگریز خاتون اپنے دبلے پتلے اور زندہ درگور قسم کے، خاوند کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ مسز آتھر نے تعارف کرایا اور پھر دوسرے مہمان کے استقبال کے لئے گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں خاصی چہل پہل ہو گئی۔

"معاف کیجئے گا۔ میرے شوہر ایک کانفرنس میں شرکت کی وجہ سے، دیر میں آئیں گے۔ آپ بہرحال، غریب کدہ کو اپنا گھر تصور فرمائیں۔ اور تکلف سے کام نہ لیں"

"آپ کے کھلاڑی تو ماشاء اللہ اپنے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں"

"یہ لوگ تو ابھی مبتدی ٹھہرے۔ بہرحال، مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"

"صاحب! انگلستان کو ہرانا تو خارج از بحث ہے کھیل اگر برابر بھی رہے تو بھی غنیمت جانیئے۔ کیوں نہ ہو۔ ہماری پشت پر سالہا سال کا تجربہ اور محنت شاقہ ہیں"

مسز آتھر کو یہ ریمارکس چنداں اچھے نہ لگے۔

"آپ کو ہمارے معزز پاکستانی مہمان سے ایسے روکھے لفظوں میں گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ لوگ تو کھیل کو بھی سیاست کی بازی گاہ بنا رہے ہیں"

مشتاق عالم بڑے صبر سے یہ سب باتیں سنتا رہا۔ اس کے تحمل کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ٹیم کی لیٹیسٹ پوزیشن سے آگاہ تھا اور کھلاڑیوں نے کھیل کا جو غیر متوقع مظاہرہ کیا تھا اس پر بہت خوش تھا لیکن حضرات ابھی تاریکی میں تھے۔ غازی کی بہ نسبت مشتاق عالم نے شہادت کے درجے کو ترجیح دی۔ وہ بڑے دھیمے اور باوقار لہجے میں گویا ہوا۔ "آپ کی باتوں کا پورا جواب تو آپ کو شام کی خبروں میں مل جائے گا۔ میں سردست یہی کہنا کافی سمجھتا ہوں۔ کہ آگے آگے

دیکھتے ہوتا ہے کیا۔"

بات کا رخ مسٹر آرتھر کی خوش آئند آمد نے بدل دیا۔

"آہاہ مشتاق عالم صاحب! آپ کا آنا مبارک۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے دیر ہوگئی۔"

مسٹر آتھر نے اپنے دلربا اور اخلاص بھرے تبسّم سے یہ الفاظ باری باری ہر مہمان سے کہے۔ مسٹر آتھر اپنی اہلیہ کے مقابلے میں "ابھی تو میں جوان ہوں" کی حد سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ وہ مضبوط اور خوشنما شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے بال سلامت تھے البتہ کہیں کہیں سفیدی بنا بنا کر ڈال رہی تھی۔

پارٹی اپنے مراحل باقاعدگی اور سرعت سے طے کرنے لگی۔ شراب کا دور چلا تو مشتاق عالم اکیلا مہمان تھا جس نے شراب پینے سے انکار کیا۔ یہ اس نے کچھ مذہبی بنا پر نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ وہ مذہب کا چنداں پابند نہیں رہا تھا۔ وہ طبعاً رومان پسند تھا۔ مگر اس کے تحت الشعور میں ایک ان جانا خوف سا تھا۔ نہ جانے وہ شراب پی لے۔ تو کیا ہو جائے؟ کہیں وہ بد حواس ہو کر نہ پڑے اور لوگ اس کا مضحکہ اڑائیں۔ وہ اپنے ملک کا غیر سرکاری سفیر تھا۔ اس کی ذاتی ذلت۔ ملک بھی کی ذلت ہوگی۔۔۔۔۔

مسٹر آتھر نے ہر طرح ترغیب دی۔ ایک آدھ بار مشتاق عالم کے دل میں ہلکی سی خواہش ہوئی کہ وہ غمِ غربت کے دفتر کو غرقِ مے ناب کر دے۔ مگر ہمت نے ساتھ نہ دیا۔ اکتاہٹ کے باوجود وہ ادرنج سکاش پیتا رہا۔

"مشتاق عالم صاحب۔ مان بھی جائیے۔ آخر پرافٹ۔۔۔۔۔ Prophet نے یہ افشردہ انگور تھوڑی ہی حرام قرار دیا تھا۔ وہ تو محض کھجور کی شراب پر حد لگی تھی۔ آپ وہم میں نہ پڑئیے اور بسم اللہ کیجیے۔" مسٹر آتھر نے شرارت کو سنجیدگی میں سمو کر کہا۔

"مسٹر آتھر! میں آپ کی دیدہ دلیری اور دل آزار طرزِ بیان کو زم سے نرم لفظوں میں بھی آداب میزبانی کی توہین سمجھتا ہوں۔" مہمان خانہ میں شہرِ خموشاں کا سناٹا چھا گیا۔

"بخدا۔ میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہ تھا۔ مجھے سخت ندامت ہے۔ از راہ کرم مجھے معاف کر دیجئے۔" مسٹر آتھر نے اظہارِ معذرت کیا۔۔۔۔

کہنے کو تو مشتاق عالم نے معاف کر دیا۔ لیکن اس کا دل بہت دکھی تھا۔ وہ جذبات کو ضبط کا فریب دینے سے قاصر رہا۔ اور رسمی وقفے کے بعد اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کی جرأت مندانہ روش کا یہ اثر ہوا کہ تمام بادہ کش ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ مسٹر و مسز آتھر آپ بقائے دوام کہاں سے لاتے؟

(۲)

کئی ماہ بعد مشتاق عالم، کرنل سٹریج کے ہاں مہمان تھا۔ کرنل صاحب سرکاری طور پر کافی اہم اور مصروف افسر تھے۔ مگر مشتاق عالم کے مسلسل مخلصانہ خطوط نے ان کی اہلیہ کے ذہنی افق کو وسعت دے ہی دی اور مشتاق عالم کو یہ دعوت قبول کرتے ہی بنی۔

کرنل سٹریج خوش وضع بزرگ تھے۔ ان کے چہرے سے وجاہت اور صحت کا حسین امتزاج مترشح تھا۔ مشتاق عالم کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ کرنل صاحب پچاس برس کے تھے۔ اور یہ کہ ان کی دوسری شادی تھی اور ان کی خوبصورت صاحبزادی ان کی پہلی شادی کی اولاد تھی۔

کرنل صاحب بلا کے ہنسوڑ تھے۔ ان سے مل کر دنیا جہاں کے غم بھول جاتے۔ ان کی معلومات کا دائرہ مشرق و مغرب کے حالات پر حاوی تھا۔ وہ ہر قوم کی خصوصیات سے آگاہ تھے۔ مذاہبِ عالم میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہر ملک کے کھیلوں اور عجیب و غریب رسم و رواج پر وہ بغیر کسی نوٹس کے ایک شاندار معلوماتی لیکچر دے سکتے تھے۔ غرضیکہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ آج کی محفل میں کرنل صاحب نے نوشی کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ مے نوشی کی تاریخ، مے نوشی کے آداب، مے کی قسمیں اور ذائقے اور رنگ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔!

مشتاق عالم کی حیرانی کی انتہا ہو گئی جب کرنل صاحب نے فرمائش کی کہ وہ اس موضوع پر اردو اور فارسی کے چند اشعار کا انگریزی ترجمہ کر کے سنائے۔ مشتاق عالم سخن فہم بھی تھا اور زبان دان بھی۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ کرنل صاحب نے بھی سخت جان قدر دان ثابت ہوتے۔ "آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں۔ بلکہ اظہارِ حقیقت، مجھے آپ کا ترجمہ حد درجہ

بھایا ہے۔ میں آپکے ادبی ذوق کو جتنا بھی سراہوں کم ہے۔"

"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔" مشتاق عالم نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

لیکن مسٹر عالم! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ وہ یہ کہ آپکے بعض شعرا جیسا کہ ابھی آپنے فرمایا۔ شراب کا ایک قطرہ چکھے بغیر ایسے بلند اشعار کیسے کہہ سکتے تھے؟ میرے نزدیک یہ گناہِ بے لذت، یہ ذہنی تلذذ نفسیاتی بیماری سے کم نہیں۔ شاید یہ لوگ سماج سے خائف تھے اور خیالوں ہی خیالوں میں اکتسابِ تسکین کرتے رہے۔ مشتاق عالم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اور شاید آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے مسٹر عالم! کو یونانی اور عربی علم طب میں شراب مسئف رطوبات سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ ہے بھی صحیح۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا چونکہ مرطوب ہے اس لئے ہم طبی نقطۂ نظر سے بھی مے نوشی میں حق بجانب ہیں۔ ہمارے لئے شراب سامانِ نشاط ہی نہیں بلکہ لازمۂ حیات ہے۔ عصائے پیری ہی نہیں، رفیقِ شباب بھی ہے۔"

صاحب خانہ کی گرمجوشی نے مشتاق عالم کا دل بڑھا دیا۔ یوں بھی اب وہ انگلستان میں نیا نویلا نہ تھا۔ انگریزی بھی وہ اب بے تکان بولتا تھا وہ دن گئے جب وہ غیر ملکی زبانیں، اردو ہی کے لب و لہجہ میں بولتا تھا اب تو ماشاء اللہ بی بی سی کے ٹھنڈے پروگرام کا تلفظ اس کی عادتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ میزبان بھی مہمان کے شائستہ آداب اور شستہ طرزِ گفتگو سے متاثر نظر آتے تھے۔ مشتاق عالم کا دل جیتے جانے کو چاہتا تھا کرنل صاحب کی بدولت تمام انگریز قوم کو وہ معاف کردینے پر آمادہ تھا

کرنل صاحب نے وہسکی کے دو جام بھرے ایک مشتاق عالم کو پیش کیا۔ دونوں نے "مسرت کا جام" نوش کیا۔ مشتاق عالم وہسکی کے گھونٹ سیتے، خمیری ذائقہ اور مفرح تیخیر سے لطف اندوز و مسرور ہو رہا تھا اور اس نئے تجربہ پر اسے چنداں افسوس نہ ہوا۔ بلکہ ایک آدھ بار تو وہ اپنے بھولپن اور رجعت پسندانہ طرزِ فکر پر دل ہی دل میں ہنسا بھی۔

یہ تو ہوا مگر کھانے میں مشتاق عالم نے ضرور پرہیز سے کام لیا۔

"میں چونکہ سبزی خور ہوں اس لئے مجھے گوشت کھانے سے معذور سمجھیں۔ دراصل میرا سبزی خوری کا مسلک کسی حد تک تلون، آشنا واقع ہوا ہے چنانچہ میں مچھلی اور انڈے کو جائز سمجھتا ہوں۔" مشتاق کے اس حسین جھوٹ کا بھلا ہو کہ اس رات اس نے کرنل صاحب کے اطالوی رکابدار کا پکا ہوا لذیذ آملیٹ کھایا۔ پھلوں پر بھی خوب ہاتھ کیا خشک میوے کھانے میں بھی۔ تہذیب کے معمولی اضافے سے، بنا کسی پھرتی اور برخوری کا غیر شعوری مظاہرہ کیا، اس رات مشتاق میں ایک خوشگوار تبدیلی نمایاں تھی اسے بجلی کے قمقمے معمول سے زیادہ لگ رہے تھے۔ زندگی میں ایک نرالی جاذبیت بیدار ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کا دماغ تر بتر، گرم تر اور خوش تر تھا۔ دل پر سے غموں کا بوجھ اتر چکا تھا۔ گویا اس رات مشتاق عالم کی تخلیق نو ہوئی تھی۔

(۳۱)

نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشتاق عالم بلا نوشی کی حدود میں قدم رکھنے لگا۔ زندگی کی اکثر ضروریات پر کفایت شعاری کرنے لگا اب لباس کا بھی خاص خیال نہیں رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ لانڈری کا بل گھٹتے گھٹتے دس فیصدی آنے لگا۔ وہ قمیص، جرابیں اور رومال خود ہی دھولیتا اور خود ہی استری کرلیتا۔ اس نے کمرہ بدل لیا تھا اور کھانا بھی دو وقت خود ہی پکالیتا۔ ناشتہ تو کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ کیونکہ ناشتہ کے وقت تو وہ بدمستی کے گڑھے میں منہ کے بل پڑا ہوتا لنچ کے وقت آنکھ کھلتی اور وہ اعضا شکن اذیت سے آہستہ آہستہ خود کو گھسیٹ کر نکالتا۔ پیٹ کچھ بھوک سے، کچھ مے نوشی کے ضعف سے، تنور کی طرح جل رہا ہوتا۔ اور وہ جلد جلد اس تنور میں لنچ کے کھانے کا ایندھن ڈالتا

کل رات وہ ہسپانوی سے خرید لایا تھا یہ اس قدر لذیذ اور دلخوش کن تھی۔ کہ اندازہ جام پینا اس کے لئے صبر آزما ثابت ہوا۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور غٹا غٹ پی گیا۔ عجیب بات تھی کہ اسے سرور تو کافی دیر تک محسوس ہوا مگر نشہ نہ چڑھا۔ اس کا دماغ بلند یوں پر پرواز کرنے لگا۔ رگ و ریشے میں ایک ولولہ انگیز حرارت محسوس ہوئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ حقیقت اور خواب کی دو دنیاؤں میں بیک وقت موجود ہے۔ آہستہ آہستہ حقیقت کے ادراک پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور سحر کے قریب اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور بستر پر جا گرا دوپہر سے ذرا پہلے سورج کی شعاعوں نے اسے بیدار کیا۔ دن

بڑا حسین تھا مطلع صاف تھا۔ اور بڑی مدت کے بعد نیلگوں آسمان دیکھ کر ایسے کسی بچھڑے ہوئے دوست سے ملاپ کی سی خوشی ہوئی

آج اسے سر لرنڈ سکالر کے ہاں دعوت پر جانا تھا۔ سر لرنڈ سکالر کا دولت کدہ لندن سے چند میل کے فاصلے پر دریائے ٹیمز کے کنارے واقع تھا۔ ان کی اپنی کشتیاں تھیں جن پر وہ مہمانوں کو دریا کی سیر کراتے

مشتاق عالم نے کونک لنچ کھایا۔ کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر شہر کی طرف چلدیا۔ وہ سر لرنڈ کے لئے کوئی کتاب تحفتاً لے جانا چاہتا تھا۔ سر لرنڈ کتابوں سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔

میوزیم سٹریٹ میں وہ ایک دکان میں داخل ہوا۔ کتب فروش ادھیڑ عمر کا طویل قامت اور وجیہہ انسان تھا۔ وہ لندن کے دکانداروں کے روایاتی خلق سے بھی زیادہ مسرت سے پیش آیا

"آپ مسلمان ہیں نا؟" اس نے بڑے وثوق سے مشتاق عالم سے دریافت کیا۔ "آپنے کیسے جانا؟" مشتاق عالم نے تعجب پر خوش طبعی کو غالب کرتے ہوئے کہا۔

"حضور! یہ کہنا تو مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ کوئی دل میں بٹھا دیتا ہے کہ فلاں مسلمان ہے۔ فلاں یہودی۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔"

مشتاق عالم نے اپنا مقصد بیان کیا اور کتب فروش کا مشورہ تھا کہ وہ قرآن کا ایک انگریزی نسخہ خریدے۔ مگر گاہک کو اس تجویز میں دقیانوسیت نظر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ رباعیات عمر خیام کا انگریزی ترجمہ موزوں رہے گا۔

حضور! مجھے اس کا حق تو نہیں پہنچتا کہ آپ سے اختلاف رائے کروں۔ کیونکہ یہ ہمارے اصول تجارت کے خلاف ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو آپ کو اپنے مذہب کے نمائندے کی حیثیت سے کوئی آئیڈیل کتاب پیش کرنی چاہئیے میں نے بھی آپکے مذہب کا کسی حد تک مطالعہ کیا ہے۔ بڑا پیارا مذہب ہے اسلام مجھے خصوصاً اس کی جمہوری جبلت اور نظریہ توحید نے بہت متاثر کیا اور اخوت و مساوات کے اصول کتنے ارفع ہیں!"

بالآخر سید امیر علی کی تاریخ اسلام پر فیصلہ ہوا مشتاق عالم نے حسب عادت جلدی میں کار پکڑی اور آدھ گھنٹے میں اپنے مقصود سٹیشن پر پہنچ گیا سر لرنڈ سکالر اپنی کار سمیت استقبال کے لئے موجود تھے

آئی ایم ڈیلائیٹڈ، آئی ایم ڈیلائیٹڈ" سر لرنڈ سکالر نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اعادہ کیا۔

"معاف فرمائیے گا۔ میری وائف آپکے استقبال کے لئے نہیں آسکیں۔ کیونکہ باغ میں بہت زیادہ کام تھا۔ دیکھئے نا۔ اب ہمارے ملک میں خادموں کا قحط ہے۔ سب کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ گھر کی صفائی کپڑوں کی صفائی۔ باغبانی، گیراج کی دیکھ بھال۔ کشتیوں کا مشغلہ غرضیکہ یہ سب کام ہم میاں بیوی مل جل کر کر لیتے ہیں۔ ابتدا میں کوفت محسوس ہوئی تھی اب تو عادت ہوگئی ہے۔ اور ایک گونہ مسرت محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ کوئی شغل نہ ہو تو زندگی میں خلا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔"

مشتاق عالم مودبانہ انہماک سے سنتا رہا۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو حسین موسم کی تعریف ہونے لگی۔ مشتاق عالم کو سچ بولنے میں خفیف سی خوشی محسوس ہوئی۔

"میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ سبزی خور ہیں۔ میری وائف نے بڑے اہتمام سے آپکے لئے شاندار سلاد تیار کر رکھی ہے آپ یقیناً اسے پسند کریں گے۔" مشتاق عالم نے شکریہ اور خوشی کا اظہار کیا۔

سر لرنڈ سکالر کا دولت کدہ بہت خوبصورت تھا۔ چپے چپے سے پاکیزگی ٹپکی پڑتی تھی۔ لیڈی سکالر کی تیار کردہ سلاد واقعی لذیذ تھی یہ میاں بیوی اولاد سے محروم تھے لیکن زندگی کی بہتیری دلچسپیوں کو اپنی شفقت بخش دی تھی۔ سر فہرست اندھوں اور یتیموں کی امداد کیلئے کار ہائے خیر تھے۔ زندگی اطمینان سے کٹ رہی تھی۔ ان کے باغ میں ایک انوکھا سلیقہ، اور ایک خاص ترتیب و تہذیب کارفرما تھی۔

مشتاق عالم نے اپنا تحفہ نذرانہ دونوں معزز میزبان خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے۔ "ہاؤ کائنڈ فل آف یو"

سر لرنڈ نے کتاب کی سرسری ورق گردانی کرتے ہوئے کہا

لیڈی سکالر نے "ہاؤ سویٹ آف یو" کا اضافہ کر دیا۔

چونکہ لیڈی سکالر حال ہی میں انفلوئنزا کے عارضے سے شفایاب ہوئی تھیں۔ پھر انہیں شام کا کھانا بھی پکانا تھا۔ اس لئے وہ کشتی کی سیر کو

سرلینڈسکالراور مشتاق عالم کا ساتھ بنتے سکیں سرلینڈ نے اپنے مہمان کو کشتی میں پہلے سوار کرایا مشتاق عالم نے کچھ ورزش کی جائز غرض کے تحت اور کچھ ازراہ ادب کشتی چلانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر سرلینڈ نہ ملنے دو گیسٹ از گیسٹ" مائی ڈیر فرینڈ" اور ذراسی سوچ کے بعد خود ہی یہ الفاظ بڑھاتے "کاش ہم لوگ مشرقی مہمانداری کی قابل فخر روایات کو اپنا سکتے۔"

دونوں دو گھنٹوں تک دریا کی سیر کا لطف اٹھاتے رہے مشتاق عالم کے مودبانہ اصرار پر سرلینڈ نے ازراہ دل جوئی آخری چند منٹوں میں اسے کشتی چلانے دی۔ سیر کے دوران میں متعدد موضوعات زیر بحث آئے۔ سرلینڈسکالر اسم بامسمی تھے۔ ان کا ذہن تعصب سے پاک تھا

"بہت سال گزرے مجھے مسز سروجنی نائیڈو اور سر رابندر ناتھ ٹیگور سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ نائیڈو ہماری بزم ادب میں گاہے گاہے شرکت فرماتی تھیں بہت خوب کہتی تھیں اگر افسوس یہ کہ سیاسیات سے باز نہ رہ سکتی تھیں اچھی خاصی دلچسپ محفل میں بھی ان کی تلخی آ ہی جاتی۔ مگر اب میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ حق پر تھیں دو رکا حال مبتلائے دو رہی جانتا ہے۔"

ٹیگور سے میں ایک محفل میں ملا۔ وہ اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اور ساتھ کے کمرے میں جاز بینڈ بج رہا تھا جس سے ان کی طبیعت بہت منغض ہوئی۔ اور ہم لوگ اس بات سے محظوظ ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ہماری حماقت اور کم نظری تھی۔"

مشتاق عالم نے ان قابل قدر جذبات کی داد متبسم سکوت سے دی مگر اس کی رگ ظرافت پھڑکے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا آپ نے کبھی سر محمد اقبال سے بھی ملاقات کی تھی؟"

"جی نہیں؟ اس کا مجھے مرتے دم تک افسوس رہے گا۔"

بہت بڑے انسان تھے۔ میں نے ان کے خطبات مدراس کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام کے انگریزی تراجم بھی نظر سے گذرے ہیں مجھے اس بات پر تعجب بھی ہے اور افسوس بھی۔ کہ انہوں نے ٹیگور کی طرح اپنے کلام سے مغرب کو کسی مغربی زبان میں متعارف نہ کرایا۔ حالانکہ وہ بڑے اچھے زبان داں تھے" مشتاق عالم کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اور اس نے "مختلف حالات ہیں" کا عذر پیش کیا۔ اور مقدور بھر "پیام مشرق" کا خلاصہ سرلینڈ کو سنایا۔

"مسٹر عالم! آپ اقبال کی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کیوں نہیں کرتے؟" سرلینڈ نے اخلاص اور سنجیدگی سے تجویز کیا۔ مگر مشتاق عالم نے اپنے احساس کمتری کے لئے بہت سے جواز پیش کئے۔ اور سرلینڈ نے اپنے موضوع کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔

"آپ کے پنجاب کے ایک خطاب یافتہ مسلمان لیڈر نے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں مجھے قرآن کا ایک انگریزی نسخہ تحفتاً دیا تھا۔ مجھے یہ ہدیۂ اخلاص بہت عزیز ہے۔ بلکہ میں نے اس کا حسب فرصت مطالعہ بھی کیا ہے۔" فاضل میزبان نے کشتی کو مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا۔ اور ان لیڈر صاحب کا نام بھی بتایا۔ "وہ ہمارے ہاں اکثر آیا کرتے تھے خاصی بے تکلفی تھی۔ ایک عرصہ تک ہماری خط و کتابت بھی رہی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ سیاسیات کے چکر میں پھنس گئے اور مجھے ملازمت نے کہیں کا نہ رکھا۔ ان کی وفات کا علم مجھے بہت دیر بعد ہوا۔ دلی صدمہ ہوا

اب دونوں باتیں کرتے کرتے گھر پہنچے۔ "ڈارلنگ کھانا تیار ہے" لیڈی صاحبہ نے خیر مقدم کے انداز میں پکار کر کہا۔

ڈنر کے بعد دونوں نے لائبریری میں کچھ وقت نکالا۔ مشتاق عالم کو ایسی شاندار لائبریری دیکھ کر سرلینڈ پر بہت رشک آیا۔ اور اسے اس بات سے ناقابل بیان مسرت ہوئی کہ مشرقی علوم و امور پر کتابوں کی معقول تعداد موجود تھی بالخصوص فرانسیسی اور ترکی زبان میں۔

"ہاں تو میں آپ سے اپنے پنجابی مسلمان دوست کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے ان کی ذہانت کا ہمیشہ اعتراف رہا۔ مگر ایک بات جو میری سمجھ میں اب تک نہ آسکی۔ یہ ہے۔ کہ وہ بلانوش تھے۔ اور ان کا مجھے قرآن کا نسخہ بطور ہدیہ دینا بجائے خود ایک متضاد بات تھی۔ مجھے آپ سے مل کر خاص طور پر جو خوشی ہوئی۔ وہ اس بات سے ہوئی کہ آپ با اصول نوجوان ہیں اور غالباً سبزی خوری کا عذاب، انگلستان جیسے سرد ملک میں۔ حرام گوشت سے بچنے کے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ میں نے مشروبات میں بھی پوری احتیاط برتی ہے۔ تاکہ آپ کو شک نہ گزرے۔ میں خود بھی شراب مدت ہوئی ترک کر چکا ہوں اور یہ اس معجزنما کتاب کا اثر ہے لیکن اس سے آپ یہ مطلب نہ لیں۔ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ نہیں

تاہم پرافٹ کی شخصیت میرے نزدیک بے نظیر ہے۔ ایک بات ہی کو لیجئے۔ بلانوش عربوں کا ان کے فرمان پر گلیوں میں شراب بہا دینا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ میرے خیال میں شراب خوری بہت بڑی لعنت ہے۔ انسانیت کے دامن پر بدنما داغ۔ خدا نے ہمیں شعور عطا فرمایا اور ہم اسے باطل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ مسٹر عالم! اس منحوس شے کو کبھی ہاتھ نہ لگایئے گا۔"

"درحقیقت میں، ایک مدت سے کسی باصول مسلمان کی جستجو میں تھا خدا کا شکر ہے کہ آپ کی ذات میں مجھے وہ مسلمان مل گیا ہے۔ آپ ہمارے ہاں کثرت سے تشریف لایا کریں۔ اور میری بوڑھی فکر کی رہنمائی کریں یوں بھی ایک نیک دل اور نیک اطوار نوجوان کی معیت حاصل ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے۔"

مشتاق عالم نے بکثرت آنے کا وعدہ کیا۔ مگر دل ہی دل میں ندامت سے اس کا برا حال تھا۔ وہ کس منہ سے اسلام کی نمائندگی کر سکتا تھا اس کو اپنی تردامنی کے اعتراف کی جرأت تو نہ ہوئی۔ مگر ایک نئے احساس نے اس کے قلب درون میں ہلچل مچا دی۔

"میں کون ہوں! کیا ہوں میں؟ میں کس لئے اور کس کے لئے زندہ ہوں؟ میں نے اپنے ملک اپنی قوم اور اپنی دنیا کو کیا دیا؟ میں بھی کیسا انسان ہوں، کہ تلاطم زدہ خاشاک کی طرح کبھی اس کنارے کبھی اس کنارے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا اسلامی تعلیم و تربیت پائی۔ میں نے اسلام کی عظمت کے دعوے کئے لیکن اپنے سے کم جاننے والے مسلمان بھائیوں تک جو کچھ اسلامی معلومات تھیں۔ پہنچائیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس ڈگر سے طبیعت اکتانے لگی۔ میں اکیلا تھا کسی نے میرا ساتھ نہ دیا۔ ساتھ دینا تو درکنار الٹے راستہ میں کانٹے بچھائے۔ مجھ میں یکہ و تنہا سماج کے مقابلہ کی تاب نہ تھی میں دھیرے دھیرے پس منظر میں گم ہو گیا معصیت گویا میری تاک میں تھی اس نے بھیس بدل کر مجھے موہ لیا۔ میری عادتیں بگڑیں اطوار خراب ہوتے۔

اور اب۔ اور اب میں بلانوش ہوں۔ والدین کی خانگی تلخیوں اور ناخوشیوں نیز تعدد ازدواج طلاق بچپن کی شادی، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل نے دین سے اور بھی دور کر دیا۔ اب میں اسلامی تعزیرات سے بیزار رہنے لگا۔ بھلا جدید معاشرے میں یہ سب باتیں کیسے واپس آ سکتی ہیں؟ ہوتے ہوتے جو تھوڑا بہت خوف خدا دل میں تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اب میرے من میں شیطان کا راج ہے میں نے جھوٹ بولا اور رخصت اٹھائی۔ دھوکہ دیا۔ تو دھوکہ کھایا۔ حق تلفی کی اور برکت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اب شراب نوشی۔ میں اپنی صحت کی بربادی کا جائزہ تو لوں۔ یہ بلانوشی کہیں میری جان کی لاگو نہ ثابت ہو۔ تو کیا میں زندگی میں کوئی فعل بغیر تجربہ کئے ترک نہ کروں گا؟ اور کیا پردیس میں اپنی جنسی اور اس کے علاج کا بھی تجربہ کئے بغیر عبرت نہ پکڑوں گا؟ جاہے میں کتنا بے بس ہوں!

میرے شکوک بدستور سہی۔ مگر اب تک مجھے جو تجربہ حاصل ہوا اس نے تو میری روش کی تردید ہی کی۔ پھر کیوں نہ میں اس پیغام پر بھروسہ کر لوں۔ اور نہ سہی یہ تعلقات و احکامات ایک ایسے شخص کے ہیں جو شخصیت کی عظمت میں اپنی مثال آپ تھا۔ جو سچا تھا۔ جو اپنے مقصد میں کامیاب رہا جس کے وعدے پورے ہوئے۔ جس کی پیشن گوئیاں سچی ثابت ہوئیں۔ جس کی عظمت کا اقرار کروڑوں انسانوں کی عقیدت کر رہی ہے زندگی میں کچھ نہ کچھ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے اسی لئے تو سپیشلسٹس ہوتے ہیں۔ یہ پیغمبر لوگ شاید روحانی سپیشلسٹس ہی تھے۔"

مشتاق عالم اب گھر پہنچ چکا تھا۔ شب مہتاب جلوہ فرما تھی اس نے شراب کی بوتل سنک میں انڈیل دی! اور صابن سے سنک کو پاک کیا پھر جگ لیکر طہارت کے لئے باتھ روم گیا۔ اور احتیاط کی کہ کہیں فرش پر پانی نہ گرے۔ بڑی دقت سے وضو کیا اور بستر کی چادر کے مصلے پر اپنے خدا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے تذبذب ہوا کہ قبلہ کدھر ہے پھر اس نے زیادہ پروا نہ کی۔ اور اپنی غلامی کا خراج پیش کرنے لگا۔

"تو پاک ہے۔ سب تعریف تیرے لئے ہے۔ تو سب سے بڑا ہے میرے گناہ معاف فرما میری خطاؤں سے درگزر فرما مجھے برائیوں سے پاک فرما میرا انجام نیک فرما۔ تو پاک ہے۔ سب تعریف تیرے لئے ہے۔ تو سب سے بڑا ہے۔ میرے مالک! مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میں تیری طرف لوٹتا ہوں۔ تیرے بھروسے پہ دختر رز سے عمر بھر کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں مجھے استقامت بخش تو پاک ہے تیرا شکر ہے۔ سب تعریف تیرے لئے ہے تو

اسرار احمد سہاوری

نفسیات و اخلاقیات کا خلطِ مبحث

انسان اپنے مطلب کے مطابق کسی بات کی تاویل کرنے کے معاملے میں بڑا حریص اور تیز عمل ہے۔ اور یہ عادت اس کی آج کی نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے چلی آتی ہے۔ چنانچہ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ دنیا کی قدیم ترین اقوام نے آسمانی کتابوں میں بھی تحریف کی ہے اور اپنے مقصد کے مطابق ان کے احکام کی ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ اس تصرف و تحریف کی بنا پر انہیں ڈرایا دھمکایا بھی گیا۔ عذاب الٰہی نازل بھی ہوا لیکن خود غرضی دنیاوی خواہشات اور مادی تمناؤں نے انہیں ایسا اندھا بنایا کہ وہ سوائے اپنی ہوا و ہوس کے کچھ دیکھ ہی نہ سکیں اور اس طرح ذلت و مسکنت کے آخری مقام پر پہونچ کر رہیں اور یہ بیجا تصرف و تحریف کا فتنہ ہمارے زمانے میں بھی جول کا توں اپنی جگہ پر قائم ہے اور اندر ہی اندر ہمارے معاشرتی قوانین اور مذہبی اصول و ضوابط کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اور اگر اس کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا تو یہ اس عمارت کو بھی بہت جلد زمین کے برابر کر دے گا۔

اور یہ غلط تاویل و ترجمانی کا مرض آسمانی کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسری تمام کتابوں کے متعلق بھی یہ بات اسی طرح صحیح ہے۔ ہم قائل کے قول کو دیکھتے ہیں اور اگر وہ ہمارے مقصد کے مطابق ہو تو اسے سیاق و سباق سے علٰحدہ کر کے اپنی عبارت آرائی اور حاشیہ آرائی کے ساتھ اپنے دعاوی کی تائید میں دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم نے ایک بڑی اخلاقی اور معاشرتی خدمت انجام دیدی ہے آجکل ہمارے بہت سے مضمون نگاروں نے نفسیات اور اخلاقیات کے متعلق یہی روش اختیار کر رکھا ہے۔ جہاں ضرورت سمجھتے ہیں ان دونوں کو ملا دیتے ہیں اور جہاں ان کی جدائی اپنے مطلب کے موافق ہو انکو جدا کر دیتے ہیں۔ ان علوم میں جو لوگ مستند مانے جاتے ہیں ان کے اقوال کو غلط طریقے پر غلط معنی پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ یوں تو تمام علوم اپنی آخری حد میں ایک ہی ہو جاتے ہیں لیکن انسان نے اپنی آسانی کے لئے انکو مختلف اور واضح شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے اور خصوصاً آجکل تو ہر علم کے مختلف شعبوں میں اس قدر مواد فراہم ہو چکا ہے کہ ان شاخوں کو بھی مستقل علوم کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہی کیفیت نفسیات اور اخلاقیات کی ہے گو یہ دونوں علوم آپس میں بہت زیادہ مماثلت اور اشتراک رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان دونوں کا حلقہ عمل بالکل علیحدہ اور واضح ہے۔ چند موضوعات مشترک بھی ہیں لیکن ان پر روشنی ڈالنے کا طریقہ مختلف ہے۔ نتائج مختلف نکالے جاتے ہیں اور وہ نتائج زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ میں یہاں نفسیات اور اخلاقیات کے علوم کی مختصر سی تعریف پیش کر دوں تاکہ میری بات کے سمجھنے میں ذرا آسانی ہو جائے۔

اخلاقیات:- اخلاقیات جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ہمارے اخلاق و عادات پر اس لحاظ سے بحث کرتی ہے کہ کس قسم کے اخلاق پسندیدہ اور مفید ہیں اور کس قسم کے غیر پسندیدہ اور مضر ہیں۔ ہمارے افعال کے لئے یہ اخلاقی حدود متعین کرتی ہے۔ ان عادات کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو ہمارے اصولِ زندگی اور ضابطۂ معاشرت کے لحاظ سے پسندیدہ ہیں اور ان عادات سے دور رہنے کی ترغیب دیتی ہے جو ہمارے اصولِ زندگی اور سماجی قوانین میں معیوب اور قبیح خیال کئے جاتے ہیں۔ اخلاقیات تفصیل کے ساتھ یہ بیان کرتی ہے کہ کون کون سی بری عادتیں معاشرتی فتنہ و فساد کا موجب بن جاتی ہیں اور ان برائیوں کو کس طرح روکا اور دور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی پوری وضاحت سے بیان کرتی ہے کہ نیک عادتیں کون کون سی برکات اپنے ساتھ لاتی ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ اخلاقیات کا موضوع یہ نہیں ہے کہ مخصوص عادات کن عضویاتی عمل اور ردِ عمل کے نتائج کے طور پر پیدا ہوتی ہیں یعنی ذہن اور انسانی جسم کی کون کون سی مخصوص حرکات مخصوص عادات پیدا کر دیتی ہیں مخصوص حالات میں ذہن کے اعصاب کس طرح

کام کرتے ہیں اور کس طرح کی نفسیاتی رو ذہن میں دوڑاتے پھرتے ہیں اور کیا اثرات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً حافظہ کیا ہے۔ اس کا کام کیا ہے۔ دماغ میں کس جگہ حافظہ کی قوت محفوظ ہے۔ ذہانت کیا چیز ہے اس کو کس طرح مخصوص پیمانوں سے ناپ کر مخصوص درجات دیئے جا سکتے ہیں بعض مخصوص ہیجانات کیوں اور کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں بعض جذبات کہاں اور کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور ان کے قلب و دماغ میں کس طرح کام کرتے ہیں یہ تمام مسائل نفسیات سے تعلق رکھتے ہیں اخلاقیات کا اس سلسلے میں یہ کام ہے کہ وہ ہمیں وہ اصول و ضوابط بتائے گی جن کے تحت ہم اپنے جذبات و احساسات کو اور ... حافظہ و عیرہ کو کام میں لائیں مثلاً کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم حافظہ میں محفوظ رکھنا چاہیئے اور کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ... ہمارے ... دوسری مثال بہادری کے جذبے کی دی جا سکتی ہے ... جذبہ کو نیک کام میں صرف کیا جائے مثلاً کسی غریب کی مدد کے سلسلے میں، وطن کی حفاظت کے لئے کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لئے نہ کہ چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کے لئے۔ بہادری کے متعلق یہ معلوم کرنا کہ یہ جذبہ جسم کے کس مقام میں پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ اس کا ردعمل دوسرے جذبات اور داعیات پر کیا ہوتا ہے یہ کام نفسیات کا ہے۔ میں ان دونوں علوم کی وضاحت کے سلسلے میں دو ایک نقل قول پیش کردوں تاکہ آسانی سے ان دونوں موضوعات میں خلط مبحث پیدا ہونے کی گنجائش نہ رہے۔

"اخلاقیات کا حلقہ اثر عموماً انسانی کردار و اعمال کے اُس میدان تک محدود ہے جہاں کہ انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا مظاہرہ کرتا ہے انسان اپنے ماحول اور اصولِ زندگی کے مطابق اپنے اور دوسروں کے بعض افعال و اعمال کو نیک و بد کی فہرست میں داخل کرتے ہیں اخلاقیات کا یہی کام ہے کہ انسانی افعال کے متعلق نیکی و بدی کے حدود متعین کرلے۔ ... خیر و شر کا معیار مقرر کرے۔ یہ ایسے سوالات کے جوابات مہیا کرتی ہے جو ہر اس شخص کے سامنے زندگی میں آتے ہیں جس کو صحیح اور نیک طریقے سے زندگی گذارنے کی خواہش ہو۔ مثلاً یہ کہ مخصوص حالات میں انصاف کے کیا تقاضے اور شرائط ہیں۔ اور اخلاقی شعور کا یہ مستقل مسئلہ کہ دو کیا کرنا چاہیئے" اخلاقیات ہی حل کرتی ہے [۵]

اسی طرح نفسیات پر بھی ایک فاضل مصنف کا قول پیش کر کے اس مسئلے پر روشنی ڈالنا ضروری ہے "اخلاقیات ایک اخلاقی علم کے لحاظ سے نفسیات سے بہت آسانی سے ممتاز کی جا سکتی ہے۔ اخلاقیات انسانی اعمال کے صحیح نتائج کو تلاش کرتی ہے۔ وہ یہ معلوم کرتی ہے کہ اخلاقی خوبیوں کی کیا بنیاد اور کیا فطرت ہے۔ اخلاق کے کیا فرائض و حقوق ہیں اور اخلاق کے نفاذ کے کیا ذرائع ہیں۔ یہ نیکی و بدی کی تقسیم کرتی ہے۔ ان کی نوعیتیں معلوم کرتی ہے اور نیکی کا اجرا کرتی ہے بدی کو روکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں نفسیات ہمارے ذہن کی حرکات کو معلوم کرتی ہے ان حرکات و تموجات کے اسباب معلوم کرتی ہے لیکن اخلاقیات ان حرکات کے نتائج سے بحث کرتی ہے" [۶]

غالباً اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ نفسیات اور اخلاقیات کا حلقہ اثر بالکل واضح اور مختلف ہے نفسیات یہ معلوم کرتی ہے کہ خاص جذبات کیوں اور کس طرح پیدا ہوتے اخلاقیات یہ بتاتی ہے کہ ان جذبات کو کیوں کر صحیح طریقے سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ گویا نفسیات کا کام ختم ہونے کے بعد اخلاقیات کا کام شروع ہوتا ہے لیکن ہم نے آج کل اس معاملے میں سخت خلط مبحث کر ڈالا ہے۔ ہم اخلاقیات کا کام بھی نفسیات سے ہی لیتے ہیں۔

یا پھر نفسیات سے کام لیکر اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور خود من مانے اصول تراش لیتے ہیں۔ اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اخلاقی اصول یہی ہیں جن پر ہم عمل کر رہے ہیں۔ یہ اخلاقیات اور اخلاقی زندگی سے ایک مجرمانہ اغماض اور نادانی کی چشم پوشی ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک اور تباہ کن ظاہر ہو رہے ہیں۔

نفسیات نے تھوڑی ہی مدت گذری ہے کہ ایک باقاعدہ سائنس کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ چونکہ نئی اور دلچسپ چیز تھی اس لئے لوگ نہایت تیزی اور بیقراری سے اس کی طرف بڑھے۔ اور اس ضرورت سے زیادہ دلچسپی اور تیزی کا ہی یہ نتیجہ ہوا کہ جو چیزیں اصولاً اس کی نہیں تھیں وہ بھی اس کے حوالے کر دیں۔ مثلاً فرائیڈ نے یہ معلوم کیا کہ انسان کا ایک شعور بالائی ہے اور ایک شعور اور ہے جس کو تحت الشعور یا لاشعور کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعور بالائے شعور سے زیادہ وسیع اور موثر ہے۔ جن چیزوں کو

[۵] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا

[۶] نفسیات از ...کار

ہم ارادتاً بھلا دیتے ہیں وہ بالکل غائب نہیں ہوتیں بلکہ تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور اکثر مناسب موقعہ پاکر ابھر آتی ہیں خصوصاً جب انسان سویا ہوا ہوتا ہے اور کوئی سماجی یا اخلاقی پابندی شعور پر نہیں رہتی تو یہ بھلائی ہوئی بلکہ دبائی ہوئی چیزیں ابھر آتی ہیں۔ اسی بنیاد پر فرائیڈ نے لوگوں کے خوابوں کی تعبیر کرنا شروع کی اور خوابوں کے ذریعے سے وہ بڑی حد تک یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ کون کون سے جذبات و داعیات کو دبا دیا گیا ہے۔ اس سے اس نے ایک اور اہم نتیجہ نکالا کہ جو داعیات کسی وجہ سے دبا دیئے جاتے ہیں وہ غیر محسوس طریقے پر اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور ایک ہیجان سا مبہم سے طریقے پر طبیعت میں قائم ہو جاتا ہے۔ یہی نامعلوم سا ہیجان کسی وقت میں قوی ہوکر۔ عصابیت۔ مالیخولیا یا اپنی انتہائے حد میں جنون تک پیدا کر دیتا ہے۔

اس نے باقاعدہ اس تحقیق سے کام لے کر عصابی لوگوں کا کامیابی سے علاج کیا اور اس نے عموماً علاج کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ مریض کو تشخیص کرکے بتا دیتا کہ تمہاری فلاں فلاں داعیات دخواہشات کو دبا دیا گیا ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے تمہارا ذہن غیر محسوس طریقے پر پریشان رہتا ہے اسی پریشانی کی وجہ سے تم نردس ہو گئے ہو۔ اس دباؤ کا شعور پیدا کر دینے کے بعد وہ کوئی مناسب تدبیر ان دبے ہوئے جذبات کو ابھارنے کی۔ ان کو تسکین دینے کی یا کسی دوسرے راستے پر لگانے کی بتا دیتا۔ اس سلسلے میں زیادہ تر مسائل اس کے سامنے جنسی جذبات کے دبا دیئے جانے کے آئے۔ اس نے تشخیص کرکے مریضوں کو بتا دیا کہ تمہارے جنسی داعیات دبا دیئے گئے ہیں ان کو فلاں فلاں کام میں لگا کر اچھے مصرف میں لا سکتے ہو اور اس طرح ان جذبات کی تسکین بھی ہو جائے گی اس کو اصطلاحی طور پر ترفیع جنسی یا ——— Sex Sublimation کہتے ہیں۔ یا پھر اگر اس نے مناسب سمجھا تو یہ تجویز کر دیا کہ ان داعیات کی تسکین کسی دوسرے جائز طریقے سے ہو جانی چاہیئے! اس سے اس کا مطلب جائز جنسی اختلاط سے تھا اس تسکین جنسی کی اجازت یا تجویز کو لوگوں نے غلط طریقے سے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس کو فرائیڈ کے مطلب کے خلاف اپنے من مانے معنی پہنا دیئے۔ ان لوگوں نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ ہر عصابیت کے مریض کے علاج کے لئے جنسی تسکین ضروری ہے اور یہ کہ ہر عصابی مریض جنسی خواہش کے دبانے سے ہی بیمار ہوتا ہے۔ اور یہ کہ مریض کو جنسی کی تسکین بہر صورت کر لینی چاہیئے۔ خواہ اس کے ذرائع جائز ہوں یا ناجائز دنیز یہ کہ مرض سے بچنے کے لئے حفاظتی طور پر بھی جائز و ناجائز طریقے سے جذبات کی گاہے بگاہے تسکین ہوتی رہنی چاہیئے۔ حالانکہ اس کے اقوال کو یہ معنی پہنانا اس پر سب سے بڑی تہمت لگانی ہے جو جنسی آزادی کے خواہشمندوں نے اپنی ہوس پرستی کی وجہ سے اس پر لگائی ہے۔ چنانچہ فرائیڈ کو بہت جلدی لوگوں کی اس بے راہ روی کا احساس ہوگیا اور اس نے اپنی پہلی فرصت میں اس گمراہ کن خیال کی تردید کی۔ فرائیڈ اپنی کتاب "تحلیل نفسی پر خطبات" میں لکھتا ہے " آپ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ مریض آزاد جنسی اختلاط سے صحتیاب ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کا خیال تحلیل پر ایک الزام سے زائد کچھ نہیں۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ تحلیلی علاج آزادانہ بے قید زندگی گزارنے کا مشورہ دے۔ یہ خیال سخت قسم کی غلط فہمی پر منحصر ہے۔ ہم تو صرف مرض کی وجہ بتا دیتے ہیں اور ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مریض خود کوئی مناسب حل تلاش کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بارے میں زیادہ مبالغہ بھی نہ کرنا چاہیئے کہ جنسی تسکین سے پرہیز ہمیشہ عصبی بیماریاں پیدا کر دیتا ہے۔ بہت تھوڑے مریض ایسے ہوتے ہیں جو جنسی تسکین سے صحتیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لئے تحلیل پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ آزادانہ جنسی اختلاط کی اجازت دیتی ہے۔ ہمارا تو صرف یہی کام ہے کہ ہم تحت الشعور میں دبی ہوئی چیزوں کو بالائے شعور میں لاکر مریض پر اصلیت کو واضح کر دیں "

مندرجہ بالا طویل اقتباس سے آپ پر کئی باتیں پوری طور پر واضح ہوگئی ہونگی۔ ایک تو یہ کہ ہر عصبی مرض کا سبب جنسی جذبات کو دبا دینا یا ان پر کچھ پابندی لگا دینا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مریض کا علاج جنسی تسکین ہو بھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ تسکین ناجائز طریقے سے اخلاق کا خون کر کے کی جائے بلکہ اس کو اخلاقی حدود کے اندر رہ کر حاصل کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ تسکین کے ذرائع بتانا تحلیل نفسی یا نفسیات کا کام نہیں۔ اس کا کام تو تشخیص تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ تجویز کر دیا کہ مرض اس وجہ سے پیدا ہوا اور اس کا علاج یہ ہے اب آگے یہ اخلاقیات کا کام ہے کہ وہ ذریعہ علاج کے اصول مرتب کرے اور بتائے کہ یہ علاج

کس طرح اخلاقی حدود کے اندر رہ کر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی اور معاشرتی
قوانین نے ایسے ضوابط بنائے ہیں کہ آدمی ان ضوابط کی حدود کے اندر
رہ کر جنسی تسکین کے سامان مہیا کر سکتا ہے۔ یہ سراسر ظلم اور زیادتی ہے کہ
آدمی ان اخلاقی اصولوں کی پرواہ نہ کرے اور بیماری کا بہانہ بنا کر جنسی
آوارگی میں مبتلا ہو جائے۔ اور یہ عذر پیش کرے کہ ماہر نفسیات کا یہی
حکم ہے کہ تم اسی طرح شفایاب ہو سکتے ہو یا آئندہ کے لئے اس مرض سے
محفوظ رہ سکتے ہو کہ جنسی آوارگی میں مبتلا ہو جاؤ۔ اس قسم کی جنسی بے راہ
روی کی وجہ سے تو انسان جانوروں کی سطح پر آجاتا ہے بلکہ جانوروں سے
بھی زیادہ ذلیل افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں جانوروں کی جنسی تحریک
تو بہت محدود اور وقتی ہوتی ہے لیکن انسان کی یہ تحریک کسی وقت اور
موسم کی پابند نہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جنسی طور پر آزاد
قسم کے لوگ بالکل پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ پاگل پن اور ذلت کی کوئی
انتہا ہے کہ مغربی ممالک میں جو زندگی کے بعض شعبوں میں انتہائی مہذب
اور تعلیم یافتہ ہیں عورتیں جنسی تسکین کے لئے کتوں کو استعمال کرتی ہیں گویا
اس جنسی آزادی اور آوارگی نے انسان کو کتوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا
ہے۔ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے۔ جنسی جذبات
بھی دوسرے جذبات کی طرح یہی حال ہے کہ آپ ان کو جس قدر چاہیں
بڑھا لیں اور جس قدر چاہیں قابو میں رکھیں آپ ان کی تربیت کر کے
ان کو اعتدال پر قائم رکھ سکتے ہیں۔ جب دوسرے جذبات کی تربیت
ہو سکتی ہے تو جنسی جذبات کی تربیت کیوں نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ
محض نادانی اور حماقت کا خیال ہے کہ آجکل عصبانیت کا مرض جنسی
بھوک کی وجہ سے زیادہ پیدا ہو رہا ہے۔ آخر آج سے ایک دو صدی پہلے
جنس کا اس قدر زور نہیں تھا تو یہ مرض کیوں نہیں اس قدر تعداد میں
پیدا ہوتا تھا اس وقت تو تسکین کے ذرائع بھی بہت کم تھے۔ دراصل
عصبانیت کے مرض کے اور دوسرے اسباب ہیں جن کو جنسی آزادی
کے حامی دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً غذا کی خرابی اور کمی کی وجہ
یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ شہوانی جذبات کو بھڑکانے
کے بے پناہ ذرائع استعمال کئے جا رہے ہیں وہ ہمہ وقت طبیعت کو
ہیجانی نقطے پر رکھتے ہیں۔ اس طوفان کی تسکین کے لئے اتنے
زیادہ ذرائع کس طرح مہیا کئے جائیں اور جو لوگ کوشش کر کے اس
قسم کے اسباب مہیا کر لیتے ہیں وہ اپنی زندگی اور تندرستی کو تو تباہ
کر ہی لیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اور جو
تسکین کے پورے اسباب مہیا نہیں کر پاتے تو وہ پریشان رہتے ہیں اور
نروس ہو جاتے ہیں۔ یا جنونی کیفیت ان کے مزاج میں پیدا ہو جاتی ہے۔
پھر آجکل ضروریات زندگی بہت بڑھ گئی ہیں اور معیار زندگی
بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آجکل ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہی
بڑا مشکل ہے معیاری زندگی گزارنا تو چند ہی خوش قسمت لوگوں کو نصیب
ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ جو درویشانہ قناعت و توکل سے
کام نہیں لے سکتے سخت پریشان رہتے ہیں ایسے لوگ ہمیشہ اپنے سے
بلند معیار والے شخص کی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں اور حسرت سے کڑھتے
رہتے ہیں۔ جو کچھ کماتے ہیں اس میں پورا نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ آج
کل کی تیز اور زہریلی دوائیں بھی اعصابی بیماریوں کے پیدا کرنے میں بہت
پیش پیش ہیں۔ پھر ایک اور بڑا سبب ہماری خانگی زندگی کی تباہی
ہے۔ جنسی آوارگی کی وجہ سے خاندان والوں سے اور اپنے گھر سے بے
تعلقی بلکہ نفرت دن رات بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ اولاد کو مستقل
طریقے سے وبال جان سمجھنے لگے ہیں۔ اور اپنی زندگی کی راحت کا کانٹا
سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کو بھی ماں باپ
سے وہ محبت نہیں رہتی اور وہ درماندگی اور بڑھاپے میں ان کا ساتھ
نہیں دیتی۔ ان تمام حالات کا انسانی اعصاب پر انتہائی تباہ کن اثر
پڑ رہا ہے۔ ایک اور اہم سبب اس بیماری کا دنیا کے تمام ممالک کا
سرد جنگ میں مبتلا رہنا ہے۔ یہ وبا عوام کے اعصابی قوتوں کو
تباہ کرنے کے لئے تنہا ہی کافی ہے۔ غرضیکہ سینکڑوں اسباب اس
قسم کے شمار کئے جاسکتے ہیں جو ہماری زندگی کو تباہ کئے ہوئے ہیں اور
بچپن سے ہی ہمارے بچوں کو نروس بنا دیتے ہیں لیکن ہم الزام دیتے
ہیں صرف ایک سبب کو اور وہ بھی نہایت کمزور اور شاذ و نادر ہی وقوع
میں آنے والا ہے۔ اور اس معاملے کا خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ شہوت
رانی کی زندگی کو انتہائی قوی اور تندرست آدمی تو کچھ عرصے تک
جھیل بھی سکتا ہے لیکن ایسے لوگ جو پہلے ہی نروس، کمزور اور ناتواں

ہوں اگر عیاشی کی زندگی پر اتر آئیں تو سوائے اس کے کہ تھوڑی سی مدت کے بعد تپ دق وغیرہ قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جائیں اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آجکل کی دنیا میں تپ دق کی بیماری کی جو کثرت ہو رہی ہے اس کا ایک بڑا سبب شہوانی جذبات کی برانگیختگی ہے اور کہیں ان کی حد سے زیادہ تسکین میسر ہوتی ہے اور کہیں عدم تسکین۔

جنسی تسکین کو عصبانیت کا واحد علاج بنا کر آج کل کے جنس زدہ انسان نے دیوانہ بکار خویش ہشیار ہونے کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔ فرائیڈ نے اس مرض کے دو علاج بتلائے تھے۔ ایک جائز تسکین اور دوسرا ترفیع (Sublimation) ترفیع سے یہ مطلب ہے کہ جنس کی قوت کو کسی اعلیٰ تعمیری کام میں صرف کیا جائے۔ تمام ماہرین نفسیات اس چیز کو تسلیم کرتے ہیں کہ جنسی رجحان ایک قوت ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی کارگردگی میں کام کرتی ہے۔ اس کا حلقۂ اثر صرف زندگی کا جنسی پہلو ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں شکل بدل کر کارفرما رہتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ تمام جنسی قوت کو یا اس کے کچھ حصے کو تربیت کر کے جنس کے علاوہ زندگی کے دوسرے مفید شعبوں میں استعمال کر لیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ زندگی کے جنسی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اس طرح تو ہم اپنی بنیادی فطرت سے بغاوت کے مرتکب ہوں گے جس کے نتائج ہماری زندگی پر اچھے نہیں پڑ سکتے۔ اس لئے کہ جاندار کی فطرت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی نوع کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو آگے بڑھائے۔ اگر جنس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تو قطع نسل کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ اس قوت کو ضرورت کے مطابق ہی جنسی پہلو پر صرف کیا جائے۔ باقی طاقت کے اس خزانے کو دوسرے مفید کاموں میں لگایا جائے۔ انسان نے یہ ہشیاری کی کہ ترفیع جنسی کے طریقۂ علاج کو تو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس میں آزمائش کا سامنا تھا اور طبیعت پر بار پڑتا تھا لیکن دوسرا طریقہ جنسی تسکین کا خوشی سے اختیار کر لیا۔ کیوں کہ اس میں لذت تھی۔ تن آسانی تھی۔ اور آزادی تھی

لذت کے مقابلے میں تکلیف۔ تن آسانی کے مقابلے میں کاوش آزادی کے مقابلے میں پابندی کون گوارا کرے۔ یوں تو ہر شخص ہے کہ اس کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں اور تکمیل آرزو میں کی مزاحمت نہ ہو لیکن یہ ہو کیسے۔ اگر وہ اپنے لئے یہ حق حا چاہتا ہے تو دوسرے بھی اسی کی قسم کے انسان ہیں لازمی ا یہی تمنا ہو گی۔ پھر اس دنیا کی زندگی اس قسم کی ہے کہ ایک دوسرے کی تمناؤں کا شکار کر لیتی ہے۔

طرح یہ دنیا اور اس کی زندگی ایک مستقل کارزار بنی ہوئی ہے۔ بے قید معاشرت کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔ کسی نہ کسی خون آرزو کا صدمہ برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اور کسی نہ کسی دست بردار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں کوئی ہی باقی نہ رہے اور زندگی جنگلی زندگی ہو کر رہ جائے۔ اور محال ہم یہ بھی گوارا کر لیں کہ آزادی کی خاطر ہم جنگلی زندگی گز کے لئے تیار ہیں اس وقت بھی ہر شخص کی تمام آرزوئیں پوری ہو سکیں ہم میں سے جو زیادہ طاقتور ہو گا وہ اپنی زیادہ خواہشا پورا کرے گا اور جو کمزور ہو گا اس کی آرزوؤں کا خون ہو کر رہے گا جنگلی زندگی میں بھی ایک قانون جاری و ساری رہتا ہے او قانون طاقت کا قانون ہے۔ جو لوگ طاقتور ہوں گے وہ پس نہ گے۔ کیوں کہ انسان تو اپنے سے بڑا کسی کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ د ہر معاملے میں وحید العصر اور تنہا ہونا پسند کرتا ہے۔ وہ یہ پ کرتا کہ اس کا کوئی دوسرا مقابل ہو۔ وہ لاثانی بن کر رہنا چاہتا دوسرے لوگوں کو اپنے مقابلے میں وہ مجبوری کے لئے برداشت کر اور یہ مجبوری یا قانون کی ہوتی ہے یا کمزوری کی۔ پھر اگر ایک شخص لوگوں سے زیادہ طاقتور ہو بھی جائے تو آخر کب تک یہ قوت اس کا دے گی۔ انحطاط اور زوال تو جانی دشمن کی طرح ہر وقت اس کے لگے ہوئے ہیں۔ اس کی طاقت میں کمی آئے گی اور دوسری نئی طا ابھرنے کی کوشش کریں گی اور نتیجہ یہ ہو گا کہ کشاکش اور جنگ ہو جائے گی۔ پھر ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس ایک قوی کے عیش و آسودگی سے، حسد کرتے ہوئے بہت سے کمزور لوگ آپس

ں جائیں اور مل کر اس کی طاقت کا خاتمہ کر دیں۔ یا لڑائی جاری رکھکر
ں کی زندگی کی راحت کو مکدر کر دیں۔ غرضکہ اس دنیا کی زندگی میں
ئی ایسی صورت نہیں نکالی جاسکتی کہ انسان جو چاہے کرتا چلا جائے۔
ں کو کسی پابندی یا قانون کا لحاظ نہ کرنا پڑے۔ اور سب سے بڑی بات
یہی ہے کہ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو تکمیل آرزو میں بھی کوئی لطف باقی
یں رہتا۔ بقول اصغر ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ب غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نفسیات و اخلاقیات دو علیحدہ
یحدہ علوم ہیں۔ ان کا حلقۂ اثر بالکل جدا ہے۔ نفسیات جہاں فیصلہ
دیتی ہے اس کے بعد اخلاقیات کا حلقۂ اثر شروع ہوتا ہے اور نفسیات
ما احکام پر اخلاقیات کے اصول کے تحت ہی عمل کیا جانا چاہیئے۔
سیات کے سب سے بڑے ماہر فرائیڈ نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے
س تقسیم پر زور دیا ہے۔ اس لئے جو شخص خواہ فرائیڈ کا پیرو ہو یا
رف مصلح یہ کہتا ہے کہ نفسیات کے نزدیک اخلاقیات کی کوئی حد
یں قطعی غلط ہے اور اس کا یہ قول نفسیات اور فرائیڈ پر ایک اتہام
ے اور اسی قسم کا اتہام ہے جیسا کہ فرائیڈ کے ایک شاگرد نے فرائیڈ پر خدا
ہنے کا اتہام لگا دیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز کبھی فرائیڈ کے خواب و خیال
ں بھی پیدا نہیں ہوئی۔ مگر انسان تو کسی نہ کسی کو خدا بنا لینے کے لئے
بور ہے۔ بقول ایک فلسفی کے "ہم اوپر کو سر اٹھا کر چل ہی نہیں سکتے
ر آسمان پر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرلیں۔ اب خدائے واحد کے اکثر
ے منکر ہو رہے ہیں تو کبھی مارکس کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں کبھی
ین اور اسٹالن کو اور کبھی فرائیڈ کو۔ غرضکہ کوئی نہ کوئی خدا انہیں
بنانا ہی پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں فرائیڈ کے ایک شاگرد کے
اظ سنئے "یقیناً کوئی انسان خدا نہیں ہو سکتا لیکن ایک آدمی
ا ہے اور وہ فرائیڈ ہے اس کی کتابوں کی دس جلدوں کا ایک ایک
ظ صحیح ہے۔ وہ سو فیصدی نہیں بلکہ دو سو فیصدی صحیح ہے۔ ہر لفظ جو
س نے لکھا ہے درست ہے اور ہر وہ لفظ جو وہ آئندہ لکھے گا صحیح ہو گا
(الہ نفسیاتِ فاسدہ مصنفہ میکڈوگل ترجمہ ولی الرحمن۔ دیباچہ
مصنف صفحہ ۳)

اس کے بعد فرائیڈ کے ایک مخالف پیری زانے کی کتاب "تشخیص امراض کے نفسیاتی اصول" کا ایک قول بھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے دیکھ لیجئے "فرائیڈ ی تحلیل کے متعلق لکھتا ہے "اس میں تخیل کا استعمال۔ تنقید کا فقدان ہے . . . . . خیال یہ ہے کہ اس کی بھی غیر مستحق قدر شناسی ہو گی اور پھر اس کا خاتمہ ہو جائیگا
علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

التماس ہے کہ . . . .

(۱) اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہو گی۔ نیز ادارہ "منیر" ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ (۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔ (۳) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ————— (ایڈیٹر)

کوثر نیازی •

نہ مال وزر کی، نہ سیم و گہر کی بات کرو
ہمارے ساتھ خلوصِ نظر کی بات کرو

رکاوٹیں تو رہِ شوق میں ضروری ہیں
قدم بڑھاؤ رفیقو! سفر کی بات کرو

حضور ناصحِ مشفق یہ میں نے عرض کیا
کہانیاں نہ کہو، کچھ ادھر کی بات کرو

جمالِ دوست کی عظمت بجا سہی لیکن
کسی غریب کے حسنِ نظر کی بات کرو

ظلمتیں ہیں حقیقت میں مہر در آغوش
سی فضا میں طلوعِ سحر کی بات کرو

دمِ خطاب فصاحت ضرور ہو واعظ
مگر خدا کے لئے کچھ اثر کی بات کرو

کسی کے تیرِ نظر کو نگاہ میں رکھنا
کبھی جو سینہ و قلب و جگر کی بات کرو

محشر رسول نگری •

اثر یکساں ہے دونوں پر شرابِ عشق و مستی کا
کبھی میں خود نہیں رہتا کبھی ساقی نہیں رہتا

حیات افروز ہے گو عقل کی ہنگامہ آرائی
خدا کو اک طرف کر دو تو کچھ باقی نہیں رہتا

ازل سے ہے جہانگیرانہ فطرت مردِ مومن کی
اگر دیں خاک سے نسبت تو آفاقی نہیں رہتا

مجھے آوارہ کر دے وادیٔ الفت کی راہوں میں
کہ منزل پر پہنچ کر سوزِ مشتاقی نہیں رہتا

نہ چھین اے عشق مجھ سے میرا احساسِ عبودیت
فنا ہو جاؤں میں ان میں تو خود باقی نہیں رہتا

اخترِ عادل رہوپ •

پہلا روپیہ

دینا ناتھ ہیڈ ماسٹر راج پور اسکول آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چوپال کے گھیرے کے پاس سے گذر رہے تھے۔ ان کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی جسے کمر اور ٹانگوں کے گرد لپیٹ کے انہوں نے داہنے کندھے پر ساڑھی کے پلو کی طرح ڈال لیا تھا۔ اس میں سے ان کا اندر پہنا ہوا بنیان صاف نظر آ رہا تھا۔ گلے میں بڑا سا جنیو تھا اور پاؤں میں ربڑ ٹائر کے معمولی چپل۔

دینا ناتھ کا سر نیچے جھکا ہوا تھا جس سے دیکھنے والے یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ چلتے ہوئے اپنے قدم گن رہے ہیں لیکن یہ بات نہیں تھی وہ ایک گہری سوچ میں غلطاں تھے۔ ان کی ذہنی پریشانی ان کے ماتھے پر ابھری ہوئی لکیروں سے عیاں تھی۔ کم سے کم اس وقت جب وہ چہل قدمی کے لئے راج پور آبادی سے دور سرسبز کھیتوں اور کھلے میدانوں میں جاتے تھے انہیں کسی کو اس طرح پاپند سلاسل نہیں کرنا چاہیئے تھا ورنہ کیا تھا کہ مزا آسکتا آشیانوں کی طرف لوٹتے ہوئے پرندوں کی چہکار میں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے ڈھلتے ہوئے سونے میں اور شفق کی لالہ کاری میں۔ لیکن دینا ناتھ کو اپنے اسکول سے محبت تھی، وہ ایک ہمدرد سرپرست کی طرح راج پور اسکول کی ترقی کے لئے ہر ممکن جتن کر رہے تھے اس لئے عملی زندگی کی فرصت کا بھی کوئی لمحہ خیال سے دور نہیں تھا۔ یہ خیال ان کے ہر جذبہ دل کو لازوال سکون دیتا۔ وہ فخر سے سوچا کرتے تھے کہ اتنی لگن کسی بھی ہیڈ ماسٹر کو اپنی درس گاہ سے نہیں ہو سکتی۔ ہو بھی سکتی ہے لیکن بے حد کمی کے ساتھ۔

دینا ناتھ بے خبری میں چلے جا رہے تھے کہ ادھر سے لالہ رام پرشاد دکان بند کرکے روپے پیسے کا حساب جوڑتا چلا جا رہا تھا۔ آج اس کی دکانی ٹھیک رہی تھی اس لئے وہ دن بھر بہت خوش رہا تھا لیکن شام کو جب اس نے حساب لگایا تھا تو اس میں ایک پیسے کی کمی تھی۔ شاید وہ کسی سے لینا بھول گیا تھا اور اس بے ایمان نے بھی اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہیں دیا تھا۔ رام پرشاد کا شبہ جگو کاکا کی طرف تھا اس نے ایک پیسے کا کڑوا تیل خریدا تھا اور شاید اس نے ہی نہیں دیا تھا، دیتے بھی کہاں سکتا تھا۔ رام پرشاد نے سوچا۔ اس کا گذران تو کھیت والوں کے بچے کھچے ٹکڑوں پر تھا۔ جیسے کتا پرورش پاتا ہے اسی طرح وہ بھی پلتا تھا۔ اگر آج رات اس کی جھونپڑی میں چراغ نہ بھی جلتا تو کون سی قیامت آ جاتی لیکن اس نے آج موقع غنیمت جان کے تیل خرید لیا تھا خیر آج اجالا کر لے۔ کل رات کہاں سے ہنڈے روشن کرے گا بے ایمان۔ لالہ رام پرشاد نے تھوک دیا۔

یکایک دینا ناتھ ہیڈ ماسٹر کسی گول چیز سے ٹکرا گئے، انہیں اپنے جسم پر گیلا ہٹ بھی محسوس ہوئی، وہ چونکے تو ان کے ہاتھ لالہ رام پرشاد کی توند پر تھے اور ان کے اور لالہ کے درمیان توند کا ایک گز کا فاصلہ تھا۔

> "......مجھے دکھ ہے میں یہ اسکول آپ کے سپرد کرکے کل چلا جاؤں گا اور یہ اپنی صورت جس پر میری ہار لکھی ہے، کبھی نہ دکھاؤں گا......"

لالہ نے اپنے دانت نکالدیئے: "اوہ آپ ہیں دینا ناتھ جی!" پھر پشیمانی دور کرنے کے لئے پوچھنے لگا، "کہیئے آپ نے اسکول کے لئے اب کیا سوچا ہے؟"

دینا ناتھ نے اپنے سینے پر بہی ہوئی تھوک کی دھاری پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "سوچنا کیا لالہ جی۔ میں تو ہمت ہار چکا۔ گاؤں کے ایک ایک آدمی کے پاس ہاتھ پھیلانے گیا۔ چاہتے تو سب ہیں کہ یہ ہائی اسکول ہو جائے لیکن چندہ دینے کو کوئی تیار نہیں۔"

"آپ بھی چھوڑیئے یہ دھندا۔" لالہ نے کہا "یہ پڑھیں گے تو ان کو کچھ

نہیں پڑھیں گے تو ان کے بچے، پھر چند لمحے ٹھہر کر کہنے لگا "صاحب میرے تو کوئی بچہ نہیں ہے ورنہ میں چندہ ضرور دیتا۔"

"ٹھیک ہے!" دینا ناتھ مسکرائے "آپ کے کوئی بچہ نہیں اس لئے چندہ نہیں دیں گے۔" ساہوکار جی کا بچہ پڑھتا ہے تو وہ کہتے ہیں آگے پڑھنے اسے شہر بھیجدیں گے۔ اب یہ چار کمرے کہاں سے بنیں، انسپکٹر نے کہہ دیا ہے کہ جب چار کمرے بن جائیں گے اور عمارت کافی ہوگی تو اسے ہائی اسکول کریں گے ورنہ نہیں۔"

لالہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا! اس نے نمستے کیا اور اپنی راہ چلتا بنا۔

دینا ناتھ آگے بڑھے، اب وہ سامنے دیکھتے ہوئے چل رہے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اور کسی لالہ سے ٹکر ہوگئی تو کیا ہوگا۔ ان کے راستے میں راج پور گاؤں کی کچی گلیاں تھیں جن پر گندا پانی بہنے سے کیچڑ ہوگئی تھی اس کیچڑ میں گاؤں والوں کے پیروں کے نشان اور ان کے چوپاؤں کے کھر محفوظ تھے۔ انہیں بیچ کے علیحدہ چلنا پڑ رہا تھا کہیں کہیں ان کا چپل گیلی مٹی میں گڑ جاتا تو قدم اٹھانے میں تکلیف محسوس ہوتی اور چھینٹوں سے کپڑوں کی حفاظت الگ کرنا پڑتی تھی۔ ان کے سامنے گوبر سے لپی ہوئی میلی میلی دیواریں تھیں اور آداب کرتے ہوئے بچے تھے جو کوڑیوں کا کھیل چھوڑ کے انہیں دیکھ کے کھڑے ہو جاتے، ان کے گندے کپڑے اور برہنہ جسم دیکھ کے دینا ناتھ کو اس بدحالی اور محرومی کا احساس ہوا جس کے پنجے میں راج پور کے رہنے والے، ان کی محنت، ان کی مسکراہٹ، انکی عورتوں کی شرم اور ان کے بچوں کی پھول جیسی مسکراہٹ جکڑی ہوئی تھی۔ نہ جانے کب تک اس پنجے کی گرفت اسی طرح مضبوط رہے گی، نہ جانے کب زندگی کے اس اندھیرے میں کہکشاں پھوٹے گی، نہ جانے کب یہ اسکول ہائی اسکول ہوسکے گا اور اس خزانے سے علم کی دولت ان بچوں کی جھولی میں ڈالی جانے گی جو آج جہالت کا کفن پہنے کوڑیاں کھیل رہے ہیں۔

دینا ناتھ آگے بڑھتے چلے گئے اور پگڈنڈیوں پگڈنڈیوں ہوتے ہوتے وہ کھلے میدان میں برگد کے ایک پیڑ کے پاس پہنچے جس کے نیچے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ وہ یہیں تک روز ٹہلنے آتے تھے! ان کے سفر کی آخری منزل بھی یہی ہوتی تھی جس طرح کوئی راہی سستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھاتا ہے وہ بھی اس چبوترے پہ بیٹھ کے اپنی حیات کی پوری یاد تازہ کیا کرتے تھے اور ماضی کی تہ دیریں الٹتے پلٹتے تھے! انہیں ان تصویروں سے اتنا ہی پیار تھا جتنا ہر بوڑھے انسان کو اپنی جوانی کی بہاروں سے ہوتا ہے کیونکہ اس میں محبت کی گرمی اور امنگوں کی تڑپ ہوتی ہے۔ دینا ناتھ بھی اس امنگ اور تڑپ کو تیس سال پیچھے چھوڑ آئے تھے اور ان کی زندگی بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ یہ زندگی تو اسی روز تنہا ہوگئی تھی جب ساوتری کو ایک ڈولا ان کے گاؤں سے چھین کر جانے کدھر لے گیا تھا۔ جب شہنائیاں ان کی اپنی محرومی پر نوحہ کناں ہوئی تھیں۔ جب ان کے اکلوتے پیار کا پودا ایک خزاں کے جھونکے میں ٹھٹھر کے مرجھا کے رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس تنہائی میں ایک ماں کی ذات باقی تھی لیکن ایک روز وہ بھی ان سے روٹھ گئی اور دینا ناتھ نے گاؤں چھوڑ دیا۔ ایک شہر پہنچے وہاں محنت مزدوری کرکے رہنے لگے اور آہستہ آہستہ پرائیوٹ طریقے پر انٹر پاس کرلیا۔ وہ آگے بھی پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن بی اے کرنے کے لئے کالج میں داخلہ لینا ضروری تھا۔ اس لئے وہ راج پور کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ تاکہ ٹیچر ہونے کی حیثیت میں بی اے کرسکیں۔

انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ اسکول میں آتے وقت ان کا مقصد ذاتی تھا! لیکن کچھ عرصہ رہنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اسکول کو ترقی دینا چاہیے! اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے سے یہ بہتر تھا کہ تمام بچوں کو فائدہ پہنچایا جاتے ان کے اسکول کی عمارت بہت مختصر تھی، دو کمرے اور دو دالان تھے جس میں جماعت آٹھ تک کے طلبا بیٹھتے تھے اور کچھ باہر زمین پر بیٹھتے تھے۔ ہائی اسکول ہونے کے لئے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے۔ لیکن عمارت کی ضرورت ایک ایسی شرط تھی کہ اس کے لئے روپے اور زمین کی ضرورت تھی انہوں نے پوری لگن کے ساتھ چندہ اگانے کی مہم جاری کردی۔ گاؤں کے ہر ہر آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے۔ ان کے بچوں کے لئے روپے مانگتے لیکن جلد ہی انہیں اس تلخ حقیقت سے دوچار ہونا پڑا کہ بڑے بڑے لوگ لالہ رام پرشاد اور ساہوکار جیسے تھے جو دوسروں کے لئے اپنا پیسہ دینا محض حماقت سمجھتے تھے۔

اس صورت حال نے دینا ناتھ کو بے حد اداس کر دیا تھا، انہیں محسوس ہوتا کہ ان کی جدوجہد کی زنجیر یہاں پہنچ کے ٹوٹ گئی ہے۔ جب وہ دیکھتے کہ چودہری حمایت علی کے لڑکا پیدا ہونے پر ایک طوائف کا مجرا کرایا گیا اور گاؤں والوں نے اس طوائف کی ایک ایک ادا پر روپے لٹاتے۔ جب اوم پرکاش اینٹ والے کی لڑکی کی شادی پر نوٹنکی بلوائی گئی اور تمام شب جشن رہا۔ جب گاؤں میں ٹورنگ سینما آجانے پر ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے لاٹھی چل گئی۔ جب ایک گرجے کے نیلام پر کرشن سنگھ اور ٹھاکر سنگھ میں بحث چل پڑی اور بولی بیس ہزار روپے پر رکی۔ جب ایک مندر بنوانے کے لئے گھنٹوں میں سینکڑوں روپیہ چندہ ہو گیا لیکن اسکول کے لئے چندہ دینے کے نام پر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہمت ٹوٹ جاتی، وہ سوچنے لگتے کہ کوشش فضول ہے اور بھاگ دوڑ سراسر لاحاصل۔

دینا ناتھ چبوترے پر بیٹھ گئے ”اب مجھے کیا کرنا چاہیئے“ انہوں نے پیڑ کی طرف نظر اٹھائی۔ ایک فاختہ ڈال سے اڑ کے فضا میں گم ہو گئی اور ان کے سوال کا جواب دے گئی۔ انہیں خیال آیا میں بھی گاؤں چھوڑ دوں یہ خیال بے حد تکلیف دہ تھا۔ زندگی کی تنہائی میں انکا سب سے پیارا رفیق یہ اسکول ہی تھا جس کی اینٹ اینٹ پر ان کے پیار کی چھاپ لگی ہوئی تھی اسے کس طرح چھوڑ دیں، کیسے بلبل اپنے آشیاں کو چھوڑ سکتا ہے کیسے پھول شاخ سے ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ کیسے راج پور چھوڑ سکتے ہیں جہاں ان کے محرومِ دل کے زخم کسی حد تک مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن شائد مجبوری یہ بھی کرلے۔ ساونتری کا ڈولا بھی ان کی نظروں کے سامنے اٹھ گیا تھا انہوں نے اس میں سے سسکیوں کی آوازیں محسوس کیں تھیں لیکن وہ تب بھی مجبور تھے اور اب بھی مجبور۔ وہ ایسی جگہ نہیں رہ سکتے تھے جہاں ان کی ناکامی قہقہے لگا کر ان کے مذاق اڑا رہی ہو۔

دوسرے روز دینا ناتھ نے تمام گاؤں والوں کو اسکول کے صحن میں اکٹھا کیا اور کہا ”میں نے دس سال تک آپکے اسکول کی خدمت کی لیکن مجھے دکھ ہے کہ اب میں آپ سے جدا ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے اسکول کی ترقی کے لئے ہر کوشش کر دیکھی، لیکن مجھ اکیلے سے کچھ نہ ہوا۔ میں نے تنگی کے ساتھ بسر کی۔ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ غریب بچوں کو وظیفوں کی شکل میں دیتا رہا۔ میری آرزو تھی کہ یہ ہائی اسکول ہو جائے لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب تک ہمارے پاس عمارت نہ ہو یہ نہیں ہو سکتا میں نے آپکے بچوں کی تعلیم کے لئے آپکے سامنے ہاتھ پھیلائے آپ سے بھیک مانگی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے دکھ ہے کہ میں یہ اسکول آپکے سپرد کر کے کل چلا جاؤں گا اور اپنی یہ صورت جس پر میری ہار لکھی ہے کبھی نہ دکھاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔“

دینا ناتھ کے پاس کہنے کو بہت تھا لیکن آواز ساتھ نہ دے سکی انہوں نے پیٹھ موڑ کر اپنی آنکھ سے آنسو پونچھا۔ مجمع پر سکوت تھا سب نے سر جھکا لئے تھے لیکن اس آواز پر لبیک کہنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ چند لمحے کھڑے رہے پھر واپس جانے کے لئے بڑھے کہ یکایک ایک آواز نے انہیں روک لیا۔

”دینا ناتھ جی!“

سب کے ساتھ لالہ رام پرشاد نے بھی مڑ کے دیکھا جگو کا کا جس کے متعلق اسے شبہ تھا کہ پیسے کا تیل مفت لے بھاگا تھا۔ پیچھے سے اٹھ کے آگے بڑھ رہا ہے وہ دینا ناتھ کے قریب آیا۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی بنڈی میں سے ایک روپیہ نکال کے دینا ناتھ کے آگے اپنے میلے ہاتھ پر پھیلا دیا اور کہا ”ماسٹر جی میں غریب آدمی ہوں — پیسہ پیسہ کر کے میں نے روپیہ جوڑا ہے میرے پاس صرف یہی ہے اسے چندہ میں لے لیجئے اور ہمیں نہ جانے دیجئے“

دینا ناتھ کے فرطِ مسرت سے آنسو نکل آئے انہوں نے بے خودی کے سے انداز میں روپیہ اٹھا کے مجمع کے سامنے کیا اور کہا ”بتلائیے میں چندہ لے لوں؟“

یکایک اوم پرکاش اینٹ والا چمک کے اٹھا اور بولا ”جی ہاں ضرور — میں کمرے بننے کے لئے مفت اینٹیں دیدوں گا“

اوم پرکاش کو دیکھ کے چودہری کرامت علی کو جوش آ گیا ”میں زمین دے دوں گا“

”ٹھاکر سنگھ نے کہا ”میں سیمنٹ کی پانچ سو بوریاں دوں گا“

کرشن سنگھ سے نہ رہا گیا اس نے کہا ”یہ بات ہے تو میں فرنیچر دوں گا“

موہن راج آگے بڑھ کے بولا ”کمرہ بنوانے کی ذمہ داری مجھ پر، تمام گاؤں والے مل کے کام کریں گے اور بس بس دیکھتے ہی دیکھتے

چار نہیں سو کرے بن جائیں گے "
پیچھے سے کئی لوگوں نے ہاتھ اٹھا کے اور آوازیں دے کے اسکی تصدیق کر دی۔
دینا ناتھ کی حالت دیکھنے کے قابل تھی وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے جیسے آج انہیں اپنی تمام زندگی کی محرومی کا نعم البدل مل گیا ہے، وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کے شکریہ ادا کر رہے تھے " دیکھئے صاحب اتنا بڑا کام منٹوں میں ہو گیا۔ یہ عزیز کے اس ایک روپے کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے "

(بشکریہ "شمع")

شوکت تھانوی

دولت خانہ

میں ابھی بستر کی چاپلی کر کے بستر کا پان کھانے کے لئے بیگم کو پاندان کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا۔ باہر نکل کر دیکھا۔ ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا:

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تم نے یعنی تم مرے نہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوتے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا ہے تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آ سکے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہوں گے بلکہ لاہور پہنچ کر اس ریاض کی تو غائبانہ نماز جنازہ تک میں شریک ہو چکے تھے۔ مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا

"اب یہیں کھڑے کھڑے محبت بگھارو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے۔"

میں نے گھبرا کر کہا "گھر؟" ــــ "ہاں ٹھیک ہے یہ گھر تو ہی ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا" میں نے کہا سنتی ہو ریاض آگیا ہے۔ ذرا پردہ کر لو۔ اندر ہی بلا لیں۔"

ایک منٹ میں پردہ ہو گیا اور ریاض کو میں نے ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ ریاض نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف وحشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا

"کیا مطلب یعنی بس۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک چارپائی آسکتی ہے تو اس میں رہتے کس طرح ہو؟" اور یہ جو تم نے بھابی سے پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں۔ مجھکو تو صرف ایک دروازہ نظر آرہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں

میں نے کہا "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے۔"

ریاض نے ایک اور دروازہ کھولتے ہوئے کہا "اچھا یہ ہوگا اندر جانے کا دروازہ۔"

اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے عرض کیا "جی نہیں یہ الماری ہے اور الماری کھول کر ریاض کو دکھا دی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے ریاض نے پاگل ہو جانے کے قریب ہوتے ہوئے کہا "ارے بھائی تو بھابی کہاں سما گئیں۔"

اب میں نے اس معمہ کے حل میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ میں ریاض کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

میاں مبارکباد دو مجھکو کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے! ورنہ تم سے کسی فٹ پاتھ پر ملاقات نہیں ہوئی۔ جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا۔ خوش نصیب ہوں میں کہ خانہ بدوش نہ بنا اور شکر ہے اس پروردگار کا جو خود لامکان ہے۔ مگر مجھے مکان دیدیا۔

ریاض نے جل کر کہا "عجیب آدمی ہیں آپ یعنی آپ اسے مکان کہہ رہے ہیں۔"

میں نے نہایت اطمینان سے کہا "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں۔ یہی میرا ڈرائنگ روم ہے یہی میرا بیڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانے پکانے کا کمرا۔" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا "ارے

"میں نے نہایت اطمینان سے کہا" ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے۔ یہی میرا بیڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانے پکانے کا کمرا۔"

میں نے کہا "سنتی ہو ذرا پان بھیج دینا" اس پر ریاض نے پھر ادھر ادھر دیکھا کہ یہ آواز سننے والی آخر کہاں ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا "یہیں ہیں اور کہاں ہوتیں۔ د

عفو کیسا جلوہ رحمت بھی نکلے گا یہیں

ذوقِ عصیاں چاہیئے عرفانِ عصیاں چاہیئے

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا اس نے ذرا تلخی سے کہا۔ "یہ آخر معمہ کیا ہے بتاتے کیوں نہیں صاف صاف۔"

میں نے کہا "بھائی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بچے سوتے ہیں تمہارے رات کو اوپر والے خانہ میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا بچہ چھوٹا جو ابھی اسی میں پیدا ہوا تھا"

ریاض نے حیرت سے کہا "کہاں یعنی اس الماری میں۔ ارے بھئی اس میں تو ٹانگیں بھی نہ پھیلاتے ہوں گے یہ بچے!"

میں نے کہا "ٹانگیں پھیلانا یا سمیٹے رہنا سب عادت پر منحصر ہے اب ان کو ٹانگیں سمیٹ کر سونے کی عادت پڑ گئی ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی صبح اٹھنے کے بعد دن بھر ٹانگیں پھیلاتے ہیں۔ وہ مثل تو تم نے سنی ہوگی کہ چادر دیکھ کر پیر پھیلائے جاتے ہیں۔ میں نے اس میں بس ذرا سی ترمیم کردی ہے کہ الماری دیکھ کر پیر پھیلانا میرے بچو۔"

ریاض نے ہکا بکا ہو کر کہا "بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہوگئے شربت کی بوتلیں ہوگئے کہ الماری میں رکھے جاتے ہیں۔ اور بھابی اس وقت کس الماری میں ہیں؟"

اور یہ کہکر وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ وہ وحشت جو اچانک کرنٹ لگ جانے پر کسی پر برس سکتی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں خود گھبرا گیا۔ اسکی یہ حالت دیکھکر۔ اور جلدی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

اس نے سہمے ہوئے انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا "یہ اچھا تھا جیسے کسی نے ٹھوکا دیا ہو مجھے" اور میں نے ہنس کر کہا "لا حول ولا قوۃ۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ میں ادھر بیٹھا ہوں" اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا۔ ریاض آنکھیں پھاڑ کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔ جب میں نے خاصدان کھول کر پان اس کی طرف بڑھائے تو اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا:

"تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں؟"

میں نے کہا "جب کوئی آتا ہے۔ وہ پلنگ کے نیچے ہی پردے میں چلی جاتی ہیں۔ کافی اونچا پلنگ ہے اور اس کے نیچے دری بچھی ہوئی ہے، چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے۔ اچھا خاصا محل ہے!"

ریاض نے حسرت کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پر سوار بیٹھے ہیں۔"

بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا "نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھئے یہ تو خانہ بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے۔"

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "بھیا وہ عادی ہوچکی ہیں آج یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں دوسرے وہ تو نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی۔ اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے۔ پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں۔ جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی!"

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا "صاحب عجیب مہمل زندگی ہے الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک درکی قبر نما کوٹھڑی اور اسی میں ساری کائنات!"

میں نے کہا "توبہ کرو ریاض توبہ کرو۔ یہ بڑا بول ہے۔ میں تو بخدا اس کوٹھڑی پر ناز کرتا ہوں۔ اور میرے دوست میری قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے وہ جو زندگی بھر گوشہ عافیت سنتے آئے تھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل یہی کوٹھڑی ہے۔ اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو کہ رات کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ادھر پنجہ اُدھر دوسرے کی ایڑی اُدھر پنجہ ادھر۔ صبح اٹھکر وہ دیکھو کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس پر بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اوپر والے خانے سے نکل کر دودھ لے آتا ہے

پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں۔ اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول چلے جاتے ہیں۔ صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقعہ اوڑھ کر اور بچے کو گود میں لے کر شاپنگ کے لئے چلی جاتی ہیں اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ مجھے نہ دراصل گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری ٹھیک لا سکتا ہوں۔ میں اس موقعہ کو غنیمت جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لاکر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لیکر غسل شروع کر دیا۔"

ریاض نے ٹوکا "یہ جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل ؟"

میں نے کہا "یہ غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی کوٹھڑی کی بھی صفائی نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آ رہی ہے نا۔ یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں۔ اور میز پوش ہٹاتا ہوں تو تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اوپر والے ٹرنک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں۔ وہ پہن کر پھر ان ٹرنکوں پر میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پر سجا دیتا ہوں۔ فرش پھر کر بچھ جاتا ہے۔ پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی اور لاکر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو۔ اس عرصے میں بیگم واپس آ جاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کا بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آ رہے ہیں۔ میں کچھ اخلاقاً اور انتقاماً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے۔ یعنی صبح کے ناشتے کے لئے بسکٹ، پان رات کے لئے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اٹھا لاتے ہو اور یہ جو ترکاری لاتے ہو یہ اصل ہریالا بناسپتی ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرانے کا عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے۔ بشرطیکہ باقاعدہ میدان جنگ میسر ہو۔ ایک کرم اڑنے کے لئے ہو۔ دوسرا بیوی کے میکے سوچ کر بیٹھنے کے لئے تیسرا شوہر کے اینٹھ کر پڑ رہنے کے لئے اور چوتھا بچوں کے لئے پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں چونکہ پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے۔"

ریاض کو اب کچھ کچھ ہنسی آئی کہنے لگا "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی!"

میں نے کہا "یہ بھی کون کافر تم سے مسخرا پن کر رہا ہے۔ میں تو محض اظہار واقعہ کر رہا ہوں۔ مگر اس کے عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے تم کو معلوم ہے۔ لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لئے آتے رہتے تھے پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لئے چا بن رہی تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے۔ شربت منگا دو۔ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا۔ مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اول تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظار کرنے کے لئے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے مگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لئے خود جی چاہتا ہے اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مثلاً اب تم آ گئے ہو۔"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا "بندہ نواز میں تو دو مہینہ سے یہاں ہوں اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں۔ ایک اپنے لئے مکان دوسرے جناب کا دولت خانہ۔"

میں نے کہا "یہ شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی۔ رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرعہ پڑھتا کہ ع ایں خیال است و محال است و جنوں۔ اور فی الحال آپ ہیں کہاں۔"

ریاض نے بیزاری سے کہا "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ بیوی نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ کہو کہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔"

ریاض نے کہا "بھیا اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ مجھے ایک مکان مل رہا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے۔

میں نے حیرت سے کہا "ایک نہ دو بکمشت تین کمرے۔ اچھا تو

پھر ش

کہنے لگا" میں نے لینے سے انکار کر دیا اور زیادہ گنجائش کے مکان
تلاش میں ناکام ہو کر پھر جو گیا اسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم
ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سر پیٹ کر چلا آیا پھر پتہ
لگا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت
بےتکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے۔ میں نے کہدیا کہ نہیں کہنے لگے اگر
میں اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کردوں تو اسے کہاں لیجا کر رکھئے گا۔ میں نے عرض کیا
گھر داماد بن کر رہنے کو تیار رہوں۔ وہ حضرت سخت برہمی سے بولے کہ میں
شادی اس لئے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے تو کچھ گنجائش پیدا ہو۔ گھر
میں آپ آئے خود بھی یہاں سمانے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں"
میں نے کہا "بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں نے مکان تو نہیں
دیکھا مگر ایک موٹر گیرج خالی نظر آیا تھا کچھ دن ہوئے دیکھو اس کی بات
کرتا ہوں"

ریاض نے ڈوبی پیروں پر لپکنے کے انداز سے کہا "میرے بھائی اگر
وہ مل جائے تو میں بک جاؤں گا تمہارے ہاتھوں۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو
لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جاکر
عرضی دینا پڑی اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیرج کی تلاش میں نکل گئے
مگر تو بہ کیجئے وہاں ایک والدین کے بزرگ اپنے ایک درجن بچوں کو لئے گیرج
کے باہر ہی نظر آئے۔ گیرج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے
دھواں نکل رہا تھا اور اندر کسی ہنڈی میں میتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔
اب ریاض کو بھی مجھ پر شک ہے اور میں شب و روز اس کے لئے
مکان اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے
ورنہ کوئی اسے گھر داماد بنالے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس ہیں ان کے
گھوڑے کا انتقال ہو گیا ہے۔ خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا
ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹتا ہو۔ (بشکریہ "خیال" بمبئی)

ظفر حسین

اسلام پسند شاعر سے

اے مرے دوست، مرے محرمِ رازِ ہستی
تجھ سے بس ایک، فقط ایک گذارش ہے مری
مرے اندازِ تخاطب میں اثر ہو کہ نہ ہو
بات تو اپنی سنا دوں، یہی خواہش ہے مری

تری بندش ہے بہت شوخ، تری فکر جمیل
ترا فن پارہ نگاہوں میں رہا جاتا ہے
ترے اشعار جواہر، ترے الفاظ نگیں
ان میں ایک سحر ہے جو ذہن پہ چھا جاتا ہے

تو جو اسلام کو مقصودِ ہنر سمجھا ہے
ترے فن پارے ہیں بیشک اسی مقصد کے نقیب
تری نظموں میں تڑپ ہے، تری غزلوں میں جنوں
تری کاوش سے خلش ہوتی ہے اک دل کے قریب

پر مرے دوست یہ تحریر فسوں ساز تری
بعض اوقات تو مقصد سے بھی ہٹ جاتی ہے
مختلف وادیوں میں گھومتا ہے طائرِ فکر
تری ہر ضرب سے تخریب بھی شہ پاتی ہے

گرم ہو جاتا ہے خوں شعلہ بیانی سے
جی میں آتا ہے کہ بس چھین لیں باطل ک
ترے جذبات کے طوفاں کا تقاضہ ہے
ایک ہی پل میں بدل جائے زمانے کا نظ

اے مرے دوست علاجِ غمِ انساں کے لئے
نوکِ نشتر کی بجائے، دمِ خنجر کیوں ہے
ترے الفاظ میں شعلوں کی لپک کیسی ہے
تری تلقین میں یہ شورشِ صرصر کیوں ہے

دینِ اسلام تو ہے صلح و محبت کا امیں
دینِ اسلام تشدد کا روادار نہیں
ہے جو اسلام کی رگ رگ میں جنونِ تعمیر
یہ جنوں پارۂ آزار ہے، آزار نہیں

تجھے سونا تو نہیں تاروں کی چھاؤں میں مگر
تجھے انگاروں کی دنیا میں نہیں رہنا ہے
بادباں کھول دے، پتوار اٹھا لے ساتھی
تجھے جذبات کی لہروں پہ نہیں بہنا ہے

اے مرے دوست مرے محرمِ رازِ ہستی
تجھ سے بس ایک فقط ایک گذارش ہے مری

(حلقہ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں پڑھی گئی)

ابوالخطیب ●

یہ کون جاگا؟

(۵)

(مسلسل ناول)

اس کی شریف فطرت اور پاکیزہ خواہشات کو اب تاریخ بھی مل
ار اس کے سامنے رہنماؤں نے اپنے سماجی مظاہرے دکھلائے تھے تو
نیا کے بہتر مستقبل کی امید ہوئی اور اس مطالعے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ
ذاہشات اور جذبات صرف انسان کی ذہنی تسکین کے لئے ہی
بلکہ انسان کی صلاحیتیں صحیح راستہ پاکر سماجی قوت بھی بنا سکتی ہیں
اس رجائیت کے بعد اس کیلئے انفرادی ارادے اور منصوبے
ے اور اس لئے اپنی ماں کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے نئے انٹر کی
ں شروع کردیں تاکہ وہ جلد سے جلد بی اے کرکے ماں کو خوش کرسکے اب
ں سے ملنے جلنے لگا سوسائٹی کا غیر متواتر ما دیانہ سلوک اسے دکھ
ہنچاتا تو وہ پھر سیرت رسولؐ اور حالات صحابہ لیکر بیٹھ جاتا اور اپنی
لو بیدار کرتا رہتا۔ متواتر غیر انسانی سلوک سے ردعمل شدید ہوتا
ں کو ختم کرکے وہ پھر دوسرے مذاہب کی برگزیدہ ہستیوں کے حالات
خصوصاً بائیبل اور گیتا اسے بہت بھائیں اس طرح اس کے دکھ درد
ن پھر غالب آجاتی اور اس کا دل پھر درخشاں مستقبل کے انتظار
ے جاتا۔

ب دن وہ اپنے کالج کے دوست سہنا کے پاس ملاقات کے لئے گیا
تپاک سے ملا اور اسے گلے سے لگاکر قریب کی کرسی پر بٹھالیا اور گھر کے
تے بنانے کا حکم دیکر اکمل سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔
لمو ابھی خیر و عافیت کے مرحلے سے گذر رہی تھی کہ سہنا کے ایک شاعر
پتلی چھڑی گھماتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے یہ دبلے پتلے تھے رنگ گورا
شیات نے ان کے پورے بدن پر پیلا رنگ چڑھا دیا تھا دہانہ
تھا جس پر پان کی سرخی پھیلی ہوئی تھی چہرے پر پتلی اور پیلی پھنسیاں
کھیوں کے چھتے کی طرح ——— شے معلوم ہوتی تھیں سر پر گاندھی
کیپ اس طرح رکھی ہوئی تھی جیسے بالوں میں الجھ کر رہ گئی ہو ٹوپی شیروانی کی
ہم رنگ تھی اور اسی رنگ کی پینٹ پہنے براؤن رنگ کا ٹوٹا ہوا مکیشن
شو تھا جو چلتے ہوئے ریڈیو کی طرح اٹھکر دھب دھب بول رہا تھا
پتلی چھڑی داہنے ہاتھ میں تھی، بائیں ہاتھ میں پانوں کی مراد آبادی
ڈبیہ اور اسی کے ساتھ ایک ریشمین بٹوا تھا جس کے پھندنے لٹک رہے
تھے چہرہ ابھی تک مسکراہٹ سے شاداب نظر آرہا تھا اور آنکھیں بھی اسی
کیفیت میں ڈوب کر چمک رہی تھیں کرسی پر بیٹھتے ہی اکمل کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے انجم نے کہا "جناب کی تعریف" پھر اپنی پانوں
کی ڈبیہ کھولی اس میں سے پان نکالا پہلے خود کھایا اس کے بعد دوسرا پان
ڈبیہ سے نکال کر اکمل کو پیش کیا۔ اکمل ایک دم چونک کر جھینپ گیا اور اس
کے مشاہدے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اکمل انجم کو دیکھ کر اس میں ڈوب گیا تھا۔
انجم کی ہر چیز سے انفرادیت ٹپک رہی تھی لیکن اس انفرادیت کے اظہار میں
سلیقہ نہیں تھا اسے انجم کی بے تکلفی سب سے زیادہ بھائی چہرے پر معصومیت
اور بھولا پن تھا جو اس وقت اسے سب سے زیادہ پسند تھا اکمل نے چہرے پر
اس کیفیت کو بڑی نمایاں حیثیت میں محسوس کرکے یقین کرلیا یہ معصومیت
اور بھولا پن اس کی شخصیت کا سب سے قوی عنصر ہے اور یہی اس کی فطرت
ہے یہ طبعاً شریف آدمی ہے۔

"ارے تمہیں پان دینا تو میں بھول ہی گیا" انجم کو شیروانی کی جیب میں
ڈبیہ رکھتے ہوئے خیال آیا۔

"یہ تو میں دیکھ رہا تھا۔"

"بھئی آپ اکمل صاحب یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی"؟ انجم نے اکمل کا
مزید تعارف چاہا۔

"یہ تو اب بتایا جائے گا کیوں کہ اب آپ اطمینان سے بیٹھ گئے ہیں"۔ ہمارے اکمل صاحب نفسیاتی تجزیے سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں"۔

"تو صاحب میرا نفسیاتی تجزیہ کیجئے آج کل میں بہت پریشان رہتا ہوں ـــــ"

"ارے صاحب آپ نفسیاتی تجزیئے کو چھوڑیئے اس کی آپ کو کیا ضرورت آپ فن کے ذریعے اپنی شخصیت کا اظہار تو کر لیتے ہیں آپ شاعر تو ہیں"، اکمل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ارے صاحب۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کس قابل سگرٹ تو پیتے ہیں آپ" انجم نے ستائش سے مسرور ہو کر اکمل کو سگریٹ پیش کی۔ اکمل نے سگریٹ مونہہ میں لگا کر شکریہ ادا کیا انجم نے پھر سگریٹ کا پاکٹ سہا کی طرف بڑھایا اس نے بھی شکریئے کے ساتھ سگریٹ قبول کیا انجم نے پان کی پھر طلب محسوس کی جیب سے ڈبیہ نکالی حسب عادت پان پہلے خود کھائے اس کے بعد دوسری جیب سے ایک خوبصورت سی شیشی نکالی اس میں سے دو گولیاں لیں اور مونہہ اونچا کر کے دائیں ہاتھ کو دہرا اٹھایا گولیاں مونہہ میں جا پڑیں۔

"بھئی آپ نے پھر وہی غلطی کی جو آپ پہلے کر چکے ہیں" سہا نے مسکراتے ہوئے انجم سے کہا۔

"بھئی میں اس طرح نہیں سوچتا۔ تمہیں ضرورت ہے تو کہدو تکلف تو میں غیروں کے ساتھ برتتا ہوں اب یہ فیصلہ آپ کیجئے کہ آپ میرے ہیں یا غیر"۔ اس بات کو سنتے ہی سہا فرط محبت سے بیقرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی پر سے انجم کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اکمل خلوص و محبت کے اس مظاہرے سے بہت متاثر ہوا اور یہی لمحے انجم سے دوستی کی تمنا اس میں اور بڑھ گئی۔ اور کچھ لمحے بھی وہ اس محبت کے بوجھ کو نہ سہہ سکا تو انجم سے کہا۔

"انجم صاحب آپ کہاں رہتے ہیں اپنا پتہ تو بتایئے تاکہ نیاز حاصل کئے جاسکیں"۔

"صاحب میں ابوالکلام روڈ پر رہتا ہوں مکان نمبر ۳۲۲ تشریف لائیے بڑی عنایت ہوگی۔

اس دن کی ملاقات کے بعد اکمل انجم سے اکثر ملتا رہا انجم اس سے بڑی محبت سے پیش آتا اور جب کبھی اکمل اس سے سوسائٹی کے رد دینے کی شکایت کرتا تو وہ اس کے گلے میں شریک ہو جاتا۔ ایک دن انجم نے اسے گھر پر مدعو کیا وہ ٹھیک وقت پر اس کے گھر پر پہونچ گیا انجم گھر کے دالان میں چولہے کے پاس بیٹھا تیل کی روٹیاں پکار رہا تھا۔

"اسلام علیکم" آیئے اکمل صاحب۔ اندر بیٹھئے۔ راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور تیل میں چپڑی ہوئی روٹی ان کے ہاتھ پر چپکی ہوئی تھی سے انہیں اور ان کی روٹی کو دیکھا اور مسکراتا ہوا اندر چلا گیا کوٹھری میں اندھیرا تھا صرف ایک روشن دان سے دن کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی دوسری طرف طاق میں ایک ہلکے زرد رنگ کی موم بتی جل رہی تھی فرش پر پرانے بوسیدہ بچھے ہوئے تھے۔ اس پر ایک سفید میلی چادر سکڑی سکڑائی پڑی تھی کونے میں ایک ٹوٹی چارپائی بچھی ہوئی تھی اس کے سرہانے میلا سا تکیہ گردن کٹی بکری کی طرح پڑا لٹک رہا تھا چارپائی کے نیچے چائے کے کپ اور سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے پڑے تھے دوسرے کونے میں ردی کے کچھ کلہڑے اوندھے پڑے روشن دان کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ کتابیں بھی ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں دیوار پر ایک حسین دوشیزہ کی تصویر ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی تھی اسی تصویر کے مقابل ایک دوسری تصویر تھی جس میں برف باری کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ برف روئی کے گالوں کی طرح جھونپڑیوں اور پہاڑوں پر پڑی ہوئی تھی۔ درخت اور ندیاں منجمد تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر میں دنیا ٹھٹھر کر رہ گئی ہے تصویر میں ایک لکڑی کا پل تھا جس پر ایک نوجوان جوڑا اپنے سردوں کو چھپائے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

بہت سے منتشر کاغذ بھی فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ پوری کوٹھری پر انتشار اسی طرح چھایا ہوا تھا جس طرح اس نے انجم پر پہلی ملاقات میں دیکھا اس کوٹھری کے جائزے کے بعد اکمل نے انجم کو مزید سمجھنے کے لئے کتابوں کو اٹھایا تو وہاں بھی بے ترتیبی۔ کوئی کتاب شعر و شاعری پر تھی تو کوئی کتاب علم ہندسہ پر ایک کتاب باغبانی پر دو کتابیں حکمت پر ایک عدد تعویذ کی کتاب اور چارپائی پر قرآن اور دانتوں کا برش کتابوں کو دیکھ کر اکمل مسکرایا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو کاغذ سے ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر کروٹے نظر آئے تو اس نے انہیں اٹھا اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ سارے کاغذات انجم کی پھٹی پرانی بیاض کے منتشر اوراق تھے جو لا پروائی

سے اس طرح پڑی رہنے سے منتشر ہو گئے تھے ان ورقوں میں اکثر نظمیں نا مکمل تھیں۔ البتہ قطعات کی بھرمار ضرور تھی۔ اکمل اس صورت حال سے فوراً آگے بڑھا اور اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں یا کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اندر کی الجھن راستے میں حائل ہوتی ہے اس نے پھر شعروں کو سمجھ سمجھ کر آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا تو ان میں مختلف اردو کے کلاسیکی شعراء کے اثرات نظر آتے اور بعد کی نظموں میں کمیونسٹ رجحانات کا غلبہ تھا۔ اس سے اکمل نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی شخصیت میں یا تو جان نہیں یا وہ کسی وجہ سے ابھر نہ سکی۔ کیونکہ ان شعروں میں میر غالب۔ مومن۔ سودا۔ فیض اور ن۔ م راشد سب کچھ نظر آتے تھے لیکن انجم کہیں نظر نہ آتے تھے۔ کاغذوں کو اٹھا کر اس نے پھر بیاض میں ترتیب سے رکھے اور ایک گہری سوچ میں پڑ گیا اس سوچ میں انجم اسے ایک بے کردار سا آدمی نظر آیا جس پر ہر قوی شخصیت غالب آ کر اپنی بات لکھوا لیتی ہے اس کے بعد اس کے شعر شعر کے زبان اور انداز بیان اسے بہت پسند آیا اسی سوچ میں اکمل کے ذہن میں معاً ایک سوال ابھرا کیوں نا میں بھی اپنی دل کی بات کہنے کے لئے اس کی شخصیت کا سہارا لوں مجھے خود اب اس میں پیوست کر دینا چاہئیے۔ اس کے دل میں پھر ایک خیال آیا تو اس پر ظلم کر رہا ہے خود اس کو اس پر غالب کرنا چاہتا ہے کیا یہ انسانیت ہے۔

نہیں نہیں۔ میری دل کی پکار سماج کی بہتری کے لئے ہے اس میں انجم کا میرا اور سماج کا تینوں کا بھلا ہے"

اس غور و فکر سے اکمل بڑی مشکل سے گذرا اور اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب وہ انجم میں خود کو جذب کر لیگا۔ (باقی آئندہ)

مصنف: او۔ ہنری
مترجم: انور حسین عزیز

شاہکار

واشنگٹن سکوئر کے مغرب کی جانب سڑکیں بہم دیوانہ وار دست وگریباں ہوتی ہیں اور ایک دوسری کو عجیب طرح کے زاویوں میں کاٹتی ہوئی دوبارہ آملتی ہیں۔ ایک ہی سڑک اپنے آپ کو دو دو تین تین بار کاٹتی ہے۔ ادیبوں اور مصوروں کے لئے یہ جگہ اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی ہے سڑکیں کچھ اسی قسم کی بنی ہوتی ہیں کہ گورکھ دھندے کا گمان گذرنے لگتا ہے اور اگر کوئی کلکٹر بھولے سے (Paints) کا غذ اور کینوس کے بلوں کی وصولی کے لئے ادھر آنکلے تو وہ بلوں کی وصولی تو کیا کرے گا اپنے ہوش وحواس کو بھی سڑکوں کی بھول بھلیوں کی نظر کردے گا غریب اور مفلوک الحال فنکار۔ جو نیویارک کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے ——— سستے مکانات کے متلاشی رہتے تھے اور اس جگہ کو زیادہ پسند کرتے تھے جہاں نسبتاً کم کرایہ ادا کرنا پڑے۔ اس نوآبادی کی عمارتیں دلنشیں نمونے کی بنی ہوئی تھیں اور کرایہ بھی ارزاں تھا۔ کرایوں کی کمی اور ضروریات زندگی کے سستے پن نے فنکاروں کو اطراف ملک سے کھینچ لیا اور رفتہ رفتہ گرینج (Green Meadow) کا یہ غیر معروف قصبہ فنکاروں کی نوآبادی میں بدل گیا۔

یہیں کسی تنگ اور بھدی سہ منزلہ عمارت میں سُو اور جونسے کا سٹوڈیو تھا۔ جونسے سٹوڈیو میں اپنے فلمی نام جونا کے نام سے مشہور تھی یہ دو نوعمر مصور لڑکیاں امریکہ کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک ریاست مین (Maine) کی رہنے والی تھی اور دوسری کا وطن کیلیفورنیا تھا۔ ان کی ملاقات نیویارک کے ایک سستے سے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں مصور تھیں۔ میلانِ طبع کی یکسانی نے انہیں اور بھی قریب کردیا۔ اور انہوں نے ایک مشترکہ سٹوڈیو کی بنا ڈال دی۔ چونکہ دونوں غریب تھیں اور بڑے شہر کے اخراجات برداشت نہ کرسکتی تھیں اس لئے انہوں نے نیویارک کی اس نوآبادی میں سکونت اختیار کرلی۔

وہ یہاں مئی کے خوشگوار موسم میں فروکش ہوئی تھیں۔ بڑا اچھا موسم تھا۔ فرحت افزا اور خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہواؤں نے آب وہوا کی اجنبیت ظاہر نہ ہونے دی۔ لیکن نومبر کیا آیا اپنے ساتھ سخت سرد شمالی ہواؤں کو بھی لیتا آیا اور اس کے ساتھ ہی نمونیہ بھی کود پڑا ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی بیسیوں لاشیں قبروں کی آبادی میں روز بروز اضافہ کرنے لگیں۔ نوآبادی کے مشرقی حصے میں بیماری کا زیادہ زور تھا۔ سُو اور جونسے کا محلہ ابھی بچا ہوا تھا لیکن نمونیہ کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا اور بلاتمیز متنفس پر حملہ کردیتا ہے۔ چنانچہ کیلیفورنیا کی چھریرے بدن کی مصورہ جونسے بھی اس ظالم کے بھیانک اور خونخوار جبڑوں کی لپیٹ میں آگئی بے چاری بستر پہ بے حس وحرکت پڑی رہتی اور کھڑکی کے شیشوں سے سامنے کی بھوری دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔

ایک دن ڈاکٹر نے سُو کو بلا کر مریضہ کی حالت صاف صاف بتادی "دس میں سے ایک چانس ہے" اور پھر تھرمامیٹر کے پارے کو اتارنے کی غرض سے جھٹکتے ہوتے کہا "اور وہ یہ ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی خواہش ہو۔ ایسی نازک حالت میں لوگ عموماً قنوطی ہوجایا کرتے ہیں۔ اور نسخوں کو محض کاغذ کا ایک بے فائدہ پلندہ سمجھنے لگتے ہیں

دن سلامتی سے گزر گیا۔ بھوری سُرخ دیوار پر آخری پتہ شام کے دھندلکے میں بھی نظر آرہا تھا۔ رات کے سائے گہرے ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی مغربی ہواؤں نے طوفانی صورت اختیار کرلی رات بھر مینہ کھڑکیوں کے شیشوں پر شور مچاتا رہا۔ اور دلندیزی عمارت کے پرنالے بہتے رہے اور جب پو پھٹی تو بات کی دُھنی جونسے نے کھڑکی کا پردہ ہٹانے کا حکم صادر کردیا۔
مگر پتہ بدستور شاخ پر موجود تھا۔

اور یقین کر بیٹھتے ہیں کہ موت ابھی آئی۔ اور یہی خیال تمہاری سہیلی کا ہے کہ اب وہ تندرست نہیں ہو سکتیں۔ کیا کہیں اس کی تمناؤں کا خون تو نہیں ہو گیا؟ اس کے دل میں کوئی ایسی آرزو ہے؟"

"آرزو ——— ہاں! اس کی خواہش تھی کہ وہ زندگی میں ——— (Madonna of Bay of Naples) کی تصویر بنائے۔ مگر...."

"تصویر! خوب رہی!! میرا مطلب ہے کیا اس کے دل میں کوئی اور قابل غور آرزو ہے۔ مثلاً کوئی نوجوان ——— آدمی؟"

"نوجوان آدمی" سُو کی آرزو ایک جھٹکے سے ٹوٹی "کیا آدمی بھی اس قابل ہے کہ..... نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں"۔

"تو پھر یہ محض نقاہت ہے۔ میں وہ سب کچھ آزما دیکھوں گا جو سائنس اس معاملہ میں پیش کر سکی لیکن جب کوئی میرا مریض صحت سے مایوس ہو کر اپنی زندگی کے دم گننے لگے تو میں دوائی کے فائدوں سے پچاس فیصدی پہلے ہی نکال لیا کرتا ہوں۔ اگر تم کوشش کر کے قنوطی خیالات اس کے ذہن سے دور کر دو۔ مثلاً اسے موسم سرما کے لئے چغوں کے نئے نمونے بنا کر اس کا ذہن بیماری کے خیالات سے بچائے رکھو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دس میں سے ایک چانس کی بجائے پانچ میں سے ایک چانس کی امید پیدا ہو جاتی ہے"۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی سُو سٹوڈیو میں جا کر اتنا روئی کہ اس کا جاپانی رومال آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اس طرح دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد اس نے اپنا ڈرائینگ بورڈ اٹھایا اور بڑی شان سے سیٹی بجاتی ہوئی جونز کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ سُو رو رہی ہے۔ جونز کھڑکی کی طرف منہ کئے اس طرح لیٹی تھی کہ شاید ہی بستر پر کوئی شکن پڑا ہو۔ اور یہ سمجھ کر کہ شاید وہ سو رہی ہے سیٹی بجانی شروع کر دی۔ اور ڈرائینگ بورڈ کو درست کر کے ایک کہانی تصویر کے روپ میں ڈھالنے لگی۔ جس طرح نو آموز ادیب اپنی ادبی زندگی کی بنیاد چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر رکھتے ہیں اسی طرح مبتدی مصور بھی اپنی فنی زندگی کا دائرہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو تصویر کا روپ دیکھ کر پھیلاتے ہیں تاکہ کام کے معاوضے سے ذہنی تفریح کے علاوہ جسم اور روح کا رشتہ استوار رکھ سکیں۔ چنانچہ سُو بھی ان دنوں انہیں ہی کو مرکز توجہ بنائے ہوئے تھی۔ لیکن آج وہ ابھی خاکہ کے طور پر اپنا لکیریں ہی کھینچ رہی تھی کہ اسے بار بار ایک دبی سی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے جونز کے بستر کی طرف لپکی۔ جونز کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کچھ گن بھی رہی تھی۔

بارہ، اور کچھ دیر بعد گیارہ، اور پھر دس، پھر نو، اور پھر اس کے بعد آٹھ اور سات، تقریباً اکٹھے ہی۔

سُو نے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھا کہ وہ کیا گن رہی ہے۔ باہر کھلا میدان تھا اور کوئی بیس گز دور سامنے کی بھوری دیوار پر ایک خشک اور پژمردہ سی آکاش بیل تھی جس کی جڑیں تک سوکھی ہوئی تھیں۔ خزاں کے سرد جھونکوں نے اس کے پتوں کو خشک کر کے اس کا دھانی لباس چھین لیا تھا۔ اور اب اس کی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں شکستہ اینٹوں کی دیوار پر نصف کے قریب، بڑی لمبی جٹاؤں کی طرح لٹک رہی تھیں۔

"کیوں جونز کیا گن رہی ہو؟"

"چھ" جونز سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی "اب وہ جلدی جلدی گر رہے ہیں۔ تین دن ہوتے یہ سو کے قریب تھے اور ان کو گنتے گنتے میرے سر میں درد ہونے لگا تھا مگر اب تو بڑی آسانی ہو گئی ہے، لو، ایک اور گرا، اور اب وہ فقط پانچ رہ گئے ہیں"۔

پانچ کیا جونا! کیا تم اپنی سُو کو بھی نہیں بتاؤ گی؟"

"پتے"۔ "آکاش بیل کے ——— اور جب آخری پتہ گرے گا تو میں بھی چل بسوں گی۔ مجھے تین دن سے پتہ ہے۔ کیا تمہیں ڈاکٹر نے نہیں بتایا۔؟"

"واہ بھئی! تم بھی نری بیوقوف ہی ہو۔ بھلا اس خزاں رسیدہ آکاش بیل کا تمہاری صحت سے کیا تعلق؟ میری جونا! اتنی بیوقوف نہ بنو۔ ڈاکٹر نے تو مجھے آج کہا کہ تمہاری صحت یابی کا دس میں سے ایک کا چانس ہے۔ جس طرح نیو یارک میں ہر دس منٹ بعد کار کا مل جانا یقینی ہے اسی طرح دس منٹ میں ایک چانس سے صحت یاب ہونا بھی یقینی ہے لیکن تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ اب اس وہم کو چھوڑ دو۔ لو، یہ تھوڑا سا شوربہ پی لو، اور مجھے تصویر مکمل کر لینے دو تاکہ تمہاری سُو اسے کسی ایڈیٹر کے پاس فروخت کر کے اپنی بیمار سہیلی کے لئے ادویات اور اپنے لئے بھی خورد نوش کا سامان لا سکے"۔

"نہیں! میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ علاوہ ازیں میں نہیں چاہتی کہ تم ان منحوس پتوں کی طرف یوں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہو"

"اچھا۔ تو پھر جب کام کر لو۔ مجھے بتا دینا!" جونزے نے آنکھیں بند کر لیں "کیونکہ میں آخری پتہ گرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ اب مجھ سے اور زحمت نہیں اٹھائی جاتی۔ میں دنیا کی ہر چیز سے اپنی گرفت کو ڈھیلا کر دینا چاہتی ہوں جس طرح یہ پتے ہوا کی لہروں پر آہستہ آہستہ تیر کر زمین پر گر رہے ہوں۔ اسی طرح میں بھی حیات کے بحر ناپید اکنار میں تیرتے ہوئے تھک کر نیچے بہت نیچے چلی جاؤں گی۔"

"تم سونے کی کوشش کرو۔ میں جا کر بابا بہرمن کو بلا لاؤں۔ وہ بوڑھے کان کن راہب کے لئے نہایت اچھا موڈل بنے گا۔ میرے آنے تک ہلنے کی کوشش نہ کرنا میں ابھی ایک منٹ میں آئی۔"

بابا بہرمن بھی مصور تھا اور ان سے نچلی منزل میں رہتا تھا۔ اسکی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی گھنی اور گھنگھریالی ڈاڑھی مائکل اینجلو کی بنائی ہوئی حضرت موسیٰ کی شبیہہ سے مماثلت رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شبیہہ میں جان پڑ گئی ہے۔ اور اس نے اپنا نام "بابا بہرمن" رکھ لیا ہے۔ وہ ایک ناکام مصور تھا۔ چالیس سال سے برابر برش چلا تا آرہا تھا لیکن ابھی تک کوئی ایسی تصویر نہ بنا سکا تھا جو اس کا نام زندہ جاوید کر دے۔ اسے ہمیشہ ایک شاہکار بنانے کا خیال رہتا لیکن یہ خیال کبھی عملی صورت میں نہ آسکا تھا۔ اور اب کئی سالوں سے اس کا ذریعہ معاش اشتہارات کے لئے ڈیزائن بنانے اور نوآبادی کے دوسرے مصوروں کے لئے موڈل بننے پر تھا۔ وہ ہمیشہ دیسی شراب پیتا تھا۔ اور ہر وقت اپنے خیالی شاہکار کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ یوں وہ ایک شعلہ مزاج اور تندخو انسان تھا۔ رقیق القلبی اور نرم دلی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اپنے آپ کو ان دو امریکن لڑکیوں کا محافظ تصور کرتا تھا

جب شو پہنچی۔ تو بابا بہرمن کمرے کے ایک دھندلے کونے میں لیٹا شراب کی خالی بوتلوں کو سونگھ رہا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک پردہ تنا ہوا تھا جو پچھلے پچاس برس سے اس کے شاہکار کی ابتدائی لکیروں کا منتظر تھا۔ شو نے بابا بہرمن سے جونزے کا وہم کا ذکر کیا کہ آخری پتے کے ساتھ وہ اپنی زندگی کا بھی خاتمہ سمجھتی ہے۔ بابا بہرمن نے اپنی سرخ چمکدار آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر مریضہ کے احمقانہ خیالات کھلاو چلانے لگا "حیرت ہے کہ اس زمانہ میں بھی احمق اور توہم پرست لوگ باقی ہیں۔ بھلا ایک مرجھاتے ہوئے پتے سے انسانی زندگی کا کیا تعلق؟ حماقت کی بھی آخر کوئی حد ہونی چاہیئے۔ جاؤ۔ میں ایسی کم عقل عورتوں کا تماشہ بننے کے لئے تیار نہیں۔ تم نے ایسے احمقانہ خیالات اس کے ذہن میں آنے ہی کیوں دیئے۔ آہ! بیچاری جونزے!"

بابا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہے اور بخار نے اسے اور بھی توہم پرست بنا دیا ہے۔ خیر! اگر آپ میرا ماڈل بننا پسند نہیں کرتے تو نہ سہی مگر تم ایک منحوس اور......"

"آخر عورت ہو نا" بوڑھا جھنجھلا اٹھا "اور کیا کہو گی۔ بھلا تمہیں کس پاجی نے کہا کہ میں ماڈل نہیں بنتا۔ آدھ گھنٹے سے برابر بک رہا ہوں، مگر یہ عورت ہے کہ کسی کی سنتی ہی نہیں میں نے کہا۔ جا کے اس کے ذہن سے باطل تصورات دور کر دو۔ یہ جگہ ویسے بھی بیماروں کے لئے خطرناک ہے میں جب اپنا شاہکار بنا دوں گا تو پھر ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے۔ سن لیا۔ اب چلو۔ میں بھی آیا۔"

جب یہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ جونزے اس وقت سو رہی تھی۔ شو نے اشارے سے بابا بہرمن کو بلایا۔ وہ دونوں سہمے سہمے کھڑکی سے سامنے بھوری دیوار پر پھیلی ہوئی آکاش بیل کو دیکھنے لگے اور پھر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی اولے بھی پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بابا بہرمن ایک پرانی سی نیلی نیکر پہنے ایک پتے پر کان کن راہب بن کر بیٹھ گیا

صبح جب شو بیدار ہوئی۔ تو اس نے جونزے کو کھڑکی کے سبز پردے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پایا۔

"اس کو پرے ہٹا دو" جونزے بیزاری سے چلائی "میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

شو نے دل سے کھڑکی کی طرف اور آہستہ سے پردہ ایک طرف سرکا دیا۔

رات بھر کی مسلسل بارش کے باوجود ابھی تک بھی ... خ

...سے لپٹی ہوئی آکاش بیل پر ایک پتہ باقی تھا۔ بارش اور آندھی کی یلغار ... اس پر اپنا اثر نہ کر سکی۔ یہ آخری پتہ تھا۔ اس کے ڈنٹھل کا رنگ سیاہی ...ل سبز تھا۔ اس کے دندانے اور کنارے زرد اور بھورے خشک رنگ کے ...آنے لگے تھے۔ پھر بھی وہ ایک شاخ پر، زمین سے کوئی بیس فٹ بلندی ...نظر آ رہا تھا۔

"یہ آخری پتہ ہے" جونسے نے کہا "میرا خیال تھا کہ یہ رات کو ...جائے گا۔ مجھے طوفان کی آواز سنائی دیتی رہی تھی۔ اچھا آج گر جائے گا ...پھر میں بھی ہمیشہ کی نیند سو جاؤں گی۔"

"جونا! پیاری جونا!" سو کا اترا ہوا چہرہ تکئے سے چھو رہا تھا۔ اگر ...تمہیں اپنی پرواہ نہیں تو کم از کم میرا ہی خیال کرو۔ میں تمہارے بعد کیا کروں گی"
لیکن جونسے بالکل خاموش تھی۔

دنیا میں سب سے تنہا وہ روح ہے۔ جو اپنے پر اسرار سفر کے لئے تیار ...رہی ہو۔ موت کا خیال تیزی سے اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ وہ ...ی پسندیدہ سیرگاہوں اور دوستوں سے بچھڑ جانے کے غم میں اور ...ی پریشان ہو گئی۔ کیونکہ جو آدمی موت کے متعلق سوچنے لگتا ہے اسے ...ایسی چیزوں سے دلچسپی نہیں رہتی۔ اور جونسے اس وقت موت و ...حیات کی کشمکش کا نظارہ کر رہی تھی۔

دن سلامتی سے گزر گیا۔ بھوری سرخ دیوار پر آخری پتہ شام کے ...دھندلکے میں بھی نظر آ رہا تھا۔ رات کے سائے گہرے ہو گئے اور اس کے ساتھ ...مغربی ہواؤں نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔ رات بھر مینہ کھڑکیوں کے ...شیشوں پر شور مچاتا رہا۔ اور ولندیزی عمارت کے پرنالے بہتے رہے ...جب پو پھٹی تو بات کی دھنی جونسے نے کھڑکی کا پردہ ہٹانے کا حکم ...در کر دیا۔

مگر پتہ بدستور شاخ پر موجود تھا۔

جونسے دیر تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ...بلایا۔ وہ اس وقت چولہے پر چوزے کا شوربہ تیار کر رہی تھی۔ "میں ...گناہ عظیم کی مرتکب ہو رہی تھی۔ سودی؟" جونسے کے لہجے میں تبدیلی ...آ چکی تھی۔ "مگر کسی طاقت نے بیل پر پتہ رکھ کر میری گندی ذہنیت ...بے نقاب کر دیا ہے۔ موت کی خواہش کرنا بھی کفرانِ نعمت ہے۔ اگر میرے لئے شراب آمیز شوربہ لاؤ۔ مگر۔ ٹھہرو۔ پہلے مجھے ایک دستی آئینہ لا دو اور پھر کچھ تکیے میرے ارد گرد رکھ دو تاکہ میں ان سب کے سہارے بیٹھ سکوں۔ میں تمہیں کھانا تیار کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ایک گھنٹہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر باتیں کرنے لگی۔ اب اسے زندگی کی امید ہو چلی تھی۔ "سودی مجھے امید ہے کہ میں کسی نہ کسی دن (Bay of Naples.) کی تصویر ضرور اتار دوں گی۔"

دوپہر کو ڈاکٹر آیا۔ سو اسے کسی بہانے گیلری میں جا ملی ——

"اب تو برابر کا چانس ہے" ڈاکٹر نے سو کا نازک ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔ "اچھی تیمارداری سے تم یقیناً جیت جاؤ گی۔ اب مجھے نچلی منزل میں ایک مریض کو دیکھنا ہے۔ اسے بابا۔ بابا۔ کہتے ہیں۔ بہرمن نام ہے اور شاید مصور بھی ہے۔ اس کو بھی نمونیہ ہے۔ دھان پان قسم کا آدمی ہے مگر حملہ بڑا سخت ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تاہم آج اسے ہسپتال پہنچا دوں گا تاکہ بیچارے کے آخری دن تو آرام سے گزر جائیں۔"

دوسرے دن ڈاکٹر نے سو کو خوشخبری دی کہ اس نے موت پر فتح پالی ہے۔ جونسے کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ اب غذا اور احتیاط کی ضرورت ہے بس اور کچھ نہیں۔

اور دوپہر کے وقت جب جونسے تکیوں کے سہارے بیٹھی نیلے رنگ کی اون سے ایک ہلکا سا رومال بن رہی تھی۔ سو آ کر اس سے لپٹ گئی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ سفید چوہیا!" سو نے اسے متوجہ کرنے کی غرض سے اس کے چٹکی لی۔ "بابا بہرمن نمونیہ سے ہسپتال میں چل بسا۔ دو دن ہی بیمار رہا ہے۔ پرسوں خادم نے اسے اپنے کمرے میں کراہتے ہوئے سنا۔ اس کے جوتے اور کپڑے پانی سے شرابور اور ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایسی طوفانی رات میں کہاں رہا۔ البتہ سامنے والی بھوری دیوار کے نیچے سے ایک جلتی ہوئی لالٹین۔ ایک سیڑھی۔ ایک رنگوں کا ڈبہ۔ جس میں زرد اور سبز رنگ ملے ہوئے تھے ——— اور چند استعمال شدہ برش ضرور ملے تھے۔

وہ دیکھو! آکاش بیل پر آخری پتہ اب بھی دکھائی دے رہا ہے جس نے تمہاری جان بچائی ہے۔ تم نے نہیں سوچا کہ یہ طوفان اور باد و باراں کی یلغار سے کیسے بچ رہا۔

"پیاری! یہ بابا بہرمن کا شاہکار ہے۔ اصل پتہ اور بیل تو اسی دن گر گئے تھے"

([illegible] ہمایوں ۵۰)

ادارہ ●

تذکرے اور تبصرے

داعیٔ امن

ازمولانا عبدالسلام قدوائی

شائع کردہ:۔ مجلس سیرت بمبئی ۱۳۸۔ ذکریا مسجد اسٹریٹ بمبئی ۹

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ابدالآباد تک کا رواں۔۔ انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔ جس وقت اور جس جگہ اس کی طرف رجوع کیا جائے گا اس سے ہدایت ملے گی۔ جس موقع اور جس مسئلہ کو زیر بحث لایا جائے گا، معلوم ہوگا کہ اسی خاص ضرورت کو رفع کرنے کے لئے یہ چراغ کوہ وجود میں آیا تھا! اس وقت دنیا میں ہر طرف بدامنی اور بے اطمینانی مسلط ہے۔ آئے دن امن کے دعوے ہوتے ہیں اور نت نئے نعرے لگائے جاتے ہیں، لیکن۔۔۔۔ "کوئی امید بر نہیں آتی"۔

مولانا عبدالسلام صاحب "ندوۃ العلما" (لکھنو) کے اساتذہ میں سے ہیں۔ "ادارہ تعلیمات اسلام" (لکھنو) کے بانی اور آجکل "جامعہ ملیہ اسلامیہ" (دہلی) کے ناظم دینیات۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو دولت علم بھی عطا فرمائی ہے اور حکمت تحریر و تقریر بھی۔ آپنے اس مختصر کتابچہ میں بڑی خوبی سے یہ ثابت کیا ہے کہ سچے اور حقیقی داعی امن تو رسول اکرم (فداہ امی وابی) صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، وحدت الٰہ اور وحدت انسان کے داعی۔ مولانا نے اس کمال سے ہمارے تصور کی رہنمائی کی ہے کہ ہم دور امن و رحمت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

○ مجلس سیرت (بمبئی) کو اللہ تعالے استقامت عطا فرمائے جس نے "سیرت پاک" کو عام کرنے کی خاطر مختصر مگر جامع کتابچوں کی صورت میں شائع کرنا شروع کیا ہے۔ پیش نظر کتابچہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ کتابچہ ۲۰×۳۰ سائز کے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ معمولی لیپرنٹنگ استعمال کیا گیا ہے۔ سرورق سادہ ہے، اور کتابت و طباعت اوسط درجہ کی تھی۔ قیمت درج نہیں ●

ترجمہ مختصر شعب الایمان

تالیف شیخ امام ابی جعفر عمر قزدینیؒ

شائع کردہ:۔ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ فریر روڈ، کراچی۔

نور محمد کارخانہ تجارت کتب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہی ایک معیار قائم کر چکا تھا۔ اور اس کے بعد پاکستان میں بھی اس نے اپنے معیار کو پوری طرح بحال رکھا ہے۔ یہ کارخانہ ان چند مخصوص اداروں میں سے ہیں، جنہوں نے دین کی ایک اہم ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اسے نہایت بہتر طریقہ پر پورا کیا ہے اور وہ دینی لٹریچر کی اشاعت و ترویج۔

امام بیہقیؒ سلف صالحین میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی کتاب "شعب الایمان" کو امام ابوجعفرؒ نے ملخص کیا ہے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کتاب کے شروع میں امام بیہقیؒ کے مختصر حالات ہیں، جن کے بعد اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے قرآن و حدیث اور بزرگان دین کے اقوال کے ذریعہ ایمان کی سات اور ستر شاخیں بنائی گئی ہیں۔ جن میں سب سے اعلیٰ کلمہ توحید ہے اور سب سے ادنیٰ یہ کہ آدمی راہ سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دے۔

متذکرہ کتاب اس کی مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس سے استفادہ کرے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے اور ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ سفید عمدہ کاغذ اور خوب صورت سرورق۔ کتابت و طباعت نظر افروز ہے قیمت ایک روپیہ

سنتِ رسولؐ

مصنف:۔ ڈاکٹر شیخ مصطفےٰ حسنی سباعی

مترجم:۔ ملک غلام علی

شائع کردہ:- مکتبہ چراغ راہ۔ بیرون لوہاری دروازہ، لاہور

مکتبہ چراغ راہ نے اپنی مختصر سی عمر میں دین کے مہمات مسائل پر جیسا ٹھوس اور جامع لٹریچر شائع کیا ہے۔ وہ نہایت قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ سنت رسول کا مسئلہ بھی دین کے اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ بلکہ دین کی ایک اہم بنیاد ہے۔ جسے ڈھانے کے زعم میں دشمن دین عناصر مبتلا ہیں۔ مکتبہ "چراغ راہ" نے "سنت رسول" شائع کرکے نہ صرف محبت رسول کا حق ادا کیا ہے بلکہ وقت کی ایک اہم ضرورت پر لبیک کہا ہے۔

اس تصنیف کو پیش کرنے والے شام کے ایک روشناس عالم ادیب اور مجاہد ہیں مصطفیٰ حسنی سباعی۔ ملک غلام علی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور واضح ہے۔ شروع میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کے قلم سے ایک تعارف دیا گیا ہے جو خاصا معلومات افزا ہے۔

"سنت رسول" میں سنت کا مفہوم، نظام دین میں اس کا مقام حدیث کی روایت و کتابت۔ فتنۂ وضع حدیث، سنت کی محافظت کے لئے محدثین کا مجاہدۂ عظیم وغیرہ جیسے اہم عنوانات کے تحت سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

کتابت ۲۰×۳۰/۱۶ سائز ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سفید عمدہ کاغذ اور خوبصورت سرورق لگایا گیا ہے۔ کتابت و طباعت اطمینان بخش ہے۔ کتاب مجلد ہے اور مع گرد پوش۔

(ج۔ق)

رفیقِ نکاح

یہ کتابچہ جو نوٹ بک سائز پر چھپا ہے مولوی محمد ظفر صاحب بی اے، ایل ایل بی کی تصنیف ہے جو ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا ہے اور ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مقصد بچوں اور چھوٹے بڑوں میں اسلامی تعلیم پھیلانا اور اخلاق و عادات سنوارنا ہے۔ یہ کتابچہ مہتمم [illegible] سے سرگودھا سے چھ پیسے کے ٹکٹ برائے محصول ڈاک بھیج کر مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے اس رسالہ میں ڈرامائی انداز بیان کے پس منظر میں نکاح کی غرض، فرائض نکاح، مہر اور ولی کی شرائط، اسلام میں چار بیویوں کا مسئلہ۔ طلاق و عدت وغیرہ کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور کافی محنت سے معلوماتی مواد فراہم کیا ہے صرف ایک چیز جو اس کتابچہ میں کھٹکتی ہے وہ اسلام کا دیگر مذاہب سے موازنہ خصوصاً ہندو مذہب سے غیر مستحسن ہے جو عقیدت مند ہندوؤں کی دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر صرف عام انسانی نقطۂ نظر سے ہی اس پر روشنی ڈالی جاتی تو زیادہ صحت مند تھا۔

"Fighting Communism by Oppression"

یہ مختصر کتاب جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جناب نعیم صدیقی کے ایک اداریہ کا ترجمہ ہے۔ چھپائی نہایت صاف اور طباعت نہایت دلکش ہے قیمت صرف چھ آنے ہے جو بالکل مناسب اور جائز ہے۔ اس مقالہ میں نعیم صدیقی صاحب نے پرزور سائنٹفک اور استدلالی طریقہ بیان سے کمیونزم اس کے محرکات اور سرکاری غیر سرکاری اداروں کے رد کمیونزم کے لئے غلط عملی اقدامات پر سیر حاصل جامع اور مدلل تبصرہ فرمایا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ جماعت اسلامی کی صحت مند پالیسی اور لائحہ عمل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے انگریزی داں طبقے میں یہ پمفلٹ نہایت مقبول ہوگا۔ مترجم نے بھی ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے اور زور بیان کا تاثر کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔

ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" لاہور

یہ ادب اسلامی کا تابندہ ستارہ گذشتہ تین ماہ سے افق ادب پر جلوہ گر ہوا ہے۔ رسالہ کی ادارت کے فرائض کوثر نیازی جیسے بے باک رفیق کے سپرد ہے۔ جو رسالے کے معیاری ہونے کی پوری پوری ضمانت ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے اور فی شمارہ آٹھ آنے ہے۔ اس ماہنامہ کو اچھے قلمکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ حالیہ ماہ جولائی کے شمارہ میں ماہر القادری کے منتخب اشعار، روش صدیقی، ساحل بی اے، [illegible]

(باقی اگلے صفحہ پر)

بقیہ "نیا نشہ" صفحہ ۳۷ سے آگے :۔

تو سب سے بڑا ہے۔ ورد دم ہو، میرے محسن پر، انسانیت کے محسن پر، اس کے ساتھیوں پر، اس کی آل پر، میری معروضات قبول فرما۔ تو سننے والا ہے تو سب کچھ جانتا ہے"!

مشتاق عالم : نومولود بچے کی طرح لطیف معصومیت کی کیفیت چھکو رہا تھا۔ اس کے مالک نے اس کے دل میں تسکین اتار دی۔ وہ اس تسکین سے سرشار ہو خواب ہوا۔ وہ سرشار تھا۔ جیسے پہلے سرشار ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ نشہ اور ہی تھا۔

(بشکریہ "تسنیم")

بقیہ "تذکرے اور تبصرے" صفحہ ۶۳ سے آگے:۔

اور شبنم سبحانی کی مرصع غزلیں ماہنامہ کی زینت ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریاآبادی نے صحافیوں کو بروقت استدلالی انداز میں انتباہ کیا ہے۔ مقالے ٹھوس اور معلوماتی ہیں۔ اسرار احمد صاحب کا خاکہ . . . . . "جو بن کھلے مرجھا گئے" بھی خوب ہے۔

ماہنامہ میں افسانوں کی تشنگی محسوس ہوتی جو ایک ادبی پرچے کے لئے موجودہ سہل پسند معاشرہ کے لئے ناگزیر ہے۔ امید ہے ادارۂ "تعمیر انسانیت" اس طرف توجہ دے گا۔

(ش۔ ج)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
FRUIT FLAVOUR UNANI SYRUP
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
Asmar
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

PTEMBER, 1955 Regd. No. S. 1378

Monthly "MUSHIR" Karachi.

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

6(10)

اکتوبر ۵۵

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

قیمت -

پاکستان

دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

بلند معیاری
ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی اد
مشہور اور مقبول عام
ہیں
2 OZ
MRZMEE
حاذق کا
مفرح فولادی
نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ وزن
بڑھاتا ہے اور ہڈیوں کو مضبوط
کرتا ہے۔ قوت اور طاقت بخشتا ہے
کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے
(خوراک)
کھانیکا ایک چمچہ روزانہ دونوں
کھانا کھانے کے بعد استعمال
بچوں کے لئے نصف خوراک
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
منیجر
حاذق دوا
بندر روڈ - کراچی

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلیفون : ۷۹۲۳

جلد : ۶ شمارہ : ۱۰

اکتوبر ۱۹۵۵ء

مُرتبہ
عبد الغفور بیگ

بدل اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے
سالانہ : پانچ روپے
بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور ۔ یوپی (بھارت)

(پرنٹر پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر مشیر بندر روڈ کراچی ۱ سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

سبدِ گل

افلاطون ادب کو محض معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ شاعر مذموم افعال اور جذبات میں اشتعال پیدا کرنے والے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں اس لئے اپنی مثالی ریاست (Ideal State) سے شاعروں کو سرے سے خارج ہی کر دیا تھا۔ مگر اس کے شاگرد ارسطو نے ادب کے متعلق زیادہ صحت مند نظریات پیش کئے ہیں۔ ارسطو نے اپنی کتاب بوطیقا (Poetics) میں کہا ہے کہ شاعری جذبات کو برانگیختہ کرنے کی بجائے ان کو پاک صاف کر دیتی ہے گویا طب کی رُو سے جو فائدہ جسم کو مسہل سے ہوتا ہے وہی روح کو شاعری سے۔ ارسطو نے شاعر و مورخ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مورخ وہ واقعات بیان کرتا ہے جو پیش آ چکے ہیں اور شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ کیا پیش آ سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ "خاص حقیقت" کو اور ادب "عام حقیقت" کو بیان کرتا ہے ——— اس ہی آخری خیال پر بڑی حد تک کلاسیزم (Classicism) کی بنیاد ہے یہاں ان یونانی فلسفیوں کے خیالات کا اجمالی جائزہ لینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ اولین نقاد ادب و شاعری کی اعلیٰ اقدار کا تعین کس حیثیت سے کرتے تھے۔ جہاں تک مورخ اور ادیب کے زاویہ نظر کا اختلاف ارسطو نے پیش کیا ہے وہ آج بھی صحیح ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ ادب کا کام واقعات عصر کی پیشکش نہیں بلکہ روح عصر کو مقید کرنا ہے۔ اس مختصر بحث سے صرف یہ بات واضح ہوتی کہ ادیب کو پیش کرنے کے لئے مواد کیسے ملے گا۔ آیا روزمرہ واقعات و حادثات کی فہرست میں۔ یا اُن حادثات و تغیرات کے عمل و ردعمل اور ان کے نتائج میں۔ تو آخر الذکر بات صحیح ہے۔ یہی وہ بے نام وادی ہے جہاں ادیب اپنے وجدان، عشق، جنون، ادراک، بصیرت اور علمیت کے ذریعے عمل تخلیق سے نئے سے نئے رنگین معطر پھولوں سے اپنے دامنِ فکر کو بھر سکتا ہے۔ اور جو کچھ خود دیکھتا ہے دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ خود تڑپ کر دوسروں کو تڑپا سکتا ہے۔ مگر ادیب کو کیا دکھانا ہے؟ کن باتوں پر تڑپنا اور تڑپانا ہے ——— ؟ یہی وہ بنیادی مسائل ہیں کہ جن کو حل کرنا گویا ادب کی اعلیٰ اقدار کا تعین کر لینا ہے۔

اگر ادیب کسی اخلاق سوز منظر کا اثر قبول کرتا ہے اور من و عن وہی اپنے ادب میں پیش کرتا ہے تو یہ کسی صورت بھی لائق تحسین جذبہ نہیں۔ گو اس قسم کی تخلیقات کو ادب کے زمرے سے خارج تو نہیں کیا جا سکتا مگر ان کو سراہا نہیں جا سکتا۔ چونکہ ادیب بقول علامہ اقبال کے "سینۂ ملت کا دل" ہے۔ اور دل کا اثر تمام جسم پر ناگزیر ہے۔ لہذا دل کا پاک صاف ہو لطیف احساسات کا حامل ہونا ضروری ہے اس لئے آج ہم اپنے ہند و پاکستان کے اُس روایتی ادب کو جس کو فارسی کے توسط سے ہمارے ادیبوں نے قبول کیا تھا اور امیر خسرو سے لیکر غالب تک بیشتر شعراء و ادباء بھاری رہانیت کے لئے مضرت رساں خیال کرتے ہیں یہاں اس سے یہ مطلب نہیں اخذ کرنا چاہئیے کہ ہمارے ادب کا قدیم سرمایہ سرے سے فرسودہ اور بیکار ہے۔ نہیں۔ بلکہ بیشتر تخلیقات محض حسن بیا

اور انفرادی لذت اندوزی پر مبنی ہیں۔ یوں قدیم ادب میں جہاں اعلیٰ اقدار ملتی ہیں اُن کے سامنے ہمارا موجودہ ادب بھی ہیچ اور پست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم ادیبوں کے یہاں وحدت خیال و بیان پائی جاتی ہے اور موجودہ ادیب حُسنِ بیان سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ ادب کی اعلیٰ اقدار وہی ہیں جو زندگی کی اعلیٰ اقدار ہیں اور زندگی کی اعلیٰ اقدار وہ ہیں جو بلا رنگ و نسل، مذہب و ملّت، تمام انسانیت کے لئے افادی پہلو رکھتی ہوں۔ مثلاً جھوٹ بولنا، چوری کرنا، زنا کا ارتکاب، نفس پروری، سرمایہ اندوزی، اور اس ہی قسم کے دیگر اعمال و افعال کسی صورت بھی انسانوں کی فلاح کا باعث نہیں ہو سکتے۔ گو بعض لوگ اس کے بھی قائل ہیں بقول شکسپیر Nothing is good or bad; but thinking makes it so مگر درحقیقت اس قسم کے مقولات دہی معاشرہ تراشتا ہے جس کے بیشتر انسان نفس کی رہبری قبول کر لیتے ہیں اور انفرادی لذت کو اجتماعی افادیت پر فوقیت دیتے ہیں۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا جب ادب درباروں اور امراء کی محفلوں میں پھلتا پھولتا تھا۔ جب لذتیت و خوشنودی سلاطین ادب کا مقصد سمجھا جاتا تھا۔ اب ادب کا رشتہ براہِ راست عوام سے ہے اور ادب کو عوام کی جد و جہد، ان کی چھوٹی بڑی مسرتوں اور غموں کا عکاس ہونا چاہیئے۔ نہ صرف عکاس بلکہ رہبر ہونا چاہیئے اسی لئے شاعری کو دانشوران ادب نے پیغمبری کا جزو بتایا ہے۔ یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ادب میں کیا پیش کیا جائے۔ مگر چونکہ ادب کی تیاری خونِ دل سے ہوتی ہے اس لئے اس کے خالق یعنی ادیب کا اعلیٰ کردار کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اگر ادیب شراب کی مذمت کرتا ہے تو شراب کا دخل اس کی زندگی میں بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ادیب عوام کے لئے کوئی نظامِ حیات پیش کرتا ہے تو اس کو بھی اس نظام کا عملی داعی ہونا چاہیئے۔ اسی لئے جب نعیم صدیقی صاحب نے چراغِ راہ کے کسی شمارہ میں علامہ اقبال پر مفصل تنقید کی تو علامہ کے کردار کے خام پہلوؤں پر بھی ان کو نظر ڈالنی پڑی اور جو یقیناً ناگزیر تھی۔ آج جوش ملیح آبادی کی شاعری کا عظیم بت محض ان کے مسخ کردار کی وجہ سے خود ترقی پسندوں کے ہاتھوں پاش پاش کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے وطن میں خود کو اجنبی محسوس کر رہے ہیں۔ غرضیکہ ادب میں زندگی کی اعلیٰ اقدار کو اپنا لینے کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ ادیب خود اپنی عملی زندگی میں ان اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔ اب صرف بیان یا ہیئت (Form) کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ اس ضمن میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اعلیٰ خیال ـــــ اعلیٰ بیان کے قالب میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ اور اس سے نیچے اتر کر ـــــ شکسپیر، ٹیگور، غالب، اقبال، کالیداس، ابن خلدون، اور دوسرے دانشوروں کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے ادیب اس طرف توجہ دینگے اور خود کو وحدت کردار و گفتار کا نمونہ بنانے کی کوشش کرینگے۔

ـــــ شمیم جاوید

مسٹر غلام محمد کا استعفیٰ

(اُن کے چار سالہ عہدِ حکومت کا حقیقت پسندانہ جائزہ)

گزشتہ ماہ پاکستان کے سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد خرابی صحت کی بنا پر اپنے عہدۂ جلیلہ سے مستعفی ہو گئے۔ اور ان کی جگہ میجر جنرل اسکندر مرزا مستقل گورنر جنرل مقرر ہو گئے ہیں۔ جب مسٹر غلام محمد کے دو ماہ کی رخصت پر جانے اور ان کی جگہ مسٹر اسکندر مرزا کے قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہونے کا اعلان ہوا تھا تو گو سرکاری حلقوں نے کوئی بات ظاہر نہیں کی تھی مگر عوام کا قیاس یہی تھا یہ "رخصت" مستقل علیحدگی اور یہ "قائم مقامی" مستقل گورنر جنرلی کا پیش خیمہ ہو گی۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کے سرکاری اعلان نے عوام کی اس قیاس آرائی کو صحیح ثابت کر دیا۔ ویسے تو مسٹر غلام محمد عرصہ دراز سے علیل ہی چلے آ رہے تھے۔ مگر گزشتہ پانچ چھ ماہ سے ان کی علالت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا اس لئے انہیں علاج کی خاطر یورپ جانا پڑا۔ مگر افسوس ہے کہ "مملکت خداداد پاکستان" کے خزانے سے اپنے علاج پر یورپ پر ایک زر کثیر صرف کرنے کے باوجود وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو سکے اور آخر انھیں مملکت کے اس عہدہ جلیلہ سے مجبوراً سبکدوش ہونا پڑا۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح بھی اپنی گورنر جنرلی کے آخر زمانہ میں سخت علیل ہو گئے تھے مگر انہوں نے مملکت کے خزانہ پر بوجھ ڈال کر علاج کے لئے یورپ جانا پسند نہ فرمایا۔ اور ملت کی گود ہی میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ آج ملک کے عوام علاج اور دواؤں کو ترس رہے ہیں کیونکہ ملک کے خزانہ میں اتنا پیسہ نہیں کہ غیر ملکی دوائیں غیر محدود تعداد میں منگائی جا سکیں۔ پھر بھی اگر مسٹر غلام محمد اس غریب ملک کے غریب خزانے سے اس صرف کثیر کے بعد کچھ صحت یاب ہو جاتے تو شاید یہ بات عوام کے اطمینان کا باعث ہوتی۔ مگر افسوس کہ عوام کے روپے کے بے دریغ خرچ کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور انھیں مجبوراً مستعفی ہونا پڑا۔ چونکہ مسٹر غلام محمد بحیثیت سربراہ مملکت چار سال تک ملک کے معاملات پر پوری طرح حاوی رہے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس چار سالہ عہدِ حکومت کا ایک غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے۔ مملکت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر فائز ہونے والے افراد کے کردار، افعال اور نظریات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کا پورا حق قوم کو ہے۔ اس حق کو نہ صرف اسلام بلکہ آج کی جمہوری دنیا بھی پوری طرح تسلیم کرتی ہے۔ چونکہ عملی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی ذمہ داری مملکت کے کلیدی مناسب پر فائز افراد ہی کے کندھوں پر ہوتی ہے اس لئے جائزہ ان افراد ہی کے افعال و نظریات کا لیا جاتا ہے۔ یہ جائزہ حقیقت میں خود قوم و ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ایسا جائزہ اس لئے بھی ضروری ہوتا ہے کہ مستقبل میں ان عہدوں پر فائز ہونے والے افراد ماضی کے اچھے اور برے کے پیش نظر آئندہ ملک کے معاملات کو زیادہ بہتر طریقہ سے سرانجام دے سکیں۔

ویسے تو مسٹر غلام محمد قیام پاکستان ہی سے ملک کی انتظامیہ کے ایک اہم رکن رہے ہیں یعنی وہ پہلے چار سال تک مملکت کے وزیر مالیات رہے ہیں اس لئے ملک میں گزشتہ آٹھ سال میں وقوع پذیر ہونے والے اچھے یا برے حالات کی ذمہ داریوں سے وہ بالکل علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ مگر ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا چار سالہ دورِ حکومت پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ اپنے اس دورِ حکومت میں انھوں نے بعض ایسے سخت اقدامات کئے (اور ان کے سخت ہونے کے احساس کا اعتراف خود انھوں نے اپنے الوداعی پیغام میں بھی کیا ہے) جن میں

دستوری قدروں اور جمہوری روایات کو قطعاً ملحوظ نہ رکھا گیا جو خود مختار ممالک میں جمہوریت کی جان ہوتی ہیں۔ ان کے ان اقدامات نے ملک کی سیاسی زندگی پر ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور کچھ ایسی غیر جمہوری اور انوکھی روایات قائم کی ہیں کہ جن کی نظیر کسی آزاد جمہوری ملک میں نہیں مل سکتی۔ جنہوں نے عوام کو ملک کے مستقبل ہی سے مایوس کر دیا ہے۔ ان کا پہلا اقدام ناظم الدین وزارت کی برطرفی تھا جب اپریل ۱۹۵۳ء میں ناظم الدین وزارت کو بیک جنبش قلم برخواست کر دیا گیا تھا تو ہم نے مشیر ماہ جون ۱۹۵۳ء کے شمارہ میں "خطرناک رجحانات" کے زیر عنوان مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کرتے ہوئے شرح صدر کے ساتھ لکھا تھا کہ:-

گزشتہ ماہ ہمارے گورنر جنرل ہز ایکسی لینسی غلام محمد صاحب نے بیک جنبش قلم خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برخاست کر دیا۔ اس برخاستگی کا پس منظر خواہ کچھ بھی ہو۔ ہمیں بڑی خوشی ہوتی اگر ہمیں یہ نہ کہنا پڑتا کہ جس عجلت ، جس غیر معمولی اور عجیب و غریب طریقہ سے یہ عمل وقوع پذیر ہوا وہ اگر غیر آئینی نہ بھی ہو مگر غیر جمہوری ضرور تھا اور جس سرعت کے ساتھ نئی وزارت . . . . تشکیل دی گئی اس کے لئے ممکن ہے قانونی جواز ڈھونڈا جا سکتا ہو مگر جمہوری جواز نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے خواجہ ناظم الدین صرف وزیر اعظم ہی نہیں تھے وہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ وہ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بھی تھے اور اسمبلی کے لیڈر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو یہ پوزیشن پاکستان مسلم لیگ، مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور اسمبلی کے اعتماد کی بنا پر حاصل تھی۔ اس اعتماد کو عدم اعتماد میں تبدیل کئے بغیر ان کو یک بینی و دوگوش وزارت عظمیٰ سے برخاست کر دینا صرف جمہوریت کی ہی موت نہیں بلکہ پاکستان مسلم لیگ کے لئے بھی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ تعجب ہو کہ ہمارے گورنر جنرل ہز ایکسی لینسی غلام محمد صاحب نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور اسمبلی سے اپنے اس اقدام کا جواز حاصل کرنا کیوں ضروری نہیں خیال فرمایا کیا ان کے خیال میں ساری مسلم لیگ اسمبلی پارٹی بلکہ ساری اسمبلی اس قابل نہ تھی کہ اس کا اعتماد حاصل کر لیا جاتا . . . . یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ(۱) کے تحت انہیں وسیع اختیارات حاصل ہیں مگر جمہوریت کی تاریخ میں ان اختیارات کو اس طرح استعمال کرنے کی ایک مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت گزشتہ چند ماہ سے ملک کی اقتصادی بدحالی اور اچانک غذائی قلت کی وجہ سے عوام میں بدنام ہو گئی تھی۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس اقتصادی بحران اور غذا کی اچانک قلت کے واحد ذمہ دار خواجہ ناظم الدین اور ان کے چند معتوب ساتھی ہی نہ تھے۔ بلکہ اول تو پوری کیبنٹ ذمہ دار تھی دوسرے اس کی اصل ذمہ دار وہ پالیسیاں تھیں جو مسلم لیگ وزارتیں گزشتہ پانچ سال سے اپنائے ہوئے تھیں جن میں ہمارے گورنر جنرل صاحب بھی بحیثیت وزیر مالیات شریک رہے تھے۔ گزشتہ پانچ سال سے مسلم لیگی وزارتوں کی اقربا نوازی، خویش پروری، رشوت ستانی، اور جانب داریوں نے ملک کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے یہ ان کا لازمی نتیجہ تھا۔ آج ہم جن ناقابل برداشت اور ناقابل تحمل مصائب کے پہاڑوں کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں ان کے لئے صرف خواجہ ناظم الدین اور ان کے چند ساتھیوں کو ذمہ دار قرار دیں تو یہ نہ تو دانشمندی ہے اور نہ ہی انصاف کا تقاضا اس کے لئے ہمارا ہی انتظامیہ مشینری کے سب کل پرزے، جن میں وزرا سے لیکر افسران بالا تک سب ہی شامل ہیں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ اگر آج کوئی بھی وزارت ہوتی۔ کوئی بھی وزیر اعظم ہوتا اس کو لامحالہ ان حالات سے دوچار ہونا ہی تھا۔ اس لئے صرف خواجہ ناظم الدین، سردار عبد الرب نشتر اور ان کے ساتھیوں کو ہدف بنا کر نئی مرکزی وزارت میں بیشتر سابقہ وزراء کا شامل رہنا کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہے خواجہ ناظم الدین اور سردار عبد الرب نشتر کی شخصیتیں قائد اعظم کے وفادار ساتھیوں کی حیثیت سے حصول پاکستان کی جنگ سے لیکر آج تک اپنے خلوص اور دیانت داری کی وجہ سے مسلم رہی ہیں اور موجودہ صاحب اقتدار گروہ میں

صحیح معنوں میں عوام کے نمائندے اگر کوئی رہ گئے تھے تو وہ یہی دو اشخاص تھے جنہیں آئین کی آڑ لے کر اور جمہوریت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھکر مکھن سے بال کی طرح باہر نکال پھینکا گیا ہے۔ لہذا سنجیدہ عوام کو بجا طور پر اس وزراتی تبدیلی میں کسی خلوص کی بجائے جماعتی سیاست بازی (Party Politics) اور مفاد پرستی کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس معتوب گروہ میں کچھ افراد ایسے ضرور موجود تھے جو اپنی نااہلی اور بددیانتی کی وجہ سے رسوائے زمانہ تھے تو سوال یہ ہے کہ ایسے افراد صرف خواجہ ناظم الدین ہی کی وزارت میں نہ تھے وہ تو قیام پاکستان ہی سے مرکزی وزارت میں موجود تھے۔ انھیں اس سے پہلے کیوں علیحدہ نہ کر دیا گیا۔ اب انھیں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے سر مڑھ کر کیوں یہ انوکھا اقدام کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ ناظم الدین عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کھو چکے تھے اس لئے انہیں علیحدہ کرنا ضروری تھا۔ تو ہمارے خیال میں انکی پوری کابینہ میں جو شخص سب سے زیادہ غیر مقبول تھا وہ چوہدری ظفر اللہ وزیر خارجہ تھے۔ اگر آج بھی ملک بھر میں صرف مقبولیت پر عوام سے استصواب رائے کرایا جائے تو جو شخص سب سے کم ووٹ حاصل کرے گا وہ ہمارے وزیر خارجہ ہی ہوں گے۔ یہ دعوی بغیر دلیل کے نہیں ہے چوہدری صاحب موصوف گزشتہ پانچ سال سے ملک کی خارجہ پالیسی کے واحد ترجمان رہے ہیں۔ ہمیں گن کر بتایا جائے کہ ملک کا کون سا اہم خارجی مسئلہ ہے جو انھوں نے بخیر و خوبی سلجھا لیا ہو۔ مسئلہ کشمیر ہے۔ متروکہ املاک کا مسئلہ ہے۔ نہری پانی کا مسئلہ ہے (یہ مسئلہ ہمارے غذائی بحران سے تعلق رکھتا ہے) انکی قیادت میں یہ مسائل سلجھنے کی بجائے ایسے الجھ گئے ہیں کہ ان کا حل ہونا قریب قریب ناممکن ہو گیا ...... خاصکر مسئلہ کشمیر جس پر پاکستان کی سالمیت کا انحصار ہے ان حقائق کے پیش نظر ہمارے خیال میں عدم مقبولیت کی بنا پر اگر کسی وزیر کا برخواست ہونا ضروری تھا وہ ہمارے عزت مآب چوہدری ظفر اللہ خاں تھے مگر ہم دیکھتے ہیں وہ نئی وزارت میں اسی طرح براجمان ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے دوران میں ملک کو اقتصادی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ تو اس کی زیادہ تر ذمہ داری ہمارے وزیر اقتصادیات عزت مآب چوہدری محمد علی پر عائد ہونی چاہیئے۔ برخاستگی کے وہ بھی مستحق ہونے چاہیئے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی نئی وزارت میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ صاحب کی وزارت کے دوران میں ملک کا عام نظم و نسق ابتر ہو گیا تھا۔ تو اس کی بھی زیادہ تر ذمہ داری ہمارے وزیر داخلہ عزت مآب مشتاق احمد گورمانی صاحب پر عائد ہوتی تھی۔ اور اس کے لئے انہیں برخواست کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ہم دیکھکر حیران ہیں کہ وہ بھی نئی وزارت میں اپنا عہدہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اندریں حالات موجودہ وزراتی تبدیلی میں ہمیں کوئی صحت مندانہ محرک نظر نہیں آتا۔

اگر مرکزی وزارت کی اس تبدیلی کو جو مندرجہ بالا سیاق و سباق سے صرف نظر کر کے مجرد آئینی تبدیلی کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو بھی جمہوریت کے نقطۂ نظر سے یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں ہے۔ اس غیر جمہوری مثال اور روایت کے ہوتے ہوئے آخر کونسی وزارت اطمینان اور تسلی کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کر سکتی ہے۔ کیا ہر آنے والی وزارت خواہ وہ اپنی پشت پر عوامی حمایت اور جمہوریت کا کتنا وزنی جواز بھی رکھتی ہو۔ کیا اس کے اراکین کے ذہن پر یہ خوف ہر وقت مسلط نہ رہے گا کہ وہ کسی وقت بھی ایک شخص کی مرضی پر بیک جنبش قلم برخاست کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے گورنر جنرل صاحب اپنے اس اقدام میں بزعم خود خواہ کتنے ہی پرخلوص کیوں نہ ہوں۔ کیا ایسی روایات ملک کے لئے آئندہ جمہوری نظام کو صحت مندانہ طور سے چلانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ کم از کم دانش مندی اور دور اندیشی تو اس کا جواب نفی ہی میں دیں گے۔

ناظم الدین وزارت کی برطرفی کے بعد کے حالات و واقعات شاہد ہیں کہ ہمارے مندرجہ بالا خدشات کسقدر مبنی بر صداقت تھے

درصل مسٹر غلام محمد کے اس اقدام کے محرک کے طور پر خلوص و وطنی خیر سگالی کا بڑے سے بڑا دعویٰ بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا کہ ان کے اس
قدام سے عالم اسباب میں رونما ہونے والے نتائج نے یہاں دستوری روایات کو پامال کرنے کا ایک ایسا دروازہ کھولدیا تھا جس کے نتیجے میں اس قسم کے
اقعات مرکز اور صوبوں میں اس کثرت سے رونما ہوتے ہیں کہ جیسے یہ باتیں اب ہماری سیاسی زندگی کا ایک لازمی جز ہوں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ
سب کچھ ملک کے استحکام اور بقا کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ آج ملک جس دستوری اور سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور آج ہمارے ہاں جس طرح دستور کو بازیچۂ
طفال بنایا جا رہا ہے ان سب کارناموں کے لئے ناظم الدین وزارت کی برطرفی نے ہی زمین ہموار کی تھی۔

مسٹر غلام محمد کا اپنے عہد حکومت میں دوسرا اقدام دستور ساز اسمبلی کو ہی توڑ دینا تھا۔ یہ اقدام بذات خود اس بات کی بڑی قوی دلیل تھا
کہ ان کے پہلے اقدام نے حالات کو اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ انہیں یہ دوسرا انتہائی اقدام کرنا پڑا۔ حالانکہ ان کا پہلا اقدام بقول ان کے حالات کو سدھارنے
کے لئے کیا گیا تھا۔ مگر عملی طور پر حالات سدھارنے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گئے گویا ان کا دوسرا اقدام ان کے پہلے اقدام کے غیر صحت مندانہ اور غیر دور
اندیشانہ ہونے کی منطقی دلیل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا دوسرا اقدام ملک کے حالات پر کس طرح اثر انداز ہوا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء سے پہلے ہم سیاسی
حیثیت سے پاکستان کو ایک خود مختار ملک سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمارا دستور یہ ایک خود مختار اور ساورن ادارہ ہے۔ جو اپنے آئینی فیصلوں کے لئے
کسی بیرونی حکومت یا اس کے کسی ایجنٹ کی تصدیق کی محتاج نہیں۔ یہی تعبیر ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء تک تصور کی جاتی رہی۔

بانی پاکستان قائداعظم مسٹر محمد علی جناح جو قانون آزادی ہند کی تدوین و ترتیب میں خود شامل تھے اور اس قانون کے مستند شارح سمجھے جاتے
تھے۔ کے زمانہ سے لیکر ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء تک اسی قانون کی یہی تعبیر تصور کی جاتی تھی۔ اور بشمول مسٹر غلام محمد سب اسی عقیدے پر عمل کرتے رہے کہ
دستور یہ ایک خود مختار ادارہ ہے اور اب تاج برطانیہ کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس دوران
میں دستور یہ نے بیسیوں قانون پاس کئے اور ان کا نفاذ گورنر جنرل کی تصدیق کے بغیر ہوتا رہا ہے حکومت اور ملک کا سارا کاروبار اسی مفروضہ پر چلتا رہا
اور کسی نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ جب دستور ساز اسمبلی نے ایک ایسا قانون پاس کیا جس میں گورنر جنرل کے اختیارات میں ترمیم کر دی گئی تو مسٹر
غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی ہی کو توڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طویل مقدمہ بازی کے بعد ہماری سب سے بڑی عدالت نے یہ فیصلہ دیدیا کہ ہماری دستور یہ
اصل طور پر خود مختار نہیں۔ بلکہ اس کا ہر فیصلہ تاج برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے گورنر جنرل کی تصدیق کا محتاج ہے اور اس کو حق ہے کہ اس کے فیصلے
معلق میں رکھدے۔ یعنی ہم بحیثیت قوم و ملک ابھی تک تاج برطانیہ کے غلام ہیں اور اس کو پاکستان کے معاملات میں غیر محدود دستوری...
اختیارات حاصل ہیں۔ یعنی ہمارے ملک کے معاملات میں غیر محدود دستوری اختیارات اس تاج کو حاصل ہیں جو اپنے ملک میں یعنی انگلستان میں ایک
ربڑ کی مہر سے زیادہ اختیارات نہیں رکھتا۔ وہ اپنے ملک میں اپنی قومی اور ملکی روایات میں اسی طرح جکڑا ہوا ہے کہ اسے شخصی آزادی تک حاصل
نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے ملک کی روایات کے خلاف کسی ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا جسے وہ چاہتا اور پسند کرتا ہو۔ اگر وہ ان روایتی
پابندیوں سے انحراف کرے تو اسے سرے سے تخت و تاج ہی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ مسٹر غلام محمد کے اس اقدام کا ملک و قوم کو جو صدمہ پہنچا
اور جو نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ ہماری قومی حمیت سخت مجروح ہوئی اور ہماری ملی غیرت کا جنازہ اس طرح اٹھا مسٹر غلام محمد کی سرکردگی میں ہمارے حکمرانوں کی طرف سے
عدالت کورٹ میں یہ بات ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا کہ تاج برطانیہ کو پاکستان کے معاملات میں غیر محدود دستوری اختیارات حاصل
ہیں۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ستم ظریفی ہے کہ جہاں دوسری قومیں اپنی گردنوں سے غیروں کی غلامی کے جوئے اتارنے میں جدوجہد کے خونفشاں ادوار سے
گزر رہی ہیں وہاں ہم نے بصد جوش و خروش خود اپنے دست شوق سے برطانیہ کے طوق غلامی کو اپنے گلے میں دوبارہ ڈال لینے پر فخر محسوس کیا۔ جمہوری روایات
کے عدم احترام اور دستور یہ کے معاملے میں اس قسم کے رویے سے متاثر ہو کر ہی گزشتہ سال محترمہ مس فاطمہ جناح نے متعدد بیانات کے ذریعہ اس
تشویش کا اظہار کیا تھا کہ اس ملک کو سات سمندر پار بسنے والی قوم کا دوبارہ غلام بنایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مس فاطمہ جناح پر تو سیاست

میں جانبداری کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

اس اقدام سے دوسرا ناقابل تلافی نقصان ملک و قوم کو یہ ہوا کہ گزشتہ سات سال میں بے شمار وقت اور مال کے صرف کے بعد جو دستور ہم فراہم کرسکے تھے وہ یکسر ضائع ہوکر رہ گیا۔ صرف وہ متاع ہی ضائع نہ ہوئی بلکہ ہم مکمل آزادی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور آج ہم وہیں ہوتے ہیں جہاں آج سے آٹھ سال پہلے تھے۔ اگر یہ اقدام نہ ہوتا تو ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کو پاکستان "جمہوریہ اسلامیہ" بن جاتا۔ ہمارا اپنا زیادہ تر اسلامی دستور نافذ ہو جاتا اور موجودہ دستوریہ کی بجائے ایک ایسی پارلیمنٹ عالم وجود میں آچکی ہوتی جسے کوئی شخص بھی یہ نہ کہہ سکتا کہ قوم کی نمائندہ نہیں ہے۔

مسٹر غلام محمد کے ان اقدامات نے مجموعی طور پر ملک و قوم کو تیسرا یہ نقصان پہنچایا ہے کہ ہماری بین الاقوامی ساکھ اور ہمارا بین الاقوامی وقار بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔ آج بیرونی ممالک سفر کرکے آنے والا ہر پاکستانی اس بات کا شاہد ہے کہ ان آزاد ممالک کے باشندے ہم پاکستانیوں کو بڑی حقارت اور پستی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بسا اوقات تو ہمارے ہم وطنوں کو ان ممالک کے باشندوں کے سامنے اپنے آپ کو پاکستانی ظاہر کرتے ہوئے بڑی شرم و ندامت محسوس ہوتی ہے۔ اندرونی طور پر یہ حالت ہے کہ عوام پاکستان کے مستقبل سے بے حد مایوس ہوگئے ہیں۔ بے حسی اور بے دلی کا یہ عالم ہے۔ اب جب ہمارے لیڈر ملک میں پامال شدہ جمہوریت، اخوت، مساوات اور عدل کے دوبارہ احیاء کے نعرے بلند کرتے ہیں تو لوگ مشکل ہی سے یقین کرتے ہیں کہ اب اس ملک میں ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ مزید برآں ایسے اقدامات کے سلسلے میں ملک ایک ایسی افسوسناک فضا میں محیط رہ گیا ہے جس میں کسی مرکزی یا صوبائی مجالس قانون ساز کا نمائندہ یا غیر نمائندہ ہونا اور کسی سیاسی جماعت یا شخصیت کا محب وطن یا غدار ہونا محض ایک مخصوص گروہ کے چند افراد کی رائے پر منحصر ہوگیا ہے۔ یہ گروہ جس وقت بھی جو رائے دیدیتا ہے اس کو حق بجانب قرار دینے کے لئے مطمح نظر رکھنے والے مفاد پرست سیاستدانوں اور صحافیوں کی فوج مستقلاً تیار رہتی ہے۔ گویا قوم و ملک کی فلاح و ترقی چند افراد سے اقتدار و ترقی ہم معنی قرار پاگئی ہے۔ مستقبل کا مورخ تو خدا جانے ان اقدامات کے متعلق کیا رائے قائم کریگا مگر حال کا مورخ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ان کے اقدامات کے نتائج اچھے نہیں نکلے۔ مسٹر غلام محمد کی قیادت میں حکمران گروہ کے ایک حصہ نے اس ملک کی قسمت کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے وہ سیاسی بصیرت رکھنے والے لوگوں کے لئے بہت ہی پریشان کن داستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس شخص یا جماعت کو اپنے ملک کے ساتھ معمولی سے معمولی ہمدردی بھی ہو وہ اپنے ملک کی بقا کو اس طرح داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ آج قوم جس طرح ایک محدود گروہ کی اندرونی کشمکش اقتدار کی وجہ سے بے انتہا مصیبتوں کا شکار ہو رہی ہے اسے کسی حال میں بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا جاسکتا اگر یہ سب کچھ کرلینے کے بعد مسٹر غلام محمد اس ملک میں جمہوریت ہی قائم کرجاتے تو ہم پھر بھی انکی بڑی احسان مند ہوتی لیکن ایک غیر نمائندہ حکومت کو برخواست کرکے اس سے بھی زیادہ غیر نمائندہ حکومت کا تقرر کردینا اور ایک دستوریہ یا مجلس قانون ساز کو توڑ کر اس سے بھی زیادہ ناقص مجلس کو لے آنا ملک کی بہتری کی علامت کس طرح قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ موجودہ حکمران گروہ ماضی کی ان بے عنوانیوں سے کچھ سبق حاصل کرسکے۔ اور ملک کی گاڑی کو جمہوریت کی شاہراہ پر لے آنے میں کامیاب ہوسکے۔

(ادارہ)

نعیم صدیقی

مولانا مودودی

اپنے اندازِ گفتگو کے آئینے میں!

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے، اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے بڑا توڑا آدمیوں ہی کا توڑا ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو اور ہر چیز کی کمی وہ پوری کر لے جاتی ہے۔

ہمارے پاس کتنے ایسے آدمی ہیں جو اگر قوم کو پکاریں تو ان کی پکار توجہ سے سنی جائے؟

کتنے وہ لوگ ہیں کہ جن کے علم و فکر کی روشنی میں ہم قرآن و قرآن کا سفر طے کر سکتے ہیں؟

کتنے افراد ایسے ہیں کہ جن کے کیرکٹر پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا جا سکے کہ یہ کبھی اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد کی چراگاہ نہیں بنائیں گے؟

—— گنیئے —— ایک، دو، تین —— ! فرمائیے شمار کہاں تک پہنچا؟ بس اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ آپ کی قومی قوت کیا ہے؟

بہرحال یہ تعداد کم ہو یا زیادہ، اس ملک کی ایک شخصیت ایسی ہے کہ جس کا نام فوراً ذہن کے سامنے آئیگا اور وہ ہے مولانا مودودی کی شخصیت!

اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک فلسفہ، ایک اجتماعی کیرکٹر، ایک سیاسی تصور، ایک تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مودودی کا نام لیتے ہی "اسلامی دستور" کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔ دیکھنا دکھانا ایک تو "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے۔ لیکن اس دیکھنے دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے اور وہ یہ کہ ان اوصاف اور عادات کو لوم کیا جائے جنہوں نے ہم جیسے کسی خاکی انسان کو ابنائے نوع کے لیے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا رہا ہوتا ہے۔

مولانا مودودی کے متعلق یہ سطور اسی مقصد سے لکھی جا رہی ہیں آئیے۔ ہم اُن کی زندگی کے ایک اہم پہلو — اندازِ گفتگو کا جائزہ لیکر دیکھیں کہ اس میں ... خاص بات کیا ہے۔

حسنِ گفتار

آدمی حیوانِ ناطق ٹھہرا۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور غماز نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے بہاؤ کی رو دگاہ ہے۔ آدمی نے بات کی اور اس کی حقیقت کھلی۔ ناطقہ کی تانت بجی، تو زمانے بھر نے رنگ پا لیا "تا مرد سخن نگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ۔ بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی اپنی زبان کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے۔ کسی کا ظرف کتنا ہے۔ کس کا ذوق کس نوعیت کا ہے۔ کس میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے۔ کون کہاں تک با اصول ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے بول کر دے چکتا ہے۔ مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گذشتہ چودہ پندرہ برس کے نعمانے سے مسلسل بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولانا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

نعیم صدیقی •

مرے[1] احوال

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
پری سی بن کے صدائے طرب اڑتی ہے
ہوا کی موج پہ بوئے گلاب اڑتی ہے
یہ میری خاک تو بن کر سحاب اڑتی ہے
شراب اڑتی ہے شب بھر شراب اڑتی ہے
شراب اڑتی ہے لیکن سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
فضا میں شوق کے جگنو کئی چمکتے ہیں
سراب دل میں تمناؤں کے جھلکتے ہیں
نظر بہکتی ہے اور ولولے ہمکتے ہیں
ہوس کا سحر، کہ سحر ہو، چمن مہکتے ہیں
چمن ملتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
کہ جیسے ہوش نہ ہو، ہوش اڑا سا رہتا ہے
غمِ جہاں، غمِ جاں مٹا سا رہتا ہے
ہر ایک داغ کا شعلہ بجھا سا رہتا ہے
بیاں میں کیسے کروں اک خلا سا رہتا ہے
خلا سا رہتا ہے پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
تخیلات افق پار جا نکلتے ہیں
وہاں، جہاں کہ فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں
جہاں سناؤں کے سوتے کئی ابلتے ہیں
وہاں، جہاں کہ شعاعوں سے شعر ڈھلتے ہیں
تو شعر ڈھلتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
فریبِ نفس کے پردے جونہی اٹھاتا ہوں
تجھے حقیقتِ عظمیٰ! میں دیکھ پاتا ہوں
تجھے میں دیکھ کے پھر پیچ و تاب کھاتا ہوں
میں اپنی جان کا سارا سکوں لٹاتا ہوں
سکوں لٹاتا ہوں پھر بھی سکوں سا ملتا ہے

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
پرائے غم مرے سینے میں آ کے بستے ہیں
یہ دیدے جن سے دہکتے شرر برستے ہیں
ہزار غم زدہ جو رحم کو ترستے ہیں
کبھی کبھی مجھے آ کر یہ ناگ ڈستے ہیں
یہ ناگ ڈستے ہیں پھر بھی سکوں سا ملتا ہے

(بشکریہ چراغِ راہ)

[1] واضح رہے یہ آواز کسی فرد کی نہیں، بلکہ انسان کا نوعی وجود بول رہا ہے

آل احمد سرور

میرے خوابوں کو یوں کچل نہ سکے | یہ حقائق مجھے بدل نہ سکے
شب ہجراں کی ہائے مجبوری | یاد سے بھی تری بہل نہ سکے
کس سے بارِ حیات اٹھتا ہے | کیا ہوا ہم اگر سنبھل نہ سکے
لے گیا کون روشنی ساری | بزم میں پھر چراغ جل نہ سکے
کل بہاروں کا ساتھ کیا دینگے | آج انگاروں پر جو چل نہ سکے
ہائے اس برف کی گراں جانی | میری کرنوں سے جو پگھل نہ سکے
جو قدم پھونک پھونک دھرتے تھے | ایسے بہکے کہ پھر سنبھل نہ سکے
رہِ ہستی کے اُف نشیب و فراز! | ہم بھی سیدھے سبھاؤ چل نہ سکے

کیسے بدلیں گے وہ زمانے کو
جو سرور آپ کو بدل نہ سکے

(بشکریہ مشرب)

کہنے سے پیشتر ہی ڈلکتے کو انعام مل دیا جاتا ہے اور مبارک سلامت کے شور میں بدقت اس کو کھولنے پر قدرت حاصل کی جاتی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ عموماً اس قسم کے تار کسی غیر متوقع اور ناخواندہ قسم کے مہمان کی آمد کے مظہر ہی ثابت ہوتے ہیں لیکن یہ آرزوئیں اتنی آسانی سے شکست کھا جانے والی نہیں۔ تار کے سلسلے میں فوراً ہی دل کو یقین دلا دیا جاتا ہے کہ یقیناً کچھ بھول چوک ہو گئی ہے۔ چنانچہ رسالہ کا انتظار ناگزیر ہے اور جب دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ رسالہ خرید کر نتیجہ دیکھا جاتا ہے تو آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آتا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اسم گرامی برسر فہرست نہ ہو شاید کتابت کی غلطی ہو لیکن حل کے اندر درج شدہ الفاظ اس فریب آرزو کو شکست دیدیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اگلے ہی صفحے پر تازہ ترین معمہ دعوت فکر و نظر دیتا ہوا نظر آتا ہے اور شکستہ آرزوں کے ماتم کے ساتھ ساتھ فوراً ہی نئی امیدوں کے چراغ روشن کر لئے جاتے ہیں اور ایک بار پھر قسمت آزمائی کی جاتی ہے۔

اور ہاں وہ مباحث جو اس دوران میں دوستوں کے درمیان ہوتے رہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے علم اور دوسرے کی دولت کے بارے میں ہمیشہ غلط اندازہ لگاتا ہے چنانچہ ان معمہ حل کرنے والوں پر یہ بات پوری پوری طرح صادق آتی ہے۔ کسی دوست کا گھر ہو یا دفتر کا کمرہ بلکہ یہ مباحث تو راہ چلتے بھی جاری رہتے ہیں۔ ہر معمہ حل کرنے والے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اشارہ کا جو مطلب اس نے اخذ کیا ہے وہی دوسرے بھی سمجھیں اور نتیجے کے بارے میں اس قدر قطعی اندازہ کیا جاتا ہے کہ بحث کرنے والے پر کچھ کچھ آشنائے راز ہونے کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ کسی نئے معمے کے متعلق بحث کرتے ہوئے ان لوگوں کے ذہن سے اپنی گزشتہ ناکامیوں کے نقوش بالکل محو ہو چکے ہوتے ہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادل ناخواستہ یا ازراہ دوستداری کسی مخلص دوست کا مشورہ بھی قبول کر لیا جاتا ہے اب اس نیک مشورے کے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں کیا کیا سر پیٹا جاتا ہے اس کا تصور دشوار بھی ہے، دلچسپ بھی۔

ویسے بھی ان معموں کے بارے میں یہ عقیدہ عام ہے کہ جو معمے حل کرنے کے بعد کسی وجہ سے یا اتفاقاً پوسٹ نہیں ہوتے وہ ہمیشہ بالکل صحیح ثابت

ہوتے ہیں۔ یہ خود فریبی کی انتہا نہیں تو کیا ہے ؎

"اب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے"

(بشکریہ "آہنگ")

بنت مجتبیٰ مینا

کیا فائدہ؟

جن بہاروں سے آنکھیں لڑائے خزاں
اُن بہاروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

شامِ غم کے سہاروں کو مت پوچھیے
غم کے ماروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

دل کے غنچوں کو شبنم عطا کیجئے
ان شراروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

آیئے دیکھیے رنگِ طوفاں ذرا
صرف دھاروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

دل اگر مثلِ لالہ نہیں داغ داغ
لالہ زاروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

رسمِ مینا و ساغر اٹھا دیجئے
چاند تاروں کی باتوں سے کیا فائدہ؟

(بشکریہ "عفت")

کرشن چندر

صحت خراب ہے

اردو کے مشہور شاعر غالبؔ نے کہا ہے کہ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" وہ یہ کہنا بھول گیا کہ اکثر اوقات جب دوا حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ خود درد بن جاتی ہے۔ مگر ان دونوں کیفیتوں سے پرے ایک اور کیفیت ہوتی ہے جس میں نہ کوئی درد ہوتا ہے نہ کوئی دوا۔ بس ایک خیال ہی خیال ہوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے درد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اچھے بھلے آدمی بھی کہنے لگتے ہیں کہ "بھئی میری تو صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

دوسروں کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ بچپن میں مجھے تھوکنے کی بہت عادت تھی۔ والدین کے روکنے پر بھی میں نے اس عادت کو نہیں چھوڑا۔ جب کوئی ٹوکتا تو کہہ دیتا تھا "بھئی کیا کروں؟ حلق میں تھوک بہت ہے اس لئے بار بار تھوکنا پڑتا ہے۔" اس سلسلہ میں کئی ڈاکٹروں سے بھی مشورہ لیا گیا۔ کسی کو میرے حلق میں کوئی نقصان دکھائی نہ دیا۔ دکھائی بھی کہاں سے دیتا؟ وہ تو صرف وہم تھا۔ خیال محض، جس کا علاج ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو صرف ایک بری عادت تھی بیس برس کی عمر ہوتے ہوتے ہی وہ ایک دیرینہ بیماری بن گئی اور میں ملنے جلنے والوں سے بار بار یہی کہتا کہ "بھئی کیا کروں۔ میرا تو حلق اتنا خراب ہے کہ..."

میں یہ کہنے کو تیار نہیں ہوں کہ ہر شخص اپنی زندگی میں ایک وہم پال لیتا ہے جو آگے چل کر اس کے جی کا جنجال بن جاتا ہے اور اس کی صحت بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن یہاں کچھ ایسی مثالیں ضرور پیش کروں گا جن سے ظاہر ہو گا کہ بہت سے مریض کسی حقیقی مرض میں نہیں، بلکہ کسی خیالی مرض میں مبتلا رہتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے بھی کوئی ایسا خیالی روگ پال رکھا ہو جسے اپنے دل کے کونے کھدرے سے ڈھونڈ نکالنے میں آپ کو یہ مضمون پڑھ کر مدد مل سکے۔

میرے ایک دوست ہیں۔ نام نہیں بتاؤں گا جن کی صحت دیکھنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ہنستے بھی بہت زور سے ہیں کھانے پینے میں بھی اپنے کسی ساتھی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن آپ جب ان سے ملنے جاتے وہ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ جب بھی پوچھیں۔ کہئے کیسا مزاج ہے؟ تو فوراً جواب دیں گے — "بھئی اپنی صحت سے تنگ آ چکا ہوں۔ سر میں ہر وقت ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ بدن ٹوٹتا رہتا ہے۔ حرارت بھی رہتی ہے۔ خیر آئیے۔ بیٹھئے۔ کہئے آپ کے لئے کیا منگواؤں؟ چائے یا لسی؟" پھر خیریت کی بات ہو چکنے کے بعد چائے آئے گی تو اگر آپ ایک پیالہ پئیں گے تو وہ چار پیالوں سے کم نہیں پئیں گے۔ اور ساتھ میں کم از کم پاؤ بھر دال موٹھ بھی ڈکار جائیں گے۔ قہقہے لگا لگا کر آپ کو لطیفے بھی سناتے رہیں گے۔ کیوں کہ ان کی صحت خراب ہے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ بدن ٹوٹتا ہے اور ہلکی ہلکی حرارت رہتی ہے۔

سر درد اور پیٹ درد ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج کوئی وید حکیم یا ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔ کوئی ایکسرے ان دردوں کا فوٹو نہیں لے سکتا یہی بات بدن ٹوٹنے کی ہے یہ کوئی درخت کی شاخ ٹوٹنے کی طرح تو ہے نہیں کہ ادھر شاخ ٹوٹی ادھر دیکھنے والے کو نظر آگئی۔ رہا حرارت رہنے کا سوال، اگر بدن میں حرارت نہیں ہو گی تو انسان زندہ کیسے رہے گا؟ لیکن میرے دوست پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ سنجیدہ ہو کر منہ بنا کر آگے بڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی یقین نہیں آتا تو خود دیکھ لو کہ ہلکا ہلکا بخار ہے یا نہیں۔" لیکن آپ جب ہاتھ دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو اپنے ہاتھ کی نسبت ٹھنڈا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کہہ دیتے ہیں۔

"صاحب۔ آپ کو ٹھنڈا بخار ہے۔"

ٹھنڈا بخار بہت سے لوگوں کو ہوتا لیکن اس کا سب سے دلچسپ تجربہ ایک بینک کے منیجر کو ہوا۔ ایک کلرک اس کے پاس چھٹی کی درخواست لیکر آیا اور کہنے لگا "صاحب بخار آ رہا ہے۔ چھٹی دیدیجئے۔"

منیجر نے پوچھا "ویل مین! کیا بات ہے؟"

کلرک نے جواب دیا "صاحب بخار ہے۔"
یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ منیجر نے ہاتھ چھوا تو بالکل ٹھنڈا تھا۔
کلرک نے کہا "صاحب! ہم غریب آدمی ہیں۔ اس لئے ٹمپریچر نیچے رہتا ہے۔"

منیجر لاجواب ہو گیا۔ اسے کلرک کو چھٹی دیتے ہی بنی۔ خیالی بخار کا تھرمامیٹر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تھرمامیٹر میں حرارت چاہے کم ہو یا زیادہ اگر مریض کے ذہن میں بخار ہے تو اسے بخار ہے۔ آپ اس بات کے خلاف کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔

میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، جن کی صحت بارہ مہینے خراب رہتی ہے۔ ایسے لوگ مسوری سے نینی تال، نینی تال سے شملہ، شملہ سے اوٹی، اور اوٹی سے سری نگر کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ان پہاڑی مقامات کے ہر شخص کو جانتے ہیں۔ ان کی کبھی ایک مرض سے تسکین نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے لئے ہر روز ایک نیا مرض چاہیئے۔ اگر کسی دن نیا مرض مل سکے تو پرانے مرض کے لئے کوئی نیا نام تو ضرور چاہیئے۔ جو چائے کے ساتھ بسکٹ کی طرح انہیں صبح سویرے مل جانا چاہیئے۔ ورنہ دن بھر ان کی صحت بگڑی رہے گی۔ اس قسم کی صحت کی خرابی کی شکایت کرنے والے عموماً ہٹے کٹے، موٹے تازے، سرخ و سپید ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر روز مرغ کھاتے ہیں۔ ٹانک کھاتے ہیں چھ میل کی سیر کرتے ہیں اور رات کو دس بجے مزے سے سو جاتے ہیں۔ کیوں کہ صحت خراب ہے۔

جن لوگوں کی صحت زیادہ خراب ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان میں بھی نہیں رہتے ہندوستان سے باہر رہ کر وہ لوگ صحت سدھارنے میں لگے رہتے ہیں۔ جس کی صحت جتنی زیادہ خراب ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان سے اتنا ہی دور رہتا ہے۔ میرے ایک دوست اسی صحت کے چکر میں طہران میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ایک اور دوست ہیں جو بیچارے گیارہ برس سے پیرس میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک اور بزرگ ہیں نہیں سوئٹزرلینڈ کے علاوہ اور کوئی علاقہ راس نہیں آتا۔ ایک صاحب پچھلے پندرہ برس سے ہونولولو میں بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ ہر خط میں وہ لکھتے ہیں "بس یہ میرا آخری خط ہے۔ الوداع!" ان پندرہ برس میں ان کے بہت سے ہٹے کٹے دوست جنہیں کوئی بیماری نہ تھی اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں لیکن میرے دوست پندرہ برس سے لگاتار ہونولولو میں پڑے ہیں اور صحت سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

ایسے مریض اپنے ملک سے دور رہ کر صرف اپنی صحت سدھارنے میں غلطاں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دن بھر ان کے پاس کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر میرے پیرس والے دوست کو لیجئے۔ اس بیچارے کا دن بھر کا پروگرام کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ صبح اٹھے چائے پی۔ اور چائے کے ساتھ وٹامن "اے" کی ایک گولی لے لی۔ پھر شیو کر کے گرم پانی سے غسل کیا اور ناشتہ کرانے والی ویٹرس سے ہنس کر دو چار باتیں کیں۔ ناشتہ بہت مختصر سا ہوتا ہے۔ دو ابلے ہوئے انڈے۔ آدھ پاؤ مکھن، فرانسیسی شہد، انگور کی جیلی۔ مادام لفراں سو کے ہاتھ کے تلے ہوئے چکن، ٹوسٹ یا گدی ٹوسٹ خستہ فرانسیسی بریڈ اور فرانسیسی شراب کی ایک پوری بوتل اور اس کے بعد وٹامن بی، سی، ڈی کی ایک موٹی سی گولی۔ یہ ہے وہ مختصر سا ناشتہ جس پر انہیں گذارا کرنا پڑتا ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد لباس پہنا، اور چھڑی ہاتھ میں لیکر قومی پارک کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹہلنے لگے۔ یا ڈاکٹر موسیو ٹولسے ملاقات کرنے اور اس دن کے لئے نئے مرض کا نام معلوم کرنے میں کچھ وقت صرف کیا۔ وہاں سے لوٹے۔ اگر دھوپ خوشگوار محسوس ہوئی تو دریا کے کنارے مچھلیاں پکڑنے چلے گئے۔ وہاں ان کی ایسے دوستوں سے ملاقات ہوگی جن کی صحت ان سے بھی زیادہ خراب ہوگی۔ ایسے لوگوں سے مل کر انہیں کچھ اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ واپس ہوٹل میں لوٹ کر لنچ کھایا۔ لنچ بھی ناشتہ کی طرح بہت ہی مختصر سا ہوتا ہے۔ چھ کورس کے لنچ کے بعد شراب کی ایک بوتل۔ اس کے بعد وٹامن ای، ایف، جی، ایچ وغیرہ کی ایک گولی، اس کے بعد آرام کرنے کے لئے بستر پر لیٹ گئے۔

ڈھائی بجے سوتے تھے جب جاگے تو پانچ بج رہے تھے۔ جلدی جلدی اٹھے، چائے پی۔ چائے لانے والی ویٹرس سے ہنس کر دو باتیں کیں۔ گرم پانی سے غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے نکل پڑے۔ گھومنے کے سلسلہ میں کئی کام ہو جاتے ہیں۔ گھومتے گھومتے ڈاکٹر کی دوکان پر پہنچے۔ جہاں طاقت کا انجکشن لیا۔ پھر باغ میں گھومنے چلے گئے جہاں مادام روبلی یا مادام موذیل سوفراں جن کی صحت ان کی طرح خراب ہوتی ہے ان

نتظار کر رہی ہوتی ہے ما ایک دوسرے کے مرض کے بارے میں پوچھ تاچھ
رنے کے بعد یہ دونوں مریض ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے
بیسے دنیا کے مصائب کے مقابلے کے لئے سہارا لینے ہوئے ڈنر کھانے نہیں
ریہ ننگی عورتوں کا ناچ دیکھتے ہیں۔ یہ نائٹ کلب میں رقص و موسیقی میں
ے تیسے چار بجے تک کا وقت گذارتے ہیں۔ کیوں کہ صحت خراب رہتی ہے

اگر میں یہ کہوں کہ خراب صحت رکھنے والے لوگ عموماً موٹے کٹے، اور تگڑے
ے ہوتے ہیں۔ تو یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہوگا۔ اس کا ایک دوسرا رخ
ہوتا ہے کچھ لوگ ہیں جو بانس کی طرح لمبے اور دبلے پتلے ہوتے ہیں لیکن
تے وہ کسی دیو کی طرح ہیں۔ کچھ لوگ چوہوں کی مانند ننھے اور مریل نظر آتے
لیکن وہ کھانے کی میز کے شیر ہیں آپ یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اس دبلے
سم میں وہ کون سی خفیہ کمائی پاکل لگی ہوئی ہے کہ جو دس آدمیوں کی
ب کو اس پتلے سے جسم میں ٹھونس دیتی ہے۔ بلکہ اس طرح غائب کر دیتا
میز پر سوائے خالی پلیٹوں کے اور کچھ نہیں رہتا۔ اس کے بعد یہ اصحاب
بخ لیتے ہیں "ہماری صحت بہت خراب رہتی ہے۔ ورنہ......"
ورنہ کیا ہمیں بھی کھا لیتے؟

وہم جب پکا ہو جاتا ہے۔ تو وہ صرف خیالی بات نہیں رہتی۔ بلکہ
ن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جنہیں
م تھا کہ وہ کانچ کے بنے ہوئے ہیں چنانچہ وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے
ہر وقت اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے جیسے اپنے آپ کو ٹکرانے سے بچا رہے
ہوں انہیں یہی فکر ستاتی رہتی تھی کہ کہیں کسی سے ٹکر نہ ہو جائے۔ اور ان
کے نرم و نازک کانچ کے جسم کا برتن کہیں سے ٹوٹ نہ جائے۔ یہ آج کل آگرے
کے پاگل خانے میں ہیں۔

ایک اور بزرگ تھے، جو اس وہم میں مبتلا تھے کہ ان کے سر پر
مرغ کا سر لگا ہوا ہے۔ آپ بھری محفل میں اٹھ کر کئی بار بانگ دیا کرتے تھے۔
یہ بھی آج کل آگرے کے پاگل خانے میں ہیں۔ دراصل اس قسم کے وہم یا
مرض کا تعلق جسم کی نسبت ذہن سے زیادہ ہوتا ہے، اور جب ذہن مریض
ہو جائے تو اس کا علاج بہت مشکل سے ہوتا ہے۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صحت صرف فرد کی ہی خراب
نہیں ہوتی بلکہ سماج کی بھی خراب ہو جاتی ہے۔ یہ ردعمل دونوں طرف ہوتا
ہے یعنی بہت سے خراب صحت والے افراد مل کر سماج کی صحت خراب
کر دیتے ہیں اور خراب صحت رکھنے والا سماج اچھے بھلے آدمیوں کی صحت
خراب کر دیتا ہے۔ اس بات کی زیادہ تفصیل میں نہ جا کر یہاں اتنا کہہ دینا
ہی کافی ہے کہ سماج کی صحت خراب ہوتی ہے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں
کہ اس کی صحت خراب ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ صحت کے ساتھ
ساتھ اس کا مزاج بھی خراب ہے ٭

(بشکریہ "افکار")

مصنف: ایم۔ڈبلو۔علی
مترجم: شمیم جاوید

گورکن

عظمت علی ایک گورکن تھا۔ اس کا کام دن رات قبریں کھودنا اور ان میں مردوں کو دفن کرنا تھا۔ اور ان مردوں میں بچے، مرد، عورتیں سب ہی شامل ہوتے تھے۔ وہ سیاہ رنگ اور قوی بازؤں کا ہیکل انسان تھا۔ جب وہ قبر کھود چکتا اور مردے کو اس میں لٹاتا اس وقت بھی اسکا چہرہ جذبات سے عاری ہوتا۔ کتنا بے رحم اور سفاک تھا وہ۔ وہ قبرستان آنے والے مردوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا جیسے وہ ان کی آمد کا منتظر ہو۔ پھر وہ نہایت تیزی سے زمین کے سینے کو اپنے پھاوڑے سے چیر دیتا۔ ادھر اُدھر سے قبر کا منہ بند کرنے کے لئے پتھر چنتا۔ پانی اور مٹی ملا کر گارا تیار کرتا اور دیکھتے ہی دیکھتے مردہ زمین کے اندر دفن کر دیتا ——— اس کو ان عزاداروں کا بھی کوئی خیال نہ آتا جو حسرت سے بے جان میت کو دیکھ رہے ہوتے اگر کوئی غریب مردہ کو قبر میں اتروانے میں دیر کرتا تو وہ چلّاتا "اٹھے بابا جلدی کرو مردے کو رکھے رہنے سے تکلیف ہوتا ہے لا" اور اس کا یہ داؤ چل جاتا لوگ اپنا غم بھول کر مردے کی اذیت کا خیال کرنے لگتے اور پھر جلد سے جلد زمین کے تاریک سینے میں اُسے اتار دیتے۔ عظمت علی نے ہزاروں بیٹوں اور بھائیوں کا دل دہلا دیا تھا۔ کتنی ماؤں کے بچوں کو ان کے دل سوز بین کے باوجود زمین میں دفن کر دیا تھا اور ہر موقعہ پر اس کا چہرہ جذبات سے عاری رہا تھا۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

عظمت علی کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں قریب کے ایک گاؤں میں رہتی تھی جس کو دیکھنے کے لئے سال یا دو سال میں وہ ایک دو روز کی چھٹی لیکر جاتا۔ اور اس کا یہ جانا در اصل رسم کا نبھانا سا تھا۔ بس یونہی۔ اور پھر بھی کبھی کبھار گاؤں جانے والا عظمت علی۔ گاؤں گیا اور اس نے تین دن کی چھٹی لی۔ اور اس کی شادی ہو گئی۔ جیسا وہ خود سیاہ فام تھا اس کی دلہن بھی ایسی ہی سیاہ فام آئی اسی کی طرح صحت مند اور چلبلی اس کا نام کلثوم تھا۔ شادی کے تین

مہینے کے اندر ہی عظمت علی نے پھر چھٹی لی اور گاؤں چلا گیا۔ اور
مہینے بعد اس نے پھر گاؤں جانے کے لئے چھٹی لی اب گاؤں جانے
خاص خوشی محسوس ہوتی۔ گھر سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی
سال ختم ہونے سے قبل ہی کلثوم کے ایک لڑکا ہوا۔
عظمت علی کو پہنچی تو خون اس کی رگوں میں ناچنے لگا۔ وہ خوش
آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بچے کو دیکھا۔ مسرت اور
اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے ننھے سے گوشت کے
اپنے بازؤں میں بھینچ لیا جو چُپر چُپر کر رہا تھا اور ننھے ننھے ہاتھ
اس کا بیٹا ——— اس کے پندرہ روز بعد پھر عظمت
اب اس کی آمد کا وقفہ مختصر سے مختصر تر ہوتا جا رہا تھا۔ بچے کا نا
رکھا گیا۔

اپنی پہلی سالگرہ پر جب لال میاں نے "اب۔ با" کہا تو عظ
کو بہت اچھا ہوا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ وہ تعجب کر رہا
میاں۔ اتنا سا لال میاں صرف ایک سال کا میاں کیسے بول سکتا
تعجب! حیرت! اس نے تقریباً گاؤں کے ہر آدمی سے اپنے بچے کی
ذہانت کا ذکر کیا اور کئی آدمیوں کو گھر پر بھی تماشہ دکھانے کے لئے
عظمت علی کو شہر میں رہنا کچھ بار سا محسوس ہوا۔ اس کے بار بار گا
اس کی آمدنی پر اچھا خاصا اثر پڑ رہا تھا۔ اور اب تو اسے زیادہ
ضرورت تھی پھر اسے اس کے لئے لال میاں کی جدائی بھی ناقابل برداشت
اب عظمت نے شہر میں مکان کی تلاش شروع کر دی مگر
مکان کا ملنا عقدہ لا ینحل تھا اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ یہیں
کے کونے پر ایک جھونپڑا سا ڈال کر رہنا شروع کر دے۔ اور اس نے
ایک کونہ تلاش کر لیا اور اس پر ٹین کا سائبان ڈال لیا۔ اب وہ خو
کہ اس طرح وہ روز لال میاں کو دیکھ سکے گا۔ لال میاں جلب کا

ہو گیا تھا۔ پورے تین سال کا۔ اب وہ اپنے ماں باپ سے توتلی زبان میں خوب باتیں کر سکتا تھا۔

ٹین کا سامان وغیرہ ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد عظمت علی چھٹی لیکر گاؤں میں آیا۔ گھر میں گھستے ہی اسے معلوم ہوا کہ لال میاں گزشتہ دو روز سے بیمار ہے اور بار بار اس کو یاد کر رہا ہے۔ عظمت علی کو دیکھتے ہی لال میاں کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گلے میں حمائل کر دیئے اور شکایت آمیز لہجہ میں کہنے لگا: "ابا جی اب ہمالے پاچھ سے مت جانا" (ابا اب ہمارے پاس سے مت جانا)

عظمت علی نے اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے کہا: "ننھے میاں ننھے! اب ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ ہاں میرا بیٹا۔" یہ کہکر اس نے اس کو اور زیادہ بھینچ لیا اور لال میاں کا چہرہ بھی خوشی سے چمک اٹھا۔

مگر بچے کا بخار دوسرے روز بھی نہیں اترا۔ شاید اسے ہوا لگ گئی تھی اس کا سینہ سردی سے جکڑا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں کے وید جی کا بتایا ہوا جوشاندہ لیسے پلایا گیا تھا مگر جب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو وید جی نے رائی کا پلستر اس کے سینے پر چڑھانے کو کہا۔ مگر لال میاں کا بخار بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ نحیف و لاغر ہوتا گیا۔ اس کا چہرہ بالکل سُست گیا اور اسکے لبوں پر کھیلنے والی معصوم مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔

بچے کی یہ حالت دیکھکر عظمت علی بے انتہا پریشان ہو گیا۔ اس سے پہلے اس قسم کی مشکلات سے اسے کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ گاؤں کے وید جی مختلف دوائیں بدلتے رہے مگر سب بے سود۔

پانچویں دن لال میاں کی حالت اور بگڑ گئی اس کو سانس لینے میں بھی دقت ہونے لگی۔ وہ بار بار سانس کے لئے منہ کھولتا اور بند کرتا اور اسکے سینے میں عجیب خرخراہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی۔ عظمت اس کی یہ حالت دیکھکر بوکھلا گیا۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ گاؤں کے چودھری نے اسے مشورہ دیا کہ وہ شہر جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا لائے۔ چونکہ چودھری کے نزدیک اب لال میاں کی حالت بہت نازک تھی۔ چودھری سے ضرور کوئی استفسار کئے عظمت فوراً شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر گاؤں سے تقریباً ستر میل کے فاصلے پر تھا اور بسوں سے آنا جانا پڑتا تھا جو تین تین گھنٹے کے وقفہ سے روانہ ہوتی تھیں۔

جب عظمت ڈاکٹر کو لیکر بس سے اترا اس وقت سہ پہر کا وقت تھا۔ بس اسٹاپ سے گاؤں خاصہ دور تھا عظمت جلد سے جلد ڈاکٹر کو لیکر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی مرضی ڈاکٹر پر نہیں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ اگر تنہا ہوتا تو اس وقت بھاگ کر دو منٹ میں گھر پہنچ گیا ہوتا مگر ڈاکٹر کو وہ کیسے چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ جیسے جیسے وہ گھر کے قریب آتے گئے عظمت کا دل بُری طرح ڈوبنے لگا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ تھا لال میاں اس کے تصور میں لال میاں اپنی چارپائی پر پڑا ہوا سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا اور سینے سے خرخراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ اس نے سوچا اس برگد کے گھنے پیڑ سے مڑنے کے بعد گاؤں کے کچے مکانات نظر آنے لگیں گے۔ اس کا گاؤں۔ اور پھر درخت سے ٹھیک بائیں طرف اس کا مکان۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا تیز چلئے۔ بس وہ رہا میرا مکان" اور یہ کہکر عظمت نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی۔ گھر کے باہر کے احاطہ میں پہنچکر عظمت کو سکتہ سا ہو گیا مکان سے رونے اور آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مکان میں آدمیوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی جس میں مرد، عورتیں بچے سبھی شامل تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی بوڑھی ماں باہر نکل آئی۔ عظمت کے اندوہناک چہرے کو دیکھتے ہی اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور اپنے چہرے کو دوپٹہ میں چھپا لیا۔ عظمت کی آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ جیسے کسی نے اس کی طاقت سلب کر لی ہو۔ وہ سکتے کے عالم میں احاطے کے چھپر کا بانس پکڑے ہوئے کھڑا رہا گاؤں کے لوگ اس کے گھر اکٹھے ہو گئے تھے۔ گاؤں کا بوڑھا چودھری اس کا اپنا چچا جو اس سے لگے مکان میں رہتا تھا اور دوسرے بزرگ اور رشتہ دار۔ اندر مکان میں عورتیں زور زور سے بین کر رہی تھیں۔ ایک محشر سا بپا تھا مگر عظمت بالکل اسی طرح خاموش و مبہوت کھڑا تھا۔ اس کے لب ساکت تھے اور آنکھیں خشک ان میں آنسوؤں کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ اس کے ایک رشتہ دار بزرگ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "عظمت۔ چلو۔ اب کفن دفن کی فکر کرو تمہارا بچہ خدا کی امانت تھا اب اس نے وہ امانت واپس لے لی۔ خدا تمہارا جوڑا سلامت رکھے وہ تمہیں اور بیٹا عطا کرے گا۔"

مگر عظمت کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اسے ہر چیز لرزتی اور کانپتی ی نظر آ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سوچنے اور سوس کرنے کی ہر قوت سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ تمام میّت کو نہلانے اور نا۔ کے انتظامات پڑوسیوں نے انجام دیتے۔ کفن کے لئے کورا لٹھا، لوبا اگر کی بتیوں کا سب انتظام انھوں نے ہی کیا۔ اس کے پڑوس میں بڑی جد کے قبرستان میں دفن کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ قبرستان اس کے گھر سے ڈے ہی فاصلہ پر تھا۔ ابھی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ میّت تیار تھی۔ ن کا چودھری چلّایا ”ارے بابا جلدی کرو۔ مردے کو رکھے رہنے سے تکلیف تی ہے“ یہ الفاظ پگھلے ہوتے سیسے کی مانند عظمت کے کانوں سے تے اس نے لال میاں کی میت کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سے سینے کے ساتھ لگا کر وہ آہستہ آہستہ چل پڑا۔ حقیقتاً اسے کچھ پتہ نہیں رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ سوگوار جلوس آہستہ آہستہ بڑی مسجد کے قبرستان کی طرف چلتا رہا قبرستان میں قبر تیار تھی۔ اس کے دوا طرف تازہ مٹی کا ڈھیر تھا۔ زمین کے تاریک اور گہرے سینے کو دیکھ کر عظمت علی کے قدم لڑکھڑا گئے۔ کیا وہ لال میاں کو اس گہرے اور تاریک غار میں پھینک دیگا؟ کیا لال میاں سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا؟

اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان سا امنڈ رہا تھا۔ وہ ایسے اندوہناک منظر کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ اپنے لال میاں کو منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے کیسے دبا دے۔ اس کی سسکیاں اس کے سینے کے کواڑوں کو توڑنے لگیں۔ وہ رونے لگا۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یکایک عظمت زور سے چیخ مار کر اپنے چچا کے قریب اوندھے منہ گر پڑا۔ وہ زمین پر گرتے ہوتے چلّایا ”چچا یہ کام تم ہی ختم کر دو۔ میں اس کو قبر میں نہیں اتار سکوں گا“

ساقی جاوید ●

عبدوں میں خانقاہوں میں صنم خانوں میں آج
رمریں محلوں میں نورانی شبستانوں میں آگ
گمگاتے ہیکلوں میں اور ایوانوں میں آگ

نجم و مہ کے دامنوں میں بجلیاں پلتی ہیں آج
کیسی کیسی محفلیں اُف آگ میں جلتی ہیں آج

دھواں دیتے زمانے، یہ دھڑکتے ماہ وسال
لیساؤں کی تابش، یہ کنشتوں کا جمال
گے سلگنے سے تصور، دہکنے سے خیال

بربطِ ہستی پہ روح و برق و آتش نغمہ زن
میتِ شام و سحر پر سُرخ شعلوں کا کفن

زارِ زندگی پر کارواں جلتے ہوئے
نکڑوں ماتھے ہزاروں آستاں جلتے ہوئے
د عیسےٰؑ کی عظمت کے نشاں جلتے ہوئے

شام کے آنچل میں شعلے صبح کے دامن میں آگ
سُرخ ہر جادے کا نغمہ، سُرخ ہر منزل کا راگ

طغرل و سنجر کا خطِ رہگزر پڑھتی ہوئی
نطشہ و ہیگل کے فکر و ذہن پر چھڑھتی ہوئی
دانش و ادراک کے ہر موڑ پر بڑھتی ہوئی

معبدوں میں آگئی، دانشکدوں میں آگئی
آگ ایمان و ادب کی سرحدوں میں آگئی

سرخ نبضِ چنگ و بربط سرخ خطِ رطل و جام
سرخ صہبا کی سیاست سرخ نغموں کا نظام
سرخ معبد کا سویرا، سرخ میخانے کی شام

دہر کا آتشکدہ رہ رہ کے جلتا ہے ابھی
وقت کے سینے میں اک لاوا پگھلتا ہے ابھی

احترامِ جبرئیلؑ و حرمتِ آدم کی خیر
نزہتِ صبحِ بہار و تابشِ شبنم کی خیر
خیر اے ناموسِ فطرت عصمتِ مریم کی خیر

سرخ شعلے ساتھ ہیں جلتے شرارے ساتھ ہیں
خرمنِ عفت کے بھوکے برق پارے ساتھ ہیں

چین کی ڈھلتی ہوئی دیوار سے اٹھتی ہے آگ
نیل کی وادی میں ہر مینار سے اٹھتی ہے آگ
آج ہر فنکار کے شہکار سے اٹھتی ہے آگ

مصر بھی ہے آگ کی زد میں سوادِ شام بھی
وہ بھڑک اٹھے جدید ایواں، قدیم اہرام بھی

بشکریہ الحمل

اسرار احمد سہاوری •

ترقی پسندوں کا اسلامی اور غیر اسلامی ادب

کسی زمانے میں ترقی پسندی اور اشتراکیت ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اب کچھ ترقی پسند ادیبوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے کہ

"ہم سیاسی طور پر اشتراکی نہیں"۔

لیکن ان کی اشتراکی ذہنیت اس دعوے سے بہت کم بدلی ہے۔ اکثریت اب بھی ایسے ہی لوگوں کی ہے جو علی الاعلان خود کو اشتراکی کہتے ہیں بعض نے مصلحتاً بظاہر اس چولے کو بدل لیا ہے، خال خال ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنھوں نے واقعی اشتراکیت اور اس کے پرچار کو سیاسی حیثیت سے ترک کر دیا ہے۔ ہم اس مضمون میں ان حضرات کا وہ ادب آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جس میں انھوں نے نہایت دیدہ دلیری سے مذہب اور خدا کا مذاق اڑایا ہے اور مذہب کی پیدا کردہ اخلاقی قدروں کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ ادب بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر مذہبی نقطہ نظر سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور اس کو جائز اور مفید ادب کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند ادب میں جائز ادب کی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اتنا وزن ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اچھی چیز ہمیں جس جگہ بھی ملے، اٹھا لینی چاہیئے۔ اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ترقی پسند ادب اپنے وسیع ترین معنی میں وہ ادب ہے جس نے زندگی کی پرانی قدروں سے بغاوت کر کے معاشرے میں نئی قدریں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اور اگر چند پرانی قدروں کو باقی بھی رکھا تو ان کی صورت تقریباً بالکل بدل ڈالی۔ زندگی کی پرانی قدروں پر سب سے بڑی چوٹ یورپ کے صنعتی انقلاب سے پڑی۔ اس صنعتی انقلاب نے زندگی کے ہر گوشہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ سائنس نے نئی نئی چیزیں ایجاد اور معلوم کیں۔ ضروریات زندگی میں تبدیلی ہوئی۔ لوگوں نے نئے نئے ڈھنگ پر سوچنا شروع کیا۔ تخیلات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا چلا گیا۔

صنعتی انقلاب کا ایک بڑا ردِ عمل یہ ہوا کہ ایک زبردست سرمایہ داروں کا پیدا ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ ایک کمزور گروہ مزدو[ر] وجود میں آیا۔ ان دونوں طبقوں میں فطرتی طور پر زبردست کشمکش ہو گئی، دوسری طرف سائنس کی معلومات کو پادریوں نے خوف و[...] کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے اپنی فوقیت اور برتری کے طلسم کو ٹوٹتے تو سرے سے سائنس اور اسکی ایجادات کے دشمن ہو گئے۔

چنانچہ اس لحاظ سے بھی لوگوں کے دو طبقے پیدا ہو گئے۔ [...] طبقہ پادریوں کا طرفدار ہو گیا۔ دوسرا سائنسدانوں اور موجدوں [...] ان دونوں طبقوں میں بھی زندگی اور موت کی کشمکش پیدا ہو گئی۔ [...] نزاع کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ غلط طریقے سے پادریوں کی دشمنی کو مذ[ہب] کی دشمنی سمجھنے لگے۔ اور اب محاذ مذہب اور سائنس کے درمیان ہو گیا۔ حالانکہ درحقیقت ایجادات اور دنیاوی ترقی کا نہ کوئی مذ[ہب] دشمن ہے نہ ہو سکتا ہے۔ یہ محض غلط اندازِ فکر تھا جس نے مذ[ہب] اور سائنس کے درمیان یہ صورتِ حال پیدا کر دی اور یہ صورت حا[ل] اب تک غلط طریقے سے جاری ہے۔ لوگ مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں۔ اس کشمکش کا ایک طویل مدت کا یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا کے دو ملکوں سے مذہب کو دیس نکالا دیدیا گیا سرمایہ داروں کے طبقہ کا بھی نام مٹا دیا گیا۔ گو بہت سے سرمایہ دا[روں] کو ختم کر کے اب حکومت نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اب اس کے [...] عوام کا خون چوس رہے ہیں۔ اور عوام اب بھی وہیں ہیں جہاں کہ [...] سے پہلے تھے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک حکومت برسر اقتدا[ر] آگئی اور زاریت کا کلیتاً استیصال کر دیا گیا۔ اسی زمانے سے اشتراکیت

دوسرے ممالک میں بھی قدم جمانے شروع کر دیئے۔ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے ادب اور اس کے نظریات پر بھی اثر ڈالنا شروع کیا

سنہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستان کے چند پڑھے لکھے لوگوں نے ملکر ایک اجلاس کیا اور اس اجلاس میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی اور اسی جگہ بیٹھکر ان لوگوں نے اس نئی انجمن کا منشور بھی تیار کیا۔ یہ منشور پوری طرح زندگی میں مارکس کے مادی نقطۂ نظر کا علمبردار تھا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین نے پہلی مرتبہ لکھنؤ میں ہندگیر اجلاس کیا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے منشی پریم چند کو چنا گیا۔ یہ ہندوستان میں پہلی نیم سیاسی اور نیم ادبی جماعت تھی۔ اس تحریک سے پہلے بھی ہندوستان کے ادیب یورپ کے ادب کو پڑھکر اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوکر ملک کے غریب طبقے سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے اس باقاعدہ انجمن کو دیکھکر نہایت تیزی سے اسکی تنظیم میں شامل ہو گئے۔ اس انجمن میں اس وقت تک سیاست پر ادب حاوی تھا۔ اور اسی وجہ سے اس میں منشی پریم چند، جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق، ملک احمد علی، رشید جہاں، راج نند، سجاد ظہیر وغیرہ شامل ہو گئے۔ یہ دور دنیا میں ایک معاشی بحران کا دور تھا۔ جنگ کی عالمگیر تباہ کاریاں لوگوں کو پریشان کر رہی تھیں۔ ہندوستان میں نیچے طبقے کے لوگوں کی زندگی وبال ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی کا میسر آنا مشکل تھا۔ پڑھے لکھے طبقہ کو معاشرے کی خرابیوں کا نہایت شدید احساس تھا۔ ان حالات کا بعد میں یہ نتیجہ ہوا کہ ترقی پسند ادیبوں میں سے اکثر نے اشتراکیت کو باقاعدہ زندگی کے ایک نظریہ کی حیثیت سے اپنا لیا اور ایسے لوگ ادیب کم اور سیاست دان زیادہ ہو گئے۔ جواہر لال نہرو نے اس تحریک کو آزادی حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔

ترقی پسند ادیبوں کی سالانہ کل ہند کانفرنس ہوتی رہی، اور وہ اپنے نصب العین کا تھوڑی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اعلان کرتے رہے۔ پانچویں کانفرنس کے اعلان نامہ میں اس قسم کی عبارت موجود ہے

"سوویٹ یونین کے اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جا چکی ہے۔ وہاں جمہوریت پسند ادیبوں کو پوری آزادی حاصل ہے اور سوویٹ یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

اس طرح ترقی پسند ادیب اشتراکیت کی گود میں جا پڑے، اور آہستہ آہستہ ترقی پسندی اور اشتراکیت مترادف الفاظ ہو کر رہ گئے۔ ان ادیبوں نے مذہب کا، خدا کا اور اخلاقی اقدار کا دل کھولکر مذاق اڑایا۔

اب چند ترقی پسند ادیبوں کی کاوشوں کے تھوڑے سے نمونے بھی آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تاکہ دعویٰ بغیر دلیل کے نہ رہے بنگال کے مشہور انقلابی شاعر نذر الاسلام صاحب فرماتے ہیں :-

"تم اپنی پیٹھ پر خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لاد دو
پھرو۔ قرآن، پران، انجیل، وید، تمہارا جی چاہے
تو انھیں گھول کر پی جاؤ۔ لیکن یہ تو کہو کہ اس دردِ سر سے
تمہارا مُدعا کیا ہے؟ قرآن، وید، انجیل کو یہ کم بخت
چوم چوم کر مرے جاتے ہیں۔ یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش
کرتے ہیں۔ کوئی انھیں بتلائے کہ انسان کتابیں بناتا
ہے، کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں"

اسی طرح جوش ملیح آبادی خدا اور شاہ کو معزول کر دینے کی تجویز اس طرح پیش کرتے ہیں :- ؎

کر بھی دے معزول ان اربابِ عز و جاہ کو
آسمانوں سے خدا کو اور زمین سے شاہ کو

ن۔م راشد صاحب اپنی ایک آزاد نظم میں اپنی آزاد محبوبہ سے اس طرح خطاب فرماتے ہیں :-

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاق کا مارا ہوا مُلّائے حزیں!

زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں

اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیاں میں ہے
تو مسرت ہے، تو بیداری ہے
تو مجھے آغوش میں لے"

خداوند تعالیٰ کے متعلق ان لوگوں نے جو جو گستاخیاں روا رکھی ہیں، ان تمام کا بیان مشکل ہے۔ بہرحال آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ خدا کے متعلق یہ کس قسم کے خیالات کی پرورش کرتے ہیں۔

شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام[1] کی ایک نظم "نعرۂ انقلاب" کے چند جملوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں"
"کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ ثابت نہیں کر سکتا"
"اس نے اپنی رُوح اگر ثواب کے حوالے کی تو جسم گناہ کے سپرد کیا"
"یہ دنیا سیاہ خانہ ہے۔ جہاں مذہب کی بیچ پر ثواب کا خیالی بادبان پڑا ہے"
"نطفہ تحقیق ہو یا ناتحقیق، وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے، اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ہے تو شہوت پرست باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی ٹھہرایا جائیگا"

قاضی نذر الاسلام صاحب اپنی نظم "باغی" میں فرماتے ہیں:-

"میں سرکش، سنگدل اور آتش زباں ہوں"
"ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں، لاابالی ہوں، اصول شکن ہوں"
"قانون، قاعدوں اور پابندیوں کو پیر کے نیچے روندڈالتا ہوں"
"سماج کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں"
"جو دل میں آتا ہے کرتا ہوں، غارت گر ہوں"
"میں فانی ہوں، میں باقی ہوں، میں ازلی ہوں میں ابدی ہوں"
"میں وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہے"
"میں خدا ہوں، میں دیوانگی ہوں، وحشت ہوں"

نظم کے اس ٹکڑے سے آپ کو ترقی پسندوں کے اخلاقی معیار اور اخلاقی اقدار کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی نظم میں قاضی صاحب دیوانگی و وحشت کا ترانہ گاتے ہوئے حسن و عشق کے گلزار میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشاں کا جوڑا ہوں، ترچھی آنکھوں کا تیر ہوں"
"کسی حسینہ کا اولین بوسہ ہوں"
"دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں"
"جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہو اس کے دامن کا نچوڑ ہوں۔"

آپ نے اس نظم میں توازن اور ہم آہنگی ملاحظہ فرمائی۔ کہاں تو نذر صاحب کا باغی۔ غارت گر ہے۔ خدا ہے۔ دیوانگی ہے۔ وحشت ہے اور کہاں پھر بوسہ۔ تھرتھری۔ سہمی ہوئی نگاہ۔ جوانی کے دامن کا نچوڑ۔ اور خدا جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ اور دامن کے نچوڑ کے تو معنی بھی سمجھنا مشکل ہیں۔ شاعر خود ہی خوب جانتا ہوگا کہ اس سے اس نے کیا مطلب لیا ہے

قاضی صاحب اپنی ایک نظم "گناہ" میں فرماتے ہیں:-

"میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔ سب گنہگار میرے ہی بھائی بہن ہیں۔

اور میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے تیرتے پاپیوں کا سردار ہوں۔

یہ تو بستی ہی پاپیوں کی ہے۔

مادر گیتی کا حسن سدا بہار ہے اور اس پر کسی جبار و قہار کا حکم نہیں چلتا۔

بلکہ اس پر محبت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرمانروائی کرتا ہے"

احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی ایک نظم "ردِ عمل" میں مشیت کو اس طرح للکارتے ہیں: ؎

اب میرا جہاں حسن و جوانی کا جہاں ہے
مقصد میرا اب خواجگی کون و مکاں ہے
اے جبرِ مشیت تیرا قانون کہاں ہے!

---

[1] یہ وہی نذر الاسلام ہیں جنکو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں لایا جا رہا ہے اور جنکے نام سے اس پاکستان میں انجمنیں قائم ہیں جو صرف اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ (م۔ق)

خالق کون و مکاں نے انسان کی کم ظرفی کا کس قدر صحیح تجزیہ کیا ہے کہ ذرا آسائش میں ہو تو مغرور ہو کر خدا کو بھلا دیتا ہے اور ذرا سی تکلیف پڑ جاتے تو بے صبر ہو کر گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔ ندیم صاحب ذرا دیر کے لئے حسن و جوانی کا جہاں دیکھتے ہی کیسے آپے سے باہر ہو گئے کہ مشیت کو للکارنے لگے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

ایک دوسرے ترقی پسند شاعر سلام مچھلی شہری اپنی نظم "پلکوں کی چھاؤں" میں فرماتے ہیں ؎

اور جو رات کو لے کر یہی مدہم سا چراغ   دیکھتی رہتی ہو غمناک نگاہوں سے مجھے
میری ہر سرد خموشی پہ بظاہر ہنس کر   بھینچ لیتی ہو جو اکثر انہی باہوں میں مجھے

ساحر صاحب لدھیانوی اپنے ایک شعر میں عقائد کو "وہم" اور مذہب کو "خیال خام" قرار دیتے ہیں ؎

عقائد وہم ہیں۔ مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

اپنی ایک نظم "چکلے" میں اس طرح گوہر افشانی فرماتے ہیں ؎

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ   یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ   ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

"طلوعِ نو" میں آپ گویا جامے سے باہر ہو گئے ہیں ؎

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر   پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب   مذہب کے اہتمام فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو   دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

علی سردار جعفری "سرمایہ دار لڑکیاں" میں فرماتے ہیں ؎

اہرمن تو اہرمن ہو جاتے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار

اشتراکی میں ہم مشربوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں ؎

برہمن تجھ کو سمجھتا ہے نجس   مولوی کے لئے کافر تو ہے
توڑ دے جھوٹے عقائد کا طلسم   صبح صادق کا پیمبر تو ہے

"ترقی پسند مصنفین" میں فرماتے ہیں ؎

ہم دیر و کلیسا کی بجھا دیں قندیل   ہر طرف مشرق و مغرب میں اجالا کر دیں
ایسا خاکہ بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں   کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں

دے کے احساس نیا ہند کے بیداروں کو   حسنِ یوسف کو چراغِ تہ داماں کر دیں
کھول دیں سب کے لئے قفل درِ میخانہ   حضرتِ جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

یہ تصویر کا تاریک رخ تھا۔ اب میں چند ترقی پسند حضرات کے کچھ وہ اشعار آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں جن کو ہم جائز ادب میں شمار کر سکتے ہیں، جن پر اسلام کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے اور جو فنی اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

فیض احمد فیض کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا   تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے   دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو   مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

ایک اور غزل میں فیض کے تیور ملاحظہ ہوں۔ یہ غزل قید خانے میں لکھی گئی ہے ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے   جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

قتیل شفائی صاحب فرماتے ہیں ؎

کانٹا ہے وہ کہ جس نے چمن کو لہو دیا   خونِ بہار جس نے پیا ہے وہ پھول ہے
لٹ کر سمجھ رہے ہیں کہ نادم ہیں رہزن   کتنی حسین اہلِ مروت کی بھول ہے

علی سردار جعفری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا   اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

اپنی ایک نظم "متاعِ ہنر" میں کہا ہے ؎

طلوعِ مہرِ درخشاں نمودِ صبحِ بہار   شفق کا رنگ جبینِ سحر کی تابانی
متاعِ ذوقِ نظارہ گراں نہیں لیکن   گراں ہے مجھ کو متاعِ ہنر کی ارزانی

"جوانی" میں فرماتے ہیں ؎

مرے نعروں میں پوشیدہ جلالِ جوشِ طوفانی   مری آہوں میں بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی
مری افسردہ نظروں میں نہاں دنیا کی قیمت ہے   مری چینِ جبیں پر نقشِ تاریخِ حقیقت ہے
مرے زخموں میں صد ہا زندگی کے آشیانوں کی   مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی

جوش ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ نظر سے گزرا تو تعجب ہوا کہ اس قدر اچھے قسم کا مسلمان آگے جا کر بے دین۔ دہریہ اور اشتراکی کیونکر ہو گیا۔ ان کا پہلا مجموعہ روحِ ادب

حمد، نعت اور سنجیدہ قسم کی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ آج اس مجموعہ کو دیکھ کر کوئی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کلام جوش ملیح آبادی کا ہو سکتا ہے۔ نمونہ کے لئے صرف ایک نظم پیش کروں گا ؎

بے تعلق ہوں دین و دنیا سے　　حُبِ ثروت نہ فکرِ جنت ہے
نہ مجھے شوقِ صبحِ آسائش　　نہ مجھے ذوقِ شامِ عشرت ہے
نہ تو حور و قصور پہ مائل　　اور نہ ساقی و مے سے رغبت ہے
نہ تقاضائے منصب و جاگیر　　نہ تمنائے شان و شوکت ہے
کچھ مجھے تیرے در سے مل جائے　　کس منافق کو اس کی حسرت ہے
کیا کروں گا میں نعمتیں لیکر　　میری ہر سانس ایک نعمت ہے
تجھ پہ روشن ہے اے مرے مولا　　کہ میرے دل میں سوز وحدت ہے
تیرے انعام کی نہیں خواہش
بلکہ مجھ کو تیری ضرورت ہے

ایک اور نظم "فرائض" اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے ؎

تجھ کو اے دل خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے
آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے
آسماں نے کی ہیں دوہری خدمتیں تیرے سپرد
چونکنا بھی ہے۔ تجھے دنیا کو چونکانا بھی ہے
صرف سننا ہی نہیں تجھ کو پیامِ زندگی
بلکہ اس پیغام کو دنیا میں پھیلانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
تجھ کو اس ظلمت کدے میں نور برسانا بھی ہے
تاب کے دیکھے گا خود ہی جوہرِ تیغِ اجل
اٹھ کہ اب اس تیغ کے جوہر کو موانا بھی ہے
موت سے بڑھکر نہیں کوئی نگہبانِ حیات
تجھ کو یہ نکتہ سمجھنا بھی ہے سمجھانا بھی ہے
اے دلِ ناعاقبت اندیش تا کے یہ خمار
بزم میں ساقی بھی ہے موجود مینا بھی ہے

اب احمد ندیم قاسمی صاحب کا کچھ جائزہ قسم کا ادب ملاحظہ ہو۔ بارگاہِ نیاز میں فرماتے ہیں ؎

جھکتے ہیں سرکشوں کے شب و روز جہاں　　رہتا ہے حسنِ فلاد ازل جلوہ گر جہاں
جن کے قدم جرس کی صدا پر نہ اٹھ سکے　　کرتے ہیں پل میں کون و مکاں کا سفر
اک ایک پل ہے زندگی جاوداں ندیم　　پاتا ہوں عمرِ خضر کو بھی مختصر یہاں

"گناہ بے گناہی" میں یوں شاد ہوتا ہے ؎

لہو ٹپکا کے گرد آلود اور آوارہ تنکوں پر　　زمیں کے چپہ چپہ کو گلستاں کر دیا میں نے
قدم بوسی پہ جن بدبخت ذروں کا مقدر تھی　　جلا دیکر انہیں مہرِ درخشاں کر دیا میں نے
جلا کر شمعِ احساس و تفکر خانۂ دل میں　　اندھیرے رہگزارِ دل پہ چراغاں کر دیا

"بے قراریوں" کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے خوب ہیں ؎

دل میں جب بیکلی نہیں رہتی　　زندگی زندگی نہیں رہتی
زندگی شاہراہِ پُر خم ہے　　زندگی اضطرابِ پیہم ہے
رعشۂ برق ہے حیات اپنی　　بے مقامی ہے کائنات اپنی

ندیم صاحب نے "تذبذب" میں چند معرفت کے اشعار کہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خوب کہے ہیں۔ احساس کی شدت عبارت کی روانی۔ الفاظ کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کسی کو مل نہ سکی بارگاہِ ناز تیری　　مگر ازل سے اسی کی تلاش جاری ہے
میرے خیال میں پرتو ہے تیرے جلوے کا　　وہ ایک خمار سا جو آگہی پہ طاری ہے
فقیہہ شہر کا اصرار ہے کہ یہ ہستی　　فقط فسردہ خیالی کی سحر کاری ہے
میری نگاہ میں لیکن وہ کانِ عرفاں بھی ہے
مگر بدستِ سہی روشنی سے عاری ہے
ڈر نجوم میں تو ہے تو چاند میں ہر کرن　　تیرے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی
ازل، ابد کا تصور، فقط تصور ہے　　تیرے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی
حرم میں تُو ہے تو آتش کدے میں ہر کرن　　کہ ایک ذات نور و نیم ہو نہیں سکتی
جو قوتیں ہوں تیری منتشر تو سچ کہہ دوں
کہ اس جہاں کی تنظیم ہو نہیں سکتی

ندیم صاحب اپنے ایک فلسفی دوست سے کیا خوب فرماتے ہیں ؎

نبضِ ادراک کہاں ڈوب چلی　　جب نظر آئے مقاماتِ جمال
فکرِ ماضی میں رہوں کیوں مغموم　　اب نگاہوں میں ہے مستقبلِ حال
عشق نے دل کو حرارت بخشی　　عقل جینے کو سمجھتی ہے وبال
زندگی خواب ہوئی جاتی ہے　　آفریں! شعبدہ بازیٔ خیال

زاتِ من و تُو کیا ہیں فقط اوہام کے پھیلے ہوئے جال
تھقہہ بن جاتا ہے ذوق و وجدان ہوں جب شاملِ حال

قطعے ملاحظہ ہوں ؎

یہ میری آرزو کا پرتو ہے میرے اوہام کا غبار نہیں
یہ وہی لَو ہے شمعِ ہستی کی جس کی تقدیر میں مزار نہیں

ں تھکن سے نڈھال ہوں لیکن کیوں ادھورا رہے سفر میرا
کروں گا میں اعترافِ شکست موت جب تھام لے گی سر میرا

سہارا" ملاحظہ ہو ؎

ن خام ہی آرزوئے منزل دوست فریبِ رنگ سہی پرتوِ جمالِ حبیب
ب ایک سہارا تو ہے مسافر کا سفر دراز سہی وہ تو ہو رہے ہیں قریب
زم خواب سہی خواب کا وجود تو ہے غمِ حیات کے دم سے ہم حیات ملا
پنی موت کو بھی زندگی بنالے گا اگر ندیم کو مر کر حریمِ ذات ملا

احساسِ غلامی" میں سلاست روانی ملاحظہ ہو ؎

میں مل گئی میری فرخندہ اختری وہ خاک پہ پڑا ہے میرا تاجِ سروری
موجِ تندو تیز بہا لے گئی مجھے کام آسکا نہ وقت پہ فنِ شناوری
اس درد، عشق فسردہ، زباں تنگ کیا ڈھونڈتی ہے مجھ میں نگاہِ ہنروری
مائلِ بزوال ہے ہر فنِ دلپذیر الفاظ کی تراش کمالِ سخنوری
دوں کے نقشِ پا پہ جبیں سجدہ ریز ہے بھولا ہوا ہوں میں روشِ بندہ پروری

ر فردا" میں ندیم صاحب کا عزم ملاحظہ ہو ؎

ں آرزوئے چشمۂ حیواں نہ کرونگا مرجاؤں گا پہ حسرتِ داماں نہ کروں گا
یری رضا میرے لئے عینِ خوشی ہو اب شکوۂ غمہائے فراواں نہ کروں گا
ہ میرے نااہل کے آگے نہ جھکیں گے برباد کبھی دولتِ عرفاں نہ کرونگا
بنسِ گرانمایہ ہے غیرت کا دفینہ غیرت کو کبھی سر بگریباں نہ کروں گا
دار نہیں راز ہیں یہ ارض و سما کے دولت کے لئے شعر کو ارزاں نہ کرونگا

ں ترقی پسندوں میں ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کا معیار بلند ہے۔
سُرخ سویرے" کا پروپیگنڈا نہ ڈھنڈورا نہیں کرتے جنسی بھوک کی حکایت
وقت ان کا مشغلہ نہیں۔ طرزِ کلام سنجیدہ ہے۔ احساس کی شدت الفاظ
انتخاب۔ تراکیب کی ہم آہنگی۔ عبارت میں ترنم بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان
کے کلام میں تاثیر ہے۔ درد ہے اور خلوص ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

ایک غزل میں عبارت کا ترنم، سلاست اور روانی قابلِ داد ہے ؎

حُسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز عشق منت کشِ فسونِ نیاز!
دل کا ہر تار لرزشِ پیہم جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
سوزشِ دردِ دل کسے معلوم کون جانے کسی کے عشق کا راز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے میرے نالوں کی گمشدہ آواز
تو ہے اور اک تغافلِ پیہم میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیِ امید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

ایک سرود میں فرماتے ہیں ؎

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا
ناخدا دُور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہہ خواب سہی گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا
ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

فیض احمد فیضؔ کے قید خانے میں کہے ہوئے کلام میں درد اور تاثیر دوبالا
ہوگئی ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھدی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

"صبحِ آزادی" انقلاب کی ناکامی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کدھر سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

قتیل شفائی کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

خیال و خواب سے چل کر شعور تک پہنچے تری تلاش میں ہم دُور دُور تک پہنچے

مذاقِ اہلِ نظر سے نہ کوئی کھیل سکا | پہنچنے والے عتابِ رخِ صنم تک پہنچے
اگر خلوص بھی شامل ہو رقصِ بسمل میں | تو بے بسی کا فسانہ غرورِ ناز تک پہنچے
توہمات کی شبنم میں آپ غلطاں تھے | ہم آج بن کے خرد کی جنوں تک پہنچے
مزاج دیدہ و دل میں کچھ اختلاف سا ہے | دگرنہ تلخی غم بھی سرور تک پہنچے
قتیل اس کی مروت کا کیا ٹھکانہ ہے | وہ اک نظر جو دلِ ناصبور تک پہنچے

ایک اور نظم ملاحظہ ہو ؎

ضمیرِ لالہ و گل کی پکار بن کے اٹھو | اٹھو تو شعلۂ رنگِ بہار بن کے اٹھو
تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے تارے | دلوں میں دردِ غمِ انتظار بن کے اٹھو
بڑھو خلوصِ تہور سے جانبِ منزل | غبارِ گردِ سرِ راہ گزار بن کے اٹھو
ابھی خزاں کے تلاطم میں ہے سفینۂ گل | ہراس رد ش سے نشانِ وقار بن کے اٹھو
نکھر کے ملے گا جمالِ سروِ چمن | سرورِ خونِ رگِ شاخسار بن کے اٹھو

محترمہ ادا بدایونی کی "تعمیرِ نو" ملاحظہ فرمائیے ؎

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک | محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک
دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی | سرگشتہ رہے گا صفتِ جام کہاں تک
کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رخِ تاباں | نظریں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک
لیلائے حقیقت سے بھی ہمرہ کبھی دو چار | خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک
رخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے آخر | ناداں گلۂ گردشِ ایام کہاں تک
کب تک ترے سینے میں خلش تیرِ نظر کی | یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک

اے ذرۂ ناچیز مجل مہر کو کر دے! | افسانۂ تقدیر کو گمنام کیا!

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہِ دام کہاں تک

ایک دوسری نظم "کمیاب نگاہیں" بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

ارزاں وہ نگاہیں ہیں زمانے میں کہ جن کو | ہر منظرِ خوش رنگ کے انداز لبھا
ہر پھول کے دامن پہ کریں ناز سے سجدہ | ہر غنچۂ نورس کو کلیجے سے لگا
کر تشنگیٔ خار سے لیں درسِ تشکر | ذروں کو کہیں ہمدم و ہمراز بنا

کمیاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں
بڑھ کر جو کمندِ انجم و خورشید پہ ڈالیں

اسرار الحق مجاز کی ایک غزل پر مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں | یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا | بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ | تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
بتانے والے وہیں پہ بتاتے ہیں منزل | ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

(بشکریہ "فاران")

شوکت تھانوی

کالا برقعہ

بس ان ہی باتوں پر تو غصہ آتا ہے۔
گھر بیٹھے بیٹھے آپ نے ٹیلیفون کر دیا۔ کہ ذرا زنانہ مشاعرہ میں جا رہی
ی پر مجھکو لیتے آئیگا۔ اب کھڑے ہیں۔ مشاعرہ ہال کے دروازہ پر اور
یں کہ ان بے شمار باہر آنے والی خواتین میں ہماری بیوی کونسی ہیں
حب ان عورتوں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ترقی تو اتنی کر لی ہے
ہ کرنے لگیں اور حال یہ ہے کہ برقعے اب تک جان
لے۔ پھر مصیبت یہ کہ برقعہ کے لئے کالا
یا مخصوص کر دیا گیا ہو کہ دوسرے
قعے تو شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں
دیکھئے کالا برقعہ، خود ان کے
ا ہی برقعہ ہے۔ اب بتلائیے کہ کالے
سیلاب میں کسی ایک برقعہ والی کو خواہ وہ اپنی ہی
نہ ہو پہچاننا کوئی آسان بات ہے؟ اگر خود اپنی بیوی کا برقعہ کالا ہو
ے والی پر کچھ ایسی یگانگت کی نظر پڑتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے
ہی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ کہ بے شمار کالے برقعے اور یہاں یہ عالم کہ
دھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
قصہ اور بھی یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کو اس قسم کے موقعوں پر نہایت
اق بھی سوجھتا ہے۔ مذاق تو خیر وہ ہمیشہ گھٹیا قسم کا فرماتی ہیں
ے اگر آنکھیں بند کر دیں۔ اب ہم پوچھ رہے ہیں "تا بال......
ہیں۔ اوہ میں سمجھا بڑی جلبیں ہیں" اور آخر میں پتہ چلا کہ کوئی
پ تھیں بھلا بتائیے یہ بھی کوئی مذاق میں مذاق ہوا۔ اب اس
) وقت پیش نہ آتی۔ اگر برقعہ کا نقاب ذرا الٹ دیتیں مگر وہ
ے قوف بنانے کے شوق میں نقاب کو اور بھی چسپاں کئے تھے
تا سی خواتین برقعہ پہننے کے باوجود منہ کھولے ہوئے نظر آ رہی

تھیں۔ وجہ یہ کہ ان بیچاریوں کی نیت یہ ہوگی کہ کوئی ان کی تلاش میں پریشان نہ ہو۔ مگر جب ارادہ ہی پریشان کرنے کا ہو تو ظاہر ہے کہ پریشانی برحق ہے مگر بقول شخصے ۔۔

لاکھ پردوں میں تجھ کو دیکھ لیا
عشق نے کیا نگاہ پائی ہے

دیکھتے کیا ہیں کہ آپ اپنے نزدیک بہت ہی چھپی چھپائی کچھ سمٹی ہوئی سی تشریف لا رہی ہیں۔ شرارت ملاحظہ ہو کہ محض ہم کو دھوکہ دینے کے لئے آج بجائے ساری کے شلوار زیب تن فرمائی تھی گویا برقعے کے نیچے شلوار دیکھ کر ہم ایسے ہی تو ہیں کہ دھوکہ کھا جائیں گے۔ اور لطف یہ کہ متوجہ ہی نہیں ہوئیں۔ ہماری طرف قریب تشریف لائیں اور کترا کر نکلنا ہی چاہتی تھیں کہ ہم نے ہنس کر کہا۔

بس بس یہ غلط ہے۔ میں نے پہچان لیا۔

آپ نے ایک مرتبہ گھوم کر دیکھا اور شوخی سے کام لے کر قدم کچھ اور تیز کر دیئے۔ بھلا بتلائیے یہ کیا حماقت ہے جو دیکھے گا وہی ہنسے گا کہ آگے آگے بیوی اڑی جا رہی ہیں۔ پیچھے پیچھے میاں لپکے جا رہے ہیں گویا میاں بیوی کی ریس ہو رہی ہے۔ ہم نے ذرا تلخی سے کہا۔

"یہ کیا واہیات ہے۔ بس ہو چکا مذاق"

مگر ان کو یقین تھا کہ اب ہم بھی دھوکہ کھا جائیں گے۔ لہٰذا برقعہ کو کچھ اٹھا کر تاکہ شلوار نمایاں ہو سکے آپ کچھ اور تیز ہو گئیں اور ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا:

ہاں ہاں صاحب دیکھ لیا کہ شلوار ہے مگر اس کے باوجود میں نے پہچان لیا۔

اب بتائیے کہ کالے برقعوں کے سیلاب میں کسی ایک برقعہ والی کو خواہ وہ اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو، پہچاننا کوئی آسان بات ہے؟ اگر خود اپنی بیوی کا کالا برقعہ ہو تو ہر کالے برقعہ والی پر کچھ ایسی یگانگت کی نظر پڑتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس مرتبہ آپ ذرا ٹھہریں۔ بجلی کی طرح تڑپ کر گھومیں اور ایک دم نقاب الٹ کر جو ہم کو گھورا ہے تو دم ہی تو نکل گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ یہ تو کوئی اور تھیں۔ اور خدا جانے کیا کیا فرما رہی تھیں۔ نہایت غصے میں وہ کہئے کہ پنجابی زبان ہم اس حد تک نہیں سمجھتے کہ گالیاں بھی ذہن نشین ہو سکیں۔ ورنہ سخت بے عزتی ہوتی۔ بمشکل تمام ان محترمہ سے صرف اسی قدر کہا "بہن معاف کیجئے گا۔ دراصل میں سمجھا تھا کہ وہ ہیں! اور ان محترمہ نے پھر نقاب چہرے پر ڈال کر نہایت برہمی سے فرمایا "دِسدا نہیں، دیکھے نہیں ہیں تیرے۔ جھنجھلا کر چاہا کہ بس واپس لوٹ جائیں آتی رہیں گی۔ خود مگر عین اس وقت وہ تشریف لے آئیں اور ہم نے بڑھ کر کہا "کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ اب جا کہاں رہی ہو ذرا یہ مجمع تو کم ہو لینے دو"

ایک نہایت بھاری بھرکم ہاتھ ہمارے شانے پر آیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ ہم کو اپنی طرف گھما لیا۔ دیکھتے کیا ہیں۔ ایک چھ سات فٹ کے دیو پیکر بزرگ آتش فشاں بنے کھڑے ہیں۔ نتھنے پھلا کر آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے بولے "کیا مطلب ہے تمہارا۔ صورت سے تو بڑے بھلے مانس معلوم ہوتے ہو۔ شرم نہیں آتی یہ غنڈہ پن کرتے؟"

ہم نے سہم کر کہا "جی۔ وہ۔ میرے گھر میں سے ......"

ان صاحب نے کھا جانے کے انداز سے دانت پیس کر کہا "آیا وہاں سے گھر میں سے۔ میں ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"

یہ حضرت کچھ اس طرح ڈونگ رہے تھے کہ آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔

"کیا بات ہے حضرت؟"

"قصہ کیا ہے؟"

"کوئی لوفر معلوم ہوتا ہے"

ان حضرت نے تصدیق کر دی "جی ہاں ذرا شکل و صورت تو دیکھئے معلوم ہوتا ہے بڑے شریف زادے ہیں اور حرکت یہ ہے کہ پردہ نشین خواتین کو راستہ چلتے آپ چھیڑتے ہیں"

ایک صاحب بولے "لاحول ولا قوۃ۔ بڑی شرم کی بات ہے"

دوسرے نے کہا "آجکل یہ شکایت عام طور پر سننے میں آ رہی ہے یہ غنڈے راستہ چلتی عورتوں کو چھیڑتے ہیں"

معلوم نہیں ہم کس طرح صرف اتنا کہہ سکے۔ صاحب غلطی ہوا میری بیوی بھی یہاں آئی ہوئی ہیں"

ان صاحب نے اور بھی شیر ہو کر فرمایا

اور یہ بہانہ تم کو ہاتھ لگ گیا کہ تم دوسروں کی بیویوں کو چھیڑو!"

ایک صاحب نے کہا۔

"علاج ان کا یہی ہے کہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ اب یہ لوگ صرف بے پردہ عورتوں پر آوازے کستے تھے اب اور نوبت [illegible]

دوسرے نے کہا۔

"جب تک ان لوگوں کے ساتھ سختی نہ کی جائے گی یہ باز نہیں رہیں"

اور عین اسی وقت ایک برقعہ پوش خاتون نے آ کر [illegible]

ایک صاحب سے پوچھا

ہوا کیا آخر؟

انھوں نے صفائی سے کہدیا۔

"کچھ نہیں بہن جی۔ یہ شریف آدمی یہاں کھڑا ہوا عورتوں [illegible] رہا تھا! ان بیچاری کے ساتھ بھی زنانیاں تھیں۔ اس نے ان کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی"

ان خاتون نے بڑھ کر نہایت دبی ہوئی آواز میں کہا

"آپ نے چھیڑا عورتوں کو؟"

یہ بیوی کی آواز تھی۔

اور اب ہم نے بھی ذرا اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع پا کر

"آپ ہی کے دھوکے میں تو یہ سب کچھ ہوا اور پہنچا [illegible]

آخر آج عزت اتر دالی نا سرہانہ؟"

ایک صاحب نے طنز سے فرمایا۔

مگر بھائی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ محض زنانے [illegible] سے گھر والی کو بھی نہیں پہچانتے؟"

دوسرے صاحب نے جاتے جاتے چپکائی۔

"یہ تو سب بہانے بازیاں ہیں۔ ورنہ ایسا بھی کیا اندھاپن !"

صاحب معاملہ نے گویا بری کرتے ہوئے کہا۔

"آئندہ ذرا آنکھیں کھول کر بیوی کو پہچانا کیجئے"

اور آخر میں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد خود بیوی صاحب نے ذرا

اس انداز میں فرمایا۔

"وہ عورت تھی کون جس کو آپ نے اس طرح چھیڑنا چاہا تھا؟"

اسی رات ہم نے جو غزل کہی اس کا مطلع عرض ہے۔

غم نہ تھا کوئی برا کہتی اگر دنیا مجھے

اپنے منہ سے تم نہ کہتے کاش دیوانہ مجھے

(بشکریہ "حریم" لکھنؤ)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ستمبر ۱۹۵۵ء میں اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہِ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی بھیجا جائے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم : منیجر "شبیر" کراچی

۲۰۷۹ مسعودہ انعام باری کراچی
۲۲۱۴ چودھری غلام علی اینڈ سنز گوجرانوالہ
۲۲۲۴ محمد سعید صاحب جیکب آباد
۲۲۲۵ مقبول احمد خانصاحب بھوپال
۲۲۲۷ غافل کرنالی، مظفرگڑھ
۲۲۳۰ چودھری محمد دین۔ گوجرانوالہ
۲۲۳۳ رحمت اللہ خانصاحب لاہور
۲۲۳۵ محمد اسلم صاحب۔ کیمبل پور
۲۲۳۷ محمد یونس صاحب کراچی
۲۲۴۰ محمود الحسن صاحب خانپور
۲۲۴۱ خواجہ محمود احمد صاحب لاہور
۲۲۴۶ گل اکبر صاحب ضلع مردان
۲۲۴۸ مراد علی صاحب رحیم یار خاں
۲۲۴۹ ڈاکٹر قیوم سعادت کراچی
۲۲۵۱ ہیڈ ماسٹر صاحب۔ باودی پورہ
۲۲۵۴ محمد الہٰی صاحب۔ شہداد پور
۲۲۵۹ محمد ہاشر صاحب کراچی
۲۳۸۵ محمد نعیم الدین صاحب کراچی
۲۳۹۳ سید شفیق قادری صاحب۔ لاڑکانہ سندھ
۲۳۹۵ محمد احمد خاں صاحب۔ راولپنڈی
۲۳۹۷ قریشی محمد اشرف شملوی دریاخاں
۲۳۹۸ سیکرٹری صاحب بوائز ریڈنگ روم نصیرآباد
۲۳۹۹ ایم۔ اے۔ رزاق۔ ماریشس
۲۴۰۰ ایم ابن نواب صاحب کراچی
۲۴۰۱ احمد خاں صاحب نیازی کراچی
۲۴۰۲ مسز صفیہ آزاد کراچی
۲۴۰۶ بیگم روح الدین صاحب سیالکوٹ
۲۴۰۷ حاجی محمد شفیع صاحب دہلی
۲۴۰۹ محمد حسن صاحب گکھڑ (گوجرانوالہ)
۲۴۱۰ ایم۔ ایچ عبدالوہاب صاحب حافظ آباد
۲۴۹۱ خورشید اختر صاحبہ۔ نارووال

جوش ملیح آبادی

خورشیدِ فکر

کیا سر پہ رہے فکر کا خورشیدِ مبیں اور — کچھ اور چڑھے دھوپ کہ ڈھل جائے؟ نہیں اور

تشکیک کے منبر سے یہ آواز سنا دو — تبلیغ نہ فرمائیں اب اربابِ یقیں اور

ادیانِ کہن سال کو شاید نہیں معلوم — تدوین کی منزل میں ہے اک مصحفِ دیں اور

وہ رشتۂ تصدیق تھا، یہ گیسوئے تحقیق — وہ حبل متیں اور تھا، یہ حبلِ متیں اور

وہ کشتۂ الہام ، یہ غارت گرِ الہام — مفتی کی "چناں" اور محقق کی "چنیں" اور

یہ رعشۂ ادراک ، وہ تمکینِ تفکر — مجذوب کی "ہاں" اور مبصر کی "نہیں" اور

ہاں نقشِ سلیماں کی ضرورت نہیں باقی — درکار ہے اب خاتمِ عالم کو نگیں اور

جا اور کسی وادیٔ نادیدہ میں کھو جا — اس دور کا پیغام ہے جبریلِ امیں اور

جتنا بھی جھلستا ہے سرِ وادیٔ تحقیق — ہوتا ہے خردمند کا اندیشہ حسیں اور

زہاد کی قسمت میں نہیں خاطرِ مسرور — ہوتے ہیں مسرت سے یہ بدبخت حزیں اور

بے طرح دلِ عرشِ بریں کانپ رہا ہے — اک کروٹ ابھی ناز سے لے فرشِ بریں اور

ہاں اب بھی ہم آہنگ نہیں ہستی و مستی — اک عشوۂ ترکانہ مرے زہرہ جبیں اور

ہاں سرحدِ ادراک کے جھلکے وہ منارے — یونہی ابھی لے تند عناں برسرِ زیں اور

جھکنے ہی پہ ہے گردنِ گردوں سرا فراز! — ہاں جذبِ دروں لے کششِ سطحِ زمیں اور

جتنیاں ہیں نہاں خانۂ اسرار کے پردے — اک نعرۂ مستانہ خراباتِ نشیں اور

ناقابلِ برداشت ہے یہ خواب کی دنیا — لے چل مجھے اے دیدۂ بیدار کہیں اور

یہ ساجد ذرات ، وہ مسجودِ ملائک — مومن کی جبیں اور، مفکر کی جبیں اور

جس درجہ بھی الفاظ سے جاتی ہے نظر دور
ہوتا ہے دل جوشِ معانی سے قریں اور

(بشکریہ [illegible])

ابو مسلم صحافی •

تنویرِ ذکر

کچھ اور بلندی کی طرف حسنِ یقیں اور
انوار کی بارش ہو شہہ عرش نشیں اور

تشکیک کے منبر سے پکاریں نہ سخنور
راہوں سے بھٹک جائیں گے پستی کے مکیں اور

ادیانِ کہن سال سے رونق ہے جہاں کی
بن جائے نہ انگارہ کہیں سطحِ زمیں اور

تحقیق نے الجھائے ہیں کیوں گیسوئے ہستی
سمٹے نہ کہیں فکر سے انساں کی جبیں اور

ہاں منکرِ الہام سے یہ کہتے ہیں ہم بھی
ترتیب دے ہمّت ہے تو اک مصحفِ دیں اور

تمکینِ تفکّر میں بھی ہے اک رعشۂ ادراک
ہے فکرِ "چناں" آج تو کل اسکی "چنیں" اور

کیوں نقشِ سلیماں کی ضرورت نہیں باقی
ملتا ہے کہیں خاتمِ عالم کو نگیں اور

اے روح الامیں پھر وہی پیغام سنا دے
بیتاب ہے، انساں کی سجدے کو جبیں اور

جھلسے ہوئے اندیشۂ انساں سے یہ امید
وہ گلشنِ گیتی کو بنا دیگا حسیں اور

زہّاد کی قسمت میں نہ ہو خاطر مسرور
عشرت میں تو انساں کو دکھا ہے حزیں اور

کانپے گا بھلا عرشِ بریں سن کے یہ باتیں
بڑ ہانک لو مجذوب کی تم خاک نشیں اور

بھٹّی میں پڑا کرتے ہیں جب جہدِ عمل کی
مردانِ خدا ہوتے ہیں ہستی کے قریں اور

اے تشنۂ ادراک یہ ہے ریگِ سرابی
بھٹکا نہ کرے مدّتوں صحرا میں کہیں اور

خود اپنی تباہی پہ ہے انسان جو مائل
گردوں سرافراز کی ابھرے گی جبیں اور

اس نعرۂ مستانہ کا حاصل نہیں معلوم
دل ہوتے ہیں سُن کر جسے اپنوں کے حزیں اور

ناقابلِ برداشت ہے تو چھوڑ دو دنیا
آجائیں گے اس غم کی امانت کے امیں اور

تم بادۂ احمر کے ذرا جام لُنڈھاؤ
سچ بات ہے ہوتی ہے مفکّر کی جبیں اور

شبّیر حسن جوش سے کہہ دو یہ صحافیؔ!
صہبائے یقیں اور بھی بادہ ہے رزیں اور

اصغر علی عابدی ●

اسٹالن گراڈ پر قہقہہ!

پانچ سال پہلے وہ میرا گہرا دوست تھا۔ لیکن صرف ایک سال قبل مجھے اسکو پاگل خانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے پاگل خانے کے ڈاکٹروں میں میرا نیا نیا تقرر ہوا تھا ایک روز میں نرس کو لئے پاگلوں کا معائنہ کرنے کے لئے چل پڑا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بڑا پرتپاک.. خیر مقدم کیا۔ اور کہنے لگا ——— "ریل کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ سیاہ پٹری کسی ناگہانی آفت کے انتظار میں ایک کمزور مریض کی طرح چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر چار پانچ رجعت پسند ڈھانچے، لمبی لمبی ڈاڑھیاں لٹکائے ٹہل رہے تھے۔ اور باقی لوگ بنچوں پر بیٹھے بوڑھے گدھوں کی طرح اونگھ رہے تھے۔ دو مزدور عورتیں جن میں ایک جوان تھی اور ایک بوڑھی وزن کرنے کے کانٹے کے پاس بیٹھی ریل کا انتظار کر رہی تھیں لیکن ——— ہا ہا ہا گاڑی تو کبھی کی چھوٹ چکی تھی۔" اس نے ایک نامعقول قہقہے سے اپنی داستان شروع کی میں نے سوچا۔ شاید وہ مجھے پہچان گیا ہے مگر اس کا دماغ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ سنا ہے وہ ہر آنے والے سے اپنی داستان اس طرح کہتا ہے۔ اور اس کے بعد خوب ہنستا ہے۔ خوب قہقہے لگاتا ہے۔ جیسے اچانک میونسپلٹی کا نل کہیں سے ٹوٹ گیا ہو پھر ہانڈی کے ابال کی طرح فوراً خاموش ہو جاتا ہے جیسے اپنی غلطی پر سخت ندامت ہوئی ہو۔ مگر وہ غلطی کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی اور آ بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ کسی اور آدمی کو اپنی داستان پھر سنانی شروع کر دیتا۔ رات دن کا اس یہی مشغلہ تھا۔ میں نے بھی چند منٹ کے لئے اپنے کان اس کے حوالے کر دیئے ٹکٹ لینے کے بعد ہی ریل آ گئی۔ اور ریل کے آتے ہی ہم دونوں میں

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا میں نے کہا "چلو گی" "کہاں" اس نے بھولپن سے پوچھا۔ میں نے بتایا "اس جہالت اور گندگی سے دور" اس دنیا میں جہاں سرخ پھول کھلتے ہیں، اور دوشیزائیں ہمیشہ دوشیزائیں رہتی ہیں جہاں پریم اور پیار ہے، جہاں انسان اپنے ذاتی مسئلوں سے آزاد ہے، جہاں اخلاقی قاعدے اور قانون کی ہوائیں نہیں ہیں، بلکہ ہر چیز انسان کی خود ساختہ ہے" ـــ اور پھر میں نے اس کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ پہلے تو وہ کچھ شرمائی لیکن بالآخر انقلابی قدریں قدامت کی قدروں پر غالب آگئیں۔ رجعت پسندی کو شکست فاش اٹھانی پڑی اس نے کہا "ضرور چلوں گی ——" انقلاب زندہ باد۔ نندی پائندہ باد۔

اور نندی، ایک قدامت پرست گندے ماحول سے، شہر کی طرف انقلابی مقاصد دل میں لئے، گرمیوں کی اس البتی دوپہر کو، زندگی کے ایک موڑ پر سے نہایت تیزی سے گذر گئے۔ ہمارے پیچھے نامعلوم اس جہالت بھرے گاؤں میں کیا ہنگامہ ہوا ہوگا! اس صبح کا نظارہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے جب وہ پرانی وضع کی دقیانوسی عورت جو میری بیوی بنی تھی مجھے اٹھانے آئی تھی "اٹھیے نہیں آپ" بنی تھی بدمعاش۔ بکھرے ہوئے بدبودار بال، میلا تہمد اور میلی شلوار، کثیف کمرہ اور جھولتا ہوا اس کے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھتا ہوا ملنگ پھٹی ہوئی بوسیدہ مچھر دانی کھٹملوں کا مخزن یہ زندگی ہے یا کسی لنگڑے اور بڈھے فقیر کا چھکڑا جو چرخ چوں چرخ چوں کرتا ہوا سڑک پر گھسٹتا ہوا اور جس کے پہیئے پتھریلی سڑک کے گڑھوں میں اٹک اٹک کر فقیر کو سوکھے پیڑ کی طرح ہلا دیتے ہوں ——— زندگی کے ان خام گھروندوں میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ ان کی خاطر کوئی کیوں گاؤں میں زندگی بسر کرے۔ اور پھر مجھ جیسا ایجوکیٹڈ آدمی جو رات دن ایک ترقی پسند دنیا کے خواب دیکھتا ہو۔ بھلا اس پانسو برس پہلے کے ماحول میں کیسے رہ سکتا تھا۔ میں نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ اور بجا طور پر بائیکاٹ کیا جس سوسائٹی کے اصولوں کو میں نہیں مانتا تھا اس سوسائٹی کا رکن بھی میں نہیں رہ سکتا تھا لیکن میں نے ایک عجیب حرکت کی اپنے ساتھ اس سوسائٹی کی عمارت سے ایک اور "اینٹ" بھی اکھاڑ لایا۔ یہ اینٹ نندی تھی۔ میری بیوی کی بہن میری بیوی اس حرکت سے جل کر آگ بگولا ہو گئی ہو گی۔ مگر وہ میرا کر ہی کیا سکتی ہے

بے ڈھنگی اور رجعت پسند عورت۔ وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ مجھے صبح سویرے ہی اٹھا دے۔ نہ جانے اس کے خدا نے اس کے کان میں کیا پھونک رکھا تھا؟ اس کا بڈھا باپ اس سے کیا کہہ کر مرا تھا۔ اور صرف اسی پر کیا منحصر تھا سارا گھر ہی جاہل تھا۔ صبح ہی سے گھر میں چیخ دپکار شروع ہو جاتی۔ عورتیں کوؤں کی طرح کائیں کائیں کرتیں بچے۔ دستے بلبلاتے۔ میرا دودھ پیتا بچہ بھی روتا اور جب تک اس کی ماں اس کے منہ میں دودھ ٹھونس نہ دیتی وہ چپ نہ ہوتا عجب قدامت پسند ماحول تھا۔ عجب جاہل لوگ تھے —— اور پھر جب وہ بچے کو دودھ پلا چکتی تو مجھے اٹھانے کے لئے آجاتی، میں اس کے قدموں کی چاپ سن کر گھبرا جاتا . . . .

اُف کمبخت ادھر ہی آرہی ہے۔ منحوس اور بد وضع بے ڈھنگی عورت زندگی سے ناواقف، زندگی کے فطری اور حیوانی مقاصد سے ناآشنا پرانے وقتوں کا کوئی عجوبہ۔ کسی قدیم فنکار کی باریک بینی کا دیہاتی مرقع —— یہ تھی میری بیوی —— جونہی وہ مچھر دانی کی جالی اٹھا کر میری جانب دیکھتی . . .، میں فوراً ہی آنکھیں میچ لیتا۔

"اٹھتے نہیں آپ!" جیسے بڑی مہذب بڑی ترقی پسند بنتی تھی رمعاش۔ نفرت کے جذبات سے میرا سینہ اُبلا پڑتا۔ کہاں کی بلا لگ گئی میرے پیچھے۔ کیا خاندانی زندگی کی خوبیاں یہی ہیں۔ میں بالکل بے حس و حرکت پلنگ پر اسی طرح پڑا رہتا۔ پسینے کے ریلے کچھ گرم کچھ ٹھنڈے میرے جسم پر بہتے رہتے تھی پھریری سی آتی کبھی گرمی سے طبیعت بے چین ہو جاتی۔ کمبخت سورج جانے اتنی جلدی کیوں نکل آتا۔ رجعت پسند سورج جو صدیوں سے ایک ہی ڈھنگ پر چمکتا ہے اور رجعت پسند کھڑکی جو برسوں سے ایک ہی انداز میں کھلتی رہتی ہے۔ اور میری بیوی کا قدامت پسند بھائی جو بے وقت کھڑکی کھول کر بھاگ جایا کرتا تاکہ بورژوائی سورج، ٹھیک بورژوائی انداز میں مجھ پر حملہ آور ہو اور اس پر طرفہ یہ کہ نصف رات گئے سوکر میں ابھی نیند کا پورا جام بھی خالی نہ کر پاتا کہ زندگی اور کرخت آوازیں میرے کانوں میں داخل ہو جاتیں۔

"اٹھتے نہیں آپ!" —— کس قدر شدید جہالت تھی بے موقع اور بے محل بولنے والی عورت۔ کیا اسی کا نام بیوی ہے۔ کیا یہی زندگی ساتھی ہے۔ کیا زندگی میں صرف وقت پر اٹھ جانا ہی ضروری ہے جب اس کے بعد وہ پلنگ پر میرے قریب بیٹھ جاتی اور اس کا ہاتھ رفتہ

رفتہ میرے پیروں کی طرف بڑھنے لگتا۔ دبانے کے لئے —— ہشت! میں نہایت عاقلانہ انداز میں اسے دھتکار دیتا۔ میں ایک انقلابی افسانہ نویس، مضمون نگار، شاعر، مقرر جانے کیا کیا ہوں میں، اور میری بیوی ایک ذلیل قدامت پسند کتیا۔ بھلا میں اس کے پیر دبانے کی کیا قدر کر سکتا تھا۔ میں ایک خوفناک بھیڑیئے کی طرح بپھرا ہوا پلنگ پر سے اٹھتا۔ اور جلدی جلدی کتنی ایک سخت باتیں اپنی بیوی کے سر پہ دے مارتا۔ میرا کام اس کے سوا اور ہے ہی کیا کہ جو انداز مجھ کو پسند نہ آئیں ان کے بارے میں جو زبان پر آئے بک دوں۔ البتہ کبھی کبھی اس کا خیال بھی رکھوں کہ گالی کی زبان مہذب شائستہ بلکہ اعلیٰ علمی اور اصطلاحی ہو۔ چنانچہ جب میں اکثر مہذب لوگوں کو رجعت پسند کہہ کر موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوں تو وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ نیچی گردن کئے اپنے دامن سے رجعت پسندی کے خیالی داغ دھونے میں لگ جاتے ہیں اور پاک یا ناپاک پانی کی تلاش میں سڑکوں اور چوراہوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو اس طرح بے وقوف بنا بنا کر محض تصور کے نئے نئے میدانوں میں ایک خیالی بازی جیتنے کے لئے دوڑا دیا۔ جیسے ریس کے بے زبان گھوڑے یا بوٹی کی طرف لپکنے والے ہانپتے ہوئے کتے۔ زبانیں لٹکی ہوئی منہ سے کف جاری۔ دمیں کسی کی اوپر کو اٹھی ہوئی اور کسی کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان دبی ہوئی اور بعض دفعہ دم کٹے کتوں نے بھی ریس میں حصہ لیا ہے بلکہ آج کل یہی دم کٹا طبقہ پیش پیش ہے انہیں عام طور پر مزدور اور کسان کے نام سے پکارا جاتا ہے —— ہاں تو جب ریس شروع ہو جاتی ہے تو پھر یہ کسی کو یاد نہیں رہتا کہ "بوٹی" کہاں ہے؟ اور کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے —— ہا ہا ہا ہا —— کیسا الّو مارتا ہوں اور پھر خود کیا کرتا ہوں؟ جب دوڑتے دوڑتے . . . . . . ان کا مقصود اصلی "بوٹی" ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اصلی مقصد صرف "دوڑنا" رہ جاتا ہے تب کہیں پھر "رجعت پسندی" کا دھبہ بنا لگ جائے —— تو وہ ساری بوٹیاں۔ ساری ہڈیاں اور ساری روٹیاں جو راستے میں بکھری ہوتی ہیں میں ایک دم سے اُچک لیتا ہوں۔ میرے جسم پر یہ سارا گوشت ایسے ہی دھوکے سے حاصل کی ہوئی بوٹیوں اور روٹیوں سے بنا ہے۔ اور کبھی کبھی میں اس دھوکے کی ٹٹی کو بھی ہٹا دیتا ہوں ۱۹۱۷ء کے خونی انقلاب کے بعد کئی دفعہ میں نے ملک گیری۔ ہوس پرستی اور مہذب ڈاکہ زنی کے خالص انقلابی اصولوں کے

ذریعے اپنی شکم پری کا سامان فراہم کیا ہے۔ مگر کسی کی مجال نہ ہوتی کہ عیب پر انگلی اٹھاتے۔ کیونکہ اگر کوئی ایسا کرتا تو میں فوراً اس پر رجعت پسند، بورژوا اور سامراجی کا لیبل لگا دیتا بس بیہودہ ڈر جاتے اور چپ ہو جاتے

منا میری آواز سن کر میری ساس چلائی "اوئی کیا کھا جائے گا مردوے سوکھ کر لکڑا چکلا ہوتی جاتی ہے، دیکھتا نہیں بچے کی دیکھ بھال کرے یا تیری خدمت کرے" بورژوائی طبقے سے ہمدردی رکھنے والی عورت جاہل ملا کی حمایتی ناگن، بھینس کی طرح پھولی ہوئی۔ گائے کی سی آواز نکال کر کہتی "تم چپ رہو اماں بی۔ میں آج اس کا دماغ ٹھیک کر کے رہوں گا۔ تم چپ رہو۔ دیکھو تم نے کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے گرجدار آواز میں اپنی ساس کو گھُرکی دی۔ اور پلنگ پر سے اٹھ کر دو چار لاتیں اور تین چار گھونسے کہاں کہاں اپنی بیوی کے جسم پر رسید کئے۔ مری، مری، کہتی ہوئی وہ ایک قدم آگے بڑھ کر پلنگ پر گر پڑی پلنگ کی چولیں۔ کارخانہ دار کی تیز مزاج عورت کی طرح چلا اٹھیں۔ میں نے اسے ایک لات اور رسید کی۔ میں غصہ کا جواب اس سے کئی گنا تیز غصے سے دیتا ہوں۔ میں جلدی جھنجھلا کر بہت دیر تک خباثت نفس اور بہیمیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں کوئی باک محسوس نہیں کرتا میرا غصہ جلدی آتا اور بہت دیر میں جاتا ہے۔ میں ایک انقلابی شاعر اور ادیب میں پرولتاری انقلاب کا داعی۔ میرے نزدیک بھلا ان فرسودہ غیر حیوانی اخلاق کی کیا اہمیت ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ماں سے چپکے چپکے کہتی۔ پانی ——— گرم پانی۔ ہش ہش ش ش ——— بھینس کی طرح پھولی ہوئی ماں گائے کی طرح سانس لیتی۔ کند ذہن اور پرانے خیالات کی حامل میری بیوی صنف گری، نگت پہ اتراتی تھی۔ اب میں اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتا ——— کمرے سے نکل کر بالآخر میں باہر آ گیا اور...... برآمدے میں بیٹھا اپنے جسم کے مختلف حصوں کو کھجاتا ہوا سگریٹ پر سگریٹ پیئے چلا جا رہا تھا۔ پشیمانی یا کامیابی کسی قسم کا احساس میرے دل میں نہیں تھا۔ میں صرف سگریٹ کے خوشبودار اور لطیف دھوئیں کو چھت کی بلند کڑیوں کی طرف چھوڑنے میں مشغول تھا اور میرے دماغ میں کارخانوں کی چمنیوں کا کثیف دھواں۔ مزدوروں کی پگھلتی ہوئی چربی اور چٹختی ہوئی ہڈیوں کی چرچراہٹ کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ میں قدامت پسند ماحول میں رہتے ہوئے ہر وقت اپنے ذہن میں ترقی پسندانہ خیالات سمائے رکھتا ہوں۔ یکایک

میری رگ رگ پھڑک اٹھی۔ میرا رونگٹا رونگٹا ماحول کے خلاف بغاوت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "انقلاب"، "ایک خونی انقلاب" کے سرخ اور جلی حروف میری آنکھوں کے سامنے فضا میں تیرنے لگے۔ میری نوجوان سالی پتھر کی سل پر مرچ مسالہ پیستی ہوئی میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں خالص حیوانی اور فطری انداز میں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے جسم کے مختلف حصوں کو بدستور کھجاتا ہوا اس کی اشتعال انگیز نظروں کا استقبال کرتا ہوں "محرم" اور "نامحرم" کی گزرے ہوئے دور کی اقدار پر زیادہ غور نہیں کرتا۔ "پاک"، "ناپاک"، "نجس" اور "غیر نجس"، یہ سب چیزیں میرے نزدیک اضافی ہیں۔ تاریخ کے کسی قدیم معاشی نظام کے ساتھ وابستہ ہوں گی۔ اب نہ وہ معاشی نظام رہا اور نہ یہ اخلاقی قدریں باقی رہ سکتی ہیں۔ مجھے اپنے جسم کی کسی ایک "غیر اخلاقی" حرکت سے ان کو پامال کرنا اور مٹانا تھا۔

ایک جھٹکے میں مسالہ پس جاتا ہے اور وہ مسالے کا ایک گولا سا بنا لیتی ہے۔ نذری اپنے جسم کے مختلف حصوں کو میری تنگ نظر بیوی کی طرح ہر وقت چھپائے رکھنے کا اہتمام نہیں کرتی۔ وہ گھر کی اور عورتوں سے بہت کم رجعت پسند ہے۔ غرارہ ایک طرف ہے تو دوپٹہ کسی اور طرف میں سگریٹ کے ایک چھوٹے ٹکڑے کا آخری کش لے کر اسے پھینکتے ہوئے آنکھیں کسی قدر بند کر کے نذری کی طرف دیکھتا ہوں۔ بکھرے ہوئے بالوں کی نقاب میں سے اس کے کسی قدر مسکراتے ہوئے ہونٹ، مجھے مسالہ پیسنے کی سل کی طرف کھینچتے ہیں۔ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں کام پر نہیں گیا تھا۔ گھر کی محرم یا غیر محرم عورتوں سے مذاق کا میں نے تہیہ کر لیا تھا۔ یہ مذہبی سوسائٹی پردے کے حق میں ہے ... ہے ہمیں خود ہی یہ موقع دیتی ہے کہ قریب کی رشتہ دار عورتوں سے ... جول بڑھایا جائے......

عورت مرد کے میل ملاپ کے بارے میں نئی انقلابی قدریں انسان کو حیوانی طریقہ کار اختیار کر دینے کی اجازت دیتی ہے۔ ایک بالکل قدرتی بات جس سے مذہب کا نام لینے کے باوجود یہ لوگ بچ نہیں سکتے۔ میں تو اکثر جانوروں کی آزاد زندگی پر رشک کرتا ہوں اور مجھے اپنے انسان ہونے پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اے کاش میں بھی کوئی آزاد منش بھینسا ہوتا۔ جس کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہ ہوتا! ——— وہ ...

آئیگا جب ہم ایک "لیس لیس" سرخ سوسائٹی" بنانے میں کامیاب ہو جائینگے جو ہماری حیوانی خواہشات کو انسانی باقاعدگی کے ساتھ پورا کرسکے گی۔

بکھرے ہوئے بالوں کے درمیان چاند ایک بار پھر مسکرایا۔ اُف یہ بکھرے ہوئے پریشان بال بھی کس بلا کے حسین ہوتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی حجامت پیچ دار اور اُلجھے ہوئے بالوں میں مجھے پیشانی سے لیکر گردن کے آخری حصے تک زندگی ہی زندگی نظر آتی ہے۔ بال کے ہر موڑ پر انقلاب ہر الجھن میں ترقی پسندی، دو دن کے شیو کے بغیر بڑھی ہوئی ڈاڑھی کی کھونٹیاں جیسے انقلاب پسند گروہ کی جھنڈیاں گندے اور بدبودار دانت جیسے مستقبل کی مزدور ریاست کے جگمگاتے ہوئے چراغ۔ میلے کچیلے کپڑے کھجلی بھرا جسم بیہودہ اور لغو چیخ پکار "رجعت پسند" "اوٹ کٹ ملا" کی گالیاں کامل انقلاب کے عبوری دور کے مراحل بچگانہ، پرانے نظام کے دعوے اور نئے نظام کے جواب دعوے میں تصادم، امتزاج بین الاضداد اور ایک نئے مرکب یا...... (SYNTHESIS) کی تیاری کے مختلف اجزاء ——— ان انقلاب اسی طرح تو آتا ہے۔ وہ دیکھو انقلاب آرہا ہے !!!! ——— انقلاب زندہ باد مزدور راج پائندہ باد۔

ایک دن میں نے نذری سے باورچی خانہ میں چھپ کر باتیں کیں۔ بہت اچھی اچھی اور ترقی پسندانہ قسم کی باتیں۔ وہ کالج کی لڑکیوں کی طرح بے تکلفی سے اور بے جھجک بولتی ہے۔ اس وقت میرے دل میں سچے انقلابی جذبات بڑی تیزی سے موجزن ہو گئے۔ مجھے کامل انقلاب کی گھڑیاں قریب سے قریب تر ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور نذری تغیر کے خوشگوار موڑ پر کھڑی ہوئی پوری انسانی زندگی کی مجسم تصویر دکھائی دینے لگی۔ نذری کے وجود کا رنگ کا رنگیلا مجھے حریت فکر ضمیر کے بے پناہ حیوانی جذبات کو فضاؤں میں بکھیر دینے کی دعوت دے رہا تھا۔ کی طرف بڑھا اور گویا ہم اپنے نصب العین کے راستے میں چند قدم اور آگے بڑھ گئے۔

میں "اسٹار بار" میں کسی معمولی شراب کے صرف دو معمولی پیگ پیکر اصلاح حال پر کسی ایک اعلیٰ قسم کی نظمیں لکھ سکتا ہوں۔ میں کسی قسم کی بھی عورت کو دیکھکر چاہے وہ کوڑھی بھکارن ہی کیوں نہ ہو۔ جدید مقصد ادب کے تحت ایک بلند پایہ افسانہ ضبط تحریر میں لا سکتا ہوں۔ میں اپنی گھر والی کو بڑی بڑی گالیاں دینے کے بعد چوراہے پر کھڑا ہو کر یا اخبار کے کالموں میں گھس کر اچھے خاصے لوگوں کو طرح طرح کی مہذب گالیاں دیتا ہوں۔ تاکہ انقلاب کا راستہ صاف ہو، اور مجھے اپنی منزل تک پہنچنے میں سہولت ہو۔ میں نے دراصل اپنی تمام حیوانی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک "انقلابی" نظام بنا لیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرے قدموں میں جماؤ اور میرے کاموں میں استقلال پیدا ہو گیا۔ اب مجھے اپنے گھر ہی میں ایک اور ساتھی مل چکا تھا۔ نذری جو میری زندگی میں اس وقت داخل ہوئی۔ جب وہ قدامت پسند ماحول سے تنگ آکر بکھرنے والی تھی۔ اس نے مردانہ جرأت سے آگے بڑھکر میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے ہمیشہ کے لئے اس کو اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ اب ایک قالب میں ایک مقصد کی طرف دو روحیں سفر کر رہی تھیں۔ دو روحیں جن کا صرف روپ جدا تھا۔ مگر اصلیت ایک تھی۔ میرے انقلابی مقاصد کی تکمیل کا دروازہ میرے سامنے چوپٹ کھل چکا تھا۔ اب مجھے صرف کپڑے پہن کر باہر نکل جانا تھا۔ میں نے کچھ دیر میں یہ کام بھی کر لیا۔

ایک دوپہر جبکہ میری جاہل بیوی۔ اس کی بھینس کی طرح موٹی ماں۔ اس کی نانی۔ اس کا اجڈ بھائی اور گھر میں کام کرنے والی چھوکری پڑوس میں گئے ہوئے تھے اور نذری باورچی خانہ میں اکیلی بیٹھی کھانا پکا رہی تھی میں اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا میں نے کہا "چلو گی؟" "کہاں؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔ میں نے بتایا "اس جہالت اور گندگی سے دور اس دنیا میں جہاں سرخ پھول کھلتے ہیں۔ اور دوشیزائیں ہمیشہ دوشیزہ رہتی ہیں۔ جہاں پریم اور پیار ہے۔ جہاں انسان اپنے ذاتی جھگڑوں سے آزاد ہے جہاں اخلاقی قاعدے اور قانون کی ہوائیں نہیں ہیں بلکہ ہر چیز انسان کی خود ساختہ ہے" اور پھر میں نے اس کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ پہلے تو وہ کچھ شرمائی لیکن بالآخر انقلابی قدریں قدامت کی قدروں پر غالب آگئیں رجعت پسندی کو شکست فاش اٹھانا پڑی۔ اس نے کہا "ضرور چلوں گی" "انقلاب زندہ باد۔ نذری پائندہ باد۔" میں نے جلتی ہوئی لکڑی کی مشعل اٹھالی کیونکہ یہ بھی ایک انقلابی علامت ہے۔ اور ہم دونوں اسٹیشن کی طرف چل پڑے گھر قبرستان کی طرح ویران پڑا تھا۔ اور میں اور نذری ایک قدامت پرست گندے ماحول سے شہر کی طرف، اعلیٰ انقلابی مقاصد دل میں لئے گرمیوں کی اس البیلی دوپہر کو۔ زندگی کے ابتدائی موڑ سے نہایت تیزی سے

لئے گئے...... تھک کر وہ رک گیا۔ اور اس کا سانس پھولنے لگا جیسے واقعی وہ کوئی بڑا فاصلہ طے کرکے آیا ہو۔ اس وقت خلاف معمول اس کو ہنسی نہیں آئی۔ میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا "تم کس شہر کی طرف گئے تھے...؟

"اسٹالن گراڈ ـــــ" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا، اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا! قہقہہ پر قہقہہ۔ وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز میرے دماغ میں آج تک گونجتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے جواب میں میرا دل رو رہا ہے۔

(بشکریہ "تسنیم" لاہور)

عرشی بھوپالی •

جنوں کو قابلِ زنجیر و دار کہتے ہیں
یہ بوالہوس یہ ذوی الاقتدار کہتے ہیں

یہ حکم ہے کہ سحر کی نہ کوئی بات کرے
چمن میں آئے گی بادِ بہار کہتے ہیں

ہماری آبلہ پائی سے تنگئی ہے چمن
وہ راہِ شوق جسے خارزار کہتے ہیں

کھنک رہے ہیں کہیں جام و ساغر و مینا
کہیں اٹھی ہی گھٹا بادہ خوار کہتے ہیں

بہت قریب سے ہو کر گئی ہو زنداں کے
وہ راہ سب کو تری رہگذار کہتے ہیں

تری نگاہ سے ملتا ہو سلسلہ اس کا
وہ درد جس کو غمِ روزگار کہتے ہیں

ہماری بات کہ قائل ہو جس کی اک دنیا
غضب ہو اس کو وہ بے اعتبار کہتے ہیں

کہاں کہاں نہ کھلائے ہیں گلستاں اس نے
وہ جسکو نقشِ کفِ پائے یار کہتے ہیں

غمِ جہاں، غمِ جاناں میں کوئی فرق نہیں
کہ ہم ترے قد و گیسو کو دار کہتے ہیں

ہمیں سے آبروئے دشت آبروئے جنوں
ہمیں کو لوگ چمن کی بہار کہتے ہیں،

———•———

م۔ح۔ صدیقی ●

واپسی

"یہ اختر صاحب ہیں۔ ویسے ہم سب انہیں محض اختر کہتے ہیں اس لئے کہ ان کی عمر محض ۲۱ سال ہے اور اس لحاظ سے یہ ذرا کمسن ہیں۔" اختر اس انداز تعارف پر جھینپ گیا اور ڈرائنگ روم کی تیز روشنی میں ایک سرخ سی لکیر اس کے بھولے بھولے گالوں سے کان کی لوتوں تک دوڑ گئی۔ وہ ویسے بھی اسکول کا کوئی طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بالوں کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ چلتے چلتے آئینے کے سامنے جلدی میں دو چار ہاتھ گھما لئے گئے ہیں۔ شیو کہیں کہیں چھوٹ گیا تھا اور ناف تک چڑھی ہوئی پتلون سے کھنچ کھنچ کر اس کی قمیص اوپر ڈھلک گئی تھی۔

"میرا نام شاہدہ ہے" دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسے بالکل اپنے سامنے نظر آئیں وہ آنکھیں جن کے اندر سے کسی مستقل پیام کی جھلک نظر آئی اور اس نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

ڈرائنگ روم میں کافی آدمی جمع ہو چکے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی تیز روشنی میں قہقہے اور طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سگریٹ اور سگار کے تلخ دھوئیں سے فضا گھٹی گھٹی سی تھی اور پائیں باغ سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی اور سرد ہوا ذرا دیر میں کثیف اور گرم ہو جاتی۔ وہاں ہر طرح کے لوگ تھے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے تاجر۔ جاگیردار اور وڈیرے۔ اعلیٰ سرکاری عہدیدار بعض سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور ان کی بیگمات۔ اختر کمرے کے اندر بیٹھتے لوگوں کی گفتگو میں عجیب بے تکا پن محسوس کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود لوگوں کا انہماک اور ہر لحظہ بلند ہوتے ہوئے قہقہوں کا شور لوگوں کی دلچسپی کا احساس دلا رہا تھا۔ اسے اس گفتگو کا سب سے دلچسپ پہلو یہ نظر آیا کہ یہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے بے پناہ وسعت رکھتی تھی۔ وہ موضوعات جو ہر لمحہ اس طرح بدل رہے تھے جیسے کسی جنکشن میں داخل ہونے والی گاڑی کا کانٹا کٹ پٹری بدل رہی ہو۔ جو شخص بڑی آزادی اور خود اعتمادی سے ہر مسئلے پر اظہار خیال کر رہا تھا جیسے ہر شخص دنیا کی ہر چیز سے واقف ہو اور پھر ان میں سے کسی کی رائے دوسرے سے مختلف نہ تھی اور اگر کبھی ایسا ہوتا بھی تو ایک نے دوسرے کی رائے سے فوراً اتفاق کر لیتا۔ آخر ان کی معلومات کس قدر وسیع ہیں اختر نے سوچا کہ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب اپنے کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف ادبی، معاشرتی اور ثقافتی اداروں کی بھی کرتے ہیں۔ لوگ مسلسل گفتگو کر رہے تھے اور کبھی کبھی خود ہی بات کہکر اس طرح لمبے چوڑے قہقہے لگاتے جیسے وہ اس کے ذہن سے اچھی طرح داد چاہتے ہوں۔ اختر اس ماحول میں ہمیشہ بڑی بوریت محسوس کرتا۔ وہ شاید اس طرح کی محفلوں میں کبھی شرکت نہ کرتا اگر اس کے لکھ پتی باپ پر اسے جلد از جلد Man of the World بنا دینے کی دھن سوار نہ ہوتی۔ اسے اس بامقصد بے تکی گفتگو سے سخت چڑ ہو گئی تھی۔ وہ سوچتا کہ لوگ ہر تقریب، ہر موقع پر ایک طرح کی گفتگو کرتے جس میں ذرا بھی کوئی نیا پن نہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر شاہدہ کی جانب دیکھا جو اس گفتگو میں اسی کی طرح بالکل خاموش رہی تھی اور صرف ایک بار ہنسی تھی کسی نے اس کی خاموشی کی یہ وجہ بتائی تھی کہ اسے غالباً اپنے بڑے ہونے کی یاد ستا رہی ہے جو اس وقت نہ جانے دنیا کے کس ملک میں جواہرات یا معمول کھاد کر رہا ہوگا۔

شاہدہ سے اس کی نگاہیں ایک دفعہ پھر ٹکرائیں۔ وہ نگاہیں جن میں آج شروع ہی سے ایک پراسرار مسکراہٹ۔ ایک معنی خیز پیام جھلک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید شاہدہ بھی اسی کی طرح ماحول سے الگ رہنا چاہتی ہے۔ اس احساس سے اسے ایک ذہنی سکون ملا۔ ویسے اختر کی نگاہیں جب بھی شاہدہ پر پڑیں تو اس نے اسے اسی طرح زیر لب مسکراتے اور اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اسی وجہ سے تھوڑی دیر کے بعد اس کے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہو گیا کہ کیا شاہدہ اب بھی دیکھ رہی ہے اور اس طرح

تع پر اس کی نظریں شاہدہ سے ٹکرا کر جھک جاتیں۔

ڈرائنگ روم کی گھٹن بڑھ رہی تھی۔ گفتگو جاری تھی۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ اختر نے ایک بار گھبرا کر کھڑکی سے باغ کے جھومتے ہوئے درختوں کو اور پھر ایک نظر شاہدہ کی جانب دیکھ کر باہر نکل گیا۔ باغ کی کھلی فضا میں پہنچتے ہی اس نے ایک لمبا سانس لیا جیسے ابھی ابھی کسی مصیبت سے چھٹکارا پایا ہو۔ وہ بادام اور سنگتروں کے درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا باغ کی آخری حدود تک چلا گیا اور یوکلپٹس کے بڑے بڑے درختوں کے نیچے ریلنگ کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف چھائے سناٹے اور فضا میں رچی ہوئی ٹھنڈک سے اس نے کچھ سکون محسوس کیا اور وہیں ریلنگ سے لگا ہوا خلا کی بے پناہ وسعتوں کو دیکھنے لگا۔ اسے چاندنی راتوں ہی اداس معلوم ہوئے۔ اداس اور تنہا۔ کہرآلود فضا میں گھلی ہوئی ملگجی ملگجی چاندنی بالکل بےکیف اور بے جان معلوم ہوئی۔ اس میں زندگی کی کوئی حرارت نہ تھی۔ وہ زندگی چاہتا تھا۔ ایک متحرک زندگی رواں زندگی۔ ایک جاندار زندگی جس میں روزمرہ کی زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت نہ ہو جس میں نیا پن ہو، انوکھا پن ہو۔ یہ صبح و شام میں بٹی ہوئی زندگی۔ یہ کس قدر بےکیف ہے ہر جگہ ایک ہی فضا ہے ایک سی ایک سی زندگی۔ زندگی جس میں جگہیں بدل کر بھی نہیں بدلتیں جس میں وقت گزر کر بھی نہیں گزرتا۔ جیسے وقت اپنی روانی کے باوجود ساکن ہو جیسے دنیا اپنی تبدیلیوں کے باوجود یکساں ہو۔ جامد ہو۔ غیر متحرک ہو جس میں انسان کے دل و دماغ میں کوئی جدت نہ رہ گئی ہو جس میں انسان ہنگاموں کے درمیان بھی تنہائی محسوس کرے۔ ایک خوفناک ہر سمت گھورتی ہوئی تنہائی جو اعصاب پر چھائی چلی جائے۔

کون سا پرابلم (problem) سالو (solve) کر رہے ہو۔ وہ چونکا۔ خیالات کا دھارا جیسے اپنا بہاؤ چھوڑ کر رک گیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے بائیں طرف شاہدہ اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اسے ہاتھ کے ہلکے دباؤ میں کچھ گرمی معلوم ہوئی۔ گرمی جو زندگی کی علامت ہے۔ کاش یہ دباؤ اور زیادہ ہوتا۔ اس نے سوچا۔ شاید اس تنہائی سے سکون میں اضافہ ہوتا۔

"پرابلم۔ پرابلم۔ ہاں .... بہت بڑا پرابلم ہے — زندگی کس قدر بورنگ ہے۔ کس قدر بےکیف۔ کس قدر بوجھل۔ کس قدر تنہا کس قدر اداس، وہ رک رک کر کہہ رہا تھا اور پھر اسے خود ہی حیرت ہوئی کہ وہ کیا کہہ گیا۔ لیکن جذبات کے اس بہاؤ سے اس نے پھر کچھ اطمینان ... محسوس کیا۔

ہاں ہے تو۔ ہر چیز ایک معمول ایک روٹین (Routine) بن گئی ہے۔ لیکن اسی روٹین سے انحراف زندگی ہے اور ... اور .... اور .... مجھے تم سے ہمدردی ہے؟"

شاہدہ جیسے بہت کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اختر نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پھر اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو اور وہ پھر دور گہری ہوتی ہوئی کہر کو دیکھنے لگا:

"لیکن کہیں اس (routine) سے فرار بھی روٹین ... (routine) نہ بن جائے۔"

"کیا پتہ" شاہدہ نے آہستگی سے کہا: وہ پھر دور فضا میں چاند پر ہر لحظہ گہری ہوتی ہوئی کہر دیکھنے لگا۔ چاندنی کچھ اور ملگجی ہو چلی تھی فضا کچھ اور تاریک ہو گئی تھی۔ تنہائی اور اداسی اور گمبھیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس تنہائی، اداسی، تاریکی اور چاندنی کے کہرآلود ملگجے پن میں شاہدہ کا قرب اسے ہر لحظہ عدم سے وجود کا احساس دے رہا تھا ایک ایسا وجود جو وجود سے کچھ کم ہو لیکن عدم سے زیادہ۔ اس نے شاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آہستہ سے دبایا اور ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی گھنٹی کو سنکر آہستہ آہستہ لوٹ پڑا۔

(۲)

'ہمدردی' کئی دنوں تک یہ لفظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتا رہا وہ بار بار اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتا اور پھر دل ہی دل میں مسکرا دیتا۔ اسے یہ ہمدردی بڑی معنی خیز معلوم ہوئی۔ اسے بھی تو شاہدہ سے ہمدردی ہے ایسی ہمدردی سے جو اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن وہ تو شادی شدہ ہے اور اس نے سامنے رکھے ہوئے خاکدان میں سگریٹ کو آہستہ آہستہ مسل ڈالا اور پھر جب وہ مسلسل کوشش کے باوجود اس ہمدردی .. مسکراہٹ اور دزدیدہ نگاہوں کو نہ بھلا سکا تو اس نے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ شاید اسے شاہدہ سے محبت ہو گئی ہے۔ 'محبت' یہ ایک لفظ ہر عنوان سے اس کے ذہن میں گونجتا رہا۔ محبت۔ پرائی عورت سے، جرم، گناہ، سنگین

فرار، بیگانگی، نیاپن۔ خیالات کا یہ رخ اس کے لئے ہمیشہ پریشان کن ہوتا وہ بار بار ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن یہ تحت الشعور کے نہ جانے کن گوشوں سے ابھر آتے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ کوئی ناول اٹھا لیتا یا پھر کوئی غزل گنگنانے لگتا۔

اور پھر رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ یہ محبت اس کے لئے بہت غیر معمولی تھی۔ غیر معمولی۔ یہ لفظ اس کے ذہن میں خود بخود آگیا تھا۔ اسکی زندگی میں یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ایک حادثہ، ایک تجربہ جس میں بے پناہ نیاپن تھا۔ جس نے اس کے روزمرہ کے معمولات پر کافی اثر ڈالا تھا۔ ایک تجربہ جس کی بدولت اکثر زندگیاں روحانی ارتقا کے ایک نئے موڑ سے دوچار ہوتی ہیں۔

اور پھر شاہدہ کو خط لکھتے وقت اس نے لکھا تھا کہ انسان کے اندر سے اگر محبت کی صلاحیت ختم ہو جائے تو وہ موت سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور جس وقت وہ پہلے پہل محبت کرتا ہے تو زندگی میں ایک نئی زندگی سے روشناس ہوتا ہے جبکہ اس کے جذبات میں شدت اس کی بصیرت میں گہرائی پیدا ہوتی ہے یہ اور اسی طرح کی نہ جانے کتنی فلسفیانہ باتیں۔

لیکن درحقیقت اختر کو اپنا یہ نیا موڑ بہت ہی پیچیدہ معلوم ہوتا اسے اپنے شدید جذبات تجزیے کے بعد بالکل سطحی معلوم ہوتے اور بعض اوقات تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ جذبات واقعی فطری ہیں یا مصنوعی۔ یہ جذبات خود بخود اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا وہ جان بوجھ کر انہیں طاری کرتا ہے۔ ان سب کے درمیان وہی بے چین کر دینے والا مستقل احساس وہی احساس جرم۔ وہی احساس گناہ وہی معمول سے فرار اور فرار کے پھر معمول بن جانے کا خطرہ۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اب وہ اس احساس سے آسانی سے نپٹ لیتا۔ کہیں وہ ان احساسات کو محض فریب کی چادر میں تو نہیں لپیٹ لیتا۔ اب وہ اس خیال سے بھی گریز کرنے لگا تھا اور وہ شاہدہ کو خطوط لکھتے وقت کوشش یہی کرتا کہ جذبات کا ایسا پرشور سیلاب بہائے جس کے سامنے مضبوط سے مضبوط قدم بھی نہ جم سکیں۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں وہ اپنے کو یہ بھی یقین دلاتا کہ وہ شاید دنیا کا سب سے دیوانہ اور جذباتی عاشق ہے لیکن دن کے اوقات میں وہ اپنے سارے کام اسی طرح کرتا کہیں ان سے جھنجھلاتا کبھی اپنی محبت سے اور سوچتا کہ یہ سب محض ایک فراڈ ہے۔ یہ زندگی یہ اس کے ہنگامے۔ یہ معمولات ہاں ہاں یہ محبت بھی لیکن پھر یہ نیا فراڈ بھی اسے اہم معلوم ہوتا کم از کم نیاپن تو ہے۔

شاہدہ کے لئے بہرحال یہ محبت کوئی فراڈ نہ تھی۔ وہ پہلی نظر اسے دل دے چکی تھی۔ بیچاری شاہدہ۔ وہ ایسے موقعوں پر کچھ غمزدہ سی ہو لیکن اس کی غمزدگی بڑی اکتا دینے والی تھی اور اس غمزدگی کا سبب شاید یہ تھا کہ اس کے حسن، صحت اور جوانی اور اس کے والہانہ عشق کے باوجود کسی نوجوان نے اس سے شادی کی تمنا نہ کی تھی اور کوئی نوجوان اس شادی کی تمنا کرتا بھی کیوں۔ وہ حسین ضرور تھی لیکن اس کا حسن ماحول تازگی اور فرحت بخشنے کے بجائے ماحول کی ہر تازگی کو اپنے اندر جذب کر وہ جب کسی ڈرائنگ روم میں جاتی تو بجلی کے قمقمے مدھم پڑ جاتے جیسے کرنٹ ہلکا پڑ گیا ہو۔ وہ بالکل ایک سوختہ تھی جو ہر زندگی اور ہر ذرہ کو رنگ برنگ کی روشنائیوں کی طرح جذب کر لیتی۔ شاہدہ کو اس مستقل احساس تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی سمجھتی وہ ٹریجیڈی جس نے اس کا ہر عشق ناکام کر دیا اور جس کی وجہ سے اس محض سماج کے نشتروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس بڈھے کھوسٹ جوہری کی پہلی ہی پیش کش پر اسے قبول کر لیا تھا۔ تیس سالہ شاہدہ آخر کب تک اپنی ناؤ کو سماج کے منجدھار میں بنا کسی ناخدا کے کھے سکتی تھی۔ وہ بڈھا کھوسٹ جوہری جس کے پاس کوئی زندگی اور کوئی تازگی نہ تھی جسے وہ جذب بھی کر سکے۔ یہ احساس ہمیشہ اسے اندوہگیں اور کربناک بنا دیتا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اسے ہر موقع اپنا جال پھیلانا چاہیے تاکہ وہ خود جس جال میں پھنسی ہوئی ہے اسے توڑ سکے۔

اور پھر جب شاہدہ نے اپنے اس نئے عشق کا ذکر مسز [illegible] کیا تو اس نے اس میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ لیتے ہوئے اس سے کہا کہ اگر وہ اختر سے محض اپنے جذبات کی تسکین چاہتی ہے تو وہ بخوشی ایسا کر سکتی ہے۔ اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی نظر میں اتنی ہی اہمیت ہے کہ دو جسموں کے اتصال سے باہمی محبت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور مرد عورت کا احسان مند ہو جاتا ہے اور پھر یہ عین فطرت ہے لیکن اگر اسے یہ خیال ہے کہ اختر اس کے کھوسٹ جوہری کی جگہ لے لیگا تو یہ محض

غلط فہمی ہے۔ اور شاہدہ کو مسز شمعون کی اس بات سے کوئی صدمہ نہ ہوا کیونکہ وہ اس کی دیرینہ ہمراز تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ یورپ اور امریکہ میں گذارنے کی وجہ سے اس کے تجربات زیادہ وسیع تھے اور عشق اور جنس کے موضوعات پر وہ ہمیشہ بڑی بے باکی سے خیالات کا اظہار کرتی۔ اسلئے شاہدہ مسز شمعون کی اس بات پر محض مسکرا کر خاموش ہوگئی کیوں کہ اسے یقین تھا کہ بڈھی مسز شمعون نہ تو اس کے پرابلم کو سمجھتی ہے اور نہ اختر کو۔

(۳)

اور پھر ایک دن اختر نے اسے اپنے شام نگر کے مکان میں کچھ عرصہ کے لئے ٹھہرنے کو مدعو کیا تو اس نے بخوشی منظور کر لیا۔ شام نگر جیسے پرفضا اور خنک مقام پر اختر کا ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جو تین طرف سے سیب اور بادام اور الوچوں کے باغ سے گھرا ہوا تھا اور پشت پر باغ کے درختوں کی جڑ سے جھیل کا ساکن نیلگوں پانی ہمہ وقت آہستہ آہستہ بہتا رہتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑی چیز وہ گہری خاموشی تھی جو فضا میں ہر وقت طاری رہتی۔

شاہدہ پروگرام کے مطابق اتوار کو ٹھیک تین بجے وہاں پہنچ گئی اختر اپنے کاروبار کے بعض ضروری امور سے فارغ ہو کر ۴ بجے کار سے پہنچنے والا تھا شاہدہ بادام کے ٹھنڈے سائے میں جھیل کے کنارے تنہا بیٹھی اختر کا انتظار کر رہی تھی۔ باغ کی ہر شے سہ پہر کے ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں بالکل پکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اور سیب اور آلوچوں کے پتوں سے چھوتی ہوئی ہوا اس کے دل و دماغ کو یوں خوابیدہ بنا رہی تھی اور اس پکی ہوئی فضا میں سامنے جھیل کا نیلگوں پانی نرم خرام تھا اور وہ انتظار کر رہی تھی لمحہ وقت گزر رہا تھا۔ لگے کی جانب کھسک رہا تھا کسی نامعلوم واقع کیطرف جو اس کی زندگی کے تمام۔ ظاہر اسکون کو درہم برہم کر دینے والا تھا۔

شاہدہ نے ایک جھرجھری لی۔ نہیں ایسی کوئی بات نہ ہوگی اس نے کہا اگر تم اس سے جذبات کی تسکین چاہتی، اس کے کان میں مسز شمعون کے الفاظ گونج رہے تھے اور پھر وہ مسکرا دی۔ نہیں نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہ ہوگا اسے اختر سے کتنی محبت ہے۔ اور اختر کو اس سے بھی۔ کیسے کیسے خطوط اس نے لکھے ہیں۔ اختر جو عشق کو زندگی کی قوت متحرکہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے اقبال کے وہ اشعار لکھے تھے کہ عشق ہی سے زندگی کی نواؤں میں زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی عشق کا تصور کس قدر حسین ہے۔ کس قدر جان آفریں۔ کس قدر بلند۔ اور مسز شمعون۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور سامنے زمین پر تھوک دیا۔ اور پھر وہ مسکرا دی۔

وقت گزر رہا تھا اور سورج کی شعاعیں اس کے زوال کیساتھ ساتھ رنگین ہوتی جا رہی تھیں۔ باغ کی سمیں چمک اب سنہرا پن لے رہی تھی۔ بیداری خوابیدہ ہو رہی تھی اور وہ شاہدہ جھیل کے کنارے بادام کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ وہ کبھی پانی بنتی بگڑتی ننھی ننھی شوخ لہروں کا تماشہ دیکھتی اور کبھی مڑ کر باغ کے دروازے کو۔ وقت کے اس بہاؤ میں اب وہ کچھ سکون کر رہی تھی۔ اسے مستقبل کی طرف سے اطمینان تھا۔ قریب کھسکتی ہوئی شام سے مسحور ہو کر وہ یہیں سو جانا چاہتی تھی۔ ایک بے پناہ مسرت اس کی نس نس سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس رہ رہ کر اختر کا خیال آ رہا تھا۔ دور جھیل کی سطح پر ایک بگلے نے یکایک غوطہ مار کر ایک مچھلی پکڑ لی اور وہ مسکرا دی اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر جھیل کی جانب دیکھنے لگی۔ بگلا مچھلی لیکر کہیں دور جا چکا تھا اسے اختر کا خیال شدت سے آ رہا تھا کتنی مٹھاس ہے اس خیال میں۔ کتنا بس ایسی مٹھاس جو بیان سے باہر ہو۔ اختر۔ اس کا اختر اور یکایک اسنے محسوس کیا کہ اختر اس کے پہلو میں کھڑا ہے۔

اوہ اختر۔ وہ کھڑی ہوگئی۔

اختر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس نے اسکی جانب ایک بار دیکھا اور پھر سامنے جھیل کی نیلگوں سطح کو دیکھنے لگا۔ ریلنگ پر جھکتے ہوئے جھیل کی شفاف سطح پر اسے اپنا عکس نظر آیا۔ جھیل کی سطح پر اس کا اپنا چہرہ زندگی کی ہر حرارت سے خالی معلوم ہوا۔ اس پر پوری سنجیدگی طاری تھی۔ ایک عرصہ تک دونوں خاموش رہے۔ شاہدہ کی آنکھیں اختر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ دن ڈھل رہا تھا اور ڈھلتا جا رہا تھا۔ شام کا ڈھلتا سورج رفتہ رفتہ زرد ہو رہا تھا۔

شاہدہ، اختر نے یکایک کہا جیسے وہ ایک عرصہ سے بولنے کی کوشش کرتا رہا ہو اور آخر کار بڑی مشکلوں سے کامیاب ہوا ہو" میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں یہاں بلا کر کچھ اچھا نہ کیا۔ یہ بالکل غلط تھا۔ مجھے افسوس ہے لیکن میں اس لئے آئی کہ میں آنا چاہتی تھی۔ شاہدہ کی آواز میں کچھ خوف تھا۔

اختر نے اس کی جانب دیکھا اور پھر جھیل کی طرف دیکھنے لگا جیسے جھیل کی صاف سطح کے نیچے کوئی خاص چیز چھپی ہوئی ہو۔" یہ بہت زیادتی تھی بڑی زیادتی تھی۔ مجھے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ مرد کے لئے یہ ایک معمولی بات ہے لیکن عورت کے لئے اور پھر تمہارے لئے اور پھر یہ محض ایک فرار ہے وقتی فرار۔ زندگی کی تنہائیوں سے اداسیوں سے لیکن یہ تنہائیاں اور... اداسیاں پھر چھا جائیں گی۔

لیکن میں کہہ رہی ہوں کہ میں خود یہاں آنا چاہتی تھی۔ ڈوبتی ہوئی شام میں اس کی آواز ایک چیخ کی طرح پھیل گئی۔

نہیں یہ میری بڑی زیادتی تھی۔

یہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ شاہدہ نے کہا اور پھر آگے کی جانب جھک کر اس نے اختر کے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈال دیں۔" بیوقوف۔ اس نے آہستہ سے کہا: کیا تمہاری محبت کی خاطر میں اتنا بھی نہیں کر سکتی۔"

اختر اسی طرح جھیل کی سطح دیکھے جا رہا تھا جھیل کا پانی اسی طرح بہہ رہا تھا۔ شاہدہ کی انگلیاں اسی طرح اس کے بالوں سے کھیل رہی تھیں اور کبھی کبھی ان انگلیوں کا لمس اسے اپنی گردن کی پشت پر بھی محسوس ہوتا اور یکایک اسے شاہدہ سے ایک نفرت سی محسوس ہوئی۔ احمق۔ اس نے دل میں کہا، آخر یہ سمجھتی کیوں نہیں کہ میں اسے نہیں چاہتا اور اس نے یسے یقین کر لیا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ کار میں آتے ہوئے تمام راستے وہ یہی سوچتا رہا تھا۔ وہ کیوں اپنی شخصیت اس میں جذب کر دے۔ کیوں اپنی شخصیت کھو دے پھر یہ فرار ایک وقتی فرار ہوگا۔ زندگی کی بوریت کا یہ کوئی علاج نہیں۔ اور پھر یہ سوالات اس وقت اور بھی شدت سے اس کے سامنے آئے تھے جب وہ سیب کے درختوں کے درمیان سے شاہدہ کو دیکھتا تھا۔ بالکل خاموشی سے اور شاہدہ کو اس کی خبر بھی نہ تھی اور وہ کبھی پانی کی طرف دیکھتی اور کبھی باغ کے دروازے کی طرف اور پھر زیر لب مسکرا دیتی جیسے اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو۔

اختر ذرا اور کھسک کر اس کی دسترس سے باہر ہو گیا اور اس نے ایک لمحہ کے لئے پھر شاہدہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں جذبات سے بالکل خالی تھیں اور شاہدہ نے محسوس کیا کہ ایک ٹھنڈی لکیر سی اس کی ہڈیوں میں اتری چلی جا رہی ہے وہ کانپ اٹھی۔ اس کے لب ہلے مگر وہ بول نہ سکی۔ شام کی پھیل رہی تھی۔ اختر دور کہیں خلا میں دیکھ رہا تھا۔ شاہدہ نے اسے نگاہوں سے دیکھا اور پھر یکایک اس پر خوف کی کیفیت طاری ہو لگی۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا خاموشی ہر لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی یہ خاموشی اسے موت کی خاموشی معلوم ہوئی۔ اس کے چہرے سے مسر کی لہر معدوم ہو گئی۔

کیا ماجرا ہے؟ آخر کار اس نے بمشکل کہا۔" تم کیوں اس قدر عجیب غریب ہو؟ کیا بات ہے اختر؟ کیا بات ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے اور آگے بڑھ کر اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے اپنی جانب پھیر لیا۔ کیا بات ہے اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اختر نے اپنے کو چھڑا لیا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔" کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایک غلط فہمی تھی۔ مجھے افسوس ہے میرا خیال ہے کہ مجھے چلا جانا چاہیئے۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔"

اور پھر بلا اس کے جواب کا انتظار کئے ہوئے۔ بلا اپنی بات کو واضح کئے ہوئے وہ لوٹ پڑا اور مکان کی طرف دوڑنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بال بال بچ گیا۔ اس نے سوچا۔ اس نے اچھی طرح سر انجام نہیں دیا نہ کسی غیر معمولی جرأت اور پامردی کا ثبوت دیا۔ پھر بھی بہر حال وہ بچ نکلا بیچاری شاہدہ! اسے اس پر افسوس ہوا لیکن وہ آخر کار اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے ایک لمحہ کے لئے خیال ہوا کہ شاہدہ کو اس کا غم رہے گا۔ اس خیال سے اسے کچھ لذت بھی ملی لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ یقیناً اس کا زیادہ خیال نہ کرے گی۔ اس نے دروازے سے باہر نکل کر اسے بند کر دیا۔ شاہدہ باغ میں پھر تنہا تھی۔ باغ پر سیاہی پھیل چلی تھی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی رہی۔ کیا وہ واقعی چلا گیا۔ دور ایک کار کے اسٹارٹ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ وہی بے پناہ سناٹا اور اس میں وہ تنہا تھی۔ جھیل کا سنگلوں پانی اب کچھ سیاہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی روانی بھی ختم ہو چلی تھی۔ سورج غروب ہو چلا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی چلتے چلتے رک گئی ہو اور وہ آہستہ آہستہ وہیں جھیل کے کنارے بادام کے خنک سائے میں لیٹ گئی۔

شمیم جاوید

کالج الکشن

کالج کا Election دیکھا
چہروں کا Attraction دیکھا
Candidate کا ہر voter سے
Mode of conversation دیکھا
لب پر کچھ اور دل میں کچھ تھا!
voter کا Intention دیکھا
Booth کے باہر Booth کے اندر
perception، Conception دیکھا
اغراضِ رنگیں کا Drama
ہم نے Declaration دیکھا

صبح سے کالج میں ہرسو!
ایجنٹوں کا دنگل دیکھا
ایجنٹوں کے اس دنگل میں
Candidates کا منگل دیکھا
کچھ ایسے بدقسمت دیکھے
جن کو بالکل Single دیکھا

دیواروں پر، دروازوں پر!
...موں کی گلکاری دیکھی
Hall کے اندر، Hall کے باہر
نعروں کی بمباری دیکھی
گوشے گوشے میں Canvassing کی
Infectious بیماری دیکھی

کچھ چہروں پر زردی دیکھی
کچھ ہاتھوں میں سردی دیکھی
چائے بھی پی کر ووٹ نہ ڈالا!
ایسی بھی بے دردی دیکھی

اک نووارد دوشیزہ کے
ہر جانب تنہائی دیکھی
اسکی ہر خاموشی نظر میں
ایک حزیں گویائی دیکھی

ایک نہالِ سبز کو ہم نے
کھلاتے، مرجھاتے دیکھا
دُور شفق پر زردی دیکھی!
بدر گہن میں آتے دیکھا!

ملکِ صبا کی اک ملکہ کو
ہم نے شاداں شاداں دیکھا
اُن کا تختِ الکشن دیکھا
اُن کا تختِ سلیماں دیکھا

اور اک دھیاری کے ووٹر
وقت پہ اس سے روٹھے دیکھے
چار قدم تھا جب کہ ساحل
ناؤ کے تختے ٹوٹے دیکھے

سابق نائب صدر کی ہم نے
"کارِ پُراسرار" کو دیکھا!
حیدر کی شمشیریں دیکھیں
مظہر کے اظہار کو دیکھا

ہنسنے اور ہنسانے والے
ڈھول پری مہراج کو دیکھا
اُن پر غلبہ پانے والے
راجہ پرتھی راج کو دیکھا

لاوارث کو بھی ورثہ سے
ووٹ کی پونجی پاتے دیکھا
آہ الکشن! واہ الکشن!
دیواروں کو گاتے دیکھا!

گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج مشن روڈ، کراچی

گیان سروپ •

روئیں گے ہم ....

مورا نویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ میں نے اس دبلی پتلی لڑکی کو ہنستے تو کیا مسکراتے بھی بہت کم دیکھا ہے۔ اس کے چہرے پر شوخی کے بجائے ہمیشہ ایک عجیب سی اداسی چھائی رہتی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ دکان کو جاتے وقت مختلف چوراہوں پر اسکول کی بسوں کے منتظر کھڑی مورا کی ہم عمر لڑکیوں کو دیکھا ہے ان کے چہرے کس قدر پُر رونق ہوتے ہیں اور مورا کی مغموم صورت .... میں سوچنے لگتا ہوں ..... شاید میری بہن کو اس عمر میں ہی اپنی ناداری کا ضرورت سے زیادہ احساس ہو گیا ہے۔ مورا کو جب بھی کوئی چیز درکار ہوتی ہے تو وہ چپکے سے میرے پاس آبیٹھتی ہے اور چپ چاپ بیٹھی مجھے عجب نگاہوں سے گھورتی رہتی ہے میں ان نظروں کا مفہوم خوب سمجھتا ہوں۔ اور مجھے خود ہی پوچھنا پڑتا ہے۔

"کیا بات ہے مورا؟"

لیکن میرا چھوٹا بھائی راجی، جو کہ ابھی چھٹی جماعت کا طالب علم ہے اپنی ضروریات کو مجھ پر ظاہر کرنے کے لئے قدرے مختلف ذریعے سے کام لیتا ہے راجی یوں تو رات کو میرے گھر لوٹنے سے پیشتر ہی سو جاتا ہے لیکن جب اسے کوئی ضرورت لاحق ہوئی۔ وہ رات گئے تک دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا میرے دکان سے واپس آنے کا انتظار کرتا ہے اور اسی روز وہ ننھی سی اونگھتی ہوئی آنکھیں میرا استقبال کرتی ہیں۔ میں ایک کامیاب ڈاکٹر کی طرح مرض بھانپ لیتا ہوں، اور خود ہی پوچھ لیتا ہوں۔

"کیا بات ہے راجی صاحب؟"

مورا ویسے تو ہر روز میرے دکان کو روانہ ہونے سے پہلے ہی اسکول کو چل دیتی ہے لیکن آج صبح مورا خلاف معمول اسکول جانے کو تیار نظر نہ آتی تھی وہ چپ چاپ میری چارپائی پر بیٹھی مجھے اپنے مخصوص ڈھنگ سے گھور رہی تھی "کیا بات ہے مورا؟" میں نے خوب سمجھ لیا تھا کہ مورا کو کسی شے کی طلب تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں ...... کچھ تو ہے ..."

"نہیں تو۔"

"اچھا ...... تو یہ بات ہے ..... ہمیں بھی نہیں بتاؤ گی۔" میں نے شفقت سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں اسکول نہیں جاؤں گی۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"ارے بھئی کیوں؟"

"بس ...... کہہ جو دیا۔" مورا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس کی اس کی آواز رندھ چلی تھی

"پھر بھی؟"

"میرے پاس جغرافیہ کی کتاب نہیں۔"

اور مجھے جیسے سانپ ہی تو سونگھ گیا۔

"بہن جی مجھے سارا سا (Period) بنچ پر کھڑا رکھتی ہیں" مورا کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور اس کی رندھی ہوئی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔ پر میں خاموش تھا۔ اور مورا کے بے رونق گالوں پر لڑھکتے ہوئے آنسوؤں کو تکتا رہا۔

"میں کھڑی کھڑی تھک جاتی ہوں۔" مورا المناک گھٹن سے دبی آواز میں کہے جا رہی تھی لیکن میں بدستور چپ سادھے تھا۔

"اور پھر بھیا ...... " مورا نے مجھے ابھی تک خاموش پا کر میرے گھٹنوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا ... "مجھے ایسا پتہ لگتا ہے جیسے کسی نے میری ٹانگوں میں سے ہڈیاں نکال لی ہوں۔"

"ارے بس ..... اتنی سی بات پر اتنے موٹے آنسو ... چل ہٹ پگلی جغرافیے کی کتاب ہی چاہیئے نہ ...... لو آج ہی لو ..."

اب میرے لئے چپ رہنا مشکل ہو چکا تھا میں نے خشکی بچاتے ہوئے

حالانکہ میں جانتا تھا کہ میری جیب میں فقط چودہ آنے سے زیادہ کی رقم نہ تھی اور
...رافیہ کی کتاب بھلا دو تین روپے سے کم میں کیا آئے گی۔ جی چاہتا تھا کہ اپنی
...بسی پر دل بھر کر رو دوں، چیخوں، چلاؤں اور ایک ہنگامہ بپا کر دوں لیکن
...سب کچھ مورا کی موجودگی میں کیوں کر ہو سکتا تھا۔

"تو آج کتاب آجائے گی نا؟" اس کی افسردہ آنکھیں کسی حد تک
...تی تھیں)۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں..... میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔
مورا نے اپنے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور بستہ اٹھا کر جلدی جلدی جاتے
...ت اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ
...ہو...... دیکھو بھیا...... کتاب ضرور آجائے...... ورنہ
...ٹانگیں......

مورا جا چکی تھی، اور میں میونسپلٹی والوں کو کوس رہا تھا جنہیں میں
...دکان ہر ہفتے بھر میں ایک بھی ناغہ نہ کرنے کے جرم میں کل ہی ۲۰ روپے جرمانہ
...ا تھا کم بخت چاہتے ہیں کہ ہفتے میں ایک ناغہ ضرور ہو، چاہے اس روز
...ے گھر میں روٹی تک نہ پکے..... میں پاگلوں کی مانند اکیلے ہی میں بڑبڑانے
...ر دوسرے کمرے سے ماں جی بولیں۔

"کیا کہہ رہے تھے رام کشن؟"

"کچھ بھی نہیں ماں جی...... کہہ رہا تھا..... ساتھ کے لئے روٹی
...دو۔ دکان کا وقت ہو گیا ہے۔" میں نے اپنی جھینپ مٹانے کو یونہی کہہ دیا۔
ابھی میں نے فٹ پاتھ صاف کر کے دری ہی بچھائی تھی کہ جین کلاتھ
...کے مالک جین بابو تشریف لے آئے اور چھوٹتے ہی بولے:

"کہو بھئی رام کشن۔ گورنمنٹ دکان کب دے رہی ہے تمہیں؟"

"جین بابو۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ گورنمنٹ کے کام ہیں..... میں
...مرسا جواب دیا۔ دراصل جین بابو کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ میں ان کے
...یمپوریم کے آگے کی پٹڑی سے اپنی دکان اٹھا لوں۔ ان کے نزدیک میری
...ن کے ایمپوریم پہ ایک دھبہ تھی۔ جین بابو نے کبھی سیدھے طور پر میرے
...کی کوشش نہ کی تھی چونکہ انہیں علم تھا کہ میں پٹڑی بیوپار منڈل کا
...ی ہوں۔

"تم نوکری کیوں نہیں کر لیتے..... خیر سے پڑھے لکھے شخص ہو۔"

"کوشش تو کب سے کر رہا ہوں..... باقی فکر نہ کیجئے جین بابو!...
جس دن بھی ملازمت مل گئی اسی روز یہ بوریا بستر گول کر لوں گا۔" میں نے بات
چیت کو ختم کرنے کے لئے دو ٹوک جواب دیا۔

"بھئی میرا کوئی یہ مطلب تھوڑا ہی تھا..... یوں تمہیں اختیار
ہے۔" جین بابو منہناتے ہوئے واپس جا رہے تھے۔
مورا کے لئے جغرافیہ کی کتاب میرے سامنے ایک مسئلہ بنی کھڑی تھی
کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا گاہک آ نکلتا۔

"لٹھا ہے؟"

"جی نہیں۔ میرے پاس تو صرف دھوتیاں ہی ہیں۔" میری امیدوں
پہ گویا اوس پڑ جاتی۔ گاہک ساتھ کی پٹڑی والی دکان پر چلا جاتا، اور وہ
دکاندار اپنے پاس لٹھا نہ ہونے پر بھی جین کلاتھ ایمپوریم سے بلیک میں لٹھا
خرید کر گاہک کو نسبتاً اونچے نرخ میں فروخت کر دیتا تھا۔
دوپہر ڈھلنے لگی تھی، اور پھر جیسے گاہکوں کا تانتا بندھنے لگا۔

"ململ ہو گی؟"

"جی نہیں۔ میرے پاس تو صرف دھوتیاں ہی ہیں۔"

"زین ملے گی؟"

"جی نہیں۔ میرے پاس تو صرف دھوتیاں ہی ہیں۔"
گاہک آتے رہے، پوچھتے رہے۔ اور میں اپنا مخصوص جواب دہراتا
رہا۔ نہ جانے رہ رہ کر کیوں یقین ہوا جا رہا تھا کہ آج دھوتیوں کا کوئی خریدار
نہیں آئے گا۔ اور اس یقین کے ساتھ ساتھ دل میں بلیک کرنے کا خیال کروٹیں
لینے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے کوئی دل میں پکار رہا تھا۔

"پاگل ہو گیا ہے رام کشن! بھلا تو کیونکر بلیک کر سکتا ہے...... تو
تو سوسائٹی کا ایک ذمہ دار فرد ہے...... پٹڑی بیوپار منڈل کا سکرٹری
ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ دو گاہک تشریف لے آئے۔ میری
متجسس نگاہوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔

"لٹھا ہے تمہارے پاس؟" ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔
جی میں آیا کہ اپنا مخصوص جواب دہرا دوں لیکن پھر جیسے کانوں میں
کہیں دور سے مورا کی دلدوز آواز سنائی دی "بھیا! میری ٹانگیں...."

"ہاں بھئی کہو نہ۔ لٹھا ہے یا نہیں؟" گاہک بے صبر ہو اٹھا۔

"سب کچھ موجود ہے صاحب۔ فرمایئے کتنا چاہیئے آپ کو؟"

"سوا چھ گز"

"ذرا رکئے۔ میرا مطلب ہے تشریف رکھئے۔ ابھی اندر سے لائے دیتا ہوں" میں انہیں وہیں کھڑا کر کے جین کلاتھ امپوریم سے لٹھا خرید لایا اور ان کے حوالے کر دیا۔

"کتنے پیسے ہوئے؟"

صرف سولہ روپے ساڑھے چھ آنے"

"وہ کیسے؟"

"دو روپے دس آنے فی گز کے حساب سے"

"تو بھاؤ بڑھ گئے ہیں کیا؟" انہوں نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

"ہاں صاحب...... آپ تو جانتے ہی ہیں گورنمنٹ کی باتیں ہوتیں کبھی اوپر کبھی نیچے...... ویسے میں تو آپ کو کنٹرول ریٹ پر ہی دے رہا ہوں" گاہک میرے عیارانہ جواب سے مطمئن ہو گئے، اور انھوں نے رقم میرے حوالے کر دی لیکن میں پولیس کے گھیرے میں تھا۔ وہ لوگ

کے رکن تھے۔ ایک اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ بچے بھیڑ کی ٹانگوں سے نکل کر بچتے بچاتے میری صورت پر ایک نگاہ ڈالنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے اور پھر سو حقارت آمیز آوازے کسے جا رہے تھے۔

"منہ کالا کر کے گدھے پر گھماؤ"

ایک موٹے شیشوں کی عینک پہنے بلیک زدہ کلرک اپنی چھاتی کو ضرورت سے زیادہ پھلا کر بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

"اجمل خاں پارک میں پھانسی پر لٹکا دو۔ ہمارا بلیک سے کچومر نکل گیا ہے"

اور بچے دکانوں والے چیخ رہے تھے۔

"ان سالوں پٹڑی والوں نے بھی اودھم مچا رکھا ہے۔ دیکھتے نہ...."

میں گذشتہ ایک گھنٹے سے انسپکٹر صاحب کے آگے کھڑا تھا، اور پھر جب انسپکٹر صاحب کو بڑی مشکل کے بعد اپنے مداحوں کی گفتگو سے ذرا فرصت نصیب ہوئی تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"کہو سکریٹری صاحب...... کوئی ضمانت دینے والا ہے؟"

میں خاموش تھا۔

"جلوس تو بڑے دھڑلے کے نکالتے تھے اور وہ فلک شگاف نعرے"

وہ کھلکھلا اٹھے۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مورا کی ٹانگوں کی ساری تھکاوٹ میری ٹانگوں میں سرایت کر گئی ہو اور کسی نے میری ٹانگوں میں سے ہڈیاں نکال لی ہوں۔ میں دھم سے فرش پر بیٹھ گیا۔

"بیلا سنگھ۔ انہیں باہر برآمدے میں بنچ پر لٹا دو......

ہاں دیکھو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے...... سکریٹری صاحب ہیں۔"

انسپکٹر صاحب نے طنزیہ لہجے میں ایک کانسٹیبل کو حکم دیا۔

میں کافی دیر باہر بنچ پر بے سدھ سا پڑا رہا۔ دریں اثنا السنکا صاحب باہر آ گئے اور مجھے شانے سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

"آپ تشریف لے جایئے۔ سیکریٹری صاآآآحب......"

میں بُتِ حیرت بنا ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا کہ جین بابو کی محبت آمیز آواز آئی۔

"رام کشن۔ کچھ غم نہ کرو...... میں نے تمہاری ضمانت دے دی ہے......"

"شکریہ۔ جین بابو...."

"ارے بھئی رام کشن۔ شکریہ کیسا؟...... آج میں نے تمہارا کام کیا ہے۔ یقیناً کل تم میرا کام کرو گے...... ہی ہی...."

"ہاں کیوں نہیں جین بابو...... میں کل سے ہی آپ کے ایمپوریم کے آگے پٹری پر دکان نہیں لگایا کروں گا" میں نے جین بابو کے کام کی نوعیت سمجھتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

"بھئی میرا کوئی یہ مطلب تھوڑی ہی تھا۔ یوں تمہیں......" جین بابو زیر لب مسکراتے جا رہے تھے۔

رات کے گیارہ بجے جب میں دل برداشتہ گھر لوٹا تو میرے پریشان دل کو اس قدر اطمینان ضرور تھا کہ کم از کم گھر والے سو چکے ہوں گے لیکن خلاف امید میاں تو راجی دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور میں نے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا:

"کیا بات ہے راجی؟"

راجی نے میری بات کا جواب دینا مناسب خیال نہ کیا بلکہ آنکھیں ملتے ہوئے اپنی پیٹھ میری طرف کر دی۔

"بھئی یہ کیا؟"

"خود ہی دیکھ لیجئے نا؟"

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نظر دوڑائی اور دیکھا کہ راجی کی اکلوتی نیکر پھٹ رہی ہے۔

"کل سے اسکول جانا بند۔۔۔!"

"لیکن راجی۔۔۔۔ تم اپنی قمیص نیکر سے باہر نکال لیا کرنا!"

"وہ تو آپ کے کہنے سے پہلے ہی کر کے دیکھ چکا ہوں لیکن لڑکے پیچھے سے قمیص اٹھا کر "ہپ۔۔۔۔۔۔ ہپ۔۔۔۔۔ ہُرّا" کر دیتے ہیں۔۔۔ بڑی شرم آتی ہے!" کتنے دلپذیر تھے راجی کے یہ معصوم الفاظ جو اپنے دامن میں تلخیاں بھی چھپائے ہوئے تھے۔

"اچھا کوئی بات نہیں راجی۔ تمہارے لئے کل ہی دہلی کلاتھ ملز کی بنی بنائی نیکر لیتا آؤں گا!"

راجی کے چہرے پر یکدم ایک مسرت سی پھیل گئی بالکل ایسے جیسے صبح نور کے چہرہ پر۔۔۔۔۔۔۔ وہ کود کر اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔

رات بھیگ چلی ہے اور مدہوشی فضا کے ذرے ذرے پر تسلط جمائے بیٹھی ہے۔ کمرے کی کسی دیوار میں گھسا ہوا کوئی کیڑا اسیٹی سی بجا رہا ہے۔ ماں جی، مو راجی اور راجی بھی سو رہے ہیں۔ میں اپنی کھاٹ پہ جسے میں نے آرام کرسی کا لطف لینے کے لئے ڈھیلا رکھا ہوا ہے۔ پڑا پڑا راجی کے معصوم چہرے پر منتد جزر کی مانند پھیلتی اور سمٹتی مسکراہٹ دیکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ راجی ضرور خواب میں دہلی کلاتھ ملز کی بنی بنائی نیکر پہنے اپنے دوستوں کے سامنے شیخیاں بگھار رہا ہوگا۔ مورا۔۔ نیند کی حالت میں اپنی پتلی ماندی ٹانگوں کو زور زور سے بستر پر ٹپک رہی ہے۔ میرا دماغ شل ہو چکا ہے میرا دل میرے سینے میں خاموش ہوا جا رہا ہے۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں اور اب جبکہ میں اپنی پلکوں کو جھپکوں گا تو آنسو میرے کھردرے گالوں کو جلاتے ہوئے میرے ہانپتے ہوئے منہ میں آگریں گے۔ آنسو میری زبان پہ پڑے پڑے نمکین پھر کڑوے نمکین اور آخر میں کڑوے ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ میں انہیں اندر نگل جاؤں گا۔ اور نہ معلوم کب تک یونہی ٹانگوں میں سے ہڈیاں نکلتی رہیں گی، اور پھٹی ہوئی نیکروں پر "ہپ۔ ہپ۔ ہُرّا" کے آوازے کسے جائیں گے؟"

(بشکریہ "افکار")

بقیہ مضمون "مولانا مودودی" صفحہ ۱۴ سے آگے:

ے آپ کو کس انداز گفتگو کی توقع کرنی چاہئیے؟ ———

بزم یاراں ہو یا مجلس بیگانگاں، سوشل زندگی کے وسیع تر معاشرہ ہوں یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ۔ بیوی بچوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولانا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معین معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی۔

(بشکریہ "تعمیر انسانیت")

اشم میرزا

نشیب و فراز!

کرنل شجاع کی لڑکی فرحت کی سالگرہ تھی۔ کیپٹن اکبر کو مدعو کرنے [illegible] مسز شجاع رضامند نہ تھی۔ ایسے بے حس انسانوں سے اسے سخت نفرت تھی [illegible] بھری محفل میں کسی کے جذبات کا ذرا بھی احترام نہ کریں۔ اکبر بھی اسکے [illegible] ایک ایسا ہی بے حس انسان تھا جسے زمانہ کی ترقی سے کوئی سروکار [illegible] ہو دوسروں کی خواہشات حقیر معلوم ہوں اور سوسائٹی کے ادب کا [illegible] پاس نہ ہو۔ مگر اکبر کے احساسات میں کبھی بھی تموج پیدا ہوا ہوتا کسی [illegible] موقعہ پر بھی مسز شجاع کے نیم عریاں جسم کی طرف خاص نگاہ سے دیکھا ہوتا [illegible] ادوں ہی سے اس کے پھڑ کیلے۔ پرکشش لباس کی تعریف کی ہوتی تو اسے [illegible] اکبر کی مخالفت کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر فرحت اسے ضرور [illegible] مدعو کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اپنی ممی کی طرح وہ بھی اکبر کی عادات کو برا سمجھتی تھی [illegible] اس کے ساتھ ہی اکبر کے اصولوں کو شکست دینے کا جذبہ اس کے سینے کی [illegible] گہرائیوں میں ابل ابل پڑ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ اپنی سالگرہ کی [illegible] پارٹی میں وہ ضرور اسے شکست دے دے گی۔ کرنل شجاع گھر کے معاملات میں [illegible] دخل دینے کا عادی نہ تھا۔ اسے اپنی خاص تفریحات ہی سے فرصت نہ ملتی [illegible] اس کے علاوہ دوسرے وہ بات بات پر گھر کے افراد کو ٹوکنا ان کی شخصی آزادی پر [illegible] سمجھتا تھا اس لئے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ فرحت کی ضد غصے [illegible] میں بدلتی جا رہی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ یوں اپنی ممی کے حکم کی تعمیل کرنے سے [illegible] انکار کر رہی تھی۔ پہلے کبھی مسز شجاع نے کسی دوست سے ملنے پر اس سے ناراضگی [illegible] ظاہر نہ کیا تھا اور نہ ہی فرحت کو ممی کی طرف سے کبھی کسی مخالفت کا خدشہ [illegible] تھا اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع [illegible] مسز شجاع کو تو اس وقت انتہائی مسرت حاصل ہوتی تھی جب فرحت [illegible] اپنے نئے دوست کو گھر پر مدعو کرتی تھی۔ مسز شجاع کو اپنے میک اپ اور [illegible] دلکش بناوٹ کی تعریفیں سننے کا جو ایک جنون سا تھا۔ فرحت کے [illegible] اسے پورا کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ اس کے اپنے بھی بہت سے دوست تھے

وہ اس کی خوشامد کرنا خوش قسمتی تصور کرتے تھے۔ مگر مسز شجاع کو ان کی تعریفوں سے سکون نہ ملتا تھا۔ نوجوان افسروں کی محفل میں وہ خود کو ایک شریر دوشیزہ سمجھنے لگتی تھی۔ ان کی تعریفوں سے اس کی زندگی کے ہر گوشے میں خمار کے گہرے سائے پھیل جاتے تھے۔ اپنی شرارتوں سے وہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ کہ ابھی اس کے شباب کا کارواں بڑھاپے کی سرحد سے بہت دور ہے اور فرحت کو ممی کی شرارتوں سے ذرا بھی گھبراہٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔ گو کہ اس کے بعض دوست بالکل بور ہو جاتے تھے مگر فرحت کی ناراضگی سے بچنے کی خاطر وہ اس کی ممی کی معیوب حرکات کو بھی برداشت کر لیتے تھے —— کیپٹن اکبر کو سالگرہ کی پارٹی میں مدعو کرنے کا معاملہ اب جھگڑے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کرنل شجاع جو دونوں کی بحث سے اکتا گیا تھا۔ منہ بنا کر بولا "ڈارلنگ تم ہی اب ہار مان لو۔ بچوں کے ساتھ بڑوں کا یوں جھگڑنا ٹھیک نہیں" مسز شجاع نے تنک کر کہا "تم چپ رہو جی یہ میرا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ اس میں ٹانگ اڑانے کا تمہیں کوئی حق نہیں" کرنل شجاع پر ایک دم فوجی غصہ سوار ہو گیا "تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ اکبر کو مدعو کرنا بھی فرحت کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ تم اپنی کسی پارٹی پر اکبر کو مت بلانا" وہ پائپ کا لمبا کش لگا کر اپنے کمرہ کی طرف چلا گیا۔ اور مسز شجاع اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ فرحت کمرے سے باہر نکل گئی۔ مسز شجاع دیر تک کمرے میں ٹہلتی رہی اور آہستہ آہستہ اس کا غصہ خود بخود ٹھنڈا ہونے لگا۔ اس نے کرنل کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ تھری ایکس کی بوتل سامنے رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ مسز شجاع دروازے سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اپنے پر اسے افسوس ہونے لگا تھا "میں بھی کتنی ضدی ہوں" اس کے ہونٹوں پر غلطی کا اعتراف مسکراہٹ بن کر ابھر آیا۔ صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر وہ سوچنے لگی "فرحت آج پہلی دفعہ مجھ سے ناراض ہوئی ہے۔ اس بدمزاج چھوکرے نے ہمارے درمیان جھگڑا

کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔ خیر اسے تو بعد میں سمجھ لوں گی۔ ابھی مجھے کوئی رنجش پیدا نہیں کرنی چاہیئے۔ کہیں فرحت کے دوست بھی مجھ سے بدظن نہ ہو جائیں۔ ان کے بغیر میری زندگی تلخ بن جائے گی۔ میرے دوستوں میں سے تو کوئی ڈھب کا آدمی نہیں۔" وہ اٹھکر باہر گئی۔ فرحت لان میں کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مسز شجاع دبے پاؤں اس کے قریب پہنچ گئی اور آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھدیئے۔ فرحت چونک سی پڑی اور پھر ممی کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھکر کھڑی ہو گئی۔ مسز شجاع سار بھرے لہجے میں بولی "میری پیاری گڑیا۔ کیا اپنی ممی سے ناراض ہو گئی ہے۔ اتنی معمولی سی بات کو تم نے اتنی اہمیت دی ہے اچھی فرحت۔ تم جانتی ہو۔ تمہارے پاپا پہلے ہی مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتے۔ تمہاری ہی وجہ سے میں اس گھر میں دن گزار رہی ہوں! اور اب تم بھی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہو ——— تم جسے چاہو مدعو کر سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اور فرحت وفور مسرت سے اس سے لپٹ گئی۔ "ممی آپ کتنی اچھی ہیں۔"

کیپٹن اکبر کو یہاں پر تبدیل ہو کر آئے ہوئے زیادہ مدت نہ گزری تھی۔ وہی ماحول تھا جس کے تعفن سے وہ اپنے دامن کی ہر سلوٹ کو بچا آیا تھا۔ مسز شجاع اس کے مردانہ حسن اور صحت مند جوانی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اکبر فرحت کے دوستوں کے حلقہ میں شامل ہو کر اس کی تفریح کا کھلونا بن جائے گا۔ اکبر ہر ایک کے ساتھ بڑے ادب اور خلوص سے ملتا لیکن اس کی کسی حرکت سے بھی دوسروں کو شبہ تک نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی جوانی کو رنگینیوں میں غرق کرنے کا خواہش مند ہے۔ مسز شجاع کی بازاری عورتوں کی سی اداؤں نے اس پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ اس کے میک اپ اور بھڑکیلے نیم عریاں لباس کی تعریف میں اکبر نے ایک کلمہ تک منہ سے نہ نکالا تھا اور مسز شجاع اس کی بے حسی کے متعلق سوچتے ہوئے بے چین ہو جاتی تھی۔ زندگی میں شاید کبھی اکبر جیسے کسی مضبوط ارادے کے انسان سے اسے واسطہ نہ پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی سوچ کسی نتیجہ پر نہ پہنچتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اکبر کو اپنی صحت مند جوانی پر بڑا گھمنڈ ہے اسی لئے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اب وہ اس کوشش میں رہنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح اکبر کی

بے حسی کو جھنجھوڑ دے۔ مگر اکبر نے تو اس جیسی نمائشی عورتوں کو اچھی طرح پرکھا تھا اس لئے وہ کسی حالت میں بھی اس کے ارادوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا خیال تک دل میں نہ لا سکتا تھا ——— فرحت بھی اس سے دلچسپی لینے لگی تھی۔ اسے بھی یقین تھا کہ اکبر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں پہل کرے گا۔ اس سے تنہائی میں ملنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے ساتھ رقص کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ مگر اس میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اس نے اس عجیب انسان کو حیران کن نظروں سے دیکھکر فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی اسے ضد نہ لگائے گی۔ چند دن یونہی گزر گئے مگر اکبر کا خیال آنے پر فرحت ایک عجیب سی بے کلی محسوس کرنے لگی تھی جیسے کسی شے کے کھو جانے کا احتمال ہو۔ اپنے دوستوں میں ہنستے ہنستے اکبر کے خیال کے ابھرنے پر وہ خاموش ہو جاتی۔ اور پھر اسے سینے میں ایک ٹیس سی پھیلتی محسوس ہوتی۔ "بے تقیر" اس کا دل چیخ اٹھتا۔ اور وہ دوستوں کے پاس سے اٹھکر تنہائی میں آ جاتی۔ اور درد بڑھ جاتا۔ مسز شجاع اکبر کا ذکر آنے پر اپنے غصہ کا اظہار کرنے لگتی۔ تو فرحت خاموش نظروں سے ممی کو دیکھتی رہتی۔ اگرچہ اکبر نے اس کے جذبات کا احترام نہ کیا تھا مگر پھر بھی ایک جذبہ ایسا تھا۔ جو اکبر کو کوئی نقصان پہنچانے سے اسے باز رکھے ہوئے تھا۔ وہ تو اکبر کی محبت کو اپنانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے بازوؤں کا سہارا لیکر مخمور فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتی تھی۔ پیار بھرا کوئی نغمہ۔ جو اس کی زندگی کے کھوکھلے وقار کو قائم رکھ سکے سننا چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا۔ کہ اکبر سے دور رہ کر وہ اپنی شرارتی مسکراہٹیں گنوا دے گی۔ وہ اسے سب دوستوں سے زیادہ چاہنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کا خیال کوشش کے باوجود دل سے مٹایا نہیں جا سکا۔ لیکن اپنے جذبات کی تشنگی کو بجھانے کی خاطر وہ اکبر کے اصولوں کو شکست نہ دے سکی تھی۔ وہ جتنا اس کے متعلق سوچتی۔ اس کی روح اتنی ہی زیادہ مضطرب ہو جاتی۔ اب اسے رنگین پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے ایک الجھن سی محسوس ہوتی تھی اسے وہم سا ہو چلا تھا کہ اکبر صرف اسی کے لئے تخلیق کیا گیا ہے ——— ایک رات جب کلب میں ایک خاص پروگرام تھا وہ سر درد کا بہانہ کر کے وہاں سے چلی آئی سبھی اس کی اس غیر متوقع حرکت پر حیران رہ گئے۔ ایسے پروگرام وہ بیماری کی حالت میں بھی نہ چھوڑتی تھی۔ وہ وہاں سے سیدھی اکبر کی کوٹھی

گئی۔ کمرے میں بلب روشن تھا اور اکبر انگیٹھی کے سامنے بیٹھا اپنے اردلی
قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ فرحت نے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا اور آہستہ
سے دروازہ پر دستک دیکر جھجک آمیز لہجے میں بولی "کیا میں اندر آسکتی ہوں"
ے گردن اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھا اور اردلی سے کہا "رستم خاں دیکھو
کون ہے" اردلی نے دروازہ کھولا اور فرحت اندر داخل ہو گئی۔ اکبر نے
ٹھتے ہوئے پوچھا "آپ اس وقت، خیریت تو ہے؟" "جی ہاں سب
ریت ہے۔ مگر" اردلی کی طرف دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اکبر سب کچھ سمجھ گیا
ر اس نے اردلی سے کہا "رستم خاں اب تم جاکر سبق یاد کرو۔ کوئی لفظ
ؤ تو پوچھ لینا" اردلی باہر نکل گیا اکبر نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
"تشریف رکھیں۔ آپ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہیں۔ بتائیے اس
میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" فرحت نے اپنے جوشیلے جذبات پر
نے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیپٹن تم میرے لئے ایک معمہ بنے ہوئے
میں اس معمہ کو حل کرنے کی خاطر یہاں آئی ہوں" اکبر انجان بنتے ہوئے
میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟ میں تو ایک سیدھا سادھا انسان
ں۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ میں کسی کے لئے کیسے
بن سکتا ہوں" فرحت بے چین ہو کر بولی "جیسے تم لگتے ہو۔ تم سے
سے رہتے ہو۔ کلب میں بھی کبھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے۔ رقص کے
م میں کبھی حصہ نہیں لیا آخر تم کس طرح زندگی بسر کرتے ہو" اکبر مسکرا
محترمہ میری زندگی تصنع سے پاک ہے۔ میں نے خود کو کبھی دھوکا دینے
شش نہیں کی۔ میں انسان ہوں۔ اور انسانوں کی زندگی بسر کر رہا ہوں"
نے تڑپ کر کہا "عجیب بات ہے۔ کیا ہم حیوان ہیں۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا
انوں کا سا نہیں ہے؟" اکبر اس کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر بولا:
ات کے خالق نے انسان کو اسی لئے شعور بخشا ہے کہ وہ ہموار اور ناہموار
ں کا فرق معلوم کر سکے۔ حیوان بھی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن کسی اصول
م رہنے کے بجائے جس طرف منہ اٹھتا ہے بھاگنے لگتے ہیں۔ اور
صحت مند اور ارفع اصولوں کو اپنا کر کائنات کے حسن کو سنوارتا ہے۔
ے کی بگڑی ہوئی حالت کو درست کرتا ہے۔ گرتوں کو سنبھالتا ہے۔
کی بنیادیں اکھاڑتا ہے۔ امن اور سلامتی کی قندیلیں روشن کرتا ہے"
کے جذبات اس بحث میں الجھنا نہ چاہتے تھے۔ وہ گہرا سانس بھر کر
بولی "تم خواہ مخواہ ان فلسفوں میں پڑ کر اپنی جوانی کے تقاضوں کا گلا گھونٹ
رہے ہو۔ دوسری جوانیوں کو سوگوار بنا رہے ہو۔ یہ دور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گا"
اکبر نے مطمئن لہجے میں کہا "آپ میری فکر نہ کریں۔ جن اصولوں کا میں شیدائی
ہوں۔ وہ کسی موڑ پر میری جوانی کو بھٹکنے نہ دیں گے۔ یہ دور سب سے بڑا
خطرناک موڑ ہے۔ اس موڑ کی غلاظت سے اپنا دامن بچائے رکھنا ہی انسان
کا سب سے بڑا کارنامہ ہے" فرحت پہلو بدل کر بولی "تم نہیں جانتے۔ تمہارے
خیال نے کسی کی نیندوں میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اس کا چین لوٹ لیا ہے
اسے زندگی کے ہنگاموں سے بیزار کر دیا ہے۔ میں آخری فیصلہ کرنے آئی ہوں"
اکبر نے ثابت قدمی سے کہا "محترمہ آپ کا یہ نشہ جلد اتر جائے گا۔ باغیانہ
جذبات کا یہ ابال عارضی ہے مستقبل کی فکر کریں۔ آپ کو اپنے ہر قول و فعل کا حساب
دینا ہوگا" فرحت جان گئی۔ کہ اکبر اس کے جال میں آسانی سے پھنسنے والا نہیں
وہ یوں اسے نہیں اپنا سکتی۔ حسرت بھرا سانس بھر کر وہ کھڑی ہو گئی۔ دروازے
کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اداس لہجے میں کہا "کیپٹن تم نے میری محبت کا مذاق
اڑا کر اچھا نہیں کیا۔ میں کتنی امیدوں کے ساتھ تمہارے پاس آئی تھی" دروازے
سے باہر نکل کر اکبر نے افسوسناک لہجے میں کہا "محترمہ! کاش آپ نے انسان
کی حقیقت معلوم کرنے کی طرف کوئی قدم اٹھایا ہوتا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔
اپنی نسوانیت کو مجروح ہونے سے بچائیے۔ ورنہ مستقبل کے تازیانے بہت
بھیانک تحفہ پیش کریں گے۔ جسے شاید ہی آپ قبول کر سکیں" اگر کوئی دوسرا
ہوتا۔ تو یقیناً فرحت اس کا منہ نوچ لیتی۔ لیکن اب تو وہ اپنی محبت سے
مجبور ہو کر خاموش رہی تھی۔ اور کئی دنوں تک یہ خاموشی اس کے ہر پروگرام
پر مسلط رہی۔ روشنی کی ایک کرن اس کے دل میں لہرائی۔ اور ماحول کی رنگینی
بڑھ کر اسے نگل لیتی۔ اکبر اس کی سنجیدگی کو ایک نیک فال سمجھ رہا تھا۔ اسے
خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ کہ فرحت نے زندگی کے نشیب و فراز کا مطالعہ شروع
کر دیا ہے۔ اور پھر ایک دن اچانک فرحت کو پہلی حالت میں دیکھ کر اکبر کو بہت
دکھ ہوا۔ فرحت اپنے دوستوں کے میلاوے میں آکر پھر رنگینیوں میں ڈوب گئی
تھی۔ وہ اکبر کے خیال کو دل سے مٹانے کی خاطر خاموشی اور سنجیدگی کے خول کو توڑ کر
ہنگاموں کی وادی میں آگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اکبر کی یاد اب اسے تڑپانے کی
جرأت نہیں کر سکتی۔ مگر روشنی کی کرن جو اچانک ابھر آئی تھی۔ اس سے دور
بھاگنا اب مشکل امر بن گیا تھا۔ اکبر سے دور رہ کر بھی وہ اکبر کو قریب ہی محسوس

کرتی تھی۔ اور محبت کی چنگاریاں انگارے بنتی جا رہی تھیں۔

دعوت نامہ پاکر اکبر نے سوچا کہ اسے صرف رسمی طور پر ہی مدعو کیا گیا ہے۔ فرحت اس کے قریب آکر بہت دور چلی گئی ہے اور مسز شجاع کا اگر بس چلے تو وہ اسے کبھی زندہ نہ رہنے دے۔ ایک ان جانے جذبے نے اسے تھپکی دی۔ کہ وہ اب بھی فرحت کو روشنی کی طرف لا سکتا ہے۔ اس کا دوست کیپٹن ہاشمی جو چند دنوں ہی میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا اور جس نے ماضی کی لغزشوں کا ازالہ کرنے کی خاطر اس کے سامنے مستقبل کو گمراہیوں سے بچانے کا عہد کیا تھا۔ بیمار تھا۔ اس لئے اکبر کو اکیلے ہی دعوت میں شریک ہونا پڑا۔ دروازے پر فرحت نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور اکبر ایسی پھیکی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ جس میں ناکامی کی تلخی اور کامیابی کا سرور رچا ہوا تھا۔ فرحت کا یہ سلوک اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ "فرحت میرا کچھ نہ کچھ ضرور احترام کرتی ہے۔ اپنے ماحول کو یوں آسانی سے چھوڑنا اگرچہ اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر آہستہ آہستہ زندگی کی چند مستعار سانسوں کے نشیب و فراز پر عبور حاصل کرکے کوئی الجھن اس کے ذہن میں باقی نہ رہے گا۔ نئے ماحول میں آکر بوسیدہ ماحول کی تباہ کن دل کشی کو وہ جلد بھول جائے گی۔" اس نے کنکھیوں سے فرحت کی طرف دیکھا اور اس کی سوچ ایک شدید جھٹکے سے لرز اٹھی۔ فرحت کا دیدہ زیب پرکشش ریشمی لباس اور جسم کے نیم عریاں زاویئے۔ اس کی سوچ کا منہ چڑانے لگے۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ اور ایک ٹیس اس کے سینے میں پھیلتی چلی گئی۔ "کاش فرحت نے خود کو سنبھالا ہوتا۔" فرحت نے اپنے آپ کو یوں سجایا ہوا تھا جیسے اس کے بعد اسے اور کوئی موقعہ ہی نہ ملے گا۔ سب دلوں سے زیادہ وہ بیتاب بنی ہوئی تھی ——— سالگرہ کے کیک پر انیس موم بتیاں روشن کرکے سب نے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" ——— گانا شروع کر دیا۔ اور اکبر کا دل تڑپ رہا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ فرحت رقص کرتے ہوئے دو تین بار اس کی میز کے قریب آئی۔ اور مسکراہٹوں کے پھول برسا کر چلی گئی۔ اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ اکبر کے جذبات کو اس قدر بھڑکانا چاہتی تھی۔ کہ وہ بے تاب ہو کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لے۔ اور اکبر کو اس کے متعلق قائم کئے ہوئے نظریئے پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دل پر فرحت کی کافرانہ اداؤں نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"ہیلو! مسٹر اکبر! اپنے سامنے میجر ریاض کی لڑکی کو بیٹھتے دیکھ کر اسے ایک الجھن سی محسوس ہونے لگی۔ عذرا نے مترنم لہجے میں کہا۔ "تم تو ہم سے برابر دور رہتے ہو۔ جیسے ہم تمہیں اغوا کر لیں گے۔" اکبر نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ عذرا کے پچھلی طرف چند گز کے فاصلہ پر کھڑی ہوئی فرحت کی طرف دیکھنے لگا۔ فرحت کی آنکھوں میں چنگاریاں رقصاں تھیں اور وہ عذرا کو گھور رہی تھی۔ عذرا نے پاس سے گزرتے ہوئے بیرے سے شمپین لانے کو کہا۔ اور میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولی۔ "ہمارا بیٹھنا اگر ناگوار گزر رہا ہو۔ تو ہم اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔" پھر وہ یوں مسکرا دی جیسے اسے کوئی پرمذاق بات یاد آگئی ہو۔ اکبر اب بھی خاموش رہا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ عذرا فوراً مشتعل کر بولی "کیپٹن! ہم تم سے بات کر رہے ہیں۔ تمہیں اپنے آپ پر رشک کرنا چاہیئے۔" اکبر کو مجبوراً بولنا پڑا۔ "محترمہ آپ ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ یہاں سے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔" عذرا نے ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مسٹر اکبر۔ تم کتنے بے حس ہو۔ کاش! تم ہمارے جذبات کی قدر کرتے۔ لیکن ہم یوں پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔" بیرے نے میز پر دو گلاس رکھ دیئے۔ اکبر کرسی کی پشت پر کمر ٹکا کے بے پروایانہ انداز سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ عذرا نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ "کیپٹن! اس تقریب ہی کا کچھ احترام کرو۔ آؤ۔ ہم ایک دوسرے کی صحت کا جام پئیں۔" فرحت اب دور کھڑی نہ رہ سکی۔ قریب آکر اس نے عذرا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر بولی۔ "مسٹر فریڈرک تمہیں یاد کر رہے ہیں۔" عذرا نے گردن اٹھا کر تیز نظروں سے اسے گھورا۔ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں اکبر کے پاس بیٹھے دیکھ کر جل کیوں گئی ہو۔ اکبر کو کوئی بھی ہم سے نہیں چھین سکتا۔" اور اس سے پہلے کہ فرحت کوئی بات کہے۔ وہ تیز لہجے میں اکبر سے مخاطب ہوئی۔ "کیپٹن۔ گلاس پکڑو۔ ہمیں فرحت کے سامنے دوستی کا پیمان باندھنا چاہیئے۔" اکبر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "محترمہ اخلاق کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ میں اس چیز سے نفرت کرتا ہوں۔" عذرا بھڑک اٹھی۔ "تم فرحت کے سامنے ہمیں ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں یہ گلاس پکڑنا ہی ہوگا۔" اکبر نے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "محترمہ آپ یہاں سے سیدھی طرح اٹھ کر چلی جائیں۔ ورنہ۔" عذرا نے دانت پیس کر فرحت کی طرف دیکھا۔ اور انتہائی غصے کی حالت میں اپنے گلاس کی شراب اکبر کے چہرے پر پھینک دی۔ اکبر کی مٹھیاں غصے سے کس گئیں۔ انتہائی ضبط

یکر دھکڑا ہوگیا۔ اور چہرے کو رومال سے صاف کرتے ہوئے دروازہ کی
تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ دروازے سے باہر نکل کر وہ سرخ بجری کی چھوٹی
پر پہنچا تھا کہ فرحت کی دردیلی آواز نے اس کے قدم روک دیئے "کیپٹن، خدا
لئے ذرا ٹھہریئے" اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ فرحت لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی
رف آرہی تھی۔ اس کے قریب آکر کھڑے ہونے پر اکبر نے پوچھا "کیا آپ
ی خدا پر یقین ہے؟" فرحت نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا
"اکبر، میں عذرا کی زیادتی کی معافی مانگنے آئی ہوں" زہر خند ہنسی اکبر
لبوں پہ ابھر آئی "محترمہ میں ایسے حادثوں کا عادی ہو چکا ہوں میرے
عذرا کا یہ سلوک کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ آپ یہاں اپنا وقت برباد نہ
یں سبھی دوست آپکے یوں باہر آنے سے مضطرب ہوں گے" فرحت نے
تی ہوئی آواز میں کہا "مجھے ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں۔ میں تو صرف
کو منانا چاہتی ہوں۔ آپ سے دور رہ کر اب مجھ میں زیادہ دیر تک تڑپنے
ہمت نہیں رہی۔ مجھے آپ سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے" "محبت"
مسکرا کر بولا: "میں یہ لفظ زندگی میں اتنی مرتبہ سن چکا ہوں کہ اب میری
ل میں اس کی کوئی وقعت نہیں رہی" فرحت نے آنسوؤں کو پینے کی
شش کرتے ہوئے کہا: "آپنے ایک عورت کی محبت کو نہیں پہچانا کاش آپ
سینے میں پتھر کی جگہ دل ہوتا" اکبر نے چوٹ کی "آپ کی ممی بھی تو عورت ہیں
ن اپنے شوہر سے ایسی ہی بے پناہ محبت کرتی ہے۔ جس کا اظہار آپ مجھ
رہی ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا" فرحت کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے۔
ب مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ممی سے بالکل مختلف ہوں"
نک سا پڑا "اگر یہ بات ہے تو پھر آپ اپنے گمراہ کن ماحول کے خلاف
ت کیوں بلند نہیں کرتیں! آپ کا یہ میک اپ، سالگرہ کی تقریب اور سلو
انف کیا میرے نظریئے کو جھٹلانے کی خاطر کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟"
بیقرار سی ہو کر بولی "تنگ نظری سے کام نہ لیں۔ اپنی آزادی کا مذاق
ئیں" اکبر بے ساختہ ہنس پڑا "چند بناوٹی الفاظ کا سہارا لیکر آپ
ہلانے کی کوشش نہ کریں۔ آزادی کا مذاق آپ لوگ اڑا رہے ہیں اپنے
تے شیش محلوں سے نکل کر عوام کی تاریک کٹیاؤں کی سیر کیجئے۔ آپ
۔۔۔ "میجر ریاض کے بڑے لڑکے اعجاز کو قریب آتے دیکھکر اکبر
ن ہو گیا۔ اعجاز نے اکبر پر حقارت آمیز نظر ڈالی۔ اور فرحت سے

دبے لہجے میں کہا: فیری ڈارلنگ۔ رقص شروع ہو گیا ہے" اکبر خدا حافظ
کہکر کوٹھی کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ فرحت رنجیدہ ہو کر بولی "سوچی۔ تمہاری
بہن نے آج بہت بری حرکت کی ہے۔ اکبر اس کی وجہ سے ناراض ہو کر چلا
گیا ہے" ریاض اسے تسلی دینے لگا "کل صبح ہم اسے منالیں گے۔ آؤ اندر چلیں
یہ رنگین لمحے زندگی میں بار بار نہیں آتے" بے دلی سے قدم اٹھاتی فرحت
اندر آگئی۔ کلب کا آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اور جوڑے مخمور انداز سے رقص کر رہے
تھے۔ غم کو بھلانے کی خاطر فرحت بھی اعجاز کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئی
اس کا ذہن سلگ رہا تھا۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ اور آنکھوں میں ناامیدی
کے دھند لکے پھیل رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوہے کے گرم کھمبے
سے چمٹی ہوئی ہے۔ اکبر کا سانس اسے اپنے چہرے پر گرم لاوے کی مانند محسوس
ہوا۔ فرحت کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ وہ اس کے جسم کا بوجھ سہارنے
سے جواب دے رہی تھیں۔ اعجاز سے علیحدہ ہو کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی
اس کے ماتھے پر پسینہ کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں
سے اعجاز کی طرف دیکھا۔ اور اسے سینے میں ایک پھانس سی چبھتی محسوس
ہوئی۔ اعجاز نے نیا پارٹنر منتخب کر لیا تھا اور فرحت یوں لرز کر کھڑی ہو گئی
جیسے اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اسے مہمانوں سے خوف محسوس ہونے لگا۔
وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ کھلی فضا میں اس نے گہرا سانس لیا اور چمکتے
ہوئے ستاروں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہر ستارہ اکبر کی زبان بنکر اسے خوابوں کے
جزیروں کی غرقابی کا نوحہ سنا رہا تھا۔ اس کی روح پر تیغ کھچی کی طرح
تڑپ رہی تھی۔ اس کا دل اجاڑ قبرستان میں جلتے ہوئے دیئے کی لو کی
طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا ذہن گرم چشمے کی مانند کھول رہا تھا۔ وہ بے چینی
سے ٹہلتی ہوئی فوارے کے پاس آگئی۔ سرو کی لمبی قطار کے قریب کسی کا
نشیلا قہقہہ ابھرا۔ اور اس کے کان کھڑے ہو گئے وہ ایک طرف ہٹ کر
قہقہے کا سراغ لگانے لگی۔ اگر وہ اس وقت اذیت ناک سوچ کے بھنور
میں پھنسی نہ ہوتی۔ تو یقیناً اسے کوئی شرارت سوجھتی اور مہمانوں کی نظروں
سے بچکر تاریک سایوں میں کسی نئے رومان کا آغاز کرنے والے جوڑے کو اپنے
مذاق کا نشانہ بناتی۔ مگر اسے اب نشیلے قہقہے نے چکرا دیا تھا۔ "نہیں آلڈر ابھری
"خالدہ ڈارلنگ۔ ڈر کو اپنے سے دور بھگا دو۔ کیپٹن حامد تمہیں کچھ نہیں کہے
گا۔ وہ فرحت کا گہرا دوست ہے اور اس کی دوستی کی خاطر وہ تمہارے

خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلے گا۔" فرحت کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے آواز کو پہچان لیا اس کی ممی کیپٹن حامد کے چھوٹے بھائی خالد کو۔ جو کالج کا طالب علم تھا اور اپنے بھائی سے ملنے آیا تھا۔ اپنے ساتھ اندھیروں میں بھٹکنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ فرحت کے خون کا کھولاؤ بڑھ گیا۔ خالد کی گھبراہٹ آمیز آواز سنائی دی "آپ نے زیادہ پی لی ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے" مسز شجاع نے مسکرا کر کہا "میں ہوش میں ہوں۔ یہ سہانا موسم یہ رسیلی تنہائی۔ یہ گھور اندھیرا۔ میرے اور قریب ہو جاؤ۔ میں تمہیں بلندیوں کی سیر کرانا چاہتی ہوں" اور اب فرحت کو یہ بلندیاں پستیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے یوں سنائی دیا۔ جیسے اکبر اس کے کان میں کہہ رہا ہو "آپ کی ممی بھی تو عورت ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر سے ایسی ہی محبت کرتی ہے جیسی آپ مجھ سے کر رہی ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا" اور اس کے دل میں ہوا فیصلہ جست لگا کر اس کے ذہن پر قابض ہو گیا...... وہ [illegible] کی مانند اپنے پاپا کے کمرے میں آ گئی۔ جب وہ وہاں سے دوبارہ [illegible] پاس آئی تو مسز شجاع کہہ رہی تھی "تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ میری تم ہمیشہ فخر محسوس کرو گے" فرحت کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ [illegible] کا پورا زور لگا کر چیخی "ممی!" اور اس سے پہلے کہ مسز شجاع اس کی موقع آمد پر اسے ڈانٹے۔ پستول چلنے کی ہیبت آواز نے فضا کو تھرا [illegible] اور اندر بیٹھے ہوئے مہمان چونک پڑے۔ اور رقص ختم ہو گیا ــــ

عمران انصاری •

○

ابھی سویرا ہے اور ابھی سے ہی شام کا غم تو کیا کرونگا
یہ سوچتا ہوں کہ زلفِ شب ہو گئی جو برہم تو کیا کرونگا

یہ کیا کہ آنکھوں میں نام کو بھی نمی نہیں عرضِ غم کی خاطر
اگر زباں بھی نہ کہہ سکی چند حرفِ مبہم تو کیا کرونگا

رہِ طلب میں یونہی کہاں تک یہ موت کا انتشارِ ذہنی
اگر نہ اجزائے زندگی کر سکا فراہم تو کیا کرونگا

ابھی ابھی میری سادگی پر زمانہ تنقید کر رہا ہے
اگر یہ تنقید بن گئی مثلِ زلفِ پُرخم تو کیا کرونگا

قابل اجمیری •

تاثرات

اضطراب فراق ہو وہی اشتیاق وصال ہے
جستجو میں جو حال تھا تجھے پا کے بھی وہی حال ہے

نہ مآل زیست کی فکر ہے نہ تباہیوں کا خیال ہے
مجھے صرف اس کا ملال ہے کہ تمہیں بھی میرا ملال ہے

آرزو ہی کا فیض ہے تری یاد ہی کا کمال ہے
مجھ کو تیرا خیال تھا مگر آج اپنا خیال ہے

نہیں کوئی راہ نما تو کیا ہے خلاف ساری فضا تو کیا
مجھے فکر سود و زیاں کیوں تری یاد شامل حال ہے

نہ شوق عجب جنوں نہ خلش خلش نہ سکوں سکوں
مار دجہ نشاط ہے کبھی بھول وجہ ملال ہے

بشکریہ فاران

کرار نوری •

○

حال دل میں نے دنیا کو سنانا چاہا
مجھ کو ہر شخص نے دل اپنا دکھانا چاہا

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لئے دنیا میں
تم نے ہر شخص پہ الزام لگانا چاہا

غیرت موج اسے پھینک گئی ساحل پر
ڈوبنے والے نے جب شور مچانا چاہا

ہم تو مانا کہ ہنسے، ہنس دئے وحشی ٹھیرے
تم ہی کہدو کبھی تم نے بھی ہنسنا چاہا

اپنی تصویر بنانے کے لئے دنیا میں
میں نے ہر رنگ پہ اک رنگ چڑھانا چاہا

اب تو اٹھیں گے قیامت ہی میں سونیوالے
انقلابات نے بیکار جگانا چاہا

رقص پروانہ سے دلمیں وہ حسد ہے نوری
میں نے ہر شمع کو دنیا میں بجھانا چاہا

(بشکریہ شرب)

ابوالخطیب •

یہ کون جاگا؟

مسلسل ناول

(آخری قسط)

"اچھا کھانا کھائیے" یہی اثنا میں انجم کوٹھری میں آگیا اکمل چونک پڑا اپنے حواس کو درست کرکے شعوری طور پر مسکرایا اور کہا۔

"میں گھر سے کھانا کھا کر آیا ہوں آپ بسم اللہ کیجئے"

لے صاحب۔ آپ تکلف نہ کیجئے۔ انجم نے اس مرتبہ اکمل کا ہاتھ پکڑا۔

"میں آپ سے صحیح عرض کر رہا ہوں"

"تو اچھا چائے میں شریک ہو جائیے" کچھ سوچکر انجم نے چائے کے لئے کہا اور تانبے کی پتیلی چولہے پر چڑھانے کے لئے پھر باہر چلا گیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا اکمل کے سامنے ٹوٹا ہوا کپ رکھا ہوا تھا اور انجم کے سامنے پیتل کا گلاس دونوں میں سے دھواں بل کھاتا ہوا نکل رہا تھا اور مسرت سے ان کے چہرے چمک رہے۔ اچھا کچھ شعر تو سنائیے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اکمل نے فرمائش کی۔

بہت اچھا ذرا چائے کے چند گھونٹ پی لوں۔ اب شراب کا نعم البدل یہی ہے میں نے بھی ابو الکلام کا اتباع کیا ہے۔ اس معاملے میں۔

اکمل مسکرایا اور اس مسکراہٹ میں اس کا ذہن پھر پچھلے تصورات میں چلا گیا جہاں وہ اس کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چائے سے بھرا پیتل کا گلاس انجم نے بہت جلد ختم کر دیا کیونکہ سنانے کا موڈ اس وقت اس کا بھی بن چکا تھا اور پھر اکمل بھی بڑا مشتاق تھا۔

چائے کے بعد شعر شروع ہوئے انجم کا ترنم اس طرح بہہ رہا تھا جیسے کوئی پہاڑی ندی چٹانوں سے اتر کر سنگ ریزوں کو بہاتی سطح پر آکر مچل رہی ہو۔ زندگی کا سارا درد و کرب اس ترنم میں جذب ہو گیا تھا۔ اکمل اس درد و کرب میں ڈوب کر اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں پہونچنے کی کوشش کرتا تھا لیکن نہیں پہونچ پا رہا تھا کوئی شے درمیان میں حائل تھی لیکن اس لمحے

اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ ضمیر مسرور و مطمئن ضرور ہے۔

انجم پر موڈ طاری تھا اس لئے وہ پے در پے غزلیں اور قطعہ سنا تا رہا اور اکمل برابر اس نغمہ کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ پھر یک اس نے محسوس کیا کہ دفعتاً کی جھنکار ختم ہو گئی تو اس نے غور سے کچھ دیکھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ اب پھر کبھی۔

بہت اچھا۔ اکمل نے بڑے اطمینان سے کہا ولیکن اس کا بھی یہاں سے اٹھنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ انجم کے اس ترنم نے اپنے جذب و کشش سے اسے اور مطمئن کر دیا۔

"اچھا اپنا پورا تعارف تو کرائیے آپ رہتے کہاں ..... کہاں" انجم کو یکایک وہ بات کس طرح یاد آگئی جو وہ ایک عرصہ سے پوچھنا چاہتا

"جی میں کٹرہ حبیب میں رہتا ہوں۔ اس کے بعد پھر کچھ کہتے وہ ٹھہر گیا کیونکہ اگلی بات ذہن میں ایک کشمکش برپا کر چکی تھی اور یہ تھی کہ کسی وقت اسے بھی اپنی اصلیت سے آگاہ کرکے آزما لیا جائے لیکن خوف و شرم کی طاقت اسے باز رکھنا چاہتی تھی کہ ایسا نہ کرو ورنہ یہ بھی تجھے ذلیل سمجھنے کا مگر پھر اس کے ذہن میں ایک بگولہ سا اٹھا اور اس کی زبان متحرک ہوئی "اور میں رنڈی کا لڑکا ہوں"

"ارے صاحب تو کیا ہوا آپ ایک بھلے مانس اور پڑھے لکھے آدمی ہیں"

اکمل نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

"نہیں صاحب۔ میری طرف دیکھئے آپ کھلے بندوں اس کا اظہار کیجئے اس سے ہوتا کیا ہے آپ کی شرافت اور آپ کا ہنر اس دنیا میں خود آپ کے لئے جگہ دلا دیگا اس دنیا میں سب ایک جیسے آدمی نہیں یہ دنیا ایک منٹ نہ چل سکے۔ یہ کہکر انجم نے اکمل کو اپنے سینے سے چمٹا لیا

زندگی میں ماں کے بعد یہ دوسری انسانی چھاتی تھی جس سے اکمل چمٹا تھا اس کیفیت سے اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

اب اکمل کا اکثر وقت انجم کے گھر پر اور اس کی صحبتوں میں گزرتا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی رات وہ اپنے گھر جاتا بلکہ ان پھٹے بوردں پر رات بسر کر لیتا انجم مشاعرے کا شاعر تھا اور قرب وجوار سے آئے دن مشاعروں کے دعوت نامے اس تک آتے رہتے۔ یہ سب کچھ انجم کے سامنے ہوتا انجم مصرع طرح پر غزلیں تیار کرتا اور داد کی طلب میں اکمل کو ترنم سے سناتا۔ اکمل سن تو ضرور لیتا لیکن شعر کے موضوعات سے اسے بڑی مایوسی ہوتی لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑا ہوا تھا کہ انجم کی روش میں تبدیلی کس طرح آئے۔

مشاعروں کے بعد وہ دونوں بیٹھتے دوسروں شاعروں کے کلام پر تبصرہ ہوتے انجم صاحب سوائے اپنے سارے شعرا کے کلام میں کوئی نہ کوئی نقص نکال لیتے اور جس شاعر کے کلام میں وہ نقص نہ نکال پاتے تو پھر اس کے اخلاق و اطوار اور چہرے مہرے پر گفتگو کر کے اسے ذلیل ثابت کرتے۔ اکمل کو اس انسانی دشمنی سے بڑی کوفت ہوتی اور جب وہ منگ ہو جاتا تو جھنجھلا کر انجم سے کہتا۔

"انجم صاحب انسان میں آپ کو کچھ اچھائیاں بھی نظر آتی ہیں"۔

انجم پر اس غیر متوقع سوال سے گھڑوں پانی پڑ جاتا اور اس وقت وہ محسوس کرتا کہ واقعی انسانوں کے ساتھ میرا یہ بہت برا سلوک ہے اس کے چہرے کو بدلتے رنگ کو دیکھ کر اکمل اندازہ کر لیتا کہ تیر خالی نہیں گیا پھر وہ کوئی دوسری بات شروع کر دیتا اس کے بعد کوئی اہم کتاب لیکر اسے سنانے بیٹھ جاتا اور اس طرح اخلاق و مذہب پر اکثر کتابیں لا لا کر اسے پڑھ پڑھ کر سناتا، انجم پڑھنے کا عادی نہ تھا اس لئے جب اس طرح اسے مل جاتا تو بڑا خوش ہوا لیکن سننے سے اس کی قوت فکر کمزور پڑنے لگی کیوں کہ اس پر اسے سوچنے کا کہاں موقعہ ملتا اکمل نے اس کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تو اس نے پھر اسے مطالعے کے لئے مجبور کیا اور دو چار کی کتابیں اس کے مطالعے میں رکھیں موجود دنیا اس کے حالات اور مذہبی نقطۂ نظر سے دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے سائنٹفک طریقے انجم مطالعہ تو کر لیتا لیکن بے دلی سے اور جب کبھی اکمل اس موڈ میں اسے دیکھتا تو اس سے جھگڑتا اور اس کے قریب رکھتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کو پھاڑ دیتا اس وقت انجم کی کیفیت بچوں کی سی ہو جاتی اور فرمانبرداری اس وقت اس کے چہرے پر بیٹے کی طرح چھا جاتی لیکن انجم نے شعر کہنا قطعی بند نہ کیا اکمل اس کا بھی جائزہ لیتا رہا اکمل نے بڑے دنوں کی محنت و مشقت کے بعد ایک کسان کی طرح یہ محسوس کیا کہ انجم کی شاعری میں اس کے پسندیدہ رجحانات کلّوں کی طرح پھوٹ رہے ہیں اور زندگی سے متعلق اس کا فنکارانہ اور یہ غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے اکمل انجم کی شاعری میں اس کیفیت کو پا کر جھوم اٹھتا اور دنیا اس وقت اسے بڑی پیاری معلوم ہوتی۔

اس تبدیلی کو مشاعروں میں بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا کیونکہ اب پرشکوہ الفاظ اور انداز بیان کے ساتھ انجم کی شاعری میں وسعت نظر اور انسان سے محبت کا عالمگیر جذبہ بھی تھا اور استادوں نے بھی داد دی۔

مشاعروں کے ساتھ اکمل نے انجم کی غزلوں کو اردو کے معتبر رسالوں میں اشاعت کے لئے بھیجیں وہاں بھی اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور خصوصاً نئی مذہبی نسل جو کالجوں میں اسلام سے تجربے کر لئے تیار ہو رہی تھی اس کی شاعری کی سب سے زیادہ گرویدہ ہوئی کیونکہ انجم کی شاعری اس نسل کی نشان منزل تھی کچھ عرصے کے بعد ریڈیو اسٹیشن نے بھی انجم کو مدعو کیا۔ مقبولیت وہاں سے بھی اسے حاصل ہوتی انجم اس تبدیلی سے بڑا مسرور و شاداں تھا اور اپنے چاروں طرف مقبولیت کو دیکھکر خود کو اکمل کے سپرد کر دینے کا جذبہ اس میں اور بڑھتا لیکن مقبولیت کے ساتھ اس میں پہلی خرابی بھی ابھرنے لگی عام شاعروں اور فنکاروں کی طرح اب وہ اپنے ہر ہم عمر کو کسی نہ کسی برے لقب سے یاد کرتا لوگوں سے قرض لے لیتا تو دیتا نہیں۔ نومشق شاعروں کا مذاق اڑا کر اپنے احساس برتری کے جذبے کو تسکین دیتا۔ اپنی اہمیت جتانے کے لئے طرح طرح کے جل فریب سے کام لیتا۔ یہ ساری خرابیاں اکمل کے کانوں تک پہونچتیں اکمل بڑا رنجیدہ ہوتا لیکن جب انجم کے مخالفین اس کے اخلاق اور فنکاری کیا اس تفاوت کو ظاہر کر کے ایک ذلیل انسان ثابت کرتے تو اکمل تڑپ اٹھتا اور اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا یہ محل بھی ٹوٹ رہا ہے تو وہ فوراً

جواس ہوکر انجم کی ان ساری اخلاقی برائیوں کی تعویلیں کرتا رہتا اور
لوں کو بتاتا کہ نہیں جہاں وہ ایک بڑا فن کار ہے وہاں وہ ایک بڑا انسان
ں ہے لیکن کیا یہ واقعہ تھا اکمل کو بھی اس سے انکار تھا کیونکہ اپنی آنکھوں
سے اکثر اس نے انجم سے بداخلاقی اور کمینگی کو سرزد ہوتے دیکھا تھا۔ اور
ں تضاد پر جب اکمل کا ضمیر اس سے سوال کرتا "یہ کیا" تو سر جھکا کر
ہاتھ جوڑ لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا اور دل میں کہتا "میں بھی بداخلاق ہوں
شاءاللہ انسان بننے کی کوشش کروں گا"

پھر وہ انجم کے پاس آتا اور تنہائی میں لے جا کر اس تضاد پر ایک
منت ملامت کرتا۔ انجم پر پھر وہی کیفیت چھا جاتی جس میں انسانیت
احترام پشیمانی کے جذبے کے ساتھ ہوتا۔

اکمل انجم کے قول و فعل کے تضاد کو صرف اس وجہ سے پسند نہ
کرتا کہ یہ اس کی شریف فطرت پر بار... گذرتا تھا بلکہ اس لئے بھی وہ
اس تضاد کو دور کرنا چاہتا تھا تاکہ انجم کی فنکاری صحیح معنوں میں اسکے
دل کی آواز بن جائے۔ صرف صنعت گری تک نہ رہے اور جو پیغام
اس کی شاعری میں نظر آتا ہے اس میں عمل کا گداز اور کشش اور پیدا
ہو جائے تاکہ دل سے نکلی بات دل کو پکڑ لے۔

اس کے بعد لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ اکمل اب زیادہ بردبار اور
حلیم بنتا جا رہا تھا۔ اپنے روزمرہ کے کاموں میں زیادہ مستعدی اور دلچسپی
سے کام لیتا اور ——— دھیرے دھیرے اس میں
سے قنوطیت ختم ہو رہی ہے۔

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیسرا آدمی اس میں اور جاگ رہا ہے
جیسے وہ نیند کا ماتا ہوا اور آنکھیں مسلتا ہوا اپنی منزل کی طرف بھاگا
چلا جا رہا ہو ——— اس منزل کی طرف جو گرد و غبار میں
اٹی پڑی ہے ——— جو انسانیت کے قافلے کو روکے کھڑی ہے

التماس ہے کہ...... ۱۔ اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی
اور لفافہ "مشیر" ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں (۲) جواب
طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے (۳) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ——— (منیجر)

راغب مراد آبادی

حسرتِ عیشِ روزگار نہ کر
عارضی شے پہ اعتبار نہ کر
پیچ و خم کم نہیں زمانے کے
دِل کو پابندِ زلفِ یار نہ کر
دیکھ رسوا نہ ہو جنوں کا راز
جیب و دامن کو تار تار نہ کر
غمِ امروز سے نجات کہاں!
عیشِ فردا کا انتظار نہ کر
اے میں قربان تری نگاہوں کے
اس قدر دل کو بے قرار نہ کر
غم کے طوفاں اتر بھی جائیں گے
شکوۂ ظلمِ روزگار نہ کر
اک نہ اک دن خزاں بھی آئے گی
دل کو آسودۂ بہار نہ کر
گریۂ شوق اس قدر راغب
رازِ پنہاں کو آشکار نہ کر

شبنم سبحانی

قفس کا ذکر چھڑے یا چمن کا ذکر چھڑے
سب ایک ہی ہے کسی انجمن کا ذکر چھڑے
صبا ہم اہلِ وفا کا بھی تذکرہ کرنا
جوان کی بزم میں دار و رسن کا ذکر چھڑے
ہماری نظریں ہیں خندق کے جاں نثاروں پہ
ہماری بزم میں کیوں کوہکن کا ذکر چھڑے
میں اپنی راہگذر کے دکھاؤں پیچ و خم
جو ان کی زلف شکن در شکن کا ذکر چھڑے
یہ قصۂ شبِ غم ختم بھی کرو شبنم
اب آؤ صبح کی پہلی کرن کا ذکر چھڑے

تذکرے اور تبصرے

اساسِ عربی

تالیف: محمد نعیم الرحمٰن (ایم اے)

شائع کردہ: نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، فریرروڈ کراچی

عربی؟ . . . . کلام اللہ کی زبان، رسول اللہ کی زبان۔ جب تک دنیا ہے، قرآن باقی ہے — ارشادِ ایزدی — اور جب تک قرآن ہے، عربی زندہ و سلامت، ناگزیر و لابدی۔ ایمان کا رشتہ قرآن کے ساتھ رسولؐ کے کلمۂ اہلِ اسلام کو مرغوب، محبوب، مطلوب، . . . . . قرآنِ عربی رسولؐ عربی۔ زبانِ عربی۔ عربی کو سیکھنے سکھانے کی ہر کوشش مبارک و مستحسن۔ "ہاں۔ اس کی دین ہے۔ جسے پروردگار دے۔"

"اساسِ عربی" اردو داں اور طالب عربی کے لئے راہ کا پہلا قدم، عربی صرف و نحو کے سلیس قواعد کا مجموعہ .... سیکھنے سکھانے کا پرانا اور مجرّب نسخہ ہے کہ پہلے تفہیم پھر تعمیل: قاعدے سمجھے جائیں اور پھر عمل کیا جائے ——

محمد نعیم الرحمٰن صاحب کا یہ معروف مجموعہ یہی بنیاد فراہم کرتا ہے . . . . یہ نہ ہو کہ ایک عمر قاعدے یاد کرنے بلکہ رٹنے میں صرف کر دی جائے اور پھر بھی زبان کے معاملے میں روزِ اول سے زیادہ کی نوبت نہ آئے۔ عربی طریقہ تعلیم کا یہ وہ سُقم، بلکہ اس کی راہ کا روڑا ہے، جس نے بہتیروں کے جی چھوٹے کئے ہیں اور اکثر کو آگے بڑھنے سے روکا ہے . . . . . لیکن مرحبا و آفریں کہ نعیم الرحمٰن صاحب نے اس ٹھوکر کو سمجھ کر قدم بڑھایا ہے اور بچ نکلے ہیں۔ انھوں نے مطالعہ، مذاکرہ اور محاسبہ کو یکجا کر دیا ہے۔ قاعدہ سمجھاتے ہیں۔ تفصیلات بتلاتے ہیں، مثالیں فراہم کرتے ہیں، اور پھر . . . . . پوچھ گچھ شروع کر دیتے ہیں۔

کتاب تقسیم سے کافی پہلے لکھی گئی تھی۔ خاصی مقبول ہوئی۔ اور بعد میں بھی رائج رہی۔ اب اسے نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے شائع کیا ہے۔ کتاب سوا تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت خوش کن ہے اور کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا گیا ہے —— قیمت پانچ روپے

بلوغ المرام

تالیف: علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ

شائع کردہ: نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، آرام باغ، کراچی

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی" الفاظ بدلے جا سکتے ہیں۔ زبان تبدیل ہو سکتی ہے لیکن مفہوم نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ وہ کائنات کلیہ ہے جو ازل سے اسی طرح چلا آ رہا ہے اور ابد تک اسی طرح رہے گا۔ یہ کسوٹی ہے، جو ایک عمل کے علاوہ کسی دوسری شے سے متاثر نہیں ہوتی۔ عمل ہی تھا جس نے اہلِ اسلام کو دنیا و عقبیٰ کا وارث بنا دیا تھا اور یہ عمل ہی ہے جس نے آج مسلمانوں کو ہر جا ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ کاش یہ اب بھی آنکھیں کھولیں اور ہوش میں آئیں۔

پیشِ نظر کتاب مسلمانوں کو دعوتِ عمل دیتی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ ان ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اسلام کو قبول کیا اور اسے قائم کیا۔ زیرِ نظر کتاب علامہ کی جمع کردہ سولہ سو احادیث نبوی کا مجموعہ ہے۔ جسے بڑی خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔

نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے کتاب کو بڑے اہتمام کے ساتھ عمدہ سفید کاغذ پر شائع کیا ہے۔ احادیث کو نمبر وار درج کیا گیا ہے اور متن و ترجمہ آمنے سامنے دیئے گئے ہیں۔ کتاب بڑے سائز پر ہے اور ضخامت ۳۲۰ صفحات ہے۔ کتاب کی جلد خوبصورت اور پُر وقار گرد پوش میں لپٹی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت کارخانہ تجارت کے معیار کے مطابق ہے۔

قیمت: آٹھ روپے (ج۔ق)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

Monthly "MUSHIR" Karachi.

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

نومبر
سنہ ۱۹۵۵ء

ماہنامہ مشیر کراچی

قیمت فی پرچہ، پاکستان، آٹھ آنے
بھارت، دس آنے

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

THE MUSHIR KARACHI

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون : ۷۹۲۳

جلد : ۶ شمارہ : ۱۱

نومبر ۱۹۵۵ء

مرتبہ
عبد الغفور بیگ

بدل اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے
سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور
یوپی (بھارت)

ترتیب

(پرنٹر و پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؀

سبدِ گل

پچھلے دو شماروں سے نہیں صفحات میں نسیم درید صاحب نے ادب اور ادیب کی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ ذکر چھیڑا تھا۔ بات معلوم نہیں آپ کو کیسی لگی۔ تشنگی کی شکایت کا تو سوال ہی نہیں، دو صفحے ہوتے ہی کیا ہیں۔ لکھنے والا زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ان باتوں کو ایک مختصر مضمون کی شکل دیدے اس دفعہ اسے کچھ اور آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ہمارے حلقہ علم و ادب میں ادب اور ادیب پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔

ہر ادب پارہ اپنے خالق کی فکری اور فنی صلاحیتوں کا ایک حسین و جمیل امتزاج ہوتا ہے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت اس کے فکری اور فنی ہر دو پہلوؤں کو پرکھنا پڑتا ہے اس میں کسی ایک کی خامی اس کی قدر و قیمت پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں اتنی گنجائش تو نہیں کہ ان موضوعات پر تفصیل سے کچھ کہا جا سکے لیکن مجمل طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر سے یہاں مراد یہ ہے کہ ایک ادیب اپنی ادبی تخلیق میں کیا کہتا ہے اور فن سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی بات کس انداز سے کہتا ہے۔ ادب بحیثیت فن کے ایک مشترکہ ورثہ ہے، جو زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں ہے۔ یہ صلاحیت بلا امتیاز رنگ و ملت اور زمان و مکان ہر اس انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے جسے اپنے معاشرے کا ادیب بننا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت ایک ایسی سعادت ہے، جسے بزور بازو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ مطالعہ اور ریاضت سے اس خداداد صلاحیت کو جلا تو حاصل ہو جائے لیکن اس کا خود پیدا کر لینا قابل فہم نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وادیٔ ادب میں قدم رکھنے سے پہلے دیانت داری سے یہ جائزہ لے لیا جائے کہ اس کی دشوار گزار راہوں پر کامیابی سے گامزن ہونے میں ممد و معاون ثابت ہونیوالی خداداد صلاحیتیں موجود بھی ہیں کہ نہیں۔ فکری بلندیاں فنی صلاحیتوں کے فقدان کا مداوا نہیں ہو سکتیں۔ فکری طور پر بلند مگر ادب کی فنی حیثیت سے عاری انسان واعظ تو ہو سکتا ہے مگر ادیب نہیں بن سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ادبی تخلیق کی اصل قدر و قیمت وہ فکری قدریں ہی متعین کرتی ہیں جو اس میں سموئی گئی ہوں۔ فنی بلندیوں کے ساتھ سطحی تخیلات اور فکری تہی دامنی کا گٹھ جوڑ الفاظ کی جادوگری تو بن جاتا ہے مگر ادب پارہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے جہاں ایک ادیب کے لئے فنی بلندی کی خداداد صلاحیت کا حامل ہونا ضروری ہے وہاں اس کا ذہنی بالیدگی اور فکری توانائی کا غیر معمولی مظاہرہ کرنا بھی لازمی ہے ـــــ ان دونوں صلاحیتوں کی ایک متوازن ہم آہنگی ہی فکر انگیز اور بلند خیال ادب پارے تخلیق کر سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ادب اپنی فنی حیثیت سے ایک عالمگیر ورثہ ہے جو ہر زبان، ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنی قدر و قیمت منواتا رہا ہے اس کی اس مسلمہ آفاقی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسانی طبائع کا فکری اختلاف ایک فطری چیز ہے

حس یہ کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے، وہ اپنے مزاج، مذاق اور ذہنی لحاظ سے ضرور مختلف الفکر رہے گا۔ یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان فکری لحاظ سے یک رنگ وہم آہنگ ہو جائیں۔ ادب میں فکری اختلاف کا یہی وہ مقام ہے جہاں ادب کا گروہوں میں بٹ جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اس کے مختلف ادوار میں دنیا کے مختلف گوشوں سے مختلف ادبی تحریکوں کے بروئے کار آنے کا سبب یہی فکری اختلاف تھا۔ دورِ حاضر میں بھی دنیا کے مختلف گوشوں سے مختلف ادبی تحریکوں کا جنم لیکر اٹھنا اور پھیلنا اس فکری اختلاف ہی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے فکری اختلاف کی بنیادوں پر اگر کوئی نئی ادبی تحریک اٹھے تو اس پر ناک بھوں چڑھانے یا چراغ پا ہونے اور اس کے خلاف نفرت و حقارت اور معاندانہ جذبات کو ابھارنے کی بجائے اسے ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کرنا دانائی اور تدبر کی دلیل ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس وقت اسی فکری اختلاف کی وجہ سے ملک کی ادبی فضا میں متعدد و مختلف مکاتیبِ فکر پائے جاتے ہیں۔

ادب میں فکری اختلاف کی حیثیت کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے یوں سمجھئے کہ دو فنکار جو مسلمہ فنی مہارت کے حامل ہیں، عورت کے دو علیحدہ علیحدہ نقش تیار کرتے ہیں؛ جو ان کی فنی مہارت کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں مگر ایک فنکار عورت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے پوز کے لحاظ سے مجسمۂ عفت و عصمت اور حیا و شرم ہے اور دوسرا اس کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ مجسمہ دعوتِ نظارہ بنی بیٹھی ہے اور اس کے نقش و نگار کی ہر ادا دیکھنے والے سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ "بیا کہ جا اینجاست" ہر دو فن پاروں کی فنی عظمتوں کے علی الرغم فکری طور پر ان میں امتیاز کرنا ناگزیر ہوگا اور یہی امتیاز ان کی قدر و قیمت پر اثر انداز بھی ہوگا۔

ادب میں فکر اور فن کی حیثیتوں کے تجزیہ کے بعد ایک اور حیثیت بھی ہے جس کا تعلق ادیب اور اس کے ادب کی اثر انگیزی سے ہے۔ وہ ہے ادیب کی وحدتِ کردار و گفتار۔ اگر ایک ادیب جو کچھ کہتا ہے اپنی زندگی میں عملی طور پر اس پر عامل نہیں تو اس کی یہ کمزوری اس کے ادب کی اثر انگیزی پر گہرا اثر ڈالے گی۔ ویسے تو کردار و گفتار کی ہم آہنگی انسان کے لئے دنیا کے ہر کام میں ضروری ہوتی ہے لیکن ادیب جو معاشرے کا معلم اور عام ذہنی سطح سے بلند ہوتا ہے، اس کے اقوال و افعال کی ناموافقت بڑے دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس لئے ایک ادیب کے لئے ضروری ہے کہ جہاں وہ فکر اور فن میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ وہاں وہ اپنے اقوال و افعال میں بھی زیادہ سے زیادہ موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ کردار و گفتار کا تضاد زندگی کے دوسرے شعبوں میں دنیوی ترقی کیلئے بھی ایک ناقابلِ عبور سدِ راہ ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر ادیب فکری اور فنی عظمتوں کے حامل ہونے کے باوجود اپنے قول و فعل کے تضاد کی وجہ سے نہ تو سماج میں کوئی موزوں رتبہ پا سکے ہیں اور نہ مادی ترقی میں کوئی خاطر خواہ مقام حاصل کر سکے ہیں ——— قول و فعل کے تضاد کے شاہد حالی اور بد سلوکی کا شکوہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(باقی آئندہ)

نعیم صدیقی •

مرے[1] احوال

گزشتہ شمارے میں "مرے احوال" جس طرح پریس (کتابت و طباعت) کی زد میں آئے ہیں، اس پر ہم سراپا ندامت ہیں ـــــ تاہم کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ـــــ "احوالِ واقعی" ملاحظہ ہوں۔ (ادارہ)

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
پری سی بن کے صدائے رباب اڑتی ہے
ہوا کی موج پہ بوئے گلاب اڑتی ہے
یہ میری خاک تو بن کر سحاب اڑتی ہے
شراب اڑتی ہے، شب بھر شراب اڑتی ہے
شراب اڑتی ہے، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
فضا میں شوق کے جگنو کئی چمکتے ہیں
سراب دل میں تمناؤں کے جھلکتے ہیں
نظر بہکتی ہے اور ولولے بھڑکتے ہیں
ہوس کا سحر، کہ ہر سُو چمن مہکتے ہیں
چمن مہکتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
کہ ہوش جیسے نہ ہو، ہوش اڑا سا رہتا ہے
غمِ جہاں، غمِ جاناں مٹا سا رہتا ہے
ہر ایک داغ کا شعلہ بجھا سا رہتا ہے
بیاں میں کیسے کروں اک خلا سا رہتا ہے
خلا سا رہتا ہے، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
ـــــ تخیلات افق پار جا نکلتے ہیں!
وہاں، جہاں کہ فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں
جہاں فسانوں کے سوتے کئی اُبلتے ہیں
وہاں جہاں کہ شعاعوں سے شعر ڈھلتے ہیں
تو شعر ڈھلتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا

(۲)

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
فریبِ نفس کے پردے جونہی اٹھاتا ہوں
تجھے حقیقتِ عظمیٰ! میں دیکھ پاتا ہوں ـــ!
تجھے میں دیکھ کے پھر پیچ و تاب کھاتا ہوں
میں اپنی جان کا سارا سکوں لٹاتا ہوں
سکوں لٹاتا ہوں، پھر بھی سکوں سا ملتا ہے

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں
پرائے غم مرے سینے میں آ کے بستے ہیں
یہ دیدے ـــ جن سے دہکتے شرر برستے ہیں
ہزار غم زدہ جو رحم کو ترستے ہیں ـــ!
کبھی کبھی مجھے آ کر یہ ناگ ڈستے ہیں
یہ ناگ ڈستے ہیں، پھر بھی سکوں سا ملتا ہے

(چراغِ راہ)

---

[1] واضح رہے، یہ آواز کسی فرد کی نہیں بلکہ انسان کا نوعی وجود بول رہا ہے۔

انور صدیقی

احساس

(مراکش اور الجزائر کی تحریکِ آزادی کی نذر)

آج دیوانوں کو زنجیر کا احساس ہوا
آج پروانوں کو تنویر کا احساس ہوا
آج آئی ہے صبا دعوتِ گلشن لے کر
اک پیامِ لبِ سوسن لے کر
ایک صد چاک سا دامن لے کر
انھیں تاریک سے زندانوں میں
جن میں صدیوں سے اندھیروں کے بسیرے رقصاں ہیں
جن میں چمکی کبھی سورج کی نہ بے مہر جبیں
جن میں دیکھی نہ گئی رات کی قندیلِ منیر
جن میں مہتاب کی مشعل کا کہیں نام نہیں
جن میں لرزے نہ کبھی رنگ و طرب کے سائے
جن میں گونجی نہ کبھی صوتِ ہزار
جن میں روشن نہ ہوئی شاخِ چنار
جن میں دیکھی نہ گئی رات کی قندیلِ منیر
ایک یخ بستہ سکوت ——
جن میں ہر لمحہ رہا کرتا ہے
انھیں تاریک سے زندانوں میں
آج آئی ہے صبا دعوتِ گلشن لے کر
ایک پیامِ لبِ سوسن لے کر
ایک صد چاک سا دامن لے کر
آج پروانوں کو تنویر کا احساس ہوا
آج دیوانوں کو زنجیر کا احساس ہوا

(دعوت دہلی)

شبنم سبحانی

انھیں بھی بخش دے یارب تو عشق کا سودا
ہمارا درد نہ یوں غمگسار سمجھیں گے

میں نذرِ جاں تو کروں حوصلے مگر ہیں پست
اسے بھی آپ زرِ کم عیار سمجھیں گے

نہ جانے اہلِ چمن کو ہی مجھ سے ضد کیسی!
جسے خزاں میں کہوں وہ بہار سمجھیں گے

جو آکے گھول دے افسردگی نگاہوں میں
وہ غم تو دوش پہ ہم اپنے بار سمجھیں گے

نہ نذرِ جاں کے فسانے ہر ایک بزم میں چھیڑ
یہ بات صرف ترے جاں نثار سمجھیں گے

ہوس کی جلوہ نمائی جہاں ہو اے شبنم
ہم ایسے عشق کو کب باوقار سمجھیں گے

ملّی اتفاق کی بنیادی قدریں

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا اور یہ کبھی نہ ہوسکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ جس سے فرار ممکن نہیں ہے، اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک اور اختلافات میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ تو درکنار، ایک گھر بھی بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں اور ایک کامیاب نظامِ زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو رد کیا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیری ترقی ہوئی ہے اسی وقت ہوئی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اصول پا لئے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں اور اس اتفاق میں ایسی گنجائشیں رکھ لی گئی ہوں کہ اختلافِ طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

پاکستان میں پچھلے آٹھ سال سے جو صورتِ حال رونما ہے اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل وجہ اتفاق کی بنیادیں تلاش کرنے میں ہماری ناکامی ہے۔ ہمیں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنے کا اختیار حاصل ہوئے آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ مگر ہم جہاں پہلے روز کھڑے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے۔ اختیار پا کر بھی ہم ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لئے کوئی کامیاب اور قابلِ ذکر کوشش نہ کر سکے۔ ہمارا دستور وہی ہے۔ انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے تعلیمی نظام وہی ہے۔ معاشی نظام وہی ہے۔ اخلاق و معاشرت کا وہی حال ہے۔ مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لئے بھی ہم کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ بلکہ قدم اٹھانے کے لئے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لئے ہماری سعی و جہد تو اسی غرض کے لئے تھی کہ ہم غلامی کے دور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لئے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی مؤثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں آٹھ سال سے اختلافات کی فصلِ بہار آئی ہوئی ہے فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات، نئی نئی شان سے ابھرتے رہے ہیں اور ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے دوسرا اس میں مزاحم ہوتا ہے اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے کوئی تیسرا اسے بگاڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورتِ حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہوگئے ہیں تو ہمیں اختلاف اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے افادہ پانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنے ذہن کو ان بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیئے جن پر سب، یا کم از کم اکثر باشندگانِ پاکستان متفق ہو سکیں۔ جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں باہمی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔

ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجوہِ نزاع کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا ... زاویۂ نظر بدل جائے تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔ ہم انہیں اپنے مذہب میں پا سکتے ہیں۔ اپنی تہذیب اور روایات میں پا سکتے ہیں۔ دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں، اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

یہ سطور اسی غرض سے لکھی جا رہی ہیں کہ چند ان بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی جائے جن پر اتفاق ممکن ہے، تاکہ سوچنے والے ان پر غور کریں۔

سب سے پہلے ہم ان اصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تخریبی فضا کے بجائے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں اس لئے کہ اگر باہمی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا ... لاحاصل ہے۔

اولین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیئے وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمانداری کے ساتھ ہو۔ دلائل کے ساتھ ہو، اور اسی حد تک رہے جس حد تک فی الواقع وہ ہے تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح مختلف نقطہ ہائے نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں، تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا لیکن کسی معاشرے کے لئے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اصول اختیار کر کے اس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے، اس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے، اس کے نقطۂ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلاف ہو تو اسے غدار اور دشمنِ وطن ٹھہرائے۔ مذہبی اختلاف ہو تو اس کے پورے دین و ایمان کو متہم کر ڈالے، اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسکی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکدر پیدا ہوتا ہے جو تعاون و مفاہمت کے لئے نہیں بلکہ صرف تصادم و مزاحمت ہی کے لئے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لئے عارضی منفعت کا کوئی پہلو تو ہو، مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر خود وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس بیہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو۔ ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لئے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے، اختلافات میں رواداری ایک دوسرے سے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش، اور دوسروں کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا ہے۔ کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لئے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا پھر اس پر مزید خرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی، لہذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے" یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اختلاف کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف عناصر کو

جنہیں بہرحال ایک ہی جگہ رہنا ہے۔ اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت و مصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک مدتِ دراز تک معاشرے کے عناصر ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بدقسمتی سے ناروا داری اور بدگمانی اور خود پسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں حکومت اور اس کے ارباب اقتدار اس میں مبتلا ہیں، سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں تک اسکے زہریلے اثرات اتر گئے ہیں۔ اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں۔ اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیر اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعتِ ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام ان لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صرف کرے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لئے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے مگر اس نفی کو اسی حد تک رہنا چاہیئے جس حد تک وہ ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیئے نہ کہ نفی۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ بعض لوگ تو اس منفی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اس کی اور اس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے یہ ایک نہایت غلط طریق کار ہے اور اس سے بڑی قباحتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے تعصبات ابھرتے ہیں۔ اس سے عام بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لئے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے جو ایک قیادت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جانے اور دوسری کسی قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے، کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو جمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہوگا۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا ہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے اور ساری قوم بے سری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدۂ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیئے یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر نہیں بلکہ دلائل سے منوائے اور جو کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ بزور نافذ کرنے کے بجائے ترغیب و تلقین سے لوگوں کو راضی کر کے نافذ کرے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لئے مفید خیال کرتا ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ اٹھے اور زبردستی اسکو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریق کار کا لازمی نتیجہ کشمکش، مزاحمت اور بدمزگی ہے ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ کامیابی کے لئے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ خواہ وہ حکومت کی طاقت

ہو یا ل دولت کی یا نفوذ و اثر کی ، وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس طاقت کا استعمال کافی ہے۔ لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی ... زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے، ملکوں کے نظام تہ و بالا کر دیئے ہیں، اور ان کو پر امن ارتقا کے راستے سے ہٹا کر پے در پے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے با اثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ اور اسی طرح ... پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انھیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیئے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیئے۔ ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا، ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا۔ یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی نہ کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اس طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لئے معرکہ آرائی پر اتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کے لئے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جائے اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے جس کے برے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے بھی اس کا تعلق ہو اس کے ساتھ اسکی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی، تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے، اور تعصب کے مقابلے میں تعصب کشمکش پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھلا اس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لئے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ ملک کی بھلائی ہی کے لئے خواہاں اور کوشاں ہوں۔ اور دوسری شرط یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصولی ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہو گی اس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لئے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کی پروا نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ قزاقوں کی ٹولی ہے اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار و اقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو ان کی جنگ بھی ملک کے لئے تباہ کن ہو گی اور صلح بھی۔

یہ پانچ اصول تو وہ ہیں جن کی پابندی اگر ملک کے تمام عناصر قبول نہ کر لیں تو یہاں سرے سے وہ فضا ہی پیدا نہیں ہو سکتی جس میں نظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتفاق ممکن ہو، یا بالفرض اس طرح کا کوئی اتفاق مصنوعی طور پر واقع ہو بھی جائے تو وہ عملاً کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مصالحانہ فضا میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ ملک کا نظامِ زندگی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

ان میں سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو ملک کے آئندہ نظام کے لئے منبعِ ہدایت اور اولین ماخذِ قانون تسلیم کیا جائے اس کو ...

قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے مگر تجربات کی درسگاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی... سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے بھلے برے کی وہ خود ذمہ دار ہے اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے۔ اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لئے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی... مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹرشپ یا اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے رد و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انھیں اس نقصانِ عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

پچھلے چند سال میں ہمارے ہاں جو حالات پیش آتے ہیں انھیں بات کی دلیل ٹھہرایا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ اسکے دعویدار [illegible] قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہ جمہوریت تو ضرور ہونی چاہیئے۔ مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیر اندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے لیکن ٹھنڈے دل سے ان تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آتے ہیں تو کسی صاحب بصیرت کے لئے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہو گی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوتی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں، یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے برے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے، اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھہرا جائے۔

یہ تو ہے استدلال کی غلطی۔ اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں، تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پر امن طریقے ہی سے قائم ہو بہرحال پر امن طریقے سے رفع نہیں ہو سکتی، اور اس امر کی بھی کوئی

ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداءً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں۔ بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہذا تمام لوگوں کو۔ جمہور کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی۔ اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ آیا وہ آمریت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں؟ آمریت خوا لتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے، اس کا راج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں؟ اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے یا جو مترتب ہوتے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں ت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور دلنظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردوبدل کسی کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے۔ ں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سیاہ و سپید پر... ف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت دلی رضا اور ارادے کسی مقصد کے لئے حرکت میں آسکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی ائی کے ساتھ ہو، انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رعام لوگ اس سے بیزار ہو کر خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں س کے جتنے پرامن راستے ہوتے ہیں وہ انہیں چن چن کر بند ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل اس کو کسی منزل خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

ان نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی ع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دیگا خواہ آمریت کا وہ داسی کو کیوں نہ حاصل ہو رہا ہو۔

اب اگر شرح صدر کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ ہمارے ملک کا نظام جمہوری ہی ہونا ہے، تو اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ہم جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ اختیار کریں اور اس میں آمریت کے لوازم ... دخصائص کی آمیزش نہ کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر جمہوریت صحیح طریقے پر کام نہیں کر سکتی، نہ وہ نتائج دکھا سکتی ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ اس غرض کے لئے ہمیں جمہوریت کے ساتھ ساتھ پانچ مزید اصولوں پر بھی اتفاق کرنا ہوگا:۔

اول، تقسیم اختیارات کا اصول، یعنی ریاست کے تینوں شعبوں (انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ) کے دائرۂ اختیار کا واضح طور پر الگ ہونا۔

دوم، شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت، اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔

سوم، انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لئے ایسی قانونی و انتظامی تدابیر جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات کے ... نتائج فی الحقیقت رائے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔

چہارم، قانون کی حکمرانی، یعنی یہ امر کہ راعی و رعایا کے لئے ایک ہی قانون ہو، اور سب اس کے پابند ہوں، اور عدالتوں کو یہ حق ہو کہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کر سکیں۔

پنجم، ملازمین حکومت کا، خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے، سیاست میں دخیل نہ ہونا اور ہر اس ہیئت حاکمہ کی اطاعت قبول کرنا جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔

یہ پانچوں اصول ایک جمہوری نظام کے ایسے لوازم ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے یا ساقط نہ سہی ناقص ہی کر دیا جائے، تو جمہوریت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور پھر وہی خرابیاں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جو کسی نہ کسی نوع کی بے نقاب یا نقاب پوش آمریت سے رونما ہوا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ملک کے انتظامی فرمانرواؤں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ کسی وقت جمہور کے نمائندوں کو رخصت کر کے خود ہی

حکومت بھی کرنے لگیں اور خود ہی اپنی مرضی سے قوانین بھی بنا لیں، تو اس میں اور کھلی کھلی بادشاہی و آمریت میں آخر کیا فرق رہ جاتا ہے اور اس طرح جمہوریت کے نام سے فریب کاری کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ یا اگر انتظامی فرمانرواؤں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ وہ عدالتوں کے ضمیر اور ان کی قدرتِ انصاف پر اثر انداز ہو سکیں تو اس حالت میں اور مطلق العنان جبّاری میں آخر کیا وجہ امتیاز ہے؟ ایک جابرانہ نظام میں بھی تو یہی قباحت ہوتی ہے کہ وہاں طاقتور کے مقابلے میں کمزور کا حق دلوانا عدالت کے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر ایک جمہوری نظام میں حکمرانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں لوگوں کی آزادیٔ ذات، آزادیٔ تحریر و تقریر، آزادیٔ اجتماع اور آزادیٔ نقل و حرکت سلب کر لیں، بغیر اس کے کہ ان کا جرم کسی عدالت میں ثابت کیا گیا ہو، اور بغیر اس کے کہ کوئی عدالت ان کے معاملے میں یہ تحقیق کرنے کی مجاز ہو کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں تو ایسے نظام کا آغاز خواہ کیسے ہی جمہوری طریقے پر ہو، اس کا انجام لازماً جمہوریت کی موت پر ہوگا، کیونکہ جمہوریت کبھی ایسے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتی جہاں حکومت پر تنقید کرنا دشوار، اور حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دشوار تر ہو جائے۔ ایسی حکومت جو ایک دفعہ برسرِ اقتدار آ جائے گا وہ پھر زبردستی اقتدار پر قابض رہے گا، اور اس کا نام بہرحال جمہوریت نہیں ہے۔

ایسا ہی معاملہ انتخابات کی آزادی کا بھی ہے۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے جس کو چاہیں حکمرانی کے لئے منتخب کریں۔ اور جب چاہیں اپنی آزاد مرضی سے ان کو تبدیل کر دیں۔ یہ چیز کیسے وجود میں آ سکتی ہے اور کس طرح باقی رہ سکتی ہے اگر دباؤ اور لالچ اور فریب اور حیلوں سے انتخابات کے نتائج اصل رائے عامہ کے بالکل برعکس برآمد کئے جا سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں تو لوگوں کو رائے اور انتخاب کا حق دینا اور نہ دینا دونوں برابر ہیں۔

اسی کے قریب اہمیت اس چیز کی بھی ہے کہ ملک میں آئین و قانون اور ضابطہ سب کے لئے یکساں ہو، سب پر غالب ہو اور کوئی اس کی خلاف ورزی کرنے کا مجاز نہ ہو یہ ان بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ جو ایک جمہوری نظام کو ایک شخصی استبداد اور ایک مطلق العنان آمریت سے ممیّز کرتی ہیں جہاں راعی کے لئے قانون کچھ اور ہو اور رعایا کے لئے کچھ اور جہاں قانون کی ساری پابندیاں صرف کمزوروں کے لئے ہوں اور طاقت والے ہر وقت آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنی من مانی کر سکتے ہوں اور جہاں عدل و انصاف کی طاقت زور آوروں کے مقابلے میں قانون کو نافذ کرنے سے عاجز ہو وہاں جمہوریت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اور قائم ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتی جمہوریت تو سب لوگوں کی برابری کا نام ہے اور برابری کا لازمی تقاضا ہے کہ ضابطہ سب کے لئے ایک ہو اور سب پر یکساں نافذ ہو۔

پھر جمہوریت کی زندگی اور کامیابی کے لئے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ حکومت کے کارپرداز اور محافظ سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو تسلیم کریں یعنی اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں اور مملکت کے کارپردازوں کا جو حقیقت میں باشندوں ہی کے ملازم ہیں یہ فرض ہے کہ جن لوگوں کو بھی باشندوں نے کارفرما بنایا ہو ان کے تحت امر رہ کر کام کریں۔ یہ بات اگر ایسے مدار کے تقاضا قبول نہ کی جائے اور ملازمینِ حکومت جتھہ بندی کر کے خود یہ طے کرنے لگیں کہ کون کارفرما ہو اور کون نہ ہو یا کارفرمائی کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں لے لینے پر تل جائیں تو صرف یہی نہیں کہ جمہوریت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی بلکہ درحقیقت اخلاقی حیثیت سے ایک بہت بڑی خیانت اور نتائج کے اعتبار سے پورے ملک کے لئے ایک نہایت خطرناک چیز ہے ایک شخص کے ملازم اگر جتھہ بندی کر کے خود اسی شخص کو مغلوب کر لیں اور اس کے گھر بار کے مالک بن بیٹھیں تو اس کا نام غداری و خیانت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا پھر جہاں پبلک کے ملازم پبلک کے ساتھ یہ معاملہ کریں وہاں اس حرکت کو اور کیا نام دیا جائے گا؟ رہے اس کے نتائج تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ

آسی ضیائی رام پوری

اَلوَقفُ لَا یُملَکُ

ہماری مسجد میں جب مولانا اظہر المسعود السواتی ثم المردانی طالب العلم درجۂ حدیث جامعۃ العرفانیہ بطور امام مسجد بنکر آئے تو بالعموم نمازیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ اس سے پہلے کتنے ہی امام مختلف وجوہ سے بدلے جاچکے تھے۔ ظہر، یا عشاء وغیرہ کی جماعت کا انتظار کرتے وقت، یا اس سے فراغت کے بعد، جب امام صاحب کہیں قریب موجود نہ ہوتے۔ یہ نمازی آپس میں ان کی شان میں بطور آمد سخن ویسے کلمے کہا کرتے جس سے ان کا سابق اماموں سے کسی نہ کسی طرح بہتر ہونا ثابت ہوتا۔

ان پڑھ اور اکھڑ حاجی جی کہتے۔ بڑا سیدھا ہے بچارا۔ چپ چاپ۔ اپنے کسی سے نہ غرض نہ مطلب ارے میاں وہ ملا مظفر بنگالی دیکھا تھا کیسا تڑاتا تھا۔ بات بات پہ جھگڑتا تھا۔

ضعیف العمر شیخ جی گھڑی ساز اپنا سوکھا سوکھا ہاتھ لمبی سفید داڑھی پر پھیر کر ایک بڑی سی ڈکار لیتے۔ انہیں ڈکاروں کا مرض تھا پھر کہتے ”اور صفائی کا کتنا خیال رکھتا ہے مسجد کی! اور یہ بنگالی ملاؤ سبکے سب ایسے گندے ہوتے ہیں کہ بس۔ خود بھی ہفتوں نہیں نہاتے اور مسجد بھی صاف ستھری نہیں رکھتے“ اور پھر ایک ڈکار لیکر اپنی تسبیح میں مشغول ہوجاتے۔

حافظ عاشق سیالکوٹی کو یہ خوشی تھی۔ اور بھئی پٹھان ہے مگر ہے بے ضرر! ہم نے تو میاں جتنے بھی پٹھان ملا دیکھے۔ سب پرلے درجے کے لالچی اور ضدی مگر یہ مولوی صاحب ان سب سے الگ ہیں۔

حد یہ کہ وہ بنگالی ملا بھی۔ جو اسی مسجد کے دوسرے حجرے میں برسوں سے قبضہ جمائے بیٹھا تھا اور عموماً لوگوں کا خیال تھا کہ دوسرے امام اسی کی وجہ سے مسجد میں نہیں ٹکتے۔ مولانا مسعود کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ ”بوت نیک ہے۔ سُلاکی عیاری کو بس نہیں جانتا“ اور اس ملا کی اسی مسجد کے امام کے متعلق اچھی رائے ہونا بڑی بات تھی۔ کیونکہ یہ ملا جسے مقامی لوگ ”ملا تعویذیا“ کے حقارت آمیز نام سے پکارتے تھے اور مشہور تھا کہ بیسیوں آدمیوں کو جھوٹے سچے تعویذ دیکر لوٹ چکا ہے) خود اس امامت کا مستقل امیدوار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ نمازی اس کے پیچھے نماز پڑھنے پر بوجوہ راضی نہ تھے۔ اور اسی لئے وہ کوئی نہ کوئی اڑنگا ایسا لگا دیتا تھا کہ امام مسجد جلد ہی یہاں سے رخصت ہوجاتا اور خود نہ معلوم کن کن ہتھکنڈوں، متولیوں کی خوشامد اور رشوہ دوانیوں سے ڈٹا بیٹھا تھا۔

سب سے وزنی رائے خاں صاحب کی تھی۔ جو مہر محلہ تو نہ تھے (کوئی بھی نہ تھا) لیکن ان کی علمیت، تمول، نیک نفسی اور بے لوثی کا معترف محلہ تو کیا شہر بھر تھا۔ انہیں سب سے زیادہ اطمینان اس پر تھا کہ اس کی قرآت درست ہے۔ خصوصاً ض اور ظ کو صحیح مخارج سے ادا کرتا ہے۔ حالانکہ بالعموم یہی وہ حروف ہیں جنھیں ادا کرنا نہ ہر ایک کی بس کی بات ہے، نہ اسے باقاعدہ سیکھنے کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔۔۔۔۔

اور جمعے کے دن مجھے ان تمام رایوں کے اسباب بھی نظر آنے لگتے۔ جس وقت امام صاحب خطبہ دینے اور امامت کرنے نیچے آتے اپنے حجرے سے برآمد ہوتے سنتیں پڑھتے خاموشی سے نمازیوں کے درمیان بیٹھے رہتے۔ اور جیسے ہی ساڑھے بارہ کا ارتعاش بجتا اللہ اکبر پر جا بیٹھتے، اور اذان کے بعد اٹھکر خطبہ پڑھنے لگتے۔ تب ان کا پورا سراپا میرے سامنے ہوتا۔ ایک درمیانی قد۔ نحیف الجثہ۔ گورا سا پینتیس سال کے لگ بھگ، عمر والا جوان، جو اپنی سفیدگی اور کالی سی ڈاڑھی کی بدولت ادھیڑ عمر کا آدمی لگتا۔ اپنے دبلے اجلے بزرگانہ کے اندر ایک عجیب ملکوتی سی صورت پیش کرتا معلوم ہوتا۔ اور ان

کچھ حیرت اور اطمینان کے ساتھ اس کے ہلتے لبوں اور متحرک ڈاڑھی کے بیچ ایک جھانکتی ہوئی ٹھوڑی کو دیکھا رہا۔ کیا بارعب آواز تھی! کتنا صحیح لب ولہجہ اور تلفظ۔ ایک ایک لفظ مسجد کے گونج دار گنبد کے باوجود واضح! اور یہ سب کچھ مل کر ماحول کتنا مقدس ہوتا، اور پھر نماز میں کتنا دل لگتا!

پھر، جب کچھ دن بعد، مسجد کے متصل اسی جامعۃ العرفانیہ سے مولانا کو سندِ حدیث بھی مل گئی تو میں نے کسی قدر تعجب اور تعریف کے ساتھ وہاں کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولوی عبدالتواب صاحب سے بھی ان کی متانت اور ذکاوت کا اعتراف سنا۔ یہ مولوی صاحب عموماً اپنے بنگالی اور سرحدی طبقہ سے نالاں ہی رہتے "کبھی نہ معلوم کون سی مٹی کے بنے ہوتے ہیں یہ طالب علم۔ بس بلا کے ٹھوٹ اور کوڑھ مغز کہ بہترا ہی ٹھونسو۔ دماغ میں کچھ ٹھنستا ہی نہیں۔ اسی لئے اول تو میں اپنے مدرسے میں ہر ایک کو لیتا ہی نہیں۔ کوئی اسی فی صدی کو ہر سال ٹال دیتا ہوں۔ کہ دوسرے جاؤ جہاں تین مہینے میں دورہ (حدیث کا ختم) کرا کے سند دیدیتے ہیں۔ اور جو تھوڑے بہت کا امتحان لے کے داخل کر لیتا ہوں ان کو بھی سارا سال جانچتا پرکھتا رہتا ہوں۔ جو بھی ذرا معیار سے گھٹا۔ میں سند دیتا نہیں دیتا۔ مگر یہ ملا مسعود میرے بہت اچھے شاگردوں میں سے ہے۔ میں نے بھی اسے دل لگا کے پڑھایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جب اپنے وطن جائے تو اس کے ذریعہ سے خدا ان پٹھانوں کی جہالت دور کرے۔"

یہاں یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ مدرسہ جامعۃ العرفانیہ بانئے تھی۔ اب سے کئی سال پہلے مولوی عبدالتواب صاحب ی مسجد کے شمالی بغل والے مدرسہ "فلاح قوم آرائیاں" میں اعلیٰ رس تھے۔ لیکا یک ایک دفعہ انہیں خیال ہوا کہ ان کا مقام غالباً ے اول تو مدرسے کو محض کسی ایک برادری کے بچوں کے لئے خاص ناکیا معنیٰ؟ یہ تو ایک نہایت تنگ نظری اور احساس کمتری ں بات ہوئی۔ پھر یہ کہ اس مدرسے کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم فقہ حنفی لسفۂ قدیم سے آگے نہ تھی۔ حالانکہ دینی مدرسے میں فقہ کے ساتھ حدیث کا اہتمام بھی ضروری ہے اور فلسفۂ قدیم ایک مہمل سی چیز ہے اس کے بدلے موجودہ دنیا کے ترقی یافتہ علوم رائج کرنے چاہئیں تیسرے یہ کہ مدرسے کا اہتمام نااہل اور "کھاؤ" متولیوں کے ہاتھ میں آگیا تھا جس سے بدنظمی اور ابتری برابر پھیلتی جا رہی تھی۔

یہ باتیں ذہن میں آنا تھیں انھوں نے اصلاح کی جدوجہد شروع کر دی۔ آدمی مخلص اور نہایت درجہ بیباک تھے۔ مدرسے کے منتظموں کو پہلے نرمی سے سمجھایا کئے۔ پھر نہایت صفائی سے موقع بے موقع ان کی بے عنوانیوں پر ٹوکنے لگے۔ یہ ایسی جرأت مندانہ بات تھی کہ عام حالات میں کسی تنخواہ دار ملازم سے اس کی توقع ہی نہ ہو سکتی۔ مگر کچھ تو خود منتظمین کی ڈاڑھی میں تنکا تھا اور کچھ مولوی صاحب کی جلالت اور علمیت سے بھی وہ لوگ مرعوب تھے۔ کسی کو ان کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر برس ہا برس پرانے نظام مدرسہ میں تبدیلی کیونکر ہو سکتی۔ اور پھر اس طرح کی اصلاح سے ذاتی منفعت کا نقصان کیونکر برداشت کیا جا سکتا تھا؟

مگر مولوی صاحب بھی دھن کے پکے تھے۔ برابر لگے رہے حتیٰ کہ ان کی باتوں سے پہلے پہل وہ ایک استاد متاثر ہوئے۔ پھر اونچی جماعتوں کے سمجھدار طلبہ اور آخرکار متولیوں کی انجمن کے ایک نئے رکن، جو ویسے بھی خاصے پرجوش اور مخلص نوجوان تھے۔ اب کیا تھا۔ باقاعدہ محاذ سا بن گیا اور یہ مطالبہ کہ مولوی صاحب کے بتائے ہوئے طریقہ پر مدرسے کی تجدید کی جائے۔ کافی شدت پکڑ گیا۔ بلکہ انجمن کے اُن نوجوان رکن نے ایک اجلاس میں یہاں تک دعویٰ کر ڈالا کہ مدرسے کی موجودہ روش خود بانیٔ مدرسہ مرحوم ہی کے خلاف ہے اور اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو مولوی صاحب ہی کی تجویز کے مطابق مدرسے میں اصلاح کرتے کیوں کہ وہ مولوی صاحب سے بہت متاثر، بلکہ ایک حد تک معتقد تھے، اور نہ بھی ہوتے تو یہ مطالبہ خود اتنا معقول تھا کہ اس کے آگے ان کی کوئی اور خواہش اگر ہوتی تو قابلِ رد تھی۔

حالات کے اس نئے رخ سے متولی لوگ بہت سٹپٹائے۔

اگر معاملہ صرف ایک رکن کا ہوتا تو نظرانداز ہو سکتا تھا۔ مگر وقت یہ

آپڑی کہ یہ سنے رکن بانی مدرسہ کے نواسے تھے۔ اور اپنی پشت پر برادری کی ایک خاصی قوت رکھتے تھے۔ ان کی بات کو "بچپنا" کہہ کر ٹال دینا آسان نہ تھا۔ پھر یہ بھی معلوم تھا کہ یہ اسی مدرسے کے فارغ اور انہی مولوی صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ پس کہا جا سکتا تھا کہ وہ تو مولوی صاحب کی حمایت کیا ہی چاہیں۔ ان کے "بھٹو" جو ٹھہرے نتیجہ یہ کہ انجمن میں رسہ کشی سی شروع ہوگئی۔ ادہر اونچی جماعتوں کے طلبہ اپنے وفد انجمن کے پاس بھیجنے لگے کہ مولوی صاحب کا مطالبہ مانا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انجمن کو معمولی طلبہ کی یہ "حرکت" گستاخانہ تھی۔ طفلانہ ہونے کی بنا پر قابلِ اعتنا بھی دکھائی دی۔ نتیجہ یہ کہ طلبہ نے مظاہروں کا سہارا سنبھالا۔ دینی مدرسے کے "مفت خور" طلبہ اور یہ جسارت! ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں! ابھی یہ کوئی اور ہی درپردہ تار ہلا رہا ہے۔ انجمن اس بنا پر مولوی صاحب کو برطرف تو کر ہی دیتی، مگر خود اس میں جوان کا حمایتی موجود تھا اور اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دو چار اور رکن بھی اس طرف ڈھلک گئے ہیں۔

اور اب، انجمن کے ارکان میں بھی باہم چپقلش شروع ہوگئی۔ آخر کہاں تک ڈھیل دی جا سکتی تھی۔ اکثریت نے چاہا کہ اب مولوی صاحب ہی کو سبکدوش کر دیا جائے۔ مگر اقلیت نے بڑی سختی سے مخالفت کی اور آخر کھچڑی پکتے پکتے یہ سا جھے کی ہانڈی عدالت کے چوراہے پر پھوٹی۔ اکثریت والے فریق پر اقلیت نے دعویٰ ٹھونک دیا کہ یہ لوگ بانی مدرسہ کے مقاصد کے مطابق مدرسہ چلانا نہیں چاہتے۔ اور ان کے ذاتی مفاد پر اپنی اصلاح کے آڑے آجاتے ہیں۔ مگر وکیلوں کے تیور۔ اور کبھی کبھی دبی زبانیں۔ بتانے لگیں کہ مقدمے میں جان نہیں ہے۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ مقدمے سے دست بردار ہونے کے بجائے انہوں نے جھلا کر مولوی صاحب سے کہا کہ کوئی فکر نہیں۔ ہم اس انجمن سے علیحدہ ہو کر ایک نیا مدرسہ کھولیں گے، اور آپ ہی اس کے مہتمم ہونگے سارا انتظام، نصاب، تربیت آپکے ذمے، اور روپیہ ہمارا۔ دیکھیں تو یہ "چوہدری" اپنا مدرسہ کیونکر چلاتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے مسجد کے مشرق کی طرف والی زمین اور ملحقہ کھنڈر خرید نا طے پا گیا۔ پوری سکیم بن گئی عدالت میں وہی مواحیں کا اندیشہ تھا۔ یہ نوخیز جوشیلے بارگئے پاس پر انہوں نے انجمن سے استعفیٰ دیدیا۔ ورنہ علیحدہ کر دیئے جاتے بہرحال ان کی جگہ نئے ممبر اس وقف کے متولی چن لئے گئے۔ اور ادھر اس انجمن جوانہوں نے پہلے ہی تیار کر لی تھی عمل درآمد ہونے لگا۔ مولوی صاحب نے کہا بھی کہ نیا مدرسہ پرانے مدرسے سے اتنا قریب نہ بنایا جائے۔ ورنہ خواہ مخواہ رنجشیں بڑھیں گی۔ مگر اس ٹولی نے نہ مانا کہ "ہم تو ایسے ہی ان کی چھاتی پر مونگ دلیں گے"۔ اور پھر مدرسے کے افتتاح کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

کچھ تو مولوی صاحب اپنی لیاقت علمی سے پہلے ہی شہر میں مشہور تھے۔ کچھ اس مقدمے کی بدولت اور بھی ان کا چرچا ہو گیا اور پھر جوان کی طرف سے نئے مدرسے کا نصاب نامہ شائع کیا گیا جس میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر تکمیل تک اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ ہی جدید ضروریات کی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ اور اس تعلیم کے دروازے بلا لحاظ برادری وغیرہ ہر مسلمان پر کھلے تھے۔ اور یہ سب کچھ مفت! تو گویا خلقت ٹوٹ پڑی۔ مخیروں نے چندوں سے مدد کی۔ ناداروں نے دعاؤں سے دل بڑھایا۔ اور طالب علموں کا تانتا بندھ گیا یہاں تک کہ دو تین ہی برس میں "مدرسہ فلاح قوم" میں سوائے کم سن بچوں کے، جو انہی متولیوں کے، اور انہی کی برادری والوں کے بیٹے بھتیجے تھے۔ کوئی بھی داخل ہونے نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ اونچی جماعتوں کے استادوں کو بھی برطرف کرنا پڑا۔ کیونکہ منطق۔ ادب، فلسفہ اور فقہ پڑھنے والا ایک بھی ادہر رخ نہ کرتا۔ اس تعلیم کے لئے دوسرے مدرسے بہت تھے۔ اور قریب ہی جامعۃ العرفانیہ موجود تھا۔ جس کا معیار داخلہ اگرچہ سخت اور بلند تھا لیکن اتنے قلیل عرصے ہی میں اس کے نتائج بہت شاندار تھے۔

سو آج، پندرہ برس بعد، مولانا اظہر المسعود صاحب اسی مدرسے کے فارغ التحصیل، اور اسی مسجد کے امام تھے۔ اور اب مہتمم مدرسہ اور شیخ الحدیث مولوی عبدالتواب صاحب بھی سوچ رہے تھے کہ اگر مولانا فی الحال اپنے وطن نہ جائیں، تو ان کو ایک عنقریب خالی ہونے والی جگہ پر اسی مدرسے میں مدرس بھی رکھ لیا جائے۔

اسی زمانے میں ایک عجیب واقعے کا چرچا پھیل گیا۔ مدرسہ "فلاحِ قوم" میں چونکہ برسوں سے اعلیٰ عربی تعلیم بند تھی۔ اس لئے فقہ، فلسفہ، ادب وغیرہ کی تمام کتابیں، جو کسی زمانے میں مدرسے کے طلبہ کو پڑھنے کے لئے عاریتاً دی جاتی تھیں۔ بیکار ہو گئی تھیں۔ "عرفانیہ" کے متولیوں نے "فلاحِ قوم" والوں سے اسی زمانے میں کہا تھا کہ جب یہ نہایت کام کی چیزیں تو ہمیں دے ڈالو۔ ہم منہ مانگے دام دیں گے۔ مگر پچھلی رنجش اور ضد ایسی نہ تھی کہ یہ سودا ہو سکتا۔ اس پر فلاحِ قوم والوں نے طعنہ بھی کہلا بھیجا تھا کہ اچھا، اب انہیں شہد لگا لگا کر چاٹا کرنا یا تعویذ بنا کے گلے میں لٹکائے پھرنا۔ تب سے وہ مدرسے کی ایک کوٹھڑی میں الماریوں پر انبار سی رکھی تھیں۔ سال کے سال، مدرسے کا دربان انہیں نکال کر دھوپ دیدیا کرتا، اور پھر وہ کوٹھری کی زینت بن جاتی۔ اس سال جو وہ دھوپ دینے کے لئے نکالی گئیں تو پتہ ہوا کہ ان میں سے کچھ کتابیں ندارد ہیں۔ فہرست سے ملایا گیا تو معلوم ہوا کہ کم از کم پینتالیس کتابیں، فقہ اور اصول فقہ کی غائب ہیں۔ سب لوگ دنگ رہ گئے۔ مدرسہ پڑھائی کے اوقات کے علاوہ بند رہتا تھا۔ کوٹھری بھی جوں کی توں مقفل۔ دربان، چوکیدار کی کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی تھی۔ تو بھی، یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟ پہلے خیال ہوا کہ "عرفانیہ" والوں کی شرارت ہے۔ مگر ان سے توقع نہ تھی کہ برسوں بعد اپنی پرانی رنجش کا بدلہ ایسے کمینے طریقے پر لیں گے۔ پھر بھی احتیاطاً جاسوس کے طور پر کچھ لوگوں کو چھوڑا گیا۔ مگر عرفانیہ میں نہ وہ کتابیں نظر پڑیں، نہ کسی کو اس حرکت سے واقف پایا گیا۔ اور پھر یہ تھا کہ ان کتابوں پر مدرسے کی مہریں پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں چرانے والا وہی ہو سکتا تھا جو فوراً انہیں شہر ہی سے کہیں اور پہنچا دے۔

ناچار تھانے میں رپٹ لکھائی گئی۔ پولیس نے مفتوں تحقیقات کی۔ مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر انجمن والے صبر کر کے بیٹھ رہے، اور رفتہ رفتہ یہ چرچا ٹھنڈا پڑنے لگا تھا کہ اچانک ایک دن بالکل غیر متوقعانہ اس کا انکشاف ہو گیا۔

آج فجر کی نماز میں مولانا اظہر المسعود نہیں تھے، اور خان صاحب امامت کر رہے تھے۔ نماز اور دعا کے بعد ہی حاجی جی نے جو تازہ ترین مقامی خبریں نہایت جامعیت اور پابندی سے جاننے کے باعث "شہر کی دائی" کہلاتے تھے نمازیوں کو منتشر ہونے سے پہلے ہی اپنے ٹھیٹ اُجڈ لہجے میں چونکا دیا۔ "ارے بھائی، کچھ خبر ہے۔ کہاں گئے یہ مولوی ازہر مسعود؟"

حافظ عاشق بے پروائی سے بولے "کیا معلوم بھائی کہیں گئے ہوں گے اپنے کسی بھائی بند کے ہاں۔ کوئی دعوت وعوت ہو گی۔ رات کو وہیں رہ گئے ہوں گے" کیوں کہ پہلے بھی چند بار ایسا ہو چکا تھا۔

"اجی نہیں" حاجی جی نے کھڑے کھڑے آگے کو جھونکا سا لیا، اور اہمیت جتانے کی خاطر ہاتھ گھمایا۔ "وہ گئے سرکاری دعوت کھانے"

"ہیں! کیا؟" کئی نمازی بول اٹھے۔

"کہا تو، وہ سرکاری مہمان ہیں آج، کل شام لے گئی پولیس انہیں۔ اور وہ جو اس مدرسے کی کتابیں غائب ہوئی تھیں نا — وہ سب نکل آئیں ان کے پاس سے —!"

یہ خبر ایک دھماکا بن کر گری، اور سب کی تھوڑی سی بہت تعجب کی چیخیں نکل گئیں۔ حافظ عاشق بولے "ارے میاں حماقت بناتے ہو۔ کیا کہہ رہے ہو! مولوی مسعود پکڑے گئے؟"

"ایمان سے۔ ابھی تڑکے ہی معلوم ہوا۔ چھٹن ابھی ڈیوٹی سے آیا تھا۔ اس نے بتایا۔" چھٹن ان کا بیٹا جیل میں وارڈر تھا۔ "سب کتابیں انہیں نے چرائی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی کر کے۔ رات کو مسجد کی سیڑھی لگا کے مدرسے کی چھت پر چڑھ جاتے تھے، اور اسی سیڑھی سے اتر کے نکال لاتے تھے۔ کنجی بنوالی تھی کوٹھری کے تالے کی۔ اور اپنے حجرے میں گڑھا کھود لیا تھا اس میں دبا دیتے تھے۔ آؤ چلو تمہیں دکھاؤں۔ مگر ہاں اس وقت تو پولیس کا تالا پڑا ہو گا۔ ارے میاں سب قبول دیا ملانے۔"

"اور یہ معلوم کیسے ہوا؟" متحیر لہجہ بہت حاضرین نے پوچھا۔

"کل وہ اسٹیشن گئے تھے کہ پارسل کر کے اپنے وطن بھیج دیں۔ وہاں اتفاق دیکھو، یہ غلام ربانی ملا۔ وہی نا، انجمن فلاح قوم کے متولی کا لڑکا اس نے جو مولوی صاحب کو دیکھا کہ بیٹھے کتابیں باندھ رہے ہیں تو اس نے پوچھا کہ مولوی صاحب یہ کیسی کتابیں ہیں اور کہاں لئے جا رہے ہو۔ تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ اس نے یونہی ایک کتاب اٹھائی اور ورق لوٹے

تو اس پر مدرسے کی مہر! اور دو چار کتابیں دیکھیں، سب پر مہریں۔ اس نے پہچان لیا۔ کہ یہ تو وہی کتابیں ہیں جو گم تھیں کتنے دن سے۔ چپکے چاپ اٹھ، پولیس والے کو بلا لایا۔ اور پکڑوا دیا۔ پھر ملا جی نے بھی قبول دیا انہیں نے چرائی تھیں۔ سو اب وہ بڑے گھر میں ہیں۔"

دن چڑھتے چڑھتے یہ خبر محلوں پہنچ گئی۔ جو سنتا۔ دھپ رہ جاتا، الیاس نیک، مرنجان مرنج۔ عالم۔ محدث اور یہ حرکت! آخر اس نے چوری کی کیسے! اور یہ گتھی بھی حاجی جی نے سلجھائی۔ سڑک پر کھڑے ہنس ہنس کر محلے والوں سے کہا: "ارے میاں ملا اظہر مسعود نے پولیس کے پوچھا کہ تم نے مولوی ہو کے چوری کیوں کی تو بولے" مال موقوفہ تھا۔ اس کا لینا جائز ہے" یہ کہہ کے ہنستے ہوئے انہوں نے آدھا دھڑ گھما کر زور سے تالی بجائی، اور دہرے ہو کر ہنستے ہنستے دوسری طرف گھوم گئے

اور واقعہ بھی یہی تھا کہ۔ مولانا اظہر المسعود نے فقہی معولے ...

"الوقفُ لایملک" سے اجتہاد کیا تھا کہ جب مالِ موقوفہ کسی کی ملک نہیں ہوتا تو اسے حاصل کر کے اپنے تصرف میں لانا چوری کی تعریف میں کیونکر آسکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ مال کتابیں ہوں، اور برسوں سے بے کار پڑی ہوں۔ اور آئندہ بھی ان کے کام میں آنے کی توقع نہ ہو

استفتاء: اب فسانہ نگار کو یہ بتانا بے سود ہے کہ جب مولوی عبدالتواب صاحب نے اپنے عزیز شاگرد کی یہ حرکت سنی تو ان کی طبیعت اتنی غیر ہو گئی کہ دو دن تک وہ مدرسے میں درس تک نہ دے سکے اور کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح مولانا مسعود کے پاس سے اپنی دی ہوئی سندِ حدیث واپس لے لیں۔ کیونکہ "وہ اس کا حقدار نہیں" اور یہ بیان کرنا بھی لاحاصل ہے کہ اب محلے والوں اور "تعویذیہ" نے مولانا موصوف کے اندر بے شمار چھوٹے بڑے عیب ڈھونڈ نکال لئے، صرف فسانہ نگار یوں عرض پرداز ہے۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین "پرویزی" و ملایان شہر [illegible] جو قرآنی نظام ربوبیت کے علمبردار ہیں، اور مرکز ملت کو اختیار کلی دینے کے پرجوش مؤید ہیں۔ بیچ اس مسئلے کے مندرجہ بالا واقعہ کی بنا پر نظیر کر اگر ایک یا چند مخصوص مفکر حضرات ایک ملک کو، جسے خدا کا نظام قائم کرنے کے لئے ایک [illegible] وقف کر دیا گیا ہو [illegible] بہبود عوام کی خاطر چپ چاپ اڑا لیں اور اس کو خویش پروری، [illegible] سنانی اور فحش ترویج کے لئے پارسل بنا کر اپنے نام جملہ حقوق محفوظ کر لیں تو ان کا یہ فعل شریعتِ حقہ، داخلاقِ مسلمہ، و قوانینِ مروجہ کے کیونکر خلاف ہو سکتا ہے، اور کسی اخباری لیڈر یا دیسے ہی دو کرداروں کو اس پر اعتراض کرنے اور ٹوکنے کا کیا حق ہے، اور ایسے لوگوں کے خلاف تادیبی و تعزیری کارروائی کی جائے کیوں نہ اقرب الی الصواب ہے۔ بینوا و توجروا۔!

(بشکریہ "چراغ راہ")

پروفیسر شور (علیگ)

مزاجِ روزگار

ظلمت کا انتقام عجب اتفاق ہے
کرنیں ہیں زیرِ دام عجب اتفاق ہے

آئینہ اور آئینہ زنگی کے ہاتھ میں
مسند نشیں غلام عجب اتفاق ہے

لکھا ہے بامِ کج کلہ و تاجدار پر
اک زلزلے کا نام عجب اتفاق ہے

ہلنے لگی ہے وقت کے سنگین ہاتھ سے
بنیادِ قصر و بام عجب اتفاق ہے

فردوسِ رنگ و بو کی تباہی کے ساتھ تھا
شعلوں کا احترام عجب اتفاق ہے

شاخ و گل و شگوفہ و برگ و بہار کی
ہیں بجلیاں امام عجب اتفاق ہے

سورج کے باوجود بقتولئے تیرگی
ہے دھوپ تک حرام عجب اتفاق ہے

دل اور خانہ ساز خداؤں کی بندگی
دل پر یہ اتہام عجب اتفاق ہے

یہ جبرِ مصلحت کہ شعاعوں کے باوجود
ظلمت سے ہے کلام عجب اتفاق ہے

ہر آشنا سے ترکِ ملاقات کی ہوس
روپوشیوں سے کام عجب اتفاق ہے

ہر رہ گذر سے بچ کے نکلنے کی احتیاط
ہم اور یہ التزام عجب اتفاق ہے

کھلتا نہیں کسی پہ کسی دل کا ماجرا
اور گفتگو ہے عام عجب اتفاق ہے

(بشکریہ "افکار")

ریاض عرفی ●

..... یہ جینیس لوگ

آجکل کسی پڑھے لکھے کے لئے جینیس ہونا نہایت ضروری ہے اگر آپ جینیس نہیں تو گویا کچھ بھی نہیں چونکہ یہ جینیس نئی وارد ہوئی ہے اس لئے اکثر لوگوں کو صحیح طور پر معلوم نہیں کہ جینیس کیا ہوتا ہے۔ اسی مشکل کو رفع کرنے کے لئے واقفیت عامہ کی خاطر اس کا کچھ حال یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

اول تو جینیس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ بالکل بے کار رہے۔ اگر آپ خدانخواستہ کوئی کاروبار کرتے ہیں تو پھر آپ کے جینیس بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ نوکر پیشہ ہیں تو مندرجہ ذیل تکلفات درکار ہوں گے۔ مثلاً آپ کا دفتر سے اکثر غائب رہنا ضروری ہوگا۔ اگر دفتر میں رہنا ہی ہے تو پھر آپ اپنی معینہ جگہ پر نہیں بیٹھ سکتے اور افسروں سے تو ہمیشہ اَن بَن رہنی چاہیئے۔ اگر ہر دوسرے تیسرے روز جواب طلبی ہوتی رہے تو یہ اور بھی مفید ہوتا ہے اب ایک اور بھی چیز ہے۔ یعنی یہ کہ جینیس نوکر تو ہو لیکن ذرا یونہی خفیف خفیف سا۔ افسر بالکل نہ ہو۔ تاکہ نہ دوسروں پر بوجھ بنے اور نہ خود پر۔ اس طرح فطرت اپنا کام بطرز احسن انجام دیتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے سپرنٹنڈنٹ کی نسبت کلرک زیادہ آسانی سے جینیس بن سکتا ہے اور ویسے بھی افسر اور جینیس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر طالب علم ہو تو پروفیسر کو جاہل مطلق سمجھے۔ صبح کالج اس وقت پہنچے جب پڑھائی کے دو چار گھنٹے گزر چکے ہوں۔ پڑھائی کے اوقات میں دوسرے ضروری کام کرے۔ مثلاً سگریٹ پینا۔ قوم کی اصلاح کے لئے غور و فکر کرنا۔ وغیرہ اپنے نصاب کی کتب سے دلی نفرت ہو۔ نہایت عمدہ کپڑے پہنے۔ اگر اپنے پاس نہ ہوں تو دوستوں رشتہ داروں کے کپڑے پہنے یہ شرط ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارا اپنا بھتیجا جو اپنے آپ کو حسن الزماں کہلواتا ہے اور جھنگ مگھیانہ میں "کالج سٹوڈنٹ" ہے۔ اکثر ہمارے ہی کپڑے پہنتا ہے اور ہم ننگا پھرا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک جینیس طالب علم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ باقاعدہ فیل ہو اس کا مقصد صرف ہوتا ہے کہ اس کے عادات و خصائل میں ایک گونہ پختگی آجائے۔ اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو تعلیم کا حصول [illegible] ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اور بھی چیز ہے جس سے جینیس پہچانا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر جینیس وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے آپ کوئی غلط مطلب نہ نکالیں۔ بتاتا ہوں جو جینیس آپ کو ۱۹۵۵ء میں ملتا ہے وہ دراصل ۲۰۵۵ء میں پیدا ہونا تھا۔ وہ گویا محض کسی حادثے کی بنا پر سو سال پہلے پیدا ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی صحیح قدر دانی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ ساری عمر اس کا رونا روتا ہے اور تلخ کافی یا گرم چائے کی پیالی میں گھل گھل کر مرجاتا ہے اور مرنے سے قبل سگریٹ سلگا سلگا کر اپنی چتا بھی تیار کر لیتا ہے۔

میرا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہاں ایک جینیس کی تمام خصوصیات کا ذکر کر ڈالوں نہ ایسا کر سکتا ہوں "نہ کر سکتے" ہے آپ کہیں اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ کہ میں شاید ان لوگوں کی خوبیوں سے کما حقہ واقف نہیں ہرگز نہیں۔ مطلب تو صرف یہ کہ اگر میں کہیں ایسا کر بیٹھوں۔ تو یا تو آپ دن دہاڑے کافی ہاؤس کے سامنے میری لاوارث لاش پائیں گے یا پھر بہت سے جینیس دوستوں کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا اور میں کسی کی روزی پر لات مارنا نہیں چاہتا۔

جینیس اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر آرٹسٹ ضرور ہوگا۔ معمولی قسم کا آرٹ اس کی نظر میں نہیں جچتا وہ تو "ایبسٹریکٹ آرٹ" کا شیدا

ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو رسالہ ہے۔ اسی میں سے چند الٹے سیدھے خطوط دکھائے گا۔ مثلاً ایک صفحہ پر اوپر ایک ٹیڑھی لکیر اور ڈیڑھ نقطہ۔ یہ کیا ہے" اوپر ایک عورت بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ نیچے باپ بیٹھا حقہ پی رہا ہے ——— یہ کہتے ہی سر دھننا شروع کر دیگا اور آپ کو افسوس ہوگا کہ کیوں آپنے اکالج کی بجائے میوزکل آف آرٹس میں داخلہ نہ لے لیا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ جینیس کبھی اکیلا نہیں پایا جاتا۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ چنانچہ اس کے غول غول پلے جاتے ہیں اور غول بابا بی کی طرح جس طرف رخ کر لیں صفایا کر دیتا ہے۔

اگر آپ مندرجہ بالا باتوں کو ہدایت نامہ کی طرح سمجھ لیں تو امید ہے کہ آپ کو جینیس سے جلد شفا ہوگی۔ اگر اب بھی آپ نہیں سمجھے تو ٹھہریے میں چند مثالیں دیکر واضح کرتا ہوں دور کیوں جائیں ——— ہمارے چند دوستوں کو ہی دیکھ لیجئے

جینیس نمبر ایک میں رانا صاحب اگر انہیں رانا کے نام سے پکارا جائے تو مرنے مارنے کو تیار ہو جائیں سردیوں میں ٹھنڈے کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ اور گرمیوں میں گرم سوٹ۔ شاعر ہیں مصور ہیں اور سب سے زیادہ موسیقار لیکن صرف خالص کلاسیکی موسیقی کو پسند فرماتے ہیں۔ چنانچہ باپ دادا کی کمائی کو اس موسیقی کی تانوں میں ... رہے ہیں۔ گھر پر سینکڑوں آلات موسیقی رکھ چھوڑے ہیں۔ ہیک ... سب کی تعلیم جاری ہے۔ موسیقی پر جان دیتے ہیں اور اس کے بدلے کے طور پر اس کی جان لیتے ہیں۔ اگر ہم کبھی ان حضرات کے ہوٹل میں جانے کی ٹھانیں تو ہم سوچیں گے کہ کیا پیا جائے۔ ٹھنڈا یا گرم۔ چونکہ یہ جینیس اکٹھے ہوں گے۔ اس لئے اس مسئلہ پر خوب ... ہوگی۔ جب ان کی رائے پوچھی جاتی ہے۔ تو جواب ملتا ہے۔ ... جانوں وہ بجو یادرا والا" ہری اوم" پہلے ٹھیک رہے گا یا پھر ... "سجناں دی ڈاچی" کیا خیال ہے؟ ایسے موقعوں پر ہمارے ... ہوتی ہے کہ مہاتما گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد بالکل غلط ... ریڈیو پر بدقسمتی سے پکا راگ ہو رہا ہو تو یہ اچھل اچھل پڑتے

اگر آپ کہیں بیچ میں بول پڑے تو آپ کی خیر نہیں۔ ادھر روشن آرا بیگم دربت لے میں شدھ کلیان کا الاپ فرما رہی ہیں۔ تو ادھر یہ دوہرے ہوتے جا رہے ہیں کبھی انگوٹھی والی انگلی کی مدد سے طبلہ بجائیں گے یا پھر ایک بازو کھڑا کر کے دوسرے کے ساتھ پہلی سارنگی بجائیں گے کبھی یہ ہاتھ ہوا میں بلند ہے تو کبھی وہ ——— پھر آپ دیکھیں گے کہ ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا۔ انگلیاں ہیں کہ سانپ کی طرح بل کھا رہی ہیں۔ منہ کھلا ہے۔ چہرے پر ایک تلخ کیفیت ہے پھر دانت کھینچ لیں اور ایک ہاتھ کے تھا میز پر مکہ دے ماریں گے "ظالم نے بیڑا غرق کر دیا کمبخت تو درمدہم سے سیدھی ٹیپ کو مل رکھب تک چلی گئی۔ حالانکہ بیچ میں پنچم اور دھیوت کی ملاوٹ سے نندھ نکھاد پر جا کر مرکی لگانا ضروری تھا۔ یہی تو اس "ٹھاٹھ" کی جان ہے اور یہ طبلے والا۔ تو یہ ہے ایک تالے کو بالکل چوتالے کی طرح بجا رہا تھا۔ گولی مار دینے کے قابل ہے یاران طبلچیوں کا تو کوئی بند و بست کرو ——— "ایسے موقعوں پر جی چاہتا ہے کہ تمام موسیقاروں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔

اب چودھری صاحب سے ملئے۔ جو موجودہ دور کے سب سے بڑے ریاسی مفکر ہیں۔ اگر ہم چلتے اپنے لئے منگوائیں تو ہمیشہ ان کی نذر ہو جاتی ہے پھر جب ہم پوچھتے ہیں کہ بھئی چودھری سگرٹ ہیں" تو عجب سنجیدگی سے فرماتے ہیں "میں ذرا کل سے سگرٹ چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم بھی چھوڑ دو" چنانچہ میں خوش ہو کر جب سگریٹ منگواتا ہوں تو یہ حضرت ڈبیا اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ لہذا اب ہم اپنے سگریٹ ان سے مانگ کر پیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ادھار پی رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا سگرٹ لگاتے چلے جائیں گے۔ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے دوستوں کو ہمارے سگرٹ زبردستی پلاتے ہیں "اگر نہیں بھی پیتے تو کبھی کبھی پی لینے میں کیا حرج ہے۔ پیو ضرور بھئی یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں" ایسے موقعوں پر میں ایک عجیب ہنسی ہنستا ہوں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ مگر کہیں ہم خود ایک آدھ گھنٹے بعد دوسرا سگرٹ پینا چاہیں تو ارشاد ہوتا ہے "بدبخت کیوں گلا خراب کر رہا ہے۔ کھانسی ہو جائے گی اور پھر علاج ہم کو کرنا پڑے گا۔ کیونکہ چودھری صاحب

ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر بھی ہیں اور غریبوں کا علاج مفت کرتے ہیں سب یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ ان عزیزوں میں سے ایک تو وہ خود ہیں باقی ہم بدنصیب دوست۔ ہر روز سیاسی پیشگوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی سابقہ پیشگوئی کا حوالہ دیں گے تو کہیں گے۔ آپ سے کون بات کر رہا ہے کچھ عرصہ سے لائبریریوں کے مخالف ہو گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے اخبار والوں کے گاہک کم ہو گئے ہیں پھر کل یہ انکشاف فرمایا کہ وہ عنقریب ایک روزنامہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہنے لگے باقی تو میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔ تمہارے ذمہ دار صرف یہ کام ہے کہ ایک ایک ہزار ... خریدار مہیا کر ڈالو جو پیشگی چندہ دیدیں۔ ہاں۔ ارے یار وہ سگرٹ کی ڈبیا کہاں گئی ——— ؟ یہ جینیس ہیں مگر ود۔ حلیہ یہ قراقلی ٹوپی۔ شیروانی قمیص نہیں پہنتے۔ شلوار اور پشاوری چپل بشکل سے عمر عیار لگتے ہیں۔ کوئی صاحب انہیں چندہ نہ دیں۔ ورنہ ہم ذمہ دار نہ ہوں گے ہمارے تیسرے جینیس دوست یعنی خواجہ صاحب ایک مقامی قسم کے اخبار میں بقول ان کے ایڈیٹر ہیں۔ یعنی خبریں ترجمہ کرتے ہیں کافی عرصہ سے علم نجوم کا بھی مطالعہ ہو رہا کہ کسی نئے شخص سے یوں مخاطب ہوں گے "آہا۔ ہا ——— بھئی واہ۔ بہت مدتوں کے بعد یہ لکیر دوبارہ نظر آئی ہے۔ اس کے بعد اس غریب کے سگرٹ لکیروں کے چکر میں ختم ہو جاتے ہیں۔ پوچھا کہ تم اپنی قسمت کا حال کیوں معلوم نہیں کرتے۔ کہنے لگے: کئی بار معلوم کر لیا ہے . . . . .

اب اگر بتاتا ہوں تو تم کہو گے۔ اپنی تعریف کرتا ہے یہ جو لکیر دیکھ رہے ہو نا ——— یہ میرے ہاتھ پر ہے یا نپولین کے ہاتھ پر تھی ہاں ——— دیکھا ہی ہوا ——— نا ——— ہنسو۔ ایک دیکھو گے اخبار نویسی اور نجوم کے علاوہ افسانہ لکھنے میں وہ کمال حاصل کیا ہے کہ باید و شاید ——— دقت یہ ہے کہ جب بھی افسانہ لکھنے بیٹھے ہیں۔ تو لکھتے لکھتے ایک نیا پلاٹ سوجھ جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے کو چھوڑ کر نئے پلاٹ کو باندھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب سگرٹ سلگانے لگتے ہیں تو دونوں پلاٹ بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ پھر نئے سرے سے شروع کرتے ہیں یہی عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح درجنوں افسانے تیار ہو چکے ہیں۔ اگر وہ مکمل ہو جائیں تو ادبی دنیا میں تہلکہ مچ جاتے۔ میٹرک پاس ہیں مگر بیسیوں کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ فی الحال کوئی پبلشر چھاپنے کو تیار نہیں۔ ہر ماہ شمع معمہ کا حل بھیج دیتے ہیں اور پھر ہر ماہ انعامی رقم کا صحیح مصرف ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ مکتبہ کھول کر اپنے شاہپاروں کو شائع کر دیں۔ گویا انعام کا آنا نہ آنا ایک برابر ہے لباس بہت عمدہ پہنتے ہیں اگر پتلون قمیص ہے تو پیچھے سے قمیص پتلون سے باہر ہو گی۔ جس روز پاجامہ پہن کر آتے ہیں تو نکٹائی ہو گی سوٹ والے روز گلا کھلا ہو گا ——— وغیرہ وغیرہ

یہ بھی جینیس ہیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ جینیس کس قدر قابلِ قدر مخلوق ہے اگر آپ اب بھی نہیں سمجھے تو یا تو آپ بھی جینیس ہیں یا پھر آپ کے بھی بُرے دن قریب آ رہے ہیں۔ ہماری طرح ———

(بشکریہ "امروز")

ابن فرید بی۔اے۔

حمدا

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ فضا خاموش تھی ــــــ

حمدا نے چاند پر ہاتھ سے اوٹ کرتے ہوئے اپنی بوڑھی آنکھوں کو سکوڑ کر دیکھا۔ اسے یہ کھیت میں کوئی آدمی پڑا ہے تو وہ اسی طرح اپنے جسم کو خم دیتے ہوئے آگے بڑھا۔ ارہر کی کھونٹھیاں قدموں کو ہموار نہیں ہونے دیتی تھیں لیکن وہ انہیں ٹھیلتا ہوا وہاں تک پہونچ گیا۔

فتّے! ــــــ وہ ایک دم چونک پڑا۔ آج ضرور کوئی واردات ہوئی ہے۔ یہ شخص اپنے حرکتوں سے باز نہ آئے گا۔ جھنجھلاہٹ سے اس کی نسیں تن گئیں اور مٹھیاں کس گئیں لیکن ارہر کی کھونٹھیاں اس کے جسم میں سوراخ کئے دے رہی ہوں گی۔ یہ سوچتے ہی جیسے وہ مضطرب ہوگیا۔ اس نے فتّے کے بے حس و حرکت جسم کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوگیا کہ اس بھاری بھرکم کو بوڑھے بازوؤں میں اٹھالینا آسان نہیں۔ تھوڑی دیر کھڑا، وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے کچھ اس طرح عجلت کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے کوئی بات سوجھ گئی ہو، اور وہ پاس بہتی ہوئی ندی کی طرف بھاگا۔ بدحواسی میں اس نے دو تین بار ندی سے چلّو میں پانی بھر کر فتّے تک لیجانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اور پھر کچھ اور سوچ کر اس نے اپنی کھدّر کی پگڑی کو ندی میں ڈبویا اور بغیر نچوڑے ہوئے فتّے کی طرف لپکا۔ فتّے اب تک ارہر کی کھونٹھیوں پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس نے پگڑی کو آہستہ آہستہ فتّے کے چہرے پر نچوڑنا شروع کیا اور دو تین قطرے پانی اس کے منہ میں بھی ٹپکانے کی کوشش کی۔ بے حس و حرکت میں جنبش سی پیدا ہوئی۔ ایک کرب انگیز کراہ نے حمدا کے دل میں امید کی رمق پیدا کردی۔ اس نے فتّے کو جھنجھوڑا اور اونچی آواز میں کئی بار پکارا فتّے نے بدقت تمام آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور ہلکی سی آواز میں کراہا، اور پھر بیہوش ہوگیا۔

حمدا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے لیکن پھر اس نے اپنے حواس جمع کئے اور دوبارہ بھاگتا ہوا ندی سے اپنی پگڑی بھگو لایا اور ایک بار اور پانی کے چھینٹوں سے فتّے کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

فتّے نے ہوش میں آتے ہی اپنے سامنے ایک اور دشمن کو دیکھا جو اس کی بے بسی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ فتّے نے اپنی ساری قوت کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ کاش اس وقت وہ اس بوڑھے... کھوسٹ کو مزہ چکھاتا جو اس کی معذوری کو اپنی فتح کا ذریعہ سمجھ کر اسکے سر پر آکر مسلط ہوگیا تھا۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنی مٹھیوں کو بھی اچھی طرح نہ کس سکا۔

فتّے کے جسم میں حرکت دیکھ کر حمدا کی بوڑھی سلوٹوں میں مسرت کی لہریں تیرنے لگیں اور بے قابو ہوکر وہ پکارنے لگا "فتّے! فتّے"
اور فتّے بے بس و مجبور منتظر تھا کہ حمدا اس کے ساتھ اب کیا کریگا وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے گھور رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں پچھتاوے کا الاؤ بھڑک رہا تھا۔

"فتّے!۔ ہمت کر، اٹھ بیٹھ، دیکھ یہ کھونٹھیاں تیرے بدن کو چھیدے دے رہی ہوں گی"

حمدا نے فتّے کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

اور فتّے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی کی طرح اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خود کو مجبور سا پا رہا تھا۔

حمدا نے فتّے کے ایک بازو کو اپنے شانوں پر سے گذارتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ اور پہلے ہاتھ کو اس کی کمر میں ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تاکہ فتّے کے بھاری جسم کا زیادہ سے زیادہ بوجھ اس کے جسم پر آجائے۔

"فتے ہمت کر، گاؤں یہاں سے میل بھر ہی ہے۔ میں تجھے اٹھا نہیں سکتا ورنہ گود ہی میں لے جاتا۔ پر اب تو کسی نہ کسی طرح چلنے کی کوشش کر۔"

فتے کا خون کھولنے لگا۔ اس کے زخم دکھنے لگے۔ یہ شخص میری بےلسی سے کتنا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اٹھا سکتا تو گود میں لے جاتا۔ اور پھر کیا کرتا؟۔ اور اب کیا کرے گا!

لیکن اس کے لہجے میں اس قدر نرمی کیوں ہے؟ کیا یہ وہ حمدا نہیں جو میرے مقابلے میں لٹھ لے کر آ کھڑا ہوا تھا۔ جب جوتے میں سب کچھ ہار کر میں زبردستی نتھو تیلی کا مریل بیل کھولے لئے جا رہا تھا۔ تاکہ قصائی کے ہاتھ اونے پونے بیچ کر اگلی پھڑ کا انتظام کر سکوں۔ کیا یہ وہی منحوس نہیں جس نے کہا تھا کہ فتے تو کسی کی روزی پر ہاتھ ڈال کر میرے جیتے جی عیش نہیں اڑا سکتا؟۔ کیا یہ وہی پاجی نہیں جس کو میں نے بڈھا سمجھ کر طرح دے دی تھی۔ اور آج یہ میرا کیا کرے گا؟۔ کاش مجھ میں اتنی قوت واپس آ جاتی کہ میں اس کی مکاری کا مزہ اس کو چکھا دیتا۔

اس نے اپنے اعضاء کو ایک بار پھر آزمانا چاہا۔

"فتے تو اپنے جھٹکے کو میرے اوپر ہی رہنے دے۔" حمدا نے فتے کے جسم میں کھنچاؤ سا محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تو فکر نہ کر میں بڈھا ہوں تو کیا۔ ابھی اتنی سکت مجھ میں ہے کہ تجھے گاؤں تک پہنچا دوں۔"

اور فتے کے تمام اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ آخر آج اس کے لہجے میں اس قدر نرمی کیوں ہے؟ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ چوٹوں کے درد سے اس کے اعضاء دکھ رہے تھے اور خیالات کے الجھاؤ سے اس کے ذہن میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ اپنی بوجھل آنکھوں سے فضا میں گھور رہا تھا۔ اور انجانے انجام کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ آخر اس کا حشر کیا ہونے والا ہے؟

"فتے مجھے معلوم ہوتا ہے آج تو نے پھر کوئی واردات کر ڈالی ہے۔" حمدا نے سکوت کو توڑا۔

فتے کچھ نہیں بولا وہ اندرونی تکلیف کی شدت سے مجبور تھا۔ بس وہ چاندنی کے چمکتی ہوئی روپہلی۔ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا رہا۔

لیکن فتے، تو آخر کب تک اسی طرح اپنی جوانی برباد کرے گا۔ اور فتے اس دردمندانہ لہجے پر جھنجھلا اٹھا۔ وہ اپنی جوانی کو برباد کر رہا تھا اب اس کی جوانی کا وہ حشر ہونے والا تھا جس کی خود اس کو بھی خبر نہ تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ حمدا کے شانوں پر رکھے ہوئے اپنے بازو کو اس طرح سمیٹ لے کہ وہ بوڑھی گردن اس کے درمیان چرمرا کر رہ جائے۔ لیکن آج اس کی ہڈیوں میں اور اس کے پٹھوں میں توانائی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ محض گوشت پوست کا ایک ڈھیلا ہو گیا تھا۔

"فتے۔ معلوم ہوتا ہے تو تھک گیا ہے۔" حمدا نے غم انگیز لہجے میں کہا۔ "لیکن بچے میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ میں تجھے اس سے زیادہ آرام پہنچا سکوں۔"

یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ فتے نے سوچا۔ یہ اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا ہے۔ ضرور اس میں کوئی اس کی چال ہے۔ اس نے ایک بار اور بڈھے کو شکست دینے کی کوشش کی۔ اگر وہ اپنے آپ کو حمدا کے اوپر گرا ہی دے تو وہ دب کر چپاتی ہو جائے گا۔ اس نے حمدا پر گرنے کی کوشش کی لیکن نقاہت سے صرف لڑکھڑا کر رہ گیا۔

"فتے تیرے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔" حمدا نے پھر ہمدردی کا اظہار کیا۔ "مگر ذرا اور ہمت سے کام لے۔ اب ہم گاؤں کے پاس ہی آ گئے ہیں۔"

اور فتے کے ذہن میں مسلسل گتھیاں پڑتی چلی جا رہی تھیں اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے زخم دکھ رہے تھے۔ اس کی... آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

"فتے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ تجھ میں کتنی قوت ہے۔ کتنی ہمت ہے، اور کتنا نڈر ہے تو۔ لیکن ان سب کا کیا فائدہ۔ آج گاؤں میں کوئی بھی تیرا نام پیار، محبت سے نہیں لیتا۔ تو نے اپنی ذات سے کسی کو فائدہ پہنچانے کی کوشش نہیں کی، الٹا سب کو دکھ پہنچایا ہے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں تیرا نام سن کر آنسو آ جاتے ہیں۔ جیسے اگر ان سے بن پڑتا تو وہ تیرے ساتھ کیا کچھ نہ کر ڈالتے۔"

فتے اس کمزوری اور لاچاری کے باوجود غصے سے بپھر اٹھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔

"حمدا، تو...... آخر...... چاہتا کیا ہے....؟"

حمدا نے فتے کو پر امید نگاہوں سے دیکھا۔

"میں کیا چاہتا ہوں۔ انسان ہونے کے ناطے میں تیرا بھلا ہی چاہتا ہوں۔"

"تو میرا...... بھلا... چاہتا ہے؟" فتے نے اپنی اکھڑی ہوئی آواز میں غضب کی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "جس نے... میرے مقابلے... میں لٹھ... اٹھایا تھا؟"

"فتے مدد مظلوم کی کی جاتی ہے، ظالم کی نہیں؟"

"تو کیا......... اب میں... مظلوم ہوں؟"

"نہیں ظالم تو، تو اب بھی ہے لیکن اسی حالت میں تجھے دیکھ کر مجھے ترس آگیا۔"

فتے، نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ پیڑوں کے جھنڈ پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سائے گہرے ہو رہے تھے، اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس صرف دونوں کے قدموں کی آواز ابھر رہی تھی۔ اور اس آواز کے زیر و بم میں فتے کے ساتھی گاؤں کے کسی کونے میں چھپے ہوئے اس کا منہ چڑا رہے تھے، جو اس کے ساتھ جان دینے آتے تھے لیکن اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے اور اسے گیدڑوں اور بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ فتے اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔

"فتے تو خود سوچ، کیا بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ جو تجھے ڈنک دے اور تو اسے پیار کرے۔ سانپ تجھے ڈس لے اور تو اسے دودھ پلائے"

فتے نے پہلی چاندنی میں اپنے بے ہنگم سائے کو دیکھنے لگا

اس کے سائے کا سر نفی میں ہل گیا۔ شاید حمدا کے سوال پر!

"بس یہی حال تیرا ہے تو دوسروں کو ڈنک مار رہا ہے۔ دوسروں کو ڈس رہا ہے پھر وہ تجھے کیوں خوش رہنے دیں گے۔ فتے مجھ بزرگ کی بات یاد رکھ دوسروں کو دکھ دیتے بغیر سکھ نہیں لیتا۔"

اور فتے پر جیسے کوئی ایسا راز کھل گیا جس سے واقف نہ ہونے اور شاہ میر احمد کا دشمن بن گیا تھا۔ اور ہر وقت حسد کی بھٹی میں سلگتا رہتا تھا۔

وہ اب گاؤں کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ چاندنی میں چھپروں کے بیچ سے اٹھتا ہوا نیلا نیلا دھواں بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ کبھی ویلروں کی سیلی سیلی بو، دماغ کو ایک طرح کے انس کا احساس دلا رہی تھی۔ اور پیڑوں اور چھپروں کے نیچے بیٹھے ہوئے ناریل کا حقہ پیتے ہوئے کسان اور چاندنی میں کبڈی کھیلتے ہوئے بچے بڑا معصوم منظر پیش کر رہے تھے۔ آج جیسے وہ نئی اور پر خلوص دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ جہاں چاندنی آج پہلی بار کسی نامعلوم سمت سے رحمتوں کی بارش کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

"حمدا چاچے......" اس نے پھر بولنے کی کوشش کی

"تو مجھے اپنے ہی گھر لیتے چل۔ میں تیرے چھپر کے نیچے ہی پڑا رہوں گا۔ میں ان کے پاس اب واپس نہیں جاؤں گا۔"

اس نے دور کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور حمدا تعجب اور مسرت سے بھونچکا سا ہو گیا۔

اور جب فتے، حمدا کے ساتھ، اپنے ساتھیوں کے درمیان سے گذرنے لگا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے،

(بشکریہ "نئی نسلیں")

اعتذار

"مشیر" کے ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں جناب ظفر حسین صاحب (ڈھاکہ) کی نظم "اسلام پسند شاعر سے" کے ساتویں کے آخری مصرع میں کتابت کی ایک غلطی ہو گئی ہے۔ قارئین اس شعر کی تصحیح فرمالیں:

غلط: ۔ ہے جو اسلام کی رگ رگ میں جنونِ تعمیر، یہ جنونِ پارۂ آزار ہے۔ آزار نہیں! — صحیح: یہ جنون چارۂ آزار ہے، آزار نہیں!

۱۱،۱،۰،

فروغ احمد •

"پیرِ تسمہ پا"

ایک سیاسی کردار کے لئے ایک کلاسیکی علامت (SYMBOL)

(۱)

ٹھہر جا مسافر، کہاں جا رہا ہے!
اِدھر بھیڑیا ہے، اُدھر شیر بیٹھا ہوا ہے
وہ ٹیلوں کے پیچھے
لٹیرے بھی اکثر یہاں گھات میں بیٹھتے ہیں
اِدھر قافلے کتنے لوٹے گئے ہیں
میں سب جانتا ہوں
کہ میں نے ان آنکھوں سے کیا کیا نہ دیکھا
میں اس راہ کے اونچے نیچے سے واقف
مری عمر گذری اسی دشت و در کی سیاحت میں آخر
ہواؤں کی لہروں کو پہچانتا ہوں
میں ہر جنبشِ برگ کو جانتا ہوں
خضر تو نہیں ہوں مگر رہنما ہوں

(۲)

تجھے اس پہاڑوں کے دامن میں،
سرسبز و شاداب وادی میں پہنچاؤں گا میں
اُدھر کیا تلاشِ خضر کر رہا ہے
یہ کیوں قیمتی وقت کو کھو رہا ہے
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ہے
اِدھر سے کئی کارواں چل چکے ہیں۔
بڑے لاؤ لشکر، سواروں کے دستے
نہیں خوف کیا ہو، کہ وہ لاؤ لشکر ہی ٹھہرے
؛ قافلے بھٹکتے ہوئے راہواروں پہ گذرے ہیں اکثر
مگر آہ! آشفتہ حالوں کا کیا ہو!

(۳)

اِدھر بھیڑیا ہے، اُدھر شیر بیٹھا ہوا ہے
یہاں قافلے کتنے لوٹے گئے ہیں
بڑا ہی خطرناک ہے یہ بیاباں
یہاں خضر و الیاس بے دست و پا ہیں
میں اس راہ کے اونچے نیچے سے واقف
مری عمر گذری اسی دشت و در کی سیاحت میں آخر
خضر تو نہیں ہوں، خضر کا بھی میں رہنما ہوں!
مرے پاس گھوڑے نہیں ہیں
مرے پاس وہ لاؤ لشکر نہیں ہیں۔
مگر میں تری رہنمائی کروں گا
تجھے اس پہاڑی کے دامن میں
سرسبز و شاداب وادی میں پہنچا کے دم لوں گا۔
دریا کا ساحل بہت دلکشا ہے
بہت دلستاں آبشاروں کا نغمہ
وہاں سیب و انگور شیریں ملیں گے
وہاں ٹھنڈے چشموں کا پانی ملے گا
وہاں اہلِ وادی کی مہماں نوازی کو بھی دیکھ لینا
فضا ساری آزاد ہوگی۔
زمیں اپنی اور آسماں اپنا ہوگا
خداوند برتر کی قدرت کا نقشہ
نظر آئے گا چار سو

نور کے خط سے ہر برگ گل پر وہاں اسم اعظم لکھا ہوگا
طائر لائیں گے وحدت کے نغمے مسلسل
یہ نقشہ ہے اس سرزمیں کا، تری منتظر سرزمیں کا

(۴)

سر راہ درماندہ بیٹھا ہوا ہوں
مگر میں بیابان دیدہ ہوں، مرد کہن سال کا دل جواں ہے
تجھے اس جزیرے تلک لے چلوں گا
نہ میں بار خاطر، نہ بار گراں ہوں
تجھے راستہ میں دکھاتا چلوں گا
خم و پیچ سے میں گذاروں گا تجھ کو
بڑا ہی خطرناک ہے یہ بیاباں
یہاں خضر دالیاس بے دست و پا ہیں
ابھی شیر کوئی ڈکارا ہے شاید
اُدھر جھاڑیاں ہل رہی ہیں
چلو خیر گذری
ہرن کے تعاقب میں اک بھیڑیا اس طرف،
جست کرتا ہوا برق کی طرح لپکا
ادھر چل ۔
یہ کانٹے تو ہیں، پر اسی سمت تجھے چل کے جانا ہے کچھ دور
پھر کوس دو کوس طے کر کے ایک راستہ پا سکیں گے
بہت سیدھا، آسان اور مختصر سا۔
پیاسا ہوں میں بھی
جزیرہ ہمارے لئے منزل آخریں
وہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ ملے گا
ٹھہر جا!
نہ ٹیلوں کے پیچھے ہے غول بیاباں کہ سرکش بگولا
مجھے وہم سا یہ ہوا تھا کہ غول بیاباں ہی ہوگا
چلو خیر گذری!
بگولوں سے لڑتے ہوئے ہم چلیں گے

کہ ہم کوئی برگ خزاں تو نہیں ہیں!

(۵)

ترے پاؤں کانٹوں سے زخمی ہیں بیشک
میں بار گراں تو نہیں ہوں!
ترا حلق بھی خشک ہوگا۔
پیاسا ہوں میں بھی
ضعیف و نزار و کہن سال ہوں میں
مگر بیچ جنگل میں تجھ کو میں کس طرح سے چھوڑ دوں
مجھ سے یہ کیسے ہوگا!
میں بار گراں تو نہیں ہوں
اب سامنے آ رہی ہے
کسی طرح کچھ دور چلنا ہے آخر

(۶)

یہ دریا ہے پایاب، کیوں ڈر رہا ہے!
چلا چل چلا چل! کنارہ نظر آ رہا ہے
ارے آہ!! پانی یہاں کچھ زیادہ تھا۔ رُکنا!
چلو خیر گذری، ابھی سر سے اونچا تو پانی نہیں ہے!
ٹھہر جا، ذرا سر پہ میں بیٹھ جاؤں
میں دامن تو اپنا بچا لوں
میں بار گراں تو نہیں ہوں
قدم تیرا ہاں ڈگمگانے نہ پائے
مبارک! مبارک!! مبارک ہو ساحل!!!

(۷)

مجھے دیکھ، میں نے ہی رستہ بتایا
تجھے سیدھے رستے پہ میں نے چلایا
بتا تو ذرا اس جزیرے میں تجھ کو بھلا کون لایا؟
میں بار گراں بن گیا ہوں
ارے یہ نئی سرزمیں ہے
مگر میں تو واقف ہوں اس سرزمیں سے

تجھے اس میں رہنا ہے، بسنا ہے بیشک
تدبّر مرا، تجربے میرے آخر کہاں سے تیسر تجھے آسکیں گے؟
میں بارِ گراں بن گیا ہوں!
ذرا حلق کو تر تو کرلوں
ذرا رس تو پی لوں، ذرا پھل تو کھالوں!
ٹھہر جا! ابھی تو ہم آئے ہیں، کچھ دم تو لے لیں
مجھے پیر دانا کا ایک قول یاد آ رہا ہے
اسی قول کا تو سراپا ہے مصداق:
وہ قول یہ ہے۔
تری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہی کوتاہ
ترا گنہ نخیل بلند کا ہے گناہ

(۸)

ترا ہاتھ اس بار در شاخ تک ہاں پہنچ تو سکے گا۔

مگر میرے احساں کا حق ہے مقدم!!!
ارے آہ یہ کیا؟ سنبھالو سنبھالو!!
یہ انگور ہیں! آہ زہر ہلاہل ہیں
اف ہائے اف ہائے! سینے میں دوزخ سلگتی ہے
دوڑو! مجھے ٹھنڈے چشمے کا پانی پلاؤ!
گرا میں، گرا میں! سنبھالو، سنبھالو
بچاؤ بچاؤ! ارے ہائے اف ہائے
اف ہائے! اف ہائے!! اف ہائے!!!......

۵۵

حلقہ ادب اسلامی ڈھاکہ کے اجتماع منعقدہ ۹ جنوری میں پڑھی گئی۔ آخری سات مصرعے اگست ۱۹۵۵ء میں بڑھائے گئے۔ (ف)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری نومبر ۵۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظرِ کرم: مینیجر، مشیر کراچی

۳۴۴۹ خاں محمد ذوالفقار علی ملتان ۲۴۱۷ حافظ حکیم علی محمد فاروقی بہاولپور ۲۴۳۰ سیمیہ تسنیم صاحبہ اوکاڑہ ۲۴۴۷ ثریا شمشاد صاحبہ کراچی
۲۱۰۴ میں بشیر احمد صاحب قمر قصور ۲۴۱۸ چوہدری نظام الدین ۔ لائلپور ۲۴۳۱ خلیل شمسی صاحب کراچی ۲۲۴۸ چوہدری نذیر عالم صاحب لاہور
۲۱۵۵ محمد شفیع صاحب ۔ راولپنڈی ۲۴۲۰ وسیم الحق صاحب کراچی ۲۴۳۴ سراج احمد خاں صاحب کراچی ۲۴۴۹ میاں احسان الحق کلیان پور
۲۲۴۳ امام رحمانی صاحب ۔ پشاور ۲۴۲۱ سکندر حیات صاحب پشاور ۲۴۳۵ ناظم صاحب ۔ فیروز آباد ۲۴۵۰ شبلی مرتضیٰ صاحب ڈھاکہ
۲۴۰۸ محمد حبیب الرحمان بہلوال ۲۴۲۴ نیاز محمد صاحب شوق لاہور ۲۴۳۶ محبوب عالم ۔ حیدرآباد سندھ ۲۴۵۳ ایس ۔ ایم اشتیاق صاحب
۲۴۱۱ امن اللہ خاں ۔ تاڑک آباد ۲۴۲۵ مسز محمد سعید صاحب کراچی ۲۴۲۷ شمیم احمد صاحب ملک لاہور ۲۴۹۲ ایم اختر امام میمن سنگھ
۲۴۱۲ منیر احمد صاحب ۔ ڈھاکہ ۲۴۲۶ سردار احمد خاں ۔ شاہ پور چاکر ۲۴۴۲ محمد اسمٰعیل صاحب میانوالی ۲۴۱۶ عطا محمد صاحب لکی مروت
۲۴۱۳ محمد عمر صاحب سیٹھ مدراس ۲۴۲۷ چوہدری اصغر علی صاحب کنری ۲۴۴۳ جی ۔ ایم افغانی صاحب راجن پور ۲۴۲۹ غلام اسماعیل صاحب جہدکی
۲۴۱۵ پیر غلام صاحب ۔ بنوں ۲۴۲۸ شیخ الطاف حسین حیدرآباد سندھ ۲۴۴۴ میاں عبدالعزیز ۔ ملتان ۲۴۴۹ محمد حمید صاحب قریشی کراچی

الطاف فاطمہ

"مکتبِ انصاریہ"

جب آٹا گھٹتے گھٹتے تین سیر اور تین سیر سے ڈھائی سیر کے بھاؤ پر آ کر ٹھہر گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے شرافت اور سفید پوشی کے بھرم کی عمارت کی بنیادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ سچ ہے کہ پوری عمارت ایک دم سے نہیں بیٹھ گئی۔ کاش یونہی ہوتا کہ پوری کی پوری اک دم ڈھے جاتی۔ تو ایک بار ہی رو کر صبر آ جاتا مگر یہاں تو ہر روز ایک آدھ اینٹ کبھی اوپر سے، کبھی نیچے سے، کبھی درمیان سے چپ چاپ کھسک جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان گنت روزن اور بے شمار دراڑیں نمودار ہونے لگیں۔ مگر کھنڈر قائم تھا جوں کا توں۔ گرتے ہوئے مصالحہ اور جھڑتی ہوئی مٹی سے لاکھ مرمت کرنا چاہی۔ مگر گرتے مکان کبھی یوں بھی رکے گئے ہیں۔ مارکین کے سفید پاجامے گھٹنوں پر سے مسکنے لگے۔ آٹھ دس لٹے گز کی قمیصوں کے کف اور کالر جواب دینے لگے۔ سیاہ الپکے کی شیروانی کا رنگ ملگجا ہونے لگا۔ اس کی رنگت ہلکی ہوتی اور پھر بھوسلی ہوتی۔ ساتھ ہی ایک اور مسئلہ سامنے آنے لگا۔ اس کی سیاہی میں غربت کے وہ گناہ جو انسان کو شریف لوگوں کی صحبت میں اور محفلوں کے قابل نہیں رکھتے چھپے رہتے تھے۔ یہ نہ صرف پھٹے ہوئے کالروں اور مسکی ہوئی قمیصوں کی پردہ داری کرتی تھی بلکہ اس کی سیاہی میں زندگی کا سنہرا اور روشن عہد بھی چھپا ہوا تھا۔ اندھیرے اجالے جا بجا اس شیروانی کی اندرونی جیبوں یا غنی کے ہاتھ کی سی ہوئی سیونوں سے اور عہد رفتہ کے مزے لینا شروع کر دیتے۔

علی گڑھ کی زندگی کے وہ رفتہ و گزشتہ دن اسی سیاہ شیروانی ہی میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہ کالر پر لگا ہوا ننھا سا گول مونوگرام کھجور کا درخت جس کا سنہرا پن بھی ماضی کے ساتھ چھپتا جا رہا تھا۔ یہی تو ان دنوں سے تھے جن کی یاد آج بھی سر اونچا رکھتی ہے اور زمین پر پیر بھی کچھ یونہی ہیں اور پھر یہ سیاہ شیروانی۔ محبت، اخوت اور مساوات کا سرچشمہ تن پر چھوکے ہمیں امین آباد میں۔ نرالی گلاوٹی میں۔ مشاعروں میں مدرسے علیگیہ پر نظر پڑتی اور "دلی را دلی می شناسد" والا معاملہ شروع ہو جاتا۔ بس پھر چاہے دونوں کے زمانہ طالب علمی میں سنوں کا کتنا ہی بڑا فرق کیوں نہ ہو۔ فوراً یہ معلوم ہوتا کہ برسوں اور قرنوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ پھر شروع ہو جاتیں علی گڑھ کی مخصوص اصطلاحیں اور باتیں کہتے ہیں روز الست میں تمام روحیں ایک دوسرے سے متعارف ہوئی تھیں اور وہی مانوسیت اور جان پہچان ہے جو ایک انسان کو دوسرے سے قریب لاتی ہے اوروں کا تو نہیں معلوم لیکن یہ ضرور ہے کہ علیگ روحیں ضرور روز الست کو خصوصیت سے متعارف کرائی گئی تھیں۔ پھر یہی نہیں۔ یہ سیاہ شیروانی اس تمام چونچالی اور زندہ دلی کو بھی زبردستی زندہ رکھتی تھی جو علی گڑھ کی مخصوص روایات میں سے ہے۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر ہر وقت دل دھک دھک کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کھلنڈرے کا لقب بھی رخصت ہو جائے گا اور پھر وہ تمام آرائش۔ وہ تمام نظریے بھی خاک بسر نظر آتے جو علی گڑھ کے طالب علم کا جہیز ہوتے تھے۔

مگر اب تو شیروانی کی فکر کو بھی مسئلے کے حوالے کر دیا گیا تھا اب تو یہ فکر لاحق تھی کہ کونسا خرچ بند کیا جائے جو پیٹ بھر جائے یہ ایک دفعہ کی بات نہیں بلکہ ہر ماہ تنخواہ کے ۴۵ روپے سوا سات لئے ہاتھ میں آتے ہی یہ سوال انصاری صاحب کے دماغ میں رینگنے لگتا۔ پھر انہوں نے اکیلے ہی اس مسئلہ کا حل دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر آتے ہی اپنی بیوی کو بھی اس مسئلہ میں شریک کرتے جس کو وہ چند سال ہوئے بیاہ کر لائے تھے جس کی عمر شادی کے وقت تیرہ سال چھ ماہ کی تھی۔ اور جو بیاہ کر آئی تھی تو خاصی دیہاتن اور بد قطع سی تھی۔ مگر اپنے علیگ شوہر اور شہر والوں کی صحبت میں بڑی تیکھی اور وضعدار سی نکل آئی تھی اور جو رفتہ رفتہ جمالیاتی ترکیبوں پر رنگ برنگی ریشم سے سوزن، نیم اور طرح طرح کے اشعار کاڑھتے ہوئے مارکین کے غلاف چڑھانے لگی تھی اور میلاد شریف اور اسی طرح کی دوسری تقریبوں میں گیت ولی مال سنا کر اتنا [illegible]

نہیں نظر آتی تھی۔ تیرہ سال چھ ماہ کی اس ضدی چھوکری کو اپنی راہ پر لگا کر انصاری صاحب کو یہ زعم ہو گیا تھا کہ زندگی کی ہر الجھن اور کٹھنائی کو وہ اپنی مرضی کے مطابق سلجھا لیا کریں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ جنگ کے زمانہ کی اس مہنگائی میں اپنی ۵۴ روپے سوا سات آنے کی تنخواہ کو اس بات پر مجبور کرنے پر بضد تھے کہ وہ ان کی سفید پوشی کو قائم رکھے۔ لیکن ہر تیسرے مہینے اور پھر بارہ ماہ بعد بدلنے والے کیلنڈر نے یہ بات ان پر بخوبی واضح کر دی کہ اس گتھی کو سلجھانے میں ان کی بیوی کا سترہ سالہ دماغ خود ان کی علیگیت اور میٹرک کا سرٹیفکیٹ سب قاصر ہیں۔

نتیجتاً الجھنیں بڑھتی گئیں۔ اب نہ کھپریل کے پیچھے بنے ہوئے کمرے کی کھونٹی سے لٹکی ہوئی شیروانی کو دیکھ کر سنہرا ماضی یاد آتا۔ نہ بیوی کو بنگالی کوٹھی اور شاہجہاں منزل کے افسانے سناتے جاتے۔ نہ کچھ پلے اور میرس روڈ کی یاد ستاتی۔ نہ ہاکی اور کرکٹ کے میچ یاد آتے۔ نہ اسٹیشن کے سامنے اور ہوسٹل کی اسٹرانگو کا ذکر ہوتا۔ بس وہی مہنگائی وہی کپڑے کا رونا، تیل کا پرمٹ۔ کھپریل کے ادھر ادھر بنی ہوئی ننھی ننھی کیاریوں میں اب بھی موسمی پھول کھلتے اور کونے میں لگے ہوئے انار کے درخت میں اب بھی کلیاں آتیں۔ جن کو دیکھ کر وہ ہمیشہ امتیاز علی تاج کی انارکلی نکال کر ایک بار پھر پڑھ لیا کرتے۔ کھپریل اب بھی انگور کی بیل تلے چھپ چھپ جاتی۔ مگر ان کو تو کچھ ایسا لگتا کہ جیسے بڑے زور کی آندھی اٹھی ہو اور بجائے زور شور کے جھکڑ چلنے کے بس غبار سا تن گیا ہو۔ ہر چیز زرد، مٹیالی سی نظر آ رہی ہو اور مہین مہین خاک گلے میں اتری جا رہی ہو۔ دھوپ بھی مری مری سی ہو رہی ہو اور ہفتے مہینے دن یونہی گزرے چلے جا رہے ہوں۔

اور ایک دن ایسے ہی میں بھرتی کے دفتر سے وہ ایک فارم لے آئے سترہ سال کی بیوی بھی اب ایسی انجان نہ تھی کہ ہر کام ان ہی کی مرضی کا ہونے دیتی۔ صغیر فاطمہ کو خوب معلوم تھا کہ یہ بھرتی کا فارم ہے۔ اس نے منت کی، سماجت کی، منہ پھلا لیا۔ دو دن تک دن اور رات میں کئی مرتبہ سیدھی سیدھی لیٹ کر دانت بھینچ کر کھیں کھیں کر کے آوازیں بھی نکالیں۔ مگر وہ مجبور تھے۔ بھوسلی شیروانی کے نیچے قمیص تار تار تھی پاجامے میں جگہ جگہ پیوند تھے۔ جوتے کا تلا گھس چکا تھا پھر وہ کبھی کھردری دری اور بغیر غلاف کے تکیہ پر نہیں لیٹے تھے۔ فارم پر ہو ہی گیا۔ وہ الٹی سیدھی تسلیاں دیتے رہے۔ کوئی سب کو لیکر میدان میں تھوڑی کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور اس طرف ہمارے لئے بھی تو فوج درکار ہوئی۔ اور بد بخت آج کل تھا لوپھینکو تو کسی لفٹنٹ یا کیپٹن ہی کے سر پر گرے گی۔ ہمیں بھی تو ارمان پورا ہو لینے دو۔ آج مدتوں بعد یو۔ ٹی۔ سی کی یاد آگئی اور رانوں تلے رائڈنگ اسکول کے گھوڑے پھڑکنے لگے۔

بچاری سیدھی سادی بیوی شوہر کے چہرے پر حسرتوں، ارمانوں اور امیدوں کی ملی جلی روشن اور تاریک لہروں کی تاب نہ لا کر چپ سی ہو گئی اور محلے میں ایک ایک سے بڑے شہیدانہ انداز میں انصاری صاحب کے فوج میں جانے کی خبر پہنچانے لگی دوسرے ہی دن ان کے در دالانے پر متعدد حضرات موجود تھے۔

"ارے میاں خیر تم تو اپنی جان سے بیزار ہو مگر اس بچاری نے کیا قصور کیا ہے؟"

کسی نے کہا "تو پھر ایک سنکھیے کی پڑیا اس کے لئے منگا کر دیتے جاؤ۔ اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا"۔

"تمہارا نہ کوئی باپ بیٹھا ہے نہ بھائی۔ ایک بیوہ پھوپھی ہیں جن کو خود ہی آٹھ روپے کا منی آرڈر نہ کرو تو ان کا چولہا بھی نہ جلے۔ یہ سات بہنوں اور ڈیڑھ بھائی کی بہن بڈھے باپ پر ایک آنے والی جان میت جا پڑے گی"

پھر وہی اپنی دلیل کہ سب کو نہیں بھیجا جاتے گا اور پھر میرا کام تو دفتری ہے اس کے جواب میں اسی وقت ڈکشنری کھولی گئی اور دفتری کے معنی با وضاحت نکالے گئے۔ منجملہ دوسرے معانی کے یہ لفظ پیا دے کے بھی معنی دیتا ہے۔ مرزا صاحب نے فہمیدانہ کہا:

غرض شام کی چائے بنانے کے لئے صغیر فاطمہ انگیٹھی میں اسی فارم کے پرزے لگا رہی تھی اور نیچی نگاہوں سے مسکرا رہی تھی۔ وہ جلے بیٹھے تھے "بس جیت لی یہ بازی تم نے، ہاں بھئی کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں چلو تم بیوہ ہونے سے بچ گئیں۔ مگر میرے اوپر کیا احسان؟ مگر خیر تمہارا کیا قصور۔ مجھے تو شروع ہی سے جملہ اسباب ویرانی عطا ہوا ہے۔ میٹرک پاس کیا تو والد صاحب کی صحت نے جواب دیدیا چار برس تک ان کی بیماری کا ساتھ دیا۔ وہ نہ رہے تو اماں نے بیٹا گھر بسایا یعنی تم چھن چھن کرتی پازیب بجاتی آنگن کا گھر بسانے بیٹھ گئیں۔ پھر اماں تو چل دیں اور ہم تمہارے

اور اپنی موٹی بھدی آواز میں ملا کر سُر سے گاتے چلے جاتے ؎

اپنے بچوں کو پڑھا کر اردو انگریزی حساب
کیجئے اسکول میں داخل بآسانی جناب

اور انصاری صاحب اندر بیٹھے بیٹھے سوچا کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اس سے نفع کماؤں گا۔ بس پھر نئے گاؤں میں زمین کرایہ پر لوں گا ایک چھپر کافی ہوگا۔ ارے میاں مولانا محمد علی نے تو ایک درخت کے نیچے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی اور ان کے چہرہ پر بڑی ذمہ دارانہ اور انتظامی کیفیت طاری ہو جاتی:

"بہرحال میں اپنے اسکول کو علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کا سمویا ہوا نمونہ بنا دوں گا۔ دستکاری آج کل بڑی اہمیت رکھتی ہے کپڑا بننا اور لکڑی کا کام کیسا رہے گا۔ اُدھوں یہ مشینی دور ہے" خیر بہرحال وہ مشینوں کی قیمتوں اور پھر ان کے کھٹ راگ سے جلد ہو کھلا جاتے اور فوراً یونیفارم کا خیال ذہن میں آتا اور وہ جذباتی بن جاتے۔ یونیفارم تو بس سیاہ شیروانی کے علاوہ کوئی ہو گی ہی نہیں اپنے علی گڑھ کی یادگار۔ اور پھر اس کے علاوہ وہ سیاہ شیروانی کے فوائد پر غور کرنے لگتے۔ بعض وقت تو یوں معلوم ہوتا کہ سر سیّد اور محمد علی ایک ساتھ سر پہ بیک وقت آنے لگے ہیں۔ اور بیچ میں علامہ اقبال اور کھٹو کے جاتے وہ ان علامہ اقبال سے اچھا خاصا جلنے لگے تھے لے کے آدمی کا دماغ خراب کر دیتے ہیں! اچھے بھلے مزے میں لوگ بیٹھے ہیں اور انھوں نے لے کر مومن غیر مطمئن کر دیا مگر وہ بھی بس بابا ان ہی پرانی کتابوں کو پڑھتے اور اپنا دماغ خراب کرتے۔ بیچارے مجبور تھے جو کتابیں وہ خرید سکتے تھے ان کے نام ہی دیکھ کر وہ جل جاتے "خونی محبوبہ" "ناہنجار عاشق" "عیار جاسوس" وہ یہ کتابیں ہرگز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مجبوراً انہی دشمن جاں چیزوں کو.. گھونٹنا پڑتا تھا!

اب وہ روز چار بجے باہر چھپر کا ذکر تے۔ ٹین کی کرسیاں اور میز ڈال کر قلم دوات اور رجسٹر لے بیٹھتے۔ تاکہ مکتب انصاریہ کے ہونہار طالب علموں کے والدین کا استقبال کریں۔ اور بچوں کے ناموں کا اندراج کریں۔ لیکن والدین کو نجانے کون سے ضروری کام لاحق رہتے کہ رجسٹر یونہی کورا پڑا رہا البتہ دو ٹیوشن چھ ماہ کے عرصہ میں اس کی بدولت ضرور مل گئیں۔ تین اور پانچ بیلیک، ایک ٹیوشن کرنے وہ چوک جاتے اور ہاشم کی ٹیوشن کے لئے انہیں مولوی گنج جانا پڑتا۔ ہاشم کی اماں پانچ روپے دیتی تھیں۔ اس قدر دبنگ اور سخت گیر تھیں اور ان کی ہر ناغہ کو یاد رکھتی تھیں اور جس طرح دودھ والے کی ناغہ کے پیسے کاٹ لیتی تھیں اسی طرح ماسٹر صاحب کی ناغہ کے پیسہ کاٹ کر بڑا فخر محسوس کرتی تھیں۔

جاڑے سے گرمی اور گرمی سے برسات آئی۔ ساون کی جھڑیوں نے پرنالے کی مٹی بہا کر بورڈ پر آنسوؤں کی سی لکیریں ڈال دیں اور پھر جاڑا آیا پھر جیٹھ بیساکھ کی گرمی نے حروف کے رنگ جھڑانا شروع کر دیئے گرمیاں اور برساتیں آتی جاتی رہیں۔ ننھا چار سال کا ہو گیا۔ اس کی ایک بہن اور بھائی اس کا دل بہلانے کو اور آ گئے تھے۔ مگر انصاری صاحب کی نظروں میں اس طرح بکھیم سے اٹھتی ہوئی آندھی کا غبار تنا رہا۔ چودھویں کی چاندنی کرنیں اور کہکشاں کی چمک سب مٹیالی مٹیالی اور مدھم مدھم نظر آتی رہی۔!

اور پھر ایک شام جب وہ گھر میں داخل ہو رہے تھے تو ان کی نظر بورڈ پر پڑی۔ اڑے ہوئے رنگ کے حروف والا آنسو بہاتا ہوا بورڈ نیچے گرا ہوا تھا انہوں نے آہستہ سے بورڈ اٹھا لیا اور گھر میں آ گئے!

باہر گلی میں چھمن داس بنواڑی لڑکوں کو ہنک رہا تھا جگیا للل کی ماں شفوراً کی اماں سے چھائیں چھائیں لڑ رہی تھی۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ مکتب انصاریہ کا بورڈ غائب ہے!

صغیر فاطمہ بیٹھے مونڈھے میں بیٹھی بچی کو تھپک رہی تھی۔ وہ دونوں بچے مٹی میں تھوڑے اور بلا کھیل رہے تھے۔ انصاری صاحب کھرے پلنگ پہ لیٹے تھے۔ ان کی دونوں کہنیاں ان کے سر کے نیچے تھیں اور وہ صغیر فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے "اچھی صغیر فاطمہ، ہمارا سہاگ قائم رہ گیا۔ تمہاری کلائیوں میں چوڑیاں کھنکتی رہیں اور انصاری تو مر بھی گیا۔ یہ لطیفہ بھی خوب ہی رہا کہ ہم مر گئے اور تم سہاگن رہیں"

اور بس اس دن سے سلسلے وار زور ہو گئے، اب تو مرنے میں خالی دری پھیلائی چکٹ تکیہ لگایا سو گئے۔ سارا دھند غبار صاف ہو گیا خاصا روشن روشن دن نظر آنے لگا۔ مزے سے مجن صاحب اور چھوٹے میاں کی بیٹھکوں میں حقہ گڑگڑانے لگے۔ بلکہ مجن صاحب کے حقہ کے نیچے میں نکو لگتے پر یہ شعر بھی لکھ کر لگا دیا ؎

حقہ حاضر ہے پیجئے صاحب
دست نازک سے لیجئے صاحب

اور پھر جب ایک دن مرزا نے پکار کر کہا۔
"اماں ماسٹر صاحب ہوت پاکستان بن گیا۔ کیا ارادے ہیں؟"
تو انھوں نے گھر ہی میں پڑے پڑے جواب دیا۔
اماں بننے دو پاکستان ہندوستان ہم تو خدا کے یہاں سے آئے ہیں
خدا کے یہاں جائیں گے۔ اس گلی میں پیدا ہوئے اسی میں مر جائیں گے؟
اور پھر دل میں ہنسے کہ زندہ کون مردود ہے۔ یہ تو مغل صیغۂ قلم
کا سہاگ ہے!

(بشکریہ "ساقی")

احمد ندیم قاسمی

○

قرارِ جاں بھی تمہی، اضطرابِ جاں بھی تمہی
مرا یقیں بھی تمہی ہو، مرا گماں بھی تمہی

تمہاری جان ہے نکہت، تمہارا جسم بہار
مری غزل بھی تمہی، مری داستاں بھی تمہی

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رُکے ہوئے بھی تمہی ہو، رواں دواں بھی تمہی

خُدا کا شکر، مرا راستہ معیّن ہے!
کہ کارواں بھی تمہی، میرِ کارواں بھی تمہی

تمہی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا
کہ میرا غم بھی تمہی، غم کے رازداں بھی تمہی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
افق پہ منزلِ ادراک کا نشاں بھی تمہی

تمام حُسنِ عمل ہو، تمام حُسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تمہی ہو، مری زباں بھی تمہی

("ادبِ لطیف")

باقر رضوی

اِنسان بدل گیا

آنکھیں کھلیں نظامِ دل وجاں بدل گیا
دیکھا تمہیں حیات کا عنواں بدل گیا

کیوں ارتباطِ دست و گریباں بدل گیا
شاید مزاجِ وحشتِ انساں بدل گیا

اب پھر نئے سرے سے پڑھو درسِ زندگی
دانش وروں نصابِ دبستاں بدل گیا!

دیکھا عروسِ دہر نے اس دلکشی کے ساتھ
دُنیا کو ترک کرنے کا ارماں بدل گیا!

انساں نے گردوپیش کو بدلا مگر یہ کیا
بدلے جو گردوپیش تو انساں بدل گیا

پھیلی ہے غم کدے کی سیاہی کہاں کہاں
کہتے ہیں رنگِ شمعِ شبستاں بدل گیا

آغوش وا کئے ہوئے ساحل کو دیکھ کر
موجوں کا بھی تہیّۂ طوفاں بدل گیا!

دیکھا کئے گلوں کی خزاں خار کی بہار
ہنستے رہے نظامِ گلستاں بدل گیا!!

("ساقی")

ایک مصری کتاب سے

مترجمہ: سعید اشرف زیدی

جنس اور نوجوان

ہماری نئی پود جس تیزی سے جنسی بے راہ روی کی طرف مسلسل بڑھ رہی ہے وہ آج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس سے صرف نظر کیا جا سکے۔ اقبال مرحوم نے کسی وقت اپنے ہم عصر ادیبوں کے اعصاب پر عورت کو سوار دیکھا تھا لیکن آج یہ حال ہے کہ اس چمن میں جو غنچہ بھی سر اٹھاتا ہے، "جنسی بھوت" کے ہاتھ اس کی طرف بڑھتے گئے ہیں۔ خوش قسمت اور بدبخت جوان ہی اس کی زد سے بچتے ہیں اور پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی سپر اندازی کے بعد دل و دماغ اور جسم و روح "مجبور" و "معذور" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جنسی ہی نہیں نفسانی بیماریاں، ذہنی الجھنیں اور جسمانی تکالیف ہمارے سامنے ہیں قطع نظر ان عظیم اعداد و شمار کے جو ریکارڈ میں نہیں آتے ———— دریا کسی ایک گھر کی صفائی سے جنس نہیں جن آبادیوں کی طہارت سے ہم نہیں، جو کبھی اس سیلاب کو کوئی مضبوط بند ہی روک سکتا ہے اور وہ صرف بلکہ سوتی ہوئی روحوں کو جگایا جائے، زندہ باتوں کو علم بنایا جائے اور بند کانوں کو کھولا جائے۔ غنیمت ہے کہ ہم پالیس کا شور سن کر ہی اٹھ بیٹھیں۔ مصر میں یہ طوفان پوری طرح امنڈ آیا ہے اور وہاں کے دردمند ذہن سوئی ہوئی قوم کو جگانے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں اس سیلاب کی روک تھام کے لئے مستقل محاذ بنانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور کچھ کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ زیر نظر ترجمہ ایک مصری کتاب سے ماخوذ ہے۔

(ادارہ)

جب انسان سگریٹ پی کر اپنے بدن کو مسموم کر لیتا ہے، اور اپنے ماب یا شراب کے ذریعہ ہیجان برپا کئے رہتا ہے۔ نیز اعلیٰ افکار و حوصلہ پیدا کرنے والی کتابوں کو نظر انداز کر کے بلکہ انہیں ٹھکرا کر شہوت خیز ں میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے اور ساتھ ہی رنگ رلیوں میں مصروف پنے جذبات کو مشتعل کرنے کے درپے رہتا ہے اور بدکردار انسانوں کی کو عزیز رکھتا ہے تو ایسا شخص درحقیقت خود اپنے سامنے اتنی مشکلات کا لیتا ہے جو اس کو کمتر ہی اپنی جنسی و حیوانی رغبتوں اور رجحانات سے طری پاکیزگی و طہارت کی زندگی بسر کرنے کی طرف مائل کر سکتے ہیں و ترور اگر وہ سچائی کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ تندرست و صحت مند ا گزارے اور اگر وہ عزم رکھتا ہے کہ جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں غ بن کر جئے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام ظاہری، و باطنی عیوب سے کنارہ کش ہو جائے اور پاک و صاف زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مروت و مردانگی دونوں صفتیں اپنے اندر محسوس کریں اور یہ بلند صفت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنی خواہشات نفس کو مغلوب کرنے کا عزم کر کے اس کے لئے پوری طرح کمربستہ ہو جائیں اور اس طرح صحیح پاکی و پاکیزگی کی زندگی گزارنا شروع کر دیں۔ اسی طرح غیر شادی شدہ (مجرد) لوگوں کا بھی یہ غلط خیال ہے کہ عمر و جن ان مصائب کو جھیل رہے ہیں اور ان سے برسرپیکار ہیں اور اگر وہ شادی کر لیں تو اس کشمکش اور ضبط نفس یا خود نفس کشی کا خاتمہ ہو جائیگا اور وہ اپنی جنسی خواہشات کو اپنی بی بی سے پورا کر سکیں گے، درحقیقت یہ زاویہ نظر خود بہت غلط ہے اور وہ ہرگز اچھے شوہر اور اچھے باپ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، کیونکہ اس طرح وہ لڑکی جس کے ...

ہوگی اگر نقص تغذیہ (متناسب غذا کی کمی) یا بکثرت ناولوں کا مطالعہ یا دن نکلنے اور سورج چڑھنے کے بعد تک پڑے سوتے رہنے کی وجہ سے کسی عصبی ضعف میں مبتلا نہیں ہے تو وہ اس ضعف میں اس وقت ضرور مبتلا ہو جائے گی جب اس کا شوہر اپنی شہوت کو روکنے اور اعتدال کے ساتھ بی بی سے ملنے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے بجائے بے اعتدالی و شہوت رانی سے کام لینا شروع کر دیگا اور یہ اپنی جگہ پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شادی شدہ افراد کی زندگی اور غیر شادی شدہ لوگوں کی زندگیوں میں کوئی بڑا تفاوت و فرق نہیں ہوتا۔ یعنی ہر لحاظ سے دونوں کی زندگیاں ضبط نفس و تعمیر شخصیت میں گزرنا چاہئیے اس لئے اگر کسی نوجوان نے شادی سے پہلے اپنی جنسی خواہشات کو روکنے کا سلیقہ نہیں سیکھا تو درحقیقت شادی جیسے مقدس و پاکیزہ تعلقات کا بار اٹھانے کا اہل بھی نہیں ہے۔

شوہر کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق پر دست درازی سے باز رہے، عورت کے آرام و راحت کا بہت زیادہ خیال رکھے تاکہ عورت اور اس کے بچے دونوں کی صحتیں بہتر اور اچھی حالت میں رہیں ملاوہ نہ صرف چند سال اسے تمام تعلقات زن و شو سے آزاد و رہا کر کے صحت و قوت اور راحت و آرام حاصل کرنے دے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک نوجوان میں ایک حقیقی مردانگی کے ایسے اعلیٰ جوہر موجود ہوں جو اسے اپنی شہوت رانی کی لذتیت سے کنارہ کش ہونے پر مسرت کے ساتھ آمادہ کر سکتے ہوں اس لئے کہ ایسا فعل محض ایک دانا و شریف انسان ہی کر سکتا ہے کہ ایک جائز حظ (تلذذ) صحبت کو بعض حالات و ظروف میں انسانی ہمدردی کے تقاضے سے اپنے اوپر حرام کر لے۔

اے جوانو! تم اپنے نفس، اپنے سرت، اپنی نیک نامی، اپنی ملکی و دینوی خوشحالی اور اپنے اعلیٰ و بلند مقاصد نیز اپنی جسمانی و اخلاقی قوت اور اپنی طہارت و اطمینان قلب الغرض ہر قسم فلاح کے طبعی تقاضوں سے تم اس پر مجبور ہو کہ تمام ناجائز جنسی تعلقات سے کنارہ کش رہ کر مثالی اور اعلیٰ زندگی کا پیکر بنو۔ اسی طرح تم اس پاکباز عورت کی وجہ سے بھی اس پاکیزگی کو اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ جسے تم اپنی شریک حیات بنانا چاہتے ہو اور یہ بس کہ ماضی کی طہارت کے تم خود معترف و قائل ہو۔

یقیناً انصاف و شرع دونوں کی رو سے یہ ایک جائز و مستحسن فعل ہے کہ تم اپنی ہونے والی شریک حیات سے طہر و عفاف کی توقع رکھو لیکن یہی حق رواج و شرع ہر اعتبار سے اسے بھی پہونچتا ہے کہ وہ تم میں بھی کردار و بلند کا مشاہدہ کرے، اور جبھی تم یہ المناک خبر سن کر اس سے انتہائی ناگواری کے ساتھ قطع تعلق کر لیتے ہو کہ اس نے اپنی عصمت کی کلی کسی دوسرے کے حوالے کر دی ہے تو پھر کوئی نوجوان کیسے یہ جرأت کر سکتا ہے کہ وہ اپنے جسم کو دوسری فاحشہ و بدکار عورتوں کے ساتھ ملوث کرنے کے لئے وقف کرے اور اپنی بیوی سے اس چیز کی توقع رکھے جس پر اس نے قابو پانے کی درخور کوشش نہ کی۔ اگر بدکاری تمہاری منگیتر یا تمہاری بہن کے لئے بُری ہے، اگر خیانت بیوی کے لئے کوئی ناپسندیدہ صفت ہے تو وہ شوہر کے لئے کس طرح معقول و غیر مذموم بن سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی دونوں اصناف کے لئے ایک ہی جیسا قانون بنایا ہے۔

اسی طرح تمہارے اوپر اپنی اولاد سے متعلق یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی پاکباز رہ کر گذاریں۔ لہٰذا جو تمہاری سیرت و شخصیت ہوگی ویسی ان کی بھی ہوگی۔ دراصل جدی و دادھیالی و ننھیالی اثرات بڑے فعال بڑے موثر اور بہت گہرے ہوتے ہیں جو کئی نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ تم پر ان بچوں سے متعلق یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کے خون میں کوئی عنصر فساد شامل نہ ہونے پائے اور نہ ان کے ناموں کو کوئی ننگ و عار داغ لگا سکے۔ تم اس کے ذمہ دار ہو کہ ان کی رگوں میں حرص و شہوت کی کوئی چنگاری بھڑکنے نہ پائے اس لئے ان کے واسطے سیرت و فضیلت کی میراث چھوڑ جاؤ۔ ساتھ ہی تم اپنی پاکیزگی و سیرت کے بقا و تحفظ کے لئے اپنے ان والدین کے سامنے بھی جوابدہ ہو جنہوں نے سالہا سال تمہاری نازبرداریاں کی ہیں اور تمہاری تربیت کی ہے۔ تم اگر کبھی بیمار ہو گئے ہو تو انہوں نے آنکھوں میں رات کاٹ دی ہے تمہارے لئے غذا و دودھ کا بندوبست کرنے کے علاوہ رو رو کر تمہاری شفایابی کے لئے دعائیں کی ہیں اور منتیں مانی ہیں۔ اس لئے اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ تم اب بدکرداریوں اور بے حیائیوں سے آشنائی کر رہے ہو تو ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور وہ اسی دل شکستگی کی حالت میں اس جہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ آخری بات مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ تم اس پاکیزگی و طہارت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جوابدہ ہو جس نے تمہیں پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور جو تمہیں اپنا

اسی زمین میں برکت (عزت و آبرو) فرمانا چاہتا ہے اور آخرت کی زندگی میں عزت و عظمت کے ساتھ رکھنا چاہتا ہے اس نے تمہیں اس لئے عقل دی تھی کہ تم حقائق کو پہچانو اور تمہیں ضمیر اس لئے عطا فرمایا تھا کہ وہ لغویات کے وقت تمہیں متنبہ کرے اور کونسے — مرتا یا تکی اور یہ حق ذات نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیگا اور اس کی رحمت ہمیشہ لاکھوں پاکیزہ و پاکباز روحوں کی محافظ رہی وہ تمہاری حفاظت کرنے کے لئے بھی کافی ہوگی —

نوجوان مرد اور عورت کے فطری تعلقات

جو نوجوان عورت کی فطرت اور مزاج و خصوصیات سے ناواقف ہے وہ اپنے تعلقات اس سے استوار نہیں کر سکتا ہے بہت سے نوجوان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ناولوں کے ذریعہ عورت کی گہرائیوں تک پہونچ چکے ہیں۔ عورت کی فطرت و طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ناول کی ہیروئن عموماً اور اکثر اوقات میں صرف ایک خیالی دنیا کی ہوتی ہے جس کو حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، خواہ وہ شریف کردار کا نمونہ یا بدعمل و رذیل عادات و خصائل کا، خواہ وہ حور صفات ہو یا چڑیل جیسی ہو۔ بہرحال علم بشریت سے واقفیت رکھنا اس کے لئے ضروری ہے کہ قلب بشری اور انسانی دلوں کی معرفت اور علم اس سے ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ سطحی ذلیل اور شہرت پرست فاحشہ ابھی اس دنیا میں موجود ہیں اور ایسی عورتیں بھی موجود ہیں جن میں کوئی اخلاقی احساس موجود نہیں ہیں یا انہیں پاکیزگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ایسی عورتیں بڑی حد تک محدود ہیں۔ بہرحال ہر نوجوان کا یہ فرض ہے کہ عورتوں کے متعلق حسن ظن رکھے اور یہ سمجھے کہ بیشتر عورتیں بڑی ہی نیک نام ہیں اور ان کی شخصیت کسی عیب سے ملوث نہیں ہوتی ہے۔ نیز یہ جان لے کہ جو عورت نیک و پاک بنکر رہنا چاہتی ہے وہ اس میں مرد سے بہت آگے بڑھ جایا کرتی ہے اور جو بدکرداری و ناپاکی کی طرف مائل ہو جاتی ہے وہ اخلاقی پستی کے ایسے عمیق گڑھے میں گرتی ہے جس کا تصور کوئی مرد نہیں کر سکتا ہے اس لئے اگر تم کسی ایسے مرد کو دیکھو جو عورت اور اس کی عزت و شرف پر یہ کہکر حملہ آور ہو کہ ہمیں اس کی نیک طینتی اور عفت مآبی سے مطمئن نہیں ہوں یا اسے باعصمت نہیں سمجھتا تو فوراً تم ایسے شخص کے پاس سے دور بھاگ کھڑے ہو، ورنہ اس کا زہر تمہیں وبائی بیماری کی طرح لگ جائیگا۔ کیونکہ ایسا شخص فاسق و شریر ہوا کرتا ہے اور اس کی فکر اس کے جسم و روح دونوں سے زیادہ گندی ہوا کرتی ہے اگر وہ کسی اور کی صداقت بازگشت نہیں ہے۔

عموماً تین قسم کے ایسے مرد ہوتے ہیں جن پر بیک وقت سخت ترین قدغن لگاکر انہیں قید کر دینا چاہئے۔ حتیٰ کہ وہ ایسے جرائم سے تائب ہو جائیں کیونکہ ایسے لوگ چور چنڈال سے بھی زیادہ معاشرہ کے لئے خطرناک ہوتے ہیں یعنی وہ شخص جو کسی نیک کا دیوالہ کرتا ہے یا وہ چور جو تمہارے گھر میں نقب لگاتا ہے وہ دونوں ارتکاب جرم کے اعتبار سے اس شخص سے کم خطرناک ہیں جو کسی شریف عورت کے ناموس و شہرت کو داغ لگاکر دنیا کے سامنے اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے، یا کسی مرد کے دل میں اس کی بی بی سے متعلق شکوک و شبہات میں ڈالتا ہے وہ اس کے ماحول کے اخلاقی و جسمانی بلاؤں و مرض یا موت سے گھیر دیتا ہے۔

بہرحال فاسق و فاجر مردوں کی قسم اول میں وہ لوگ شامل ہیں جو حرام و ناجائز شہوانی زندگی کے غلام بنکر رہ گئے ہیں اور بے حیائی کے کھلاڑی ہیں اس لئے مارے مارے پھرتے ہیں کہ اپنے سے کہیں زیادہ ذلیل آبرو باختہ عورتوں سے اپنی جنسی تسکین کا سامان بہم پہونچا سکیں عارضی طور پر تو یہ لوگ اپنی ان بداعمالیوں کے لازمی نتیجہ "مرض" سے بے نیاز ہو جاتے ہیں لیکن جس سزا سے کوئی صورت مفر نہ ہو یا جس عمل کی مکافات سے بچنے کا کوئی امکان نہ ہو، اس سے چند ایک کے سوا جو اتفاقاً یا کسی وجہ سے محفوظ رہ جائیں باقی کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے۔ دوسری قسم فاسق و بدکار افراد ہیں جو بڑے بڑے شہروں میں بستے ہیں اور کافی مال و دولت سے بہرہ مند ہیں وہ کسی ایک محبوبہ کا اس لئے انتخاب کر لیتے ہیں کہ وہ جنسی امراض کی چھوت سے محفوظ رہیں لیکن اگر وہ اس طرح چھوت سے بھی بچ گئے تو اس کے بجائے وہ رسوائی و بدنامی کے خوف سے ہر لحظہ کانپتے و لرزتے ہیں۔ ساتھ ہی اگر اس مالدار عیاش طبیعت نے اپنی محبوبہ کی تمام فرمائشوں اور تمام خواہشات کو پورا نہ کیا یا ان سے کسی دوسرے طریقہ سے پیش آیا تو پھر اس کی خیر منائیں کہ ان دونوں کے تعلقات کی خبر مالدار صاحب کے گھر میں کب پہونچتی

ہے اور ساری دنیا انہیں کوسنا شروع کر دیتی ہے بلکہ یہاں اس چیز کا بھی قوی امکان ہے کہ (چھوت سے محفوظ) یہ محبوبہ و معشوقہ اس شخص کے خاندان و گھر کی خوشی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی اس نوجوان دونوں کی زندگیوں کو مستقل بدکاریوں کا ذریعہ بنالے اس طرح جس خطرے سے بچنے کے لئے انہوں نے بدکاری کے اس نئے طریقوں کی آزمائش کی تھی وہ اس سے بھی بدتر جہنم اور ہزار در ہزار خطرات و رسوائیوں سے دوچار ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔

اب آخری یعنی تیسری قسم کے بدکاروں میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنی محبوبہ کو ایک پیسہ بھی دینے کی استطاعت نہیں رکھتے مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس محبوبہ سے التذاذ کے ذریعہ کوئی متعدی مرض بھی نہیں منتقل نہ ہو اس لئے وہ اپنی نفس کی سیری اور بہیمانہ خواہشات کی تسکین کے لئے فریب کاری اور دھوکہ بازی سے کام لیکر نو عمر اور بھولی لڑکیوں کو بہکاتے ہیں یا اغوا کرلے جاتے ہیں۔ یقیناً جو شخص اس طریقہ سے کسی نوجوان لڑکی کے شیشۂ عصمت و عفت کو چور کرتا ہے اور اس کے شرف کو چند لمحات کی حیوانی شہوت رانی کے لئے پامال کر دیتا ہے اور اس کی منزلت کو معاشرہ میں کم کرکے اسے ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار کر دیتا ہے نیز اپنے اس کردار اور اپنی اس ناپاک ذہنیت کے ذریعہ اس لڑکی کے خیالات کو بھی فاسد کرکے اسے بدترین رذالت و ننگ و بے شرمی کے گڑھے میں جینے اور آئندہ معصیتوں سے لبریز زندگی گزارنے کے لئے پھینک دیتا ہے تو ایسا شخص موت یا دائمی قید (حبس دوام) کا مستحق ہے اور اس کی یہ حرکت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص غصہ کی حالت میں اپنے ہمسائے کو قتل کردے۔

گرچہ مذکورہ تینوں قسمیں کی برائیاں ہر جوان سے صادر نہیں ہوا کرتیں اور قوم کا ایک بڑا طبقہ الحمد للہ کہ ان سے محفوظ ہے، تاہم میں اپنا ایک ایسا تجربہ و مشاہدہ یہاں لکھتا ہوں جس میں بڑے بڑے پاکیزہ اور بلندتر نوجوان مبتلا ہیں اور جو مذکورہ تینوں فتنوں سے بھی زیادہ خطرناک، زیادہ عیارانہ اور زیادہ فریبکارانہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہ آخری قسم سب سے زیادہ فتنوں اور گمراہیوں کا باعث ہے اور اس لئے قوم کے ہر فرد کو اس خطرے کے دفع کرنے کے لئے پورے عزم کے ساتھ آمادہ اور اصلاح و تدبیر کے ہر اسلحہ سے مسلح رہنا چاہیے، تاکہ لوگ پھر اس جال میں نہ پھنس سکیں۔ بہر حال یہ وہ خطرہ ہے جس سے ہر نوجوان مرد و عورت اپنی نسبت (یعنی شادی کی گفت و شنید) کے دوران میں دوچار ہوتا ہے چنانچہ ہر وہ نوجوان جو شادی سے متعلق کوئی بلند و اعلیٰ مقصد نہیں رکھتا ہے یا اپنے قول و قرار اپنے عہد و پیمان اور اپنے کردار کا پاس و لحاظ نہیں رکھتا ہے اور نہ اس پر سختی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے تو وہ ہمیشہ معیوب روش اختیار کرکے شرمناک اور بعید از اخلاق حرکتیں کرنے لگتا ہے اور اپنی منسوبہ کی عصمت کو بھی داغدار کرنے کا تہیہ کر بیٹھتا ہے اب اس نوجوان سے پوچھئے کہ جب تم اتنا بڑا جرم کر چکے تو یہ توقع تم کس منہ سے کرتے ہو کہ تمہاری منسوبہ اپنی عزت لوٹنے اور اپنی عصمت دری کرنے والے شخص کی عزت بھی کرے گی (خصوصاً شوہر بن جانے کے بعد.....) اور اس کے بعد جب تمہارے اولاد ہوگی اور تم انہیں آنکھ بھر کر دیکھو گے تو اس خیال سے تمہارا کیا حال ہوگا کہ ان کی ماں کی عصمت لوٹنے والے اور اس کی ناقابل بیان بے حرمتی کرنے والے تمہیں ہو۔ تو اس وقت مقدس باپ کی صورت میں یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ سوچو! کہ تم اپنی اس حرکت سے کیا اسی عمارت کو ڈھا نہیں رہے ہو جو تمہاری راحتوں کی مرجع بننے والی ہے؟ تم اپنی منسوبہ کی عفت اور اس کی پاکیزہ ترین [illegible] کو اس وقت لوٹ رہے ہو جبکہ وہ خود تمہاری رفیقۂ حیات اور تمہارے [illegible] عیش و نشاط بننے والی ہے پھر تم اس عورت پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہو جس کے متعلق تمہیں خود تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ اپنی ذات اپنے خاندان اور اپنے خالق تینوں سے خیانت و بے وفائی کا ثبوت پیش کر چکی ہے۔ ساتھ ہی [illegible] اس بدکاری کے انجام اور اس ننگ و ذلت پر بھی غور کرو جسے تم شاید عمر بھر برداشت کرتے رہو گے۔ پھر اپنی اس منسوبہ کی سہیلیوں اور اس کی دوسری ہمسنوں کے احساسات پر بھی نظر ڈالو۔ جو تمہارے اس فعل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ہوں گی اور خود اپنے متعلق اندازہ لگاؤ کہ تمہارے دل پر اس وقت کیا گزرے گی جب تمہاری حقیقی بہن کا کوئی منسوب، تمہاری ہی جیسی حرکت اس کے ساتھ کر بیٹھے اور اس کی سادگی، کم سنی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے فریب نفس اور ہوا و ہوس کا شکار بنالے نیز اس ذلت کو بھی نہ بھولو جو تمہاری ہر لحظہ بھر کی لطف اندوزی و ہوس رانی سے تم دونوں کے خاندان والوں، دوستوں، سہیلیوں اور [illegible] پہچان کے لوگوں کو ہوئی ہوگی۔ پھر گو اس نے اپنی خوشی سے نیم رضا

ثبوت دیا، اور تمہیں اس فعل سے زبردستی باز نہ رکھ سکی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے دل میں تمہاری پہلی جیسی عزت ہرگز باقی نہیں رہی کیونکہ تم نے اس کی عصمت و ناموس کو داغ لگا دیا اور اس کی نیک نامی پر دھبہ لگا دیا جس سے اس کی عزت پر حرف آگیا۔

وہ اگر تمہارے سامنے "عزیز مصر" کی بی بی سے زیادہ بے باکی و ذلت کے ساتھ آتی اور اپنی رضامندی کا ہر طرح اظہار کرکے تمہیں مجبور بھی کرتی جب بھی تمہاری غیرت اور تمہاری مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ تم سیدنا یوسف (علیہ السلام) کی طرح یہ کہتے ہوئے چیخ پڑتے کہ "میں اتنی بڑی بدکاری کا ارتکاب کرکے (اللہ تعالیٰ) کے سامنے کس طرح مجرم بنوں؟" اگر تم یہ نہیں کہتے بلکہ وہی بدبختی اور ساری ترغیبات اسی کی طرف سے تھیں تمہیں تو ایسی عورت سے تم الگ کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس لئے کہ اگر اس سے تم نے شادی کرلی تو اپنی زندگی آپ برباد کردی اور اپنی ساری مسرتوں اور راحتوں پر پانی پھیر دیا۔ ہر وہ نوجوان جس میں مردانگی اور جوانمردی کی اعلیٰ صفات موجود ہیں اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ کسی نوجوان لڑکی کا اعتماد کھونے کے بعد اپنی زندگی کو ننگ و ذلت کے احساسات سے محروم ہوتے ہوئے بالعمل تم کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے ایک باعصمت پاک دامن عورت کا انتخاب کرنا چاہئے اور انتخاب کرلینے کے بعد ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ تم دونوں میں محبت کی پینگیں اتنی زیادہ نہ بڑھیں جس سے کسی کی آبرو اور پاکدامنی پر حرف آجائے اور اس کی عزت و ناموس خطرہ میں

پڑ جائے اسی طرح ہر اس عورت کو سمجھانے کی کوشش کرو جو تم سے زبردستی گھل مل سکتی ہو اور تم راہ بڑھا رہی ہو یا غیر ضروری اور غلط قسم کی محبت کا اظہار کر رہی ہو۔ سچی اور پکی محبت اور عیاری (خود غرضی کی محبت میں فرق و تمیز کرنا اگرچہ ایک نوجوان کے لئے مشکل ہے مگر محال نہیں ہے۔ مترجم)

بہرحال اگر تم دونوں کی زندگی کے یہ دن غیر شریفانہ اوضاع و اطوار سے گزرے تو خوب یاد رکھو کہ تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کرنے سے باز نہیں رہے گا (اور تم اخلاق و انسانیت کے مجرم و خائن کہلانے سے بچا نہ سکو گے مترجم) پھر شاید تمہیں عمر بھر کف افسوس ملنا پڑے۔

آخر میں یہ بھی سمجھ لو کہ جو طریقہ ان المناک نتائج کا باعث ہوتا ہے وہ انتہائی "بے تکلفی" کا طریقہ اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہی بے باکانہ غیر شریفانہ روش ہوتی ہے جس میں فریقین شرم و غیرت کو دھو کر پی جاتے ہیں اور جس کا مظاہرہ اس کی بات چیت اور نقل و حرکت سب میں ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں ذلت و ندامت سے صرف وہی نوجوان بچ سکتا ہے جو اپنی پوری قوت ارادی اور اپنے شرف و عقل (جو علم سے نہیں بلکہ تربیت سے حاصل ہوتا ہے مترجم) دونوں سے کام لیکر ایسی ڈگر پر قدم ہی نہ رکھے جہاں سے وہ پھسل سکتا ہے یا اس کے قدموں میں لغزش آسکتی ہے۔

(بشکریہ "جنسیات")

حاصل مرادآبادی

اختلاف

بنتِ مشرق ـــــ ★ ـــــ بنتِ مغرب

بنتِ مشرق

تری نظروں میں ہے پوشیدہ حیا کی دولت
تیرا کردار ہے محکومِ شریعت اب بھی
تیرے اوصاف کا قائل ہے زمانہ اب تک
تیرا دستور ہے پردے سے نہ باہر جانا ـــ!
تیرا مقصود ہے شوہر کی اطاعت کرنا
تیری تہذیب جُدا ہے، ترے افکار جُدا
تو نئی رسم، نئے دور سے آگاہ نہیں
تیرے بچوں کو ہے ملت کی حفاظت کرنا
بزمِ مشرق میں ترے دم سے اُجالا ہے ہنوز
تجھ کو دیرینہ روایات پہ چلنا ہوگا ـــ!

بنتِ مغرب

ترے نزدیک حیا کی نہیں کوئی قیمت
تجھ کو ہر قیدِ تعیّن سے ہے نفرت اب بھی
تیری رسوائی کا ہے عام فسانہ اب تک
تیرا معمول کلب گھر کی ہوائیں کھانا
تیرا شیوہ ہے فقط سیر و سیاحت کرنا
تیرا اخلاق جُدا ہے، ترا کردار جُدا
تجھ کو رُسوائیِ ماحول کی پرواہ نہیں
تیری اولاد کا مسلک ہے تجارت کرنا
تو نے مغرب سے قدم اپنا نکالا ہے ہنوز
تجھ کو اس ملک کے دستور میں ڈھلنا ہوگا

(بشکریہ "عفت")

معسود فاروقی

دورِ جدید کا دس سالہ نمبر دیکھ کر

پانچ چھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ حلقۂ ادب اسلامی کراچی کا ہفتہ وار اجتماع ہو رہا تھا۔ کہ ایک صاحب، جو غیر ملکی معلوم ہو رہے تھے تشریف لائے سیاہ رنگ موٹے موٹے ہونٹ چھوٹی چھوٹی آنکھیں لنگی باندھے ہوئے۔ آتے ہی آکر خاموش بیٹھ گئے۔ جب کارروائی ختم ہوگئی تو انھوں نے اپنا تعارف کرایا ـــــــــ یہ محمد صالح برمی تھے۔ اپنے آنے کے سلسلے میں انھوں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ صاف اور شستہ اردو بول رہے تھے اور ہر لفظ سے انتہائی خلوص و محبت ٹپک رہی تھی اردو زبان سے مسلمانانِ برما کی دلچسپی اور اسلامی رشتۂ اخوت پر انھوں نے بڑی سادگی کے ساتھ موثر خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ حلقۂ ادبِ اسلامی روزنامہ دورِ جدید برما کے دس سالہ نمبر کے لئے اپنی نگارشات دے اور رنگون کے اردو اخبار کے ساتھ قلمی تعاون کرے ـــــــــ حاضرین نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے وعدہ کیا اور حلقہ کی طرف سے تعاون کا یقین دلایا۔

تہا صاحب سے یہ اچانک ملاقات برمی مسلمانوں اور دورِ جدید کے ساتھ تعلقات و رابطہ کا ایک پیش خیمہ بن گئی۔ ایسی ہی ملاقاتوں سے پوری طرح اس حقیقت کا شعور ہوتا ہے جو دیس بدیس کے رہنے والوں کے درمیان محبت و الفت کے رشتے کو اس طرح مضبوط و مستحکم کر دیتی ہے کہ جب اجنبی مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے درمیان میں رنگ، نسل، قوم اور ملک کا کوئی پردہ حائل نہیں رہتا وہ اجنبی نہیں ہیں بلکہ دوست ہیں بہت ہی گہرے بہت ہی پرانے ہیں بالکل مل جاتے جن کے دلوں کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو دور ہوتے بھی ایک دوسرے سے بالکل قریب ہی تھے۔

تہا صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ حلقہ ادب کے رفقا نے نظمیں اور مقالے ان کے حوالے کئے کہ وہ دورِ افتادہ بھائیوں کی طرف سے برمی مسلمانوں کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیں لیکن سوءِ اتفاق سے کچھ ایسی الجھن آن پڑی کہ تہا صاحب اس آخری ڈاک سے یہ سوغات روانہ نہیں کر سکے جو بروقت ان نگارشات کو وہاں پہنچا دیتی دورِ جدید کا دس سالہ نمبر اپنی تکمیل کے آخری مرحلوں میں تھا اس لئے؟ حلقہ ادب کی نگارشات اس نمبر میں شائع نہ ہوسکیں جس کا تہا صاحب کو بہت ہی افسوس ہوا اور وہ بڑے جذباتی انداز میں اس واقعہ پر رنج و ملال کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر حضرت علیؓ کا مقولہ یاد آتا ہے اور واقعی کس قدر حکمت آمیز بات ہے

"عرفت ربی بفسخ العزائم"

"میں نے اپنے رب کو، ارادوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے پہچانا"

بہرحال دورِ جدید کے دس سالہ نمبر میں باوجود تہا صاحب کی سعی کوشش کے حلقہ ادب کے رفقا حصہ نہیں لے سکے۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر گیا اس درمیان میں تہا صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں میں نے ان ملاقاتوں کو کافی فائدہ اٹھایا اور برما سے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں۔

اس پورے عرصہ میں دورِ جدید کے دس سالہ نمبر کا بڑا انتظار تہا صاحب جب بھی ملتے اس کی آمد کے متعلق کوئی نہ کوئی اطلاع دیتے۔ آخرکار ایک دن تہا صاحب مسکراتے ہوئے ملے اور ایک بہت ہی ضخیم رسالہ انھوں نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرے اندیشوں کے برعکس یہ پرچہ انتہائی دیدہ زیب اور بہت ہی دلچسپ نظر آیا فرصت ملنے پر میں نے جب اس نمبر کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے انتہائی خوشی اور حیرت ہوئی۔ پاکستان کے اردو روزنامے ہر سال دو تین نمبر پیش کرتے رہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے سوائے معدودے چند نمبروں کے یہاں کا کوئی نمبر...

جہازی سائز کے ۳۰ صفحہ کا یہ بھاری بھرکم نمبر ایک انتہائی خوب صورت ٹائٹیل میں ملبوس ہے پہلے صفحہ پر نقروں کے پس منظر میں رنگون کی ... آؤسان کا ایک دیدہ زیب منظر ہے اندر کے صفحات میں بھی برما سے متعلق بڑی دلچسپ اور معلومات افزا تصاویر ہیں تقریباً ۴۴ فکر انگیز مضامین اور ایک درجن شگفتہ منظومات شامل ہیں جو بیشتر برمی صحاب کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس نمبر کو دیکھنے سے اردو کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے اور برمی مسلمانوں کی اردو کے ساتھ دلچسپی پر رشک آتا ہے۔ برما کے ان لکھنے والوں کی زبان اتنی صاف اور شستہ ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ان لوگوں کی تحریریں ہیں۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے بلاشبہ روزنامہ دورجدید برما جیسے دور دراز علاقہ میں اردو کا ایک قابل فخر روزنامہ ہے اور اس خلوص و محبت کا آئینہ دار ہے جو برمی مسلمانوں کو اردو زبان کے ساتھ ہے۔ ہمارے لئے یہ بات اس خاص وقت میں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے جبکہ پاکستان میں چند سیاسی طالع آزماؤں نے اپنی مخصوص سیاسی اغراض کے لئے اردو کے ساتھ ایک طرح کا معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ برمی مسلمان کی یہ جدوجہد پاکستانیوں کے لئے .. باعث غیرت و عبرت ہے۔ اس جدوجہد کی تفصیلات، صلاح تہیا، صاحب کے مضمون "برما میں اردو" سے بخوبی ملتی ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اردو زبان کے ساتھ ہمارا یہ لگاؤ اور تعلق خالی محض اس بنا پر نہیں ہے کہ یہ ہماری مادری زبان اور قومی زبان رہی ہے بلکہ حقیقت میں اردو کی قدر و قیمت اس لئے ہے کہ یہی وہ زبان ہے جو برعظیم ہند اور اس کے اطراف و اکناف تقریباً ۱۰ کروڑ انسانوں کے درمیان ایک فکری رابطہ اور تعلق کا واحد ذریعہ ہے۔ اسلامی علم و فنون کا سارا سرمایہ اردو میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اپنے اس بیش بہا سرمایہ کے ذریعہ اردو اس سوادِ اعظم کے مسلمانوں کے ذہنی رشتوں کو مضبوط رکھنے کا کام برسہا برس سے سرانجام دے رہی ہے۔ جب تک اس علاقہ کی دوسری زبانیں اسلامی رجحانات و نظریات سے اردو کی طرح مالامال نہیں ہو جاتیں اس وقت تک اردو کے پھیلاؤ کو روکنا اور اس کی تحقیر کرنا ایک بہت بڑا ملی جرم ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ برمی مسلمانوں کو اردو کی اس اہمیت کا پوری طرح احساس ہے اس نمبر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برمی مسلمانوں کی اردو کے ساتھ دلچسپی محض ایک لسانی دلچسپی نہیں بلکہ مقصدی دلچسپی ہے اور وہ اردو کو اسلامی علم و دانش کے حصول و اشاعت کا ایک بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دورجدید کی یہ صوری اشاعت برمی مسلمانوں کے دینی مزاج اور ان کے اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ بیشتر مضامین ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے لکھنے والوں کو اسلامی مقصدیت سے کتنی گہری وابستگی ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں بیشتر اس قسم کا لٹریچر تیار ہو رہا ہے جو ایک طرف تو عام انسانی اخلاقیات کو تباہ و برباد کر رہا ہے اور دوسری طرف خصوصیت کے ساتھ اسلامی اقدار کے خلاف دانستہ محاذ بناتے ہوئے رنگون کے واحد اردو روزنامہ کی یہ فکری صالحیت عطیہ خداوندی سے کم نہیں۔ اسلامی ملکوں میں اس وقت تک صحت مندانہ تبدیلیاں نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ان ملکوں کے لٹریچر میں نقطہ نظر کی تبدیلی پیدا نہ ہو جیسی آوارگی، اخلاقی انتشار اور ملحدانہ خیالات پھیلانے والے رسائل و جرائد کا جو سیلاب بہا چلا آ رہا ہے اس کا سدباب اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم قدیم ادبی روایات کا ماتم کرتے سر نگوں بیٹھے رہیں بلکہ اس سیلاب کے مقابلہ کے لئے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور خداپرستانہ نقاط نظر کے ایک جوابی سیلاب کی ضرورت ہے جو تحریر و کلام میں ناشائستہ اور غیر حقیقت پسندانہ بہاؤ کو روک دے اور لکھنے پڑھنے والوں کے زاویۂ نگاہ کو غیر معمولی طریقہ سے بدل دے۔ یہ کام مسلمان ملکوں کے نوجوان ادیبوں اور پختہ فکر دانشوروں کا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اسلامی اقدار کی .... ترویج و اشاعت کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر دیں اور سنجیدہ مقالوں، افسانوں، تنقیدوں، نظموں اور ادب پاروں میں سچی اور حقیقت پسندانہ اسلامی زندگی کو روشناس کرانے کی کوشش کریں یہ قلمی جہاد نہ صرف یہ کہ الحاد و بے دینی، ذہنی بے راہ روی اور اخلاقی انتشار کے جراثیم کا قلع قمع کر دے گا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسی ہم خیالی اور ہم آہنگی دے گا کہ وہ سوچیں گے تو اپنے اپنے دماغ سے لیکن ایک ہی بات سوچیں گے بولیں گے تو اپنی اپنی زبان میں لیکن جب بولیں گے تو ایک ہی بات بولیں گے۔ ان کے ذہن ان کے دماغ ان کے

دل اور ان کی زبانیں ایک ہو جائیں گی۔ پھر کیا مشکل رہ جائے گی کہ وہ ایک ہی منزل کی طرف ہم قدم وعناں نہ ہو جائیں۔؟ وہ ایک بات وہ ایک خیال کیا ہے؟ تشریح کی جائے تو کتابیں کیا کم ہوں اور اشارہ و کنایے سے کام لیا جائے تو صرف ایک بول میں مکمل ترجمانی ہو سکتی ہے

"ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام"

یہ وہ ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو دور دور سے کھینچ کر ایک مرکز پر جمع کر سکتی ہے یہ وہ گیت ہے جو ایک سوچی سمجھی منزل کی طرف ان کو نشان لئے جا سکتا ہے یہ وہ نعرہ ہے جو جہاد زندگی میں ان کو ہم قدم و ہم عناں کر لیتا ہے۔ ہم جب کبھی بیرونی مسلمانوں سے ملتے ہیں علم و ادب کے موضوع پر ان کو اس ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرتے اور اس کے لئے ان کی رفاقت کے خواستگار رہتے ہیں۔ لیکن ہر ملک کے مسلمانوں کے اس ترجمان پرچہ کو دیکھکر اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس دعوت فکر کے لئے کچھ زیادہ زحمت برداشت کی جائے کیونکہ وہ خود اس کے حامل اور داعی نظر آتے ہیں۔ اس پرچے نے جہاں ہر ملک کے قلمکاروں کے اس نقطۂ نظر کو واضح رکھا وہاں یہ بات بھی آشکارا کر دی کہ وہ نہ صرف سچ بولتے ہیں بلکہ سچ بولنے کا سلیقہ اور آہنگ بھی رکھتے ہیں اور یہی فن اور اسلوب کا صحیح استعمال ہے اس وقت دنیا میں جو جھوٹ پھیلا ہوا ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے لوگ فطرتاً و طبعاً جھوٹ کو پسند کرتے ہیں کیونکہ انسان کی فطرت کسی حال میں جھوٹ اور کجی کو پسند نہیں کرتی بلکہ انسانیت کا خمیر ہی یہ ہے کہ وہ سچ اور راستی کو پسند کرے دنیا میں پھیلے ہوئے جھوٹ کا سبب صرف یہ ہے کہ چالاک اور ہوشیار لوگ اس جھوٹ پر بڑی فنکاری اور چابک دستی سے سچ کا ملمع چڑھا دیتے ہیں یہ ان کی طرز ادا اور اسلوب بیان ہی ہے جو لوگوں کو جھوٹ پر اچھالے جاتا ہے۔

اسلوب بیان، طرز ادا اور فنی سلیقہ کسی بھی خیال اور مقصد کے موثر اظہار کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں خواہ وہ مقصد حق ہو یا باطل جھوٹ ہو یا سچ۔ لیکن یہ انتہائی افسوسناک صورت ہے کہ لوگوں نے سچ کو اپنی بدسلیقگی بدکلامی اور وحشیانہ انداز بیان سے لوگوں کے لئے ایک ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ممکن ہے یہ بات سچ ہو کہ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کہنے والے نے یہ بات صرف ان لوگوں کے لئے کہی ہوگی جن کا مزاج صفراوی ہو جاتا ہے اور ہر میٹھی چیز ان کو کڑوی معلوم دیتی ہے سچ ایک سلیم الطبع انسان کے لئے کسی وقت بھی کڑوا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے لئے ہمیشہ رسیلا اور میٹھا ہی ہوتا ہے۔ سچائی کے اس رس کو مٹھاس کو جب تک فن اور اسلوب کے سانچوں میں کشید کر کے پورے سلیقہ کے ساتھ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ذہن کی پیاس بجھ نہیں سکتی۔ یہی وہ محنت طلب کام ہے جو اسلامی اور تعمیری ادب کی تحریک سرانجام دینا چاہتی ہے۔ اور اس کام کو سرانجام دینے کا ڈھنگ، صرف تین لفظوں میں پوشیدہ ہے۔

"سچائی، سلیقہ اور محنت"

دور جدید کا یہ دس سالہ نمبر بھی اللہ کے فضل سے ان تین.. لفظوں کی جامع تشریح و توضیح ہے۔ اس میں سچائی، سلیقہ اور محنت کا پرتو ہر صفحہ پر پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ خاص طور سے ادارہ کی جانب سے لکھا ہوا مضمون "دور جدید کے پہلے دس سال" تو ان لفظوں کو صحیح آئینہ داری کر رہا ہے۔ اس مضمون کو پڑھکر اس خلوص و حق... پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا جو دور جدید کے موسس اور کارکنوں کا طرۂ امتیاز ہے ایک سوچی سمجھی مقصدیت کی خاطر جس طرح مادی فائدوں کو نظر انداز کیا گیا اور جس ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس کے کارکنوں نے ایک جانی بوجھی منزل کی طرف قدم بڑھائے ہیں وہ اردو رسالوں اور اخباروں کی تاریخ میں ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ ایک ایسے مقصد کے لئے اچھے ذرائع ہی نتیجہ بخش اور مفید ہو سکتے ہیں لوگ عموماً ایک اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے برے ذرائع استعمال کر لیتے کا دیدہ و دانستہ دھوکہ کھاتے اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا مقصد تو سرے سے غائب ہو جاتا ہے اور برے ذرائع مقصد و منتہا بن جاتے ہیں دور جدید کے روح رواں صاحب ابراہیم احمد مظاہری اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ اور واقف تھے چنانچہ انھوں نے دور جدید کے انتظام و انصرام میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا اور یہ ان کی حسن نیت اور مستقل مزاجی ہی کا نتیجہ ہے کہ باوجود ان گنت آزمائشوں کے دور جدید

باقی صفحہ ۶۲ پر)

طالب حجازی

کربلا

قوتِ جبروت سے کسی نے کہا تھا برملا
سر یہ جھک سکتا نہیں کٹ جائے گو میرا گلا

سرزمینِ کربلا کس کے لہو سے سرخ کی؟
قصرِ باطل کس کے ایماں کی حرارت سے جلا؟

مٹ گیا خانوادۂ حضرتؐ خدا کے دین پر
گر گیا لیکن اُجاگر جلوۂ ربِّ علا

عظمتِ ناموسِ پیمبرؐ پہ قرباں ہو گیا
احترامِ آدمیت وہ شہیدِ کربلا!

کانپ اُٹھے ارض و سما دشت و جبل تھرا اٹھے
خاک پر جس وقت تڑپا فاطمہؓ کا لاڈلا

کفر کے چہرے پہ مستی ظلم کی رقصاں ہوئی
گردنِ شبیرؓ پر جب خنجرِ بُرّاں چلا

اُن کے ہاتھوں سے لُٹی باغِ رسالت کی بہار
جو نمازوں میں سدا پڑھتے رہے صلِّ علیٰ

جبر و استبداد اُدھر، اور جرأتِ شبیرؓ اِدھر
اہلِ حق کے سامنے پھر سے بپا ہے کربلا

احمد نسیم مینانگری

فریب دیتے ہیں!

نشاط و کیف کے دھارے فریب دیتے ہیں
رہِ طلب میں سہارے فریب دیتے ہیں

سکونِ قلب میسر نہیں کسی کو یہاں
ہوا و حرص کے دھارے فریب دیتے ہیں

قدم قدم پہ یہ طوفان رُخ بدلتے ہیں!
بھنور میں آ کے کنارے فریب دیتے ہیں

کہیں تو عقل سے انسان فریب کھاتا ہے
کہیں یہ عقل کے مارے فریب دیتے ہیں

کریں تو غیر کا ہم کس طرح یہاں شکوہ
ہمیں تو اپنے ہی سارے فریب دیتے ہیں

نسیم میں ہوں چراغِ سحر کا پروانہ!
فضا کے مجھ کو اشارے فریب دیتے ہیں

(بشکریہ "دعوت" دہلی)

نیّر بانو

حُسنِ انتظام

دسمبر کی چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی بچوں نے تقاضے شروع کر دیئے کہ اماں کہیں چلتے ہمیشہ گھر میں رہتے رہتے جی بھی تو گھبرا گیا ہے اس مرتبہ ہم ضرور کہیں جائیں گے۔ چھٹیاں آتی ہیں اور یونہی گذر جاتی ہیں۔

"کہیں جائیں گے مگر آخر کہاں؟"

اپنے اتنے تو رشتہ دار ہیں۔ کسی کے گھر چلتے۔ کیا ان کے پاس گھر نہیں ہیں"۔

"گھر تو ہیں مگر کسی نے بلایا تو نہیں"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے بغیر بلائے چلتے"۔

"نہیں بھئی آج کل وہ باتیں نہیں رہیں۔ اب لوگ بن بلائے رشتہ داروں کو دیکھکر خوش نہیں ہوتے"۔

اماں کیا ہمارے چچا، پھوپی، خالہ، ماموں ہمیں دیکھکر خوش نہ ہوں گے پھر اپنے خالہ ماموں کے ہاں چلتے۔ وہ تو آپ کو دیکھکر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ آپ اس زمانے کے کتنے قصے سناتی ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے ہم اس وقت ہوتے۔ کتنی سیر و تفریح کرتے، کیسا مزہ رہتا۔

"میرے خالہ ماموں اب بہت دور ہیں۔ وہاں جانا مشکل ہے۔ تمہارے چچا پھوپھی ہندوستان میں ہیں وہاں پہنچنا اور بھی مشکل ہے۔ یہ سیر و تفریح پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے"۔

"آپ کی پھوپھی تو یہیں قریب ہیں"۔

"وہ اب بڑی آدمی ہو گئی ہیں۔ ہم اُن سے ملنے کے لائق نہیں رہے۔ کیا خبر تم ان کے خوبصورت صوفوں اور قالینوں کو اپنے پیروں سے خراب کر دو۔ ان کے پھولوں کو اپنے ہاتھوں سے نوچ کھسوٹ کر پھینک دو بس رہنے دو ایسی باتیں کر کے مجھے پریشان نہ کرو۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاکر کھیلو یا کہانیاں پڑھو"۔

میرا یہ صاف جواب سُنکر تینوں بچوں کے چہرے اداس ہو گئے۔

"کہاں تک کہانیاں پڑھیں۔ ان چھٹیوں میں شاید کہانیاں ہی پڑھنی ہوں گی"۔ اتنی بات کہکر وہ آہستہ آہستہ میرے پاس سے اٹھے اور سُست قدموں سے باہر چلے گئے۔ وہ تو چلے گئے مگر ان کے اداس چہرے کی کیفیت نے مجھے افسردہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں جانے کی فرمائش کیا کرتے تھے اور مجھے یونہی ٹالنا پڑتا۔ سیر و تفریح اور نئی نئی جگہیں دیکھنے کا کسے شوق نہیں ہوتا۔ ننھے ننھے دلوں میں اس لمبی چوڑی دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں۔

> میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے ہی بچوں کے مایوس اور افسردہ چہرے آگئے بلکہ ایسے ہی اور سینکڑوں بچوں کی صورتیں گھوم گئیں۔ لیکن یہ گھٹنوں چلنے والے انسان اپنے سے بڑوں کو اس روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور مایوس لوٹا دیئے ہیں۔ یہ تھوڑی سی محبت، ذرا سے وقت کی بھیک مانگتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں ہوتا جو ان سے محبت کرے، ان پر وقت صرف کر سکے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ صرف اپنے آپ سے محبت کرنی چاہیئے۔ اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، ہمارا وقت اور ساری توجہ بس۔ ہمارے اپنے لئے ہوتی ہے۔ ننھے منے انسانوں کا یہ تجربہ نہ جانے کیسی سوسائٹی کو جنم دے گا۔

ہم جولیوں کے ساتھ مل بیٹھنے اور نئے نئے دوست بنانے کو جی چاہتا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اپنے تمام رشتہ داروں کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ تو مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ کتنے بچے ہیں، کیسی شکلیں ہیں۔ کیا نام ہیں۔ کس کس جماعت میں پڑھتے ہیں۔ کھیلنا جانتے ہیں۔ گڑیاں بنانی آتی

ہیں۔ آپ ان کے ہاں جاتی کیوں نہیں۔ انھیں بلاتی کیوں نہیں۔ اگر
کوئی دور دراز کا عزیز اچانک آجاتے اور میں کہدوں کہ یہ بھی ہمارے
رشتہ دار ہیں تو اس سے ایسے گھل مل جائیں گے اور شوق سے کام کرتے
پھریں گے کہ کم از کم مجھے ان کی خاطر مدارات اور دلجوئی کی طرف سے
اطمینان ہوجائے گا۔ یہ رشتہ داروں کی محبت ڈھونڈتے ہیں مگر وہ
انہیں میسّر نہیں ہوتی۔ جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے ہمارے چچا ماموں کتنی
محبت اور کتنا خیال رکھتے تھے۔ آخر غلطیاں اور قصور ہم سے ہوتے ہی
ہوں گے مگر ڈانٹ ڈپٹ ہمیں یاد نہیں۔ چچا اتنی محبت سے بولتے تھے
میرے لئے کتابیں اور رسالے لایا کرتے تھے۔ سردیوں کی راتوں میں بڑے
اہتمام سے گھنٹوں بیٹھ کر عظیم بیگ کی مزے دار کہانیاں پڑھ کر سناتے۔
ان کے پڑھنے سے جیسے کہانیوں میں جان پڑ جاتی۔ فرش پر درمیان میں
انگیٹھی رکھی ہوتی۔ چاروں طرف ہم بہن بھائی بیٹھے تلی، ریوڑیاں اڑاتے
کان اور دھیان کہانی پر دیتے ہوتے۔ بادامنوں کی طرح چلغوزے چھیل
چھیل کر منہ میں ڈالتے جاتے، وہ بھی چچا ہی لایا کرتے۔ وہ ریلوے میں
آفیسر تھے۔ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل جب انہوں نے پڑھ کر
سنائی تو پڑھتے پڑھتے وہ نقشہ کھینچا کہ ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے ہم خود
اس ریل میں سوار ہیں اور ہنستے ہنستے بے حال ہوگئے۔ جب مجھے کوئی
کام کرتے دیکھتے تو وہ ایک ایسی گر کی باتیں بتا دیتے کہ آج تک ان سے
فائدہ اٹھا رہی ہوں۔ خوب صورت کاج بنانے کا کیا طریقہ ہے، گرم کپڑا
سینا کیسے آسان ہوجاتا ہے۔ ہانڈی بھونتے وقت کن کن باتوں کا
خیال رکھا جائے تو سالن زیادہ مزیدار ہوسکتا ہے۔ جب ہم گورکھپور
میں تھے تو کوٹھی کے پچھواڑے آموں کا بڑا گھنا باغ تھا۔ ہم بہنیں درختوں
پر چڑھنے کی مشق کر رہی تھیں کہ ہمارے ساتھ نائیوں کی لڑکیاں بھی آکر
شامل ہوگئیں۔ کہنے لگیں۔ رسی لاؤ، جھولا ڈالیں۔ بیر، گھر میں سے
بہت موٹی سی رسی لے آئی اور وہ لڑکیاں ایک موٹا سا خشک ڈالا
نہ کسی طرح سے لے آئیں۔ انہوں نے اوپر چڑھ کر ایک ڈال میں
رسی باندھ دی۔ جھولا تیار ہوگیا۔ وہ خشک ڈالا نیچے جھولے میں ڈال
کر ہم سب آٹھ دس لڑکیاں اس پر لد گئیں۔ پہلے ہی جھونٹے میں آم
کی بوڑھی ڈال اڑاڑا دھم سے نیچے آرہی۔ وہ تو خیر گذری جھونٹے کی
جھونک میں وہ گری ورنہ سب کے سر پھٹتے۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا اور
کر اندر بھاگ گئی اور غسل خانے میں چھپ گئی۔ دھماکا سن کر چچا باہر
آئے انہیں دیکھ کر مالیوں کی لڑکیاں پھر پھرا گئیں۔ چھوٹی بہن کو پکڑ
کر اندر لاتے۔ ایک تو بیچاری یونہی ڈر کے مارے رو رہی تھی۔ پھر
شاید ایک چانٹا بھی لگا۔ میرا دل ڈر کے مارے بری طرح گھبرا رہا تھا
اور بہن کے لئے دل دکھ رہا تھا کہ خود تو بچ کر بھاگ آئی اور اسے پکڑوا دیا
مگر جب میں نکل کر باہر آئی تو مجھے کچھ نہیں کہا کسی نے۔ عید پر چچا ہمارے
ہاں ضرور آتے، عید کی چہل پہل اور رونق دوگنی ہوجاتی۔

اور ماموں کیسے نیک تھے۔ کتنے شفیق اور مہربان، انہوں نے
کبھی ہمیں نہیں ڈانٹا۔ وہ ہم سے اتنی محبت کرتے تھے کہ آج کل اس
کی مثال ملنا ہی ناممکنات میں سے ہے۔ میرے بچے جب وہ باتیں
سنتے ہیں تو حیرت اور رشک سے میرا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بچوں
کو بہلانے کے لئے ایسی محبت اور شفقت کا نمونہ کہیں دور دور بھی
نہیں ملتا۔ ان کی محبت میرے لئے ایک ایسا چراغ تھی جس نے زندگی
کے پُر پیچ راستے میں میرے ڈگمگاتے قدموں کو بہت دفعہ سہارا دیا۔
ملازمت کے سلسلے میں ان کا مختلف جگہ تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ جہاں
بھی ہوتے اپنی بہن کو ضرور بلاتے۔ کنبہ کو یکجا دیکھ کر خوش ہوجاتے۔
کھانے، ناشتہ پر محفل جمتی ایسی پُرلطف باتیں ہوتیں کہ گرمی میں
ہنس کر ان باتوں کو کان ... ہیں۔ لطیفے سناتے، سوال پوچھتے
کوئی بحث چھیڑ دیتے۔ ہم ادب سے خاموش بیٹھے۔ تو چھیڑ چھیڑ کر بحث
کراتے۔ اسی طرح سوچنے اور بات کرنے کا سلیقہ آنے لگا اس دستور
کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اتفاق سے دہلی میں ہمارا ساتھ ہوگیا تو شہر کے شہر
میں ہم چھٹیوں میں ان کے گھر جا کر رہتے، ممانی ہماری ان کو بہت
چاہتی تھیں۔ برسات آتی۔ ساون کی جھڑیاں لگتیں تو فوراً ہمارے
گھر پہنچتیں۔ اماں کے سر ہو جاتیں کہ چلو بچوں کو ساتھ لے کر گھر بند
کرنے کی دقت ہوگی تو کیا ہے۔ ان بچوں کا خیال کرو۔ ان کا بھی
کہیں آنے جانے، ملنے ملانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے لئے اور کون سا
گھر ہے۔ ایک جگہ رہتے رہتے دل اکتا جاتا ہے۔ زبردستی چلنے کا وعدہ لیکر
جاتیں۔ ہم خوشی سے کھل جاتے۔ دو تین دن میں تیاری کر ماموں کے

گھر پہنچ جاتے۔ پھر سیر و تفریح کے اتنے پروگرام بنتے کہ سال بھر کی کمی پوری ہو جاتی۔ کبھی بادکھلے، کبھی نہرو، کبھی لال قلعہ، صفدر جنگ، حوض قاضی غرض دہلی کا چپہ چپہ چھان مارتے۔

سہ پہر کو ماموں دفتر سے آتے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ آرام کرتے، ناشتے کے بعد کہتے چلو بچو سیر کرنے، بولو کہاں چلوگے۔ کئی مرتبہ رات کے دس بجے چاندنی میں قطب صاحب گھمانے لے گئے۔ ممانی ہر روز پوچھ پوچھ کر ہماری پسند کی چیزیں پکواتیں۔ ایک دن بارش میں ہمایوں کے مقبرے لے گئیں۔ ایک ٹوکری میں پکوان کا سامان انگیٹھی کوئلے سب ساتھ رکھا۔ وہاں پہنچکر ہم خوب گھومے، پھرے۔ ممانی اور اماں نے پکوان اتارا۔ پھر ہم نے مزے لیکر کھایا۔ ممانی کبھی گرمیوں میں پہاڑ پر اکیلی نہیں گئیں۔ ہمیشہ ہمیں ساتھ لے جاتیں۔ حالانکہ ہمارے ساتھ ہونے سے انہیں دقت تو زیادہ ہی اٹھانی پڑتی ہوگی۔ ذمہ داری بڑھ جاتی ہوگی مگر انھوں نے کبھی اس بات کی پرواہ نہ کی۔ مسوری میں، ماموں نے ممانی کی نوکروں سے چھٹی کردی کہ آپ آرام کیجئے اور گھر... باورچی خانہ اور نوکر اپنے انتظام میں لے لئے۔ مجھے اپنا مددگار بنایا، موٹی موٹی کتابیں پڑھتے، پاس بٹھا کر مجھے سمجھاتے جاتے۔ مجھ سے گھر کے کام کے نقشے بنواتے، پھر پوچھتے یہ کام کس طرح کرنا چاہیئے۔ دراصل وہ مجھے گھر داری کی تربیت دے رہے تھے اور ان چند دنوں میں اتنی تربیت دیدی کہ سالوں تجربے کے بعد بھی اتنی واقفیت نہ ہوتی۔

بھوپال کا علاقہ خوب گھوم پھر کر دیکھا مجھے اتنا یاد ہے کہ سر جھکا کر دیکھو تو نیچے ہری ہری گھاس تھی۔ اور اوپر درختوں کی چھتریاں ہی چھتریاں یا مینہ برساتے بادل۔ ایک دن چپکے سے گھر سے نکل کر نربدا پر پہنچی۔ بپھری ہوئی نربدا ندی گھن گرج کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ کنارے پر لگے تھے۔ تاریکٹ ایک منٹ ٹھہری ہوں گی کہ سر چکرانے لگا اور پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ جانے کس قوت نے مجھے وہاں سے ہٹا دیا۔ ورنہ گرنے ہی لگی تھی۔ بھوپال سے واپسی میں سانچی ٹوپ دیکھنے کا پروگرام بنا۔ ماموں انگلی پکڑے ایک ایک چیز ہمیں دکھا رہے تھے۔ ہر مجسمے اور تصویر کی تشریح کرتے جاتے تھے۔ گوتم بدھ کی تاریخ سے ہمیں اتنی دلچسپی ہوگئی تھی جہاں کہیں اس کا تذکرہ ملتا پہلے اسے پڑھتے... اپنے وقت میں سے پورا حصہ ہمیں دیتے۔ اپنی ساری محبت دے ڈالتے۔ ممانی اکثر ہمیں چیزیں دیتی رہتیں کبھی کسی کام سے خوش ہوکر بطور انعام کبھی کسی موقع پر تحفتاً، ہماری شرارتیں، ہماری بے وقوفیاں دونوں خاموشی سے برداشت کرتے جس کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہوگا جو کچھ کیا اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ ہم پر زور دعوے سے اپنا حق وصول کرتے وہ ہنس ہنسکر ہمیں دونوں ہاتھوں سے دیتے اور خوش ہوتے۔ کیا اچھا زمانہ اور کتنے اچھے لوگ تھے!

اب تو خون کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اب محبت اور تعلق کی بنیاد میں خون کا جوش کام نہیں آتا۔ معاشرت کے اختلافات نے ایک نئی رشتہ داری کو جنم دیا ہے۔ دولت مندوں کی اپنی الگ برادری ہے۔ جداگانہ تہذیب و معاشرت ہے۔ جو خوشی پہلے رشتہ داروں کے قرب سے حاصل کی جاتی تھی وہ اب غیروں میں تلاش کرلی جاتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب اوپری اور سطحی خوشی ہوتی ہوگی۔ جن تعلقات اور محبت میں خلوص اور گہری رچی ہوئی اپنائیت نہ ہو۔ وہ دل کو سچی آسودگی کیسے بخش سکتی ہے۔ ہم اپنے بچوں کو دے ہی کیا رہے ہیں، انہیں رشتہ داری کے معنی کس طرح سمجھائیں۔ یہ انسانیت سے محبت کرنا، انسان کی عظمت و بزرگی کس جگہ سے سیکھنا شروع کریں گے میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے ہی بچوں کے مایوس و افسردہ چہرے آگئے بلکہ ایسے ہی اور سینکڑوں بچوں کی صورتیں گھوم گئیں..... ابھی یہ گھٹنوں چلنے والے انسان اپنے سے بڑوں کو کس روپ میں دیکھ رہے ہیں یہ التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور مایوس لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ یہ تھوڑی سی محبت، ذرا سے وقت کی بھیک مانگتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں ہوتا جو ان سے محبت کرے، ان پر وقت صرف کرسکے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ سے محبت کرنی چاہیئے۔ اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہمارا وقت اور ساری توجہ بس ہمارے اپنے لئے ہوتی ہے ننھے منے انسانوں کا یہ تجربہ نہ جانے کیسی سوسائٹی کو جنم دے گا۔

میں جانے کتنی دیر اسی ادھیڑبن میں لگی رہتی کہ اسلم کتاب پڑھتے پڑھتے ایک لفظ کے معنی پوچھنے کے بہانے میرے پاس آگیا۔

"امی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میں بھی ایک بات سوچ رہا

"تم کیا سوچ رہے تھے؟"

"یہی کہ گلیوں میں جگہ جگہ بجلی کی روشنی کیوں ہوتی ہے؟"

"اتنی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، روشنی میں راستہ چلنا آسان ہوتا ہے۔"

نہیں لاں، بلکہ رات کے چوروں کو گھروں کے دروازے تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

یہ سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ غالباً اسی لئے اس نے مجھے اپنی فکر کا نمبر سنایا تھا۔ میرے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ گیا۔ آپ تو یوں ہی خفا ہونے لگتی ہیں۔ سچ مچ ہمارا دل کہیں جانے کو بہت چاہ رہا تھا۔

"اچھا تو میں سوچوں گی کہ کہاں جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ نہیں"

"آپا اور سلمہ سے کہہ دوں کہ ہم جا رہے ہیں۔"

"واہ میں نے وعدہ تو نہیں کیا۔"

انگلی پکڑنے کا سہارا پا کر اکرم کے پیٹ میں کہیں بات کھلبلی ہے ...میں کہیں جانے سے امکانات کا جائزہ لینے لگی۔ دور کے رشتے سے ...ری ایک نند ہوتی تھیں وہ کئی مرتبہ بچوں کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر ...چکی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اور نہیں تو دو چار دن کے لئے وہاں ہو آتے ...۔ بچوں کی بات رہ جائے گی۔ قریب بھی ہیں۔ سفر کی زیادہ زحمت ...نہ ہوگی۔ یہ سب سوچ کر شاکرہ آپا کو خط لکھ دیا کہ ہم چار روز کے ...آپکے ہاں آ رہے ہیں۔

دو دن تیں میں لگ کر تیاری کر لی۔ بچے ایسے خوش، جیسے ...کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ خیر ہم بخیریت وہاں پہنچ گئے۔ اسٹیشن ...کے لڑکے ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ گھر بڑا صاف ...تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی نمایاں خوبی تھی ...نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا پھر معلوم ہوا کہ گھر میں آدمی ...کافی ہیں۔ ان کی بوڑھی ساس، سیانی لڑکیاں، لڑکے، اپنی ...یاں، میاں کی بھابیاں، دیورانی اور اس کے بچے، کم و بیش کوئی ...افراد تو گھر ہی کے ہوں گے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ جس گھر میں اتنے ...ہوں وہاں نہ غل غپاڑہ۔ نہ افراتفری اور نہ کسی قسم کی بد انتظامی ...ہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید سب رہتے اکٹھے ہوں گے کھانا پینا

الگ الگ ہوگا۔ مگر کھانے کے وقت سب نے جب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا تو یہ خیال بھی دل سے نکالنا پڑا۔ اپنے گھر میں تو میں اکیلی ہی ہوں پھر بمشکل تمام دن بھر میں اتنا وقت ملتا ہوگا کہ تھوڑا بہت کسی وقت سینا پرونا لے کر بیٹھ جاؤں۔ یا کوئی بہت ہی ضروری خط ہوا تو اس کا جواب لکھوں۔ اکثر گرمیوں کی سلائی جاڑے میں جا کر ختم ہوتی تھی اور جاڑے کے کپڑے مارچ اپریل تک سلتے رہتے تھے آخری سویٹر اسی روز مکمل ہوتا تھا جب باقی سب گرم کپڑے اور سویٹر فینائل کی گولیاں ڈال کر بکس میں بند کرنے کا دن آجاتا تھا۔ آئے تو ہم چار روز کے لئے تھے مگر ان کے بے حد اصرار پر ایک ہفتہ تک رکنا پڑا۔ ہمارے آنے کی خوشی میں انہوں نے چلتے پر اپنی چند ملنے والیوں کو بلایا۔ دو چار کے گھر ہمیں لے کر گئیں۔ دو ایک قابل دید جگہیں بھی دکھائیں۔ سردیوں میں باہر نکلنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر جب باہر آجائیں تو لطف بھی آتا ہے۔

قدرت تو ہر موسم میں اپنی بہاریں لٹاتی ہے۔ زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں کلیوں کے تنگ و تاریک گوشوں میں دیکھ لیں تو اس کا کیا قصور۔ کھیتوں میں دور دور تک گیہوں لہلہا رہے ہیں بیچ بیچ میں سرسوں پھولی تھی۔ پہلے ایک کھیت والے سے منت میں آکر بہت سا سرسوں کا ساگ لیا۔ بچوں نے خوب دوڑ بھاگ لگائی۔

بڑے ہو کر بچوں جیسا دل نہیں رہتا۔ اندیشہ ہائے دور دراز کسی کی خوشی کو خالص نہیں چھوڑتے۔ بچپن میں جب دنیا کو نیا نیا دیکھنا شروع کرتے ہیں تو اس کی رنگا رنگی اور وسعت ایک عجیب قسم کا سرور بخشتی ہے غالباً بچوں کو یہ نقشہ چڑھ گیا تھا۔ میں اور شاکرہ آپا ایک مینڈھ پر دھوپ کا رخ بچا کر بیٹھ گئیں۔ دیر تک آسمان کی بکھری ہوئی نیلاہٹ کو دیکھتی رہی۔ کھیتوں کی شادابی نے جیسے روح کو بھی تر و تازہ کر دیا تھا۔ وہ خدا جس نے دنیا کے ناقابل ذکر خطوں کو حسن اور شادابی سے مالا مال کیا ہے تو وہ خطہ جسے اس نے اپنے حسن و جمال کی صنعت گری کے لئے مخصوص کیا ہے اس کے بانک پن اور نکھار کا کیا عالم ہوگا۔

جب ہم گھر پہنچے تو وہی علاء الدین کے چراغ والا معاملہ تھا گھر صاف، ستھرا، کھانا وغیرہ تیار۔ مجھے پھر حیرت ہوئی۔ آخر رہا نہ گیا تو آپا سے پوچھ ہی لیا کہ کیا واقعی آپکے پاس علاء الدین کا چراغ ہے۔ آپ تو پورا

وقت بھی مجھے دے رہی ہیں۔ نوکر چاکر بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گھر اس سلیقہ سے کس طرح چلا رہی ہیں پھر اتنی مہمان داری ہیں میں نے کسی وقت آپ کو گھبراتے نہیں دیکھا، اور آپ کے باورچی خانہ میں پیالے بھی بڑے آرٹسٹک طریقہ سے رکھے ہوتے ہیں کہ میں نے پانچ منٹ انھیں دیکھنے ہی میں گذار دیتے۔

وہ بڑی ہنسیں اور جیسے خوش بھی ہو گئیں۔ بولیں! مہمانداری کی یہ بات ہے کہ یہ سب اپنے ہی ہیں، انہوں کو مہمان نہیں کہتے۔ میرے دیور اس وقت بیکار ہیں ایسے وقت میں ان کا ساتھ نہ دیا جائے تو... اپنائیت کس کام کی۔ میاں کی بھانجیوں کا یہ حق ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے ماموں کے گھر آ کر رہا کریں۔ اپنی بھتیجی کو تعلیم کی وجہ سے بلا رکھا ہے... وہاں دیہات میں اس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میرا دل نہیں لگتا جب تک اپنا کنبہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ گھر کا سلیقہ اور انتظام خراب نہ ہو۔ گھر کے تمام بڑے بڑے کام سب پر برابر تقسیم کر دیئے ہیں اور اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہر ایک کو اپنے حصے کا کام پوری ذمہ داری سے کرنا ہوگا۔ بس اسی وجہ سے ہر کام وقت پر اپنے آپ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور تم مجھے فرصت میں دیکھتی ہو۔ ویسے میں بھی اپنے حصہ کا کام کرتی ہوں، کوئی چیخ پکار اور گڑبڑ نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ ہم پڑھے لکھے تو بس یونہی ہیں۔ خاک کسی بات کا پتہ نہیں۔ شاکرہ آپا کہنے کو جاہل ہیں پر کیسی اچھی طبیعت پائی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی شاگردی کروں۔ سارے گھر والے ان کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ وہ خود کس محبت سے ان کا نام لیتی ہیں۔ ہر ایک کیلئے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ یہ ایثار اور خیر خواہی کا جذبہ کتنا قابل قدر ہے۔ اچھے لوگوں سے ابھی دنیا خالی نہیں ہوئی۔ میرے زخمی دل پر جیسے کسی نے ٹھنڈے ٹھنڈے مرہم کا پھایا رکھ دیا۔

(بشکریہ "عفت")

وحید اللہ وحید •

○

زندہ باش اے سوزشِ غم تو سلامت زندہ باش
رکھ خیال اتنا قدم میں آنہ جائے ارتعاش

ایک اک ٹکڑے سے چمکی اس کے سو برقِ جمال
جب کیا اس نے مرا آئینۂ دل پاش پاش

ہو کے ویراں بھی یہ دل ہے کتنی رنگینی لئے
رہ چکی ہے کیا کبھی اس گھر میں تیری بود و باش

عشق گریاں آرزو مضطر تمنا سوگوار
ایک ماتم تھا جو اس محفل سے نکلی دل کی لاش

کھولے جن غنچوں نے لب انکی زبانیں کھینچ لیں
حسنِ پنہاں کا کرے کوئی تو کیونکر راز فاش

پھر اٹھا اک درد تڑپا دل بھر آئے آنکھوں میں اشک
کسی کے آنے کا تصور ہے الٰہی خیر باش

آگئے لے کر پیامِ الوداع موئے سفید
دیدۂ غفلت قریب آئی سحر ہشیار باش

منھ دکھلانے جائیں ہم کیا انکی محفل میں وحید
ہر گھڑی تن پروری ہے ہر نفس فکرِ معاش

انور صہبائی •

دعا

شبِ تاریک، طوفاں، برق و باراں!
رواں ہوں ایک دشتِ پُرخطر میں
نظر بے نور ہے، مجروح پاؤں!
نہیں ہمت مرے قلب و جگر میں
میں تنہا گرتے پڑتے جا رہا ہوں!
نہ ہمدم ہے نہ رہبر اس سفر میں
غضب کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں
نہیں کچھ فرق اب شام و سحر میں
الٰہی! مجھ کو نورِ حق عطا کر!
الٰہی! خوفِ باطل سے رہا کر!

(ہمایوں)

کرشن گوپال عابدؔ •

ایک دِل سَو گھاؤ

دروازے پر شہنائی بیٹھ چکی تھی۔ سرشام ہی گھر میں گیتوں کی.. صدائیں گونجنے لگتیں۔ جوان جوان خوب صورت لڑکیاں جن کے ننھے ننھے سینوں میں ننھے ننھے کنوارے ارمان تھے دامنوں میں دوپٹے کے آنچل دبا دبا کر ہلکے ہلکے سروں میں گیت گاتیں ——— راہی کے پردیسی کے ڈھولا کے، وہ گیت جو محبت کی ہلکی ہلکی آنچ میں تپ کر پرسوز بنتے تھے، وہ گیت جن کی ابتدا بھی دھڑکن تھی اور انتہا بھی، وہ گیت جو رقت انگیز بھی تھے، شعلہ بار بھی، جن میں آنسو بھی تھے، گلے بھی، شکوے بھی ——— ان جذبوں کے گیت جنہوں نے آسودگی نہ پائی۔ اور ان خوابوں کے گیت جو دور دیس کے خوبرو مردوں سے متعلق ہوتے ......

اور تب نقرئی آوازوں میں ڈوبے ہوئے ان گیتوں کے ساتھ ہلکے ہلکے ڈھولک بجتی اور ایک طلسم سا چھا جاتا۔ سانولے سینے دھڑکنے لگتے۔ اور خوابوں کے جزیرے آباد ہو جاتے ——— اور نئی نویلی دلہنیں... شرمائی شرمائی سی بیٹھی رہتیں اور بہوئیں بناؤ سنگھار کر کے ان آوازوں میں اپنی آوازیں ملانے کی ناتمام کوشش کرتیں اور پھر بیچ بیچ میں لایعنی سی باتوں کے سلسلے چھیڑ دیتیں۔ بڑی عمر کی عورتیں ان تمام گیتوں کو حسرت سے سنتیں۔ کبھی ناک بھوں چڑھاتیں کبھی ناک پر انگلی رکھتیں کبھی ہونٹ سکیڑتیں اور کبھی ڈھولک کھینچ کر بے ڈھنگے پن سے دھپ دھپاتیں اور ایک ہنگامہ سا مچا رہتا۔

یہ ہنگامہ بہت دنوں سے مچا ہوا تھا۔ اس کی ماں بہت ارمانوں سے اس کا بیاہ رچا رہی تھیں۔ وہ ایک زمانے سے اس کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو میں جی رہی تھیں اور اب جب کہ یہ وقت آپہنچا تھا......

اب تو بیاہ سر پر تھا ——— بارات میں صرف چار دن باقی رہ گئے تھے ——— اور یہ چار دن .....

کتنے سپنے، کتنے ارمان، کتنے ان چھوئے کنوارے جذبے ان چار دنوں سے متعلق تھے۔ گیتوں کی محبوب سروں کے مابین لرزتے کانپتے لجاتے وہ خواب .... وہ دولہا بنے گا۔ سر پر پھولوں کا سہرا باندھے گا

> پھر جب دولت آئی، کتنے ہی گھرانوں سے پیغام بھی آنے لگے ——— لڑکیاں روپوں کی طرح برسنے لگیں، مگر اتنی عمر گذر جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک کنوارا تھا ....

گھوڑی پر بیٹھے گا۔ بارات چلے گی۔ ہنگامے ہوں گے۔ روشنیاں ہوں گی تمتماتے چہرے ہوں گے۔ نئے ملبوس ہوں گے۔ آتشبازیاں ہوں گی۔ خوشیوں اور مسرتوں کے ہجوم ہوں گے، اور وہ سب کچھ ہو گا جن کے بارے میں وہ کتنے برسوں سے سوچتا آیا ہے۔

کتنے برس ———؟

ہاں کتنا طویل عرصہ گزر گیا، اس نے سوچا تھا، وہ انتظار نہ کر پائے گا اس نے سوچا تھا وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ہار جائے گا.... اپنے جذباتیت کے ہاتھوں شکست کھا جائے گا۔ مگر نہیں ——— جیت اس کی ہوئی۔ فتحیاب وہی رہا۔

اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ سگریٹ کا آخری کش لگایا اور اسے بھی دوسرے لاتعداد سگرٹوں کی طرح میز کے کونے سے مسل کر فرش پر پھینک دیا۔ ٹین اٹھایا۔ ڈھکنا کھولا۔ مگر اس کی انگلیاں خالی لوٹ آئیں۔ اس نے چونک کر دیکھا ڈبہ خالی تھا۔ وہ لپک الماری کی طرف لپکا۔ وہاں بھی سگریٹ نہ تھے۔ سرہانے کے نیچے۔ آتشدان پر سگریٹ کہیں نہ تھے، وہ جھنجھلا اٹھا اسے اپنے خیالات کے تسلسل کے لئے سگریٹ کی بے انتہا ضرورت تھی۔ اور سگریٹ کہیں نہ تھے۔ ہاں! فرش پر، میز پر، ایش ٹرے

میں، آتشدان پر سگرٹوں کے بے انتہا ادھ جلے ٹکڑے پڑے تھے۔ اور راکھ ہر جگہ بکھری ہوئی تھی، اور خالی ڈبے لڑھکتے ہوئے دیوار کے سہارے خاموش پڑے تھے۔ اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے یکبارگی یہ سب دیکھا آہ! اتنی سی دیر میں وہ کتنے سارے سگریٹ پھونک گیا۔

تب وہ اٹھا۔ دریچے کے پاس آیا۔ اسے کھول دیا۔ دھواں پھیلتا سکڑتا باہر نکلنے لگا۔ گیتوں کی آواز پائیں باغ کے سناٹوں کے کندھوں پر سوار اندر آنے لگی۔ اور پائیں باغ کے کھمبوں کے اوپر کا زرد چاند اس کا مونہہ چڑانے لگا۔

اس نے اپنے دکھتے ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور آخری بار سوچنے لگا۔ "جو کچھ وہ کر رہا ہے کیا ٹھیک ہے ——؟"

مگر یہ کیسی آواز تھی؟ جانے کہاں سے پیدا ہو کر یہ آواز اس کے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی تھی؟ یہ آواز کیوں پیدا ہو رہی تھی؟ اس کا تو وہ مدتوں سے گلا گھونٹ چکا تھا۔ اس وقت جب دنیا اور دنیا والوں نے اس کے تمام گیتوں کو کچل دیا تھا ان کنوارے، البیلے، مسرت مدہوش اور خوبصورت جذبوں کو ہمیشہ کے لئے موت کی سرد گود کے حوالے کر دیا تھا اس وقت آواز بھی ختم ہو چکی تھی۔ پھر اب —— اتنے عرصہ بعد —— وہی آواز آ آ کر اس کے ذہنی سکون کو کیوں تہہ و بالا کئے جا رہی تھی۔ کیوں؟ کیوں؟ ——

اس نے دریچے کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کا کوئی سہما سا قطرہ پلکوں پر لرزنے لگا —— "آہ! یہ کتنا کمزور ہے۔ کتنا بے بس ——"

اور تب ناگاہ اس کے پلکوں کے ڈھکنے چیر کر ارشاد اس کے دل و دماغ میں گھس آئی —— ارشاد —— اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کائنات کا حسن اپنے دامن میں سمیٹے —— ارشاد —— وہ حسین ننھا منا سا گیت جسے وہ مدتوں سے بھولنے کی کوشش کرتا آ رہا تھا۔ اسکی روح کے سناٹوں نے اسے پھر اگل دیا تھا۔

ارشاد ——؟

ارشاد اس کی زندگی کا سب سے پہلا مکمل گیت تھی۔ مکمل افسانہ تھی ل خواب تھی۔ اس کی جوانی کا سب سے پہلا سنگ میل تھی۔ ارشاد نے اسے وہ تمام جذبے عطا کئے تھے جو مرد کی زیست کا سہارا ہوتے ہیں۔ اس کے تصور میں ارشاد کے بہت سے روپ تھے۔ وہ ارشاد جو ننھی منی سی معصوم بچی تھی اور اس کے ساتھ مل کر گھروندے بنایا کرتی تھی۔ اور بچپن کے نامکمل ان جانے کھیل کھیلا کرتی تھی۔ پھر وہ ارشاد جو سکول جانے لگی تھی۔ سکول کی گاڑی میں بڑی لڑکیوں کی طرح بیٹھ جایا کرتی تھی اور دوپٹے کے آنچل کو مضبوطی سے کانوں کے گرد لپیٹ دیتی تھی۔ پھر وہ ارشاد جس کے ہونٹ اس کے سامنے آتے ہوئے حیا کے بوجھ سے تھرا اٹھتے تھے۔ اور اس کی غلافی پلکیں اس کی دو نیلی گہری جھیلوں والی آنکھوں کو ڈھک لیا کرتی تھی پھر وہ ارشاد.......

مگر کہاں تک گنا جائے وہ تو اس کی زندگی تھی۔ زندگی کا ایک ثانیہ بھی وہ اس کے خیال سے غافل نہیں رہا —— ان کا گھر آمنے سامنے تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی بچپن بتا کر جوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی چند نئے تصورات کو دامن میں بسایا تھا نئے عہد و پیمان کئے تھے۔ جب تک اس کے ابو جان تھے ارشاد کے گھر والے اس کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ وہ بلا روک ٹوک ان کے ہاں جایا کرتا تھا اور گھنٹوں ارشاد کے سامنے بیٹھ کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا حسن و نازکی اس ملکہ کو —— حتیٰ کہ وہ شرما جاتی تھی اور اس کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی اور وہ اسے بادلوں کی طرح تلاش کرتا رہتا تھا۔

دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کی محبت سے بخوبی واقف تھے۔ جوانی کی حدود میں پہنچ جانے کے بعد بھی ان کی دیوانگی بدستور تھی چنانچہ ایک روز اس کے ابو جان نے ارشاد کے ابا سے اسے اس کے لئے مانگ لیا تھا۔

ان دنوں وہ دسویں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

اسے یاد ہے اس روز دونوں گھرانوں میں بہت ہنگامے ہوئے تھے۔ ان کی منگنی کی رسم نہایت شان سے منائی گئی تھی۔ ارشاد کا اس سے پردہ کرایا گیا تھا۔ اس کے دوستوں نے اور گھر والوں نے بڑی دیر تک اسے ارشاد کا نام لے لے کے چھیڑا تھا ارشاد کے ابا نے اسے اپنے پاس بٹھا کر نہایت شفقت سے سونے کی ایک انگوٹھی دی تھی۔

ارشاد اس کی بنا دی گئی تھی —— مگر ارشاد اس سے دور تھی

اس کا دل اس سے ملنے اسے دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے لئے ترستا رہتا تھا

پھر اچانک ایک روز اس کے ابوجان اس کی امی کو اور اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس روز وہ خوب رویا تھا۔ جب ان کا جنازہ اٹھا تھا ارشاد کے ابانے اس کے کندھوں اپنا ہاتھ رکھکر اسے سہارا دیا تھا۔

ابوجان کی اچانک موت کے بعد ایک روز اسے پتہ چلا تھا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا اور اسے اپنا اور امی کا پیٹ بھرنے کے لئے تعلیم کو منقطع کرنا پڑے گا۔ اور اپنے مستقبل کے ان خوابوں کو بھول جانا پڑے گا

مگر جس روز اس نے کالج چھوڑنے کا ارادہ کیا ارشاد کے تصور نے اس کو تعلیم جاری رکھنے کی ترغیب دی۔ اس لئے جس طرح بھی ہوسکا آدھا پیٹ کھا کر، پرانے گھسے کپڑے پہن کر اس نے تعلیم کو جاری رکھا۔ اسکی امی اور ارشاد کے ابا نے اس کا نکاح دینا منظور کیا تھا۔ کیونکہ سب کو امید تھی بی، اے کے بعد وہ اس لائق ہوسکے گا کہ اپنے خاندان کی گئی ہوئی عزت لوٹا سکے۔

اس نے اونچے اونچے رنگ محل بنائے تھے۔ ارادوں اور خوابوں کے خولوں میں گھرا جب وہ بی اے کا امتحان دے رہا تھا اس نے اپنی امی کو یقین دلایا تھا کہ بی اے کے بعد جب اسے اچھی سی ملازمت مل جائے گی وہ اسے کہنیوں تک سونے سے لاد دے گا۔

مگر ہوا کیا ؟ ہم ——— بی اے کا امتحان ہوا۔ امتیازی نمبروں سے پاس ہو کر وہ اپنی لیاقت اور اپنی تعلیم کے زعم میں وہ نوکریوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ بڑی افسری کے خواب دیکھنے کے بعد ایک روز جب وہ تھکا ماندہ دل گرفتہ گھر لوٹ رہا تھا اس نے سوچا اگر افسری نہیں تو اسے معمولی سی نوکری تو ضرور مل جائے گی۔ جس سے کم از کم وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ بھر سکے گا

مگر وقت گزرتا گیا۔ وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ اسے نوکری نہ ملی۔

وہ دھکے کھاتا رہا۔ ایک امید کے بعد دوسری امید۔ دوسری کے بعد تیسری تیسری کے بعد چوتھی۔ مگر بچپن کے ریت کے گھروندوں اور ان امیدوں میں کوئی فرق نہ تھا اور وہ لٹتا گیا۔ اس کا چہرہ سوکھتا گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمتی گئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑگئے۔ محنت، فکر اور شرم کے مارے اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا ——— اور یہ سارا عرصہ ارشاد کا تصور اسے آس بندھاتا رہا۔ ظلمات کے اندھیروں کے درمیان روشنی کی ایک ننھی لکیر۔ مگر ایک روز ....

ایک روز اسے پتہ چلا کہ ارشاد کے ابا نے ارشاد کا نکاح کہیں اور کر دیا ہے چونکہ وہ غریب ہر اور بے روزگار ہے۔ اور اتنی مدت تک وہ ایک موہوم سی امید کے سہارے انتظار کرتے رہے اور وہ نالائق نکلا کیوں کہ کسی نے اسے نوکری نہیں دی۔ وہ مہینوں سے سڑکوں کی خاک چھان رہا ہے اور ایک نوکری نہیں تلاش کر پا رہا۔ اس لئے اس نالائق کے ہاتھ اپنی پھول سی بچی کا ہاتھ دینے کے لئے وہ تیار نہیں۔ وہ اسے فاقوں مرتا نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ محبت روٹی نہیں دے سکتی۔ کیونکہ محبت غریبی کے دامن میں نہیں پل سکتی۔ اور وہ جس کے ہاتھوں ارشاد کو سونپا جا رہا ہے اتنا امیر ہے کہ ارشاد عیش کرے گی۔ ہزاروں میں کھیلے گی۔ سونے میں تلے گی۔ کیا ہوا اگر اس کے بچپن کے خوابوں کو اس سے چھینا جا رہا ہے۔ کیا ہوا اگر اس کو جہیز میں آنسوؤں کے سمندر دیئے جا رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر اس کا خاوند بڑی عمر کا ہے۔ مگر روپے میں بڑی طاقت ہے

اور خالد ——— ؟

اس پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ روشنی کی ننھی سی آخری لکیر کو بھی چھین لیا گیا تھا۔ اب وہ کس سہارے زندہ رہتا ———

چاروں طرف سے اسے طوفانوں نے گھیر لیا۔ آندھیوں نے اس کے مسکن کے پرخچے اڑا دیئے اور اس سے کہا گیا کہ آنسو بھی نہ بہائے۔

پھر جس روز ارشاد دلہن بنی۔ وہ چھپ کر اسے دیکھنے گیا تھا۔ دلہن کے لباس میں اس کا شبیہہ بے طرح نکھر آیا تھا۔ مگر اس کی طرح وہ بھی سوگوار تھی۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ خودکشی کے اس خیال کو جو اس کے ذہن پر قابض ہو چکا تھا بھول کر گھر لوٹ آیا تھا۔ مگر اس کی خاموشی کی تہہ میں نفرت کے ہزاروں سمندر تھے ....

ارشاد کی رخصتی کے دوسرے دن اس نے ارشاد کی چھوٹی بہن نجمہ کو دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پانچ برس کی تھی۔ اسے دیکھ کر اسکے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری تھی۔

اس بات کو آج کتنے برس بیت گئے۔ اس لمبے سارے عرصے میں زمانے نے کتنے رنگ بدلے۔ کل کا خالد جسے کہیں نوکری نہ ملتی تھی اور

جس کے لئے کہا گیا تھا کہ وہ اوباش اور آوارہ ہے اور کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اور جس سے اس کی محبوبہ کو چھین لیا گیا تھا آج شہر کا ایک امیر ترین آدمی گنا جاتا تھا۔ لوگ اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ اتنا امیر کیسے ہوا؟ کیونکر ہوا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ ہاں! ایک بات تھی۔ شہر بھر میں اس کی بہت عزت تھی

پھر جب دولت آئی کتنے ہی گھرانوں سے پیغام بھی آنے لگے۔ لڑکیاں روپوں کی طرح برسنے لگیں۔ مگر اس نے اپنے ہونٹوں سے کھچی ہوئی مسکراہٹ کو واپس نہ لوٹایا آج تک کسی نے کبھی اسے مسکراتے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے اتنی عمر گذر جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک کنوارا تھا۔

اس کی ماں نے ہزاروں مرتبہ رو رو کر کہا، دھمکیاں دے دے کر اسے دلہن لانے کے بارے میں کہا مگر اس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ اس نے اسے تنہائی کے واسطے دیئے۔ اتنی بڑی حویلی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ وہ پتھر بن چکا تھا۔ کوئی جذبہ، کوئی غم، کوئی احساس اس پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ اس پر بری طرح کلبیت سوار تھی اور ماں اب تھک ہار کر برسوں سے خاموش ہو چکی تھی۔ وہ اب اس سے کچھ نہ کہتی وہ اس کے غم کو سمجھتی تھی جو اس کی روح کی انتہائی گہرائیوں میں کہیں محلول ہو چکا تھا۔ جو جرکہ ارشاد کی جدائی نے لگایا تھا وہ ابھی ہرا نہ تھا مگر اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید کبھی وقت کے ہاتھوں یہ زخم مندمل ہو جائے۔ اس روز اس کا لال اس کی گود میں لوٹ آئے گا اس روز بہاریں لوٹ آئیں گی۔ اس روز وہ عورت کے ہونٹوں کے لازوال تبسم کی خواہش کرے گا ——— وہ نہایت چاہ سے اس روز کا انتظار کر رہی تھی۔

اور خالد کے نجمہ کے جوان ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

کیوں کہ اسے انتقام لینا تھا۔ اس سارے گھناؤنے سماج سے۔ رسوم سے۔ اس کمینگی سے۔ ان انسانیت سوز دعدوں سے۔ وہ انتظار کر رہا تھا کب نجمہ جوان ہو گی کب وہ اس کے ہاں بیاہ کا پیغام بھیجے گا اور کب اسے انکار کر نکلنے کا موقعہ دے گا کب اس کے دل کی دہکتی جوالا بجھے گی۔ کب ان کو پتہ چلے گا کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں انسانیت بھی کچھ ہے۔

اور اب نجمہ جوان ہو چکی تھی۔ اس نے اسے دیکھا تھا۔ وہ ہو بہو ارشاد کا روپ تھی ——— وہی چہرہ۔ وہی نقش ویسے ہی لانبے بال۔ اس نے اس کی آواز کی نغمگی بھی سن لی تھی۔ اور ارشاد کی اور اس کی آواز میں مناسبت بھی تلاش کر لی تھی۔ نجمہ اب اس کے لئے ارشاد بن گئی تھی۔

جس روز نجمہ کے گھر شہر کے اس سب سے بڑے رئیس کا پیغام پہنچا تھا۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ نجمہ کے ابا خود دوڑے دوڑے آئے تھے۔ انھوں نے خالد سے پچھلی تمام باتیں بھول جانے کو کہا تھا۔ اور کہا تھا کہ مرد کی عمر کبھی نہیں ڈھلتی کہ دراصل شادی کی عمر یہی ہے۔ کہ نجمہ کے ساتھ اس کا رشتہ انھیں سر آنکھوں پر منظور ہے۔

اس رات وہ ارشاد کو یاد کر کے بہت رویا تھا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا ——— پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ نجمہ کو بیاہ لانے کے بعد اس سے اس کے والدین کا ایک ایک بدلہ لے گا۔ اسے بھوکوں مارے گا۔ اور وہ تمام ظلم اس پر ڈھائے گا جو عین جوانی کی عمر میں اس پر توڑے گئے ——— اور ٹھیک اسی طرح جیسے اس کے ارمانوں کو کچلا گیا۔ وہ نجمہ کے خوابوں کو پائمال کرے گا۔ اس کی جوانی کو پانی بنا کر بہائے گا۔

مگر جب سے اس نے نجمہ کو دیکھا تھا اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بھول جائے گا۔ سب بھول جائے گا۔ وہ بھی آخر انسان ہے اس کا بھی دل دھڑکتا ہے۔ کب تک وہ اپنے اوپر جبر کرے گا۔ اب وہ ارشاد کو اور اس ظلم کو اور اپنے ماضی کو بھول کر نجمہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے آنچلوں میں اپنے آپ کو گم کر دے گا۔

اور وہ اس شادی کا منتظر تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا اس کے تمام خواب سچے تھے اور آنے والی دلہن نجمہ نہیں ارشاد ہے۔ وہی ارشاد جس کے لئے اس نے بچپن اور جوانی کے دن گزارے۔

اور بارات کے صرف چار دن باقی تھے۔ صرف چار دن .... ایک ایک گھڑی گن رہا تھا کہ اچانک آج ....

شام کا وقت تھا۔ ابھی کچھ بازار سے بہت سی ضروری لوازمات خرید کر آنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آ کر کپڑے اتار رہا تھا۔ نوکر نے ایک نوجوان کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو بہت دیر سے اس کے آنے کی راہ تک

رہا تھا ——

"کہئیے —— !"

"آپ خالد صاحب ہیں —— ؟"

"جی —— فرمائیے ——"

لڑکا جوان اور خوبصورت تھا۔ اچھا جسم تھا۔ صورت سے وہ شریف خاندان کا نظر آتا تھا۔ فراخ پیشانی تھی۔ جس پر بال بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور حسین تھیں۔ اور ان سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

"فرمائیے ——" اس نے اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔

اس نے محسوس کیا کہ لڑکا اپنے اوپر انتہا ضبط کر رہا ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ جسم سلگ رہا ہے۔ لڑکے کے سینے میں کوئی لاوا ہے جوش سے اس کا گلا رندھ گیا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا وہ اس کے قریب آگیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر اسے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔

تب یکبارگی لڑکا رونے لگا۔ سسک سسک کر رونے لگا اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپاکر......

اور جب طوفان ختم ہوا۔ جب ہچکیاں رکیں۔ لڑکے نے اسکی طرف دیکھکر کہا تھا —— "آپنے نجمہ کو کبھی دیکھا ہے —— ؟"

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

اور لڑکا کہتا جا رہا تھا —— "خالد صاحب! آپ نے اپنے آپ کو بھی کبھی دیکھا ہے؟ دونوں کی عمروں کی بیچ کی خلیج کو محسوس کیا ہے؟ وہ تو خیر کلی ہے اور آپ ...... آپ اس کے حسن کے بدصورت خریدار ہیں ...... کیا آپ سمجھتے ہیں وہ آپکے ساتھ خوش رہ سکے گی؟ اس کے ان خوابوں کا کیا ہوگا جو اس نے بچپن سے اب تک دیکھے؟ اس کی جوانی کا کیا ہوگا؟ اس کے حسن کا کیا ہوگا؟ آپ پیسے کے زور سے اسے خرید کر سمجھتے ہیں آپ جیت گئے —— ؟ نہیں —— خالد صاحب آپ بھول رہے ہیں —— غلطی کر رہے ہیں ——"

"چلے جاؤ —— چلے جاؤ ——" اس نے چیخ کر کئی بار کہا تھا۔ "چلے جاؤ —— نکل جاؤ —— جیسے طوفان آگئے تھے۔

اور لڑکا کہہ رہا تھا "ہاں آپ امیر ہیں۔ آپ اسے خرید لیں گے مگر ان وعدوں کا کیا ہوگا؟ جو اس نے مجھ سے کئے؟ —— بتائیے بتائیے —— وہ تو میری بنکر رہنے کی قسم کھا چکی ہے پھر وہ آپ کی کیسے بن سکتی ہے —— بتائیے۔ بتائیے ......

"چلے جاؤ —— چلے جاؤ ——" وہ چنگھاڑ رہا تھا۔

"اس لئے ناکہ میں غریب ہوں اور آپکے پاس دولت کے انبار ہیں مجھے مدتوں سے اچھا کھانا نہیں ملا اور آپ ہر روز کئی آدمیوں کا کھانا کتوں کو کھلا دیتے ہیں۔ اس لئے ناکہ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں بے روزگار ہوں اور آپکے پاس میرے جیسے کئی نوکر ہیں۔ مگر کاش آپ میری جگہ ہوتے۔ میری جگہ ہوتے ....." اور سسکیاں —— سسکیاں۔

پھر یہ طوفان تھمے نہ تھے۔ اس وقت سے اب تک یہ فقرے اس کے ذہن میں متلاطم تھے۔ —— "کاش آپ میری جگہ ہوتے"

آہ ان لفظوں کے ساتھ کتنے اسرار پوشیدہ تھے۔ اس کی زندگی کی کتنی المناک کہانیاں پوشیدہ تھیں کتنے آنسو۔ کتنی ہچکیاں، کتنے لٹے ارمان اور اس وقت سے اب تک وہ سگرٹ پر سگرٹ پھونکے جا رہا تھا سگریٹ ایک ایک کرکے ختم ہو چکے تھے۔ کمرہ دھوئیں سے بھر اٹھا۔ باہر صحنک میں گیتوں کی آواز بھی دب گئی تھی۔ باہر پائیں باغ میں مہمانوں کے لئے گڑے خیموں میں بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ چاند بھی پچھلی طرف لڑھک گیا تھا مگر یہ طوفان بدستور ہنگامے بپا کئے تھے۔ "کاش آپ میری جگہ ہوتے"

آج مدتوں کے پنہاں آنسو بہہ نکلے تھے۔

زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔

ناسور رسنے لگے تھے۔

پھر چار دنوں کے بعد جب بارات چلنے لگی لوگوں کو دیر تک دولہا کی تلاش رہی۔ خالد اپنے کمرے میں نہ تھا۔ سب گھبرا گئے تھے۔ چہروں پر جب ہوائیاں اڑنے لگیں اور مہمانوں میں افراتفری مچ گئی اور اندر عورتوں میں کانا پھوسیاں ہونے لگیں ایک کار دروازے پر رکی اور لوگوں نے دیکھا کہ خالد کے ساتھ پھٹے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان اور بھی ہے جسے وہ ہاتھ سے پکڑے کھینچے لئے آ رہا ہے۔

اور جب بارات نجمہ کے گھر پہنچی۔ خالد نے نجمہ کے ابا سے کہا .....

(باقی صفحہ ۶۴ پر دیکھ)

غزالہ ●

"بغیر عنوان کے"

قلم میرے ہاتھ میں ہے۔ سامنے میز پر ایک معمولی سے کاغذ کی کاپی کھلی پڑی ہے اور نظریں چھت کی کڑیوں کو گننے میں مصروف ہیں اور ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے، میں سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں؟

یہ ایک پرانا سا جاپانی قلم ہے۔ جس کی نب کثرت استعمال سے تقریباً گھس چکی ہے، اور پھر جاپانی تو نیسے بھی ہر چیز نا پختی ہی ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ہم نہ سمجھیں۔ یہ تفصیل میں نے اپنی ادبیت کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے مقصداً آپ کو گنوائی ہے۔ کیونکہ آج سب ہی یہ بات جانتے ہیں کہ ہمارا آج کا ادیب اور فنکار غریب ہوتا ہے، اس کے پاس سامانِ نگارش تک صحیح طور پر اور کافی مقدار میں فراہم نہیں ہوتا۔ اور کیا غریب اور بدحالی "ادبیت" کی سب سے بڑی سند نہیں ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج جتنے مفلس اور قلاش ہیں، سب کے سب، ادیب یا فنکار ہیں؟ یا مستقبل قریب میں بننے والے ہیں؟ جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں، بلکہ جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔ خیر، خیر، یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ ورنہ تو خیر سے مجھے اپنی ادبیت، یا ہمہ دانی کا ثبوت دینے کے لئے غریب کا جواز پیش کرنے کی شاید چنداں حاجت نہیں وہ تو کچھ اس خاکسار کی "نگارشات عالیہ" ہی سے آپ کو اندازہ.. ہو جائے گا کہ بقول شخصے "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" یا "سو پشت سے ہے پیشہ آباء ادب گری۔ کچھ مفاسی ذریعۂ عزت نہیں مجھے!" اب اگر آپ کو اب بھی۔ اس جانب، کی اذیت، یا ادب نوازی کا یقین نہ آئے تو میں آپ کی ناشناس فہم و فراست پر فاتحہ پڑھتے ہوئے جبر کر لوں گی، اور اپنا شمار "آئینہ فروشان شہر کوراں" میں کرانا پسند نہیں کروں گی!

ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ آج ایک عرصے کے بعد اور وطن عزیز میں آنے کے بعد پہلی بار مجھے یہاں کے اردو کے ایک موقر جریدہ کی طرف سے کچھ لکھنے کی دعوت ملی ہے۔ اور وہ بھی ایک افسانہ یا خاکہ! نیز مجھے بصد نوازش آگاہ کیا ہے کہ اگر میں اپنے ناچیز خیالات کا اظہار نہیں.. کروں گی تو یہ اردو ادب پر ایک ظلم ہوگا"

اور میں سوچ رہی ہوں کہ کیا واقعی اس میں کچھ صداقت ہے؟ یا یونہی۔

'دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے'!

واضح ہو کہ یہ دعوت مجھے میرے دلی جذبات و احساسات کے صحیح ترجمان ایک حقیقت انگیز معنوں کے استرداد کے بعد ملی ہے۔! ممکن ہے اشک شوئی کے طور پر ہو؟ مگر نہیں، مجھے کسی کی نیت پر شبہ کرنے کا کیا حق ہے؟ ممکن ہے وہ ان کی مجوزہ پالیسی کے مطابق، نہ ہو، یا اور کوئی نقص ہو۔ جس کو ہم جیسے بیچارے "ادیبوں" سے زیادہ ایڈیٹروں سے نقادان کرام، زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں ———!

بہرحال، اب بھلا میں اس آرڈر کی تعمیل کیسے کروں جبکہ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ آخر میں کس قسم کا افسانہ لکھوں؟ اور افسانہ لکھوں تو اس میں لکھوں کیا؟ یوں تو انسان زندگی کا ہر پہلو مختلف قسم کے آرڈرز سے عبارت ہے، مثلاً بچپن میں ماں باپ کے آرڈرز کی تعمیل ضروری، اس کے بعد جوانی میں شوہر اور سسرال والوں کی سیوا اور احکامات کی تعمیل ناگزیر، اور پھر بڑھاپے میں نوجوان اولاد کے آرڈرز سر چڑھ کر بولتے اور اپنا حق منواتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آرڈرز کی سب ہی قسمیں ہیں۔ مثلاً آتے گئے، پڑوسیوں کے، پھر دوست احباب کے، اس کے بعد پبلک کے اور کوئی ادبی ذوق کا حامل ہوا تو ایڈیٹران کرام کے احکامات، برداشت کرنے پڑتے ہیں، اور عمر یونہی بیت جاتی ہے اور یہ سلسلہ قبر تک یونہی چلتا رہتا ہے، تو مطلب یہ کہ یہ قصہ تو چلتا ہی

لیتے تھا۔ مگر میرے پاس ان فرمائشوں کی تعمیل کے لئے ہے کیا؟ ظاہر ہے کہ نارنگی یا اناناس نے سینڈوچ میں نہیں کھائی پھر میرے اس مختصر و معمولی سے کرایہ کے مکان میں فرانسیسی، امریکی یا اسپینی قسم کا دریچہ بھی کوئی نہیں جس کے بارے میں کچھ روشنی ڈال سکوں۔ لندن لیٹر یا اسی قسم کا کوئی سفرنامہ میں نہیں لکھ سکتی۔ کیوں کہ اس سعادت سے ہنوز ناشاد رہی ہوں، پھر فسادات سے متعلق کوئی ہیجان انگیز چیز لکھکر اپنی مظلومیت اور بربادی کا اظہار کرنے سے بھی معذور ہوں کیونکہ اس ہنگامہ میں قوم کے عظیم جانی و مالی نقصان کے باوجود میرا اپنا ذاتی اس قسم کا کوئی نقصان بھی اتفاق سے نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ آبائی وطن اور چند عزیز ترین ہستیاں چھوٹ گئیں، اور میرٹھ میں ۴۶ء۔۴۷ میں ہمارے کرایہ کے مکان کا ایک حصہ جلا ڈالا گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی سخت جانی اور سخت کوشی کے باعث بچ گئے، اور زندہ و سلامت وطن عزیز "پاکستان دارالامان" پہنچ گئے، اور یہ بھی محض اتفاق ہے کہ یہاں آنے کے بعد ہمارے غریب خانہ میں زندگی میں شاید پہلی مرتبہ چوری ہوئی، اور وہ بھی دن دہاڑے اور اس صفائی سے کہ بجز اللہ کے نام کے کچھ باقی نہیں رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان میں اسی طرح دن دہاڑے چوریاں اور ڈکیتیاں ہونا عام ہے اور یہ "بہادری" یہاں کے شورہ پشتوں کا مایۂ افتخار ہے کہ وہ جو چاہیں کر گذریں، ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ بعض شریف نما اجلے پوش مہاجر، صاحبان بھی اس مہم میں ان کے ہمراہی بن چکے ہیں۔ اور اپنے ہر قسم کے اعمال و افعال کی پردہ پوشی کے ضمن میں محض مہاجریت کی سند کو کافی سمجھتے ہیں اور اسی کی ٹٹی کی آڑ میں خوب خوب شکار کھیلتے ہیں۔ مگر خیر۔ مجھے اس سے کیا بحث کیونکہ "جمہوریت" میں ہر شخص اپنے فعل کا خود مختار ہے اور کسی کو کسی پر نکتہ چینی کا حاصل نہیں۔ تو میں اپنی واردات عرض کر رہی تھی کہ وطن عزیز میں مسلسل ۵ سال کی قید محض ایک انتہائی تنگ و تاریک "لومڑی کی کھٹ" یا بقول شخصے "جراثیم خانہ" میں محبوس رہ کر کاٹنے کے بعد ٹی۔بی جیسا... پاکستان کا محبوب اور عام مرض لگا کر لے لاتعداد کلفتیں اور دشواریاں... جھیلنے کے بعد اب تقریباً دو سال سے ایک کثیر الکرایہ ذرا معقول سے مکان میں پناہ مل سکی ہے۔ جہاں پر ایک مدت بعد کھلی فضا میں سانس لینا اور اللہ میاں کے تاروں بھرے نیلگوں آسمان کی زیارت نصیب ہو سکی ہے ورنہ اس سے قبل تو قیام پاکستان دارالامان، کی برکتوں سے زندہ درگوری کا لطف اٹھا رہے تھے، اور ایک محبِ وطن پاکستان کی حیثیت سے "نہ جائے ماندن۔ نہ پائے رفتن"، کی تفسیر بنے ہوتے ہمہ تن صابر و شاد اور مہر بہ لب تھے۔ کہ حب الوطنی، اور وفاداری، کا آج یہی نشان ہے اور اس کے خلاف جانیوالا قابل گردن زدنی۔! تو آپ ہی بتایئے اس قدر خشک اور غیر دلچسپ و ناگفتنی صورت حالات میں افسانہ آخر کیا اور کس موضوع پر لکھا جا سکتا ہے؟ ہاں پھر ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ افسانہ عین مین اصلاحی، اخلاقی اور آفاقی نوعیت کا ہو اور ظاہر ہے کہ اصلاحی افسانہ ہم کیا لکھیں گے جبکہ ہماری زندگی، ماحول اور حال و مستقبل ہی ابھی غیر اصلاحی ہیں۔ یعنی ان میں اصلاح و تصحیح کی بڑی گنجائش ہے۔ اور یہ کام کچھ ایسا آسان اور چند دن کا تو ہے نہیں۔ بہرکیف اصلاح اور.... آفاقیت کی خواہشمند اور در پے اصلاح ضرور ہوں۔ انجام نامعلوم — کیونکہ "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"۔

دراصل میرے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جب بھی میں افسانہ لکھنے کے ارادے سے بیٹھتی ہوں بے اختیار افسانہ جو مجھے لکھنے لگتا ہے اور میں اسے نہیں لکھ پاتی۔ چنانچہ جھنجھلا کر قلم میز پر پٹک دیتی ہوں اور.. مضامین بند کر دیتی ہوں اور یہ افسانہ ہمیشہ ناتمام ہی رہتا ہے، کیونکہ میری زندگی میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو دوسروں کے لئے باعثِ دلچسپی اور وجہ فرحت و انبساط ہو۔ البتہ سرتاپا عبرت بہت سی چیزیں ہیں اور ان کو دہرانا اس لئے بے سود ہے کہ ان کو سننا آپ پسند نہیں کریں گے اور عین ممکن ہے کہ ہمارے سماج کے معزز و محترم ٹھیکیداروں کی طبع نازک کے لئے یہ تلخ و زہرناک داستان وجہ گرانی اور نفاالنباطمانچہ بر رخسار یزید" ثابت ہو جائے، اور وہ خواہ مخواہ "ملاک" "صنعت کردہ" کی دیدہ دلیری کو کوسنے لگ جائیں گے"۔ کیونکہ اپنے جسم کے خود پیدا کردہ ناسوروں سے آنکھ ملانے کی ہمت آج ہم میں نہیں۔ لہٰذا اس موضوع کو تو معرضِ بحث آنا ہی نہ چاہئیے۔ رہ گئے زندگی کے دوسرے مسائل! تو ان کے متعلق یہ ہے کہ میری آنکھوں نے تو اب تک زندگی کے صرف المیہ پہلو کو ہی دیکھا ہے اور میں صرف اس کے ہی دیانتدارانہ نقاب کشائی کر سکتی

ہوں۔ اس کے علاوہ زندگی کے کسی اور پہلو کی اگر میں ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گی تو وہ یقیناً حقیقت سے دور ہوگی، اور اس لئے اثر سے خالی ہوگی۔ لہٰذا ایک بے اثر چیز کو پیش کر کے فضول اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیوں کروں؟ اب رہی حقیقت نگاری! تو ظاہر ہی ہے کہ حقیقت ہمیشہ کڑوی اور تند ہوتی ہے، اور اس کی تاب لانے کی ہمت اور جرأت آج کتنوں میں ہے؟ اس ضمن میں مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ تقسیم برصغیر سے قبل میں نے اپنا ایک خاصا معقول سا افسانہ (جس کو میں خود پڑھ کر کافی رنجی تھی) دہلی کے ایک معمولی رسالے کے لئے بھیجا، جس پر شاید شفیق باز کا نوٹ بھی تھا۔ مگر وہ افسانہ نہایت بے قدری اور بے اعتنائی کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔ اس الزام کے ساتھ کہ میں نے اس میں عوامی مذاق کا لحاظ رکھنے سے پہلوتہی کی ہے، اور یہ عوامی مذاق کیا ہے؟ یہ آج آپ، ہم سب ہی جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس افسانہ میں کسی نوجوان لڑکی یا کسی لڑکے سے روائتی عشق، یا کسی عشقیہ فلم اور فلم ایکٹرس پر تبصرہ قطعی نہیں تھا۔ نہ جنس و جنسی محرکات کو ہی موضوع بحث بنایا گیا تھا، اور نہ ہی راج کپور، دلیپ کمار و نرگس کی اداکاری سے بحث کی گئی تھی، پھر آخر وہ قابل قبول ہوتا تو کیونکر؟ اور ہمارے عوامی مذاق، کو اس قدر خشک موضوعات بھلا کس طرح اپیل کر سکتے تھے؟ لہٰذا اگر وہ نہایت دیری سے مسترد کر دیا گیا تو اس میں ایسی تعجب کی کیا بات تھی؟ اور اس کے بعد دل برداشتہ ہو کر میں نے ایک عرصہ تک کے لئے کچھ لکھنے یا چھپوانے کا خیال ہی ترک کر دیا، اور پھر بہت دنوں بعد جب لکھنے کی ترنگ آئی۔ اور میں نے یونہی ایک معمولی سا قلم برداشتہ مضمون لکھ کر بدایوں کے ایک جریدہ کے لئے بھیجدیا جس کی اشاعت کی توقع بھی بالکل نہ تھی، تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اسی ہفتہ جریدہ مذکور کے منیجر صاحب کا خط میرے مضمون اور طرز تحریر کی مدح سرائی کے ساتھ چلا آ رہا ہے، اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی ہے کہ میں ان کے رسالے کے حصہ نسواں کی ادارت قبول کر لوں اور وہ ایسی ہی ایک صاحب طرز ادیبہ کے قلمی تعاون کی فکر میں تھے۔" وغیرہ وغیرہ۔ اور میرا مضمون آئندہ اشاعت میں نمایاں حیثیت سے شائع ہو رہا ہے "حالانکہ ایسی ویسی کوئی بات نہ تھی۔ کہ اس خصوصیت کا مستحق قرار دیا جاتا۔

الغرض میں نے کافی حیل و حجت کے بعد یہ ذمہ داری قبول فرمالی، اور کئی ماہ تک نہایت خلوص و انہماک سے رضاکارانہ طور پر رسالہ کو بہتر بنانے کی خدمت انجام دیتی رہی، تاوقتیکہ فسادات کا خوفناک طوفان اس رسالہ اور اس کے اسٹاف کو ہی نہ لے ڈوبا۔ اور مجھے یہاں بہا لایا پھر میں تھی اور زندگی کے نئے تجربات و حوادث۔ اور انھوں نے آج تک تقریباً خود فراموش اور حواس باختہ سا تھا۔ اور میں یہاں آنے کے بعد اپنے قلمی مشاغل کی توسیع و ترویج کی بلند ترین ارادوں کے باوجود آج تک کچھ نہ کر سکی! اور مستقبل میں کیا کچھ کر سکوں گی! اس کا ہنوز کوئی علم یا آثار نہیں۔ یہ ہے میری ادبی زندگی کا مختصر تجربہ! اور اب ایک عرصہ کے تعطل و جمود کے بعد دل اور اس کے ابلتے ہوئے احساسات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک مضمون لکھا بھی تو اس کا بھی بدقسمتی سے وہی حشر ہوا۔ جو انڈیا میں ایک بار ہو چکا تھا۔ یعنی یہ حسرت و یاس، واپسی اور چند کاروباری قسم کے پرخلوص نصائح، اور بس! چنانچہ اب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ کوئی ایسی چیز جس میں میرے دلی احساسات، اور زندگی کے حقیقی تقاضوں کی غمازی ہوتی ہو۔ دوسروں کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور اپنے ضمیر، ذہن اور احساسات و نظریات کے خلاف کچھ سوچنا اور لکھنے کی کوشش کرنا میرے دماغ اور قلم کے لئے ناقابل قبول ہے، پھر سوال یہ ہے کہ آخر میں کروں کیا؟ نہ میں اپنے قلم سے انحراف کر سکتی ہوں، نہ وہ مجھ سے انحراف کر سکتا ہے۔ گویا دونو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قلم میں میری زندگی پنہاں ہے، اور قلم ہی مجھ پر حاوی ہے، نہ میں اس کے خلاف جا سکتی ہوں، اور نہ ہی وہ میرے برخلاف جانے کی جرأت کر سکتا ہے اس کی ہر جنبش میں میرے دل کی دھڑکن اور زندگی کی تصویر پنہاں ہے، اب یہ اور بات ہے کہ لوگ اس تصویر میں اپنے خد و خال کی جھلک دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، اور اس کی حسب حیثیت پذیرائی سے آنکھیں دیدہ و دانستہ چرانے لگتے ہیں، اور پھر الٹی مجھ سے فرمائش کرتے ہیں "میں لکھتی کیوں نہیں؟" کوئی مجھے بتائیے۔ اس طرفہ ستم ظریفی کا..

میرے پاس کیا جواب ہے؟

میں لوگوں کے لئے افسانہ لکھنا چاہتی ہوں، اور افسانہ مجھے لکھنے

لکھتا ہے، تو اس میں، میں کس حد تک قصوروار ہوں؟ میں افسانے کے خلاف نہیں جا سکتی، اور افسانہ میری زندگی کے خلاف نہیں جا سکتا پھر میں کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں؟ حقیقی زندگی اور اس کے سچے ... تقاضوں کے سوا میرے پاس لکھنے کے لئے اور کچھ نہیں ہے ۔ــــ اور زندگی کی وہی اقدار اور پہلو ہیں جو میرے اپنے تجربات یا مشاہدہ میں آچکے ہیں اس کے علاوہ محض خیالی اور کاغذی گھوڑے دوڑانے کی کم از کم میں قائل نہیں، پھر آپ ہی مجھے بتائیں کہ میں کیا لکھوں اور کس طرح؟

جواب چاہتی ہوں ــــــ مگر یاد رہے کہ میں کوئی بڑی "افسانہ نگار" نہیں ہوں۔ جس کی بات قابل اعتنا ضروری ہو یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود لکھنے بیٹھوں تو میرا یہ حقیر و شکستہ سا قلم کوزہ میں سمندر سمونے کی ناکام کوشش کرنے لگتا ہے۔ اور کسی عنوان اس کا جوش سرد پڑتا نظر نہیں آتا۔ کوئی دنیاوی رکاوٹ اس کی روانی اور تندی کو روک نہیں سکتی۔ اس کے پرجوش بہاؤ کے آگے بند باندھ نہیں سکتی! یہ فطرتاً آزاد اور ہر طاقت سے غیر متاثر ہے، اور انشاء اللہ اسی طرح آزاد رہے گا! آپ ہنسیں گے کہ ایک تنکا سمندروں کے رخ کو کس طرح موڑ سکتا ہے؟ مگر ایک دن آئیگا کہ یہ حقیر سا تنکا ظلم و جبروت کے بڑے بڑے سمندروں کے دھاروں کو پاش پاش کر دے گا۔ طاغوتی قوتوں کے بہاؤ کا رُخ موڑ کر رہے گا اور تب آپ اس کی عظمت، اور خفیہ طاقتوں کو پہچان سکیں گے!

فی الحال تو یہ محض ایک ٹوٹا پھوٹا جاپانی قلم ہے، اور بس! جس کی نب بھی شکستہ ہے، اور قوت پرواز بھی محدود! کہ یہ دنیا میں مظلومیت اور سچائی کا نمائندہ اور حق و صداقت، نیکی اور ایثار کی بے پناہ قوتوں کا علمبردار قلم ہے اور جس کی قوتوں کو زنگ لگانے پر آج ہمارے معاشرہ کا ہر کس و ناکس دیرلے اور مُصر ہے۔! مگر اس پر زنگ نہیں لگے گا کبھی نہیں لگ سکے گا۔ یہ دنیا ہی نیکی، سچائی، اور خلوص کے احیاء کے لئے وجود اور حرکت میں آیا ہے۔ اور انشاء اللہ اسکی یہ حرکت اور سعی لازوال رہے گی!

باطل کا سیلاب، اور شورش چندوں کی ہنگامہ انگیزیاں اس کو کبھی بہکا نہیں سکیں گی۔ کیونکہ یہ ایک کچلی ہوئی مظلوم و مجبور عورت کا قلم ہے۔ جس کا عزم آج راسخ، اور ارادے غیر متزلزل ہیں۔ اور جو پوری دیانت اور خلوص، اور ہمت و استقلال سے کسی مقصد کو اپنانے پر تل جائے، تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے! اچھا آداب عرض!

بقیہ مضمون صفحہ ۴۵ سے آگے:-

نہ صرف یہ کہ زندہ رہا بلکہ وہ برابر ترقی اور کامرانی کی جانب بڑھتا رہا اور اب اس بات کا مجسم ثبوت بنا ہوا ہے کہ برائیوں اور خرابیوں کی اس گرم بازاری میں بھی نیکیوں اور سچائیوں کے سکے چل سکتے ہیں ضرورت صرف ایسے مردانوں کی ہے جو نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کی پروا کئے بغیر میل اور کھوٹ کے خلاف ثابت قدم رہیں۔ زندگی کے الجھے ہوئے راستوں میں سیدھی اور صاف راہ کو ہموار کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے

اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ روزنامہ دور جدید اپنی اس روش پر ثابت قدم رہے گا اور اپنے حلقہ اثر میں اسلامی اقدار کو ترویج و اشاعت کرتے ہوئے ان سینکڑوں نوجوانوں کی پشت پناہی کرے گا جو عالم اسلام میں اسلامی فکر و نظر پیدا کرنے کے لئے ایک کٹھن اور صبر آزما جدوجہد میں لگے ... ہوتے ہیں۔

مسلمانانِ برما کو پاکستان کا سلام۔

نامہ و پیام

مدیر محترم۔ سلام مسنون!

مؤقر جریدہ "مشیر" کی صحیح عظمتوں کا احساس افتخار اعظمی صاحب کے ذریعہ مجھے ہوا تھا۔ اس سے قبل جب بھوپال میں جناب عرشی سے ملاقات ہوا کرتی تھی تو یہی موضوع بحث ہوتا تھا کہ ہند و پاک میں تعمیر پسند رجحانات پر مشتمل کون سا ماہنامہ ہے جو سب سے زیادہ لکھنے کے قابل ہے۔ مختصراً یہاں یہ تحریر کر دوں کہ تقسیم سے قبل اردو کے معیاری رسالوں میں بکثرت لکھا کرتا تھا مگر تقسیم کے بعد کی ذہنی و ادبی تقسیموں سے ایسی بد دلی پیدا ہوئی کہ احتجاجاً ہر رشتۂ ادبی کو منقطع کرلیا۔ اور صرف یہ تماشہ دیکھتا رہا کہ اردو ادب کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے شکر ہے کہ عرصہ کی بحرانی فضا سے امید کی دو کرنیں پھوٹیں یعنی واضح طور پر یہ ظاہر ہونے لگا کہ اسلامی و غیر اسلامی ادب کا شعور بتدریج پیدا ہو رہا ہے میں کہ ادب میں کسی نوع کی تقسیم کا قائل ہی نہ تھا یعنی کسی بھی "چھاپ" کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود لاشعوری طور پر میرا میلان طبع تعلیماتِ قرآنی کی اشاعت پر رہا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان الہامی پیامات کو جس دور میں بھی ادب و شعر کی راہ سے پیش کیا جائے گا۔ عالم انسانیت کی فلاح ضرور اس میں مضمر ہو گی۔ صرف ضرورت اس کی ہے کہ فنکار اپنی تخلیقات میں موقع و محل اور زمانہ کی ادا شناسی کا حق ادا کرے۔ قرآن جگہ جگہ مشاہدہ اور تجربہ پر زور دیتا ہے لہٰذا آج کے تجربات و مشاہدات کو دیانتداری سے پیش کی جا سکے تو یقیناً ذہن و فکر کے نئے نئی راہیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

لیکن ستم ظریفی یہ میرے ساتھ رہی ہے کہ جن مشاہدات و تجربات کو میں پوری دیانتداری سے نظم و غزل کے جامہ میں پیش کرتا تھا انھیں مارکسی نظریہ رکھنے والے اپنے حق میں مفید سمجھ کر خوب شائع کرتے تھے۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور قدوس صہبائی۔ وغیرہ جو علی الترتیب 'نیا زمانہ' ہفتہ وار 'نیا ادب' ماہنامہ اور 'نظام' کے ایڈیٹر اور سکریٹری ترقی پسند مصنفین بمبئی ...... رہے ہیں برسوں میری نظموں کی اسپرٹ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے دیگر ترقی پسندوں نے مجھے اپنی اگلی صف کا شاعر تسلیم کرلیا۔ احمد نگر دکن کی شاخ کا میں صدر بنا دیا گیا مگر اس دوران میں جب میری نظموں سے میرے تصورِ توحید و نظام اسلامی پر روشنی پڑی تو جگہ جگہ یہ بحثیں چھڑ گئیں کہ مجھے ترقی پسند مانا بھی جائے یا نہیں بمبئی میں جب میرا قیام عمل میں آیا تو میں نے واضح طور پر اپنے نظریۂ ادب کو بیان کر دیا۔ جس کے بعد وہ سارا جوش و خروش اس تیزی سے سرد پڑا کہ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ آیا صرف اس لئے مجھے ترقی پسند نہیں مانا جا سکتا کہ میں خدا کا قائل ہوں اور دنیا میں خلافتِ راشدہ کی مثل حکومت چاہتا ہوں۔ ہر چند میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر ہماری راہیں مختلف ہو جائیں مگر آج ...... سرمایہ داری کو مٹانے کا سوال ہے تو اس کے مقابلے کے لیے جس طرح اشتراکی اپنے اصولوں سے صف بستہ ہو سکتے ہیں تو ایک اسلامی ذہن کا شاعر بھی اس لئے ان کا ساتھ دے سکتا ہے کہ اسلام نے بھی دولت کی غلط تقسیم کو مٹانے کا حکم دیا ہے۔

یہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس بحث سے قبل میرے ذہن میں بھی اس کا یہ حل نہیں تھا کہ ترقی پسند تحریک کے بالمقابل تعمیر پسند تحریک قائم کر کے اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے ادیب و شاعر ایک طرف آ جائیں بلکہ میں اس علیحدگی کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا تھا کیونکہ ڈاکٹر اقبال کی روشن مثال میرے سامنے تھی۔ جنہوں نے ہر ترقی کا ساتھ دیا مگر جماعتی بندشوں سے ہمیشہ آزاد رہے۔

لیکن جب اس کے بعد وہ بحرانی دور آیا جس میں بعض تماش بینی

کو میں نے اپنا شعار بنالیا تھا اور جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کر آیا ہوں اس کے بعد کے حالات میں خود بخود یہ ماننا ہی پڑا کہ تعمیر پسند تحریک اشد ضروری ہے۔ تب جاکر اس خیال کے نمائندہ رسالوں کا انتخاب زیر غور آیا تو "مشیر" کو میں نے ہر طرح اس معیار پر پورا پایا۔

اسی خیال و تصور پر افتخار اعظمی صاحب اور عرشی بھوپالی صاحب سے جب پوری طرح اتفاق ہوگیا تھا تو میں نے چند نظموں کی نقول.. افتخار صاحب کو دیدی تھیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتیں۔ علی گڑھ کے پتہ پر میرے نام "مشیر" جاری بھی ہوگیا مگر میں اس کے بعد بھی اس لئے خاموش رہا کہ میرے قیام علی گڑھ کا کوئی اطمینان نہیں تھا۔ اُدہر افتخار صاحب بمبئی جاچکے تھے اب جبکہ وہ واپس آگئے ہیں... اور علی گڑھ میں تعمیر پسند مصنفین کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل عمل میں آرہی ہے اور کچھ میرے یونیورسٹی میں رہنے کے اسباب بھی پیدا ہوگئے ہیں تو یہ مکتوب ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب پابندی سے "مشیر" میں لکھتا رہوں گا۔ ایک نظم ہمسلک ہٰذا ہے۔

ہاں۔ "مشیر" میں میں نے شبنم سبحانی کا مکتوب دیکھا جس میں افتخار اعظمی کی نظم "غم آرزو" کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اگرچہ وہ زبان وفن کا ایک شاہکار ہے لیکن اس میں فکری انتشار اور یاس و قنوطیت کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس میں مقصد نہیں ہے کسی نظم کے بارے میں اچھے یا برے دعوے کرنا تو آسان ہے لیکن نقاد کا تو یہ کام ہے کہ وہ اپنے دعووں کے ساتھ کچھ دلائل دے شبنم سبحانی نے فکری انتشار اور تخیلی ہم آہنگی کے فقدان کا دعویٰ کیا ہے کاش وہ اس دعوے پر اگر پوری نہ سہی تو آدھی ہی دلیل دیتے۔ مجھے تو نظم میں کوئی انتشار نہیں نظر آیا اس کے تین مربوط اجزا ہیں آخری جز سے کوئی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے

کیا آخری جز میں ظلم، بربریت اور ستم کیش سامراج کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ انسانیت کو سنوارنے اور بنانے کی تمنا اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلانے کی خواہش۔ کیا مقصد اسلام سے ہم آہنگ نہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ رسولِ کریمؐ نے "حلف الفضول" جیسے انسانی دوستانہ معاہدے میں شرکت کی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اگر یہ معاہدہ دورِ اسلام میں ہو تو میں دل و جان سے اس میں شرکت کروں گا؟ کم از کم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ "غم آرزو" کا آخری حصہ اسی اعلیٰ نقطہ پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ اس نظم میں جذبہ تخیل بھی ہے۔ شاعرانہ احساس بھی۔ اور فنکار کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کے اسلامی کردار کا انسانیت نواز پہلو بھی آخری حصہ میں ہے۔

بہہ رہی ہے چشم انساں سے ابھی تک جوئے خوں!
سینۂ گیتی نظر آتا ہے مجھکو داغ داغ
خونِ دل سے میں انہیں بخشوں گا حسنِ آب و رنگ
لالہ و گل سے ابھی محروم ہیں یہ باغ و راغ

آخری شعر کیا اسلامی اور انسانی کردار کا نمایاں پہلو نہیں پیش کرتا ہے؟ آئندہ اس نظم پر اپنے پورے تاثرات کے ساتھ ساتھ جمیل احمد فاروقی کی اس تنقید کا جواب بھی تحریر کروں گا جو معیار میں شائع ہو چکی ہے۔ اس خط میں اگرچہ صرف آپ مخاطب ہیں لیکن امید ہے کہ "مشیر" کے ذریعہ میرے ان خیالات کو قارئین کے سامنے ہم آپ پیش کریں گے۔ "مشیر" کی ترقی کے لئے دعاگو ہوں۔ اور آپ کی خیریت کا خواہاں!

والسلام ——— عمران انصاری

بقیہ مضمون صفحہ ۵۸ سے آگے:

شریف کا پیغام اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ غریب اور بے روزگار ہے۔ مگر اب اس کے لئے نجمہ کو بیاہنے میں آپ کو کوئی انکار نہ ہوگا۔ اس کے نام میں نے اپنی آدھی دولت لکھ دی ہے اور اب وہ اتنا ہی امیر ہے جتنا کہ میں ——— ارشاد کی بار جو غلطی ہوئی تھی اسے دہرانے کی بجائے میں نے سدھار لیا ہے۔ میرا کوئی بڑا بھائی موجود نہ تھا مگر... شریف کا بڑا بھائی میں موجود ہوں ———"

نجمہ کے ابا خالد کو گلے سے لپٹا کر رونے لگے۔ بہت سی اور آنکھیں بھی آبدیدہ ہوگئیں۔ اندر عورتوں نے دبی زبان سے کہا "خالد فرشتہ ہے" مگر اس فرشتے کے اندر چھپے انسان کو کسی نے نہ دیکھا جو ایک کونے میں جاکر اپنی بانہہ کو آنکھوں پر رکھے سسک رہا تھا۔ (بشکریہ "شمع" دہلی)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

NOVEMBER 1955 TELEPHONE 7923 Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" Karachi.

y Title Printed at Paragon Printers, Bunder Road, Karachi-1

کراچی
ماہنامہ
مشیر
دسمبر
سنہ ۱۹۵۵ء
مرتبہ
عبدالغفور بیگ
قیمت فی پرچہ
پاکستان
بھارت
8
ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون : ۔۔۔ ۔ ۲۲۳ ۔ ۷۹

جلد: ٦ شمارہ: ۱۲
دسمبر ۱۹۵۵ء

مرتبہ
عبد الغفور بیگ

بدلِ اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے
سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :
پندرہ روزہ الحسنات رام پور
(یو۔پی) بھارت

ترتیب

(پرنٹر و پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

ادب اور مذہب

اس دفعہ "سبد گل" کے ان دو صفحات میں حمید اللہ صاحب صدیقی کا ایک مقالہ "ادب اور مذہب" کے عنوان سے پیش قارئین ہے۔ یہ مقالہ حلقہ ادب اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی ۲۴ نومبر ۱۹۵۵ء میں پڑھا گیا تھا۔ مذہب کا تعلق انسانی زندگی سے اور زندگی کا تعلق ادب سے کب سے، کتنا اور کیوں ہے؟ اسی موضوع پر اس مقالہ میں ایک مختصر مگر سیر حاصل بحث کی گئی ہے "سبد گل" میں ادیب اور ادب کے مقتضیات ہی زیر بحث رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اس مقالہ کا موضوع بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سابقہ سلسلہ کی بقیہ کڑیوں کو انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں زیر بحث لایا جائیگا۔ (مدیر)

ادب اور مذہب۔ ان دونوں الفاظ کو ایک ساتھ دیکھ کر ممکن ہے کہ ہمارے نام نہاد ترقی پسندوں کو کچھ چڑھ سا ہو۔ کچھ غم و غصہ بھی محسوس ہو لیکن بظاہر اس کا کوئی موقع نہیں اس لئے کہ ان دونوں چیزوں کا انسان سے ہمیشہ ہی سے بڑا گہرا ربط رہا ہے اور آثار بھی کچھ ایسے ہی ہیں کہ آئندہ بھی یہ ربط اسی طرح مضبوط اور گہرا رہے گا۔ اگر ان دونوں چیزوں سے انسان کے ازلی اور ابدی تعلق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس بات کا تسلیم کرنا زیادہ بارِ خاطر نہ ہوگا کہ ان دونوں کا باہمی تعلق بھی اسی طرح ازلی اور ابدی ہے۔

سب سے پہلے انسان اور مذہب کے باہمی تعلق کو لیجئے۔ یہاں مجھے مختلف مذاہب کی حقانیت یا افادیت سے بحث نہیں ہے۔ ان باتوں پر نقطہ ہائے نظر میں کافی اختلاف ہو سکتا ہے۔ میری مراد یہاں کسی خاص مذہب سے بھی نہیں ہے بلکہ مذہب سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ کسی ایک ہستی یا شئے یا بہت سی ہستی اور اشیا کی برتری اور بالادستی کو اس انداز پر دل سے تسلیم کر دے کہ اس کے سامنے سرِ نیاز خم کرنا اس کے لئے ناگزیر ہو جائے یہی درحقیقت دنیا کے تمام مذاہب کی مشترکہ بنیاد ہے۔ معبود یا معبودات کی ہیئت و نوعیت میں فرق کرنا یا پھر ان کی بندگی کی اشکال و رسوم میں اختلاف رکھنا بعد کی باتیں ہیں۔ مذہب کا وجود یا مذہب سے تعلق محض کسی معبود کے وجود ہی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ جب انسان کسی بھی ہستی یا شئے کو قابلِ بندگی سمجھ لیتا ہے، اسے اپنی مرادوں کی تکمیل کا سرچشمہ مان لیتا ہے تو دوسرے لفظوں میں وہ اس بات کو بھی تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ اس شئے یا ہستی کا بندہ ہے اور وہ شئے یا ہستی اس کی معبود ہے۔ اس عنوان سے اگر سوچا جائے تو یہ بات کہ انسان کا مذہب سے ازل سے تعلق رہا ہے ایک تاریخی حقیقت نظر آتی ہے جس کا منھ چڑھانا تو ممکن ہے مگر جھٹلانا ممکن نہیں۔ آدم کو خواہ دنیا کا اولین انسان مانا جائے جسے ہماری آپ کی شکل و صورت کے ساتھ خدا نے اول روز ہی تخلیق کیا تھا یا ایمیبا (Amoeba) کی کوئی ترقی یافتہ شکل، بہرحال جب سے ایک انسان کے وجود کو تسلیم کیا جائے گا مذہب کے وجود کو بھی ماننا ہی پڑیگا کیوں کہ انسان نے ان ادوار میں بھی جنہیں ابتدائی (Primitive) اور وحشی (Barbarous) کہتے ہیں۔ جسے پتھر اور دھات کا زمانہ کہتے ہیں، جسے تاریکی اور جہالت کا زمانہ کہتے ہیں۔ جبکہ اسے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ و محمدؐ کے خدا کا صحیح عرفان یا تو نہیں تھا یا وہ اسے بھلا چکا تھا۔ جبکہ گوتم و رام کے بھگوان سے بھی نا آشنا تھا اس وقت بھی اس نے کسی نہ کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا تھا خواہ یہ کوئی مظہر فطرت ہی کیوں نہ رہا ہو، جمادات، نباتات اور حیوانات کا کوئی مفید یا خوفناک نمونہ ہی کیوں نہ رہا ہو، یا پھر اس کے اپنے بناتے ہوئے پتھر کے صنم ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ انسان نے بندگی کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی اور غالباً یہاں یہ کہہ دینا بیجا نہ ہوگا کہ انسان ابتدا سے لیکر اب تک ایک خدا اور خود ساختہ خداؤں کے درمیان بھولتا رہا ہے

تاریخی اعتبار سے دنیا ابتدا سے آجتک دو طرح کے معبودوں کی پرستار رہی ہے۔ ایک وہ معبود جس کے وجود کی نشاندہی اور جس کی بندگی کے آداب انبیا نے بتائے ہیں۔ دوسرے وہ معبود جس کے وجود کو انسانی ذہن دنیا میں خود دریافت کرتا رہا ہے۔ جہاں پہلے معبود میں کسی طرح کا تغیر نہیں واقع ہوسکا وہاں دوسری طرح کے معبود ہمیشہ بدلتے رہے۔ ان میں مظاہر فطرت بھی رہے، نباتات و حیوانات بھی، ان میں پتھر کے صنم بھی رہے اور اصنام خیالی بھی ممکن ہے کہ یہاں یہ بات کہی جائے کہ یہ دور پرستش جو دنیا میں ہزارہا سال سے جاری اور قائم رہا ہے اب ختم ہو رہا ہے لیکن یہ دعویٰ حقیقت کے خلاف ہوگا اس لئے کہ آج بھی دنیا کی کثیر اکثریت ایک خدا کے وجود کو تسلیم کرتی ہے اور بقیہ اقلیت بھی کسی نہ کسی شکل میں یہ تصور ضرور رکھتی ہے اور بات صرف تصور ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس تصور اور عقیدے کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے آداب بندگی بھی وابستہ ہیں جن پر آج بھی اسی طرح عمل ہوتا ہے جس طرح زمانۂ قدیم میں ہوتا تھا۔ صرف آداب بندگی مختلف مذہب کے مختلف تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس اور دیگر علوم و فنون کی ترقی اور نت نئی ایجادات کی بدولت انسان کی بڑھتی ہوئی قوت تسخیر نے انسانیت کے ایک گروہ کو اس مغالطے میں ضرور مبتلا کیا کہ انسان اب خدا کا محتاج نہیں ہے اور اس سے بے نیاز ہو کر بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ لادینیت میں پروان چڑھی ہوئی تہذیب و تمدن نے آج انسان کو ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ اپنی ایجادات اور تخلیقات سے خود لرزہ براندام ہے اور اسے یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں اس کی اپنی ہی صنعت گری اس کا کام تمام نہ کردے۔ یہ معبود اپنی تخلیق سے خود خائف ہے اور اس کا یہ خوف خود اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ معبود جو اپنے ہی بنائے ہوئے [illegible] معبود نہیں ہو سکتا۔ یہ خوف مغربی تہذیب کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو چکا ہے کہ اس کا سارا سکون و اطمینان رخصت ہو چکا ہے اور اس کے ردعمل کے طور پر خود اس تہذیب کے بطن سے وہ فکر جنم لے رہا ہے...... جو انسانیت کی نجات کی ضمانت ہی نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ پھر سے اسی خدا کے سایۂ عاطفت میں لوٹ آئے بعض ناقدین اسی فکر کو اور ردعمل کو فراریت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن انہیں یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ اگر انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ مادیت اور لادینیت کو حقیقت قرار دیں اور روحانیت اور دین کو فراریت تو دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق ہے کہ مادیت اور لادینیت کو گمراہی قرار دیں اور روحانیت اور دین کو حقیقت ٹھہرائیں۔ درحقیقت کون سا طرز عمل فراریت ہے اور کون سا [illegible] اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مقصد کہنے کا صرف یہ تھا کہ بندگی اور عبادت انسان کی فطرت کا مطالبہ ہے اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انسانوں کے کسی گروہ نے اس مطالبے کو جھٹلایا ہے اور اس کی ضرورت سے انکار کیا ہے تو وہ ایک ایسے روحانی خلا سے دوچار ہوا ہے جس نے یا تو اسے تباہ کر دیا ہے یا اس وقت تک دم نہیں لینے دیا ہے جب تک کہ اس نے اس خلا کو پھر صحیح معنوں میں پُر نہیں کر لیا ہے کیونکہ خلا بحیثیت خلا کے قائم نہیں رہ سکتا وہ تو پُر ہو کر رہے گا۔ اگر اسے غلط طریقے پر پُر کیا گیا تو یقیناً کرب اور تکلیف بے اطمینانی اور کشمکش کی کیفیت رونما ہوگی۔

اب ادب اور انسان کے تعلق کو لیجئے۔ ادب نام ہے انسان کے جذبات، احساسات، مشاہدات اور تجربات کے اس اظہار کا جس میں اس کا تخیل کارفرما ہو۔ انسان نے اس وقت بھی ادب کی تخلیق کی ہے جبکہ اس کی زبان خاموش تھی اور اس نے اپنے مشاہدات کی تشریح زمین کے فرش اور غار کی دیواروں پر آڑی ترچھی لکیریں بنا کر کی اور ہم آج اسے بھی ادب کہتے ہیں جبکہ انسان محسوسات کو تجربہ گردان کر اس کا اظہار کرتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان انسان کے ہزارہا سال کے ان تجربات میں جو وقت اور ضرورت کے پیش نظر وہ کرتا رہا ہے۔ الغرض ادب اور انسان کا تعلق بھی مذہب اور انسان کے تعلق کی طرح ازلی اور ابدی ہے۔ یعنی اسی طرح اس کا ایک بنیادی مطالبہ ہے جس کا اظہار اور جس کی تکمیل مختلف نوعیتوں سے ابتدا سے آجتک ہوتی رہی ہے۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو بنیادی مطالبات جن کا انسان سے ابتدا سے تعلق رہا ہے۔ جو انسان کی روح کی پکار رہے ہیں۔ آپس میں بھی کوئی تعلق رکھتے ہیں یا نہیں اور آیا یہ تعلق ایک سطحی اور معمولی تعلق ہے یا کوئی گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔ جس کی بدولت ان دونوں کو جدا

نہیں کیا جاسکتا اور اگر جدا کیا جائے تو ادب میں کوئی واضح خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ان دونوں چیزوں یعنی ادب اور مذہب کا تعلق انسان سے ہے۔ انسانی زندگی ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اکائی کی تشریح (Analysis) تو کی جاسکتی ہے۔ اس کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ انگلی میں اگر ایک پھانس بھی چبھتی ہے تو جسم کے سامنے حصے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ رنج و مسرت۔ آرام و تکلیف کی کوئی بھی کیفیت ہو اس کا اثر سارے جسم پر مرتب ہو کر رہتا ہے خواہ اس کا احساس ہمیں ہو یا نہ ہو۔ اور پھر فنکار یا ادیب جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں دوسروں کے ساتھ ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی اپنی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ یہ شخصیت مجموعہ ہوتی ہے اس کے نظریات و عقائد کی، اس کے افکار و خیالات کی۔ اس کے جذبات و احساسات کی۔ گویا لازمی طور پر ہر فن پارے اور ادبی نگارش میں فنکار اور ادیب کے صرف جذبات و احساسات ہوتے ہیں، تخیلات اور اسلوب ہوتا ہے بلکہ افکار و نظریات بھی ہوتے ہیں۔ اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ لکھتے وقت اپنی شخصیت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دے اور اس طرح اپنی ادبی نگارشات کو اپنے نظریات و افکار سے محفوظ رکھے وہ اگر شعوری طور پر اس کی کوشش بھی کریگا تو کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور اگر کامیاب ہوگا تو اس کا ادب ناکام رہے گا کیونکہ ادب کا تعلق انسانی دل و دماغ سے اتنا گہرا ہے کہ اس میں تصنع اور بناوٹ کی ہزار کوششوں کے باوجود انسانی ذہن کی بنیادی فکر آشکارا ہو کر رہتی ہے۔ پھر جب ادیب اور فنکار کا بحیثیت ایک انسان ہونے کے مذہب سے گہرا تعلق ہو تو یہ کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ادب اور فن کا اس کے مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر فنکار اور ادیب اپنے فن و ادب میں اپنے ان افکار و نظریات کے علاوہ جنہیں کہ وہ بہتر سمجھتا ہے۔ جن پر اس کا ایمان ہوتا ہے کوئی اور فکر کوئی اور نظریہ پیش کرتا ہے تو یقیناً وہ اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ دھوکہ کرتا ہے کیونکہ وہ انہیں ایک ایسی چیز دے رہا ہے جو اسے خود ناپسند ہے۔ جس پر اسے خود اعتماد نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو ایک شخص خود اپنے لئے مفید نہیں سمجھتا۔ قابلِ ایمان و ...... اعتماد نہیں سمجھتا وہ اسے اپنے معاشرے اور اپنے سماج کے لئے کیونکر بہتر اور قابل اعتماد سمجھ سکتا ہے۔ یہ تو فکر و عمل کا ایک کھلا ہوا تضاد ہوگا جسے رواج دینے والا ادیب و فنکار یقیناً اپنے دور کے لئے اپنی نسل کے لئے کوئی مستحسن فعل نہ کریگا کیونکہ وہ درحقیقت اسی تضاد سے اپنے قاری کو بھی دوچار کریگا ادیب بھی معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح سوسائٹی سے اگر ایک طرف بہت سے حقوق و مراعات حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہوتے ہیں جن سے چشم پوشی کرنا یا عہدہ برآ ہونا اس کے لئے ایک خیانت ہے۔ جس طرح وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی لکھی اور کہی ہوئی باتوں کو زیادہ سے زیادہ افراد پڑھیں، سنیں اور پسند کریں اسی طرح اس کے قاری اور سامع کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اسے اپنی غلط باتوں سے گمراہ نہ کرے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر مذہب کا تعلق ادب سے کیوں ضروری ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ مذہب ہمارے انفرادی اور اجتماعی اخلاق، نظریات، افکار، ہمارے باہمی تعلقات اور برتاؤ ہر چیز کی اصلاح کرتا ہے اور اسے متعین کرتا ہے۔ ادب کا مطالعہ بھی ناگزیر طور پر ہمارے اخلاق، افکار، نظریات اور عادات و اطوار کو متاثر کرتا ہے۔ ہم ایک ناول میں دیکھتے ہیں کہ ایک خاص حالت میں ایک کردار اس طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کردار اور اس کے اس عمل کو فنکار کی فنکارانہ ہمدردی (Artistic Sympathy) بھی حاصل ہے۔ تو عین ممکن ہے کہ فنکار کے ذہن اور اس کی پیش کش سے ہم اس قدر متاثر ہوں کہ ان حالات میں اسی طرح عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس طرح کے اثرات سے ہم محفوظ رہ سکیں۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم ذہن اور دماغ کو دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کر دیں اور ایک خانے میں مذہبی اثرات جمع کریں اور دوسرے میں ادبی۔ یہ اس وقت تو بالکل ہی ناممکن ہے جب ہم کسی مانے ہوئے عظیم ادیب کی نگارشات کو استفادے اور اصلاح کے جذبے سے پڑھتے ہیں اور یہ اس وقت بھی ناممکن ہے جبکہ ہم محض تفریح خاطر یا تسکین ذوق کی خاطر کوئی دیوان یا کوئی ناول اٹھا لیتے ہیں کیونکہ ادیب خود اپنے شعوری ارادوں کے باوجود اس طرح کی خود کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ وہ جب بھی متاثر کریگا مجموعی طور پر کرے گا۔ بحیثیت انسانوں کے کریگا خواہ ہم اس پر آمادہ ہوں یا نہ ہوں مثلاً یہ دیکھئے کہ جو چیز بھی ہم کھاتے ہیں وہ زبان کے چٹخارے اور کام و دہن کے تلذذ

(باقی صفحہ ۴۶ پر دیکھئے)

میمورنڈم

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی ہدایت کے مطابق مرکزی جمعیۃ کے ایک وفد نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نائب صدر کی زیر قیادت ممبرانِ دستوریہ پاکستان اور مرکزی وزراء کی خدمت میں جو میمورنڈم پیش کیا اُس کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

جناب محترم! السلام علیکم

قیام پاکستان کی جد و جہد کے سلسلے میں جمعیۃ علماء اسلام نے جو نمایاں حصہ لیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو میدانِ عمل میں تھے پوری طرح واقف ہیں کہ کن حالات میں ایک نازک ترین دور میں جبکہ مذہبی احساس رکھنے والے مسلمانوں کو ایک قومی نظریہ اور اکھنڈ بھارت کے دام میں لانے کے لئے ہندو کانگریس کی پروپیگنڈا مشینری پوری شدت کے ساتھ مصروف کار تھی۔ جمعیۃ علماء اسلام ہی وہ جماعت تھی جس نے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں علماء کو ایک پلیٹ فارم پر منظم کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کی جد و جہد میں جو وہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسے قومی وطن کے حصول کے لئے کر رہی تھی جس کی تشکیل و تعمیر وہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کے مطابق کر سکیں اور جہاں بلا کسی مزاحمت کے اسلام کے قوانین کی حکمرانی قائم ہو سکے۔ اس سلسلہ میں قائد اعظم قائد ملت شیخ الاسلام اور دیگر صف اول کے رہنماؤں کے واضح و مبہم اعلانات اور وعدوں ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلم عوام پورے جوش و خروش کے ساتھ تحریک پاکستان میں شریک ہوئے اور اس عزیز نصب العین کے حصول کے لئے ہر قسم کی تکلیفوں اور قربانیوں پر آمادہ ہوئے۔ جمعیۃ علماء اسلام نے غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں پشاور سے مدراس تک اور کراچی سے چاٹگام تک جگہ جگہ دورے، کانفرنسیں اور پبلک جلسے کر کے عوام کی رائے کو منظم کیا اور انہیں ایک قومی نظریہ اور متحدہ ہندوستان کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کی زد سے نکالا ۱۹۴۵ - ۴۶ء کے معرکہ آرا انتخابات اور اس کے بعد صوبہ سرحد اور آسام میں پاکستان کے لئے استصواب رائے عامہ میں جمعیۃ نے جو مؤثر حصہ لیا ہے وہ ابھی تک لوگوں کے ذہن میں ہے۔

انتہائی افسوس و ندامت کی بات ہے کہ اپنے قسم کی باہمی جنگ اقتدار، آپس کی منافست اور قائدین کے تذبذب اور مقصد سے وابستگی کے فقدان کے باعث آٹھ سال سے زائد ہو چکے مگر اب تک یہ ملک دستور سے محروم رہا اور اب جبکہ بہت سے نشیب و فراز کے بعد دستور سازی کا کام — از سر نو شروع ہونے والا ہے تو طرح طرح کی تشویشناک خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ سابقہ دستوریہ نے جو مسودہ تیار کیا تھا اسلامی اور جمہوری نقطہ نظر سے اس کی خامیوں کو دور کرنا اور خلا کو پر کرنا تو درکنار موجودہ دستوریہ کا رجحان یہ ہے کہ پہلے کی پاس شدہ ان دفعات کو بھی یا ان میں سے بعض کو حذف کر دیا جائے جو اسلام یا جمہوری اصول کی تائید میں ہیں۔ یہاں تک افواہیں ہیں کہ مملکت کا طے شدہ نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں سے لفظ "اسلامیہ" خارج کیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں اتنا ہی نہیں بلکہ کانگریسی ہندو ممبروں کو خوش کرنے اور انہیں مخلوط انتخاب دینے کے لئے اس دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہنے کے عزائم ہیں جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا ——

ان حالات میں جمعیۃ علماء اسلام اپنا فریضہ سمجھتی ہے کہ وہ ارکانِ دستوریہ پر خصوصاً ان شخصیتوں سے جو دستور سازی میں مؤثر کردار کی حیثیت رکھتے ہیں یہ واضح کر دے بلکہ انہیں متنبہ کرے کہ وہ اس عہد و پیمان سے انحراف

کرنے کی کوشش نہ کریں جو قوم سے اور اللہ تعالیٰ سے کئے جا چکے ہیں اور ایسا دستور بنانے سے نہ شرمائیں جو پوری طرح اسلامی تعلیمات و روایات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ کسی طرح دانشمندانہ فعل نہ ہوگا کہ غیروں کو خوش کرنے کے لئے انہیں اپنی قوم کے حوصلوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی جائے خصوصاً جبکہ معاملہ اس نظامِ فکر کا ہو جو قیام پاکستان کا باعث ہوا اور جس کے بغیر پاکستان کی بقا محال نظر آتی ہے نہ یہ کوئی حب الوطنی کا کام ہوگا کہ ایسے مٹھی بھر آدمیوں کو خوش کرنے کے لئے جن کے قلوب بھارت، روس، انگلستان یا امریکہ سے وابستہ ہیں ملک کے عوام کے ایسے مطالبات و جذبات کو ٹھکرا دیا جائے جن کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

اندریں حال جمعیۃ علماء اسلام پوری شدت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہمارا دستور قرار داد مقاصد کے (جسے حسب سابق بطور تمہید دستور میں درج کیا جانا چاہیئے) مقتضیات کے عین مطابق مرتب کیا جائے۔ اس میں سابقہ دستوریہ کی منظور کردہ دفعات نمبر ۲ و ۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۱ و ۱۲ (جہاں تک مملکت کے نام کا تعلق ہے) و نمبر ۱۵ (جہاں تک صدر مملکت کے مذہب کا تعلق ہے) ۲۲ و ۲۶ و ۳۴ و ۴۳ و ۹۳ و ۹۸ و ۱۲۷ (ضمیمہ نمبر ۱) کو لازماً شامل کیا جائے اور اجتماع علماء منعقدہ کراچی ۵۳ء کی متفقہ تجاویز و سفارشات (ضمیمہ نمبر ۲) کی روشنی میں دیگر اسلامی اور جمہوری دفعات شامل کی جائیں۔ خصوصاً حسب ذیل امور کا التزام ضرور کیا جائے۔

(۱) قانون سازی کے لئے قرآن و سنت کو ماخذ اصل قرار دیا جائے

(۲) سابقہ دستوریہ کی منظور کردہ دفعہ ۴ کے تحت فقرہ شرطیہ درج کیا جائے جس کا مفہوم یہ ہو کہ مالی مسائل پر دفعہ ۴ کا اطلاق اس وقت ہوگا جب وفاقی اسمبلی اس باب میں قرارداد کے ذریعے طے کرے اور وہ قرارداد ایک ایسے کمیشن کی سفارت کے مطابق ہو جو ماہرین علوم اسلامیہ اور ماہرین علوم مالیہ و اقتصادیہ پر مشتمل ہو اور جس کا تقرر منظوری دستور سے چھ ماہ کے اندر اندر کر دیا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دو سال کی مدت میں ان ابتدائی اور تدریجی منازل کی بابت اپنی مکمل سفارشات پیش کرے جو موجودہ مالی اقتصادی نظام کو بدل کر اسلامی احکام و مقتضیات کے مطابق مالی نظام رائج کرنے کے لئے درکار ہوں۔

وفاقی اسمبلی نیز واحدہ جاتی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ایسے کمیشن کے کنٹرول اور مکمل اختیار میں ہونا چاہئے جو وفاقی عدالت عالیہ یا متعلقہ واحدہ جاتی ہائیکورٹ کے مستقل ججوں پر مشتمل ہو اور ان کو انتخابات سے متعلق تمام مکمل اختیارات حاصل ہوں اور کوئی ایسا قانون وضع نہ کیا جاسکے جو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میں مزاحم ہو سکے۔

(۴) ہر شہری بلا لحاظ اس کے کہ سوسائٹی میں اس کا کیا مقام ہے قانون کی نظر میں مساوی ہوگا اور کسی فرد کو قانون کے عمومی ضوابط سے مستثنیٰ اور کسی قسم کے خصوصی مراعات کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔

(۵) کوئی ایسا قانون نہیں وضع کیا جائے گا نہ برقرار رہ سکے گا جس کے ذریعہ حبس امتناعی یا عام ملکی عدالتوں کے سامنے باضابطہ مقدمے کے بغیر کسی شہری کے لئے کسی اور سزا کا جواز پیدا ہو الا یہ کہ جنگ کے دوران میں کسی ایسے شہری کو جس پر دشمن ملک سے سازش کا الزام ہو زیر حراست رکھا جاسکتا ہو مگر اسے بھی زیادہ سے زیادہ تیس دن کے اندر کسی ہائیکورٹ کے جج کے سامنے بغرض مقدمہ (بشرط ضرورت خفیہ اجلاس میں) معہ تمام شواہد کے پیش کرنا اور اسے اپنی صفائی کا پورا موقع دینا لازمی ہوگا

(۶) پاکستان کے مسلمانوں نیز ہر غیر مسلم جماعت کو جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اپنے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

(۷) اگر پارلیمانی عاملہ رکھی جائے تو کسی ایسے شخص کو کابینہ بنانے کا یا کابینہ میں شامل کئے جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے جو وفاقی اسمبلی یا واحدہ جاتی اسمبلی کا جیسی بھی صورت ہو، منتخب شدہ رکن نہیں ہے۔

(۸) اگر صدارتی عاملہ ہو تو صدر مملکت کا عام حق رائے دہی بالغاں کے ذریعہ منتخب ہونا چاہیئے اور اس کے انتخاب کے لئے دوگونہ اکثریت لازمی ہونی چاہیئے یعنی عام رائے دہندگان کی اکثریت اور مسلم رائے دہندگان کی اکثریت۔

(۹) پارلیمانی عاملہ کی صورت میں بھی صدر مملکت کا انتخاب حلقہ وفاقی ایوان کے ارکان سے بہت زیادہ وسیع ہونا چاہیئے اور اس انتخاب میں بھی دوہری اکثریت کی شرط لازمی ہونی چاہیئے۔

(۱۰) عدلیہ کے مکمل استقلال اور علیحدگی کی ضمانت ہونی چاہیئے

اور کوئی ایسی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے جس کے ذریعہ عاملہ عدلیہ کو متاثر کر سکے۔

توقع ہے کہ آپ اس اہم ترین مسئلہ میں ذاتی طور پر خصوصی دلچسپی لیں گے اور اپنے رفقاء کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے کہ سابقہ دستور سے جو اسلام اور جمہوری اصولوں کے حق میں جو دفعات منظور کی ہیں ان میں کوئی کمی ہرگز نہ ہو اور ہمارا دستور پاکستان کے عامۃ المسلمین کی آرزوں کے مطابق مرتب ہو جو ایسا دستور نہ بنے پائے جو ان لاکھوں شہیدوں کی روح کے ساتھ غداری کے مترادف ہو جن کی بیش قیمت جانیں اس لئے قربان ہوئیں کہ ایک ایسی مملکت کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے جو حقیقی معنوں میں اسلام کے گہوارہ کی حیثیت سے پھلے پھولے اور ترقی کرے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو اس امر کی بصیرت و جرأت دے کہ آپ بے لوثی اور بے خوفی کے ساتھ اسلام اور ملت اسلامیہ کے اس عظیم مقصد کی حمایت کر سکیں۔

(آپ کے دینی بھائی)

نعیم صدیقی

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز

عاصمہ کا شوہر شہانہ پاکستان کے ایک بہت بڑے فولادی کارخانے میں معمولی مزدور تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم مشین کے دندانہ دار پہیئے کے جبڑوں میں آکر بالکل قیمہ ہوگیا۔ عالم انسانی کے سامنے ایک نئے نظام عدل و اخوت کو پیش کرنے والی عظیم ریاست وملت کی خدمت کرتے کرتے جام شہادت نوش کئے اسے پورے پندرہ برس ہو چکے تھے۔

یہ ٹریکٹر بنانے کا ایک بھاری کارخانہ تھا۔ میلوں رقبہ اس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ فولاد کے بڑے بڑے ہولناک پیکر آگ، بھاپ اور بجلی کے مسخر شدہ دیووں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح دن رات حرکت کر رہے تھے۔ کارخانہ کیا تھا۔ اپنی جگہ ایک کائنات تھا۔ نظم، قانون اور ترتیب رکھنے والی کائنات۔ جس کے اعصاب کو لرزا دینے والے شور میں آہنی وجودوں کا ایک ایک ایٹم اپنے اخلاق کی تسبیح کہتا سنائی دیتا تھا۔ جس نے ان وجودوں کو "بأس شدید" سے آراستہ کیا تھا۔

یہ کارخانہ سرمائے کی ترکیب کے لحاظ سے پیچیدہ ساخت رکھتا تھا اس کی جب داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ تو دس کروڑ کا منصوبہ سامنے تھا۔ یہ نوخیز اور غریب مملکت جسے دوسرے بیشمار منصوبوں کے لئے سرمائے کی وسیع مقداروں کی ضرورت درپیش تھی۔ اس کے اندر سے اتنی بڑی مقدار سرمایہ کا نکل آنا ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ باہر کی بڑی بڑی قوموں نے نہایت دوررس مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے سرمایہ کی پیش کش کی لیکن اسلامی مملکت کی زیرک قیادت نے اپنی قومی معیشت کی رگوں میں غیر ملکی مستعار خون کا دوڑایا جانا پسند نہ کیا۔ حکومت نے پیش نظر کام کے لئے ایک فرم کی تشکیل کی۔ اور اپنی طرف سے ۲ کروڑ روپیہ بنیادی سرمائے کے طور پر دس سال کے لئے پیش کر دیا۔ کہ اس مدت میں آہستہ آہستہ یہ سرمایہ واپس لے لیا جائے گا اور اس کی جگہ عوامی سرمایہ کو لیا جائے گا۔ ۴ کروڑ کا سرمایہ ایک ہزار روپے کی حصص کی صورت میں فرم میں شریک ہو کر چند بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے ڈالا گیا۔ بقیہ چار کروڑ روپے کے لئے دس دس روپے کے حصص مقرر کر کے عوام کے سامنے اپیل کی گئی۔ کہ وہ تعمیر کی ایک اہم ضرورت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور اس کاروبار کے متوقع منافع میں حصہ دار بنیں۔ لوگوں میں چونکہ اپنے ملی نظریہ حیات سے زندگی کی ایک نئی رو دوڑا رکھی تھی۔ اور ایک عمومی جذبہ بیدار کارنامی جو نت نئے شعبے دکھا رہا تھا اس لئے اس اپیل کو لیکر جب قیادت پریس، سیاسی پارٹیاں اور مذہبی اور سوشل ادارے متحرک ہو گئے۔ تو عورتوں نے زیور بیچ بیچ کر، بچوں نے جیب خرچ بچا بچا کر، اور عام لوگوں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے حصص خریدے۔ تین چار ماہ میں ایک غریب قوم نے پوری مطلوبہ رقم فرم کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دی۔ وہ محض کاروباری نفع کا محرک نہیں تھا وہ ایک ولولہ تعمیر و ترقی تھا جسے قوم کے محبوب نصب العین نے چند سال میں ابھار کر ایک طوفانی طاقت بنا دیا تھا۔ یہی قوم تھی۔ کہ جب تک اس کا شرار حیات بجھا پڑا رہا اپنا روپیہ عیاشی اور تفریح میں تو جھونک دیتی رہی لیکن اس کی جیب سے نہ تو سوشل سروس کے اداروں کو چلانے کے لئے اور نہ تعمیر و ترقی کے بڑے بڑے کاموں کو جاری کرنے کے لئے روپیہ نکل سکتا تھا۔ لیکن اب وہ شرار حیات از سر نو چمک اٹھا تھا۔ یہی اس قوم کا اصل سرمایہ تھا۔ اور اب یہ سرمایہ کاروبار تعمیر و ترقی میں لگ رہا تھا۔

دس کروڑ روپے کے اس بھاری بھرکم کارخانے میں سرمایہ محبت و تعاون کی ایک نئی فضا میں ہم آہنگ ہو کر کام کرنے کے لئے میدان میں اترے۔ اہل سرمایہ کا ذہن یہ تھا۔ کہ ان کی دولت خدا کی طرف سے ایک امانت ہے۔ جس کا ہر ہر حبہ اس کے بندوں کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر خدمت میں مصروف ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ذریعے ملت کو اپنے جہانی نصب العین کی طرف پیشقدمی کرنے میں ہم

سہولت بہم پہونچنی چاہیے۔ محنت کا طریقہ وضع [illegible] کہ ان کے رگ پٹھوں اور ان کے اعضاء و جوارح کی قوتوں کی بہ رمق اس نظام خیر و برکت کے تحفظ اور ارتقاء میں کھپ جانی چاہیے۔ جس کے سامنے [illegible] دس کروڑ افراد سکھ چین کی سانس [illegible] تھے۔ اور جن کے مٹھی [illegible] انسانیت [illegible] بھولی [illegible] پڑ [illegible] تھے [illegible] مقاصد کا کھلا میدان سامنے موجود [illegible] کا خون [illegible] ڈالے [illegible] تھے۔ اور [illegible] محنت [illegible] ہماری [illegible] کے [illegible] کام کرتے چلے گئے [illegible] مقصد کے سپاہی تھے۔ ساری قوم سپاہیوں کی قوم تھی [illegible] کے خلاف لڑ رہے تھے [illegible] سپاہی [illegible] خود غرضی اور نفس پرستی سے جنگ آزما تھے [illegible] سپاہی [illegible] لڑ رہے تھے [illegible] سپاہی جو معصیت کے [illegible] تنگ [illegible] افلاس اور فاقہ کے خلاف معرکہ آرا تھے [illegible] سپاہی [illegible] عازم تھے جہول نے ملک کے ایک ایک کارخانے [illegible] اسرار طبیعت [illegible] کی مختلف طاقتوں کو [illegible] ان کے اندر جو فرق و اختلاف بھی تھے۔ وہ تقسیم کار [illegible] زندگی کے [illegible] تھے۔ ان کی محنت [illegible] کوئی پہلو رکھنے والی ایک لمبی جد و جہد [illegible] زندگی [illegible] ماحول میں ایک خاکروب تک جھاڑو دیتے ہوئے یہ احساس رکھتا تھا۔ کہ وہ اپنے [illegible] بھائیوں کی زندگی و صحت کو بچانے کے لئے [illegible] اللہ کی راہ میں جہاد لڑ رہا ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کو [illegible] اور لوری دیتے ہوئے اور اسے نہلاتے دھلاتے ہوئے اس شعور میں سرمست نظر آتی تھی۔ کہ وہ عالمگیر پیمانے پر بدی اور ظلم کے خلاف معرکہ آرا ہونے والے ایک جانباز کو پال پوس رہی ہے۔ اور وہ اپنی آغوش تربیت کے سانچے میں نظام حق کا ایک مکمل پرزہ ڈھال رہی ہے۔ ایک [illegible] جذبہ میں سرشار رہتا تھا کہ وہ کرہ ارض پر ایک جنت تعمیر کرنے میں [illegible] سکوں کی [illegible] پہلی اینٹیں لگا کر حصہ لے رہا ہے۔ اسی طرح ایک کسان اپنے ہل سے زمین کا سینہ چیرتے ہوئے، اور ایک مزدور مشین کا پہیہ گھماتے ہوئے اور ایک کلرک قلم کی گھس گھس میں مصروف یہ تصور ذہن میں رکھتا تھا۔ کہ میں اپنے مقصد

کے دس کروڑ ساتھیوں کے پیٹ بھرنے، ان کے تن ڈھانکنے، اور ان کو آرام پہونچانے، ان کو مضبوط اور قوی بنانے کی مہم کا علمبردار ہوں۔ ہر شخص زندگی کا فرض اس طرح انجام دے رہا ہے۔ جیسے کہ وہ زمین آسمان کے کارپرداز کی ایک بڑی اجتماعی عبادت انجام دے رہا ہے۔

کارخانے میں داخل ہوتے ہی خدا پرستانہ فضا دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ جگہ جگہ قرآن کی خاص خاص آیات جلی حروف میں لکھ کر آویزاں کر دی گئی ہیں "پاک ہے وہ ہستی جس نے سب کچھ مسخر کر کے ہماری خدمت میں لگا دیا" "زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے" "زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے ہی لئے پیدا کیا ہے" "ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی بھاری طاقت ہے"

کارخانے میں داخل ہونے سے پہلے ہر شفٹ کے مزدور ایک ہال میں چند منٹ کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے سامنے قرآن کا کوئی حصہ ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ان کو ترغیب یہ دی گئی ہے کہ مشین پر جا کر کام کا آغاز خدا کے نام کے ساتھ کریں۔ اس کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کریں اور "سبحٰن الذی سخرلنا ہذا" پڑھ کر قدرت کے عطیات سے خدمت لیں۔ یہ فضا اس لئے بنائی گئی تھی۔ کہ انسان میں اندھا کر دینے والا وہ نشہ قوت نہ پیدا ہونے پائے جس میں سرشار ہونے والی قوموں نے قدرت کے عطیات کو خود انسانیت کی تباہی و بربادی اور کمزوروں پر ظلم توڑنے میں استعمال کیا۔ اس لئے۔ کہ سائنس اور مشین کی طاقت کا طومار آدمی کو خدا سے دور نہ لے جا سکے۔ اس لئے۔ کہ مادیت کا ماحول انسانی خودی کی روحانیت کو کچل نہ ڈالے۔ اس لئے۔ کہ انسان لوہے اور بھاپ اور بجلی کے طوفان میں نہ ڈوب جائے۔

سب سے بڑھکر یہ کہ کارخانوں کے وسط میں اونچے سفید میناروں والی لمبی چوڑی مسجد جلوہ آرا تھی۔ جس میں مقررہ اوقات پر اذان ہوتی تھی۔ تمام کا تمام کارخانہ ساکت ہو جاتا تھا، اور رزم کے بڑے سے بڑے کارپرداز، منیجر، محاسب، کلرک، مزدور، چوکیدار، خاکروب سب کے سب آسمانی آقا کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے لپکتے، اور محمود و ایاز ایک ہی صفوں میں آکھڑے ہو جاتے۔ یہ نمازیں جان رسمیت نہ تھی بلکہ وہ اس سے ایک نئی قوت، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا طوفانی عزم

رے کے پلٹتے تھے۔

اس کارخانے میں اگرچہ سرمایہ لگانے والے حصہ داروں، کام چلانے والے اونچے عہدیداروں اور عام مزدوروں میں کوئی مصنوعی جبری مساوات کارفرما نہ تھی۔ لیکن یہاں ہر مزدور کو سات گھنٹے کے کام پر باعزت زندگی گذارنے کے لئے جسم و روح کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے والی روزی ملتی تھی۔ رہنے کے لئے صاف ستھرے ہوادار کوارٹر قطار در قطار بنائے گئے تھے۔ کارخانہ کی طرف سے لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ ثانوی درجہ تک مدارس تھے۔ ایک اعلیٰ درجہ کا ماتی شفاخانہ تھا۔ جو جدید آلات و وسائل سے مسلح تھے۔ لائبریری تھی۔ متعدد ریڈنگ روم تھے۔ جہاں اخبارات و جرائد فراہم کئے جاتے تھے۔ چار ریڈیو گھر تھے۔ جہاں سامعین کی کافی تعداد بیٹھکر بیک وقت پروگرام سے استفادہ کر سکتی تھی۔ مزدوروں اور ان کی بیویوں کے لئے تعلیم بالغاں کے شبینہ مدارس موجود تھے۔ مردوں اور عورتوں کے دو الگ الگ کلب موجود تھے۔ لکچر ہال تھا جس میں تعلیمی و اخلاقی فلم بھی دکھائے جاتے تھے۔ تفریح گاہیں، پارک اور نہانے کے تالاب موجود تھے۔ کھیل کے کئی میدان اور ضروری سامان موجود تھا۔ مزدوروں کو شہر لے جانے کے لئے کارخانہ کی دو بسیں صبح و شام آتی جاتی رہتی تھیں۔ یہ سارے انتظامات کارخانہ کی طرف سے بالکل مفت بہم پہنچائے گئے تھے۔ بازار تھا۔ جس کی ساری دکانیں "نظامِ اخوت" کے تحت مزدور خود ہی چلاتے تھے۔

اس عظیم کارخانے میں شہباز ایک معمولی مزدور بھرتی ہوا تھا۔ ترقی کرتے کرتے وہ اعلیٰ قسم کی فنی محنت سرانجام دینے لگا۔ شہباز ہمیشہ ٹھیک وقت پر ڈیوٹی پر آموجود ہوتا۔ اس سلسلے میں اس کی شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ ایک منٹ کی تاخیر کو ملت بلکہ انسانیت کے حق میں خیانت سمجھتا تھا۔ اسے اپنی مشینوں سے محبت تھی۔ جیسے وہ زندہ وجود ہوں جیسے وہ انسان ہوں جیسے وہ اس سے باتیں کرتی ہوں۔ دکھ درد کہتی اور دکھ درد سنتی ہوں، روتی اور ہنستی ہوں جیسے ان کے اندر دل دھڑک رہے ہوں جیسے ان کے اندر دماغ سوچ رہے ہو۔ جیسے وہ اس کی متاعِ حیات ہوں۔ دیو پیکر پہیے جب اپنی چال پکڑ لیتے۔ تو شہباز کی رگ رگ میں جیسے طمانیت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ اسے لوہے کی پرزوں کی کھٹا کھٹ میں بہترین نغمے سنائی دیتے۔ اپنے کارخانے کی کلوں کے ساتھ اس کی ساری روح متحرک ہو جاتی۔ اسی متحرک روح کے زیر اثر وہ اوور ٹائم لگاتا۔ اور اپنے فنی دین زائد کام کئے چلا جاتا۔ لیکن اس نے کبھی اوور ٹائم کی اجرت خود وصول نہیں کی بلکہ یہ ساری رقم "اخوت فنڈ" میں جمع ہو جاتی جس میں شہباز جیسے اور کتنے ہی مجسمہ ہائے ایثار کا خون پسینہ مجموعی بہبود کے لئے اسی طرح جاجا کر سمٹ رہا تھا۔

یہ کارخانہ کسی خیالی دنیا کا کارخانہ نہیں تھا۔ یہ کسی افسانوی ماحول کا خواب نہیں تھا۔ ایک امر واقعہ تھا۔ انسانوں کی ایک کوشش و کاوش تھی۔ انسان جو اختلاف رکھتے ہیں۔ انسان جن میں گوناگوں، اختلاف ہیں۔ انسان جن کے تعلقات میں مد و جزر واقع ہوتے رہتے ہیں کبھی کبھار ناگواریاں بھی پیدا ہوتیں۔ کبھار بھی واقع ہو جاتے کشمکش بھی واقع ہونے لگتی کبھی مختلف مدارج کے مزدوروں کے درمیان کبھی منتظمین اور کارکنوں کے درمیان، کبھی بڑے سرمائے والوں اور چھوٹے سرمائے والوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جاتی —— اور زندگی کی ساری ہماہمی تو ہے ہی اسی مد و جزر سے۔ اس قسم کی نزاعات کے لئے پنچایت موجود تھی جس میں ہر عنصر کی نمائندگی تھی۔ اور اس کے اوپر اسی ترکیب کا مشترک انتظامی بورڈ تھا۔ تمام قواعد و ضابطے، اجرتیں اور حقوق چھٹیاں اور وفاتِ کارگردگی، سوشل خدمات اور منافع کی تقسیم، سارے امور اسی بورڈ کے اجلاس میں، اہلِ سرمایہ، انتظامی عملے اور مزدوروں کے نمائندوں کی باہمی افہام و تفہیم "مسلمان کارخانہ جات" کی حدود کے اندر طے پاتے یہ گویا اس صنعتی خاندان کے بڑوں کی مجلس اور اس کا نظام بھی قرآن کی شورائیت پر مبنی تھا۔

ایک دن شہباز اپنے مہیب آہنی سازوں کے نغمے کی لے میں مست دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ایک ساتھی کی مشین کو بھی کنٹرول کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔ وہ پارے کی سی بے تابی کے ساتھ کبھی ادھر لپکتا اور کبھی اُدھر یکایک اس کے کوٹ کا دامن بیس فٹ کے قطر کے ایک دندانے دار پہیے میں الجھا اور آناً فاناً شہباز مشین کی لپیٹ میں آگیا۔ خطرے کا خودکار الارم بجا مختلف گھنٹیاں گونجنے لگیں۔ اور چلتی کلیں اس شہید فرض کا ماتم کرنے

لئے ساکت و صامت ہو گئیں۔ منیجر، کارخانے کے بڑے بڑے عہدہ داروں کی رہائش کارخانے کے متصل ہی تھی۔ دفتری کارکن اور طبی عملہ سب لپک کر پہنچے، مگر ان کا ایک محبوب بھائی زندگی و موت کی سرحد کو پار کر چکا تھا اور اس شان سے پار کر گیا تھا کہ اب اس کے جسم کا ہیولیٰ تک باقی نہ تھا۔ اس کا جسم انسانی ہڈیوں کے ذرے اور اس کے خون کے قطرے کہیں سے کہیں تک پھیل گئے تھے۔ تمام دن بھر کے لئے بند ہو گیا [illegible] اخبارات نے آناً فاناً ضمیمے شائع کئے اور شہباز کی موت کو ایسی اہمیت دی جیسے ملک کی کوئی نامور ہستی گزر گئی ہو۔ عاصمہ اور اس کے ہفت سالہ بچے جلال صادق پر حادثہ [illegible] کی خبر کا ایک بھاری پہاڑ ٹوٹ پڑا اور کہانی سے گرا دیا۔ ان دونوں کو موقع پر جانے سے [illegible] منظر دیکھنے سے بچا لیا گیا کیونکہ وہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ کارخانے کے مزدور اس طرح آکر [illegible] جمع ہو رہے تھے اور خود منیجر اس طرح تڑپ رہا تھا جیسے ان سب کا ان کے سینے [illegible] کا سنگا ہو گیا تھا۔

اس شہید وطن کے گوشت کے ذرے [illegible] کے کپڑوں کے چیتھڑے ٹکڑے ہاتھ آسکے جمع کئے گئے۔ [illegible] خاک میں بھی پتی گئی اور شہباز کے جسم کی اس یادگار کو [illegible] میں لایا گیا۔ یکایک چھوٹی چھوٹی بدلیوں سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی [illegible] آسمان دکھ درد میں شریک ہو رہا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد بڑے پارک میں جنازہ کی نماز ادا ہوئی۔ اس وقت مغربی افق پر بادلوں کے سرخ سرخ ٹکڑے پھیلے ہوئے اس طرح معلوم ہو رہے تھے جیسے سورج کا کلیجہ کٹا رکھا ہو۔ اس نماز میں ضلع کا ڈپٹی کمشنر، عدالتوں کے جج اور وکلا، یونیورسٹی کے [illegible] طلبا، بڑے بڑے تاجر اور صحافی شریک تھے [illegible] برادری تھی۔ مقصدی برادری! آج اس برادری کا ایک قیمتی بازو کٹ گیا تھا۔

عاصمہ سے اس کا شوہر چھن گیا تھا۔ اور اس زخم کو مندمل کرنے والا کوئی مرہم موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کی ٹیسوں کو کم کرنے کے لئے سچی انسانی ہمدردی اگر کارگر ہو سکتی تھی۔ تو اس کی کمی نہ تھی۔ پورا ماحول اس دکھ درد میں شریک تھا۔ اس کے آنسوؤں میں پورے ملک کے آنسو جھلک رہے تھے۔ یوں عاصمہ بھی آخر شہباز کی بیوی تھی۔ اور اسی قوم کی ایک بیدار دل بیٹی تھی۔ جس کے بچے بچے کے سینے میں فولادی قلب و جگر کام کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے ضرور غم کی گھٹائیں برستی رہیں لیکن کیا مجال جو اس نے ایک بے جا کلمہ بھی اپنی زبان سے نکالا ہو۔ اور سنجیدگی و وقار کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ اس نے مسلمانوں کے سے صبر کا نمونہ پیش کیا۔ باقی اسے اپنے اور اپنے بچے کے معاشی مستقبل کی طرف سے ذرہ برابر بھی فکر نہ تھی۔ وہ شعور رکھتی تھی۔ کہ ایک قوم کی قوم اور ایک حکومت کی حکومت میری پشت پر موجود ہے، وہ آگاہ بھی کہ اوپر سرکاری خزانہ اور اس کے نیچے کارخانے کا "اخوت فنڈ" اپنا سایۂ شفقت پھیلائے تھا جس کے نیچے بیواؤں اور یتیموں کے لئے عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کا پورا پورا انتظام موجود ہے۔ اس "اخوت فنڈ" کو بنانے میں مزدور خود بھی حصہ لیتے تھے۔ کارخانہ بھی مقررہ تناسب سے منافع کی ایک بڑی رقم اس میں ڈالتا تھا۔ اور پھر اوپر سے حکومت خود اس کارخانے کی زکوٰۃ کی ایک بھاری مقدار اس میں شامل کرتی تھی۔ اس فنڈ میں مزدوروں کو قرض بھی دیے جاتے تھے۔ بیماری، زچگی اور مختلف تقاریب اور حوادث کے پیش آجانے پر اس میں سے مقررہ اعانتیں بھی دی جاتی تھیں..... علاوہ بریں اس فنڈ میں سے مزدوروں کی بیواؤں اور ان کے یتیم بچوں کی پوری پوری کفالت بھی کی جاتی تھی۔ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ عاصمہ نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔ اس موقع پر اخوت فنڈ سے اڑھائی صد روپیہ کی اعانت اور مزید اڑھائی صد روپیہ بطور قرض دیا گیا تھا۔ اب شہباز کی شہادت کا حادثہ پیش آیا۔ تو ضروری اخراجات اسی فنڈ نے برداشت کئے۔ اس کے علاوہ کارخانے کے ایک بڑے حصہ دار نے اپنی جیب خاص سے ایک ہزار روپیہ لاکر عاصمہ کے قدموں میں بطور ہدیہ رکھ دیا۔

ایک دن اچانک عاصمہ کے کوارٹر کے سامنے کئی موٹر گاڑیاں آکر رکیں۔ دو گاڑیاں تو کارخانے کی تھیں۔ اور ایک نیلی سی بھاری گاڑی بالکل اجنبی سی لگتی تھی۔ یہ صوبے کے گورنر کی کار تھی۔ گورنر بہادر گاڑی سے اترے۔ ان کے سکریٹری نے اندر اطلاع کرائی۔ اجازت ملنے پر موصوف بیٹھک میں تشریف لے گئے۔ صوبے کا آخری بڑا آدمی ایک معمولی

مزدور کی بیوہ کے سامنے خود اس کے کوارٹر پر آ کر اپنے ہمدردانہ جذبات پیش کر رہا تھا۔ پردے کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز کے ساتھ عاصمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہا کہ جناب نے ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کو زندہ کر دیا ہے اور آپ کے نظامِ حکومت نے جو ماحول مجھ سے غمزدوں کے لئے فراہم کر دیا ہے۔ اس میں رہتے ہوئے میں یہ محسوس کرتی ہوں۔ کہ شہباز زندہ ہے ہمارے کھیتوں میں چلتے ہوئے ٹریکٹروں کی شکل میں زندہ ہے۔ شہباز میرے لئے کما رہا ہے! اس کی روح نہیں مر سکتی۔ وہ ساری فضا میں رچی بسی ہوئی ہے۔"

گورنر بہادر نے ایک تحریری حکمنامہ میز پر رکھتے ہوئے عاصمہ کو بتایا کہ "جلال صادق کی تعلیم کی پوری ذمہ داری میری حکومت نے لے لی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کارخانہ اپنے فنڈ سے آپ کے لئے گاؤں کے مکان کی تعمیر نو کر رہا ہے۔ جونہی آپ وہاں منتقل ہوں۔ سرکاری طور پر وہاں کے دیہی نظامِ اخوت کے تحت آپ کو گھریلو صنعت کا کوئی کام فراہم کر دیا جائیگا۔ یہ خاص ہدایات ہمارے دفتر سے بھیجی جا رہی ہیں۔ آپ کا کارخانہ جلال صادق کے برسرِ روزگار ہونے تک آپ کو یک صد روپیہ ماہانہ کی پنشن دے گا۔ میں کبھی نہ کبھی آپکے پاس گاؤں میں بھی حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی خدمت بھی مجھ سے مطلوب ہو، یا کوئی تکلیف پہنچے، تو ایک پوسٹ کارڈ لکھکر مجھے مطلع فرمائیے۔ آپ میری بہن ہیں، اور میں آپ کا بھائی ہوں۔ جو کچھ مجھ سے بن آئے گا۔ خدمت کا حق ادا کروں گا! حکومت کی ساری مشینری آپ کی خادم ہے"۔

"اللہ آپکے احسان کا بدلہ دے! اللہ آپکے جذبات کو قبول کرے۔ میں خود آپ کی اور اس ریاست کی خادم ہوں"۔ ایک بیوہ کی دعاؤں کے ہجوم میں گورنر بہادر رخصت ہو گئے۔"

آج اس واقعہ کو پندرہ برس گذر چکے ہیں۔ عاصمہ کی آنکھوں کا نور آج جلال صادق ایک کڑیل جوان بنا کھڑا ہے۔ اس نے بی اے کر لیا ہے اور اس موقع پر کارخانہ ایک خاص تقریب منا رہا ہے۔ تقریب میں شرکت کے لئے عاصمہ اور اس کی بڑی بیٹی کو بھی دعوت دی گئی ہے۔ عاصمہ جلال اور اس کی بہن تینوں گاڑی سے آ رہے ہیں۔ اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے بڑا بھاری مجمع ہے۔ گاڑی بس اب آنے ہی کو ہے۔

ادھر کارخانہ سجایا جا رہا تھا۔ بڑے پارک میں شام کی پارٹی کے لئے شامیانے لگ رہے تھے، اور کارخانے کے قبرستان میں شہباز کی قبر پر چھائی ہوئی بیلوں کے نیچے پھولوں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔

کارخانہ کی روح بول بول کر کہہ رہی تھی "کہ دولت و صنعت انسان کے لئے ہے۔ انسان دولت و صنعت کے لئے نہیں ہے"۔

(بشکریہ "چراغِ راہ")

قتیل شفائی
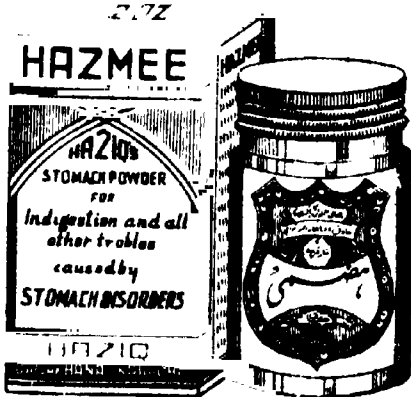
میرا قلم

مرے قلم سے تقاضا ہے شہریاروں کا
کہ اس کے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا
اگر کہیں نظر آئیں سلگتے ویرانے!
قرار دے انھیں ہمسر گلاب زاروں کا
اگر زمیں پہ بلکتے ہوں خاک کے ذرے
گماں ہو ان پہ دمکتے ہوئے ستاروں کا
اگر شباب کے نوحے فضا میں بجنے لگیں
مذاق اڑائے زمانہ ستم کے ماروں کا!
اگر کوئی سرِ بازار بھوک سے تڑپے
بنائے اس کو فسانہ خدا کے پیاروں کا

یہ بھولا بھالا تقاضا بجا سہی لیکن
مرے ضمیر کو یہ بندگی قبول نہیں!
شرر کو پھول بنانا مجھے نہیں آتا
گھٹا کو زلف سمجھنا مرا اصول نہیں
ترس گئے ہوں اگر ہونٹ مسکرانے کو
تو کس زباں سے کہوں زندگی ملول نہیں
روش روش پہ اگر خار راستہ روکیں
میں کیوں کہوں کہ یہاں سرو ہیں ببول نہیں
مرے قلم نے اگر کوئی بھید کھول دیا
تو اعتراف کروں گا یہ میری بھول نہیں

مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے!
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن
مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمتِ انساں کی آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مورخ ہے جس کے سینے میں
غمِ حیات کی تاریخ سرسراتی ہے
میں خود اسیر سہی، میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں!

(بشکریہ حمایتِ اسلام)

آثر زید پوری •

ھیرا

"شبو میاں کی جے ہو!"

"شبو میاں کی جے ہو!"

"شبو میاں کی جے!!" جے کاروں کی آواز سے شبو میاں کی حویلی کی دیواریں گونج اٹھیں اور شبو میاں حویلی سے باہر آگئے ——— حویلی کے آگے قصبے کے بھنگیوں کا ایک ہجوم ان کی جے کے پرجوش نعرے لگا رہا تھا۔ شبو میاں کے ہونٹوں پر ایک کامیاب لیڈر کی مخصوص مسکراہٹ بکھر آئی انتہائی مخلصانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر انہوں نے ہجوم کو خاموش ہو جانے کی ہدایت کی لیکن انہیں دیکھ کر ہجوم کا جوش اور بھی بڑھ گیا تھا ایک بار پھر وہ سب اپنی پوری قوت سے چلائے "شبو میاں کی جے ہو!"

بھنگیوں کا چوہدری کلو ہجوم کے آگے آگے تھا۔ سب سے پہلے وہی شبو میاں کی طرف جھپٹا، اور شبو میاں یہ دیکھ کر کچھ بوکھلا سے گئے کہ کلو اپنے ہاتھوں میں گیندے کے زرد زرد پھولوں کا ہار اٹھائے ان کی طرف آ رہا ہے۔ غیر ارادی طور پر شبو میاں ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"نہیں بھائی!" انہوں نے بہت ہی لجاجت سے آگے بڑھتے ہوئے کلو کو روک دیا "یہ ہار بڑے بڑے نیتاؤں کو زیب دیتے ہیں اور میں ایک بہت معمولی آدمی ہوں۔ تم سبھوں کا سیوک ہوں۔ میرے لئے تمہارے عقیدت کے پھول، تمہاری محبت کے بول ہی بہت ہیں۔"

کلو ٹھٹک گیا۔ وہ شبو میاں کے گلے میں ہار ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا کلو کے پیچھے بڑھتے ہوئے دوسرے بھی رک گئے۔ شبو میاں ایک پر وقار مسکراہٹ کے ساتھ بولے "میں تمہاری جیت کی خبر سن چکا ہوں — تمہاری اس جیت سے میں بہت خوش ہوں بہت زیادہ خوش۔"

یکایک کلو نے جھک کر ہار شبو میاں کے قدموں میں ڈال دیا اور عقیدت سے بوجھل لہجے میں بولا "سرکار ہماری جیت آپ ہی کی جوتی کا صدقہ ہے آپ کا ہاتھ اگر ہماری پیٹھ پر نہ ہوتا تو ہمارے اندر یہ طاقت یہ عزم پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا ——— آپ نے ہمارے بچوں ہماری عورتوں کی ایک بڑی مصیبت ختم کر دی ہے ——— ہم ساری زندگی آپ کے احسان سے گردن نہیں اٹھا سکتے۔"

"مجھے شرمندہ نہ کرو بھائی!" شبو میاں خاکساری کے ساتھ گردن جھکا کر بولے "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

کلو کو شبو میاں کے قدموں میں ہار ڈالتے دیکھ کر دوسرے بھنگی بھی کلو کی تقلید کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شبو میاں کے قدموں میں گیندے کے زرد زرد پھولوں کے انبار لگ گیا۔ ——— سب سے آخر میں ایک نوجوان بھنگی اپنے ہاتھوں میں ہار سنبھالے ان کے قریب آیا لیکن اس کے ہاتھ شبو میاں کے پاؤں کی طرف نہیں جھکے بلکہ ان کے گردن کی طرف اٹھے اور زرد زرد پھولوں کا ہار شبو میاں کے گلے میں مسکرانے لگا۔ یہ سب اچانک ہوا کہ وہ سنبھل بھی نہ سکے۔ ہار کو اپنے سینے پر جھولتا ہوا دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری کے نقوش بے اختیار ابھر پڑے لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گئے وہ پھر مسکرانے لگے ——— کلو کی نگاہوں نے شبو میاں کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا تھا۔ ہار پہنانے والے نوجوان کی طرف اس نے تیز نگاہوں سے دیکھا ——— لیکن اس سے پہلے کہ کلو کچھ کہے وہ نوجوان بھنگی کچھ بولے شبو میاں خود ہی بول اٹھے ——— "کوئی بات نہیں ——— دراصل میں اسے پسند نہیں کرتا کہ ہار پہنے جائیں ——— اپنا جلوس نکلوایا جائے ——— اور شبو میاں کے کردار کی اس بلندی کا

> "بات صرف جمیا اور کنوئیں کی نہ تھی بلکہ ایک بھنگن نے اپنے سے اونچے سارے طبقوں کو للکارا تھا"

بھی کالو کے ساتھ دوسرے بھنگیوں کو بھی یقین کرلینا پڑا۔ انہیں یہ یاد بھی [illegible] سکا کہ آج چند سال پہلے بھی شبو میاں اسی قصبے میں سب چیئرمین کی [illegible]سٹ کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور الکشن میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کے [illegible] نے انہیں اتنے ہار پہنائے تھے کہ وہ پھولوں میں چھپ سے گئے تھے ——— اور پھر اسی قصبے میں ان کا کتنا شاندار جلوس نکلا تھا ——— لیکن یہ بات انہیں یاد نہ آسکی۔ بے پناہ عقیدت نے ان کے ذہنوں کو منجمد کر دیا تھا۔

شبو میاں اپنے قصبے کے خوشحال لوگوں میں سے تھے۔ وہ روٹی اور [illegible] کے غم سے آزاد تھے۔ اور جب کوئی انسان روٹی اور [illegible] کے غم سے [illegible] ہوتا ہے تو اس کے اندر کوئی اور [illegible] بھوک جاگ اٹھتی ہے۔ شبو میاں کے اندر بھی یہ دوسری بھوک [illegible] شہرت و ناموری کی بھوک۔ اثر و اقتدار کی بھوک [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] نے ان کے [illegible] [illegible] تھے۔ حاکم، حکام تک ان کی پہنچ تھی [illegible] اس بھوک کو خاطر خواہ غذا ملتی رہی تھی۔ [illegible] [illegible] ان کے [illegible] دوست سمجھتے تھے۔ ان کے آگے سر جھکاتے آئے تھے ——— ایک تحت فضا بدل گئی۔ زمانے نے کروٹ لی۔ ملک میں سرنگوں ہوئیں [illegible] سر بلند نظر آنے لگیں۔ ایک نئے نظام نے جنم لیا۔ یہ نظام پہلے نظام سے بہتر تھا یا بدتر۔ لیکن اس نظام میں بھی انسانوں کے دلوں کو [illegible] اور سکون میسر نہ تھا۔ دلوں کے ساتھ ذہنوں میں بھی انقلاب [illegible] [illegible] پرانی روشوں کے پرستار مردہ راہوں کا جائزہ لینے بیٹھے سے [illegible] کبھی نہ پورے ہونے والے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کے سیدھی [illegible] [illegible] پر اندھا دھند دوڑ پڑے تھے۔ [illegible] [illegible] ان کے سامنے [illegible] منزل تھی بلکہ ان کی شہرت ہی [illegible] [illegible] کچھ مردود [illegible] [illegible] [illegible] کی طرف کھنچ رہے تھے کہ انسانوں کا ایک بڑا سا کارواں ادھر ہی [illegible] رہا تھا۔ اور یہ اس بات کی ضمانت تھی کہ ان راہوں کے پیچھے کوئی [illegible] منزل ضرور ہے۔ کچھ ایسے تھے کہ جو پرانی اور موجودہ [illegible] دونوں ہی [illegible] سے مطمئن نہ تھے۔ انھیں ایک نئی راہ۔ ایک نئی صبح کی تلاش [illegible] اور کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کی کبھی بھی اپنی کوئی راہ نہ تھی۔ زمانے کی [illegible] راہوں کے ساتھ چلنا جن کا شعار تھا۔ اور شبو میاں اسی آخری گروہ میں سے تھے۔

انقلاب نے زندگی کا دھارا یکسر بدل دیا تھا۔ سطوت و اقتدار جو... زمینداروں اور راجاؤں کی ڈیوڑھی کے کنیز و غلام رہے تھے۔ اب ان سے الگ ہو کر نیتاؤں اور لیڈروں کی چوکھٹ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ شبو میاں کے وقار کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں ان کے اقتدار کی سنگی دیوار میں شگاف اور رخنے پڑ چکے تھے۔ ان شگافوں کو پُر کرنے کے لئے دیوار کو پھر سے استحکام عطا کرنے کے لئے نیا مسالہ ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔ شبو میاں کے ذہن کی آنکھیں زمینداروں اور حکام سے ہٹ کر ان پس ماندہ طبقوں کو دیکھ رہی تھیں جو آج کی نئی راہوں میں نشانِ راہ کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے تھے شبو میاں یہ گر سمجھ چکے تھے کہ آج اجتماعی مفاد کی آڑ لے کر ہی ذاتی مفاد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آج پست اور کچلے ہوئے طبقوں کا بظاہر سہارا بن کر اور دراصل ان کا سہارا لیکر ہی اوپر اٹھا جا سکتا ہے اور انہوں نے اسی لئے مسالے کی مدد سے اپنے اقتدار کی دیوار میں پڑے ہوئے شگاف اور رخنے مٹانا شروع کر دیئے۔ وقت نے شبو میاں کے قدموں میں ایک ایسی راہ بچھا دی جو انہیں ان کی مطلوبہ منزل تک پہنچاتی تھی۔ یہ راہ ایک صبح اچانک ان کی زندگی میں آئی۔ اور شبو میاں کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ ان کی نگاہوں نے اس راہ کے پیچھے چھپی ہوئی منزل دیکھ لی تھی۔

جنوری کی ایک صبح تھی۔ سورج کو مشرق سے ابھرے ہوئے کوئی ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کہر کی چادر کو چیر کر پیلی پیلی دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ لیکن ہواؤں میں اب بھی کافی خنکی تھی۔ چائے اور ناشتے سے فارغ ہو کر شبو میاں بھاری اوورکوٹ میں بدن چھپاتے اپنے گھر سے نکل کر افسر میاں کی بیٹھک جا رہے تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ہر صبح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے وہ افسر میاں کی بیٹھک میں ضرور جاتے تھے۔ یہاں دوسرے ہم مذاق ساتھیوں کے ساتھ کچھ دیر تک گپ شپ رہتی اور پھر تاش کی گڈی سنبھال لی جاتی اور چوسر پر جھپکا پڑنے لگتا ——— افسر میاں کی بیٹھک شبو میاں کے گھر سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی ....

.... افسر میاں کی بیٹھک تک جانے میں شبو میاں کو گنگا چمار کے گھر کے قریب گزرنا پڑتا تھا اور گنگا کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر محلے کا وہ پکا کنواں تھا جس سے گنگا چمار اور بھنگیوں کے

چودھری کلو کے گھروں کے علاوہ محلے کے دوسرے سارے گھروں میں پانی جاتا تھا ——— آج گنگا کے گھر سے قریب پہنچتے ہی شبو میاں کو کنوئیں کے پاس محلے کے کتنے ہی آدمیوں کی بھیڑ سی نظر آئی ——— بہت سی ملی جلی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور شبو میاں کے قدم اپنی راہ سے ہٹ کر ادھر ہی اٹھ گئے۔ شبو میاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ طوفان کلو چودھری کی جوان بیٹی جمیا کا لایا ہوا ہے تو بے اختیار ان کے ہونٹ مسکرا پڑے۔ آج وہ راہ خود بخود ان کے سامنے آگئی تھی جس کی انہیں تلاش تھی۔ ان کے ذہن کے پردے پر شوخ اور خودسر جمیا کی تصویر ابھر آئی۔ گزری ہوئی رات میں جس نے محلے کے اسی کنوئیں سے پانی بھر کر سارے محلے میں طوفان اٹھا دیا تھا۔ جو اپنے اس فعل کو ہر طرح جائز اور درست سمجھ رہی تھی جس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "ایسی اندھیری اور برفیلی راتوں میں اپنے گھر سے دو دو فرلانگ چل کر میں بھنگیوں کے مخصوص کنوئیں سے پانی نہیں لا سکتی۔ میری بھی جان ہے ——— میں بھی انسان ہوں"۔ اور محلے کے لوگوں کا خیال تھا کہ جمیا جو کچھ کہہ رہی ہے یہ اس کے الفاظ نہیں ہیں جمیا کے منہ سے ملک کا نیا قانون بول رہا ہے۔ ورنہ ایک بھنگن اور اتنی سرکشی! بڑی جرأت اور سر چڑھنے کی جسارت!

بات صرف جمیا اور کنوئیں کی نہ تھی بلکہ ایک بھنگن نے اپنے سے اونچے سارے طبقوں کو للکارا تھا، اور اس وقت محلے کے تقریباً سارے لوگ کنوئیں کے پاس اسی بات پر غور کرنے کے لئے یکجا ہوتے تھے کہ جمیا کے خلاف ان کا طرز عمل کیا ہونا ہے۔ محلے کے ایک خاں صاحب تو یہاں تک سوچ گئے تھے کہ نیچ لوگوں کو سیدھی راہ پر لانے کے لئے تشدد ہی ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ لیکن دوسرے لوگ ایسا فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ پھر بھی جمیا کی جرأت پر غصے سے کوئی دل خالی نہ تھا اور ہر زبان اس غصے کا اظہار کر رہی تھی "آخر جمیا نے اس کنوئیں سے پانی لینے کی جسارت کیسے کی؟"

"آج سے پہلے کبھی اس نے اس کنوئیں کا پانی لیا تھا۔ جو آج یہ جرأت کی ———"

"اجی بھنگیوں اور چماروں کے کنوئیں ہمیشہ ہی سے الگ رہتے ہیں یہ اس قصبے کا صدیوں پرانا قانون ہے ——— لیکن اس دور کی تو ہر بات ہی نیا ہی ہے ———"

"مجھے تو اس میں گنگا چمار کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ کنواں اس کے گھر والوں سے دور نہیں۔ اسی کے اشارے سے جمیا نے یہ حرکت کی ہے"

"بھئی یہ دور تو نیچ ذات والوں کا دور ہے شرفاء اور اچھے لوگوں کی تو زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے محلے کے سارے بھلے لوگ دوسرے محلے کے کنوئیں سے پانی لائیں یا پیاسے مریں؟"

"نہیں جی ——— دوسرے محلے سے کیوں پانی لائیں گے۔ اسی کنوئیں کا پانی نکال کر پاک کر لیں گے۔ اس کے بعد کسی بھنگی نے پھر یہ جسارت کی تو ان کا سر ہوگا اور ہمارا جوتا!"

"جوتے اور سر والی بات اب بھول جائیے خاں صاحب!" شبو میاں اب آگے بڑھے "اس سلسلے میں جس دن بھی یہ کھیل کھیلا اسی محلے سے پوری برادری کی بارات سرکاری مہمان خانے جائے گی ———" خاں صاحب کے ساتھ دوسرے لوگ بھی چونک کر شبو میاں کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں تو اصل سبب یہی ——— قریب کھڑے ہوئے ایک بزرگ نے پاس آ کر بڑی ٹھنڈی سانس لی ——— "لیکن غور فرمائیے اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

شبو میاں نے انہیں سمجھانا چاہا "بھنگی بھی انسان ہیں ——— ہمارے ہیں جب امیر اور پاسی تک اس کنوئیں سے پانی لے سکتے ہیں تو پھر بھنگیوں کے پانی لینے میں کیا مضائقہ ہے؟"

"آپ نے بھی خوب کہی ———" محلے کا ایک نوجوان شبو کی بات پر اچھل پڑا "ہمارے ہی غلیظ کے سہارے پلے ہوئے یہ لوگ ہمارے ہی دسترخوان پر رینگنے کی جسارت کریں!"

"لیکن گندگی کس سے وجود میں آئی ہے؟" شبو میاں نرمی کے ساتھ بولے "ہماری ہی پیدا کردہ گندگی سے ہماری زندگیوں کو پاک کرنے والے قابل نفرت تو نہیں ——— وہ ہمارے شکریے اور ہمدردی کے مستحق ہوں گے" اور شبو میاں آگے بڑھ گئے، دوسرا الجھن کی بجائے یہ ان کے لئے عمل کا وقت تھا۔

"حضور ——— کلو چودھری بہا اس اپنے ساتھی [illegible] آنکھیں نیچے کر کے بولا "——— میں تو اس لونڈیا سے تنگ آگیا

کی بھی جیت تھی۔ یہ جیت ان کی سیاست دانی، ان کی دماغ سوزی کا حاصل تھی۔ یہ جیت ان کے کتنے ہی شب و روز کی کاوشوں کا صلہ تھی۔ اس جیت پر ان کی لیڈری کا دارومدار تھا۔ ان کے اقتدار کا انحصار تھا۔ اس جیت کے لئے انھوں نے کتنوں سے بگاڑ مول لیا تھا۔ کتنوں میں بُرے کہلائے تھے ——— لیکن اب وہ اپنے کو کامیاب لیڈر پا رہے تھے ——— جے کاروں کی آوازوں سے ان کی حویلی کی دیواریں گونج اٹھی تھیں ——— عقیدت مند بھنگیوں نے ان کے قدموں میں پھولوں کے انبار لگا دیئے تھے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اب دوسرے طبقے بھی ان کے سامنے سر نہ اٹھائیں گے اگر کسی نے سر اٹھانے کی جرأت کی بھی تو ان کے صرف ایک اشارے سے اس کے گھر کی فضا تعفن اور بدبو سے بھر سکتی ہے۔ اور پھر تو اسے سر جھکانا ہی پڑیگا یہ سنہری توقع شبو میاں کے اندر کلبلاتی ہوئی بھوک کے لئے بہت ہی لذیذ نوالہ تھی۔

اور پھر ایک دن شبو میاں کے ذہن میں ایک خیال ابھرا ———
یہ خیال چند سال پہلے بھی ایک بار ان کے ذہن میں ابھر چکا تھا۔ وہ اپنا گھر کمانے والی بوڑھی بھنگن کی بجائے کسی جوان بھنگن کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ان کا اقتدار بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا تھا ——— کسی بھی بھنگن کی ججمانی، اس کی مرضی کے بغیر کوئی دوسرا بھنگی نہیں کما سکتا۔ بھنگیوں کا بنایا ہوا یہ قانون ان کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ اور شبو میاں کو خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ لیکن اب؟ شبو میاں قانون کی اس دیوار میں اپنے لئے دروازہ بنا چکے تھے ان کے ذہن کے پردے پر جمیا اپنی بھرپور جوانی، بے پناہ رعنائیوں کے ساتھ اُبھر رہی تھی ——— جمیا ——— جو کیچڑ میں پڑا ہوا گلاب تھی۔ کوئلوں میں دبا ہوا ہیرا تھی۔ ——— اور شبو میاں کو اپنی بوڑھی بھنگن کا چہرہ اور بھی مکروہ نظر آنے لگا۔

شبو میاں اپنی حویلی سے باہر نکل رہے تھے اور جمیا اپنا ٹوکرا سنبھالے ان کی حویلی میں داخل ہو رہی تھی۔ بیچ ڈیوڑھی میں جمیا نے شبو میاں کو روک لیا اور شبو میاں بری طرح بوکھلا گئے ——— بالکل اسی طرح جیسے اب سے چند ماہ پہلے، ایک دن، اسی ڈیوڑھی میں، اسی طرح انہوں نے جمیا کا راستہ روکا تھا۔ اور جمیا بوکھلا گئی تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" شبو میاں جلدی سے ایک نظر اپنے چاروں طرف ڈالتے ہوئے ہکلائے ——— اور جمیا پھٹ پڑی ———
"مجھے تباہ کر کے اب انجان بن رہے ہو۔ یہ پاپ اب زیادہ دنوں تک نہیں چھُپ سکتا۔ میں رسوا ہوئی تو تمہیں بھی بدنام کر کے چھوڑ دوں گی۔ بھرے قصبے میں تمہاری جھوٹی عظمت کی دھجیاں اڑا دوں گی"۔

شبو میاں نے اتنی کڑوی بات آج تک کسی کے منہ سے نہیں سُنی تھی لیکن جمیا کی تلخ کلامی انہیں برداشت کرنا پڑی۔ اس منزل میں پہنچکر شیر دل سے شیر دل مرد بھی ایک حقیر اور کمزور عورت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ شبو میاں کی گردن بھی ایک لمحے کے لئے جھک گئی۔ وہ جمیا کی فطرت جانتے تھے۔ ضدی اور خود سر جمیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کر کے بھی دکھا سکتی ہے۔ شبو میاں کو اس بات کا یقین تھا۔ انہیں پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ ان کی عزت، عظمت اور وقار، سب کچھ اس حقیر سی بھنگن کی مٹھی میں پہنچ چکا ہے۔ ان کے خلاف اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ان کی عظمت کے پُرشکوہ قلعہ کے لئے ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ تباہ کن ہو سکتا ہے۔ شبو میاں وقت کے تقاضے اور نزاکت سمجھتے تھے۔ کمال نرمی سے بولے "لیکن آج تمہیں اتنا غصہ کیوں ہے؟ میں تو سب کچھ نباہنے پر تیار ہوں"!

"کب تیار ہوگے؟ جب ذلیل ہو چکے گی؟ تمہارے وعدوں کا اب میں انتظار نہیں کر سکتی ———"

جمیا کے جواب سے مشتعل یا متفکر ہونے کی بجائے شبو میاں مسکرانے لگے "تم ٹھیک کہہ رہی ہو جمیا۔ دیر اب ہمارے لئے مضر ہی ہوگی۔ ہمیں جو کرنا ہے وہ ہو ہی جانا چاہئیے۔ لیکن یہاں رہ کر شاید ایسا نہ ہو سکے۔ بہت سی رکاوٹیں ہمارا راستہ روکیں گی۔ ہاں یہاں سے دور چل کر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں ——— کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

اور جمیا نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ اس کے سامنے بھی تو کوئی دوسری راہ نہ تھی ——— اور شبو میاں جمیا سے یہ کہکر ڈیوڑھی سے باہر ہو گئے "آج رات کے دس بجے قصبے کے باہر مہوا باغ، میں مجھے ملو! وہاں سے اسٹیشن تک پہنچنے کا میں انتظام کر لوں گا"!

اسی رات جب گھڑی پونے دس بجا رہی تھی ——— شبو میاں

چوروں کی طرح اپنی حویلی سے نکل کر مہوا باغ، کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مہوا باغ، جو قصبے کی آبادی سے باہر، قصبے کے بھی سرے پر تھا ــــــ

اور جب صبح ہوئی تو ــــــ کلو چودری کے گھر سے درد وغم میں ڈوبی ہوئی چیخیں ابل پڑیں ــــــ قصبے کی پُرسکون فضا میں ایک سنسنی سی پھیل گئی ــــــ مہوا باغ کے کنوئیں سے جمیا کی لاش برآمد ہوئی تھی۔ عام قیاس تھا کہ جمیا نے خودکشی کی ہے۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں کنوئیں کے پانی کے علاوہ ایک بچہ بھی تھا۔ کنواری جمیا کے پیٹ میں بچہ!

اس حادثے کی خبر ملتے ہی شبلو میاں کلو کے گھر پہنچ گئے تھے۔ قصبے کے دوسرے بہت سے بھنگی بھی کلو کے گھر میں جمع تھے۔ شبلو میاں کا حساس دل جمیا کی اس ناگہانی موت سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ان کی زبان بہت ہی پُر اندوہ لہجے میں ان کے دلی تاثرات کی ترجمانی کر رہی تھی۔

شبلو میاں کہہ رہے تھے ــــــ "جب تک نیا سماج تشکیل نہیں پاتا۔ جب تک انسانیت کی رگوں میں طبقاتی امتیاز کا زہر موجود ہے۔ غریبوں پر مظالم ہوتے ہی رہیں گے۔ اپنی لاج رکھنے کے لئے ہزاروں جمیائیں خودکشی کرتی رہیں گی ــــــ مرتی رہیں گی"

موقع پر موجود بھنگیوں میں سے ایک نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوسرے بھنگی سے سرگوشی کی "اپنے شبلو میاں تو بس ہیرا ہیں ہیرا"

"بیشک" دوسرے بھنگی نے تائید میں گردن ہلائی ــــــ تشبیہ کتنی مکمل تھی کتنی جامع لیکن تشبیہ دینے والے کے سامنے صرف ظاہری رُخ تھا۔ ہیرے کی چمک دمک دلکشی اور عظمت ــــــ کاش اسے ہیرے کے اندر چھپے ہوئے زہر کا بھی احساس ہوتا ــــــ ہو سکتا!

(بشکریہ "شمع" دہلی)

کوثر نیازی

بجائے جام لے اب ہاتھ میں شمشیر اے ساقی
فضا میں گونجتا ہے نعرۂ تکبیر اے ساقی

بہت کی حضرتِ انسان نے تدبیر اے ساقی
نہ بدلی جا سکی اب تک مگر تقدیر اے ساقی

سوئے مقتل چلے ہیں آج شاید تیرے دیوانے
سنائی دے رہا ہے نغمۂ زنجیر اے ساقی

غضب ہے تیرے مستوں کا جنوں رہنِ تعقل ہے
تعجب ہے کہ خود صیاد ہے نخچیر اے ساقی

عبث ڈھونڈا اسے افسردہ انگوروں میں میں نے
وہ جوہر جو بنا دے خاک کو اکسیر اے ساقی

نشانِ زخم بھی ملتا نہیں ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں
ترازو ہو گیا دل میں یہ کیسا تیر اے ساقی

یہ حالت ایک دن رندانِ خستہ حال بدلیں گے
فضائے میکدہ سے ہو نہ تو دلگیر اے ساقی

طرب انگیز نغموں سے مداوا اس کا کیا ہو گا
فضا میں بس گیا ہے شورِ دار و گیر اے ساقی

جسے لاکھوں مئے رنگیں کے ساغر پا نہیں سکتے
شرابِ تشنہ کامی میں ہے وہ تاثیر اے ساقی

یہ میخانہ ہے اس میں ایک اک میکش کا حصہ ہے
اسے سمجھا ہے کیوں پیرِ مغاں جاگیر اے ساقی

یزیدِ وقت بھی ہے، عرصۂ کرب و بلا بھی ہے
نظر آتا نہیں لیکن کوئی شبیر اے ساقی

(چراغ راہ)

"مجھے تو اعتراض نہیں۔ چلا جائے۔" ماسٹر صاحب نے ذرا بید لی سے کہا وہ سعید کا کچھ ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اتنا کہ سعید کو اس کے ننہال سے کچھ الگ رکھنے کا جذبہ ان کے تحت الشعور میں ضرور کہیں موجود تھا۔

بس سعید کے دل میں تو خوشی سے لڈو پھوٹ گئے۔ اسی وقت تیاریاں شروع ہو گئیں۔

دھوبی کا دُھلا ہوا پاجامہ اور قمیص جو اس کا بڑا بھائی کالج کی چھٹیوں میں تنگ ہونے کی بنا پر دے گیا تھا اس کے پاس موجود تھے۔ دھوبی کا دھلا ہوا کپڑا ایسا صاف تھا کہ نیا معلوم ہوتا تھا اور چمڑے کا نوکدار جوتا جسے موچی سے لئے ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا۔ یہ پہن کر تو سعید کی عید اس روز ہو گئی لیکن اس کی امی نے کہا۔

"یہ کپڑے ایک تولیے میں لپیٹ کر تھیلے لو۔ وہیں جا کر پہننا۔ راستے میں میلے ہو جائیں گے۔"

سعید پر اگرچہ کچھ اداس سی پڑ گئی لیکن بات پتے کی تھی اس لئے کہ میلے کپڑے پہن کر پہلی بار اپنی نئی ننہیال جانا اسے بھی پسند نہ تھا۔

"دیکھو بیٹا اپنی دو تین کتابیں تھیلے جاؤ جہاں موقع ملے پڑھتے رہنا تفریح بھی ہو گی اور تعلیم بھی۔"

سعید کے ابا نے روانہ ہوتے ہوتے کہا۔

"تم اپنا کرایہ تو نکالا لائے ہو نا سعید۔" اچانک چلتے چلتے ماموں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" سعید نے جھجک کر کہا۔ "ابا جی نے چلتے ہوئے آٹھ آنے صرف خرچ کے لئے دیتے تھے۔"

اس نے مٹھی کھول کر دکھا دی۔ ایک سفید اٹھنی مٹھی میں چمک رہی تھی ——

"نہیں یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اسے محفوظ رکھو۔ جیب میں ڈال لو۔" ماموں نے کہا ——

سعید کا دل بجھ گیا۔ اس نے یہ اٹھنی خرچ کرنے کے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔

دس میل کا وہ سفر تو بڑا ہی دلچسپ رہا۔ ایک ملے اور نہ ختم ہونے والے دیہاتی راستے کا کھیتوں۔ دیہاتی بستیوں۔ خشک ندی نالوں اور نغمہ الاپتے ہوئے رہٹوں کے قریب سے بل کھاتے ہوئے گزرتے چلے جانا ایک پیہم سفر جیسے کا گھر بہت پیچھے اور آنے کی منزل کا دور ہی دور ہوتے چلے جانا ایک عجیب تجربہ تھا۔ روانہ ہوتے ہوتے وہ یوں صاف سمجھا تھا کہ جیسے گھر سے ایک قدم باہر نکلے گا تو دوسرا ننہیال کی چوکھٹ پر ہو گا لیکن وہاں تو پہلے پہر سے ٹوپی اتر کر پوٹلی میں آ گئی۔ پھر جوتا اتر کر ہاتھ میں پھر پوٹلی میں چلا گیا۔ پاجامہ کھینچ کر ٹخنوں اور گھٹنوں تک آ گیا۔ لیکن سفر جاری رہا۔ سورج نکلنے سے بہت پہلے وہ روانہ ہوئے تھے لیکن اس کا کوئی آخری سرا نہ تھا۔ راستہ جیسے وہ زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلہ پر ختم دکھتا تھا وہ اس کی رفتار سے اس کے آگے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ دائرہ اس کی رفتار پر۔ اس کی بے بسی پر۔ اس کی تکان پر۔ اس کے اس نئے سفر کے عزم پر اور اس کی بھولی بھالی امیدوں اور آرزوؤں پر اس کے گرد رقص تضحیک کرتا رہا۔ گویا کہہ رہا تھا

"زندگی کے نئے مسافر میری گرفت سے بچ کر کہاں جاؤ گے جہاں تم جاؤ گے وہیں تم میرے گھیرے میں رہو گے۔ مجھے تم پھلانگ نہیں سکتے مجھے تم چھو نہیں سکتے تم عمر بھر چلو اور میں عمر بھر وسیع ہوتا اور تمہارے گرد رقص کرتا رہوں گا۔ تم یونہی میرے حلقے میں چلتے چلتے بڑھو گے۔ پھلو پھولو گے اور پھر اسی راہ میں کسی پوشیدہ مقام پر تمہارے لئے ایک گڑھا کھدا ہوا ہے جس میں تم سما جاؤ گے۔ لیکن میری وسعت کو اپنے قدموں سے ناپ نہ سکو گے۔"

لیکن سعید تھا کہ حوادثِ زمانہ کی اس خاموش بولی سے بے نیاز ہر مسافر کی طرح بڑھے جا رہا تھا۔ آگے آگے حسین علی اور پیچھے پیچھے سعید سورج ابھرا پھر گرم ہوا۔ پھر تپنے لگا کبھی حسین علی اور وہ دوڑ لگاتے۔ کبھی دور سے نظر آنے والے سرِ راہ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے ساتھ پوٹلی میں بندھا ہوا کھانا کھانے کے لئے طے کرتے اور جب وہ درخت قریب آ جاتا تو حسین علی آگے سے اگلا درخت مقرر کر دیتا کبھی دل ہی دل میں اپنے سے آگے جانے والے راہیوں کے ساتھ مقابلہ طے ہو جاتا اور دونوں تیز رفتاری سے ان کے قریب سے گزر کر آگے نکل جاتے۔

جب سورج کافی گرم ہو گیا تو ایک رہٹ کے پاس نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ بیٹھے۔ بیل سعید کی طرح ایک نا ختم ہونے والی منزل کے لئے ایک گول دائرے میں گردش کر رہے تھے۔ رہٹ کی ٹنڈیں پانی سے

ایک مدرسہ تھا اس سے ہٹ کر ایک خانقاہ تھی اور خانقاہ سے آگے
صرف آدھ کوس پر گھڑیال تھا۔ حسین علی نے اسے بتایا کہ انہیں بازار میں سے
گزرنا ہوگا اور وہاں سے ریوڑیاں لیکر جائے گا۔ اس خیال نے سعید کی رفتار
کچھ تیز کردی۔ راستے میں خربوزوں کا ایک کھیت آیا جو راستے کے ساتھ
ساتھ کچھ دور تک چلا گیا تھا حسین علی کی رفتار کم ہوگئی۔ وہ آہستہ آہستہ
کھیت کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

"سعید وہ دیکھو کتنا بڑا خربوزہ ہے۔ پک کر بالکل زرد ہو رہا ہے"
حسین علی نے ایک بیل کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر چاروں طرف
دیکھ کر دوسرے لمحے ایک چھلانگ میں تھا حسین علی اس بیل پر جھکا ہوا تھا
اور وہ خربوزہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ سعید کا دل ایک نامعلوم خوف سے
دھک دھک کرنے لگا وہ حیرت سے ماموں کی طرف دیکھ رہا تھا اس
نے تو یہ سنا تھا کہ یہ چوری ہے جو بُری چیز ہے لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا اسے
محسوس ہوا کہ اس کے سامنے کوئی حادثہ ہوگیا تھا جس کا وہ گواہ تھا چلتے
ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کھیت سے آگے گزر کر حسین علی
نے وہ خربوزہ دونوں ہاتھوں میں دبا کر توڑا۔ انگلیوں سے بیج نکال کر
پھینک دیئے اور نصف حصے کا ایک ٹکڑا توڑ کر سعید کو دیا۔

"لو سعید کھاؤ۔ میٹھا معلوم ہوتا ہے" حسین علی نے اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں ۔میں" سعید کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں۔ ہاں اور بھی دوں گا۔ یہ تو لو!" ماموں نے کہا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا" سعید نے بمشکل کہا۔

"کھاؤ کم کھاتے نا۔ تم بھی نرے مولوی ہو" حسین علی نے کہا اور
خربوزے کا ٹکڑا اطمینان سے کھانے لگا۔ چند لمحے میں اس نے خربوزے
کے بڑے بڑے لقمے نگل کر چھلکے پھینک دیئے۔ اور وہ دونوں چلتے رہے۔

بالآخر درختوں کا جھنڈ آیا۔ اس سے گزر کر بنڈی آیا۔ پھر خشک نالہ
پھر اینٹوں کا بھٹہ۔ پھر سنگتروں کا باغ۔ پھر مدرسہ۔ پھر خانقاہ۔ حسین علی
کے بتلاتے ہوئے نشانِ منزل ایک ایک کرکے آتے اور گزرتے رہے۔ یہانتک
کہ سعید کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اس کی ایڑیاں شدید درد کرنے لگیں
اس کی پنڈلیاں شل ہونے لگیں۔ وہ اپنے جسم کو صرف قوتِ ارادی کے
بل پر ماموں حسین علی کے پیچھے پیچھے گھسیٹنے لگا۔ یکایک اس کے سامنے
پختہ مکانوں کی اونچی اونچی برجیاں اُفق پر ابھرتی ہوئی نظر آئیں شہر آ
گیا تھا۔

بازار میں سے گزرتے ہوئے سعید نے دبی زبان سے ماموں کو ریوڑیوں
کا وعدہ یاد دلایا۔

"اب موٹر کا ٹیم ہوگیا ہے۔ چھوٹ گئی تو سب ریوڑیاں دھری
رہ جائیں گی۔ نہ آگے کے رہیں گے نہ پیچھے کے" حسین علی نے بے توجہی سے کہا
اور سعید دل شکستگی کے ساتھ بازار میں مٹھائیوں کی بھری ہوئی دکانوں
کے پاس سے گزر کر اڈے کی طرف مڑ گیا۔

"آؤ ... یار ...... دو سواریاں جہلم کی
لاری تیار ہے۔ آؤ۔ بھائی گٹھری والیا" موٹر کا کلینر چلا رہا تھا۔

اور حسین علی لاری کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"دیکھ کیا ہو۔ چلنا ہو تو بیٹھو موٹر تیار ہے" کلینر نے کہا جو بیک
وقت کلینر اور کنڈکٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔

وہ کوئی آدمی یا تو تھا ذاتی بدخط انہوں پہ پیچھے بیٹھے اب غنڈہ
بن گیا تھا۔ لمبی لمبی لٹکتی ہوئی مونچھیں۔ ململ کا میلا کرتا اور نیلے رنگ کا تہمد
جو ٹخنے سے بہت نیچے لٹک کر زمین صاف کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پر
کا لمبا لوہے کا ہینڈل تھا جو اس نے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ بتانے کے لئے
کہ لاری چلنے میں اب صرف ہینڈل مارنے کی دیر ہے

"لیکن جگہ کہاں ہے" حسین علی نے کلینر سے پوچھا۔

"بادشاہو جگہ نہ ہوگی تو ہم آپ کو اپنے سر پر بٹھا کر لے جائیں گے"
اور کلینر نے موٹر کی چھت کی طرف اشارہ کیا۔ "بس پولیس چوکی کے پاس
تمہیں ذرا اتر کر تھوڑا پیدل چلنا ہوگا۔ اس سے آگے نکل کر تو پوری لاری
تمہاری ہے"

سعید کو ایک مسافر نے ذرا تنگ ہو کر اپنے سامنے پڑی ہوئی ایک
گٹھری پر بٹھا لیا اور حسین علی چھت پر چڑھ گیا۔

اور کلینر نے پھر ہانک لگائی۔

"آؤ بھائی لاری کے مسافرو۔ لاری تیار ہے۔ بس دو سواری کی
کسر ہے"

لاری کا کرایہ بچانا چاہتا تھا۔ سامنے جہلم کا پل تھا۔ پل کے پار شہر تھا اور شہر سے صرف دو تین میل کے فاصلے پر وہ تنگ تھا جہاں انہیں جانا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے محسوس ہوا کہ ایک چوری ہو رہی تھی۔ ایک نقب لگ رہی تھی اور وہ چوری اور نقب زنی میں حسین علی کے ساتھ شریک تھا۔ چوروں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے کرایہ بچانے کے لئے یہ دوڑ لگائی تھی۔ گویا انھوں نے لاری کا پٹرول چرا لیا تھا۔ ایک روپیہ آٹھ آنے چرا لئے تھے، اور چوری کے اس مال کا ایک تہائی حصہ سعید کی مٹھی میں بھی تھا۔ وہ چمکتی ہوئی اٹھنی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک انگارہ اس کی مٹھی میں گھس آیا۔ ایک بچھو نے اس کی مٹھی میں کاٹنا شروع کر دیا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ جھٹک دیا اور وہ بچھو۔ وہ انگارہ دور جا پڑے۔ اسے محسوس ہوا اسے چاروں طرف سے دیکھا جا رہا تھا۔ بے شمار آنکھیں آگے پیچھے دائیں بائیں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ واپس لاری والے کے پاس جا کر اسے اٹھنی دے آئے اور اس سے معافی مانگے

لیکن اس کی ٹانگوں میں دم نہ رہا تھا۔ اس کے پاؤں کے ساتھ گویا ایک ایک من وزن بندھا ہوا تھا۔ اور کسی کا خوفناک ہاتھ اسے اپنی گردن پر محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے لاری کا کلینر اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا اب اس کے قدم بھی نہ اٹھ سکتے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا تھا

"اے سعید اٹھنی کہاں ہے ؟" اس نے حسین علی کی آواز سنی جو اسے کندھے سے پکڑ کر اس کی جیب ٹٹول رہا تھا۔

"میں نے پھینک دی" سعید نے افسردگی سے کہا۔

ایک زنانے کا چانٹا اس کے گال پر پڑا۔

"مرا آیا حاجی کا بچہ" حسین علی نے کہا اور چل دیا۔

موٹے موٹے آنسو سعید کی آنکھوں سے ٹپک کر اس کے دل و دماغ کی ساری خلش کو دھو گئے۔

(بشکریہ "معیار")

آغا صادق

نیا سینما ہال

خدا کا شکر ہے سنما تو بن گیا اک اور
چلے گا شہر میں رقص و سرود کا اب دور

ہماری قوم کو اس چیز کی ضرورت تھی
اسی پہ کب سے لگی سب کی چشمِ حسرت تھی

تھیٹروں میں کئی سال بھیڑ بھاڑ رہی !
اس انتظار میں اک اک گھڑی پہاڑ رہی

جواں ہمارے، کہاں کھیل دیکھنے جاتے؟
خدائے حسن، کہاں جنتِ نظر پاتے

ہُوا نہ کھیل تو کچھ لطفِ زندگی ہی نہیں
بغیر کھیل کے آنکھوں میں روشنی ہی نہیں

نہ مسجدوں کی ضرورت نہ خانقاہوں کی
اگر ہے کوئی ضرورت تو جلوہ گاہوں کی

کہ مسجدیں تو ہیں پہلے ہی شہر میں اکثر
خدا کے فضل سے خالی رہی ہیں آٹھ پہر

نماز پڑھنے کی فرصت کہاں جوانوں کو
خدا بسائے اب ایسے تماشہ خانوں کو !!

رہیں سرائیں تو انکا ہے اب خیال کسے
پڑے ہیں کتنے ہی میداں مسافروں کیلئے

جہاں پڑیں گے وہاں رات کٹ ہی جائیگی
کبھی پیامِ سفر صبح لے ہی آئے گی !!

تھیٹروں کی ضرورت ہے اب زمانے کو
سمجھ رہا ہے عبادت جو ناچ گانے کو

خدا کا شکر ہے بندے ہیں آج فرض شناس
ہوا ہے ان کو تقاضائے وقت کا احساس

دعائیں دیجئے سنما بنانے والے کو
بساطِ عیش گریزاں بچھانے والے کو

(بشکریہ "تذکرہ")

لالہ صحرائی

دو دوست

ان دنوں جرمنوں نے پیرس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس مفلس شہر کے نفیس تر لوگ مہینوں کے فاقوں کے باعث بڑی مکروہ زندگی گزار رہے تھے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھنے والی چڑیوں اور بدرویوں کے اندر پھدکنے والے مینڈکوں اور بلوں کے اندر دبکے رہنے والوں چوہوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ بھوک کی قہرمانیوں سے عاجز آئے ہوئے لوگ کسی شے کو نہ چھوڑتے تھے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ جنوری کی ایک تابناک صبح کو موسیو مارسیٹ بیرون شہر کی ایک اداس سڑک پر نہایت ہی آزردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ قدم دھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ خوب پتلون میں ٹھونس رکھے تھے، اور اس کا سر جیسے کسی شدید ذہنی بوجھ کی گرانباری سے جھکا ہوا تھا۔ کیوں نہ ہو مسلسل کئی روز سے بیچارے کے منہ میں تو سوائے ایک کھیل تک اڑ کر نہ گئی تھی۔

موسیو مارسیٹ جو پیشے کے لحاظ سے ایک خوش وقت گھڑی ساز اور طبیعت کے لحاظ سے ایک چرب زبان شخص تھا۔ اب وقت کی نزاکت اور زبان کے چٹخارے سے محرومی کا بری طرح نالاں نظر آتا تھا۔ دفعتاً وہ چلتے چلتے رک گیا اور پھر جو اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو اس نے اپنے سامنے کسی کی باہیں پھیلی ہوئی پائیں۔ اس نے فی الفور پہچان لیا کہ یہ اس کا پرانا دوست اور جھیل کا ساتھی موسیو سادریج ہے جس کے ساتھ مل کر وہ کئی سال تک مچھلیاں پکڑنے جاتا رہا تھا۔

جرمنوں کے ساتھ لڑائی چھڑنے سے پہلے موسیو مارسیٹ بلا ناغہ ہر اتوار کو بانس کی ایک لمبی چھڑی اور ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبہ لیکر گھر سے چل دیتا۔ اور پھر کئی بازاروں اور کئی سڑکوں کا طویل چکر کاٹ کر پیرس کی ایک مضافاتی جھیل پر جا پہنچتا جو اس کے گھر سے خاصی دور ہونے کے باوجود ہر وقت اور ہر لمحے اس کی تخیل کی وادی میں ہلکورے لیتی رہتی۔ اور جس کے شفاف پانی کا عکس ہر وقت اس کی روح پر جلوہ فگن رہتا۔ ۔ ۔ ۔

جھیل پر پہنچنے کے فوراً بعد وہ اپنی بنسی کی ڈوری پانی میں ڈال کر مچھلیاں پکڑنے بیٹھ جاتا ہے اور پھر برابر شام تک اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیتا۔

اسی جھیل پر ہر اتوار کو اس کی ملاقات ایک دوسرے بدن اور ٹھگنے قد کے نہایت ہی خوش باش شخص سے ضرور ہوتی جس کا نام موسیو سادریج تھا اور جو شہر کے [illegible] والے بازار میں دکان کرتا تھا موسیو سادریج بھی عین اس کی مانند مچھلیاں پکڑنے کا دلدادہ تھا۔ وہ دونوں اکثر تو اتوار کا دن [illegible] چپ رہ کر ایک ساتھ بیٹھے رہتے۔ بنسیوں کی ڈوریں ان کے ہاتھوں میں ہوتیں اور نیم خوردہ پائپ ان کے منہ میں ——— ان کے پیر نیچے جھیل کے پانی پر لٹکے ہوتے اور ان کی نگاہیں سطح آب کی شکنوں پر جمی رہتیں ——— یوں کئی سال کی ہم نشینی سے ان دونوں کے دلوں میں محبت اور رفاقت کا ایک گہرا احساس جنم لے چکا تھا۔ ان کی روحوں میں اور جذبات کے زیر و بم میں کامل آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔ کسی کسی دن تو وہ دن بھر بالکل گنگ بیٹھے رہتے۔ اور ایک دوسرے سے ایک لفظ نہ کہتے لیکن کبھی کبھی جی بھر کر گپ شپ لڑاتے۔ واقعہ یہ تھا کہ ان کا انس و محبت اب ترقی پا کر اس معراج تک پہنچ چکا تھا جہاں دلوں کی کیفیت الفاظ کے ذریعے ادا کرنا ناممکن نہیں رہتا۔ اور جہاں روح کی آہنگی اور ذوق کی موافقت زبان کی بجائے نگاہوں سے بھی زیادہ دلوں کو ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے کی قدرت بخش دیتی ہے۔

بہار کے دنوں میں جب کبھی قبل دوپہر کی چمکیلی پہنائیوں میں وہ تار رکھے بیٹھے۔ اور سورج کا منور ترین منبع آتش کی بجائے [illegible] سا نظر آتا۔ جب دھوپ میں ایک تیکھی حدت کی بجائے ایک دھیمی دھیمی زندگی آمیز تپش کے فوارے ابلتے۔ تب جھیل کے چہرے پر ایک نئی شادمانی ظاہر

اور پھر دونوں اپنی اپنی ہنسی لانے کے لئے رخصت ہو گئے۔

ایک ہی گھنٹہ بعد وہ شکار کا ساز و سامان لیکر پھر اسی قہوہ خانے کے سامنے آ گئے۔ اور پھر شانہ سے شانہ ملا کر وہ بڑی تیزی سے سڑک پر چلنے لگے۔ ان کی چال میں فتحیاب سپاہیوں کا طنطنہ تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں مسرت و شگفتگی کی سرشاریاں ...... تھوڑی ہی دیر بعد وہ حفاظتی چوکیوں کے کمانڈر کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ کمانڈر ان کی ترنگ کا حال سنکر مسکرا دیا اور بالآخر چوکیاں عبور کرنے کا پرمٹ انہیں دیدیا۔

سرحدی چوکیوں کو عبور کر کے وہ ایک تباہ شدہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ایک انگوروں کے باغ میں سے گزرتے ہوئے وہ دریائے سین کی ایک چھوٹی سی ندی کے قریب آئے۔ اسی ندی کے کناروں سے ملحق ہوئی ان کی محبوب جھیل آباد تھی۔ ندی کے کناروں پر چڑھ کر جب انہوں نے آس پاس نگاہ دوڑائی تو انہیں ہر طرف ایک ہُو کا دہشت پھیلا ہوا نظر آیا...... ندی کا مٹیالا پانی دم بخود معلوم ہوتا تھا۔ کہیں کہیں اُگے ہوئے جیری کے پیڑ بھنچے بھنچے دکھائی دیتے تھے۔ باداموں فصلوں سے لبریز کھیت بیمار چہروں کی مانند بستے سے نظر آتے تھے .... غرضیکہ ہر شے موت کے بوجھل سایوں تلے کراہتی اور سسکتی نظر آتی تھی .... ندی کا پاٹ بہت ہی کم چوڑا تھا۔ اور اس کے کناروں پر جا بجا مٹی کے ڈھیر ابھرے پڑے تھے — ساوریج ندی کے دوسرے کنارے کی اونچی جگہوں کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے بولا:

"ان جگہوں میں لازماً جرمن سپاہی چھپے ہوں گے"!

جرمن سپاہی!

دونوں کے دل ان الفاظ کو سنتے ہی دہل گئے۔ اگرچہ ان دونوں نے آج تک کسی جرمن سپاہی کو دو بدو نہ دیکھا تھا۔ لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے پیرس کے چاروں طرف ان کی موجودگی کا پر حق تصور ہمیشہ ان کو دہلائے رکھتا تھا........ آہ جرمنوں کی موجودگی کا وہ بھیانک تصور جو عبارت تھا۔ تباہی و بربادی سے، لوٹ مار اور قتل و غارت سے۔ بے عزتی — و بے آبروئی سے اور بھوک اور قحط سے ——— یہ تصور اگرچہ بظاہر ایک غیر مرئی مخلوق تھا۔ لیکن اس کی خوفناک معنویت کو فرانس کا بچہ بچہ دن میں بیسیوں مرتبہ کئی خبیث شکلوں میں مجسم دیکھتا رہتا!

مارسیٹ لڑکھڑاتے ہوئے بولا:

"اگر ہم جرمنوں کے ہتے چڑھ گئے تو!"

"تو کیا؟" ساوریج خوش طبعی سے بولا "ہم بڑے ہی احترام اور بڑی ہی عقیدت کے ساتھ ایک مچھلی ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ تاکہ وہ اس کو اپنے دسترخوان کی زینت بنا سکیں۔"

لیکن ان ذہنی فریبوں کے باوجود وہ تادیر ندی کے کھلے کناروں پر آگے بڑھنے سے تامل کرتے رہے۔ دراصل انہیں چار سو پھیلے ہوئے خوفناک سناٹے اور وحشت خیز فضاؤں سے بڑا خوف آتا تھا۔

آخرکار موسیو ساوریج اپنا دل مضبوط کرتے ہوئے بولا: "آؤ خدا کا نام لے کر چلدیں"!

"چلدو بھائی، لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ"! مارسیٹ نے تشویش بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

اور پھر دونوں زمین پر لیٹ گئے۔ اور انگوروں کے باغ کی اوٹ لیکر ندی کے کنارے کنارے رینگنے لگے۔ ان کا سارا وجود بس آنکھیں اور کان بن کر رہ گیا۔ چنانچہ وہ ذرا سے کھڑکے کو سن کر اور کسی چڑیا کو اڑتے دیکھکر فی الفور تھم جاتے تھے۔ اور کان کھڑے کر کے اور آنکھیں پھاڑ کر اپنے آس پاس دیکھنے لگتے۔

انگوروں کے باغ کو عبور کرنے کے بعد ان کے سامنے پھر ایسی سپاٹ زمین کا ایک قطعہ آ گیا جس پر کوئی اوٹ موجود نہ تھی۔ مجبوراً انہوں نے اس جگہ کو دوڑ کر عبور کیا۔ اور پھر ساتھ ہی وہ اپنی محبوب جھیل کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو جھاڑیوں میں چھپا لیا۔ اور پھر کان دھر کر آس پاس میں کسی آواز کی ٹوہ لینے لگے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ ہیں تو انہوں نے اپنی ڈوریں پانی میں ڈالدیں اور اطمینان کے ساتھ مچھلیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

سب سے پہلے ساوریج نے ایک مچھلی پکڑی۔ پھر مارسیٹ نے اور اس کے بعد تو شکار کی یافت کا ایک تانتا بندھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی نہ کسی ڈور سے بندھی کلغی تڑپتی جس کے ساتھ میں ڈور کی کنڈی کے ساتھ پھنسی ہوئی سیمین مخلوق پارے سے بھری ہوئی شیشی کی مانند جھیل کی سطح پر ابھرتی اور پھر دونوں شکاریوں کے مابین دھرے ہوئے ہمجنسوں کے ڈھیر میں آ گرتی۔

مچھلیوں کے ڈھیر میں دم بدم اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں شکاریوں کی معصوم مسرتوں کے خزانے بھی بڑھتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مدت کے بچھڑے ہوئے دوستوں کو یکایک اپنی محبت کی کوئی گمشدہ فردوس ہاتھ آگئی ہے جس کی ایک ایک نعمت سے وہ جی بھر کر حظ اٹھا رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے چہروں پر دھوپ کا ایک نشاط بھرا پیار محسوس کیا اور پھر جانفزا پیار کی لہریں ان کی روحوں کی عمیق ترین گہرائیوں تک نفوذ کر گئیں۔ ان کی آنکھوں نے دیکھنا، ان کے کانوں نے سننا اور ان کے دماغوں نے سوچنا قطعاً چھوڑ دیا۔ دوسری کائنات ان کے واسطے جیسے مٹ کر رہ گئی!

یکایک ایک مہیب گرج نے ان کا سینہ ہلا دیا اور اس کے ساتھ ہی توپوں کی گونج جیسے فضا میں بکھر گئی۔

ماریسٹ نے گردن گھما کر دیکھا ۔ دور ندی کے کنارے کی ایک اونچی پہاڑی پر سیاہ دھوئیں کا ایک گولا سا نمودار ہوا اور ایک گرج سنائی دی۔ جس کے ساتھ ہی دھوئیں کی غلیظ اور بہت بڑا ہیولا بن کر پہاڑی کی چوٹی کے گرد آویزاں ہو گیا۔

تیسری مرتبہ پھر ایک زبردست دھماکا سنائی دیا اور اس کے بعد تو گھن گرج کا ایک تانتا بندھ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پہاڑی کے دہن سے ایک سیاہ دھواں نکلتا اور پھر کثیف دھوئیں کے مرغولے چار سو ساکن ہواؤں میں بڑے بڑے بادلوں کی صورت میں تیرنے لگتے۔

سادوریج نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔ "لگتا ہے کم بختوں نے پھر وہی منحوس حرکت شروع کر دی ہے۔"

ماریسٹ نے اپنی ڈور میں بندھے پر کو نیلے پانی کی سطح کے ساتھ کھیلتے ہوئے گہری نظر سے دیکھا۔ اور کچھ لمحے اپنے اندر ایک بھاپ سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے ان کا امن پسند دل ان دیوانے لوگوں کی جنگ آزمائی پر پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولا:۔

"کتنے احمق ہیں یہ لوگ، جو یوں حماقت اور ظلم سے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں!"

"احمق کیا، یہ تو درندے ہیں!" سادوریج تیزی سے بولا۔

ادھر ماریسٹ کی ڈور میں ایک نئی مچھلی پھنس چکی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے باہر نکالا۔ اور پھر کنڈی کے کانٹے سے اس کے نازک نتھنے کو جدا کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ جب تک دنیا میں سیاست دان موجود ہیں انسان ہمیشہ اسی طرح انسان کو فنا کرتا رہے گا!"

"اے کاش! فرانس ہی نے جنگ سے انکار کر دیا ہوتا!" ماریسٹ حیرت سے کہنے لگا۔

"جنگ سے انکار تو خیر کون کرتا، ہمارے لئے تو یہ جمہوریہ ہونا بھی وبال جان ہے۔ اگر فرانس میں کوئی بادشاہ حکمران ہوتا تو ہم بھی دوسرے ملکوں میں جا کر لڑائیاں لڑتے اور اپنے ملک کو ہرگز ہرگز میدانِ جنگ نہ بننے دیتے!" ماریسٹ نے کہا۔ اور پھر دونوں دوستوں کے مابین ایک میٹھی سی بحث شروع ہو گئی۔ اور وہ بڑے بڑے اہم سیاسی مسئلوں کو چھوٹے چھوٹے محدود مگر سادہ لوح ذہنوں کے ذریعے نہایت ہی صاف اور فطری دلائل سے حل کرنے لگے اور بالآخر دونوں بالاتفاق رائے اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں کسی شخص کو بھی آزادی نہیں ملنی چاہیئے۔ اور آزادی ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے رہی بے مہار آزادی جو کہ آزادی سے زیادہ شیطنیت کا درجہ رکھتی ہے (افسوس بے چارہ مولیسا اسلام سے بے خبر ہی دنیا سے سدھار گیا)

اور ادھر سامنے کی پہاڑی سے بدستور مہلک گولے برس برس کر.... فرانسیسیوں کے مکانوں کو تہس نہس اور ان کی زندگیوں کو نابود کرتے رہے۔ اور ساتھ ہی خدا جانے ہزاروں روحوں کے سہانے سپنے ان کی ہزارہا آرزوں سے سینچی ہوئی مسرتوں کی کھیتیاں اور ان کی آرزو ہا.... امیدوں، تمناؤں اور ولولوں کے سنہری تار و پود تباہ و برباد ہو گئے پھر ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے قلوب میں ایسے ایسے ناسور اور گھاؤ ہویدا ہوتے رہے جن کا علاج دنیا کے کسی طبیب کے پاس نہ تھا۔

"اور اسکا نام ہے زندگی!" ماریسٹ نے زہرخند کرتے ہوئے طرہ جڑ دیا۔ ناگہاں انہیں اپنے پیچھے چند قدموں کی چاپ سنائی

دی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے جسم میں خون جم کر رہ گیا۔ گردن گھماتے ہی انہیں اپنے سروں کے عین اوپر چار آدمی ایستادہ نظر آئے۔ چار مضبوط اور دراز قد آدمی، چار وردی پوش اور رائفلوں سے مسلح جوان۔ چار جرمن سپاہی!

خوف سے ان کے رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔ اور بنسیاں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پانی میں بے ملاح کی کشتیوں کی مانند تیرنے لگیں۔

چند ہی لمحوں میں ان کی مشکیں کس دی گئیں اور پھر جرمن سپاہی انھیں ہانک کر ندی کے پار ایک گاؤں میں لے گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ یہ گاؤں جو بظاہر تباہ شدہ کھنڈروں پر مشتمل نظر آتا ہے دراصل سینکڑوں جرمنوں کی کمین گاہ بنا ہوا ہے۔

بالآخر جرمن سپاہی انھیں نسبتاً ایک محفوظ مکان میں لے گئے جس کے آنگن میں بچھی ہوئی ایک سیاہ میز کے پیچھے ایک ہیکل شخص کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اس کا سارا بدن بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اسکی آنکھوں میں ایک شیطانی حیوانیت کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ موسیو سانترنج اور مارسیٹ کو دیکھتے ہی اس نے دانت نکوسے، اور پھر نہایت ہی شستہ فرانسیسی زبان میں بولا:۔۔

"کہو صاحبو۔ شکار کا کچھ مزا بھی آیا؟"

عین اس وقت ایک سپاہی نے مچھلیوں کا وہ سارا ڈھیر افسر کے قدموں میں ڈال دیا جسے وہ جھیل پر سے نہایت ہی حفاظت کے ساتھ اکٹھا کر لایا تھا۔

جرمن افسر مسکرا دیا، اور پھر بولا "خوب! شکار تو تم نے خاصا کر لیا تھا دوستو، لیکن بھئی ہم تو تم سے اور ہی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" پھر چند لمحے رک کر کہنے لگا "اب جو کچھ میں کہنے لگا ہوں اسے غور سے سننا اور خواہ مخواہ گھبرانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم فرانس کے دو جاسوس ہو جنھیں دشمن نے ہمارے فوجی راز جاننے کے لئے یہاں بھیجا ہے تم نے مچھلیوں کے شکار کا جو ڈھونگ رچایا ہے ہم اسے گرفتاری سے بچنے کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہم نے تمہیں عین موقعہ پر پکڑ لیا۔ اور ظاہر ہے کہ اب تمھاری سزا گولی ہے۔ جس کے اخلاقاً، قانوناً ہر لحاظ سے تم پورے مستحق ہو۔ لیکن تم جانو جنگی مصلحتوں کا ایک تقاضا اور بھی ہے۔ وہ تقاضا کیا ہے؟ لو سنو!

چونکہ تم فرانسیسی سرحدی چوکیوں سے ہو کر یہاں آئے ہو۔ لہٰذا یقیناً تمہیں ان چوکیوں سے گزرنے کا وہ شناختی لفظ بھی ضرور معلوم ہوگا جسے بتا کر تمہیں ان چوکیوں کو واپس عبور کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے وہ شناختی لفظ بتا دو۔ اس کے عوض میں تمہیں فی الفور رہا کر دوں گا۔

دونوں دوست سہمے ہوئے ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔ جرمن افسر کی باتیں سن کر دونوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ اور ان کے لٹکے ہوئے ہاتھ خزاں کی زد میں آئے ہوئے پژمردہ پتوں کی مانند کانپنے لگے لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔

جرمن افسر ان کی پریشانی کو بھانپ گیا، اور اب وہ نرمی سے بولا "دیکھو عزیزو، یہاں تمھارے ملک کا کوئی بھی آدمی موجود نہیں ہے اگر تم ہمیں وہ شناختی لفظ بتا دو تو تمھارا یہ انکشاف ہمیشہ کے لئے راز ہی بنا رہیگا۔ اور تمھارا کوئی ہم وطن اس حرکت سے آگاہ نہ ہو سکے گا لیکن ہاں اگر تم یہ لفظ نہیں بتلاؤ گے تو اس کا نتیجہ موت ہوگا۔ اور موت بھی فوری قسم کی۔ تو اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو اپنے لئے، موت یا زندگی؟"

دونوں بت بنکر سنتے رہے اور کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

جرمن افسر نے اب ایک دوسرے انداز میں گفتگو کرنی شروع کی۔ وہ جھیل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا:۔

"بس پانچ منٹ کی بات ہے کہ پھر تم اس جھیل کے کنارے جا پہنچو گے ..... صرف پانچ منٹ میں ... بولو کیا خیال ہے؟ بیوقوف مت بنو، دیکھو آخر تمھارے بال بچے بھی تو ہونگے۔"

اور ادھر پہاڑی پر سے پھر گولہ باری شروع ہو گئی۔

دونوں دوست بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ان آسمانی [illegible]

کی مانند جو پہلی بار زمین پر اترے ہوں اور یہاں کی زبان سے ناواقف ہونیکی وجہ سے کسی بات کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔

جرمن افسر نے سپاہیوں کو اپنی زبان میں کوئی حکم سنایا۔ اور پھر اس نے اپنی کرسی دونوں قیدیوں کی سیدھ سے ذرا ایک طرف کھسکالی۔ ادھر پورے بارہ سپاہیوں نے مارسیٹ اور سادریج سے کوئی بیس گز پرے جا کر اپنی رائفلوں کی سمت ان کی طرف باندھ دی۔ جرمن افسر درشتی سے بولا

"دیکھو، صرف ایک منٹ کی اور اجازت ہے آخری اجازت!" اور یہ ایک منٹ بھی گزر گیا۔

دفعتاً جرمن سپاہی کرسی پر سے اٹھا۔ اور پھر ان کے قریب جا کر مارسیٹ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور نہایت ہی ملائمت سے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "جلدی سے بتا دو وہ شناختی لفظ، گھبراؤ نہیں تمہارے ساتھی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ اور وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے تم پر ترس کھا کر چھوڑ دیا ہے۔"

مارسیٹ بالکل خاموش رہا

اس کے بعد جرمن افسر نے موسیو سادریج کو الگ لے جا کر اسکے کان میں بھی اسی مشورے کا منتر پھونکا۔ لیکن بوڑھے سادریج کے منہ سے بھی ایک لفظ نہ نکلا۔

افسر نے اب پھر جرمن زبان میں کوئی حکم سنایا اور سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کی گرفت مزید سخت کر دی

ناگہاں مارسیٹ کی نگاہوں کے سامنے مچھلیوں کا ڈھیر دوبارہ چمکا۔ یہ ڈھیر اس کے قدموں سے چند گز دور گھاس پر پڑا تھا اور اس کی بہت سی مچھلیاں ابھی زندگی کی کسک سے کلبلا رہی تھیں انھیں دیکھتے ہی مارسیٹ کے دل پر رقت سی طاری ہو گئی۔ وہ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں غم واندوہ کی گھٹائیں گھر کر چھا گئیں۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پلکوں پر گستاخ آنسو چھلک آئے۔

اسکا گلا رندھ گیا، اور وہ ہکلا کر بولا!

"ال..... ل..... ل وداع موسیو سادریج"

"الوداع موسیو..... مار..... رسیٹ!" سادریج نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے ان کے جسم یوں بے تحاشا جھول رہے تھے۔ جیسے وہ کسی بھونچال میں مبتلا دھرتی کے ٹکڑے پر کھڑے ہوں۔

"فائر" جرمن افسر دھاڑا

اور ایکدم اکٹھی بارہ گولیاں سنسناتی ہوئی لپکیں۔ معاً سادریج منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اور پھر مارسیٹ کا دراز بدن اپنے دوست کی نعش پر گر پڑا۔ مارسیٹ کا چہرہ آسمان کی سمت نگراں تھا اور اس کے کرتے کے اندر خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

جرمن افسر نے پھر ایک اور حکم سنایا اور چند سپاہی پتھر اور رسے لے کر نمودار ہوئے۔ جس سے مقتول دوستوں کی نعشیں باندھ کر وہ انھیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے جھیل کی سمت چل دیئے۔

اور دور پہاڑی پر سے اب بھی گولے برس رہے تھے اور اسکی چوٹی سے نکلتا ہوا دھواں اب ایک عظیم مینار کی شکل اختیار کر کے آسمان کی سطح کو چومنے لگا تھا۔

جھیل کے کنارے پہنچکر دو سپاہیوں نے سادریج کی نعش کو سر اور پاؤں سے تھام کر اٹھایا اور دوسرے دو نے مارسیٹ کی نعش کو۔ نعشوں کو ایک دو مرتبہ انھوں نے دائیں بائیں لہرایا اور پھر ایک غلیظ نعرہ مار کر انھیں جھیل میں پھینک دیا۔

گرنے سے پیشتر لاشیں فضا میں خم کھا گئیں اور پانی چھوتے ہی وزنی پتھروں کے بوجھ سے یکدم جھیل میں ڈوب گئیں۔

لاشوں کی ضرب سے پانی ایک لحظہ کے لئے تڑپا۔ چند چھینٹے اس میں سے اڑے، جھاگ امڈی، کناروں کی سمت لہروں کا ایک ہلکا سا تموج لپکا اور پھر وہی پرانا سکون اور سکوت چھا گیا۔ تاہم جھیل کی سطح پر خون سے بھرے ہوئے چند بلبلے ضرور دیر تک تیرتے رہے

جب سپاہی واپس اپنے افسر کی خدمت میں پہنچے اور اسے لاشوں کو ٹھکانے لگا دینے کی اطلاع دی تو ہمدردی و افسوس کا ایک ہلکا سا سایہ بھی اس کی جبیں پر نہ آیا۔ اور وہ بدستور درشتی سے بولا۔ "تو اب ان مچھلیوں کی باری ہے!"

اسکا باورچی سپاہی اشارہ پاتے ہی لپک کر بڑھا۔ اور افسر نے مچھلیوں والا ٹوکرا اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور بولا۔
"لے جاؤ انہیں اور فوراً تل کر لاؤ، مچھلیاں زندہ ہی مزا دیتی ہیں۔"

اس کے بعد وہ زور سے کھانسا، ڈھیر سا تھوک اگلا، اور پھر اپنے پائپ کو سلگا کر پینے لگا —— بڑے ہی مزے کے ساتھ!

(موپاساں)

(بشکریہ "تعمیر انسانیت")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے!

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری دسمبر ۵۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعہ مطلع فرمائیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم: مینیجر "مشیر" کراچی

نمبر	نام	نمبر	نام	نمبر	نام
۹۵۴	خان زمان خان صاحب میانوالی	۲۰۹۸	شیخ حافظ صاحب کلیان	۲۴۵۵	عبدالحق صاحب تبسم۔ ہری پور
۹۶۸	رحمان نجمی صاحب کراچی	۲۱۰۰	باقر احمد صاحب صدیقی۔ کراچی	۲۴۵۸	پاک مشینری سٹور سکھر
۹۷۱	ڈاکٹر گل احمد صاحب نی بنڈ	۲۱۱۴	بابو محمد اسحاق صاحب لاہور	۲۴۵۹	ثاقب گجراتی صاحب چنیوٹ
۹۸۱	عقیل صدیقی صاحب ملتان	۲۲۳۴	نور محمد خان صاحب حیدرآباد	۲۴۶۰	کریم بخش صاحب احمد پور
۹۸۶	حاجی محمد حیات صاحب رحیم یار خاں	۲۲۵۵	اہلیہ نہال احمد صاحب کراچی	۲۴۶۱	سید ممتاز علی شاہ صاحب لاہور
۹۸۷	شیخ محمد قاسم صاحب بھڈ	۲۲۵۷	علی احمد خان صاحب پیر جو گوٹھ	۲۴۶۲	سید دین محمد شاہ۔ بہاولپور
۹۹۲	مس کے ایم خالد۔ کراچی	۲۲۶۳	حاجی ابراہیم صاحب گوجرانوالہ	۲۴۶۴	عبدالعزیز خان صاحب (میانوالی)
۹۹۵	شیخ عبدالحمید عبدالغنی منٹگمری	۲۲۶۱	میر غلام رسول صاحب۔ کراچی	۲۴۶۸	نور محمد صاحب منٹگمری
۹۹۹	عطیہ یزداں صاحبہ۔ کراچی	۲۲۶۷	مولوی راجش الرحمت گلگت	۲۴۶۹	سیکرٹری اسپورٹس کلب ملاکنڈ
۱۰۰۴	قطب الدین صاحب راولپنڈی	۲۳۰۱	زین العابدین صاحب سوات	۲۴۷۰	محمد شمس الحق صاحب (بہار)
۱۰۱۵	فضل محمد صاحب پشاور	۲۳۲۹	عبدالسلام خان صاحب لاہور	۲۴۷۱	ایم اے منصوری صاحب کراچی
۱۰۱۹	حکیم محمد شریف صاحب سیالکوٹ	۲۴۱۹	محمد فاضل صاحب راولپنڈی	۲۴۷۳	حمیدالدین صاحب قریشی۔ کراچی
۱۰۵۰	م۔ع صاحب گجرات	۲۴۲۲	سید غوث صاحب کراچی	۲۴۷۸	عبداللطیف صاحب کراچی
۲۰۶۹	حفیظ الرحمٰن صاحب کراچی	۲۴۲۳	سید علی حسین ہاشمی شکارپور	۲۴۸۴	محمد عطاء الرب صاحب صدیقی بارسیال
۲۰۷۵	عبدالعزیز صاحب رحیم یار خاں	۲۴۳۳	عبدالرحمٰن صاحب منٹگمری	۲۵۰۱	محمد اسحاق صاحب مارتی پور
۲۰۸۳	کوہ نور آپٹیکل ایجنسی میمن سنگھ	۲۴۵۱	ایس اے رحمٰن صاحب کراچی	۲۵۰۴	عبدالرحمان محمد علی صدر صاحب راجشاہی
۲۰۹۱	فضل حق صاحب ملتان شہر	۲۴۵۴	سید احمد اللہ صاحب کراچی		

احمد نسیم مینالگری

جو کائناتِ حسن کی تفسیر بن گئی
ان کی وہ اک ادا مری تقدیر بن گئی

اک دن جو تھی [illegible]
وہ آفتابِ الفت کی [illegible] بن گئی!

طوفانِ برق و بادہ کا خدشہ نہیں مجھے
کٹ جائے گی جو راہ میں زنجیر بن گئی

اہلِ جنوں کے ہاتھوں سے تعمیرِ زندگی
خاکِ حیات [illegible] اکسیر بن گئی

یہ انتہائے گردشِ دوراں ہے کہ ہم
ہر شامِ غم حیات کی [illegible] بن گئی

نظر حور جوی

شراب میں ہے نہ ساغر و جام میں نہ مطرب کے ساز میں ہے
وہ کیف و مستی کہاں کسی میں جو نرگسِ نیم باز میں ہے!

الجھ کے جس میں سمجھ لیا میں نے وہ ابھی تک جو راز میں ہے
حقیقتاً سر بلا سے دوری کسی کی زلفِ دراز میں ہے!

غرور میں ہے نہ کبر میں ہے نہ سر بلندی میں خودسری میں
جو آہ و زاری میں لطف ہے یا مزا جو ناز و نیاز میں ہے!

جناب کی ایک ایک ادا سے میں خوب اچھی طرح ہوں واقف
میں جانتا ہوں وہ سب ہی کچھ جو دماغِ بندہ نواز میں ہے!

پلائے اصرار کر کے ساقی تو ننگِ اخلاق ہے نہ پینا
نظر یہ تیری دلیل بھی خوب میکشی کے جواز میں ہے!

انتم میرزا

روشنیوں کا شہر

دلی نے بچی ہوئی چرس کی گولیاں کاغذ میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیں۔ اور سندر پہلوان کی کٹڑی سے باہر نکل آیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ اور شام کے دھندلکوں میں موسم سرما کی ابتدائی کپکپاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ لگے بندھے گاہکوں کے ٹھکانوں کا چکر لگانے سے پہلے دلی شیراز خاں کی آمد کا پتہ لگانا چاہتا تھا۔ شیراز خاں کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اسے اب تک آجانا چاہیئے تھا۔ پہلے وہ کبھی اتنے دنوں تک سرحد میں نہ رہا تھا۔ جب کبھی جاتا۔ مال تیار ہوتا۔ اور کامیاب سازش کے تحت وہ صحیح سلامت واپس آجاتا۔ مگر اب ایک ہفتہ کی غیر حاضری نے دلی کے دل میں کئی وہم ابھارے تھے۔ اسے یقین تو تھا۔ کہ شیراز خاں کبھی بھی ——— ایکسائز والوں کے ہتھے نہیں چڑھ سکتا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس کا دل اچانک یوں تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ جیسے کسی خوفناک پنجے نے اسکی گردن دبوچ لی ہے۔ دن میں وہ کئی بار شیراز خاں کے چوبارے پر ہو آیا تھا۔ شیراز خاں کے دونوں نوکر بھی فکرمند تھے۔ انہیں بھی کوئی اطلاع نہ ملی تھی۔ اور وہ اپنے خان کی اس لاپروائی کا تصور سلیم کو ٹھہرا رہے تھے۔ سلیم ایک خوبصورت اور بحزیلا لڑکا تھا ——— اس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ اس کی چال میں عورتوں کی سی نزاکت تھی۔ اور چہرے کے نقوش میں جاذبیت اور کشش تھی۔ اس کو ٹھیکیدار محبت خاں کے ساتھ پہلی مرتبہ دیکھ کر شیراز خاں اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ سلیم کو اپنی ملکیت بنا کر ہی دم لے گا۔ اس نے سلیم کو ایسا سبز باغ دکھایا۔ کہ چند دن کے بعد وہ ٹھیکیدار سے ناطہ توڑ کر شیراز خاں کے چوبارے کی رونق بن گیا تھا۔ ٹھیکیدار کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ انتقامی جذبے نے اسے شیراز خاں اور اس کے ایجنٹوں سے سخت متنفر کر دیا تھا۔ اور پشاوری ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے قسم کھائی تھی۔ کہ شیراز خاں کو اس کا مال ہتھیانے کا ایسا سبق سکھائے گا۔ کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ شیراز خاں نے اس کی دھمکی کی کوئی پروا نہ کی تھی۔ ٹھیکیدار کے مقابلے میں وہ خود کو مضبوط پا رہا تھا۔ مگر ٹھیکیدار سامنے سے وار کرنے کی بجائے کوئی ایسا مضبوط جال بچھانا چاہتا تھا۔ جس میں سے انتہائی کوشش کے باوجود بھی شیراز خاں نکل نہ سکے۔ شیراز خاں نے اس طریقے سے اپنے کاروبار کو پھیلا رکھا تھا۔ کہ کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ سلیم اب ہر وقت شیراز خاں کے پاس رہنے لگا تھا اس لئے ٹھیکیدار اب اسے ذرا دھمکا بھی نہ سکتا تھا۔ اندر ہی اندر دشمنی بڑھتی جا رہی تھی۔ دلی پہلے ٹھیکیدار سے ہنس کر بول لیتا تھا۔ اب ان کی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ شیراز خاں کا ہر آدمی اب ٹھیکیدار کے لئے ایک زہریلا بچھو بن گیا تھا۔ دلی کو ٹھیکیدار کی نفرت سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ شیراز خاں کے ہوتے ہوئے اسے کسی کے غصے کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔ مگر اب شیراز خاں سرحد کی طرف مال لینے گیا ہوا تھا۔ ایک ہفتہ سے اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ اور اس یقین کے باوجود کہ شیراز خاں کہیں پر شکست نہیں کھا سکتا۔ دلی کا دل اچانک تڑپ اٹھتا تھا ——— شیراز خاں کے چوبارے کے سامنے پہنچ کر اس نے اوپر نظر اٹھائی چوبارے کا بلب روشن تھا زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ دلی کے چہرے پر ایک چمک پیدا ہو گئی جلدی سے سیڑھیاں چڑھتا۔ وہ چوبارے میں پہنچ گیا۔ شیراز خاں کے دونوں نوکر منہ لٹکائے اداس بیٹھے تھے۔ دونوں نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے ان کی بے چینی انتہا کو پہنچ گئی ہو" خاں صاحب کا کچھ پتہ چلا؟" دلی خاں کے سوال پر دونوں نے مایوسانہ انداز سے نفی میں سر ہلا دیئے۔ اور دلی کے چہرے کی چمک مٹ گئی۔ اور وہ یوں نیچے اترنے لگا۔ جیسے اسے چوبارے کے گرنے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہو ——— سڑک کے موڑ پر پشاوری ہوٹل میں خوب رونق تھی۔ ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بج رہا تھا۔ ہوٹل کے مالک ایوب خاں کے ہاتھ پھرتی سے چائے بنانے میں مصروف تھے۔ نوکر میزوں کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ روشنی زندگی کے ہنگاموں کو وجد میں لے آئی تھی ——

روشنی ادھ کھلی کلیوں کو پھول بنا رہی تھی۔ روشنی مکان کے اندھیروں کو دور پھینک رہی تھی۔ روشنی نے نیشادری ہوٹل کے حسن کو نکھار دیا تھا مگر اس روشنی میں دلی کو شیر از خاں کے خنجر کا شدید احساس ہو رہا تھا یہ روشنی اس کے یقین کو متزلزل کر رہی تھی۔ وہ سیاہیوں کا ایک غبار پھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایوب خاں نے اسے باہر کھڑے دیکھ لیا۔ پیالی میں روپیے بچھ ہلاتے ہوئے اس نے آواز دی: "دلی خاں۔ بھائی اندر آجاؤ"
اپنے نام کے ساتھ خاں کے اضافے پر وہ بے پایاں خوشی محسوس کیا کرتا تھا مگر اب اسے ایوب خاں کے لہجے میں طنز کے نشتر کی چبھن محسوس ہوئی۔
ایوب خاں نے مسکرا کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ دلی اس مسکراہٹ کو ایک بیہودہ مذاق سمجھنے لگا۔ اسے ایک دوسری جانی پہچانی آواز سنائی دی "دلی خاں۔ اندر آجاؤ" بالو سراج کے ہاتھ کا اشارہ پاکر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بالو سراج کے پاس ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ دلی نے اسے پہلی بار نیشادری ہوٹل میں دیکھا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے سر کو ذرا جھٹکا دیا۔ ذرا اس کی مسکراہٹ نے [illegible] اس نے میز کے نیچے ہاتھ کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی گولیاں نکال لیں۔ بالو سراج بولا: "دلی خاں تم نے پٹ لیا تھا [illegible] جلنے والے کو تاڑ لیتے ہیں اس سے زندگی کی امید نہیں ہو سکتی۔" دلی نے میز کے نیچے سے دو گولیاں سراج کو پکڑاتے ہوئے پوچھا: "کیا [illegible] نہیں گئی؟" ——
بالو سراج کے چہرے پر کرختگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے ایک گولی ساتھ والے آدمی کو پکڑا دی۔ دوسری جیب میں رکھ لی اور پیسے نکالتے ہوئے بولا "کل رات کو سینما کا آخری شو دیکھ کر گھر واپس آ رہا تھا کہ نادر حلوائی کو زرینہ کے مکان سے نکلتے دیکھ کر مجھ پر [illegible] وہ آہستہ سے بند ہو گیا۔ اور میرا جی چاہا کہ شور مچا کر تمام محلے والوں کو جگا دوں۔ مگر نہ جانے میں ایسا کیوں نہ کر سکا۔" دوسرے آدمی نے سگریٹ کا تمباکو ہتھیلی پر نکال لیا۔ اور گولی توڑ کر تمباکو میں ملا کر پھر سے سگریٹ میں بھرنے لگا۔ بالو سراج ساتھ والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ میرا لنگوٹیا یار اشرف ہے۔ بہت مدت کے بعد ملا ہے۔ آج دوپہر کو میں اس کے ساتھ کوٹھے پر کھڑا کبوتروں کو ہوا میں قلابازیاں لگاتے دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک کانچ کی چوڑی فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔
زرینہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی شوخی تھی۔ خمار تھا۔ اس کی اداؤں میں اب بھی چنچلاہٹ تھی شرارت تھی۔ جیسے اس نے رات کے حادثے کا کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔ میں جان چکا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے بیوقوف بنانے کے لئے ہو رہا ہے۔ اس کی بے وفائی کے قصے تو میں نے تم سے بھی سنے تھے۔ مگر یقین نہ آتا تھا اور اب میں اپنی آنکھوں سے نادر حلوائی کو اپنے مال پر چھاپہ مارتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔" اشرف التجاہٹ آمیز لہجے میں بولا: "ماضی کو بھول جاؤ دوست۔ بس سمجھ لینا کہ اتنے دنوں تک اس کی فرمائشیں پوری کرنے میں جو رقم تم نے صرف کی تھی۔ وہ چوری ہو گئی ہے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا۔ تو ایک ایک پائی وصول کر لیتا۔" ——
بالو سراج نے دانت کچکچا کر کہا "میں اب بھی اپنی رقم وصول کر سکتا ہوں مگر میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔ میں تو اب اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں۔" اشرف تسلی دینے لگا "اب تمہیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ میں سندھ سے جو عورت خرید کر لایا ہوں۔ وہ کبھی خواب میں بھی تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔" دلی ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دے رہا تھا۔
گولیوں کی قیمت وصول کر کے اٹھتے ہوئے بولا "پھر ملاقات ہو گی۔"
جب وہ باہر نکلنے لگا۔ تو ایوب خاں نے ہتھیلیوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر آگے جھکتے ہوئے کہا: "سلیم واپس آگیا ہے" اور دلی کے پاؤں لکڑی کے تختے پر جم کر رہ گئے۔ "خان کہاں ہے؟" اس کا اضطراب بڑھ گیا۔ ایوب خاں سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا "اس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا۔ ابھی سرور خاں بتا گیا ہے۔ کہ سلیم ٹھیکیدار کے ساتھ کار میں بیٹھا اسٹیشن کی طرف سے آ رہا تھا ٹھیکیدار کا منشی ابھی تک نہیں آیا۔ اس سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"
آگے قدم اٹھاتے ہوئے دلی کو ایک خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ٹھیکیدار اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ بار بار وہ گردن گھما کر اپنے خوف کو شرمندہ کر دیتا تھا۔ مسکرانے کی کوشش کے باوجود اس کے ہونٹوں پر کوئی کرن نہ پھوٹتی تھی۔ تانگہ اسٹینڈ پر پہنچ کر اس نے بڑے غور سے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر اڈے کے چوہدری کے پاس مونجھ کی بڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "دلی خاں آج بہت دیر سے آئے ہو۔؟" چوہدری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ دلی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "کوئی خاص بات

نہیں چوہدری جی۔ گھر پر ہی دیر ہوگئی تھی" دوسری طرف بیٹھا ہوا خوش پوش نوجوان کھڑا ہوگیا اور انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا "چوہدری جی۔ کل والا کوچوان ابھی تک نہیں آیا۔ بنا بنایا پروگرام بگڑ جائے گا" چوہدری اسے تسلی دینے لگا" بابو جی۔ وہ ضرور آئے گا۔ شاید کوئی دور کی سواری مل گئی ہو۔ اگر زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرسکتے۔ تو پھر کوئی اور بندوبست کردوں" نوجوان بولا "چوہدری جی کل اس نے ایک نمبر مال سپلائی کیا تھا اور آج اس نے اسے اس سے بھی قیمتی مال لانے کا وعدہ کیا ہوا ہے"

دلی اپنے قریب ہی۔ تانگے پر سوار ہونے والے خوب صورت بچوں اور میاں بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ بچے بڑے پیارے اور بھولے بھالے تھے۔ بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ وہ انہیں گود میں اٹھا کر سینے سے لگالے۔ شاید اس طرح وہ ذہنی انتشار سے خلاصی پالے۔ ایک بے چین خواہش اس کے دل میں ہل چل مچانے لگی۔ تانگہ چل پڑا اور دلی کی نظریں سڑک کے موڑ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں اپنے دونوں بھانجوں کے چہرے گھومنے لگے۔ اسے اپنے بھانجوں سے بہت محبت تھی۔ جب وہ کارخانے سے چھٹی کے بعد گھر واپس آتا تو دونوں معصوم بھانجے اس سے لپٹ جایا کرتے، اور ان کی توتلی باتوں سے وہ بے پایاں خوشی حاصل کیا کرتا۔ شیراز خاں کے ورغلانے پر اس نے نوکری چھوڑ دی۔ بغیر محنت کے وہ کارخانے سے زیادہ کما لیتا تھا۔ ایسے نفع بخش بیوپار نے اسے ایک نئی دنیا دکھادی تھی۔ اچھائی برائی کی پہچان کا احساس دبتا جارہا تھا۔ اور اس کے اور بھانجوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہوتی چلی گئی تھی ——— اس کی بوڑھی ماں اور بہنوئی نے بہت مخالفت کی تھی۔ اس کی بہن بھی ناراض ہوگئی تھی۔ مگر دلی کو تو جیسے شیراز خاں نے تعویذ گھول کر پلادیئے ہوں۔ کسی کی ناراضگی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ بلکہ الٹا وہ سمجھانے والوں کو اپنے مستقبل کی دولت مندی کے خواب سنایا کرتا تھا۔ اس کا بہنوئی جو کسٹڈی میں رہتا تھا۔ دوسری جگہ منتقل ہوگیا۔ پھر اس کی تبدیلی دوسرے شہر ہوگئی۔ دلی کو ان کی ناراضگی پر افسوس ہوتا تھا۔ اپنے بہنوئی کو اب وہ بے وقوف سمجھنے لگا تھا۔ اسکے نزدیک اب روپیہ حاصل کرنے کا فکر ہی آئین حیات بن چکا تھا۔ اسکی ماں اپنے نواسوں کی جدائی میں ہر وقت کڑھتی رہتی تھی۔ اور دلی بھی تنہائی میں یوں محسوس کرتا تھا۔ جیسے دونوں بھانجے اس کے کندھے پر سوار ہونے کی کوشش کررہے ہوں۔ عالم بے خودی میں اس کے بازو پھیل جاتے اور تصورات کی پگڈنڈی پر ٹھوکر کھا کر وہ چونک پڑتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بہنوئی اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی خاطر ضرور اس کے پاس آئے گا۔ مگر وقت گذرتا جارہا تھا۔ اور جدائی کی خلیج وسیع تر ہوتی جارہی تھی ——— چوہدری نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "دلی خاں آج دو گولیاں زیادہ دینا" دلی نے گہرا سانس بھرا۔ اور دو گولیاں چوہدری کو پکڑا کر رقم اپنے کٹ کی جیب میں ڈال لی۔ ڈوبتے ہوئے دل کو تھام کر وہ کھڑا ہوگیا۔ روشنیوں کے شہر میں شیراز خاں کے بغیر وہ خود کو اجنبی محسوس کررہا تھا۔ اس نے اپنے مستقبل کی جو ایک عمارت کھڑی کی تھی۔ شیراز خاں کی گمشدگی نے اس میں دراڑیں پیدا کردی تھیں۔ بس اسٹاپ کے قریب پہنچ کر اس کا پاؤں فٹ پاتھ سے نیچے جا پڑا۔ اور جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ کر چھوڑ دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دھندلکے پھیل گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ اور بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ پنواڑی کی دکان پر ریڈیو کی پھیلتی ہوئی آواز اسے بڑی ناگوار محسوس ہوئی۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے دو مسافر بڑی بے باکی سے انگریزی فلم کی ہیروئن کی سڈول پنڈلیوں کی تعریفیں کررہے تھے۔ دلی کو ان کی باتوں سے ایک الجھن سی محسوس ہورہی تھی۔ ایک ان جانا خوف اس کی روح کے اردگرد جال بنتا جارہا تھا۔ بس آگئی اور دلی بے دلی سے اس میں سوار ہوگیا ایک ضعیف آدمی کے پاس بیٹھ کر وہ پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی روشنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی آوازوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دائیں طرف والا آدمی نصیحتاً کہہ رہا تھا "ابے سالے۔ خون پسینہ ایک کرکے چار پیسے کماتے ہو اور مالدار بننے کے لالچ میں ریس کے میدان میں گنوا آتے ہو۔ اپنے بیوی بچوں کا تمہیں ذرا بھی خیال نہیں ———" بائیں طرف والا آدمی بولا "میاں وقت آلینے دو تم پہلے شخص ہوگے۔ جو مبارکباد کہنے آئیگے۔ اب کی بار گولڈن ہورن دوڑ رہا ہے۔ اس دفعہ ضرور جیتوں گا۔ اور بیوی بچے ٹھاٹ سے زندگی بسر کریں گے ———" اور دلی ماضی کے گہرے کنوئیں میں گرتا چلا

اس نے بھی تو ایسے ہی دلکش فریب میں مبتلا ہو کر اپنی بہن کے پیار کو
مجروح کیا تھا۔ اپنے بہنوئی کے خلوص کا [illegible] اڑایا تھا اور ابھی تک وہ
کچھ بھی نہ بن سکا تھا۔ اونچی حویلیوں اور چمکیلی کاروں کے خواب [illegible]
[illegible] اس کے آگے دوڑ رہے تھے۔ اور [illegible] خوفناک جبڑے
کھولے اسے نگلنے کے لئے چلے [illegible] اور [illegible]
کا کچھ پتہ نہ تھا۔ "گولڈن [illegible]
[illegible] اور اس کے لبوں پر [illegible] کالج کے ہوسٹل کے
سامنے وہ بس سے اتر آیا۔ [illegible] ہوئی بلی کی مانند
حرکت کر رہا تھا۔ کیفے [illegible] کے سامنے [illegible] لگی ہوئی تھی
[illegible] ہاتھ پر کھڑے ہو کر وہ [illegible] دینے لگا [illegible]
[illegible] دیکھ کے اسے تعجب ہوا۔ اس طرف [illegible] ایک آدمی کو [illegible]
کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ اس کے قریب [illegible] لہجے میں پوچھا
"بھائی صاحب۔ کیفے [illegible] کے سامنے لوگ [illegible] کھڑے ہیں"
اس آدمی نے جوشیلے لہجہ میں کہا! پرنسپل کی رپورٹ پر پولیس نے کیفے پر
چھاپہ مارا ہے۔ اور تجوری [illegible] کی گولیاں برآمد کی ہیں۔ ایسے
[illegible] ہمارے معاشرے کو [illegible] سے مکدر [illegible] ہیں۔ شیراز
[illegible] سے کالج کے نوجوانوں [illegible] کی وبا پھیلی ہے۔
ایسے لوگوں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہئیے۔ [illegible] اپنی گردن پر کھردرے
[illegible] کی گرفت محسوس ہوئی۔ [illegible] کی دھڑکن
[illegible] گئی۔ نیچے لمبے ڈگ بھرتا وہ [illegible] کی روشنی [illegible]
کے سائے عجیب ہیبت ناک شکلیں اختیار کر رہے تھے۔ [illegible] کی
اس کے بدن میں سوئیوں کی مانند [illegible] مستقل [illegible]
کے پاس جانے کی اس میں ہمت نہ رہی تھی۔ [illegible] اپنے کاروبار کے
[illegible] کا کبھی وہم تک بھی نہ ہوا تھا۔ شیراز [illegible] سوچ پر اسے
[illegible] تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیراز خاں کی [illegible] زندگی کے
کسی موڑ پر شکست نہیں کھا سکتا۔ اور اب شیراز خاں [illegible]
[illegible] کا مالک گرفتار ہو گیا تھا۔ اور [illegible] روشنیوں کے [illegible] وہ خود کو [illegible]
[illegible] کے مریض کی مانند پا رہا تھا۔ سینما ہوس کے [illegible] بورڈ
[illegible] ہوئی نیم عریاں ایکٹرس کی تصویر دیکھ کر اس نے یوں [illegible]

[illegible] جیسے کوئی اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں گھبونے لگا ہو
آخری شو کی گھنٹی ٹنٹنا رہی تھی۔ اس کی روح کی گہرائی میں یہ ٹنٹناہٹ
زہریلی چبھن کی طرح پھیل گئی۔ ہوٹل جہاں زیب کے سامنے پہنچ کر وہ خود کو
بہت تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ جیسے کسی
ڈھلوان پر سے لڑھکتا چلا آ رہا ہو شیشم کے سائے میں بیٹھ کر اس نے گھٹنوں
پر پیشانی رکھ دی۔ اور تیز تیز سانس لینے لگا۔ ہوٹل میں کوئی رنگین پروگرام
تھا۔ رنگ برنگی روشنیوں سے ہوٹل سجا ہوا تھا۔ آرکسٹرا کی لہریں فضا میں
نشہ بکھیر رہی تھیں۔ اور دل کا کرب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل
رہی تھیں۔ اس کے شعور میں کانٹے اچھل رہے تھے۔ اس کے کانوں میں
چیونٹیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ گردن اٹھا کر اس نے مضطرب نظروں سے سامنے
کی طرف دیکھا۔ ایک حسین جوڑا نشیلے انداز سے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ
رہا تھا۔ شیشم کے درخت کے پرلی طرف وہ جوڑا ٹھہر گیا۔ مرد کی نشیلی آواز
ابھری۔ "ڈارلنگ ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے۔ اس حسین رات کا ہی کچھ
خیال کر و۔ تمہارے بغیر میرے سب پروگرام ادھورے رہ جائیں گے"
عورت نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا! "رات بہت گزر چکی ہے۔ مجھے بیمار
بے بی کا خیال ستا رہا ہے" وہ "ددے پر گئے ہوئے ہیں۔ بے بی مجھے
بلا رہا ہے" مرد اسے پچکا سنے لگا۔ "اس عمر میں ہمیں بیلیوں کا اتنا خیال
نہیں کرنا چاہئیے۔ وقت سے پہلے آکر یہ بے بی ہمارے پروگرام کا ستیا ناس
کر دیتے ہیں

[illegible] اندر چلیں۔ رقص کرتے ہوئے تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔"
عورت [illegible] کا جواب دینے کی بجائے چلائی۔ "ٹانگہ" مامتا
نے [illegible] جذبات کی بے رحمانہ یلغار کو شکست دیدی تھی۔ اور ولی
یوں کھڑا ہو گیا جیسے اس کا بھانجا بیمار ہو۔ وہ اس کے لئے ترس رہا ہو۔
اور اس کی بہن دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کی تھکاوٹ
غائب ہو گئی تھی۔ اور اس کے قدم تیزی سے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے
پشاوری ہوٹل کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ کہ ایوب خاں نے اسے
آواز دیکر ٹھہرا لیا۔ ہوٹل میں سود خور پٹھان اونچی آواز میں باتیں
کر رہے تھے۔ ایوب خاں کی مصروفیت کم ہو گئی تھی۔ ولی کے قریب
آنے پر اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

ٹھیکیدار کے منشی سے معلوم ہوا ہے کہ شیراز خاں کے تعاقب میں ٹھیکیدار نے اپنے آدمی لگا دیئے تھے۔ اس حرام خور بونڈے سلیم کے ساتھ مل کر انھوں نے شیراز خاں کو عین موقع پر گرفتار کرا دیا۔"

اور وَلی نے یوں اس خبر کو سنا جیسے اس نے شیراز خاں کا نام پہلی مرتبہ سنا ہو۔ اس کے چہرے پر کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ کچھ کہے بغیر وہ گھر کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ گندے نالے کے پل پر پہنچکر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ اور اب وہ ایک قدم بھی آگے نہ اٹھا سکے گا۔ چرس کی گولیاں مٹھی میں پکڑ کر اسنے بازو اونچا کیا۔ اور نفرت کے ساتھ شدید جذبے کے تحت گولیاں گندے نالے میں پھینک دیں۔ ابھی تک اسکا بوجھ کم نہ ہوا تھا۔ اس نے فروخت کی ہوئی گولیوں کی رقم بھی گندے نالے میں پھینک دی اور اذیت ناک بوجھ اتر گیا۔ اور اسے یوں دکھائی دینے لگا جیسے دونوں بھانجے اس کے کندھے پر بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور بوڑھی ماں کے ارمان، بہن کا پیار اور بہو کا خلوص خوش آمدید کہنے کے لئے اس کی طرف دیوانہ وار بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ اس روشنیوں کے شہر سے بچ کر، جہاں چرس کے دھوئیں اور رقص کے دائروں میں انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ ... روشنیوں کے شہر کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ جہاں پاکیزگی اور خلوص کی قندیلیں انسانیت کے حسن کو نکھار رہی ہیں ٭

عاصی [illegible]

فغانِ صبحگاہی

زمیں سے عرش بریں [illegible] روں کی زقند — بس ایک فطرتِ خود بیں، بس ایک ذوقِ بلند

پھر امتحان [illegible] — خدا کے واسطے کوئی خلیل کا فرزند

تو ہی کچھ آہ [illegible] — اس آہ سے تو ستاروں پہ ڈالتے ہیں کمند

مرا خیال [illegible] نظر — مرا یقین، کہ نرگس کی آنکھ بالکل بند

تجھے خیال ہے [illegible] میں کیا ہے — ترے خیال کی مٹھی میں کائنات ہے بند

ترے وجود کا مطلب [illegible] کا ذوقِ نمود — ہے برقِ طور کا چشمِ کلیم سے پیوند

کہیں رکی نہ مری آرزوئے شوق [illegible] — طریقِ عشق میں آئے بہت سے پست و بلند

[illegible] نہیں مرے مولا مجھے فغاں ہی فغاں

کہ اپنی اپنی طبیعت ہے، اپنی اپنی پسند

لاکھوں دن کے کام کا نقصان
جناب! میں سخت کھانسی اور زکام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے آج دفتر حاضر نہ ہو سکوں گا امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔
اور یہ صرف اس لئے کہ لوگ کھانسی، نزلہ اور زکام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر دیکھئے کہ کتنے آدمیوں کا کتنا قیمتی وقت ان عام بیماریوں کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔
ایک طرف وقت اور دولت برباد ہوتی ہے تو دوسری طرف صحت و مسرت۔
اس بے اندازہ نقصان سے پناہ کی سب سے اچھی تدبیر ہے سعالین کا استعمال جو کھانسی، نزلہ اور زکام سے بچاؤ کا ذریعہ بھی ہے اور موثر علاج بھی۔
کھانسی، نزلہ اور زکام کی خصوصی دوا
سعالین
گلے اور پھیپھڑوں کی حفاظت کرتی ہے
ہمدرد
Sualin
Sualin

امین لودی ●

غنڈہ

طاہر کی [illegible] طبیعت کے مدنظر گھڑ لئے سے [illegible] ہوئے تھے [illegible] درجہ بدرجہ [illegible] ہنگامی کے پیش نظر [illegible] بکاری سے متنفر [illegible] "بدھو" مشہور تھا [illegible] دیہ پڑ دسیلوں کی طرح [illegible]

طاہر اپنے دل [illegible] خیالات کے [illegible] کی طبیعت [illegible] ماحول کے [illegible] سے مغلوب نہ ہو [illegible] کے برعکس جب کبھی کوئی [illegible] رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دیتا تو جواب میں مسکراہٹ [illegible] کی زبان پر یہ شعر آجاتا

نظر ملی ہے [illegible]
نظر کو مائل رنگیں [illegible]

اس کے دفتر والے بھی بڑے پُر مذاق [illegible] کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر کے لئے [illegible] مزاحیہ انداز میں اپنے افسر بالا کی نقلیں اتارتا۔ کوئی ترنم سے غزل پڑھتا کبھی کسی مسئلہ پر نہایت سنجیدہ گفتگو ہوتی اور کبھی کمرہ محض قہقہوں سے گونجتا۔ وہ خوب ہنستے۔ خوب باتیں کرتے کبھی سیاسی، کبھی مذہبی تو کبھی فلمی لیکن طاہر صرف اسی وقت بولتا جب کوئی شرعی یا اخلاقی مسئلہ زیر بحث ہو ورنہ وہ صرف سننے پر ہی اکتفا کرتا۔

ایک دن عین اسی وقت جب ان بابوؤں کی محفل گرم تھی، ایک لمبے تڑنگے سا شخص کمرے میں داخل ہوا اور ایک مخصوص انداز میں سلام کرکے اپنے دوست حمید کے پاس بیٹھ گیا۔ گو اس سے پہلے بھی گاہ بگاہ وہ آتا رہا تھا لیکن طاہر کو اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا چنانچہ ہر اس شخص کی طرح جو پہلی بار کسی عجیب و غریب آدمی کو دیکھے طاہر بھی اس کے تمام اعضا کو مجسس نگاہوں سے گھورنے لگا۔ بھاری بھرکم جسم، دراز قد، بڑا سر، لمبی لمبی مونچھیں۔ بڑی بڑی اور ڈراؤنی آنکھیں، موٹی اور پھیلی ہوئی ناک۔ سب کچھ حیران کن تھا۔ جب حمید اپنے اس "دیو نما" دوست کو لیکر کمرے سے باہر نکل گیا تو طاہر نے جو موقع کا منتظر ہی تھا اپنے برابر بیٹھے ہوئے اکاؤنٹس کلرک سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف ......؟"

"ارے اتنی مشہور ہستی کو نہیں جانتے۔ کمال کیا ملا صاحب آپنے بھی یہ تو کئی بار دفتر آچکا ہے اپنے رسید کلرک حمید سے ملنے جو اس کا ... دوست ہے۔"

"لیکن مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے کہ میں حمید کے کمرے میں نہیں بیٹھتا۔"

"میاں یہ فرسٹ کلاس غنڈہ ہے۔"

"ایں۔ غنڈہ۔ اور فرسٹ کلاس؟"

طاہر متحیر نظروں سے اس طرح اکاؤنٹس کلرک کو دیکھنے لگا جیسے وہ لفظ "غنڈہ" کی تفسیر جاننا چاہتا ہو۔ "فرسٹ کلاس" کی وضاحت کا متمنی ہو۔

"اماں حیران کیوں ہوتے ہو ملا صاحب۔ سب کچھ تمہاری سمجھ میں ابھی آجائے گا۔ سنو! یہ شخص دیکھنے میں قوی ہیکل اور بہت بھدا ہے لیکن تجارت کرتا ہے مسکراتی ہوئی کلیوں کی، مہکتے ہوئے پھولوں کی چھلکتی ہوئی جوانی کی، دلآویز حسن کی۔"

"آپ تو اب شاعری کرنے لگے۔"

میاں شاعری تو میرے خاندان میں کسی نے نہیں کی ـــــ میں کیا کروں گا۔"

پہیلیاں کیوں بجھاتے ہو صاف صاف باتیں کرو۔"

"اچھا تو اب بھی نہیں سمجھے۔ آخر ملّا ہی ہونا! دیکھو جس طرح اپنوں اور بیگانوں نے جتنے معزز خطابات ہو سکتے تھے سب تمہیں دیدیئے بالکل اسی طرح جس قدر نامعقول الفاظ ہو سکتے ہیں ان سب کی تفسیر اس "غنڈہ" کی شخصیت میں نظر آجائے گی۔ یہ "دیو" نہ صرف خود شرابی ہے، جواری ہے، عیاش ہو بلکہ وہ شراب، جوئے اور عیش کی تجارت بھی کرتا ہے۔ وہ بڑے آدمیوں کو ان کی تفریح کے تمام سامان مہیا کرتا ہے اور اپنے اس کاروبار کے لئے اس کی رسائی عام رنگینیوں سے لیکر "خاص حسن" تک ہے۔ وہ "خاص آدمیوں" کو ایسا حسن بھی مہیا کرتا ہے جو صرف محلوں کی زینت کا مستحق ہو۔ جو عام انسانوں کے تصور سے بالاتر ہو۔"

"لیکن ایسے زبردست غنڈہ سے اپنے حمید کا کیا تعلق؟"

"حمید اس کا دوست ہو اور شاید معاون بھی۔"

"اچھا یہ بات ہو؟"

"میرا خیال ہے تم دوسرا پہلو بھی سمجھ گئے۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ تم نے دفتر کے تمام بابوؤں کو جن کا لباس ان کی زبوں حالی کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ اکثر مہنگائی کا گلہ، بیماریوں کی شکایت اور اپنی تنگدستی کا ذکر کرتے ہوئے ضرور پایا ہوگا لیکن اس کے برعکس بھڑکیلا لباس پہننے والے حمید کو ہمیشہ خوش دیکھا ہوگا۔ وہی رسید کلرک حمید جو اپنے پاپیادہ آنے والے ساتھیوں کے مقابلہ میں اکثر اوقات ٹیکسی میں دفتر آتا ہے۔"

"بس بس اب میں سب کچھ سمجھ گیا۔"

کھانے کا وقت ختم ہو گیا اور تمام کلرک از سر نو اپنے اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ بظاہر طاہر بھی اپنی نشست پر تھا لیکن طائر خیال اسے دفتر کی فضا سے اڑا کر بہت دور لے جا چکا تھا۔ اس کے جذبات میں ایک اضطراب تھا۔ اس کا درد مند دل بے چین تھا وہ سوچ رہا تھا کیا وہ دن کبھی نہ آئے گا جب اس کا معاشرہ ان تمام آلودگیوں سے پاک ہوگا جب اس کی سماجی زندگی پُروقار اور باعظمت ہوگی۔ جب اس کا ملک دنیا کے لئے نشانِ منزل ثابت ہوگا۔ طاہر کے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہر اس شخص کو غنڈہ کہے جو اس بڑی بڑی مونچھوں والے "دیو" سے کسی صورت میں بھی ملتا ہو جو "طاقتور" ہونے کے باوجود اس "مجرم اعظم" کو پکڑنے میں ناکام رہتا ہو، جو اسے پکڑ لینے کے بعد سزا دینے سے گریز کرتا ہو۔

اسی دن شام کو طاہر الفنسٹن اسٹریٹ سے گذر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر نسرین پر پڑی جو اسی فرم کے کروڑپتی مالک کی بیٹی تھی جس میں طاہر ملازم تھا۔ یہ لڑکی حسن و جمال کی زندہ تصویر تھی۔ فرم کے دیگر افراد اس خوب صورت تتلی سے متعلق کئی داستانیں سُن چکے تھے لیکن طاہر سوائے اس کے وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے مالک کی بیٹی ہے اور ایک اچھے ملازم کی حیثیت میں وہ ہمیشہ اپنے دل کو نسرین کا احترام کرنے پر رضامند پاتا تھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب اس نے اس ماہرو دوشیزہ کو اسی لمبی لمبی مونچھوں والے تنومند ہیکل دیو کے ساتھ مصروف گفتگو پایا جس کے متعلق وہ آج بہت کچھ معلومات دفتر میں حاصل کر چکا تھا۔ یک لخت نسرین کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ ایک روح فرسا تصویر بنکر اس کے سامنے آگیا اور اس نے محسوس کیا جیسے ہزاروں معصوم دوشیزاؤں کی دلدوز چیخیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی ہیں۔ مدد کو بلا رہی ہیں۔ طاہر جذبات سے بے قابو ہو کر سڑک عبور کرتا ہوا چرنیٹے پر نسرین کے پاس پہونچا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کہئے۔" نسرین نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن علیحدگی میں۔"

"اوہ سمجھی! بزنس ٹاک۔"

نسرین نے مونچھوں والے سے کہا: "جسٹ اے مومنٹ۔" اور طاہر سے مخاطب ہو کر "آیئے" کہتی ہوئی دو تین قدم آگے بڑھ گئی۔ طاہر نے اس کے قریب ہو کر یوں کہنا شروع کیا۔

"گو آپ مجھے نہیں پہچانتیں۔ میں کون ہوں؟ لیکن میں آپ

جانتا ہوں۔ آپ میرے مالک [illegible] میں آپ کی فرم کا ایک معمولی ملازم ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کر دوں [illegible] ایک بہت بڑا غنڈہ ہے اور [illegible] آپ کو دیکھ کر [illegible]

"ہا ہا ہا ...... [illegible] کا ایک [illegible] کو [illegible] اور [illegible] بھی وہ ٹہلتے ہوئے بولے [illegible] سے خالی ہوں"

طاہر بے خوف [illegible] کو بلانے جانے کا مطلب [illegible] کے کہنے سے پولیس اس غنڈے کو [illegible] نصیحت پولیس کے [illegible] [illegible] میں آگئی اور [illegible] [illegible]

افسر ہو، مائی باپ ہو، ان داتا ہو۔

پھر آگے بڑھ کر طاہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"کیا وہی ہے میم صاحب ......"

اور پھر نخوت میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی

"ہاں بالکل یہی"

پھر کیا تھا لال پگڑی والا بری طرح گرجا۔

"ابے صورت شکل سے تو بڑا صوفی لگتا ہے تو اور پھر ایسے ——— لڑکیوں کو چھیڑتا ہے"

طاہر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیران و پریشان پھٹی پھٹی نظروں سے پولیس والے کو دیکھ رہا تھا۔

اور پولیس والے نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا "ابے دیکھتا کیا ہے چل۔ ابھی ہوش آجائے گا۔ غنڈہ کہیں کا"

(بشکریہ "امروز")

التماس ہے کہ ......

اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پتہ لکھنا نہ بھولئے۔ بغیر پتے کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ نیز ادارہ "مشیر" ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ——— (منیجر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۴ سے آگے)

کے علاوہ اور طرح سے بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ نگلی اور ہضم کی جاتی ہے اور اس طرح سارے جسم انسانی کو متاثر کرتی ہے خواہ ہم اسے محض چٹخارے اور لذت ہی کے لئے کیوں نہ کھائیں۔ میرے خیال میں تقریباً یہی عمل ہم اس وقت بھی مرتب ہوتا ہے جبکہ ہم کوئی ادبی نگارش محض تفریح خاطر یا تسکین ذوق کے لئے پڑھتے ہیں۔ اور پھر یہاں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ وہ ادب جو ہم محض تفریحاً پڑھتے ہیں بیشتر ہمیں زیادہ متاثر کرتا ہے کیونکہ اس وقت ہماری مدافعت کی قوت خوابیدہ اور قبولیت کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے یا بلا کسی محافظ کے ہوتی ہے۔ ایسا ادب اس لئے ہمارے پورے اخلاقی اور مذہبی وجود کو متاثر کرتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی کہی جا سکتی ہے کہ بلکہ عموماً کہی جاتی ہے کہ ادب کے معاملے میں ہمیں بہت وسیع النظر اور آزاد خیال ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کو یہ استحقاق ہونا چاہیئے کہ وہ جو کچھ چاہے سوچے اور لکھے ہمیں فکر اور اس کے نتائج پر حدود و قیود نہیں لگانی چاہیئے۔ اگر فکر غلط ہوگی اور اس کے نتیجے میں تخلیق مضرت رساں ہوگی تو تجربہ ہو جانے کے بعد ہم لوگ خود اس سے گریز کر لیں گے بلکہ غلط رجحانات تجربات کی کسوٹی پر آکر خود بخود دم توڑ دیں گے اس سلسلہ میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ ادب کوئی انفرادی چیز نہیں ہے بلکہ اجتماعی سرمایہ ہے اس کی تخلیق تو ایک فرد ہی کرتا ہے لیکن تخلیق کے بعد یہ عام میراث (Common Property) بن جاتا ہے۔ جس طرح سے اجتماعی زندگی میں کسی شخص کو اس بات کا استحقاق نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہے کرے کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال ہوتا ہے بلکہ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسروں کو نقصان پہنچے گا اسی طرح لکھنا بھی ایک فعل ہے جس کا اثر دوسروں پر مرتب ہوتا ہے۔ آخر کسی شخص کو اس بات کا استحقاق کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی من مانی نگارشات سے دوسروں کو بے راہ رو کرے۔ پھر یہ بات کسی حد تک باوزن سمجھی جاتی اگر اس سرزمین پر یا اس کائنات میں انسانوں کی محض ایک ہی نسل ابتدا سے انتہا تک قائم رہتی ہے۔ پھر اس طرح کے تجربات کے خوب خوب مواقع ہوتے اور اصلاح کے بھی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ یہاں نسلیں بدلتی رہتی ہیں انسان کی شعوری پختگی کی مدت مختصر ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس پر مزید بدقسمتی یہ بھی ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے پیش رووں تک کے تجربات کو بھول جاتی ہے یا بھلا دیتی ہے۔ اس لئے اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ انسانوں کے جم غفیر کو چند ذہین اور ناقابل ادیبوں کی تجربہ گاہ بننے دیا جائے

ادب اور مذہب کے باہمی تعلق پر گفتگو کرتے وقت عام طور پر تین طرح کے ادب ذہن میں آتے ہیں۔ پہلا ادب وہ مذہبی ادب ہے جو قرآن احادیث اور انجیل جیسی کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار ادب میں اسی طرح ہوگا جس طرح ہم تاریخ فلسفہ اور سائنس وغیرہ کی ان کتابوں کو جن میں تاریخی فلسفیانہ اور سائنٹفک معلومات کے علاوہ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ تاریخی یا فلسفیانہ یا سائنٹفک ادب کہتے ہیں۔ یہاں بات یہ ہوتی ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین کو اپنے مقصد اور معلومات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان پر اس قدر قدرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں ادب کی جھلک اس طرح پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کے موضوعات اور معلومات سے کوئی دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود محض اسلوب بیان کی خاطر انکی تصانیف کو پڑھ کر محظوظ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ادب محض اسلوب بیان ہی کا نام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر اس طرح کی کتابوں سے وہ اہمیت چھین لی جائے جو موضوعات کے لحاظ سے انہیں حاصل ہے تو بحیثیت ادب پاروں کے ان کا کوئی خاص مقام نہ رہ جائے گا۔ تقریباً یہی حیثیت مذہبی تصانیف کی ہے جن کی افادیت اور اہمیت اس لئے زیادہ کہ وہ خدا یا نبی کا کلام ہیں اور ان میں جو مواد ہے وہ بہت اہم ہے۔ اس لئے نہیں ہے کہ وہ ادبی تصانیف ہیں۔ دوسرے نمبر پر ہم اس شاعری کو لے سکتے ہیں جو منقبت اور نعتیہ شاعری کہلاتی ہے۔ یہاں بھی شاعر مذہبی اسپرٹ کے ماتحت شاعری کے پورے موضوع سے بحث نہیں کرتا بلکہ محض ایک جز سے بحث کرتا ہے اور انسان کے بہت سے دیگر اہم جذبات و احساسات کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ اس طرح کی شاعری کو عظیم ادب یا شاعر کو عظیم شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ شاعری محض ایک جز سے شاعر کے لگاؤ اور وابستگی کا پتہ دیتی ہے۔ تیسری قسم میں ہم اس ادب کو شمار کر سکتے ہیں جسے تبلیغی ادب کہتے ہیں یعنی وہ ادب جس کا مقصد محض مذہب کے Cause کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ یہ ادب سب میں کمتر درجے کا ہوتا ہے جس میں توبۃ النصوح ٹائپ کی کتابوں کا شمار ہو سکتا ہے لیکن

عقیل خیرآبادی

فکرِ ہوش

سر سے ہو "موازنہ" یہ خورشید مبیں ۔ اور
فرما رہے ہوں "جوش"[1] "مبیں" تاب نہیں اور

افرادِ تجدد کو یہ شاید نہیں معلوم
آتا ہے نظر فاصلے سے جہل حسیں اور

تعلیم کے منبر سے اذاں دیتا ہے کون
قرآں پڑھے جتنا بڑھے اتنا یقیں اور

تحقیق کہ اسلام ہے تصدیقِ مسلسل
ہاں ایک ہے بس ایک نہیں جہل مبیں اور

یہ رشتۂ الہام ہے وہ کشتۂ اوہام
مسلم کا یقیں اور ہے منکر کا یقیں اور

یہ نقل ہے ادراک کی وہ اصل ہیں ادراک
مجذوب و منافق کا زماں اور زمیں اور

خورشید کو دیکھا ہے کبھی ابر کی زد میں
ایمان نظر آتا ہے ظلمت میں حسیں اور

ہاں تشنۂ تکمیل تھی "انگشتِ شہادت"
درکار تھا اک خاتمِ عالم کو نگیں اور

سب "فاعتبروا یا اولی الابصار" کے باغی
اکبار ہوں یہ برسرِ زیں، زیرِ زمیں اور

لو جھک گئی وہ گردنِ گردوں سر افراز
اب "مارکس" کا در اور ہے "لینن" کی جبیں اور

"وادیٔ یہموں" کے اے شاعرِ بدمست
ہذیان ترا اور ہے جبریلِ امیں اور

"جوش" اپنے ہی الفاظ میں کھو جاتا ہے اکثر
کہتے ہوئے یہ شعر وہ شاید تھا کہیں اور

"یہ ساجدِ ذرات وہ مسجودِ کواکب
مومن[2] کی جبیں اور ہے کافر کی جبیں اور"

(فاران)

[1] جوش ملیح آبادی کی نظم کے جواب ہیں۔ [2] جوش صاحب نے اپنی پیشانی پر جبینِ مومن کا قیاس کیا ہے۔ حالانکہ جو خدا کے سوا اور کسی کے آگے سجدہ گزار ہو وہ سرے سے مسلمان ہی کب ہے۔ (م۔ق)

"میں تو خاک بھی نہیں سمجھی۔ ذرا بھی خطرناکی نظر نہیں آ رہی۔"

"بس تم تو یونہی ہو۔ ابھی اور بھی سنو۔ میں نے سمجھا ایک کام تو خراب کیا لاؤ کوئی ایسا کام سنواروں کہ اماں تھوڑا سا خوش ہو جائیں۔ چھوٹے بچوں کو اپنے کمرے میں سمیٹ لائی۔ میں آج اپنا تجربہ کرنے پر تلی ہوئی تھی یعنی رہنما ہونا۔ تاکہ کسی کو سینا سکھاؤں کسی کو بننے میں لگا دوں اور کسی کو اسکول کا کام ہی کرا دوں۔ جیسے اماں کرتی ہیں۔ مگر یہ بچے بالکل میرے قابو میں نہ آتے۔ بہتیرا کہانیاں اور نظمیں سنانی شروع کیں لیکن انھوں نے کچھ سُن کر نہ دیا۔ بلکہ الٹا مجھے تنگ کر دیا۔ ایسی پیچ دھاڑ مچائی۔ میرا منہ پڑا لیا۔ نقلیں اتاریں اور وہ بدتمیزیاں کیں کہ میں رو دی۔ آخر تنگ آکر سب کو مار مار کر نکال دیا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ کیا کم خطرناک باتیں ہیں ذرا سوچو تو سہی۔ کہیں ایسا دیو کو آگے چل کر میرے گھر اور بچوں کے منصوبے ایسے ہی اڑا اڑا دھم ہو جائیں اور میں حیران پریشان منہ دیکھتی رہ جاؤں۔ کیوں مہرو ایسا تو نہ ہوگا۔ بتاؤ بہت سی باتیں تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ سوچتے سوچتے میرا جی دنیا سے اچاٹ ہوا جا رہا ہے زندگی سے بیزار ہوں۔ یہ دنیا کیسی خوب صورت جگہ ہے کیسی عجیب عجیب اور انوکھی باتیں ہم روز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اس خوب صورت اور عجیب جگہ میں زندگی بھی تو خوب صورتی اور حسن کے ساتھ گذارنی چاہئے۔ چپ کیوں میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ کیا یہ غلط ہے، بولتی کیوں نہیں مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ بے ڈھنگے پن سے میں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی خود ہی خراب کر لوں گی۔ پھر دنیا میں آنے کا کیا فائدہ اور جینے کا کیا مزا؟"

"ارے لڑکی! دیوانی ہو گئی ہے کیا، آج سے پہلے تو بھلی چنگی تھی۔ شاید جلی ہوئی ہنڈیا کی بو تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ اتنی سی بات سے زندگی سے بیزار ہوا کرتے ہیں۔ اگر یوں جئے تو زندگی میں کئی کئی مرتبہ مرنا پڑے۔ جب بچے لکھنے کی کوشش میں حرف بگاڑ بگاڑ دیتے ہیں۔ اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ آئندہ وہ خوشخط لکھ ہی نہ سکیں گے۔ پگلی زندگی تو مسلسل کوشش اور تجربہ کرتے رہنے کا نام ہے۔ اس جینے سے بیزاری کا علاج میں بتاؤں؟"

"ضرور، مگر مہرو میں سوچتی ہوں کہ یہ خوشخط والی بات میری سمجھ میں پہلے کیوں نہ آئی۔ دو تین گھنٹے میں کتنی پریشان رہی مشکل سے دل بہلانے کو یہ کتاب ڈھونڈ نکالی۔ ہائے اللہ اگر تم نہ آتیں تو یہ رات مشکل سے گذرتی پھر کیا ہوتا۔"

"پھر یہ ہوتا . . . . . . ہاں وہ میں یہ کہہ رہی تھی۔ لڑو گی تو نہیں خدا لگتی کہوں ذرا موڈ بدلا ہے تمہارا۔"

"واہ کیا دیوانہ سمجھ لیا ہے مجھے کہ لوگوں سے خواہ مخواہ لڑتی پھروں۔"

"سنو! سیدھی سی بات میرا کہنا یہ ہے سنو تمہاری بیزاری کا علاج یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر شادی کر ڈالو اپنا علیحدہ گھر بساؤ۔ اپنے بال بچوں کو پاکر تم مگن ہو جاؤ گی۔ تمہارا گھریلو نفرت اسی وقت مسرت محسوس کرے گی۔"

"اپنا گھر بسانے برائے ایسا نہ ہو۔ اب جس گھڑی رہ رہی ہوں وہاں سے بھی نکال دی جاؤں۔ تمہاری عقل بھی ٹھکانے ہے کہ نہیں۔ کیوں جوتے کھلوانے کے کام کرتی ہو۔"

"کیوں شادی کرنا جوتے کھانے کا کام ہے؟"

"اگر نہیں تو آپ اماں جان کے پاس چلتی شہانی چلی جاؤ پھر پاس بیٹھ کر بڑے پیار سے کہنا اماں! ہم تو ہماری شادی کرا دیجئے۔ دیکھیں سوال جو تے لگتے ہیں کہ نہیں۔ اپنا اس نسخے کو خود ہی ہو آزما دیکھو۔"

"خیر یہ وقت آنے پر ہم بھی آزما لیں گے۔ اس وقت تو تمہارا ذکر ہے مطلب یہ ہو کہ یہ تو ٹھیک ہے مگر . . . . مگر ماں باپ سمجھیں جب . . ."

"تو اور کیا۔ کیا کوئی لڑکی اپنے منہ سے کہتی ہے کہ اب شادی کا وقت آگیا ہے کر دیجئے۔ اس وقت کا تصور تو کرو مہرو۔ اپنی بچی میں یہ آثار جنون دیکھکر ماں باپ کیسے گھبرائیں گے؟"

"مجھے کیا خبر تھی، اگر تم شادی پر ایسی ہی آمادہ ہو رہی ہو تو لاؤ میں خالہ جان سے کہتی ہوں۔"

"دیکھ لو وہی بات۔ ہنس کیوں رہی ہو۔ خود ہی تو ذکر چھیڑا تھا خود ہی مذاق بنا رہی ہو۔ تمہارا خیال تھا میں شاید لڑنا شروع کر دوں گی۔ کیا شادی پر بات چیت کرنا جرم ہے۔ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق خیال آ ہی جاتا ہے میں اکثر خیال کرتی ہوں کیا لڑکیوں کے لئے ایسا سوچنا بڑی بات ہے۔"

"ارے نہیں، میں تو تمہیں یوں ہی چھیڑ رہی تھی۔ اپنے دل میں مستقبل کے متعلق خیال آنا قدرتی بات ہے اور قدرتی خیال برا نہیں ہوتا۔ میں کسی روز خالہ جان سے ذکر کر دوں گی۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں۔ اب چلتی ہوں۔"

"ابھی نہیں کوئی بلانے آئے گا تب چلی جانا۔ میرا جی چاہتا ہے آج تم سے بہت سی باتیں کروں۔"

"دیر ہو جائے گی، بھئی اماں خفا ہوں گی۔ سونے سے پہلے تم سے باتیں کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس لئے چلی آئی ہوں۔"

"چلو کیا ہوا۔ ایک دن میرے لئے خفگی سہہ لینا۔ تم کہتی ہو اماں سے ذکر کروں گی۔ مگر کیا یہ ایسی بات ہے کہ کوئی بتلائے تب ہی خبر ہو۔ ماں باپ اپنی اولاد کی زندگی کے اس پہلو سے آنکھیں بند کئے رکھنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ لیکن مناسب عمر کو پہنچنے کے بعد کیوں موقع نہیں دیتے کہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائیں۔ اپنے لئے دنیا میں جگہ پیدا کریں۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔"

"نہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ کون ماں باپ بے خبر رہتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ سیانی لڑکی کو دیکھ دیکھ کر ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین غائب ہو جاتا ہے۔ اچھے رشتے کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب کوئی رشتہ ملے گا اسی وقت شادی کریں گے۔"

"اچھا رشتہ کسے کہتے ہیں۔ اچھا رشتہ حاصل کرنے کے لئے پہلے وہ لڑکیوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے لئے جہیز اکٹھا کرتے ہیں۔ انہیں ہر [illegible] کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ تب وہ [illegible] بن جاتی ہیں پھر ان کی عام رشتے پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحبزادی کیا بنائیں۔ بیکار مباش کچھ کیا کر کے اصول پر ان سے ڈگریوں پر ڈگریاں دلائے چلے جاتے ہیں۔ یا سروس میں ڈال دیتے ہیں۔ صاحبزادی کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور شادی کے معاملے میں نسبت گھٹتی جاتی ہے۔ آخر یہ گورکھ دھندا کب تک۔ یہ چکر کب ختم ہوگا؟"

"یعنی لڑکیوں کو ڈگریاں لینے یا سروس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"بات تو سمجھا کرو۔ یہاں عام لڑکیوں کی بات ہو رہی ہے۔ جو لڑکیاں ڈگریوں کا شوق رکھتی ہیں یا سروس کرنا چاہتی ہیں ان کو کون روکتا ہے۔ مثلاً مجھے سروس کا مطلق شوق نہیں۔ نہ مجھے پرنسپل یا پروفیسر بننا ہے۔ مجھے پروفیسر قسم کی لڑکیوں کے خشک خشک چہرے اچھے نہیں لگتے۔ موٹی موٹی ڈگریاں ان کی شوخی اور تازگی کو چاٹ جاتی ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند کا سوال ہے۔ دو تین مہینے بعد میری کالج کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ عام زندگی بسر کرنے کے لئے علم سے جتنی رہنمائی ہو سکتی ہے، وہ مجھے مل چکی ہے۔ اس کے بعد کیا کرنا چاہئے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اور کچھ نہ کچھ سوچنا قدرتی بات ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا۔ میں کیا تم سے کوئی سفارش چاہتی ہوں یہ تو آپس کی بات چیت ہے۔ ظاہر ہے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر رہے۔ کیا تم سنجیدگی سے ایک چھوٹی سی بات پر غور نہیں کر سکتی۔ جب لڑکیاں بچپن اور لڑکپن کی سرحد گزار کر سیانی ہو جاتی ہیں۔ ان کا جسم طاقت اور توانائی حاصل کر لیتا ہے۔ جس طاقت کے بل پر وہ اپنا گھر بار سنبھال سکتی ہیں۔ نیا خون انہیں ایک جوش اور حوصلے کے ساتھ زندگی کے میدان میں قدم رکھنے پر ابھارتا ہے۔ ان کی کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ چند منصوبے ہوتے ہیں۔ اپنی فطرت کے خلاف وقت گزارتے گزارتے کیا یہ صلاحیتیں بیکار نہیں ہو جائیں۔ وہ نیا نیا جوش ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔ میں تو کہتی ہوں کہ صلاحیتیں اور جوش اس طرح بیکار ضائع ہی نہیں ہوتے بلکہ بوسیدہ ہونے لگتے ہیں۔ میں کتنی ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جن کی اپنے گھر کے انتظار، انتظار میں، بالوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہونے لگی ہے۔ آنکھوں کی چمک مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ میٹھی میٹھی لوریاں لبوں پر ہی خشک ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں سوچتی ہوں ان کا قصور کیا ہے۔ ایسی پژمردہ لڑکیاں اگر کبھی گھر دار بنیں تو کیا ان کا جسم ان کے دل کا ساتھ دیگا۔ کیا یہ تازگی اور جوش دوبارہ پیدا ہو سکے گا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایک پھول مرجھانے کے بعد دوبارہ خوشبو نہیں دے سکتا۔ ایک پھل ایک بار پک چکنے کے بعد پہلے جیسا خوش ذائقہ نہیں رہ سکتا۔ کیا انسانی زندگی میں فطرت کا اصول بدل جائے گا۔"

"او میرے خدا! آخر تم کیا چیز ہو، یہ سب باتیں تم کس وقت سوچ لیتی ہو۔ میں تو تمہیں عام لڑکیوں کی طرح سمجھتی تھی۔ زندگی کے معاملے میں تمہاری نظر کتنی گہری اور سچی ہے یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا۔"

"ہم سب عام ہی لڑکیاں ہیں۔ کوئی خاص پیدا نہیں ہوتی۔ کسی کے سرخاب کے پر نہیں لگے ہوتے۔"

"تمہارا جوڑ کم از کم ذہنی اعتبار سے تو تمہارے ہم مرتبہ ہونا چاہئے۔"

"لیکن یہ جانچ کون سکتا ہے۔ رواج تو یہ ہے کہ ظاہری ٹھاٹ بلٹ گریڈ آفیسری دیکھی جاتی ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کی ذہنی افتاد کو

سمجھ نہیں پاتے جو پرانی اولاد کی ذہنی بھول بھلیوں کا سراغ لگاتے پھریں گے"

"یہ تو طے شدہ ہے کہ اولاد کے معاملے میں تمہیں والدین پر اعتبار نہیں۔ تم سخت قسم کی باغی لڑکی واقع ہوئی ہو۔ تمہارا تو یہ جی چاہتا ہو کہ سارے ماں باپ رات کو نیت کر کے سو جائیں۔ صبح اٹھتے ہی منہ اندھیرے دروازہ کھول چوکھٹ پر کھڑے رہیں۔ جو پہلا آدمی نظر پڑے اس کے ہاتھ میں بیٹی کا ہاتھ تھما کر بے فکر ہوں"

اختر ایسی ہنسی کہ بے حال ہو گئی۔

"کیا کہنے ہیں تمہارے۔ یہ تو بڑی رومانی قسم کی شادی ہوئی پر تم نے کہانیاں نہیں پڑھیں۔ اس اصول پر کتنی ہی شہزادیاں لکڑہاروں اور چرواہوں سے بیاہی گئیں۔ سچ مچ وہ شہزادیاں بھی کیسی —— خوش قسمت ہوں گی۔ محل و دربار کے تکلفات سے نجات پا کر شکر کرتی ہوں گی۔ اپنے ہاتھ سے دودھ دوہنے اور لکڑیاں کاٹنے میں انہیں کتنا مزہ آتا ہو گا"

"ان کی قسمت پر اگر ایسا ہی رشک آرہا ہے تو اپنے لئے کوئی چرواہا ہی کیوں نہ منتخب کر لو"

"کیوں چرواہا کیا برا ہے۔ آج کل زمانہ کتنا ترقی کر گیا ہے —— تہذیب و تمدن، معاشرت، رہن سہن۔ ہر شے میں ترقی ہوئی ہے کیا چرواہوں نے ترقی نہ کی ہو گی ایک چرواہا جس کا عمدہ ساڈیری فارم ہو موٹی تازی تندرست گائیں، بھینسیں ہوں جس کے ہاں خالص، دودھ مکھن اور گھی کی فراوانی ہو۔ اپنے کھیت کیار ہوں۔ ایسے گھر کا انتظام سنبھالا تو بڑا دلچسپ کام ہو سکتا ہے، یقیناً"

"ہو گا تو چرواہا بھی بہرحال عام انسان ہی کی طرح"

"اس میں کیا شک ہے"

"مگر عام آدمیوں کو تو انسان نہیں کہتے۔ تم سچ کہتی ہو۔ اختر کبھی ماں باپ ایک معمولی لڑکے کے ساتھ اپنی لائق فائق لڑکی بیاہنا پسند نہیں کرتے مالدار گھرانوں، گزیٹڈ آفیسروں کی تلاش اور ان کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں"

"یہ ایک روایت بن گئی ہے، وقت آگیا ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کی جائے۔ اصل میں ہمارا زندگی کا تصور ہی غلط ہو گیا ہے۔ سادگی، ہر حال میں خوش رہنا اور تحمل۔ یہ تین بڑے اور اہم اصول ہماری زندگی کے تصور سے بالکل خارج ہیں۔ جو زندگی گذارتا ہے اور جو زندگی گذارنے میں ساتھی بنتا ہے دونوں ان اصولوں سے مدد نہیں لیتے یہ ساری گڑبڑ اسی کی ہے۔ زندگی تو بہرحال ایک گذرنے والی چیز ہے۔ ہوتا یہ ہو کہ میاں بیوی سے بیزار، بیوی میاں سے شاکی۔ دل دنیا سے اچاٹ ہر ایک اپنی اپنی قسمت کو کوستا ہوا ملتا ہے۔ یہ رواں دواں ابلتی بپھرتی زندگی چڑچڑے پن اور لکڑ مزاجی کی بھینٹ چڑھ کر برباد ہو جاتی ہے۔ زندگی کی راحت اور خوشی و خوشحالی پر منحصر ہے۔ دولت و امارت گزیٹڈ آفیسری گورنری اور سکریٹریٹ پر نہیں"

"تمہاری باتوں میں کتنا یقین اور حقیقت ہے۔ میں نے اس پہلو پر کبھی اتنے خلوص سے سوچا ہی نہیں تھا کہ ع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

اس مختصر سی عمر میں تم نے یہ سمجھ کہاں سے پائی؟"

"دوسروں کے تجربات سے! میں آنکھیں کھول کر چلنے کی قائل ہوں اندھا دھند قدم نہیں اٹھاتی۔ آخر سب لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جب کوئی نوجوان ذمہ دارانہ زندگی کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے اپنا راستہ خود ہی ہموار کرنا پڑے گا۔ تب کسی نہ کسی مرحلے میں کامیابی اور آسائشیں مل ہی جائیں گی۔ اگر اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں اور جو کچھ پاس ہے وہ بھی کھویا جا سکتا ہے"

"اور اس وقت کے انتظار میں مائیں اپنی بیٹیاں لئے بیٹھی رہیں گی اور ان کے اندر زندگی کی آرزو کا شعلہ کجلا کر رہ جائے گا اور اس کی چھائی اڑ اڑ کر ان کے بالوں پر جمتی رہے گی۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"بالکل۔ جب ہر حال میں انتظار ہی کرنا ہے تو ماں باپ کے گھر میں بیٹھ کر کیوں بال سفید کئے جائیں۔ جس کی زندگی کا ساتھی بننا ہے اس کے گھر کیوں نہ ہوں۔ اس کی کوششوں میں اس کا ہاتھ بٹائیں اس کی کامیابی میں بھی لطف اٹھائیں۔ میں ان رسم و رواج کی غلطیوں سے بیزار ہوں۔ یہ جونکیں بن کر چمٹ گئے ہیں۔ لڑکیوں کا زندہ گرم گرم خون چوس جاتے ہیں ان سے تو اپنے اسلام کے پرانے اصول ہی بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ جانے ہم نے انہیں اپنی ریت رسم کی فہرست سے کیوں خارج کر دیا ——"

"جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کی شادی کرنا چاہی تو خود ہی ان کا پیغام لے کر گئے تھے۔"

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کا رشتہ خود ان سے مشورے کے بعد طے کیا تھا۔ کوئی دولت مند اور عہدیدار تلاش نہیں کیا۔ سادگی سے شادی کی۔ دونوں ہر حال میں خوش رہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت تنگی ترشی میں بسر ہوتا۔"

"باتوں میں بہت دیر ہو گئی اب تو جانے دو۔"

"آج نہ جاؤ تو کیا ہے۔ صبح چلی جانا، میں امی جان سے کہتی ہوں وہ تمہارے ہاں کہلا دیں گی۔"

"نہیں بھئی اب تو چلتی ہوں۔ بڑا ضروری کام ہے۔"

"لے، اب آدھی رات کو کون سا ضروری کام یاد آ گیا۔"

"یاد ہی تو آیا ہے۔ تمہارے لئے کوئی چر دانا تلاش کرتی ہوں۔ صبح ہی دروازے پر کھڑا پاؤ گی۔"

"یہ تمہاری خراب عادت نہ گئی۔ مار کھائے بغیر مانو گی نہیں۔"

"مار وار چھوڑو۔ اب میں کہاں ماننے والی ہوں۔ بھائی جان پرسوں سے ابھی میں بہ جگہ نکلنے گئے ہیں۔ ان کا ارادہ چھوٹا سا ڈسری فارم کھولنے کا ہے۔ پولٹری فارم بھی۔ میں تم سے ذکر کرنا ہی بھول گئی تھی۔ تمہارے چر دانے کی بات پر خیال آ رہا ہے۔ ایک گریجویٹ ہائی کلاس چر دانا مل سکتا ہے۔ بولو کیا خیال ہے!"

"تم تو میری بیزاری کا علاج گھر سے تجویز کر کے لائی تھیں۔"

"ایمان سے میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ تمہارے جان کے مقابلے میں ہماری کیا حیثیت ہے۔ ایسے بڑے گھرانے کی لڑکی خیال ہم غریبوں کو کہاں آ سکتا ہے۔ مگر آج کی باتوں سے تو میں سوچ رہ گئی کہ تم اور بھائی جان دونوں مل کر بڑی اچھی اور خوشگوار زندگی رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں مال و دولت کے انبار نہیں مگر گزر بسر اچھی ہو جاتی ہے۔ وہ میرے بھائی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھائی ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے بڑے اچھے آدمی ہیں آخر ایک دن انہیں اپنا گھر بسانا ہے ہم اُن سے اکثر پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیسی لڑکی پسند ہے۔ میرے اندازے میں اُن کے اور تمہارے خیالات بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ مجھے تم سے جتنی محبت ہے تم خود جانتی ہو۔"

"مگر نند بن کر کٹ کھنی مت بن جانا۔"

"اگر تمہارے والدین میرے بھائی کا رشتہ پسند کر لیں تو تم دونوں آئیڈیل قسم کے میاں بیوی ثابت ہو گے۔ کیا اس چر دانے پر نظر انتخاب پڑ سکے گی۔ اب کیوں سادھ لی۔ ذرا دیر پہلے تو کیسے چہک رہی تھیں۔"

اختر کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا۔ گال اور کان تمتما اٹھے۔

"ایسی باتیں لڑکیوں سے نہیں کی جاتیں۔"

"ابھی ابھی جو باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ لڑکیاں نہیں دادی امائیں کر رہی تھیں۔"

"وہ عام تھیں۔ تم ذاتیات پر اتر آئی ہو۔ اب چلو یہاں سے۔"

"کہاں؟"

"اماں کے پاس۔"

"تمہاری اماں کے پاس؟" شرارت سے ہنس کر "اتنی جلدی تو میرے خیال میں مناسب نہ ہو گی۔"

"بھئی اللہ! یہ کیا بات ہوئی۔ میرا مطلب تھا اپنی ماں کے گھر جاؤ۔"

"اور ہاں بھائی جان کو تم نے شاید نہ دیکھا ہو، مجھے ان کی تصویر سمجھو، دوسری بات ہے وہ اسلامی طریقے والی۔ اگر میں انہیں یہ سب یاد دلاؤں اور وہ تمہیں دیکھنا چاہیں۔"

"منہ دھو رکھو، آئیں بڑی وہاں سے کم بخت کتنی بدتمیز ہوتی جا رہی ہے دھرنا مار کر بیٹھی ہے۔ اب نکلتی بھی ہو یہاں سے یا زبردستی دھکیلنا پڑے گا باہر۔"

"مار دیا دھکے دے کر باہر نکالو۔ مجھے جو معلوم کرنا تھا کر لیا۔ کل ہی اماں جان کو پٹی پڑھا کر بھیجتی ہوں تمہارے ہاں۔"

اب تو اختر نے اٹھ کر سچ مچ مہر کو کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

مہر جیسی ہنستی اندر داخل ہوئی تھی۔ اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی چلی گئی۔

(بشکریہ "عفت")

راغب مرادآبادی •

رُباعیات

جوہری طاقت کا انجام!

سرمایۂ اقتدار کھونا ہوگا
منہ خون کے آنسوؤں سے دھونا ہوگا
نازاں ہیں جو آج جوہری طاقت پہ
کل اپنے کئے پہ ان کو رونا ہوگا

رقص؟

دُھن ہے یہی لڑکیوں کو اب رقص کریں
بن ٹھن کے بہ ذوقِ شوق سب رقص کریں
اربابِ ہوس کی دل نوازی کے لئے
ممکن ہو اگر تمام شب رقص کریں

فریبِ نفس

جب دل پہ فریبِ نفس چل جاتا ہے
کردار و عمل کا رخ بدل جاتا ہے
انسان کہ جو نفس پہ قابو پا لے
گرتے گرتے بھی وہ سنبھل جاتا ہے

بُرا وقت

انسان پہ جب وقت بُرا آتا ہے
اوہامِ غلط کی رَو میں بہ جاتا ہے
ہو جاتی ہے سلب قوتِ فکر و عمل
جی دانش و تدبیر سے گھبراتا ہے

سعیِ مسلسل!

قطرہ دُرِ آبدار ہو سکتا ہے
کانٹا گلِ نوبہار ہو سکتا ہے
ہے سعیِ مسلسل کی ضرورت راغبؔ
مزدور بھی شہریار ہو سکتا ہے

۱

تہذیب

افراد

بیگم نعیم .... ایک چالیس سالہ خاتون
زینت .... بیگم نعیم کی اٹھارہ سالہ لڑکی
بیگم عزیز .... بیگم نعیم کی دوست
زرینہ .... ملازمہ
خانساماں .... اور .... بیرا

منظر

ایک کمرہ جو خواب گاہ معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف پلنگ بچھا ہے۔ سرہانے کی طرف بڑا لیمپ رکھا ہے۔ بائیں طرف دو آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ آرام کرسیوں کی پشت کی طرف دو کھڑکیاں ہیں دائیں طرف دروازہ ہے۔ کھڑکیوں اور دروازہ پر رنگین پھولدار پردے پڑے ہیں۔ آرام کرسیوں کے درمیان ایک میز ہے جس پر چند نوٹ رکھے ہیں۔ بیگم نعیم اچھے لباس میں ملبوس دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں اخبار ہے۔ وہ کچھ پڑھ رہی ہے، اردگرد کی فضا پر مکمل سکوت چھا رہا ہے۔

بیگم نعیم: (پکارتی ہے) زرینہ، زرینہ!

(زرینہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آتی ہے)

زرینہ: جی بیگم صاحب!

(بیگم اخبار گود میں رکھ لیتی ہے۔ میز پر سے نوٹ اٹھاتی ہے اور بارہ روپے گن کر اسے دیتی ہے وہ جھک کر لیتی ہے اور سلام کر کے جانے لگتی ہے)

[بیگم] نعیم: خانساماں کو بھیج دینا۔

[زر]ینہ: (پیچھے مڑ کر) جی بہت اچھا۔

(ایک آدھ لمحے کے بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے)

[بیگ]م: خانساماں

خانساماں: جی سرکار

بیگم نعیم: آ جاؤ۔

(خانساماں کمرے میں آتا ہے۔ سلام کرتا ہے اور مودب طور پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بیگم نعیم میز سے نوٹ اٹھاتی ہے۔ چالیس روپے گنتی ہے اور اسے دیتی ہے وہ روپے لیتا ہے اور جھک کر سلام کرتا ہے)

بیگم نعیم: بیرا کو بھیج دینا۔

خانساماں: بہت بہتر جناب!

(خانساماں باہر کی طرف رخ کرتا ہے اس اثنا میں کسی برتن کے گرنے کی آواز آتی ہے خانساماں چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ بیگم نعیم چونک اٹھتی ہے اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں)

بیگم نعیم :۔ بیرا ہوگا!

خانساماں :۔ شاید سرکار!

(خانساماں باہر نکل جاتا ہے۔ غصے میں بیگم نعیم گود میں سے اخبار اٹھاکر برابر والی آرام کرسی پر پٹک دیتی ہے۔ بیرا آتا ہے اور دروازے کے قریب کھڑا ہوجاتا ہے۔)

بیگم نعیم :۔ گرج کر کیا ہوا؟

بیرا :۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) جی ... جی

بیگم نعیم :۔ کیا توڑا ہے؟

بیرا :۔ (لرزتی ہوئی آواز سے) جی جگ۔

بیگم نعیم :۔ (قہر آلود نظروں سے بیرے کی طرف دیکھتی ہے) جگ کا بچہ! کون سا توڑا ہے؟

بیرا :۔ جی سفید۔

بیگم نعیم :۔ بڑا یا چھوٹا۔

بیرا :۔ (آہستگی سے) جی بڑا

بیگم نعیم :۔ تیرے باپ کی کمائی کا تھا جو توڑ ڈالا؟ ہاتھ میں سوراخ ہیں کیا جو ایک جگ نہ پکڑ سکے۔؟ نوکری یوں نہیں ہوتی نہیں کر سکتا تو جا کہیں مر رہ! (دائیں پاؤں سے جوتا اتارتی ہے اور پاؤں آرام کرسی پر رکھ لیتی ہے) ابھی پچھلے مہینے پیالی توڑی تھی، کل کوئی اور چیز توڑنا۔ پرسوں کوئی اور چیز۔

(دوسرا پاؤں بھی کرسی پر رکھ لیتی ہے) عجب تماشا شروع کر رکھا ہے (فیصلہ کن لہجے سے) سُن لو جگ۔ تمہاری تنخواہ میں سے آئے گا۔

(بیرا چونک اٹھتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے گھبرائی ہوئی نظروں سے بیگم نعیم کی طرف دیکھتا ہے۔ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا نظریں جھکا لیتا ہے۔ بیگم نعیم میز پر سے نوٹ اٹھاتی ہے اس میں سے پندرہ روپے میز پر رکھ دیتی ہے اور باقی بیرے کی طرف پھینک دیتی ہے)

بیگم نعیم :۔ اٹھا لو یہ باقی پندرہ روپوں کا جگ آئیگا۔ (نوٹ زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ بیرا بیگم نعیم کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے۔)

بیرا :۔ بیگم صاحب میرے چھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ایک ماں ہے ایک بہن اور ایک ......

بیگم نعیم :۔ (فقرے کو کاٹ کر حقارت سے) تو میں کیا کروں؟

بیرا :۔ ایک بچہ بیمار بھی ہے، آپ اگلے مہینے روپے کاٹ لیجئے گا

بیگم نعیم :۔ (پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں) تو اس کے لئے کفن خریدنا ہے۔ (ایک لمحے کے توقف کے بعد) اور یہ بڑھ بڑھ کر بولنا تم نے کب سے سیکھا ہے۔؟ عجب بدتہذیبی شروع کر دی ہے!

(بیرے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ جانے لگتا ہے۔ پھر رکتا ہے۔ زمین پر بکھرے ہوئے نوٹوں کی طرف دیکھتا ہے کچھ سوچتا ہے۔ پھر اٹھا لیتا ہے۔ اور دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ بیگم نعیم اخبار اٹھاکر پڑھنے لگتی ہے۔)

دوسرا منظر:۔

(بیگم نعیم پلنگ پر سو رہی ہے زرینہ تیزی سے آتی ہے کمرے میں پہنچکر بیگم نعیم کی طرف دیکھتی ہے اور سوچ میں پڑ جاتی ہے پھر قدرے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے قریب جاتی ہے اور ہولے ہولے پکارتی ہے)

زرینہ :۔ بیگم صاحب! بیگم صاحب!

(بیگم نعیم نیم وا آنکھوں سے زرینہ کی طرف دیکھتی ہے۔ چہرہ غضب آلود ہوجاتا ہے)

زرینہ :۔ (جلدی سے) بیگم صاحب بیگم عزیز آئی ہیں۔

بیگم نعیم :۔ (چادر دور پھینکتے ہوئے) بلالو۔

(زرینہ باہر نکلتی ہے۔ بیگم نعیم اٹھکر دروازہ کی طرف جاتی ہے اتنے میں بیگم عزیز داخل ہوتی ہے۔۔۔)

بیگم نعیم :۔ (مسکراکر) آئیے۔ میں تو مایوس ہو چلی تھی۔

(دونوں آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتی ہیں)

بیگم عزیز :۔ پہلے پانی منگوا دیجئے پھر باتیں ہونگی۔ سخت پیاس لگی ہے

بیگم نعیم :۔ بیرا! بیرا!

بیرا :۔ جی حضور! (کمرے میں داخل ہوکر)

ہیرا :- (اٹھاتی ہوئی نوٹ رکھکر) بہت بہتر حضور!

(ہیرا چلا جاتا ہے زینت نیچے پاؤں لٹکا کر پلنگ پر نیم دراز ہو جاتی ہے اور گنگنانے لگتی ہے۔ بیگم عزیز اور بیگم نعیم دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ اتنے میں ہیرا ہارمونیم لئے آجاتا ہے۔)

زینت :- (پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے) نیچے رکھدو۔

(ہیرا ہارمونیم قالین پر رکھدیتا ہے اور نوٹ اٹھا کر چلا جاتا ہے۔ زینت بیٹھ جاتی ہے اور ہارمونیم کے پردوں کو ٹھیک کرنے لگتی ہے اتنے میں ہیرا آتا ہے)

ہیرا :- مس صاحب دکاندار کا آدمی ابھی تک پھاٹک پر کھڑا ہے۔

زینت :- او ٹھیک، مجھے ہارمونیم کے پندرہ روپے دینا ہیں۔

(بیگم نعیم میز پر سے وہی پندرہ روپے اٹھاتی ہے اور ہیرا کی طرف اٹھاتی ہے۔ ہیرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ تھامتا ہے ہارمونیم کے سُر نکلنے لگتے ہیں، ہیرے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، اتنے میں زرینہ گھبرائی ہوئی آتی ہے)

زرینہ :- ہیرا تمہارا لڑکا . . . . .

ہیرا :- (اذیت سے) مرگیا)

(زرینہ افسردہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ ہیرے کے ہاتھوں سے روپے گرجاتے ہیں۔ ہارمونیم کے سُر بالکل مدہم پڑجاتے ہیں)

بیگم عزیز :- لڑکا کتنی عمر کا تھا؟

زرینہ :- شاید دو سال کا تھا۔

بیگم عزیز :- خیر، میں سمجھی جوان تھا۔

(ہیرا اسکی طرف دیکھتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں)

بیگم نعیم :- (زرینہ کی طرف دیکھ کر) یہ روپے اٹھا کر دکاندار کے آدمی کو دے آؤ۔ ہیرا تم گھر جا سکتے ہو۔

(ہیرا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے زرینہ بھی روپے اٹھا کر اس کے پیچھے جاتی ہے، ہارمونیم کے سُر پھر سے نکلنے لگتے ہیں۔)

بیگم نعیم :- آجکل تو ان لڑکیوں کو گانا بجانا سکھانا ہی پڑتا ہے۔

بیگم عزیز :- ہاں تہذیب جدید کی یہ دو کرتوتیں ہونگا۔

(دروازے سے نکلتے نکلتے ہیرا پیچھے مڑکر دونوں کی طرف دیکھتا ہے اس کے چہرے پر تلخی چھاجاتی ہے)

(ہارمونیم کے سُر بلند ہونے لگتے ہیں)

(بشکریہ "الحمرا")

حدیث نمبر چھپ گیا ہے

پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث کراچی کا خاص نمبر، جو اہل قرآن، منکرین حدیث، چکڑالوی اور پرویزی حضرات احادیث نبویہ پر جتنے اعتراضات پیش کرتے ہیں، حدیث نمبر میں ان کے صاف، واضح، بچے تلے مکمل مدلل مفصل مشرح اور اطمینان بخش جوابات درج ہیں۔ اس شاندار اور بے نظیر نمبر میں پاکستان اور ہندوستان کے مشاہیر زندہ دماغ اہل قلم علماء وشعراء حضرات نے نثر و نظم میں تعریف حدیث۔ شان حدیث۔ حفاظت حدیث۔ کتابت حدیث تدوین حدیث۔ تنقید حدیث۔ اصول حدیث۔ دلائل حدیث۔ درایت حدیث۔ روایت حدیث۔ تاریخ حدیث۔ حجیت حدیث۔ سند حدیث۔ راویان حدیث۔ حفاظ حدیث۔ عظمت حدیث۔ فضیلت حدیث۔ کرامت حدیث۔ مقام حدیث۔ صداقت حدیث۔ شرافت حدیث اور کتب حدیث پر بہترین طریق و اعلیٰ انداز سے خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ شکر اللہ سعیہم۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حدیث نمبر دشمنان حدیث نبوی کے بے بنیاد لایعنی اور لچر پوچ اعتراضات کے قلعہ کو مسمار اور پاش پاش کرنے کے لئے لاجواب ایٹم بم ثابت ہوا ہے۔ عاشقان رسول و محبان حدیث رسول کے اعتقاد و ایمان کی صیانت و حفاظت کے لئے مستحکم ڈھال ہے۔ لہذا لازم ہے کہ فدایان حدیث نبوی کا بچہ بچہ اس کو خرید کر حرز جان و تعویذ ایمان بنائے۔ خود اس کا مطالعہ کرے اور منکرین حدیث تک بھی پہنچائے۔ بڑے بڑے علمائے کرام کا کہنا ہے کہ اس دور الحاد اور پرفتن زمانہ میں اس حدیث نمبر کی اشاعت کرنا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جن علماء و شعراء کے بہترین رشحات قلم اس گرانقدر نمبر کی زینت بن چکے ہیں، ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں ملاحظہ ہوں:

مولانا عبدالستار صاحب دہلوی	مولانا شاہ بدیع الدین صاحب سندھی	مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
مولانا عبدالجلیل صاحب دہلوی	مولانا عبدالغفار صاحب دہلوی الخیری	مولانا اسلم صاحب جیراجپوری وغیرہ
مولانا عبداللہ صاحب روپڑی	مولانا عبدالسلام صاحب جھنگوی	**شعراء صاحبان**
مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی	مولانا عبداللہ صاحب لائل پوری	ابوالبیان صاحب حماد
مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی	مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری	صابر صاحب کاشمیری
مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی	مولانا شرف الدین صاحب دہلوی	روش صاحب امروہوی
مولانا عبدالحق صاحب بہاول پوری	مولانا مقبول احمد صاحب مجاہد گمٹکوی	نظمی صاحب آروی
مولانا عبداللہ صاحب عقیل مئوی	مولانا ابوالبیان عبدالرحمان حماد فرآبادی	ماہر القادری صاحب
مولانا محمد اسماعیل صاحب روپڑی	مولانا عبیداللہ صاحب مبارک پوری	کوثر صاحب دہلوی
مولانا عبدالقادر صاحب روپڑی	مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی	عبدالمجید صاحب بی۔ اے۔ سالک
مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی	مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی	مجید صاحب لاہوری
مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی	مولانا سید سلیمان صاحب ندوی	رئیس صاحب امروہوی
مولانا محمد رفیق صاحب پسروری	مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی	کوثر صاحب میرٹھی
مولانا عبدالقادر صاحب حصاری	مولانا نورالدین صاحب اجمیری	عاصی صاحب کرنالوی
مولانا عبدالمجید صاحب سوہدروی	مولانا عبدالحمید صاحب ارشد	ماہر صاحب اکبرآبادی

صحیفہ اہلحدیث کا یہ خاص نمبر خوشنما سہ رنگا ٹائیٹل، دلکش نظمیں، عمدہ مضامین، بہترین لکھائی، عمدہ چھپائی اور ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے ہدیہ مع محصولڈاک صرف تین روپے ہے۔ بشمع رسالت کے پروانے آج ہی تین روپے کا منی آرڈر پاکستانی پتہ پر بھیجکر یہ بیش بہا تحفہ جلد از جلد حاصل کریں۔ بعد میں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکے گا۔ نوٹ کر لیجئے۔ یہ حدیث نمبر وی پی پارسل روانہ نہ ہوگا، بلکہ تین روپے پیشگی آنے پر بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا۔ ہندوستانی حضرات:- مولانا عبدالواحد صاحب مدرسہ دارالکتاب والسنہ منڈی بان صدر بازار دہلی کے پتہ پر تین روپے آٹھ آنے کا منی آرڈر کرکے رسید ہمیں بھیجدیں، ہم حدیث نمبر بھیجدیں گے۔ انشاء اللہ۔

پاکستانی پتہ

مکتبہ شعیب ... روڈ کراچی

The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER

Only Title Printed by Paragon Printers, Bunder Road, karachi-1.